مُعارِفُ القُرآن

جلد ششم

سورۂ مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مومنون، نور، فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت مکمل
پارہ ۱۶ رکوع ۴ تا پارہ ۲۱ رکوع ۳

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المعارف
کراچی

معارف القرآن

ادارۃ المعارف
کراچی ۱۴ پاکستان

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

نحمدهٗ ونستعينهٗ ونستغفرهٗ ونؤمن بهٖ ونتوكّل عليهِ

ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيّأت أعمالنا

من يّهده الله فلا مُضلّ لهٗ ومن يُّضلله فلا هادي لهٗ

ونشهد أن لآ إله إلا الله وحدهٗ لا شريك لهٗ

ونشهد أن سيّدنا ومولانا مُحمّدًا عبدهٗ ورسولهٗ

صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين

معارف القرآن

جلد ششم

سورۂ مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مؤمنون، نور، فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، رُوم

پارہ: ۱۶، رُکوع: ۴ تا پارہ ۲۱ رُکوع: ۹

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

اِدارۃ المعارف کراچی

دفتر ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف حکومت سندھ

فون نمبر 021-99332012

موبائل نمبر 0300-3311811

جامع مسجد آرام باغ کراچی

نشان مجاریہ: آر۔آر۔او (اوقاف)

R.O. 43-2021

مورخہ 04-02-2021

تصدیق نامہ

ہم نے ''ادارۃ المعارف کراچی'' احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کی مطبوعہ تفسیر ''معارف القرآن'' مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان، جلد ششم کی اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد حنیف خالد صاحب (رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمۂ اوقاف سندھ) سے پروف ریڈنگ کروائی ہے۔ تفسیر ''معارف القرآن'' کے مکمل متن کو بغور پڑھا گیا، جو اغلاط تھیں، انہیں بحمد اللہ درست کروادیا گیا ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ تفسیر ''معارف القرآن'' حتی الامکان لفظی اور اعرابی اغلاط سے ان شاء اللہ تعالیٰ پاک و مبرا ہے۔

المصدق

4-2-2021

GOVERNMENT OF SINDH

RESEARCH AND REGISTRATION OFFICER AUQAF DEPARTMENT

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومت سندھ

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومت سندھ

باہتمام : محمد مشتاق ستی

طبع جدید : محرم ۱۴۴۴ھ - اگست ۲۰۲۲ء (۴)

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی

عرضِ ناشر:۔ اگرچہ ''معارف القرآن'' کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپیوٹر کمپوزنگ و کتابت، طباعت اور جلد بندی وغیرہ میں سہواً غلطی ہوجاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو برائے کرم مطلع فرمائیں۔

ادارۃ المعارف کراچی

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی پوسٹ کوڈ: **75180**

فون: 021-35032020، 021-35123161

موبائل: 0300 - 2831960

ای میل: imaarif@live.com

Idaratul-ma-Arif Karachi-14 Pakistan.

فہرستِ مضامین معارف القرآن جلد ششم

***

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ

اٰیاتہا ۹۸ | ۱۹ سُوْرَۃُ مَرْیَمَ مَکِّیَّۃٌ ۴۴ | رکوعاتہا ۶

سورۂ مریم مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں اٹھانوے آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ۟ۚ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۖ ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ

کہیعص یہ مذکور ہے تیرے رب کی رحمت کا اپنے بندہ زکریا پر جب پکارا اس نے اپنے رب کو

نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا

چھپی آواز سے، بولا اے میرے رب بوڑھی ہوگئیں میری ہڈیاں اور شعلہ نکلا سر سے بڑھاپے کا

وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ

اور تجھ سے مانگ کر اے رب میں کبھی محروم نہیں رہا اور میں ڈرتا ہوں بھائی بندوں سے اپنے پیچھے

وَكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا فَهَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ ﴿۵﴾ يَّرِثُنِىْ

اور عورت میری بانجھ ہے سو بخش تو مجھ کو اپنے پاس سے ایک کام اُٹھانے والا جو میری جگہ بیٹھے

وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ

اور یعقوب کی اولاد کی، اور کر اُس کو اے رَبّ مَن مانتا، اے زکریا ہم تجھ کو خوشخبری سُناتے ہیں

بِغُلٰمِ ۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ

ایک لڑکے کی جس کا نام ہے یحییٰ، نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی، بولا اے رَبّ کہاں سے ہوگا

لِىْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿۸﴾

مجھ کو لڑکا اور میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوگیا یہاں تک کہ اکڑ گیا،

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ

کہا یُونہی ہوگا، فرمادیا تیرے رَبّ نے وہ مجھ پر آسان ہے اور تجھ کو پیدا کیا میں نے پہلے سے

وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ

اور نہ تھا تو کوئی چیز، بولا اے رَبّ ٹھہرادے میرے لئے کوئی نشانی، فرمایا تیری نشانی یہ کہ بات نہ کرے تو لوگوں سے

ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ

تین رات تک صحیح تندرست، پھر نِکلا اپنے لوگوں کے پاس حجرہ سے تو اِشارہ سے کہا اُن کو

اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ

کہ یاد کرو صبح اور شام، اے یحییٰ اُٹھالے کتاب زور سے اور دیا ہم نے اس کو

الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾

حکم کرنا لڑکا پن میں اور شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی اور تھا پرہیزگار اور نیکی کرنے والا

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ

اپنے ماں باپ سے اور نہ تھا زبردست خود سر، اور سلام ہے اُس پر جس دن پیدا ہوا

وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ ع

اور جس دن مرے اور جس دن اُٹھ کھڑا ہو زندہ ہو کر

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

کٓھٰیٰعٓصٓ ① یہ تذکرہ ہے اُس رحمت کا جو تمہارے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی، ② یہ اُس وقت کی بات ہے جب انہوں نے اپنے پروردگار کو آہستہ آہستہ آواز سے پکارا تھا۔ ③ انہوں نے کہا تھا کہ: "میرے پروردگار! میری ہڈیاں تک کمزور پڑ گئی ہیں، اور سر بڑھاپے کی سفیدی سے بھڑک اُٹھا ہے، اور میرے پروردگار! میں آپ سے دُعا مانگ کر کبھی نامراد نہیں ہوا۔ ④ اور مجھے اپنے بعد اپنے چچازاد بھائیوں کا اندیشہ لگا ہوا ہے، اور میری بیوی بانجھ ہے، لہٰذا آپ خاص اپنے پاس سے مجھے ایک ایسا وارث عطا کر دیجئے ⑤ جو میرا بھی وارث ہو، اور یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد سے بھی میراث پائے۔ اور یا ربّ! اُسے ایسا بنایئے جو (خود آپ کا) پسندیدہ ہو۔" ⑥ (آواز آئی کہ:) اے زکریا! ہم تمہیں ایک ایسے لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ اس سے پہلے ہم نے اس کے نام کا کوئی اور شخص پیدا نہیں کیا۔" ⑦ زکریا نے کہا: "میرے پروردگار! میرے یہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے، اور میں بڑھاپے سے اس حال کو پہنچ گیا ہوں کہ میرا جسم سوکھ چکا ہے!" ⑧ کہا: "ہاں! ایسا ہی ہوگا۔ تمہارے ربّ نے فرمایا ہے کہ یہ تو میرے لئے معمولی بات ہے۔ اور اس سے پہلے میں نے تمہیں پیدا کیا تھا جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔" ⑨ زکریا نے کہا: "میرے پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے۔" فرمایا: "تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم صحت مند ہونے کے باوجود تین رات تک لوگوں سے بات نہیں کر سکو گے۔" ⑩ چنانچہ وہ عبادت گاہ سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آئے، اور ان

کو اِشارے سے ہدایت دی کہ تم لوگ صبح وشام اللہ کی تسبیح کیا کرو۔ ⑪ (پھر جب یحییٰ پیدا ہوکر بڑے ہو گئے تو ہم نے ان سے فرمایا:) ''اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو۔'' اور ہم نے بچپن ہی میں ان کو دانائی بھی عطا کردی تھی، ⑫ اور خاص اپنے پاس سے نرم دِلی اور پاکیزگی بھی، اور وہ بڑے پرہیزگار تھے، ⑬ اور اپنے والدین کے خدمت گذار، نہ وہ سرکش تھے، نہ نافرمان۔ ⑭ اور (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) سلام ہے ان پر اُس دن بھی جس روز وہ پیدا ہوئے، اُس دن بھی جس روز انہیں موت آئے گی، اور اُس دن بھی جس روز انہیں زندہ کرکے دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ ⑮

خلاصۂ تفسیر

کٓھٰیٰعٓصٓ ۝ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آئندہ قصہ آتا ہے) تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کے مہربانی فرمانے کا اپنے (مقبول) بندہ (حضرت) زکریا (علیہ السلام کے حال) پر جبکہ اُنہوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا (جس میں یہ) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں (بوجہ پیری کے) کمزور ہوگئیں اور (میرے) سر میں بالوں کی سفیدی پھیل پڑی (یعنی تمام بال سفید ہوگئے اور اس حال کا مقتضاء یہ ہے کہ میں اس حالت میں اولاد کی درخواست نہ کروں مگر چونکہ آپ کی قدرت ورحمت بڑی کامل ہے) اور (میں اس قدرت ورحمت کے ظہور کا خوگر ہمیشہ رہا ہوں چنانچہ اس کے قبل کبھی) آپ سے (کوئی چیز) مانگنے میں اے میرے رَبّ ناکام نہیں رہا ہوں (اس بناء پر بعید سے بعید مقصود بھی طلب کرنا مضائقہ نہیں) اور (اُس طلب کا مرجح یہ امر خاص ہوگیا ہے کہ) میں اپنے (مرنے کے) بعد (اپنے) رشتہ داروں (کی طرف) سے (یہ) اندیشہ رکھتا ہوں (کہ میری مرضی کے موافق شریعت اور دین کی خدمت نہ بجا لاویں گے۔ یہ امر مرجح ہے طلبِ اولاد کے لئے جس میں خاص خاص اوصاف پائے جائیں جن کو توقع خدمتِ دین میں دخل ہو) اور (چونکہ میری پیرانہ سالی کے ساتھ) میری بیوی (بھی) بانجھ ہے (جس کے کبھی باوجود میری صحتِ مزاج کے اولاد ہی نہیں ہوئی اس لئے اسبابِ عادیہ اولاد ہونے کے بھی مفقود ہیں) سو (اس صورت میں) آپ مجھ کو خاص اپنے پاس سے (یعنی بلاتوسط اسبابِ عادیہ کے) ایک ایسا وارث (یعنی بیٹا) دیدیجئے کہ وہ (میرے علومِ خاصّہ میں) میرا وارث بنے اور (میرے جد) یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان (کے علوم متوارثہ میں اُن) کا وارث بنے (یعنی علومِ سابقہ ولاحقہ اُس کو حاصل ہوں) اور (بوجہ باعمل ہونے کے) اس کو اے میرے رَبّ (اپنا) پسندیدہ (ومقبول) بنایئے (یعنی عالم بھی ہو اور عامِل بھی ہو۔ حق تعالیٰ کا بواسطہ ملائکہ کے ارشاد ہوا کہ) اے زکریا ہم تم کو ایک فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اس کے قبل (خاص اوصاف میں) ہم نے کسی کو اس کا ہم صفت نہ بنایا ہوگا (یعنی جس علم وعمل کی تم دُعا کرتے ہو

وہ تو اس فرزند کو ضرور ہی عطا کریں گے اور مزید برآں کچھ اوصافِ خاصّہ بھی عنایت کئے جائیں گے مثلاً خشیتِ الٰہیہ سے خاص درجہ کی رقّتِ قلب وغیرہ۔ چونکہ اس اجابتِ دُعا میں کوئی خاص کیفیت حصولِ ولد کی بتلائی نہ گئی تھی اس لئے اس کے استفسار کے لئے) زکریا (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے میرے رَبّ میرے اولاد کس طور پر ہوگی حالانکہ میری بی بی بانجھ ہے اور (ادھر) میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں (پس معلوم نہیں کہ ہم جوان ہوں گے یا مجھ کو دُوسرا نکاح کرنا ہوگا یا بحالتِ موجودہ اولاد ہوگی) ارشاد ہوا کہ حالت (موجودہ) یوں ہی رہے گی (اور پھر اولاد ہوگی اے زکریا) تمہارے رَبّ کا قول ہے کہ یہ (امر) مجھ کو آسان ہے اور (یہ کیا اس سے بڑا کام کر چکا ہوں مثلاً) میں نے تم کو (ہی) پیدا کیا ہے حالانکہ (پیدائش کے قبل) تم کچھ بھی نہ تھے (اسی طرح خود اسبابِ عادیہ بھی کوئی چیز نہ تھے جب معدوم کو موجود کرنا آسان ہے تو ایک موجود سے دوسرا موجود کر دینا کیا مشکل ہے یہ سب ارشاد تقویتِ رجا کے لئے تھا نہ کہ دفع شبہ کے لئے، کیونکہ زکریا علیہ السلام کو کوئی شبہ نہ تھا جب) زکریا (علیہ السلام کو قوی اُمید ہوگئی تو اُنہوں) نے عرض کیا کہ اے میرے رَبّ (وعدہ پر تو اطمینان ہو گیا اب اس وعدہ کے قربِ وقوع یعنی حمل کی بھی) کوئی علامت میرے لئے مقرر فرما دیجئے (تا کہ زیادہ شکر کروں اور خود وقوع تو محسوساتِ ظاہرہ ہی میں سے ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری (وہ) علامت یہ ہے کہ تم تین رات (اور تین دن تک) آدمیوں سے بات (چیت) نہ کر سکو گے حالانکہ تندرست ہو گے (کوئی بیماری وغیرہ نہ ہوگی اور اسی وجہ سے ذکر اللہ کے ساتھ تکلم پر قدرت رہے گی چنانچہ باذن اللہ تعالیٰ زکریا علیہ السلام کی بیوی حاملہ ہوئیں اور حسب اخبارِ الٰہی زکریا علیہ السلام کی زبان بستہ ہوگئی) پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے اور اُن کو اشارہ سے فرمایا (کیونکہ زبان سے تو بول نہ سکتے تھے) کہ تم لوگ صبح اور شام خدا کی پاکی بیان کیا کرو۔ (یہ تسبیح اور امر بالتسبیح یا تو حسب معمول تھا ہمیشہ تذکیر اَزبان سے کہتے تھے آج اشارہ سے کہا یا اس نعمتِ جدیدہ کے شکر میں خود بھی تسبیح کی کثرت فرمائی اور اَوروں کو بھی اسی طور پر امر فرمایا غرض پھر یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو اُن کو حکم ہوا کہ) اے یحییٰ کتاب کو (یعنی توریت کو کہ اس وقت وہی کتاب شریعت تھی اور انجیل کا نزول بعد میں ہوا) مضبوط ہو کر لو (یعنی خاص کوشش کے ساتھ عمل کرو) اور ہم نے ان کو (ان کے) لڑکپن ہی میں (دین کی) سمجھ اور خاص اپنے پاس سے رقتِ قلب (کی صفت) اور پاکیزگی (اخلاق کی) عطا فرمائی تھی (حکم میں علم کی طرف اور حنان اور زکوٰۃ میں اخلاق کی طرف اشارہ ہو گیا) اور وہ (خلق کے ساتھ) سرکشی کرنے والے (یا حق تعالیٰ کی) نافرمانی کرنے والے نہ تھے اور (عند اللہ ایسے وجیہ اور مکرّم تھے کہ اُن کے حق میں منجانب اللہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ) ان کو (اللہ تعالیٰ کا) سلام پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہو کر اُٹھائے جائیں گے۔

معارف ومسائل

سورۂ کہف کے بعد سورۂ مریم شاید اس مناسبت سے رکھی گئی کہ جیسے سورۂ کہف بہت سے واقعاتِ عجیبہ پر مشتمل تھی اسی طرح سورۂ مریم بھی ایسے واقعاتِ غریبہ پر مشتمل ہے (رُوح المعانی)۔[1] كٓهٰيٰعٓصٓ حروف مقطعہ اور متشابہات میں سے ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے بندوں کے لئے اِس کی تفتیش بھی اچھی نہیں۔ نِدَآءً خَفِيًّا ۳ اس سے معلوم ہوا کہ دُعاء کا آہستہ اور خفیہ کرنا افضل ہے، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ خَيْرَ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَخَيْرَ الرِّزْقِ مَا يَكْفِيْ، یعنی بہترین ذکر خفی (آہستہ) ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کافی ہو جائے (ضرورت سے نہ گھٹے نہ بڑھے)۔ (قرطبی)[2]

اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا، کمزوری ہڈیوں کی ذکر فرمائی کیونکہ وہی عمود بدن ہیں، جب ہڈی ہی کمزور ہو جائے تو یہ سارے بدن کی کمزوری ہے۔ اِشتعال کے لفظی معنی بھڑک اُٹھنے کے ہیں اس جگہ بالوں کی سفیدی کو آگ کی روشنی سے تشبیہ دے کر اس کا پورے سر پر پھیل جانا مقصود ہے۔

دُعا میں اپنی حاجت مندی کا اظہار مستحب ہے

اس جگہ دُعا سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے ضعف وکمزوری کا ذکر کیا، اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کی طرف خلاصۂ تفسیر میں اِشارہ کیا گیا ہے کہ ان حالات کا مقتضا یہ تھا کہ اولاد کی خواہش نہ کروں۔ ایک دُوسری وجہ امام قرطبی نے تفسیر میں یہ بھی بیان فرمائی کہ دُعا مانگنے کے وقت اپنے ضعف وبدحالی اور حاجت مندی کا ذکر کرنا قبولیتِ دُعاء کے لئے اقرب ہے، اسی لئے علماء نے فرمایا کہ انسان کو چاہئے کہ دُعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حاجت مندی کا ذکر کرے۔[3] مَوَالِيَ، مولیٰ کی جمع ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے اُن میں سے ایک معنی چچازاد بھائی اور اپنے عصبات کے بھی آتے ہیں اس جگہ وہی مراد ہے۔

انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی

يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ باتفاق جمہور علماء اس جگہ وراثت سے وراثتِ مالی مراد نہیں، کیونکہ اوّل تو حضرت زکریا کے پاس کوئی بڑی دولت ہونا ثابت نہیں جس کی فکر ہو کہ اس کا وارث کون ہوگا اور ایک پیغمبر کی شان سے بھی ایسی فکر

---

[1] روح المعانی ج:۱۶ ص:۵۷، تحت هٰذه الآية۔

[2] مجمع الزوائد، رقم الحديث: ۱۶۷۹۵ وتفسير القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۱ ص:۷۶

[3] تفسير القرطبی ج:۱۱ ص:۷۷

کرنا بعید ہے اس کے علاوہ صحیح حدیث جس پر صحابہ کرام کا اجماع ثابت ہے اُس میں ہے:

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ۔ [1] (رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ والترمذی)

بیشک علماء وارث ہیں انبیاء کے کیونکہ انبیاء علیہم السلام دینار ودرہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ اُن کی وراثت علم ہوتا ہے جس نے علم حاصل کرلیا اُس نے بڑی دولت حاصل کرلی۔

یہ حدیث کتبِ شیعہ کافی، کُلَیْنِیْ وغیرہ میں بھی موجود ہے، اور صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا نُوْرَثُ وَمَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔ [2]

ہم انبیاء کی مالی وراثت کسی کو نہیں ملتی ہم جو مال چھوڑیں وہ سب صدقہ ہے۔

اور خود اس آیت میں يَرِثُنِيْ کے بعد وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ کا اضافہ اس کی دلیل ہے کہ وراثت مالی مراد نہیں کیونکہ جس لڑکے کی پیدائش کی دُعا کی جارہی ہے اس کا آلِ یعقوب کے لئے مالی وارث بننا بظاہر حال ممکن نہیں۔ کیونکہ آلِ یعقوب کے وارث اُن کے عصبات قریبہ ہوں گے اور وہ وہی مَوَالِیْ ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا وہ بلاشبہ قرابت وعصوبت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے اقرب ہیں اقرب کے ہوتے ہوئے عصبہ بعید کو وراثت ملنا اُصولِ وراثت کے خلاف ہے۔

روح المعانی میں کتب شیعہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

رَوَى الْكُلَيْنِيُّ فِي الْكَافِيْ عَنْ اَبِي الْبُخْتَرِيِّ عَنْ اَبِيْ عَبْدِاللهِ قَالَ اِنَّ سُلَيْمَانَ وَرِثَ دَاوٗدَ وَاِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِثَ سُلَيْمَانَ۔

سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔ [3]

یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی مالی وراثت ملنے کا کوئی احتمال وامکان ہی نہیں، مراد اس سے علوم نبوّت کی وارثت ہے اس سے معلوم ہوا کہ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ [4] (النمل:۱۶) میں بھی وراثت مالی

---

[1] مسند احمد، باقی احادیث أبی الدرداء رضی اللہ عنہ رقم الحدیث:۲۲۳۴۷، وسنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فی فضل العلم ج:۲ ص:۱۵۷، وجامع الترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ ج:۲ ص:۹۸،۹۷

[2] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر، ج:۲ ص:۵۷۵

[3] روح المعانی ج:۱۶ ص:۶۴ [4] ترجمہ:- اور داؤد کے قائم مقام سلیمان ہوئے۔

مراد نہیں۔ لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِيًّا ۝۷ لفظ سَمِیّ کے معنے ہمنام کے بھی آتے ہیں، اور مثل و مشابہ کے بھی، اس جگہ اگر پہلے معنے مراد لئے جائیں تو مطلب واضح ہے کہ ان سے پہلے یَحۡیٰی نام کسی شخص کا نہیں ہوا تھا۔ یہ نام کی یکتائی اور اِمتیاز بھی بعض خاص صفات میں اُن کی یکتائی کی طرف مشیر تھی اس لئے اس کو ان کی صفتِ خاص میں ذکر کیا گیا۔ اور اگر دوسرے معنے مراد لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ بعض خاص صفات اور حالات اُن کے ایسے ہیں جو پچھلے انبیاء میں سے کسی میں نہ تھے اُن صفاتِ خاصہ میں وہ بے مثل تھے۔ مثلاً اُن کا حَصُوۡر ہونا وغیرہ اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یحیٰی علیہ السلام پچھلے سارے انبیاء سے مطلقاً افضل ہوں کیونکہ اُن میں حضرت خلیل اللہ اور حضرت کلیم اللہ کا ان سے افضل ہونا مُسلّم و معروف ہے۔ (مظہری)[1]

عِتِيًّا ۝۸ عُتُوٌّ سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تأثر قبول نہ کرنا ہے مراد اس سے ہڈیوں کا خشک ہو جانا ہے۔

سَوِيًّا ۝۱۰ کے معنے تندرست کے ہیں یہ لفظ اس لئے بڑھایا گیا کہ زکریا علیہ السلام پر اس حالت کا طاری ہونا کہ کسی انسان سے بات نہ کر سکیں کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا اور اسی وجہ سے ذکر اللہ اور عبادت میں ان کی زبان ان تینوں دنوں میں برابر کھلی ہوئی تھی بلکہ یہ حالت بطور معجزہ اور علامتِ حمل کے اُن پر طاری کی گئی تھی۔ حَنَانًا، اس لفظ کے لغوی معنے رقتِ قلب اور رحمت و شفقت کے ہیں جو حضرت یحیٰی علیہ السلام کو امتیازی طور پر دی گئی تھی۔

وقف لازم

وَاذۡكُرۡ فِي الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ ۘ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا ۝۱۶ لا

اور مذکور کر کتاب میں مریم کا جب جُدا ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان میں

فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا ۖ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا

پھر پکڑلیا اُن سے ورے ایک پردہ پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اُس کے آگے

بَشَرًا سَوِيًّا ۝۱۷ قَالَتۡ اِنِّيۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا ۝۱۸

آدمی پورا، بولی مجھ کو رحمٰن کی پناہ تجھ سے اگر ہے تو ڈر رکھنے والا

[1] تفسیر المظہری ج: ۶ ص: ۸۴، ۸۵، تحت ھٰذہ الآیۃ۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ

بولا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رَبّ کا کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا، بولی کہاں سے ہوگا

لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ

میرے لڑکا اور چھوا نہیں مجھ کو آدمی نے اور میں بدکار کبھی نہیں تھی، بولا یونہی ہے، فرمادیا تیرے رَبّ نے

هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ

وہ مجھ پر آسان ہے اور اُس کو ہم کیا چاہتے ہیں لوگوں کے لئے نشانی اور مہربانی اپنی طرف سے،

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾

اور ہے یہ کام مقرر ہو چکا

آسان ترجمۂ قرآن

اور اس کتاب میں مریم کا بھی تذکرہ کرو۔ اُس وقت کا تذکرہ جب وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر اُس جگہ چلی گئیں جو مشرق کی طرف واقع تھی۔ ﴿١٦﴾ پھر انہوں نے ان لوگوں کے اور اپنے درمیان ایک پردہ ڈال لیا۔ اس موقع پر ہم نے ان کے پاس اپنی رُوح (یعنی ایک فرشتے) کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک مکمل انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ﴿١٧﴾ مریم نے کہا: ''میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ اگر تم میں خدا کا خوف ہے (تو یہاں سے ہٹ جاؤ) ﴿١٨﴾ فرشتے نے کہا: ''میں تو تمہارے رَبّ کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں، (اور اس لئے آیا ہوں) تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دُوں۔'' ﴿١٩﴾ مریم نے کہا: ''میرے لڑکا کیسے ہو جائے گا، جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے، اور نہ میں کوئی بدکار عورت ہوں؟'' ﴿٢٠﴾ فرشتے نے کہا: ''ایسے ہی ہو جائے گا۔ تمہارے رَبّ نے فرمایا ہے کہ: ''یہ میرے لئے ایک معمولی بات ہے۔ اور ہم یہ کام اس لئے کریں گے تاکہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کی) ایک نشانی بنائیں، اور اپنی طرف سے رحمت کا مظاہرہ کریں۔ اور یہ بات پوری طرح طے ہو چکی ہے۔'' ﴿٢١﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کتاب (یعنی قرآن کے اس خاص حصہ یعنی سورت) میں (حضرت) مریم (علیہا السلام) کا قصہ بھی ذکر کیجئے (کہ وہ زکریا علیہ السلام کے قصہ مذکورہ سے خاص مناسبت رکھتا ہے اور وہ اُس وقت واقع ہوا) جب کہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ (ہوکر) ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب میں تھا (غسل کے لئے) گئیں پھر ان (گھر والے) لوگوں کے سامنے سے اُنہوں نے (درمیان میں) پردہ ڈال لیا (تا کہ اس کی آڑ میں غسل کر سکیں) پس (اس حالت میں) ہم نے اپنے فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) کو بھیجا اور وہ (فرشتہ) اُن کے سامنے (ہاتھ پاؤں اور صورت وشکل میں) ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا (چونکہ حضرت مریم نے اُس کو انسان سمجھا اس لئے گھبرا کر) کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اپنے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (کچھ) خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جائے گا) فرشتہ نے کہا کہ (میں بشر نہیں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو بلکہ) میں تو تمہارے رَبّ کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں (اس لئے آیا ہوں) تا کہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دُوں (یعنی تمہارے منہ میں یا گریبان میں دَم کردوں جس کے اثر سے باذن اللہ حمل رہ جائے اور لڑکا پیدا ہو) وہ (تعجب سے) کہنے لگیں (نہ کہ انکار سے) کہ میرے لڑکا کس طرح ہوجائے گا حالانکہ (اس کی شرائط عادیہ میں سے مرد کے ساتھ مقاربت ہے اور وہ بالکل مفقود ہے کیونکہ) مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا (یعنی نہ تو نکاح ہوا) اور نہ میں بدکار ہوں، فرشتہ نے کہا کہ (بس بغیر کسی بشر کے چھونے کے) یوں ہی (لڑکا) ہوجائے گا (اور میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ) تمہارے رَبّ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات (کہ بغیر اسباب عادیہ کے بچہ پیدا کردوں) مجھ کو آسان ہے اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم بغیر اسبابِ عادیہ کے) اس خاص طور پر اس لئے پیدا کریں گے تا کہ ہم اُس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی (قدرت کی) بنادیں اور (نیز اُس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت پانے کے لئے) اس کو باعثِ رحمت بنادیں اور یہ (بے باپ کے اس بچہ کا پیدا ہونا) ایک طے شدہ بات ہے (جو ضرور ہوکر رہے گی)۔

معارف ومسائل

اِنْتَبَذَتْ، نبذ سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے دُور ڈالنے اور پھینکنے کے ہیں۔ اِنْتِبَاذٌ کے معنی مجمع سے ہٹ کر دُور چلے جانے کے ہوئے۔ مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ یعنی گھر کے اندر مشرقی جانب کے کسی گوشہ میں چلی گئیں۔ اُن کا گوشہ میں جانا کس غرض کے لئے تھا اس میں احتمالات اور اقوال مختلف ہیں بعض نے کہا کہ غسل کرنے کے لئے اُس گوشہ میں گئی تھیں۔ بعض نے کہا کہ حسبِ عادت عباداتِ الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے محراب کی شرقی جانب کے کسی گوشہ کو اختیار کیا تھا۔

قرطبی نے اسی دوسرے احتمال کو احسن قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نصاریٰ نے جو جانب مشرق کو اپنا قبلہ بنایا اور اس جانب کی تعظیم کرتے ہیں اُس کی وجہ یہی ہے۔[۱]

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا، رُوح سے مراد جمہور کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں، اور بعض نے کہا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کے بطن سے پیدا ہونے والے بشر کی شبیہ اُن کے سامنے کردی، مگر پہلا قول راجح ہے بعد کے کلمات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ فرشتہ کو اُس کی اپنی اصلی صورت وہیئت میں دیکھنا انسان کے لئے آسان نہیں، اُس کی ہیبت غالب آجاتی ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غارِ حراء میں اور بعد میں پیش آیا، اس مصلحت سے جبرئیلِ امین حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بشکلِ انسانی ظاہر ہوئے، جب حضرت مریم نے ایک انسان کو اپنے قریب دیکھا جو پردہ کے اندر آگیا تو خطرہ ہوا کہ اِس کا ارادہ بُرا معلوم ہوتا ہے اس لئے فرمایا:

اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ، (میں اللہ رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں تجھ سے) بعض روایات میں ہے کہ جبرئیلِ امین نے یہ کلمہ سنا تو اللہ کے نام کی تعظیم کے لئے کچھ پیچھے ہٹ گئے۔

اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ یہ کلمہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی ظالم سے مجبور ہوکر فریاد کرے کہ اگر تو مؤمن ہے تو مجھ پر ظلم نہ کر۔ تیرا ایمان اس ظلم سے روکنے کے لئے کافی ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے لئے مناسب ہے کہ اللہ سے ڈرو، غلط اقدام سے بچو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ استعاذہ کی شرط نہیں بلکہ استعاذہ کے مؤثر ہونے کی شرط برائے ترغیب ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ کلمہ بطور مبالغہ کے لایا گیا ہے کہ اگر تم متقی بھی ہو تب بھی میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اور اس کے خلاف ہو تو معاملہ ظاہر ہے۔ (مظہری)[۲]

لِاَهَبَ لَكِ، اس میں عطائے فرزند کو جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طرف اس لئے منسوب کیا کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے بھیجا تھا کہ اُن کے گریبان میں پھونک ماردیں۔ یہ پھونک عطائے فرزند کا ذریعہ بن جائے گی، اگرچہ یہ عطا دراصل فعلِ الٰہی ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ

پھر پیٹ میں لیا اس کو پھر یکسو ہوئی اس کو لے کر ایک بعید مکان میں، پھر لے آیا اس کو درد زہ

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۹۰

[۲] تفسیر المظهری ج:٦ ص:۸۸

اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

ایک کھجور کی جڑ میں بولی کسی طرح میں مرچکتی اس سے پہلے اور ہوجاتی بھولی بسری

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

پس آواز دی اس کو اس کے نیچے سے کہ غمگین مت ہو کردیا تیرے ربّ نے تیرے نیچے ایک چشمہ

وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

اور ہلا اپنی طرف کھجور کی جڑ اُس سے گریں گی تجھ پر پکّی کھجوریں

فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْٓ

اب کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی رکھ پھر اگر تو دیکھے کوئی آدمی تو کہیو

اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ ۚ

میں نے مانا ہے رحمٰن کا روزہ سو بات نہ کروں گی آج کسی آدمی سے

آسان ترجمۂ قرآن

پھر ہوا یہ کہ مریم کو اُس بچے کا حمل ٹھہر گیا، (اور جب ولادت کا وقت قریب آیا) تو وہ اس کو لے کر لوگوں سے الگ ایک دُور مقام پر چلی گئیں۔ ﴿۲۲﴾ پھر زچگی کے درد نے انہیں ایک کھجور کے درخت کے پاس پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگیں: ''کاش کہ میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی، اور مر کر بھولی بسری ہوجاتی!'' ﴿۲۳﴾ پھر فرشتے نے ان کے نیچے ایک جگہ سے اُنہیں آواز دی کہ: ''غم نہ کرو، تمہارے ربّ نے تمہارے نیچے ایک چشمہ پیدا کردیا ہے۔ ﴿۲۴﴾ اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ، اُس میں سے پکی ہوئی تازہ کھجوریں تم پر جھڑیں گی۔ ﴿۲۵﴾ اب کھاؤ، اور پیؤ، اور آنکھیں ٹھنڈی رکھو۔ اور اگر لوگوں میں سے کسی کو آتا دیکھو تو (اشارے سے) کہہ دینا کہ: ''آج میں نے خدائے رحمٰن کے لئے ایک روزے کی منّت مانی ہے، اس لئے میں کسی بھی انسان سے بات نہیں کروں گی۔'' ﴿۲۶﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر (اس گفتگو کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے اُن کے گریبان میں پھونک ماردی جس سے) اُن کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا، پھر (جب اپنے وقت پر حضرت مریم کو بچہ کی پیدائش کے آثار محسوس ہوئے تو) اس حمل کو لئے ہوئے (اپنے گھر سے) کسی دُور جگہ (جنگل پہاڑ میں) الگ چلی گئیں پھر (جب درد شروع ہوا تو) دردِ زہ کی وجہ سے کھجور کے درخت کی طرف آئیں (کہ اس کے سہارے بیٹھیں اُٹھیں، اب حالت یہ تھی کہ نہ کوئی انیس نہ جلیس، درد سے بے چین، ایسے وقت جو سامان راحت وضرورت کا ہونا چاہئے وہ ندارد، ادھر بچہ ہونے پر بدنامی کا خیال، آخر گھبرا کر) کہنے لگیں کاش میں اس (حالت) سے پہلے مرگئی ہوتی اور ایسی نیست ونابود ہوجاتی کہ کسی کو یاد بھی نہ رہتی، پس (اسی وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے حضرت) جبرئیل (علیہ السلام پہنچے اور اُن کے احترام کی وجہ سے سامنے نہیں گئے بلکہ جس مقام پر حضرت مریم تھیں اس سے اسفل مقام میں آڑ میں آئے اور اُنہوں) نے اُن کے (اس) پائیں (مکان) سے ان کو پکارا۔ (جس کو حضرت مریم نے پہچانا کہ یہ اُسی فرشتہ کی آواز ہے جو اوّل ظاہر ہوا تھا) کہ تم (بے سروسامانی سے یا خوفِ بدنامی سے) مغموم مت ہو، (کیونکہ بے سروسامانی کا تو یہ انتظام ہوا ہے کہ) تمہارے رَبّ نے تمہارے پائیں (مکان) میں ایک نہر پیدا کردی ہے (جس کے دیکھنے سے اور پانی پینے سے فرحت طبعی ہو، ونیز حسبِ روایت روح ان کو اس وقت پیاس بھی لگی تھی اور حسب مسئلہ طِبیہ گرم چیزوں کا استعمال قبلِ وضع یا بعد وضع مسہلِ ولادت ودافعِ فضلات ومقوی طبیعت بھی ہے اور پانی میں اگر سخونت (گرمی) بھی ہو جیسا بعض چشموں میں مشاہد ہے تو اور زیادہ مزاج کے موافق ہوگا، ونیز کھجور کثیر الغذاء مولّدِ خون، مسمّن ومقوی گردہ کمر ومفاصل ہونے کی وجہ سے زچہ کے لئے سب غذاؤں اور دواؤں سے بہتر ہے اور حرارت کی وجہ سے جو اُس کی مضرت کا احتمال ہے سو اوّل تو رطب میں حرارت کم ہے، دوسرے پانی سے اس کی اصلاح ہوسکتی ہے تیسرے مضرت کا ظہور جب ہوتا ہے کہ عضو میں ضعف ہو ورنہ کوئی چیز بھی کچھ نہ کچھ مضرت سے خالی نہیں ہوتی ونیز خرق عادت (کرامت) کا ظہور اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت ہونے کی وجہ سے موجبِ مسرّتِ روحانی بھی ہے) اور اس کھجور کے تنہ کو (پکڑ کر) اپنی طرف ہلاؤ اس سے تم پر تروتازہ کھجوریں جھڑیں گی (کہ اس سے پھل کے کھانے میں لذتِ جسمانی اور بطور خرق عادت کے پھل کے آنے میں لذتِ روحانی مجتمع ہے) پھر (اس پھل کو) کھاؤ اور (وہ پانی) پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو (یعنی بچہ کے دیکھنے سے اور کھانے پینے سے اور علامت قبول عنداللہ ہونے سے خوش رہو) پھر (جب بدنامی کے احتمال کا موقع آئے یعنی کوئی آدمی اس قصہ پر مطلع ہو تو اس کا یہ انتظام ہوا ہے کہ) اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو بھی (آتا اور اعتراض کرتا) دیکھو تو (تم کچھ مت بولنا بلکہ اشارہ سے اس سے) کہہ دینا کہ میں نے تو اللہ کے واسطے (ایسے)

روزہ کی منّت مان رکھی ہے (جس میں بولنے کی بندش ہے) سو (اس وجہ سے) میں آج (دن بھر) کسی آدمی سے نہیں بولوں گی (اور خدا کے ذکر اور دُعا میں مشغول ہونا اور بات ہے بس تم اتنا جواب دے کر بے فکر ہو جانا، اللہ تعالیٰ اس مولود مسعود کو خرقِ عادت کے طور پر بولتا کر دے گا جس سے ظہور اعجاز دلیل نزاہت و عصمت ہو جائے گی غرض ہر غم کا علاج ہو گیا۔)

معارف و مسائل

تمنائے موت کا حکم

یہ تمنائے موت اگر غمِ دُنیا سے تھی تب تو غلبۂ حال کو اس کا عذر کہا جائے گا جس میں انسان من کُلّ الوجوہ مکلّف نہیں رہتا اور اگر غمِ دین سے تھا کہ لوگ بدنام کریں گے اور شاید مجھے اس پر صبر نہ ہو سکے تو بے صبری کی معصیت میں ابتلا ہوگا، موت سے اس معصیت کی حفاظت رہے گی تو ایسی تمنا ممنوع نہیں ہے اور اگر شبہ ہو کہ حضرت مریم کو جو کہا گیا کہ تم کہہ دینا کہ میں نے نذر کی ہے سو انہوں نے نذر تو نہ کی تھی، جواب یہ ہے کہ اسی سے یہ حکم بھی مفہوم ہو گیا کہ تم نذر بھی کر لینا اور اس کو ظاہر کر دینا۔

سکوت کا روزہ شریعتِ اسلامیہ میں منسوخ ہو گیا

قبل از اسلام یہ بھی عبادت میں داخل تھا کہ بولنے کا روزہ رکھے، صبح سے رات تک کسی سے کلام نہ کرے۔ اسلام نے اس کو منسوخ کر کے یہ لازم کر دیا کہ صرف بُرے کلام گالی گلوچ، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ عام گفتگو ترک کرنا اسلام میں کوئی عبادت نہیں رہی اس لئے اس کی نذر ماننا بھی جائز نہیں۔ لما رواہ ابوداؤد مرفوعًا لَا يُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ وَلَا صُمَاتَ يَوْمٍ إِلَى اللَّيْلِ [1] وحسنہ السیوطی والعزیز، یعنی بچہ بالغ ہونے کے بعد باپ کے مرنے سے یتیم نہیں کہلاتا، اُس پر اَحکام یتیم کے جاری نہیں ہوتے اور صبح سے شام تک خاموش رہنا تو (اسلام میں) کوئی عبادت نہیں۔ اور دردِ زہ میں پانی اور کھجور کا استعمال طِبًّا بھی مفید ہے اور اکل وشرب کا حکم بظاہر اباحت کے لئے معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

بغیر مرد کے تنہا عورت سے بچہ پیدا ہو جانا خلافِ عقل نہیں

اور حمل و تولد بلا توسّط مرد کے خارق عادت (معجزہ) ہے اور خوارق میں کتنا ہی استبعاد ہو مضائقہ نہیں بلکہ

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء متی ینقطع الیتم ج:۲ ص:۴۱

وصفِ اعجاز کا اور زیادہ ظہور ہے لیکن اس میں اس وجہ سے زیادہ استبعاد بھی نہیں کہ حسب تصریح کتب طب عورت کی منی میں قوّتِ منعقدہ کے ساتھ قوّتِ عاقدہ بھی ہے اس لئے مرض رَجَا میں اعضاء کی کچھ ناتمام صورت بھی بن جاتی ہے کما صرح فی القانون، پس اگر یہی قوّتِ عاقدہ اور بڑھ جائے تو زیادہ مستبعد نہیں ہے۔ (بیان القرآن) [۱]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو کھجور کا درخت ہلانے کا حکم دیا، حالانکہ اُس کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ بغیر اُن کے ہلانے کے خود ہی کھجوریں اُن کی گود میں گر جاتیں مگر حکمت یہ ہے کہ اس میں تحصیلِ رزق کے لئے کوشش کرنے کا سبق ملتا ہے اور یہ بھی بتلانا ہے کہ رزق کے حاصل کرنے میں کوشش اور محنت کرنا توکل کے خلاف نہیں۔ (رُوح المعانی) [۲]

سَرِيًّا (۲۴) لفظ **سری** کے لغوی معنی چھوٹی نہر کے ہیں۔ اس موقع پر حق تعالیٰ نے ایک چھوٹی نہر اپنی قدرت سے بلاواسطہ جاری فرما دی یا جبرئیل کے ذریعہ چشمہ جاری کرا دیا، دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت مریم کی تسلی کے اسباب ذکر کرنے کے وقت تو پہلے پانی کا ذکر فرمایا پھر کھانے کی چیز کھجور کا، اور جب استعمال کا ذکر آیا تو ترتیب بدل کر پہلے کھانے کا حکم فرمایا پھر پانی پینے کا۔ **فَكُلِي وَاشْرَبِي**، وجہ غالباً یہ ہے کہ انسان کی فطری عادت ہے کہ پانی کا اہتمام کھانے سے پہلے کرتا ہے خصوصاً کوئی ایسی غذا جس کے بعد پیاس لگنا یقینی ہو اُس کے کھانے سے پہلے پانی مہیا کرتا ہے مگر استعمال کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے غذا کھاتا ہے پھر پانی پیتا ہے۔ (رُوح المعانی) [۳]

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾

پھر لائی اس کو اپنے لوگوں کے پاس گود میں وہ اُس کو کہنے لگے اے مریم تو نے کی یہ چیز طوفان کی

يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

اے بہن ہارون کی نہ تھا تیرا باپ بُرا آدمی اور نہ تھی تیری ماں بدکار

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ

پھر ہاتھ سے بتلایا اُس لڑکے کو، بولے ہم کیونکر بات کریں اُس شخص سے کہ وہ ہے گود میں لڑکا وہ بولا

---

[۱] بیان القرآن تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۵،۶ [۲] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۱۶ ص:۸۵

[۳] روح المعانی بحوالۂ بالا۔

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۟ۙ (۳۰) وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا

میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اُس نے کتاب دی ہے اور مجھ کو اُس نے نبی کیا اور بنایا مجھ کو برکت والا

اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۟ۖ (۳۱)

جس جگہ میں ہوں اور تاکید کی مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ؗ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (۳۲) وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ

اور سلوک کرنے والا اپنی ماں سے اور نہیں بنایا مجھ کو زبردست بدبخت اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا

وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (۳۳)

اور جس دن مروں اور جس دن اُٹھ کھڑا ہوں زندہ ہو کر

آسان ترجمۂ قرآن

پھر وہ اُس بچے کو اُٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ وہ کہنے لگے کہ: ''مریم! تم نے تو بڑا غضب ڈھادیا۔ (۲۷) اے ہارون کی بہن! نہ تو تمہارا باپ کوئی بُرا آدمی تھا، نہ تمہاری ماں کوئی بدکار عورت تھی!'' (۲۸) اس پر مریم نے اُس بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا: ''بھلا ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی پالنے میں پڑا ہوا بچہ ہے؟'' (۲۹) (اس پر) بچہ بول اُٹھا کہ: ''میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی ہے، اور نبی بنایا ہے، (۳۰) اور جہاں بھی میں رہوں، مجھے بابرکت بنایا ہے، اور جب تک زندہ رہوں، مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، (۳۱) اور مجھے اپنی والدہ کا فرماں بردار بنایا ہے، اور مجھے سرکش اور سنگ دِل نہیں بنایا۔ (۳۲) اور (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) سلامتی ہے مجھ پر اُس دن بھی جب میں پیدا ہوا، اور اُس دن بھی جس دن میں مروں گا، اور اُس دن بھی جب مجھے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا۔'' (۳۳)

خلاصۂ تفسیر

(غرض مریم علیہا السلام کی اس کلام سے تسلی ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے) پھر وہ ان کو گود میں لئے ہوئے

(وہاں سے بستی کو چلیں اور) اپنی قوم کے پاس لائیں، لوگوں نے (جو دیکھا کہ ان کی شادی تو ہوئی نہ تھی یہ بچہ کیسا، بدگمان ہوکر) کہا اے مریم! تم نے بڑے غضب کا کام کیا (یعنی نعوذ باللہ بدکاری کی، اور یوں تو بدکاری کوئی بھی کرے بُرا ہے لیکن تم سے ایسا فعل ہونا زیادہ غضب کی بات ہے کیونکہ) اے ہارون کی بہن! (تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا چنانچہ) تمہارے باپ کوئی بُرے آدمی نہ تھے (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو) اور نہ تمہاری ماں بدکار تھیں (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو، پھر ہارون جو تمہارے رشتہ کے بھائی ہیں جن کا نام ان ہارون نبی کے نام پر رکھا گیا ہے وہ کیسے کچھ نیک شخص ہیں، غرض جس کا خاندان کا خاندان پاک صاف ہو اُس سے یہ حرکت ہونا کتنا بڑا غضب ہے) پس مریم (علیہا السلام) نے (یہ ساری تقریر سُن کر کچھ جواب نہیں دیا بلکہ) بچہ کی طرف اشارہ کر دیا (کہ اس سے کہو جو کچھ کہنا ہو یہ جواب دے گا) وہ لوگ (سمجھے یہ ہمارے ساتھ تمسخر کرتی ہیں) کہنے لگے کہ بھلا ہم ایسے شخص سے کیونکر باتیں کریں جو ابھی گود میں بچہ ہی ہے (کیونکہ بات اُس شخص سے کی جاتی ہے جو کہ وہ بھی بات چیت کرتا ہو، سو جب یہ بچہ ہے اور بات پر قادر نہیں، تو اس سے کیا بات کریں اتنے میں) وہ بچہ (خود ہی) بول اُٹھا کہ میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں (نہ تو اللہ ہوں جیسا کہ جہلاء نصاریٰ سمجھیں گے اور نہ غیر مقبول ہوں جیسا یہود سمجھیں گے اور بندہ ہونے کے اور پھر خاص ہونے کے یہ آثار ہیں کہ) اس نے مجھ کو کتاب (یعنی انجیل) دی (یعنی گو آئندہ دے گا مگر بوجہ یقینی ہونے کے ایسا ہی ہے جیسا کہ دیدی) اور اس نے مجھ کو نبی بنایا (یعنی بنائے گا) اور مجھ کو برکت والا بنایا (یعنی مجھ سے خلق کو دین کا نفع پہنچے گا) میں جہاں کہیں بھی ہوں (گا مجھ سے برکت پہنچے گی وہ نفع تبلیغِ دین ہے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے اُنہوں نے تو نفع پہنچا ہی دیا) اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں (دُنیا میں) زندہ رہوں (اور ظاہر ہے کہ آسمان پر جانے کے بعد مکلّف نہیں رہے اور یہ دلیل ہے بندہ ہونے کی جیسا کہ اور دلائل ہیں خصوصیت کے) اور مجھ کو میری والدہ کا خدمت گزار بنایا (اور چونکہ بے باپ پیدا ہوئے ہیں اس لئے والدہ کی تخصیص کی گئی) اور اس نے مجھ کو سرکش بدبخت نہیں بنایا (کہ ادائے حقِ خالق یا ادائے حقِ والدہ سے سرکشی کروں یا حقوق و اعمال کے ترک سے بدبختی خرید لوں) اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا (کہ وہ زمانہ قربِ قیامت کا بعد نزول من السماء کے ہوگا) اور جس روز میں (قیامت میں) زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا (اور اللہ کا سلام دلیل ہے خاص بندہ ہونے کی)۔

معارف و مسائل

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ان الفاظ سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت مریم کو جب غیبی بشارتوں کے ذریعہ اس کا اطمینان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بدنامی اور رُسوائی سے بچائیں گے تو خود ہی اپنے نومولود بچے کو لئے اپنے گھر واپس آ گئیں۔ پھر یہ

واپسی پیدائش کے کتنے دن بعد ہوئی۔ ابن عساکر کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولادت سے چالیس روز بعد جب نفاس سے فراغت وطہارت ہوچکی اُس وقت اپنے گھر والوں کے پاس آئیں۔ (رُوح المعانی) [۱]

شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ لفظ فَرِیٌّ عربی زبان میں دراصل کاٹنے اور پھاڑنے کے معنی میں آتا ہے، جس کام یا جس چیز کے ظاہر ہونے میں غیر معمولی کاٹ چھانٹ ہو اُس کو فَرِیٌّ کہتے ہیں۔ ابوحیان نے فرمایا کہ ہر امرِ عظیم کو فَرِیٌّ کہا جاتا ہے خواہ وہ اچھائی کے اعتبار سے عظیم ہو یا بُرائی کے اعتبار سے۔ اس جگہ بڑی بُرائی کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا اکثر استعمال ایسی ہی چیز کے لئے معروف ہے جو اپنی شناعت اور بُرائی کے اعتبار سے غیر معمولی اور بڑی سمجھی جاتی ہو۔ [۲]

يَٰٓأُخْتَ هَٰرُونَ، حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور ساتھی تھے حضرت مریم کے زمانے سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے یہاں حضرت مریم کو ہارون کی بہن قرار دینا ظاہر ہے کہ اپنے اس ظاہری مفہوم کے اعتبار سے نہیں ہوسکتا اسی لئے جب حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کے پاس بھیجا تو اُنہوں نے سوال کیا کہ تمہارے قرآن میں حضرت مریم کو اُخت ہارون کہا گیا ہے حالانکہ ہارون علیہ السلام اُن سے بہت قرنوں پہلے گزر چکے ہیں، حضرت مغیرہ کو اس کا جواب معلوم نہ تھا جب واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ اہلِ ایمان کی عادت یہ ہے کہ تبرکاً انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے نام رکھتے ہیں اور اُن کی طرف نسبت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد ومسلم والترمذی والنسائی)۔ [۳] اس حدیث کے مطلب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت مریم کی نسبت حضرت ہارون کی طرف اس لئے کردی گئی کہ وہ اُن کی نسل واولاد میں سے ہیں اگرچہ زمانہ کتنا ہی بعید ہوگیا ہو جیسے عرب کی عادت ہے کہ قبیلہ تمیم کے آدمی کو اخا تمیم اور عرب کے آدمی کو اخا عرب بولتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں ہارون سے مراد ہارون نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق مراد نہیں بلکہ حضرت مریم کے اپنے بھائی کا نام ہارون تھا جو تبرکاً حضرت ہارون نبی کے نام پر رکھا گیا تھا اس طرح مریم کو اخت ہارون کہنا اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے درست ہوگیا۔

مَا كَانَ أَبُوكِ ٱمْرَأَ سَوْءٍ، ان الفاظِ قرآن سے اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ اور صالحین کی اولاد میں ہو وہ اگر کوئی بُرا کام کرتا ہے تو وہ عام لوگوں کے گناہ سے زیادہ بڑا گناہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے اُس کے بڑوں کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے اس لئے اولاد صالحین کو اعمالِ صالحہ اور تقویٰ کی زیادہ فکر کرنا چاہئے۔

---

[۱] روح المعانی ج:۱۶ ص:۸۷

[۲] تفسیر البحر المحیط لأبی حیانؒ تحت ھٰذہ الآیة (باختصار) ج:۸ ص:۱۸، راجع للتفصیل روح المعانی ج:۱۶ ص:۸۷

[۳] مسند احمد، حدیث المغیرة بن شعبة رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۱۸۲۹۳، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورة مریم ج:۲ ص:۱۴۸، وصحیح مسلم، کتاب الآداب، باب النھی عن التکنی بأبی القاسم إلخ ج:۲ ص:۲۰۶

اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ ؕ ایک روایت میں ہے کہ جس وقت خاندان کے لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو ملامت کرنا شروع کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پی رہے تھے۔ جب انہوں نے ان لوگوں کی ملامت کو سُنا تو دودھ چھوڑ دیا اور اپنی بائیں کروٹ پر سہارا لے کر اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ یعنی میں اللہ کا بندہ ہوں، اس پہلے ہی لفظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس غلط فہمی کا اِزالہ کر دیا کہ اگرچہ میری پیدائش معجزانہ انداز سے ہوئی ہے مگر میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں تاکہ لوگ میری پرستش میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ ان الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی شیر خوارگی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوّت اور کتاب ملنے کی خبر دی۔ حالانکہ کسی پیغمبر کو چالیس سال کی عمر سے پہلے نبوّت و کتاب نہیں ملتی۔ اس لئے مفہوم اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرما دیا ہے کہ مجھے اپنے وقت پر نبوّت اور کتاب دیں گے اور یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے نبوّت اُس وقت عطا کر دی گئی تھی جب کہ آدم علیہ السلام ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اُن کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا۔ [۱] اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اس کے سوا نہیں کہ عطائے نبوّت کا وعدہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قطعی اور یقینی تھا یہاں بھی اسی یقین کو عطائے نبوّت کے لفظ ماضی سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ عطائے نبوّت کا اظہار کرنے سے ان لوگوں کی بدگمانی رفع کر دی گئی کہ میری والدہ پر بدکاری کا الزام لگانا سراسر غلط ہے کیونکہ میرا نبی ہونا اور مجھے رسالت کا ملنا اس کی دلیل ہے کہ میری پیدائش میں کسی گناہ کا دخل نہیں ہو سکتا۔

وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّکٰوةِ، کسی چیز کا حکم جب زیادہ تاکید کے ساتھ کیا جائے تو اس کو وصیت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی اس کا مفہوم یہی ہے کہ بڑی تاکید سے ان دونوں چیزوں کا مجھے حکم دیا۔

نماز اور زکوٰۃ، ایسی عبادتیں ہیں کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی و رسول کی شریعت میں فرض رہی ہیں البتہ مختلف شریعتوں میں ان کی تفصیلات اور جزئیات مختلف رہی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز اور زکوٰۃ فرض تھے۔ رہا یہ معاملہ کہ عیسیٰ علیہ السلام تو کبھی مالدار ہی نہیں ہوئے، نہ گھر بنایا نہ کچھ جمع کیا پھر زکوٰۃ کا اُن کو حکم دینا کس بناء پر ہے؟ تو اس کا مقصد واضح یہ ہے کہ ان کی شریعت میں قانون یہ بنا دیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس مال ہو اُس پر زکوٰۃ فرض ہے عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کے مخاطب ہیں کہ جب کبھی مال بقدرِ نصاب جمع ہو جائے تو زکوٰۃ ادا کریں پھر اگر عمر بھر میں کبھی مال جمع ہی نہ ہو تو یہ اُس کے منافی نہیں۔ (روح) [۲]

[۱] مصنف ابن ابی شیبة رقم الحدیث: ۳۶۵۵۳ [۲] روح المعانی تحت ھذہ الآیة ج:۱۶ ص:۸۹، ۹۰

مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ یعنی نماز اور زکوٰۃ کا حکم میرے لئے دائمی ہے جب تک زندہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ حیات ہے جو اس عالم دُنیا میں زمین پر ہے کیونکہ یہ اعمال اسی زمین پر ہو سکتے ہیں اور یہیں سے متعلق ہیں آسمان پر اُٹھائے جانے کے بعد نزول کے زمانے تک رُخصت کا زمانہ ہے۔

وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ اس جگہ صرف والدہ کا ذکر کیا والدین کا نہیں، اس میں اشارہ کر دیا کہ میرا وجود معجزانہ طور پر بغیر والد کے ہوا ہے اور بچپن کا یہ معجزانہ کلام اس کے لئے کافی شہادت اور دلیل ہے۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ

یہ ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا سچی بات جس میں لوگ جھگڑتے ہیں اللہ ایسا نہیں

اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ

کہ رکھے اولاد وہ پاک ذات ہے جب ٹھہرالیتا ہے کسی کام کا کرنا، سو یہی کہتا ہے اس کو کہ

كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ

ہو وہ ہوجاتا ہے اور کہا بیشک اللہ ہے رَبّ میرا اور رَبّ تمہارا، سو اس کی بندگی کرو، یہ ہے راہ

مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

سیدھی پھر جُدی جُدی راہ اختیار کی فرقوں نے اُن میں سے سو خرابی ہے منکروں کو

مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا

جس وقت دیکھیں گے ایک دن بڑا، کیا خوب سنتے اور دیکھتے ہوں گے، جس دن آئیں گے ہمارے پاس،

لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ

پر بے انصاف آج کے دن صریح بہک رہے ہیں اور ڈر سنادے اُن کو اُس پچتاوے کے دن کا،

وقف لازم

اِذۡ قُضِیَ الۡاَمۡرُ ؕ وَ هُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ وَّ هُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ

جب فیصل ہو چکے گا کام اور وہ بھول رہے ہیں اور وہ یقین نہیں لاتے ہم وارث ہوں گے

ع ۲ ۲۵ ۵

الۡاَرۡضَ وَ مَنۡ عَلَیۡهَا وَ اِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۴۰﴾ ع

زمین کے اور جو کوئی ہے زمین پر اور وہ ہماری طرف پھر آئیں گے

آسان ترجمۂ قرآن

یہ ہیں عیسیٰ بن مریم! ان (کی حقیقت) کے بارے میں سچی بات یہ ہے جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ ﴿۳۴﴾ اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے، اُس کی ذات پاک ہے۔ جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اُس سے یہ کہتا ہے کہ: ''ہو جا'' چنانچہ وہ ہو جاتی ہے۔ ﴿۳۵﴾ اور (اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ:) یقیناً اللہ میرا بھی پروردگار ہے، اور تمہارا بھی پروردگار، اس لئے اُس کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ ﴿۳۶﴾ پھر بھی ان میں سے مختلف گروہوں نے اختلاف ڈال دیا ہے، چنانچہ جس دن یہ ایک زبردست دن کا مشاہدہ کریں گے، اُس دن اُن کی بڑی تباہی ہوگی جنھوں نے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ ﴿۳۷﴾ جس روز یہ ہمارے پاس آئیں گے، اُس دن یہ کتنے سننے والے اور دیکھنے والے بن جائیں گے! لیکن یہ ظالم آج کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ﴿۳۸﴾ اور (اے پیغمبر!) ان کو اُس پچھتاوے کے دن سے ڈرایئے جب ہر بات کا آخری فیصلہ ہو جائے گا، جبکہ یہ لوگ (اس وقت) غفلت میں ہیں، اور ایمان نہیں لا رہے۔ ﴿۳۹﴾ یقین جانو کہ زمین اور اُس پر سارے رہنے والوں کے وارث ہم ہی ہوں گے، اور ہماری طرف ہی ان سب کو لوٹایا جائے گا۔ ﴿۴۰﴾

خلاصۂ تفسیر

یہ ہیں عیسیٰ بن مریم (جن کے اقوال واحوال مذکور ہوئے جس سے ان کا بندۂ مقبول ہونا معلوم ہوتا ہے نہ جیسے کہ عیسائیوں نے ان کو بندوں کی فہرست سے خارج کر کے خدا تک پہنچا دیا ہے اور نہ ویسے جیسا کہ یہودیوں نے ان کو مقبولیت سے خارج کر کے طرح طرح کی تہمتیں لگائی ہیں) میں (بالکل) سچی بات کہہ رہا ہوں جس میں یہ (افراط وتفریط کرنے والے) لوگ جھگڑ رہے ہیں (چنانچہ یہود ونصاریٰ کے اقوال اوپر معلوم ہوئے اور چونکہ یہود کا قول ظاہراً بھی موجبِ تنقیصِ نبی تھا جو کہ بداہۃً باطل ہے اس لئے اس کے رد کی طرف اس مقام پر توجہ نہیں فرمائی بخلاف قولِ نصاریٰ کے

کہ ظاہراً مثبت زیادتِ کمال تھا کہ نبوّت کے ساتھ خدا کا بیٹا ہونا ثابت کرتے تھے اس لئے آگے اس کو رَد فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کی تنقیص بوجہ انکارِ توحید کے لازم آتی ہے حالانکہ) اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ (کسی کو) اولاد بنائے وہ (بالکل) پاک ہے (کیونکہ اس کی یہ شان ہے کہ) وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو اتنا فرمادیتا ہے کہ ہوجا سو وہ ہوجاتا ہے (اور ایسے کمال کے واسطے اولاد کا ہونا عقلاً نقص ہے) اور (آپ اِثباتِ توحید کے لئے لوگوں سے فرمادیجئے کہ مشرکین بھی سن لیں کہ) بیشک اللہ میرا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (خالص خدا کی عبادت کرنا یعنی توحید اختیار کرنا دین کا) سیدھا راستہ ہے سو (توحید پر باوجود ان عقلی اور نقلی دلائل قائم ہونے کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارہ میں) باہم اِختلاف ڈال دیا (یعنی توحید کا انکار کرکے طرح طرح کے مذاہب ایجاد کرلئے) سو ان کافروں کے لئے ایک بڑے (بھاری) دن کے آجانے سے بڑی خرابی (ہونے والی) ہے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے کہ یہ دن ایک ہزار سال دراز اور ہولناک ہونے کی وجہ سے بہت عظیم ہوگا) جس روز یہ لوگ (حساب وجزا کے لئے) ہمارے پاس آئیں گے (اس روز) کیسے کچھ شنوا اور بینا ہوجائیں گے۔ (کیونکہ قیامت میں یہ حقائق پیشِ نظر ہوجائیں گے اور تمامتر غلطیاں رفع ہوجائیں گی) لیکن یہ ظالم آج (دُنیا میں کیسی) صریح غلطی میں (مبتلا ہورہے) ہیں، اور آپ ان لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرایئے جبکہ (جنت دوزخ کا) اخیر فیصلہ کردیا جائے گا (جس کا ذکر حدیث میں ہے کہ جنت اور دوزخ والوں کو موت دکھلا کر اس کو ذبح کردیا جائے گا اور دونوں کو خلود (یعنی ہمیشہ ہمیشہ اسی حال میں زندہ رہنے کا حکم سنادیا جائے گا، رواہ الشیخان والترمذی۔ اور اس وقت کی حسرت کا بیحد ہونا ظاہر ہے) اور وہ لوگ (آج دُنیا میں) غفلت میں (پڑے) ہیں اور وہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لیکن آخر ایک دن مریں گے) اور تمام زمین اور زمین پر رہنے والوں کے وارث (یعنی آخر مالک) ہم ہی رہ جائیں گے اور یہ سب ہمارے ہی پاس لَوٹائے جائیں گے (پھر اپنے کفر وشرک کی سزا بھگتیں گے)۔

معارف ومسائل

ذٰلِكَ عِيسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہود ونصاریٰ کے بیہودہ خیالات میں افراط وتفریط کا یہ عالم تھا کہ نصاریٰ نے تو تعظیم میں اتنی زیادتی کی کہ اُن کو خدا تعالیٰ کا بیٹا بنادیا، اور یہود نے اُن کی توہین وتذلیل میں یہاں تک کہہ دیا کہ وہ یوسف نجار کی ناجائز اولاد ہیں۔ معاذ اللہ، حق تعالیٰ نے ان دونوں غلط کاروں کی غلطی بتلا کر اس کی صحیح حیثیت ان آیات میں واضح فرمادی۔ (قرطبی) [1]

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۱۰۵

قَوْلَ الْحَقِّ، بفتح لام اس کی واضح ترکیب نحوی یہ ہے کہ اَقُوْلُ قَوْلَ الْحَقِّ اس کی اصل ہے اور بعض قراءتوں میں قَوْلُ الْحَقِّ بضم لام بھی ہے تو اس صورت میں مراد یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام خود قول حق ہیں جیسا کہ ان کو کلمۃ اللہ کا لقب بھی دیا گیا ہے کیونکہ ان کی پیدائش بلا واسطہ سبب ظاہری کے صرف اللہ تعالیٰ کے قول سے ہوئی ہے۔ (قرطبی) [۱]

يَوْمَ الْحَسْرَةِ، اس روز کو یوم الحسرت اس لئے کہا گیا ہے کہ اہل جہنم کو تو یہ حسرت ہونا ظاہر ہے کہ اگر وہ مومن صالح ہوتے تو ان کو جنت ملتی اب جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ ایک خاص قسم کی حسرت اہل جنت کو بھی ہوگی جیسا کہ طبرانی اور ابویعلیٰ نے بروایت حضرت معاذ یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کو کسی چیز پر حسرت نہ ہوگی بجز ان لمحات وقت کے جو بغیر ذکر اللہ کے گزر گئے۔ [۲] اور بغویؒ بروایت ابوہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مرنے والے کو حسرت وندامت سے سابقہ پڑے گا۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یہ ندامت وحسرت کس بناء پر ہوگی تو آپ نے فرمایا کہ نیک اعمال کرنے والے کو اس پر حسرت ہوگی کہ اور زیادہ نیک اعمال کیوں نہ کر لئے کہ اور زیادہ درجاتِ جنت ملتے اور بدکار آدمی کو اس پر حسرت ہوگی کہ وہ اپنی بدکاری سے باز کیوں نہ آ گیا۔ (مظہری) [۳]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ

اور مذکور کر کتاب میں ابراہیم کا بیشک تھا وہ سچا نبی جب کہا اپنے باپ کو

يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ

اے باپ میرے کیوں پوجتا ہے اُس کو جو نہ سنے اور نہ دیکھے اور نہ کام آئے تیرے کچھ اے باپ میرے مجھ کو

قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

آئی ہے خبر ایک چیز کی جو تجھ کو نہیں آئی سو میری راہ چل دکھلادوں تجھ کو راہ سیدھی

---

[۱] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۱۰۵

[۲] المعجم الكبير للطبرانيؒ رقم الحديث:۱۶۶۰۸

[۳] جامع الترمذي، باب الزهد، باب ما جاء في ذهاب البصر ج:۲ ص:۶۶، و تفسير المظهري تحت هذه الآية ج:۶ ص:۹۷

يَآ أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۖ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يَآ أَبَتِ

اے باپ میرے مت پوج شیطان کو بیشک شیطان ہے رحمٰن کا نافرمان اے باپ میرے

إِنِّيٓ أَخَافُ أَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾

میں ڈرتا ہوں کہیں آلگے تجھ کو ایک آفت رحمٰن سے پھر تو ہوجائے شیطان کا ساتھی

قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓإِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ

وہ بولا کیا تو پھرا ہوا ہے میرے ٹھاکروں سے اے ابراہیم اگر تو باز نہ آئے گا تو تجھ کو سنگسار کروں گا

وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۖ

اور دُور ہوجا میرے پاس سے ایک مدت، کہا تیری سلامتی رہے میں گناہ بخشواؤں گا تیرا اپنے ربّ سے

إِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

بیشک وہ ہے مجھ پر مہربان اور چھوڑتا ہوں تم کو اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا

وَأَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى أَلَّآ أَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ

اور میں بندگی کروں گا اپنے ربّ کی، اُمید ہے کہ نہ رہوں گا اپنے ربّ کی بندگی کرکر محروم پھر جب جُدا ہوا اُن سے

وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۖ وَكُلًّا

اور جن کو وہ پوجتے تھے اللہ کے سوا بخشا ہم نے اُس کو اسحاق اور یعقوب اور دونوں کو

جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع ٣

نبی کیا اور دیا ہم نے اُن کو اپنی رحمت سے اور کیا اُن کے واسط سچا بول اُونچا

آسان ترجمۂ قرآن

اور اس کتاب میں ابراہیم کا بھی تذکرہ کرو۔ بیشک وہ سچائی کے خوگر نبی تھے۔ (۴۱) یاد کرو جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ: ''ابا جان! آپ ایسی چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، اور نہ آپ کا کوئی کام کر سکتی ہیں؟ (۴۲) ابا جان! میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، اس لئے میری بات مان لیجئے، میں آپ کو سیدھا راستہ بتلا دُوں گا۔ (۴۳) ابا جان! شیطان کی عبادت نہ کیجئے۔ یقین جانئے کہ شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے۔ (۴۴) ابا جان! مجھے اندیشہ ہے کہ خدائے رحمٰن کی طرف سے آپ کو کوئی عذاب نہ آ پکڑے، جس کے نتیجے میں آپ شیطان کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔'' (۴۵) ان کے باپ نے کہا: ''ابراہیم! کیا تم میرے خداؤں سے بیزار ہو؟ یاد رکھو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تم پر پتھر برساؤں گا، اور اب تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے دُور ہو جاؤ۔'' (۴۶) ابراہیم نے کہا: ''میں آپ کو (رُخصت کا) سلام کرتا ہوں۔ میں اپنے پروردگار سے آپ کی بخشش کی دُعا کروں گا۔ بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ (۴۷) اور میں آپ لوگوں سے بھی الگ ہوتا ہوں، اور اللہ کو چھوڑ کر آپ لوگ جن جن کی عبادت کرتے ہیں، اُن سے بھی، اور میں اپنے پروردگار کو پکارتا رہوں گا۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ اپنے ربّ کو پکار کر میں نامراد نہیں رہوں گا۔'' (۴۸) چنانچہ جب وہ اُن سے اور ان (بتوں) سے الگ ہو گئے جنہیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، تو ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب (جیسی اولاد) بخشی، اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا۔ (۴۹) اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا، اور انہیں اُونچے درجے کی نیک نامی عطا کی۔ (۵۰)

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) میں (لوگوں کے سامنے حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کا (قصہ) ذکر کیجئے (تاکہ ان کو توحید و رسالت کا مسئلہ زیادہ منکشف ہو جائے) وہ (ہر قول فعل میں) بڑے راستی والے (تھے اور) پیغمبر تھے (اور وہ قصہ جس کا ذکر کرنا اس جگہ مقصود ہے اُس وقت ہوا تھا) جب کہ اُنہوں نے اپنے باپ سے (جو کہ مشرک تھا) کہا کہ اے میرے باپ تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سنے اور نہ کچھ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے (مراد بت ہیں حالانکہ اگر کوئی دیکھتا سنتا کچھ کام آتا بھی ہو مگر واجب الوجود نہ ہو تب بھی لائقِ عبادت نہیں چہ جائیکہ ان اوصاف سے بھی عاری ہو تو وہ بدرجۂ اولیٰ لائق عبادت نہ ہوگا) اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا (مراد اس سے وحی ہے جس میں احتمال غلطی کا ہو ہی نہیں سکتا پس میں جو کچھ کہہ رہا ہوں قطعاً

حق ہے جب یہ بات ہے) تو تم میرے کہنے پر چلو میں تم کو سیدھا رستہ بتلاؤں گا (اور وہ توحید ہے) اے میرے باپ تم شیطان کی پرستش مت کرو (یعنی شیطان کو اور اس کی عبادت کو تو تم بھی بُرا سمجھتے ہو اور بت پرستی میں شیطان پرستی بالیقین لازم ہے کہ وہی یہ حرکت کراتا ہے۔ اور کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ حق تعالیٰ کے مقابلے میں بھی اس کی تعلیم کو حق سمجھے یہی عبادت ہے پس بت پرستی میں شیطان پرستی ہوئی اور) بیشک شیطان (حضرت) رحمٰن کا نافرمانی کرنے والا ہے (تو وہ کب اطاعت کے لائق ہوگا) اے میرے باپ، میں اندیشہ کرتا ہوں (اور وہ اندیشہ یقینی ہے) کہ تم پر رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے (خواہ دُنیا میں یا آخرت میں) پھر تم (عذاب میں) شیطان کے ساتھ ہو جاؤ (یعنی جب اطاعت میں اس کا ساتھ دو گے تو نفس عقوبت میں بھی اس کا ساتھ ہوگا گو شیطان کو دُنیا میں عذاب نہ ہوا ہو اور اس شیطان کی معیت اور مشارکت فی العقوبت کو کوئی اپنی بھلائی چاہنے والا پسند نہ کرے گا۔

(ابراہیم علیہ السلام کی یہ تمام تر نصائح سن کر) باپ نے جواب دیا کہ کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو اے ابراہیم (اور اس لئے مجھ کو بھی منع کرتے ہو یاد رکھو) اگر تم (ان بتوں کی مذمّت سے اور مجھ کو ان کی عبادت سے منع کرنے سے) باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو مار پتھروں کے سنگسار کردوں گا (پس تم اس سے باز آجاؤ) اور ہمیش ہمیش کے لئے مجھ (کو کہنے سننے) سے برکنار رہو، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا (بہتر) میرا سلام لو (اب تم سے کہنا سننا بے سود ہے) اب میں تمہارے لئے اپنے رَبّ سے مغفرت کی (اس طرح) درخواست کروں گا (کہ تم کو ہدایت کرے جس پر مغفرت مرتب ہوتی ہے) بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے (اس لئے اسی سے عرض کروں گا جس کا قبول فرمانا یا نہ فرمانا دونوں مختلف اعتبار سے رحمت اور مہربانی ہے) اور (تم اور تمہارے ہم مذہب جب میری حق بات کو بھی نہیں مانتے تو تم میں رہنا بھی فضول ہے اس لئے) میں تم لوگوں سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کر رہے ہو اُن سے (بدناً بھی) کنارہ کرتا ہوں (جیسا قلباً پہلے ہی سے برکنار ہوں، یعنی یہاں رہتا بھی نہیں) اور (اطمینان سے علیحدہ ہو کر) اپنے رَبّ کی عبادت کروں گا (کیونکہ یہاں رہ کر اس میں بھی مزاحمت ہوگی) اُمید (یعنی یقین) ہے کہ اپنے رَبّ کی عبادت کر کے محروم نہ رہوں گا (جیسا بت پرست اپنے باطل معبودوں کی عبادت کر کے محروم رہتے ہیں، غرض اس گفتگو کے بعد اُن سے اس طرح علیحدہ ہوئے کہ ملک شام کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے) پس جب ان لوگوں سے اور جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے اُن سے (اس طرح) علیحدہ ہو گئے (تو) ہم نے اُن کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا فرمایا (جو کہ رفاقت کے لئے اُن کی بت پرست برادری سے بدرجہا بہتر تھے) اور ہم نے (ان دونوں میں) ہر ایک کو نبی بنایا اور ان سب کو ہم نے (طرح طرح کے کمالات دے کر) اپنی رحمت کا حصہ دیا اور (آئندہ نسلوں میں) ہم نے ان کا نام نیک اور بلند کیا (کہ سب تعظیم اور ثناء کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور اسحاق کے قبل اسماعیل ان ہی صفات کے ساتھ عطا ہو چکے تھے)۔

معارف و مسائل

صِدّیق کی تعریف

صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ لفظ صِدّیق بکسرِ صاد قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کے معنے اور تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ جس شخص نے عمر میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ صدیق ہے بعض نے فرمایا کہ جو شخص اعتقاد اور قول و عمل ہر چیز میں صادق ہو یعنی جو دل میں اعتقاد ہو ٹھیک وہی زبان پر ہو اور اس کا ہر فعل اور ہر حرکت و سکون اسی اعتقاد اور قول کے تابع ہو۔ روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں اسی آخری معنے کو اختیار کیا ہے [۱] اور پھر صِدّیقیت کے درجات متفاوت ہیں۔ اصل صدیق تو نبی و رسول ہی ہوسکتا ہے اور ہر نبی و رسول کے لئے صِدّیق ہونا وصفِ لازم ہے مگر اس کا عکس نہیں کہ جو صِدّیق ہو اس کا نبی ہونا ضروری ہو بلکہ غیر نبی بھی جو اپنے نبی و رسول کے اتباع میں صدق کا یہ مقام حاصل کرلے وہ بھی صِدّیق کہلائے گا۔ حضرت مریم کو خود قرآنِ کریم نے وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ [۲] (المائدۃ:۷۵) کا خطاب دیا ہے حالانکہ جمہورِ اُمت کے نزدیک وہ نبی نہیں، اور کوئی عورت نبی نہیں ہوسکتی۔

اپنے بڑوں کو نصیحت کرنے کا طریقہ اور اُس کے آداب

يٰۤاَبَتِ، عربی لغت کے اعتبار سے ہی لفظ باپ کی تعظیم و محبت کا خطاب ہے۔ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ نے جو مقام جامعیتِ اوصاف و کمالات کا عطا فرمایا تھا، اُن کی یہ تقریر جو اپنے والد کے سامنے ہو رہی ہے اعتدالِ مزاج اور رعایتِ اضداد کی ایک بے نظیر تقریر ہے کہ ایک طرف باپ کو شرک و کفر اور کھلی گمراہی میں نہ صرف مبتلا بلکہ اس کا داعی دیکھ رہے ہیں جس کے مٹانے ہی کے لئے خلیل اللہ پیدا کئے گئے ہیں، دوسری طرف باپ کا ادب اور عظمت و محبت ہے اِن دونوں ضدوں کو حضرت خلیل اللہ نے کس طرح جمع فرمایا۔ اوّل تو يٰۤاَبَتِ کا لفظ جو باپ کی مہربانی اور محبت کا داعی ہے ہر جملہ کے شروع میں اس لفظ سے خطاب کیا۔ پھر کسی جملہ میں باپ کی طرف کوئی لفظ ایسا منسوب نہیں جس سے اس کی توہین یا دل آزاری ہو کہ اُس کو گمراہ یا کافر کہتے بلکہ حکمتِ پیغمبرانہ کے ساتھ صرف اُن کے بتوں کی بے بسی اور بے حسی کا اظہار فرمایا کہ ان کو خود اپنی غلط رَوِش کی طرف توجہ ہو جائے۔ دوسرے جملہ میں اپنی اس نعمت کا اظہار فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو علومِ نبوّت کی عطا فرمائی تھی۔ تیسرے اور چوتھے جملے میں اُس انجامِ بد سے ڈرایا جو اس شرک و کفر کے نتیجہ میں آنے والا تھا۔ اس پر بھی باپ نے بجائے کسی غور و فکر یا یہ کہ اُن کی فرزندانہ گزارش پر کچھ نرمی کا پہلو اختیار کرتے پورے تشدد کے

[۱] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۹۷، ۹۸ [۲] ترجمہ:- اور اُن کی والدہ ایک ولی بی بی ہیں۔

ساتھ خطاب کیا، اُنھوں نے تو خطاب يَآاَبَتِ کے پیارے لفظ سے کیا تھا جس کا جواب عرف میں یَا بُنَیَّ کے لفظ سے ہونا چاہئے تھا مگر آزر نے ان کا نام لے کر يٰٓاِبْرٰهِيْمُ سے خطاب کیا اور اُن کو سنگسار کر کے قتل کرنے کی دھمکی اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیدیا۔ اس کا جواب حضرت خلیل اللہ کی طرف سے کیا ملتا ہے وہ سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا:

سَلٰمٌ عَلَيْكَ یہاں لفظ سلام دو معنے کے لئے ہوسکتا ہے اوّل یہ کہ یہ سلام مقاطعہ ہو یعنی کسی سے قطع تعلق کرنے کا شریفانہ اور مہذّب طریقہ یہ ہے کہ بات کا جواب دینے کے بجائے لفظ سلام کہہ کر علیحدہ ہوجائے جیسا کہ قرآن کریم نے اپنے مقبول و صالح بندوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ (الفرقان) یعنی جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ خطاب کرتے ہیں تو یہ اُن سے دوبدو ہونے کے بجائے لفظ سلام کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ باوجود مخالفت کے میں تمہیں کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہاں سلام عرفی سلام ہی کے معنے میں ہو۔ اس میں فقہی اِشکال یہ ہے کہ کسی کافر کو اِبتداءً سلام کرنا حدیث میں ممنوع ہے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَبْدَءُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى بِالسَّلَامِ [۱] (یعنی یہود و نصاریٰ کو اِبتداءً سلام نہ کرو) مگر اس کے بالمقابل بعض روایاتِ حدیث میں ایک ایسے مجمع کو ابتدائی سلام کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس میں کفار و مشرکین اور مسلمان سب جمع تھے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت اُسامہؓ کی روایت سے ثابت ہے۔ [۲]

اسی لئے فقہائے اُمت کا اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہوا۔ بعض صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے قول و عمل سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے بعض سے عدم جواز، جس کی تفصیل قرطبی نے احکام القرآن میں اسی آیت کے تحت بیان کی ہے۔ اور امام نخعی نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر تمہیں کسی کافر یہودی نصرانی سے ملنے کی کوئی دینی یا دُنیوی ضرورت پیش آجائے تو اس کو ابتدائی سلام کرنے میں مضائقہ نہیں اور بے ضرورت سلام کی ابتداء کرنے سے بچنا چاہئے۔ اس میں مذکورہ دونوں حدیثوں کی تطبیق ہوجاتی ہے۔ واللہ اعلم (قرطبی) [۳]

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ یہاں بھی یہ اشکال ہے کہ کسی کافر کے لئے اِستغفار کرنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا تھا کہ وَاللهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَا لَمْ اُنْهَ عَنْهُ (یعنی بخدا میں آپ کے لئے اس وقت تک ضرور اِستغفار یعنی دعائے مغفرت کرتا رہوں گا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے منع نہ

---

۱ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النهی عن ابتداء اهل الکتاب بالسلام إلخ ج:۲ ص:۲۱۳

۲ صحیح البخاری، کتاب الإستئذان، باب التسلیم فی مجلس فیه اخلاط من المسلمین والمشرکین ج:۲ ص:۹۲۴، وصحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب لقی النبی صلی الله علیه وسلم إلخ ج:۲ ص:۱۰۹

۳ تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۱ ص:۱۱۲

فرما دیا جائے)۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (التوبۃ: ۱۱۳) (یعنی نبی اور ایمان والوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں)[۱] اس آیت کے نازل ہونے پر آپ نے چچا کے لئے استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

جواب اشکال کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ سے وعدہ کرنا کہ آپ کے لئے استغفار کروں گا یہ ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے اس کے بعد ممانعت کردی گئی سورۂ ممتحنہ میں حق تعالیٰ نے خود اس واقعہ کو بطور استثناء ذکر فرما کر اس کی اطلاع دیدی ہے اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ (الممتحنۃ: ۴)[۲] اور اُس سے زیادہ واضح سورۂ توبہ میں آیتِ مذکورہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا (التوبۃ: ۱۱۳) کے بعد دوسری آیت میں فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ (التوبۃ: ۱۱۴)[۳] جس سے معلوم ہوا کہ یہ استغفار اور اس کا وعدہ باپ کے کفر پر جمے رہنے اور خدا کا دشمن ثابت ہونے سے پہلے کا تھا جب یہ حقیقت واضح ہوگئی تو انہوں نے بھی براءت کا اعلان کردیا۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ایک طرف تو حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باپ کے ادب و محبت کی رعایت میں یہ انتہاء کردی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے دوسری طرف یہ بھی نہیں ہونے دیا کہ حق کے اظہار اور اُس پر مضبوطی کو کوئی ادنیٰ سی ٹھیس لگے، باپ نے جو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اس کو اس جملہ میں بخوشی منظور کرلیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ میں تمہارے بتوں سے بیزار ہوں صرف اپنے رَبّ کو پکارتا ہوں۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اس جملے سے پہلے جملے میں ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول آیا ہے کہ میں اُمید کرتا ہوں کہ میں اپنے پروردگار سے دعا کرنے میں ناکام و نامراد نہیں ہوں گا۔ ظاہر یہ ہے کہ گھر اور خاندان سے جدائی کے بعد تنہائی کی وحشت وغیرہ کے اثرات سے بچنے کی دُعا مراد تھی مذکورہ جملہ میں اس دُعاء کی قبولیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے گھر، خاندان اور اُن کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مکافات اس طرح فرمائی کہ ان کو صاحبزادہ اسحاق علیہ السلام عطا فرمایا اور ساتھ ہی اس کا عمرِ دراز پانا

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت لا إله إلّا الله ج:۱ ص:۱۸۱، وصحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب الدليل على صحة إسلام من حضره الموت إلخ ج:۱ ص:۴۰

[۲] ترجمہ: لیکن ابراہیم کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی کہ میں تمہارے لئے استغفار ضرور کروں گا۔

[۳] سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۱۳ و آیت نمبر ۱۱۴ کا ترجمہ یہ ہے: پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں اس امر کے ظاہر ہوجانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا وہ صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے وعدہ کرلیا تھا پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہوگئے، واقعی ابراہیم بڑے رحیم المزاج حلیم الطبع تھے۔

اور صاحبِ اولاد ہونا بھی لفظ یعقوب بڑھا کر ذکر فرما دیا اور صاحبزادہ کا عطا ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا تھا، تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ باپ کے خاندان سے بہتر ایک مستقل خاندان دے دیا جو انبیاء صلحاء پر مشتمل تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

اور مذکور کر کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ تھا چُنا ہوا اور تھا رسول نبی

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ

اور پکارا ہم نے اس کو داہنی طرف سے طور پہاڑ کی اور نزدیک بلایا اس کو بھید کہنے کو اور بخشا ہم نے اس کو

مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ

اپنی مہربانی سے بھائی اُس کا ہارون نبی اور مذکور کر کتاب میں اسماعیل کا

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ ج وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ

وہ تھا وعدہ کا سچا اور تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ص وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ

نماز کا اور زکوٰۃ کا اور تھا اپنے رَبّ کے یہاں پسندیدہ اور مذکور کر کتاب میں

اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ قلا وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

ادریس کا وہ تھا سچا نبی اور اُٹھالیا ہم نے اس کو ایک اونچے مکان پر

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ق

یہ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا، اللہ نے پیغمبروں میں آدم کی اولاد میں

وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ز وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ز وَمِمَّنْ

اور ان میں جن کو سوار کرلیا ہم نے نوح کے ساتھ اور ابراہیم کی اولاد میں اور اسرائیل کی اور اُن میں جن کو

هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ط اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝۵۸ السجدة

السجدة ۵

ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا، جب اُن کو سنائے آیتیں رحمٰن کی گرتے ہیں سجدہ میں اور روتے ہوئے

آسان ترجمۂ قرآن

اور اس کتاب میں موسیٰ کا بھی تذکرہ کرو۔ بیشک وہ اللہ کے چُنے ہوئے بندے تھے، اور رسول اور نبی تھے۔ ۝۵۱ ہم نے اُنہیں کوہِ طور کی دائیں جانب سے پکارا، اور اُنہیں اپنا رازدار بنا کر اپنا قرب عطا کیا۔ ۝۵۲ اور ہم نے ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اپنی رحمت سے انہیں (ایک مددگار) عطا کیا۔ ۝۵۳ اور اس کتاب میں اسمٰعیل کا بھی تذکرہ کرو۔ بیشک وہ وعدے کے سچے تھے، اور رسول اور نبی تھے۔ ۝۵۴ اور وہ اپنے گھر والوں کو بھی نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے، اور اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ ۝۵۵ اور اس کتاب میں اِدریس کا بھی تذکرہ کرو۔ بیشک وہ سچائی کے خوگر نبی تھے۔ ۝۵۶ اور ہم نے انہیں رفعت دے کر ایک بلند مقام تک پہنچا دیا تھا۔ ۝۵۷ آدم کی اولاد میں سے یہ وہ نبی ہیں جن پر اللہ نے اِنعام فرمایا، اور ان میں سے کچھ ان لوگوں کی اولاد میں سے ہیں جن کو ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، اور کچھ ابراہیم اور اِسرائیل (یعقوب علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں۔ اور یہ سب ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، اور (اپنے دِین کے لئے) منتخب کیا۔ جب ان کے سامنے خدائے رحمٰن کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی تو یہ روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔ ۝۵۸

خلاصۂ تفسیر

اور اس کتاب (یعنی قرآن) میں موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے (یعنی لوگوں کو سنایئے ورنہ کتاب میں ذکر کرنے والا تو فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہے) وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے خاص کئے ہوئے (بندے) تھے اور وہ رسول بھی تھے، نبی بھی تھے اور ہم نے اُن کو کوہِ طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور ہم نے اُن کو راز کی باتیں کرنے کے لئے مقرب بنایا اور ہم نے اُن کو اپنی رحمت (اور عنایت) سے اُن کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا کیا (یعنی اُن کی درخواست کے موافق اُن کو نبی

کیا کہ اُن کی مدد کریں) اور اس کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بلاشبہ وہ وعدے کے (بڑے) سچے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے اور اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا (خصوصاً اور بھی احکام کا عموماً) حکم کرتے رہتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بیشک وہ بڑی راستی والے نبی تھے اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند رُتبہ تک پہنچا دیا یہ (حضرات جن کا شروع سورت سے یہاں تک ذکر ہوا زکریا علیہ السلام سے ادریس علیہ السلام تک یہ) وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے (خاص) انعام فرمایا ہے (چنانچہ نبوّت سے بڑھ کر کونسی نعمت ہوگی) منجملہ (دیگر) انبیاء (علیہم السلام) کے (یہ وصف سب مذکورین میں مشترک ہے اور یہ سب) آدم (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے) اور (بعضے ان میں) ان لوگوں کی نسل سے (تھے) جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (چنانچہ بجز ادریس علیہ السلام کے کہ وہ اجداد نوح علیہ السلام سے ہیں باقی سب میں یہ وصف ہے) اور (بعضے ان میں) ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے چنانچہ حضرت زکریا و یحییٰ و عیسیٰ وموسیٰ علیہ السلام دونوں کی اولاد میں تھے اور اسحاق و اسماعیل و یعقوب علیہ السلام صرف حضرت ابراہیم کی اولاد میں تھے) اور (یہ سب حضرات) اُن لوگوں میں سے (تھے) جن کو ہم نے ہدایت فرمائی اور ان کو مقبول بنایا (اور باوجود اس مقبولیت واختصاص کے ان سب حضرات موصوفین کی عبدیت کی یہ کیفیت تھی کہ) جب ان کے سامنے (حضرت) رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو (غایت افتقار وانکسار وانقیاد کے اظہار کے لئے) سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔

معارف و مسائل

كَانَ مُخْلَصًا، مخلَص بفتح لام وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خالص کر لیا ہو یعنی جس کو غیر اللہ کی طرف التفات نہ ہو، اُس نے اپنے نفس اور تمام خواہشات کو اللہ کی مرضی کے لئے مخصوص کر دیا ہو۔ یہ شان خصوصی طور پر انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّآ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ (ص) یعنی ہم نے ان کو مخصوص کر دیا ہے ایک خاص کام یعنی دارِ آخرت کی یاد کے لئے۔ اُمت میں جو حضرات کاملین انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر ہوں اُن کو بھی اس مقام کا ایک درجہ ملتا ہے اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ قدرتی طور پر گناہوں اور بُرائیوں سے بچا دیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ، یہ مشہور پہاڑ ملک شام میں مصر اور مَدۡیَن کے درمیان واقع ہے آج بھی اسی نام سے مشہور ہے حق تعالیٰ نے اس کو بھی بہت سی چیزوں میں ایک خصوصیت وامتیاز دیا ہے۔

الْاَيْمَنِ، طور کی یہ داہنی جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے کیونکہ وہ مَدْيَنَ سے چلے تھے جب طور کے بالمقابل پہنچے تو طور ان کی داہنی جانب تھا۔ نَجِيًّا ۝۵۲ سرگوشی اور خصوصی کلام کو مناجات اور جس شخص سے ایسا کلام کیا جائے اُس کو نجی کہا جاتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ، ہبہ کے لفظی معنے عطیّہ کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ ان کی امداد کے لئے حضرت ہارون کو بھی نبی بنا دیا جائے یہ دُعا قبول کی گئی اسی کو لفظ وَهَبْنَا سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ہم نے عطیہ دیدیا موسیٰ علیہ السلام کو ہارون کا۔ اسی لئے حضرت ہارون کو ہبۃ اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ (مظہری) [1]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام ہیں مگر اُن کا ذکر اُن کے والد اور بھائی ابراہیم و اسحاق کے ذکر کے ساتھ نہیں فرمایا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر درمیان میں آنے کے بعد ان کا ذکر فرمایا۔ شاید اس سے مقصود ان کے ذکر کا خاص اہتمام ہو کہ ضمنی لانے کے بجائے مستقلاً ذکر کیا گیا اور یہاں جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں ان کے زمانۂ بعثت کی ترتیب نہیں رکھی گئی کیونکہ ادریس علیہ السلام جن کا ذکر ان سب کے بعد آرہا ہے وہ زمانے کے لحاظ سے ان سب سے مقدم ہیں۔

كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ، ایفاء وعدہ ایک ایسا خلقِ حسن ہے کہ ہر شریف آدمی اس کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خلاف کرنے کو ایک رذیل حرکت قرار دیا جاتا ہے حدیث میں وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت بتلایا ہے، اسی لئے اللہ کا کوئی نبی و رسول ایسا نہیں جو صادق الوعد نہ ہو مگر اس سلسلہ کلام میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے ساتھ کوئی خاص وصف بھی ذکر کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ وصف دوسروں میں نہیں بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان میں یہ خاص صفت ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے جیسے ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ان کا مُخْلَصْ ہونا ذکر فرمایا ہے حالانکہ یہ صفت بھی تمام انبیاء علیہم السلام میں عام ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا اس لئے اُن کے ذکر میں اس کا ذکر فرمایا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا صدقِ وعد میں امتیاز اس بناء پر ہے کہ اُنہوں نے جس چیز کا وعدہ اللہ سے یا کسی بندے سے کیا اس کو بڑی مضبوطی اور اہتمام سے پورا کیا، اُنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو ذبح کرنے کے لئے پیش کر دیں گے اور اُس پر صبر کریں گے اس میں پورے اُترے۔ ایک شخص سے ایک جگہ ملنے کا وعدہ کیا وہ وقت پر نہ آیا تو اُس کے انتظار میں تین دن اور بعض روایات میں ایک سال اُس کا انتظار کرتے رہے (مظہری) [2] اور

---

[1] تفسیر المظهری ج:۶ ص:۱۰۱

[2] تفسیر المظهری ج:۶ ص:۱۰۲

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ترمذی میں بروایت عبداللہ بن ابی الحمساء ایسا ہی واقعہ وعدہ کر کے تین دن تک اُسی جگہ انتظار کرنے کا منقول ہے۔ (قرطبی) [۱]

ایفائے وعدہ کی اہمیت اور اُس کا درجہ

ایفائے وعدہ انبیاء وصلحاء کا وصفِ خاص اور تمام شریف انسانوں کی عادت ہے اس کے خلاف کرنا فساق فجار رذیل لوگوں کی خصلت ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَلۡعِدَۃُ دَیۡنٌ [۲] وعدہ ایک قرض ہے یعنی جس طرح قرض کی ادائیگی انسان پر لازم ہے اسی طرح وعدہ پورا کرنے کا اہتمام بھی لازم ہے۔ دوسری ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں وَاْیُ الۡمُؤۡمِنِ وَاجِبٌ یعنی وعدہ مؤمن کا واجب ہے۔ [۳]

حضرات فقہاء نے باتفاق یہ فرمایا ہے کہ وعدہ کا قرض ہونا اور ایفاء وعدہ کا واجب ہونا اس معنی میں ہے کہ بلا عذر شرعی اس کو پورا نہ کرنا گناہ ہے لیکن وہ ایسا قرض نہیں جس کی چارہ جوئی عدالت سے کی جاسکے اور زبردستی وصول کیا جاسکے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ دیانۃً واجب ہے قضاءً واجب نہیں۔ (قرطبی وغیرہ) [۴]

مصلح کا فرض ہے کہ اصلاح کا کام اپنے اہل وعیال سے شروع کرے

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خصوصی اوصاف میں ایک یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو ہر مؤمن مسلمان کے ذمہ واجب ہے کہ اپنے اہل وعیال کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا رہے۔ قرآنِ حکیم میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا (التحریم:۶) یعنی بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے، پھر اس میں حضرت اسماعیل کی خصوصیت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ حکم اگرچہ عام ہے اور سبھی مسلمان اس کے مکلّف ہیں لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کے اہتمام و انتظام میں امتیازی کوشش فرماتے تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خصوصی ہدایت ملی تھی کہ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴿۲۱۴﴾ (الشعراء:۲۱۴) یعنی اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے، آپ نے اس کی تعمیل میں اپنے خاندان کو جمع کر کے خصوصی خطاب فرمایا۔ [۵]

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۱۱۵، وسنن ابی داوٗد، کتاب الأدب، باب فی العدۃ ج:۲ ص:۳۳۴

[۲] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث:۳۶۴۷

[۳] کنز العمال رقم الحدیث:۶۸۷۲

[۴] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا۔

[۵] صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۶۶۵۹، ودلائل النبوۃ للبیہقیؒ رقم الحدیث:۴۸۶

دوسری بات یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب پوری قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ سبھی کو پیغامِ حق پہنچاتے اور امرِ الٰہی کا پابند کرتے ہیں، اہل وعیال کی خصوصیت میں کیا حکمت ہے؟ بات یہ ہے کہ دعوتِ پیغمبرانہ کے خاص اُصول ہیں اُن میں یہ اہم بات ہے کہ جو ہدایت عام خلق اللہ کو دی جائے اُس کو پہلے اپنے گھر سے شروع کرے۔ اپنے گھر والوں کو اس کا ماننا اور منوانا نسبۃً آسان بھی ہوتا ہے اُس کی نگرانی بھی ہر وقت کی جاسکتی ہے اور وہ جب کسی خاص رنگ کو اختیار کرلیں اور اُس میں پختہ ہوجائیں تو اس سے ایک دینی ماحول پیدا ہوکر دعوت کو عام کرنے اور دوسروں کی اصلاح کرنے میں بڑی قوت پیدا ہوجائے گی۔ اصلاحِ خلق کے لئے سب سے زیادہ مؤثر چیز ایک صحیح دینی ماحول کا وجود میں لانا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہر بھلائی یا بُرائی تعلیم وتعلّم اور افہام وتفہیم سے زیادہ ماحول کے ذریعہ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِدۡرِيۡسَ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں (روح المعانی بحوالہ مستدرک حاکم) [۱] اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی ورسول ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے نازل فرمائے (کما فی حدیث ابی ذر زمخشری)۔ [۲] اور ادریس علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو علمِ نجوم اور حساب بطور معجزہ عطا کیا گیا (بحرمحیط)۔ [۳] اور سب سے پہلے انسان ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنا اور کپڑا سینا ایجاد کیا۔ ان سے پہلے لوگ عموماً جانوروں کی کھال بجائے لباس استعمال کرتے تھے اور سب سے پہلے ناپ تول کے طریقے بھی آپ نے ہی ایجاد فرمائے اور اسلحہ کی ایجاد بھی آپ سے شروع ہوئی۔ آپ نے اسلحہ تیار کرکے بنو قابیل سے جہاد کیا۔ (بحرمحیط، قرطبی، مظہری، روح) [۴]

وَرَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ یعنی ہم نے ادریس علیہ السلام کو مقامِ بلند پر اُٹھالیا۔ معنے یہ ہیں کہ اُن کو نبوّت ورسالت اور قربِ الٰہی کا خاص مقام عطا فرمایا گیا۔ اور بعض روایات میں جو ان کا آسمان پر اُٹھانا منقول ہے اُن کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا:

هٰذَا مِنۡ اَخۡبَارِ كَعۡبِ الۡاَحۡبَارِ الۡاِسۡرَائِيۡلِيَّاتِ وَفِيۡ بَعۡضِهٖ نَكَارَةٌ۔

یہ کعب احبار کی اسرائیلی روایات میں سے ہے اور اُن میں سے بعض میں نکارت واجنبیت ہے۔

---

[۱] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۶ ص:۱۰۵، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:۳۹۷۲

[۲] تفسير كشاف تحت هذه الآية ج:۴ ص:۹۶

[۳] تفسير البحر المحيط تحت هذه الآية ج:۸ ص:۳۲

[۴] روح المعانی ج:۱۶ ص:۱۰۵، وتفسير القرطبی ج:۱۱ ص:۱۱۷

اور قرآن کریم کے الفاظِ مذکورہ بہر حال اس معاملہ میں صریح نہیں کہ یہاں رفعتِ درجہ مراد ہے یا زندہ آسمان میں اُٹھانا مراد ہے اس لئے ان کا رفع الی السماء قطعی نہیں اور تفسیرِ قرآن اُس پر موقوف نہیں۔ (بیان القرآن) [1]

فائدہ از بیان القرآن رسول اور نبی کی تعریف میں فرق اور باہمی نسبت

رسول اور نبی کی تعریف میں متعدد اقوال ہیں، آیاتِ مختلفہ میں غور کرنے سے جو بات احقر کے نزدیک محقق ہوئی وہ یہ ہے کہ اِن دونوں کے مفہوم میں نسبت عموم وخصوص من وجہٍ کی ہے۔ رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعتِ جدیدہ پہنچائے خواہ وہ شریعت خود اس رسول کے اعتبار سے بھی جدید ہو جیسے تورات وغیرہ یا صرف اُن کی اُمت کے اعتبار سے جدید ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدیم شریعت ہی تھی لیکن قوم جُرہم جن کی طرف اُن کو مبعوث فرمایا تھا اُن کو اس شریعت کا علم پہلے سے نہ تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے ذریعہ ہوا۔ اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لئے نبی ہونا ضروری نہیں جیسے فرشتے کہ وہ رسول تو ہیں مگر نبی نہیں ہیں یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد جن کو آیتِ قرآن اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ (یٰسٓ) میں رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ انبیاء نہیں تھے۔

اور نبی وہ ہے جو صاحبِ وحی ہو خواہ شریعتِ جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعتِ قدیمہ کی جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل شریعتِ موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے لفظ رسول نبی سے عام ہے اور دوسرے اعتبار سے لفظ نبی بہ نسبت رسول کے عام ہے جس جگہ یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال کئے گئے جیسا کہ آیات مذکورہ میں رَسُوْلًا نَّبِيًّا آیا ہے وہاں تو کوئی اشکال نہیں کہ خاص اور عام دونوں جمع ہو سکتے ہیں کوئی تضاد نہیں لیکن جس جگہ یہ دو لفظ باہم متقابل آئے ہیں جیسے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ (الحج:۵۲) میں تو اس جگہ بقرینۂ مقام لفظ نبی کو خاص اُس شخص کے معنی میں لیا جائے گا جو شریعتِ سابقہ کی تبلیغ کرتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ اس سے مراد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہیں وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اس سے مراد صرف ابراہیم علیہ السلام ہیں وَمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اس سے مراد اسماعیل واسحاق ویعقوب علیہم السلام ہیں وَاِسْرَآءِيْلَ اس سے مراد حضرت موسیٰ وہارون وحضرت زکریا ویحییٰ وعیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ سابقہ آیات میں چند اکابر انبیاء علیہم السلام کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے جس میں اُن کی عظمتِ شان کو بیان کیا گیا ہے، چونکہ انبیاء کی عظمت میں عوام سے غلو کرنے کا خطرہ تھا جیسے یہود نے حضرت عُزیر کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہی بنا دیا اس لئے اس مجموعہ کے بعد ان سب کا

[1] تفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۱۱

اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ گزار اور خوف وخشیت سے بھر پور ہونا اس آیت میں ذکر فرمادیا گیا تاکہ افراط وتفریط کے درمیان رہیں۔ (بیان القرآن)[1]

تلاوتِ قرآن کے وقت بُکاء یعنی آب دیدہ ہونا سنتِ انبیاء ہے

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ قرآن کی تلاوت کے وقت بُکاء (رونے) کی کیفیت پیدا ہونا محمود اور انبیاء علیہم السلام کا وصف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ وتابعین اور اولیاء اللہ سے بکثرت اس کے واقعات منقول ہیں۔

قرطبی نے فرمایا کہ علماء نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ قرآنِ کریم میں جو آیتِ سجدہ تلاوت کی جائے اُس کے سجدے میں اُس کے مناسب دُعا کی جائے، مثلاً سورۂ سجدہ میں یہ دُعا کریں[2] اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ السَّاجِدِيْنَ لِوَجْهِكَ الْمُسَبِّحِيْنَ بِحَمْدِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ عَنْ اَمْرِكَ اور سُبْحٰنَ الَّذِیْ کے سجدہ میں یہ دُعا کریں[3] اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ الْبَاكِيْنَ اِلَيْكَ الْخَاشِعِيْنَ لَكَ اور آیت مذکورہ خَرُّوْا سُجَّدًا کے سجدہ میں یہ دُعا کریں[4] اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنْ عِبَادِكَ الْمُنْعَمِ عَلَيْهِمُ الْمَهْدِيِّيْنَ السَّاجِدِيْنَ لَكَ الْبَاكِيْنَ عِنْدَ تِلَاوَةِ اٰيَاتِكَ۔ (قرطبی)[5]

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ

پھر اُن کی جگہ آئے ناخلف کھو بیٹھے نماز اور پیچھے پڑگئے مزوں کے

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

سو آگے دیکھ لیں گے گمراہی کو مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کی نیکی

فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدَ

سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں اور اُن کا حق ضائع نہ ہوگا کچھ، باغوں میں بسنے کے جن کا وعدہ کیا ہے

---

[1] تفسیر بیان القرآن تحت ھذہ الآیۃ ج:۷ ص:۱۱

[2] ترجمہ:- اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے کردیجئے جو تیری ذات کے سامنے سجدہ کرتے ہیں حمد کے ساتھ تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں ہوجاؤں ان لوگوں میں سے جو تیرے حکم سے تکبر کرتے ہیں۔

[3] ترجمہ:- اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے کردیجئے جو تیرے سامنے رونے والے ہیں، تیرے لئے خشوع کرنے والے ہیں۔

[4] ترجمہ:- اے اللہ! مجھے ان بندوں میں سے کردیجئے جن پر انعام کیا گیا ہے، جو ہدایت یافتہ ہیں، تیرے سامنے سجدہ کرتے ہیں، تیری آیات کی تلاوت کے وقت رونے والے ہیں۔

[5] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۱ ص:۱۲۱

الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا

رحمٰن نے اپنے بندوں سے اُن کے بن دیکھے بیشک ہے اُس کے وعدہ پر پہنچنا نہ سنیں گے وہاں

لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ

بک بک سوائے سلام اور اُن کے لئے ہے اُن کی روزی وہاں صبح اور شام یہ وہ بہشت ہے جو

نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں جو کوئی ہوگا پرہیزگار

آسان ترجمۂ قرآن

پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کی جگہ آئے جنہوں نے نمازوں کو برباد کیا، اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلے۔ چنانچہ ان کی گمراہی بہت جلد ان کے سامنے آجائے گی۔ ﴿۵۹﴾ البتہ جن لوگوں نے توبہ کرلی، اور ایمان لے آئے، اور نیک عمل کئے، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔ ﴿۶۰﴾ (ان کا داخلہ) ایسے ہمیشہ باقی رہنے والے باغات میں (ہوگا) جن کا خدائے رحمٰن نے اپنے بندوں سے ان کے دیکھے بغیر وعدہ کر رکھا ہے۔ یقیناً اس کا وعدہ ایسا ہے کہ یہ اس تک ضرور پہنچیں گے۔ ﴿۶۱﴾ وہ اس میں سلامتی کی باتوں کے سوا کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔ اور وہاں ان کا رزق انہیں صبح وشام ملا کرے گا۔ ﴿۶۲﴾ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو متقی ہو۔ ﴿۶۳﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکورین) کے بعد (بعضے) ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا (خواہ اعتقاداً کہ انکار کیا یا عملاً کہ اس کے ادا کرنے میں یا حقوق وآدابِ ضروریہ میں کوتاہی کی) اور (نفسانی ناجائز) خواہشوں کی پیروی کی (جو ضروری طاعت سے غافل کرنے والی تھیں) سو یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی دیکھیں گے (خواہ ابدی ہو یا غیر ابدی) ہاں مگر جس نے (کفر ومعصیت سے) توبہ کرلی (اور مطلب کفر سے توبہ کرنے کا یہ ہے کہ) ایمان لے آیا اور (معصیت سے توبہ کرنا یہ ہے کہ) نیک کام کرنے لگا سو یہ لوگ (بلا خرابی دیکھے) جنت میں جائیں گے اور (جزا ملنے کے

وقت) ان کا ذرا نقصان نہ کیا جائے گا (یعنی ہر نیک عمل کی جزا ملے گی یعنی) ان ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (جائیں گے) جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے (اور) اس کے وعدہ کی ہوئی چیز کو یہ لوگ ضرور پہنچیں گے اس (جنت) میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہ سننے پائیں گے (کیونکہ وہاں فضول بات ہی نہ ہوگی) بجز (فرشتوں اور ایک دوسرے کے) سلام (کرنے) کے (اور ظاہر ہے کہ سلام سے بہت ہی خوشی اور راحت ہوتی ہے تو وہ فضول نہیں) اور اُن کو کھانا صبح وشام ملا کرے گا (یعنی یہ تو معین طور پر ہوگا اور یوں دوسرے وقت بھی اگر چاہیں گے ملے گا) یہ جنت (جس کا ذکر ہوا) ایسی ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اس کا مالک ایسے لوگوں کو بنا دیں گے جو کہ خدا سے ڈرنے والے ہوں (جو مبنیٰ ہے ایمان اور عمل صالح کا)۔

معارف ومسائل

خَلْفٌ، یہ لفظ بسکون لام بُرے قائم مقام بُری اولاد کے لئے اور بفتح لام اچھے قائم مقام اور اچھی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے (مظہری) [۱] مجاہدؒ کا قول ہے کہ یہ واقعہ قربِ قیامت میں صلحاءِ اُمّت کے ختم ہو جانے کے بعد ہوگا کہ نماز کی طرف التفات نہ رہے گا اور فسق وفجور کھلم کھلا ہونے لگے گا۔

نماز بے وقت یا بلا جماعت پڑھنا اضاعتِ نماز اور گناہِ عظیم ہے

اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ، نماز کے ضائع کرنے سے مراد جمہور مفسرین عبداللہ بن مسعود، نخعی، قاسم، مجاہد، ابراہیم، عمر بن عبدالعزیز وغیرہ کے نزدیک نماز کو اُس کے وقت سے مؤخر کر کے پڑھنا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نماز کے آداب وشرائط میں سے کسی میں کوتاہی کرنا جس میں وقت بھی داخل ہے اضاعتِ نماز میں شامل ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اضاعتِ صلوٰۃ سے مراد بے جماعت کے گھر میں نماز پڑھ لینا ہے۔ (قرطبی، بحر محیط) [۲]

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے سب عُمّالِ حکومت کو یہ ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا تھا:

اِنَّ اَهَمَّ اَمْرِكُمْ عِنْدِی الصَّلٰوةُ، فَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ۔ (موطا مالک) [۳]

میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے تو جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے وہ دوسرے تمام احکامِ دین کو بھی اور زیادہ ضائع کرے گا۔

حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز کے آداب اور تعدیلِ ارکان میں کوتاہی کرتا ہے تو اُس سے دریافت

---

[۱] تفسير المظهری تحت هذه الآية ج:٦ ص:١٠٣

[۲] تفسير القرطبی تحت هذه الآية ج:١١ ص:١٢٢، وتفسير البحر المحيط ج:٨ ص:٣٣

[۳] موطا مالك رقم الحديث:٦، كتاب وقوت الصلاة۔

کیا کہ تم کب سے یہ نماز پڑھتے ہو؟ اُس نے کہا کہ چالیس سال سے، حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ تم نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی اور اگر تم اسی طرح کی نمازیں پڑھتے ہوئے مرگئے تو یاد رکھو کہ فطرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مروگے۔ [۱]

ترمذی میں حضرت ابومسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو نماز میں اِقامت نہ کرے۔ مراد یہ ہے کہ جو رکوع اور سجدہ میں اور رکوع میں کھڑے ہو کر یا دو سجدوں کے درمیان سیدھا کھڑا ہونا یا سیدھا بیٹھنے کا اہتمام نہ کرے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے وضوء اور طہارت میں کوتاہی کی یا نماز کے رکوع سجدے میں یا ان دونوں کے درمیان سیدھا کھڑے ہونے بیٹھنے میں جلد بازی کی اُس نے نماز کو ضائع کر دیا۔

حضرت حسنؒ نے اضاعتِ صلوٰۃ اور اتباعِ شہوات کے بارے میں فرمایا کہ مسجدوں کو معطل کر دیا اور صنعت وتجارت اور لذّات وخواہشات میں مبتلا ہوگئے۔

امام قرطبیؒ ان روایات کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ آج اہلِ علم اور معروف بالصلاح لوگوں میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو نماز کے آداب سے غافل، محض نقل وحرکت کرتے ہیں۔ یہ چھٹی ہجری کا حال تھا جس میں ایسے لوگ خال خال پائے جاتے تھے آج یہ صورتِ حال نمازیوں میں عام ہوگئی، اِلّا ماشاءاللہ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَاَعْمَالِنَا۔

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ، شہوات سے مراد دُنیا کی وہ لذتیں ہیں جو انسان کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل کریں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شاندار مکانوں کی تعمیر اور ایسی شاندار سواریوں کی سواری جس پر لوگوں کی نظریں اُٹھیں، اور ایسا لباس جس سے عام لوگوں میں امتیاز کی شان نظر آئے شہواتِ مذکورہ میں داخل ہیں۔ (قرطبی) [۲]

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ لفظ غیّ عربی زبان میں رشاد کے بالمقابل ہے ہر بھلائی اور خیر کو رشاد اور ہر بُرائی اور شر کو غیّ کہا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس میں سارے جہنم سے زیادہ طرح طرح کے عذاب جمع ہیں۔

ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اُس زنا کار کے لئے تیار کیا ہے جو اپنی زنا کاری پر مُصر اور عادی ہے اور اُس شراب خور کے لئے جو شراب کا عادی ہے اور اس سود خور کے لئے جو سود خوری سے باز نہیں آتا اور اُن لوگوں کے لئے جو ماں باپ کی نافرمانی کریں اور جھوٹی شہادت دینے والوں کے لئے اور اُس عورت کے لئے جو کسی دوسرے کے بچے کو اپنے شوہر کا بچہ بنادے۔ (قرطبی) [۳]

---

[۱] سنن النسائی، کتاب السهو، باب تطفيف الصلاة ج:۱ ص:۹۳ [۲] تفسير القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۱۲۵

[۳] تفسير القرطبی ج:۱۱ ص:۱۲۵

لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا، لغو سے مراد کلامِ باطل فضول اور گالی گلوچ اور ایذاء دینے والا کلام ہے کہ اہلِ جنت اِس سے پاک صاف رہیں گے کوئی کلمہ اُن کے کان میں ایسا نہ پڑے گا جو اُن کو رنج و تکلیف پہنچائے۔

اِلَّا سَلٰمًا یہ استثناءِ منقطع ہے مراد یہ ہے کہ وہاں جس کا جو کلام سننے میں آئے گا وہ سلامتی اور بھلائی اور خوشی میں اضافہ کرے گا۔ اصطلاحی سلام بھی اس میں داخل ہے جو اہلِ جنت آپس میں ایک دوسرے کو کریں گے اور اللہ کے فرشتے ان سب کو کریں گے۔ (قرطبی) [1]

وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِيۡهَا بُكۡرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ جنت میں یہ نظامِ شمسی اور طلوع و غروب باللیل والنہار تو نہ ہوگا، ایک قسم کی روشنی ہمہ وقت رہے گی مگر رات اور دن اور صبح اور شام کے امتیازات کسی خاص انداز سے ہوں گے۔ اسی صبح و شام میں اہلِ جنت کا رزق ان کو پہنچے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اہلِ جنت کو جس وقت جس چیز کی خواہش ہوگی وہ اُسی وقت بلا تاخیر پوری کی جائے گی (وَلَهُمۡ مَّا يَشۡتَهُوۡنَ ﴿۵۷﴾ (النحل)) اعلانِ عام ہے پھر صبح شام کی تخصیص کی وجہ انسانی عادت و فطرت کی بناء پر ہے کہ وہ صبح شام کھانے پینے کا عادی ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ جس شخص کو صبح شام کی غذا پوری ملے وہ آرام و عیش والا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرما کر کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کا کھانا دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے صبح اور شام۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں صبح شام کا لفظ بول کر عموم مراد ہے جیسے رات دن کا لفظ بھی یا مشرق مغرب کا لفظ عموم کے لئے بولا جاتا ہے کوئی خاص وقت یا جگہ مراد نہیں ہوتی تو مطلب یہ ہوگا کہ اُن کا رزق اُن کی خواہش کے موافق ہر وقت موجود رہے گا۔ واللہ اعلم (قرطبی) [2]

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا

اور ہم نہیں اُترتے مگر حکم سے تیرے رَبّ کے اُسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے

وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ ۚ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ

اور جو اس کے بیچ میں ہے اور تیرا رَبّ نہیں ہے بھولنے والا رَبّ آسمانوں کا اور زمین کا

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۱۲۶

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۱۲۷

وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ ع

اور جو اُن کے بیچ ہے سو اُسی کی بندگی کر اور قائم رہ اس کی بندگی پر کسی کو پہچانتا ہے تو اُس کے نام کا

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ

اور کہتا ہے آدمی کیا جب میں مرجاؤں تو پھر نکلوں گا زندہ ہوکر کیا یاد نہیں رکھتا

الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ

آدمی کہ ہم نے اس کو بنایا پہلے سے اور وہ کچھ چیز نہ تھا سو قسم ہے تیرے ربّ کی ہم گھیر بلائیں گے اُن کو

وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ج ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ

اور شیطانوں کو پھر سامنے لائیں گے گرد دوزخ کے گھٹنوں پر گرے ہوئے پھر جُدا کرلیں گے ہم

مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ج ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ

ہر ایک فرقہ میں سے جونسا ان میں سے سخت رکھتا تھا رحمٰن سے اکڑ پھر ہم کو خوب معلوم ہے

بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ج كَانَ عَلٰى رَبِّكَ

جو بہت قابل ہیں اُس میں داخل ہونے کے اور کوئی نہیں تم میں جو نہ پہنچے گا اُس پر ہوچکا یہ وعدہ تیرے ربّ پر

حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ج ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

لازم مقرر پھر بچائیں گے ہم اُن کو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دیں گے گنہگاروں کو اس میں اوندھے گرے ہوئے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (فرشتے تم سے یہ کہتے ہیں کہ) ہم آپ کے ربّ کے حکم کے بغیر اُتر کر نہیں آتے۔ جو کچھ ہمارے آگے

ہے، اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، وہ سب اُسی کی ملکیت ہے۔ اور تمہارا ربّ ایسا نہیں ہے جو بھول جایا کرے۔ (۶۴) وہ آسمانوں اور زمین کا بھی مالک ہے، اور جو مخلوقات اُن کے درمیان ہیں، اُن کا بھی۔ لہٰذا تم اُس کی عبادت کرو، اور اُس کی عبادت پر جمے رہو۔ کیا تمہارے علم میں کوئی اور ہے جو اُس جیسی صفات رکھتا ہو؟ (۶۵) اور (کافر) انسان یہ کہتا ہے کہ: "جب میں مر چکا ہوں گا تو کیا واقعی اُس وقت مجھے زندہ کر کے نکالا جائے گا؟" (۶۶) کیا اس انسان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ ہم نے اُسے شروع میں اُس وقت پیدا کیا تھا جب وہ کچھ بھی نہیں تھا؟ (۶۷) تو قسم ہے تمہارے پروردگار کی! ہم ان کو اور ان کے ساتھ سارے شیطانوں کو ضرور اِکٹھا کریں گے، پھر ان کو دوزخ کے گرد اس طرح لے کر آئیں گے کہ یہ سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ (۶۸) پھر ان کے ہر گروہ میں سے اُن لوگوں کو کھینچ نکالیں گے جو خدائے رحمٰن کے ساتھ سرکشی کرنے میں زیادہ سخت تھے۔ (۶۹) پھر یہ بات ہم ہی خوب جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو سب سے پہلے اس دوزخ میں جھونکے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ (۷۰) اور تم میں سے کوئی نہیں ہے جس کا اِس (دوزخ) پر گذر نہ ہو۔ اس بات کا تمہارے پروردگار نے حتمی طور پر ذمہ لے رکھا ہے۔ (۷۱) پھر جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، انہیں تو ہم نجات دے دیں گے، اور جو ظالم ہیں، انہیں اس حالت میں چھوڑ دیں گے کہ وہ اس (دوزخ میں) گھٹنوں کے بل پڑے ہوں گے۔ (۷۲)

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول

صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے یہ آرزو ظاہر فرمائی کہ ذرا زیادہ آیا کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور (ہم آپ کی درخواست کا جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے جواب دیتے ہیں سنیے وہ یہ ہے کہ) ہم (یعنی فرشتے) بدون آپ کے ربّ کے حکم کے وقتاً فوقتاً نہیں آسکتے اسی کی (ملک) ہیں ہمارے آگے کی سب چیزیں (مکان ہو یا زمان، مکانی ہو یا زمانی) اور (اسی طرح) ہمارے پیچھے کی سب چیزیں اور جو چیزیں اُن کے درمیان میں ہیں (آگے کا مکان تو جو منہ کے سامنے ہو اور پیچھے کا جو پشت کی طرف ہو اور مابین ذلک جس میں یہ شخص خود ہو اور آگے کا زمان جو مستقبل ہو اور پیچھے کا جو ماضی ہو اور مابین ذلک جو زمانۂ حال ہو) اور آپ کا ربّ بھولنے والا نہیں (چنانچہ یہ سب اُمور آپ کو پہلے سے معلوم ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم تکویناً وتشریعاً مسخرِ امر ہیں اپنی رائے سے ایک مکان سے دوسرے مکان میں یا جب ہم چاہیں کہیں آ جا نہیں سکتے لیکن جب ہمارا بھیجنا مصلحت ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھیج دیتے ہیں

یہ احتمال نہیں کہ شاید کسی مصلحت کے وقت بھول جاتے ہوں) وہ رَبّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو اِن دونوں کے درمیان میں ہیں سو (جب ایسا حاکم و مالک ہے تو اے مخاطب) تو اس کی عبادت (اور اطاعت) کیا کر اور (ایک آدھ بار نہیں بلکہ) اس کی عبادت پر قائم رہ (اور اگر اس کی عبادت نہ کرے گا تو کیا دوسرے کی عبادت کرے گا) بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے (یعنی کوئی اس کا ہم صفت نہیں تو لائقِ عبادت بھی کوئی نہیں، پس اسی کی عبادت کرنا ضرور ہوا) اور انسان (منکرِ آخرت) یوں کہتا ہے کہ میں جب مر جاؤں گا تو کیا پھر زندہ کر کے قبر سے نکالا جاؤں گا (اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) کیا (یہ) انسان اس بات کو نہیں سمجھتا کہ ہم اس کو اس کے قبل (عدم سے) وجود میں لا چکے ہیں، اور یہ (اس وقت) کچھ بھی نہ تھا (جب ایسی حالت سے حیات کی طرف لانا آسان ہے تو دوبارہ حیات دینا تو بدرجۂ اولیٰ آسان ہے) سو قسم ہے آپ کے رَبّ کی ہم ان کو (قیامت میں زندہ کر کے موقفِ حشر میں) جمع کریں گے اور (ان کے ساتھ) شیاطین کو بھی (جو دُنیا میں ان کے ساتھ رہ کر بہکاتے سکھاتے تھے جیسا دوسری آیت میں ہے قَالَ قَرِیْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُهٗ [1] (ق: ۲۷)) پھر ان (سب) کو دوزخ کے گرداگرد اس حالت سے حاضر کریں گے کہ (مارے ہیبت کے) گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے پھر (ان کفار کے) ہر گروہ میں سے (جیسے یہود و نصاریٰ و مجوس بُت پرست) ان لوگوں کو جُدا کریں گے جو اِن میں سب سے زیادہ اللہ سے سرکشی کیا کرتے تھے (تاکہ ایسوں کو اوروں سے پہلے دوزخ میں داخل کریں) پھر (یہ نہیں کہ اس جُدا کرنے میں ہم کو کسی تحقیقات کی ضرورت پڑے کیونکہ) ہم (خود) ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو دوزخ میں جانے کے زیادہ (یعنی اوّل) مستحق ہیں (پس اپنے علم سے ایسوں کو الگ کر کے اوّل اُن کو پھر دُوسرے کفار کو دوزخ میں داخل کریں گے اور یہ ترتیب صرف اوّلیت میں ہے، اور آخریت نہ ہونے میں تو سب مساوی ہیں اور جہنم کا وجود ایسا یقینی ہے کہ اس کا معائنہ سب مؤمن و کافر کو کرایا جائے گا گو صورت اور غرض معائنہ کی مختلف ہوگی کفار کو بطور دخول کے اور تعذیب ابدی کے واسطے اور مؤمنین کو بطور پُل صراط اور زیادتِ شکر اور فرح کے واسطے کہ اُس کو دیکھ کر جو جنت میں پہنچیں گے تو اور زیادہ شکر کریں گے اور خوش ہوں گے) اور (بعض گنہگاروں کو سزائے محدود کے لئے جو کہ درحقیقت تطہیر ہے اسی عموم معائنہ کی خبر دی جاتی ہے کہ) تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر گزر نہ ہو (کسی کا دخولاً اور کسی کا عبوراً) یہ (وعدہ کے موافق) آپ کے رَبّ کے اعتبار سے (بطور) لازم (مؤکد کے) ہے جو (ضرور) پورا ہو کر رہے گا پھر (اس جہنم پر عبور سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں مؤمن و کافر برابر ہیں بلکہ) ہم ان لوگوں کو نجات دیدیں گے جو خدا سے ڈر (کر ایمان لا) ئے تھے، (خواہ اوّل ہی دفعہ میں نجات ہو جائے جیسے مؤمنین کاملین کو اور خواہ بعد کسی قدر تکلیف کے جیسے کہ مؤمنین ناقصین کو) اور ظالموں کو (یعنی کافروں کو) اس میں (ہمیشہ کے لئے) ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے رنج و غم کے) گھٹنوں کے بَل گر پڑیں گے۔

---

[1] ترجمہ پوری آیت کا یہ ہے: وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا تھا کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار میں نے اُس کو گمراہ نہیں کیا تھا لیکن یہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا۔

معارف ومسائل

وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ لفظ اصْطِبَار کے معنے مشقت وتکلیف پر ثابت قدم رہنا ہے اس میں اشارہ ہے کہ عبادت پر دوام وثبات مشقت چاہتا ہے عبادت گزار کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ لفظ سَمِيّ کے مشہور معنے ہمنام کے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ مشرکین اور بُت پرستوں نے اگرچہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت سے انسانوں، فرشتوں، پتھروں اور بتوں کو شریک کر ڈالا تھا اور ان سب کو اِلٰہ یعنی معبود کہتے تھے مگر کسی نے لفظ اللہ معبود باطل کا نام کبھی نہیں رکھا۔ یہ ایک تکوینی اور تقدیری امر تھا کہ دُنیا میں اللہ کے نام سے کوئی بُت اور کوئی اِلٰہ باطل موسوم نہیں ہوا اس لئے اس معنے کے اعتبار سے بھی مضمون آیت کا واضح ہے کہ دُنیا میں اللہ کا کوئی ہمنام نہیں۔

اور اکثر مفسرین مجاہد، ابنِ جبیر، قتادہ، ابنِ عباسؓ سے اس جگہ اس لفظ کے معنی مثل اور شبیہ کے منقول ہیں اس کا مطلب واضح ہے کہ صفاتِ کمال میں اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل وعدیل یا نظیر نہیں ہے۔

لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ، اس جگہ وَالشَّيٰطِيْنَ کا واو بمعنے مَعَ ہے اور مراد یہ ہے کہ ہر کافر کو اُس کے شیطان کے ساتھ ایک سلسلہ میں باندھ کر اُٹھایا جائے گا۔ اس صورت میں یہ صرف کافروں کے حشر کا بیان ہوگا، اور اگر مراد عام لی جائے جس میں مؤمن وکافر سب داخل ہیں تو شیاطین کے ساتھ ان سب کے حشر کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر کافر تو اپنے شیطان کے ساتھ بندھا ہوا حاضر ہوگا اور مؤمنین بھی اس موقفِ حشر میں الگ نہیں ہوں گے اس لحاظ سے سب کے ساتھ شیاطین کا اجتماع ہوجائے گا۔ (قرطبی) [1]

حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾ ابتدائے حشر کے وقت مؤمنین وکفار اور سعداء واشقیاء سب جہنم کے گرد جمع کئے جائیں گے اور سب پر ہیبت طاری ہوگی سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ پھر مؤمنین اور سعداء کو جہنم سے عبور کرا کر جنت میں داخل کیا جائے گا تاکہ اس منظر جہنم کو دیکھنے کے بعد اُن کو مکمل خوشی اور دائمی اور مخالفین دین پر شماتت اور اُس پر اللہ کا مزید شکر نصیب ہو۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ ،لفظ شیعه اصل لغت میں کسی خاص شخص یا خاص عقیدہ کے متبعین کو کہا جاتا ہے اس لئے بمعنی فرقہ بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور مراد آیت کی یہ ہے کہ کفار کے مختلف فرقوں میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوگا اس کو ان سب میں ممتاز کر کے مقدم کیا جائے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ جہنم میں اس ترتیب سے داخل کیا جائے گا کہ

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۱ ص:۱۳۲

جس کا جرم سب سے زیادہ ہوگا وہ سب سے پہلے اس کے بعد دوسرے اور تیسرے درجے کے مجرمین داخلِ جہنم کئے جائیں گے۔ (مظہری) [۱]

وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ یعنی کوئی انسان مؤمن یا کافر ایسا نہ رہے گا جس کا ورودِ جہنم پر نہ ہو۔ ورود سے مراد دخول نہیں بلکہ عبور ہے جیسا کہ ابن مسعودؓ کی ایک روایت میں لفظ مرور بھی آیا ہے۔ اور اگر دخول مراد لیا جائے تو مؤمنین متقین کا دخول اس طرح ہوگا کہ جہنم اُن کے لئے بَرۡد وسلام بن جائے گی اُن کو اُس کی کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی جیسا کہ حضرت ابوسُمَیّہؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نیک آدمی یا فاجر آدمی باقی نہ رہے گا جو ابتداءً جہنم میں داخل نہ ہو مگر اس وقت مؤمنین متقین کے لئے جہنم بَرۡد وسلام بن جائے گی جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے نارِ نمرود بَرۡد وسلام بنادی گئی تھی۔ اس کے بعد مؤمنین کو یہاں سے نجات دے کر جنت میں لے جایا جائے گا۔ [۲] یہی معنے آیت کے اس اگلے جملے کے ہیں ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا، یہ مضمون حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے اور قرآن کریم میں جو لفظ ورود کا آیا ہے اگر اس کے معنے دخول کے بھی لئے جائیں تو دخول بطور عبور کے مراد ہوگا اس لئے کوئی تضاد نہیں۔

وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ

اور جب سُنائے اُن کو ہماری آیتیں کھلی ہوئی کہتے ہیں جو لوگ کہ منکر ہیں ایمان والوں کو

اَىُّ الۡفَرِيۡقَيۡنِ خَيۡرٌ مَّقَامًا وَّ اَحۡسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا

دونوں فرقوں میں کس کا مکان بہتر ہے اور کس کی اچھی لگتی ہے مجلس اور کتنی ہلاک کرچکے ہم

قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّرِءۡيًا ﴿۷۴﴾ قُلۡ مَنۡ كَانَ فِى الضَّلٰلَةِ

پہلے ان سے جماعتیں وہ ان سے بہتر تھے سامان میں اور نمود میں تو کہہ جو رہا بھٹکتا

فَلۡيَمۡدُدۡ لَهُ الرَّحۡمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوۡا مَا يُوۡعَدُوۡنَ اِمَّا الۡعَذَابَ

سو چاہئے اس کو کھینچ لے جائے رحمٰن لنبا یہاں تک کہ جب دیکھیں گے جو وعدہ ہوا تھا اُن سے یا آفت

---

[۱] تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:٦ ص:١١٠ و١١١

[۲] مسند احمد، رقم الحديث:١٤٨٩٤، مسند جابر بن عبدالله رضي الله عنه، ومجمع الزوائد رقم الحديث:١١١٥٩

وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضۡعَفُ جُنۡدًا ﴿۷۵﴾

اور یا قیامت سو تب معلوم کرلیں گے کس کا بُرا ہے مکان اور کس کی فوج کمزور ہے

وَيَزِيۡدُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا هُدًى ؕ وَ الۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ

اور بڑھاتا جاتا ہے اللہ سُوجھنے والوں کو سُوجھ اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر رکھتی ہیں

عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيۡرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

تیرے رَبّ کے یہاں بدلہ اور بہتر پھر جانے کو جگہ

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب ان کے سامنے ہماری کُھلی کُھلی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، تو کافر لوگ مؤمنوں سے کہتے ہیں کہ: "بتاؤ، ہم دونوں فریقوں میں سے کس کا مقام زیادہ بہتر ہے اور کس کی مجلس زیادہ اچھی ہے؟" ﴿۷۳﴾ اور (یہ نہیں دیکھتے کہ) ان سے پہلے ہم کتنی نسلیں ہلاک کرچکے ہیں، جو اپنے ساز وسامان اور ظاہری آن بان میں ان سے کہیں بہتر تھیں۔ ﴿۷۴﴾ کہہ دو کہ: "جو لوگ گمراہی میں جا پڑیں تو اُن کے لئے مناسب یہی ہے کہ خدائے رحمٰن اُنہیں خوب ڈھیل دیتا رہے۔" یہاں تک کہ جب یہ لوگ وہ چیز خود دیکھ لیں گے جس سے انہیں ڈرایا جارہا ہے، چاہے وہ (اس دُنیا کا) عذاب ہو، یا قیامت، تو اُس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ بدترین مقام کس کا تھا، اور لشکر کس کا زیادہ کمزور تھا۔ ﴿۷۵﴾ اور جن لوگوں نے سیدھا راستہ اختیار کرلیا ہے، اللہ ان کو ہدایت میں اور ترقی دیتا ہے۔ اور جو نیک عمل باقی رہنے والے ہیں، ان کا بدلہ بھی تمہارے پروردگار کے یہاں بہتر ملے گا، اور ان کا (مجموعی) انجام بھی بہتر ہوگا۔ ﴿۷۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان منکر لوگوں کے سامنے ہماری (وہ) کُھلی کُھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (جن میں مؤمنین کا حق پر ہونا اور کفار کا باطل پر ہونا مذکور ہوتا ہے) تو یہ کافر لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ (یہ بتلاؤ ہم) دونوں فریقوں میں (یعنی ہم میں اور تم میں دُنیا میں) مکان کس کا زیادہ اچھا ہے اور محفل کس کی اچھی ہے (یعنی ظاہر ہے کہ خانگی اور مجلسی ساز وسامان اور اہل

واعوان میں ہم بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ مقدمہ تو محسوس ہے اور دوسرا مقدمہ عرفی ہے کہ انعام واحسان اور عطاء نعمت اُس شخص کے لئے ہوتا ہے جو دینے والے کے نزدیک محبوب اور پسند ہو، ان دونوں مقدموں سے ثابت ہوا کہ ہم اللہ کے محبوب ومقبول ہیں اور تم مغضوب ومخذول۔ آگے اللہ تعالیٰ ایک جواب الزامی اور ایک تحقیقی دیتے ہیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں) اور (یہ نہیں دیکھتے کہ) ہم نے ان سے پہلے بہت سے ایسے ایسے گروہ (ہیبت ناک سزاؤں سے کہ بالیقین عذاب تھے) ہلاک کئے ہیں جو سامان اور نمود میں ان سے بھی (کہیں زیادہ) اچھے تھے (اس سے معلوم ہوا کہ مقدمہ ثانیہ غلط ہے بلکہ کسی حکمت اور مصلحت سے نعمتِ دنیویہ مبغوض ومردود کو بھی دی جاسکتی ہے، آگے دوسرا جواب ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں (یعنی تم) اللہ تعالیٰ اُن کو ڈھیل دیتا چلا جارہا ہے (یعنی اس نعمت دنیوی میں یہ حکمت ہے کہ مہلتِ دے کر اتمامِ حجت کردے جیسا دوسری آیت میں ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ الخ (فاطر: ۳۷) [1] اور یہ مہلت چندروزہ ہے) یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے جب اس کو دیکھ لیں گے خواہ عذاب کو (دُنیا میں) خواہ قیامت کو (دوسرے عالم میں) سو (اُس وقت) اُن کو معلوم ہو جاوے گا کہ بُرا مکان کس کا ہے اور کمزور مددگار کس کے ہیں (یعنی دُنیا میں جو اپنے اہلِ مجلس کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں وہاں معلوم ہوگا کہ ان میں کتنا زور ہے کیونکہ وہاں تو کسی کا کوئی زور ہوگا ہی نہیں۔ اسی کو اضعف فرمایا تھا) اور (مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو (دُنیا میں تو) ہدایت بڑھاتا ہے (یعنی اصل سرمایہ یہ ہے کہ اگر اس کے ساتھ مال ودولت نہ ہو مضر نہیں) اور (آخرت میں ظاہر ہوگا کہ) جو نیک کام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں وہ تمہارے رَبّ کے نزدیک ثواب میں بھی بہتر ہیں اور انجام میں بھی بہتر ہیں (پس اُن کو ثواب میں بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی جن میں مکان اور باغات سب کچھ ہوں گے اور انجام ان اعمال کا ابدیت اور دوام ہے ان نعمتوں کا۔ پس کیفیۃً وکمیۃً مسلمانوں ہی کی حالتِ اخیرہ بہتر ہوگی اور اخیر ہی کا اعتبار بھی ہے)۔

معارف ومسائل

خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ یہاں کفار نے مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لئے دو چیزیں پیش کیں۔ اوّل دُنیا کا مال ودولت اور ساز وسامان دوسرے حشم خدم اور اپنا جتھہ اور جماعت کہ یہ بظاہر کفار کو بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ حاصل تھی اور یہی دو چیزیں ہیں جو انسان کے لئے نشہ کا کام کرتی ہیں اور اُن کا فخر وغرور اچھے اچھے عقل مند ذہین لوگوں کو غلط راستوں پر ڈال دیتا ہے اور پچھلے دور کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور حکومت وسلطنت والوں کی عبرت خیز تاریخ سے

[1] ترجمہ: کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی کہ جس کو سمجھنا ہوتا وہ سمجھ سکتا۔

غافل کر کے اپنے موجودہ حال کو اپنا ذاتی کمال اور دائمی راحت کا ذریعہ باور کرا دیتا ہے۔ بجز اُن لوگوں کے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق دُنیا کے مال و دولت اور عزّت و جاہ کسی کو اپنا ذاتی کمال یا دائمی ساتھی نہ سمجھیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر زبان سے بھی ادا کریں اور اُس کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرنے میں بھی اس کے اَحکام کی پابندی کریں اور اس کے فنا یا کم ہو جانے کے خطرہ سے بھی کسی وقت غافل نہ ہوں تو وہی اس شر سے محفوظ رہتے ہیں۔ جیسے انبیاء علیہم السلام ہیں، حضرت سلیمان اور داوٗد علیہما السلام اور صحابہ کرامؓ میں بہت سے اغنیاءِ صحابہ اور اسی طرح اُمت میں لاکھوں اولیاء، صلحاء، جن کو حق تعالیٰ نے دُنیا کا مال و دولت بھی خوب عطا فرمایا اور دین کی دولت اور اپنا خوف بھی بے انتہاء۔

کفار کے اس مغالطہ کو قرآن حکیم نے اس طرح دُور فرمایا کہ دُنیا کی چند روزہ نعمت و دولت نہ اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت ہوسکتی ہے نہ دُنیا ہی میں وہ کسی ذاتی کمال کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ بہت سے بے عقل جاہلوں کو دُنیا میں یہ چیزیں عقلاء اور دانش مندوں سے زیادہ مل جاتی ہیں۔ پچھلی تاریخ اُٹھا کر دیکھو تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ایسی ایسی بلکہ ان سے بھی زیادہ کتنی دولتوں اور شوکتوں کے ڈھیر زمین پر ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

رہا حشم و خدم اور دوست و احباب کی کثرت سو اس کی حقیقت بھی اول تو دُنیا ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے کہ آڑے وقت میں کوئی کام نہیں آتا۔ پھر اگر دُنیا میں وہ برابر خدمت کرتے بھی رہے تو وہ گے دن کی، اس کے بعد محشر کے میدان میں اُن کا کون ساتھی ہوگا؟

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ باقیات صالحات کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جس کی تفصیل سورۂ کہف میں گزر چکی ہے اور مختار قول یہی ہے کہ اس سے مراد وہ تمام طاعات اور نیک کام ہیں جن کے فوائد باقی رہنے والے ہیں۔ مَّرَدًّا کا لفظ بمعنے مرجع ہے مراد انجام و عاقبت ہے۔ مراد آیت کی واضح ہے کہ اعمالِ صالحہ ہی اصل دولت ہیں جن کا ثواب بڑا اور انجام دائمی راحت ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ؕ

بھلا تو نے دیکھا اُس کو جو منکر ہوا ہماری آیتوں سے اور کہا مجھ کو مل کر رہے گا مال اور اولاد

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ۙ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ

کیا جھانک آیا ہے غیب کو، یا لے رکھا ہے رحمٰن سے عہد یہ نہیں، ہم لکھ رکھیں گے

مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ لا وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ

جو وہ کہتا ہے اور بڑھاتے جائیں گے اس کو عذاب میں لنبا اور ہم لے لیں گے اس کے مرنے پر جو کچھ وہ بتلا رہا ہے

وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ لا

اور آئے گا ہمارے پاس اکیلا، اور پکڑ رکھا ہے لوگوں نے اللہ کے سوا اَوروں کو معبود تا کہ وہ ہوں اُن کے لئے مدد،

كَلَّا ط سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع

ع ۸ / ۵

ہرگز نہیں، وہ منکر ہوں گے اُن کی بندگی سے اور ہو جائیں گے اُن کے مخالف

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جس نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ: "مجھے مال اور اولاد (آخرت میں بھی) ضرور ملیں گے۔" ﴿۷۷﴾ کیا اُس نے عالمِ غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے، یا اُس نے خدائے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ ﴿۷۸﴾ ہرگز نہیں! جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، ہم اُسے بھی لکھ رکھیں گے، اور اُس کے عذاب میں اور اضافہ کر دیں گے۔ ﴿۷۹﴾ اور جس (مال اور اولاد) کا یہ حوالہ دے رہا ہے، اُس کے وارث ہم ہوں گے، اور یہ ہمارے پاس تنِ تنہا آئے گا۔ ﴿۸۰﴾ اور ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود اس لئے بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کی پشت پناہی کریں۔ ﴿۸۱﴾ یہ سب غلط بات ہے! وہ تو ان کی عبادت ہی کا انکار کر دیں گے، اور اُلٹے ان کے مخالف ہو جائیں گے۔ ﴿۸۲﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھلا آپ نے اس شخص (کی حالت) کو بھی دیکھا جو ہماری آیتوں کے ساتھ (جن کا حق یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا جن میں سے آیاتِ بعثت بھی ہیں) کفر کرتا ہے اور (علیٰ سبیل الاستہزاء) کہتا ہے کہ مجھ کو (آخرت میں) مال اور اولاد ملیں گے (مطلب یہ کہ اس کی حالت بھی قابلِ تعجب ہے آگے اس کا رد ہے کہ) کیا یہ شخص غیب پر مطلع ہو گیا ہے یا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد (اس بات کا) لے لیا ہے (یعنی اس دعوے کا علم آیا بلا واسطہ اسباب ہوا ہے کہ علمِ غیب ہے یا بواسطہ اسباب ہوا ہے پھر چونکہ وہ دعویٰ حکمِ عقلی تو ہے نہیں بلکہ امر نقلی ہے۔ اس لئے صرف دلیلِ نقلی کہ

اخبار خداوندی ہے اس کی دلیل ہوسکتی ہے سو دونوں طریق مفقود ہیں اوّل تو عقلاً بھی ممتنع ہے اور دوسرا وقوعاً منتفی ہے) ہرگز نہیں (محض غلط کہتا ہے اور) ہم اس کا کہا ہوا بھی لکھ لیتے ہیں (اور وقت پر یہ سزا دیں گے کہ) اس کے لئے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور اس کی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک رہ جائیں گے (یعنی وہ تو دُنیا سے مرجائے گا اور اموال واولاد پر کوئی اس کا اختیار نہ رہے گا ہم ہی سب کے مالک رہیں گے اور قیامت میں ہم اس کو نہ دیں گے بلکہ) وہ ہمارے پاس (مال واولاد سے) تنہا ہوکر آئے گا اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود تجویز کر رکھے ہیں تاکہ ان کے لئے وہ (عنداللہ) باعثِ عزّت ہوں (جیسا اس آیت میں حکایت ہے وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس:۱۸) [۱]. سو ایسا) ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہ تو (قیامت میں خود) اُن کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں گے (جیسا سورۂ یونس کے تیسرے رکوع میں گزر چکا ہے وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ (یونس) [۲]) اور (اُلٹے) ان کے مخالف ہوجائیں گے، (قالاً بھی جیسا گزرا اور حالاً بھی کہ بجائے عزّت کے سببِ ذلت ہوجائیں گے ان معبودین میں اصنام بھی ہوں گے سواُن کا ناطق ہونا جیسا يَكْفُرُوْنَ کا مقتضا ہے مثل نطق جوارح کے مستبعد ومستغرب نہیں)۔

معارف ومسائل

لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ بخاری ومسلم میں حضرت خباب بن الارتؓ کی روایت ہے کہ ان کا کچھ قرض عاص بن وائل کے ذمّہ تھا یہ اُن کے پاس تقاضہ کے لئے گئے اُس نے کہا کہ میں تو تمہارا قرض اُس وقت تک نہیں دُوں گا جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر وانکار کا معاملہ نہ کرو۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ میں یہ کام نہیں کرسکتا جب تک کہ تم مرو پھر زندہ ہو۔ عاص بن وائل نے کہا کہ اچھا کیا میں مرکر پھر زندہ ہوں گا۔ اگر ایسا ہے تو بس تمہارا قرض بھی اُسی وقت چکاؤں گا جب دوبارہ زندہ ہوں گا کیونکہ اُس وقت بھی میرے پاس مال اور اولاد ہوں گے۔ (قرطبی) [۳]

قرآنِ کریم نے اس احمق کے جواب میں فرمایا کہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ دوبارہ زندہ ہونے کے وقت بھی اُس کے پاس مال اور اولاد ہوں گے اَطَّلَعَ الْغَيْبَ، کیا اس نے غیب کی باتوں کو جھانک کر معلوم کرلیا ہے اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ یا اللہ رحمٰن سے اس نے مال واولاد کے لئے کوئی عہد اور وعدہ لے لیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی نہیں۔ پھر اس نے یہ خیال کیسے پکالیا۔ وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ، یعنی جس مال اور اولاد کا یہ ذکر کر رہا ہے آخرت میں ملنے کا

---

[۱] ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔

[۲] ترجمہ: اور ان کے وہ شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔

[۳] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ذکر القین والحداد ج:۱ ص:۲۸۰، وصحیح مسلم، کتاب صفة المنافقین، باب صفة القیامة والجنة والنار ج:۲ ص:۳۷۰، وتفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۱۴۵، ۱۴۶

معاملہ تو بہت دُور ہے دُنیا میں بھی جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس کو بھی چھوڑنا پڑے گا اور اس کے وارث آخر کار ہم ہوں گے یعنی یہ مال و اولاد اس سے چھن کر بالآخر اللہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

وَيَأْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ اور قیامت کے روز یہ اکیلا ہمارے دربار میں حاضر ہوگا نہ کوئی اولاد ساتھ ہوگی نہ مال۔ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ یعنی یہ خود تراشیدہ بُت اور معبود باطل جن کی عبادت اس لئے کرتے تھے کہ یہ اُن کے مددگار رہوں گے محشر میں اس کے برعکس یہ اُن کے دشمن ہوجائیں گے اللہ تعالیٰ اُن کو نطق و زبان عطا فرمادیں گے اور یہ بولیں گے کہ یا اللہ ان کو عذاب و سزا دیجئے کہ انہوں نے تجھ کو چھوڑ کر ہمیں معبود بنالیا تھا۔ (قرطبی) [1]

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ

تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اُچھالتے ہیں ان کو اُبھار کر سو تو جلدی نہ کر

عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ

اُن پر ہم تو پوری کرتے ہیں اُن کی گنتی جس دن ہم اکٹھا کرلائیں گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس

وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ (وقف لازم)

مہمان بُلائے ہوئے اور ہانک لے جائیں گے گنہگاروں کو دوزخ کی طرف پیاسے، نہیں اختیار رکھتے لوگ سفارش کا

اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ (وقف لازم)

مگر جس نے لے لیا ہے رحمٰن سے وعدہ

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ہم نے کافروں پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو انہیں برابر اُکساتے رہتے ہیں؟ ﴿۸۳﴾ لہٰذا تم ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو، ہم تو ان کے لئے گنتی گن رہے ہیں۔ ﴿۸۴﴾ (اُس دن کو نہ بھولو) جس دن ہم سارے متقی لوگوں کو مہمان بنا کر خدائے رحمٰن کے پاس جمع کریں گے، ﴿۸۵﴾ اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۱ ص:۱۴۸

طرح ہنکا کر دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ (۸۶) لوگوں کو کسی کی سفارش کرنے کا اختیار بھی نہیں ہوگا، سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے خدائے رحمٰن سے کوئی اجازت حاصل کر لی ہو۔ (۸۷)

خلاصۂ تفسیر

(آپ جو اِن کی گمراہی سے غم کرتے ہیں تو) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر (ابتلاءً) چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو (کفر وضلال پر) خوب اُبھارتے (اور اُکساتے) رہتے ہیں (پھر جو خود ہی اپنے اختیار سے اپنے بدخواہ کے بہکانے میں آجائے اس کا کیوں غم کیا جائے) سو (جب شیاطین ابتلاءً مسلط ہوئے ہیں اور تعجیل سزائے مستحق میں ابتلاء رہتا نہیں تو) آپ اُن کے لئے جلدی (عذاب ہونے کی درخواست) نہ کیجئے ہم اُن کی باتیں (جن پر سزا ہوگی) خود شمار کر رہے ہیں، (اور وہ سزا اُس روز واقع ہوگی) جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن (کے دار النعیم) کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے (اور کوئی ان کا سفارشی بھی نہ ہوگا کیونکہ وہاں) کوئی سفارش کا اختیار نہ رکھے گا مگر ہاں جس نے رحمٰن کے پاس سے اجازت لی ہے (وہ انبیاء وصلحاء ہیں اور اجازت خاص ہے مؤمنین کے ساتھ پس کفار محلِ شفاعت نہ ہوئے)۔

معارف ومسائل

تَؤُزُّهُمۡ اَزًّا (۸۳) عربی لغت میں لفظ ھَزَّ، اَزَّ، فَزَّ، حَضَّ سب ایک معنی میں ہیں یعنی کسی کام کے لئے اُبھارنا اور آمادہ کرنا۔ خفّت وشدّت اور کمی زیادتی کے لحاظ سے ان میں باہمی فرق ہے۔ لفظ اَزَّ کے معنی پوری قوت اور تدبیر وتحریک کے ذریعہ کسی شخص کو کسی کام کے لئے آمادہ بلکہ مجبور کر دینے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ شیاطین ان کو اعمالِ بد پر اُبھارتے رہتے ہیں اور اُن کی خوبیاں اُن کے دل پر مسلط کر دیتے ہیں خرابیوں پر نظر نہیں ہونے دیتے۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمۡ عَدًّا (۸۴) مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے عذاب کے بارے میں جلدی نہ کریں وہ تو عنقریب ہونے ہی والا ہے کیونکہ ہم نے اُن کو گنے چُنے ایام جو مدت دُنیا میں رہنے کی دی ہے وہ بہت جلد پوری ہونے والی ہے اس کے بعد عذاب ہی عذاب ہے نَعُدُّ لَهُمۡ یعنی ہم ان کے لئے شمار کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی کوئی چیز آزاد نہیں اُن کی عمر کے دن رات گِنے ہوئے ہیں، اُن کے سانس، اُن کی نقل وحرکت کا ایک ایک قدم، اُن کی لذات اُن کی زندگی کا ایک ایک لحظہ ہم گِن رہے ہیں، یہ گنتی پوری ہوتے ہی ان پر عذاب ٹوٹ پڑے گا۔

مامون رشید نے ایک مرتبہ سورۂ مریم پڑھی۔ جب اس آیت پر پہنچے تو حاضرین مجلس جو علماء فقہاء تھے اُن میں سے

ابنِ سماک کی طرف اشارہ کیا کہ اس کے متعلق کچھ کہیں۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ جب ہمارے سانس گنے ہوئے ہیں ان پر زیادتی نہیں ہوسکتی تو یہ کس قدر جلد ختم ہوجائیں گے۔ اسی کو بعض شعراء نے کہا ہے ؎

حَيَاتُكَ اَنْفَاسٌ تُعَدُّ فَكُلَّمَا مَضىٰ نَفَسٌ مِنْكَ انْتَقَصْتَ بِهٖ جُزْءًا

یعنی تیری زندگی کے سانس گنے ہوئے ہیں، جب ایک سانس گزرتا ہے تو تیری زندگی کا ایک جزء کم ہوجاتا ہے۔ کہاجاتا ہے کہ انسان دن رات میں چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔ (قرطبی) [۱]

اور بعض حضرات نے فرمایا ؎

وَكَيْفَ يَفْرَحُ بِالدُّنْيَا وَلَذَّتِهَا فَتًى يُعَدُّ عَلَيْهِ اللَّفْظُ وَالنَّفَسُ

یعنی دُنیا اور اس کی لذّت پر وہ شخص کیسے مگن اور بے فکر ہوسکتا ہے جس کے الفاظ اور سانس گنے جارہے ہوں (رُوح) [۲] يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ لفظ وفد ایسے آنے والوں کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی بڑے بادشاہ یا امیر کے پاس اکرام واعزاز کے ساتھ جائیں بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ یہ لوگ سواریوں پر سوار ہوکر پہنچیں گے اور سواری ہر شخص کی وہ ہوگی جس کو وہ دُنیا میں اپنے لئے پسند کرتا تھا۔ اونٹ، گھوڑا یا دوسری سواریاں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اُن کے اعمال صالحہ اُن کی مرغوب سواریوں کی صورت اختیار کرلیں گے۔ یہ روایاتِ حدیث روح المعانی اور قرطبی نے نقل کی ہیں۔ [۳]

اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ وِرْد کے لفظی معنی پانی کی طرف جانے کے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ پیاس ہی کے وقت کوئی آدمی یا جانور پانی پر جاتا ہے اِس لئے وِرْدًا کا ترجمہ پیاسا کیا گیا۔

مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عہد سے مراد شہادت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے، بعض نے فرمایا کہ عہد سے مراد حفظ کتاب اللہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے کا حق ہر ایک کو نہیں ملے گا بجز اُن لوگوں کے جو ایمان کے عہد پر مضبوط رہے۔ (رُوح) [۴]

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ

اور لوگ کہتے ہیں رحمٰن رکھتا ہے اولاد بیشک تم آپھنسے ہو بھاری چیز میں، ابھی آسمان

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۱ ص:۱۵۰

[۲] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۶ ص:۱۳۵

[۳] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۶ ص:۱۳۵، وکنز العمال رقم الحدیث:۴۵۰۴، وصفة الجنة لابن ابی الدنیا رقم الحدیث:۲

[۴] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۶ ص:۱۳۷

يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ

پھٹ پڑیں اس بات سے اور ٹکڑے ہو زمین اور گر پڑیں پہاڑ ڈھے کر اس پر کہ پکارتے ہیں رحمٰن کے نام پر

وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ

اولاد اور نہیں پھبتا رحمٰن کو کہ رکھے اولاد، کوئی نہیں

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ

آسمان اور زمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہوکر اس کے پاس اُن کی شمار ہے

وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور گن رکھی ہے اُن کی گنتی، اور ہر ایک اُن میں آئے گا اُس کے سامنے قیامت کے دن اکیلا البتہ جو یقین لائے ہیں

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ

اور کی ہیں اُنہوں نے نیکیاں اُن کو دے گا رحمٰن محبت سو ہم نے آسان کر دیا یہ قرآن تیری زبان میں

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا

اسی واسطے کہ خوشخبری سنا دے تو ڈرنے والوں کو، اور ڈرا دے جھگڑالو لوگوں کو۔ اور بہت ہلاک کر چکے ہم

ع ۶ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

ان سے پہلے جماعتیں، آہٹ پاتا ہے تو اُن میں کسی کی یا سنتا ہے اُن کی بھنک؟

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن کی کوئی اولاد ہے! ﴿۸۸﴾ (ایسی بات کہنے والو!) حقیقت یہ ہے کہ تم نے بڑی

سنگین حرکت کی ہے۔ ⑲ کچھ بعید نہیں کہ اس کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں۔ ⑨٠ کہ ان لوگوں نے خدائے رحمٰن کے لئے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ⑨١ حالانکہ خدائے رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ اُس کی کوئی اولاد ہو۔ ⑨٢ آسمانوں اور زمین میں جتنے لوگ ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو خدائے رحمٰن کے حضور بندہ بن کر نہ آئے۔ ⑨٣ یقین رکھو کہ اُس نے سب کا اِحاطہ کر رکھا ہے اور انہیں خوب اچھی طرح گن رکھا ہے۔ ⑨٤ اور قیامت کے دن ان میں سے ایک ایک شخص اُس کے پاس اکیلا آئے گا۔ ⑨٥ (ہاں) بیشک جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، خدائے رحمٰن ان کے لئے دِلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔ ⑨٦ چنانچہ (اے پیغمبر!) ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان بنا دیا ہے تا کہ تم اس کے ذریعے متقی لوگوں کو خوشخبری دو، اور اسی کے ذریعے ان لوگوں کو ڈراؤ جو ضد کی وجہ سے جھگڑے پر آمادہ ہیں۔ ⑨٧ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ کیا تمہیں ٹٹولنے سے بھی ان میں سے کسی کا پتہ ملتا ہے، یا ان میں سے کسی کی بھنک بھی تمہیں سنائی دیتی ہے؟ ⑨٨

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے اَولاد (بھی) اختیار کر رکھی ہے (چنانچہ نصاریٰ کثرت سے اور یہود قلّت سے اور مشرکینِ عرب اس عقیدہ فاسدہ میں مبتلا تھے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) تم نے (جو) یہ (بات کہی تو) ایسی سخت حرکت کی ہے کہ اس کے سبب کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اُڑ جائیں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے (کیونکہ) جتنے کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام ہو کر حاضر ہوتے ہیں (اور) اس نے سب کو (اپنی قدرت میں) احاطہ کر رکھا ہے اور (اپنے علم سے) سب کو شمار کر رکھا ہے (یہ حالت تو ان کی فی الحال ہے) اور قیامت کے روز سب کے سب اس کے پاس تنہا تنہا حاضر ہوں گے (کہ ہر شخص خدا ہی کا محتاج اور محکوم ہوگا، پس اگر خدا کے اولاد ہو تو خدا ہی کی طرح وجوب وجود و لوازمِ وجوب کے ساتھ موصوف ہونا چاہئے اور خدا کی یہ صفات ہیں جو مذکور ہوئیں، عمومِ قدرت، عمومِ علم۔ اور غیر خدا کی یہ صفتیں ہیں افتقار و انقیاد جو ضد ہیں وجوب کے پھر ضدّین کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے)۔

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ (ان کو علاوہ نعم مذکورہ اخرویہ کے دُنیا میں یہ نعمت دے گا کہ) ان کے لئے (خلائق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا سو (آپ ان کو یہ بشارت دے دیجئے کیونکہ) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس سے متقیوں کو خوشخبری سنائیں اور (نیز) اس سے

جھگڑالو آدمیوں کو خوف دلا دیں اور (ان خوف کی چیزوں میں سے قمت دنیویہ کا ایک یہ بھی مضمون ہے کہ) ہم نے ان کے قبل بہت سے گروہوں کو (عذاب وقہر سے) ہلاک کر دیا ہے (سو) کیا آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا ان (میں سے کسی) کی کوئی آہستہ آواز سنتے ہیں (یہ کنایہ ہے بے نام ونشان ہونے سے سو کفار اس قمت دنیویہ کے بھی مستحق ہیں گو کسی مصلحت سے کسی کافر کے لئے اس کا وقوع نہ ہو مگر اندیشہ کے قابل تو ہے)۔

معارف ومسائل

وَتَخِرُّ الۡجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ ان آیات سے معلوم ہوا کہ زمین اور پہاڑ اور اُس کی تمام چیزوں میں ایک خاص قسم کا عقل وشعور موجود ہے اگرچہ وہ اس درجہ کا نہ ہو جس پر اَحکامِ الٰہیہ مرتب ہوتے ہیں جیسے انسان کی عقل وشعور۔ یہی عقل وشعور ہے جس کی وجہ سے دُنیا کی ہر چیز اللہ کے نام کی تسبیح کرتی ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ (بنی اسرائیل : ۴۴) یعنی کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو ان چیزوں کا یہی شعور وادراک ہے جس کا ذکر ان آیاتِ مذکورہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے خصوصاً اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دینے سے زمین اور پہاڑ وغیرہ سخت گھبراتے اور ڈرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جن وانس کے علاوہ تمام مخلوقات خداتعالیٰ کے ساتھ شرک سے بہت ڈرتی ہیں اور یہ خطرہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ (روح المعانی) [1]

وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ﴿۹۴﴾ یعنی حق تعالیٰ شانہ تمام انسانوں کے اشخاص واعمال کا پورا علم رکھتے ہیں اُن کے سانس اُن کے قدم اُن کے لقمے اور گھونٹ اللہ کے نزدیک شمار کئے ہوئے ہیں نہ کم ہو سکتے ہیں نہ زیادہ۔

سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ یعنی ایمان اور عمل صالح پر قائم رہنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کر دیتے ہیں دوستی اور محبت، یعنی ایمان اور عمل صالح جب مکمل ہوں اور بیرونی عوارض سے خالی ہوں تو اُن کا خاصہ یہ ہے کہ مؤمنین صالحین کے درمیان آپس میں بھی اُلفت ومحبت ہو جاتی ہے۔ ایک نیک صالح آدمی دوسرے نیک آدمی سے مانوس ہوتا ہے اور دوسرے تمام لوگوں اور مخلوقات کے دلوں میں بھی اللہ تعالیٰ اُن کی محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

بخاری، مسلم، ترمذی، وغیرہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے کو پسند فرماتے ہیں تو جبرئیل امین سے کہتے ہیں کہ میں فلاں آدمی سے محبت کرتا ہوں تم بھی اُن سے محبت کرو۔ جبرئیل امین سارے آسمانوں میں اس کی منادی کرتے ہیں اور سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے

[1] روح المعاني ج:۱۶ ص:۱۴۰

ہیں پھر یہ محبت زمین پر نازل ہوتی ہے (تو زمین والے بھی سب اس محبوبِ خدا سے محبت کرنے لگتے ہیں) اور فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے یعنی اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (روح المعانی) [1] اور ہرم بن حیانؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے پورے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کے دل اس کی طرف متوجہ فرما دیتے ہیں۔ (قرطبی) [2]

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنی اہلیہ ہاجرہ اور شیر خوار صاحبزادہ اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان ریگستان میں بحکمِ خدا تعالیٰ چھوڑ کر ملک شام واپس جانے کا ارادہ فرمایا تو اُن کے لئے بھی دُعا مانگی تھی فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ (ابراہیم: ۳۷) یعنی یا اللہ میرے بے کس اہل وعیال کے لئے آپ کچھ لوگوں کے قلوب کو مائل اور متوجہ فرما دیجئے۔ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں سال گزر چکے ہیں کہ مکہ اور اہلِ مکہ کی محبت ساری دُنیا کے دِلوں میں بھر دی گئی ہے اور دُنیا کے ہر گوشے سے بڑی بڑی محنت ومشقت اُٹھا کر اور عمر بھر کی کمائی خرچ کر کے لوگ پہنچتے رہتے ہیں اور دُنیا کے ہر گوشہ کی چیزیں مکہ معظّمہ کے بازار میں دستیاب ہوتی ہیں۔

اَوۡ تَسۡمَعُ لَهُمۡ رِكۡزًا ﴿۹۸﴾ رِکز وہ مخفی آواز ہے جو سمجھ میں نہ آئے جیسے مرنے والے کی زبان لڑکھڑانے کے بعد جو آواز ہوتی ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ سب حکومت وسلطنت والے اور شوکت وحشمت اور طاقت وقوت والے جب اللہ کے عذاب میں پکڑے گئے اور فنا کئے گئے تو ایسے ہو گئے کہ اُن کی کوئی مخفی آواز اور حسّ وحرکت بھی سنائی نہیں دیتی۔

الحمد للہ کہ آج ۲۰/ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ بروز دوشنبہ بعد العشاء سورۂ مریم کی یہ تفسیر بارہ دن میں مکمل ہوئی،

فالحمد لله اوّله وآخره وظاهره وباطنه والله أسأل ان يتقبله بفضله۔

---

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة مریم ج:۲ ص:۱۴۹، وصحيح البخاری، کتاب الأدب، باب المقة من الله تعالىٰ عز وجل ج:۲ ص:۸۹۲، وصحيح مسلم، کتاب البر الخ، باب إذا احب الله عبدًا الخ ج:۲ ص:۳۳۱

[2] تفسير القرطبی ج:۱۱ ص:۱۶۱ تحت هٰذه الآية۔

سُوْرَةُ طٰهٰ

اٰیاتھا ١٣٥ ٢٠ سُوْرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ ٤٥ رکوعاتھا ٨

سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو پینتیس آیتیں ہیں اور آٹھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اس سورت کا دوسرا نام سورۂ کلیم بھی ہے (كَمَا ذَكَرَ السَّخَاوِيُّ) وجہ یہ ہے کہ اس میں حضرت کلیم اللہ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ مفصل مذکور ہے۔

مسند دارمی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے آسمان وزمین پیدا کرنے سے بھی دو ہزار سال پہلے سورۂ طٰہٰ و یٰسٓ پڑھی (یعنی فرشتوں کو سنائی) تو فرشتوں نے کہا کہ بڑی خوش نصیب اور مبارک ہے وہ اُمت جس پر یہ سورتیں نازل ہوں گی اور مبارک ہیں وہ سینے جو ان کو حفظ رکھیں گے اور مبارک ہیں وہ زبانیں جو ان کو پڑھیں گی، [1] یہی وہ مبارک سورت ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا تہیہ کر کے نکل نے والے عمر بن خطابؓ کو ایمان قبول کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں گرنے پر مجبور کر دیا جس کا واقعہ کتب سیرت میں معروف مشہور ہے۔

---

[1] مجمع الزوائد رقم الحديث: ١١١٦٣

ابن اسحاق کی روایت اس طرح ہے کہ عمر بن خطابؓ ایک روز تلوار لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ راستے میں نُعَیم بن عبداللہ مل گئے، پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر بن خطابؓ نے کہا کہ میں اس گمراہ شخص کا کام تمام کرنے کے لئے جا رہا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا، اُن کے دین و مذہب کو بُرا کہا، اُن کو بیوقوف بنایا اور اُن کے بتوں کو بُرا کہا۔ نُعَیم نے کہا کہ عمر! تمہیں تمہارے نفس نے دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو گے اور اُن کا قبیلہ بنوعبدمناف تمہیں زندہ چھوڑے گا کہ زمین پر چلتے پھرتے رہو۔ اگر تم میں عقل ہے تو اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو کہ وہ مسلمان اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کے تابع ہو چکے ہیں۔ عمر بن خطاب پر اُن کی بات اثر کر گئی اور یہیں سے اپنی بہن بہنوئی کے مکان کی طرف پھر گئے۔ اُن کے مکان میں حضرت خبّاب بن ارت صحابیؓ ان دونوں کو قرآن کی سورت طٰهٰ پڑھا رہے تھے جو ایک صحیفہ میں لکھی ہوئی تھی۔

ان لوگوں نے جب محسوس کیا کہ عمر بن خطابؓ آ رہے ہیں تو حضرت خبّابؓ گھر کے کسی کمرہ یا گوشہ میں چھپ گئے اور ہمشیرہ نے یہ صحیفہ اپنی ران کے نیچے چھپا لیا، مگر عمر بن خطاب کے کانوں میں خبّاب بن ارتؓ کی اور اُن کے کچھ پڑھنے کی آواز پہنچ چکی تھی اس لئے پوچھا کہ یہ پڑھنے پڑھانے کی آواز کیسی تھی جو میں نے سنی ہے؟ اُنہوں نے (اوّل بات کو ٹالنے کے لئے) کہا کہ کچھ نہیں، مگر اب عمر بن خطابؓ نے بات کھول دی کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم دونوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع اور مسلمان ہو گئے ہو اور یہ کہہ کر اپنے بہنوئی سعید بن زیدؓ پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کی ہمشیرہ فاطمہؓ نے جب یہ دیکھا تو شوہر کو بچانے کے لئے کھڑی ہو گئیں، عمر بن خطاب نے اُن کو بھی مار کر زخمی کر دیا۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو بہن بہنوئی دونوں نے بیک زبان کہا کہ سن لو! ہم بلاشبہ مسلمان ہو چکے ہیں، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں، اب جو تم کر سکتے ہو کر لو! ہمشیرہ کے زخم سے خون جاری تھا، اس کیفیت کو دیکھ کر عمر بن خطابؓ کو کچھ ندامت ہوئی اور بہن سے کہا کہ وہ صحیفہ مجھے دکھلاؤ جو تم پڑھ رہی تھیں تاکہ میں بھی دیکھوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تعلیم لائے ہیں؟ عمر بن خطاب لکھے پڑھے آدمی تھے، اس لئے صحیفہ دیکھنے کے لئے مانگا، بہن نے کہا کہ ہمیں خطرہ ہے کہ ہم نے یہ صحیفہ اگر تمہیں دے دیا تو تم اس کو ضائع کر دو یا بے ادبی کرو۔ عمر بن خطاب نے اپنے بتوں کی قسم کھا کر کہا کہ تم یہ خوف نہ کرو، میں اس کو پڑھ کر تمہیں واپس کر دوں گا۔ ہمشیرہ فاطمہؓ نے جب یہ رُخ دیکھا تو اُن کو کچھ اُمید ہو گئی کہ شاید عمر بھی مسلمان ہو جائیں۔ اس وقت کہا کہ بھائی! بات یہ ہے کہ تم نجس ناپاک ہو اور اس صحیفہ کو پاک آدمی کے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اگر تم دیکھنا ہی چاہتے ہو تو غسل کر لو۔ عمرؓ نے غسل کر لیا پھر یہ صحیفہ ان کے حوالہ کیا گیا تو اس میں سورۂ طٰهٰ لکھی ہوئی تھی اس کا شروع حصہ ہی پڑھ کر عمرؓ نے کہا کہ یہ کلام تو بڑا اچھا اور نہایت محترم ہے۔ خبّاب بن اَرَتؓ جو مکان میں چھپے

ہوئے یہ سب کچھ سن رہے تھے، عمرؓ کے یہ الفاظ سنتے ہی سامنے آگئے اور کہا کہ اے عمر بن خطاب! مجھے اللہ کی رحمت سے یہ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے رسول کی دُعا کے لئے منتخب فرمالیا ہے کیونکہ گزشتہ کل میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا کرتے ہوئے سنا ہے کہ اَللّٰھُمَّ اَیِّدِ الْاِسْلَامَ بِاَبِی الْحَکَمِ بْنِ ھِشَامٍ اَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، یااللہ! اسلام کی تائید وتقویت فرما ابوالحکم بن ہشام (یعنی ابوجہل) کے ذریعہ یا پھر عمر بن خطاب کے ذریعہ۔ مطلب یہ تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی مسلمان ہوجائے تو مسلمانوں کی کمزور جماعت میں جان پڑ جائے۔ پھر خبابؓ نے کہا کہ اے عمرؓ! اب تو اس موقع کو غنیمت سمجھ۔ عمر بن خطابؓ نے خبابؓ سے کہا کہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو۔ (قرطبی) [1] آگے اُن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا اور اِسلام قبول کرنا مشہور ومعروف واقعہ ہے۔

طٰهٰ ۝١ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝٢ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝٣

طٰہٰ اس واسطے نہیں اُتارا ہم نے تجھ پر قرآن کہ تو محنت میں پڑے، مگر نصیحت کے واسطے اس کی جو ڈرتا ہے

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝٤ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ

اُتارا ہوا ہے اس کا جس نے بنائی زمین اور آسمان اونچے وہ بڑا مہربان عرش پر

اسْتَوٰى ۝٥ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

قائم ہوا۔ اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں اور ان دونوں کے درمیان

وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝٦ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝٧

اور نیچے گیلی زمین کے اور اگر تو بات کہے پکار کر تو اس کو تو خبر ہے چھپی ہوئی بات کی اور اس سے بھی چھپی ہوئی کی،

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝٨

اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی کی اُسی کے ہیں سب نام خاصے

---

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۱ ص:۱۶۳، ۱۶۴، والمستدرک للحاکمؒ رقم الحدیث:۲۸۹۷، ودلائل النبوۃ للبیھقیؒ رقم الحدیث:۵۱۹

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

طٰہٰ! ① ہم نے تم پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم تکلیف اُٹھاؤ۔ ② البتہ یہ اس شخص کے لئے ایک نصیحت ہے جو ڈرتا ہو۔ ③ اسے اُس ذات کی طرف سے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جا رہا ہے جس نے زمین اور اُونچے اُونچے آسمان پیدا کئے ہیں۔ ④ وہ بڑی رحمت والا عرش پر استوا فرمائے ہوئے ہے۔ ⑤ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، وہ سب بھی اسی کی ملکیت ہے، اور زمین کی تہوں کے نیچے جو کچھ ہے وہ بھی۔ ⑥ اگر تم کوئی بات بلند آواز سے کہو (یا آہستہ)، تو وہ چپکے سے کہی ہوئی باتوں کو، بلکہ اور زیادہ چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ ⑦ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُسی کے اچھے اچھے نام ہیں۔ ⑧

خلاصۂ تفسیر

طٰہٰ (کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) ہم نے آپ پر قرآن (مجید) اس لئے نہیں اُتارا کہ آپ تکلیف اُٹھائیں بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لئے (اُتارا ہے) جو (اللہ سے) ڈرتا ہو یہ اس (ذات) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے (اور) وہ بڑی رحمت والا عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہے (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے اور وہ ایسا ہے کہ) اسی کی مِلک ہیں جو چیزیں آسمانوں میں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں (یعنی آسمان سے نیچے اور زمین سے اوپر) اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں (یعنی زمین کے اندر جو تَر مٹّی ہے جس کو ثریٰ کہتے ہیں جو چیز کہ اس کے نیچے ہے، مراد یہ کہ زمین کی تہ میں جو چیزیں ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت و سلطنت تھی) اور (علم کی یہ شان ہے کہ) اگر تم (اے مخاطب) پکار کر بات کہو تو (اس کے سننے میں تو کیا شبہ ہے) وہ تو (ایسا ہے کہ) چپکے سے کہی بات کو اور (بلکہ) اس سے بھی زیادہ خفی بات کو (یعنی جو ابھی دل میں ہے) جانتا ہے (وہ) اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود (ہونے کا مستحق) نہیں اس کے (بڑے) اچھے اچھے نام ہیں (جو اوصاف و کمالات پر دلالت کرتے ہیں سو قرآن ایسی ذات جامع الصفات کا نازل کیا ہوا ہے اور یقینی حق ہے)۔

معارف و مسائل

طٰہٰ، اس لفظ کی تفسیر میں علماء تفسیر کے اقوال بہت ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس کے معنی یَا رَجُلُ اور ابن عمرؓ

سے یَا حَبِیْبِیْ منقول ہیں، بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ اور یٰسٓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی میں سے ہیں اور بے غبار بات وہ ہے جو حضرت صدیقِ اکبرؓ اور جمہور علماء نے فرمائی کہ جس طرح قرآن کی بہت سی سورتوں کے ابتداء میں آئے ہوئے حروف مقطعہ مثلاً الٓمّٓ وغیرہ متشابہات یعنی اسرار میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا لفظ طٰہٰ بھی اسی میں داخل ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ لِتشقیٰ، شَقَاء سے مشتق ہے جس کے معنی تعب اور مشقت و تکلیف کے ہیں۔ نزولِ قرآن کی ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تمام رات عبادت کے لئے کھڑے رہتے اور نماز تہجد میں تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے تھے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین مبارک پر ورم آ گیا [۱] اور دن بھر اس کی فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح کفار کو ہدایت ہو وہ قرآن کی دعوت کو قبول کرلیں۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں قسم کی مشقت سے بچانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت اور تکلیف میں پڑ جائیں، تمام رات جاگنے اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ بن گیا کہ شروع رات میں آرام فرماتے تھے اور آخر شب میں بیدار ہو کر تہجد ادا فرماتے تھے۔

اسی طرح اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ آپ کا فرض صرف تبلیغ و دعوت کا ہے جب آپ نے یہ کام کرلیا تو پھر اس کی فکر آپ کے ذمہ نہیں کہ کون ایمان لایا اور کس نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ (تلخیص از قرطبی) [۲]

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۳ ابن کثیرؒ [۳] نے فرمایا کہ نزولِ قرآن کی ابتداء میں ساری رات تہجد و تلاوت میں مشغول رہنے سے بعض کفار نے مسلمانوں پر یہ آوازے کسے کہ ان لوگوں پر قرآن کیا نازل ہوا ایک مصیبت نازل ہوگئی نہ رات کا آرام نہ دن کا چین۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ یہ جاہل بدنصیب حقائق سے بے خبر کیا جانیں کہ قرآن اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم خیر ہی خیر اور سعادت ہی سعادت ہے اس کو مصیبت سمجھنے والے بے خبر اور احمق ہیں۔ صحیحین کی حدیث میں بروایت معاویہؓ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کی بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کا علم اور سمجھ بوجھ عطا فرما دیتے ہیں۔ [۴]

اس جگہ امام ابن کثیر نے ایک صحیح حدیث دوسری بھی نقل فرمائی ہے جو علماء کے لئے بڑی بشارت ہے یہ حدیث

---

[۱] مجمع الزوائد، رقم الحدیث: ۱۱۱٦۵

[۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج: ۱۱ ص: ۱٦۷

[۳] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج: ۵ ص: ۲۷۲

[۴] صحیح البخاری، کتاب العلم، باب العلم، قبل القول والعمل ج: ۱ ص: ۱٦

طبرانی نے حضرت ثعلبہ بن الحکمؓ سے روایت کی ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے۔ حدیث یہ ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى لِلْعُلَمَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِذَا قَعَدَ عَلٰى كُرْسِيِّهٖ لِقَضَاءِ عِبَادِهٖ اِنِّیْ لَمْ اَجْعَلْ عِلْمِیْ وَحِكْمَتِیْ فِيْكُمْ اِلَّا وَاَنَا اُرِيْدُ اَنْ اَغْفِرَ لَكُمْ عَلٰى مَا كَانَ مِنْكُمْ وَلَا اُبَالِیْ۔ (ابن کثیر) [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی کرسی پر تشریف فرما ہوں گے تو علماء سے فرما دیں گے کہ میں نے اپنا علم و حکمت تمہارے سینوں میں صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میں تمہاری مغفرت کرنا چاہتا ہوں باوجود اُن خطاؤں کے جو تم سے سرزد ہوئیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔

مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں علماء سے مراد وہی علماء ہیں جن میں علم کی قرآنی علامت خشیت اللہ موجود ہو اس آیت میں لفظ لِّمَنْ يَّخْشٰى اسی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں یہ علامت نہ ہو وہ اس کے مستحق نہیں۔ واللہ اعلم۔

عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ استواء علی العرش کے متعلق صحیح بے غبار وہی بات ہے جو جمہور سلف صالحین سے منقول ہے کہ اس کی حقیقت و کیفیت کسی کو معلوم نہیں، متشابہات میں سے ہے۔ عقیدہ اتنا رکھنا ہے کہ استواء علی العرش حق ہے اُس کی کیفیت اللہ جل شانہٗ کی شان کے مطابق و مناسب ہوگی جس کا ادراک دُنیا میں کسی کو نہیں ہو سکتا۔

وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ ثریٰ، نمناک گیلی مٹی کو کہتے ہیں جو زمین کھودنے کے وقت نکلتی ہے مخلوقات کا علم تو صرف ثریٰ تک ختم ہو جاتا ہے، آگے اس ثریٰ کے نیچے کیا ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اس نئی تحقیق و ریسرچ اور نئے نئے آلات اور سائنس کی انتہائی ترقی کے باوجود اب سے چند سال پہلے زمین کو برما کر کے ایک طرف سے دوسری طرف نکل جانے کی کوشش مدتوں تک جاری رہی۔ ان سب تحقیقات اور انتھک کوششوں کا نتیجہ اخبارات میں سب کے سامنے آچکا ہے کہ صرف چھ میل کی گہرائی تک یہ آلاتِ جدیدہ کام کر سکے، آگے ایک ایسا غلاف حجری ثابت ہوا جہاں کھودنے کے سارے آلات اور سائنس جدید کے سب افکار عاجز ہو گئے یہ صرف چھ میل تک کا علم انسان حاصل کر سکا ہے جبکہ زمین کا قطر ہزاروں میل کا ہے اس لئے اس اقرار کے سوا چارہ نہیں کہ ماتحت الثریٰ کا علم حق تعالیٰ ہی کی مخصوص صفت ہے۔

يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝۷ سرّ سے مراد وہ چیز ہے جو انسان نے اپنے دل میں چھپائی ہوئی ہے کسی پر ظاہر نہیں اور اَخْفٰى سے مراد وہ بات ہے جو ابھی تک تمہارے دل میں بھی نہیں آئی آئندہ کسی وقت دل میں آئے گی۔ حق تعالیٰ ان سب

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۵ ص:۲۷۲، والمعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث:۱۳۶۴، ومجمع الزوائد رقم الحدیث:۵۲۷

چیزوں سے واقف و باخبر ہیں کہ اس وقت کسی انسان کے دل میں کیا ہے اور کل کو کیا ہوگا، کل کا معاملہ ایسا ہے کہ خود اس شخص کو بھی آج اس کی خبر نہیں کہ کل کو میرے دل میں کیا بات آئے گی۔ (قرطبی) [1]

وقف لازم

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا

اور پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی جب اُس نے دیکھی ایک آگ تو کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو

اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝۱۰

کہ میں نے دیکھی ہے ایک آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس اس میں سے سلگا کر، یا پاؤں آگ پر پہنچ کر رستہ کا پتہ

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝۱۱ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ

پھر جب پہنچا آواز آئی اے موسیٰ میں ہوں تیرا ربّ، سو اُتار ڈال اپنی جوتیاں تو ہے

بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۲ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝۱۳

پاک میدان طویٰ میں اور میں نے تجھ کو پسند کیا ہے سو تو سنتا رہ جو حکم ہو

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴

میں جو ہوں اللہ ہوں کسی کی بندگی نہیں سوا میرے سو میری بندگی کر، اور نماز قائم رکھ کر میری یادگاری کو

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝۱۵

قیامت بیشک آنے والی ہے، میں مخفی رکھنا چاہتا ہوں اُس کو تاکہ بدلہ ملے ہر شخص کو جو اُس نے کمایا ہے

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝۱۶

سو کہیں تجھ کو نہ روک دے اس سے وہ شخص جو یقین نہیں رکھتا اُس کا اور پیچھے پڑ رہا ہے اپنے مزوں کے پھر تو پٹکا جائے

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۱ ص:۱۷۰، والمستدرك للحاكمؒ (باختصار) رقم الحديث:۳۳۸۷

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) کیا تم تک موسیٰ کا واقعہ پہنچا ہے؟ ⑨ یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کو ایک آگ نظر آئی تو انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا: "تم یہیں ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید میں اس میں سے کوئی شعلہ تمہارے پاس لے آؤں، یا اُس آگ کے پاس مجھے راستے کا پتہ مل جائے۔" ⑩ چنانچہ جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو انہیں آواز دی گئی کہ: "اے موسیٰ! ⑪ یقین سے جان لو کہ میں ہی تمہارا ربّ ہوں۔ اب تم اپنے جوتے اُتار دو۔ تم اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ ⑫ اور میں نے تمہیں (نبوّت کے لئے) منتخب کیا ہے۔ لہٰذا جو بات وحی کے ذریعے کہی جارہی ہے، اُسے غور سے سنو۔ ⑬ حقیقت یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس لئے میری عبادت کرو، اور مجھے یاد رکھنے کے لئے نماز قائم کرو۔ ⑭ یقین رکھو کہ قیامت کی گھڑی آنے والی ہے۔ میں اُس (کے وقت) کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر شخص کو اُس کے کئے کا بدلہ ملے۔ ⑮ لہٰذا کوئی ایسا شخص تمہیں اس سے ہرگز غافل نہ کرنے پائے جو اس پر ایمان نہ رکھتا ہو، اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہو، ورنہ تم ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ ⑯

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام کے قصہ) کی خبر پہنچی ہے (یعنی وہ سننے کے قابل ہے کہ اس میں توحید و نبوّت کے متعلق علوم ہیں جن کی تبلیغ نافع ہوگی وہ قصہ یہ ہے کہ) جب کہ اُنہوں نے (مدین سے آتے ہوئے ایک رات کو جس میں سردی بھی تھی اور راستہ بھی بھول گئے تھے کوہِ طور پر) ایک آگ دیکھی (کہ واقع میں وہ نور تھا مگر شکل آگ کی سی تھی) سو اپنے گھر والوں سے (جو صرف بی بی تھی یا خادم وغیرہ بھی) فرمایا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو (یعنی میرے پیچھے پیچھے مت آنا کیونکہ یہ تو احتمال ہی نہ تھا کہ بدون ان کے آگے سفر کرنے لگیں گے) میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ (کسی لکڑی وغیرہ میں لگا کر) لاؤں (تاکہ سردی کا علاج ہو) یا (وہاں) آگ کے پاس رستہ کا پتہ (جاننے والا کوئی آدمی بھی) مجھ کو مل جائے سو وہ جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو (ان کو منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا ربّ ہوں، پس تم اپنی جوتیاں اُتار ڈالو، (کیونکہ) تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو (یہ اس میدان کا نام ہے) اور میں نے تم کو (نبی بنانے کے لئے منجملہ دیگر خلائق کے) منتخب فرمایا ہے سو (اس وقت) جو کچھ وحی کی جارہی ہے اس کو (غور سے) سن لو (وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں، تو تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو (دوسری بات یہ سنو کہ)

بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو (تمام خلائق سے) پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں (اور قیامت اس لئے آئے گی تا کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے سو (جب قیامت کا آنا یقینی ہے تو) تم کو قیامت (کے لئے مستعد رہنے) سے ایسا شخص باز نہ رکھنے پائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی (نفسانی) خواہشوں پر چلتا ہے (یعنی تم ایسے شخص کے اثر سے قیامت کے لئے تیاری کرنے سے بے فکر نہ ہو جانا) کہیں تم (اس بے فکری کی وجہ سے) تباہ نہ ہو جاؤ۔

معارف و مسائل

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۹﴾ سابقہ آیات میں قرآنِ کریم کی عظمت اور اس کے ضمن میں تعظیمِ رسول کا بیان ہوا تھا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس مناسبت سے ذکر کیا گیا کہ منصبِ رسالت و دعوت کی ادائیگی میں جو مشکلات اور تکلیفیں پیش آیا کرتی ہیں اور انبیاء سابقین نے اُن کو برداشت کیا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آجائیں تا کہ آپ اس کے لئے پہلے سے مستعد اور تیار ہو کر ثابت قدم رہیں جیسا کہ ایک آیت میں ارشاد ہے وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ (ہود: ۱۲۰) یعنی رسولوں کے یہ سب قصے ہم آپ سے اس لئے بیان کرتے ہیں تا کہ آپ کا قلب مضبوط ہو جائے اور منصبِ نبوّت کا بار اُٹھانے کے لئے تیار ہو جائے۔

اور موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ جو یہاں مذکور ہے اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب وہ مَدْيَنْ پہنچ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر اس معاہدہ کے ساتھ مقیم ہو گئے کہ آٹھ یا دس سال تک ان کی خدمت کریں گے اور اُنہوں نے تفسیر بحرِ محیط وغیرہ کی روایت کے مطابق ابعد الاجلین یعنی دس سال پورے کر لئے تو شعیب علیہ السلام سے رخصت چاہی کہ میں اب اپنی والدہ اور بہن سے ملنے کے لئے مصر جاتا ہوں اور جس خطرہ کی وجہ سے مصر چھوڑا تھا کہ فرعونی سپاہی ان کی گرفتاری اور قتل کے درپے تھے عرصہ دراز گزر جانے کے بعد اب وہ خطرہ بھی باقی نہ رہا تھا۔ شعیب علیہ السلام نے ان کو مع اہلیہ یعنی اپنی صاحبزادی کے کچھ مال اور سامان دے کر رخصت فرما دیا راستہ میں ملک شام کے بادشاہوں سے خطرہ تھا اس لئے عام راستہ چھوڑ کر غیر معروف راستہ اختیار کیا۔ موسم سردی کا تھا اور اہلیہ محترمہ حاملہ قریب الولادت تھیں کہ صبح شام میں ولادت کا احتمال تھا۔ غیر معروف راستہ اور جنگل میں راستہ سے ہٹ کر طور پہاڑ کی مغربی اور داہنی سمت میں جا نکلے، رات اندھیری سردی برفانی تھی اسی حال میں اہلیہ کو دردِ زہ شروع ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سردی سے حفاظت کے لئے آگ جلانا چاہا۔ اُس زمانے میں دیا سلائی (ماچس) کے بجائے چقماق پتھر استعمال کیا جاتا تھا جس کو مارنے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی اس کو استعمال کیا مگر اس سے آگ نہ نکلی۔ اسی حیرانی و پریشانی کے عالم میں کوہ طور پر آگ نظر آئی جو درحقیقت نور تھا تو گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے وہاں جاتا ہوں تا کہ تمہارے لئے آگ لاؤں اور ممکن ہے کہ آگ کے پاس کوئی

راستہ جاننے والامل جائے تو راستہ بھی معلوم کرلوں۔ گھر والوں میں اہلیہ محترمہ کا ہونا تو متعین ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خادم بھی ساتھ تھا۔ وہ بھی اس خطاب میں داخل ہے بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ رفیقِ سفر بھی ساتھ تھے مگر راستہ بھولنے میں یہ اُن سے جُدا ہو گئے تھے۔ (بحر محیط) [1]

فَلَمَّآ اَتٰىهَا، یعنی جو آگ دُور سے دیکھی جب اُس کے پاس پہنچے۔ مسند احمد وغیرہ میں وہب بن مُنبہؒ کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس آگ کی طرف چلے اور اس کے قریب پہنچے تو ایک عجیب حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ایک بڑی آگ ہے جو ایک ہرے بھرے درخت کے اوپر شعلے مار رہی ہے مگر حیرت یہ ہے کہ اُس درخت کی کوئی شاخ یا پتہ جلتا نہیں بلکہ آگ نے درخت کے حسن اور تری و تازگی اور رونق میں اور زیادتی کر دی ہے۔ یہ حیرت انگیز منظر کچھ دیر تک اس انتظار میں دیکھتے رہے کہ شاید کوئی چنگاری آگ کی زمین پر گرے تو یہ اُٹھالیں۔ جب دیر تک ایسا نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے گھاس وغیرہ کے کچھ تنکے جمع کر کے اُس آگ کے قریب کئے کہ اِن میں آگ لگ جائے گی تو ان کا کام ہو جائے گا مگر جب یہ گھانس پھونس آگ کے قریب کئے تو آگ پیچھے ہٹ گئی، اور بعض روایات میں ہے کہ آگ اُن کی طرف بڑھی یہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، بہر حال آگ حاصل کرنے کا مطلب پورا نہ ہوا۔ یہ عجیب وغریب آگ سے حیرت کے عالم میں تھے کہ ایک غیبی آواز آئی (روح) [2] یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کے دامن میں پیش آیا جو ان کی داہنی جانب تھا اور جس کا نام طویٰ تھا۔

نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ بحر محیط، روح المعانی [3] وغیرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ آواز اس طرح سنی کہ ہر جانب سے یکساں آ رہی تھی اس کی کوئی جہت متعین نہیں تھی اور سننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کانوں سے نہیں بلکہ تمام اعضاء بدن سے سنا گیا جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آواز کا حاصل یہ تھا کہ جس چیز کو آپ آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ نہیں اللہ تعالیٰ کی ایک تجلّی ہے اور اس میں فرمایا کہ میں ہی آپ کا رَبّ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس آواز کے متعلق یہ یقین کس طرح ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی آواز ہے؟ اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اُن کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیا کہ وہ یقین کرلیں کہ یہ آواز حق تعالیٰ ہی کی ہے دوسرے اس آگ کے حیرت انگیز حالات کہ درخت کو جلانے کے بجائے اس کی تازگی اور حسن بڑھا رہی ہے اور آواز بھی عام لوگوں کی آواز کی طرح نہیں کہ ایک سمت سے آئے بلکہ ہر طرف سے یہ آواز یکساں سنی گئی دوسرے صرف کانوں نے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء جو سننے کے لئے وضع نہیں ہوئے سب اس کی سماعت میں شریک تھے اس سے بھی سمجھا گیا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز ہے۔

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۸ ص:۲۳

[2] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۶ ص:۱۶۶، ۱۶۷، وكتاب الزهد لأحمد بن حنبلؒ رقم الحديث:۳۴۸

[3] روح المعانی ج:۱۶ ص:۱۶۸

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا کلامِ لفظی بلا واسطہ سنا

روح المعانی میں بحوالہ مسند احمد وہب کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جب نداء یا موسیٰ کے لفظ سے دی گئی تو اُنہوں نے لبیک کہہ کر جواب دیا اور عرض کیا کہ میں آواز سن رہا ہوں مگر آواز دینے والے کی جگہ معلوم نہیں، آپ کہاں ہیں تو جواب آیا کہ میں تیرے اوپر، سامنے، پیچھے اور تیرے ساتھ ہوں۔ پھر عرض کیا کہ میں یہ کلام خود آپ کا سن رہا ہوں یا آپ کے بھیجے ہوئے کسی فرشتہ کا؟ تو جواب آیا کہ میں خود ہی آپ سے کلام کر رہا ہوں۔ اس پر صاحبِ روح فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ کلام لفظی بلا واسطہ فرشتہ کے خود سنا ہے جیسا کہ اہل السنۃ والجماعت میں سے ایک جماعت کا مسلک یہی ہے کہ کلامِ لفظی بھی قدیم ہونے کے باوجود سنا جا سکتا ہے اس پر جو شبہ حدوث کا کیا جاتا ہے اس کا جواب اُن کی طرف سے یہ ہے کہ کلامِ لفظی اِس وقت حادث ہوتا ہے جبکہ وہ مادّی زبان سے ادا کیا جائے جس کے لئے جسم، سمت، جہت شرط ہے، نیز سننے کے لئے صرف کان مخصوص ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس طرح سنا کہ نہ آواز کی کوئی جہت وسمت تھی اور نہ سننے کے لئے صرف کان مخصوص تھا سارے اعضا سن رہے تھے، ظاہر ہے یہ صورت احتمال حدوث سے پاک ہے۔ واللہ اعلم [۱]

مقامِ اَدب میں جوتے اُتار دینا اَدب کا مقتضا ہے!

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ جوتے اُتارنے کا حکم یا تو اس لئے دیا گیا کہ مقامِ ادب ہے اور جوتا اُتار کر ننگے پاؤں ہو جانا مقتضائے ادب ہے اور یا اس لئے کہ جوتے مردار کی کھال کے بنے ہوئے تھے جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ [۲] حضرت علیؓ اور حسن بصریؒ اور ابن جریجؒ سے وجہ اول ہی منقول ہے اور جوتا اُتارنے کی مصلحت یہ بتلائی تا کہ آپ کے قدم اس مبارک وادی کی مٹی سے لگ کر اُس کی برکت حاصل کریں اور بعض نے فرمایا کہ یہ حکم خشوع اور تواضع کی صورت بنانے کے لئے ہوا جیسا کہ سلف صالحین طواف بیت اللہ کے وقت ایسا ہی کرتے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر بن خصاصیہ کو قبروں کے درمیان جوتے پہن کر چلتے دیکھا تو فرمایا اِذَا كُنْتَ فِيْ مِثْلِ هٰذَا الْمَكَانِ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ یعنی جب تم اس جیسے مکان سے گزرو (جس کا احترام مقصود ہے) تو اپنے جوتے اُتار لو۔ [۳]

---

[۱] روح المعانی ج:۱۶ ص:۱۶۸، ۱۶۹

[۲] جامع الترمذی، کتاب اللباس، باب ما جاء فی لبس الصوف ج:۱ ص:۳۰۳

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۱۷۳، وسنن ابن ماجة (باختصار) ابواب الجنائز، باب ما جاء فی خلع النعلین فی المقابر ص:۱۱۲

جوتے اگر پاک ہوں تو اُن میں نماز درست ہو جانے پر سب فقہاء کا اتفاق ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے پاک جوتے پہن کر نماز پڑھنا صحیح روایات سے ثابت بھی ہے، [١] مگر عام عادت وسنت یہی معلوم ہوتی ہے کہ جوتے اُتار کر نماز پڑھی جاتی تھی کہ وہ اقرب الی التواضع ہے۔ (قرطبی) [٢]

اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٢﴾ حق تعالیٰ نے زمین کے خاص خاص حصوں کو اپنی حکمت سے خاص امتیاز اور شرف بخشا ہے جیسے بیت اللہ، مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی اسی طرح وادیٔ طویٰ بھی اُنہی مقاماتِ مقدسہ میں ہے جو کوہِ طور کے دامن میں ہے۔ (قرطبی) [٣]

قرآن سننے کا اَدب

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ﴿١٣﴾ حضرت وہب بن مُنبّہ سے منقول ہے کہ قرآن سننے کے آداب میں سے یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعضاء کو فضول حرکت سے روکے کہ کسی دوسرے شغل میں کوئی عضو بھی نہ لگے اور نظر نیچی رکھے اور کلام سمجھنے کی طرف دھیان لگائے اور جو شخص اس ادب کے ساتھ کوئی کلام سنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے سمجھنے کی بھی توفیق دیدیتے ہیں۔ (قرطبی) [٤]

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ اس کلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دین کے تمام اُصول کی تعلیم دیدی گئی یعنی توحید، رسالت، آخرت فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ﴿١٣﴾ میں رسالت کی طرف اشارہ ہے اور فَاعْبُدْنِيْ ۙ کے معنی یہ ہیں کہ صرف میری عبادت کریں، میرے سوا کسی کی عبادت نہ کریں یہ مضمون توحید کا ہو گیا آگے اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ میں آخرت کا بیان ہے۔ فَاعْبُدْنِيْ ۙ کے حکم میں اگرچہ نماز کا حکم بھی داخل ہے لیکن اس کو جداگانہ اس لئے بیان فرمادیا کہ نماز تمام عبادات میں افضل واعلیٰ بھی ہے اور حدیث کی تصریح کے مطابق دین کا عمود اور ایمان کا نور ہے اور ترکِ نماز کافروں کی علامت ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی رُوح ذکر اللہ ہے اور نماز اوّل سے آخر تک ذکر ہی ذکر ہے زبان سے بھی دل سے بھی اور دوسرے اعضاء سے بھی، اس لئے نماز میں ذکر اللہ سے غفلت نہ ہونی چاہئے اور اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر کوئی شخص نیند میں مغلوب ہو گیا یا کسی کام میں لگ کر بھول گیا اور نماز کا وقت نکل گیا تو جب نیند

---

[١] سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی النعل ج:١ ص:١٠٢

[٢] تفسیر القرطبی ج:١١ ص:١٧٤

[٣] تفسیر القرطبی ج:١١ ص:١٧٥

[٤] تفسیر القرطبی ج:١١ ص:١٧٦، و روح المعانی ج:١٦ ص:١٧١ تحت ھٰذہ الآیۃ۔

سے بیدار ہو یا بھول پر تنبہ ہو اور نماز یاد آئے اُسی وقت نماز کی قضاء پڑھ لے جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث میں آیا ہے۔ [۱]

اَكَادُ اُخْفِيْهَا، یعنی قیامت کے معاملہ کو میں تمام مخلوقات سے مخفی رکھنا چاہتا ہوں یہاں تک کہ انبیاء اور فرشتوں سے بھی اور اَكَادُ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اگر لوگوں کو قیامت و آخرت کی فکر دلا کر ایمان و عمل صالح پر اُبھارنا مقصود نہ ہوتا تو اتنی بات بھی ظاہر نہ کی جاتی کہ قیامت آنے والی ہے جیسا کہ اُوپر آیت میں آیا ہے اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ، مقصود اس سے اخفائے قیامت میں مبالغہ کرنا ہے۔

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ (تا کہ جزاء دیا جائے ہر نفس اپنے عمل کی) اس جملہ کا تعلق اگر لفظ اٰتِيَةٌ سے ہے تو معنی ظاہر ہیں کہ قیامت کے آنے کی حکمت و مصلحت یہ ہے کہ دُنیا تو دار الجزاء نہیں یہاں نیک و بد عمل کی جزاء کسی کو نہیں ملتی، اور اگر کبھی دُنیا میں کچھ جزاء مل بھی جاتی ہے تو وہ عمل کی پوری جزاء نہیں ہوتی ایک نمونہ سا ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جہاں ہر نیک و بد عمل کی جزاء و سزا پوری دی جائے۔

اور اگر جملہ کا تعلق اَكَادُ اُخْفِيْهَا سے قرار دیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے اور معنے یہ ہوں گے کہ قیامت اور موت کے وقت اور تاریخ کو مخفی رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے عمل اور سعی میں لگے رہیں اپنی شخصی قیامت یعنی موت اور پورے عالم کی قیامت یعنی حشر کے دن کو دُور سمجھ کر غافل نہ ہو بیٹھیں۔ (رُوح) [۲]

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہئے کہ آپ کافروں اور بے ایمانوں کے کہنے سے قیامت کے معاملے میں غفلت برتنے لگیں اور وہ آپ کی ہلاکت کا سبب بن جائے، ظاہر ہے کہ کسی نبی و رسول سے جو معصوم ہے یہ غفلت نہیں ہوسکتی اس کے باوجود ایسا خطاب کرنا دراصل اُن کی اُمت اور عام مخلوق کو سنانا ہے کہ جب اللہ کے پیغمبروں کو بھی ایسی تاکید کی جاتی ہے تو ہمیں اس کا کتنا اہتمام کرنا چاہئے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا

اور یہ کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسیٰ بولا یہ میری لاٹھی ہے اس پر ٹیک لگاتا ہوں

وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ قَالَ اَلْقِهَا

اور پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں پر اور میرے اس میں چند کام ہیں اور بھی، فرمایا ڈال دے اس کو

[۱] اسی سلسلے کے ایک حدیث صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب قضاء الصلاة الفائتة ج:۱ ص:۲۴۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۶ ص:۱۷۳

يٰمُوۡسٰی ﴿١٩﴾ فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسۡعٰی ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذۡهَا وَ لَا تَخَفۡ وقفة

اے موسیٰ تو اُس کو ڈال دیا، پھر اُسی وقت وہ سانپ ہوگیا دوڑتا ہوا فرمایا پکڑلے اُس کو اور مت ڈر

سَنُعِیۡدُهَا سِیۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰی ﴿٢١﴾ وَ اضۡمُمۡ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ

ہم ابھی پھیر دیں گے اس کو پہلی حالت پر اور مِلالے اپنا ہاتھ اپنی بغل سے کہ نکلے سفید ہوکر

مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَةً اُخۡرٰی ﴿٢٢﴾ لا لِنُرِیَكَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡكُبۡرٰی ﴿٢٣﴾ ج

بلاعیب یہ نشانی دوسری تاکہ دکھاتے جائیں ہم تجھ کو اپنی نشانیاں بڑی،

اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿٢٤﴾ ع

جا طرف فرعون کی کہ اُس نے بہت سر اُٹھایا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور موسیٰ! یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟'' ﴿١٧﴾ موسیٰ نے کہا: ''یہ میری لاٹھی ہے۔ میں اس کا سہارا لیتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں پر (درخت سے) پتے جھاڑتا ہوں، اور اس سے میری دوسری ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔'' ﴿١٨﴾ فرمایا: ''موسیٰ! اسے نیچے پھینک دو'' ﴿١٩﴾ چنانچہ انہوں نے اسے پھینک دیا۔ بس پھر کیا تھا! وہ اچانک ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گئی۔ ﴿٢٠﴾ اللہ نے فرمایا: ''اسے پکڑلو، اور ڈرو نہیں۔ ہم ابھی اسے اس کی پچھلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ ﴿٢١﴾ اور اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں دباؤ، وہ کسی بیماری کے بغیر سفید ہو کر نکلے گا۔ یہ (تمہاری نبوّت کی) ایک اور نشانی ہوگی۔ ﴿٢٢﴾ (یہ ہم اس لئے کررہے ہیں) تاکہ اپنی بڑی نشانیوں میں سے کچھ تمہیں دِکھائیں۔ ﴿٢٣﴾ (اب) فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکشی میں حد سے نکل گیا ہے۔'' ﴿٢٤﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے اے موسیٰ! انہوں

نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے میں (کبھی) اس پر سہارا لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام (نکلتے) ہیں (مثلاً کندھے پر رکھ کر اسباب وغیرہ لٹکا لینا یا اس سے موذی جانوروں کو دفع کرنا وغیرہ وغیرہ) ارشاد ہوا کہ اس (عصا) کو (زمین پر) ڈال دو اے موسیٰ! سو اُنہوں نے اس کو (زمین پر) ڈال دیا تو یکایک وہ (خدا کی قدرت سے) ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا (جس سے موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے) ارشاد ہوا کہ اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں ہم ابھی (پکڑتے ہی) اس کو اس کی پہلی حالت پر کر دیں گے (یعنی یہ پھر عصا بن جائے گا اور تم کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور (دوسرا معجزہ اور دیا جاتا ہے کہ) تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو (پھر نکالو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بلا کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا کہ یہ دوسری نشانی (ہماری قدرت اور تمہاری نبوّت کی) ہوگی (اور یہ حکم لاٹھی کے ڈال دینے اور ہاتھ کو گریبان میں دینے کا اس لئے ہے) تا کہ ہم تم کو اپنی (قدرت کی) بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دکھلائیں (تو اب یہ نشانیاں لے کر) تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے (کہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کو تبلیغ توحید کرو اور اگر نبوّت میں شبہ کرے تو یہی معجزے دکھلا دو)۔

معارف ومسائل

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ بارگاہِ ربّ العالمین کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کرنا کہ آپ کے ہاتھ میں کیا چیز ہے موسیٰ علیہ السلام پر لطف وکرم اور خاص مہربانی کا آغاز ہے تا کہ حیرت انگیز مناظر کے دیکھنے اور کلامِ ربانی کے سننے سے جو ہیبت اور دہشت اُن پر طاری تھی وہ دُور ہو جائے یہ ایک دوستانہ انداز کا خطاب ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے اس کے علاوہ اس سوال میں یہ حکمت بھی ہے کہ آگے اس عصا کو جو اُن کے ہاتھ میں تھا ایک سانپ اور اژدہا بنانا تھا۔ اس لئے پہلے ان کو متنبہ کر دیا کہ دیکھ لو تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے جب اُنہوں نے دیکھ لیا کہ وہ لکڑی کا عصا ہے تب اُس کو سانپ بنانے کا معجزہ ظاہر کیا گیا ورنہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ میں رات کے اندھیرے میں شاید لاٹھی کی جگہ سانپ ہی پکڑ لایا ہوں۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال صرف اتنا ہوا تھا کہ ہاتھ میں کیا چیز ہے اس کا اتنا جواب کافی تھا کہ لاٹھی ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ تین باتیں اصل سوال کے جواب سے زیادہ عرض کیں اوّل یہ کہ یہ عصا میرا ہے، دوسرے یہ کہ میں اس سے بہت سے کام لیتا ہوں ایک یہ کہ اس پر ٹیک لگا لیتا ہوں دوسرے یہ کہ اس سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں تیسرے یہ کہ اس سے اور بھی میرے بہت سے کام نکلتے ہیں، اس طویل اور تفصیلی جواب میں عشق ومحبت اور اس کے ساتھ رعایت ادب کی جامعیت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ عشق ومحبت کا تقاضا ہے کہ

جب محبوب مہربان ہو کر متوجہ ہے تو بات دراز کی جائے تاکہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے مگر ساتھ ہی ساتھ ادب کا مقتضا یہ بھی ہے کہ بہت بے تکلف ہو کر کلام زیادہ طویل بھی نہ ہو۔ اس دوسرے مقتضاء پر عمل کرنے کے لئے اخیر میں اختصار کر دیا کہ وَلِيَ فِيهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ یعنی میں اس سے اور بھی بہت سے کام لیا کرتا ہوں اور ان کاموں کی تفصیل بیان نہیں کی۔ (روح ومظہری) [۱]

تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ضرورت اور مصلحت سے ایسا کرنا بھی جائز ہے کہ جو بات سوال میں نہ پوچھی گئی ہو اس کو بھی جواب میں بیان کر دیا جائے۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہاتھ میں عصا رکھنا سنتِ انبیاء ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی سنت تھی اور اس میں بے شمار دینی دنیوی فوائد ہیں۔ (قرطبی) [۲]

فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں جو عصا تھا بحکمِ ربانی اس کو ڈال دیا تو وہ سانپ بن گیا، اس سانپ کے بارے میں قرآن کریم کی آیات میں ایک جگہ تو یہ آیا ہے كَاَنَّهَا جَآنٌّ (النمل:۱۰) جان عربی لغت میں چھوٹے اور پتلے سانپ کو کہتے ہیں۔ اور دُوسری جگہ آیا ہے فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ (الاعراف:۱۰۷) ثعبان کے معنے اژدہا اور بڑے موٹے سانپ کے ہیں، اور اس آیت میں جو لفظ حَيَّةٌ آیا ہے یہ عام ہے ہر چھوٹے بڑے اور پتلے موٹے سانپ کو حیہ کہا جاتا ہے۔ تطبیق ان آیات کی اس طرح ہو سکتی ہے کہ یہ سانپ شروع میں پتلا اور چھوٹا ہو پھر موٹا اور بڑا ہو گیا، یا یہ کہ سانپ تو بڑا اور اژدہا ہی تھا مگر اس کو جَانّ یعنی ہلکا چھوٹا سانپ اس مناسبت سے کہا گیا کہ یہ عظیم الشان اژدہا سرعت سیر کے اعتبار سے چھوٹے سانپ کی طرح تھا یعنی عام عادت کے خلاف کہ بڑے اژدہے تیز نہیں چل سکتے یہ بڑی تیزی سے چلتا تھا اور آیت میں لفظ كَاَنَّهَا سے جو تشبیہ کے معنی میں ہے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ جانّ سے اس کو تشبیہ ایک خاص وصف سرعت سیر میں دی گئی ہے۔ (مظہری) [۳]

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ، جَنَاح، دراصل جانور کے بازو کو کہا جاتا ہے اس جگہ اپنے بازو کے یعنی بغل میں ہاتھ لگا لینے کا حکم ہوا ہے تاکہ یہ دوسرا معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا جائے کہ جب بغل کے نیچے ہاتھ ڈال کر نکالیں تو آفتاب کی طرح چمکنے لگے حضرت ابن عباسؓ سے تَخْرُجْ بَيْضَآءَ کی یہی تفسیر منقول ہے۔ (مظہری) [۴]

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ، اپنے رسول کو دو عظیم الشان معجزوں سے مسلح کرنے کے بعد اُن کو حکم دیا گیا کہ فرعون سرکش کو دعوتِ ایمان دینے کے لئے چلے جائیں۔

---

[۱] روح المعانی ج:۱۶ ص:۱۷۶، والمظہری ج:۶ ص:۱۳۳　[۲] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۱ ص:۱۸۸

[۳] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۱۳۴　[۴] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۱۳۵

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ

بولا اے ربّ کشادہ کر میرا سینہ اور آسان کر میرا کام اور کھول دے

عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾

گرہ میری زبان سے کہ سمجھیں میری بات اور دے مجھ کو ایک کام بٹانے والا میرے گھر کا

هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾

ہارون میرا بھائی اس سے مضبوط کر میری کمر اور شریک کر اس کو میرے کام میں

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾

کہ تیری پاک ذات کا بیان کریں ہم بہت سا، اور یاد کریں ہم تجھ کو بہت سا، تو تو ہے ہم کو خوب دیکھتا

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

فرمایا ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ

آسان ترجمۂ قرآن

موسیٰ نے کہا: ”پروردگار! میری خاطر میرا سینہ کھول دیجئے، ﴿۲۵﴾ اور میرے لئے میرا کام آسان بنا دیجئے، ﴿۲۶﴾ اور میری زبان میں جو گرہ ہے، اُسے دُور کر دیجئے، ﴿۲۷﴾ تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ ﴿۲۸﴾ اور میرے لئے میرے خاندان ہی کے ایک فرد کو مددگار مقرّر کر دیجئے، ﴿۲۹﴾ یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں! ﴿۳۰﴾ ان کے ذریعے میری طاقت مضبوط کر دیجئے، ﴿۳۱﴾ اور ان کو میرا شریکِ کار بنا دیجئے، ﴿۳۲﴾ تا کہ ہم کثرت سے آپ کی تسبیح کریں، ﴿۳۳﴾ اور کثرت سے آپ کا ذکر کریں۔ ﴿۳۴﴾ بیشک آپ ہمیں اچھی طرح دیکھنے والے ہیں۔“ ﴿۳۵﴾ اللہ نے فرمایا: ”موسیٰ! تم نے جو کچھ مانگا ہے، تمہیں دے دیا گیا، ﴿۳۶﴾

خلاصۂ تفسیر

(جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ مجھ کو پیغمبر بنا کر فرعون کی فہمائش کے لئے بھیجا جا رہا ہے تو اس وقت اس منصب عظیم کے مشکلات کی آسانی کے لئے درخواست کی اور) عرض کیا کہ اے میرے رَبّ میرا حوصلہ (اور زیادہ) فراخ کر دیجئے (کہ تبلیغ میں انقباض یا تکذیب ومخالفت میں ضیق نہ ہو) اور میرا (یہ) کام (تبلیغ کا) آسان فرما دیجئے (کہ اسباب تبلیغ کے مجتمع اور موانع تبلیغ کے مرتفع ہو جائیں) اور میری زبان پر سے بستگی (لکنت کی) ہٹا دیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے واسطے میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں اُن کے ذریعہ سے میری قوّت کو مستحکم کر دیجئے اور اُن کو میرے (اس تبلیغ کے) کام میں شریک کر دیجئے (یعنی ان کو بھی نبی بنا کر مامور بالتبلیغ کیجئے کہ ہم دونوں تبلیغ کریں اور میرے قلب کو قوت پہنچے) تاکہ ہم دونوں (مل کر تبلیغ ودعوت کے وقت) آپ کی خوب کثرت سے پاکی (شرک ونقائص سے) بیان کریں اور آپ (کے اوصاف وکمال) کا خوب کثرت سے ذکر کریں (کیونکہ اگر دو شخص مبلغ ہوں گے تو ہر شخص کا بیان دوسرے کی تائید سے وافر اور متکاثر ہوگا) بیشک آپ ہم کو (اور ہمارے حال کو) خوب دیکھ رہے ہیں (اس حالت سے ہماری احتیاج اس امر کی کہ ایک دوسرے کے معاون ہوں آپ کو معلوم ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری (ہر) درخواست (جو کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ الخ میں مذکور ہے) منظور کی گئی اے موسیٰ۔

معارف ومسائل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کلام الٰہی کا شرفِ خاص حاصل ہوا اور منصبِ نبوّت ورسالت عطا ہوا تو اپنی ذات اور اپنی طاقت پر بھروسہ چھوڑ کر خود حق تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ اس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں اُسی کی مدد سے پوری ہو سکتی ہیں اور اُن پر جو مصائب اور شدائد آنا لازمی ہیں اُن کی برداشت کا حوصلہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطاء ہو سکتا ہے اس لئے اس وقت پانچ دُعائیں مانگیں، پہلی دُعا اِشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ یعنی میرا سینہ کھول دے۔ اس میں ایسی وسعت عطا فرما دے جو علوم نبوّت کا متحمل ہو سکے اور دعوتِ ایمان لوگوں تک پہنچانے میں جو اُن کی طرف سے سخت سست سننا پڑتا ہے اس کو برداشت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

دوسری دُعا وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ﴿۲۶﴾ (یعنی میرا کام میرے لئے آسان کر دے) یہ فہم وفراست بھی نبوّت ہی کا ثمرہ تھا کہ کسی کام کا مشکل یا آسان ہونا بھی ظاہری تدبیروں کے تابع نہیں یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطیہ ہوتا ہے وہ اگر چاہتے ہیں تو کسی کے لئے مشکل سے مشکل بھاری سے بھاری کام آسان کر دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں تو

آسان سے آسان کام مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں مسلمانوں کو اس دُعا کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس طرح دُعا مانگا کریں اَللّٰھُمَّ الْطُفْ بِیْ فِیْ تَیْسِیْرِ کُلِّ عَسِیْرٍ فَاِنَّ تَیْسِیْرَ کُلِّ عَسِیْرٍ عَلَیْکَ یَسِیْرٌ، یعنی یا اللہ ہم پر مہربانی فرما ہر مشکل کام کو آسان کرنے کے لئے کیونکہ ہر مشکل کام کا آسان کر دینا آپ کے قبضہ میں ہے۔ [1]

تیسری دُعا وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ یعنی کھول دے میری زبان کی بندش تاکہ لوگ میرا کلام سمجھنے لگیں۔ اس بندش کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دودھ پینے کے زمانے میں تو اپنی والدہ ہی کے پاس رہے اور دربار فرعون سے اُن کو دودھ پلانے کا وظیفہ اور صلہ ملتا رہا۔ جب دودھ چھڑایا گیا تو فرعون اور اس کی بیوی آسیہ نے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا اس لئے والدہ سے واپس لے کر اپنے یہاں پالنے لگے۔ اسی عرصہ میں ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ لی اور اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا اور بعض روایات میں ہے کہ ایک چھڑی ہاتھ میں تھی جس سے کھیل رہے تھے وہ فرعون کے سر پر ماری، فرعون کو غصہ آیا اور اس کے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بیوی آسیہ نے کہا کہ شاہا! آپ بچے کی بات پر خیال کرتے ہیں جس کو کسی چیز کی عقل نہیں اور اگر آپ چاہیں تو تجربہ کر لیں کہ اس کو کسی بھلے بُرے کا امتیاز نہیں۔ فرعون کو تجربہ کرانے کے لئے ایک طشت میں آگ کے انگارے اور دوسرے میں جواہرات لا کر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھ دیئے خیال یہ تھا کہ بچہ ہے یہ بچوں کی عادت کے مطابق آگ کے انگارے کو روشن، خوبصورت سمجھ کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا جواہرات کی رونق بچوں کی نظر میں ایسی نہیں ہوتی کہ اس طرف توجہ دیں، اس سے فرعون کو تجربہ ہو جائے گا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ بچپن کی نادانی سے کیا۔ مگر یہاں تو کوئی عام بچہ نہیں تھا، خدا تعالیٰ کا ہونے والا رسول تھا جن کی فطرت اوّل پیدائش سے ہی غیر معمولی ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام نے آگ کے بجائے جواہرات پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر جبرئیل امین نے اُن کا ہاتھ آگ کے طشت میں ڈال دیا اور اُنہوں نے آگ کا انگارہ اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا، جس سے زبان جل گئی اور فرعون کو یقین آ گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل کسی شرارت سے نہیں بچپن کی بے خبری کے سبب سے تھا۔ اسی واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں ایک قسم کی تکلیف پیدا ہو گئی اسی کو قرآن میں عقدہ کہا گیا ہے اور اسی کو کھولنے کی دُعا حضرت موسیٰؑ نے مانگی۔ (مظہری وقرطبی) [2]

پہلی دو دُعائیں تو عام تھیں سب کاموں میں اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لئے، تیسری دُعا میں اپنی ایک محسوس کمزوری کے ازالہ کی درخواست کی گئی کہ رسالت ودعوت کے لئے زبان کی طلاقت اور فصاحت بھی ایک ضروری چیز

---

[1] مجمع الزوائد رقم الحديث: ١٧٤٢٣

[2] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج: ١١ ص: ١٩٢، والمظهري ج: ٦ ص: ١٣٦

ہے۔ آگے ایک آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ سب دُعائیں قبول کرلی گئیں جس کا ظاہر یہ ہے کہ زبان کی یہ لکنت بھی ختم ہوگئی ہوگی مگر خود موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ رسالت میں شریک کرنے کی جو دُعا کی ہے اُس میں یہ بھی فرمایا ہے کہ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا (القصص: ۳۴)، یعنی ہارون علیہ السلام زبان کے اعتبار سے بہ نسبت میرے زیادہ فصیح ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر لکنت کا کچھ باقی تھا۔ نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عیوب لگائے اُن میں یہ بھی کہا کہ وَلَا یَکَادُ یُبِیۡنُ ﴿۵۲﴾ (الزخرف)، یعنی یہ اپنی بات کو صاف بیان نہیں کرسکتے۔ بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی دُعا میں اتنی ہی بات مانگی تھی کہ زبان کی بندش اتنی کھل جائے کہ لوگ میری بات سمجھ لیا کریں، اتنی لکنت دُور کردی گئی کچھ معمولی اثر پھر بھی رہا ہو تو وہ اس دُعا کی قبولیت کے منافی نہیں۔

چوتھی دُعا وَاجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَهۡلِیۡ ﴿۲۹﴾ (یعنی بنادے میرا ایک وزیر میرے ہی خاندان میں سے) پچھلی تین دُعائیں اپنے نفس اور ذات سے متعلق تھیں یہ چوتھی دُعا اعمالِ رسالت کو انجام دینے کے لئے اسباب جمع کرنے سے متعلق ہے اور ان اسباب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے اور اہم اس کو قرار دیا کہ ان کا کوئی نائب اور وزیر ہو جو اُن کی مدد کرسکے۔ وزیر کے معنی ہی لغت میں بوجھ اُٹھانے والے کے ہیں، وزیرِ سلطنت چونکہ اپنے امیر و بادشاہ کا بارِ ذمہ داری سے اُٹھاتا ہے اس لئے اس کو وزیر کہتے ہیں۔ اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمالِ عقل معلوم ہوا کہ کسی کام یا تحریک کے چلانے کے لئے سب سے پہلی چیز انسان کے اعوان و انصار ہیں وہ منشاء کے مطابق مل جائیں تو آگے سب کام آسان ہوجاتے ہیں اور وہ غلط ہوں تو سارے اسباب و سامان بھی بے کار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ آج کل کی سلطنتوں اور حکومتوں میں جتنی خرابیاں مشاہدہ میں آئی ہیں غور کریں تو ان سب کا اصلی سبب امیرِ ریاست کے اعوان و انصار اور وزراء و اُمراء کی خرابی بے عملی یا بدعملی یا عدم صالحیت ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی شخص کو کوئی حکومت و امارت سپرد فرماتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ یہ اچھے کام کرے حکومت کو اچھی طرح چلائے تو اُس کو نیک وزیر دیدیتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے اگر یہ کسی ضروری کام کو بھول جائے تو وزیر یاد دلا دیتا ہے اور جس کام کا وہ ارادہ کرے وزیر اس میں اس کی مدد کرتا ہے۔ (رواہ النسائی [۱] عن القاسم بن محمد)

اس دُعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو وزیر طلب فرمایا اس کے ساتھ ایک قید مِّنۡ اَهۡلِیۡ ﴿۲۹﴾ کی بھی لگادی کہ یہ وزیر میرے خاندان و اقارب میں سے ہو کیونکہ اپنے خاندان کے آدمی کے عادات و اخلاق دیکھے بھالے اور طبائع میں باہم اُلفت و مناسبت ہوتی ہے جس سے اس کام میں مدد ملتی ہے بشرطیکہ اس کو کام کی صلاحیت میں دوسروں سے فائق

---

[۱] سنن النسائي، كتاب البيعة، باب وزير الإمام ج:۲ ص:۱۸۶

دیکھ کر لیا گیا ہو، محض اقربا پروری کا داعیہ نہ ہو۔ اس زمانے میں چونکہ عام طور پر دیانت واخلاص مفقود اور اصل کام کی فکر غائب نظر آتی ہے، اس لئے کسی امیر کے ساتھ اس کے خویش وعزیز کو وزیر یا نائب بنانے کو مذموم سمجھا جاتا ہے اور جہاں دیانتداری پر بھروسہ پورا ہو تو کسی صالح واصلح خویش وعزیز کو کوئی عہدہ سپرد کر دینا کوئی عیب نہیں بلکہ مہماتِ اُمور کی تکمیل کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین عموماً وہی حضرات ہوئے جو بیتِ نبوّت کے ساتھ رشتہ داریوں کے تعلقات بھی رکھتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دُعا میں پہلے تو عام بات فرمائی کہ میرے خاندان واہل میں سے ہو، پھر متعین کر کے فرمایا کہ وہ میرا بھائی ہارون ہے جس کو میں وزیر بنانا چاہتا ہوں تا کہ میں اُس سے مہماتِ رسالت میں قوت حاصل کر سکوں۔

حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین یا چار سال بڑے تھے، اور تین سال پہلے ہی وفات پائی۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی وہ مصر میں تھے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا پر اُن کو بھی نبی بنا دیا تو بذریعہ فرشتہ اُن کو بھی مصر ہی میں اس کی اطلاع مل گئی جب موسیٰ علیہ السلام کو مصر میں فرعون کی تبلیغ کے لئے روانہ کیا گیا تو اُن کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ وہ مصر سے باہر اُن کا استقبال کریں اور ایسا ہی واقع ہوا۔ (قرطبی) [1]

وَاَشۡرِكۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۝۳۲ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارونؑ کو اپنا وزیر بنانا چاہا تو یہ اختیار خود اُن کو حاصل تھا تبرکاً حق تعالیٰ کی طرف سے کرنے کی دُعا کی مگر ساتھ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کو نبوّت ورسالت میں اپنا شریک قرار دیں یہ اختیار کسی رسول و نبی کو خود نہیں ہوتا اس لئے اس کی جُداگانہ دُعا کی کہ اُن کو میرے کارِ رسالت میں شریک فرما دے آخر میں فرمایا:

صالح رُفقاء ذکر وعبادت میں بھی مددگار ہوتے ہیں

كَیۡ نُسَبِّحَكَ كَثِیۡرًا ۝۳۳ وَّنَذۡكُرَكَ كَثِیۡرًا ۝۳۴ یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کو وزیر اور شریک نبوّت بنانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم کثرت سے آپ کی تسبیح وذکر کیا کریں گے۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ تسبیح وذکر تو ایسی چیز ہے کہ ہر انسان تنہا بھی جتنا چاہے کر سکتا ہے اس کے لئے کسی ساتھی کے عمل کا کیا دخل لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر وتسبیح میں بھی سازگار ماحول اور اللہ والے ساتھیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جس کے ساتھی اللہ والے نہ ہوں وہ اتنی عبادت نہیں کر سکتا جتنی وہ کر سکتا ہے جس کا ماحول اللہ والوں کا اور ساتھی ذاکر شاغل ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ذکر اللہ میں مشغول رہنا چاہے اس کو سازگار ماحول کی بھی تلاش کرنا چاہئے۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۱ ص:۱۹۴

دُعائیں یہاں ختم ہوگئیں آخر میں حق تعالیٰ کی طرف سے ان سب دُعاؤں کے قبول ہو جانے کی بشارت دیدی گئی
قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ یعنی آپ کی مانگی ہوئی سب چیزیں آپ کو دے دی گئیں۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۸﴾

اور احسان کیا تھا ہم نے تجھ پر ایک بار اور بھی جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سناتے ہیں

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ

کہ ڈال اس کو صندوق میں پھر اس کو ڈال دے دریا میں پھر دریا اُس کو لے ڈالے کنارے پر

يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ۬ وَلِتُصْنَعَ

اُٹھالے اُس کو ایک دشمن میرا اور اس کا اور ڈال دی میں نے تجھ پر محبت اپنی طرف سے اور تاکہ پرورش پائے تو

عَلٰى عَيْنِىْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِىْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ وقف لازم

میری آنکھ کے سامنے، جب چلنے لگی تیری بہن اور کہنے لگی میں بتاؤں تم کو ایسا شخص جو اس کو پالے

فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَقَتَلْتَ نَفْسًا

پھر پہنچادیا ہم نے تجھ کو تیری ماں کے پاس کہ ٹھنڈی رہے اُس کی آنکھ اور غم نہ کھاوے اور تو نے مار ڈالا ایک شخص کو

فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۣ۬ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِىْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۬ۙ

پھر بچادیا ہم نے تجھ کو اس غم سے اور جانچا ہم نے تجھ کو ایک ذرا جانچنا، پھر ٹھہرا رہا تو کئی برس مدین والوں میں

ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ

پھر آیا تو تقدیر سے اے موسیٰ اور بنایا میں نے تجھ کو خاص اپنے واسطے جا تو

وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾

اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر اور سستی نہ کریو میری یاد میں جاؤ طرف فرعون کی اُس نے بہت سر اُٹھایا

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

سو کہو اُس سے بات نرم شاید وہ سوچے یا ڈرے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے تم پر ایک اور مرتبہ بھی احسان کیا تھا، ﴿۳۷﴾ جب ہم نے تمہاری ماں سے وحی کے ذریعے وہ بات کہی تھی جو اَب وحی کے ذریعے (تمہیں) بتائی جارہی ہے۔ ﴿۳۸﴾ کہ اس (بچے) کو صندوق میں رکھو، پھر اس صندوق کو دریا میں ڈال دو۔ پھر دریا کو چھوڑ دو کہ وہ اسے ساحل کے پاس لاکر ڈال دے، جس کے نتیجے میں ایک ایسا شخص اس (بچے) کو اُٹھالے گا جو میرا بھی دُشمن ہوگا، اور اس کا بھی دُشمن۔ اور میں نے اپنی طرف سے تم پر ایک محبوبیت نازل کردی تھی، اور یہ سب اس لئے کیا تھا تا کہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔ ﴿۳۹﴾ اس وقت کا تصوّر کرو جب تمہاری بہن گھر سے چلتی ہے، اور (فرعون کے کارندوں سے) یہ کہتی ہے کہ: ''کیا میں تمہیں اُس (عورت) کا پتہ بتاؤں جو اِس (بچے) کو پالے؟'' اس طرح ہم نے تمہیں تمہاری ماں کے پاس لوٹا دیا، تا کہ اُس کی آنکھ ٹھنڈی رہے، اور وہ غمگین نہ ہو۔ اور تم نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، پھر ہم نے تمہیں اس گھٹن سے نجات دی، اور تمہیں کئی آزمائشوں سے گذارا۔ پھر تم کئی سال مدین والوں میں رہے، اس کے بعد اے موسیٰ! تم ایک ایسے وقت پر یہاں آئے ہو جو پہلے سے مقدّر تھا، ﴿۴۰﴾ اور میں نے تمہیں خاص اپنے لئے بنایا ہے۔ ﴿۴۱﴾ تم اور تمہارا بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ، اور میرا ذکر کرنے میں سستی نہ کرنا۔ ﴿۴۲﴾ دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے آگے نکل چکا ہے۔ ﴿۴۳﴾ جا کر دونوں اُس سے نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے، یا (اللہ سے) ڈر جائے۔'' ﴿۴۴﴾

خلاصۂ تفسیر

ہم تو اور دفعہ اور بھی (اس کے قبل بے درخواست ہی) تم پر احسان کر چکے ہیں جبکہ ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات

الہام سے بتلائی جو (بوجہ مہتم بالشان ہونے کے) الہام سے بتلانے کے (قابل) تھی (وہ) یہ کہ موسیٰ کو (جلّا دوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے) ایک صندوق میں رکھو، پھر ان کو (مع صندوق کے) دریا میں (جس کی ایک شاخ فرعون کے محل تک بھی گئی تھی) ڈال دو پھر دریا اُن کو (مع صندوق کے) کنارہ (کے پاس) تک لے آئے گا کہ (آخر کار) اُن کو ایک ایسا شخص پکڑے گا جو (کافر ہونے کی وجہ سے) میرا بھی دشمن ہے اور اُن کا بھی دشمن ہے (خواہ فی الحال بوجہ اس کے کہ سب بچوں کو قتل کرتا تھا خواہ آئندہ ان کا خاص طور پر دشمن ہوگا) اور (جب صندوق پکڑا گیا اور تم اس میں سے نکالے گئے تو) میں نے تمہارے (چہرے کے) اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈال دیا (تا کہ جو تم کو دیکھے پیار کرے) اور تا کہ تم میری (خاص) نگرانی میں پرورش پاؤ۔ (یہ اس وقت کا قصہ ہے) جبکہ تمہاری بہن (تمہاری تلاش میں فرعون کے گھر) چلتی ہوئی آئیں، پھر (تم کو دیکھ کر اجنبی بن کر) کہنے لگیں (جبکہ تم کسی انا کا دودھ نہ پیتے تھے) کیا تم لوگوں کو ایسے شخص کا پتہ دُوں جو اس کو (اچھی طرح) پالے رکھے (چنانچہ ان لوگوں نے چونکہ اُن کو تلاش تھی منظور کیا اور تمہاری بہن تمہاری ماں کو بُلا کر لائیں) پھر (اس تدبیر سے) ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس پھر پہنچا دیا تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اُن کو غم نہ رہے (جیسا تھوڑے عرصہ تک فراق سے مغموم رہیں) اور (بڑے ہونے کے بعد ایک اور احسان کیا کہ) تم نے (غلطی سے) ایک شخص (قبطی) کو جان سے مار ڈالا (جس کا قصہ سورۂ قصص میں ہے اور مار کر غم ہوا خوفِ عقاب سے بھی اور خوف انتقام سے بھی) پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی (خوفِ عقاب سے تو اس طرح کہ استغفار کی توفیق دی اور اس کو قبول کیا اور خوفِ انتقام سے اس طرح کہ مصر سے مدین پہنچا دیا) اور (مدین پہنچنے تک) ہم نے تم کو خوب خوب محنتوں میں ڈالا (اور پھر ان سے خلاصی دی جن کا ذکر سورۂ قصص میں ہے کہ خلاصی دینا بھی منّت ہے اور خود ابتلاء بھی بوجہ اس کے کہ وہ سبب ہے حصولِ اخلاق حمیدہ و ملکاتِ فاضلہ کا مستقل احسان ہے)۔

پھر (مدین پہنچے اور) مدین والوں میں کئی سال رہے پھر ایک خاص وقت پر (جو میرے علم میں تمہاری نبوّت اور ہم کلامی کے لئے مقدر تھا) تم (یہاں) آئے اے موسیٰ اور (یہاں آنے پر) میں نے تم کو اپنے (نبی بنانے کے) لئے منتخب کیا (سو اب) تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں (یعنی معجزات کہ اصل دو معجزے ہیں عصا و ید بیضا اور ہر ایک میں وجوہِ اعجاز متعدد ہیں) لے کر (جس موقع کے لئے حکم ہوتا ہے) جاؤ اور میری یادگاری میں (خواہ خلوت میں خواہ تبلیغ کے وقت) سستی مت کرنا (اب موقع جانے کا بتلایا جاتا ہے کہ) دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چلا ہے پھر (اس کے پاس جا کر) اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (رغبت سے) نصیحت قبول کر لے یا (عذابِ الٰہی سے) ڈر جائے (اور اس سے مان جائے)۔

معارف ومسائل

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (٣٧) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو انعامات وعنایاتِ حق اس وقت مبذول ہوئیں کہ شرفِ ہم کلامی سے نوازا گیا، نبوّت ورسالت عطا ہوئی، خاص معجزات عطا ہوئے اس کے ساتھ یہاں حق تعالیٰ اپنی وہ نعمتیں بھی اُن کو یاد دلاتے ہیں جو شروع پیدائش سے اس وقت تک زندگی کے ہر دَور میں آپ پر مبذول ہوتی رہیں اور مسلسل آزمائشوں اور جان کے خطروں کے درمیان قدرتِ حق نے کن حیرت انگیز طریقوں سے ان کی حفاظت فرمائی۔ یہ نعمتیں جن کا ذکر آگے آتا ہے زمانہ وقوع کے اعتبار سے پہلی ہیں یہاں جو اُن کو اُخریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نعمتیں اس کے بعد کی ہیں بلکہ لفظ اُخریٰ کبھی مطلقاً دوسرے کے معنے میں بھی آتا ہے جس میں مقدم مؤخر کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا یہاں بھی یہ لفظ اسی معنے میں ہے (روح) [1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ پورا قصہ حدیث کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى (٣٨) یعنی جبکہ وحی بھیجی ہم نے آپ کی والدہ کے پاس ایک ایسے معاملہ کی جو صرف وحی سے ہی معلوم ہوسکتا تھا وہ یہ کہ فرعونی سپاہی جو اسرائیلی لڑکوں کو قتل کرنے پر مامور تھے اُن سے بچانے کے لئے اُن کی والدہ کو بذریعہ وحی الٰہی بتلایا گیا کہ اُن کو ایک تابوت میں بند کر کے دریا میں ڈال دیں اور اُن کے ہلاک ہونے کا اندیشہ نہ کریں ہم اُن کو حفاظت سے رکھیں گے اور پھر آپ کے پاس ہی واپس پہنچا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں عقل وقیاس کی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اُن کی حفاظت کا ناقابلِ قیاس انتظام صرف اُسی کی طرف سے بتلانے پر کسی کو معلوم ہوسکتا ہے۔

کیا وحی کسی غیر نبی ورسول کی طرف بھی آسکتی ہے

صحیح بات یہ ہے کہ لفظ وحی کے لغوی معنے ایسے خفیہ کلام کے ہیں جو صرف مخاطب کو معلوم ہو، دُوسرے اس پر مطلع نہ ہوں۔ اس لغوی معنے کے اعتبار سے وحی کسی کے لئے مخصوص نہیں۔ نبی ورسول اور عام مخلوق بلکہ جانور تک اس میں شامل ہوسکتے ہیں۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (النحل:٦٨) میں شہد کی مکھیوں کو بذریعہ وحی تلقین وتعلیم کرنے کا ذکر اسی معنے کے اعتبار سے ہے اور اس آیت میں اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ بھی اس معنی لغوی کے اعتبار سے ہے اس سے ان کا نبی یا رسول ہونا لازم نہیں آتا، جیسے حضرت مریم علیہا السلام کو ارشادات ربانی پہنچے باوجودیکہ باتفاق جمہورِ اُمت وہ نبی یا رسول نہیں تھیں، اس طرح

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:١٦ ص:١٨٧

کی لغوی وحی عموماً بطور الہام کے ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کسی کے قلب میں ایک مضمون ڈال دیں اور اس کو اس پر مطمئن کر دیں کہ اللہ کی طرف سے ہے جیسے عموماً اولیاء اللہ کو اس قسم کے الہامات ہوتے رہے ہیں، بلکہ ابو حیّان اور بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ اس طرح کی وحی بعض اوقات کسی فرشتے کے واسطے سے بھی ہو سکتی ہے جیسے حضرت مریم کے واقعہ میں اس کی تصریح ہے کہ جبرئیل امین نے بشکلِ انسانی متمثل ہو کر ان کو تلقین فرمائی مگر اس کا تعلق صرف اُس شخص کی ذات سے ہوتا ہے جس کو یہ وحی الہام ہوتی ہے۔ اصلاحِ خلق اور تبلیغ و دعوت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا بخلاف وحیِ نبوّت کے کہ اس کا منشاء ہی مخلوق کی اصلاح کے لئے کسی کو کھڑا کرنا اور تبلیغ و دعوت کے لئے مأمور کرنا ہوتا ہے اس کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ اپنی وحی پر خود بھی ایمان لائے اور دوسروں کو بھی اپنی نبوّت کے ماننے اور اپنی وحی کے ماننے کا پابند بنائے جو اُس کو نہ مانے اُسے کافر قرار دے۔

یہی فرق ہے اس وحیِ الہام یعنی وحیِ لغوی میں اور وحیِ نبوّت یعنی وحیِ اصطلاحی میں۔ وحیِ لغوی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ رہے گی، اور نبوّت اور وحیِ نبوّت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔ بعض بزرگوں کے کلام میں اسی کو وحیِ تشریعی و غیر تشریعی کے عنوان سے تعبیر کر دیا ہے جس کو مدعیِ نبوّت قادیانی نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی بعض عبارتوں کے حوالہ سے اپنے دعوائے نبوّت کے جواز کی دلیل بنایا ہے جو خود ابنِ عربیؒ کی تصریحات سے باطل ہے۔ اس مسئلہ کی مکمل بحث و توضیح میری کتاب ختمِ نبوّت میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کا نام

روح المعانی میں ہے کہ ان کا مشہور نام یُوحانذ ہے اور اتقان میں ان کا نام لحیانہ بنت یصمد بن لادی لکھا ہے، اور بعض لوگوں نے ان کا نام بَارخَا بعض بَازخت بتلایا ہے۔ بعض تعویذ گنڈے والے ان کے نام کی عجیب خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ ہمیں اس کی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوئی اور غالب یہ ہے کہ خرافات میں سے ہے۔ [1]

فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ، اس جگہ لفظ یم بمعنے دریا سے بظاہر نہر نیل مراد ہے آیت میں ایک حکم تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو دیا گیا ہے کہ اس بچے (موسیٰ علیہ السلام) کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیں، دوسرا حکم بصیغۂ امر دریا کے نام ہے کہ وہ اس تابوت کو کنارہ پر ڈال دے فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ، دریا چونکہ بظاہر بے حس و بے شعور ہے اُس کو حکم دینے کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا اسی لئے بعض حضرات نے یہ قرار دیا کہ اگرچہ یہاں صیغۂ امر بمعنی الحکم استعمال ہوا ہے مگر مراد

[1] روح المعانی ج:۱۶ ص:۱۸۷

اس سے حکم نہیں بلکہ خبر دینا ہے کہ دریا اس کو کنارہ پر ڈال دے گا۔ مگر محققین علماء کے نزدیک یہ امر اپنے ظاہر پر امر اور حکم ہی ہے اور دریا ہی اُس کا مخاطب ہے کیونکہ اُن کے نزدیک دُنیا کی کوئی مخلوق درخت اور پتھر تک بے عقل و بے شعور نہیں بلکہ سب میں عقل وادراک موجود ہے اور یہی عقل وادراک ہے جس کے سبب یہ سب چیزیں حسب تصریح قرآن اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ انسان اور جن اور فرشتہ کے علاوہ کسی مخلوق میں عقل وشعور اتنا مکمل نہیں جس پر احکام حلال وحرام عائد کر کے مکلّف بنایا جائے، دانائے رُوم نے خوب فرمایا ہے ؎

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند — با من وتو مردہ باحق زندہ اند [1]

يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهٗ یعنی اس تابوت اور اس میں بند کئے ہوئے بچے کو ساحلِ دریا سے ایسا شخص اُٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰ کا بھی، مراد اس سے فرعون ہے۔ فرعون کا اللہ کا دشمن ہونا تو اُس کے کفر کی وجہ سے ظاہر ہے مگر موسیٰ علیہ السلام کا دشمن کہنا اس لئے محلِ غور ہے کہ اس وقت تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن نہیں تھا بلکہ اُن کی پرورش پر زرِ کثیر خرچ کر رہا تھا پھر اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن فرمانا یا تو انجام کار کے اعتبار سے ہے کہ بالآخر فرعون کا دشمن ہو جانا اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور یہ کہا جائے تو بھی کچھ بعید نہیں کہ جہاں تک فرعون کی ذات کا تعلق ہے وہ فی نفسہٖ اُس وقت بھی دشمن ہی تھا۔ اُس نے حضرت موسیٰ کی تربیت صرف بیوی آسیہ کی خاطر گوارا کی تھی اور اس میں بھی جب اُس کو شبہ ہوا تو اُسی وقت قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا جو حضرت آسیہ کی دانشمندی کے ذریعہ ختم ہوا۔ (روح ومظہری) [2]

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ اس جگہ لفظ محبت مصدر بمعنے محبوبیت ہے اور مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی عنایت ورحمت سے آپ کے وجود میں ایک محبوبیت کی شان رکھ دی تھی کہ جو آپ کو دیکھے آپ سے محبت کرنے لگے۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ (مظہری) [3]

وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ لفظ صنعت سے اس جگہ مراد عمدہ تربیت ہے جیسے عرب میں صَنَعْتُ فَرَسِيْ کا محاورہ اسی معنی میں معروف ہے کہ میں نے اپنے گھوڑے کی اچھی تربیت کی اور عَلٰى عَيْنِيْ سے مراد عَلٰى حِفْظِيْ یعنی اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمالیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہترین تربیت براہ راست حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہو اس لئے مصر کی سب سے بڑی ہستی یعنی فرعون کے ہاتھوں ہی اس کے گھر میں یہ کام اس طرح لیا گیا کہ وہ اس سے بے خبر تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے دشمن کو پال رہا ہوں۔ (مظہری) [4]

---

[1] ترجمہ: مٹی، ہوا پانی اور آگ سب اللہ کے فرمانبردار ہیں میں اور تو ان کو مردہ سمجھتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک وہ زندہ ہیں۔

[2] تفسیر المظہری تحت ھذہ الآیۃ ج:۶ ص:۱۳۹، ۱۴۰، وروح المعانی ج:۱۶ ص:۱۸۸، ۱۸۹

[3] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۱۴۰ [4] بحوالۂ بالا۔

اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ، موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا اس تابوت کے تعاقب میں جانا اور اُس کے بعد کا قصہ جس کا اجمال اس آیت میں آیا ہے جس کے آخر میں فرمایا ہے وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا یعنی ہم نے آپ کی آزمائش کی بار بار (قالہ ابن عباسؓ) یا آپ کو مبتلائے آزمائش کیا بار بار (قالہ الضحاک) اس کی پوری تفصیل سنن نسائی کی ایک طویل حدیث میں بروایت ابن عباسؓ آئی ہے وہ یہ ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مفصل قصہ

حدیث الفتون کے نام سے طویل حدیث سنن نسائی کتاب التفسیر میں بروایت ابنِ عباسؓ نقل کی ہے اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو پورا نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس روایت کو مرفوع یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان قرار دیا ہے اور ابن کثیر نے بھی حدیث کے مرفوع ہونے کی توثیق کے لئے فرمایا ہے کہ:- وَصَدَّقَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ، یعنی اس حدیث کا مرفوع ہونا میرے نزدیک درست ہے پھر اس کے لئے ایک دلیل بھی بیان فرمائی۔ لیکن اس کے بعد یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں یہ روایت نقل کی ہے مگر وہ موقوف یعنی ابن عباسؓ کا اپنا کلام ہے، مرفوع حدیث کے جملے اس میں کہیں کہیں آئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے یہ روایت کعب احبارؒ سے لی ہے جیسا کہ بہت سے مواقع میں ایسا ہوا ہے مگر ابن کثیر جیسے ناقدِ حدیث اور نسائی جیسے امام حدیث اس کو مرفوع مانتے ہیں اور جنہوں نے مرفوع تسلیم نہیں کیا وہ بھی اس کے مضمون پر کوئی نکیر نہیں کرتے اور اکثر حصہ اس کا تو خود قرآن کریم کی آیات میں آیا ہوا ہے اس لئے پوری حدیث کا ترجمہ لکھا جاتا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تفصیلی قصے کے ضمن میں بہت سے علمی اور عملی فوائد بھی ہیں۔ حدیث الفتون بسند امام نسائیؒ قاسم بن ابی ایوب فرماتے ہیں کہ مجھے سعید بن جبیرؒ نے خبر دی کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آئی ہے یعنی وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا میں نے دریافت کیا کہ اس میں فتون سے کیا مراد ہے؟ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس کا واقعہ بڑا طویل ہے صبح کو سویرے آجاؤ تو بتلا دیں گے، جب اگلے دن صبح ہوئی تو میں سویرے ہی ابنِ عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوگیا تاکہ کل جو وعدہ فرمایا تھا اُس کو پورا کراؤں۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ سنو (ایک روز) فرعون اور اس کے ہم نشینوں میں اس بات کا ذکر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ اُن کی ذرّیت میں انبیاء اور بادشاہ پیدا فرمائیں گے۔ بعض شرکائے مجلس نے کہا کہ ہاں بنی اسرائیل تو اس کے منتظر ہیں جس میں اُن کو ذرا شک نہیں کہ اُن کے اندر کوئی نبی و رسول پیدا ہوگا اور پہلے ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نبی یوسف بن یعقوب علیہ السلام ہیں جب اُن کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا یہ اس کے

مصداق نہیں (کوئی اور نبی اور رسول پیدا ہوگا جو اس وعدہ کو پورا کرے گا)۔فرعون نے یہ سنا تو (اُس کو فکر لاحق ہوگئی کہ اگر بنی اسرائیل میں جن کو اُس نے غلام بنا رکھا تھا کوئی نبی و رسول پیدا ہوگیا تو وہ ان کو مجھ سے آزاد کرائے گا) اِس لئے حاضرینِ مجلس سے دریافت کیا کہ اس آفت سے بچنے کا کیا راستہ ہے یہ لوگ آپس میں مشورے کرتے رہے اور انجام کار سب کی رائے اس پر متفق ہوگئی کہ (بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اُس کو ذبح کر دیا جائے اس کے لئے) ایسے سپاہی مقرر کردیئے گئے جن کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں اور وہ بنی اسرائیل کے ایک ایک گھر میں جا کر دیکھتے تھے جہاں کوئی لڑکا نظر آیا اس کو ذبح کر دیا۔

کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد ان کو یہ ہوش آیا کہ ہماری سب خدمتیں اور محنت مشقت کے کام تو بنی اسرائیل ہی انجام دیتے ہیں اگر یہ سلسلہ قتل کا جاری رہا تو اُن کے بوڑھے تو اپنی موت مرجائیں گے اور بچے ذبح ہوتے رہے تو آئندہ بنی اسرائیل میں کوئی مرد نہ رہے گا جو ہماری خدمتیں انجام دے۔نتیجہ یہ ہوگا کہ سارے مشقت کے کام ہمیں خود ہی کرنا پڑیں گے اس لئے اب یہ رائے ہوئی کہ ایک سال میں پیدا ہونے والے لڑکوں کو چھوڑ دیا جائے، دوسرے سال میں پیدا ہونے والوں کو ذبح کر دیا جائے۔اس طرح بنی اسرائیل میں کچھ جوان بھی رہیں گے جو اپنے بوڑھوں کی جگہ لے سکیں اور اُن کی تعداد اتنی زیادہ بھی نہیں ہوگی جس سے فرعونی حکومت کو خطرہ ہو سکے۔یہ بات سب کو پسند آئی اور یہی قانون نافذ کر دیا گیا (اب حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کا ظہور اس طرح ہوا کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایک حمل اس وقت ہوا جبکہ بچوں کو زندہ چھوڑ دینے کا سال تھا، اس میں حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے فرعونی قانون کی رُو سے اُن کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا اگلے سال جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اُس میں حضرت موسیٰ حمل میں آئے تو اُن کی والدہ پر رنج وغم طاری تھا کہ اب یہ بچہ پیدا ہوگا تو قتل کر دیا جائے گا۔ابنِ عباسؓ نے قصہ کو یہاں تک پہنچا کر فرمایا کہ اے ابنِ جُبیر فتون یعنی آزمائش کا یہ پہلا موقع ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ابھی دُنیا میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اُن کے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔اس وقت حق تعالیٰ نے ان کی والدہ کو بذریعہ وحی الہام یہ تسلّی دیدی کہ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ (القصص) یعنی تم کوئی خوف وغم نہ کرو (ہم اس کی حفاظت کریں گے اور کچھ دن جُدا رہنے کے بعد) ہم ان کو تمہارے پاس واپس کردیں گے پھر ان کو اپنے رسولوں میں داخل کرلیں گے۔جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوگئے تو اُن کی والدہ کو حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا (نیل) میں ڈال دو۔موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اس حکم کی تعمیل کردی۔جب وہ تابوت کو دریا کے حوالہ کر چکیں تو شیطان نے اُن کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ تونے کیا کام کیا اگر بچہ تیرے پاس رہ کر ذبح بھی کر دیا جاتا تو اپنے ہاتھوں سے کفن دفن کر کے کچھ تو تسلی ہوتی اب تو اس کو دریا کے جانور کھائیں گے (موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی رنج وغم میں مبتلا تھیں کہ) دریا کی موجوں نے تابوت کو ایک ایسی چٹان پر ڈال دیا جہاں

فرعون کی باندیاں لونڈیاں نہانے دھونے کے لئے جایا کرتی تھیں، انہوں نے یہ تابوت دیکھا تو اُٹھالیا اور کھولنے کا ارادہ کیا تو ان میں سے کسی نے کہا کہ اگر اس میں کچھ مال ہوا اور ہم نے کھول لیا تو فرعون کی بیوی کو یہ گمان ہوگا کہ ہم نے اس میں سے کچھ الگ رکھ لیا ہے، ہم کچھ بھی کہیں اُس کو یقین نہیں آئے گا اس لئے سب کی رائے یہ ہوگئی کہ اس تابوت کو اسی طرح بند اُٹھا کر فرعون کی بیوی کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

فرعون کی بیوی نے تابوت کھولا تو اس میں ایک ایسا لڑکا دیکھا جس کو دیکھتے ہی اُس کے دل میں اُس سے اتنی محبت ہوگئی جو اس سے پہلے کسی بچے سے نہیں ہوئی تھی (جو درحقیقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظہور تھا وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ) دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بوسوسہ شیطانی اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو بھول گئیں اور حالت یہ ہوگئی وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ (القصص: ۱۰) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل ہر خوشی اور ہر خیال سے خالی ہوگیا (صرف موسیٰ علیہ السلام کی فکر غالب آگئی) ادھر جب لڑکوں کے قتل پر مامور پولیس والوں کو فرعون کے گھر میں ایک لڑکا آجانے کی خبر ملی تو وہ چھریاں لے کر فرعون کی بیوی کے پاس پہنچ گئے کہ یہ لڑکا ہمیں دو تاکہ ذبح کر دیں۔

ابن عباسؓ نے یہاں پہنچ کر پھر ابن جُبیرؒ کو مخاطب کیا کہ اے ابنِ جُبیر فتون یعنی آزمائش کا (دوسرا) واقعہ یہ ہے۔ فرعون کی بیوی نے ان لشکری لوگوں کو جواب دیا کہ ابھی ٹھہرو کہ صرف اس ایک لڑکے سے تو بنی اسرائیل کی قوت نہیں بڑھ جائے گی میں فرعون کے پاس جاتی ہوں اور اس بچے کی جان بخشی کراتی ہوں، اگر فرعون نے اس کو بخش دیا تو یہ بہتر ہوگا ورنہ تمہارے معاملے میں دخل نہ دُوں گی یہ بچہ تمہارے حوالہ ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ فرعون کے پاس گئی اور کہا کہ یہ بچہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے فرعون نے کہا کہ ہاں تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا تو معلوم ہے مگر مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کی قسم کھائی جاسکتی ہے اگر فرعون اس وقت بیوی کی طرح اپنے لئے بھی موسیٰ علیہ السلام کے قرۃ العین آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کا اقرار کر لیتا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ہدایت کر دیتا جیسا کہ اُس کی بیوی کو ہدایت ایمان عطا فرمائی۔

(بہرحال بیوی کے کہنے سے فرعون نے اس لڑکے کو قتل سے آزاد کر دیا) اب فرعون کی بیوی نے اس کو دودھ پلانے کے لئے اپنے آس پاس کی عورتوں کو بُلایا۔ سب نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے کی خدمت انجام دیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی کی چھاتی نہ لگتی (وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ [۱] (القصص: ۱۲) اب فرعون کی بیوی کو یہ فکر ہوگئی کہ جب کسی کا دودھ نہیں لیتے تو زندہ یہ کیسے رہیں گے اس لئے اپنی کنیزوں کے سپرد کیا کہ اس کو بازار اور لوگوں کے مجمع میں لے جائیں شاید کسی عورت کا دودھ یہ قبول کر لیں۔

[۱] ترجمہ: اور ہم نے پہلے ہی موسیٰ پر دُودھ پلائیوں کی بندش کر رکھی تھی۔

اس طرف موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بے چین ہوکر اپنی بیٹی کو کہا کہ ذرا باہر جا کر تلاش کرو اور لوگوں سے دریافت کرو کہ اس تابوت اور بچہ کا کیا انجام ہوا، وہ زندہ ہے یا دریائی جانوروں کی خوراک بن چکا ہے اس وقت تک اُن کو اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ یاد نہیں آیا تھا جو حالتِ حمل میں اُن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت اور چند روزہ مفارقت کے بعد واپسی کا کیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ کی بہن باہر نکلیں تو (قدرتِ حق کا یہ کرشمہ دیکھا کہ) فرعون کی کنیزیں اس بچے کو لئے ہوئے دودھ پلانے والی عورتوں کی تلاش میں ہیں، جب اُنہوں نے یہ ماجرا دیکھا کہ یہ بچہ کسی عورت کا دودھ نہیں لیتا اور یہ کنیزیں پریشان ہیں تو ان سے کہا کہ میں تمہیں ایک ایسے گھرانے کا پتہ دیتی ہوں جہاں مجھے اُمید ہے کہ یہ اُن کا دودھ بھی لیں گے اور وہ اس کو خیر خواہی و محبت کے ساتھ پالیں گے۔ یہ سن کر ان کنیزوں نے ان کو اس شبہ میں پکڑ لیا کہ یہ عورت شاید اس بچے کی ماں یا کوئی عزیز خاص ہے جو وثوق کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ وہ گھر والے اس کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں (اس وقت یہ بہن بھی پریشان ہوگئی)۔

ابنِ عباسؓ نے اس جگہ پہنچ کر پھر ابنِ جُبیر کو خطاب کیا کہ یہ (تیسرا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے بات بنائی اور کہا کہ میری مراد اس گھر والوں کے ہمدرد و خیر خواہ ہونے سے یہی تھی کہ فرعونی دربار تک اُن کی رسائی ہوگی اُس سے ان کو منافع پہنچنے کی اُمید ہوگی اس لئے وہ اس بچے کی محبت و ہمدردی میں کسر نہ کریں گے۔ یہ سن کر کنیزوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ یہ واپس اپنے گھر پہنچی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو واقعہ کی خبر دی وہ اُن کے ساتھ اُس جگہ پہنچیں جہاں یہ کنیزیں جمع تھیں، کنیزوں کے کہنے سے اُنہوں نے بھی بچے کو گود میں لے لیا، موسیٰ علیہ السلام فوراً اُن کی چھاتیوں سے لگ کر دودھ پینے لگے یہاں تک کہ پیٹ بھر گیا۔ یہ خوشخبری فرعون کی بیوی کو پہنچی کہ اس بچے کے لئے دودھ پلانے والی مل گئی۔ فرعون کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بُلوایا۔ اُنہوں نے آکر حالات دیکھے اور محسوس کیا کہ فرعون کی بیوی میری حاجت و ضرورت محسوس کر رہی ہے تو ذرا خودداری سے کام لیا۔ اہلیہ فرعون نے کہا کہ آپ یہاں رہ کر اس بچے کو دودھ پلائیں کیونکہ مجھے اس بچے سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کو اپنی نظروں سے غائب نہیں رکھ سکتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا کہ میں تو اپنے گھر کو چھوڑ کر یہاں نہیں رہ سکتی کیونکہ میری گود میں خود ایک بچہ ہے جس کو دودھ پلاتی ہوں، میں اس کو کیسے چھوڑوں۔ ہاں اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ بچہ میرے سپرد کریں میں اپنے گھر رکھ کر اس کو دودھ پلاؤں اور یہ وعدہ کرتی ہوں کہ اس بچے کی خبر گیری اور حفاظت میں ذرا کوتاہی نہ کروں گی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ بھی یاد آگیا جس میں فرمایا کہ چند روز کی جُدائی کے بعد ہم اُن کو تمہارے پاس واپس دے دیں گے اس لئے وہ اور اپنی بات پر جم گئیں۔ اہلیہ فرعون نے مجبور ہوکر ان کی بات مان لی اور یہ اُسی روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر اپنے گھر آگئیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کا نشو و نما خاص طریقے پر فرمایا۔

جب موسیٰ علیہ السلام ذرا قوی ہو گئے تو اہلیہ فرعون نے اُن کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ مجھے لا کر دکھلا جاؤ (کہ میں اس کے دیکھنے کے لئے بے چین ہوں) اور اہلیہ فرعون نے اپنے سب درباریوں کو حکم دیا کہ یہ بچہ آج ہمارے گھر میں آ رہا ہے تم میں سے کوئی ایسا نہ رہے جو اس کا اکرام نہ کرے اور کوئی ہدیہ اس کو پیش نہ کرے اور میں خود اس کی نگرانی کروں گی کہ تم لوگ اس معاملہ میں کیا کرتے ہو۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ گھر سے نکلے اُسی وقت سے اُن پر تحفوں اور ہدایا کی بارش ہونے لگی یہاں تک کہ اہلیہ فرعون کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنے پاس سے خاص تحفے اور ہدیے الگ پیش کئے۔ اہلیہ فرعون ان کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئی اور یہ سب تحفے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیدیئے۔ اس کے بعد اہلیہ فرعون نے کہا کہ اب میں ان کو فرعون کے پاس لے جاتی ہوں وہ ان کو انعامات اور تحفے دیں گے جب ان کو لے کر فرعون کے پاس پہنچی تو فرعون نے ان کو اپنی گود میں لے لیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر زمین کی طرف جھکا دیا۔ اُس وقت دربار کے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک نبی پیدا ہوگا جو آپ کے ملک و مال کا وارث ہوگا، آپ پر غالب آئے گا اور آپ کو پچھاڑے گا، یہ وعدہ کس طرح پورا ہو رہا ہے۔

فرعون متنبہ ہوا اور اُسی وقت لڑکوں کو قتل کرنے والے سپاہیوں کو بُلا لیا تا کہ اس کو ذبح کر دیں ابن عباسؓ نے یہاں پہنچ کر پھر ابن جبیر کو خطاب کیا کہ یہ (چوتھا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ پھر موت سر پر منڈلانے لگی۔

اہلیہ فرعون نے یہ دیکھا تو کہا کہ آپ تو یہ بچہ مجھے دے چکے ہیں پھر اب یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے فرعون نے کہا کہ تم یہ نہیں دیکھتیں کہ یہ لڑکا اپنے عمل سے گویا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ مجھ کو زمین پر پچھاڑ کر مجھ پر غالب آجائے گا۔ اہلیہ فرعون نے کہا کہ آپ ایک بات کو اپنے اور میرے معاملہ کے فیصلہ کے لئے مان لیں جس سے حق بات ظاہر ہو جاوے گی (کہ بچے نے یہ معاملہ بچپن کی بے خبری میں کیا ہے یا دیدہ دانستہ کسی شوخی سے) آپ دو انگارے آگ کے اور دو موتی منگوا لیجئے اور دونوں کو ان کے سامنے کر دیجئے اگر یہ موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں اور آگ کے انگاروں سے بچیں تو آپ سمجھ لیں کہ اس کے افعال عقل و شعور سے دیدہ و دانستہ ہیں اور اگر اس نے موتیوں کے بجائے انگارے ہاتھ میں اُٹھا لئے تو یہ یقین ہو جائے گا کہ یہ کام کسی عقل و شعور سے نہیں کیا گیا کیونکہ کوئی عقل والا انسان آگ کو ہاتھ میں نہیں اُٹھا سکتا (فرعون نے اس آزمائش کو مان لیا) دو انگارے اور دو موتی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کئے تو موسیٰ علیہ السلام نے انگارے اُٹھا لئے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے کہ جبرئیل امین نے اُن کا ہاتھ انگاروں کی طرف پھیر دیا) فرعون نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً اُن کے ہاتھ سے انگارے چھین لئے کہ اُن کا ہاتھ نہ جل جائے (اب تو اہلیہ فرعون کی بات بن گئی) اُس نے کہا کہ آپ نے واقعہ کی حقیقت کو دیکھ لیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے پھر یہ موت

موسیٰ علیہ السلام سے ٹلا دی کیونکہ قدرتِ خداوندی کو ان سے آگے کام لینا تھا۔

(حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی طرح فرعون کے شاہانہ اعزاز واکرام اور شاہانہ خرچ پر اپنی والدہ کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے یہاں تک کہ جوان ہوگئے)۔

اُن کے شاہی اکرام واعزاز کو دیکھ کر فرعون کے لوگوں کو بنی اسرائیل پر وہ ظلم وجور اور تذلیل وتوہین کرنے کی ہمت نہ رہی جو اس سے پہلے آلِ فرعون کی طرف سے ہمیشہ بنی اسرائیل پر ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام شہر کے کسی گوشہ میں چل رہے تھے تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں جن میں سے ایک فرعونی ہے اور دوسرا اسرائیلی۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر امداد کے لئے پکارا۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی آدمی کی جسارت پر بہت غصہ آگیا کہ اس نے شاہی دربار میں موسیٰ علیہ السلام کے اعزاز واکرام کو جانتے ہوئے اسرائیلی کو اُن کے سامنے پکڑ رکھا ہے جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اسرائیلیوں کی حفاظت کرتے ہیں اور لوگوں کو تو صرف یہی معلوم تھا کہ ان کا تعلق اسرائیلی لوگوں سے صرف رضاعت اور دودھ پینے کی وجہ سے ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی والدہ یا کسی اور ذریعہ سے یہ معلوم کرا دیا ہو کہ یہ اپنی دودھ پلانے والی عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور اسرائیلی ہیں۔

غرض موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آکر اس فرعونی کے ایک مُکّا رسید کیا جس کو وہ برداشت نہ کرسکا اور وہیں مر گیا مگر اتفاق سے وہاں کوئی اور آدمی موسیٰ علیہ السلام اور ان دونوں لڑنے والوں کے سوا موجود نہیں تھا، فرعونی تو قتل ہوگیا اسرائیلی اپنا آدمی تھا اس سے اس کا اندیشہ نہ تھا کہ یہ مخبری کردے گا۔

جب یہ فرعونی موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (القصص) یعنی یہ کام شیطان کی طرف سے ہوا ہے وہ کھلا دشمن گمراہ کرنے والا ہے (پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی) رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (القصص) یعنی اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا (کہ یہ خطاءِ قتلِ فرعونی کی مجھ سے سرزد ہوگئی) مجھے معاف فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا کیونکہ وہ ہی بہت معاف کرنے والا اور بہت رحمت کرنے والا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ کے بعد خوف وہراس کے عالم میں یہ خبریں دریافت کرتے رہے (کہ اس کے قتل پر آلِ فرعون کا ردِعمل کیا ہوا اور دربارِ فرعون تک یہ معاملہ پہنچا یا نہیں) معلوم ہوا کہ معاملہ فرعون تک اس عنوان سے پہنچا کہ کسی اسرائیلی نے آلِ فرعون کے ایک آدمی کو قتل کردیا ہے اس لئے اسرائیلیوں سے اس کا انتقام لیا جائے۔ اس معاملے میں ان کے ساتھ کوئی ڈھیل کا معاملہ نہ کیا جائے۔ فرعون نے جواب دیا کہ اس کے قاتل کو متعین کرکے مع شہادت کے پیش کرو۔ کیونکہ بادشاہ اگرچہ تمہارا ہی ہے مگر اُس کے لئے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ بغیر شہادت وثبوت کے کسی سے قصاص لے

لے۔ تم اس کے قاتل کو تلاش کرو اور ثبوت مہیا کرو میں ضرور تمہارا انتقام بصورتِ قصاص اُس سے لوں گا۔ آلِ فرعون کے لوگ یہ سُن کر گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے لگے کہ کہیں اس کے قتل کرنے والے کا سراغ مل جائے مگر ان کو کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

اچانک یہ واقعہ پیش آیا کہ اگلے روز موسیٰ علیہ السلام گھر سے نکلے تو اُسی اسرائیلی کو دیکھا کہ کسی دوسرے فرعونی شخص سے مقاتلہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور پھر اس اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لئے پکارا مگر موسیٰ علیہ السلام کل کے واقعہ پر ہی نادم ہو رہے تھے اور اس وقت اسی اسرائیلی کو پھر لڑتے ہوئے دیکھ کر اس پر ناراض ہوئے (کہ خطا اسی کی معلوم ہوتی ہے یہ جھگڑالو آدمی ہے اور لڑتا ہی رہتا ہے) مگر اس کے باوجود موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ فرعونی شخص کو اس پر حملہ کرنے سے روکیں لیکن اسرائیلی کو بھی بطور تنبیہ کے کہنے لگے تُو نے کل بھی جھگڑا کیا تھا آج پھر لڑ رہا ہے تو ہی ظالم ہے۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ آج بھی اُسی طرح غصّے میں ہیں جیسے کل تھے تو اُس کو موسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ سے یہ شبہ ہو گیا کہ یہ آج مجھے ہی قتل کر دیں گے تو فوراً بول اُٹھا کہ اے موسیٰ! کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو جیسے کل تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔

یہ باتیں ہونے کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر فرعونی شخص نے آلِ فرعون کے اُن لوگوں کو جو کل کے قاتل کی تلاش میں تھے جا کر یہ خبر پہنچا دی کہ خود اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا ہے کہ تم نے کل ایک آدمی قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر دربار فرعون تک فوراً پہنچائی گئی۔ فرعون نے اپنے سپاہی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے بھیج دیئے۔ یہ سپاہی جانتے تھے کہ وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے۔ اطمینان کے ساتھ شہر کی بڑی سڑک سے موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں نکلے۔ اس طرف ایک شخص کو موسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں سے جو شہر کے کسی بعید حصہ میں رہتا تھا اس کی خبر لگ گئی کہ فرعونی سپاہی موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں بغرض قتل نکل چکے ہیں اس نے کسی گلی کوچے کے چھوٹے راستہ سے آگے پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی۔

یہاں پہنچ کر پھر ابن عباسؓ نے ابنِ جُبیر کو خطاب کیا کہ اے ابن جُبیر یہ (پانچواں) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ موت سر پر آ چکی تھی اللہ نے اُس سے نجات کا سامان کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ خبر سن کر فوراً شہر سے نکل گئے اور مَدْیَنْ کی طرف رُخ پھر گیا۔ یہ آج تک شاہی ناز و نعمت میں پلے تھے کبھی محنت و مشقت کا نام نہ آیا تھا، مصر سے نکل کھڑے ہوئے مگر راستہ بھی کہیں کا نہ جانتے تھے مگر اپنے ربّ پر بھروسہ تھا کہ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۲۲﴾ (القصص) یعنی اُمید ہے کہ میرا ربّ مجھے راستہ دکھائے گا۔ جب شہر مَدْیَنْ کے قریب پہنچے تو شہر سے باہر ایک کنویں پر لوگوں کا اجتماع دیکھا جو اُس پر اپنے جانوروں کو پانی

پلا رہے تھے۔ اور دیکھا کہ دو عورتیں اپنی بکریوں کو سمیٹے ہوئے الگ کھڑی ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا کہ تم الگ کیوں کھڑی ہو؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم ان سب لوگوں سے مزاحمت اور مقابلہ کریں اس لئے ہم اس انتظار میں ہیں کہ جب یہ سب لوگ فارغ ہو جائیں تو جو کچھ بچا ہوا پانی مل جائے گا اُس سے ہم اپنا کام نکالیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اُن کی شرافت دیکھ کر خود اُن کے لئے کنویں سے پانی نکالنا شروع کر دیا اللہ تعالیٰ نے قوت وطاقت بخشی تھی بڑی جلدی اُن کی بکریوں کو سیراب کر دیا۔ یہ عورتیں اپنی بکریاں لے کر اپنے گھر گئیں اور موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے سایہ میں چلے گئے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿٢٤﴾ (القصص) یعنی اے میرے پروردگار میں محتاج ہوں اس نعمت کا جو آپ میری طرف بھیجیں (مطلب یہ تھا کہ کھانے کا اور ٹھکانہ کا کوئی انتظام ہو جائے) یہ لڑکیاں جب روزانہ کے وقت سے پہلے بکریوں کو سیراب کر کے گھر پہنچیں تو اُن کے والد کو تعجب ہوا اور فرمایا آج تو کوئی نئی بات ہے، لڑکیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے پانی کھینچنے اور پلانے کا قصہ والد کو سنا دیا۔ والد نے ان میں سے ایک کو حکم دیا کہ جس شخص نے یہ احسان کیا ہے اس کو یہاں بُلا لاؤ، وہ بُلا لائی، والد نے موسیٰ علیہ السلام سے اُن کے حالات دریافت کئے اور فرمایا لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿٢٥﴾ (القصص) یعنی اب آپ خوف وہراس اپنے دل سے نکال دیجئے، آپ ظالموں کے ہاتھ سے نجات پا چکے ہیں، ہم نہ فرعون کی سلطنت میں ہیں نہ اس کا ہم پر کچھ حکم چل سکتا ہے۔

اب ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے اپنے والد سے کہا یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿٢٦﴾ (القصص) یعنی ابا جان، ان کو آپ ملازم رکھ لیجئے کیونکہ ملازمت کے لئے بہترین آدمی وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔ والد کو اپنی لڑکی سے یہ بات سن کر غیرت سی آئی کہ میری لڑکی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ قوی بھی ہیں اور امین بھی۔ اس لئے اس سے سوال کیا کہ تمہیں اُن کی قوت کا اندازہ کیسے ہوا اور اُن کی امانت داری کس بات سے معلوم کی۔ لڑکی نے عرض کیا کہ اُن کی قوت کا مشاہدہ تو اُن کے کنویں سے پانی کھینچنے کے وقت ہوا کہ سب چرواہوں سے پہلے اُنہوں نے اپنا کام کر لیا دوسرا کوئی ان کی برابر نہیں آ سکا اور امانت کا حال اس طرح معلوم ہوا کہ جب اُن کو بُلانے کے لئے گئی اور اوّل نظر میں جب انہوں نے دیکھا کہ میں ایک عورت ہوں تو فوراً اپنا سر نیچا کر لیا اور اس وقت تک سر نہیں اُٹھایا جب تک کہ میں نے ان کو آپ کا پیغام نہیں پہنچا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلو مگر مجھے اپنے گھر کا راستہ پیچھے سے بتلاتی رہو اور یہ بات صرف وہی مرد کر سکتا ہے جو امانتدار ہو۔ والد کو لڑکی کی اس دانشمندانہ بات سے مسرّت ہوئی اور اس کی تصدیق فرمائی اور خود بھی ان کے بارے میں قوت وامانت کا یقین ہو گیا۔ اُس وقت لڑکیوں کے والد نے (جو اللہ

کے رسول حضرت شعیب علیہ السلام تھے) موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو یہ منظور ہے کہ میں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح آپ سے کردوں جس کی شرط یہ ہوگی کہ آپ آٹھ سال تک ہمارے یہاں مزدوری کریں، اور اگر آپ دس سال پورے کر دیں تو اپنے اختیار سے کر دیں بہتر ہوگا مگر ہم یہ پابندی آپ پر عائد نہیں کرتے تاکہ آپ پر زیادہ مشقت نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو منظور فرمالیا جس کی رُو سے موسیٰ علیہ السلام پر صرف آٹھ سال کی خدمت بطور معاہدہ کے لازم ہوگئی باقی دو سال کا وعدہ اختیاری رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے وہ وعدہ بھی پورا کرا کر دس سال پورے کرا دیئے۔

سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک نصرانی عالم مجھے ملا، اُس نے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میعادوں میں سے کونسی میعاد پوری فرمائی؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ اس وقت تک ابن عباسؓ کی یہ حدیث مجھے معلوم نہ تھی۔ اس کے بعد میں ابنِ عباسؓ سے ملا اُن سے سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آٹھ سال کی میعاد پورا کرنا تو موسیٰ پر واجب تھا اس میں کچھ کمی کرنے کا تو احتمال ہی نہیں اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کا اختیاری وعدہ بھی پورا ہی کرنا منظور تھا اس لئے دس سال کی میعاد پوری کی۔ اس کے بعد میں اس نصرانی عالم سے ملا اور اس کو یہ خبر دی تو اُس نے کہا کہ تم نے جس شخص سے یہ بات دریافت کی ہے کیا وہ تم سے زیادہ علم والے ہیں، میں نے کہا کہ بیشک وہ بہت بڑے عالم اور ہم سب سے افضل ہیں۔

(دس سال کی میعاد خدمت پوری کرنے کے بعد جب) حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر شعیب علیہ السلام کے وطن مَدْیَنْ سے رخصت ہوئے، راستہ میں سخت سردی اندھیری رات، راستہ نامعلوم، بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اچانک کوہ طور پر آگ دیکھنے پھر وہاں جانے اور حیرت انگیز مناظر کے بعد معجزہ عصا و ید بیضاء اور اس کے ساتھ منصبِ نبوّت و رسالت عطا ہونے کے بعد (جس کا پورا قصہ قرآن میں اُوپر گزر چکا ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ فکر ہوئی کہ میں فرعونی دربار کا ایک مفرور ملزم قرار دیا گیا ہوں مجھ سے قبطی کا قصاص لینے کا حکم وہاں سے ہو چکا ہے اب اُس کے پاس دعوتِ رسالت لے کر جانے کا حکم ہوا ہے، نیز اپنی زبان میں لکنت کا عذر بھی سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض پیش کی۔ حق تعالیٰ نے اُن کی فرمائش کے مطابق اُن کے بھائی حضرت ہارون کو شریکِ رسالت بنا کر اُن کے پاس وحی بھیج دی اور یہ حکم دیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شہر مصر سے باہر استقبال کریں۔ اس کے مطابق موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے، ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی دونوں بھائی (حسب الحکم) فرعون کو دعوتِ حق دینے کے لئے اُس کے دربار میں پہنچے کچھ وقت تک تو اُن کو دربار میں حاضری کا موقع نہیں دیا گیا۔ یہ دونوں دروازے پر

ٹھہرے رہے پھر بہت سے پردوں میں گزر کر حاضری کی اجازت ملی اور دونوں نے فرعون سے کہا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (طٰہٰ: ۴۷) یعنی ہم دونوں تیرے رَبّ کی طرف سے قاصد اور پیغامبر ہیں۔ فرعون نے پوچھا فَمَنْ رَّبُّكُمَا (طٰہٰ: ۴۹) (تو بتلاؤ تمہارا رَبّ کون ہے) موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے وہ بات کہی جس کا قرآن نے خود ذکر کر دیا رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝۵۰ (طٰہٰ) اس پر فرعون نے پوچھا کہ پھر تم دونوں کیا چاہتے ہو اور ساتھ ہی قبطی مقتول کا واقعہ ذکر کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجرم ٹھہرایا (اور اپنے گھر میں اُن کی پرورش پانے کا احسان جتلایا) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں باتوں کا وہ جواب دیا جو قرآن میں مذکور ہے (یعنی مقتول کے معاملہ میں تو اپنی خطا اور غلطی کا اعتراف کر کے ناواقفیت کا عذر ظاہر کیا اور گھر میں پرورش پر احسان جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تم نے سارے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اُن پر طرح طرح کے ظلم کر رہے ہو اُسی کے نتیجہ میں یہ نیرنگِ تقدیر میں تمہارے گھر میں پہنچا دیا گیا اور جو کچھ اللّٰہ کو منظور تھا وہ ہو گیا اس میں تمہارا کوئی احسان نہیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو خطاب کر کے پوچھا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اللّٰہ پر ایمان لے آؤ اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر دو۔ فرعون نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ اگر تمہارے پاس رسولِ رَبّ ہونے کی کوئی علامت ہے تو دکھلاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا تو وہ عظیم الشان اژدہے کی شکل میں منہ کھولے ہوئے فرعون کی طرف لپکا۔ فرعون خوفزدہ ہو کر اپنے تخت کے نیچے چھپ گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے پناہ مانگی کہ اس کو روک لیں، موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑ لیا، پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو وہ چمکنے لگا، یہ دوسرا معجزہ فرعون کے سامنے آیا، پھر دوبارہ گریبان میں ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

فرعون نے ہیبت زدہ ہو کر اپنے درباریوں سے مشورہ کیا (کہ تم دیکھ رہے ہو یہ کیا ماجرا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہئے) درباریوں نے متفقہ طور پر کہا کہ (کچھ فکر کی بات نہیں) یہ دونوں جادوگر ہیں اپنے جادو کے ذریعہ تم کو تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں اور تمہارے بہترین دین و مذہب کو (جو اُن کی نظر میں فرعون کی پرستش کرنا تھا) یہ مٹانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی کوئی بات نہ مانیں (اور کوئی فکر نہ کریں) کیونکہ آپ کے ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں، آپ اُن کو بُلا لیجئے وہ اپنے جادو سے ان کے جادو پر غالب آ جائیں گے۔

فرعون نے اپنی مملکت کے سب شہروں میں حکم دے دیا کہ جتنے آدمی جادوگری میں ماہر ہوں وہ سب دربار میں حاضر کر دیئے جائیں، ملک بھر کے جادوگر جمع ہو گئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کہ جس جادوگر سے آپ ہمارا مقابلہ کرانا چاہتے ہیں وہ کیا عمل کرتا ہے، اُس نے بتلایا کہ وہ اپنی لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، جادوگروں نے بڑی بے فکری سے کہا کہ یہ تو

---

[1] ترجمہ: موسیٰ نے کہا کہ ہمارا رَبّ وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر رہنمائی فرمائی۔

کوئی چیز نہیں، لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنا دینے کے جادو کا تو جو کمال ہمیں حاصل ہے اُس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر یہ طے کر دیجئے کہ اگر ہم اس پر غالب آ گئے تو ہمیں کیا ملے گا۔

فرعون نے کہا کہ تم غالب آ گئے تو تم میرے خاندان کا جزء اور مقربین خاص میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہو گے۔

اب جادوگروں نے مقابلہ کا وقت اور جگہ موسیٰ علیہ السلام سے طے کر کے اپنی عید کے دن چاشت کا وقت مقرر کر دیا۔ ابن جُبیرؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ان کا یوم الزینہ (یعنی عید کا دن) جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اُس کے جادوگروں پر فتح عطا فرمائی وہ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ جب سب لوگ ایک وسیع میدان میں مقابلہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تو فرعون کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ (الشعراء) یعنی ہمیں یہاں ضرور رہنا چاہئے تاکہ یہ ساحر یعنی موسیٰ وہارون اگر غالب آ جائیں تو ہم بھی ان پر ایمان لے آئیں، اُن کی یہ گفتگو ان حضرات کے ساتھ استہزاء و مذاق کے طور پر تھی (اُن کا یقین تھا کہ یہ ہمارے جادوگروں پر غالب نہیں آ سکیں گے)۔

میدانِ مقابلہ مکمل آراستہ ہو گیا تو جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا کہ پہلے آپ کچھ ڈالیں (یعنی اپنا سحر دکھلائیں) یا ہم پہلے ڈال کر ابتدا کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ تم ہی پہل کرو، اپنا جادو دِکھلاؤ۔ ان لوگوں نے اپنی لاٹھیاں اور کچھ رسیاں زمین پر یہ کہتے ہوئے ڈال دیں بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ (الشعراء) یعنی بطفیل فرعون، ہم ہی غالب آئیں گے (یہ لاٹھیاں اور رسیاں دیکھنے میں سانپ بن کر چلنے لگیں) یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام پر ایک خوف طاری ہوا فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ [1] (طٰہٰ)

یہ خوف طبعی بھی ہو سکتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے، انبیاء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خوف اس بات کا ہو کہ اب اسلام کی دعوت جس کو میں لے کر آیا ہوں اس میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ ایک بڑا اژدہا بن گیا جس کا منہ کھلا ہوا تھا، اس اژدہے نے اُن تمام سانپوں کو نگل لیا جو جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں کے بنائے تھے۔

فرعونی جادوگر جادو کے فن کے ماہر تھے یہ ماجرا دیکھ کر اُن کو یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی عصا کا یہ اژدہا جادو سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ہے، اس لئے جادوگروں نے اُسی وقت اعلان کر دیا کہ ہم اللہ پر اور موسیٰ علیہ السلام کے

---

[1] ترجمہ: سو موسیٰ کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا۔

لائے ہوئے دین پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے پچھلے خیالات وعقائد سے توبہ کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کی کمر توڑ دی اور اُنہوں نے جو جال پھیلایا تھا وہ سب باطل ہوگیا فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (الاعراف) فرعون اور اس کے ساتھی مغلوب ہوگئے اور ذلت ورُسوائی کے ساتھ اس میدان سے پسپا ہوئے۔

جس وقت یہ مقابلہ ہورہا تھا فرعون کی بیوی آسیہ پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر اللہ تعالیٰ سے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کے لئے دُعا مانگ رہی تھی اور آلِ فرعون کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ یہ فرعون کی وجہ سے پریشان حال ہیں اُس کے لئے دُعا مانگ رہی ہیں حالانکہ اُن کا غم وفکر سارا موسیٰ علیہ السلام کے لئے تھا (اور اُنہیں کے غالب آنے کی دُعا مانگ رہی تھیں)۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوئی معجزہ دکھاتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر حجت تمام ہوجاتی تو اُسی وقت وعدہ کرلیتا تھا کہ اب میں بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیج دوں گا مگر جب موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے وہ عذاب کا خطرہ ٹل جاتا تو اپنے وعدہ سے پھر جاتا تھا اور یہ کہہ دیتا تھا کہ کیا آپ کا رَبّ کوئی اور بھی نشانی دکھا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا بالآخر اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون پر طوفان اور ٹڈی دَل اور کپڑوں میں جُوئیں اور برتنوں اور کھانے میں مینڈکوں اور خُون وغیرہ کے عذاب مسلط کردیئے، جن کو قرآن میں آیات مفصّلات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فرعون کا حال یہ تھا کہ جب اُن میں سے کوئی عذاب آتا اور اُس سے عاجز ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتا کہ کسی طرح یہ عذاب ہٹا دیجئے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کردیں گے پھر جب عذاب ٹل جاتا تو پھر بدعہدی کرتا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیدیا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سب کو لے کر رات کے وقت شہر سے نکل گئے فرعون نے جب صبح کو دیکھا کہ یہ سب لوگ چلے گئے تو اپنی فوج تمام اطراف سے جمع کر کے اُن کے تعاقب میں چھوڑ دی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے اُس دریا کو جو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے راستہ میں تھا یہ حکم دیدیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تجھ پر لاٹھی ماریں تو دریا میں بارہ راستے بَن جانے چاہئیں۔ جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل الگ الگ گزر سکیں۔ اور جب یہ گزر جائیں تو اُن کے تعاقب میں آنے والوں پر یہ دریا کے بارہ حصے پھر مِل جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب دریا کے قریب پہنچے تو یہ یاد نہ رہا کہ لاٹھی مارنے سے دریا میں راستے پیدا ہوں گے اور اُن کی قوم نے اُن سے فریاد کی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ (الشعراء) یعنی ہم تو پکڑ لئے گئے (کیونکہ پیچھے سے فرعونی فوجوں کو آتا دیکھ رہے تھے اور آگے یہ دریا حائل تھا) اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ یاد آیا کہ دریا پر لاٹھی مارنے سے اس میں راستے پیدا ہوجائیں گے اور فوراً دریا پر اپنی لاٹھی ماری۔ یہ وہ وقت تھا کہ بنی اسرائیل کے پچھلے حصوں سے فرعونی افواج کے اگلے حصے تقریباً مل چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے دریا کے الگ الگ ٹکڑے ہوکر وعدہ ربانی کے مطابق بارہ راستے بن گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے۔ فرعونی افواج جو اُن کے

تعاقب میں تھی اُنہوں نے دریا میں راستے دیکھ کر اُن کے تعاقب میں اپنے گھوڑے اور پیادے ڈال دیئے تو دریا کے یہ مختلف ٹکڑے بامرِ ربانی پھر آپس میں مِل گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو اُن کے اصحاب نے کہا کہ ہمیں یہ خطرہ ہے کہ فرعون اُن کے ساتھ غرق نہ ہوا ہو اور اُس نے اپنے آپ کو بچا لیا ہو تو موسیٰ علیہ السلام نے دُعاء فرمائی کہ فرعون کی ہلاکت ہم پر ظاہر کردے قدرتِ حق نے فرعون کی مُردہ لاش کو دریا سے باہر پھینک دیا اور سب نے اس کی ہلاکت کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا۔

اس کے بعد یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آگے چلے تو راستہ میں ان کا گزر ایک قوم پر ہوا جو اپنے بنائے ہوئے بتوں کی عبادت اور پرستش کر رہے تھے، تو یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ (الاعراف) یعنی اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسے انہوں نے بہت سے معبود بنا رکھے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم عجیب قوم ہو کہ ایسی جہالت کی باتیں کرتے ہو، یہ جو لوگ جو بتوں کی عبادت میں مشغول ہیں ان کی عبادت برباد ہونے والی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا) کہ تم اپنے پروردگار کے اتنے معجزات اور اپنے اوپر انعامات دیکھ چکے ہو پھر بھی تمہارے یہ جاہلانہ خیالات نہیں بدلے۔ یہ کہہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنے اُن ساتھیوں کے یہاں سے آگے بڑھے اور ایک مقام پر جا کر اُن کو ٹھہرا دیا اور فرمایا تم سب یہاں ٹھہرو، میں اپنے رَبّ کے پاس جاتا ہوں، تیس دن کے بعد واپس آجاؤں گا اور میرے پیچھے ہارون علیہ السلام میرے نائب وخلیفہ رہیں گے ہر کام میں اُن کی اطاعت کرنا۔

موسیٰ علیہ السلام ان سے رُخصت ہو کر کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور (اشارۂ ربانی سے) تیس دن رات کا مسلسل روزہ رکھا تاکہ اس کے بعد کلامِ ربّانی سے مستفید ہوسکیں مگر تیس دن رات کے مسلسل روزہ سے جو ایک قسم کی بُو روزہ دار کے منہ میں ہوجاتی ہے یہ فکر ہوئی کہ اس بُو کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شرفِ ہم کلامی نامناسب ہے تو پہاڑی گھاس کے ذریعہ مسواک کرکے منہ صاف کرلیا۔ جب بارگاہِ حق میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ تم نے افطار کیوں کرلیا (اور اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کھایا پیا نہیں بلکہ صرف منہ صاف کرلینے کو پیغمبرانہ امتیاز کی بنا پر افطار کرنے سے تعبیر فرمایا) موسیٰ علیہ السلام نے اس حقیقت کو سمجھ کر عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھے یہ خیال ہوا کہ آپ سے ہم کلام ہونے کے لئے منہ کی بُو دُور کرکے صاف کرلوں۔ حکم ہوا کہ موسیٰ کیا تمہیں خبر نہیں کہ روزہ دار کے منہ کی بُو ہمارے نزدیک مُشک کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے، اب آپ لَوٹ جایئے اور دس دن مزید روزے رکھئے پھر ہمارے پاس آیئے موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔

ادھر جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے دیکھا کہ مقررہ مدت تیس روز گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام واپس

نہیں آئے تو اُن کو یہ بات ناگوار ہوئی، ادھر حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے رخصت ہونے کے بعد اپنی قوم میں ایک خطبہ دیا کہ قوم فرعون کے لوگوں کی بہت سی چیزیں جو تم نے عاریۃً مانگ رکھی تھی یا اُنہوں نے تمہارے پاس ودیعت (امانت) رکھوا رکھی تھی وہ سب تم اپنے ساتھ لے آئے ہو اگرچہ تمہاری بھی بہت سی چیزیں قوم فرعون کے پاس عاریت اور ودیعت کی تھیں اور آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اُن کی یہ چیزیں ہماری چیزوں کے معاوضہ میں ہم نے رکھ لی ہیں مگر میں اس کو حلال نہیں سمجھتا کہ اُن کی عاریت اور ودیعت کا سامان تم اپنے استعمال میں لاؤ اور ہم اس کو واپس بھی نہیں کر سکتے اس لئے ایک گڑھا کھودوا کر سب کو حکم دیا کہ یہ چیزیں خواہ زیورات ہوں یا دوسری استعمالی اشیاء سب اس گڑھے میں ڈال دو (ان لوگوں نے اس کی تعمیل کی) ہارون علیہ السلام نے اس سارے سامان کے اوپر آگ جلوادی جس سے یہ سب سامان جل گیا اور فرمایا کہ اب یہ نہ ہمارا رہا نہ اُن کا۔

اُن کے ساتھ ایک شخص سامری ایک ایسی قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھا مگر جب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو یہ بھی اُن کے ساتھ ہولیا، اس کو یہ عجیب اتفاق پیش آیا کہ اس نے (جبریل علیہ السلام) کا ایک اثر دیکھا (یعنی جہاں اُن کا قدم پڑتا ہے اُس میں زندگی اور نمو پیدا ہو جاتا ہے) اس نے اُس جگہ سے ایک مُٹھی مٹی کو اُٹھالیا، اس کو ہاتھ میں لئے ہوئے آرہا تھا کہ ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، ہارون علیہ السلام نے خیال کیا کہ اس کی مٹھی میں کوئی فرعونی زیور وغیرہ ہے اس سے کہا کہ جس طرح سب نے اس گڑھے میں ڈالا ہے تم بھی ڈال دو، اس نے کہا یہ تو اُس رسول (جبرئیل) کے نشانِ قدم کی مٹی ہے جس نے تمہیں دریا پار کرایا ہے اور میں اس کو کسی طرح نہ ڈالوں گا بجز اس کے کہ آپ یہ دُعا کریں کہ میں جس مقصد کے لئے ڈالوں وہ مقصد پورا ہو جائے، ہارون علیہ السلام نے دُعا کا وعدہ کرلیا اُس نے وہ مٹھی مٹی کی اس گڑھے میں ڈال دی اور حسبِ وعدہ ہارون علیہ السلام نے دُعا کی کہ یا اللہ جو کچھ سامری چاہتا ہے وہ پورا کر دیجئے، جب وہ دُعا کر چکے تو سامری نے کہا کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ سونا، چاندی، لوہا، پیتل جو کچھ اس گڑھے میں ڈالا گیا ہے ایک گائے کا بچھڑا بن جائے۔ ہارون علیہ السلام دُعا کر چکے تھے اور وہ قبول ہو چکی تھی جو کچھ زیورات اور تانبا پیتل لوہا اس میں ڈالا گیا تھا سب کا ایک بچھڑا بن گیا جس میں کوئی روح تو نہ تھی مگر گائے کی طرح آواز نکالتا تھا۔ حضرت ابنِ عباس نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ واللہ وہ کوئی زندہ آواز نہیں تھی بلکہ ہوا اُس کے پچھلے حصہ سے داخل ہو کر منہ سے نکلتی تھی اُس سے یہ آواز پیدا ہوتی تھی۔

یہ عجیب وغریب قصہ دیکھ کر بنی اسرائیل کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے، ایک فرقہ نے سامری سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اُس نے کہا یہی تمہارا خدا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول کر دوسری طرف چلے گئے۔ ایک فرقہ نے یہ کہا کہ ہم سامری کی اس بات کی اُس وقت تک تکذیب نہیں کر سکتے جب تک موسیٰ علیہ السلام حقیقت حال بتلائیں اگر واقع میں یہی ہمارا خدا

ہے تو ہم اس کی مخالفت کر کے گناہگار نہیں ہوں گے اور یہ خدا نہیں تو ہم موسیٰ علیہ السلام کے قول کی پیروی کریں گے۔

ایک اور فرقہ نے کہا کہ یہ سب شیطانی دھوکہ ہے یہ ہمارا ربّ نہیں ہو سکتا نہ ہم اس پر ایمان لا سکتے ہیں نہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ایک اور فرقہ کے دل میں سامری کی بات اُتر گئی اور اُس نے سامری کی تصدیق کر کے اس کو اپنا خدا مان لیا۔

ہارون علیہ السلام نے یہ فسادِ عظیم دیکھا تو فرمایا یٰقَوۡمِ اِنَّمَا فُتِنۡتُمۡ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحۡمٰنُ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ وَاَطِيۡعُوۡۤا اَمۡرِىۡ ﴿۹۰﴾ (طٰهٰ) یعنی اے میری قوم تم فتنہ میں پڑ گئے ہو بلاشبہ تمہارا ربّ اور خدا تو رحمٰن ہے تم میرا اتباع کرو اور میرا حکم مانو۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ بتلایئے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کو کیا ہوا کہ ہم سے تیس دن کا وعدہ کر کے گئے تھے اور وعدہ خلافی کی یہاں تک کہ اب چالیس دن پورے ہو رہے ہیں۔ اُن کے کچھ بے وقوفوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے ربّ کو بھول گئے۔ اُس کی تلاش میں پھرتے ہوں گے۔

اس طرف جب چالیس روزے پورے کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہم کلامی نصیب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس فتنہ کی خبر دی جس میں اُن کی قوم مبتلا ہوگئی تھی فَرَجَعَ مُوۡسٰۤى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۚ (طٰهٰ:۸۶) موسیٰ علیہ السلام وہاں سے بڑے غصّے میں اور افسوس کی حالت میں واپس آئے اور آکر وہ باتیں فرمائیں جو قرآن میں تم نے پڑھی ہیں۔ وَاَلۡقَى الۡاَلۡوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاۡسِ اَخِيۡهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيۡهِ ؕ (الاعراف:۱۵۰) یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اس غصّے میں اپنے بھائی ہارون کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچے اور الواحِ تورات جو کہ کوہ طور سے ساتھ لائے تھے ہاتھ سے رکھ دیں پھر غصہ فرو ہونے کے بعد بھائی کا عذر صحیح معلوم کر کے اس کو قبول کیا اور اُن کے لئے اللہ سے استغفار کیا، پھر سامری کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ تو نے یہ حرکت کیوں کی، اُس نے جواب دیا فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ (طٰهٰ:۹۶) یعنی میں نے رسول (جبرئیل) کے نشانِ قدم کی مٹی اُٹھالی تھی اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ (یہ جس چیز پر ڈالی جائے گی اُس میں حیات کے آثار پیدا ہو جائیں گے) مگر میں نے تم لوگوں سے اس بات کو چھپائے رکھا فَنَبَذۡتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِىۡ نَفۡسِىۡ ﴿۹۶﴾ (طٰهٰ) یعنی میں نے اس مٹی کو (زیورات وغیرہ کے ڈھیر پر ڈال دیا) میرے نفس نے میرے لئے یہ کام پسندیدہ شکل میں دکھلایا۔ قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ فِى الۡحَيٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ ۖ وَاِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ ۚ وَانۡظُرۡ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِىۡ ظَلۡتَ عَلَيۡهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِى الۡيَمِّ نَسۡفًا ﴿۹۷﴾ (طٰهٰ) یعنی موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو فرمایا کہ جا، اب تیری سزا یہ ہے کہ تو زندگی بھر یہ کہتا پھرے کہ مجھے کوئی مس نہ کرے (ورنہ وہ بھی عذاب میں گرفتار ہو جائے گا) اور تیرے لئے ایک میعاد مقرر ہے جس کے خلاف نہیں ہوگا (کہ زندگی میں تو یہ عذاب چکھتا رہے) اور دیکھ اپنے اُس معبود کو جس کی تو نے پرستش کی ہے ہم اس کو آگ میں جلائیں گے پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہا دیں گے، اگر یہ خدا ہوتا تو ہم کو اس عمل پر قدرت نہ ہوتی۔

اس وقت بنی اسرائیل کو یقین آ گیا کہ ہم فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے اور سب کو اُس جماعت پر غبطہ اور رشک ہونے لگا، جس کی رائے حضرت ہارون کے مطابق تھی (یعنی یہ ہمارا خدا نہیں ہوسکتا) بنی اسرائیل کو اپنے اس گناہِ عظیم پر تنبہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رَبّ سے دُعا کیجئے کہ ہمارے لئے توبہ کا دروازہ کھول دے جس سے ہمارے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کام کے لئے بنی اسرائیل میں سے ستر ایسے صلحاء نیک لوگوں کا انتخاب کیا جو پوری قوم میں نیکی اور صلاح میں ممتاز تھے اور جو اُن کے علم میں گوسالہ پرستی سے بھی دُور رہے تھے اس انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لیا۔ ان ستر منتخب صلحاء بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر کوہِ طور کی طرف چلے تا کہ اللہ تعالیٰ سے ان کی توبہ قبول کرنے کے بارے میں عرض کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے تو زمین میں زلزلہ آیا جس سے موسیٰ علیہ السلام کو بڑی شرمندگی اس وفد کے سامنے ہوئی اور قوم کے سامنے بھی۔ اس لئے عرض کیا رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ (الاعراف: ۱۵۵) یعنی اے میرے پروردگار اگر آپ ان کو ہلاک ہی کرنا چاہتے تھے تو اس وفد میں آنے سے پہلے ہلاک کر دیتے اور مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیتے، کیا آپ ہم سب کو اس لئے ہلاک کرتے ہیں کہ ہم میں کچھ بیوقوفوں نے گناہ کیا ہے۔ اور دراصل وجہ اس زلزلہ کی یہ تھی کہ اس وفد میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحقیق وتفتیش کے باوجود کچھ لوگ اُن میں سے شامل ہو گئے تھے جو پہلے گوسالہ پرستی کر چکے تھے اور اُن کے دِلوں میں گوسالہ کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دُعا وفریاد کے جواب میں ارشاد ہوا وَرَحۡمَتِيۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٍ ؕ فَسَاَكۡتُبُهَا لِلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِاٰيٰتِنَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِيَّ الۡاُمِّيَّ الَّذِيۡ يَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِي التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ ۫ (الاعراف) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری رحمت تو سب کو شامل ہے اور میں عنقریب لکھ دوں گا اپنی رحمت (کا پروانہ) اُن لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اتباع کرتے ہیں اُس رسولِ اُمّی کا جس کا ذکر لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔

یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، اے میرے پروردگار، میں نے آپ سے اپنی قوم کی توبہ کے بارے میں عرض کیا تھا، آپ نے جواب میں رحمت کا عطا فرمانا میری قوم کے علاوہ دوسری قوم کے متعلق ارشاد فرمایا، تو پھر آپ نے میری پیدائش کو مؤخر کیوں نہ کر دیا کہ مجھے بھی اُسی نبی اُمّی کی اُمتِ مرحومہ کے اندر پیدا فرما دیتے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہونے کا ایک طریقہ ارشاد ہوا کہ ان کی توبہ قبول ہونے کی صورت یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے متعلقین میں سے باپ یا بیٹے جس سے ملے اس کو تلوار سے قتل کر دے اُسی جگہ میں جہاں یہ گوسالہ پرستی کا گناہ کیا تھا۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے وہ ساتھی جن کا حال موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھا اور ان کو بے قصور صالح سمجھ کر

ساتھ لیا تھا مگر درحقیقت اُن کے دل میں گوسالہ پرستی کا جذبہ اب تک تھا وہ بھی اپنے دل میں نادم ہو کر تائب ہو گئے اور اُنہوں نے اُس شدید حکم پر عمل کیا جو اُن کی توبہ قبول کرنے کے لئے بطور کفارہ نافذ کیا تھا (یعنی اپنے عزیز و اقارب کا قتل) اور جب اُنہوں نے یہ عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے قاتل و مقتول دونوں کی خطا معاف فرما دی اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی الواح جن کو غصہ میں ہاتھ سے رکھ دیا تھا اُٹھا کر اپنی قوم کو لے کر ارضِ مقدسہ (شام) کی طرف چل دیئے وہاں ایک ایسے شہر پر پہنچے جس پر جبّارین کا قبضہ تھا جن کی شکل وصورت اور قد و قامت بھی ہیبت ناک تھی اُن کے ظلم و جور اور قوت و شوکت کے عجیب و غریب قصے ان سے کہے گئے (موسیٰ علیہ السلام اس شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے مگر بنی اسرائیل پر ان جبّارین کے حالات سن کر رُعب چھا گیا اور) کہنے لگے اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑے جبّار ظالم لوگ ہیں جن کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں اور ہم تو اس شہر میں اُس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک یہ جبّارین وہاں موجود ہیں، ہاں وہ یہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم اُس شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ (المائدۃ: ۲۳) اس روایت کے راویوں میں جو یزید بن ہارون ہے اُس سے پوچھا گیا کہ کیا ابنِ عباسؓ نے اس آیت کی قراءت اسی طرح کی ہے، یزید بن ہارون نے کہا کہ ہاں ابنِ عباسؓ کی قراءت یوں ہی ہے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ سے مراد قوم جبّارین کے دو آدمی ہیں جو اس شہر سے آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، اُنہوں نے بنی اسرائیل پر اپنی قوم کا رعب طاری دیکھ کر کہا کہ ہم اپنی قوم کے حالات سے خوب واقف ہیں تم اُن کے ڈیل ڈول اور اُن کی جسامت اور اُن کی بڑی تعداد سے ڈر رہے ہو حقیقت یہ ہے کہ اُن میں دل (کی قوت) بالکل نہیں اور نہ مقابلہ کرنے کی ہمت ہے تم ذرا شہر کے دروازے تک چلے چلو تو دیکھ لینا کہ (وہ ہتھیار ڈال دیں گے) اور تم ہی اُن پر غالب آؤ گے۔

اور بعض لوگوں نے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ دو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی قوم بنی اسرائیل کے تھے۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ (المائدۃ) یعنی بنی اسرائیل نے ان دونوں آدمیوں کی نصیحت سننے کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب اس بیہودگی کے ساتھ دیا کہ اے موسیٰ! ہم تو اس شہر میں اُس وقت تک ہرگز نہ جائیں گے جب تک جبّارین وہاں موجود ہیں اگر آپ ان کا مقابلہ ہی کرنا چاہتے ہیں تو آپ اور آپ کا ربّ جا کر ان سے لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل پر حق تعالیٰ کے بیشمار انعامات کے ساتھ ہر قدم پر اُن کی سرکشی اور بیہودگی کا مشاہدہ کرتے آ رہے تھے مگر اس وقت تک صبر و تحمل سے کام لیتے رہے، کبھی اُن کے لئے بددُعا نہیں کی اس وقت ان کے اس بیہودہ جواب سے وہ بہت دل شکستہ اور غمگین ہو گئے اور ان کے لئے بددُعا کی، اُن کے حق میں فاسقین کے الفاظ

استعمال فرمائے۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول فرمائی اور اُن کو اللہ تعالیٰ نے بھی فاسقین کا نام دیدیا اور اس زمین مقدس سے ان لوگوں کو چالیس سال کے لئے محروم کردیا اور اس کھلے میدان میں اُن کو ایسا قید کردیا کہ صبح سے شام تک چلتے رہتے تھے کہیں قرار نہ تھا۔ مگر چونکہ اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن کے ساتھ تھے اُن کی برکت اور طفیل سے اس قوم فاسقین پر اس سزا کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں برستی رہیں کہ اس میدان تیہ میں یہ جس طرف چلتے تھے بادل ان کے سروں پر سایہ کردیتا تھا، اُن کے کھانے کے لئے مَنّ وسَلْویٰ نازل ہوتے تھے، اُن کے کپڑے معجزانہ انداز سے نہ میلے ہوتے تھے نہ پھٹتے تھے۔ اور ان کو ایک مربع پتھر عطا فرمادیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیدیا تھا کہ جب اُن کو پانی کی ضرورت ہو تو اس پتھر پر اپنی لاٹھی مارو تو اس میں سے بارہ چشمے جاری ہوجاتے تھے، پتھر کی ہر جانب سے تین چشمے بہنے لگتے تھے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں یہ چشمے متعین کرکے تقسیم کردیئے گئے تھے تاکہ باہم جھگڑا نہ پیدا ہو اور جب بھی یہ لوگ کسی مقام سے سفر کرتے اور پھر کہیں جاکر منزل کرتے تو اس پتھر کو وہیں موجود پاتے تھے۔ (قرطبی)[1]

حضرت ابن عباسؓ نے اس حدیث کو مرفوع کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا ہے اور میرے نزدیک یہ درست ہے کیونکہ حضرت معاویہؓ نے ابنِ عباسؓ کو یہ حدیث روایت کرتے ہوئے سنا تو اس بات کو منکر اور غلط قرار دیا جو اس حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس قبطی کو قتل کیا تھا اور اس کا سراغ قوم فرعون کو نہیں مل رہا تھا تو اُس کی مخبری اُس دوسرے فرعونی شخص نے کی جس سے دوسرے روز یہ اسرائیلی لڑ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس فرعونی کو تو کل کے واقعہ قتل کا علم نہیں تھا وہ اس کی مخبری کیسے کرسکتا تھا اس کی خبر تو صرف اسی لڑنے والے اسرائیلی کو معلوم تھی۔

جب حضرت معاویہؓ نے ان کی حدیث کے اس واقعہ کا انکار کیا تو ابن عباسؓ کو غصہ آیا، اور حضرت معاویہؓ کا ہاتھ پکڑ کر سعد بن مالک زہریؓ کے پاس لے گئے اور اُن سے کہا کہ اے ابواسحاق کیا تمہیں یاد ہے جب ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتیلِ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حدیث بیان فرمائی، اس راز کا افشاء کرنے والا اور فرعون کے پاس مخبری کرنے والا اسرائیلی تھا یا فرعونی۔ سعد بن مالک نے فرمایا کہ فرعونی تھا کیونکہ اُس نے اسرائیلی سے یہ سن لیا تھا کہ کل کا واقعہ قتل موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوا تھا اس نے اس کی شہادت فرعون کے پاس دے دی، امام نسائی نے یہ پوری طویل حدیث اپنی کتاب سنن کبریٰ کی کتاب التفسیر میں نقل فرمائی ہے۔[2]

اور اس پوری حدیث کو ابنِ جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اسی یزید بن ہارون کی

---

[1] تفسیر القرطبی ج: ۱ ص: ۴۲۰، تفسیر سورۃ البقرۃ۔

[2] السنن الکبریٰ للنسائیؒ رقم الحدیث: ۱۱۳۲۶

سند سے نقل کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ ابنِ عباسؓ کا اپنا کلام ہے جس کو انہوں نے کعب بن احبار کی ان اسرائیلی روایات سے لیا ہے جن کے نقل کرنے اور بیان کرنے کو جائز رکھا گیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں اس کلام میں مرفوع حدیث کے جملے بھی شامل ہیں۔ امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں اس پوری حدیث اور اس پر مذکور الصدر تحقیق وتصدیق لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابوالحجاج مِزّی بھی ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی طرح اس روایت کو موقوف، ابن عباسؓ کا کلام قرار دیتے تھے۔ انتہٰی (تفسیر ابن کثیر از ص:۱۴۸ تا ۱۵۳ جلد ۳)

مذکور الصدر قصّہ موسیٰ علیہ السلام سے حاصل شدہ نتائج و عِبَر اور فوائد مہمہ

قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا اس قدر اہتمام فرمایا ہے کہ اکثر سورتوں میں اس کا کچھ نہ کچھ ذکر آہی جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ یہ قصہ ہزاروں عبرتوں اور حکمتوں پر اور خداوند سبحانہٗ وتعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے عجیب مظاہر پر مشتمل ہے جس سے انسان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اس میں عملی اور اخلاقی ہدایتیں بھی بیشمار ہیں چونکہ اس جگہ یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کے ذیل میں آئی ہوئی عبرتوں، نصیحتوں اور ہدایتوں کا کچھ حصہ بھی لکھ دیا جائے:

فرعون کی احمقانہ تدبیر اور اس پر قدرتِ حق کا حیرت انگیز ردِّ عمل

فرعون کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں کوئی لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا تو اسرائیلی لڑکوں کی پیدائش بند کرنے کے لئے قتلِ عام کا حکم دیدیا۔ پھر اپنی ملکی اور ذاتی مصلحت سے ایک سال کے لڑکوں کو باقی رکھنے اور دوسرے سال کے لڑکوں کے قتل کرنے کا فیصلہ نافذ کر دیا اللہ تعالیٰ کو قدرت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس سال میں پیدا کر دیتے جو سال بچوں کو باقی چھوڑنے کا تھا مگر قدرت کو منظور یہ ہوا کہ اس احمق کی اس ظالمانہ تدبیر کو پوری طرح اس پر الٹ دیا جائے اور اس کو خوب بیوقوف بنایا جائے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو اس سال میں پیدا فرمایا جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اور اپنی حکمتِ بالغہ سے صورت ایسی پیدا کر دی کہ موسیٰ علیہ السلام خود اس (جبّار) ظالم کے گھر میں پرورش پائیں، فرعون اور اس کی بیوی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شوق ورغبت سے اپنے گھر میں پالا، سارے شہر کے اسرائیلی لڑکے موسیٰ کے شبہ میں قتل ہو رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام خود فرعون کے گھر میں آرام وآسائش اور عزّت واکرام کے ساتھ اُن کے خرچ پر پرورش پا رہے تھے۔

در بہ بندد دشمن اندر خانہ بود ـــ حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود [1]

---

[1] ترجمہ: دروازہ بند کر دیا حالانکہ دشمن گھر کے اندر ہی تھا، فرعون کا حیلہ اس طرح کا افسانہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر معجزانہ انعام اور فرعونی تدبیر کا ایک اور انتقام

حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر عام بچوں کی طرح کسی انّا کا دودھ قبول کر لیتے تو اُن کی پرورش اپنے دشمن فرعون کے گھر پھر بھی آرام کے ساتھ ہوتی مگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اُن کی جُدائی سے پریشان رہتیں اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی کسی کافر عورت کا دودھ ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کافر عورت کے دودھ سے بھی بچالیا اور اُن کی والدہ کو بھی جدائی کی پریشانی سے نجات دی اور نجات بھی اس طرح کہ فرعون کے گھر والے ان کے ممنونِ احسان ہوئے ان پر ہدایا اور تحفوں کی بارش ہوئی اور اپنے ہی محبوب بچے کو دودھ پلانے پر فرعونی دربار سے معاوضہ بھی ملا اور عام ملازموں کی طرح فرعون کے گھر میں بھی رہنا نہ پڑا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿١٤﴾ [1] (المؤمنون)

صنعت کاروں اور تاجروں وغیرہ کے لئے ایک بشارت

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو صنعت کار اپنی صنعت وحرفت میں نیت نیک ثواب کی رکھے اُس کی مثال موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جیسی ہوجاتی ہے کہ اپنے ہی بچے کو دودھ پلا ئیں اور اس کا دوسروں سے معاوضہ لیں (ابن کثیر) [2] مطلب یہ ہے کہ کوئی معمار مسجد، خانقاہ، مدرسہ یا کوئی رفاہِ عام کا ادارہ تعمیر کرتا ہے اگر اُس کی نیت صرف اپنی مزدوری کرنے اور پیسے کمانے کی ہے تو اس کو صرف وہی ملے گا، اور اگر اُس نے نیت یہ بھی کر لی کہ یہ تعمیرات نیک کاموں میں آئیں گی اُن سے اہلِ دین کو نفع پہنچے گا اس لئے دوسری قسم کی تعمیرات پر اُن کو ترجیح دی تو اس کو اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کی طرح مزدوری بھی ملے گی اور اپنا دینی فائدہ بھی۔

اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو ایک محبوبیت کی شان عطا ہوتی ہے کہ ہر دیکھنے والا اُن سے محبت کرتا ہے

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ (طٰہٰ:٤٠) میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو ایک خاص شان محبوبیت کی عطا فرما دیتے ہیں جن کو دیکھ کر اپنا پرایا، دوست دشمن سب محبت کرنے لگتے ہیں انبیاء علیہم السلام کا تو بڑا مقام ہے بہت سے اولیاء اللہ میں بھی اس محبوبیت کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے۔

---

[1] ترجمہ: سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

[2] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:٥ ص:٢٨٤، ومصنف ابن ابى شيبة، بالفاظ مختلفة رقم الحديث:١٩٥٣٢

فرعونی کافر شخص کا قتل جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ ہو گیا اس کو خطا کس بنا پر قرار دیا گیا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی مسلمان سے ایک فرعونی کافر کو لڑتا ہوا دیکھ کر فرعونی کو مُکّا مارا جس سے وہ مر گیا اُس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود بھی عمل شیطان فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے اس خطا کی معافی طلب کی وہ معاف بھی کر دی گئی۔

مگر یہاں ایک فقہی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرعونی شخص ایک کافر حربی تھا جس سے موسیٰ علیہ السلام کا کوئی معاہدہ صلح بھی نہ تھا نہ اُس کو اہلِ ذمہ کافروں کی فہرست میں داخل کیا جاسکتا ہے جن کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے، یہ تو حربی کافر تھا جس کا حکم اسلامی شریعت میں یہ ہے کہ وہ مباح الدم ہے اس کا قتل کوئی گناہ نہیں، پھر یہاں اس کو عملِ شیطان اور خطا کس بنا پر قرار دیا گیا۔

عام کتبِ تفسیر میں کسی نے اس سوال سے تعرض نہیں کیا۔ احقر جب سیّدی حکیم الاُمت حضرت مولانا تھانویؒ کے حکم سے احکام القرآن کی تصنیف میں مشغول تھا اور اس میں یہ واقعہ زیرِ تحریر آیا تو حضرت نے اس سوال کا جواب یہ دیا تھا کہ اگرچہ اس فرعونی شخص سے براہِ راست کوئی صریح معاہدہ صلح یا ذمہ کا نہیں تھا مگر چونکہ اُس وقت نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکومت تھی نہ اس فرعونی کی، بلکہ دونوں حکومتِ فرعون کے شہری تھے اور ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن تھے یہ ایک قسم کا عملی معاہدہ تھا، فرعونی کے قتل میں اس عملی معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی اس لئے اس کو خطا قرار دیا گیا اور یہ خطا چونکہ قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوگئی اس لئے موسیٰ علیہ السلام کی عصمت نبوّت کے منافی نہیں۔

سیّدی حضرت حکیم الامۃ اسی بنا پر مشترک ہندوستان میں جبکہ مسلمان اور ہندو دونوں انگریز کی حکومت میں رہتے تھے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہ رکھتے تھے کہ وہ کسی ہندو کی جان و مال پر ظلم کرے۔

ضعیفوں کی امداد اور خدمتِ خلق دین و دُنیا کے لئے نافع اور مفید ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہر مَدْیَنْ سے باہر کنویں پر دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے ضعف کی بنا پر اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاسکتی تھیں، یہ عورتیں بالکل اجنبی، اور موسیٰ علیہ السلام ایک مسافر تھے مگر ضعیفوں کی امداد و خدمت مقتضائے شرافت اور اللہ کے نزدیک محبوب عمل تھا اس لئے اُن کے واسطے محنت اُٹھائی اور اُن کی بکریوں کو پانی پلا دیا اس کا اجر و ثواب تو اللہ کے پاس بڑا ہے۔ دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن کے اسی عمل کو مسافرانہ بے کسی اور بے سروسامانی کا ایسا علاج بنا دیا جو اُن کی اگلی زندگی اُن کی شان کے مطابق سنوارنے کا ذریعہ بن گیا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت اور اُن کی دامادی

کا شرف حاصل ہوا، جوان ہونے کے بعد جو کام اُن کی والدہ کو کرنا تھا اللہ تعالیٰ نے غربت کے عالم میں اپنے ایک نبی کے ہاتھ سے انجام دلوایا۔

دو پیغمبروں میں اجیر اور آجر کا معاملہ اور اس کی حکمتیں اور فوائدِ عجیبہ

موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر مہمان ہو کر فرعونی سپاہیوں کے خوف سے مطمئن ہوئے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے صاحبزادی کے مشورہ پر اُن کو اپنے یہاں اجیر رکھنے کا خیال ظاہر فرمایا اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں اور خلق اللہ کے لئے اہم ہدایتیں ہیں۔

اوّل یہ کہ شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی و رسول تھے ایک مسافر غریب الوطن کی اتنی امداد اُن سے کچھ مستبعد نہ تھی کہ کچھ عرصہ اپنے یہاں بلا کسی معاوضہ خدمت کے مہمان رکھ لیتے مگر غالباً اُنہوں نے پیغمبرانہ فراست سے موسیٰ علیہ السلام کا عالی حوصلہ ہونا معلوم کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ دیر تک مہمانی قبول نہ کریں گے اور کسی دوسری جگہ چلے گئے تو اُن کو تکلیف ہوگی اس لئے بے تکلف معاملہ کی صورت اختیار کر لی جس میں دوسروں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ کسی کے گھر جا کر اپنا بار اُس پر ڈالنا شرافت کے خلاف ہے۔

دوسرے اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت و رسالت سے فائز کرنا چاہتے تھے جس کے لئے اگرچہ کوئی مجاہدہ و عمل نہ شرط ہے اور نہ وہ کسی عمل و مجاہدہ کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے وہ تو خالص اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ اور انعام ہوتا ہے مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو بھی مجاہدات اور محنت و مشقت کے دَور سے گزارتے ہیں جو اخلاقِ انسانی کی تکمیل کا ذریعہ اور دوسروں کی اصلاح کا بڑا سبب بنتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اس وقت تک شاہانہ اعزاز و اکرام میں گزری تھی آگے اُن کو خلقِ خدا کے لئے ہادی و رہبر اور ان کا مصلح بننا تھا، حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ اس مزدوری و محنت کے معاہدہ میں اُن کی اخلاقی تربیت کا راز بھی پوشیدہ تھا، عارف شیرازی نے اسی کو کہا ہے ؎

شبانِ وادیٔ ایمن گہے رسد بمراد [1] کہ چند سال بجاں خدمتِ شعیب کند

تیسرے جو خدمت ان سے لی گئی وہ بکریاں چرانے کی تھی، یہ عجیب بات ہے کہ یہ کام اکثر انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا ہے۔ شاید اس میں یہ راز بھی ہو کہ بکری ایسا جانور ہے جو گلّے سے آگے پیچھے بھاگنے کا عادی ہوتا ہے جس پر چَرانے والے کو بار بار غصہ آتا ہے، اس غصہ کے نتیجہ میں اگر وہ اس بھاگنے والی بکری سے قطع نظر کرے تو بکری ہاتھ سے گئی وہ کسی

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت مراد کو پہنچتے ہیں جب چند سال دل سے حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت کرتے ہیں۔

بھیڑیے کا لقمہ بنے گی اور اپنی مرضی کے تابع چلانے کے لئے اس کو مار پیٹ کرے تو وہ کمزور اتنی ہے کہ ذرا چوٹ مار دو تو ٹانگ ٹوٹ جائے اس لئے چرواہے کو بڑے صبر و حلم سے کام لینا پڑتا ہے۔ عام خلق خدا تعالیٰ کا بھی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسا ہی حال ہوتا ہے جس میں انبیاء نہ اُن سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں اور نہ زیادہ تشدد کر کے اُن کو راستہ پر لا سکتے ہیں صبر و حلم ہی کو شیوہ بنانا پڑتا ہے۔

کسی کو کوئی عہدہ اور ملازمت سپرد کرنے کے لئے بہترین دستور العمل

اس قصہ میں شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے جو اپنے والد کو یہ مشورہ دیا کہ ان کو ملازم رکھ لیا جائے۔ اس مشورہ کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ بہترین اجیر وہ شخص ہوسکتا ہے جو قوی بھی ہو، امین بھی۔ قوی سے مراد اس کام کی قوت وصلاحیت والا ہونا ہے جو کام اُس کے سپرد کرنا ہے اور امین سے مراد یہ ہے کہ اُس کی سابقہ زندگی کے حالات اس کی امانت ودیانت پر شاہد ہوں، آج کل مختلف ملازمتوں اور سرکاری وغیرہ سرکاری عہدوں کے لئے انتخاب کا جو اُصول رکھا جاتا ہے اور درخواست گزار میں جن اوصاف کو دیکھا جاتا ہے اگر غور کریں تو سب کے سب ان دو لفظوں میں جمع ہیں بلکہ اُن کے تفصیلی شرائط میں بھی یہ جامعیت عموماً نہیں ہوتی، کیونکہ امانت ودیانت تو کہیں زیرِ غور ہی نہیں آتی۔ صرف علمی قابلیت کی ڈگریاں معیار ہوتی ہیں اور آج کل جہاں کہیں سرکاری وغیر سرکاری اداروں کے نظام میں ابتری پائی جاتی ہے وہ بیشتر اسی اصولِ دیانت کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قابل اور عاقل آدمی جب امانت ودیانت سے کورا ہوتا ہے تو پھر وہ کام چوری اور رشوت خوری کے بھی ایسے ایسے راستے نکال لیتا ہے کہ کسی قانون کی گرفت میں نہ آسکے۔ اسی نے آج دُنیا کے بیشتر سرکاری وغیر سرکاری اداروں کو بیکار بلکہ مضر بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام میں اسی لئے اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے جس کے برکات دُنیا نے صدیوں تک دیکھے ہیں۔

ساحروں اور پیغمبروں کے معاملات میں کُھلا ہوا فرق

فرعون نے جن جادوگروں کو جمع کیا تھا اور پورے ملک وقوم کا خطرہ اُن کے سامنے رکھ کر کام کرنے کو کہا تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ خود اپنا کام سمجھ کر اس خدمت کو دل وجان سے انجام دیتے مگر وہاں ہوا یہ کہ خدمت شروع کرنے سے پہلے سودے بازی شروع کردی کہ ہمیں کیا ملے گا۔

اس کے بالمقابل تمام انبیاء علیہم السلام کا عام اعلان یہ ہوتا ہے وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ (الشعراء: ۱۲۷) یعنی میں تم سے اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، اور انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ ودعوت کے مؤثر ہونے میں اُن کے اس استغناء کا بڑا دخل ہے۔ جب سے علماء دین اہلِ فتویٰ اہلِ خطابت ووعظ کی خدمت کا انتظام اسلامی بیت المال میں نہیں رہا ان کو

اپنی تعلیم اور وعظ و امامت پر تنخواہ لینے کی مجبوری پیش آئی وہ اگرچہ متأخرین فقہاء کے نزدیک بدرجۂ مجبوری جائز قرار دی گئی مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس معاوضہ لینے کا اثر تبلیغ و دعوت اور اصلاحِ خلق پر نہایت بُرا ہوا جس نے اُن کی کوششوں کا فائدہ بہت ہی کم کر دیا۔

فرعونی جادوگروں کے جادو کی حقیقت

ان لوگوں نے اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو بظاہر سانپ بنا کر دکھلایا تھا۔ کیا وہ واقعی سانپ بن گئی تھیں اس کے متعلق الفاظِ قرآن یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی ﴿۶۶﴾ (طٰہٰ) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقۃً سانپ نہیں بنی تھی بلکہ یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس نے خیالات حاضرین پر تصرّف کر کے ایک قسم کی نظر بندی کر دی کہ حاضرین کو وہ چلتے پھرتے سانپ دکھائی دینے لگے۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی جادو سے کسی شئ کی حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان جادوگروں کا جادو تبدیل حقیقت کے درجہ کا نہیں تھا۔

قبائلی تقسیم معاشرتی معاملات کی حد تک کوئی مذموم عمل نہیں

اسلام نے وطنی، لسانی، نسبی، قبائلی تقسیموں کو قومیت کی بنیاد بنانے پر سخت نکیر کیا ہے اور ان تفرقوں کو مٹانے کی ہر قدم ہر کام میں کوشش کی ہے بلکہ اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد ہی اسلام کی دینی قومیت ہے جس میں عربی، عجمی، حبشی، فارسی، ہندی، سندھی سب ایک قوم کے افراد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے لئے سب سے پہلا کام مہاجرین وانصار میں یگانگت اور مواخات قائم کرنے سے شروع فرمایا تھا اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں قیامت تک کے لئے یہ دستور العمل دیدیا تھا کہ علاقائی اور نسبی اور لسانی امتیازات سب بُت ہیں جن کو اسلام نے توڑ ڈالا ہے، لیکن معاشرتی معاملات میں ایک حد تک ان امتیازات کی رعایت کو گوارا کیا گیا ہے کیونکہ کھانے پینے رہنے سہنے کے طریقے مختلف قبائل اور مختلف اوطان کے الگ الگ ہوتے ہیں اُس کے خلاف کرنا تکلیفِ شدید ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جن بنی اسرائیلیوں کو مصر سے ساتھ لے کر نکلے تھے اُن کے بارہ قبیلے تھے، حق تعالیٰ نے ان قبیلوں کے امتیاز کو معاشرتی معاملہ میں جائز رکھا اور دریا میں بھی جو راستے بطور معجزہ پیدا فرمائے تو بارہ راستے الگ الگ ہر قبیلے کے لئے پیدا فرمائے، اسی طرح وادی تیہ میں جس پتھر سے بطور معجزہ پانی کے چشمے جاری ہوتے تھے وہ بھی بارہ ہوتے تھے، تاکہ قبائل میں مزاحمت نہ ہو، ہر ایک قبیلہ اپنا مقررہ پانی حاصل کرے۔ واللہ اعلم

جماعتی انتظام کے لئے خلیفہ اور نائب بنانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ایک مہینے کے لئے اپنی قوم سے الگ ہوکر کوہِ طور پر عبادت میں مشغول ہونا چاہا تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر سب کو ہدایت کی کہ میرے پیچھے سب ان کی اطاعت کرنا تا کہ آپس میں اختلاف ونزاع نہ پھوٹ پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی جماعت یا خاندان کا بڑا اگر کہیں سفر پر جائے تو سنتِ انبیاء یہ ہے کہ کسی کو اپنا قائم مقام خلیفہ بنا جائے جو ان کے نظم وضبط کو قائم رکھے۔

مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ سے بچنے کے لئے بڑی سے بڑی بُرائی کو وقتی طور پر برداشت کیا جاسکتا ہے

بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری کے وقت جو گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹا اور اُن کے تین فرقے ہوگئے حضرت ہارون علیہ السلام نے سب کو دعوتِ حق تو دی مگر اُن میں سے کسی فرقہ سے کُلّی اجتناب اور بیزاری وعلیحدگی کا موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک اعلان نہیں کیا۔ اس پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ناراض ہوئے تو اُنہوں نے یہی عذر پیش کیا کہ میں تشدد کرتا تو بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہوجاتے اُن میں تفرقہ پھیل جاتا، اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ﴿۹۴﴾ (طٰہٰ) یعنی میں نے اس لئے کسی بھی فرقہ سے علیحدگی اور بیزاری کا شدّت سے اظہار نہیں کیا کہ کہیں آپ واپس آکر مجھے یہ الزام نہ دیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کردیا اور میری ہدایت کی پابندی نہیں کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اُن کے عذر کو غلط نہیں قرار دیا بلکہ صحیح تسلیم کرکے اُن کے لئے دُعاواِستغفار کیا۔ اس سے یہ ہدایت نکلتی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ سے بچنے کے لئے وقتی طور پر اگر کسی بُرائی کے معاملے میں نرمی برتی جائے تو دُرست ہے وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔

قصّۂ موسیٰ علیہ السلام کی جو آیات اُوپر لکھی گئی ہیں اُن کے آخر میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو فرعون کی ہدایت کے لئے بھیجنے کا حکم ایک خاص ہدایت کے ساتھ دیا گیا ہے یعنی فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی ﴿۴۴﴾ (طٰہٰ) اس میں۔

پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اُصول

یہ بیان ہوا ہے کہ فریقِ مخالف کتنا ہی سرکش اور غلط سے غلط عقائد وخیالات کا حامل ہو، اصلاح وہدایت کا فریضہ

انجام دینے والوں پر لازم ہے کہ اس کے ساتھ بھی ہمدردانہ خیر خواہانہ انداز سے بات نرم کریں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوسکتا ہے کہ مخاطب کچھ غور و فکر پر مجبور ہوجائے اور اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوجائے۔

فرعون جو خُدائی کا دعویدار جبّار اور ظالم ہے، جو اپنی ذات کی حفاظت کے لئے ہزارہا بنی اسرائیل کے بچّوں کے قتل کا مجرم ہے اُس کی طرف بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص پیغمبروں کو بھیجتے ہیں تو یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں کہ اُس سے بات نرم کریں تاکہ اس کو غور و فکر کا موقع ملے۔ اور یہ اُس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ فرعون اپنی سرکشی سے اور گمراہی سے باز آنے والا نہیں ہے مگر اپنے پیغمبروں کو اس اُصول کا پابند کرنا تھا جس کے ذریعہ خلق خدا سوچنے سمجھنے پر مجبور ہوکر خدا تعالیٰ کے خوف کی طرف آجائے۔ فرعون کو ہدایت ہو یا نہ ہو مگر اصول وہ ہونا چاہئے جو ہدایت و اصلاح کا ذریعہ بن سکے۔

آج کل جو بہت سے اہلِ علم اپنے اِختلافات میں ایک دوسرے کے خلاف زبان درازی اور الزام تراشی کو اسلام کی خدمت سمجھ بیٹھے ہیں اُنہیں اس پر بہت غور کرنا چاہئے۔

قَالَا رَبَّنَآ إِنَّنَا نَخَافُ أَن يَفْرُطَ عَلَيْنَآ أَوْ أَن يَطْغَىٰ ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ

بولے اے رَبّ ہمارے ہم ڈرتے ہیں کہ بھبک پڑے ہم پر یا جوش میں آجائے فرمایا نہ ڈرو

إِنَّنِي مَعَكُمَآ أَسْمَعُ وَأَرَىٰ ﴿٤٦﴾ فَأْتِيَاهُ فَقُولَآ إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ

میں ساتھ ہوں تمہارے سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں سو جاؤ اس کے پاس اور کہو ہم دونوں بھیجے ہوئے ہیں تیرے رَبّ کے

فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَٰكَ بِـَٔايَةٍ

سو بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور مت ستا ان کو ہم آئے ہیں تیرے پاس نشانی لے کر

مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَٰمُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ﴿٤٧﴾ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَآ

تیرے رَبّ کی اور سلامتی ہو اس کی جو مان لے راہ کی بات ہم کو حکم ملا ہے

اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾

کہ عذاب اس پر ہے جو جھٹلائے اور منہ پھیر لے بولا پھر کون ہے رَبّ تم دونوں کا اے موسیٰ

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾

کہا رَبّ ہمارا وہ ہے جس نے دی ہر چیز کو اس کی صورت پھر راہ سجھائی۔

آسان ترجمۂ قرآن

دونوں نے کہا: ''ہمارے پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم پر زیادتی نہ کرے، یا کہیں سرکشی پر آمادہ نہ ہوجائے۔'' ﴿۴۵﴾ اللہ نے فرمایا: ''ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں، سن بھی رہا ہوں، اور دیکھ بھی رہا ہوں۔ ﴿۴۶﴾ اب اُس کے پاس جاؤ، اور کہو کہ ہم دونوں تمہارے رَبّ کے پیغمبر ہیں، اس لئے بنواِسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو، اور انہیں تکلیفیں نہ پہنچاؤ، ہم تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں، اور سلامتی اُسی کے لئے ہے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ ﴿۴۷﴾ ہم پر یہ وحی نازل کی گئی ہے کہ عذاب اُس کو ہوگا جو (حق کو) جھٹلائے، اور منہ موڑے۔'' ﴿۴۸﴾ (یہ ساری باتیں سن کر) فرعون نے کہا: ''موسیٰ! تم دونوں کا رَبّ ہے کون؟'' ﴿۴۹﴾ موسیٰ نے کہا: ''ہمارا رَبّ وہ ہے جس نے ہر چیز کو وہ بناوٹ عطا کی جو اُس کے مناسب تھی، پھر (اس کی) رہنمائی بھی فرمائی۔'' ﴿۵۰﴾

خلاصۂ تفسیر

(جب یہ حکم دونوں صاحبوں کو پہنچ چکا تو) دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار (ہم تبلیغ کے لئے حاضر ہیں لیکن) ہم کو اندیشہ ہے کہ (کہیں) وہ ہم پر (تبلیغ سے پہلے ہی) زیادتی نہ کر بیٹھے (کہ تبلیغ ہی رہ جائے) یا یہ کہ (عین تبلیغ کے وقت اپنے کفر میں) زیادہ شرارت نہ کرنے لگے (کہ اپنی بک بک میں تبلیغ نہ سُنے نہ سننے دے جس سے وہ عدم تبلیغ کے برابر ہوجائے) ارشاد ہوا کہ (اس امر سے مُطلق) اندیشہ نہ کرو (کیونکہ) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا دیکھتا ہوں (میں تمہاری حفاظت کروں گا اور اُس کو مرعوب کردوں گا جس سے پوری تبلیغ کرسکو گے جیسا دوسری آیت میں ہے نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا [1] (القصص: ۳۵)) سوتم (بے خوف وخطر) اس کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار

[1] ترجمہ: ہم تم دونوں کو ایک خاص شوکت عطا کرتے ہیں۔

کے فرستادے ہیں (کہ ہم کو نبی بنا کر بھیجا ہے) سو (تو ہماری اطاعت کر اصلاحِ عقیدہ میں بھی کہ توحید کی تصدیق کر اور اصلاحِ اخلاق میں بھی کہ ظلم وغیرہ سے باز آ اور) بنی اسرائیل کو (جن پر تو ناحق ظلم کرتا ہے اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر کے) ہمارے ساتھ جانے دے (کہ جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں رہیں) اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا (اور) ہم (جو دعویٰ نبوّت کا کرتے ہیں تو خالی خولی نہیں بلکہ ہم) تیرے پاس تیرے رَبّ کی طرف سے (اپنی نبوّت کا) نشان (یعنی معجزہ بھی) لائے ہیں اور (تصدیق اور قبولِ حق کا ثمرہ اس قاعدہ کلیہ سے معلوم ہوگا کہ) ایسے شخص کے لئے (عذاب الٰہی سے) سلامتی ہے جو (سیدھی) راہ پر چلے (اور تکذیب وردِّ حق کے باب میں) ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ (اللہ کا) عذاب (قہر کا) اس شخص پر ہوگا جو (حق کو) جھٹلائے اور (اس سے) روگردانی کرے (غرض یہ سارا مضمون جا کر اس سے کہو چنانچہ دونوں حضرات تشریف لے گئے اور جا کر اس سے سب کہدیا) وہ کہنے لگا کہ پھر (یہ تو بتلاؤ کہ) تم دونوں کا رَبّ کون ہے (جس کے تم اپنے کو فرستادہ بتلاتے ہو) اے موسیٰ (جواب میں) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ ہمارا (دونوں کا بلکہ سب کا) رَبّ وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان میں جو جاندار چیزیں تھیں اُن کو ان کے منافع ومصالح کی طرف) رہنمائی فرمائی (چنانچہ ہر جانور اپنی مناسب غذا اور جوڑہ اور مسکن وغیرہ ڈھونڈ لیتا ہے پس وہی ہمارا بھی رَبّ ہے)۔

معارف ومسائل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خوف کیوں ہوا؟

اِنَّنَا نَخَافُ، حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام نے اس جگہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دو طرح کے خوف کا اظہار کیا۔ ایک اَنْ یَّفْرُطَ کے لفظ سے جس کے اصلی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ شاید فرعون ہماری بات سننے سے پہلے ہی ہم پر حملہ کر دے، دوسرا خوف اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾ کے لفظ سے بیان فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ سرکشی پر اُتر آئے کہ آپ کی شان میں نامناسب کلمات بکنے لگے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتداء کلام میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوّت ورسالت عطا فرمایا گیا اور اُنہوں نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ شریک کرنے کی درخواست کی اور یہ درخواست قبول ہوئی تو اُسی وقت حق تعالیٰ نے اُن کو یہ بتلا دیا تھا کہ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا [1] (القصص: ۳۵)، نیز یہ بھی اطمینان دلا دیا گیا تھا کہ آپ کی درخواست میں جو جو چیزیں طلب کی گئی ہیں وہ سب ہم نے آپ کو دے دیں قَدْ

---

[1] ترجمہ: ہم ابھی تمہارے بھائی کو تمہارا قوتِ بازو بنائے دیتے ہیں اور ہم تم دونوں کو ایک خاص شوکت عطا کرتے ہیں۔

اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ (طٰهٰ)، ان مطلوب چیزوں میں شرح صدر بھی تھا جس کا حاصل یہی تھا کہ مخالف سے کوئی دل تنگی اور خوف وہراس پیدا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے بعد پھر یہ خوف اور اس کا اظہار کیسا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ پہلا وعدہ کہ ہم آپ کو غلبہ عطا کریں گے اور وہ لوگ آپ تک نہ پہنچ سکیں گے یہ ایک مبہم وعدہ ہے کہ مراد غلبہ سے حجت ودلیل کا غلبہ بھی ہوسکتا ہے اور مادی غلبہ بھی۔ نیز یہ خیال بھی ہوسکتا ہے کہ اُن پر غلبہ تو جب ہوگا کہ وہ ان کے دلائل سنیں معجزات دیکھیں مگر خطرہ یہ ہے کہ وہ کلام سننے سے پہلے ہی اُن پر حملہ کر بیٹھے اور شرح صدر کے لئے یہ لازم نہیں کہ طبعی خوف بھی جاتا رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خوف کی چیزوں سے طبعی خوف تو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے جو وعدوں پر پورا ایمان ویقین ہونے کے باوجود بھی ہوتا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ہی لاٹھی کے سانپ بن جانے کے بعد اُس کے پکڑنے سے ڈرنے لگے تو حق تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ (النمل:۱۰)، ڈرو نہیں اور دوسرے تمام مواقع خوف میں ایسا ہی ہوتا رہا کہ طبعی اور بشری خوف لاحق ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے بشارت کے ذریعہ اس کو زائل فرمایا۔ اسی واقعہ کی آیات میں فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ [۱] (القصص:۲۱) اور فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا [۲] (القصص:۱۸) اور فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ [۳] (طٰهٰ) کی آیات اس مضمون پر شاہد ہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء اور سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بشری خوف کی وجہ سے مدینہ شریف کی طرف اور کچھ صحابہ کرام نے پہلے حبشہ کی پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ غزوۂ احزاب میں اسی خوف سے بچنے کے لئے خندق کھودی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ نصرت وغلبہ بار بار آچکا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ مواعیدِ ربّانی سے یقین تو ان سب کو پورا حاصل تھا مگر طبعی خوف جو بمقتضائے بشریت انبیاء میں بھی ہوتا ہے وہ اس کے منافی نہیں۔

اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب کچھ سنتا اور دیکھتا رہوں گا۔ معیت سے مراد نصرت وامداد ہے جس کی پوری حقیقت وکیفیت کا ادراک انسان کو نہیں ہوسکتا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوتِ ایمان کے ساتھ اپنی قوم کو معاشی مصیبت سے بھی چھڑانے کی دعوت دی

اُس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام، جیسے خلقِ خُدا کو ہدایت ایمان دینے کا منصب رکھتے ہیں اسی طرح اپنی اُمت کو دُنیوی اور معاشی مصائب سے آزاد کرنا بھی اُن کے منصب میں شامل ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ

---

[۱] ترجمہ: پس موسیٰ وہاں سے نکل گئے خوف اور وحشت کی حالت میں۔ [۲] ترجمہ: پھر موسیٰ کو شہر میں صبح ہوئی خوف اور وحشت کی حالت میں۔

[۳] ترجمہ: سو موسیٰ کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا۔

علیہ السلام کی دعوتِ فرعون میں دونوں چیزیں شامل ہیں اوّل اللہ پر ایمان، دوسرے بنی اسرائیل کی آزادی۔ خصوصاً اس آیتِ مذکورہ میں تو صرف اسی دوسرے جزء کے ذکر پر اکتفاء فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور پھر ہر ایک کے وجود کے مناسب اس کو ہدایت فرمائی جس سے وہ اس کام میں لگ گئی

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک ہدایت جو انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اور فرضِ منصبی ہے وہ تو خاص ہدایت ہے جس کے مخاطب اہلِ عقول انسان اور جنّات ہی ہوتے ہیں۔ ایک دوسری قسم کی تکوینی ہدایت بھی ہے جو مخلوقات میں ہر چیز کے لئے عام اور شامل ہے۔ آگ، پانی، مٹی اور ہوا اور ان سے مرکب ہونے والی ہر شئی کو حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کا ادراک و شعور دیا ہے جو اگرچہ انسان و جن کی برابر نہیں، اسی لئے احکام حلال و حرام ان چیزوں پر عائد نہیں ہوتے مگر ادراک و شعور سے خالی نہیں، اسی ادراک و شعور کے راستہ حق تعالیٰ نے ہر شئے کو اس کی ہدایت کر دی کہ تو کس کام کے لئے پیدا کی گئی ہے، تجھے کیا کرنا ہے۔ اسی تکوینی حکم اور ہدایت کے تابع زمین و آسمان اور اُن کی تمام مخلوقات اپنے اپنے کام اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں۔ چاند سورج اپنا کام کر رہے ہیں اور دوسرے سیّارے و ثوابت اپنے اپنے کام میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ ایک منٹ یا سیکنڈ کا بھی کبھی فرق نہیں ہوتا۔ ہوا، پانی، آگ اور مٹی اپنی اپنی منشاء پیدائش میں لگے ہوئے اُن سے بغیر حکم ربّانی سرِمُو فرق نہیں کرتے۔ ہاں جب اُن کا حکم ہوتا ہے تو کبھی آگ گلزار بھی بن جاتی ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے، اور کبھی پانی آگ کا بھی کام کرنے لگتا ہے جیسے قوم نوح کے لئے اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا[1] (نوح:۲۵) بچہ کو ابتداء پیدائش کے وقت جبکہ اس کو کوئی بات سکھانا کسی کے بس میں نہیں یہ کس نے سکھایا کہ ماں کی چھاتی سے اپنی غذا حاصل کرے، اس کے لئے چھاتی کو دبا کر چُوسنے کا ہنر کس نے بتلایا، بُھوک پیاس سردی گرمی کی تکلیف ہو تو رو پڑنا اُس کی ساری ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ مگر یہ رونا کس نے سکھایا؟ یہ وہی ہدایتِ ربّانی ہے جو ہر مخلوق کو اس کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق غیب سے بغیر کسی کی تعلیم کے عطا ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک عام ہدایت تکوینی ہر ہر مخلوق کے لئے ہے جس کی ہر مخلوق تکوینی طور پر پابند ہے اور اس کے خلاف کرنا اس کی قدرت سے خارج ہے، دوسری ہدایتِ خاص اہلِ عقول انسان و جن کے لئے ہے یہ ہدایت تکوینی اور جبری نہیں بلکہ اختیاری ہوتی ہے، اسی اختیار کے نتیجہ میں اُس پر ثواب یا عذاب مرتب ہوتا ہے اَعْطٰی کُلَّ

[1] ترجمہ: وہ غرق کئے گئے پھر دوزخ میں داخل کئے گئے۔

شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ میں پہلی ہی قسم کی ہدایت مذکور ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو سب سے پہلے رَبّ العالمین کا وہ کام بتلایا جو ساری مخلوق پر حاوی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام ہم نے یا کسی دوسرے انسان نے کیا ہے۔ فرعون اس کا تو کوئی جواب نہ دے سکا اب اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹلایا اور ایک سوال موسیٰ علیہ السلام سے کیا کہ جس کا حقیقی جواب عوام سُنیں تو موسیٰ علیہ السلام سے بدگمان ہو جائیں وہ یہ کہ پچھلے دور کی تمام اُمتیں اور اقوامِ عالم جو بُتوں کی پرستش کرتے رہے آپ کے نزدیک اُن کا کیا حکم ہے وہ کیسے ہیں اُن کا انجام کیا ہوا؟ مقصد یہ تھا کہ اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ یہ سب گمراہ اور جہنمی ہیں تو مجھے یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ لو یہ ساری دُنیا ہی کو بیوقوف گمراہ اور جہنمی سمجھتے ہیں اور لوگ یہ سُن کر اُن سے بدگمان ہوں گے تو ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا مگر پیغمبر خدا موسیٰ علیہ السلام نے اس کا ایسا حکیمانہ جواب دیا جس سے اُس کا یہ منصوبہ غلط ہو گیا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰی ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ ۚ

بولا پھر کیا حقیقت ہے اُن پہلی جماعتوں کی کہا اُن کی خبر میرے رَبّ کے پاس لکھی ہوئی ہے

لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَ لَا یَنۡسَی ﴿۵۲﴾ ۫ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّ سَلَکَ لَکُمۡ

نہ بہکتا ہے میرا رَبّ اور نہ بھولتا ہے، وہ ہے جس نے بنا دیا تمہارے واسطے زمین کو بچھونا اور چلائیں تمہارے لئے

فِیۡهَا سُبُلًا وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا

اس میں راہیں اور اُتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اُس سے

مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ کُلُوۡا وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ

طرح طرح کی سبزی کھاؤ اور چراؤ اپنے چوپایوں کو البتہ اس میں نشانیاں ہیں

لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۵۴﴾ ع مِنۡهَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡهَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡهَا نُخۡرِجُکُمۡ

عقل رکھنے والوں کو، اسی زمین سے ہم نے تم کو بنایا اور اسی میں پھر پہنچا دیتے ہیں اور اسی سے نکالیں گے تم کو

تَارَةً أُخْرٰى ۝٥٥ وَلَقَدْ أَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبٰى ۝٥٦ قَالَ أَجِئْتَنَا

دوسری بار اور ہم نے فرعون کو دکھلادیں اپنی سب نشانیاں، پھر اُس نے جھٹلایا اور نہ مانا بولا کیا تو آیا ہے

لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝٥٧ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ

ہم کو نکالنے ہمارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اے موسیٰ سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں ایک ایسا ہی جادو،

فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ أَنْتَ

سو ٹھہرالے ہمارے اور اپنے بیچ میں ایک وعدہ نہ ہم خلاف کریں اُس کا اور نہ تو

مَكَانًا سُوًى ۝٥٨ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَأَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝٥٩

ایک میدان صاف میں، کہا وعدہ تمہارا ہے جشن کا دن اور یہ کہ جمع ہوں لوگ دن چڑھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

فرعون بولا: ''اچھا پھر ان قوموں کا کیا معاملہ ہوا جو پہلے گذر چکی ہیں؟'' ۝٥١ موسیٰ نے کہا: ''ان کا علم میرے رَبّ
کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ میرے رَبّ کو نہ کوئی غلطی لگتی ہے، نہ وہ بھولتا ہے۔'' ۝٥٢ یہ وہ ذات ہے جس نے زمین
کو تمہارے لئے فرش بنا دیا، اور اُس میں تمہارے لئے راستے بنائے، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اُس کے ذریعے
طرح طرح کی مختلف نباتات نکالیں۔ ۝٥٣ خود بھی کھاؤ، اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ۔ یقیناً ان سب باتوں میں عقل والوں
کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ ۝٥٤ اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا، اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے، اور اسی
سے ایک مرتبہ پھر تمہیں نکال لائیں گے۔ ۝٥٥ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اُس (فرعون) کو اپنی ساری نشانیاں دِکھائیں، مگر وہ
جھٹلاتا ہی رہا، اور مان کر نہیں دیا۔ ۝٥٦ کہنے لگا: ''موسیٰ! کیا تم اس لئے آئے ہو کہ اپنے جادو کے ذریعے ہمیں اپنی زمین سے
نکال باہر کرو؟ ۝٥٧ اچھا تو ہم بھی تمہارے سامنے ایسا ہی جادو لا کر رہیں گے۔ اب تم کسی کھلے میدان میں ہمارے اور اپنے
درمیان مقابلے کا ایسا وقت طے کرلو جس کی خلاف ورزی نہ ہم کریں، نہ تم کرو۔'' ۝٥٨ موسیٰ نے کہا: ''تم سے وہ دن طے
ہے جس میں جشن منایا جاتا ہے، اور یہ بھی طے ہے کہ دن چڑھے ہی لوگوں کو جمع کرلیا جائے۔'' ۝٥٩

خلاصۂ تفسیر

فرعون نے (اس پر شبہ کیا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾ (طٰہٰ) اور) کہا کہ اچھا تو پہلے لوگوں کا کیا حال ہوا (جو انبیاء کی تکذیب کرتے تھے اُن پر کون سا عذاب نازل ہوا) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ عذابِ موعود دُنیا ہی میں آنا ضرور ہے بلکہ کبھی دُنیا میں بھی آجاتا ہے اور آخرت میں ضرور ہی ہوگا چنانچہ) ان لوگوں (کی بداعمالیوں) کا علم میرے پروردگار کے پاس دفتر (اعمال) میں (محفوظ) ہے (گو ان کو دفتر کی حاجت نہیں مگر بعض حکمتوں سے ایسا ہی کیا گیا ہے غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال معلوم ہیں اور) میرا ربّ (ایسا جاننے والا ہے کہ) نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے (پس ان کے اعمال کا صحیح صحیح علم اس کو حاصل ہے مگر عذاب کے لئے وقت مقرر کر رکھا ہے جب وہ وقت آئے گا وہ عذاب اُن پر جاری کر دیا جائے گا۔ پس دُنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر و تکذیب علت عذاب کی نہ ہو یہاں تک موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ہو چکی آگے اللہ تعالیٰ اپنی شان ربوبیت کی کچھ تفصیل بیان فرماتے ہیں جس کا ذکر اجمالاً موسیٰ علیہ السلام کے اس کلام میں تھا رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى الخ (طٰہٰ:۵۰) عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ الخ (طٰہٰ:۵۲) لَا يَضِلُّ رَبِّيْ الخ (طٰہٰ:۵۲) چنانچہ ارشاد ہوا کہ) وہ (ربّ) ایسا ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور اس (زمین) میں تمہارے (چلنے کے) واسطے راستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے اقسام مختلفہ کے نباتات پیدا کئے (اور تم کو اجازت دی کہ) خود (بھی) کھاؤ اور اپنے مواشی کو (بھی) چراؤ ان سب (مذکورہ) چیزوں میں اہلِ عقل کے (استدلال کے) واسطے (قدرتِ الٰہیہ کی) نشانیاں ہیں (اور جس طرح نباتات کو زمین سے نکالتے ہیں اسی طرح) ہم نے تم کو اسی زمین سے (ابتدا میں) پیدا کیا، (چنانچہ آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے سو اُن کے واسطے سے سب کا مادہ بعید خاک ہوئی) اور اسی میں ہم تم کو (بعد موت) لے جائیں گے (چنانچہ کوئی مُردہ کسی حالت میں ہو لیکن آخر کو مدتوں کے بعد سہی مگر مٹی میں ضرور ملے گا) اور (قیامت کے روز) پھر دوبارہ، اسی سے ہم تم کو نکال لیں گے (جیسا پہلی بار اس سے پیدا کر چکے ہیں)۔

اور ہم نے اس (فرعون) کو اپنی (وہ) سب ہی نشانیاں دکھلائیں (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھیں) سو وہ (جب بھی) جھٹلایا ہی کیا اور انکار ہی کرتا رہا (اور) کہنے لگا کہ اے موسیٰ! تم ہمارے پاس (یہ دعویٰ لے کر) اس واسطے آئے ہو (گے) کہ ہم کو ہمارے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے نکال باہر کرو (اور خود عوام کو فریفتہ اور تابع بنا کر رئیس بن

جاؤ) سواب ہم بھی تمہارے مقابلے میں ایسا ہی جادو لاتے ہیں تو ہمارے اور اپنے درمیان میں ایک وعدہ مقرر کرلو جس کے نہ ہم خلاف کریں اور نہ تم خلاف کرو کسی ہموار میدان میں (تا کہ سب دیکھ لیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تمہارے (مقابلہ کے) وعدہ کا وقت وہ دن ہے جس میں (تمہارا) میلا ہوتا ہے، اور (جس میں) دن چڑھے لوگ جمع ہو جاتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ میلے کا موقع اکثر ہموار ہی زمین میں ہوتا ہے اسی سے مکان سویٰ کی شرط بھی پوری ہو جائے گی)۔

معارف ومسائل

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ فرعون نے پچھلی اُمتوں کے انجام کا سوال کیا تھا اگر اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام اُن کے گمراہ اور جہنمی ہونے کا صاف طور سے اظہار کرتے تو فرعون کو موقع اس طعن کا مل جاتا کہ یہ تو صرف ہمیں ہی نہیں ساری دُنیا کو گمراہ جہنمی سمجھتے ہیں، اور عوام اس سے شبہ میں پڑ جاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا حکیمانہ جواب دیا کہ بات بھی پوری آگئی اور فرعون کو بہکانے کا موقع نہ ملا۔ فرمایا کہ اُن کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے کہ اُن کا کیا انجام ہوگا، میرا رَبّ نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔ غلطی کرنے سے مراد یہ ہے کہ کرنا کچھ چاہے ہو جائے کچھ اور بھولنے کا مطلب ظاہر ہے۔

اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ ازواج بمعنے انواع واصناف ہے اور شَتّٰى شتیت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں متفرق۔ مراد یہ ہے کہ نباتات کی اتنی بیشمار قسمیں پیدا فرمائیں کہ اُن کی قسموں کا احاطہ بھی انسان نہیں کرسکتا۔ پھر ہر نبات جڑی بوٹی، پھول، پھل، درخت کی چھال میں اللہ تعالیٰ نے ایسی ایسی خاصیتیں رکھی ہیں کہ علم طب اور ڈاکٹری کے ماہرین حیران ہیں اور ہزاروں سال سے اس کی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہونے کے باوجود یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے متعلق جو کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ حرف آخر ہے اور یہ ساری نباتات کی مختلف قسمیں انسان اور اس کے پالتو جانوروں اور جنگلی جانوروں کی غذا یا دوا ہوتی ہیں ان کی لکڑی سے انسان مکانوں کی تعمیر میں کام لیتا ہے۔ اور گھریلو سامانِ استعمال کی ہزاروں قسمیں بناتا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾[1] (المؤمنون)، اسی لئے اس کے آخر میں فرمایا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ یعنی اس میں بہت سی نشانیاں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ہیں عقل والوں کے لئے۔ نُهیٰ، نُهْيَةٌ کی جمع ہے نُهْيَةٌ عقل کو اس لئے کہا جاتا کہ وہ انسان کو بُرے اور مضر کاموں سے روکتی ہے۔

---

[1] ترجمہ: سوکیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

ہر انسان کے خمیر میں نُطفہ کے ساتھ اُس جگہ کی مٹی بھی شامل ہوتی ہے جہاں وہ دفن ہوگا

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ، منہا کی ضمیر زمین کی طرف راجع ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہم نے تم کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا مخاطب اس کے سب انسان ہیں حالانکہ عام انسانوں کی پیدائش مٹی سے نہیں بلکہ نطفہ سے ہوئی بجز آدم علیہ السلام کے کہ اُن کی پیدائش براہِ راست مٹی سے ہوئی تو یہ خطاب یا تو اس بناء پر ہوسکتا ہے کہ انسان کی اصل اور سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں ان کے واسطے سے سب کی تخلیق مٹی کی طرف منسوب کر دینا کچھ بعید نہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر نطفہ مٹی ہی کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے نطفہ سے تخلیق درحقیقت مٹی ہی سے تخلیق ہوگئی۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ الفاظِ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان کی تخلیق مٹی سے ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر انسان کی تخلیق میں حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مٹی شامل فرماتے ہیں اس لئے ہر ایک انسان کی تخلیق کو براہِ راست مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ الفاظ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان کی تخلیق مٹی سے عمل میں آئی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث اس پر شاہد ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان پر رحمِ مادر میں اُس جگہ کی مٹی کا کچھ جزء ڈالا جاتا ہے جس جگہ اُس کا دفن ہونا اللہ کے علم میں مقدر ہے۔[1] یہ حدیث ابونعیم نے ابن سیرین کے تذکرہ میں روایت کر کے فرمایا ہے هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ مِنْ حَدِيْثِ عَوْنٍ لَمْ نَكْتُبْهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عَاصِمِ بْنِ نَبِيْلٍ وَهُوَ اَحَدُ الثِّقَاتِ الْاَعْلَامِ مِنْ اَهْلِ بَصْرَةَ، اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے۔ اور عطاء خراسانی نے فرمایا کہ جب رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے تو جو فرشتہ اس کی تخلیق پر مامور ہے وہ جا کر اُس جگہ کی مٹی لاتا ہے جس جگہ اس کا دفن ہونا مقرر ہے اور یہ مٹی اُس نطفہ میں شامل کر دیتا ہے اس لئے تخلیق نطفہ اور مٹی دونوں سے ہوتی ہے اور اسی آیت سے استدلال کیا مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ۔[2] (قرطبی)

تفسیر مظہری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پیدا ہونے والے بچّے کی ناف میں ایک جزء مٹی کا ڈالا جاتا ہے اور جب مرتا ہے تو اُسی زمین میں دفن ہوتا ہے جہاں کی مٹی اُس کے خمیر میں شامل کی گئی تھی اور فرمایا کہ میں اور ابوبکر و عمر ایک ہی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اُسی میں دفن ہوں گے۔ یہ روایت خطیب نے نقل کر کے فرمایا ہے کہ حدیث غریب ہے اور ابنِ جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار

---

[1] حلية الأولياء ج:۲ ص:۲۸۰

[2] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۱۱ ص:۲۱۰

کیا ہے مگر شیخ محدث میرزا محمد حارثی بدخشیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث کے بہت سے شواہد حضرت ابن عمر، ابن عباس، ابوسعید، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں۔ جن سے اس روایت کو قوت پہنچتی ہے اس لئے یہ حدیث حسن (لغیرہ) سے کم نہیں۔ (مظہری) [1]

مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلہ کے لئے یہ خود تجویز کیا کہ ایسے مقام پر ہونا چاہئے جو آلِ فرعون اور حضرت موسیٰ و بنی اسرائیل کے لئے مسافت کے اعتبار سے برابر ہو تاکہ کسی فریق پر زیادہ دُور جانے کی مشقت نہ پڑے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو قبول کر کے دن اور وقت کی تعیین اس طرح فرما دی مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ یعنی یہ مقابلہ یوم الزینة میں ہونا چاہئے۔ مراد عید یا کسی میلے وغیرہ کے اجتماع کا دن ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ کونسا دن تھا؟ بعض نے کہا کہ آلِ فرعون کی کوئی عید مقرر تھی جس میں وہ زینت کے کپڑے پہن کر شہر سے باہر نکلنے کے عادی تھے، بعض نے کہا کہ وہ نیروز کا دن تھا، کسی نے کہا یوم السبت یعنی ہفتہ کا دن تھا جس کی یہ لوگ تعظیم کرتے تھے، بعض نے کہا کہ وہ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔

فائدہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دن اور وقت کی تعیین میں بڑی حکمت سے کام لیا کہ دن اُن کی عید کا تجویز کیا جس میں سب چھوٹے بڑے ہر طبقے کے لوگوں کا اجتماع پہلے سے متعین تھا جس کا نتیجہ لازمی یہ تھا کہ یہ اجتماع بہت بڑا پورے شہر کے لوگوں پر مشتمل ہو جائے اور وقت ضحیٰ یعنی چاشت کا رکھا جو آفتاب کے بلند ہونے کے بعد ہوتا ہے جس میں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ سب لوگوں کو اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر اس میدان میں آنا آسان ہو۔ دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ وقت روشنی اور ظہور کے اعتبار سے سارے دن میں بہتر ہے ایسے ہی وقت میں دلجمعی اور سکون کے ساتھ اہم کام کئے جاتے ہیں اور ایسے وقت کے اجتماع سے جب لوگ منتشر ہوتے ہیں تو بات دُور دُور تک پھیل جاتی ہے چنانچہ اس روز جب حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی ساحروں پر غلبہ عطا فرمایا تو ایک ہی دن میں پورے شہر میں بلکہ دُور دُور تک اس کی شہرت ہو گئی۔

جادو کی حقیقت اور اس کی اقسام اور شرعی احکام

یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ ہاروت و ماروت کے قصہ میں معارف القرآن جلد اوّل ص:۳۱۸ سے ص:۳۲۵ تک بیان ہو چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

---

[1] تفسیر المظهری ج:۶ ص:۱۴۶ تحت هذه الآية۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ

پھر اُلٹا پھرا فرعون پھر جمع کئے اپنے سارے داؤ، پھر آیا کہا اُن کو موسیٰ نے کم بختی تمہاری

لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾

جھوٹ نہ بولو اللہ پر پھر غارت کردے تم کو کسی آفت سے، اور مراد کو نہیں پہنچا جس نے جھوٹ باندھا

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ

پھر جھگڑے اپنے کام پر آپس میں اور چھپ کر کیا مشورہ بولے مقرر یہ دونوں جادوگر ہیں

يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا

چاہتے ہیں کہ نکال دیں تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور موقوف کرادیں

بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ

تمہارے اچھے خاصے چلن کو سو مقرر کرلو اپنی تدبیر پھر آؤ قطار باندھ کر اور جیت گیا آج

مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ

جو غالب رہا بولے اے موسیٰ یا تو تو ڈال اور یا ہم ہوں

اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ

پہلے ڈالنے والے کہا نہیں تم ڈالو پھر تبھی اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اس کے خیال میں آئیں

مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾

ان کے جادو سے کہ دوڑ رہی ہیں پھر پانے لگا اپنے جی میں ڈر موسیٰ،

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ

ہم نے کہا تو مت ڈر۔ مقرر تو ہی رہے گا غالب اور ڈال جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے کہ نگل جائے جو کچھ اُنہوں نے بنایا،

اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ

اُن کا بنایا ہوا تو فریب ہے جادوگر کا، اور بھلا نہیں ہوتا جادوگر کا جہاں ہو پھر گر پڑے جادوگر

سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ

سجدہ میں بولے ہم یقین لائے ربّ پر ہارون اور موسیٰ کے بولا فرعون تم نے اس کو مان لیا

قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ

میں نے ابھی حکم نہ دیا تھا وہ ہی تمہارا بڑا ہے جس نے سِکھلایا تم کو جادو

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ

سو اب میں کٹواؤں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں اور سولی دوں گا تم کو

فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ

کھجور کے تنہ پر اور جان لوگے ہم میں کس کا عذاب سخت ہے اور دیر تک رہنے والا وہ بولے ہم تجھ کو زیادہ نہ سمجھیں گے

عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ

اس چیز سے جو پہنچی ہم کو صاف دلیل اور اُس سے جس نے ہم کو پیدا کیا سو تو کرگزر جو تجھ کو کرنا ہے

اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ ؕ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا

تو یہی کرے گا اس دُنیا کی زندگی میں ہم یقین لائے ہیں اپنے ربّ پر تاکہ بخشے ہم کو ہمارے گناہ

وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿٧٣﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ

اور جو تو نے زبردستی کروایا ہم سے یہ جادُو اور اللہ بہتر ہے اور سدا باقی رہنے والا بات یہی ہے کہ جو کوئی آیا

رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۗ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿٧٤﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ

اپنے رَبّ کے پاس گناہ لے کر سو اس کے واسطے دوزخ ہے نہ مرے اس میں نہ جئے اور جو آیا اس کے پاس

مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿٧٥﴾

ایمان لے کر نیکیاں کرکر سو اُن لوگوں کے لئے ہیں درجے بلند

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ وَذٰلِكَ

باغ ہیں بسنے کے بہتی ہیں اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہا کریں گے اُن میں اور یہ

جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿٧٦﴾ ع

بدلہ ہے اس کا جو پاک ہوا۔

آسان ترجمۂ قرآن

چنانچہ فرعون (اپنی جگہ) واپس چلا گیا، اور اُس نے اپنی ساری تدبیریں اِکٹھی کیں، پھر (مقابلے کے لئے) آ گیا۔ ﴿٦٠﴾ موسیٰ نے ان (جادوگروں سے) کہا: ''افسوس ہے تم پر! اللہ پر بہتان نہ باندھو، ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمہیں ملیامیٹ کر دے گا، اور جو کوئی بہتان باندھتا ہے، نامراد ہوتا ہے۔'' ﴿٦١﴾ اس پر ان کے درمیان اپنی رائے قائم کرنے میں اختلاف ہو گیا، اور وہ چپکے چپکے سرگوشیاں کرنے لگے۔ ﴿٦٢﴾ (آخرکار) انہوں نے کہا کہ: ''یقینی طور پر یہ دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون) جادوگر ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور پر تم لوگوں کو تمہاری سرزمین سے نکال باہر کریں، اور تمہارے بہترین (دِینی) طریقے کا خاتمہ ہی کر ڈالیں۔ ﴿٦٣﴾ لہٰذا اپنی ساری تدبیریں پختہ کرلو، پھر صف باندھ کر آؤ، اور یقین رکھو کہ آج جو غالب آجائے گا، فلاح اُسی کو حاصل ہوگی۔'' ﴿٦٤﴾ جادوگر بولے: ''موسیٰ! یا تو تم (اپنی لاٹھی پہلے) ڈال

دو، یا پھر ہم ڈالنے میں پہل کریں؟ ﴿۶۵﴾ موسیٰ نے کہا: ”نہیں، تم ہی ڈالو“ بس پھر اچانک ان کی (ڈالی ہوئی) رسیاں اور لاٹھیاں اُن کے جادو کے نتیجے میں موسیٰ کو ایسی محسوس ہونے لگیں جیسے دوڑ رہی ہیں۔ ﴿۶۶﴾ اس پر موسیٰ کو اپنے دِل میں کچھ خوف محسوس ہوا۔ ﴿۶۷﴾ ہم نے کہا: ”ڈرو نہیں، یقین رکھو تم ہی تم سر بلند رہو گے۔ ﴿۶۸﴾ اور جو (لاٹھی) تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے، اُسے (زمین پر) ڈال دو، ان لوگوں نے جو کاریگری کی ہے، وہ اُس سب کو نگل جائے گی۔ ان کی ساری کاریگری ایک جادوگر کے کرتب کے سوا کچھ نہیں، اور جادوگر چاہے کہیں چلا جائے، اُسے فلاح نصیب نہیں ہوتی۔“ ﴿۶۹﴾ چنانچہ (یہی ہوا اور) سارے جادوگر سجدے میں گرا دیئے گئے۔ کہنے لگے کہ: ”ہم ہارون اور موسیٰ کے رَبّ پر ایمان لے آئے۔“ ﴿۷۰﴾ فرعون بولا: ”تم ان پر میرے اجازت دینے سے پہلے ہی ایمان لے آئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ (موسیٰ) تم سب کا سرغنہ ہے جس نے تمہیں جادو سکھلایا ہے۔ اب میں نے بھی پکا ارادہ کرلیا ہے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا، اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی چڑھاؤں گا۔ اور تمہیں یقیناً پتہ لگ جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔“ ﴿۷۱﴾ جادوگروں نے کہا: ”ہمارے سامنے جو روشن نشانیاں آگئی ہیں، ان پر اور اُس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، ہم تمہیں ہرگز ترجیح نہیں دے سکتے۔ اب تمہیں جو کچھ کرنا ہو، کرلو۔ تم جو کچھ بھی کرو گے، اسی دُنیوی زندگی کے لئے ہوگا۔ ﴿۷۲﴾ ہم تو اپنے رَبّ پر اِیمان لا چکے ہیں، تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو بھی بخش دے، اور جادو کے اُس کام کو بھی جس پر تم نے ہمیں مجبور کیا۔ اور اللہ ہی سب سے اچھا اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔“ ﴿۷۳﴾ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنے پروردگار کے پاس مجرم بن کر آئے گا، اُس کے لئے جہنم ہے جس میں نہ وہ مرے گا اور نہ جئے گا۔ ﴿۷۴﴾ اور جو شخص اُس کے پاس مؤمن بن کر آئے گا جس نے نیک عمل بھی کئے ہوں گے، تو ایسے ہی لوگوں کے لئے بلند درجات ہیں، ﴿۷۵﴾ وہ ہمیشہ رہنے والے باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے! اور یہ صلہ ہے اُس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ ﴿۷۶﴾

خلاصۂ تفسیر

غرض (یہ سُن کر) فرعون (دربار سے اپنی جگہ) لوٹ گیا پھر اپنا مکر کا (یعنی جادُو کا) سامان جمع کرنا شروع کیا پھر (سب کو لے کر اس میدان میں جہاں وعدہ ٹھہرا تھا) آیا (اس وقت) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان (جادُوگر) لوگوں سے فرمایا کہ ارے کمبختی مارو! اللہ تعالیٰ پر جھوٹ افترا مت کرو (کہ اس کے وجود یا توحید کا انکار کرنے لگو یا اس کے ظاہر کئے ہوئے معجزات کو سحر بتلانے لگو) کبھی خدا تعالیٰ تم کو کسی قسم کی سزا سے بالکل نیست و نابود ہی کردے اور جو جھوٹ باندھتا ہے وہ (آخر کو) ناکام رہتا ہے پس جادوگر (یہ بات سُن کر ان دونوں حضرات کے بارہ میں) باہم اپنی رائے میں اختلاف

کرنے لگے اور خفیہ گفتگو کرتے رہے (بالآخر سب متفق ہو کر) کہنے لگے کہ بیشک یہ دونوں جادوگر ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے تم کو تمہاری سرزمین سے نکال باہر کریں اور تمہارے عمدہ (مذہبی) طریقہ کا دفتر ہی اُٹھادیں تو اب تم مل کر اپنی تدبیر کا انتظام کرو اور صفیں آراستہ کر کے (مقابلہ میں) آؤ اور آج وہی کامیاب ہے جو غالب ہو (پھر) اُنہوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا کہ اے موسیٰ (کہیئے) آپ (اپنا عصا) پہلے ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں آپ نے (نہایت بے پروائی سے) فرمایا نہیں تم ہی پہلے ڈالو (چنانچہ اُنہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور نظر بندی کردی) پس یکا یک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اُن کی نظر بندی سے موسیٰ (علیہ السلام) کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے (سانپ کی طرح) چلتی دوڑتی ہوں سو موسیٰ (علیہ السلام) کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا (کہ جب دیکھنے میں یہ رسیاں اور لاٹھیاں بھی سانپ معلوم ہوتی ہیں اور میرا عصا بھی بہت سے بہت سانپ بن جائے گا تو دیکھنے والے تو دونوں چیزوں کو ایک ہی سا سمجھیں گے تو حق و باطل میں امتیاز کس طرح کریں گے، اور یہ خوف باقتضائے طبع تھا ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے تو اس کے تمام نشیب وفراز کا بھی انتظام کردے گا اور اپنے مرسل کی کافی مدد کرے گا اور ایسا خوف طبعی جو درجۂ وسوسہ میں تھا شانِ کمال کے منافی نہیں الغرض جب یہ خوف ہوا اس وقت) ہم نے کہا کہ تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہو گے اور (اس کی صورت یہ ہے کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں جو (عصا) ہے اس کو ڈالدو، ان لوگوں نے جو کچھ (سانگ) بنایا ہے یہ (عصا) سب کو نگل جائے گا یہ جو کچھ بنایا ہے جادوگروں کا سانگ ہے اور جادوگر کہیں جاوے معجزے کے مقابلے میں کبھی) کامیاب نہیں ہوتا (موسیٰ علیہ السلام کو تسلی ہوگئی کہ اب امتیاز خوب ہوسکتا ہے چنانچہ انہوں نے عصا ڈالا اور واقعی وہ سب کو نگل گیا) سو جادوگروں (نے جو یہ فعل فوق السحر دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ بیشک معجزہ ہے اور فوراً ہی سب) سجدہ میں گر گئے (اور بآواز بلند) کہا کہ ہم تو ایمان لے آئے ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے پروردگار پر، فرعون نے (یہ واقعہ دیکھ کر جادوگروں کو دھمکایا اور) کہا کہ بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں (یعنی میری خلاف مرضی) تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے واقعی (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ (سحر میں) تمہارے بھی بڑے (اور اُستاذ) ہیں کہ انہوں نے تم کو سحر سکھلایا ہے (اور اُستاد شاگردوں نے سازش کر کے جنگِ زرگری کی ہے تاکہ تم کو ریاست حاصل ہو) سو (اب حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے) میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں (تاکہ سب دیکھ کر عبرت حاصل کریں) اور یہ بھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہم دونوں میں (یعنی مجھ میں اور ربِّ موسیٰ میں) کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے ان لوگوں نے صاف جواب دیدیا کہ ہم تجھ کو کبھی ترجیح نہ دیں گے بمقابلہ ان دلائل کے جو ہم کو ملے ہیں اور بمقابلہ اس ذات کے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھ کو جو کچھ کرنا ہو (دل کھول کر) کر ڈال تو بجز اس کے کہ اس دنیوی زندگانی

میں کچھ کرلے اور کر ہی کیا سکتا ہے بس ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لاچکے تا کہ ہمارے (پچھلے) گناہ (کفر وغیرہ) معاف کردیں اور تو نے جو جادو (کے مقدمہ) میں ہم پر زور ڈالا اس کو بھی معاف کردیں اور اللہ تعالیٰ (باعتبار ذات وصفات کے بھی تجھ سے) بدرجہا اچھے ہیں اور (باعتبار ثواب وعقاب کے بھی) زیادہ بقا والے ہیں (اور تجھ کو نہ خیریت نصیب ہے نہ بقا تو تیرا کیا انعام جس کا وعدہ ہم سے کیا تھا اور کیا عذاب جس کی اب وعید سُناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے جس ثواب اور عذاب کو بقا ہے اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص (بغاوت کا) مجرم ہوکر (یعنی کافر ہوکر) اپنے رَبّ کے پاس حاضر ہوگا سو اُس کے لئے دوزخ (مقرر) ہے اس میں نہ مرے ہی گا اور نہ جئے ہی گا (نہ مرنا تو ظاہر ہے اور نہ جینا یہ کہ جینے کا آرام نہ ہوگا) اور جو شخص اس کے پاس مؤمن ہوکر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں سو ایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے اور جو شخص (کفر ومعصیت سے) پاک ہو اُس کا یہی انعام ہے (پس اس قانون کے موافق ہم نے کفر کو چھوڑ کر ایمان اختیار کرلیا)۔

معارف ومسائل

فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ، فرعون نے اپنے کید یعنی مقابلہ موسیٰ علیہ السلام کی تدبیر میں ساحروں اور اُن کے آلات کو جمع کرلیا، حضرت ابن عباسؓ سے ان ساحروں کی تعداد بہتّر منقول ہے اور دوسرے اقوال ان کی تعداد میں بہت مختلف ہیں، چار سو سے لے کر نو لاکھ تک ان کی تعداد بتلائی گئی ہے اور یہ سب اپنے ایک رئیس شمعون کے ماتحت اس کے حکم کے مطابق کام کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ ان کا رئیس ایک اندھا آدمی تھا۔ (قرطبی) [1] واللہ اعلم

موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کو پیغمبرانہ خطاب

جادُو کا مقابلہ معجزات سے کرنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادُوگروں کو ہمدردانہ نصیحت آمیز چند کلمات کہہ کر اللہ کے عذاب سے ڈرایا وہ الفاظ یہ تھے: وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰى ﴿٦١﴾ یعنی تمہاری ہلاکت سامنے آچکی ہے، اللہ تعالیٰ پر افتراء اور بہتان نہ لگاؤ کہ اس کے ساتھ خدائی میں فرعون یا کوئی اور شریک ہے، اگر تم ایسا کروگے تو وہ تم کو عذاب میں پیس ڈالے گا اور تمہاری جڑ بنیاد اکھاڑ دے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا ہے وہ انجام کار ناکام اور محروم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ فرعون کی طاغوتی طاقت وقوت اور حشم وخدم کے سہارے جو لوگ مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۲۱۴

آ چکے تھے ان واعظانہ کلمات کا اُن پر کوئی اثر ہونا بہت ہی بعید تھا مگر انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کے ساتھ حق کی ایک مخفی طاقت وشوکت ہوتی ہے اُن کے سادے الفاظ بھی سخت سے سخت دِلوں پر تیر ونشتر کا کام کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ جملے سُن کر ساحروں کی صفوں میں ایک زلزلہ پڑ گیا اور آپس میں اختلاف ہونے لگا کہ یہ کلمات کوئی جادوگر نہیں کہہ سکتا یہ تو اللہ ہی کی طرف سے معلوم ہوتے ہیں اس لئے بعض نے کہا کہ ان کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں اور بعض اپنی بات پر جمے رہے (فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ) کا یہی مطلب ہے، پھر اس اختلاف کو دُور کرنے کے لئے آپس میں سرگوشی اور آہستہ مشورے ہونے لگے (وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾) مگر بالآخر مجموعی رائے مقابلہ کرنے ہی پر جم گئی اور کہنے لگے [۱] اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ یعنی یہ دونوں جادُوگر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ تم کو یعنی فرعون اور آلِ فرعون کو تمہاری زمین مصر سے نکال دیں، مطلب یہ ہے کہ جادو کے ذریعہ تمہارے ملک پر اپنا قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ تمہارا طریقہ جو سب سے افضل وبہتر ہے اس کو مٹا دیں مُثْلٰى، اَمْثَلُ کا صیغہ مؤنث ہے جس کے معنے افضل واعلیٰ کے ہیں، مطلب یہ تھا کہ تمہارا مذہب وطریقہ کہ فرعون کو اپنا خدا اور صاحبِ اختیار واقتدار مانتے ہو یہی سب سے افضل وبہتر طریقہ ہے یہ لوگ اس کو مٹا کر اپنا دین ومذہب پھیلانا چاہتے ہیں اور لفظ طریقہ کے ایک معنی یہ بھی آتے ہیں کہ قوم کے سرداروں اور نمائندہ لوگوں کو اس قوم کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور علی مرتضیٰؓ سے اس جگہ طریقہ کی یہی تفسیر منقول ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمہاری قوم کے سرداروں اور باعزّت لوگوں کو ختم کردیں، اس لئے تم لوگوں کو چاہئے کہ مقابلہ کے لئے اپنی پوری تدبیر وتوانائی صرف کرو اور سب جادوگر صف بستہ ہوکر یکبارگی اُن کے مقابلے پر عمل کرو (فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا) صف بستہ ہونے کو مقابل پر رُعب ڈالنے کا ایک خاص اثر ہوتا ہے اس لئے جادوگروں نے اپنی صف بندی کرکے مقابلہ کیا۔

جادوگروں نے اپنی بےفکری اور بےپروائی کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی سے کہا کہ پہل آپ کرتے ہیں یا ہم کریں یعنی پہلے آپ اپنا عمل کرتے ہیں یا ہم کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا بَلْ اَلْقُوْا یعنی پہلے تمہیں ڈالو اور اپنے جادو کا کرشمہ دکھلاؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں۔ اوّل تو ادبِ مجلس کہ جب جادوگروں نے اپنا یہ حوصلہ دکھلایا کہ مخالف کو پہلے حملہ کرنے کی اجازت دی تو اس کا شریفانہ جواب یہی تھا کہ ان کی طرف سے اس سے زیادہ حوصلے کے ساتھ ان کو ابتداء کرنے کی اجازت دی جائے۔

---

[۱] حضرت نافع مدنیؒ وغیرہ کی قراءت میں اِنَّ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ منقول ہے۔ یہ بظاہر عربی زبان کے نحوی قاعدہ کے خلاف ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کے بعض لغات میں یہ صورت بھی جائز ہے۔ (فصله القرطبی)

دوسرے یہ کہ جادوگروں کا یہ کہنا اپنے اطمینان اور بےفکری کا مظاہرہ تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن ہی کو ابتداء کرنے کا موقع دے کر اپنی بےفکری اور اطمینان کا ثبوت دیدیا۔ تیسرے یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ان کے جادو کے سب کرشمے آجائیں، اس کے بعد اپنے معجزات کا اظہار کریں تو بیک وقت غلبۂ حق کا ظہور واضح طور پر ہوجائے۔ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد پر اپنا عمل شروع کردیا اور اپنی لاٹھیاں اور رسّیاں جو بڑی تعداد میں تھیں بیک وقت زمین پر ڈال دیں اور وہ سب کی سب بظاہر سانپ بن کر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِہِمْ اَنَّہَا تَسْعٰی ﴿۶۶﴾ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی جادوگروں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی تھی جو مسمریزم کے ذریعہ بھی ہوجاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ لاٹھیاں اور رسّیاں سانپ بن کر دوڑتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، وہ حقیقۃً سانپ نہ بنی تھیں، اور اکثر جادو اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ صورتِ حال دیکھ کر خوف طاری ہوا جس کو اُنہوں نے اپنے نفس میں چھپائے رکھا دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ خوف اگر موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کے لئے ہوا تو مقتضائے بشریت سے ایسا ہونا نبوّت کے خلاف نہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ خوف اپنی جان کا نہیں تھا بلکہ اس کا تھا کہ اس مجمع کے سامنے ساحروں کا غلبہ محسوس کیا گیا تو جو مقصد دعوتِ نبوّت کا تھا وہ پورا نہ ہوسکے گا اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے جو ارشاد ہوا اُس میں یہ اطمینان دلایا گیا کہ جادوگر غالب نہ آسکیں گے آپ ہی کو فتح اور غلبہ حاصل ہوگا۔ اگلی آیت میں لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴿۶۸﴾ فرما کر اس خطرہ کو دُور کیا گیا ہے۔

وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ، موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی خطاب ہوا کہ آپ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اُس کو ڈال دو، مراد اس سے موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا مگر یہاں عصا کا ذکر نہیں فرمایا۔ اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ اُن کے جادو کی کوئی حقیقت نہیں، اِس کی پروا نہ کرو اور جو کچھ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے ڈال دو وہ اُن کے سب سانپوں کو نگل جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈال دیا وہ ایک بڑا اژدہا بن کر ان سب جادو کے سانپوں کو نگل گیا۔

فرعونی جادوگروں کا مسلمان ہوکر سجدہ میں پڑ جانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصا نے اژدہا بن کر جب اُن کے خیالی سانپوں کو نگل لیا تو چونکہ یہ لوگ جادو کے ماہرین تھے ان کو یقین ہوگیا کہ یہ کام جادُو کے ذریعہ نہیں ہوسکتا بلکہ یہ بلاشبہ معجزہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوتا ہے اس لئے سجدہ میں گر گئے اور اعلان کردیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رَبّ پر ایمان لے آئے۔ بعض روایات

حدیث میں ہے کہ ان جادوگروں نے سجدہ سے اُس وقت تک سر نہیں اُٹھایا جب تک کہ اُن کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ قدرت نے نہیں کرادیا۔ (رَوَاہُ عَبْدُ ابْنُ حُمَیْدٍ وَابْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ وَابْنُ الْمُنْذِرِ عَنْ عِکْرَمَۃَ۔ رُوْح) [1]

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ فرعون کی رُسوائی اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے واضح کردی تو بوکھلا کر اوّل تو ساحروں کو یہ کہنے لگے کہ بغیر میری اجازت کے تم کیسے اِن پر ایمان لائے۔ گویا لوگوں کو یہ بتلانا تھا کہ میری اجازت کے بغیر ان جادوگروں کا کوئی قول وفعل معتبر نہیں مگر ظاہر ہے کہ اس کُھلے ہوئے معجزہ کے بعد کسی کی اجازت کی ضرورت کسی عاقل انسان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے اب جادوگروں پر اس سازش کا الزام لگایا کہ اب معلوم ہوا کہ تم سب موسیٰ کے شاگرد ہو اسی جادوگر نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور تم نے سازش کر کے اُس کے سامنے اپنی ہار مان لی ہے۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ، اب جادوگروں کو سخت سزا سے ڈرایا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے جس کی یہ صورت ہوگی کہ داہنا ہاتھ کٹے گا تو بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ یہ صورت یا تو اس لئے تجویز کی کہ فرعونی قانون میں سزا کا یہی طریقہ رائج ہوگا یا اس لئے کہ اس صورت میں انسان ایک عبرت کا نمونہ بن جاتا ہے وَلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ یعنی ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھر تمہیں کھجور کے درختوں پر سُولی دی جائے گی کہ تم اُن پر اسی طرح لٹکے رہو گے یہاں تک کہ بھوک اور پیاس سے مرجاؤ۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا، جادوگروں نے فرعون کی یہ سخت دھمکی اور سخت سزا دینے کا اعلان سُن کر اپنے ایمان پر بڑی پختگی کا ثبوت دیا۔ کہنے لگے کہ ہم تجھے یا تیرے کسی قول کو اُن بینات ومعجزات پر ترجیح نہیں دے سکتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ جادوگر جب سجدہ میں گرے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو جنت کے ان مقاماتِ عالیہ اور نعمتوں کا مشاہدہ کرادیا جو اُن کو ملنے والے تھے اس کو ان لوگوں نے کہا کہ ان بینات کے ہوتے ہوئے ہم تیری بات نہیں مان سکتے (قرطبی) [2] نیز خالقِ کائنات ربِّ سمٰوات کو چھوڑ کر تجھے اپنا ربّ نہیں مان سکتے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اب جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں فیصلہ کر، اور جو چاہے سزا تجویز کر۔ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا یعنی اگر تو نے ہمیں سزا دے بھی دی تو وہ سزا صرف اسی دُنیا کی چند روزہ زندگی ہی تک ہوگی مرنے کے بعد تو تیرا ہم پر قبضہ نہیں رہے گا بخلاف حق تعالیٰ کے کہ ہم اس کے قبضہ میں مرنے سے پہلے بھی ہیں اور مرنے کے بعد بھی، اُس کی سزا کی فکر سب سے مقدم ہے۔

---

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:١٦ ص:٢٣٠، وتفسير ابن ابی حاتم رقم الحديث:١٤٣٤٩

[2] تفسير القرطبی تحت هذه الآية ج:١١ ص:٢٢٥

وَمَآ اَكۡرَهۡتَنَا عَلَيۡهِ مِنَ السِّحۡرِ جادوگروں نے اب فرعون پر یہ الزام لگایا کہ ہمیں جادوگری پر تو نے ہی مجبور کر رکھا تھا ورنہ ہم اس لغو کام کے پاس نہ جاتے، اب ہم ایمان لا کر اللہ سے اس جادو کے گناہ کی بھی معافی مانگتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ جادوگر تو خود اپنے اختیار سے مقابلہ کرنے کے لئے آئے تھے اور اس مقابلہ کی سودا بازی بھی فرعون سے کر چکے تھے کہ ہم غالب آئیں گے تو کیا ملے گا، پھر ان کا فرعون پر یہ الزام لگانا کہ تو نے ہمیں جادو کرنے پر مجبور کر رکھا تھا یہ کیسے صحیح ہوگا؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ جادوگر شروع میں تو شاہی انعام و اکرام کے لالچ میں مقابلہ کے لئے تیار تھے بعد میں ان کو کچھ احساس ہوا کہ ہم معجزہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اُس وقت فرعون نے ان کو مجبور کیا۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ فرعون نے اپنے ملک میں جادوگری کی تعلیم کو جبری بنایا ہوا تھا اس لئے ہر شخص جادو سیکھنے پر مجبور تھا۔ (روح) [1]

اہلیۂ فرعون آسیہ کا انجام خیر

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حق و باطل کے اس معرکہ کے وقت فرعون کی بیوی برابر خبر رکھتی رہی کہ انجام کیا ہوا۔ جب اُس کو یہ بتلایا گیا کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام غالب آ گئے تو فوراً اُس نے اعلان کر دیا کہ میں بھی ربّ موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئی۔ فرعون کو اپنے گھر کی خبر لگی تو حکم دیا کہ ایک بڑے پتھر کی چٹان اُٹھا کر اس کے اُوپر ڈال دو، آسیہ نے جب یہ دیکھا تو آسمان کی طرف نظر اُٹھائی اور اللہ سے فریاد کی، حق تعالیٰ نے پتھر اس کے اُوپر گرنے سے پہلے اس کی روح قبض کر لی پھر پتھر اُس بے جان جسم پر گرا۔ [2]

فرعونی جادوگروں میں عجیب انقلاب

اِنَّهٗ مَنۡ يَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا الٰی وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ یہ کلمات اور حقائق جن کا تعلق خالص اسلامی عقائد اور عالم آخرت سے ہے ان جادوگروں کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں اور اسلامی عقائد و اعمال کی کوئی تعلیم اُن کو ملی نہیں، یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت کی برکت اور اُن کے اخلاص کا اثر تھا کہ حق تعالیٰ نے اُن پر دین کے تمام حقائق آن کی آن میں ایسے کھول دیئے کہ اُن کے مقابلے میں نہ اپنی جان کی پروا رہی نہ کسی بڑی سے بڑی سزا اور تکلیف کا خوف رہا، گویا ایمان کے ساتھ ساتھ ہی ان کو ولایت کا بھی وہ مقام حاصل ہو گیا جو دوسروں کو عمر بھر کے مجاہدوں ریاضتوں سے بھی حاصل ہونا مشکل ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ﴿۱۴﴾ [3] (المؤمنون) حضرت عبد اللہ ابن

---

[1] روح المعانی ج:۱۶ ص:۲۳۳

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۲۲۵

[3] ترجمہ: سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

عباسؓ اور عبید بن عمیرؒ نے فرمایا کہ قدرتِ حق کا یہ کرشمہ دیکھو کہ یہ لوگ شروع دن میں کفار جادوگر تھے اور آخرِ دن اولیاء اللہ اور شہداء۔ (ابن کثیر)[1]

وَ لَقَدۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى ۙ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡ فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ لے نکل میرے بندوں کو رات سے پھر ڈالدے اُن کے لئے

طَرِيۡقًا فِى الۡبَحۡرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخۡشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ

سمندر میں رستہ سُوکھا نہ خطرہ کر آ پکڑنے کا اور نہ ڈر ڈوبنے سے، پھر پیچھا کیا اُن کا فرعون نے

بِجُنُوۡدِهٖ فَغَشِيَهُمۡ مِّنَ الۡيَمِّ مَا غَشِيَهُمۡ ؕ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهٗ

اپنے لشکروں کو لے کر، پھر ڈھانپ لیا اُن کو پانی نے جیسا کہ ڈھانپ لیا اور بہکایا فرعون نے اپنی قوم کو

وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ قَدۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَوٰعَدۡنٰكُمۡ

اور نہ سمجھایا، اے اولادِ اسرائیل چھڑالیا ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے اور وعدہ ٹھہرایا تم سے

جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنَ وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوۡا

داہنی طرف پہاڑ کی اور اُتارا تم پر منّ اور سلویٰ کھاؤ

مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَلَا تَطۡغَوۡا فِيۡهِ فَيَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبِىۡ ۚ

ستھری چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور نہ کرو اس میں زیادتی پھر تو اُترے گا تم پر میرا غصہ

وَمَنۡ يَّحۡلِلۡ عَلَيۡهِ غَضَبِىۡ فَقَدۡ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّىۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ

اور جس پر اُترا میرا غصہ سو وہ پٹکا گیا، اور میری بڑی بخشش ہے اس پر جو توبہ کرے اور یقین لائے

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۳ ص:۲۱۴، ۲۱۵

وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾

اور کرے بھلا کام پھر راہ پر رہے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی کہ: ”تم میرے بندوں کو لے کر راتوں رات روانہ ہو جاؤ، پھر ان کے لئے سمندر میں ایک خشک راستہ اس طرح نکال لینا کہ نہ تمہیں (دُشمن کے) آ پکڑنے کا اندیشہ رہے، اور نہ کوئی اور خوف ہو۔“ ﴿٧٧﴾ چنانچہ فرعون نے اپنے لشکروں سمیت اُن کا پیچھا کیا تو سمندر کی جس (خوفناک) چیز نے انہیں ڈھانپا، وہ انہیں ڈھانپ کر ہی رہی۔ ﴿٧٨﴾ اور فرعون نے اپنی قوم کو برے راستے پر لگایا، اور انہیں صحیح راستہ نہ دِکھایا۔ ﴿٧٩﴾ اے بنی اِسرائیل! ہم نے تمہیں تمہارے دُشمن سے نجات دی، اور تم سے کوہِ طور کے دائیں جانب آنے کا وعدہ ٹھہرایا، اور تم پر من وسلویٰ نازل کیا۔ ﴿٨٠﴾ جو پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں عطا کیا ہے، اُس میں سے کھاؤ، اور اس میں سرکشی نہ کرو جس کے نتیجے میں تم پر میرا غضب نازل ہو جائے۔ اور جس کسی پر میرا غضب نازل ہو جاتا ہے، وہ تباہی میں گر کر رہتا ہے۔ ﴿٨١﴾ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص توبہ کرے، ایمان لائے، اور نیک عمل کرے، پھر سیدھے راستے پر قائم رہے تو میں اُس کے لئے بہت بخشنے والا ہوں۔ ﴿٨٢﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (جب فرعون اس پر بھی ایمان نہ لایا اور ایک عرصہ تک مختلف معاملات و واقعات ہوتے رہے اس وقت) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ ہمارے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو مصر سے) راتوں رات (باہر) لے جاؤ (اور دُور چلے جاؤ تاکہ فرعون کے ظلم و شدائد سے ان کو نجات ہو) پھر (راہ میں جو دریا ملے گا تو) ان کے لئے دریا میں (عصا مار کر) خشک راستہ بنا دینا (یعنی عصا مارنا کہ اس سے خشک راستہ بن جائے گا) نہ تو تم کو کسی کے تعاقب کا اندیشہ ہوگا (کیونکہ اہلِ تعاقب کامیاب نہ ہوں گے گو تعاقب کریں) اور نہ اور کسی قسم کا (مثلاً غرق وغیرہ کا) خوف ہوگا (بلکہ امن و اطمینان سے پار ہو جاؤ گے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام موافق حکم کے ان کو شباشب نکال لے گئے اور صبح مصر میں خبر مشہور ہوئی) پس فرعون اپنے لشکروں کو لے کر ان کے پیچھے چلا (اور بنی اسرائیل موافق وعدۂ الٰہیہ کے دریا سے پار ہو گئے اور ہنوز وہ دریائی راستے اسی طرح اپنی حالت پر تھے جیسا دوسری آیت میں ہے وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا[1] اِنَّهُمْ جُنْدٌ

[1] ترجمہ: اور تم اس دریا کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا ان کا سارا لشکر ڈبو یا جائے گا۔

مُغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ (الدخان) فرعونیوں نے جلدی میں کچھ آگا پیچھا سوچا نہیں، ان رستوں پر ہو لئے، جب سب اندر آ گئے) تو (اس وقت چاروں طرف سے) دریا (کا پانی سمٹ کر) ان پر جیسا ملنے کو تھا آملا (اور سب غرق ہو کر رہ گئے) اور فرعون نے اپنی قوم کو بُری راہ پر لگایا اور نیک راہ اُن کو نہ بتلائی (جس کا اس کو دعویٰ تھا [۱] وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ (المؤمن) اور بُری راہ ہونا ظاہر ہے کہ دُنیا کا بھی ضرر ہوا کہ سب ہلاک ہوئے اور آخرت کا بھی، کیونکہ جہنم میں گئے جیسا کہ آیت میں ہے [۲] اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ (المؤمن) پھر بنی اسرائیل کو فرعون کے تعاقب اور غرقِ دریا سے نجات کے بعد اور نعمتیں عنایت ہوئیں مثلاً عطائے توراۃ اور منّ وسلویٰ، ان نعمتوں کو عطا کر کے ہم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ) اے بنی اسرائیل (دیکھو) ہم نے (تم کو کیسی کیسی نعمتیں دیں کہ) تم کو تمہارے (ایسے بڑے) دشمن سے نجات دی اور ہم نے تم سے (یعنی تمہارے پیغمبر سے تمہارے نفع کے واسطے) کوہِ طور کی داہنی جانب آنے کا (اور وہاں آنے کے بعد توراۃ دینے کا) وعدہ کیا اور (وادی تیہ میں) ہم نے تم پر منّ وسلویٰ نازل فرمایا (اور اجازت دی کہ) ہم نے جو نفیس چیزیں (شرعاً بھی کہ حلال ہیں اور طبعاً بھی کہ لذیذ ہیں) تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ اور اس (کھانے) میں حد (شرعی) سے مت گزرو (مثلاً یہ کہ حرام سے حاصل کیا جائے، کذا فی الدر یا کھا کر معصیت کی جائے) کہیں میرا غضب تم پر واقع ہو جائے، اور جس شخص پر میرا غضب واقع ہوتا ہے وہ بالکل گیا گزرا ہوا اور (نیز اُس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ) میں ایسے لوگوں کے لئے بڑا بخشنے والا بھی ہوں جو (کفر و معصیت سے) توبہ کر لیں، اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں پھر (اسی راہ) پر قائم (بھی) رہیں (یعنی ایمان و عمل صالح پر مداومت کریں یہ مضمون ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تذکیرِ نعمت اور امر بالشکر و نہی عن المعصیت اور وعد و وعید یہ خود بھی دینی نعمت ہے۔)

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى حق و باطل معجزہ اور جادُو کے فیصلہ کن معرکہ نے فرعون اور آلِ فرعون کی کمر توڑ دی اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی قیادت میں جمع ہو گئے تو اب اُن کو یہاں سے ہجرت کا حکم ملتا ہے۔ اور چونکہ فرعون کے تعاقب اور آگے دریا کے راستہ میں حائل ہونے کا خطرہ سامنے تھا اس لئے دونوں چیزوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطمئن کر دیا گیا کہ دریا پر اپنی لاٹھی ماریں گے تو درمیان سے خشک راستے نکل آئیں گے اور پیچھے سے فرعون کے تعاقب کا خطرہ نہ رہے گا جس کا تفصیلی واقعہ حدیث الفتون کے تحت میں اسی سُورۃ میں گزر چکا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا پر لاٹھی ماری تو اس میں بارہ سڑکیں اس طرح بن گئیں کہ پانی کے تودے

[۱] ترجمہ: اور میں تم کو عین طریق مصلحت بتلاتا ہوں۔ [۲] ترجمہ: فرعون والوں کو نہایت سخت آگ میں داخل کرو۔

بحرِ منجمد کی طرح دونوں طرف پہاڑ کی برابر کھڑے رہے اور درمیان سے راستے خشک نکل آئے جیسا کہ سورۂ شعراء میں ہے فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٍ كَالطَّوۡدِ الۡعَظِيۡمِ ؀ (الشعراء) [1] اور درمیان میں جو یہ پانی کی دیواریں ان بارہ سڑکوں کے درمیان تھیں اُن کو قدرت نے ایسا بنادیا کہ ایک سڑک سے گزرنے والے دوسری سڑکوں سے گزرنے والوں کو دیکھتے بھی جاتے تھے اور باہم باتیں بھی کررہے تھے تاکہ ان کے دلوں میں یہ خوف وہراس بھی نہ رہے کہ ہمارے دوسرے قبیلوں کا کیا حال ہوا۔ (قرطبی) [2]

مصر سے نکلنے کے وقت بنی اسرائیل کے بعض حالات اور اُن کی تعداد اور لشکر فرعون کی تعداد

تفسیر روح المعانی میں یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شروع رات میں بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے دریائے قلزم کی طرف نکلے۔ بنی اسرائیل نے اس سے پہلے شہر کے لوگوں میں یہ شہرت دیدی تھی کہ ہماری عید ہے ہم عید منانے کے لئے باہر جائیں گے اور اس بہانے سے قبطی لوگوں سے کچھ زیورات عاریۃً مانگ لئے کہ عید سے آکر واپس کردیں گے۔ بنی اسرائیل کی تعداد اس وقت چھ لاکھ تین ہزار اور دوسری روایت میں چھ لاکھ ستر ہزار تھی یہ اسرائیلی روایات ہیں جن میں مبالغہ ہوسکتا ہے لیکن اتنی بات قرآن کریم کے اشارات اور روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ اُن کے بارہ قبیلے تھے اور ہر قبیلے کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ بھی قدرتِ حق تعالیٰ کا ایک عظیم مشاہدہ تھا کہ جب یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر آئے تو بارہ بھائی تھے، اب بارہ بھائیوں کے بارہ قبیلوں کی اتنی عظیم الشان تعداد مصر سے نکلی جو چھ لاکھ سے زائد بتلائی جاتی ہے۔ فرعون کو جب ان کے نکل جانے کی اطلاع ملی تو اپنی فوجیں جمع کیں جن میں سترّ ہزار سیاہ گھوڑے تھے اور لشکر کے مقدمہ میں سات لاکھ سوار تھے۔ جب پیچھے سے اس فوجی سیلاب کو اور آگے دریائے قلزم کو بنی اسرائیل نے دیکھا تو گھبرا اُٹھے اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ؀ (الشعراء) کہ ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تسلّی دی کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيۡ سَيَهۡدِيۡنِ ؀ (الشعراء) کہ میرے ساتھ میرا ربّ ہے وہ مجھے راستہ دے گا، پھر بحکمِ ربانی دریا پر لاٹھی ماری اور اُس میں بارہ سڑکیں خشک نکل آئیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے اُن سے گزر گئے۔ جس وقت فرعون اور اُس کا لشکر یہاں پہنچا تو لشکرِ فرعون یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر سہم گیا کہ ان کے لئے دریا میں کس طرح راستے بن گئے مگر فرعون نے اُن کو کہا کہ یہ سب کرشمہ میری ہیبت کا ہے جس سے دریا کی روانگی رُک کر راستے بن گئے ہیں یہ کہہ کر

---

[1] ترجمہ: اور ہر حصہ اتنا تھا جیسا بڑا پہاڑ۔

[2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۱ ص:۲۲۹

فوراً آگے بڑھ کر اپنا گھوڑا دریا کے اس راستہ میں ڈال دیا اور سب لشکر کو پیچھے آنے کا حکم دیا۔ جس وقت فرعون مع اپنے تمام لشکر کے ان دریائی راستوں کے اندر سما چکے اُسی وقت حق تعالیٰ نے دریا کو روانی کا حکم دیدیا اور دریا کے سب حصّے مِل گئے فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾ کا یہی حاصل ہے۔ (روح المعانی)[1]

وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ، فرعون سے نجات اور دریا سے پار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور اُن کے واسطے سے تمام بنی اسرائیل سے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ کوہِ طور کی داہنی جانب چلے آئیں تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی جائے اور بنی اسرائیل خود بھی ان کے شرفِ ہم کلامی کا مشاہدہ کرلیں۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿٨٠﴾ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل عبور دریا کے بعد آگے بڑھے اور ایک مقدس شہر میں داخل ہونے کا اُن کو حکم ملا۔ اُنہوں نے خلاف ورزی کی، اس کی یہ سزا دی گئی کہ اسی وادی میں جس کو وادیِ تیہ کہتے ہیں قید کر دیئے گئے۔ یہاں سے چالیس سال تک باہر نہ نکل سکے۔ اس سزا کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اُن پر اس قید کے زمانے میں بھی طرح طرح کے انعامات ہوتے رہے اُنہیں میں سے منّ وسلویٰ کا انعام تھا جوان کی غذا کے لئے دیا جاتا تھا۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ

اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ بولا وہ یہ آرہے ہیں میرے پیچھے

وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ

اور میں جلدی آیا تیری طرف اے میرے ربّ تا کہ تو راضی ہو، فرمایا ہم نے تو بچلا دیا تیری قوم کو تیرے پیچھے

وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿٨٥﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ

اور بہکایا اُن کو سامری نے پھر اُلٹا پھرا موسیٰ اپنی قوم کے پاس غصہ میں بھرا پچتاتا ہوا

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ

کہا اے قوم کیا تم سے وعدہ نہ کیا تھا تمہارے ربّ نے اچھا وعدہ کیا طویل ہوگئی تم پر مدّت

[1] روح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:١٦ ص:٢٣٧

أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِي ﴿٨٦﴾

یا چاہا تم نے کہ اُترے تم پر غضب تمہارے رَبّ کا اس لئے خلاف کیا تم نے میرا وعدہ

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا

بولے ہم نے خلاف نہیں کیا تیرا وعدہ اپنے اختیار سے ولیکن اُٹھوایا ہم سے بھاری بوجھ

مِّنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾ فَأَخْرَجَ لَهُمْ

قوم فرعون کے زیور کا سو ہم نے اس کو پھینک دیا، پھر اس طرح ڈھالا سامری نے پھر بنا نکالا ان کے واسطے

عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَٰذَا إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾

ایک بچھڑا ایک دھڑ جس میں آواز گائے کی، پھر کہنے لگے یہ معبود ہے تمہارا اور معبود ہے موسیٰ کا سو وہ بھول گیا

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾ ع

بھلا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ وہ جواب تک نہیں دیتا اُن کو کسی بات کا اور اختیار نہیں رکھتا اُن کے بُرے کا اور نہ بھلے کا

آسان ترجمۂ قرآن

اور (جب موسیٰ کوہِ طور پر اپنے لوگوں سے پہلے چلے آئے تو اللہ نے ان سے کہا:) ''موسیٰ! تم اپنی قوم سے پہلے جلدی کیوں آگئے؟'' ﴿۸۳﴾ انہوں نے کہا: ''وہ میرے پیچھے پیچھے آیا ہی چاہتے ہیں، اور پروردگار! میں آپ کے پاس اس لئے جلدی آگیا تاکہ آپ خوش ہوں۔'' ﴿۸۴﴾ اللہ نے فرمایا: ''پھر تمہارے آنے کے بعد ہم نے تمہاری قوم کو فتنے میں مبتلا کردیا ہے، اور انہیں سامری نے گمراہ کرڈالا ہے۔'' ﴿۸۵﴾ چنانچہ موسیٰ غم و غصّے میں بھرے ہوئے اپنی قوم کے پاس واپس لوٹے۔ کہنے لگے: ''میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے پروردگار نے تم سے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ تو کیا تم پر کوئی بہت لمبی مدت گذر گئی تھی، یا تم چاہتے ہی یہ تھے کہ تم پر تمہارے رَبّ کا غضب نازل ہوجائے، اور اس وجہ سے تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟'' ﴿۸۶﴾ کہنے لگے: ''ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی، بلکہ ہوا یہ کہ ہم پر لوگوں

کے زیورات کے بوجھ لدے ہوئے تھے، اس لئے ہم نے انہیں پھینک دیا، پھر اسی طرح سامری نے کچھ ڈالا'' ﴿۸۷﴾ اور لوگوں کے سامنے ایک بچھڑا بنا کر نکال لیا، ایک جسم تھا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ لوگ کہنے لگے کہ: ''یہ تمہارا معبود ہے، اور موسیٰ کا بھی معبود ہے، مگر موسیٰ بھول گئے ہیں۔'' ﴿۸۸﴾ بھلا کیا انہیں یہ نظر نہیں آرہا تھا کہ وہ نہ ان کی بات کا جواب دیتا تھا، اور نہ ان کو کوئی نقصان یا نفع پہنچا سکتا تھا؟ ﴿۸۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (جب اللہ تعالیٰ کو توراۃ دینا منظور ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر آنے کا حکم فرمایا اور قوم کو بھی یعنی بعضوں کو ساتھ آنے کا حکم ہوا (کَذَا فِی فَتْحِ الْمَنَّانِ عَنِ الْبَابِ التَّاسِعِ عَشَرَ مِنْ سَفَرِ الْخُرُوْجِ) موسیٰ علیہ السلام شوق میں سب سے آگے تنہا جا پہنچے اور دوسرے لوگ اپنی جگہ رہ گئے طور کا ارادہ ہی نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ) اے موسیٰ، آپ کو اپنی قوم سے آگے جلدی آنے کا کیا سبب ہوا، اُنہوں نے (اپنے گمان کے موافق) عرض کیا کہ وہ لوگ یہی تو ہیں میرے پیچھے پیچھے (آرہے ہیں) اور میں (سب سے پہلے) آپ کے پاس (یعنی اُس جگہ جہاں مکالمت ومخاطبت کا آپ نے وعدہ فرمایا) جلدی سے اس لئے چلا آیا کہ آپ (زیادہ) خوش ہوں گے (کیونکہ امتثالِ امر میں پیش قدمی کرنا زیادہ موجب خوشنودی کا ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری قوم کو تو ہم نے تمہارے (چلے آنے کے) بعد ایک بلا میں مبتلا کر دیا اور ان کو سامری نے گمراہ کر دیا (جس کا بیان آگے آتا ہے فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا الخ اور فَتَنَّا میں اس ابتلاء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب اس لئے کیا کہ خالق ہر فعل کا وہی ہے ورنہ اصل نسبت اس فعل کی سامری کی طرف ہے جس کو اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾ میں ظاہر فرمایا ہے) غرض موسیٰ (علیہ السلام بعد انقضائے میعاد کے) غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف واپس آئے (اور) فرمانے لگے کہ اے میری قوم کیا تم سے تمہارے رَبّ نے ایک اچھا (اور سچا) وعدہ نہیں کیا تھا (کہ ہم تم کو ایک کتاب احکام کی دیں گے تو اس کتاب کا تو تم کو انتظار واجب تھا) کیا تم پر (میعاد مقرر سے بہت) زیادہ زمانہ گزر گیا تھا (کہ اس کے ملنے سے نااُمیدی ہوگئی اس لئے اپنی طرف سے ایک عبادت ایجاد کر لی) یا (باوجود نااُمیدی نہ ہونے کے) تم کو یہ منظور ہوا کہ تم پر تمہارے رَبّ کا غضب واقع ہو اس لئے تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا (کہ آپ کی واپسی تک کوئی نیا کام نہ کریں گے اور آپ کے نائب ہارون علیہ السلام کی اطاعت کریں گے) اُس کے خلاف کیا وہ کہنے لگے کہ ہم نے جو آپ سے وعدہ کیا تھا اس کو اپنے اختیار سے خلاف نہیں کیا (یہ معنی نہیں کہ کسی نے اُن سے زبردستی یہ فعل کرا لیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس رائے کو ہم نے ابتداءً جبکہ خالی الذہن تھے اختیار کر لیا تھا، اس کے خلاف سامری کا فعل ہمارے لئے منشأ اشتباہ بن گیا جس سے ہم نے وہ رائے سابق یعنی توحید اختیار نہ کی بلکہ رائے بدل گئی۔ گو

اس پر بھی عمل اختیار ہی سے ہوا چنانچہ آئندہ کہا گیا) ولیکن قوم (قبط) کے زیور میں سے ہم پر بوجھ لدرہا تھا سو ہم نے اس کو (سامری کے کہنے سے آگ میں) ڈال دیا پھر اسی طرح سامری نے (بھی اپنے ساتھ کا زیور) ڈالدیا (آگے اللہ تعالیٰ قصہ کی تکمیل اس طرح فرماتے ہیں) پھر اُس (سامری) نے ان لوگوں کے لئے ایک بچھڑا (بناکر) ظاہر کیا کہ وہ ایک قالب (خالی از کمالات) تھا جس میں ایک (بے معنی) آواز تھی سو (اس کی نسبت وہ احمق) لوگ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ تمہارا اور موسیٰ کا بھی معبود تو یہ ہے (اس کی عبادت کرو) موسیٰ تو بھول گئے (کہ طور پر خدا کی طلب میں گئے ہیں حق تعالیٰ ان کی احمقانہ جسارت پر فرماتے ہیں کہ) کیا وہ لوگ اتنا بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ (بواسطہ یا بلاواسطہ) نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ اُن کے کسی ضرر یا نفع پر قدرت رکھتا ہے (ایسا ناکارہ خدا کیا ہوگا اور الٰہ حق بواسطہ انبیاء کے خطاب وکلام ضروری فرماتا ہے)۔

معارف ومسائل

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل فرعون کے تعاقب اور دریا سے نجات پانے کے بعد آگے بڑھے تو اُن کا گزر ایک بُت پرست قوم پر ہوا اور اُن کی عبادت و پرستش کو دیکھ کر بنی اسرائیل کہنے لگے کہ جس طرح اُنہوں نے موجود اور محسوس چیزوں یعنی بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کے احمقانہ سوال کے جواب میں بتلایا کہ تم بڑے جاہل ہو یہ بت پرست لوگ تو سب ہلاک ہونے والے ہیں اور ان کا طریقہ باطل ہے اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ﴿١٣٨﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمۡ فِيۡهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿١٣٩﴾ [1] (الاعراف) اس وقت حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا کہ اپنی قوم کے ساتھ کوہ طور پر آجایئے تو ہم آپ کو اپنی کتاب تورات عطا کریں گے جو آپ کے اور آپ کی قوم کے لئے دستور العمل ہوگا مگر عطاء تورات سے پہلے آپ تیس روز اور تیس رات کا مسلسل روزہ رکھیں پھر اس کے بعد اس میعاد میں دس کا اور اضافہ کر کے چالیس روز کر دیئے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنی قوم کے کوہِ طور کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وعدۂ ربّانی کی وجہ سے شوق بھڑک اُٹھا اور اپنی قوم کو یہ وصیت کر کے آگے چلے گئے کہ تم بھی میرے پیچھے آجاؤ، میں آگے جا کر عبادت روزہ وغیرہ میں مشغول ہوتا ہوں جس کی میعاد مجھے تیس روز بتلائی گئی ہے، میری غیبت میں ہارون علیہ السلام میرے نائب اور قائم مقام ہوں گے۔ بنی اسرائیل مع ہارون علیہ السلام کے اپنی رفتار سے پیچھے چلتے رہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی کر کے آگے بڑھ گئے اور خیال یہ تھا کہ قوم کے لوگ بھی پیچھے پیچھے کوہِ طور کے قریب پہنچیں گے مگر وہاں وہ سامری کا فتنہ گوسالہ پرستی کا پیش آگیا۔

[1] ترجمہ: واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ تباہ کیا جائے گا اور ان کا یہ کام محض بے بنیاد ہے۔

بنی اسرائیل کے تین فرقے ہو کر اختلاف میں مبتلا ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پیچھے پہنچنے کا معاملہ رُک گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ نے یہ خطاب فرمایا وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ یعنی اے موسیٰ! آپ اپنی قوم سے آگے جلدی کر کے کیوں آ گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عجلت کرنے کا سوال اور اس کی حکمت

سوال کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی حالت سے بے خبر رہ کر یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ بھی کوہِ طور کے قریب پہنچ گئے ہوں گے اور قوم فتنہ میں مبتلا ہو چکی ہے اس کی خبر موسیٰ علیہ السلام کو دے دی جائے (از تفسیر ابن کثیر)۔[1] اور روح المعانی میں بحوالہ کشف اس سوال کی وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی تربیت کے متعلق ایک خاص ہدایت دینا اور ان کی اس عجلت پر تنبیہ کرنا تھا کہ آپ کے منصبِ رسالت کا تقاضا یہ تھا کہ قوم کے ساتھ رہتے ان کو اپنی نظر میں رکھتے اور ساتھ لاتے۔ آپ کی عجلت کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ قوم کو سامری نے گمراہ کر دیا۔ اس میں خود فعل عجلت کی مذمت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ شان انبیاء کی نہ ہونی چاہئے۔ اور بحوالہ انتصاف نقل کیا ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کے ساتھ سفر کرنے کا طریقہ بتلایا گیا کہ رئیس القوم کو پیچھے رہنا چاہئے جیسے لوط علیہ السلام کے واقعہ میں حق تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ مؤمنین کو اپنے ساتھ لے کر شہر سے نکل جائیے، اُن کو آگے رکھ کر خود اُن سب کے پیچھے رہیئے: وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ (الحجر: ۶۵)

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گمان کے مطابق عرض کیا کہ میری قوم کے لوگ بھی پیچھے پیچھے پہنچنا ہی چاہتے ہیں اور میں کچھ جلدی کر کے آگے اس لئے آ گیا کہ حکم کی تعمیل میں پیش قدمی کرنا حاکم کی زیادہ خوشنودی کا سبب ہوا کرتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ان کو قوم بنی اسرائیل میں پیش آنے والے فتنہ گوسالہ پرستی کی اطلاع دیدی اور یہ کہ ان کو تو سامری نے گمراہ کر دیا ہے اور وہ فتنہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

سامری کون تھا؟

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ آلِ فرعون کا قبطی آدمی تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے پڑوس میں رہتا تھا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور جب بنی اسرائیل کو لے کر موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو یہ بھی ساتھ ہو لیا۔ بعض نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے ایک قبیلہ سامرہ کا رئیس تھا اور قبیلہ سامرہ ملک شام میں معروف ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ یہ فارسی شخص کرمان کا رہنے والا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسی قوم کا آدمی تھا جو گائے کی پرستش کرنے والی تھی یہ کسی

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۳۰۹

طرح مصر پہنچ گیا اور بظاہر دین بنی اسرائیل میں داخل ہو گیا مگر اس کے دل میں نفاق تھا (قرطبی) [۱] حاشیہ قرطبی میں ہے کہ یہ شخص ہندوستان کا ہندو تھا جو گائے کی عبادت کرتے ہیں انتہٰی۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ گیا یا پہلے ہی سے منافقانہ طور پر ایمان کا اظہار کیا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

مشہور یہ ہے کہ سامری کا نام موسیٰ ابن ظفر تھا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ سامری پیدا ہوا تو فرعون کی طرف سے تمام اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا حکم جاری تھا اس کی والدہ کو خوف ہوا کہ فرعونی سپاہی اس کو قتل کر دیں گے تو بچے کو اپنے سامنے قتل ہوتا دیکھنے کی مصیبت سے یہ بہتر سمجھا کہ اس کو جنگل کے ایک غار میں رکھ کر اوپر سے بند کر دیا (کبھی کبھی اس کی خبر گیری کرتی ہوگی) ادھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو اس کی حفاظت اور غذا دینے پر مامور کر دیا وہ اپنی ایک انگلی پر شہد ایک پر مکھن ایک پر دودھ لاتے اور اس کو بچے کو چٹا دیتے تھے یہاں تک کہ یہ غار ہی میں پل کر بڑا ہو گیا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ کفر میں مبتلا ہوا اور بنی اسرائیل کو مبتلا کیا پھر قہرِ الٰہی میں گرفتار ہوا۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے دو شعروں میں اس طرح ضبط کیا ہے (از روح المعانی) [۲] ؎

اِذَا الْمَرْءُ لَمْ یُخْلَقْ سَعِیْدًا تَحَیَّرَتْ ۔۔۔ عُقُوْلُ مُرَبِّیْهِ وَخَابَ الْمُؤَمِّلُ

فَمُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاهُ جِبْرِیْلُ کَافِرٌ ۔۔۔ وَمُوْسَی الَّذِیْ رَبَّاهُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلُ

(ترجمہ) جب کوئی شخص اصل پیدائش میں نیک بخت نہ ہو تو اُس کے پرورش کرنے والوں کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں اور اس سے اُمید کرنے والا محروم ہو جاتا ہے۔ دیکھو جس موسیٰ کو جبرئیل امین نے پالا تھا وہ تو کافر ہو گیا اور جس موسیٰ کو فرعون لعین نے پالا تھا وہ خدا کا رسول بن گیا۔

اَلَمْ یَعِدْکُمْ رَبُّکُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۥ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رنج وغم کے عالم میں واپس آکر قوم سے خطاب کیا اور پہلے اُن کو اللہ تعالیٰ کا وعدہ یاد دلایا جس کے لئے وہ سب قوم کو لے کر طور کی جانب ایمن کی طرف چلے تھے کہ یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ہدایت عطا فرمائیں گے اور جس کے ذریعہ دین و دُنیا کے تمام مقاصد تمہارے پورے ہوں گے۔

اَفَطَالَ عَلَیْکُمُ الْعَهْدُ، یعنی اللہ کے اس وعدہ پر کوئی بڑی مدت بھی تو نہیں گزری جس میں تمہارے بھول جانے کا احتمال ہو کہ وعدہ کا انتظار زمانہ دراز تک کرنے کے بعد مایوس ہو گئے اس لئے دوسرا طریقہ اختیار کر لیا۔

اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ، یعنی بھول جانے یا انتظار سے تھک جانے کا کوئی احتمال نہیں تو اب اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ تم نے خود ہی اپنے قصد و اختیار سے اپنے رَبّ کے غضب کو دعوت دی۔

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۲۳۳، ۲۳۴

[۲] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۶ ص:۲۴۴

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا، لفظ مَلْك بفتح میم و بضم میم دونوں کے معنے تقریباً ایک ہیں اور مراد اس جگہ اس سے اپنا اختیار ہے اور مقصد اس کا یہ ہے کہ ہم نے گوسالہ کی پرستش پر اقدام اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ سامری کے عمل کو دیکھ کر ہم مجبور ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے۔ سامری یا اس کے عمل نے ان کو مجبور تو نہیں کر دیا تھا خود ہی غور و فکر سے کام نہ لیا تو مبتلا ہو گئے آگے سامری کا وہ واقعہ بیان کیا۔

وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ، لفظ اوزار، وزر کی جمع ہے جس کے معنے ثقل اور بوجھ کے ہیں، انسان کے گناہ بھی چونکہ قیامت کے روز اُس پر بوجھ بن کر لادے جائیں گے اس لئے گناہ کو وزر اور گناہوں کو اوزار کہا جاتا ہے۔ زِيْنَةِ الْقَوْمِ، لفظ زینۃ سے مراد زیور ہے اور قوم سے مراد قومِ فرعون (قبط) ہے جن سے بنی اسرائیل نے عید کا بہانہ کر کے کچھ زیورات مستعار لے لئے تھے اور وہ پھر اُن کے ساتھ رہے۔ اُن کو اوزار بمعنی گناہوں کا بوجھ اس لئے کہا کہ عاریت کا نام کر کے ان لوگوں سے لئے تھے جس کا حق یہ تھا کہ اُن کو واپس کئے جائیں چونکہ واپس نہیں کئے گئے تو اس کو گناہ قرار دیا۔ اور حدیثِ فتون کے نام سے جو مفصّل حدیث اُوپر نقل کی گئی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے ان لوگوں کو اُس کے گناہ ہونے پر متنبہ کیا اور ایک گڑھے میں یہ سب زیور ڈال دینے کا حکم دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ سامری نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے ان کو کہا کہ یہ زیورات دوسروں کا مال ہے تمہارے لئے اس کا رکھنا وبال ہے اس کے کہنے سے گڑھے میں ڈالے گئے۔

کفار کا مال مسلمان کے لئے کس صورت میں حلال ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار جو اہلِ ذمّہ یعنی مسلمانوں کی حکومت میں اُن کے قانون کی پابندی کر کے بستے ہیں اسی طرح وہ کفار جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ جان و مال وغیرہ کے امن کا ہو جائے ان کافروں کا مال تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے حلال نہیں لیکن جو کافر نہ مسلمانوں کا اہلِ ذمہ ہے نہ اُس سے ان کا کوئی عہد و معاہدہ ہے جن کو فقہاء کی اصطلاح میں کافر حربی کہا جاتا ہے اُن کے اموال تو مسلمانوں کے لئے مباح الاصل اشیاء کی طرح حلال ہیں پھر ہارون علیہ السلام نے ان کو وزر و گناہ کیسے قرار دیا اور اُن کے قبضہ سے نکال کر گڑھے میں ڈالنے کا حکم کیوں دیا۔ اس کا ایک جواب تو مشہور ہے جو عامّہ مفسرین نے لکھا ہے کہ کفار حربی کا مال لینا اگرچہ مسلمان کے لئے جائز ہے مگر وہ مال بحکم مال غنیمت ہے اور مالِ غنیمت کا قانون شریعت اسلام سے پہلے یہ تھا کہ کافروں کے قبضہ سے نکال لینا تو اس کا جائز تھا مگر مسلمانوں کے لئے اس کا استعمال اور اس سے نفع اُٹھانا حلال نہیں تھا بلکہ مال غنیمت جمع کر کے کسی ٹیلہ وغیرہ پر رکھدیا جاتا تھا اور آسمانی آگ (بجلی وغیرہ) آ کر اس کو کھا جاتی تھی یہی علامت اُن کے جہاد قبول ہونے کی تھی اور جس مالِ غنیمت کو آسمانی آگ نہ

کھائے وہ علامت اس کی تھی کہ جہاد مقبول نہیں اس لئے وہ مال بھی منحوس سمجھا جاتا اور کوئی اس کے پاس نہ جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں جو مخصوص رعایتیں اور سہولتیں دی گئی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مال غنیمت کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا گیا جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی تصریح ہے۔ [۱]

اس قاعدہ کے اعتبار سے بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا ہوا مال جو قوم فرعون سے لیا تھا مالِ غنیمت ہی کے حکم میں قرار دیا جائے تب بھی اس کا استعمال ان کے لئے جائز نہیں تھا اسی وجہ سے اس مال کو اوزار کے لفظ سے تعبیر کیا گیا اور حضرت ہارون کے حکم سے اس کو ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا۔

فائدہ مہمہ

لیکن فقہی نظر سے اس معاملہ کی جو تحقیق امام محمدؒ کی کتاب سیر [۲] اور اس کی شرح سرخسی میں بیان کی گئی ہے وہ بہت اہم اور اقرب الی الصواب ہے۔ وہ یہ ہے کہ کافر حربی کا مال بھی ہر حال میں مالِ غنیمت نہیں ہوتا بلکہ اس کی شرط یہ ہے کہ باقاعدہ جہاد و قتال کے ذریعہ بزور شمشیر اُن سے حاصل کیا جائے اسی لئے شرح سیر میں مغالبہ بالمحاربہ شرط قرار دیا ہے اور کافر حربی کا جو مال مغالبہ اور محاربہ کی صورت سے حاصل نہ ہو وہ مال غنیمت نہیں بلکہ اس کو مال فیئ کہتے ہیں مگر اُس کے حلال ہونے میں ان کفار کی رضاء و اجازت شرط ہے جیسے کوئی اسلامی حکومت ان پر ٹیکس عائد کر دے اور وہ اس پر راضی ہو کہ یہ ٹیکس دیدے تو اگرچہ یہ کوئی جہاد و قتال نہیں مگر رضامندی سے دیا ہوا مال مال فیئ کے حکم میں ہے اور وہ بھی حلال ہے۔

یہاں قومِ فرعون سے لئے ہوئے زیورات ان دونوں قسموں میں داخل نہیں کیونکہ یہ اُن سے عاریت کہہ کر لئے گئے تھے وہ ان کو مالکانہ طور پر دینے کے لئے رضامند نہ تھے کہ اس کو مال فیئ کہا جائے اور کوئی جہاد و قتال تو وہاں ہوا ہی نہیں کہ مالِ غنیمت شمار کیا جائے اس لئے شریعتِ اسلام کی رُو سے بھی یہ مال اُن کے لئے حلال نہ تھا۔

واقعہ ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ جانے کا قصد فرمالیا اور آپ کے پاس عرب کے کفار کی بہت سی امانتیں رکھی تھیں کیونکہ سارا عرب آپ کو امانتدار یقین کرتا اور امین کے لفظ سے خطاب کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی امانتوں کو واپس کرنے کا اتنا اہتمام فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد کر کے اپنے پیچھے ان کو چھوڑا اور حکم دیا کہ جس جس کی امانت ہے اُس کو واپس کر دی جائے آپ اس سے فارغ ہو کر ہجرت کریں۔ اس مال کو

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ ج: ۱ ص: ۱۹۹

[۲] مبسوط للسرخسیؒ، کتاب الصرف، باب الصرف فی دار الحرب ج: ۱۶ ص: ۴۴۹ تا ۴۵۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کے تحت حلال قرار نہیں دیا اور نہ وہ مسلمانوں کا حق ہوتا کافروں کو واپس کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ واللہ اعلم

فَقَذَفْنٰهَا، یعنی ہم نے ان زیورات کو پھینک دیا۔ حدیث فتون مذکورہ کی رُو سے یہ عمل حضرت ہارون علیہ السلام کے حکم سے کیا گیا اور بعض روایات میں ہے کہ سامری نے ان کو بہکا کر زیورات گڑھے میں ڈلوا دیئے اور دونوں باتیں جمع ہو جائیں یہ بھی کوئی مستبعد نہیں۔

فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾ حدیث فتون مذکور میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے سب زیورات گڑھے میں ڈلوا دیئے اور اس میں آگ جلوا دی کہ سب زیورات پگھل کر یک جسم ہو جائیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد اس کا معاملہ طے کیا جائے گا کہ کیا کیا جائے۔ جب سب لوگ اپنے اپنے زیورات اس میں ڈال چکے تو سامری بھی مٹھی بند کئے ہوئے پہنچا اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں بھی ڈالدوں۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی کوئی زیور ہوگا، فرمایا کہ ڈالدو۔ اُس وقت سامری نے ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں جب ڈالوں گا کہ آپ یہ دُعا کریں کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ پورا ہو جائے۔ ہارون علیہ السلام کو اس کا نفاق و کفر معلوم نہیں تھا دُعا کر دی۔ اب جو اُس نے اپنے ہاتھ سے ڈالا تو زیور کے بجائے مٹی تھی جس کو اُس نے جبرئیل امین کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے کہیں یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھ کر اُٹھا لیا تھا کہ جس جگہ اس کا قدم پڑتا ہے وہیں مٹی میں نشوونما اور آثارِ حیات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے اُس نے سمجھا کہ اس مٹی میں آثار حیات رکھے ہوئے ہیں۔ شیطان نے اس کو اس پر آمادہ کر دیا کہ یہ اس کے ذریعہ ایک بچھڑا زندہ کر کے دکھلا دے۔ بہر حال اس مٹی کا ذاتی اثر ہو یا حضرت ہارون علیہ السلام کی دُعا کا کہ یہ سونے چاندی کا پگھلا ہوا ذخیرہ اس مٹی کے ڈالنے اور ہارون علیہ السلام کی دُعا کرنے کے ساتھ ایک زندہ بچھڑا بن کر بولنے لگا۔ جن روایات میں ہے کہ سامری ہی نے بنی اسرائیل کو زیورات اس گڑھے میں ڈالنے کا مشورہ دیا تھا اُن میں یہ بھی ہے کہ اُس نے زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی مورت تیار کر لی تھی مگر اس میں کوئی زندگی نہیں تھی۔ پھر یہ جبرئیل امین کے نشانِ قدم کی مٹی ڈالنے کے بعد اس میں حیات پیدا ہو گئی (یہ سب روایات تفسیر قرطبی [1] وغیرہ میں مذکور ہیں اور ظاہر ہے کہ اسرائیلی روایات ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا مگر ان کو غلط کہنے کی بھی کوئی دلیل موجود نہیں) فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ، یعنی نکال لیا سامری نے ان زیورات سے ایک بچھڑے کا جسم جس میں گائے کی آواز (خُوَارٌ) تھی۔ لفظ جسدا سے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ محض ایک

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۱ ص:۲۳۵

جسد اور جسم تھا زندگی اس میں نہیں تھی اور آواز بھی ایک خاص صفت کے سبب اس سے نکلتی تھی، عامہ مفسرین کا قول وہی ہے جو اوپر لکھا گیا کہ اس میں آثار زندگی کے تھے۔

فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِيَ ۝۸۸ یعنی سامری اور اس کے ساتھی یہ بچھڑا بولنے والا دیکھ کر دوسرے بنی اسرائیل سے کہنے لگے کہ یہی تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے موسیٰ علیہ السلام بھول بھٹک کر کہیں اور چلے گئے۔ یہاں تک بنی اسرائیل کے عذر لنگ کا بیان تھا جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عتاب کے وقت پیش کیا اس کے بعد اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۝۸۹ میں ان کی حماقت اور گمراہی کو بیان فرمایا ہے کہ اگر یہ فی الواقع ایک بچھڑا زندہ ہی ہوگیا اور گائے کی طرح بولنے لگا تو عقل کے دشمنو! یہ تو سمجھو کہ خدائی کا اس سے کیا واسطہ ہے جبکہ نہ وہ تمہاری کسی بات کا جواب دے سکتا ہے نہ تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے تو اس کو خدا ماننے کی حماقت کا کیا جواز ہے؟

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ

اور کہا تھا اُن کو ہارون نے پہلے سے اے قوم بات یہی ہے کہ تم بہک گئے اس بچھڑے سے اور تمہارا رَبّ تو

الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝۹۰ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ

رحمٰن ہے سو میری راہ چلو اور مانو بات میری، بولے ہم برابر اسی پر لگے بیٹھے رہیں گے

حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝۹۱ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ

جب تک لوٹ کر آئے ہمارے پاس موسیٰ، کہا موسیٰ نے اے ہارون کس چیز نے روکا تجھ کو جب دیکھا تھا تو نے کہ

ضَلُّوْٓا ۝۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝۹۳ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ

وہ بہک گئے کہ تو میرے پیچھے نہ آیا کیا تو نے رَدّ کیا میرا حکم وہ بولا اے میری ماں کے جنے نہ پکڑ

بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ

میری داڑھی اور نہ سر، میں ڈرا کہ تو کہے گا پھوٹ ڈالدی تو نے بنی اسرائیل میں

وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

اور یاد نہ رکھی میری بات

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہا تھا کہ: ''میری قوم کے لوگو! تم اس (بچھڑے) کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہو گئے ہو، اور حقیقت میں تمہارا رَبّ تو رحمٰن ہے، اس لئے تم میرے پیچھے چلو اور میری بات مانو۔'' ﴿۹۰﴾ وہ کہنے لگے کہ: ''جب تک موسیٰ واپس نہ آ جائیں، ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے۔'' ﴿۹۱﴾ موسیٰ نے (واپس آ کر) کہا: ''ہارون! جب تم نے دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں تو تمہیں کس چیز نے روکا تھا ﴿۹۲﴾ کہ تم میرے پیچھے چلے آتے؟ بھلا کیا تم نے میری بات کی خلاف ورزی کی؟'' ﴿۹۳﴾ ہارون نے کہا: ''میرے ماں کے بیٹے! میری داڑھی نہ پکڑو، اور نہ میرا سر۔ حقیقت میں مجھے یہ اندیشہ تھا کہ تم یہ کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا، اور میری بات کا پاس نہیں کیا۔'' ﴿۹۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں سے ہارون (علیہ السلام) نے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے سے) پہلے بھی کہا تھا کہ اے میری قوم تم اس (گوسالہ) کے سبب گمراہی میں پھنس گئے ہو (یعنی اس کی پرستش کسی طرح درست نہیں ہو سکتی یہ کھلی گمراہی ہے) اور تمہارا رَبّ (حقیقی) رحمٰن ہے (نہ کہ یہ گوسالہ) سو تم (دین کے بارے میں) میری راہ پر چلو اور (اس باب میں) میرا کہنا مانو (یعنی میرے قول فعل کی اقتدا کرو) اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم تو جب تک موسیٰ (علیہ السلام) واپس (ہو کر) آئیں اُسی (کی عبادت) پر برابر جمے بیٹھے رہیں گے (غرض ہارون علیہ السلام کا کہنا نہیں مانا تھا یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام بھی آ گئے اور قوم سے اوّل خطاب کیا جو اُوپر آ چکا بعد اس کے ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور) کہا کہ اے ہارون جب تم نے (ان کو) دیکھا تھا کہ یہ (بالکل) گمراہ ہو گئے (اور نصیحت بھی نہیں سُنی) تو (اس وقت) تم کو میرے پاس چلے آنے سے کون امر مانع ہوا تھا (یعنی اس وقت میرے پاس چلا آنا چاہئے تھا تا کہ ان لوگوں کو اور زیادہ یقین ہوتا کہ تم اُن کے فعل کو نہایت ناپسند کرتے ہو اور نیز ایسے باغیوں سے قطع تعلقات جس قدر زیادہ ہو بہتر ہے) سو کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا (کہ میں نے کہا تھا لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ (الاعراف) جیسا پارہ نہم میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مفسدین کے راستہ کا اتباع نہ کریں جس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ مفسدین کے ساتھ تعلقات نہ رکھیں اور

سب سے الگ ہوجائیں) ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے مَیّا جائے (یعنی میرے بھائی) تم میری داڑھی مت پکڑو اور نہ سر (کے بال) پکڑو (اور میرا عذر سُن لو میرے تمہارے پاس نہ آنے کی یہ وجہ تھی کہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ (اگر میں آپ کی طرف چلا تو میرے ساتھ وہ لوگ بھی چلیں گے جو گوسالہ پرستی سے الگ رہے تو بنی اسرائیل کی جماعت کے دو ٹکڑے ہوجائیں گے کیونکہ گوسالہ کی پرستش کو بُرا سمجھنے والے میرے ساتھ ہوں گے اور دوسرے لوگ اس کی عبادت پر ہی جمے رہیں گے اور اس حالت میں) تم کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ڈالدی (جو بعض اوقات ان کے ساتھ رہنے سے زیادہ مضر ہوتی ہے کہ مفسدین خالی میدان پا کر بے خطر فساد میں ترقی کرتے ہیں) اور تم نے میری بات کا پاس نہ کیا (کہ میں نے کہا تھا) اَصْلِحْ (الاعراف: ۱۴۲) یعنی اس صورت میں آپ مجھے یہ الزام دیتے کہ میں نے تمہیں اصلاح کرنے کا حکم دیا تھا تم نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈال کر فساد کھڑا کر دیا)۔

معارف و مسائل

بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹ پڑا تو حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی خلافت اور نیابت کا حق ادا کر کے قوم کو سمجھایا مگر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اُن میں تین فرقے ہوگئے ایک فرقہ تو حضرت ہارون کے ساتھ رہا اُن کی اطاعت کی اُس نے گوسالہ پرستی کو گمراہی سمجھا اُن کی تعداد بارہ ہزار بتلائی گئی ہے، کذا فی القرطبی۔ باقی دو فرقے گوسالہ پرستی میں تو شریک ہوگئے فرق اتنا رہا کہ ان دونوں میں سے ایک فرقے نے یہ اقرار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آکر اس سے منع کریں گے تو ہم گوسالہ پرستی کو چھوڑ دیں گے۔ دوسرا فرقہ اتنا پختہ تھا کہ اس کا یقین یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی واپس آکر اسی کو معبود بنالیں گے اور ہمیں اس طریقے کو بہر حال چھوڑنا نہیں ہے۔ جب ان دونوں فرقوں کا یہ جواب حضرت ہارون نے سُنا کہ ہم تو موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک گوسالہ ہی کی عبادت پر جمے رہیں گے تو حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ہم عقیدہ بارہ ہزار ساتھیوں کو لے کر اُن سے الگ تو ہوگئے مگر رہنے سہنے وغیرہ کی جگہ وہی تھی اس میں اُن کے ساتھ اشتراک رہا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپس آکر اوّل تو بنی اسرائیل کو وہ خطاب کیا جو پچھلی آیتوں میں بیان ہوا ہے پھر اپنے خلیفہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر اُن پر سخت غصّہ اور ناراضی کا اظہار کیا اُن کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے اور فرمایا کہ جب ان بنی اسرائیل کو آپ نے دیکھ لیا کہ کھلی گمراہی یعنی شرک و کفر میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوگئے تو تم نے میرا اتباع کیوں نہ کیا، میرے حکم کی خلاف ورزی کیوں کی۔

مَامَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ تمہیں میرا اتباع کرنے سے کس چیز نے روکا، اس اتباع کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اختیار کیا گیا کہ اتباع سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے پاس طور پر چلا جانا ہے اور بعض مفسرین نے اتباع کی مراد یہ قرار دی کہ جب یہ لوگ گمراہ ہو گئے تو آپ نے ان کا مقابلہ کیوں نہ کیا کیونکہ میری موجودگی میں ایسا ہوتا تو میں یقیناً اس شرک و کفر پر قائم رہنے والوں سے جہاد اور مقاتلہ کرتا تم نے ایسا کیوں نہ کیا۔ دونوں صورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام پر الزام یہ تھا کہ ایسی گمراہی کی صورت میں یا تو اُن سے مقاتلہ اور جہاد کیا جاتا یا پھر اُن سے براءت اور علیحدگی اختیار کر کے میرے پاس آجاتے، اُن کے ساتھ رہتے بستے رہنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک اُن کی خطا اور غلطی تھی۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے اس معاملے کے باوجود ادب کی پوری رعایت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو نرم کرنے کے لئے خطاب يَبْنَؤُمَّ کے الفاظ سے کیا یعنی میری ماں کے بیٹے اس خطاب میں ایک خاص اشارہ سختی کا معاملہ نہ کرنے کی طرف تھا کہ میں آپ کا بھائی ہی تو ہوں کوئی مخالف تو نہیں اس لئے آپ میرا عُذر سُنیں۔ پھر عُذر یہ بیان کیا کہ مجھے خطرہ یہ پیدا ہو گیا کہ اگر میں نے ان لوگوں سے مقابلہ اور مقاتلہ کرنے پر آپ کے آنے سے پہلے اقدام کیا یا اُن کو چھوڑ کر خود بارہ ہزار بنی اسرائیل کے ساتھ آپ کے پاس چلا گیا، تو بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا اور آپ نے جو چلتے وقت مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ (الاعراف: ۱۴۲) میں اس اصلاح کا مقتضا یہ سمجھا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہونے دوں (ممکن ہے کہ آپ کے واپس آنے کے بعد یہ سب ہی سمجھ جائیں اور ایمان و توحید پر واپس آجائیں) اور دوسری جگہ قرآن کریم میں ہارون علیہ السلام کے عُذر میں یہ قول بھی ہے کہ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ (الاعراف: ۱۵۰) یعنی قوم بنی اسرائیل نے مجھے ضعیف و کمزور سمجھا کیونکہ میرے ساتھی دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم تھے اس لئے قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے۔

خلاصہ عذر کا یہ ہے کہ میں اُن کی گمراہی کا ساتھی نہیں تھا جتنا سمجھانا اور ہدایت پر رکھنا میرے بس میں تھا وہ میں نے پورا کیا اُن لوگوں نے میری بات نہ مانی اور میرے قتل کرنے کے درپے ہو گئے ایسی صورت میں اُن سے مقاتلہ کرتا یا اُن کو چھوڑ کر آپ کے پاس جانے کا ارادہ کرتا تو صرف یہ بارہ ہزار بنی اسرائیل میرے ساتھ ہوتے باقی سب مقاتلہ اور مقابلہ پر آجاتے اور باہمی معرکہ گرم ہو جاتا، میں نے اس سے بچنے کے لئے آپ کی واپسی تک کے لئے کچھ مساہلت کی صورت اختیار کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عُذر سُنا تو ہارون علیہ السلام کو چھوڑ دیا اور اصل بانئ فساد سامری کی خبر لی۔ قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی رائے کو صحیح مان لیا یا محض اُن کی خطائے اجتہادی سمجھ کر چھوڑ دیا۔

دو پیغمبروں میں اختلافِ رائے اور دونوں طرف صواب کے پہلو

اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اس حالت میں ہارون علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کو اس مشرک قوم کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے تھا ان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آجاتے جس سے اُن کے عمل سے مکمل بیزاری کا اظہار ہو جاتا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیشہ کے لئے بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور تفرقہ قائم ہو جائے گا اور چونکہ اُن کی اصلاح کا یہ احتمال موجود تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد اُن کے اثر سے پھر یہ سب ایمان اور توحید کی طرف لوٹ آئیں اس لئے کچھ دنوں کے لئے اُن کے ساتھ مساہلت اور مساکنت کو ان کی اصلاح کی توقع تک گوارا کیا جائے۔ دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل، ایمان وتوحید پر لوگوں کو قائم کرنا تھا مگر ایک نے مفارقت اور مقاطعہ کو اس کی تدبیر سمجھا، دوسرے نے اصلاحِ حال کی اُمید تک اُن کے ساتھ مساہلت اور نرمی کے معاملہ کو اس مقصد کے لئے نافع سمجھا۔ دونوں جانبیں اہلِ عقل وفہم اور فکر ونظر کے لئے محل غور وفکر ہیں۔ کسی کو خطا کہنا آسان نہیں مجتہدینِ اُمت کے اجتہادی اختلافات عموماً اسی طرح کے ہوتے ہیں ان میں کسی کو گناہگار یا نافرمان نہیں کہا جاسکتا رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کے بال پکڑنے کا معاملہ تو یہ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے شدت وغضب کا اثر تھا کہ تحقیقِ حال سے پہلے اُنہوں نے ہارون علیہ السلام کو ایک واضح غلطی پر سمجھا اور جب ان کا عذر معلوم ہو گیا تو پھر اپنے لئے اور اُن کے لئے دُعاء مغفرت فرمائی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ

کہا موسیٰ نے اب تیری کیا حقیقت ہے اے سامری بولا میں نے دیکھ لیا جو اوروں نے نہ دیکھا

فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾

پھر بھر لی میں نے ایک مٹھی پاؤں کے نیچے سے اس بھیجے ہوئے کے پھر میں نے وہی ڈال دی اور یہی صلاح دی مجھ کو میرے جی نے

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ

کہا موسیٰ نے دُور ہو تیرے لئے زندگی بھر تو اتنی سزا ہے کہ کہا کرے مت چھیڑو اور تیرے واسطے

مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ

ایک وعدہ ہے وہ ہرگز تجھ سے خلاف نہ ہوگا اور دیکھ اپنے معبود کو جس پر تمام دن تو معتکف رہتا تھا

لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ

ہم اس کو جلادیں گے پھر بکھیر دیں گے دریا میں اُڑاکر تمہارا معبود تو وہی اللہ ہے

الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

جس کے سوا کسی کی بندگی نہیں سب چیز سما گئی ہے اس کے علم میں

آسان ترجمۂ قرآن

موسیٰ نے کہا: ''اچھا تو سامری! تجھے کیا ہوا تھا؟'' ﴿۹۵﴾ وہ بولا: ''میں نے ایک ایسی چیز دیکھ لی تھی جو دوسروں کو نظر نہیں آئی تھی۔ اس لئے میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اُٹھالی، اور اُسے (بچھڑے پر) ڈال دیا۔ اور میرے دِل نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا۔'' ﴿۹۶﴾ موسیٰ نے کہا: ''اچھا تو جا، اب زندگی بھر تیرا کام یہ ہوگا کہ تو لوگوں سے یہ کہا کرے گا کہ مجھے نہ چھونا۔ اور (اس کے علاوہ) تیرے لئے ایک وعدے کا وقت مقرر ہے جو تجھ سے ٹلایا نہیں جاسکتا۔ اور دیکھ اپنے اس (جھوٹے) معبود کو جس پر تو جما بیٹھا تھا! ہم اسے جلا ڈالیں گے، اور پھر اس (کی راکھ) کو چورا چورا کر کے سمندر میں بکھیر دیں گے۔ ﴿۹۷﴾ حقیقت میں تم سب کا معبود تو بس ایک ہی اللہ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُس کا علم ہر چیز کا اِحاطہ کئے ہوئے ہے۔ ﴿۹۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(پھر سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے) کہا کہ اے سامری! تیرا کیا معاملہ ہے (یعنی تو نے یہ حرکت کیوں کی) اس نے کہا کہ مجھ کو ایسی چیز نظر آئی تھی جو اوروں کو نظر نہ آئی تھی (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر چڑھے ہوئے جس روز دریا سے پار اُترے ہیں جو بمصلحت نصرت مؤمنین واہلاک کفّار کے آئے ہوں گے اور تاریخ طبری میں سدی سے بسند نقل کیا ہے کہ حضرت جبرئیل موسیٰ علیہ السلام کے پاس یہ حکم لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے کہ آپ

طور پر جائیں تو اُس وقت سامری نے دیکھا تھا) [1] پھر میں نے اس فرستادہ (خداوندی کی سواری) کے نقش قدم سے ایک مُٹھی (بھر کر خاک) اُٹھالی تھی (اور خود بخود میرے قلب میں یہ بات آئی کہ اس مین زندگی کے اثرات ہوں گے جس چیز پر ڈالی جائے گی اُس میں زندگی پیدا ہو جائے گی) سو میں نے وہ مٹھی (خاک اس بچھڑے کے قالب کے اندر) ڈالدی اور میرے جی کو یہی بات (بھائی اور) پسند آئی، آپ نے فرمایا تو بس تیرے لئے اس (دنیوی) زندگی میں یہ سزا (تجویز کی گئی) ہے کہ تو یہ کہتا پھرے گا کہ مجھ کو کوئی ہاتھ نہ لگانا اور تیرے لئے (اس سزا کے علاوہ) ایک اور وعدہ (حق تعالیٰ کے عذاب کا) ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں (یعنی آخرت میں جُدا عذاب ہوگا) اور تو اپنے اس معبود (باطل) کو دیکھ جس (کی عبادت) پر تو جما ہوا بیٹھا تھا (دیکھ) ہم اس کو جلادیں گے پھر اس (کی راکھ) کو دریا میں بکھیر کر بہادیں گے (تاکہ نام ونشان اُس کا نہ رہے) بس تمہارا (حقیقی) معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ (اپنے) علم سے تمام چیزوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

معارف و مسائل

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ، (یعنی وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی) اس سے مراد جبرئیل امین ہیں اور اُن کے دیکھنے کے واقعہ میں ایک روایت تو یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز سے دریائے قلزم میں خشک راستے بن گئے اور بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے اور فرعونی لشکر دریا میں داخل ہورہا تھا تو جبرئیل امین گھوڑے پر سوار یہاں موجود تھے دوسری روایت یہ ہے کہ دریا سے پار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر آنے کی دعوت دینے کے لئے جبرئیل امین گھوڑے پر سوار تشریف لائے تھے ان کو سامری نے دیکھ لیا دوسرے لوگوں کو معلوم نہ ہوسکا اس کی وجہ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ سامری کی پرورش خود جبرئیل امین کے ذریعہ ہوئی تھی جس وقت اس کی ماں نے اس کو غار میں ڈال دیا تھا تو جبرئیل امین روزانہ اس کو غذا دینے کے لئے آتے تھے اس کی وجہ سے وہ اُن سے مانوس تھا اور پہچانتا تھا دوسرے لوگ نہیں پہچان سکے۔ (بیان القرآن) [2]

فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ، رسول سے مراد اس جگہ فرستادۂ خداوندی حضرت جبرئیل امین ہیں۔ سامریٰ کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈالی کہ جبرئیل امین کے گھوڑے کا قدم جس جگہ پڑتا ہے وہاں کی مٹی میں حیات و زندگی کے خاص اثرات ہوں گے یہ مٹی اُٹھالی جائے اس نے نشانِ قدم کی مٹی اُٹھالی۔ یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے اُلْقِيَ فِيْ رَوْعِهٖ اَنَّهٗ لَا يُلْقِيْهَا عَلٰى شَيْءٍ فَيَقُوْلَ كُنْ كَذَا اِلَّا كَانَ، یعنی سامری کے دل میں خود بخود یہ بات پیدا ہوئی

---

[1] تاریخ الطبری ج:۱ ص:۲۹٦ [2] بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۷ ص:۳۲،۳۳

کہ نشانِ قدم کی اس مٹی کو جس چیز پر ڈال کر یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز بن جا تو وہ وہی چیز بن جائے گی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سامری نے گھوڑے کے نشان قدم کا یہ اثر مشاہدہ کیا کہ جس جگہ قدم پڑتا وہیں سبزہ فوراً نمودار ہو جاتا تھا جس سے یہ استدلال کیا کہ اس مٹی میں آثارِ حیات ہیں، کذا فی الکمالین۔ اسی تفسیر کو روح المعانی [۱] میں صحابہ و تابعین اور جمہور مفسرین سے منقول کہا ہے اور اس میں آج کل ظاہر پرست لوگوں نے جو شبہات نکالے ہیں ان سب کا جواب دیا ہے فَجَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ۔ (بیان القرآن) [۲]

پھر جب بنی اسرائیل کے جمع کئے زیورات سے اس نے ایک بچھڑے کی ہیئت بنالی تو اپنے گمان کے مطابق کہ اس مٹی میں آثارِ حیات ہیں جس چیز میں ڈالی جائے گی اس میں زندگی پیدا ہو جائے گی اس نے یہ مٹی اُس بچھڑے کے اندر ڈالدی۔ بقدرتِ خداوندی اُس میں حیات کے آثار پیدا ہو گئے اور بولنے لگا۔ اور حدیث فتون جو پہلے مفصّل آچکی ہے اس میں یہ ہے کہ اس نے حضرت ہارون علیہ السلام سے دُعا کرائی کہ میں اپنے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس کو ڈالتا ہوں شرط یہ ہے کہ آپ یہ دُعا کردیں کہ جو میں چاہتا ہوں وہ ہو جائے۔ حضرت ہارون اس کے نفاق اور گوسالہ پرستی سے واقف نہ تھے دُعا کردی اور اُس نے وہ خاک نشانِ قدم کی اس میں ڈالدی تو حضرت ہارون کی دُعا سے اس میں حیات کے آثار پیدا ہو گئے۔ اور ایک روایت کے حوالہ سے یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سامری فارس یا ہندوستان کا باشندہ اُس قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کرتی ہے، مصر پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا بعد میں پھر مرتد ہو گیا یا پہلے ہی ایمان کا اظہار منافقانہ کیا تھا پھر نفاق ظاہر ہو گیا۔ اس اظہارِ ایمان کا فائدہ اس کو یہ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دریا سے پار ہو گیا۔

فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے لئے دُنیا کی زندگی میں یہ سزا تجویز کی کہ سب لوگ اس سے مقاطعہ کریں کوئی اس کے پاس نہ جائے اور اس کو بھی یہ حکم دیا کہ کسی کو ہاتھ نہ لگائے اور زندگی بھر اسی طرح وحشی جانوروں کی طرح سب سے الگ رہے۔ یہ سزا ہو سکتا ہے کہ ایک قانون کی صورت میں ہو جس کی پابندی اس پر اور دوسرے سب بنی اسرائیل پر منجانب موسیٰ علیہ السلام لازم کردی گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قانونی حیثیت کی سزا سے آگے خود اس کی ذات میں بقدرتِ خداوندی کوئی ایسی بات پیدا کردی گئی ہو کہ نہ وہ دوسروں کو چھو سکے نہ کوئی دوسرا اس کو چھو سکے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بددُعا سے اس میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر یہ کسی کو ہاتھ لگادے یا کوئی اس کو ہاتھ لگادے تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا، کذا فی المعالم۔ [۳] اس ڈر کے مارے وہ سب سے الگ بھاگا پھرتا تھا اور جب کسی کو قریب آتا دیکھتا تو دُور سے پکارتا تھا لَا مِسَاسَ یعنی کوئی مجھے نہ چھوئے۔

---

[۱] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۶ ص:۲۵۴　　[۲] بیان القرآن ج:۷ ص:۳۳

[۳] تفسير البغوی تحت هذه الآية ج:۵ ص:۲۹۲

سامری کی سزا میں ایک لطیفہ

روح المعانی میں بحوالہ بحرِ محیط نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو قتل کردینے کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی سخاوت اور لوگوں کی خدمت کرنے کی وجہ سے قتل کی سزا سے منع فرمادیا۔ (بیان القرآن) [۱]

لَنُحَرِّقَنَّهٗ (یعنی ہم اس کو آگ میں جلائیں گے) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچھڑا سونے چاندی کے زیورات سے گھڑا ہوا تھا تو اس کے آگ میں جلانے کی کیا صورت ہوگی سونا چاندی پگھلنے والی چیز ہے جلنے والی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اول تو خود اس میں اختلاف ہے کہ بچھڑے میں آثارِ حیات پیدا ہونے کے بعد بھی وہ چاندی سونے ہی کا رہا یا اس کی حقیقت تبدیل ہو کر گوشت اور خون بن گیا۔ اگر وہ گوشت اور لحم ودم بن گیا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کو جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ذبح کر کے جلا دیا جائے گا اور اگر دوسرا قول لیا جائے تو اس کے جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو سوہان سے ریت کر ذرّہ ذرّہ کردیا جائے گا (کما فی الدر المنثور) [۲] یا کسی حیلۂ اکسیر یہ سے جلا دیا جائے گا (کما فی روح المعانی) [۳] اور یہ بھی کوئی امر مستبعد نہیں کہ احراق اور جلانا بطور خرقِ عادت ومعجزہ ہو۔ واللہ اعلم (بیان القرآن) [۴]

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَ قَدْ اٰتَيْنٰكَ

یوں سُناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے احوال جو پہلے گزر چکے اور ہم نے دی تجھ کو

مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝۹۹ۚۖ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝۱۰۰ۙ

اپنے پاس سے پڑھنے کی کتاب جو کوئی منہ پھیر لے اُس سے سو وہ اُٹھائے گا دن قیامت کے ایک بوجھ

خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝۱۰۱ۙ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ

سدا رہیں گے اس میں اور بُرا ہے اُن پر قیامت میں وہ بوجھ اُٹھانے کا جس دن پھونکیں گے صور میں

---

[۱] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۶ ص:۲۵۶، وبیان القرآن ج:۷ ص:۳۳

[۲] الدر المنثور تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۳۲

[۳] روح المعانی ج:۱۶ ص:۲۵۷

[۴] بیان القرآن ج:۷ ص:۳۳

وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ

اور گھیر لائیں گے ہم گناہگاروں کو اُس دن نیلی آنکھیں چپکے چپکے کہتے ہوں گے آپس میں

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ

تم نہیں رہے مگر دس دن ہم کو خوب معلوم ہے جو کچھ کہتے ہیں جب بولے گا

ع ۵ / ۱۴ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ

اُن میں اچھی راہ روش والا تم نہیں رہے مگر ایک دن اور تجھ سے پوچھتے ہیں پہاڑوں کا حال

فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا

سو تو کہہ ان کو بکھیر دے گا میرا ربّ اُڑا کر پھر کر چھوڑے گا زمین کو صاف میدان نہ دیکھے تو اُس میں

عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ وَخَشَعَتِ

موڑ اور نہ ٹیلا اُس دن پیچھے دوڑیں گے پکارنے والے کے ٹیڑھی نہیں جس کی بات اور دب جائیں گی

الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ

آوازیں رحمٰن کے ڈر سے پھر تو نہ سُنے گا مگر کھس کھسی آواز، اُس دن کام نہ آئے گی سفارش

اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ

مگر جس کو اجازت دی رحمٰن نے اور پسند کی اُس کی بات وہ جانتا ہے جو کچھ ہے اُن کے آگے

وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ

اور پیچھے اور یہ قابو میں نہیں لاسکتے اس کو دریافت کرکر اور رگڑتے ہیں منہ آگے اس جیتے ہمیشہ رہنے والے کے

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور خراب ہوا جس نے بوجھ اُٹھایا ظلم کا اور جو کوئی کرے کچھ بھلائیاں اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو

فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا

سو اس کو ڈر نہیں بے انصافی کا اور نہ نقصان پہنچنے کا اور اسی طرح اُتارا ہم نے قرآن عربی زبان کا اور پھیر پھیر کر سُنائی

فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ

اس میں ڈرانے کی باتیں تاکہ وہ پرہیز کریں یا ڈالے ان کے دل میں سوچ، سو بُلند درجہ اللہ کا

الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫

اس سچے بادشاہ کا اور تو جلدی نہ کر قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو چکے اس کا اُترنا

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور کہہ اے ربّ زیادہ کر میری سمجھ

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) ماضی میں جو حالات گذرے ہیں اُن میں سے کچھ واقعات ہم اسی طرح تم کو سناتے ہیں، اور ہم نے تمہیں خاص اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ عطا کیا ہے۔ ﴿۹۹﴾ جو لوگ اُس سے منہ موڑیں گے، تو وہ قیامت کے دن بڑا بھاری بوجھ لادے ہوں گے، ﴿۱۰۰﴾ جس (کے عذاب) میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور قیامت کے دن اُن کے لئے یہ بدترین بوجھ ہوگا، ﴿۱۰۱﴾ جس دن صور پھونکا جائے گا، اور اُس دن ہم سارے مجرموں کو گھیر کر اس طرح جمع کریں گے کہ وہ نیلے پڑے ہوں گے، ﴿۱۰۲﴾ آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں گے کہ تم (قبروں میں یا دُنیا میں) دس دن سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ ﴿۱۰۳﴾ جس بارے میں وہ باتیں کریں گے اُس کی حقیقت ہمیں خوب معلوم ہے، جبکہ ان میں سے جس کا طریقہ سب سے بہتر ہوگا، وہ کہے گا کہ تم ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ ﴿۱۰۴﴾ اور لوگ تم سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ قیامت میں

ان کا کیا بنے گا؟) جواب میں کہہ دو کہ میرا پروردگار ان کو دُھول کی طرح اُڑا دے گا ﴿۱۰۵﴾ اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا ﴿۱۰۶﴾ کہ اس میں تمہیں نہ کوئی بل نظر آئے گا، نہ کوئی اُبھار ﴿۱۰۷﴾ اُس دن سب کے سب منادی کے پیچھے اس طرح چلے آئیں گے کہ اُس کے سامنے کوئی ٹیڑھ نہیں دِکھا سکیں گے۔ اور خدائے رحمٰن کے آگے تمام آوازیں دَب کر رہ جائیں گی، چنانچہ تمہیں پاؤں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے گا۔ ﴿۱۰۸﴾ اُس دن کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی، سوائے اُس شخص (کی سفارش) کے جسے خدائے رحمٰن نے اجازت دے دی ہو، اور جس کے بولنے پر وہ راضی ہو۔ ﴿۱۰۹﴾ وہ لوگوں کی ساری اگلی پچھلی باتوں کو جانتا ہے، اور وہ اُس کے علم کا اِحاطہ نہیں کر سکتے۔ ﴿۱۱۰﴾ اور سارے کے سارے چہرے حی و قیوم کے آگے جھکے ہوں گے، اور جو کوئی ظلم کا بوجھ لاد کر لایا ہوگا، نامراد ہوگا۔ ﴿۱۱۱﴾ اور جس نے نیک عمل کئے ہوں گے، جبکہ وہ مؤمن بھی ہو، تو اُسے نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی حق تلفی کا۔ ﴿۱۱۲﴾ اور ہم نے اسی طرح یہ وحی ایک عربی قرآن کی شکل میں نازل کی ہے، اور اُس میں تنبیہات کو طرح طرح سے بیان کیا ہے، تاکہ لوگ پرہیزگاری اختیار کریں، یا یہ قرآن اُن میں کچھ سوچ سمجھ پیدا کرے۔ ﴿۱۱۳﴾ ایسی ہی اُونچی شان ہے اللہ کی، جو سلطنت کا حقیقی مالک ہے! اور (اے پیغمبر!) جب قرآن وحی کے ذریعے نازل ہو رہا ہو تو اُس کے مکمل ہونے سے پہلے قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو، اور یہ دُعا کرتے رہا کرو کہ: "میرے پروردگار! مجھے علم میں اور ترقی عطا فرما۔" ﴿۱۱۴﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

سورۂ طٰہٰ میں اصل بیان توحید، رسالت اور آخرت کے اُصولی مسائل کا ہے انبیاء علیہم السلام کے واقعات اسی سلسلہ میں بیان ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بڑی تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور اُس کے ضمن میں رسالتِ محمدیہ کا اثبات بھی ہے اسی اثباتِ رسالتِ محمدیہ کا یہ حصّہ ہے جو اگلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ ان واقعات وقصص کا اظہار ایک نبی اُمّی کی زبان سے خود دلیل رسالت ونبوّت اور وحی الٰہی کی ہے اور ان سب کا سرچشمہ قرآن ہے اور حقیقتِ قرآن کے ذیل میں کچھ تفصیل معاد وآخرت کی بھی آگئی ہے (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا) اسی طرح ہم آپ سے اور واقعات گزشتہ کی خبریں (اور حکایتیں) بھی بیان کرتے رہتے ہیں (تاکہ نبوّت کے دلائل میں زیادتی ہوتی چلی جائے) اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے (یعنی قرآن جس میں وہ خبریں ہیں اور وہ خود بھی استقلالاً بوجہ اپنے اعجاز کے دلیلِ نبوّت ہے اور وہ نصیحت نامہ ایسا ہے کہ) جو لوگ اس (کے مضامین ماننے) سے روگردانی کریں گے سو وہ

قیامت کے روز بڑا بھاری بوجھ (عذاب کا) لادے ہوں گے (اور) وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بوجھ قیامت کے روز اُن کے لئے بڑا (بوجھ) ہوگا جس روز صُور میں پھونک ماری جائے گی (جس سے مُردے زندہ ہوجائیں گے) اور ہم اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگوں کو (میدانِ قیامت میں) اس حالت سے جمع کریں گے کہ (نہایت بدصورت ہوں گے کہ آنکھوں سے) کرنجے ہوں گے (جو آنکھوں کا بدترین رنگ شمار ہوتا ہے اور خوفزدہ اس قدر ہوں گے کہ) چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے ہوں گے (اور ایک دوسرے سے کہتے ہوں گے) کہ تم لوگ (قبروں میں) صرف دس روز رہے ہوگے (مطلب یہ کہ ہم تو یُوں سمجھے تھے کہ مر کر پھر زندہ ہونا نہیں یہ گمان تو بالکل غلط نکلا، نہ زندہ ہونا تو درکنار یہ بھی تو نہ ہوا کہ دیر ہی میں زندہ ہوتے بلکہ بہت ہی جلدی زندہ ہوگئے، کہ وہ مدّت دس روز کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ وجہ اس مقدار کے برابر معلوم ہونے کی اس روز کی درازی اور ہول اور پریشانی ہے کہ قبر میں رہنے کی مدّت اس کے سامنے اس قدر کم معلوم ہوگی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) جس (مدّت) کی نسبت وہ بات چیت کریں گے اس کو ہم خوب جانتے ہیں (کہ وہ کس قدر ہے) جب کہ ان سب میں کا زیادہ صائب الرائے یوں کہتا ہوگا کہ نہیں تم تو ایک ہی روز (قبر میں) رہے ہو (اس کو صائب الرائے اس لئے فرمایا کہ یوم کے طول اور ہول کے اعتبار سے یہی نسبت اقرب ہے پس اس شخص کو حقیقت شدت کا زیادہ ادراک ہوا اس لئے اس شخص کی رائے پہلے شخص کے اعتبار سے بہتر ہے اور یہ مقصود نہیں کہ اس شخص کی بات بالکل صحیح ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ دونوں مقداریں اصلی تحدید کے اعتبار سے صحیح نہیں اور نہ ان قائلین کا یہ مقصود تھا) اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کا حال سُن کر بعضے) لوگ آپ سے پہاڑوں کی نسبت پوچھتے ہیں (کہ قیامت میں ان کا کیا حال ہوگا) سو آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ میرا ربّ ان کو (ریزہ ریزہ کرکے) بالکل اُڑادے گا پھر زمین کو ایک میدان ہموار کردے گا کہ جس میں تو (اے مخاطب) نہ ناہمواری دیکھے گا اور نہ کوئی بُلندی (پہاڑ ٹیلہ وغیرہ کی) دیکھے گا اس روز سب کے سب (خدائی) بُلانے والے (یعنی صُور پھونکنے والے فرشتہ) کے کہنے پر ہولیں گے (یعنی وہ اپنی صُور پھونکنے کی آواز سے سب کو قبروں سے بُلائے گا تو سب نکل پڑیں گے) اس کے سامنے (کسی کا) کوئی ٹیڑھاپن نہ رہے گا (کہ قبر سے زندہ ہوکر نہ نکلے جیسے دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے سامنے ٹیڑھے رہتے تھے کہ تصدیق نہ کرتے تھے) اور (مارے ہیبت کے) تمام آوازیں اللہ تعالیٰ کے سامنے دب جائیں گی سو (اے مخاطب) تو بجز پاؤں کی آہٹ کے (کہ میدان حشر کی طرف چپکے چپکے چل رہے ہوں گے) اور کچھ (آواز) نہ سُنے گا (خواہ بوجہ اس کے کہ اس وقت بولتے ہی نہ ہوں گے گو دوسرے موقع پر آہستہ آہستہ بولیں جیسا اُوپر آیا ہے **يَتَخَافَتُوْنَ** اور خواہ بوجہ اس کے کہ بہت آہستہ بولتے ہوں گے جو ذرا فاصلے سے ہو وہ نہ سُن سکے) اُس روز (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو (انبیاء وصلحاء کی سفارش نفع دے گی) کہ جس (کی سفارش کرنے) کے واسطے اللہ تعالیٰ نے (شافعین کو) اجازت دیدی ہو اور اُس شخص کے واسطے (شافع کا) بولنا پسند کرلیا ہو

(مراد اس سے مؤمن ہے کہ شافعین کو اس کی سفارش کے لئے اجازت ہوگی اور اس باب میں شافع کا بولنا پسندیدۂ حق ہوگا اور کفّار کے لئے سفارش کی کسی کو اجازت ہی نہ ہوگی پس عدم نفع بوجہ عدم شفاعت کے ہے اس میں اعتراض کرنے والے کفّار کو ڈرانا ہے کہ تم تو شفاعت سے بھی محروم رہوگے اور) وہ (اللہ تعالیٰ) ان سب کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے اور اس (کے معلومات) کو ان کا علم احاطہ نہیں کرسکتا (یعنی ایسا تو کوئی امر نہیں جو خلق کو معلوم ہو اور اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ ہو اور ایسے بہت اُمور ہیں جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور خلق کو معلوم نہیں پس مخلوقات کے وہ سب احوال بھی اس کو معلوم ہیں جن پر شفاعت کی قابلیت یا عدم قابلیت مرتب ہے سو جو اس کا اہل ہوگا اس کے واسطے سفارش کرنے کی شافعین کو اجازت ہوگی اور جو اہل نہ ہوگا اس کے لئے اجازت نہ ہوگی) اور (اس روز) تمام چہرے اس حی وقیوم کے سامنے جُھکے ہوں گے (اور سب متکبرین اور منکرین کا تکبر و انکار ختم ہوجائے گا) اور (اس وصف میں تو سب مشترک ہوں گے پھر آگے ان میں یہ فرق ہوگا کہ) ایسا شخص تو (ہر طرح) ناکام رہے گا جو ظلم (یعنی شرک) لے کر آیا ہوگا اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا سو اس کو (کامل ثواب ملے گا) نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کمی کا (مثلاً یہ کہ کوئی گناہ اس کے نامہ اعمال میں زیادہ لکھ دیا جائے یا کوئی نیکی کم لکھ دی جائے اور یہ کنایہ ہے کمال ثواب سے پس اس کے مقابلہ میں کفار سے ثواب کی نفی مقصود ہوگی بوجہ عدم موجبِ ثواب کے گو ظلم اور حق تلفی کفار کی بھی نہ ہوگی اور کفّار کے نیک اعمال کا حساب میں نہ لکھا جانا یہ کوئی ظلم نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ اُن کے اعمال شرطِ ایمان سے خالی ہونے کی وجہ سے کالعدم ہوگئے) اور ہم نے (جس طرح یہ مضامین مذکورۂ مقام صاف صاف ارشاد کئے ہیں) اسی طرح اس کو (سارے کو) عربی قرآن کرکے نازل کیا ہے (جس کے الفاظ واضح ہیں) اور اس میں ہم نے طرح طرح سے وعید (قیامت وعذاب کی) بیان کی ہے (جس سے معنی بھی واضح ہوگئے مطلب یہ کہ سارے قرآن کے مضامین ہم نے صاف صاف بتلائے ہیں) تاکہ وہ (سُننے والے) لوگ (اس کے ذریعہ سے بالکل) ڈر جائیں (اور فی الحال ایمان لے آئیں) یا (اگر بالکل نہ ڈریں تو یہی ہو کہ) یہ قرآن ان کے لئے کسی قدر (تو) سمجھ پیدا کردے (یعنی اگر پورا اثر نہ ہو تو تھوڑا ہی ہو اور اسی طرح چند بار تھوڑا تھوڑا جمع ہو کر کافی مقدار ہوجائے اور کسی وقت مسلمان ہوجائیں) سو اللہ تعالیٰ جو بادشاہِ حقیقی ہے عالی شان ہے (کہ ایسا نافع کلام نازل فرمایا) اور (جس طرح عمل کرنا اور نصیحت ماننا جو اوپر مذکور ہوئے قرآن کی تبلیغ کا حق واجب ہے جس کا ادا کرنا سب مسلمانوں پر جو احکام کے مکلّف ہیں فرض ہے اسی طرح بعض آداب قرآن کی تنزیل سے بھی متعلق ہیں جن کے ادا کرنے کا تعلق آپ سے ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ) قرآن (پڑھنے) میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہو چکے عجلت نہ کیا کیجئے (کہ اس میں آپ کو تکلیف ہوتی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام سے سُننا اور اس کو پڑھنا ساتھ ساتھ کرنا پڑتا ہے سو ایسا نہ کیجئے اور اس کا اندیشہ نہ کیجئے کہ شاید یاد نہ رہے یاد کرانا ہمارے ذمّہ ہے) اور آپ (بھی یاد ہونے کے لئے ہم سے) یہ دُعا کیجئے کہ

اے میرے رَبّ میرا علم بڑھادے (اس میں علم حاصل کے یاد رہنے کی اور غیر حاصل کے حصول کی اور جو حاصل ہونے والا نہیں اُس میں عدم حصول ہی کو خیر اور مصلحت سمجھنے کی اور سب علوم میں خوش فہمی کی یہ سب دُعائیں داخل ہیں تو وَلَا تَعۡجَلۡ کے بعد اس کا آنا نہایت ہی مناسب ہوا حاصل یہ کہ تدابیر حفظ میں سے تدبیر تعجیل کو ترک کیجئے اور تدبیر دُعا کو اختیار کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَقَدۡ اٰتَيۡنٰكَ مِنۡ لَّدُنَّا ذِكۡرًا ﴿۹۹﴾ ذکر سے مراد اس جگہ جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن ہے مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡهُ فَاِنَّهٗ يَحۡمِلُ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وِزۡرًا ﴿۱۰۰﴾ یعنی جو شخص قرآن سے اعراض (روگردانی) کرے گا قیامت کے روز اس کے اوپر گناہوں کا بڑا بوجھ لدا ہوگا۔ قرآن سے اعراض کی مختلف صورتیں ہیں اس کی تلاوت کی طرف کوئی دھیان ہی نہ کرے نہ کبھی قرآن پڑھنے اور سیکھنے کی فکر کرے یا قرآن کو پڑھے مگر غلط سلط پڑھے تصحیح حروف کی فکر نہ کرے یا صحیح بھی پڑھے مگر بے دلی اور بے پروائی سے پڑھے یا کسی دُنیوی مال وعزّت کی خواہش سے پڑھے۔ اسی طرح قرآن کے احکام کو سمجھنے کی طرف توجہ نہ دینا بھی قرآن سے اعراض ہے اور سمجھنے کے بعد اُن پر عمل کرنے میں کوتاہی یا اس کے احکام کی خلاف ورزی یہ تو اعراض کا انتہائی درجہ ہے۔ غرض قرآن کے حقوق سے بے پروائی کرنے کا بڑا وبال ہے جو قیامت کے روز بار گراں بن کر اس کی گردن پر لاد دیا جائے گا جیسا کہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ انسان کے بُرے اعمال اور گناہ قیامت کے روز ایک بارگراں بن کر اس کے اوپر لادا جائے گا۔[۱]

يُنۡفَخُ فِي الصُّوۡرِ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ ایک گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ صُور کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک سینگ ہے جس میں پھونک ماری جائے گی،[۲] مراد یہ ہے کہ سینگ کی طرح کی کوئی چیز ہے جس میں فرشتہ کی پھونک مارنے کا پوری دُنیا پر یہ اثر ہوگا کہ سب مُردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے حقیقت اس صُور کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ صحیح حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ابتداء وحی میں جب جبرئیل امین کوئی آیت قرآن لے کر آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سُناتے تو آپ اُن کے ساتھ ساتھ آیت کو پڑھنے کی بھی کوشش فرماتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یاد سے نکل جائے اس میں آپ پر دوہری مشقت ہوتی تھی اوّل قرآن کو جبرئیل سے سُننے اور سمجھنے کی اس کے ساتھ اس کو یاد رکھنے کے لئے اپنی زبان سے ادا کرنے کی، حق تعالیٰ نے اس

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۷۲۶۵

[۲] جامع الترمذی، ابواب صفة القیامة، باب ما جاء فی شأن الصور ج:۲ ص:۶۹

آیت میں نیز سورۂ قیامہ کی آیت لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ (القیامۃ:۱۶) میں آپ کے لئے آسانی یہ پیدا فرمادی [۱] کہ جو آیات قرآن آپ پر نازل کی جاتی ہیں اُن کا یاد رکھنا آپ کی ذمہ داری نہیں وہ ہمارے ذمہ ہے ہم خود آپ کو یاد کرادیں گے اس لئے آپ کو جبرئیل امین کے ساتھ ساتھ پڑھنے اور زبان کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں آپ اُس وقت صرف اطمینان کے ساتھ سُنا کریں البتہ یہ دُعا کرتے رہیں کہ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ یعنی اے میرے پروردگار! میرا علم بڑھا دیجئے۔ اس جامع دُعا میں نازل شدہ قرآن کا یاد رکھنا بھی داخل ہے اور غیر نازل شدہ کی طلب بھی اور اُس کے سمجھنے کی توفیق بھی۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۶ / ۱۵

اور ہم نے تاکید کردی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے، مگر نہ مانا ابلیس نے

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ

پھر کہہ دیا ہم نے اے آدم یہ دشمن تیرا ہے اور تیرے جوڑے کا سو نکلوا نہ دے تم کو بہشت سے،

فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ لا وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا

پھر تو پڑ جائے تکلیف میں، تجھ کو یہ ملا ہے کہ نہ بھوکا ہو تو اس میں

وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ

اور نہ ننگا اور یہ کہ نہ پیاس کھینچے تو اس میں اور نہ دھوپ پھر جی میں ڈالا اس کے شیطان نے کہا اے آدم میں بتاؤں تجھ کو

عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا

درخت سدا زندہ رہنے کا اور بادشاہی جو پُرانی نہ ہو پھر دونوں نے کھالیا اُس میں سے پھر کھل گئیں اُن پر ان کی بُری چیزیں

[۱] تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۲۹۷

وَطَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ ۚ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

اور لگے گانٹھنے اپنے اوپر پتے بہشت کے اور حکم ٹالا آدم نے اپنے ربّ کا پھر راہ سے بہکا

ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِيۡعًا

پھر نواز دیا اس کو اُس کے ربّ نے پھر متوجہ ہوا اُس پر اور راہ پر لایا فرمایا اُترو یہاں سے دونوں اکٹھے

بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ

رہو ایک دوسرے کے دشمن پھر اگر پہنچے تم کو میری طرف سے ہدایت پھر جو چلا میری بتلائی راہ پر

فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً

سو وہ نہ بہکے گا اور نہ وہ تکلیف میں پڑے گا اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گزران

ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِىۡۤ اَعۡمٰى

تنگی کی اور لائیں گے ہم اس کو دن قیامت کے اندھا وہ کہے گا اے ربّ کیوں اُٹھالایا تو مجھ کو اندھا

وَقَدۡ كُنۡتُ بَصِيۡرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا ۚ

اور میں تو تھا دیکھنے والا فرمایا یونہی پہنچی تھیں تجھ کو ہماری آیتیں پھر تو نے ان کو بھلادیا،

وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ اَسۡرَفَ وَلَمۡ يُؤۡمِنۡۢ

اور اسی طرح آج تجھ کو بھلادیں گے اور اسی طرح بدلہ دیں گے ہم اس کو جو حد سے نکلا اور یقین نہ لایا

بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبۡقٰى ﴿۱۲۷﴾

اپنے ربّ کی باتوں پر اور آخرت کا عذاب سخت ہے اور بہت باقی رہنے والا

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک بات کی تاکید کی تھی، پھر اُن سے بھول ہوگئی، اور ہم نے اُن میں عزم نہیں پایا۔ ﴿۱۱۵﴾ یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو، چنانچہ سب نے سجدہ کیا، البتہ اِبلیس تھا جس نے انکار کیا۔ ﴿۱۱۶﴾ چنانچہ ہم نے کہا کہ: ''اے آدم! یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دُشمن ہے، لہٰذا ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوادے، اور تم مشقت میں پڑ جاؤ۔ ﴿۱۱۷﴾ یہاں تو تمہیں یہ فائدہ ہے کہ نہ تم بھوکے ہوگے، نہ ننگے، ﴿۱۱۸﴾ اور نہ یہاں پیاسے رہوگے، نہ دُھوپ میں تپوگے۔'' ﴿۱۱۹﴾ پھر شیطان نے اُن کے دِل میں وسوسہ ڈالا۔ کہنے لگا: ''اے آدم! کیا میں تمہیں ایک ایسا درخت بتاؤں جس سے جاودانی زندگی اور وہ بادشاہی حاصل ہوجاتی ہے جو کبھی پرانی نہیں پڑتی؟'' ﴿۱۲۰﴾ چنانچہ ان دونوں نے اُس درخت میں سے کچھ کھالیا جس سے اُن دونوں کے شرم کے مقامات اُن کے سامنے کھل گئے، اور وہ دونوں جنت کے پتوں کو اپنے اُوپر گانٹھنے لگے۔ اور (اس طرح) آدم نے اپنے رَبّ کا کہا ٹالا، اور بھٹک گئے۔ ﴿۱۲۱﴾ پھر اُن کے رَبّ نے اُنہیں چن لیا، چنانچہ ان کی توبہ قبول فرمائی، اور انہیں ہدایت عطا فرمائی۔ ﴿۱۲۲﴾ اللہ نے فرمایا: ''تم دونوں کے دونوں یہاں سے نیچے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دُشمن ہوگے۔ پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے، تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گمراہ ہوگا، اور نہ کسی مشکل میں گرفتار ہوگا۔ ﴿۱۲۳﴾ اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اُس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی، اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا کرکے اُٹھائیں گے۔ ﴿۱۲۴﴾ وہ کہے گا کہ: ''یا رَبّ! تو نے مجھے اندھا کرکے کیوں اُٹھایا، حالانکہ میں تو آنکھوں والا تھا؟'' ﴿۱۲۵﴾ اللہ کہے گا: ''اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں، مگر تو نے اُنہیں بھلادیا۔ اور آج اُسی طرح تجھے بھلادیا جائے گا۔'' ﴿۱۲۶﴾ اور جو شخص حد سے گذر جاتا ہے، اور اپنے پروردگار کی نشانیوں پر اِیمان نہیں لاتا، اُسے ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب واقعی زیادہ سخت اور زیادہ دیر رہنے والا ہے۔ ﴿۱۲۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اس سے (بہت زمانہ) پہلے ہم آدم (علیہ السلام) کو ایک حکم دے چکے تھے (جس کا بیان آگے آتا ہے) سو ان سے غفلت (اور بے احتیاطی) ہوگئی اور ہم نے (اس حکم کے اہتمام میں) ان میں پختگی (اور ثابت قدمی) نہ پائی اور (اس اجمال کی تفصیل اگر مطلوب ہو تو) وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کے

سامنے سجدہ (تحیت) کرو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے (کہ) اُس نے انکار کیا پھر ہم نے (آدم سے) کہا کہ اے آدم (یاد رکھو) یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بی بی کا (اس وجہ سے) دشمن ہے (کہ تمہارے معاملہ میں مردود ہوا) سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوادے (یعنی اس کے کہنے سے کوئی ایسا کام مت کر بیٹھنا کہ جنت سے باہر کئے جاؤ) پھر مصیبت (اکتسابِ معاش) میں پڑ جاؤ (اور ساتھ میں تمہاری بی بی بھی، مگر زیادہ حصّہ مصیبت کا تم کو بھگتنا پڑے اور) یہاں جنت میں تو تمہارے لئے یہ (آرام) ہے کہ نہ تم کبھی بھوکے ہوگے (جس سے تکلیف ہو یا اس کی تدبیر میں دیر اور پریشانی ہو) اور نہ ننگے ہوگے (کہ کپڑا نہ ملے یا احتیاج کے اتنی دیر بعد ملے کہ تکلیف ہونے لگے) اور نہ یہاں پیاسے ہوگے (کہ پانی نہ ملے یا دیر ہونے سے تکلیف ہو) اور نہ دھوپ میں تپو گے (کیونکہ جنت میں دھوپ ہی نہیں اور مکان بھی ہر طرح پناہ کے ہیں بخلاف اس حالت کے کہ اگر جنت سے نکل کر دُنیا میں گئے تو یہ ساری مصیبتیں پیش آئیں گی اس لئے ان اُمور کو پیشِ نظر رکھ کر خوب ہی ہوشیاری و بیداری سے رہنا) پھر ان کو شیطان نے (جھانسہ دیا یعنی) بہکایا، کہنے لگا کہ اے آدم کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلادوں (کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ شاد و آباد رہو) اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف نہ آئے سو (اس کے بہکانے سے) دونوں نے اس درخت سے کھالیا (جس سے ممانعت ہوئی تھی اور شیطان نے اس کو شجرۃ الخلد کہہ کر بہکایا تھا) تو (اس کے کھاتے ہی) ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور (اپنا بدن ڈھانکنے کو) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت (کے درختوں) کے پتّے چپکانے لگے اور آدم سے اپنے رَبّ کا قصور ہوگیا سو (جنت میں ہمیشہ رہنے کا مقصد حاصل کرنے کے باب میں) غلطی میں پڑ گئے پھر (جب اُنہوں نے معذرت کی تو) ان کے رَبّ نے (زیادہ) مقبول بنالیا سو ان پر (مہربانی سے) توجہ فرمائی اور راہ (راست) پر ہمیشہ قائم رکھا (کہ پھر ایسی خطا نہیں ہوئی اور جب درخت کھالیا تو) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے دونوں جنت سے اُترو (اور دُنیا میں) ایسی حالت سے جاؤ کہ (تمہارے فرزندوں میں) ایک کا دشمن ایک ہوگا پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت (کا ذریعہ یعنی رسول یا کتاب) پہنچے تو (تم میں) جو شخص میری اس ہدایت کا اتباع کرے گا تو وہ نہ (دُنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) شقی ہوگا، اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے (قیامت سے پہلے دنیا اور قبر میں) تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے (قبر سے) اُٹھائیں گے وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رَبّ آپ نے مجھ کو اندھا کر کے کیوں اُٹھایا میں تو (دُنیا میں) آنکھوں والا تھا (مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی) ارشاد ہوگا کہ (جیسی تجھ کو سزا ہوئی ہے) ایسا ہی (تجھ سے عمل ہوا تھا وہ یہ کہ) تیرے پاس (انبیاء و علماء کے واسطے سے) ہمارے احکام پہنچے تھے پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور ایسا ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جائے گا (جیسا تو نے خیال نہ کیا تھا) اور (جس طرح کہ یہ سزا مناسب عمل دی گئی) اسی طرح (ہر) اُس شخص کو ہم (مناسب عمل) سزا دیں

گے جو حد (اطاعت) سے گزر جائے اور اپنے رَبّ کی آیتوں پر ایمان نہ لائے اور واقعی آخرت کا عذاب ہے بڑا سخت اور بڑا دیرپا (کہ اس کی کہیں انتہاء ہی نہیں تو اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام کرنا واجب ہے)۔

معارف ومسائل

ربط

یہاں سے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوتا ہے یہ قصہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ اور اعراف میں پھر کچھ سورۂ حجر اور سورۂ کہف میں گزر چکا ہے اور آخر میں سورۂ ص میں آئے گا، ہر مقام پر اس کے مناسب اجزائے قصہ کو مع ہدایاتِ متعلقہ کے بیان کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس قصہ کی مناسبت پچھلی آیات سے حضرات مفسرین نے مختلف پہلوؤں سے بیان فرمائی ہے اُن میں سب سے زیادہ روشن اور بے غبار بات یہ ہے کہ سابقہ آیات میں یہ ارشاد آیا ہے كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ [1] (طٰہٰ:۹۹) اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ کی نبوّت ورسالت کے اثبات اور آپ کی اُمت کو متنبہ کرنے کے لئے ہم انبیائے سابقین کے حالات وواقعات آپ سے بیان کرتے ہیں جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی قصہ اس آیت سے پہلے بیان ہو چکا ہے اور ان تمام قصوں میں سب سے پہلا اور بعض حیثیات میں سب سے اہم حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ہے۔ یہاں سے اس کو شروع کیا گیا ہے جس میں اُمّتِ محمدیہ کو اس پر تنبیہ کرنا ہے کہ شیطان تمام بنی آدم کا پُرانا دشمن ہے اس نے سب سے پہلے تمہارے ماں باپ سے اپنی دُشمنی نکالی اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں اور ہمدردانہ مشوروں کے جال پھیلا کر اُن کو ایک لغزش میں مبتلا کر دیا جس کے نتیجے میں جنت سے اُترنے کے احکام جاری ہوئے اور جنت کی پوشاک اُن سے سلب ہوگئی، پھر حق تعالیٰ کی طرف رُجوع اور لغزش کی معافی ہو کر ان کو رسالت ونبوّت کا مقامِ بلند عطا ہوا۔ اس لئے تمام بنی آدم کو اغوائے شیطانی سے کبھی بے فکر نہ ہونا چاہئے، اَحکامِ دین کے معاملے میں شیطانی وساوس اور حیلوں سے بچنے کا بڑا اہتمام کرنا چاہئے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ اس میں لفظ عَهِدْنَا اَمَرْنَا یا وَصَّيْنَا کے معنے میں ہے (بحرِ محیط) [2] مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس واقعہ کے متعلق آپ سے بہت پہلے آدم علیہ السلام کو ایک وصیت کی تھی یعنی تاکیدی حکم دیا تھا (جس کا ذکر سورۂ بقرہ وغیرہ میں بھی آچکا ہے اور آگے بھی کچھ آرہا ہے) کہ ایک درخت کو معیّن کر کے

[1] ترجمہ: اسی طرح ہم آپ سے اَور واقعاتِ گزشتہ کی خبریں بھی بیان کرتے رہتے ہیں۔

[2] تفسير البحر المحيط تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۱۲۵

بتلادیا تھا کہ اس درخت کو یعنی اس کے پھل پھول یا کسی جزء کو نہ کھانا اور اس کے قریب بھی نہ جانا، باقی ساری جنت کے باغات اور نعمتیں تمہارے لئے کھلی ہوئی ہیں اُن کو استعمال کرتے رہو اور جیسا کہ آگے آتا ہے یہ بھی بتلادیا تھا کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے کہیں اس کے بہکانے میں نہ آجانا کہ تمہارے لئے مصیبت بنے مگر آدم علیہ السلام بھول گئے اور اُن میں ہم نے ارادہ کی پختگی نہ پائی۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں ایک نِسیَان دوسرے عزم، نسیان کے معنی مشہور ہیں بھول جانا، غفلت میں پڑ جانا اور عزم کے لفظی معنی کسی کام کے لئے اپنے ارادے کو مضبوط باندھنے کے ہیں۔ ان دونوں لفظوں سے مراد اس جگہ کیا ہے اس کے سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور پیغمبر سب کے سب گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

پہلے لفظ میں حضرت آدم علیہ السلام پر نسیان اور بھول طاری ہوجانے کا ذکر ہے اور چونکہ بھول اور نسیان غیر اختیاری امر ہے اس لئے اس کو گناہ ہی میں شمار نہیں کیا گیا جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیْ الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ،[1] یعنی میری اُمت سے خطا اور نسیان کا گناہ معاف کردیا گیا ہے اور قرآن کریم کا ارشادِ عام ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ:۲۸۶) یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اس کے اختیار وقدرت سے باہر ہو۔ لیکن یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم میں ایسے اسباب بھی رکھے ہیں کہ ان کو پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو انسان بھول اور خطا سے بچ سکتا ہے انبیاء علیہم السلام چونکہ حق تعالیٰ کے مقربین خاص ہیں اُن سے اتنی بات پر بھی مواخذہ ہوسکتا ہے کہ اُن اسبابِ اختیاریہ سے کیوں کام نہ لیا جن کے ذریعہ اس بھول سے بچ سکتے تھے۔ بسا اوقات ایک وزیر سلطنت کے لئے وہ کام قابلِ مؤاخذہ سمجھا جاتا ہے جو عام نوکروں کے لئے قابلِ انعام ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ، یعنی اُمت کے صالحین اور نیک لوگوں کے بہت سے نیک عمل مقربان بارگاہِ الٰہی کے حق میں سیئات اور لغزش قرار دی جاتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا یہ واقعہ اول تو نبوّت ورسالت سے پہلے کا ہے جس میں کسی گناہ کا صدور انبیاء سے بعض علمائے اہلِ سنت کے نزدیک عصمت کے خلاف نہیں۔ دوسرے درحقیقت یہ بھول ہے جو گناہ نہیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کے مقام بلند اور تقرب حق سبحانہ وتعالیٰ کے لحاظ سے اس کو بھی اُن کے حق میں ایک لغزش قرار دی گئی جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور اُن کو متنبہ کرنے کے لئے اس لغزش کو عصیان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

دوسرا لفظ عزم ہے اور اسی آیت میں یہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام میں عزم نہ پایا گیا اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ عزم کے

---

[1] کنز العمال رقم الحدیث:۱۰۳۰۷

معنی کسی کام کے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام حکمِ ربّانی کی تعمیل کا مکمّل فیصلہ اور قصد کئے ہوئے تھے مگر شیطانی وساوس سے اس قصد کی مضبوطی میں فرق آ گیا اور بھول نے اُس پر قائم نہ رہنے دیا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ، یہ اُس عہد کا مختصر بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیا تھا اس میں تخلیقِ آدم کے بعد سب فرشتوں کو اور اُن کے ضمن میں ابلیس کو بھی، کیونکہ اس وقت تک ابلیس جنت میں فرشتوں کے ساتھ رہتا سہتا تھا یہ حکم دیا گیا کہ سب کے سب آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں سب فرشتوں نے سجدہ کر لیا مگر ابلیس نے انکار کر دیا جس کی وجہ دوسری آیات میں اس کا تکبر تھا کہ میں آگ سے بنا ہوں یہ مٹی سے، اور آگ بہ نسبت مٹی کے افضل و اشرف ہے میں اس کو سجدہ کیوں کروں، اس پر ابلیس تو ملعون ہو کر جنت سے نکالا گیا۔ حضرت آدم وحوّا کے لئے جنت کے سب باغات اور ساری نعمتوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور ہر چیز کے استعمال کی اجازت دی گئی صرف ایک معیّن درخت کے متعلق یہ ہدایت کی گئی کہ اس کو (یعنی اس کے پھل پھول وغیرہ کو) نہ کھائیں اور اس کے قریب بھی نہ جائیں۔ یہ مضمون بھی سورۂ بقرہ واعراف کی آیتوں میں آچکا ہے یہاں اس کا ذکر کرنے کے بجائے حق تعالیٰ نے اپنا وہ ارشاد ذکر کیا ہے جو اس عہد کے محفوظ رکھنے اور اس پر قائم رہنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ دیکھو شیطان ابلیس جیسا کہ واقعۂ سجدہ کے وقت ظاہر ہو چکا ہے تم دونوں یعنی آدم وحوّا کا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ وہ کسی مکر و حیلے سے دھوکہ دے کر تم سے اس عہد کی خلاف ورزی کرا دے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم جنت سے نکالے جاؤ۔ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ یعنی یہ شیطان کہیں تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے جس کی وجہ سے تم مصیبت اور مشقت میں پڑ جاؤ۔ لفظ تَشْقٰى شقاوت سے مشتق ہے۔ یہ لفظ دو معنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک شقاوتِ آخرت، دوسرے شقاوتِ دُنیا یعنی جسمانی مشقت ومصیبت۔ اس جگہ یہی دوسرے معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ پہلے معنی میں کسی پیغمبر کے لئے تو کیا کسی نیک مسلمان کے لئے بھی یہ لفظ نہیں بولا جا سکتا اسی لئے فرّاءؒ نے اس شقاوت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ''هُوَ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ كَدِّ يَدَيْهِ'' یعنی شقاوت سے اس جگہ مراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے خوراک حاصل کرنا پڑے گی (قرطبی) [1] اور اس جگہ قرینۂ مقام بھی دوسرے ہی معنی کے لئے شاہد ہے کیونکہ اس کے بعد کی آیت میں جنت کی نعمتوں میں سے اُن چار نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو ہر انسان کی زندگی کے لئے عمودی حیثیت رکھتی ہیں اور ضروریاتِ زندگی میں سب سے اہم ہیں۔ یعنی کھانا، پینا، لباس اور مسکن۔ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ سب نعمتیں جنت میں تو بلا کسی کسب واکتساب اور محنت ومشقت کے ملتی ہیں۔ اس میں اشارہ پایا گیا کہ یہاں سے نکل گئے تو یہ نعمتیں سلب ہو جائیں گی اور شاید اسی اشارہ کے لئے یہاں جنت کی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ صرف اُن کا ذکر کیا جن پر انسانی زندگی موقوف ہے اور اس سے ڈرایا گیا کہ شیطانی اغواء میں آ کر کہیں ایسا نہ ہو کہ جنت سے نکالے جاؤ اور

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۱ ص:۲۵۳

یہ سب نعمتیں سلب ہو جائیں اور پھر زمین پر اُن ضروریاتِ زندگی کو بڑی محنت مشقت اُٹھا کر حاصل کرنا پڑے یہ مفہوم لفظ فَتَشۡقٰی کا ہے جو جمہور مفسرین نے لکھا ہے۔ امام قرطبی نے اس جگہ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آدم علیہ السلام جب زمین پر تشریف لائے تو جبرئیلؑ نے جنت سے کچھ دانے گیہوں چاول وغیرہ کے لاکر دیئے کہ اُن کو زمین میں کاشت کرو پھر جب یہ پودا نکلے اور اُس پر دانے جمیں تو اس کو کاٹو پھر پیس کر روٹی بناؤ اور ان سب کاموں کے طریقے بھی حضرت آدم کو سُجھا دیئے اس کے مطابق آدم علیہ السلام نے روٹی پکائی اور کھانے کے لئے بیٹھے تھے کہ روٹی ہاتھ سے چھوٹ کر پہاڑ کے نیچے لڑھک گئی آدم علیہ السلام اس کے پیچھے چلے اور بڑی محنت کر کے واپس لائے تو جبرئیل امین نے کہا کہ اے آدم آپ کا اور آپ کی اولاد کا رزق زمین پر اسی طرح محنت مشقت سے حاصل ہوگا۔ (قرطبی)[1]

بیوی کا نفقہ ضروریہ شوہر کے ذمہ ہے

اس مقام پر شروع آیت میں حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت حوّاء کو بھی خطاب میں شریک کیا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوۡجِكَ فَلَا يُخۡرِجَنَّكُمَا مِنَ الۡجَنَّةِ جس میں بتلایا ہے کہ شیطان آپ کا بھی دشمن ہے اور آپ کی بیوی کا بھی اور یہ کہ ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو یہ جنت سے نکلوا دے مگر آخر آیت میں لفظ فَتَشۡقٰی ﴿۱۱۷﴾ کو مفرد استعمال فرمایا بیوی کو اس میں شریک نہیں کیا ورنہ بمقتضائے مقام فَتَشۡقَيَا کہا جاتا ہے۔ امام قرطبی نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ ضروریاتِ زندگی بیوی کی مرد کے ذمّہ ہیں ان کے حصول میں جو محنت و مشقت ہو اس کا تنہا ذمہ دار مرد ہے اسی لئے فَتَشۡقٰی ﴿۱۱۷﴾ بصیغۂ مفرد لاکر اشارہ کر دیا کہ زمین پر اُتارے گئے تو ان ضروریاتِ زندگی کی تحصیل میں جو کچھ محنت مشقت اُٹھانا پڑے گی وہ حضرت آدم علیہ السلام پر پڑے گی کیونکہ حوّاء کا نفقہ اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ان کے ذمّہ ہے۔

نفقۂ واجبہ صرف چار چیزیں ہیں

قرطبی نے فرمایا کہ اسی آیت نے ہمیں یہ بھی بتلا دیا کہ عورت کا جو نفقہ مرد کے ذمّہ ہے وہ صرف چار چیزیں ہیں۔ کھانا پینا اور لباس اور مسکن۔ اس سے زائد جو کچھ شوہر اپنی بیوی کو دیتا یا اُس پر خرچ کرتا ہے وہ تبرّع واحسان ہے واجب ولازم نہیں۔[2] اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی کے علاوہ جس کسی کا نفقہ شریعت نے کسی شخص کے ذمّہ عائد کیا ہے اس میں بھی چار چیزیں اس کے ذمّہ واجب ہوتی ہیں جیسے ماں باپ کا نفقہ اولاد کے ذمّہ جبکہ وہ محتاج اور معذور ہوں وغیر ذلک جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

---

[1] [2] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج: ۱۱ ص: ۲۵۳

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿١١٨﴾ جنت میں ضروریاتِ زندگی کی یہ بنیادی چاروں چیزیں بے مانگے بلا مشقت ملتی ہیں۔ اور جنت میں بھوک نہ لگنے سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب تک بھوک نہ لگے کھانے کا ذائقہ اور لذّت ہی نہیں آسکتی، اسی طرح جب تک پیاس نہ ہو ٹھنڈے پانی کی لذت وراحت نہیں محسوس ہوسکتی۔ وجہ یہ ہے کہ جنت میں بھوک پیاس نہ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ بھوک پیاس کی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی کہ بھوک کے وقت کھانے کو اور پیاس کے وقت پینے کو نہ ملے یا دیر میں ملے بلکہ ہر وہ چیز جس کو اس کا دل چاہے گا فوراً حاضر موجود ملے گی۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ إلی قولہ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿١٢١﴾ اس آیت میں جو یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم وحوا کو کسی خاص درخت کے کھانے اور اُس کے پاس جانے سے بھی روک دیا تھا اور اُس پر مزید یہ تنبیہ بھی فرمادی تھی کہ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے اس کے مکر وکید سے بچتے رہنا وہ کہیں تمہیں جنت سے نہ نکلوادے اتنی واضح ہدایتوں کے بعد بھی یہ پیغمبر عالی مقام شیطان کے دھوکہ میں کس طرح آگئے اور یہ کہ یہ تو کھلی نافرمانی اور گناہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ورسول ہیں اُن سے یہ گناہ کیسے سرزد ہوا جبکہ جمہور اُمّت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ اِن سب سوالات کا جواب سورۂ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اوّل صفحہ: ۲۲۲ پر گزر چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ اور اس آیت میں جو حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت صاف لفظوں میں عَصٰى اور پھر غَوٰى فرمایا گیا ہے اس کی وجہ بھی سورۂ بقرہ میں بیان ہوچکی ہے کہ اگرچہ آدم علیہ السلام کا یہ عمل شرعی قانون کی رُو سے گناہ میں داخل نہیں تھا لیکن حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور مقربین خاص میں سے ہیں اس لئے اُن کی ادنیٰ لغزش کو بھی بھاری لفظوں سے عصیان کہہ کر تعبیر کیا گیا اور اِس پر عتاب کیا گیا اور لفظ غَوٰى دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک معنی زندگی تلخ ہوجانے اور عیش خراب ہوجانے کے ہیں۔ دوسرے معنی گمراہ ہوجانے یا غافل ہوجانے کے۔ ائمۂ تفسیر قشیری اور قرطبی وغیرہ نے اس جگہ لفظ غَوٰى کے پہلے معنی ہی کو اختیار کیا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عیش جنت میں حاصل تھا وہ نہ رہا تو زندگی تلخ ہوگئی۔[1]

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک اہم ہدایت، اُن کے ادب واحترام کی حفاظت

قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں آیتِ مذکورہ میں جو الفاظ عَصٰى وغیرہ آدم علیہ السلام کے بارے میں ہیں اس سلسلہ میں اُنہوں نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے وہ اُنہیں کے الفاظ میں یہ ہے:

لَا يَجُوْزُ لِاَحَدِنَا الْيَوْمَ اَنْ يُّخْبِرَ بِذٰلِكَ عَنْ اٰدَمَ اِلَّا اِذَا ذَكَرْنَاهُ فِيْ اَثْنَاءِ قَوْلِهٖ تَعَالٰى عَنْهُ اَوْ

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۱ ص:۲۵۷

قَوْلِ نَبِيِّهٖ، فَاَمَّا اَنْ يَّبْتَدِئَ ذٰلِكَ مِنْ قِبَلِ نَفْسِهٖ فَلَيْسَ بِجَائِزٍ لَنَا فِيْ اٰبَائِنَا الْاَدْنَيْنَ اِلَيْنَا الْمُمَاثِلِيْنَ لَنَا فَكَيْفَ فِيْ اَبِيْنَا الْاَقْدَمِ الْاَعْظَمِ الْاَكْرَمِ النَّبِيِّ الْمُقَدَّمِ الَّذِيْ عَذَرَهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى وَتَابَ عَلَيْهِ وَغَفَرَ لَهٗ۔ (ازتفسیر قرطبی وذکرہ فی البحر المحیط ایضًا) [۱]

ہم میں سے کسی کے لئے آج یہ جائز نہیں کہ آدم علیہ السلام کی طرف یہ لفظ عصیان منسوب کرے بجز اس کے کہ قرآن کی اس آیت کی یا کسی حدیثِ نبوی کے ضمن میں آیا ہو وہ بیان کرے لیکن یہ کہ اپنی طرف سے یہ لفظ منسوب کرنا ہمارے اپنے قریبی آباء واجداد کے لئے بھی جائز نہیں، پھر ہمارے سب سے پہلے باپ جو ہر حیثیت میں ہمارے آباء سے مقدم اور اعظم واکرم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معزز ہیں جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور معافی کا اعلان کر دیا ان کے لئے تو کسی حال میں جائز نہیں۔

اسی لئے قشیری ابونصر نے فرمایا کہ اس لفظ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی اور غاوی کہنا جائز نہیں اور قرآنِ کریم میں جہاں کہیں کسی نبی یا رسول کے بارے میں ایسے الفاظ آئے ہیں یا تو وہ خلاف اولیٰ اُمور ہیں یا نبوّت سے پہلے کے ہیں۔ اس لئے بضمن آیاتِ قرآن وروایاتِ حدیث تو اُن کا تذکرہ درست ہے لیکن اپنی طرف سے اُن کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ (قرطبی) [۲]

اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا، یعنی اتر جاؤ جنت سے (دونوں) یہ خطاب حضرت آدم وابلیس دونوں کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور اس صورت میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کا مضمون واضح ہے کہ دُنیا میں جا کر بھی شیطان کی دشمنی جاری رہے گی اور اگر یہ کہا جائے کہ شیطان کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی جنت سے نکالا جا چکا تھا اب اس کو اس خطاب میں شریک قرار دینا بعید ہے تو دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ خطاب آدم وحواء علیہما السلام دونوں کو ہو۔ اس صورت میں باہمی عداوت سے مراد ان کی اولاد میں باہمی عداوت ہونے کو بیان کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اولاد میں باہمی عداوت ماں باپ کی زندگی بھی تلخ کر دیتی ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ، یہاں ذکر سے مراد قرآن بھی ہوسکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک بھی جیسا کہ دوسری آیات میں ذِكْرًا ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا (الطّلاق) آیا ہے دونوں کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص قرآن سے یا رسول سے اعراض کرے یعنی قرآن کی تلاوت اور اس کے احکام پر عمل سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اعراض کرے اُس کا انجام یہ ہے کہ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ یعنی اس کی معیشت تنگ ہوگی اور قیامت میں اس کو اندھا کر کے اُٹھایا جائے گا۔ پہلا عذاب دُنیا ہی میں اس کو مل جائے گا اور دوسرا یعنی اندھا ہونے کا عذاب قیامت میں ہوگا۔

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۱ ص:۲۵۵، ۲۵۶، واحکام القرآن لابن العربیؒ ج:۵ ص:۲۶۰

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۲۵۷

کافر اور بدکار کی زندگی دُنیا میں تلخ اور تنگ ہونے کی حقیقت

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ دُنیا میں معیشت کی تنگی تو کفار وفجّار کے لئے مخصوص نہیں، مؤمنین صالحین کو بھی پیش آتی ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ شدائد ومصائب اس دُنیا کی زندگی میں اُٹھانے پڑتے ہیں۔ صحیح بخاری اور تمام کتبِ حدیث میں روایت سعدؓ وغیرہ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا کی بلائیں اور مصیبتیں سب سے زیادہ انبیاء پر سخت ہوتی ہیں اُن کے بعد جو جس درجہ کا صالح اور ولی ہے اُسی کی مناسبت سے اس کو یہ تکلیفیں پہنچتی ہیں۔[1] اس کے بالمقابل عموماً کفار وفجار کو خوشحال اور عیش وعشرت میں دیکھا جاتا ہے تو پھر یہ ارشادِ قرآنی کہ اُن کی معیشت تنگ ہوگی آخرت کے لئے تو ہوسکتا ہے دُنیا میں خلاف مشاہدہ معلوم ہوتا ہے۔

اس کا صاف بے غبار جواب تو یہ ہے کہ یہاں دُنیا کے عذاب سے قبر کا عذاب مراد ہے کہ قبر میں اُن کی معیشت تنگ کردی جائے گی۔ خود قبر جو اُن کا مسکن ہوگا وہ اُن کو ایسا دبائے گا کہ اُن کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں گی جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح ہے[2] اور مسند بزار میں بسند جیّد حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس آیت کے لفظ مَعِيْشَةً ضَنْكًا کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ اس سے مراد قبر کا عالم ہے۔ (مظہری)[3]

اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے تنگیٔ معیشت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اُن سے قناعت کا وصف سلب کرلیا جائے گا اور حرصِ دُنیا بڑھادی جائے گی (مظہری)[4] جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کے پاس کتنا ہی مال ودولت جمع ہوجائے کبھی قلبی سکون اس کو نصیب نہیں ہوگا ہمیشہ مال بڑھانے کی فکر اور اس میں نقصان کا خطرہ اس کو بے چین رکھے گا۔ اور یہ بات عام اہلِ تموّل میں مشاہد ومعروف ہے جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے پاس سامانِ راحت تو بہت جمع ہوجاتا ہے مگر جس کا نام راحت ہے وہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ وہ قلب کے سکون واطمینان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ

سو کیا اُن کو سمجھ نہ آئی اس بات سے کہ کتنی غارت کردیں ہم نے اُن سے پہلے جماعتیں یہ لوگ پھرتے ہیں ان کی جگہوں میں

---

[1] جامع الترمذی، ابواب الزهد، باب الصبر علی البلاء ج:٢ ص:٦٥

[2] جامع الترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر، ج:٢ ص:٢٠٥

[3] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:١٧١، ١٧٢، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحدیث: ٣٤٣٩، ومجمع الزوائد رقم الحدیث: ١١١٧٠

[4] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:١٧١، ١٧٢

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ﴿١٢٨﴾ ع وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ

اس میں خوب نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کو اور اگر نہ ہوتی ایک بات کہ نکل چکی تیرے رب کی طرف سے

لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾ ط فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ

تو ضرور ہوجاتی مٹھ بھیڑ اور اگر نہ ہوتا وعدہ مقرر کیا گیا سو تو سہتا رہ جو وہ کہیں اور پڑھتا رہ خوبیاں

رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ج وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ

اپنے رب کی سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور کچھ گھڑیوں میں رات کی پڑھا کر

وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ

اور دن کی حدوں پر شاید تو راضی ہو اور مت پسار اپنی آنکھیں اُس چیز پر جو فائدہ اُٹھانے کو دی ہم نے

أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ط وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ

ان طرح طرح کے لوگوں کو رونق دُنیا کی زندگی کی اُن کے جانچنے کو اور تیرے رب کی دی ہوئی روزی بہتر ہے

وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ط لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ط

اور بہت باقی رہنے والی اور حکم کر اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی قائم رہ اس پر ہم نہیں مانگتے تجھ سے روزی

نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ط وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿١٣٢﴾ وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ط

ہم روزی دیتے ہیں تجھ کو اور انجام بھلا ہے پرہیزگاری کا اور لوگ کہتے ہیں یہ کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب سے،

أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُم

کیا پہنچ نہیں چکی اُن کو نشانی اگلی کتابوں میں کی اور اگر ہم ہلاک کر دیتے اُن کو

بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

کسی آفت میں اس سے پہلے تو کہتے اے ربّ کیوں نہ بھیجا ہم تک کسی کو پیغام دے کر کہ ہم چلتے تیری کتاب پر

مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ج

ذلیل اور رُسوا ہونے سے پہلے تو کہہ ہر کوئی راہ دیکھتا ہے سو تم بھی راہ دیکھو

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ع　　ع ۸ / ۱۷

آئندہ جان لوگے کون ہیں سیدھی راہ والے اور کس نے راہ پائی

آسان ترجمۂ قرآن

پھر کیا ان لوگوں کو اس بات نے بھی کوئی ہدایت کا سبق نہیں دیا کہ ان سے پہلے کتنی نسلیں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا، جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے بھی ہیں؟ یقیناً جن لوگوں کے پاس عقل ہے، اُن کے لئے اس بات میں عبرت کے بڑے سامان ہیں۔ ﴿۱۲۸﴾ اور اگر تمہارے ربّ کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی، اور (اس کے نتیجے میں عذاب کی) ایک میعاد مقرر نہ ہوتی، تو لازمی طور پر عذاب (ان کو) چمٹ چکا ہوتا۔ ﴿۱۲۹﴾ لہٰذا (اے پیغمبر!) یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں، تم ان پر صبر کرو، اور سورج نکلنے سے پہلے اور اُس کے غروب سے پہلے اپنے ربّ کی تسبیح اور حمد کرتے رہو، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو، اور دن کے کناروں میں بھی، تاکہ تم خوش ہو جاؤ۔ ﴿۱۳۰﴾ اور دُنیوی زندگی کی اُس بہار کی طرف آنکھیں اُٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان (کافروں) میں سے مختلف لوگوں کو مزے اُڑانے کے لئے دے رکھی ہے، تاکہ ہم ان کو اُس کے ذریعے آزمائیں۔ اور تمہارے ربّ کا رزق سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دیرپا ہے۔ ﴿۱۳۱﴾ اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی اُس پر ثابت قدم رہو۔ ہم تم سے رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم تمہیں دیں گے۔ اور بہتر انجام تقویٰ ہی کا ہے۔ ﴿۱۳۲﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ”یہ (نبی) ہمارے پاس اپنے ربّ کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لے آتے؟“ بھلا کیا ان کے پاس پچھلے (آسمانی) صحیفوں کے مضامین کی گواہی نہیں آ گئی؟ ﴿۱۳۳﴾ اور اگر ہم انہیں اس (قرآن) سے پہلے ان کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ لوگ کہتے کہ: ”ہمارے پروردگار! آپ نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا، تاکہ ہم ذلیل اور رُسوا ہونے سے پہلے آپ کی آیتوں کی پیروی کرتے؟“ ﴿۱۳۴﴾ (اے پیغمبر!

ان سے) کہہ دو کہ: ''(ہم) سب انتظار کررہے ہیں، لہٰذا تم بھی انتظار کرو'' کیونکہ عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ سیدھے راستے والے لوگ کون ہیں، اور کون ہیں جو ہدایت پا گئے ہیں؟ ﴿۱۳۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(یہ معرضین جو اِعراض پر اِصرار کررہے ہیں تو) کیا ان لوگوں کو (اب تک) اس سے بھی ہدایت نہیں ہوئی کہ ہم اُن سے پہلے بہت سے گروہوں کو (اس اعراض ہی کے سبب عذاب سے) ہلاک کرچکے ہیں کہ اُن (میں سے بعض) کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ بھی چلتے (پھرتے) ہیں (کیونکہ شام کو جاتے ہوئے اہلِ مکہ کے رستہ میں بعض اُن قوموں کے مکانات آتے تھے) اُس (امر مذکور) میں تو اہل فہم کے (سمجھنے کے) لئے (کافی) دلائل (اعراض کے نتائجِ بد ہونے کے) موجود ہیں اور (اُن پر فوری عذاب نہ آنے سے جو اُن کو شبہ اپنے مذہب کے مذموم نہ ہونے کا ہوتا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اگر آپ کے رَبّ کی طرف سے ایک بات پہلے سے فرمائی ہوئی نہ ہوتی (وہ یہ کہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے ان کو مہلت دی جائے گی) اور (عذاب کے لئے) ایک میعاد معیّن نہ ہوتی (کہ وہ قیامت کا دن ہے) تو (اُن کے کفر واعراض کے اقتضاء سے) عذاب لازمی طور پر ہوتا (خلاصہ یہ کہ کفر تو مقتضی عذاب کا ہے لیکن ایک مانع کی وجہ سے توقف ہو رہا ہے پس اُن کا وہ شبہ اور فوری عذاب نہ آنے سے اپنے حق پر ہونے کا استدلال غلط ہے، غرض یہ کہ امہال ہے اہمال نہیں) سو (جب عذاب کا آنا یقینی ہے تو) آپ اُن کی (کفر آمیز) باتوں پر صبر کیجئے (اور بغض فی اللہ کی وجہ سے جو اُن پر غیظ آتا ہے اور ان پر تاخیر عذاب سے اضطراب ہوتا ہے اس اضطراب کو ترک کیجئے، اور اپنے رَبّ کی حمد (وثنا) کے ساتھ (اس کی) تسبیح (وتقدیس) کیجئے (اس میں نماز بھی آ گئی) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً نماز فجر) اور اس کے غروب سے پہلے (مثلاً نماز ظہر وعصر) اور اوقاتِ شب میں (بھی) کیا کیجئے (مثلاً نماز مغرب وعشاء) اور دن کے اوّل وآخر میں (تسبیح کرنے کے واسطے اہتمام کے لئے مکرر کہا جاتا ہے جس سے نماز فجر ومغرب کے ذکر کی بھی اہتماماً تکریر ہوگئی) تاکہ (آپ کو ثواب ملے) آپ (اُس سے) خوش ہوں (مطلب یہ کہ آپ اپنی توجہ معبود حقیقی کی طرف رکھئے لوگوں کی فکر نہ کیجئے) اور ہرگز اُن چیزوں کی طرف آپ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جیسا اب تک بھی نہیں دیکھا) جس سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو (مثلاً یہود ونصاریٰ ومشرکین کو) اُن کی آزمائش کے لئے متمتّع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے (مطلب اَوروں کو سُنانا ہے کہ جب معصوم نبی کے لئے یہ ممانعت ہے جن میں احتمال بھی نہیں تو غیر معصوم کو تو اس کا اہتمام کیونکر ضروری نہ ہوگا۔ اور آزمائش یہ کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے) اور آپ کے رَبّ کا عطیہ (جو

آخرت میں ملے گا) بدرجہا (اس سے) بہتر اور دیرپا ہے (کہ کبھی فنا ہی نہ ہوگا۔ خلاصہ کلام کا یہ ہوا کہ نہ اُن کے اِعراض بکسر الہمزہ کی طرف التفات کیا جائے نہ ان کے اَعراض بفتح الہمزہ یعنی اسبابِ عیش کی طرف، سب کا انجام عذاب ہے) اور اپنے متعلقین کو (یعنی اہلِ خاندان کو یا مؤمنین کو) بھی نماز کا حکم کرتے رہئے اور خود بھی اس کے پابند رہئے (یعنی زیادہ توجہ کے قابل یہ اُمور ہیں) ہم آپ سے اور (اسی طرح دوسروں سے ایسے) معاش (کموانا) نہیں چاہتے (جو طاعاتِ ضروریہ سے مانع ہوں) معاش تو آپ کو (اور اسی طرح اَوروں کو) ہم دیں گے (یعنی مقصود اصلی اکتساب نہیں بلکہ دین اور طاعت ہیں، اکتساب کی اُسی حالت میں اجازت یا امر ہے کہ ضروری طاعت میں وہ مخل نہ ہو) اور بہتر انجام تو پرہیزگاری ہی کا ہے۔ (اس لئے ہم حکم دیتے ہیں لَا تَمُدَّنَّ اور وَأْمُرْ أَهْلَكَ الخ اور معرضین کے بعض احوال واقوال جو اُوپر معلوم ہوئے اسی طرح اُن کا ایک اور قول بھی مذکور ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (عناداً) یُوں کہتے ہیں کہ یہ رسول ہمارے پاس کوئی نشانی (اپنی نبوّت کی) کیوں نہیں لاتے (آگے جواب ہے کہ) کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کے مضمون کا ظہور نہیں پہنچا (مراد اس سے قرآن ہے کہ اس سے کتبِ سابقہ کے مضمونِ پیشین گوئی کے صدق کا ظہور ہوگیا مطلب یہ کہ کیا اُن کے پاس قرآن نہیں پہنچا جس کی پہلے سے شہرت تھی کہ وہ نبوّت پر کافی دلیل ہے) اور اگر ہم ان کو قبل قرآن آنے کے (سزائے کفر میں) کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے (اور پھر قیامت کے روز اصلی سزا کفر کی دی جاتی کہ وہ لازم ہی تھی) تو یہ لوگ (بطور عذر کے) یُوں کہتے کہ اے ہمارے رَبّ آپ نے ہمارے پاس کوئی رسول (دُنیا میں) کیوں نہیں بھیجا تھا کہ ہم آپ کے احکام پر چلتے قبل اس کے کہ ہم (یہاں خود) بے قدر ہوں اور (دوسروں کی نگاہ میں) رُسوا ہوں (سو اب اس عذر کی بھی گنجائش نہیں رہی، اگر وہ یُوں کہیں کہ وہ عذاب کب ہوگا تو) آپ کہہ دیجئے کہ (ہم) سب انتظار کر رہے ہیں سو (چندے) اور انتظار کر لو اب عنقریب تم کو (بھی) معلوم ہو جائے گا کہ راہ راست والے کون ہیں اور وہ کون ہے جو (منزلِ) مقصود تک پہنچا (یعنی وہ فیصلہ عنقریب بعد موت یا بعد الحشر ظاہر ہو جائے گا)۔

معارف ومسائل

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ، يَهْدِ میں ضمیر فاعل هُدیٰ کی طرف راجع ہے جو اسی لفظ کے ضمن میں مذکور ہے اور هُدیٰ سے مراد قرآن یا رسول ہے تو معنے یہ ہیں کہ کیا قرآن یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یعنی اہلِ مکہ کو یہ ہدایت نہیں دی اور اس سے باخبر نہیں کیا کہ تم سے پہلے کتنی اُمتیں اور جماعتیں اپنی نافرمانی کی وجہ سے عذابِ خداوندی میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو چکی ہیں جن کے گھروں اور زمینوں میں اب تم چلتے پھرتے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں ضمیر فاعل اللہ تعالیٰ کی طرف

راجع ہو اور معنے یہ ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت نہیں دی الخ۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ، اہلِ مکہ جو ایمان سے بھاگنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرے بُرے کلمات سے یاد کرتے تھے، کوئی ساحر، کوئی شاعر، کوئی کاذب کہتا تھا، اُن کی ایذاؤں کا علاج قرآن کریم نے اس جگہ دو چیزوں سے بتلایا ہے: اوّل یہ کہ آپ ان کے کہنے کی طرف التفات نہ کریں بلکہ صبر کریں، دوسری چیز اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جانا ہے جو اگلے جملے میں وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

دشمنوں کی ایذاؤں سے بچنے کا علاج صبر اور اللہ کی یاد میں مشغول ہونا ہے

دشمنوں سے تو اس دُنیا میں کسی چھوٹے بڑے، اچھے بُرے انسان کو نجات نہیں ملتی۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے اور دشمن کتنا ہی حقیر و ضعیف ہو اپنے مخالف کو کچھ نہ کچھ ایذا پہنچا ہی دیتا ہے، زبانی گالی گلوچ ہی سہی، سامنے ہمت نہ ہو تو پیچھے ہی سہی۔ اس لئے دشمن کی ایذاؤں سے بچنے کی فکر ہر شخص کو ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ان کا بہترین اور کامیاب نسخہ دو چیزوں سے مرکب بیان فرمایا ہے۔ اول صبر یعنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور انتقام کی فکر میں نہ پڑنا دوسرے اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں مشغول ہو جانا۔ تجربہ شاہد ہے کہ صرف یہی نسخہ ہے جس سے ان ایذاؤں سے نجات مل سکتی ہے ورنہ انتقام کی فکر میں پڑنے والا کتنا ہی قوی اور بڑا اور صاحب اقتدار ہو بسا اوقات مخالف سے انتقام لینے پر قادر نہیں ہوتا اور یہ فکرِ انتقام ایک مستقل عذاب اُس کے لئے بن جاتا ہے اور جب انسان کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے اور وہ دھیان یہ کرے کہ اس دُنیا میں کوئی کسی کو کسی طرح کا نقصان یا ایذا بغیر مشیت خداوندی کے نہیں پہنچا سکتا اور اللہ تعالیٰ کے اعمال و افعال سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے جو صورت پیش آئی ہے اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی تو مخالف کی ایذاؤں سے پیدا ہونے والا غیظ و غضب خود بخود کافور ہو جاتا ہے اسی لئے آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكَ تَرْضٰی ﴿۱۳۰﴾ یعنی اس تدبیر سے آپ راضی خوشی بسر کر سکیں گے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کریں اس کی حمد و شکر کے ساتھ۔ اس میں اشارہ ہے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے یا کچھ عبادت کرنے کی توفیق ہو جائے اس کو چاہئے کہ اپنے اس عمل پر ناز و فخر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر کو اپنا وظیفہ بنائے یہ ذکر اللہ یا عبادت اُسی کی توفیق کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

اور یہ لفظ سَبِّحْ بِحَمْدِ عام ذکر و حمد کے معنے میں بھی ہو سکتا ہے اور خاص نماز کے معنے میں بھی۔ عموماً حضرات مفسرین نے اسی کو لیا ہے اور اس کے بعد جو اوقات معیّن کر کے بتلائے ہیں وہ بھی نمازوں کے اوقات قرار دیئے ہیں مثلاً قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ سے مراد نماز فجر اور قَبْلَ غُرُوْبِهَا سے مراد نماز ظہر و عصر اور وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ سے مراد رات کی سب نمازیں مغرب عشاء یہاں تک کہ تہجد بھی اس میں شامل ہے اور پھر لفظ اَطْرَافَ النَّهَارِ سے اس کی مزید تاکید بتلائی گئی ہے۔

دولتِ دُنیا چند روزہ ہے یہ اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں بلکہ مؤمن کے لئے خطرہ کی چیز ہے

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور دراصل ہدایت کرنا اُمّت کو ہے کہ دُنیا کے مالداروں سرمایہ داروں کو قسم قسم کی دُنیوی رونق اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہیں۔ آپ اُن کی طرف نظر بھی نہ اُٹھایئے کیونکہ یہ سب عیش فانی اور چندروزہ ہے اللہ تعالیٰ نے جو نعمت آپ کو اور آپ کے واسطے سے مؤمنین کو عطا فرمائی ہے وہ بدرجہا اُن کی اس چندروزہ رونقِ حیات سے بہتر ہے۔

دُنیا میں کفار و فجّار کی عیش و عشرت اور دولت و حشمت ہمیشہ ہی سے ہر شخص کے لئے یہ سوال بنتی رہی ہے کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مبغوض اور ذلیل ہیں تو اُن کے پاس یہ نعمتیں کیسی اور کیوں ہیں، اور اطاعت شعار مؤمنین کی غربت وافلاس کیوں؟ یہاں تک کہ فاروقِ اعظمؓ جیسے عالی قدر بزرگ کو اس سوال نے متاثر کیا جس وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے خاص حجرہ میں داخل ہوئے جس میں آپ خلوت گزیں تھے اور یہ دیکھا کہ آپ ایک موٹی موٹی تیلیوں کے بوریئے پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان تیلیوں کے نشانات آپ کے بدن مبارک پر کھڑے ہوگئے ہیں تو بے اختیار رو پڑے اور عرض کیا: یارسول اللہ! یہ کسریٰ و قیصر اور اُن کے اُمراء کیسی کیسی نعمتوں اور راحتوں میں ہیں اور آپ ساری مخلوق میں اللہ کے منتخب رسول اور محبوب ہیں اور آپ کی معیشت کا یہ حال ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابنِ خطاب! کیا تم اب تک شک وشبہ میں مبتلا ہو، یہ لوگ تو وہ ہیں جن کی لذّات و محبوبات اللہ نے اسی دُنیا میں اُن کو دے دی ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، وہاں عذاب ہی عذاب ہے [1] (اور مؤمنین کا معاملہ برعکس ہے) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کی زینت اور راحت طلبی سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق زندگی کو پسند فرماتے تھے باوجودیکہ آپ کو پوری قدرت حاصل تھی کہ اپنے لئے بہتر سے بہتر راحت کا سامان جمع کرلیں۔ اور جب کبھی دُنیا کی دولت آپ کے پاس بغیر کسی محنت مشقت اور سعی وطلب کے آ بھی جاتی تھی تو فوراً اللہ کی راہ میں غرباء، فقراء پر اس کو خرچ کر ڈالتے تھے اور اپنے واسطے کل کے لئے بھی کچھ باقی نہ چھوڑتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ابوسعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مَا يَفْتَحِ اللهُ لَكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا۔ [2] (ابن کثیر)

---

[1] صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب موعظة الرجل إلخ (باختصار) ج: ١ ص: ٧٨٢

[2] صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب التحذير من الاغترار بزينة الدنيا إلخ ج: ١ ص: ٣٣٦

مجھے تم لوگوں کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف اور خطرہ ہے وہ دولت اور زینتِ دُنیا ہے جو تم پر کھول دی جائے گی۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو پہلے ہی یہ خبر بھی دے دی ہے کہ آئندہ زمانے میں تمہاری فتوحات دُنیا میں ہوں گی اور مال و دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی ہو جائے گی۔ وہ صورتِ حال کچھ زیادہ خوش ہونے کی نہیں بلکہ ڈرنے کی چیز ہے کہ اُس میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کے احکام سے غفلت نہ ہو جائے۔

اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو نماز کی پابندی کی تاکید اور اس کی حکمت

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۚ یعنی آپ اپنے اہل کو بھی نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اُس پر جمے رہیے، یہ بظاہر دو حکم الگ الگ ہیں، ایک اہل و عیال کو نماز کی تاکید دوسرے خود اس کی پابندی۔ لیکن غور کیا جائے تو خود اپنی نماز کی پوری پابندی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ آپ کا ماحول آپ کے اہل و عیال اور متعلقین نماز کے پابند ہوں کیونکہ ماحول اس کے خلاف ہوا تو طبعی طور پر انسان خود بھی کوتاہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

لفظ اهل میں بیوی، اولاد اور متعلقین سبھی داخل ہیں جن سے انسان کا ماحول اور معاشرہ بنتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ روزانہ صبح کی نماز کے وقت حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کے مکان پر جا کر آواز دیتے تھے اَلصَّلٰوةَ اَلصَّلٰوةَ۔ (قرطبی) [۱]

اور حضرت عروہ ابن زبیرؓ جب کبھی اُمراء و سلاطین کی دولت و حشمت پر اُن کی نظر پڑتی تو فوراً اپنے گھر میں لَوٹ جاتے اور گھر والوں کو نماز کے لئے دعوت دیتے اور یہ آیت پڑھ کر سُناتے تھے۔ اور حضرت فاروق اعظمؓ جب رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کر دیتے تھے اور یہی آیات پڑھ کر سُناتے تھے۔ (قرطبی) [۲]

جو آدمی نماز اور اللہ کی عبادت میں لگ جاتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے لئے رزق کا معاملہ آسان بنا دیتے ہیں

لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۚ یعنی ہم تم سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ تم اپنا اور اپنے اہل و عیال کا رزق اپنے زورِ علم و عمل سے پیدا کرو بلکہ یہ معاملہ ہم نے اپنے ذمّہ رکھا ہے کیونکہ رزق کی تحصیل دراصل انسان کے بس میں ہے ہی نہیں وہ زیادہ سے زیادہ

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۱ ص:۲۶۳

[۲] کنز العمال رقم الحدیث:۳۵۷۵۸، وموطا مالکؒ رقم الحدیث:۳۸۹، کتاب النداء للصلاۃ، باب ما جاء فی صلاۃ اللیل

یہی تو کرسکتا ہے کہ زمین کو نرم قابلِ کاشت بنائے اور کچھ دانے اس میں ڈال دے مگر دانہ کے اندر سے درخت نکالنا اور پیدا کرنا اس میں تو اس کا کوئی ادنیٰ دخل نہیں وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ درخت نکل آنے کے بعد بھی انسان کا سارا عمل اس کی حفاظت کرنا اور جو پھل پھول قدرت نے اُس کے اندر پیدا فرمائے ہیں اُن سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ یہ بارِ محنت بھی اس کے لئے آسان اور ہلکا کر دیتے ہیں۔ ترمذی اور ابنِ ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَا ابْنَ اٰدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِيْ اَمْلَاْ صَدْرَكَ غِنًى وَاَسُدَّ فَقْرَكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ مَلَاْتُ صَدْرَكَ شُغْلًا وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ۔ (ابن کثیر) [۱]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابنِ آدم تو میری عبادت کے لئے اپنے آپ کو فارغ کرلے تو میں تیرے سینے کو غناء و استغناء سے بھر دوں گا اور تیری محتاجی کو دُور کر دوں گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تیرا سینہ فکر اور شغل سے بھر دوں گا اور محتاجی دُور نہ کروں گا (یعنی جتنا مال بڑھتا جائے گا حرص بھی اُتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی اس لئے ہمیشہ محتاج ہی رہے گا)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ:

مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ الْمَعَادِ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ فِيْ اَحْوَالِ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِيْ اَيِّ اَوْدِيَتِهٖ هَلَكَ رواه ابن ماجة۔ (ابن کثیر) [۲]

جو شخص اپنے سارے فکروں کو ایک فکر یعنی آخرت کی فکر بنا دے تو اللہ تعالیٰ اس کے دُنیا کے فکروں کی خود کفالت کر لیتا ہے اور جس کے فکر دُنیا کے مختلف کاموں میں لگے رہے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پروا نہیں کہ وہ اُن فکروں کے کسی جنگل میں ہلاک ہو جائے۔"

بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ یعنی پچھلی آسمانی کتابیں تورات وانجیل اور صحفِ ابراہیم علیہ السلام وغیرہ سب کے سب رسول آخرالزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورسالت کی شہادت دیتے آئے ہیں کیا یہ بینات ان منکرین کے لئے کافی سے زیادہ ثبوت نہیں ہے۔

[۱] سنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب الهم بالدنيا ص:۳۰۲، وجامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، بابٌ ج:۲ ص:۷۳، وتفسير ابن كثير ج:۵ ص:۳۲۸ تحت هذه الآية۔

[۲] سنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب الهم بالدنيا ص:۳۰۲، وتفسير ابن كثير بحوالۂ بالا۔

فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهۡتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ یعنی آج تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو زبان دی ہوئی ہے ہر ایک اپنے طریقے اور اپنے عمل کے بہتر اور صحیح ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے، لیکن یہ دعویٰ کچھ کام دینے والا نہیں، بہتر اور صحیح طریقہ تو وہی ہوسکتا ہے جو اللہ کے نزدیک مقبول وصحیح ہو، اور اس کا پتہ قیامت کے روز سب کو لگ جائے گا کہ کون غلطی اور گمراہی پر تھا کون صحیح اور سیدھے راستہ پر۔ اَللّٰهُمَّ اهۡدِنَا لِمَا اخۡتُلِفَ فِيۡهِ اِلَى الۡحَقِّ بِاِذۡنِكَ وَلَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ وَلَا مَلۡجَاَ وَلَا مَنۡجَاَ مِنۡكَ اِلَّا اِلَيۡكَ۔

الحمدُ لله الّذی وَفّقنِی لتکمِیۡل سُورۃ طٰهٰ ضحیٰ یَومِ الخمیۡس لأربعة عشر خلتۡ مِنۡ ذِی الحِجّة الحَرامِ ۱۳۹۰ھ والله سُبحَانَهٗ وَتعالیٰ اسۡأل لتکمیۡل بَاقی القراٰن وَاللهُ المُستعَانُ وَعَلَیهِ التکلانُ

○

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ

اٰياتها ۱۱۲ ۲۱ سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ مَكِّيَّةٌ ۷۳ رکوعاتها ۷

سورۂ انبیاء مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو بارہ آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ ①

نزدیک آگیا لوگوں کے اُن کے حساب کا وقت اور وہ بے خبر ٹلا رہے ہیں

مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۙ ②

کوئی نصیحت نہیں پہنچتی اُن کو اُن کے رَبّ سے نئی مگر اس کو سنتے ہیں کھیل میں لگے ہوئے

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ

کھیل میں پڑے ہیں دل اُن کے اور چھپا کر مصلحت کی بے انصافوں نے یہ شخص کون ہے ایک آدمی ہے

مِّثْلُكُمْ ج اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿٣﴾ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ

تم ہی جیسا پھر کیوں پھنستے ہو اس کے جادو میں آنکھوں دیکھتے اُس نے کہا میرے ربّ کو خبر ہے بات کی

فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ز وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٤﴾ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ

آسمانوں میں ہو یا زمین میں اور وہ ہے سُننے والا جاننے والا اس کو چھوڑ کر کہتے ہیں بیہودہ

اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ

خواب ہیں نہیں، جھوٹ باندھ لیا ہے، نہیں شعر کہتا ہے پھر چاہئے لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی جیسے پیغام لے کر آئے ہیں

الْاَوَّلُوْنَ ﴿٥﴾ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ج اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾

پہلے، نہیں مانا اُن سے پہلے کسی بستی نے جن کو غارت کردیا ہم نے کیا اب یہ مان لیں گے

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ

اور پیغام نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے مگر یہی مردوں کے ہاتھ وحی بھیجتے تھے ہم اُن کو سو پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے

اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٧﴾ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ

اگر تم نہیں جانتے اور نہیں بنائے تھے ہم نے اُن کے ایسے بدن کہ وہ کھانا نہ کھائیں

وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿٨﴾ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ

اور نہ تھے وہ ہمیشہ رہ جانے والے پھر سچا کردیا ہم نے اُن سے وعدہ سو بچادیا اُن کو

وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٩﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا

اور جس کو ہم نے چاہا اور غارت کردیا حد سے نکلنے والوں کو ہم نے اُتاری ہے تمہاری طرف کتاب

فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰ ع

کہ اس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

لوگوں کے لئے ان کے حساب کا وقت قریب آپہنچا ہے، اور وہ ہیں کہ غفلت کی حالت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں! ۝۱ جب کبھی ان کے پروردگار کی طرف سے نصیحت کی کوئی نئی بات ان کے پاس آتی ہے تو وہ اسے مذاق بنا بنا کر اس حالت میں سنتے ہیں ۝۲ کہ ان کے دِل فضولیات میں منہمک ہوتے ہیں۔ اور یہ ظالم چپکے چپکے (ایک دوسرے سے) سرگوشی کرتے ہیں کہ: ''یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تمہی جیسا ایک انسان نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا پھر بھی تم سوجھتے بوجھتے جادو کی بات سننے جاؤ گے؟'' ۝۳ پیغمبر نے (جواب میں) کہا کہ: ''آسمان اور زمین میں جو کچھ کہا جاتا ہے، میرا پروردگار اُس سب کو جانتا ہے۔ وہ ہر بات سنتا ہے، ہر چیز سے باخبر ہے۔'' ۝۴ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ: ''یہ (قرآن) بے جوڑ خوابوں کا مجموعہ ہے، بلکہ یہ ان صاحب نے خود گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ ایک شاعر ہیں۔ بھلا یہ ہمارے سامنے کوئی نشانی تو لے آئیں جیسے پچھلے پیغمبر (نشانیوں کے ساتھ) بھیجے گئے تھے!'' ۝۵ حالانکہ ان سے پہلے جس کسی بستی کو ہم نے ہلاک کیا، وہ ایمان نہیں لائی، اب کیا یہ لوگ ایمان لے آئیں گے؟ ۝۶ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی اور کو نہیں، آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے۔ لہٰذا (کافروں سے کہو کہ) اگر تمہیں خود علم نہیں ہے تو نصیحت کا علم رکھنے والوں سے پوچھ لو۔ ۝۷ اور ہم نے ان (رسولوں) کو ایسے جسم بنا کر پیدا نہیں کر دیا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں، اور نہ وہ ایسے تھے کہ ہمیشہ زندہ رہیں۔ ۝۸ پھر ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا، اُسے سچا کر دکھایا کہ ان کو بھی بچا لیا، اور (ان کے علاوہ) جن کو ہم نے چاہا ان کو بھی، اور جو لوگ حد سے گذر چکے تھے، انہیں ہلاک کر دیا۔ ۝۹ (اب) ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب اُتاری ہے جس میں تمہارے لئے نصیحت ہے۔ کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے؟ ۝۱۰

خلاصۂ تفسیر

اُن (منکر) لوگوں سے اُن کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا (یعنی قیامت وقتاً فوقتاً نزدیک ہوتی جاتی ہے) اور یہ (ابھی) غفلت (ہی) میں (پڑے) ہیں (اور اس کے یقین کرنے اور اس کے لئے تیاری کرنے سے) اعراض کئے

ہوئے ہیں (اور اُن کی غفلت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ) اُن کے پاس اُن کے رَبّ کی طرف سے جو نصیحت تازہ (حسب حال ان کے) آتی ہے (بجائے اس کے کہ اُن کو تنبہ ہوتا) یہ اس کو ایسے طور سے سُنتے ہیں کہ (اس کے ساتھ) ہنسی کرتے ہیں (اور) اُن کے دل (اصلاً اُدھر) متوجہ نہیں ہوتے اور یہ لوگ یعنی ظالم (اور کافر) لوگ (آپس میں) چُپکے چُپکے سرگوشی کرتے ہیں (اس لئے نہیں کہ ان کو اہلِ اسلام کا خوف تھا کیونکہ مکہ میں کفار ضعیف نہ تھے بلکہ اس لئے کہ اسلام کے خلاف خفیہ سازش کر کے اس کو مٹائیں) کہ یہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) محض تم جیسے ایک (معمولی) آدمی ہیں (یعنی نبی نہیں اور یہ جو ایک دلکش و دلرُبا کلام سُناتے ہیں اس پر اعجاز کا شبہ اور اس اعجاز سے نبوّت کا خیال نہ کرنا کیونکہ وہ حقیقت میں سحر آمیز کلام ہے) تو کیا (باوجود اس بات کے) پھر بھی تم جادو کی بات سُننے کو (ان کے پاس) جاؤ گے حالانکہ تم (اس بات کو خوب) جانتے (بوجھتے) ہو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینے کا حکم ہوا اور اُنہوں) نے (موافق حکم کے جواب میں) فرمایا کہ میرا رَبّ ہر بات کو (خواہ) آسمان میں ہو اور (خواہ) زمین میں (ہو اور خواہ ظاہر ہو یا خفی ہو خوب) جانتا ہے اور وہ خوب سُننے والا اور خوب جاننے والا ہے (سو تمہارے ان اقوالِ کفریہ کو بھی جانتا ہے اور تم کو خوب سزا دے گا اور اُنہوں نے کلامِ حق کو صرف جادو کہنے پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ یوں (بھی) کہا کہ یہ (قرآن) پریشان خیالات ہیں (کہ واقع میں دلکش بھی نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) اُنہوں نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (قصداً و اختیاراً اپنے دل سے) تراش لیا ہے (اور خواب کے خیالات میں تو انسان قدرے بے اختیار اور معذور اور مبتلائے اشتباہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ افتراء کچھ قرآن ہی کے ساتھ خاص نہیں) بلکہ یہ تو ایک شاعر شخص ہیں (ان کی تمام باتیں ایسی ہی تراشیدہ اور خیالی ہوتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رسول نہیں ہیں اور بڑے مُدّعی رسالت کے ہیں) تو ان کو چاہئے کہ ایسی کوئی (بڑی) نشانی لائیں جیسا پہلے لوگ رسول بنائے گئے (اور بڑے بڑے معجزات ظاہر کئے اس وقت ہم رسول مانیں اور ایمان لائیں اور یہ کہنا بھی ایک بہانہ تھا ورنہ انبیاءِ سابقین کو بھی نہ مانتے تھے حق تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں کہ) اُن سے پہلے کوئی بستی والے جن کو ہم نے ہلاک کیا ہے (باوجود ان کے فرمائشی معجزات ظاہر ہو جانے کے) ایمان نہیں لائے سو کیا یہ لوگ (ان معجزات کے ظاہر ہونے پر) ایمان لے آئیں گے (اور ایسی حالت میں ایمان نہ لانے پر عذاب نازل ہو جائے گا اس لئے ہم وہ معجزات ظاہر نہیں فرماتے اور قرآن معجزہ کافی ہے) اور (رسالت کے متعلق جو ان کا یہ شبہ ہے کہ رسول بشر نہ ہونا چاہئے اُس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے آپ سے قبل صرف آدمیوں ہی کو پیغمبر بنایا ہے جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے سو (اے منکرو) اگر تم کو (یہ بات) معلوم نہ ہو تو اہلِ کتاب سے دریافت کر لو (کیونکہ یہ لوگ اگرچہ کافر ہیں مگر خبر متواتر میں راوی کا مسلمان یا ثقہ ہونا شرط نہیں، پھر تم اُن کو اپنا دوست سمجھتے ہو تو تمہارے نزدیک اُن کی بات معتبر ہونی چاہئے) اور (اسی طرح رسالت کے متعلق جو اس شبہ کی دوسری تقریر ہے کہ رسول فرشتہ ہونا چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے ان رسولوں کے (جو کہ

گزر چکے ہیں) ایسے بدن نہیں بنائے تھے جو کھانا نہ کھاتے ہوں (یعنی فرشتہ نہ بنایا تھا) اور (یہ لوگ جو آپ کی وفات کے انتظار میں خوشیاں منا رہے ہیں لقولہ تعالیٰ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰ [1] (الطور) کذا فی المعالم، یہ وفات بھی منافی نبوّت نہیں کیونکہ) وہ (گزشتہ) حضرات (بھی دُنیا میں) ہمیشہ رہنے والے نہیں ہوئے (پس اگر آپ کی بھی وفات ہو جائے تو نبوّت میں کیا اعتراض لازم آیا، غرض یہ کہ جیسے پہلے رسول تھے ویسے ہی آپ بھی ہیں اور یہ لوگ جس طرح آپ کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح ان حضرات کی بھی اُس زمانے کے کفّار نے تکذیب کی) پھر ہم نے جو ان سے وعدہ کیا تھا (کہ مکذبین کو عذاب سے ہلاک کریں گے اور تم کو اور مؤمنین کو محفوظ رکھیں گے ہم نے) اُس (وعدہ) کو سچا کیا یعنی ان کو اور جن جن کو (نجات دینا) منظور ہوا (اُس عذاب سے) ہم نے نجات دی اور (اس عذاب سے) حدِ (اطاعت) سے گزرنے والوں کو ہلاک کیا (سو ان لوگوں کو ڈرنا چاہیئے اے منکرو! اس تکذیب کے بعد تم پر دُنیا و آخرت میں عذاب آئے تو تعجب نہیں کیونکہ) ہم تمہارے پاس ایسی کتاب بھیج چکے ہیں کہ اس میں تمہاری نصیحت (کافی) موجود ہے کیا (باوجود ایسی تبلیغ موعظت کے) پھر بھی تم نہیں سمجھتے (اور نہیں مانتے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انبیاء کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سورۂ کہف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء یہ چاروں سورتیں نزول کے اعتبار ابتدائی سورتیں ہیں اور میری یہ قدیم دولت اور کمائی ہیں جن کی ہمیشہ حفاظت کرتا ہوں۔ (قرطبی) [2]

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ، یعنی وہ وقت قریب آ گیا جبکہ لوگوں سے اُن کے اعمال کا حساب لیا جائے گا مراد اس سے قیامت ہے اور اُس کا قریب آ جانا دُنیا کی پچھلی عمر کے لحاظ سے ہے کیونکہ یہ اُمّت آخر الاُمم ہے، اور اگر حساب عام مراد لیا جائے تو حسابِ قبر بھی اس میں شامل ہے جو ہر انسان کے مرنے کے فوراً بعد دینا ہوتا ہے اور اسی لئے ہر انسان کی موت کو اس کی شخصی قیامت کہا گیا ہے مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ، یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو ابھی قائم ہو گئی، [3] اس معنے کے اعتبار سے حساب کا وقت قریب ہونا تو بالکل ہی واضح ہے کہ ہر شخص کی موت خواہ کتنی ہی عمر ہو کچھ دُور نہیں خصوصاً جبکہ عمر کی انتہا نامعلوم ہے تو ہر دن ہر گھنٹہ موت کا خطرہ سامنے ہے۔

---

[1] ترجمہ: ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

[2] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۲۶۶

[3] كنز العمال رقم الحديث:۴۲۷۴۸، والمقاصد الحسنة ج:۱ ص:۲۲۴، "حرف الميم"۔

مقصود اس آیت سے غفلت شعار لوگوں کو متنبہ کرنا ہے، جس میں سب مؤمن و کافر داخل ہیں، کہ دنیا کی خواہشات میں مشغول ہو کر اس حساب کے دن کو نہ بھلائیں کیونکہ اس کو بھلا دینا ہی ساری خرابیوں اور گناہوں کی بنیاد ہے۔

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ جو لوگ آخرت اور قبر کے عذاب سے غفلت اور اُس کے لئے تیاری سے اعراض کرنے والے ہیں یہ اُن کے حال کا مزید بیان ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن کی کوئی نئی آیت آتی اور پڑھی جاتی ہے تو وہ اس کو اس حالت میں سُنتے ہیں کہ کھیل اور ہنسی مذاق کرتے ہیں اور ان کے دل اللہ سے اور آخرت سے بالکل غافل ہوتے ہیں اس کی یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ قرآن کی آیات سننے کے وقت یہ اپنے کھیل اور شغل میں اسی طرح لگے رہتے ہیں قرآن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ خود آیاتِ قرآن ہی سے کھیل اور ہنسی مذاق کا معاملہ کرنے لگتے ہیں۔

أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ۝ یعنی یہ لوگ آپس میں آہستہ آہستہ سرگوشی کر کے یہ کہتے ہیں کہ یہ جو اپنے کو نبی اور رسول کہتے ہیں یہ تو ہم جیسے ہی انسان ہیں کوئی فرشتہ تو ہیں نہیں کہ ہم اُن کی بات مان لیں اور پھر اس کلام الٰہی کو جو اُن کے سامنے پڑھا جاتا تھا اور اس کی حلاوت و بلاغت اور دِلوں میں تاثیر کا کوئی کافر بھی انکار نہ کرسکتا تھا اُس سے لوگوں کو ہٹانے کی صورت یہ نکالی کہ اس کو سحر اور جادو قرار دیں اور پھر لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لئے یہ کہیں کہ جب تم سمجھ گئے کہ یہ جادو ہے تو پھر ان کے پاس جانا اور یہ کلام سننا دانشمندی کے خلاف ہے شاید یہ گفتگو آپس میں آہستہ اس لئے کرتے تھے کہ مسلمان سُن لیں گے تو اُن کی احمقانہ تلبیس کا پول کھول دیں گے۔

بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ، أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ان خوابوں کو کہا جاتا ہے جن میں کچھ نفسانی یا شیطانی خیالات شامل ہو جاتے ہیں اسی لئے اس کا ترجمہ پریشان خیالات سے کیا گیا ہے۔ یعنی ان منکرین نے اوّل تو قرآن کو جادو کہا پھر اُس سے آگے بڑھے تو پریشان خواب کہنے لگے پھر اس سے بھی آگے بڑھے تو کہنے لگے یہ تو خدا تعالیٰ پر افتراء اور بہتان ہے کہ یہ اس کا کلام ہے پھر کہنے لگے کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ کوئی شاعر آدمی ہے شاعرانہ خیالات اس کے کلام میں ہوتے ہیں۔

فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ، یعنی اگر یہ واقعی نبی و رسول ہیں تو ہمارے مانگے ہوئے خاص معجزات دکھلائیں اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ پچھلی اُمتوں میں اس کا بھی تجربہ اور مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جس طرح کا معجزہ اُنہوں نے خود طلب کیا اللہ کے رسول کے ہاتھوں وہی معجزہ سامنے آ گیا مگر وہ پھر بھی ایمان نہ لائے اور منہ مانگے معجزے کو دیکھنے کے بعد بھی جو قوم ایمان سے گریز کرے اس کے لئے اللہ کا قانون یہ ہے کہ دُنیا ہی میں عذاب نازل کر کے ختم کر دی جاتی ہے اور چونکہ اُمتِ مرحومہ کو حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز میں دُنیا کے عذابِ عام سے محفوظ کر دیا ہے اس لئے اُن کو اُن کے مانگے ہوئے معجزات دکھلانا مصلحت نہیں۔ آگے أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ ۝ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ کیا منہ مانگے معجزہ کو

دیکھ کر یہ ایمان لے آئیں گے مراد یہ ہے کہ ان سے اس کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی اس لئے مطلوبہ معجزہ نہیں دکھایا جاتا۔

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اہلِ الذکر سے مراد اس جگہ علماء تورات وانجیل ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں پچھلے انبیاء کا حال معلوم نہیں کہ وہ انسان تھے یا فرشتہ تو علمائے تورات وانجیل سے معلوم کرلو کیونکہ وہ سب جانتے ہیں کہ سب انبیائے سابقین انسان ہی کی نوع سے تھے اس لئے اگر یہاں اہل الذکر سے مطلق اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ ہی مراد ہوں تو بعید نہیں کیونکہ اس معاملے کے سبھی شاہد ہیں۔ خلاصۂ تفسیر میں اسی احتمال کو اختیار کر کے تشریح کی گئی ہے۔

مسئلہ:- تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جاہل آدمی جس کو احکامِ شریعت معلوم نہ ہوں اُس پر عالم کی تقلید واجب ہے کہ عالم سے دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کرے۔ [1]

قرآنِ کریم عربوں کے لئے عزت وفخر ہے

كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ کتاب سے مراد قرآن ہے اور ذکر اس جگہ بمعنے شرف وفضیلت اور شہرت کے ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ قرآن جو تمہاری زبان عربی میں نازل ہوا تمہارے لئے ایک بڑی عزّت اور دائمی شہرت کی چیز ہے تمہیں اس کی قدر کرنا چاہئے جیسا کہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ اہلِ عرب کو حق تعالیٰ نے قرآن کی برکت سے ساری دُنیا پر غالب اور فاتح بنادیا اور پورے عالم میں اُن کی عزت وشہرت کا ڈنکا بجا۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ عربوں کی مقامی یا قبائلی یا لسانی خصوصیت کی بناء پر نہیں بلکہ صرف قرآن کی بدولت ہوا۔ اگر قرآن نہ ہوتا تو شاید آج کوئی عرب قوم کا نام لینے والا بھی نہ ہوتا۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۱۱

اور کتنی پیس ڈالیں ہم نے بستیاں جو تھیں گناہگار اور اُٹھا کھڑے کئے اُن کے پیچھے اور لوگ

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝۱۲ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا

پھر جب آہٹ پائی انہوں نے ہماری آفت کی تب لگے وہاں سے ایڑ کرنے، ایڑ مت کرو اور لوٹ جاؤ

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۲۷۲

اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا

جہاں تم نے عیش کیا تھا اور اپنے گھروں میں شاید کوئی تم کو پوچھے کہنے لگے ہائے خرابی ہماری ہم تھے بیشک

ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

گنہگار پھر برابر یہی رہی اُن کی فریاد یہاں تک کہ ڈھیر کردیئے گئے کاٹ کر بجھے پڑے ہوئے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے کتنی بستیوں کو پیس ڈالا جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری نسلیں پیدا کیں۔ ﴿۱۱﴾ چنانچہ جب انہوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو وہ ایک دم وہاں سے بھاگنے لگے۔ ﴿۱۲﴾ (ان سے کہا گیا:) ''بھاگو مت، اور واپس جاؤ اپنے انہی مکانات اور اسی عیش و عشرت کے سامان کی طرف جس کے مزے تم لوٹ رہے تھے، شاید تم سے کچھ پوچھا جائے۔'' ﴿۱۳﴾ وہ کہنے لگے: ''ہائے ہماری کم بختی! سچی بات یہ ہے کہ ہم لوگ ہی ظالم تھے۔'' ﴿۱۴﴾ ان کی یہی پکار جاری رہی یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایک کٹی ہوئی کھیتی، ایک بجھی ہوئی آگ بنا کر رکھ دیا۔ ﴿۱۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے بہت سی بستیاں جن کے رہنے والے ظالم (یعنی کافر) تھے تباہ کر ڈالیں اور ان کے بعد دوسری قوم پیدا کر دی تو جب ان ظالموں نے ہمارا عذاب آتا دیکھا تو اس بستی سے بھاگنا شروع کیا (تاکہ عذاب سے بچ جائیں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ) بھاگو مت اور اپنے سامانِ عیش اور اپنے مکانات کی طرف واپس چلو شاید تم سے کوئی پوچھے پاچھے (کہ تم پر کیا گزری مقصود اس سے بطور تعریض کے ان کی احمقانہ جسارت پر تنبیہ ہے کہ جس سامان اور مکان پر تم کو ناز تھا اب نہ وہ سامان رہا نہ مکان نہ کسی دوست ہمدرد کا نام و نشان رہا) وہ لوگ (نزولِ عذاب کے وقت) کہنے لگے کہ ہائے ہماری کم بختی بیشک ہم لوگ ظالم تھے اُن کا یہی شور و غُل رہا یہاں تک کہ ہم نے اُن کو ایسا (نیست و نابود) کر دیا جس طرح کھیتی کٹ گئی ہو یا آگ بجھ گئی ہو۔

معارف و مسائل

اِن آیات میں جن بستیوں کے تباہ کرنے کا ذکر ہے بعض مفسرین نے ان کو یمن کی بستیاں حضوراء اور قلابہ قرار

دیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھیجا تھا جس کے نام میں روایات مختلف ہیں۔ بعض میں موسیٰ بن میشا اور بعض میں شعیب ذکر کیا گیا ہے اور اگر شعیب نام ہے تو وہ مدین والے شعیب علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور ہیں۔ ان لوگوں نے اللہ کے رسول کو قتل کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک کافر بادشاہ بُخت نصر کے ہاتھوں تباہ کرایا۔ بُخت نصر کو ان پر مسلّط کر دیا جیسا کہ بنی اسرائیل نے جب فلسطین میں بے راہی اختیار کی تو اُن پر بھی بُخت نصر کو مسلّط کر کے سزا دی گئی تھی مگر صاف بات یہ ہے کہ قرآن نے کسی خاص بستی کو معین نہیں کیا اس لئے عام ہی رکھا جائے اُس میں یہ یمن کی بستیاں بھی داخل ہوں گی۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَاۤ

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے کھیلتے ہوئے اگر ہم چاہتے

اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ نَقْذِفُ

کہ بنالیں کچھ کھلونا تو بنالیتے ہم اپنے پاس سے اگر ہم کو کرنا ہوتا یوں نہیں پر ہم پھینک مارتے ہیں

بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ

سچ کو جھوٹ پر پھر وہ اس کا سر پھوڑ ڈالتا ہے پھر وہ جاتا رہتا ہے اور تمہارے لئے خرابی ہے

مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ

اُن باتوں سے جو تم بتلاتے ہو اور اسی کا ہے جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں اور جو اس کے نزدیک رہتے ہیں

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ ج يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ

سرکشی نہیں کرتے اس کی عبادت سے اور نہیں کرتے کاہلی یاد رکھتے ہیں رات

وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ

اور دن نہیں تھکتے کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اور معبود زمین میں کے کہ وہ

يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ

جلا اُٹھائیں گے ان کو، اگر ہوتے ان دونوں میں اور معبود سوائے اللہ کے تو دونوں خراب ہوجاتے، سو پاک ہے اللہ

رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾

عرش کا مالک ان باتوں سے جو یہ بتلاتے ہیں اُس سے پوچھا نہ جائے جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ

کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اس سے ورے اور معبود تو کہہ لاؤ اپنی سند یہی بات ہے میرے ساتھ والوں کی

وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾

اور یہی بات ہے مجھ سے پہلوں کی، کوئی نہیں پر وہ بہت لوگ نہیں سمجھتے سچی بات سو ٹلا رہے ہیں

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے

فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ

سو میری بندگی کرو اور کہتے ہیں رحمٰن نے کرلیا کسی کو بیٹا وہ ہرگز اس لائق نہیں لیکن وہ بندے ہیں

مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ

جن کو عزّت دی ہے اُس سے بڑھ کر نہیں بول سکتے اور وہ اسی کے حکم پر کام کرتے ہیں اس کو معلوم ہے

مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ

جو اُن کے آگے ہے اور پیچھے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کی جس سے اللہ راضی ہو اور وہ

مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ

اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں اور جو کوئی اُن میں کہے کہ میری بندگی ہے اس سے ورے

فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع

سو اس کو ہم بدلہ دیں گے جہنم یونہی ہم بدلہ دیتے ہیں بے انصافوں کو

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اُس کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ہم کوئی کھیل کرنا چاہتے ہوں۔ ﴿۱۶﴾ اگر ہمیں کوئی کھیل بنانا ہوتا تو ہم خود اپنے پاس سے بنا لیتے، اگر ہمیں ایسا کرنا ہی ہوتا۔ ﴿۱۷﴾ بلکہ ہم تو حق بات کو باطل پر کھینچ مارتے ہیں، جو اُس کا سر توڑ ڈالتا ہے، اور وہ ایک دم ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ اور جو باتیں تم بنا رہے ہو، اُن کی وجہ سے خرابی تمہاری ہی ہے۔ ﴿۱۸﴾ اور آسمانوں اور زمین میں جو لوگ بھی ہیں، اللہ کے ہیں۔ اور جو (فرشتے) اللہ کے پاس ہیں، وہ نہ اُس کی عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، نہ تھکتے ہیں۔ ﴿۱۹﴾ وہ رات دن اُس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور سست نہیں پڑتے۔ ﴿۲۰﴾ بھلا کیا ان لوگوں نے زمین میں سے ایسے خدا بنا رکھے ہیں جو نئی زندگی دیتے ہیں؟ ﴿۲۱﴾ اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔ لہٰذا عرش کا مالک اللہ اُن باتوں سے بالکل پاک ہے جو یہ لوگ بنایا کرتے ہیں۔ ﴿۲۲﴾ وہ جو کچھ کرتا ہے، اُس کا کسی کو جواب دہ نہیں ہے، اور اِن سب کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ ﴿۲۳﴾ بھلا کیا اُسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا رکھے ہیں؟ (اے پیغمبر!) ان سے کہو کہ: ”لاؤ اپنی دلیل!“ یہ (قرآن) بھی موجود ہے جس میں میرے ساتھ والوں کے لئے نصیحت ہے، اور وہ (کتابیں) بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لئے نصیحت تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حق بات کا یقین نہیں کرتے، اس لئے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ﴿۲۴﴾ اور تم سے پہلے ہم نے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس پر ہم نے یہ وحی نازل نہ کی ہو کہ: ”میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا میری عبادت کرو۔“ ﴿۲۵﴾ یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ”خدائے رحمٰن (فرشتوں کی شکل میں) اولاد رکھتا ہے۔“ سبحان اللہ! بلکہ (فرشتے تو اللہ کے) بندے ہیں جنہیں عزّت بخشی گئی ہے۔ ﴿۲۶﴾ وہ اُس سے آگے بڑھ کر کوئی بات نہیں کرتے، اور وہ اُسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ ﴿۲۷﴾ وہ اُن کی تمام اگلی پچھلی باتوں کو جانتا ہے، اور وہ کسی کی سفارش نہیں کر سکتے، سوائے اُس کے جس کے لئے اللہ کی مرضی ہو، اور وہ اُس کے خوف سے سہمے رہتے ہیں۔ ﴿۲۸﴾ اور اگر اُن میں سے کوئی (بالفرض) یہ کہے

کہ: ''اللہ کے علاوہ میں بھی معبود ہوں''، تو اُس کو ہم جہنم کی سزا دیں گے۔ ایسے ظالموں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ﴿۲۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (ہمارے یکتا ہونے پر ہماری مصنوعات دلالت کر رہی ہیں کیونکہ) ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعلِ عبث کرنے والے ہوں (بلکہ ان میں بہت سی حکمتیں ہیں جن میں بڑی حکمت توحیدِ حق پر دلالت ہے اور) اگر ہم کو (آسمان اور زمین کے بنانے سے کوئی حکمت مقصود نہ ہوتی بلکہ ان کو محض مشغلہ ہی بنانا منظور ہوتا (جس میں کوئی معتد بہ فائدہ مقصود نہیں ہوتا محض دل بہلانا منظور ہوتا ہے) تو ہم خالص اپنے پاس کی چیز کو مشغلہ بناتے (مثلاً اپنی صفات کمال کے مشاہدہ کو) اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا (کیونکہ مشغلہ کو شاغل کی شان سے مناسبت چاہئے تو کہاں ذات خالقِ کائنات اور کہاں یہ مصنوعات حادثہ البتہ صفات کو بوجہ قدیم اور لازم ذات ہونے کے باہم مناسبت ہے سو جب بدلائل عقلیہ واجماعِ اہلِ مِلل اس کا بھی مشغلہ قرار دیا جانا محال ہے تو مصنوعات حادثہ میں تو کسی کو اس کا وہم بھی نہ ہونا چاہئے پس ثابت ہوا کہ ہم نے عبث یعنی فضول پیدا نہیں کیا) بلکہ اثباتِ حق اور ابطال باطل کے لئے پیدا کیا ہے اور) ہم (اُس) حق بات کو (جس کے ثبوت پر مصنوعات دلالت کرتی ہیں اس) باطل بات پر (اس طرح غالب کر دیتے ہیں جیسے یوں سمجھو کہ ہم اس کو اس پر) پھینک مارتے ہیں سو وہ (حق) اس (باطل) کا بھیجا نکال دیتا ہے (یعنی اس کو مغلوب کر دیتا ہے) سو وہ (باطل مغلوب ہو کر) دفعۃً جاتا رہتا ہے (یعنی دلائلِ توحید جو ان مصنوعات سے حاصل ہوتے ہیں شرک کی بالکلیہ نفی کر دیتے ہیں جس کی جانب مخالف کا احتمال ہی نہیں رہتا) اور (تم جو باوجود ان دلائل قاہرہ کے شرک کرتے ہو تو) تمہارے لئے اس بات سے بڑی خرابی ہے جو تم (خلاف حق کے) گھڑتے ہو اور (حق تعالیٰ کی وہ شان ہے کہ) جتنے کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اِسی کے (مملوک) ہیں اور (ان میں سے) جو اللہ کے نزدیک (بڑے مقبول ومقرب) ہیں (اُن کی بندگی کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں (بلکہ شب وروز (اللہ کی) تسبیح (وتقدیس) کرتے ہیں (کسی وقت) موقوف نہیں کرتے (جب ان کی یہ حالت ہے تو عام مخلوق تو کس شمار میں ہے پس لائق عبادت کے وہی ہے اور جب کوئی دوسرا ایسا نہیں تو پھر اس کا شریک سمجھنا کتنی بے عقلی ہے) کیا (باوجود ان دلائلِ توحید کے) ان لوگوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں (بالخصوص) زمین کی چیزوں میں سے (جو کہ اور بھی ادنیٰ تر اور نازل تر ہیں جیسے پتھر یا معدنیات کے بُت) جو کسی کو زندہ کرتے ہیں (یعنی جو جان بھی نہ ڈال سکتا ہو ایسا عاجز کب معبود ہونے کے قابل ہوگا اور) زمین (میں یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں (کبھی کے) درہم برہم ہو جاتے (کیونکہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہوتا، ایک دوسرے

سے ٹکراتے اور اس کے لئے فساد لازم ہے لیکن فساد واقع نہیں ہے اس لئے متعدد معبود بھی نہیں ہو سکتے) سو (ان تقریرات سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ جو کہ مالک ہے عرش کا اُن اُمور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کر رہے ہیں (کہ نعوذ باللہ اس کے اور شرکاء بھی ہیں حالانکہ اس کی ایسی عظمت ہے کہ) وہ جو کچھ کرتا ہے اُس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پُرس کی جا سکتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ باز پرس کر سکتا ہے پس کوئی عظمت میں اس کا شریک نہیں ہوا پھر معبودیت میں کوئی کیسے شریک ہو سکتا ہے، یہاں تک تو بطور ابطال اور نقض واستلزام محال کے کلام تھا آگے بطور سوال اور منع کے کلام ہے کہ) کیا خدا کو چھوڑ کر انہوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں (ان سے) کہئے کہ تم اپنی دلیل (اس دعویٰ پر) پیش کرو (یہاں تک تو سوال اور دلیلِ عقلی سے شرک کا ابطال تھا آگے دلیل نقلی سے استدلال ہے کہ) یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب (یعنی قرآن) اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں (یعنی توراۃ و انجیل و زبور) موجود ہیں (جن کا صدق اور منزل من اللہ ہونا دلیل عقلی سے ثابت ہے اور اَوروں میں گو تحریف ہوئی ہے مگر قرآن میں تحریف کا احتمال نہیں، پس جو مضمون ان کتب کا قرآن کے مطابق ہوگا وہ یقیناً صحیح ہے اور ان سب دلائل مذکورہ کا مقتضا یہ تھا کہ یہ لوگ توحید کے قائل ہو جاتے لیکن پھر بھی قائل نہیں) بلکہ ان میں زیادہ وہی ہیں جو امرِ حق کا یقین نہیں کرتے سو (اس وجہ سے) وہ (اس کے قبول کرنے سے) اعراض کر رہے ہیں اور (یہ توحید کوئی جدید بات نہیں جس سے توحّش ہو بلکہ شرع قدیم ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں پس میری (ہی) عبادت کیا کرو اور یہ (مشرک) لوگ (جو ہیں ان میں بعضے) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں کو) اولاد بنا رکھی ہے (توبہ توبہ) وہ (اللہ تعالیٰ اس سے) پاک ہے (اور وہ فرشتے اس کی اولاد نہیں ہیں) بلکہ (اس کے) بندے ہیں (ہاں) معزز (بندے ہیں اسی سے بے عقلوں کو اشتباہ ہو گیا اور ان کی عبدیت اور محکومیت اور ادب کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے (بلکہ منتظر حکم رہتے ہیں) اور وہ اُسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں (اس کے خلاف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ اُن کے اگلے پچھلے احوال کو (خوب) جانتا ہے (پس جو حکم ہوگا اور جب حکم ہوگا موافق حکمت کے ہوگا اس لئے نہ عملی مخالفت کرتے ہیں نہ قولی مسابقت کرتے ہیں) اور (ان کے ادب کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ بجز اس (شخص) کے جس کے لئے (شفاعت کرنے کی) خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں اور (یہ تو بیان تھا ان کی مغلوبیت اور محکومیت کا۔ آگے بیان ہے اللہ تعالیٰ کی غالبیت اور حاکمیت کا، گو حاصل دونوں کا متقارب ہے یعنی) ان میں سے جو شخص (بالفرض) یوں کہے کہ (نعوذ باللہ) میں علاوہ خدا کے معبود ہوں سو ہم اس کو سزائے جہنم دیں گے (اور) ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی خدا کا ان پر پورا بس ہے جیسے اور مخلوقات پر، پھر وہ خدا کی اولاد جس کے لئے خدا ہونا ضروری ہے کیسے ہو سکتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ یعنی ہم نے آسمان اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو لعب اور کھیل کے لئے نہیں بنایا۔ پچھلی آیتوں میں بعض بستیوں کو تباہ و ہلاک کرنے کا ذکر آیا تھا اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس طرح زمین و آسمان اور اُن کی تمام مخلوقات کی تخلیق بڑی بڑی اہم حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے جن بستیوں کو تباہ کیا گیا اُن کا تباہ کرنا بھی عین حکمت تھا۔ اس مضمون کو اس آیت میں تعبیر اس طرح کیا گیا کہ یہ توحید یا رسالت کے منکر کیا ہماری قدرتِ کاملہ اور علم و بصیرت کی ان نمایاں نشانیوں کو جو زمین و آسمان کی تخلیق میں اور تمام مخلوقات کی صنعت گری میں مشاہدہ کی جارہی ہیں دیکھتے سمجھتے نہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہ سب چیزیں فضول ہی محض کھیل کے لئے پیدا کی ہیں۔

لٰعِبِيْنَ، لَعْبٌ سے مشتق ہے، لَعْبٌ ایسے کام کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی صحیح مقصد متعلق نہ ہو (راغب)[1] اور لَـهْوٌ اُس کام کو کہتے ہیں جس سے کوئی صحیح یا غلط مقصد ہی نہ ہو خالی وقت گزاری کا مشغلہ بنایا جائے منکرینِ اسلام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر اعتراض اور توحید کا انکار کرتے ہیں، قدرتِ حق کی ان عظیم الشان نشانیوں کے باوجود نہیں مانتے تو اُن کا یہ عمل گویا اس کا دعویٰ ہے کہ یہ سب چیزیں فضول ہی کھیل کے لئے بنائی گئی ہیں، اُن کے جواب میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ کھیل اور فضول نہیں ذرا بھی غور و فکر سے کام لو تو کائنات کے ایک ایک ذرّہ میں اور قدرت کی ایک ایک صنعت میں ہزاروں حکمتیں ہیں اور سب کی سب معرفت حق سبحانہٗ اور اس کی توحید کے خاموش سبق ہیں۔

ہر گیاہے کہ از زمیں روید　　　وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید[2]

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ یعنی اگر ہم کوئی مشغلہ بطور کھیل کے بنانا ہی چاہتے اور ہمیں یہ کام کرنا ہی ہوتا تو ہمیں اس کی کیا ضرورت تھی کہ زمین و آسمان وغیرہ پیدا کریں یہ کام اپنے پاس کی چیزوں سے بھی ہوسکتا تھا۔

عربی زبان میں حرف لَوْ فرضی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جس کا کوئی وجود نہ ہو اس جگہ بھی اسی حرف سے یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ جو احمق ان تمام علویات اور سفلیات، آسمانی اور زمینی مخلوقات اور مصنوعاتِ عجیبہ کو لہو و لعب سمجھتے ہیں کیا وہ اتنی بھی عقل نہیں رکھتے کہ اتنے بڑے بڑے کام لہو و لعب کے لئے نہیں ہوا کرتے یہ کام جس کو کرنا ہو وہ یوں نہیں کیا

[1] مفردات القرآن للراغبؒ ج: ۱ ص: ۴۵۰　[2] ترجمہ: جو گھاس بھی زمین سے اگتی ہے، وحدہٗ لا شریک لہٗ کہتی ہے۔

کرتا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ لہو ولعب کا کوئی کام بھی -حق تعالیٰ کی عظمتِ شان تو بہت بلند و بالا ہے- کسی اچھے معقول آدمی سے بھی متصوّر نہیں۔

لَهْوٌ کے اصلی اور معروف معنی بیکاری کے مشغلہ کے ہیں اسی کے مطابق مذکورہ تفسیر کی گئی ہے۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ لفظ لَهْوٌ کبھی بیوی کے لئے اور اولاد کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور یہاں یہ مراد لی جائے تو مطلب آیت کا یہود ونصاریٰ پر رد کرنا ہوگا جو حضرت مسیح یا عزیر علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اولاد ہی بنانی ہوتی تو انسان مخلوق کو کیوں بناتے اپنے پاس کی مخلوق میں سے بنا لیتے۔ واللہ اعلم

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ قذف کے لغوی معنی پھینکنے اور پھینک مارنے کے، يَدْمَغُ کے معنے دماغ پر ضرب لگانے کے ہیں اور زاہق کے معنے جانے والا اور بے نام ونشان ہو جانے والا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ زمین وآسمان کی عجیب وغریب کائنات ہم نے کھیل کے لئے نہیں بلکہ بڑی حکمتوں پر مبنی کر کے بنائی ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کے ذریعہ حق و باطل کا امتیاز ہوتا ہے، مصنوعات قدرت کا مشاہدہ انسان کو حق کی طرف ایسی رہبری کرتا ہے کہ باطل اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اسی مضمون کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ حق کو باطل کے اُوپر پھینک مارا جاتا ہے جس سے باطل کا دماغ (بھیجا) نکل جاتا ہے اور وہ بے نام ونشان ہو کر رہ جاتا ہے۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ یعنی ہمارے جو بندے ہمارے پاس ہیں مراد اس سے فرشتے ہیں وہ ہر وقت ہماری عبادت میں بغیر کسی وقفہ کے ہمیشہ مشغول رہتے ہیں اگر تم ہماری عبادت نہ کرو تو ہماری خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انسان چونکہ دوسروں کو بھی اپنے حال پر قیاس کرنے کا عادی اور خوگر ہوتا ہے اس کو دائمی عبادت سے دو چیزیں مانع ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی کی عبادت کرنے کو اپنے درجہ اور مقام کے خلاف سمجھے اس لئے عبادت کے پاس ہی نہ جائے دوسرے یہ کہ عبادت تو کرنا چاہتا ہے مگر دائمی مسلسل اس لئے نہیں کر سکتا کہ بمقتضائے بشریت وہ تھوڑا کام کر کے تھک جاتا ہے اس کو آرام کرنے اور سونے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے آخر آیت میں فرشتوں سے ان دونوں موانع کی نفی کر دی گئی کہ وہ نہ تو ہماری عبادت سے استکبار کرتے ہیں کہ اس کو اپنی شان کے خلاف جانیں اور نہ عبادت کرنے سے کسی وقت تھکتے ہیں اسی مضمون کی تکمیل بعد کی آیت میں اس طرح فرمائی يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ یعنی فرشتے رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں کسی وقت سست بھی نہیں ہوتے۔

عبداللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے کعب احبار سے پوچھا کہ کیا فرشتوں کو تسبیح کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں، اگر ہے تو پھر دوسرے کاموں کے ساتھ ہر وقت کی تسبیح کیسے جاری رہتی ہے۔ کعب نے فرمایا اے میرے بھتیجے کیا تمہارا کوئی کام اور مشغلہ تمہیں سانس لینے سے روکتا ہے اور کام کرنے میں مخل و مانع ہوتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ تسبیح فرشتوں کے لئے

ایسی ہے جیسے ہمارا سانس یا آنکھ جھپکنا کہ یہ دونوں چیزیں ہر وقت ہر حال میں جاری رہتی ہیں اور کسی کام میں مانع اور مخل نہیں ہوتیں۔ (قرطبی و بحر محیط) [۱]

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ اس میں مشرکین کی جہالت کوئی طرح ظاہر فرمایا ہے۔ اول یہ کہ یہ کیسے احمق ہیں کہ خدا بھی بنایا تو زمین کی مخلوق کو بنایا یہ تو علوی اور آسمانی مخلوقات سے بہرحال کمتر و ابتر ہیں دوسرے یہ کہ جن کو خدا بنایا کیا ان کو اُنہوں نے یہ کام کرتے دیکھا ہے کہ وہ کسی کو زندہ کرتے اور اس میں جان ڈالتے ہیں۔ معبود کے لئے تو یہ بات ضروری ہے کہ موت و حیاتِ خلائق اس کے قبضہ میں ہو۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ، یہ توحید کی دلیل عادی ہے جو عام عادات کے اعتبار پر مبنی ہے اور دلیل عقلی کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی مختلف تقریریں علمِ کلام کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور دلیل عادی اس بناء پر ہے کہ اگر زمین و آسمان کے دو خدا اور دونوں مالک و مختار ہوں تو ظاہر یہ ہے کہ دونوں کے احکام پورے پورے زمین و آسمان میں نافذ ہونے چاہئیں اور عادۃً یہ ممکن نہیں کہ جو حکم ایک دے وہی دوسرا بھی دے یا جس چیز کو ایک پسند کرے دوسرا بھی اُسی کو پسند کرے۔ اس لئے کبھی کبھی اختلافِ رائے اور اختلاف احکام ہونا ناگزیر ہے اور جب دو خداؤں کے احکام زمین و آسمان میں مختلف ہوئے تو نتیجہ ان دونوں کے فساد کے سوا کیا ہے۔ ایک خدا چاہتا ہے کہ اس وقت دن ہو، دوسرا چاہتا ہے رات ہو، ایک چاہتا ہے بارش ہو، دوسرا چاہتا ہے نہ ہو، تو دونوں کے متضاد احکام کس طرح جاری ہوں گے اور اگر ایک مغلوب ہو گیا تو مالکِ مختار اور خدا نہ رہا۔ اس پر یہ شبہ کہ دونوں آپس میں مشورہ کر کے احکام جاری کیا کریں اس میں کیا بُعد ہے اس کے جوابات علمِ کلام کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے آئے ہیں۔ اتنی بات یہاں بھی سمجھ لی جائے کہ اگر دونوں مشورہ کے پابند ہوئے ایک بغیر دوسرے کے مشورے کے کوئی کام نہ کر سکے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی مالک و مختار نہیں، دونوں ناقص ہیں اور ناقص خدا نہیں ہوسکتا اور شاید اگلی آیت لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ میں بھی اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ جو شخص کسی قانون کا پابند ہو جس کے افعال و اعمال پر کسی کو مواخذہ کرنے کا حق ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ خدا وہ ہی ہے جو کسی کا پابند نہ ہو، جس سے کسی کو سوال کرنے کا حق نہ ہو۔ اگر دو خدا ہوں اور دونوں مشورہ کے پابند ہوں تو ہر ایک کو دوسرے سے سوال کرنے اور ترک مشورہ پر مواخذہ کرنے کا حق لازمی ہے جو خود منصبِ خدائی کے منافی ہے۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ اس کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ سے مراد قرآن اور ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ سے مراد تورات و انجیل اور زبور وغیرہ کتب سابقہ ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ میرا اور میرے ساتھ والوں کا قرآن اور پچھلی اُمتوں کی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ موجود ہیں کیا اُن میں سے کسی کتاب میں اللہ

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیة ج:۱۱ ص:۲۸۷، وتفسیر البحر المحیط تحت ھٰذہ الآیة ج:۸ ص:۱۴۷

کے سوا کسی کی عبادت کی تلقین موجود ہے۔ تورات وانجیل وغیرہ میں تحریف ہوجانے کے باوجود یہ تو اب تک بھی کہیں صاف نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کر کے دوسرا معبود بنالو۔ بحر محیط میں اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قرآن ذکر ہے میرے ساتھ والوں کے لئے بھی اور ذکر ہے مجھ سے پہلوں کے لئے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے ساتھ والوں کے لئے تو دعوت اور تشریح احکام کے لحاظ سے ذکر ہے اور سابقین کے لئے ذکر بایں معنے ہے کہ اس کے ذریعہ سابقین کے احوال ومعاملات اور قصص زندہ ہیں۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝٢٧ یعنی فرشتے حق تعالیٰ کی اولاد تو کیا ہوتے وہ تو ایسے خائف اور مؤدب رہتے ہیں کہ نہ قول میں اللہ تعالیٰ سے سبقت کرتے ہیں نہ عمل میں اس کے خلاف کبھی کچھ کرتے ہیں، قول میں سبقت نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک حق تعالیٰ ہی کی طرف سے کوئی ارشاد نہ ہو خود کوئی کلام کرنے میں مسابقت کی ہمت نہیں کرتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑوں کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ جب مجلس میں کوئی بات آئے تو جو اس مجلس کا بڑا ہے اس کے کلام کا انتظار کیا جائے پہلے ہی کسی اور کا بول پڑنا خلافِ ادب ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ

اور کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان اور زمین منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٣٠ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ

اور بنائی ہم نے پانی سے ہر ایک چیز جس میں جان ہے پھر کیا یقین نہیں کرتے اور رکھ دیئے ہم نے زمین میں

رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝٣١

بھاری بوجھ کبھی اُن کو لے کر جھک پڑے اور رکھیں اُس میں کشادہ راہیں تاکہ وہ راہ پائیں

وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ښ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝٣٢

اور بنایا ہم نے آسمان کو چھت محفوظ اور وہ آسمان کی نشانیوں کو دھیان میں نہیں لاتے

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ

اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور سورج اور چاند سب

فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

اپنے اپنے گھر میں پھرتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، کیا اُنہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ سارے آسمان اور زمین بند تھے، پھر ہم نے اُنہیں کھول دیا، اور پانی سے ہر جاندار چیز پیدا کی ہے؟ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے؟ ﴿۳۰﴾ اور ہم نے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ پیدا کیے ہیں، تاکہ وہ اُنہیں لے کر ملنے نہ پائے، اور اُس میں ہم نے چوڑے چوڑے راستے بنائے ہیں، تاکہ وہ منزل تک پہنچ سکیں۔ ﴿۳۱﴾ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنادیا ہے، اور یہ لوگ ہیں کہ اُس کی نشانیوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ﴿۳۲﴾ اور وہی (اللہ) ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے۔ سب کسی نہ کسی مدار میں تیر رہے ہیں۔ ﴿۳۳﴾

خلاصۂ تفسیر

کیا ان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے (یعنی نہ آسمان سے بارش ہوتی تھی نہ زمین سے کچھ پیداوار، اسی کو بند ہونا فرمایا جیسا کہ اب بھی اگر کسی جگہ یا کسی زمانے میں آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار نہ ہوتو اُس جگہ یا اُس زمانے کے اعتبار سے اس کو بند کہا جاسکتا ہے) پھر ہم نے دونوں کو (اپنی قدرت سے) کھول دیا (کہ آسمان سے بارش اور زمین سے نباتات کا اُگنا شروع ہوگیا) اور (بارش سے صرف نباتات ہی کو نمو نہیں ہوتا بلکہ) ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے (یعنی ہر زندہ جاندار کے وجود اور بقاء میں پانی کا دخل ضرور ہے خواہ بلاواسطہ ہو یا کسی واسطہ سے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ [1] (البقرۃ: ۱۶۴) کیا (ان باتوں کو سن کر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے اور ہم نے (اپنی قدرت سے) زمین میں

---

[1] ترجمہ: اور پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے۔

پہاڑ اس لئے بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے اور ہم نے اس (زمین) میں کشادہ کشادہ رستے بنائے تا کہ لوگ (ان کے ذریعہ) منزلِ (مقصود) کو پہنچ جائیں اور ہم نے (اپنی قدرت سے) آسمان کو (بمقابلہ زمین کے اس کے اُوپر مثل) ایک چھت (کے) بنایا جو (ہر طرح سے) محفوظ ہے۔ (یعنی گرنے سے بھی ٹوٹنے پھوٹنے سے بھی اور اس سے بھی کہ شیطان وہاں تک پہنچ کر آسمان کی باتیں سن سکیں گے مگر یہ آسمان کا محفوظ و مضبوط ہونا بھی دائمی نہیں ایک زمانہ معین تک ہے) اور یہ لوگ اس (آسمان) کے (اندر کی موجودہ) نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں (یعنی ان میں غور وفکر اور تدبر نہیں کرتے) اور وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے (وہ نشانیاں آسمان کی یہی ہیں اور شمس وقمر میں سے) ہر ایک، ایک ایک دائرے میں (اس طرح چل رہے ہیں کہ گویا) تیر رہے ہیں۔

معارف ومسائل

اَوَلَمْ يَرَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا، اس جگہ لفظ رؤیت بمعنے علم عام ہے خواہ وہ آنکھوں سے دیکھ کر حاصل ہو یا استدلال عقلی سے۔ کیونکہ آگے جو مضمون آرہا ہے اُس کا تعلق کچھ مشاہدہ اور دیکھنے سے ہے کچھ علم استدلالی سے۔

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ لفظ رتق کے معنے بند ہونے اور فتق کے معنے کھول دینے کے ہیں۔ ان دو لفظوں کا مجموعہ رتق وفتق کسی کام کے انتظام اور اُس کے پورے اختیار کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ آسمان اور زمین بند تھے ہم نے ان کو کھول دیا۔ اس میں بند ہونے اور کھول دینے سے مراد کیا ہے اس کی مراد میں حضرات مفسرین نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں مگر اُن سب میں جو معنے صحابہ کرام اور جمہور مفسرین نے اختیار فرمائے وہ وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں لئے گئے ہیں کہ بند ہونے سے مراد آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار کا بند ہونا ہے اور کھولنے سے مراد ان دونوں کو کھول دینا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص اُن کے پاس آیا اور اُن سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی اُنہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس شیخ کے پاس جاؤ اُن سے دریافت کرو اور وہ جو جواب دیں مجھے بھی اس کی اطلاع کرو۔ یہ شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ اس آیت میں رتقا اور فتقنا سے کیا مراد ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ پہلے آسمان بند تھے بارش نہ برساتے تھے اور زمین بند تھی کہ اس میں نباتات نہیں اُگتی تھی جب اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو آباد کیا تو آسمان کی بارش کھول دی اور زمین کا نشو ونما۔ یہ شخص آیت کی تفسیر معلوم کر کے حضرت ابن عمرؓ کے پاس واپس گیا اور جو کچھ ابن عباسؓ سے سنا تھا وہ بیان کیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اب مجھے ثابت ہو گیا کہ واقعی ابن عباسؓ کو قرآن کا علم عطا کیا گیا ہے۔ اس

سے پہلے میں تفسیر قرآن کے بارے میں ابن عباسؓ کے بیانات کو ایک جرأت سمجھا کرتا تھا جو مجھے پسند نہ تھی اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علومِ قرآن کا خاص ذوق عطا فرمایا ہے اُنہوں نے رتق وفتق کی تفسیر صحیح فرمائی ہے۔ [۱]

روح المعانی میں ابن عباسؓ کی اس روایت کو ابن المنذر اور ابو نعیم اور ایک جماعت محدثین کے حوالہ سے نقل کیا ہے جن میں حاکم صاحبِ مستدرک بھی ہیں، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ [۲]

ابن عطیہ عوفی اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ تفسیر حسن اور جامع اور سیاق وسباق قرآن کے مناسب ہے اس میں منکرین کے خلاف عبرت اور حجت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور قدرتِ کاملہ کا اظہار بھی جو معرفت وتوحید کی بنیاد ہے اور بعد کی آیات میں جو "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" فرمایا ہے اس سے اسی معنے کے اعتبار سے مناسبت ہے۔ بحر محیط میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ قرطبی نے اسی کو عکرمہ کا قول بھی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ایک دوسری آیت سے بھی اس معنے کی تائید ہوتی ہے یعنی وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ [۳] (الطارق) طبری نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ [۴]

"وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" مراد یہ ہے کہ ہر جاندار کی تخلیق میں پانی کا دخل ضرور ہے اور جاندار وذی روح اہلِ تحقیق کے نزدیک صرف انسان اور حیوانات ہی نہیں بلکہ نباتات بلکہ جمادات میں رُوح اور حیات محققین کے نزدیک ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ پانی کو ان سب چیزوں کی تخلیق وایجاد اور ارتقاء میں بڑا دخل ہے۔

ابن کثیر نے امام محمدؒ کی سند سے بروایت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ میں جب آپ کی زیارت کرتا ہوں تو میرا دل باغ باغ اور آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں، آپ مجھے ہر شے (کی تخلیق) کے بارے میں بتلا دیجئے، آپ نے فرمایا کہ ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اس کے بعد ابو ہریرہؓ نے سوال کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جس پر عمل کرنے سے میں جنت میں پہنچ جاؤں، آپ نے فرمایا:

اَفْشِ السَّلَامَ وَاَطْعِمِ الطَّعَامَ وَصِلِ الْاَرْحَامَ وَقُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ ثُمَّ ادْخُلِ الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ، تَفَرَّدَ بِهٖ اَحْمَدُ وَهٰذَا اِسْنَادٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ اِلخ۔ [۵]

سلام کرنے کو عام کرو (خواہ مخاطب اجنبی ہو) اور کھانا کھلایا کرو (اس کو بھی حدیث میں عام رکھا ہے

---

[۱] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۵ ص:۳۳۹

[۲] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۷ ص:۳۵، والمستدرك للحاكم (بالاختصار) رقم الحديث:۳۴۰۰ تفسير سورة الأنبياء۔

[۳] ترجمہ: قسم ہے آسمان کی جس سے بارش ہوتی ہے اور زمین کی جو پھٹ جاتی ہے۔

[۴] تفسير الطبری تحت هذه الآية ج:۱۸ ص:۴۳۲، والقرطبی ج:۱۱ ص:۲۸۴، والبحر المحيط ج:۸ ص:۱۵۵

[۵] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۵ ص:۳۴۰ ومسند احمد رقم الحديث:۷۹۱۹

کھانا کھلاناہر شخص کو خواہ کافر فاسق ہی ہو ثواب سے خالی نہیں) اور صلہ رحمی کیا کرو اور رات کو تہجد کی نماز پڑھا کرو جب سب لوگ سوتے ہوں تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ لفظ مَيْد عربی زبان میں اضطرابی حرکت کو کہا جاتا ہے اور مراد آیت کی یہ ہے کہ زمین پر پہاڑوں کا بوجھ حق تعالیٰ نے اس کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ڈال دیا ہے تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کر سکے جس سے اُس کے اُوپر بسنے والوں کو نقصان پہنچے۔ اس کی فلسفیانہ تحقیق کہ پہاڑوں کے بوجھ کو زمین کے قرار میں کیا دخل ہے اس کی یہاں ضرورت نہیں۔ تفسیر کبیر وغیرہ میں اس کا مفصّل بیان اہلِ علم دیکھ سکتے ہیں اور بقدر ضرورت سورۂ نمل کی تفسیر میں حضرت حکیم الامۃؒ نے تفسیر بیان القرآن میں بھی لکھ دیا ہے۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۳۳ لفظ فلک دراصل ہر دائرے اور گول چیز کو کہا جاتا ہے اسی وجہ سے چرخے میں جو گول چمڑا لگا ہوتا ہے اس کو فَلْكَةُ الْمِغْزَلْ کہتے ہیں (روح)[1] اور اسی وجہ سے آسمان کو بھی فلک کہہ دیا جاتا ہے۔ یہاں مراد شمس وقمر کی وہ مداریں ہیں جن پر وہ حرکت کرتے ہیں۔ الفاظ قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے یہ مداریں آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضاء میں۔ حالیہ خلائی تحقیقات نے واضح کر دیا ہے کہ یہ مداریں خلاء اور فضاء میں آسمان سے بہت نیچے ہیں۔

اس آیت کے ظاہر سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ آفتاب بھی ایک مدار پر حرکت کرتا ہے جدید فلاسفہ پہلے اس کے منکر تھے اب وہ بھی اس کے قائل ہو گئے ہیں۔ مزید تفصیلات کی یہ جگہ نہیں۔ وَاللّٰهُ سُبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۳۴

اور نہیں دیا ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا، پھر کیا اگر تو مرگیا تو وہ رہ جائیں گے

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا

ہر جی کو چکھنی ہے موت اور ہم تم کو جانچتے ہیں بُرائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو اور ہماری طرف

تُرْجَعُوْنَ ۳۵ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ

پھر کر آجاؤ گے اور جہاں تجھ کو دیکھا منکروں نے تو کوئی کام نہیں اُن کو تجھ سے مگر ٹھٹھا کرنا

[1] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۷ ص:۴۰

أَهٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ ج وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُونَ ﴿٣٦﴾

کیا یہی شخص ہے جو نام لیتا ہے تمہارے معبودوں کا اور وہ رحمٰن کے نام سے منکر ہیں

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ط سَأُورِيكُمْ آيٰتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ﴿٣٧﴾

بنا ہے آدمی جلدی کا اب دکھلاتا ہوں تم کو اپنی نشانیاں سو مجھ سے جلدی مت کرو

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿٣٨﴾ لَوْ يَعْلَمُ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو اگر جان لیں

الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ

یہ منکر اُس وقت کو کہ نہ روک سکیں گے اپنے منہ سے آگ اور نہ اپنی پیٹھ سے

وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٣٩﴾ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا

اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی کچھ نہیں وہ آئے گی اُن پر ناگہاں پھر ان کے ہوش کھودے گی پھر نہ پھیر سکیں گے اُس کو

وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ

اور نہ اُن کو فرصت ملے گی اور ٹھٹھے ہوچکے ہیں رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر اُلٹ پڑی

بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٤١﴾ ع قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ

ٹھٹھا کرنے والوں پر اُن میں سے وہ چیز جس کا ٹھٹھا کرتے تھے تو کہہ کون نگہبانی کرتا ہے تمہاری

بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ط بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُعْرِضُونَ ﴿٤٢﴾

رات میں اور دن میں رحمٰن سے کوئی نہیں وہ اپنے ربّ کے ذکر سے منہ پھیرتے ہیں

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ

یا ان کے واسطے کوئی معبود ہیں کہ اُن کو بچاتے ہیں ہمارے سوا وہ اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے اور نہ اُن کی

مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ

ہماری طرف سے رفاقت ہو کوئی نہیں پر ہم نے عیش دیا اُن کو اور اُن کے باپ دادوں کو یہاں تک کہ بڑھ گئی اُن پر زندگی

اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

پھر کیا نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اُس کے کناروں سے اب کیا وہ جیتنے والے ہیں

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۫ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ

تو کہہ میں جو تم کو ڈراتا ہوں سو حکم کے موافق اور سُنتے نہیں بہرے پکارنے کو

اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ

جب کوئی اُن کو ڈر کی بات سُنائے اور کہیں پہنچ جائے اُن تک ایک بھاپ تیرے ربّ کے عذاب کی تو ضرور کہنے لگیں

يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ

ہائے کم بختی ہماری بیشک ہم تھے گنہگار اور رکھیں گے ہم ترازوئیں انصاف کی قیامت کے دن

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ

پھر ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ایک ذرّہ اور اگر ہوگا برابر رائی کے دانہ کی تو ہم لے آئیں گے اُس کو

وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور ہم کافی ہیں حساب کرنے کو

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) تم سے پہلے بھی ہمیشہ زندہ رہنا ہم نے کسی فرد بشر کے لئے طے نہیں کیا۔ چنانچہ اگر تمہارا انتقال ہوگیا تو کیا یہ لوگ ایسے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں؟ ﴿۳۴﴾ ہر جان دار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہم تمہیں آزمانے کے لئے بُری بھلی حالتوں میں مبتلا کرتے ہیں، اور تم سب ہمارے پاس ہی لوٹا کر لائے جاؤ گے۔ ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا ہے، وہ جب تمہیں دیکھتے ہیں تو اس کے سوا اُن کا کوئی کام نہیں ہوتا کہ وہ تمہارا مذاق بنانے لگتے ہیں (اور کہتے ہیں:) ''کیا یہی صاحب ہیں جو تمہارے خداؤں کا ذکر کیا کرتے ہیں؟ (یعنی یہ کہتے ہیں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں)'' حالانکہ ان (کافروں) کی اپنی حالت یہ ہے کہ وہ خدائے رحمٰن ہی کا ذکر کرنے سے انکار کئے بیٹھے ہیں! ﴿۳۶﴾ انسان جلد بازی کی خصلت لے کر پیدا ہوا ہے۔ میں عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دِکھلا دُوں گا، لہٰذا تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ۔ ﴿۳۷﴾ اور یہ لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ: ''اگر تم سچے ہو تو آخر یہ (عذاب کی) دھمکی کب پوری ہوگی؟'' ﴿۳۸﴾ کاش ان کافروں کو اُس وقت کی کچھ خبر لگ جاتی جب یہ نہ اپنے چہروں سے آگ کو دُور کرسکیں گے، اور نہ اپنی پشتوں سے، اور نہ ان کو کوئی مدد میسر آئے گی۔ ﴿۳۹﴾ بلکہ وہ (آگ) ان کے پاس ایک دم آدھمکے گی، اور ان کے ہوش وحواس گم کرکے رکھ دے گی، پھر نہ یہ اُسے پیچھے ہٹا سکیں گے، اور نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔ ﴿۴۰﴾ اور (اے پیغمبر!) تم سے پہلے بھی پیغمبروں کا مذاق اُڑایا گیا تھا، پھر اُن کا مذاق بنانے والوں کو اُسی چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ﴿۴۱﴾ کہہ دو کہ: ''کون ہے جو رات میں اور دن میں خدائے رحمٰن (کے عذاب سے) سے تمہارا بچاؤ کرے؟'' مگر وہ ہیں کہ اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ﴿۴۲﴾ بھلا کیا ان کے پاس ہمارے سوا کوئی ایسے خدا ہیں جو ان کی حفاظت کرتے ہوں؟ وہ تو خود اپنی مدد نہیں کرسکتے، اور نہ ہمارے مقابلے میں کوئی ان کا ساتھ دے سکتا ہے۔ ﴿۴۳﴾ بلکہ معاملہ یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو سامانِ عیش عطا کیا، یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ان پر ایک عمر گذر گئی۔ بھلا کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو اس کے مختلف کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ پھر کیا وہ غالب آجائیں گے؟ ﴿۴۴﴾ کہہ دو کہ: ''میں تو تمہیں وحی کے ذریعے ڈراتا ہوں'' لیکن بہرے لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں ڈرایا جاتا ہے تو وہ کوئی پکار نہیں سنتے۔ ﴿۴۵﴾ اور اگر تمہارے پروردگار کے عذاب کا ایک جھونکا بھی انہیں چھو جائے تو یہ کہہ اُٹھیں گے کہ: ''ہائے ہماری کم بختی! واقعی ہم لوگ ظالم تھے۔'' ﴿۴۶﴾ اور ہم قیامت کے دن ایسی ترازویں لا رکھیں گے جو سراپا انصاف ہوں گی، چنانچہ کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا، تو ہم اُسے سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لینے کے لئے ہم کافی ہیں۔ ﴿۴۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (یہ لوگ جو آپ کی وفات کی خوشیاں منا رہے ہیں، لقولہ تعالیٰ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿٣٠﴾ [1] (الطّور)، یہ وفات بھی منافی نبوّت کی نہیں کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کے لئے (خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی دنیا میں) ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا (کقولہ تعالیٰ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿٨﴾ [2] (الانبیاء) پس جیسے آپ سے پہلے انبیاء کو موت آئی اس سے ان کی نبوّت میں کسی کو شبہ نہیں ہوا اسی طرح آپ کی وفات سے آپ کی نبوّت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبوّت اور موت دونوں ایک شخص میں جمع ہوسکتی ہیں) پھر (یہ کہ) اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو کیا یہ لوگ (دُنیا میں) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (آخر یہ بھی مریں گے پھر خوشی کا کیا مقام ہے؟ مطلب یہ کہ آپ کی وفات سے ان کی خوشی اگر ابطال نبوّت کے لئے ہے، تب تو مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ الخ اس کا جواب ہے اور اگر ذاتی بغض و عداوت سے ہے تو اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ الخ اس کا جواب ہے غرض ہر حال میں یہ انتظار مہمل اور لغو ہے اور موت تو ایسی چیز ہے کہ تم میں) ہر جاندار موت کا مزا چکھے گا اور (یہ جو ہم نے چند روزہ تم کو زندگی دے رکھی ہے تو اس سے مقصود محض یہ ہے کہ) ہم تم کو بُری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں (بُری حالت سے مراد جو کہ خلاف مزاج ہو جیسے مرض و فقر اور اچھی حالت سے مراد جو کہ موافق مزاج ہو جیسے صحت اور غنا زندگی میں یہی حالتیں مختلف طور پر پیش آتی ہیں۔ کوئی ان میں ایمان اور طاعت بجالاتا ہے اور کوئی کفر و معصیت کرتا ہے مطلب یہ کہ زندگی اس لئے دے رکھی ہے کہ دیکھیں کیسے کیسے عمل کرتے ہو) اور (اس زندگی کے ختم پر) پھر تم سب ہمارے پاس چلے آؤ گے (اور ہر ایک کو اُس کے مناسب سزا و جزا دیں گے پس امر مہم تو موت اور مابعد الموت ہی ہوا اور زندگی محض عارضی پھر یہ لوگ اس پر اتراتے ہیں اور پیغمبر کی وفات پر خوشیاں مناتے ہیں یہ نہ ہوا کہ اس مستعار زندگی میں دولتِ ایمان وطاعت کما لیتے جو اُن کے کام آتی اور اُلٹا نامۂ اعمال سیاہ اور آخرت کی منزل بھاری کر رہے ہیں ڈرتے نہیں) اور (ان منکرین کی یہ حالت ہے کہ) یہ کافر لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے ہنسی مذاق کرنے لگتے ہیں (اور آپس میں کہتے ہیں) کہ کیا یہی (صاحب) ہیں جو تمہارے معبودوں کا (بُرائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں (سو آپ پر تو بتوں کے انکار کا بھی اعتراض ہے) اور (خود) یہ لوگ (حضرت) رحمٰن (جل شانہٗ) کے ذکر پر انکار (اور کفر) کیا کرتے ہیں (تو اعتراض کی بات تو درحقیقت یہ ہے اس لئے ان کو اپنی اس حالت پر استہزاء کرنا چاہئے تھا اور اُن کی یہ حالت ہے کہ جب سزائے کفر کا مضمون سنتے ہیں جیسے اوپر ہی ذکر ہوا ہے اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٥﴾ تو بوجہ تکذیب کے اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ یہ سزا جلد آجائے اور یہ تقاضا اور عجلت کچھ انسانی طبیعت کا خاصہ اکثر یہ بھی ہے پس اس کا طبعی ہونا ایسا ہے جیسے گویا) انسان جلدی ہی

[1] ترجمہ: ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ [2] ترجمہ: اور وہ حضرات ہمیشہ رہنے والے نہیں ہوئے۔

(کے خمیر) کا بنا ہوا (ہے یعنی عجلت اور جلدی مثل اُس کے اجزاء ترکیبیہ کے ہے اسی واسطے یہ لوگ عذاب جلدی جلدی مانگتے ہیں اور اس میں دیر ہونے کو دلیل عدم وقوع کی سمجھتے ہیں لیکن اے کافرو یہ تمہاری غلطی ہے کیونکہ اس کا وقت معین ہے سو ذرا صبر کرو) ہم عنقریب (اس کے وقت آنے پر) تم کو اپنی نشانیاں (قہر کی یعنی سزائیں) دکھائے دیتے ہیں، پس تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ (کیونکہ عذاب وقت سے پہلے آتا نہیں اور وقت پر ٹلتا نہیں) اور یہ لوگ (جب یہ مضمون سنتے ہیں کہ وقت موعود پر عذاب آئے گا تو رسول اور مؤمنین سے یوں) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کس وقت آوے گا اگر تم (وقوع عذاب کی خبر میں) سچے ہو (تو توقف کا ہے کا جلدی سے کیوں نہیں واقع کر دیا جاتا۔ اصل یہ ہے کہ ان کو اس مصیبت کی خبر نہیں جو ایسی بے فکری کی باتیں کرتے ہیں) کاش ان کافروں کو اس وقت کی خبر ہوتی جبکہ (اُن کو سب طرف سے دوزخ کی آگ گھیرے گی اور) یہ لوگ (اُس) آگ کو نہ اپنے سامنے سے روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے اور نہ اُن کی کوئی حمایت کرے گا (یعنی اگر اس مصیبت کا علم ہوتا تو ایسی باتیں نہ بناتے اور یہ جو دنیا ہی میں عذابِ نار کی فرمائش کر رہے ہیں سو یہ ضرور نہیں کہ اُن کی فرمائش کے موافق عذابِ نار آجائے) بلکہ وہ آگ (تو) ان کو ایک دم سے آئے گی سو اُن کو بدحواس کر دے گی پھر نہ اُس کے ہٹانے کی اُن کو قدرت ہوگی اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی اور (اگر وہ یوں کہیں کہ اگر یہ عذاب آخرت میں موعود ہونے کی وجہ سے دُنیا میں نہیں ہوتا تو اچھا دُنیا میں اس کا کوئی نمونہ تو دکھلا دو تو گو بقاعدہ مناظرہ نمونہ دکھلانا ضرور نہیں لیکن تبرعاً نمونہ کا پتہ بھی دیا جاتا ہے وہ یہ کہ) آپ سے پہلے جو پیغمبر گزرے ہیں اُن کے ساتھ بھی (کفّار کی طرف سے) تمسخر کیا گیا سو جن لوگوں نے اُن سے تمسخر کیا تھا اُن پر وہ عذاب واقع ہو گیا جس کے ساتھ وہ استہزاء کرتے تھے (کہ عذاب کہاں ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ کفر موجبِ عذاب ہے پس اگر دُنیا میں وقوع نہ ہو تو آخرت میں ہوگا اور یہ بھی اُن سے) کہہ دیجئے (کہ دُنیا میں جو تم عذاب سے محفوظ ہو سو یہ حفاظت بھی حضرت رحمٰن ہی کر رہا ہے اس میں بھی اُسی کا احسان اور دلالت علی التوحید ہے اور اگر تم اُس کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر بتلاؤ) کہ وہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمٰن (کے عذاب) سے تمہاری حفاظت کرتا ہو (اور اس مضمون کا مسلم مقتضا یہ تھا کہ توحید کے قائل ہو جاتے مگر وہ اب بھی قائل نہ ہوئے) بلکہ وہ لوگ (اب بھی بدستور) اپنے رَبّ (حقیقی) کے ذکر (توحید کے قبول کرنے) سے روگرداں (ہی) ہیں (ہاں ہم مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ کے مصداق کی توضیح کے لئے تصریحاً دریافت کرتے ہیں کہ) کیا ان کے پاس ہمارے سوا اور ایسے معبود ہیں کہ (عذاب مذکور سے) اُن کی حفاظت کر لیتے ہوں (وہ بیچارے ان کی تو کیا حفاظت کرتے اُن کی بیچارگی و درماندگی کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ خود اپنی حفاظت کی قدرت نہیں رکھتے (مثلاً اُن کو کوئی توڑنے پھوڑنے لگے تو مدافعت بھی نہیں کر سکتے کقولہ تعالیٰ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ [1] (الحج: ۷۳) پس نہ وہ اُن کے معبود ان کی حفاظت کر سکتے ہیں) اور نہ ہمارے مقابلہ

[1] ترجمہ: اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔

میں کوئی اُن کا ساتھ دے سکتا ہے (اور یہ لوگ باوجود ان دلائل ساطعہ کے جو حق کو قبول نہیں کرتے تو یہ وجہ نہیں کہ دعویٰ یا دلیل میں کچھ خلل ہے) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) میں نے ان کو اور اُن کے باپ دادوں کو (دُنیا کا) خوب سامان دیا یہاں تک کہ اُن پر (اسی حالت میں) ایک عرصۂ دراز گزر گیا (کہ پشتہا پُشت سے عیش آرام کرتے آرہے ہیں پس کھا کھا کے غُرّانے لگے اور آنکھیں پتھرا گئیں مطلب یہ کہ ان ہی میں خلل غفلت کا ہے لیکن باوجود مُنَبِّہاتِ تشریعیہ وتکوینیہ کے اتنی غفلت بھی نہ ہونا چاہئے چنانچہ ایک امر مُنَبِّہ کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ) کیا اُن کو یہ نظر نہیں آتا کہ ہم (ان کی) زمین کو (بذریعہ فتوحات اسلامیہ کے) ہر چہار طرف سے برابر گھٹاتے چلے جاتے ہیں سو کیا یہ لوگ (یہ توقع رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین پر) غالب آئیں گے (کیونکہ قرائن عادیہ اور دلائل تنزیلیہ متفق ہیں اُن کے مغلوب اور اہلِ حق کے غالب ہوتے جانے پر تاوقتیکہ مسلمان طاعتِ خداوندی سے منہ نہ موڑیں اور حمایتِ اسلام نہ چھوڑیں پس اس امر میں تامل کرنا بھی تنبیہ کے لئے کافی ہے اگر اس پر بھی عناد وجہالت سے وقوع عذاب ہی کی فرمائش کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو ڈراتا ہوں (عذاب کا آنا میرے بس سے باہر ہے) اور (گو یہ طریقہ دعوت الی الحق کا اور یہ انذار کافی ہے مگر) یہ بہرے جس وقت (حق کی طرف بلائے جانے کے واسطے عذاب سے) ڈرائے جاتے ہیں سنتے ہی نہیں (اور طریق وضوح حق میں تامل ہی نہیں کرتے بلکہ وہی مُرغی کی ایک ٹانگ عذاب ہی مانگے جاتے ہیں) اور (کیفیت عالی ہمّتی کی یہ ہے کہ) اگر ان کو آپ کے رَبّ کے عذاب کا ایک جھونکا بھی ذرا لگ جائے تو (ساری بہادری ختم ہو جائے اور) یوں کہنے لگیں کہ ہائے ہماری کمبختی (کیسی ہمارے سامنے آئی) واقعی ہم خطاوار تھے (بس اس ہمّت پر عذاب کی فرمائش ہے واقعی اُن کی اس شرارت کا تو یہی مقتضا تھا کہ دُنیا ہی میں فیصلہ کر دیتے مگر ہم بہت سی حکمتوں سے دُنیا میں سزائے موعود دینا نہیں چاہتے بلکہ آخرت کے لئے اُٹھا رکھا ہے اور (وہاں) قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کریں گے) سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا اور (ظلم نہ ہونے کا یہ ثمرہ ہوگا کہ) اور اگر (کسی کا کوئی) عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو ہم اُس کو (وہاں) حاضر کر دیں گے (اور اس کا بھی وزن کریں گے) اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں (ہمارے اس وزن اور حساب کے بعد پھر کسی حساب وکتاب کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ اُسی پر سب فیصلہ ہو جائے گا پس وہاں لوگوں کی شرارتوں کی بھی سزائے مناسب وکافی جاری کر دی جاوے گی)۔

معارف ومسائل

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ سابقہ آیات میں کفّار ومشرکین کے باطل دعووں اور مشرکانہ عقیدوں کی جن میں حضرت مسیح یا عزیر وغیرہ کو خدائی کا شریک یا فرشتوں اور مسیحؑ کو خدا تعالیٰ کی اولاد کہا گیا ان گمراہ کن عقائد کی تردید وابطال

واضح دلائل کے ساتھ آیا ہے جس کا مخالفین کے پاس کوئی جواب نہ تھا ایسے مواقع میں جب مخالف حجت و دلیل سے مغلوب ہو جائے تو جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ مشرکینِ مکہ اس کی تمنا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد وفات ہو جائے جیسا کہ بعض آیات میں ہے نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰ [1] (الطور) اس آیت میں حق تعالیٰ نے اُن کی اس بیہودہ تمنا کے دو جواب دیئے ہیں۔ وہ یہ کہ اگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد ہی وفات ہو گئی تو تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ اگر تمہارا مقصد یہ ہے کہ اُن کی موت ہو جائے گی تو ہم لوگوں کو بتلائیں گے کہ یہ نبی و رسول نہیں تھے ورنہ موت نہ آتی تو اس کا یہ جواب دیا کہ جن انبیاء کی نبوّت کو تم بھی مانتے ہو کیا اُن کو موت نہیں آئی، جب اُن کی موت سے اُن کی نبوّت و رسالت میں کوئی فرق نہیں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے آپ کی نبوّت کے خلاف کوئی پروپیگنڈا کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر تمہارا مقصد آپ کی جلد وفات سے اپنا غصّہ ٹھنڈا کرنا ہے تو یاد رکھو کہ یہ موت کا مرحلہ تمہیں بھی درپیش ہے آخر تمہیں بھی مرنا ہے پھر کسی کی موت سے خوش ہونے کے کیا معنے ؎

اگر بمرد عدو جائے شادمانی نیست — کہ زندگانیٔ ما نیز جاودانی نیست [2]

موت کیا چیز ہے؟

پھر ارشاد فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے یہاں مراد ہر نفس سے نفوسِ ارضیہ یعنی زمینی جاندار ہیں۔ اُن سب کو موت آنا لازمی ہے نفوسِ ملائکہ اس میں داخل نہیں، اس میں اختلاف ہے کہ قیامت کے روز فرشتوں کو بھی موت آئے گی یا نہیں؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ ایک لحظہ کے لئے تو سب پر موت طاری ہو جائے گی خواہ انسان اور نفوسِ ارضیہ ہوں یا فرشتے اور نفوسِ سماویہ۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ فرشتے اور جنت کے حور و غلمان موت سے مستثنیٰ ہیں۔ واللہ اعلم (روح المعانی) [3] اور موت کی حقیقت جمہور علماء کے نزدیک روح کا جسدِ عنصری سے نکل جانا ہے اور روح خود ایک جسمِ نورانی لطیف ذی حیات متحرک کا نام ہے جو انسان کے پورے بدن میں ایسا سمایا ہوا رہتا ہے جیسے عرق گلاب اس کے پھول میں۔ ابن قیم نے روح کی حقیقت بیان کر کے اس کو سو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ (رُوح المعانی) [4]

لفظ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ سے اشارہ اس طرف پایا جاتا ہے کہ ہر نفس موت کی خاص تکلیف محسوس کرے گا کیونکہ مزہ چکھنے کا محاورہ ایسے ہی مواقع میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رُوح کا جیسا اتصال بدن کے ساتھ ہے اُس کے نکلنے

---

[1] ترجمہ: ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

[2] ترجمہ: اگر دشمن مر جائے تو یہ خوشی کا مقام نہیں ہے کیونکہ ہماری زندگی بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔

[3] تفسیر روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۱۷ ص:۴۶

[4] تفسیر روح المعانی بحوالۂ بالا۔

کے وقت تکلیف اور الم کا احساس امر طبعی ہے رہا بعض اہلُ اللہ کا یہ معاملہ کہ اُن کو موت سے لذت و راحت حاصل ہوتی ہے کہ دُنیا کی تنگیوں سے نجات ہوئی اور محبوبِ اکبر سے ملاقات کا وقت آ گیا، تو یہ ایک دوسری طرح کی لذّت ہے جو مفارقت بدن کی طبعی تکلیف کے منافی نہیں کیونکہ جب کوئی بڑی راحت اور بڑا فائدہ سامنے ہوتا ہے تو اُس کے لئے چھوٹی تکلیف برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے اس معنٰی کے لحاظ سے بعض اہل اللہ نے دُنیا کے غم و رنج اور مصیبتوں کو بھی محبوب قرار دیا ہے کہ ''از محبت تلخہا شیریں شوند'' [۱]

غم چہ استادۂ تو بر درِ ما   اندر آ یارِ ما برادرِ ما [۲]

اور مولانا رومی نے فرمایا ؎

رنج راحت شد چو مطلب شد بزرگ   گرد گلہ توتیائے چشمِ گرگ [۳]

دُنیا کی ہر تکلیف و راحت آزمائش ہے

وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً یعنی ہم شر اور خیر دونوں کے ذریعہ انسان کی آزمائش کرتے ہیں۔ شر سے مراد ہر خلاف طبع چیز ہے جیسے بیماری، رنج و غم، فقر و فاقہ اور خیر سے اس کے بالمقابل ہر مرغوب طبع چیز ہے جیسے صحت و عافیت، خوشی و راحت، غناء و اسبابِ عیش وغیرہ۔ یہ دونوں طرح کی چیزیں اس دُنیا میں انسان کی آزمائش کے لئے آتی ہیں کہ شر یعنی خلاف طبع اُمور پر صبر کر کے اس کا حق ادا کرنا اور خیر یعنی مرغوب خاطر چیزوں پر شکر کر کے اس کا حق ادا کرنا ہے آزمائش یہ ہے کہ کون اس پر ثابت قدم رہتا ہے کون نہیں رہتا۔ اور بزرگوں نے فرمایا کہ حقوق شکر پر ثابت قدم رہنا بہ نسبت حقوقِ صبر کے مشکل ہے۔ انسان کو تکلیف پر صبر کرنا اتنا بھاری نہیں ہوتا جتنا عیش و عشرت اور آرام و راحت میں اس کے حقِ شکر ادا کرنے پر ثابت قدمی مشکل ہوتی ہے اسی بنا پر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا:

بُلِيْنَا بِالضَّرَّاءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِيْنَا بِالسَّرَّاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ۔ (رُوح المعانی) [۴]

یعنی ہم تکلیفوں میں مبتلا کئے گئے اُس پر تو ہم نے صبر کر لیا لیکن جب راحت و عیش میں مبتلا کئے گئے تو اُس پر صبر نہ کر سکے یعنی اُس کے حقوق ادا کرنے پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔

---

[۱] ترجمہ: محبت کی وجہ سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی بن جاتی ہیں۔

[۲] ترجمہ: اے غم! کیا بات ہے کہ تو ہمارے دروازے پر ہی کھڑا ہے، اندر آ اے میرے دوست اے میرے بھائی۔

[۳] ترجمہ: جب مقصد بڑا ہو تو اس کے راستے میں رنج بھی راحت ہو جاتا ہے، ریوڑ کا گرد و غبار بھیڑیے کی آنکھ کا سرمہ بن جاتا ہے۔

[۴] روح المعانی ج:۱۷ ص:۱۴۶

جلد بازی مذموم

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ عجل بمعنی عجلت اور جلدی کے ہے جس کی حقیقت کسی چیز کو اُس کے وقت سے پہلے طلب کرنا ہے اور یہ وصف فی نفسہٖ مذموم ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی اس کو انسانی کمزوری کے طور پر ذکر فرمایا ہے وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ⑪ (بنی اسرائیل) یعنی انسان بڑا جلد باز ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر اپنی قوم سے آگے بڑھ کر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو وہاں بھی اس عجلت پر عتاب ہوا۔ اور انبیاء وصلحاء کے بارے میں جو مسارعت اور مسابقت فی الخیرات کو بطور مدح کے ذکر کیا گیا ہے وہ جلد بازی اور عجلت کے مفہوم میں داخل نہیں۔ کیونکہ وہ وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب نہیں بلکہ وقت پر تکثیرِ خیرات وحسنات کی کوشش ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

اور خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں جس طرح کچھ دوسری کمزوریاں رکھ دی گئی ہیں ان میں سے ایک کمزوری عجلت کی بھی ہے اور جو چیز طبیعت اور جبلّت میں داخل ہوتی ہے عرب اس کو اِسی عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ شخص اُس چیز سے پیدا کیا گیا جیسے کسی کے مزاج میں غصہ غالب ہوگا تو کہا جائے گا کہ یہ غصّے کا بنا ہوا آدمی ہے۔

سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ، اس میں آیات سے مراد وہ معجزات اور حالات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق وحقانیت پر شہادت دیتے ہیں (قرطبی) [1] جیسے غزوۂ بدر وغیرہ میں یہ نشانیاں کھلے طور پر ظاہر ہوئیں، اور انجام کار اُن مسلمانوں کا غلبہ سب کی آنکھوں نے دیکھ لیا جن کو سب سے زیادہ ضعیف وذلیل سمجھا جاتا تھا۔

قیامت میں وزن اعمال اور اُس کی میزان

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، لفظ مَوَازِين میزان کی جمع ہے جو ترازو کے معنے میں آتا ہے اس جگہ میزان کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے بعض حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ وزن اعمال کے لئے بہت سی میزانیں استعمال کی جائیں گی خواہ ہر شخص کے لئے الگ الگ میزان ہو یا خاص خاص اعمال کے لئے الگ الگ میزانیں ہوں مگر جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ میزان ایک ہی ہوگی اس کو بصیغۂ جمع اس لئے تعبیر کر دیا ہے کہ وہ بہت سی موازین کا کام دے گی کیونکہ ساری مخلوقات آدم علیہ السلام سے قیامت تک جن کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے اُن سب کے اعمال کو یہی ترازو تولے گی۔ اور قسط کے معنی عدل وانصاف کے ہیں معنے یہ ہیں کہ یہ میزان عدل وانصاف کے ساتھ وزن کرے گی ذرا کمی بیشی نہ ہوگی۔ مستدرک حاکم میں بروایت حضرت سلمانؓ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۱ ص:۲۸۹

فرمایا کہ قیامت کے روز جو میزان وزنِ اعمال کے لئے رکھی جائے گی اتنی بڑی اور وسیع ہوگی کہ اُس میں آسمان وزمین کو تولنا چاہیں تو وہ بھی اس میں سما جائیں۔ (مظہری) [1]

حافظ ابوالقاسم لالکائی نے اپنی سُنن میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزان پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا اور ہر انسان کو اس میزان کے سامنے لایا جائے گا۔ اگر اس کی نیکیوں کا پلّہ بھاری ہوگیا تو فرشتہ منادی کرے گا جس کو تمام اہلِ محشر سُنیں گے کہ فلاں شخص کامیاب ہوگیا اب کبھی اس کو محرومی نہیں ہوگی، اور اگر نیکیوں کا پلّہ ہلکا رہا تو یہ فرشتہ منادی کرے گا کہ فلاں شخص شقی اور محروم ہوگیا اب کبھی کامیاب بامراد نہیں ہوگا۔ اور حافظ مذکور نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ فرشتہ جو میزان پر مقرر ہوگا حضرت جبریل امین ہیں۔ (قرطبی) [2]

حاکم اور بیہقی اور آجری نے حضرتِ صدیقہ عائشہؓ سے روایت کیا ہے اُنہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا قیامت کے روز بھی آپ اپنے اہل واولاد کو یاد رکھیں گے تو فرمایا کہ قیامت میں تین مقام تو ایسے ہوں گے کہ اُن میں کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ ایک وہ وقت جب میزان عدل کے سامنے وزن اعمال کے لئے حاضر ہوں گے جب تک یہ نتیجہ معلوم نہ ہوجائے کہ اس کا پلّہ نیکیوں کا بھاری ہوا یا ہلکا رہا کسی کو کسی کی یاد نہ آئے گی اور دوسرا مقام وہ ہے جب نامہائے اعمال اُڑائے جائیں گے جب تک یہ متعین نہ ہوجائے کہ نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آیا (جو نجات کی علامت) یا بائیں ہاتھ یا پشت کی طرف آیا (جو عذاب کی علامت ہے) اور تیسرا مقام پُل صراط سے گزرنے کا وقت ہے جب تک پار نہ ہوجائیں کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ (مظہری) [3]

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ یعنی یومِ حساب اور میزان اعمال کے وقت انسان کے سارے چھوٹے بڑے اچھے بُرے اعمال حاضر کئے جائیں گے تاکہ حساب اور وزن میں شامل ہوں۔

وزنِ اعمال کی صورت

یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمال نامے تولے جائیں جیسا کہ حدیث بطاقہ سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عین اعمال کو وہاں جواہر مستقلہ کی شکل دیدی جائے اور اُن کا وزن کیا جائے عام طور سے روایات اسی پر شاہد ہیں اور جمہور علماء نے اسی صورت کو اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید میں وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ [4] (الکہف:۴۹) وغیرہ آیات اور بہت سی روایاتِ حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:٢٠٠، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث: ٨٨٩١

[2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:١١ ص:٢٩٣ [3] المستدرك للحاكمؒ رقم الحديث: ٨٨٤٣

[4] ترجمہ: اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب موجود پائیں گے۔

اعمال کا محاسبہ

ترمذی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر بیٹھا اور بیان کیا یا رسول اللہ میرے دو غلام ہیں جو مجھے جھوٹا کہتے ہیں اور معاملات میں خیانت کرتے ہیں اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اُس کے مقابلے میں مَیں اُن کو زبان سے بھی بُرا بھلا کہتا ہوں اور ہاتھ سے مارتا بھی ہوں، تو میرا اور ان غلاموں کا انصاف کس طرح ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُن کی نافرمانی اور خیانت اور سرکشی کو تولا جائے گا، پھر تمہارے سبّ وشتم اور مار پیٹ کو تولا جائے گا۔ اگر تمہاری سزا اور ان کا جُرم برابر ہوئے تو معاملہ برابر ہو جائے گا۔ اور اگر تمہاری سزا اُن کے جُرم سے کم رہی تو وہ تمہارا احسان شمار ہوگا اور اگر اُن کے جرم سے بڑھ گئی تو جتنی تم نے زیادتی کی ہے اُس کا تم سے انتقام اور قصاص لیا جائے گا۔ یہ شخص یہاں سے اُٹھ کر الگ بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، اس نے عرض کیا کہ اب تو میرے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ میں ان کو آزاد کر کے اس حساب کے غم سے بے فکر ہو جاؤں۔ (قرطبی)[1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم نے دی تھی موسیٰ اور ہارون کو فیصلے چکانے والی کتاب اور روشنی اور نصیحت ڈرنے والوں کو

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

جو ڈرتے ہیں اپنے ربّ سے بن دیکھے اور وہ قیامت کا خطرہ رکھتے ہیں

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۚ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

اور یہ ایک نصیحت ہے برکت کی جو ہم نے اُتاری سو کیا تم اس کو نہیں مانتے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل کا ایک معیار، (ہدایت کی) ایک روشنی اور اُن متقی لوگوں کے لئے نصیحت کا

[1] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۲۵۷، وجامع الترمذي، ابواب التفسير، باب ومن تفسير سورة الأنبياء ج:۲ ص:۱۴۹

سامان عطا کیا تھا۴۸ جو دیکھے بغیر اپنے پروردگار سے ڈریں، اور جن کو قیامت کی گھڑی کا خوف لگا ہوا ہو۔ ۴۹ اور اب یہ (قرآن) برکتوں والا پیغام نصیحت ہے جو ہم نے نازل کیا ہے۔ کیا پھر بھی تم اسے ماننے سے انکار کرتے ہو؟ ۵۰

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (آپ کے قبل) موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو ایک فیصلہ کی اور روشنی کی اور متقیوں کے لئے نصیحت کی چیز (یعنی توریت) عطا فرمائی تھی جو (متقی) اپنے ربّ سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور (خدا ہی سے ڈرنے کے سبب) وہ لوگ قیامت سے (بھی) ڈرتے ہیں (کیونکہ قیامت میں اس کا خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور سزا نہ ہونے لگے) اور (جیسے اُن کو وہ کتاب ہم نے دی تھی اسی طرح) یہ (قرآن بھی) ایک کثیر الفائدہ نصیحت (کی کتاب) ہے جس کو ہم نے نازل کیا، سو کیا (بعد اس کے کہ تنزیلِ کتب کا عادۃ اللہ ہونا معلوم ہوگیا اور خود اس کا منزل من اللہ ہونا دلیل سے ثابت ہے) پھر بھی تم اس کے (منزل من اللہ ہونے کے) منکر ہو۔

معارف و مسائل

اَلْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۴۸ یہ تینوں صفتیں تورات کی ہیں کہ فرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والی ہے اور قلوب کے لئے ضیاء و نور ہے اور لوگوں کے لئے ذکر و تذکیر اور ذریعۂ ہدایت ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ فرقان سے مراد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے جو ہر موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہی کہ فرعون کے گھر میں پرورش ہوئی اور پھر اُس سے مقابلے کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ذلیل کیا پھر لشکر فرعون کے تعاقب کے وقت دریا میں راستے پیدا ہو کر اس سے نجات ملی اور لشکر فرعون غرق کیا گیا اسی طرح بعد کے ہر موقع پر اس مدد خداوندی کا مشاہدہ ہوتا رہا۔ اور ضیاء و ذکر دونوں تورات کی صفتیں ہیں قرطبی نے اسی کو ترجیح دی ہے کیونکہ الفرقان کے بعد واؤ کے ذریعہ فاصلہ کرنے سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ فرقان تورات کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ واللہ اعلم

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۵۱

اور آگے دی تھی ہم نے ابراہیم کو اس کی نیک راہ اور ہم رکھتے ہیں اس کی خبر

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

جب کہا اُس نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو یہ کیسی مورتیں ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ

بولے ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو انہی کی پوجا کرتے بولا مقرر رہے تم اور تمہارے باپ دادے

فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾

صریح گمراہی میں بولے تو ہمارے پاس لایا ہے سچی بات یا تو کھلاڑیاں کرتا ہے

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ

بولا نہیں رَبّ تمہارا وہی ہے رَبّ آسمان اور زمین کا جس نے اُن کو بنایا

وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ

اور میں اسی بات کا قائل ہوں اور قسم اللہ کی میں علاج کروں گا تمہارے بتوں کا

بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ

جب تم جاچکوگے پیٹھ پھیرکر پھر کر ڈالا اُن کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ایک بڑا اُن کا کہ شاید

اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

اس کی طرف رجوع کریں کہنے لگے کس نے کیا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ وہ تو کوئی بے انصاف ہے

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ

وہ بولے ہم نے سُنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے اس کو کہتے ہیں ابراہیم وہ بولے اس کو لے آؤ

عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا

لوگوں کے سامنے شاید وہ دیکھیں، بولے کیا تو نے کیا ہے یہ

بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ

ہمارے معبودوں کے ساتھ اے ابراہیم بولا نہیں پر یہ کیا ہے ان کے اس بڑے نے سو ان سے پوچھ لو

اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾

اگر وہ بولتے ہیں پھر سوچے اپنے جی میں پھر بولے لوگو تم ہی بے انصاف ہو

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۗءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾

پھر اوندھے ہوگئے سر جھکا کر تُو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾

بولا کیا پھر تم پوجتے ہو اللہ سے ورے ایسے کو جو تمہارا کچھ بھلا کرے نہ بُرا

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ

بیزار ہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے کیا تم کو سمجھ نہیں بولے اس کو جلاؤ

وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا

اور مدد کرو اپنے معبودوں کی اگر کچھ کرتے ہو ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور آرام

عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾

ابراہیم پر اور چاہنے لگے اُس کا بُرا پھر اُنہی کو ڈالا ہم نے نقصان میں

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ

اور بچا نکالا ہم نے اُس کو اور لوط کو اُس زمین کی طرف جس میں برکت رکھی ہم نے جہان کے واسطے اور بخشا ہم نے اس کو

اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً

اسحاق اور یعقوب دیا انعام میں اور سب کو نیک بخت کیا اور ان کو کیا ہم نے پیشوا

يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ

راہ بتلاتے تھے ہمارے حکم سے اور کہلا بھیجا ہم نے اُن کو کرنا نیکیوں کا اور قائم رکھنی نماز

وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

اور دینی زکوٰۃ اور وہ تھے ہماری بندگی میں لگے ہوئے

آسان ترجمۂ قرآن

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو وہ سمجھ بوجھ عطا کی تھی جو اُن کے لائق تھی، اور ہم اُنہیں خوب جانتے تھے۔ ﴿۵۱﴾ وہ وقت یاد کرو جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ''یہ کیا مورتیں ہیں جن کے آگے تم دھرنا دیئے بیٹھے ہو؟'' ﴿۵۲﴾ وہ بولے کہ: ''ہم نے اپنے باپ دادوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔'' ﴿۵۳﴾ ابراہیم نے کہا: ''حقیقت یہ ہے کہ تم بھی اور تمہارے باپ دادے بھی کھلی گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔'' ﴿۵۴﴾ انہوں نے کہا: ''کیا تم ہم سے سچ مچ کی بات کررہے ہو، یا دِل لگی کررہے ہو؟'' ﴿۵۵﴾ ابراہیم نے کہا: ''نہیں، بلکہ تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، جس نے یہ ساری چیزیں پیدا کی ہیں، اور لوگو! میں اس بات پر گواہی دیتا ہوں۔ ﴿۵۶﴾ اور اللہ کی قسم! جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک (ایسا) کام کروں گا (جس سے ان کی حقیقت کھل جائے گی)۔'' ﴿۵۷﴾ چنانچہ ابراہیم نے ان کے بڑے بت کے سوا سارے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا، تاکہ وہ لوگ اُن کی طرف رُجوع کریں۔ ﴿۵۸﴾ وہ کہنے لگے کہ: ''ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ وہ کوئی بڑا ہی ظالم تھا۔'' ﴿۵۹﴾ کچھ لوگوں نے کہا: ''ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان بتوں کے بارے میں باتیں بنایا کرتا ہے، اُسے ابراہیم کہتے

ہیں۔'' ⑥٠ انہوں نے کہا: ''تو پھر اُس کو سب لوگوں کے سامنے لے کر آؤ، تاکہ سب گواہ بن جائیں۔'' ⑥١ (پھر جب ابراہیم کو لایا گیا تو) وہ بولے: ''ابراہیم! کیا ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت تم ہی نے کی ہے؟'' ⑥٢ ابراہیم نے کہا: ''نہیں، بلکہ یہ حرکت اُن کے اس بڑے سردار نے کی ہے، اب انہی بتوں سے پوچھ لو، اگر یہ بولتے ہوں۔'' ⑥٣ اس پر وہ لوگ اپنے دِل میں کچھ سوچنے لگے، اور (اپنے آپ سے) کہنے لگے کہ: ''سچی بات تو یہی ہے کہ تم خود ظالم ہو۔'' ⑥٤ پھر انہوں نے اپنے سر جھکا لئے، اور کہا: ''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔'' ⑥٥ ابراہیم نے کہا: ''بھلا بتاؤ کہ کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کر رہے ہو جو تمہیں نہ کچھ فائدہ پہنچاتی ہیں نہ نقصان؟ ⑥٦ تف ہے تم پر بھی، اور اُن پر بھی جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ بھلا کیا تمہیں اتنی سمجھ نہیں؟'' ⑥٧ وہ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے: ''آگ میں جلا ڈالو اس شخص کو، اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم میں کچھ کرنے کا دَم خم ہے۔'' ⑥٨ (چنانچہ انہوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا، اور) ہم نے کہا: ''اے آگ! ٹھنڈی ہو جا، اور ابرہیم کے لئے سلامتی بن جا۔'' ⑥٩ اُن لوگوں نے ابراہیم کے لئے بُرائی کا منصوبہ بنایا تھا، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اُنہی کو بُری طرح ناکام کر دیا۔ ⑦٠ اور ہم اُنہیں اور لوط کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے دُنیا جہان کے لوگوں کے لئے برکتیں رکھی ہیں۔ ⑦١ اور ہم نے اُن کو اِنعام کے طور پر اِسحاق اور یعقوب عطا کئے۔ اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نیک بنایا۔ ⑦٢ اور ان سب کو ہم نے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور ہم نے وحی کے ذریعے انہیں نیکیاں کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے کی تاکید کی تھی، اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے۔ ⑦٣

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے اس (زمانۂ موسوی) سے پہلے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی (شان کے مناسب) خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم اُن (کے کمالاتِ علمیہ وعملیہ) کو خوب جانتے تھے (یعنی وہ بڑے کامل تھے اُن کا وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ اُنہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی برادری سے (اُن کو بت پرستی میں مشغول دیکھ کر) فرمایا کہ کیا (واہیات) مورتیں ہیں جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو (یعنی یہ ہرگز قابلِ عبادت نہیں) وہ لوگ (جواب میں) کہنے لگے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے، (اور وہ لوگ عاقل تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورتیں لائق عبادت کے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ بیشک تم اور تمہارے باپ دادے (ان کو لائقِ عبادت سمجھنے میں) صریح غلطی میں (مبتلا) ہو۔ (یعنی خود ان ہی کے پاس ان کی معبودیت کی کوئی دلیل اور سند نہیں ہے وہ تو اس لئے ضلال میں ہیں اور تم ایسوں کی تقلید کرتے ہو جو بے دلیل بے ثبوت اوہام کے پیچھے چلنے والے ہیں اس لئے تم ضلال میں ہو چونکہ اُن لوگوں

نے ایسی بات سنی نہ تھی نہایت متعجب ہوکر) وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا تم (اپنے نزدیک) سچّی بات (سمجھ کر) ہمارے سامنے پیش کررہے ہو یا (یوں ہی) دل لگی کررہے ہو، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں (دل لگی نہیں بلکہ سچّی بات ہے اور صرف میرے ہی نزدیک نہیں بلکہ واقع میں بھی سچّی بات یہی ہے کہ یہ عبادت کے قابل نہیں) بلکہ تمہارا رَبّ (حقیقی جو لائقِ عبادت ہے) وہ ہے جو تمام آسمانوں کا اور زمین کا رَبّ ہے جس نے (علاوہ تربیت کے) اُن سب (آسمانوں اور زمین اور اُن میں جو مخلوق ہے جس میں یہ اصنام بھی داخل ہیں سب) کو پیدا کیا اور میں اس (دعویٰ) پر دلیل بھی رکھتا ہوں (تمہاری طرح کورانہ تقلید سے کام نہیں کرتا) اور خدا کی قسم میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا جب تم (ان کے پاس سے) چلے جاؤ گے (تا کہ ان کا عاجز اور درماندہ ہونا زیادہ مشاہدے میں آجائے، اُن لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ اکیلے ہمارے مخالف کارروائی کیا کرسکتے ہیں کچھ التفات نہ کیا ہوگا اور چلے گئے) تو (اُن کے چلے جانے کے بعد) انہوں نے اُن بتوں کو (تَبَر وغیرہ سے توڑ پھوڑ کر) ٹکڑے ٹکڑے کردیا بجز اُن کے ایک بڑے بُت کے (جو جثّہ میں یا اُن لوگوں کی نظر میں معظم ہونے میں بڑا تھا کہ اس کو چھوڑ دیا جس سے ایک قسم کا استہزاء مقصود تھا کہ ایک کے سالم اور دوسروں کے قطع وبُرید سے ایہام ہوتا ہے کہ کہیں اُسی نے تو سب کو نہیں توڑا، پس ابتداءً تو ایہام ہے پھر جب وہ لوگ قطع وبُرید کرنے والے کی تحقیق کریں گے اور اُس بڑے بُت پر احتمال بھی نہ کریں گے تو ان کی طرف سے اُس کے عجز کا بھی اعتراف ہوجائے گا اور حجت اور لازم تر ہوجائے گی۔ پس انتہاءً یہ الزام وافحام ہے یعنی لاجواب کرنا ہے اور مقصود مشترک اثباتِ عجز ہے، بعض کا انکار سے اور ایک کا اُن کے اقرار سے، غرض ایک کو اس مصلحت سے چھوڑ کر سب کو توڑ دیا) کہ شاید وہ لوگ ابراہیم کی طرف (دریافت کرنے کے طور پر) رجوع کریں (اور پھر وہ تقریر جواب سے مکرر پوری طرح احقاقِ حق کرسکیں۔ غرض وہ لوگ جو بت خانہ میں آئے تو بتوں کی بُری گَتْ بنی دیکھی آپس میں) کہنے لگے کہ یہ (بے ادبی کا کام) ہمارے بتوں کے ساتھ کس نے کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس نے بڑا ہی غضب کیا (یہ بات ایسے لوگوں نے پوچھی جن کو اس قول کی اطلاع نہ تھی تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ الخ یا تو اس وجہ سے کہ وہ اس وقت موجود نہ ہوں گے کیونکہ اس مناظرہ کے وقت تمام قوم کا مجتمع ہونا ضرور نہیں اور یا موجود ہوں مگر سُنا نہ ہو اور بعضوں نے سُن لیا ہو، كذا فی الدر المنثور عن ابن مسعود نحوًا منه) بعضوں نے کہا (جن کو اس قول کا علم تھا) کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراہیم کرکے پکارا جاتا ہے اُن بتوں کا (بُرائی کے ساتھ) تذکرہ کرتے سُنا ہے (پھر) وہ (سب) لوگ (یا جنہوں نے اوّل استفسار کیا تھا) بولے کہ (جب یہ بات ہے) تو اچھا اس کو سب آدمیوں کے سامنے حاضر کرو تا کہ (شاید وہ اقرار کرلے اور) وہ لوگ (اس کے اقرار کے) گواہ ہوجائیں (پھر اتمام حجت کے بعد سزا دی جائے جس پر کوئی ملامت نہ کرسکے، غرض سب کے روبرو وہ آئے اور اُن سے) اُن لوگوں نے کہا کہ کیا ہمارے بتوں کے ساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے اے ابراہیم، اُنہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ (تم یہ احتمال

کیوں نہیں فرض کرتے کہ یہ حرکت میں نے) نہیں کی، بلکہ اُن کے اُس بڑے (گرو) نے کی (اور جب اس کبیر میں فاعل ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے تو ان صغار میں ناطق ہونے کا احتمال بھی ہوگا) سو اِن (ہی) سے پوچھ لو (نا) اگر یہ بولتے ہوں (اور اگر بڑے بُت کا فاعل اس عمل کا ہونا اور دوسرے بتوں میں بولنے کی طاقت ہونا باطل ہے تو عجز ان کا تمہارے نزدیک مسلم ہوگیا پھر اعتقاد الوہیت کی کیا وجہ ہے) اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچے پھر (آپس میں) کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی لوگ ناحق پر ہو (اور ابراہیم حق پر ہے کہ جو ایسا عاجز ہو وہ کیا معبود ہوگا) پھر (شرمندگی کے مارے) اپنے سروں کو جھکالیا (ابراہیم علیہ السلام سے نہایت مغلوبانہ لہجہ میں بولے کہ) اے ابراہیم تم کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ بُت (کچھ) بولتے نہیں (ہم اُن سے کیا پوچھیں اور اس سے فاعلیتِ کبیر کی نفی بدرجۂ اولیٰ ہوگئی اس وقت) ابراہیم (علیہ السلام) نے (خوب خبر لی اور) فرمایا کہ (افسوس جب یہ ایسے ہیں) تو کیا خدا کو چھوڑ کر تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکے اور نہ (بالمباشرۃ) کچھ نقصان پہنچا سکے تف ہے تم پر (کہ باوجود وضوحِ حق کے باطل پر مصر ہو) اور اُن پر (بھی) جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے (اس تمام تقریر سے خصوص اس سے کہ توڑنے پھوڑنے سے انکار نہیں فرمایا باوجودیکہ احتمال انتقام مقتضی انکار کو تھا ان کو ثابت ہوگیا کہ یہ کام اُن ہی کا ہے اور تقریر کا کچھ جواب بن نہ آیا تو بمقتضائے اس قول کے کہ ؎

چو حجت نماند جفا جوئے را پر خاش درہم کشد روئے را [۱]

یعنی جب جاہل جواب نہ رکھتا ہو اور قدرت رکھتا ہو تو برسرِ پیکار آجاتا ہے، آپس میں) وہ لوگ کہنے لگے کہ ان (ابراہیم) کو آگ میں جلادو اور اپنے معبودوں کا (اُن سے) بدلا لو اگر تم کو کچھ کرنا ہے (تو یہ کام کرو ورنہ بالکل ہی بات ڈوب جائے گی۔ غرض سب نے متفق ہوکر اس کا سامان کیا اور ان کو آتشِ سوزاں میں ڈال دیا اُس وقت) ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اَے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہوجا، ابراہیم کے حق میں (یعنی نہ ایسی گرم رہ جس سے جلنے کی نوبت آئے اور نہ بہت ٹھنڈی برف ہوجا کہ اس کی ٹھنڈک سے تکلیف پہنچے بلکہ مثل ہوائے معتدل کے بن جا چنانچہ ایسا ہی ہوگیا) اور اُن لوگوں نے اُن کے ساتھ بُرائی کرنا چاہا تھا (کہ ہلاک ہوجائیں گے) سو ہم نے اُن ہی لوگوں کو ناکام کردیا (کہ اُن کا مقصود حاصل نہ ہوا بلکہ اور بالعکس حقانیت ابراہیم علیہ السلام کا زیادہ ثبوت ہوگیا) اور ہم نے ابراہیم کو اور (اُن کے برادرزادہ کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) [۲] لوط علیہ السلام کو (کہ اُنہوں نے برخلاف قوم کے ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی تھی

---

[۱] ترجمہ: جب ظالم شخص کے پاس دلیل نہیں رہتی تو وہ غصّے سے اپنے چہرے کو بگاڑ لیتا ہے۔

[۲] الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۵ ص:۶۴۲، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:۴۰۵۲، وتفسير القرطبی، تفسير سورة الأنعام آيت:۸۴ ج:۷ ص:۳۱

قال تعالیٰ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ [۱] (العنکبوت) اور اس وجہ سے لوگ اُن کے بھی مخالف اور دَر پے تھے) ایسے ملک (یعنی شام) کی طرف بھیج کر (کافروں کے شر و ایذاء سے) بچالیا جس میں ہم نے دُنیا جہان والوں کے واسطے (خیرو) برکت رکھی ہے (دُنیوی بھی کہ ہر قسم کے عمدہ پھل پھول بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اس سے منتفع ہوسکتے ہیں اور دینی بھی کہ بکثرت انبیاء علیہم السلام وہاں ہوئے جن کے شرائع کی برکت دُور دُور عالم میں پھیلی یعنی اُنہوں نے ملک شام کی طرف باذن الٰہی ہجرت فرمائی) اور (ہجرت کے بعد) ہم نے اُن کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب پوتا عطا کیا اور ہم نے ان سب (باپ بیٹے پوتے) کو (اعلیٰ درجہ کا) نیک کیا (اعلیٰ درجہ کی نیکی کا مصداق عصمت ہے جو بشریت میں خواص نبوّت سے ہے پس مراد یہ ہے کہ اُن سب کو نبی بنایا) اور ہم نے اُن (سب) کو مقتدا بنایا (جو کہ لوازمِ نبوّت سے ہے) کہ ہمارے حکم سے (خلق کو) ہدایت کیا کرتے تھے (جو کہ مناصب نبوّت سے ہے) اور ہم نے اُن کے پاس نیک کاموں کے کرنے کا اور (خصوصاً) نماز کی پابندی کا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا (یعنی یہ حکم بھیجا کہ ان کاموں کو کیا کرو) اور وہ (حضرات) ہماری (خوب) عبادت کیا کرتے تھے (یعنی ان کو جو حکم ہوا تھا اس کو اچھی طرح بجالاتے تھے پس صٰلِحِیْنَ میں کمال نبوّت کی طرف اور اَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ میں کمال علم کی طرف اور کَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ میں کمال عمل کی طرف اور اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ میں دوسروں کی ہدایت و تربیت کی طرف اشارہ کافیہ ہے۔

معارف و مسائل

وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ، الفاظ آیت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے اپنی برادری کے سامنے کہی تھی مگر اس پر شبہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿۸۹﴾ (الصافات) (میں بیمار ہوں) کا عذر کر کے اُن کے ساتھ عید کے اجتماع میں جانے سے گریز کیا تھا اور جب بتوں کو توڑنے کا واقعہ پیش آیا تو برادری اس تلاش میں پڑی کہ یہ کس نے کیا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کا یہ کلام پہلے ہی برادری کو معلوم تھا تو یہ سب باتیں کیسے ہوئیں۔ اس کا جواب اوپر خلاصۂ تفسیر میں یہ دیا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اس خیال کے اکیلے آدمی تھے پوری برادری کے مقابلے میں اُن کی کوئی حیثیت نہ سمجھ کر ممکن ہے کہ ان کے کلام کی طرف التفات نہ کیا ہو اور بھول بھی گئے ہوں (بیان القرآن) [۲] اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تلاش و تحقیق کرنے والے دوسرے لوگ ہوں جن کو ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو کا علم نہیں تھا اور مفسرین میں سے مجاہد اور قتادہ کا قول یہ ہے کہ یہ کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برادری کے سامنے نہیں کہا بلکہ اپنے دل میں کہا یا

[۱] ترجمہ: سو صرف لوط (علیہ السلام) نے ان کی تصدیق فرمائی۔

[۲] بیان القرآن تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۵۰، ۵۱

برادری کے جانے کے بعد ایک دو ضعیف آدمی جو رہ گئے تھے اُن سے کہا پھر جب بُت شکنی کا واقعہ پیش آیا اور برادری کو ایسا کرنے والے کی تلاش ہوئی تو ان لوگوں نے مخبری کر دی۔ (قرطبی) [1]

فَجَعَلَهُمۡ جُذٰذًا، جُذَاذٌ، جذ بکسر الجیم کی جمع ہے جس کے معنی ٹکڑے کے ہیں مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے توڑ کر ان سب بتوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

اِلَّا كَبِيۡرًا لَّهُمۡ، یعنی صرف بڑے بُت کو بغیر توڑے ہوئے چھوڑ دیا، اس کا بڑا ہونا یا تو حسّی اعتبار سے ہو کہ اپنے جسم اور جثّے کے اعتبار سے یہ دوسرے بتوں سے بڑا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسم اور جثّے میں سب کے برابر ہونے کے باوجود یہ بُت ان بُت پرستوں کے عقیدہ میں سب سے بڑا مانا جاتا ہو۔

لَعَلَّهُمۡ اِلَيۡهِ يَرۡجِعُوۡنَ ۝۵۸ اس میں اِلَيۡهِ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ایک یہ کہ ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہو جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں ایسا ہی بیان کیا گیا اور اس کے مناسب آیت کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد اس عمل سے خود ہی یہ تھا کہ یہ لوگ میری طرف رجوع کریں مجھ سے پوچھیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو میں اُن کو اُن کی بیوقوفی پر مطلع کروں اور اِلَيۡهِ يَرۡجِعُوۡنَ ۝۵۸ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عمل اس اُمید پر کیا کہ شاید اپنے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر اُن میں عقل آجائے کہ یہ پرستش کے قابل نہیں پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی طرف رجوع ہو جائیں۔اور کلبی نے فرمایا کہ اِلَيۡهِ کی ضمیر کبیر کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہیں کہ جب یہ لوگ واپس آکر سارے بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے اور بڑے بُت کو صحیح سالم اور اس کے مونڈھے پر کلہاڑا رکھا ہوا دیکھیں گے تو شاید اُس بڑے بُت کی طرف رجوع کریں اور اُس سے پوچھیں کہ ایسا کیوں ہوا وہ کوئی جواب نہ دے گا تو اس کا بھی عاجز ہونا اُن پر واضح ہو جائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول جھوٹ نہیں بلکہ ایک کنایہ تھا اس کی تفصیل وتحقیق

قَالَ بَلۡ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيۡرُهُمۡ هٰذَا فَسۡـَٔلُوۡهُمۡ اِنۡ كَانُوۡا يَنۡطِقُوۡنَ ۝۶۳ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی برادری نے گرفتار کر کے بُلایا اور ان سے اقرار لینے کے لئے سوال کیا کہ کیا آپ نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہے تم خود ان سے دریافت کر لو اگر یہ بول سکتے ہوں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کیا تھا پھر اس سے انکار اور اُن کے بڑے کی طرف منسوب کرنا بظاہر خلاف واقعہ ہے جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے حضرت خلیل اللہ کی شان اس سے بالا و برتر ہے۔

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۱ ص:۲۶۰

اس کے جواب کے لئے حضرات مفسرین نے بہت سے احتمالات بیان فرمائے ہیں اُن میں سے ایک وہ بھی ہے جس کو خلاصۂ تفسیر بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور فرض کے تھا یعنی تم یہ کیوں نہیں فرض کر لیتے کہ یہ کام بڑے بُت نے کیا ہوگا [۱] اور بطور فرض کے کوئی خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ میں داخل نہیں جیسے خود قرآن میں ہے: اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ (الزخرف) یعنی اگر اللہ رحمٰن کے کوئی لڑکا ہوتا تو میں سب سے پہلے اُس کی عبادت کرنے والوں میں داخل ہوتا۔ لیکن بے غبار اور بے تاویل وہ توجیہ ہے جس کو بحر محیط، قرطبی، رُوح المعانی وغیرہ میں اختیار کیا ہے کہ یہ اسناد مجازی ہے جو کام ابراہیم علیہ السلام سے اپنے ہاتھ سے کیا تھا اس کو بڑے بُت کی طرف بطور اسناد مجازی کے منسوب کر دیا [۲] کیونکہ اس کام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آمادہ کرنے والا یہی بت تھا اور اس کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہو کہ اُن کی برادری اُس بُت کی تعظیم سب سے زیادہ کرتی تھی اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی چور کی سزا میں اُس کا ہاتھ کاٹ دے اور پھر کہے کہ یہ میں نے نہیں کاٹا بلکہ تیرے عمل اور تیری کجروی نے ہاتھ کاٹا ہے کیونکہ ہاتھ کاٹنے کا سبب اس کا عمل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی طور پر بھی بتوں کے توڑنے کو بڑے بُت کی طرف منسوب کیا تھا جیسا کہ روایات میں ہے کہ جس تبر یا کلہاڑے سے اُن کے بُت توڑے تھے بڑے بُت کے مونڈھے پر یا اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا کہ دیکھنے والے کو یہ خیال پیدا ہو کہ اُس نے ہی یہ کام کیا ہے اور قولاً بھی اس کی طرف منسوب فرمایا تو یہ ایک اسناد مجازی ہے جیسے عربی کا مشہور مقولہ اَنْبَتَ الرَّبِيْعُ الْبَقْلَةَ اس کی معروف مثال ہے (یعنی موسم ربیع کی بارش نے کھیتی اُگائی ہے) کہ اگرچہ اُگانے والا درحقیقت حق تعالیٰ ہے مگر اس کے ایک ظاہری سبب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور اس کو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑے بُت کی طرف اس فعل کو عملاً اور قولاً منسوب کر دینا جھوٹ ہرگز نہیں۔ البتہ بہت سی مصالح دینیہ کے لئے یہ توریہ اختیار فرمایا ان میں ایک مصلحت تو یہی تھی کہ دیکھنے والوں کو اس طرف توجہ ہو جائے کہ شاید اس بڑے بُت کو اس پر غصہ آگیا ہو کہ میرے ساتھ عبادت میں ان چھوٹے بتوں کو کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال اُن کے دلوں میں پیدا ہو تو توحید حق کا راستہ کھل جاتا ہے کہ جب ایک بڑا بُت اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تو رَبّ العالمین ان پتھروں کی شرکت اپنے ساتھ کیسے گوارا کرے۔

دوسرے یہ کہ ان کو یہ خیال اس وقت پیدا ہونا قرین عقل ہے کہ جن کو ہم خدا اور مختارِ کل کہتے ہیں اگر یہ ایسے ہی ہوتے تو کوئی اُن کے توڑنے پر کیسے قادر ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اس فعل کو وہ بڑے بُت کی طرف منسوب کر دیں تو جو بُت یہ

---

[۱] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۷ ص:۵۱

[۲] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۸ ص:۱۷۱، وروح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۷ ص:۶۵

کام کر سکے کہ دوسرے بتوں کو توڑ دے اس میں گویائی کی طاقت بھی ہونی چاہئے اس لئے فرمایا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول مذکور کو بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ کہا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو بڑے بُت کی طرف منسوب فرمایا اور یہ اسناد مجازی کے طور پر فرمایا تو اس میں کوئی جھوٹ اور خلاف واقعہ کا شبہ نہیں رہتا صرف ایک قسم کا توریہ ہے۔

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ منسوب کرنے کی حقیقت

ایک سوال اب یہ رہ جاتا ہے کہ صحیح احادیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمْ يَكْذِبْ غَيْرَ ثَلَاثٍ (رواہ البخاری ومسلم) [1] یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بجز تین جگہوں کے پھر ان تینوں کی تفصیل اسی حدیث میں اس طرح بیان فرمائی کہ ان میں سے دو جھوٹ تو خالص اللہ کے لئے بولے گئے ایک یہی جو اس آیت میں بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ فرمایا ہے، دوسرا عید کے روز برادری سے یہ عذر کرنا کہ اِنِّیْ سَقِيْمٌ ﴿٨٩﴾ (الصافات) میں بیمار ہوں اور تیسرا (اپنی زوجہ کی حفاظت کے لئے بولا گیا) وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک بستی پر گزر ہوا جہاں کا رئیس ظالم بدکار تھا جب کسی شخص کے ساتھ اس کی بیوی کو دیکھتا تو بیوی کو پکڑ لیتا اور اُس سے بدکاری کرتا۔ مگر یہ معاملہ اُس صورت میں نہ کرتا تھا جبکہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ یا بہن اپنے بھائی کے ساتھ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بستی میں مع اہلیہ کے پہنچنے کی مخبری اس ظالم بدکار کے سامنے کر دی گئی تو اُس نے حضرت سارہ کو گرفتار کر کے بلوالیا۔ پکڑنے والوں نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ عورت رشتہ میں تم سے کیا تعلق رکھتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے ظالم کے خوف سے بچنے کے لئے یہ فرمادیا کہ یہ میری بہن ہے (یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں تیسرے جھوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے) مگر اس کے باوجود وہ پکڑ کر لے گئے اور ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کو بھی بتلا دیا کہ میں نے تم کو اپنی بہن کہا ہے تم بھی اس کے خلاف نہ کہنا اور وجہ یہ ہے کہ اسلامی رشتہ سے تم میری بہن ہو کیونکہ اس وقت اس زمین میں ہم دو ہی مسلمان ہیں اور اسلامی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو مقابلے پر قدرت نہ تھی۔ اللہ کے سامنے الحاح وزاری کے لئے نماز پڑھنا شروع کر دیا حضرت سارہ اس کے پاس پہنچیں یہ ظالم بُری نیت سے ان کی طرف بڑھا تو قدرت نے اس کو اپاہج ومعذور کر دیا اس پر اس نے حضرت سارہ سے درخواست کی کہ تم دُعا کر دو کہ میری یہ معذوری دُور ہو جائے میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا۔ ان کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو صحیح سالم کر دیا مگر اُس نے عہد شکنی کی اور پھر بُری نیت سے اُن پر ہاتھ ڈالنا چاہا پھر اللہ نے اُس کے ساتھ وہی معاملہ کیا اسی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل إبراهيم خليل الله عليه السلام ج:۲ ص:۲۶۶

طرح تین مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حضرت سارہ کو واپس کر دیا (یہ خلاصہ مضمون حدیث کا ہے) بہر حال اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ کی نسبت صراحۃً کی گئی ہے جو شانِ نبوّت وعصمت کے خلاف ہے مگر اس کا جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے وہ یہ کہ دراصل ان میں سے ایک بھی حقیقی معنی جھوٹ نہ تھا یہ توریہ تھا جو ظلم سے بچنے کے لئے جائز و حلال ہوتا ہے وہ جھوٹ کے حکم میں نہیں ہوتا اس کی دلیل خود حدیث مذکور میں یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں اپنی بہن بتلایا ہے تم سے پوچھا جائے تو تم بھی مجھے بھائی بتلانا اور بہن کہنے کی وجہ بھی اُن کو بتلا دی کہ ہم دونوں اسلامی برادری کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں اسی کا نام توریہ ہے کہ الفاظ ایسے بولے جائیں جن کے دو مفہوم ہوسکیں، سننے والا اُس سے ایک مفہوم سمجھے اور بولنے والے کی نیت دوسرے مفہوم کی ہو اور ظلم سے بچنے کے لئے یہ تدبیر توریہ کی باتفاق فقہاء جائز ہے یہ شیعوں کے تقیّہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تقیہ میں صریح جھوٹ بولا جاتا ہے اور اُس پر عمل بھی کیا جاتا ہے توریہ میں صریح جھوٹ نہیں ہوتا بلکہ جس معنے سے متکلم بول رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہوتے ہیں جیسے اسلامی برادری کے لحاظ سے بھائی بہن ہونا۔ یہ وجہ تو خود حدیث مذکور کے الفاظ میں صراحۃً مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت کذب نہ تھا بلکہ ایک توریہ تھا۔ ٹھیک اسی طرح کی توجیہ پہلے دونوں کلاموں میں ہوسکتی ہے، بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ کی توجیہ ابھی اوپر لکھی گئی ہے کہ اس میں بطور اسناد مجازی اس فعل کو بڑے بُت کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح اِنِّیْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ (الصافات) کا لفظ ہے کیونکہ سقیم کا لفظ جس طرح ظاہری طور پر بیمار کے معنے میں آتا ہے اسی طرح رنجیدہ و غمگین اور مضمحل ہونے کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے ابراہیم علیہ السلام نے اسی دوسرے معنے کے لحاظ سے اِنِّیْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ (الصافات) فرمایا تھا مخاطبوں نے اس کو بیماری کے معنے میں سمجھا اور اسی حدیث میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ ان تین کذبات میں دو اللہ کی ذات کے لئے تھے یہ خود قرینہ قویہ اس کا ہے کہ یہ کوئی گناہ کا کام نہ تھا ورنہ گناہ کا کام اللہ کے لئے کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوسکتا اور گناہ کا کام نہ ہونا جبھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً کذب نہ ہو بلکہ ایسا کلام ہو جس کے دو معنی ہوسکتے ہوں، ایک کذب اور دوسرا صحیح ہو۔

حدیث کذبات ابراہیم علیہ السلام کو غلط قرار دینا جہالت ہے

مرزا قادیانی اور کچھ دوسرے مستشرقین سے مغلوب مسلمانوں نے اس حدیث کو باوجود صحیح السند ہونے کے اس لئے غلط اور باطل کہہ دیا کہ اس سے حضرت خلیل اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور سند کے سارے راویوں کو جھوٹا کہہ دینا اس سے بہتر ہے کہ خلیل اللہ کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے اور پھر اس سے ایک کلیہ قاعدہ یہ نکال لیا کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی قوی اور صحیح اور معتبر اسانید سے ثابت ہو غلط قرار دی جائے یہ بات

اپنی جگہ تو بالکل صحیح اور ساری اُمت کے نزدیک بطور فرض محال کے مسلّم ہے مگر علمائے اُمت نے تمام ذخیرہ احادیث میں اپنی عمریں صرف کر کے ایک ایک حدیث کو چھان لیا ہے، جس حدیث کا ثبوت قوی اور صحیح اسانید سے ہوگیا اُن میں ایک بھی ایسی نہیں ہوسکتی جس کو قرآن کے خلاف کہا جاسکے بلکہ وہ اپنی کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو رَد اور باطل کرنا چاہا اس کو قرآن سے ٹکرا دیا اور یہ کہہ کر فارغ ہوگئے کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہونے کے سبب غیر معتبر ہے جیسا کہ اسی حدیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ الفاظ کذبات سے توریہ مراد ہونا خود حدیث کے اندر موجود ہے رہا یہ معاملہ کہ پھر حدیث میں توریہ کو کذبات کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا تو اُس کی وجہ وہی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی بھول اور لغزش کو عصٰی اور غوٰی کے الفاظ سے تعبیر کرنے کی ابھی سورۂ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے کہ مقربانِ بارگاہ حق تعالیٰ کے لئے ادنیٰ کمزوری اور محض رُخصت اور جائز پر عمل کر لینا اور عزیمت کو چھوڑ دینا بھی قابلِ مواخذہ سمجھا جاتا ہے اور ایسی چیزوں پر قرآن میں حق تعالیٰ کا عتاب انبیاء کے بارے میں بکثرت منقول ہے حدیث شفاعت جو مشہور و معروف ہے کہ محشر میں ساری مخلوق جمع ہو کر حساب جلد ہونے کے متعلق انبیاء سے شفاعت کے طالب ہوں گے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء سے پہلے تک تمام انبیاء کے پاس پہنچیں گے ہر پیغمبر اپنے کسی قصور اور کوتاہی کا ذکر کر کے شفاعت کی ہمت نہ کرے گا، آخر میں سب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ اس شفاعتِ کبریٰ کے لئے کھڑے ہوں گے۔ [1] اس حدیث میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ ان کلمات کو جو بطور توریہ کے کہے گئے تھے حقیقۃً کذب نہ تھے مگر پیغمبرانہ عزیمت کے خلاف تھے اپنا قصور اور کوتاہی قرار دے کر عذر کر دیں گے۔ اسی کوتاہی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حدیث میں ان کو بلفظ کذبات تعبیر کر دیا گیا جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تھا اور آپ کی حدیث روایت کرنے اور بیان کرنے کی حد تک ہمیں بھی حق ہے مگر اپنی طرف سے کوئی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یوں کہے کہ اُنہوں نے جھوٹ بولا یہ جائز نہیں جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصّہ کے ساتھ سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں قرطبی اور بحر محیط کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن یا حدیث میں جو اس طرح کے الفاظ کسی پیغمبر کے بارے میں آئے ہیں اُن کا ذکر بطور تلاوتِ قرآن یا تعلیمِ قرآن یا روایتِ حدیث کے تو کیا جاسکتا ہے خود اپنی طرف سے اُن الفاظ کا کسی پیغمبر کی طرف منسوب کرنا بے ادبی ہے جو کسی کے لئے جائز نہیں۔

حدیثِ مذکور میں ایک اہم ہدایت اور اخلاصِ عمل کی باریکی کا بیان

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جن کذباتِ ثلاثہ کا ذکر آیا ہے حدیث میں ان میں سے

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب إثبات الشفاعة إلخ ج: ۱ ص: ۱۰۸، ۱۰۹

پہلے دو کے بارے میں تو یہ آیا کہ اللہ کے لئے تھے، مگر تیسری بات جو حضرت سارہ کے بارے میں کہی گئی اُس کو اللہ کے لئے نہیں فرمایا حالانکہ بیوی کی آبرو کی حفاظت بھی عین دین ہے اس پر تفسیر قرطبی میں قاضی ابوبکر بن عربی سے ایک بڑا نکتہ نقل کیا ہے جس کے متعلق ابن عربی نے فرمایا کہ یہ صلحاء واولیاء کی کمر توڑ دینے والی بات ہے وہ یہ کہ تیسری بات بھی اگرچہ کام دین ہی کا تھا مگر اس میں کچھ اپنا حظِ نفس بیوی کی عصمت اور حرم کی حفاظت کا بھی تھا، اتنی سی غرض دُنیوی شامل ہوجانے کی بنا پر اس کو فِی اللہ اور لِلّٰہ کی فہرست سے الگ کردیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ[1] (الزمر:۳) یہ معاملہ بیوی کی عصمت کی حفاظت کا اگر ہماری یا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو بلاشبہ اس کو بھی للہ فی اللہ ہی میں شمار کیا جاتا مگر انبیاء علیہم السلام کی عظمتِ شان کا مقام سب سے بلند ہے اُن کے لئے اتنا ساحظِ نفس شامل ہونا بھی اخلاص کامل کے منافی سمجھا گیا۔[2] وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَفَّقَنَا اللّٰهُ لِلْاِخْلَاصِ فِیْ كُلِّ عَمَلٍ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نارِ نمرود کے گلزار بن جانے کی حقیقت

جو لوگ معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں اُنہوں نے تو اس میں عجیب وغریب تحریفات کی ہیں۔ بات یہ ہے کہ فلسفہ کا یہ ضابطہ کہ جو چیز کسی چیز کے لئے لازم ذات ہو وہ اُس سے کسی وقت جدا نہیں ہوسکتی خود ایک باطل اور بے دلیل ضابطہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس دُنیا میں اور تمام مخلوقات میں کوئی چیز کسی کے لازم ذات نہیں بلکہ صرف عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ آگ کے لئے حرارت اور جلانا لازم ہے، پانی کے لئے ٹھنڈا کرنا اور بُجھانا لازم ہے۔ مگر یہ لازم صرف عادی ہے عقلی نہیں کیونکہ فلاسفہ بھی اس کے عقلی ہونے کی کوئی معقول دلیل نہیں پیش کرسکے اور جب یہ لازم عادی ہوا تو جب اللہ تعالیٰ کسی خاص حکمت سے کسی عادت کو بدلنا چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں اُس کے بدلنے میں کوئی عقلی محال لازم نہیں آتا جب اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ بُجھانے اور ٹھنڈا کرنے کا کام کرنے لگتی ہے اور پانی جلانے کا حالانکہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی ہوتی ہے اور پانی بھی پانی ہی ہوتا ہے مگر کسی خاص فرد یا جماعت کے حق میں بحکمِ خداوندی وہ اپنی خاصیت چھوڑ دیتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی نبوّت کے ثبوت میں جو معجزات حق تعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں اُن سب کا حاصل یہی ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حکم دیدیا کہ ٹھنڈی ہوجاوہ ٹھنڈی ہوگئی اور اگر بَرْدًا کے ساتھ وَسَلٰمًا کا لفظ نہ ہوتا تو آگ برف کی طرح ٹھنڈی ہوکر سببِ ایذا بن جاتی۔ اور قومِ نوحؑ جو پانی میں ڈوبی تھی اُن کے بارے میں قرآن نے فرمایا اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا (نوح:۲۵) یعنی یہ لوگ پانی میں غرق ہوکر آگ میں داخل ہوگئے۔ حَرِّقُوْهُ یعنی پوری برادری اور نمرود نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ان کو آگ میں جلادیا جائے۔ تاریخی روایات میں ہے کہ ایک مہینہ تک سارے شہر کے لوگ اس کام کے لئے

---

[1] ترجمہ: یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۳۰۱، واحکام القرآن لابن العربیؒ ج:۵ ص:۳۶۹ فی تفسیر الآیۃ المذکورۃ۔

لکڑی وغیرہ سوختہ کا سامان جمع کرتے رہے پھر اس میں آگ لگا کر سات دن تک اس کو دھونکتے اور بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ اُس کے شعلے فضائی آسمان میں اتنے اونچے ہو گئے کہ اگر کوئی پرندہ اُس پر گزرے تو جل جائے۔ اس وقت ارادہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالا جائے تو فکر ہوئی کہ ڈالیں کیسے اُس کے پاس تک جانا کسی کے بس میں نہیں تھا شیطان نے ان کو منجنیق (گوپیا) میں رکھ کر پھینکنے کی ترکیب بتلائی۔ جس وقت اللہ کے خلیل منجنیق کے ذریعہ اس آگ کے سمندر میں پھینکے جا رہے تھے تو سب فرشتے بلکہ زمین و آسمان اور اُن کی مخلوقات سب چیخ اُٹھے کہ یا ربّ آپ کے خلیل پر کیا گزر رہی ہے، حق تعالیٰ نے ان سب کو ابراہیم علیہ السلام کی مدد کرنے کی اجازت دے دی۔ فرشتوں نے مدد کرنے کے لئے حضرت ابراہیم سے دریافت کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے وہ میرا حال دیکھ رہا ہے۔ جبرئیل امین نے عرض کیا کہ آپ کو میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت انجام دُوں، جواب دیا کہ حاجت تو ہے مگر آپ کی طرف نہیں بلکہ اپنے ربّ کی طرف۔ (مظہری) [۱]

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اُوپر گزر چکا ہے کہ آگ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بردوسلام ہونے کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ آگ آگ ہی نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں تبدیل ہوگئی ہو مگر ظاہر یہ ہے کہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی رہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آس پاس کے علاوہ دوسری چیزوں کو جلاتی رہی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن رسیوں میں باندھ کر آگ میں ڈالا گیا تھا اُن رسیوں کو بھی آگ ہی نے جلا کر ختم کیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بدن مبارک تک کوئی آنچ نہیں آئی۔ (کما فی بعض الروایات)

تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آگ میں سات روز رہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عمر میں کبھی ایسی راحت نہیں ملی جتنی ان سات دنوں میں حاصل تھی۔ (مظہری) [۲]

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ یعنی حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھ لوط علیہما السلام کو ہم نے اس زمین سے جس پر نمرود کا غلبہ تھا (یعنی عراق کی زمین) نجات دے کر ایک ایسی زمین میں پہنچا دیا جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لئے برکت رکھی ہے مراد اس سے مُلک شام کی زمین ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی حیثیت سے بڑی برکتوں کا مجموعہ ہے باطنی برکت تو یہ ہے کہ یہ زمین مخزنِ انبیاء ہے بیشتر انبیاء علیہم السلام اسی زمین میں پیدا ہوئے اور ظاہری برکات آب وہوا کا اعتدال، نہروں اور چشموں کی فراوانی پھل پھول اور ہر طرح کی نباتات کا غیر معمولی نشوونما وغیرہ ہے جس کے فوائد صرف اس زمین کے رہنے والوں کو نہیں بلکہ عام دُنیا کے لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

---

[۱] [۲] تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۶ ص:۲۰۷، ۲۰۸

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ یعنی ہم نے عطا کر دیا اس کو بیٹا اسحاق (اُن کی دُعا و درخواست کے مطابق) اور اُس پر زیادہ دیدیا پوتا یعقوب علیہ السلام یعنی دُعا تو صرف بیٹے کے لئے تھی اللہ نے اپنے فضل سے بیٹا بھی دیا پھر اس سے پوتا بھی اپنی طرف سے زائد عطا فرما دیا اسی لئے اس کو نافلہ کہا گیا ہے۔

وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ

اور لُوط کو دیا ہم نے حکم اور سمجھ اور بچا نکالا اس کو اس بستی سے جو

كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ

کرتے تھے گندے کام وہ تھے لوگ بڑے نافرمان اور اس کو لے لیا ہم نے

فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ ع

اپنی رحمت میں، وہ ہے نیک بختوں میں

آسان ترجمۂ قرآن

اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا، اور انہیں اُس بستی سے نجات دی جو گندے کام کرتی تھی۔ حقیقت میں وہ بہت بُرائی والی نافرمان قوم تھی۔ ﴿۷۴﴾ اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کرلیا، وہ یقیناً نیک لوگوں میں سے تھے۔ ﴿۷۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور لوط (علیہ السلام) کو ہم نے حکمت اور علم (مناسب شان انبیاء) عطا فرمایا اور ہم نے ان کو اس بستی سے نجات دی جس کے رہنے والے گندے گندے کام کیا کرتے تھے (جن میں سب سے بدتر لواطت تھی اور بھی بہت سے بیہودہ اور بُرے افعال کے یہ لوگ عادی تھے۔ شراب خوری، گانا بجانا، داڑھی کٹانا، مونچھیں بڑھانا، کبوتر بازی، ڈھیلے پھینکنا، سیٹی بجانا، ریشمی لباس پہننا، اخرجه اسحاق بن بشر والخطيب وابن عساكر عن الحسن مرفوعاً كذا في الروح) [1]

[1] تفسير روح المعاني تحت هذه الآية ج:۱۷ ص:۷۱، وتاريخ دمشق، باب حرف اللام ج:۵۰ ص:۳۲۲

بلاشبہ وہ لوگ بڑے بدذات، بدکار تھے اور ہم نے لوط کو اپنی رحمت میں (یعنی جن بندوں پر رحمت ہوتی ہے ان میں) داخل کیا (کیونکہ) بلاشبہ وہ بڑے (درجہ کے) نیکوں میں سے تھے (بڑے درجہ کے نیک سے مراد معصوم ہے جو نبی کی خصوصیت ہے)۔

معارف ومسائل

حضرت لوط علیہ السلام کو جس بستی سے نجات دینے کا ذکر ان آیات میں آیا ہے اُس بستی کا نام سَدُوم تھا اس کے تابع سات بستیاں اور تھیں جن کو جبرئیلؑ نے اُلٹ کر تہ وبالا کر ڈالا تھا صرف ایک بستی باقی چھوڑ دی تھی جس میں لوط علیہ السلام مع اپنے متعلقین مؤمنین کے رہ سکیں۔ (قالہ ابن عباسؓ۔ قرطبی) [1]

تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ۔ خبائث خبیثہ کی جمع ہے۔ بہت سی خبیث اور گندی عادتوں کو خبائث کہا جاتا ہے۔ یہاں ان کی سب سے بڑی خبیث اور گندی عادت جس سے جنگلی جانور بھی پرہیز کرتے ہیں لواطت تھی، یعنی مرد کا مرد کے ساتھ شہوت پوری کرنا۔ یہاں اسی ایک عادت کو اس کے بڑے جرم ہونے کے سبب خبائث کہہ دیا گیا ہو تو یہ بھی بعید نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے اور اس کے علاوہ دوسری خبیث عادتیں اُن میں ہونا بھی روایات میں مذکور ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں بحوالہ رُوح المعانی گزر چکا ہے اس لحاظ سے مجموعہ کو خبائث کہنا تو ظاہر ہی ہے۔ واللہ اعلم

وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ

اور نوح کو جب اس نے پکارا اس سے پہلے پھر قبول کر لی ہم نے اس کی دُعا سو بچا دیا اس کو اور اس کے گھر والوں کو

مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ

بڑی گھبراہٹ سے اور مدد کی اُس کی ان لوگوں پر جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتیں

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾

وہ تھے بُرے لوگ پھر ڈُبا دیا ہم نے ان سب کو

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۳۰۶

آسان ترجمۂ قرآن

اور نوح کو بھی (ہم نے حکمت اور علم عطا کیا)، وہ وقت یاد کرو جب اس واقعے سے پہلے اُنہوں نے ہمیں پکارا، تو ہم نے ان کی دُعا قبول کی، اور ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بڑی بھاری مصیبت سے بچالیا۔ ﴿۷۶﴾ اور جس قوم نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا، اُس کے مقابلے میں اُن کی مدد کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت برے لوگ تھے، اس لئے ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔ ﴿۷۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ اُس (زمانۂ ابراہیمی) سے پہلے اُنہوں نے (اللہ تعالیٰ سے) دُعا کی (کہ ان کافروں سے میرا بدلہ لے لیجئے) سو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور اُن کو اور اُن کے متبعین کو بڑے بھاری غم سے نجات دی (یہ غم کفار کی تکذیب اور اُس کے ساتھ طرح طرح کی ایذائیں پہنچانے سے پیش آتا تھا) اور (نجات اس طرح دی کہ) ہم نے ایسے لوگوں سے ان کا بدلہ لیا جنہوں نے ہمارے حکموں کو (جو کہ حضرت نوح علیہ السلام لائے تھے) جھوٹا بتلایا تھا بلاشبہ وہ لوگ بہت بُرے تھے اس لئے ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔

معارف و مسائل

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ، مِنْ قَبْلُ سے مراد ابراہیم ولوط علیہما السلام سے پہلے ہونا ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں آیا ہے اور نوح علیہ السلام کی جس نداء کا ذکر اس جگہ مجملاً آیا ہے اس کا بیان سورۂ نوح میں یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے قوم کے لئے بددُعا کی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ (نوح) یعنی اے پروردگار روئے زمین پر کافروں میں کسی بسنے والے کو نہ چھوڑ اور ایک جگہ یہ ہے کہ جب نوح علیہ السلام کی قوم نے کسی طرح اُن کا کہنا نہ مانا تو اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا، اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾ (القمر) یعنی میں مغلوب اور عاجز ہو چکا ہوں آپ ہی ان لوگوں سے انتقام لے لیجئے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ کربِ عظیم سے مراد یا تو طوفان میں غرق ہونا ہے جس میں پوری قوم مبتلا ہوئی، یا اس قوم کی ایذائیں مراد ہیں جو وہ طوفان سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے خاندان کو پہنچاتے تھے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ

اور داؤد اور سلیمان کو جب لگے فیصل کرنے کھیتی کا جھگڑا جب روند گئیں اس کو رات میں ایک قوم کی بکریاں

وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫

اور سامنے تھا ہمارے ان کا فیصلہ پھر سمجھا دیا ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو اور دونوں کو دیا تھا ہم نے حکم اور سمجھ

وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ

اور تابع کئے ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑ، تسبیح پڑھا کرتے اور اُڑتے جانور اور یہ سب کچھ ہم نے کیا اور اس کو سکھلایا ہم نے

صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

بنانا ایک تمہارا لباس کہ بچاؤ ہو تم کو تمہاری لڑائی میں سو کچھ تم شکر کرتے ہو

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ

اور سلیمان کے تابع کی ہوا زور سے چلنے والی کہ چلتی اس کے حکم سے اس زمین کی طرف جہاں برکت دی ہم نے

وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ

اور ہم کو سب چیز کی خبر ہے اور تابع کئے کتنے شیطان جو غوطہ لگاتے اس کے واسطے

وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ ۙ

اور بہت سے کام بناتے اس کے سوائے اور ہم نے ان کو تھام رکھا تھا

آسان ترجمۂ قرآن

اور داود اور سلیمان (کو بھی ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا) جب وہ دونوں ایک کھیت کے جھگڑے کا فیصلہ کر رہے

تھے، کیونکہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت اُس کھیت میں جا گھسی تھیں، اور ان لوگوں کے بارے میں جو فیصلہ ہوا اُسے ہم خود دیکھ رہے تھے۔ ⑦⑧ چنانچہ اس فیصلے کی سمجھ ہم نے سلیمان کو دے دی، اور (ویسے) ہم نے دونوں ہی کو حکمت اور علم عطا کیا تھا۔ اور ہم نے داود کے ساتھ پہاڑوں کو تابع دار بنا دیا تھا کہ وہ پرندوں کو ساتھ لے کر تسبیح کریں، اور یہ سارے کام کرنے والے ہم تھے۔ ⑦⑨ اور ہم نے اُنہیں تمہارے فائدے کے لئے ایک جنگی لباس (یعنی زرہ) بنانے کی صنعت سکھائی تا کہ وہ تمہیں لڑائی میں ایک دوسرے کی زد سے بچائے۔ اب بتاؤ کہ کیا تم شکر گذار ہو؟ ⑧⓪ اور ہم نے تیز چلتی ہوئی ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا تھا جو اُن کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہمیں ہر ہر بات کا پورا پورا علم ہے۔ ⑧① اور کچھ ایسے شریر جنّات بھی ہم نے اُن کے تابع کر دیئے تھے جو اُن کی خاطر پانی میں غوطے لگاتے تھے، اور اس کے سوا اور بھی کام کرتے تھے۔ اور ان سب کی دیکھ بھال کرنے والے ہم تھے۔ ⑧②

خلاصۂ تفسیر

اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارہ میں (جس میں غلّہ تھا یا انگور کے درخت تھے کذا فی الدر المنثور) فیصلہ کرنے لگے جبکہ اس (کھیت) میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اُس کو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے سو ہم نے اس فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دیدی۔ اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا (یعنی داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا صورت مقدمہ کی یہ تھی کہ جس قدر کھیت کا نقصان ہوا تھا اس کی لاگت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی۔ داؤد علیہ السلام نے ضمان میں کھیت والے کو وہ بکریاں دلوادیں اور اصل قانون شرعی کا یہی مقتضا تھا جس میں مدعی یا مدعا علیہ کی رضا کی شرط نہیں مگر چونکہ اس میں بکری والوں کا بالکل ہی نقصان ہوتا تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے بطور مصالحت کے جو کہ موقوف تھی جانبین کی رضامندی پر یہ صورت جس میں دونوں کی سہولت اور رعایت تھی تجویز فرمائی کہ چندروز کے لئے بکریاں تو کھیت والے کو دی جائیں کہ ان کے دُودھ وغیرہ سے اپنا گزر کرے اور بکری والوں کو وہ کھیت سپرد کیا جائے کہ اس کی خدمت آبپاشی وغیرہ سے کریں جب کھیت پہلی حالت پر آجائے کھیت اور بکریاں اپنے اپنے مالکوں کو دیدی جائیں۔ کذا فی الدر المنثور [1] عن مرة وابن مسعود ومسروق وابن عباس ومجاهد وقتادة والزهری۔ پس اس سے معلوم ہوگیا کہ دونوں فیصلوں میں کوئی تعارض نہیں کہ ایک کی صحت دوسرے کی عدم صحت کو مقتضی ہو اس لئے وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا بڑھا دیا گیا) اور (یہاں تک تو کرامتِ عامہ کا ذکر تھا جو دونوں

[1] الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۷ ص:۷۶، ومصنف عبدالرزاق رقم الحديث:۱۸۴۳۳ و۱۸۴۳۴

حضرات میں مشترک تھی آگے دونوں حضرات کی خاص خاص کرامتوں کا بیان ہے) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو کہ (ان کی تسبیح کے ساتھ) وہ (بھی) تسبیح کیا کرتے تھے اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (جیسا سورۂ سبا میں ہے يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ [1] (سبا:۱۰) اور (کوئی اس بات پر تعجب نہ کرے کیونکہ ان کاموں کے) کرنے والے ہم تھے (اور ہماری قدرت کا عظیم ہونا ظاہر ہے پھر ان معجزات میں تعجب ہی کیا ہے) اور ہم نے ان کو زرہ (بنانے) کی صنعت تم لوگوں کے (نفع کے) واسطے سکھلائی (یعنی) تاکہ وہ (زرہ) تم کو (لڑائی میں) ایک دوسرے کی زد سے بچائے (اور اس نفع عظیم کا مقتضا یہ ہے کہ تم شکر کرو) سو تم (اس نعمت کا) شکر کرو گے بھی (یا نہیں) اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کا تیز ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے (مراد ملک شام ہے جو اِن کا مسکن تھا کذا فی الدر عن السدی ویدل علیه عمارته بیت المقدس یعنی جب ملک شام سے کہیں چلے جاتے اور پھر آتے تو یہ آنا اور اسی طرح جانا بھی ہوا کے ذریعہ سے ہوتا تھا جیسا درمنثور میں بروایت وتصحیح حاکم حضرت ابن عباسؓ سے اس کی کیفیت مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام مع اعیان ملک کے کرسیوں پر بیٹھ جاتے پھر ہوا کو بُلا کر حکم دیتے وہ سب کو اُٹھا کر تھوڑی دیر میں ایک ایک ماہ کی مسافت قطع کرتی) [2] اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں (ہمارے علم میں سلیمان کو یہ چیزیں دینے میں حکمت تھی اس لئے عطا فرمائی) اور بعضے بعضے شیطان (یعنی جن) ایسے تھے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے لئے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر اُن کے پاس لائیں) اور وہ اور کام بھی اس کے علاوہ (سلیمان کے لئے) کیا کرتے تھے اور (گو وہ جن بڑے سرکش اور شریر تھے مگر) ان کے سنبھالنے والے ہم تھے (اس لئے وہ چوں نہیں کر سکتے تھے) ۔

معارف و مسائل

اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ لفظ نفش کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے یہ ہیں کہ رات کے وقت کوئی جانور کسی کے کھیت پر جا پڑے اور نقصان پہنچائے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ، فَفَهَّمْنٰهَا کی ضمیر بظاہر مقدمہ اور اس کے فیصلہ کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو فیصلہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ تھا اللہ تعالیٰ نے وہ حضرت سلیمان کو سمجھا دیا۔ اس مقدمہ اور فیصلہ کی صورت اوپر خلاصۂ تفسیر میں

[1] ترجمہ: اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو اور پرندوں کو بھی حکم دیا (کہ ان کے ساتھ تسبیح کرو) ۔

[2] الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۷ ص:۸۰، ۸۱، ومصنف ابن ابی شیبة رقم الحدیث: ۳۱۸۵۲

آ چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی از روئے قانونِ شرعی غلط نہیں تھا مگر جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو سمجھایا اُس میں فریقین کی رعایت اور مصلحت تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ پسندیدہ قرار دیا گیا۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباسؓ اور قتادہ اور زہری سے اس واقعہ کی روایت اس طرح کی ہے کہ دو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں ایک شخص بکریوں والا دوسرا کھیتی والا تھا کھیتی والے نے بکریوں والے پر یہ دعویٰ کیا کہ اس کی بکریاں رات کو چھوٹ کر میرے کھیت میں گھس گئیں اور کھیت کو بالکل صاف کر دیا کچھ نہیں چھوڑا (غالباً مدعا علیہ نے اس کا اقرار کر لیا ہوگا اور بکریوں کی پوری قیمت اس کے ضائع شدہ کھیت کی قیمت کے برابر ہوگی اس لئے) حضرت داؤدؑ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ بکریوں والا اپنی ساری بکریاں کھیت والے کو دیدے۔ (کیونکہ جو چیزیں قیمت ہی کے ذریعہ لی اور دی جاتی ہیں جن کو عرف فقہاء میں ذوات القیم کہا جاتا ہے وہ اگر کسی نے ضائع کر دی تو اس کا ضمان قیمت ہی کے حساب سے دیا جاتا ہے بکریوں کی قیمت چونکہ ضائع شدہ کھیتی کی قیمت کے مساوی تھی اس لئے یہ ضابطہ کا فیصلہ فرمایا گیا) یہ دونوں مدعی اور مدعا علیہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت سے واپس ہوئے تو (دروازے پر اُن کے صاحبزادے) حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اُنہوں نے دریافت کیا کہ تمہارے مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوا؟ ان لوگوں نے بیان کر دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر اس مقدمہ کا فیصلہ میں کرتا تو اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا جو فریقین کے لئے مفید اور نافع ہوتا۔ پھر خود والد ماجد حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی بات عرض کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تاکید کے ساتھ دریافت کیا کہ وہ کیا فیصلہ ہے جو دونوں کے لئے اس فیصلہ سے بہتر ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ بکریاں تو سب کھیت والے کو دیدیں کہ وہ اُن کے دودھ اور اُون وغیرہ سے فائدہ اُٹھاتا رہے اور کھیت کی زمین بکریوں والے کے سپرد کر دیں کہ وہ اس میں کاشت کر کے کھیت اُگائے۔ جب یہ کھیت اُس حالت پر آجائے جس پر بکریوں نے کھایا تھا تو کھیت کھیت والے کو دلوادیں اور بکریاں بکری والے کو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس فیصلے کو پسند فرما کر کہا کہ بس اب فیصلہ یہی رہنا چاہئے اور فریقین کو بُلا کر دوسرا فیصلہ نافذ کر دیا۔ (مظہری وقرطبی وغیرہ) [1]

کیا فیصلہ دینے کے بعد کسی قاضی کا فیصلہ توڑا اور بدلا جاسکتا ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب ایک فیصلہ دے چکے تھے تو سلیمان علیہ السلام کو اُس کے توڑنے کا کیا حق تھا؟ اور اگر خود حضرت داؤد ہی نے اُن کا فیصلہ سُن کر اپنے سابق فیصلے کو توڑا اور دوسرا جاری کیا تو کیا قاضی کو اس کا اختیار ہے کہ ایک فیصلہ دیدینے کے بعد اس کو توڑ دے اور فیصلہ بدل دے۔

[1] تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۳۳۲، وتفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۱ ص:۳۰۷، ۳۰۸، والمظهری تحت هذه الآیة ج:۶ ص:۲۱۲

قرطبیؒ نے اس جگہ اس طرح کے مسائل پر بڑی تفصیل سے بحث فرمائی ہے خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ اگر کسی قاضی نے نصوصِ شرعیہ اور جمہور اُمّت کے خلاف کوئی غلط فیصلہ محض اٹکل سے دیدیا ہے تو وہ فیصلہ باتفاقِ اُمّت مردود و باطل ہے دوسرے قاضی کو اس کے خلاف فیصلہ دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب اور اس قاضی کا معزول کرنا واجب ہے لیکن اگر ایک قاضی کا فیصلہ شرعی اجتہاد پر مبنی اور اصولِ اجتہاد کے ماتحت تھا تو کسی دوسرے قاضی کو اس فیصلہ کا توڑنا جائز نہیں کیونکہ اگر ایسا کیا جائے گا تو فساد عظیم ہوگا اور اسلامی قانون ایک کھیل بن جائے گا اور روز حلال وحرام بدلا کریں گے، البتہ اگر خود اسی فیصلہ دینے والے قاضی کو بعد اس کے کہ اصول اجتہاد کے تحت وہ ایک فیصلہ نافذ کر چکا ہے اب از روئے اجتہاد یہ نظر آئے کہ پہلے فیصلے اور پہلے اجتہاد میں غلطی ہوگئی ہے تو اس کا بدلنا جائز بلکہ بہتر ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے جو ایک مفصل خط حضرت ابوموسیٰ اشعری کے نام قضاء اور فصل مقدمات کے اصول پر مشتمل لکھا تھا اُس میں اس کی تصریح ہے کہ فیصلہ دینے کے بعد اجتہاد بدل جائے تو پہلے فیصلہ کو بدل دینا چاہئے۔ یہ خط دار قطنی نے سند کے ساتھ نقل کیا ہے (قرطبی ملخصاً)۔[1] اور شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط باب القضاء میں بھی یہ خط مفصّل دیا ہے۔

اور امام تفسیر مجاہد کا قول یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کے فیصلے اپنی اپنی جگہ ہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے جو فیصلہ فرمایا تھا وہ ضابطہ کا فیصلہ تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو فرمایا وہ درحقیقت مقدمہ کا فیصلہ نہیں، بلکہ فریقین میں صلح کرانے کا ایک طریقہ تھا اور قرآن میں وَالصُّلْحُ خَيْرٌ[2] (النساء:۱۲۸) کا ارشاد وارد ہے اس لئے یہ دوسری صورت اللہ کے نزدیک پسندیدہ ٹھہری۔ (مظہری)[3]

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے قاضیوں کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ جب آپ کے پاس دو فریق کا مقدمہ آئے تو پہلے ان دونوں میں رضامندی کے ساتھ کسی بات پر صلح کرانے کی کوشش کریں اگر یہ ناممکن ہو جائے تو اپنا شرعی فیصلہ جاری کریں اور حکمت اس کی یہ ارشاد فرمائی کہ حاکمانہ عدالتی فیصلے سے وہ شخص جس کے خلاف ہوا ہو دب تو جاتا ہے مگر ان دونوں میں بغض وعداوت کا بیج قائم ہو جاتا ہے جو دو مسلمانوں میں نہیں ہونا چاہئے بخلاف مصالحت کی صورت کے کہ اس سے دلوں کی منافرت بھی دُور ہو جاتی ہے۔ (از معین الحکام)[4]

مجاہد کے اس قول پر یہ معاملہ قاضی کے فیصلہ کو توڑنے اور بدلنے کا نہیں رہا بلکہ فریقین کو جو حکم سُنایا تھا وہ ابھی گئے بھی نہ تھے کہ ان میں ایک صورت مصالحت کی نکل آئی اور وہ دونوں اس پر راضی ہوگئے۔

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۳۱۲، وسنن الدارقطنی رقم الحدیث:۴۵۲۴، فی تذکرۃ عمر رضی اللہ تعالی عنہ، باب فی الأقضیۃ والأحکام۔

[2] ترجمہ: اور یہ صلح بہتر ہے۔

[3] تفسیر المظھری ج:۶ ص:۲۱۴، ۲۱۵

[4] معین الحکام، الباب السادس والعشرون القضاء بالصلح بین الخصمین ج:۲ ص:۸۰

دو مجتہد اگر اپنے اپنے اجتہاد سے دو متضاد فیصلے کریں تو کیا اُن میں سے ہر ایک صواب اور درست ہے یا کسی ایک کو غلط کہا جائے

اس موقع پر قرطبی نے بڑی تفصیل سے اور دوسرے مفسرین نے مفصّل یا مختصر یہ بحث بھی کی ہے کہ ہر مجتہد ہمیشہ مصیب ہی ہوتا ہے اور دو متضاد اجتہاد ہوں تو دونوں کو حق سمجھا جائے گا یا اُن میں سے ایک فیصلہ کو خطاء اور غلط قرار دیا جائے گا۔ اس میں قدیم زمانے سے علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ آیت مذکورہ سے دونوں جماعتوں نے استدلال کیا ہے جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ دونوں اجتہاد حق ہیں اگرچہ متضاد ہوں اُن کا استدلال آیت کے آخری جملے سے ہے جس میں فرمایا وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا اس میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں کو حکمت اور علم عطا کرنے کا ارشاد ہے حضرت داؤد علیہ السلام پر کوئی عتاب نہیں ہے نہ ان کو یہ کہا گیا کہ اُن سے غلطی ہوگئی اس سے معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی حق تھا اور سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ بھی، البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو فریقین کے لئے اصلح ہونے کی بنا پر ترجیح دیدی گئی۔ اور جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اختلافِ اجتہاد کے مواقع میں حق ایک طرف ہوتا ہے دوسرا غلط ہوتا ہے ان کا استدلال اسی آیت کے پہلے جملہ سے ہے یعنی فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ کہ اس میں تخصیص کر کے حضرت سلیمان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو حق فیصلہ سمجھا دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ حق نہ تھا گو وہ بوجہ اپنے اجتہاد کے اس میں معذور ہوں اور اُن سے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو۔ یہ بحث اصولِ فقہ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے آئی ہے وہاں دیکھی جاسکتی ہے یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے اجتہاد کیا اور کوئی حکم دینی اصول اجتہاد کے ماتحت بیان کیا۔ اگر اس کا اجتہاد صحیح ہوا تو اُس کو دو اجر ملیں گے ایک اجتہاد کرنے کی محنت کا دوسرا صحیح وصواب حکم تک پہنچنے کا اور اگر یہ اجتہاد صحیح نہ ہوا اُس سے خطا ہوگئی تو پھر اس کو ایک اجر اجتہاد کی محنت کا ملے گا دوسرا اجر جو اصل حکم صحیح تک پہنچنے کا تھا وہ نہ ملے گا (یہ حدیث اکثر مستند کتبِ حدیث میں منقول ہے) [1] اس حدیث سے اس اختلافِ علماء کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت یہ اختلاف ایک نزاعِ لفظی جیسا ہے کیونکہ حق دونوں طرف ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد میں خطا کرنے والے مجتہد اور اس کے متبعین کے لئے بھی اجتہاد حق وصحیح ہے اس پر عمل کرنے سے اُن کی نجات ہو جائے گی خواہ یہ اجتہاد اپنی ذات میں خطاء ہی ہو مگر اس پر عمل کرنے والوں کو کوئی گناہ نہیں اور جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ حق ان دونوں میں ایک ہی ہے دوسرا غلط اور خطا ہے اس کا حاصل بھی اس سے زیادہ نہیں کہ

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب بيان أجر الحاكم إذا اجتهد إلخ ج:٢ ص:٧٦، وصحيح البخاري، كتاب الاعتصام، باب أجر الحاكم إذا اجتهد إلخ ج:٢ ص:١٠٩٢

اصل مراد حق تعالیٰ اور مطلوبِ خداوندی تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اس مجتہد کے ثواب میں کمی آجائے گی اور یہ کمی اس وجہ سے ہے کہ اس کا اجتہاد حق بات تک نہ پہنچا لیکن یہ مطلب ان کا بھی نہیں ہے کہ مجتہد خاطی پر کوئی ملامت ہوگی یا اُس کے متبعین کو گناہ گار کہا جائے گا۔ تفسیر قرطبی میں اس مقام پر ان تمام مباحث کو پوری تفصیل سے لکھا ہے اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ [1]

یہ مسئلہ فقہیہ کہ اگر کسی کے جانور دوسرے آدمی کی جان یا مال کو نقصان پہنچائیں تو فیصلہ کیا ہونا چاہئے

حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جانور کے مالک پر ضمان آئے گا اگر یہ واقعہ رات میں ہوا ہو، لیکن یہ ضروری نہیں کہ داؤد علیہ السلام کی شریعت کا جو فیصلہ ہو وہی شریعتِ محمدیہ میں رہے اسی لئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر رات کے وقت کسی کے جانور دوسرے کے کھیت میں داخل ہو کر نقصان پہنچا دیں تو جانور کے مالک پر ضمان آئے گا اور اگر دن میں ایسا ہو تو ضمان نہیں آئے گا اُن کا استدلال حضرت داؤدؑ کے فیصلہ سے بھی ہو سکتا ہے مگر شریعت محمدیہ کے اُصول کے تحت اُنہوں نے ایک حدیث سے استدلال فرمایا ہے جو مؤطا امام مالک میں مرسلاً منقول ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ کی ناقہ ایک شخص کے باغ میں داخل ہو گئی اور اس کو نقصان پہنچا دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ باغوں اور کھیتوں کی حفاظت رات میں ان کے مالکوں کے ذمہ ہے اور ان کی حفاظت کے باوجود اگر رات کو کسی کے جانور نقصان پہنچا دیں تو جانور کے مالک پر ضمان ہے [2] اور امام ابوحنیفہ اور فقہاء کوفہ کا مسلک یہ ہے کہ جس وقت جانوروں کے ساتھ ان کا چرانے والا یا حفاظت کرنے والا کوئی آدمی موجود ہو، اُس نے غفلت کی اور جانوروں نے کسی کے باغ یا کھیت کو نقصان پہنچا دیا اس صورت میں تو جانور کے مالک پر ضمان آتا ہے خواہ یہ معاملہ رات میں ہو یا دن میں اور اگر مالک یا محافظ جانوروں کے ساتھ نہ ہوں جانور خود ہی نکل گئے اور کسی کے کھیت کو نقصان پہنچا دیا تو جانور کے مالک پر ضمان نہیں معاملہ دن اور رات کا اس میں بھی برابر ہے امام اعظمؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم اور تمام محدثین نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جَرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ [3] یعنی جانور جو کسی کو نقصان پہنچائے وہ قابلِ مواخذہ نہیں یعنی جانور کے مالک پر اس کا ضمان نہیں

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۱ ص:۳۰۹، ۳۱۰

[2] موطا مالکؒ، کتاب الأقضية، باب القضاء فی الضواری والحرسية رقم الحديث:۲۷۶۶

[3] صحيح البخاری، کتاب الزکاة، باب فی الرکاز خمس (بالتقديم والتأخير) ج:۱ ص:۲۰۳، وصحيح مسلم، کتاب الحدود، باب جرح العجماء إلخ ج:۲ ص:۷۳ (بالتقديم والتأخير)۔

ہے (بشرطیکہ جانور کا مالک یا محافظ اس کے ساتھ نہ ہو جیسا کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے) اس حدیث میں دن رات کی تفریق کے بغیر عام قانون شرعی یہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر جانور کے مالک نے خود اپنے قصد وارادے سے کسی کے کھیت میں نہیں چھوڑا، جانور بھاگ کر چلا گیا تو اس کے نقصان کا ضمان جانور کے مالک پر نہیں ہوگا۔[1] اور حضرت براء بن عازب کے واقعہ کی روایت کی سند میں فقہاء حنفیہ نے کلام کیا ہے اور فرمایا کہ اس کو صحیحین کی حدیثِ مذکور کے مقابلے میں حجت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ وَاللهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ

پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ظاہری کمالات میں سے ایک کمال حُسنِ صَوت کا بھی عطا فرمایا تھا، جب وہ زبور پڑھتے تھے تو پرندے ہوا میں ٹھہرنے لگتے تھے اور اُن کے ساتھ تسبیح کرنے لگتے تھے اسی طرح پہاڑ اور ہر شجر و مدر سے تسبیح کی آواز نکلنے لگتی تھی۔ خوش آوازی کا کمال تو ظاہری کمالات میں سے تھا اور پرندوں اور پہاڑوں کا تسبیح میں شریک ہوجانا۔ بتسخیر خداوندی بطور معجزہ کے تھا اور معجزہ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ پرندوں اور پہاڑوں میں حیات و شعور ہو بلکہ بطور معجزہ ہر غیر ذی شعور میں بھی شعور پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق یہی ہے کہ پہاڑوں اور پتھروں میں بھی حیات و شعور بقدر اُن کی حیثیت کے موجود ہے صحابہ کرام میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بہت خوش آواز تھے ایک روز وہ قرآن پڑھ رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر اُن کی طرف ہوا تو آپ اُن کی تلاوت سننے کے لئے ٹھہر گئے اور سنتے رہے پھر فرمایا کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے خوش آوازی حضرت داؤد علیہ السلام کی عطا فرمائی ہے۔ جب ابوموسیٰؓ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی تلاوت سن رہے تھے تو عرض کیا کہ اگر مجھے آپ کا سننا معلوم ہو جاتا تو میں اور زیادہ سنوار کر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ (ابن کثیر)[2]

فائدہ

اس سے معلوم ہوا کہ تلاوتِ قرآن میں حُسنِ صَوت اور اچھا لہجہ جس سے دلکشی پیدا ہو ایک درجہ میں مطلوب و محمود ہے بشرطیکہ آج کل کے قراء کی طرح اس میں غلو نہ ہو کہ صرف آواز ہی سنوارنے اور لوگوں کو لبھانے کی فکر رہ جائے تلاوت کا اصل مقصد ہی غائب ہو جائے۔ وَاللهُ اَعْلَمُ

---

[1] العناية شرح الهداية، كتاب الديات، باب جناية البهيمة، وبدائع الصنائع، كتاب الجنايات، فصل في وجوب الضمان إلخ۔

[2] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۵ ص:۳۵۸، وجامع الأُصول رقم الحديث: ۶۶۲۱

زرہ بنانے کی صنعت حضرت داؤد علیہ السلام کو منجانب اللہ عطا کی گئی

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ، لفظ لَبُوْس لغت کے اعتبار سے اسلحہ میں سے ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان اوڑھ کر یا گلے میں ڈال کر استعمال کرے۔ مراد اس جگہ آہنی زرہ ہے جو جنگ میں حفاظت کے لئے پہنی جاتی ہے دوسری آیت میں ہے وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝۱۰ (سبا) یعنی ہم نے اُن کے لئے لوہے کو نرم کر دیا تھا خواہ اس طرح کہ لوہا اُن کے ہاتھ میں آ کر خود بخود نرم ہو جاتا ہو کہ اُس کو جس طرح موڑیں مُڑ جائے اور باریک یا موٹا کرنا چاہیں تو ہو جائے جیسے موم ہوتا ہے یا اس طرح کہ اُن کو آگ میں پگھلا کر نرم کرنے کی تدبیر بتلا دی جو سب لوہے کے کارخانوں میں آج استعمال کی جاتی ہے۔

ایسی صنعت جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے مطلوب اور فعلِ انبیاء ہے

اس آیت میں زرہ سازی کی صنعت داؤد علیہ السلام کو سکھانے کے ذکر کے ساتھ اُس کی حکمت بھی یہ بتلائی ہے کہ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ یعنی تا کہ یہ زرہ تمہیں جنگ کے وقت تیز تلوار کے خطرہ سے محفوظ رکھ سکے یہ ایک ایسی ضرورت ہے کہ جس سے اہلِ دین اور اہلِ دُنیا سب کو کام پڑتا ہے اس لئے اس صنعت کے سکھانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک انعام قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس صنعت کے ذریعہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں اس کا سیکھنا سکھانا داخلِ ثواب ہے بشرطیکہ نیت خدمتِ خلق کی ہو، صرف کمائی ہی مقصد نہ ہو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے مختلف قسم کی صنعتوں کا عمل کرنا منقول ہے حضرت آدم علیہ السلام سے کھیتی بونے کاٹنے کا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو صنعت کار اپنی صنعت میں نیت نیک یعنی خدمتِ خلق کی رکھے اُس کی مثال اُمّ موسیٰ کی سی ہو جاتی ہے کہ اُنہوں نے اپنے ہی بچّہ کو دودھ پلایا اور معاوضہ فرعون کی طرف سے مفت میں ملا۔ اسی طرح خدمتِ خلق کی نیت سے صنعت کاری کرنے والے کو اپنا مقصد ثوابِ خدمتِ خلق تو حاصل ہوگا ہی صنعت کا نفع دنیوی مزید براں اس کو ملے گا یہ حدیث حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصّہ میں سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کی تسخیر اور اُس کے متعلقہ مسائل

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کا یہ واقعہ پیش آیا کہ لشکری گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول ہو کر عصر کی نماز فوت ہوگئی تو اپنی اس غفلت پر افسوس ہوا اور یہ گھوڑے جو اس غفلت کا سبب بنے تھے ان کو بیکار کر کے چھوڑ دیا، چونکہ اُن کا یہ عمل اللہ کی رضاجوئی کے لئے ہوا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو گھوڑوں سے بہتر اور تیز رفتار سواری ہوا کی عطا فرما دی اس واقعہ کی تفصیل اور اس سے متعلقہ آیات کی تفسیر صٓ میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً، یہ جملہ سابقہ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ پر عطف ہے یعنی جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو اُن کی آواز کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا تھا جس پر سوار ہو کر وہ جہاں چاہتے بہت جلد آسانی سے پہنچ جاتے تھے اس جگہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ تسخیر داؤد علیہ السلام میں تو لفظ مَعَ استعمال فرمایا کہ اُن کے ساتھ پہاڑوں پرندوں کو مسخر کر دیا تھا اور یہاں حرف لام کے ساتھ فرمایا کہ ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا اس میں لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دونوں تسخیروں میں فرق تھا، داؤد علیہ السلام جب تلاوت کرتے تو پہاڑ اور پرندے خود بخود تسبیح کرنے لگتے تھے اُن کے حکم کے منتظر نہ رہتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو اُن کے حکم کے تابع بنا دیا گیا کہ جب چاہیں جس وقت چاہیں جس طرف جانا چاہیں ہوا کو حکم دیدیا اُس نے پہنچا دیا پھر جہاں اُترنا چاہیں وہاں اُتار دیا پھر جب واپس چلنے کا حکم ہوا واپس پہنچا دیا۔ (روح عن البیضاوی) [۱]

تفسیر ابن کثیر میں تخت سلیمان علیہ السلام جو ہوا پر چلتا تھا اُس کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے لکڑی کا ایک بہت بڑا وسیع تخت بنوایا تھا جس پر خود مع اعیان سلطنت اور مع لشکر اور آلات حرب کے سب سوار ہو جاتے پھر ہوا کو حکم دیتے وہ اس عظیم الشان وسیع و عریض تخت کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا وہاں جا کر اُتار دیتی تھی۔ یہ ہوائی تخت صبح سے دوپہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا اور دوپہر سے شام تک ایک مہینہ کی یعنی ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت ہوا کے ذریعہ طے ہو جاتی تھی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سعد بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس تخت سلیمانی پر چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں جس میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہلِ ایمان انسان سوار ہوتے تھے اور ان کے پیچھے اہلِ ایمان جن بیٹھتے تھے پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ اس پورے تخت پر سایہ کر لیں تا کہ آفتاب کی تپش سے تکلیف نہ ہو پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا وہ اس عظیم الشان مجمع کو اُٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچا دیتی تھی۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس ہوائی سفر کے وقت پورے راستہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سر جھکائے ہوئے اللہ کے ذکر و شکر میں مشغول رہتے تھے دائیں بائیں کچھ نہ دیکھتے تھے اور اپنے عمل سے تواضع کا اظہار فرماتے تھے۔ (ابن کثیر) [۲]

عَاصِفَةً، ریح عاصفہ کے لفظی معنے سخت اور تیز ہوا کے ہیں۔ قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس ہوا کی صفت رُخاء بیان کی گئی ہے، جس کے معنے نرم ہوا کے ہیں جس سے نہ غبار اُڑے نہ فضا میں تلاطم پیدا ہو۔ بظاہر یہ دو متضاد صفتیں ہیں لیکن دونوں صفتوں کا جمع ہونا اس طرح ممکن ہے کہ یہ ہوا اپنی ذات میں بڑی سخت اور تیز ہو جس کی وجہ سے چند گھنٹوں میں

---

[۱] تفسیر روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۱۷ ص:۷۷

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۳۵۸

ایک مہینہ کی مسافت طے کر سکے لیکن قدرتِ حق تعالیٰ نے اُس کو ایسا بنادیا ہو کہ اُس سے فضاء میں تلاطم نہ پیدا ہو چنانچہ اس کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کہ جس فضا میں یہ تخت روانہ ہوتا تھا وہاں کسی پرندے کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچتا تھا۔

سلیمان علیہ السلام کے لئے تسخیر جنّات وشیاطین

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کردیا شیاطین جن میں سے ایسے لوگوں کو جو دریاؤں میں غوطہ لگا کر سلیمان علیہ السلام کے لئے جواہرات نکال کرلاتے تھے اوراس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے جن میں سے بعض کا ذکر دوسری آیات میں آیا ہے۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ (سبا: ۱۳) یعنی بناتے ہیں حضرت سلیمان کے لئے محرابیں اور شاندار مکانات اور مورتیں اور پتھر کے بڑے بڑے پیالے جو حوض کی طرح کام دیں اُن سے سلیمانؑ بڑی مشقت کے کام بھی لیتے تھے اور عجیب وغریب صنعتوں کے بھی، اور ہم ہی اُن کے محافظ تھے۔

شیاطین، وہ آگ کے بنے ہوئے اجسام لطیفہ ہیں جو عقل وشعور رکھتے ہیں اور انسان کی طرح احکامِ شرع کے مکلّف ہیں۔ اس نوع کے لئے اصل لفظ جن یا جنّات استعمال ہوتا ہے ان میں جو ایمان قبول نہ کریں کافر ہیں ان کو شیاطین کہا جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تو سبھی جنّات تھے خواہ مؤمن ہوں یا کافر، مگر مؤمنین تو تسخیر کے بغیر بھی سلیمان علیہ السلام کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے کرتے تھے اُن کے لئے تسخیر کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ اس لئے تسخیر میں صرف شیاطین یعنی کفار وجنّات کا ذکر فرمایا کہ وہ باوجود اپنے کفر وسرکشی کے زبردستی حضرت سلیمان کے تابع فرمان رہتے تھے اور شاید اسی لئے آیت کے آخر میں یہ جملہ بڑھایا گیا کہ ہم ہی اُن کے محافظ تھے ورنہ کفار جنّات سے تو ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچا دیں مگر حفاظتِ خداوندی کا پہرہ اُن پر لگا ہوا تھا اس لئے کوئی گزند نہ پہنچا سکتے تھے۔

ایک لطیفہ

حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے تو حق تعالیٰ نے سب سے زیادہ سخت اور کثیف اجسام کو مسخر فرمایا جن میں پہاڑ اور لوہا جیسی سخت چیزیں شامل ہیں، اس کے بالمقابل سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسے اجسامِ لطیفہ کو مسخر فرمایا جو دیکھنے میں بھی نہ آسکیں جیسے ہوا اور جنّات اس میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ہر قسم کی مخلوقات پر حاوی ہونا واضح کیا گیا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)[1]

---

[1] تفسیر کبیر تحت هٰذه الآیة ج:۱۲ ص:۴۰۴

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور ایوب کو جس وقت پکارا اس نے اپنے رَبّ کو کہ مجھ پر پڑی ہے تکلیف اور تو ہے سب رحم والوں سے رحم والا

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ

پھر ہم نے سُن لی اُس کی فریاد سو دُور کر دی جو اُس پر تھی تکلیف اور عطا کئے اس کو اس کے گھر والے اور اتنے ہی اور ان کے ساتھ

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

رحمت اپنی طرف سے اور نصیحت بندگی کرنے والوں کو

آسان ترجمۂ قرآن

اور ایوب کو دیکھو! جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ: "مجھے یہ تکلیف لگ گئی ہے، اور تو سارے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔" ﴿۸۳﴾ پھر ہم نے ان کی دُعا قبول کی، اور انہیں جو تکلیف لاحق تھی، اُسے دُور کر دیا، اور ان کو ان کے گھر والے بھی دیئے، اور ان کے ساتھ اتنے ہی لوگ اور بھی، تاکہ ہماری طرف سے رحمت کا مظاہرہ ہو، اور عبادت کرنے والوں کو ایک یادگار سبق ملے۔ ﴿۸۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ایوب (علیہ السلام) کے قصّے کا تذکرہ کیجئے جب کہ اُنہوں نے (مرض شدید میں مبتلا ہونے کے بعد) اپنے رَبّ کو پکارا کہ مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں (تو اپنی مہربانی سے میری یہ تکلیف دُور کر دیجئے) تو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور اُن کو جو تکلیف تھی اُس کو دُور کر دیا اور (بغیر اُن کی درخواست کے) ہم نے اُن کا کنبہ (یعنی اولاد جو اُن سے غائب ہو گئے تھے (قاله الحسن كذا في الدر المنثور) [۱] یا مر گئے تھے (کما قال غیرہ) عطا فرمایا (اس طرح سے کہ وہ اُن کے پاس آ گئے یا بایں معنیٰ کہ اتنے ہی اور پیدا ہو گئے، قاله عكرمه كما في فتح المنان) اور ان کے ساتھ (گنتی میں) اُن کے برابر اور بھی (دیئے یعنی جتنی اولاد پہلے تھی اُس کے برابر اور بھی دیدیئے خواہ خود اپنی

---

[۱] الدر المنثور تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۸۴

صلب سے یا اولاد کی اولاد ہونے کی حیثیت سے) (کذا فی فتح المنان من کتاب ایوب) اپنی رحمتِ خاصہ کے سبب سے اور عبادت کرنے والوں کے لئے ایک یادگار رہنے کے سبب سے۔

معارف و مسائل

قصہ ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام کے قصہ میں اسرائیلی روایات بڑی طویل ہیں اُن میں سے جن کو حضرات محدثین نے تاریخی درجہ میں قابلِ اعتماد سمجھا ہے وہ نقل کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم سے تو صرف اتنی بات ثابت ہے کہ اُن کو کوئی شدید مرض پیش آیا جس پر وہ صبر کرتے رہے بالآخر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو اُس سے نجات ملی اور یہ کہ اس بیماری کے زمانے میں اُن کی اولاد اور احباب سب غائب ہو گئے خواہ موت کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے، پھر حق تعالیٰ نے اُن کو صحت و عافیت دی اور جتنی اولاد تھی وہ سب اُن کو دیدی بلکہ اتنی ہی اور بھی زیادہ دیدی، باقی حصّے کے اجزاء بعض تو مستند احادیث میں موجود ہیں اور زیادہ تر تاریخی روایات ہیں حافظ ابن کثیر نے اس قصے کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ:

ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ابتدا میں مال و دولت اور جائیداد اور شاندار مکانات اور سواریاں اور اولاد اور حشم و خدم بہت کچھ عطا فرمایا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبرانہ آزمائش میں مبتلا کیا یہ سب چیزیں اُن کے ہاتھ سے نکل گئیں اور بدن میں بھی ایسی سخت بیماری لگ گئی جیسے جذام ہوتا ہے کہ بدن کا کوئی حصّہ بجز زبان اور قلب کے اس بیماری سے نہ بچا وہ اس حالت میں زبان و قلب کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھتے اور شکر ادا کرتے رہتے تھے۔ اس شدید بیماری کی وجہ سے سب عزیزوں، دوستوں اور پڑوسیوں نے اُن کو الگ کر کے آبادی سے باہر ایک کوڑا کچرہ ڈالنے کی جگہ پر ڈالدیا۔ [۱] کوئی اُن کے پاس نہ جاتا تھا صرف اُن کی بیوی اُن کی خبر گیری کرتی تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیٹی یا پوتی تھی جس کا نام لیّا بنت میشا ابن یوسف علیہ السلام بتلایا جاتا ہے (ابن کثیر) [۲] مال و جائیداد تو سب ختم ہو چکا تھا ان کی زوجہ محترمہ محنت مزدوری کر کے اپنے اور اُن کے لئے رزق اور ضروریات فراہم کرتی اور ان کی خدمت کرتی تھیں۔ ایوب علیہ السلام کا یہ ابتلاء و امتحان کوئی حیرت و تعجب کی چیز نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَآءُ ثُمَّ الصَّالِحُوْنَ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ، [۳] یعنی سب سے زیادہ سخت بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں اُن کے بعد

---

[۱] حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے بارے میں اس روایت کی اصل وضاحت معارف القرآن جلد نمبر ۷ صفحہ نمبر ۵۷۸ پر سورۂ ص کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ محمد تقی عثمانی ۱۸/۳/۱۴۲۶ھ

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۵ ص:۳۶۲

[۳] المعجم الكبير للطبرانیؒ، رقم الحديث:۲۰۰۹۶، ومسند احمد رقم الحديث: ۱۴۸۱، مسند سعد بن ابی وقاص رضی الله عنه۔

دوسرے صالحین کو درجہ بدرجہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہر انسان کا ابتلاء اور آزمائش اس کی دینی صلابت اور مضبوطی کے اندازے پر ہوتا ہے جو دین میں جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے اُتنی اس کی آزمائش وابتلاء زیادہ ہوتی ہے (تاکہ اسی مقدار سے اس کے درجات اللہ کے نزدیک بلند ہوں) حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں دینی صلابت اور صبر کا ایک امتیازی مقام عطا فرمایا تھا (جیسے داؤد علیہ السلام کو شکر کا ایسا ہی امتیاز دیا گیا تھا) مصائب وشدائد پر صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام ضرب المثل ہیں۔ یزید بن میسرہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو مال واولاد وغیرہ سب دُنیا کی نعمتوں سے خالی کر کے آزمائش فرمائی تو اُنہوں نے فارغ ہو کر اللہ کی یاد اور عبادت میں اور زیادہ محنت شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے مال جائیداد اور دولتِ دُنیا اور اولاد عطا فرمائی جس کی محبت میرے دل کے ایک ایک جزء پر چھا گئی پھر اس پر بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ان سب چیزوں سے فارغ اور خالی کر دیا اور اب میرے اور آپ کے درمیان حائل ہونے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔

حافظ ابن کثیر یہ مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہب بن منبہ سے اس قصہ میں بڑی طویل روایات منقول ہیں جن میں غرابت پائی جاتی ہے اور طویل ہیں اس لئے ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ [1]

حضرت ایوب علیہ السلام کی دُعا صبر کے خلاف نہیں

حضرت ایوب علیہ السلام اس شدید بلاء میں کہ سب مال وجائیداد اور دَولتِ دُنیا سے الگ ہو کر ایسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ لوگ پاس آتے ہوئے گھبرائیں، بستی سے باہر ایک کوڑے کچرے کی جگہ پر سات سال چند ماہ پڑے رہے کبھی جزع وفزع یا شکایت کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں آیا۔ نیک بی بی لیّا زوجہ محترمہ نے عرض بھی کیا کہ آپ کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے اللہ سے دُعا کیجئے کہ یہ تکلیف دُور ہو جائے تو فرمایا کہ میں نے ستّر سال صحیح تندرست اللہ کی بے شمار نعمت ودولت میں گزارے ہیں کیا اس کے مقابلے میں سات سال بھی مصیبت کے گزرنے مشکل ہیں۔ پیغمبرانہ عزم وضبط اور صبر وثبات کا یہ عالم تھا کہ دُعا کرنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں صبر کے خلاف نہ ہو جائے (حالانکہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنا اور اپنی احتیاج وتکلیف پیش کرنا بے صبری میں داخل نہیں) بالآخر کوئی ایسا سبب پیش آیا جس نے ان کو دُعا کرنے پر مجبور کر دیا اور جیسا کہ اُوپر لکھا گیا ہے یہ دُعا دُعا ہی تھی کوئی بے صبری نہیں تھی حق تعالیٰ نے اُن کے کمالِ صبر پر اپنے کلام میں مہر ثبت فرما دی ہے فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ [2] (ص: ۴۴) اس سبب کے بیان میں روایات بہت مختلف اور طویل ہیں اس لئے ان کو چھوڑا جاتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۵ ص:۳۵۹، ۳۶۰

[2] ترجمہ: بے شک ہم نے ان کو صابر پایا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ (جب ایوب علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی اور اُن کو حکم ہوا کہ زمین پر ایڑ لگایئے یہاں سے صاف پانی کا چشمہ پھوٹے گا اُس سے غسل کیجئے اور اس کا پانی پیجئے تو یہ سارا روگ چلا جائے گا۔ حضرت ایوبؑ نے اس کے مطابق کیا تمام بدن جو زخموں سے چُور تھا اور بجز ہڈیوں کے کچھ نہ رہا تھا اس چشمہ کے پانی سے غسل کرتے ہی سارا بدن کھال اور بال یکا یک اپنی اصلی حالت پر آ گئے تو) اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے جنت کا ایک لباس بھیج دیا وہ زیب تن فرمایا اور اس کوڑے کچرے سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ زوجہ محترمہ حسبِ عادت ان کی خبر گیری کے لئے آئی تو اُن کو اپنی جگہ پر نہ پا کر رونے لگی۔ ایوب علیہ السلام جو ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے اُن کو نہیں پہچانا کہ حالت بدل چکی تھی، اُنہیں سے پوچھا کہ اے خدا کے بندے (کیا تمہیں معلوم ہے کہ) وہ بیمار مبتلا جو یہاں پڑا رہتا تھا کہاں چلا گیا، کیا کتوں یا بھیڑیوں نے اُسے کھا لیا؟ اور کچھ دیر تک اس معاملے میں اُن سے گفتگو کرتی رہی۔ یہ سب سُن کر ایوب علیہ السلام نے اُن کو بتلایا کہ میں ہی ایوب ہوں مگر زوجہ محترمہ نے اب تک بھی نہیں پہچانا۔ کہنے لگی اللہ کے بندے کیا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں تو ایوب علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ غور کرو میں ہی ایوب ہوں اللہ تعالیٰ نے میری دُعا قبول فرمالی اور میرا بدن از سرِ نو درست فرما دیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا مال و دولت بھی اُن کو واپس دے دیا اور اولاد بھی، اور اولاد کی تعداد کے برابر مزید اولاد بھی دے دی۔ (ابن کثیر) [۱]

ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے سات لڑکے سات لڑکیاں تھیں اس ابتلاء کے زمانے میں یہ سب مر گئے تھے، جب اللہ نے ان کو عافیت دی تو ان کو بھی دوبارہ زندہ کر دیا اور اُن کی اہلیہ سے نئی اولاد بھی اتنی ہی اور پیدا ہو گئی جس کو قرآن میں وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ فرمایا ہے۔ ثعلبی نے کہا کہ یہ قول ظاہر آیت قرآن کے ساتھ اقرب ہے۔ (قرطبی) [۲]

بعض حضرات نے فرمایا کہ نئی اولاد خود اپنے سے اُتنی ہی مل گئی جتنی پہلے تھی اور اُن کے مثل اولاد سے مراد اولاد کی اولاد ہے۔ واللہ اَعْلَم

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ۚ۸۵ وَاَدْخَلْنٰهُمْ

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو یہ سب ہیں صبر والے اور لے لیا ہم نے اُن کو

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۵ ص:۳۶۲، وتفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۱۴۵۶۴، ج:۹ ص:۳۳۶

[۲] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۱ ص:۳۲۶

فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾

اپنی رحمت میں وہ ہیں نیک بختوں میں

آسان ترجمۂ قرآن

اور اِسماعیل اور اِدریس اور ذُوالکفل کو دیکھو! یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ ﴿۸۵﴾ اور ان کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کرلیا تھا۔ یقیناً ان کا شمار نیک لوگوں میں ہے۔ ﴿۸۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اِسماعیل اور اِدریس اور ذُوالکفل (کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے یہ سب (احکامِ الٰہیہ تشریعیہ اور تکوینیہ پر) ثابت قدم رہنے والے لوگوں میں سے تھے اور ہم نے ان (سب) کو اپنی رحمت (خاصّہ) میں داخل کرلیا تھا بیشک یہ (سب) کمال صلاحیت والوں میں تھے۔

معارف و مسائل

حضرت ذُوالکفل نبی تھے یا ولی اور اُن کا قصہ عجیبہ

آیاتِ مذکورہ میں تین حضرات کا ذکر ہے جن میں حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام کا نبی ورسول ہونا قرآنِ کریم کی بہت سی آیات سے ثابت اور اُن کا تذکرہ بھی قرآن میں جابجا آیا ہے۔ تیسرے بزرگ ذُوالکفل ہیں۔ ابنِ کثیرؒ نے فرمایا کہ ان کا نام ان دونوں پیغمبروں کے ساتھ شامل کرکے ذکر کرنے سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بھی کوئی اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زُمرۂ انبیاء میں نہیں تھے بلکہ ایک مردِ صالح اولیاء اللہ میں سے تھے۔ [1] امامِ تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت یَسَعْ (جن کا نبی وپیغمبر ہونا قرآن میں مذکور ہے) جب بوڑھے اور ضعیف ہوگئے تو ارادہ کیا کہ کسی کو اپنا خلیفہ بنائیں جو اُن کی زندگی میں وہ سب کام اُن کی طرف سے کرے جو نبی کے فرائض میں داخل ہیں۔

اس مقصد کے لئے حضرت یَسَعْ علیہ السلام نے اپنے سب صحابہ کو جمع کیا کہ میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں جس کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۳۶۳

لئے تین شرطیں ہیں جو شخص ان شرائط کا جامع ہو اس کو خلیفہ بناؤں گا۔ وہ تین شرطیں یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتا ہو اور ہمیشہ رات کو عبادت میں بیدار رہتا ہو اور کبھی غصہ نہ کرتا ہو۔ مجمع میں سے ایک ایسا غیر معروف شخص کھڑا ہوا جس کو لوگ حقیر و ذلیل سمجھتے تھے اور کہا کہ میں اس کام کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت یَسَع نے دریافت کیا کہ کیا تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور ہمیشہ شب بیداری کرتے ہو اور کبھی غصہ نہیں کرتے؟ اس شخص نے عرض کیا کہ بیشک میں ان تین چیزوں کا عامل ہوں۔ حضرت الیسع (کو شاید کچھ اس کے قول پر اعتماد نہ ہوا اس لئے) اُس روز اس کو رَد کر دیا پھر کسی دوسرے روز اسی طرح مجمع سے خطاب فرمایا اور سب حاضرین ساکت رہے اور یہی شخص پھر کھڑا ہو گیا اُس وقت حضرت یَسَع نے ان کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا۔ شیطان نے یہ دیکھا کہ ذُوالکفل اس میں کامیاب ہو گئے تو اپنے اعوان شیاطین سے کہا کہ جاؤ کسی طرح اس شخص پر اثر ڈالو کہ یہ کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے یہ منصب اس کا سلب ہو جائے۔ اعوانِ شیطان نے عذر کر دیا۔ کہ وہ ہمارے قابو میں آنے والا نہیں شیطان ابلیس نے کہا کہ اچھا تم اس کو مجھ پر چھوڑ دو (میں اُس سے نمٹ لوں گا)۔ حضرت ذوالکفلؑ اپنے اقرار کے مطابق دن بھر روزہ رکھتے اور رات بھر جاگتے تھے صرف دوپہر کو قیلولہ کرتے تھے (قیلولہ دوپہر کے سونے کو کہتے ہیں) شیطان عین دوپہر کو ان کے قیلولہ کے وقت آیا اور دروازہ پر دستک دی یہ بیدار ہو گئے اور پوچھا کون ہے کہنے لگا کہ میں بوڑھا مظلوم ہوں، اُنہوں نے دروازہ کھول دیا، اُس نے اندر پہنچ کر ایک افسانہ کہنا شروع کر دیا کہ میری برادری کا مجھ سے جھگڑا ہے اُنہوں نے مجھ پر یہ ظلم کیا وہ ظلم کیا، ایک طویل داستان شروع کر دی یہاں تک کہ دوپہر کے سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ حضرت ذُوالکفل نے فرمایا کہ جب میں باہر آؤں تو میرے پاس آ جاؤ میں تمہارا حق دلواؤں گا۔

حضرت ذُوالکفل باہر تشریف لائے اور اپنی مجلسِ عدالت میں اُس کا انتظار کرتے رہے مگر اس کو نہیں پایا۔ اگلے روز جب وہ عدالت میں فیصلہ مقدمات کے لئے بیٹھے تو اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے اور یہ نہ آیا۔ جب دوپہر کو قیلولہ کے لئے گھر میں گئے تو یہ شخص آیا اور دروازہ کوٹنا شروع کیا۔ انہوں نے پھر پوچھا کون ہے؟ جواب دیا کہ ایک مظلوم بوڑھا ہے، اُنہوں نے پھر دروازہ کھول دیا اور فرمایا کہ کیا میں نے کل تم سے نہیں کہا تھا کہ جب میں اپنی مجلس میں بیٹھوں تو تم آ جاؤ (تم نہ کل آئے نہ آج صبح سے آئے) اُس نے کہا کہ حضرت میرے مخالف بڑے خبیث لوگ ہیں جب انہوں نے دیکھا کہ آپ اپنی مجلس میں بیٹھے ہیں اور میں حاضر ہوں گا تو آپ اُن کو میرا حق دینے پر مجبور کریں گے تو اُنہوں نے اُس وقت اقرار کر لیا کہ ہم تیرا حق دیتے ہیں، پھر جب آپ مجلس سے اُٹھ گئے تو انکار کر دیا۔ اُنہوں نے پھر اس کو یہی فرمایا کہ اب جاؤ جب میں مجلس میں بیٹھوں تو میرے پاس آ جاؤ۔ اسی گفت وشنید میں آج کے دوپہر کا سونا بھی رہ گیا اور وہ باہر مجلس میں تشریف لے گئے اور اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے (اگلے روز بھی دوپہر تک انتظار کیا وہ نہیں آیا پھر جب تیسرے روز دوپہر کا وقت ہوا اور نیند کو تیسرا دن ہو گیا تھا نیند کا غلبہ تھا) تو گھر میں آ کر گھر والوں کو اس پر مقرر کیا کہ کوئی شخص دروازے پر

دستک نہ دے سکے۔ یہ بوڑھا پھر تیسرے روز پہنچا اور دروازے پر دستک دینا چاہا لوگوں نے منع کیا تو ایک روشندان کے راستے سے اندر داخل ہوگیا اور اندر پہنچ کر بجانا شروع کردیا یہ پھر نیند سے بیدار ہوگئے اور دیکھا کہ یہ شخص گھر کے اندر ہے اور دیکھا کہ دروازہ بدستور بند ہے اس سے پوچھا، تو کہاں سے اندر پہنچا، اس وقت حضرت ذُوالکفل نے پہچان لیا کہ یہ شیطان ہے اور فرمایا کہ کیا تُو خدا کا دشمن ابلیس ہے؟ اس نے اقرار کیا کہ ہاں، اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے میری ہر تدبیر میں تھکا دیا کبھی میرے جال میں نہیں آیا، اب میں نے یہ کوشش کی کہ تجھے کسی طرح غصہ دلا دوں تاکہ تو اپنے اس اقرار میں جھوٹا ہو جائے جو یَسَع نبی کے ساتھ کیا ہے، اس لئے میں نے یہ سب حرکتیں کیں۔ یہ واقعہ تھا جس کی وجہ سے اُن کو ذُوالکفل کا خطاب دیا گیا، کیونکہ ذُوالکفل کے معنی ہیں ایسا شخص جو اپنے عہد اور ذمہ داری کو پورا کرے، حضرت ذُوالکفل اپنے اس عہد پر پورے اُترے۔ (ابن کثیر)[1]

مسند احمد میں ایک روایت اور بھی ہے مگر اس میں ذُوالکفل کے بجائے الکفل کا نام آیا ہے۔ اسی لئے ابن کثیر نے اُس روایت کو نقل کر کے کہا کہ یہ کوئی دوسرا شخص کفل نامی ہے وہ ذُوالکفل جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ نہیں۔ روایت یہ ہے:-

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی ہے اور ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ سات مرتبہ سے زائد سُنی ہے وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ کفل بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا جو کسی گناہ سے پرہیز نہ کرتا تھا، اُس کے پاس ایک عورت آئی اُس نے اس کو ساٹھ دینار (گنیاں) دیں اور فعل حرام پر اس کو راضی کرلیا۔ جب وہ مباشرت کے لئے بیٹھ گیا تو یہ عورت کانپنے اور رونے لگی اُس نے کہا کہ رونے کی کیا بات ہے کیا میں نے تم پر کوئی جبر اور زبردستی کی ہے۔ اس نے کہا نہیں جبر تو نہیں کیا۔ لیکن یہ ایسا گناہ ہے جو میں نے کبھی عمر بھر نہیں کیا اور اس وقت مجھے اپنی ضرورت نے مجبور کردیا اس لئے اس پر آمادہ ہوگئی۔ یہ سُن کر وہ شخص اسی حالت میں عورت سے الگ ہوکر کھڑا ہوگیا اور کہا کہ جاؤ یہ دینار بھی تمہارے ہیں اور اَب سے کفل بھی کوئی گناہ نہیں کرے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ اسی رات میں کفل کا انتقال ہوگیا اور صبح اس کے دروازے پر غیب سے یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی گئی غَفَرَ اللّٰهُ لِلْكِفْلِ یعنی اللہ نے کفل کو بخش دیا ہے۔[2]

ابنِ کثیر نے یہ روایت مسند احمد کی نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کو صحاحِ ستّہ میں سے کسی نے روایت نہیں کیا اور اسناد اس کی غریب ہے اور بہرحال اگر روایت ثابت بھی ہے تو اس میں ذکر کفل کا ہے ذُوالکفل کا نہیں، یہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے۔[3] وَاللّٰهُ اَعْلَم

---

۱ تفسیر ابن کثیر ج:۵ ص:۳۶۴، وتفسیر الطبری تحت ھذه الآیة ج:۱۸ ص:۵۰۸، ۵۰۹

۲ مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، رقم الحدیث:۴۸۵۰		۳ تفسیر ابن کثیر ج:۵ ص:۳۶۵

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ذُوالکفل حضرت یَسَع نبی کے خلیفہ اور ولی صالح تھے، اُن کے خاص محبوب اعمال کی بنا پر ہوسکتا ہے کہ اُن کا ذکر اس آیت میں بزمرہ انبیاء کر دیا گیا اور اس میں بھی کوئی بعد نہیں معلوم ہوتا کہ شروع میں یہ حضرت یَسَع کے خلیفہ ہی ہوں پھر حق تعالیٰ نے ان کو منصب نبوّت عطا فرما دیا ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اَعْلَمُ

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى

اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصّہ ہوکر پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اس کو پھر پکارا

فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ ﴿۸۷﴾

ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گناہگاروں سے

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

پھر سُن لی ہم نے اس کی فریاد اور بچا دیا اس کو اس گھٹنے سے اور یونہی ہم بچا دیتے ہیں ایمان والوں کو

آسان ترجمۂ قرآن

اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یونس علیہ السلام) کو دیکھو! جب وہ خفا ہو کر چل کھڑے ہوئے تھے، اور یہ سمجھے تھے کہ ہم ان کی کوئی پکڑ نہیں کریں گے۔ پھر انہوں نے اندھیریوں میں سے آواز لگائی کہ: "(یا اللہ!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے۔ بیشک میں قصوروار ہوں۔" ﴿۸۷﴾ اس پر ہم نے ان کی دُعا قبول کی، اور انہیں گھٹن سے نجات عطا کی، اور اسی طرح ہم ایمان رکھنے والوں کو نجات دیتے ہیں۔ ﴿۸۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یونس علیہ السلام کے قصّہ) کا تذکرہ کیجئے جب وہ (اپنی قوم سے جبکہ وہ ایمان نہ لائی) خفا ہو کر چل دیئے (اور ان کی قوم پر سے عذاب ٹلنے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لئے ہمارے حکم کا انتظار نہیں کیا) اور اُنہوں نے (اپنے اجتہاد سے) یہ سمجھا کہ ہم (اس چلے جانے میں) اُن پر کوئی دارو گیر نہ کریں گے (یعنی چونکہ اس فرار کو انہوں نے اپنے اجتہاد سے جائز سمجھا اس لئے وحی کا انتظار نہ کیا لیکن چونکہ اُمید وحی تک وحی کا انتظار انبیاء

کے لئے مناسب ہے اور یہ مناسب کام اُن سے ترک ہو گیا لہٰذا ان کو یہ ابتلا پیش آیا کہ راستہ میں اُن کو کوئی دریا ملا اور وہاں کشتی میں سوار ہوئے، کشتی چلتے چلتے رُک گئی یونس علیہ السلام سمجھ گئے کہ میرا یہ بلا اجازت فرار ناپسند ہوا اس کی وجہ سے یہ کشتی رُکی، کشتی والوں سے فرمایا کہ مجھ کو دریا میں ڈال دو، وہ راضی نہ ہوئے غرض قرعہ پر اتفاق ہوا تب بھی ان ہی کا نام نکلا، آخر اُن کو دریا میں ڈال دیا اور خدا کے حکم سے ان کو ایک مچھلی نے نگل لیا، اخرجہ ابن ابی حاتم عن ابن عباس کذا فی الدر المنثور) [۱] پس اُنہوں نے اندھیروں میں پکارا (ایک اندھیرا مچھلی کے پیٹ کا، دوسرا دریا کے پانی کا دونوں گہرے اندھیرے جو بہت سے اندھیروں کے قائم مقام، یا تیسرا اندھیرا رات کا، قالہ ابن مسعودؓ کما فی الدر المنثور، [۲] غرض ان تاریکیوں میں دُعا کی) کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں (یہ توحید ہے) آپ (سب نقائص سے) پاک ہیں (یہ تنزیہ ہے) میں بیشک قصوروار ہوں (یہ استغفار ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ میرا قصور معاف کر کے اس شدت سے نجات دیجئے) سو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور اُن کو اس گھٹن سے نجات دی (جس کا قصہ سورۂ صافات میں [۳] فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ الخ (الصّٰفّٰت: ۱۴۵) میں مذکور ہے) اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب اور غم سے) نجات دیا کرتے ہیں (جبکہ چندے غم میں رکھنا مصلحت نہ ہو)۔

معارف و مسائل

وَذَا النُّوْنِ، حضرت یونس بن متّیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم نے سورۂ یونس، سورۂ انبیاء پھر سورۂ صافات اور سورۂ نون میں ذکر فرمایا کہیں ان کا اصل نام ذکر فرمایا ہے کہیں ذوالنون یا صاحب الحوت کے القاب سے ذکر کیا گیا ہے۔ نون اور حوت دونوں کے معنے مچھلی کے ہیں ذوالنون اور صاحب الحوت کا ترجمہ ہے مچھلی والا، حضرت یونس علیہ السلام کو بتقدیر الٰہی چند روز بطنِ ماہی میں رہنے کا واقعہ غریبہ پیش آیا تھا اس کی مناسبت سے ان کو ذوالنون بھی کہا جاتا ہے اور صاحب الحوت کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا۔

قصۂ یونس علیہ السلام

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یونس علیہ السلام کو علاقہ موصل کی ایک بستی نینویٰ کے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یونس علیہ السلام نے ان کو ایمان و عمل صالح کی دعوت دی، اُنہوں نے تمرّد اور سرکشی سے کام لیا۔ یونس علیہ السلام ان

---

[۱] تفسیر الدر المنثور تحت تفسیر سورة الصّٰفّٰت: ۱۳۹، ج:۸ ص:۳۵۹

[۲] تفسیر الدر المنثور تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۹۴

[۳] ترجمہ: سو ہم نے ان کو ایک میدان میں ڈال دیا۔

سے ناراض ہوکر بستی سے نکل گئے اور اُن کو کہہ دیا کہ تین دن کے اندر تمہارے اوپر عذاب آ جائے گا۔ یونس علیہ السلام بستی چھوڑ کر نکل گئے تو ان کو فکر ہوئی کہ اب عذاب آ ہی جائے گا (اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کے بعض آثار کا اُن کو مشاہدہ بھی ہو گیا) تو اُنہوں نے اپنے شرک و کفر سے توبہ کی اور بستی کے سب مرد عورت اور بچے جنگل کی طرف نکل گئے اور اپنے مویشی جانوروں اور اُن کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئے اور بچوں کو اُن کی ماؤں سے الگ کر دیا اور سب نے گریہ وزاری کرنا شروع کی اور الحاح وزاری کے ساتھ اللہ سے پناہ مانگی، جانوروں کے بچوں نے جن کو اُن کی ماؤں سے الگ کر دیا گیا تھا الگ شور وغُل کیا۔ حق تعالیٰ نے اُن کی سچی توبہ اور الحاح وزاری کو قبول کر لیا اور عذاب اُن سے ہٹا دیا۔ ادھر حضرت یونس علیہ السلام اس انتظار میں رہے کہ قوم پر عذاب آ رہا ہے وہ ہلاک ہوگئی ہوگی جب اُن کو یہ پتہ چلا کہ عذاب نہیں آیا اور قوم صحیح سالم اپنی جگہ ہے تو (ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب میں جھوٹا سمجھا جاؤں گا، اور بعض روایات میں ہے کہ اُن کی قوم میں یہ رسم جاری تھی کہ کسی کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا (مظہری)[1] اس سے حضرت یونس علیہ السلام کو اپنی جان کا بھی خطرہ لاحق ہو گیا تو) یونس علیہ السلام نے اپنی قوم میں واپس جانے کے بجائے کسی دوسری جگہ کو ہجرت کرنے کے قصد سے سفر اختیار کیا، راستہ میں دریا تھا اس کو پار کرنے کے لئے ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اتفاق سے کشتی ایسے گرداب میں پھنسی کہ غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا ملّاحوں نے یہ طے کیا کہ کشتی میں سوار لوگوں میں سے ایک کو دریا میں ڈال دیا جائے تو باقی لوگ غرقابی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اس کام کے لئے کشتی والوں کے نام پر قرعہ اندازی کی گئی اتفاق سے قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام پر نکل آیا (کشتی والے شاید ان کی بزرگی سے واقف تھے) ان کو دریا میں ڈالنے سے انکار کیا اور دوبارہ قرعہ ڈالا پھر بھی اس میں نام یونس علیہ السلام کا نکلا، ان کو پھر بھی تأمل ہوا تو تیسری مرتبہ قرعہ ڈالا پھر بھی اُنہیں کا نام نکل آیا۔ اسی قرعہ اندازی کا ذکر قرآن کریم میں دوسری جگہ ان الفاظ سے آیا ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ (الصّٰفّٰت) یعنی قرعہ اندازی کی گئی تو یونس علیہ السلام ہی اس قرعہ میں متعین ہوئے۔ اس وقت یونس علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور اپنے غیر ضروری کپڑے اُتار کر اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا اُدھر حق تعالیٰ نے بحر اخضر سے ایک مچھلی کو حکم دیا وہ دریاؤں کو چیرتی پھاڑتی فوراً یہاں پہنچ گئی (کما قاله ابن مسعودؓ) اور یونس علیہ السلام کو اپنے اندر لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو یہ ہدایت فرما دی تھی کہ نہ ان کے گوشت کو کوئی نقصان پہنچے نہ ہڈی کو یہ تیری غذا نہیں بلکہ تیرا پیٹ چند روز کے لئے ان کا قید خانہ ہے (یہاں تک یہ سب واقعہ روایت ابن کثیر[2] میں ہے بجز اُن کلمات کے جو قوسین میں لئے گئے ہیں وہ دوسری کتابوں سے لئے ہوئے ہیں) قرآن کریم کے اشارات اور بعض تصریحات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:٦ ص:٢٣٢

[2] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:٥ ص:٣٦٦

حضرت یونس علیہ السلام کا بغیر اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہوا اسی پر عتاب نازل ہوا اور دریا میں پھر مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی نوبت آئی۔

حضرت یونس علیہ السلام نے جو قوم کو تین دن کے اندر عذاب آجانے سے ڈرایا تھا ظاہر یہ ہے کہ یہ اپنی رائے سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہوا تھا اور اس وقت قوم کو چھوڑ کر ان سے الگ ہو جانا بھی جو قدیم عادت انبیاء علیہم السلام کی ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی بحکم خداوندی ہوا ہوگا یہاں تک کوئی بات لغزش کی موجب عتاب نہیں تھی مگر جب قوم کی سچّی توبہ اور الحاح وزاری کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان سے عذاب ہٹا دیا اُس وقت حضرت یونس علیہ السلام کا اپنی قوم میں واپس نہ آنا اور بقصدِ ہجرت سفر اختیار کرنا یہ اپنے اس اجتہاد کی بنا پر ہوا کہ اس حالت میں اگر میں واپس اپنی قوم میں گیا تو جھوٹا سمجھا جاؤں گا اور میری دعوت بے اثر بے فائدہ ہو جائے گی بلکہ اپنی جان کا بھی خطرہ ہے اور اگر میں اُن کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ مواخذہ وگرفت نہیں ہوگی۔ اپنے اجتہاد کی بنا پر ہجرت کا قصد کر لینا اور اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کا انتظار نہ کرنا اگرچہ کوئی گناہ نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ کو یونس علیہ السلام کا یہ طرزِ عمل پسند نہ آیا کہ وحی کا انتظار کئے بغیر ایک فیصلہ کر لیا یہ اگرچہ کوئی گناہ نہیں تھا مگر خلافِ اولیٰ ضرور ہوا۔ انبیاء علیہم السلام اور مقربانِ بارگاہِ الٰہی کی شان بہت بُلند ہوتی ہے اُن کو مزاج شناس ہونا چاہئے، اُن سے اس معاملے میں اَدنیٰ کوتاہی ہوتی ہے تو اس پر بھی عتاب اور گرفت ہوتی ہے یہی معاملہ تھا جس پر عتاب ہوا۔

تفسیر قرطبی میں قشیری سے بھی یہ نقل کیا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ صورتِ غضب یونس علیہ السلام کی اُس وقت پیش آئی جبکہ قوم سے عذاب ہٹ گیا ان کو یہ پسند نہ تھا، اور مچھلی کے پیٹ میں چندروز رہنا بھی کوئی تعذیب نہیں بلکہ تادیب کے طور پر تھا جیسے اپنے نابالغ بچّوں پر زجر وتنبیہ تعذیب نہیں ہوتی تادیب ہوتی ہے تاکہ آئندہ وہ احتیاط برتیں (قرطبی) [۱] واقعہ سمجھ لینے کے بعد آیاتِ مذکورہ کے الفاظ کی تفسیر دیکھئے:

ذَهَبَ مُغَاضِبًا، یعنی چلے گئے غصّے میں آکر، ظاہر ہے کہ مراد اس سے اپنی قوم پر غصّہ ہے حضرت ابنِ عباسؓ سے یہی منقول ہے اور جن حضرات نے **مُغَاضِبًا** کا مفعول رَبّ کو قرار دیا ہے اُن کی مراد بھی مُغَاضِبًا لِرَبِّہٖ ہے یعنی اپنے رَبّ کے لئے غصّے میں بھر کر چل دیئے اور کفار وفجّار سے اللہ کے لئے غصّہ کرنا عین علامتِ ایمان ہے۔ (کذا فی القرطبی والبحر المحیط) [۲]

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ، لفظ **نَقْدِرُ** میں باعتبار لغت ایک احتمال یہ ہے کہ مصدر قدرت سے مشتق ہو تو معنے یہ ہوں

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۱ ص:۳۳۰، ۳۳۱

[۲] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۱۸۴، والقرطبی ج:۱۱ ص:۳۲۹

گے کہ اُنھوں نے یہ گمان کرلیا کہ ہم اُن پر قدرت اور قابو نہ پاسکیں گے ظاہر ہے کہ یہ بات کسی پیغمبر سے تو کیا کسی مسلمان سے بھی اس کا گمان نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسا سمجھنا کفر صریح ہے اس لئے یہاں یہ معنے قطعاً نہیں ہوسکتے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مصدر قَدْر سے مشتق ہو جس کے معنے تنگی کرنے کے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ (العنکبوت: ۶۲) یعنی اللہ تعالیٰ وسعت کردیتا ہے رزق میں جس کے لئے چاہے اور تنگ کردیتا ہے جس پر چاہے۔ ائمہ تفسیر میں سے عطاء، سعید بن جبیر، حسن بصری، اور بہت سے علماء نے یہی معنے اس آیت میں لئے ہیں اور مراد آیت کی یہ قرار دی کہ حضرت یونس علیہ السلام کو اپنے قیاس واجتہاد سے یہ گمان تھا کہ ان حالات میں اپنی قوم کو چھوڑ کر کہیں چلے جانے کے بارے میں مجھ پر کوئی تنگی نہیں کی جائے گی۔ اور تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ قَدْر بمعنے تقدیر سے مشتق ہے جس کے معنے قضاء اور فیصلہ دینے کے ہیں تو معنے آیت کے یہ ہوں گے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو یہ گمان ہوگیا کہ اس معاملہ میں مجھ پر کوئی گرفت اور مواخذہ نہیں ہوگا۔ ائمہ تفسیر میں سے قتادہ اور مجاہد اور فرّاء نے اسی معنے کو اختیار کیا ہے۔ بہرحال پہلے معنے کا تو اس جگہ کوئی احتمال نہیں دوسرے یا تیسرے معنے ہوسکتے ہیں۔

دُعائے یونس علیہ السلام ہر شخص کے لئے ہر زمانے میں ہر مقصد کے لئے مقبول ہے

وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ یعنی جس طرح ہم نے یونس علیہ السلام کو غم اور مصیبت سے نجات دی اسی طرح ہم سب مؤمنین کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں جبکہ وہ صدق واخلاص کے ساتھ ہماری طرف متوجہ ہوں اور ہم سے پناہ مانگیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذوالنون کی وہ دُعا جو اُنہوں نے بطنِ ماہی کے اندر کی تھی یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ جو مسلمان اپنے کسی مقصد کے لئے ان کلمات کے ساتھ دُعا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں گے۔ (رواہ احمد والترمذی والحاکم صححہ من حدیث سعد بن ابی وقاص۔ ازمظہری)[1]

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ۚ

اور زکریا کو جب پکارا اُس نے اپنے ربّ کو، اے ربّ نہ چھوڑ تو مجھ کو اکیلا اور تو ہے سب سے بہتر وارث

[1] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۲۳۳، ۲۳۴، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحدیث:۱۸۶۲، کتاب الدعاء إلخ، ومسند احمد رقم الحدیث:۱۴۶۹، مسند سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، وجامع الترمذی، ابواب الدعوات، بابٌ (دعوۃ ذی النون فی بطن الحوت) ج:۲ ص:۱۸۸

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَ وَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ

پھر ہم نے سُن لی اس کی دُعا اور بخشا اس کو یحییٰ اور اچھا کردیا اس کی عورت کو

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ

وہ لوگ دوڑتے تھے بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو توقع سے اور ڈر سے

وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور تھے ہمارے آگے عاجز

آسان ترجمۂ قرآن

اور زکریا کو دیکھو! جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ: ''یا ربّ! مجھے اکیلا نہ چھوڑیئے، اور آپ سب سے بہتر وارث ہیں۔'' ﴿۸۹﴾ چنانچہ ہم نے ان کی دُعا قبول کی، اور ان کو یحییٰ (جیسا بیٹا) عطا کیا، اور ان کی خاطر ان کی بیوی کو اچھا کردیا۔ یقیناً یہ لوگ بھلائی کے کاموں میں تیزی دِکھاتے تھے، اور ہمیں شوق اور رُعب کے عالم میں پکارا کرتے تھے، اور ان کے دِل ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔ ﴿۹۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور زکریا (علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جب کہ اُنہوں نے اپنے رَبّ کو پکارا کہ اے میرے رَبّ مجھ کو لاوارث نہ رکھیو (یعنی مجھ کو فرزند دیجئے جو میرا وارث ہو) اور (یوں تو) سب وارثوں سے بہتر (یعنی حقیقی وارث) آپ ہی ہیں (اس لئے فرزند بھی وارث حقیقی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت وہ بھی فنا ہوجائے گا لیکن اس ظاہری وارث سے بعض دینی فوائد اور منافع حاصل ہوجائیں گے اس لئے اس کی طلب ہے) سو ہم نے ان کی دُعا قبول کرلی اور ہم نے ان کو یحییٰ (فرزند) عطا فرمایا اور ان کی خاطر سے اُن کی بی بی کو بھی (جو بانجھ تھیں) اولاد کے قابل کردیا یہ سب (انبیاء جن کا اس سورت میں ذکر ہوا ہے) نیک کاموں میں دوڑتے تھے اور اُمید وبیم کے ساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے دَب کر رہتے تھے۔

معارف ومسائل

حضرت زکریا علیہ السلام کی خواہش تھی کہ ایک فرزند وارث عطا ہو اُس کی دُعا مانگی مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ کہ بیٹا ملے یا نہ ملے ہر حال میں آپ تو بہتر وارث ہیں یہ پیغمبرانہ رعایتِ ادب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اصل توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہونا چاہئے غیر اللہ کی طرف اُن کی توجہ ہو بھی تو اصل مرکز سے نہ ہٹنے پائے۔

يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وہ رغبت وخوف یعنی راحت اور تکلیف کی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی عبادت ودُعا کے وقت اُمید وبیم دونوں کے درمیان رہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے قبول اور ثواب کی اُمید بھی رہتی ہے اور اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے خوف بھی۔ (قرطبی) [1]

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا

اور وہ عورت جس نے قابو میں رکھی اپنی شہوت پھر پھونک دی ہم نے اُس عورت میں اپنی روح اور کیا اس کو

وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور اس کے بیٹے کو نشانی جہان والوں کے واسطے

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُس خاتون کو دیکھو جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اُس کے اندر اپنی رُوح پھونکی، اور اُنہیں اور اُن کے بیٹے کو دُنیا جہان کے لوگوں کے لئے ایک نشانی بنادیا۔ ﴿۹۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اُن بی بی (مریم کے قصہ) کا بھی تذکرہ کیجئے جنہوں نے اپنے ناموس کو (مُردوں سے) بچایا (نکاح سے بھی اور ناجائز سے بھی) پھر ہم نے اُن میں (بواسطہ جبرئیل علیہ السلام) اپنی روح پھونک دی (جس سے اُن کو بے شوہر کے حمل رہ گیا) اور ہم نے ان کو اور اُن کے فرزند (عیسیٰ علیہ السلام) کو دُنیا جہان والوں کے لئے (اپنی قدرتِ کاملہ کی) نشانی بنادیا

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۳۳۶

(کہ اُن کو دیکھ سُن کر سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ بغیر باپ کے بھی اولاد پیدا کرسکتا ہے اور بغیر ماں اور باپ کے بھی جیسا کہ آدم علیہ السلام)۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾

یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں ربّ تمہارا سو میری بندگی کرو

وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع فَمَنْ يَّعْمَلْ

اور ٹکڑے ٹکڑے بانٹ لیا لوگوں نے آپس میں اپنا کام، سب ہمارے پاس پھر آئیں گے سو جو کوئی کرے

مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

کچھ نیک کام اور وہ رکھتا ہو ایمان سو اکارت نہ کریں گے اس کی سعی کو اور ہم اس کو لکھ لیتے ہیں

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ

اور مقرر ہو چکا ہر بستی پر جس کو غارت کر دیا ہم نے کہ وہ پھر کر نہیں آئیں گے یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں

يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ

یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر اوچان سے پھسلتے چلے آئیں اور نزدیک آلگے

الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا

سچا وعدہ پھر اُس دم اوپر لگی رہ جائیں منکروں کی آنکھیں ہائے کم بختی ہماری

قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ

ہم بے خبر رہے اس سے، نہیں، پر ہم تھے گنہگار، تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ

اللہ کے سوائے ایندھن ہے دوزخ کا تم کو اُس پر پہنچنا ہے اگر ہوتے یہ بُت

اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا

معبود تو نہ پہنچتے اُس پر اور سارے اس میں سدا پڑے رہیں گے اُن کو وہاں چلّانا ہے اور وہ اس میں

لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا

کچھ نہ سُنیں گے جن کے لئے پہلے سے ٹھہرچکی ہماری طرف سے نیکی وہ اُس سے

مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ

دُور رہیں گے نہیں سُنیں گے اُس کی آہٹ اور وہ اپنے جی کے مزوں میں

خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ

سدا رہیں گے نہ غم ہوگا اُن کو اس بڑی گھبراہٹ میں اور لینے آئیں گے اُن کو فرشتے

هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ

آج دن تمہارا ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا جس دن ہم لپیٹ لے ویں آسمان کو

كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ

جیسے لپیٹتے ہیں طومار میں کاغذ جیسا سرے سے بنایا تھا ہم نے پہلی بار، پھر اس کو دہرائیں گے، وعدہ ضرور ہو چکا ہے ہم پر

اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ

ہم کو پورا کرنا ہے اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے میرے نیک بندے

آسان ترجمۂ قرآن

(لوگو!) یقین رکھو کہ یہ (دِین جس کی یہ تمام انبیاء دعوت دیتے رہے ہیں) تمہارا دِین ہے جو ایک ہی دِین ہے، اور میں تمہارا پروردگار ہوں، لہٰذا تم میری عبادت کرو۔ ﴿۹۲﴾ اور لوگوں نے اپنے دِین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے بانٹ لیا، (مگر) سب ہمارے پاس لوٹ کر آنے والے ہیں۔ ﴿۹۳﴾ پھر جو مؤمن بن کر نیک عمل کرے گا تو اُس کی کوشش کی ناقدری نہیں ہوگی، اور ہم اُس کوشش کو لکھتے جاتے ہیں۔ ﴿۹۴﴾ اور جس کسی بستی (کے لوگوں) کو ہم نے ہلاک کیا ہے، اُس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ پلٹ کر (دُنیا میں) آجائیں، ﴿۹۵﴾ یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کو کھول دیا جائے گا، اور وہ ہر بلندی سے پھسلتے نظر آئیں گے، ﴿۹۶﴾ اور سچا وعدہ پورا ہونے کا وقت قریب آجائے گا تو اچانک حالت یہ ہوگی کہ جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا تھا اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، (اور وہ کہیں گے کہ:) ”ہائے ہماری کم بختی! ہم اس چیز سے بالکل ہی غفلت میں تھے، بلکہ ہم نے بڑے ستم ڈھائے تھے۔“ ﴿۹۷﴾ (اے شرک کرنے والو!) یقین رکھو کہ تم اور جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ تمہیں اسی جہنم میں جا اُترنا ہے۔ ﴿۹۸﴾ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو اُس (جہنم) میں نہ جاتے۔ اور سب کے سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۹۹﴾ وہاں اُن کی چیخیں نکلیں گی، اور وہاں وہ کچھ سن نہیں سکیں گے۔ ﴿۱۰۰﴾ (البتہ) جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے بھلائی پہلے سے لکھی جا چکی ہے، (یعنی نیک مؤمن) اُن کو اُس جہنم سے دُور رکھا جائے گا۔ ﴿۱۰۱﴾ وہ اُس کی سرسراہٹ بھی نہیں سنیں گے، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من پسند چیزوں کے درمیان رہیں گے۔ ﴿۱۰۲﴾ اُن کو وہ (قیامت کی) سب سے بڑی پریشانی غمگین نہیں کرے گی، اور فرشتے اُن کا (یہ کہہ کر) استقبال کریں گے (کہ:) ”یہ تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔“ ﴿۱۰۳﴾ اُس دن (کا دھیان رکھو) جب ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے کاغذوں کے طومار میں تحریریں لپیٹ دی جاتی ہیں۔ جس طرح ہم نے پہلی بار تخلیق کی ابتدا کی تھی، اسی طرح ہم اُسے دوبارہ پیدا کردیں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنے کا ہم نے ذمہ لیا ہے۔ ہمیں یقیناً یہ کام کرنا ہے۔ ﴿۱۰۴﴾ اور ہم نے زَبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ ﴿۱۰۵﴾

خلاصۂ تفسیر

ربط آیات

یہاں تک انبیاء علیہم السلام کے قصص اور واقعات اور اُن کے ضمن میں بہت سے اُصولی اور فروعی مسائل کا بیان تھا۔ اُصول مثلاً توحید ورسالت اور عقیدۂ آخرت، سب انبیاء علیہم السلام میں اُصول مشترک ہیں جو اُن کی دعوت کی بنیاد ہے جیسا کہ واقعاتِ مذکورہ میں ان حضرات کی سب کوششوں کا محور توحیدِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا مضمون تھا۔ اگلی آیات میں بطور نتیجۂ قصص توحید کا اثبات اور شرک کی مذمت کا بیان ہے:

اے لوگو! (اُوپر جو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ وعقیدہ توحید کا معلوم ہو چکا ہے) یہ تمہارا طریقہ ہے (جس پر تم کو رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے (جس میں کسی نبی اور کسی شریعت کو اختلاف نہیں ہوا) اور (حاصل اس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمہارا رَبّ ہوں تو تم میری عبادت کیا کرو اور (لوگوں کو چاہیئے تھا کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتابیں اور شریعتیں اسی طریقہ کی داعی ہیں تو وہ بھی اسی طریقہ پر رہتے مگر ایسا نہ کیا بلکہ) ان لوگوں نے اپنے دین میں اختلاف پیدا کرلیا (مگر اس کی سزا دیکھیں گے کیونکہ) سب ہمارے پاس آنے والے ہیں (اور آنے کے بعد ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا) تو جو شخص نیک کام کرتا ہوگا اور وہ ایمان والا بھی ہوگا تو اس کی محنت اکارت جانے والی نہیں اور ہم اس کو لکھ لیتے ہیں (جس میں بھول اور خطا کا امکان نہیں رہتا اُس لکھے ہوئے کے مطابق اس کو ثواب ملے گا) اور (ہم نے جو یہ کہا کہ سب کے سب ہمارے پاس آنے والے ہیں اس میں منکرین یہ شبہ کرتے ہیں کہ دُنیا کی اتنی عمر گزر چکی ہے اب تک تو ایسا ہوا نہیں کہ مُردے زندہ ہوئے ہوں اُن کا حساب ہوا ہو، اُن کا یہ شبہ اس لئے غلط ہے کہ اللہ کی طرف لوٹنے کے لئے ایک دن قیامت کا مقرر ہے اُس سے پہلے کوئی نہیں لوٹتا، یہی وجہ ہے کہ) ہم جن بستیوں کو (عذاب یا موت سے) فنا کر چکے ہیں اُن کے لئے یہ بات (بامتناع شرعی) ناممکن ہے کہ وہ (دُنیا میں حساب کتاب کے لئے) پھر لوٹ کر آئیں (مگر یہ نہ لوٹنا دائمی نہیں بلکہ وقت موعود یعنی قیامت تک ہے) یہاں تک کہ جب (وہ وقت موعود آپہنچے گا جس کا ابتدائی سامان یہ ہوگا کہ) یاجوج ماجوج (جن کا اب سد ذوالقرنین کے ذریعہ راستہ رُکا ہوا ہے وہ) کھول دیئے جائیں گے اور وہ (انتہائی کثرت کے سبب) ہر بلندی (ٹیلہ اور پہاڑ) سے نکلتے (معلوم) ہوں گے اور (اللہ کی طرف لوٹنے کا سچا وعدہ) نزدیک آپہنچا ہوگا تو بس پھر یکایک یہ حالت ہوجائے گی کہ منکروں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی (اور وہ یوں کہتے نظر

آئیں گے) ہائے ہماری کم بختی ہم اس سے غفلت میں تھے (پھر کچھ سوچ کر کہیں گے کہ اس کو غفلت تو جب کہا جا سکتا ہے کہ کسی نے ہمیں آگاہ نہ کیا ہوتا) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم ہی قصوروار تھے (حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے وہ بھی اس وقت اس کے قائل ہو جائیں گے، آگے مشرکین کے لئے وعید ہے) بلاشبہ تم اور جس کو تم خدا کے سوا پوج رہے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے (اور) تم سب اس میں داخل ہو گے (اس میں وہ انبیاء اور فرشتے داخل نہیں ہو سکتے جن کو دُنیا میں بعض مشرکین نے خدا اور معبود بنالیا تھا کیونکہ اُن میں ایک مانع شرعی موجود ہے کہ وہ اس کے مستحق نہیں اور نہ ان کا اس میں کوئی قصور ہے آگے آیت میں اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ سے بھی اس شبہ کو دفع کیا گیا ہے اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ) اگر (یہ تمہارے معبود) واقعی معبود ہوتے، تو اس (جہنم) میں کیوں جاتے اور (جانا بھی ایسا کہ چند روزہ نہیں بلکہ) سب (عابدین اور معبودین) اس میں ہمیشہ کو رہیں گے (اور) اُن کا اس میں شور وغل ہوگا اور وہاں (اپنے شور وغل میں) کسی کی کوئی بات سُنیں گے بھی نہیں (یہ تو دوزخیوں کا حال ہوا اور) جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی مقدر ہو چکی ہے (اور اس کا ظہور اُن کے اعمال وافعال میں ہوا) وہ لوگ اس (دوزخ) سے (اس قدر) دُور رکھے جائیں گے کہ اس کی آہٹ بھی نہ سُنیں گے (کیونکہ یہ لوگ جنت میں ہوں گے اور جنت دوزخ میں بڑا بُعد ہے) اور وہ لوگ اپنی جی چاہی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے (اور) ان کو بڑی گھبراہٹ (یعنی قیامت میں زندہ ہونے اور محشر کے ہولناک مناظر دیکھنے کی حالت) غم میں نہ ڈالے گی اور (قبر سے نکلتے ہی) فرشتے ان کا استقبال کریں گے (اور کہیں گے) یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (یہ اکرام کا معاملہ اور بشارت اُن کے لئے زیادہ خوشی ومسرّت کا سبب ہو جائے گا اور اگر کسی روایت سے یہ ثابت ہو جائے کہ قیامت کے ہول اور خوف سے کوئی مستثنیٰ نہیں سب کو پیش آئے گا تو چونکہ نیک بندوں کے لئے اس کا زمانہ بہت قلیل ہوگا اس لئے وہ کالعدم ہے اور) وہ دن (بھی) یاد کرنے کے قابل ہے، جس روز ہم (نفخۂ اولیٰ کے بعد) آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضامین کا کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے (پھر لپیٹنے کے بعد خواہ معدوم محض کر دیا جائے یا نفخۂ ثانیہ تک اسی حالت پر رہے دونوں باتیں ممکن ہیں اور) ہم نے جس طرح اوّل بار پیدا کرنے کے وقت (ہر چیز کی) ابتداء کی تھی اسی طرح (آسانی سے) اس کو دوبارہ پیدا کر دیں گے یہ ہمارے ذمّہ وعدہ ہے ہم ضرور (اس کو پورا) کریں گے اور (اوپر جو نیک بندوں سے ثواب ونعمت کا وعدہ ہوا ہے وہ بہت قدیم اور مؤکد وعدہ ہے چنانچہ) ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوحِ محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے (قدامت اس وعدہ کی تو اس سے ظاہر ہے کہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور تاکید اس بات سے ہے کہ کوئی آسمانی کتاب اس سے خالی نہیں)۔

معارف ومسائل

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ اس جگہ لفظ حرام بمعنے ممتنع شرعی کے ہے جس کا ترجمہ خلاصۂ تفسیر میں ناممکن سے کیا گیا ہے اور لَا يَرْجِعُوْنَ میں اکثر حضرات مفسرین کے نزدیک حرف لَا زائد ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ جو بستی اور اس کے آدمی ہم نے ہلاک کر دیئے ہیں ان کے لئے محال ہے کہ وہ پھر لوٹ کر دُنیا میں آجائیں اور بعض حضرات مفسرین نے لفظ حرام کو اس جگہ بمعنی واجب قرار دے کر لَا کو اپنے معروف معنی نفی کے لئے رکھا ہے اور مفہوم آیت کا یہ لکھا ہے کہ واجب ہے اس بستی پر جس کو ہم نے عذاب سے ہلاک کر دیا ہے کہ وہ دُنیا میں نہیں لوٹیں گے (قرطبی) [1] آیت کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی دُنیا میں آکر عمل صالح کرنا چاہے تو اس کا موقع نہیں ملے گا، اب تو صرف روز قیامت کی زندگی ہوگی۔

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ لفظ حَتّٰى سابق مضمون پر تفریع وترتیب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آیت سابقہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جو لوگ کفر پر مر چکے ہیں اُن کا دوبارہ دُنیا میں زندہ ہو کر لوٹنا ناممکن ہے اس عدم امکان کی انتہا یہ بتلائی گئی کہ دوبارہ زندہ ہو کر لوٹنا ناممکن اُس وقت تک ہے جب تک کہ یہ واقعہ یاجوج ماجوج کا پیش نہ آجائے جو قیامت کی قریبی علامت ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ ہم چند صحابہ ایک روز آپس میں کچھ مذاکرہ کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، دریافت فرمایا کہ کیا مذاکرہ تمہارے درمیان جاری ہے ہم نے عرض کیا کہ قیامت کا ذکر کر رہے ہیں آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دس علامتیں اُس سے پہلے ظاہر نہ ہو جائیں۔ ان دس علامتوں میں خروج یأجوج مأجوج کا بھی ذکر فرمایا۔ [2]

آیت میں یأجوج مأجوج کے لئے لفظ فُتِحَتْ یعنی کھولنا استعمال فرمایا گیا ہے جس کے ظاہری معنے یہی ہیں کہ اس وقت سے پہلے وہ کسی بندش اور رکاوٹ میں رہیں گے قربِ قیامت کے وقت جب اللہ تعالیٰ کو اُن کا نکلنا منظور ہوگا تو یہ بندش راستے سے ہٹادی جائے گی۔ اور ظاہر قرآن کریم سے یہ ہے کہ رکاوٹ سدِّ ذوالقرنین ہے جو قربِ قیامت میں ختم ہو جائے گی خواہ اس سے پہلے بھی وہ ٹوٹ چکی ہو مگر اُن کے لئے بالکل راستہ ہموار اُسی وقت ہوگا۔ سورۂ کہف میں یأجوج مأجوج اور سدِّ ذوالقرنین کے محل وقوع اور دوسرے متعلقہ مسائل پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ لفظ حَدَب ہر اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے وہ بڑے پہاڑ ہوں یا چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۱ ص:۳۴۰

[2] صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، فصل من اشراط الساعة خروج یأجوج ومأجوج ج:۲ ص:۳۸۸

سورۂ کہف میں جہاں یاجوج ماجوج کے محل وقوع پر گفتگو کی گئی ہے اس سے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی جگہ دُنیا کے شمالی پہاڑوں کے پیچھے ہے اس لئے خروج کے وقت اسی طرف سے پہاڑوں ٹیلوں سے اُمنڈتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ یعنی تم اور تمہارے معبود بجز اللہ کے سب کے سب جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اس آیت میں تمام معبوداتِ باطلہ جن کی ناجائز پرستش کفار کے مختلف گروہوں نے دُنیا میں کی سب کا جہنم میں داخل ہونا بیان فرمایا گیا ہے اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ناجائز عبادت تو حضرت مسیحؑ اور عزیرؑ اور فرشتوں کی بھی کی گئی ہے تو سب کے جہنم میں جانے کا کیا مطلب ہوگا؟ اس کا جواب حضرت ابنِ عباسؓ نے دیا ہے اُن کی روایت تفسیر قرطبی میں اس طرح ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن کی ایک آیت ایسی ہے جس میں لوگ شبہات کرتے ہیں مگر عجیب اتفاق ہے کہ اس کے متعلق لوگ مجھ سے سوال نہیں کرتے، معلوم نہیں کہ شبہات کا جواب ان لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے اس لئے سوال نہیں کرتے یا انہیں شبہ اور جواب کی طرف التفات ہی نہیں ہوا۔ لوگوں نے عرض کیا وہ کیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ وہ آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ الآیۃ ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار قریش کو سخت ناگوار ہوا اور کہنے لگے کہ اس میں تو ہمارے معبودوں کی سخت توہین کی گئی ہے یہ لوگ (عالمِ اہل کتاب) ابن الزبعری کے پاس گئے اور اس کی شکایت کی اُس نے کہا کہ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو ان کو اس کا جواب دیتا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیا جواب دیتے، اس نے کہا کہ میں اُن سے کہتا کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کی اور یہود حضرت عُزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اُن کے بارے میں آپ کیا کہیں گے (کیا معاذ اللہ وہ بھی جہنم میں جائیں گے) کفار قریش یہ سن کر بڑے خوش ہوئے کہ واقعی یہ بات تو ایسی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو آگے آتی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے بھلائی اور اچھا نتیجہ مقدر ہو چکا ہے وہ اس جہنم سے بہت دُور رہیں گے۔

اور اسی ابن الزبعری کے متعلق قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ (الزخرف) یعنی جب ابن زبعری نے حضرت ابن مریم کی مثال پیش کی تو آپ کی قوم کے لوگ قریش خوشی سے شور مچانے لگے۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ فزع اکبر سے مراد صور کا نفخۂ ثانیہ ہے جس سے سب مردے زندہ ہوکر حساب کے لئے کھڑے ہوں گے بعض حضرات نے نفخۂ اُولیٰ کو فزع اکبر قرار دیا ہے۔ ابن عربی کا قول یہ ہے کہ نفخات تین ہوں گے پہلا نفخہ نفخۂ فزع ہوگا جس سے ساری دُنیا کے لوگ گھبرا اُٹھیں گے اسی کو یہاں فزع اکبر

کہا گیا ہے۔ دوسرا نفخہ نفخۂ صعق ہوگا جس سے سب مرجائیں گے اور فنا ہوجائیں گے، تیسرا نفخہ نفخۂ بعث ہوگا جس سے مُردے زندہ ہوجائیں گے۔ اس کی شہادت میں مسند ابویعلی اور بیہقی، عبد بن حمید، ابوالشیخ، ابن جریر طبری وغیرہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث نقل کی گئی ہے۔ (مظہری) [۱] واللہ اعلم

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۖ لفظ سجل کے معنے حضرت ابن عباسؓ سے صحیفہ کے منقول ہیں۔ علی بن طلحہ، عوفی، مجاہد، قتادہ وغیرہ نے بھی یہی معنی بیان کئے ہیں۔ ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور کُتُبْ اس جگہ بمعنے المکتوب ہے معنی یہ ہیں کہ آسمان کو اس طرح لپیٹ دیا جائے گا جس طرح کوئی صحیفہ اپنے اندر لکھی ہوئی تحریر کے ساتھ لپیٹ دیا جاتا ہے (کذا قالہ ابن کثیر وذکرہ فی الروح) سجل کے متعلق دوسری روایات کہ وہ کسی شخص یا فرشتہ کا نام ہے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں (فصلہ ابن کثیر) [۲] آیت کے مفہوم کے متعلق صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سب زمینوں اور آسمانوں کو لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں رکھیں گے [۳] ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کو ان کے اندر کی تمام مخلوقات کے ساتھ اور ساتوں زمینوں کو ان کی تمام مخلوقات کے ساتھ لپیٹ کر ایک جگہ کردیں گے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک رائی کے دانے کی مثل ہوں گے۔ (ابن کثیر) [۴]

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُونَ ﴿١٠٥﴾

لفظ زَبُوْر، زُبُرْ کی جمع ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں، اور زَبُوْر اُس خاص کتاب کا نام بھی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اس جگہ زَبُوْر سے کیا مراد ہے؟ اس میں اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ذِکْر سے مراد آیت میں تورات ہے اور زَبُوْر سے مراد وہ سب کتابیں ہیں جو تورات کے بعد نازل ہوئیں: انجیل، زَبُورِ داؤد اور قرآن (اخرجه ابن جرير) [۵] یہی تفسیر ضحاک سے بھی منقول ہے۔ اور ابنِ زید نے فرمایا کہ ذِکْر سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور زَبُوْر سے مراد تمام کتابیں جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں، زجاج نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (روح المعانی) [۶]

الْاَرْضَ اس جگہ ارض سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک ارضِ جنت ہے، ابنِ جریر نے ابنِ عباسؓ سے یہ تفسیر نقل کی ہے اور یہی تفسیر مجاہد، ابنِ جُبیر، عکرمہ، سدی اور ابوالعالیہ سے بھی منقول ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ قرآن کی

---

[۱] تفسیر المظهری ج:٦ ص:٢٣٩ تا ٢٤١، وتفسير الطبرى تحت هذه الآية ج:١٨ ص:٥٤٤، ومسند اسحاق بن راهويهٗ رقم الحديث:١٠

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:٥ ص:٣٨٢، ٣٨٣

[۳] صحيح البخاری، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالىٰ خلقت بيدى إلخ ج:٢ ص:١١٠١ [۴] تفسير ابن كثير بحوالۂ بالا۔

[۵] تفسير الطبرى ج:١٨ ص:٥٤٧ [۶] روح المعانی تحت هذه الآية ج:١٢ ص:٨٤

دوسری آیت اسی کی مؤید ہے جس میں فرمایا ہے [1] وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ (الزمر: ۷۴) اور آیت میں جو یہ فرمایا کہ اس ارض کے وارث صالحین ہوں گے، یہ بھی اسی کا قرینہ ہے کہ ارض سے ارض جنت مراد ہو، [2] دُنیا کی زمین کے وارث تو مؤمن کافر سبھی ہوجاتے ہیں۔ نیز یہ کہ یہاں صالحین کا وارثِ ارض ہونا ذکرِ قیامت کے بعد آیا ہے اور قیامت کے بعد جنت کی زمین کے سوا کوئی دوسری زمین نہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس ارض سے مراد عام ارض ہے دُنیا کی زمین بھی اور جنت کی زمین بھی جنت کی زمین کے تو تنہا وارث صالحین ہونا ظاہر ہے۔ دُنیا کی پوری زمین کے وارث ہونا بھی ایک وقت میں مؤمنین صالحین کے لئے موعود ہے جس کی خبر قرآن کریم کی متعدد آیات میں دی گئی ہے۔ ایک آیت میں ہے: [3] اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ (الاعراف) ایک دوسری آیت میں ہے: [4] وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ الآية (النور: ۵۵)، تیسری ایک آیت میں: [5] اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ (المؤمن) مؤمنین صالحین کا دُنیا کے معظم معمورہ پر قابض اور وارث ہونا ایک مرتبہ دنیا پہلے مشاہدہ کرچکی ہے اور زمانہ دراز تک یہ صورت قائم رہی اور پھر مہدی علیہ السلام کے زمانے میں ہونے والی ہے۔ (روح المعانی وابن کثیر) [6]

اِنَّ فِىْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً

اس میں مطلب کو پہنچتے ہیں لوگ بندگی والے اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کرکر

لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ

جہان کے لوگوں پر تو کہہ مجھ کو تو حکم یہی آیا ہے کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے پھر کیا ہو تم

مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ

حکم برداری کرنے والے پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تُو کہدے میں نے خبر کردی تم کو دونوں طرف برابر، اور میں نہیں جانتا

---

[1] ترجمہ: اور ہم کو اس سرزمین کا مالک بنادیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ [2] تفسیر الطبری ج:۱۸ ص:۵۴۹

[3] ترجمہ: یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنادیں اپنے بندوں میں سے اور اخیر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

[4] ترجمہ: تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا۔

[5] ترجمہ: ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی جس میں کہ گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔

[6] تفسیر روح المعانی ج:۱۲ ص:۴۸۴، وابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۳۸۴

اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ

نزدیک ہے یا دُور ہے جو تم سے وعدہ ہوا وہ رَبّ جانتا ہے جو بات پکار کر کرو اور جانتا ہے

مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾

جو تم چھپاتے ہو اور میں نہیں جانتا شاید تاخیر میں تم کو جانچنا ہے اور فائدہ دینا ہے ایک وقت تک

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۷/۱۹ النصف

رسول نے کہا اے رَبّ فیصلہ کر انصاف کا اور رَبّ ہمارا رحمٰن ہے اسی سے مدد مانگتے ہیں ان باتوں پر جو تم بتلاتے ہو

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک اس (قرآن) میں عبادت گذار لوگوں کے لئے کافی پیغام ہے۔ ﴿۱۰۶﴾ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ ﴿۱۰۷﴾ کہہ دو کہ: "مجھ پر تو یہی وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ تو کیا تم اطاعت قبول کرتے ہو؟" ﴿۱۰۸﴾ پھر بھی اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو کہہ دو کہ: "میں نے تمہیں علی الاعلان خبردار کر دیا ہے۔ اور مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ جس (سزا) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ قریب ہے یا دُور۔ ﴿۱۰۹﴾ بیشک اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو بلند آواز سے کہی جاتی ہیں، اور وہ باتیں بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو۔ ﴿۱۱۰﴾ اور میں نہیں جانتا شاید (سزا میں) یہ (تاخیر) تمہارے لئے ایک آزمائش ہے، اور کسی خاص وقت تک کے لئے مزے کرنے کا موقع دینا ہے۔" ﴿۱۱۱﴾ (آخرکار) پیغمبر نے کہا کہ: "اے میرے پروردگار! حق کا فیصلہ کر دیجئے، اور ہمارا پروردگار بڑی رحمت والا ہے، اور جو باتیں تم بناتے ہو، اُن کے مقابلے میں اُسی کی مدد درکار رہے۔" ﴿۱۱۲﴾

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اس (قرآن یا اُس کے جزء یعنی سورتِ مذکورہ) میں کافی مضمون ہے ان لوگوں کے لئے جو عبادت کرنے والے ہیں (اور جو عبادت اور اطاعت سے سرکشی کرنے والے ہیں یہ ہدایت تو اُن کے لئے بھی ہے مگر ان میں ہدایت کی طلب نہیں، اس لئے اس کے فائدے سے محروم ہیں) اور ہم نے آپ کو کسی اور بات کے واسطے (رسول بنا کر) نہیں بھیجا مگر

دُنیا جہان کے لوگوں پر (اپنی) مہربانی کرنے کے لئے (وہ مہربانی یہی ہے کہ لوگ رسول سے ان مضامین کو قبول کریں اور ہدایت کے ثمرات حاصل کریں اور جو قبول نہ کرے وہ اُس کا قصور ہے اُس سے اس مضمون کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا) آپ ان لوگوں سے (بطور خلاصہ کلام کے مکرر) فرما دیجئے کہ میرے پاس تو (موحدین اور مشرکین کے باہمی اختلاف کے بارے میں) صرف یہ وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو (اس کی حقانیت ثابت ہو جانے کے بعد) اب بھی تم مانتے ہو (یا نہیں یعنی اب تو مان لو) پھر بھی اگر یہ لوگ (اس کے قبول کرنے سے) سرتابی کریں تو آپ (بطور اتمامِ حجت کے) فرما دیجئے کہ میں تم کو نہایت واضح اطلاع کر چکا ہوں (جس میں ذرّہ برابر خفا و پوشیدگی نہیں رہی توحید اور حقانیت اسلام کی اطلاع بھی اور اس کے انکار پر جو سزا ملے گی وہ بھی صاف صاف بیان ہو چکی ہے اب نہ مجھ پر تبلیغ حق کی کوئی ذمہ داری باقی رہی نہ تمہارا کوئی عذر باقی رہا) اور اگر (اس کے حق ہونے میں تم کو اس وجہ سے شبہ ہو کہ جو سزا ابتلائی گئی ہے وہ مِل کیوں نہیں جاتی تو سمجھ لو کہ سزا کا ملنا تو یقینی ہے مگر) میں یہ نہیں جانتا کہ جس (سزا) کا تم سے وعدہ ہوا ہے آیا وہ قریب (واقع ہونے والی ہے) یا دُور دراز (زمانے میں واقع ہونے والی) ہے (البتہ اُس کا واقع ہونا ضروری ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تمہاری پکار کر کہی ہوئی بات کی بھی خبر ہے اور جو تم دل میں رکھتے ہو اُس کی بھی خبر ہے اور (تاخیر عذاب سے اس کے واقع نہ ہونے کے دھوکے میں نہ رہنا یہ تاخیر کسی مصلحت و حکمت سے ہو رہی ہے) میں نہیں جانتا (کہ وہ مصلحت کیا ہے ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ) شاید (یہ تاخیر عذاب) تمہارے لئے امتحان ہو (کہ شاید متنبہ ہو کر ایمان لے آئیں) اور ایک وقت (محدود یعنی موت کے وقت) تک فائدہ پہنچانا ہو (کہ خوب غفلت بڑھے اور عذاب بڑھتا چلا جائے۔ پہلا معاملہ یعنی امتحان رحمت ہے اور دوسرا معاملہ یعنی عمر دراز اور اُس کی سہولتیں دینا یہ عقوبت و سزا ہے، اور جب ان سب مضامین سے ہدایت نہ ہوئی تو) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (باذنِ الٰہی) کہا کہ اے میرے رَبّ (ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان) فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ عملی فیصلہ فرما دیجئے کہ مسلمانوں سے جو فتح و نصرت کے وعدے ہیں وہ واقع کر دیجئے تاکہ اُن پر اور زیادہ حجت تمام ہو جائے) اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے یہ بھی فرمایا کہ) ہمارا رَبّ بڑا مہربان ہے جس سے اُن باتوں کے مقابلے میں مدد چاہی جائے جو تم بنایا کرتے ہو (کہ مسلمان جلد نیست و نابود ہو جائیں گے یعنی ہم اُسی مہربان رَبّ سے تمہارے مقابلہ میں مدد چاہتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ عالمین عالم کی جمع ہے جس میں ساری مخلوقات انسان، جن، حیوانات، نباتات، جمادات سبھی داخل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سب چیزوں کے لئے رحمت ہونا اس طرح ہے کہ تمام

کائنات کی حقیقی رُوح اللہ کا ذکر اور اُس کی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت زمین سے یہ رُوح نکل جائے گی اور زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا تو ان سب چیزوں کی موت یعنی قیامت آجائے گی اور جب ذکر اللہ وعبادت کا ان سب چیزوں کی روح ہونا معلوم ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سب چیزوں کے لئے رحمت ہونا خود بخود ظاہر ہوگیا، کیونکہ اس دُنیا میں قیامت تک ذکر اللہ اور عبادت آپ ہی کے دَم قدم اور تعلیمات سے قائم ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ میں اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی رحمت ہوں۔ (اخرجه ابن عساکر عن ابی هريرة) [۱] اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ بُعِثْتُ بِرَفْعِ قَوْمٍ وَخَفْضِ اٰخَرِيْنَ، یعنی میں اللہ کی بھیجی ہوئی رحمت ہوں تاکہ (اللہ کے حکم ماننے والی) ایک قوم کو سربلند کردوں اور دوسری قوم (جو اللہ کا حکم ماننے والی نہیں اُن کو) پست کردوں۔ (ابن کثیر) [۲]

اس سے معلوم ہوا کہ کفر وشرک کو مٹانے کے لئے کفّار کو پست کرنا اور اُن کے مقابلے میں جہاد کرنا بھی عین رحمت ہے جس کے ذریعہ سرکشوں کو ہوش آکر ایمان اور عمل صالح کا پابند ہوجانے کی اُمید کی جاسکتی ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعْلَم۔

تم تفسير سُوْرَةِ الْاَنْبِيَآءِ ولله الحمد ليلة الرّابع والعشرينَ مِنْ ذِي الحجّة الْحرام ۱۳۹۰ھ من الهجرة النّبويّةِ قبلَ العشاء وَله الحَمْدُ اوّلًا واٰخِرًا وظاهرًا وَباطنًا وهو المرجوّ لا تمام الباقي وما ذٰلك عليه بعزيز

رَبّنا تقبّلْ منّا انّكَ انتَ السّميعُ العليمُ

○

---

[۱] المستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث:۹۹، وشعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث:۱۳۸۷

[۲] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۳۸۶، وكنز العمال رقم الحديث:۳۲۰۹۷، وجامع الأحاديث للسيوطيؒ رقم الحديث:۲۷۳۲

سُورَةُ الْحَجّ

آیاتہا ۷۸ | ۲۲ سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۳ | رکوعاتہا ۱۰

سورۂ حج مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھتر آیتیں ہیں اور دس رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①

لوگو ڈرو اپنے ربّ سے بیشک بھونچال قیامت کا ایک بڑی چیز ہے

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ

جس دن اس کو دیکھو گے بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلائے کو اور ڈال دے گی

كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ

ہر پیٹ والی اپنا پیٹ اور تو دیکھے لوگوں پر نشہ اور اُن پر نشہ نہیں پر

عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

آفت اللہ کی سخت ہے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے لوگو! اپنے پروردگار (کے غضب) سے ڈرو۔ یقین جانو کہ قیامت کا بھونچال بڑی زبردست چیز ہے۔ ①
جس دن وہ تمہیں نظر آجائے گا، اُس دن ہر دودھ پلانے والی اُس بچے (تک) کو بھول بیٹھے گی جس کو اُس نے دودھ پلایا، اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا بیٹھے گی، اور لوگ تمہیں یوں نظر آئیں گے کہ وہ نشے میں بدحواس ہیں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوگا۔ ②

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو! اپنے ربّ سے ڈرو (اور ایمان واطاعت اختیار کرو کیونکہ) یقیناً قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی (جس کا آنا ضروری ہے اُس روز کے شدائد سے بچنے کی اب فکر کرو جس کا طریقہ تقویٰ ہے آگے اس زلزلہ کی شدت کا بیان ہے) جس روز تم لوگ اس (زلزلہ) کو دیکھو گے اُس روز (یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والیاں (ہیبت ودہشت کی وجہ سے) اپنے دودھ پیتے (بچہ) کو بھول جائیں گی اور تمام حمل والیاں اپنا حمل (دن پورے ہونے سے پہلے) ڈال دیں گی اور تجھ کو (اے مخاطب) لوگ نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے (کیونکہ وہاں کسی نشہ کی چیز استعمال کرنے کا کوئی امکان واحتمال ہی نہیں) لیکن اللہ کا عذاب ہی سخت چیز ہے (جس کے خوف کی وجہ سے اُن کی حالت نشہ والے کی سی ہوجائے گی)۔

معارف ومسائل

خصوصیات سورت

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین کا اختلاف ہے حضرت ابن عباسؓ ہی سے دونوں روایتیں منقول ہیں، جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ سورت آیاتِ مکیہ اور مدنیہ سے مخلوط سورت ہے، قرطبی نے اِسی کو اصح قرار دیا ہے۔ نیز

فرمایا کہ اس سورت کے عجائب میں سے یہ بات ہے کہ اس کی آیات کا نزول بعض کا رات میں، بعض کا دن میں، بعض کا سفر میں، بعض کا حضر میں، بعض کا مکّہ میں، بعض کا مدینہ میں، بعض کا جنگ و جہاد کے وقت اور بعض کا صلح و امن کی حالت میں ہوا ہے اور اس میں بعض آیتیں ناسخ ہیں اور بعض منسوخ، بعض محکم ہیں بعض متشابہ کیونکہ تمام اصناف تنزیل پر مشتمل ہے۔ [1]

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بحالتِ سفر نازل ہوئی تو آپ نے بلند آواز سے اس کی تلاوت شروع فرمائی، رُفقاءِ سفر صحابۂ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سُن کر جمع ہو گئے، آپ نے صحابۂ کرام کو خطاب کر کے فرمایا کہ زلزلۂ قیامت جس کا ذکر اس آیت میں ہے آپ جانتے ہیں کہ کس دن میں ہوگا؟ صحابۂ کرام نے عرض کیا: اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ دن ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمائیں گے کہ جہنم میں جانے والوں کو اُٹھایئے۔ آدم علیہ السلام دریافت کریں گے کہ وہ جہنم میں جانے والے کون لوگ ہیں؟ تو حکم ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں نو سو ننانوے، اور فرمایا کہ یہی وہ وقت ہوگا کہ ہول اور خوف سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور حمل والی عورتوں کا حمل ساقط ہو جائے گا۔ صحابۂ کرام یہ سُن کر سہم گئے اور پوچھنے لگے: پھر یا رسول اللہ! ہم میں سے وہ کون ہوگا جو نجات پائے؟ تو فرمایا کہ تم بے فکر رہو! جہنم میں جانے والا یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار اور تم میں سے ایک ہوگا۔ یہ مضمون صحیح مسلم وغیرہ کی روایات میں ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے [2] اور بعض روایات میں ہے کہ اُس روز تم ایسی دو مخلوقوں کے ساتھ ہو گے کہ وہ جب کسی جماعت کے ساتھ ہوں تو وہی تعداد میں غالب اور اکثر رہیں گے۔ ایک یاجوج ماجوج اور دوسرے ابلیس اور اس کی ذُرّیت اور اولادِ آدم میں سے جو لوگ پہلے مر چکے ہیں (اس لئے نو سو ننانوے میں بڑی تعداد اُنہیں کی ہوگی) تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ سب روایات نقل کی ہیں۔ [3]

زلزلہ قیامت کب ہوگا؟

قیامت قائم ہونے اور لوگوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد یا اس سے پہلے، بعض نے فرمایا کہ یہ قیامت سے پہلے اسی دُنیا میں ہوگا اور قیامت کی آخری علامت میں شمار ہوگا جس کا ذکر قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں آیا ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ (الزلزال)۔ [4] وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝۱۴ (الحاقۃ)۔ [5] اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ [6]

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱

[2] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان کون هذه الأمّة نصف اهل الجنة ج:۱ ص:۱۱۸، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الحج ج:۲ ص:۱۵۰

[3] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۳، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الحج ج:۲ ص:۱۵۰

[4] ترجمہ: جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جائے گی۔

[5] ترجمہ: اور زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔ [6] ترجمہ: جب کہ زمین کو سخت زلزلہ آئے گا۔

رَجًّا ﴿۴﴾ (الواقعۃ) وغیرہ۔ اور بعض حضرات نے حدیث مذکور جس میں آدم علیہ السلام کو خطاب کرنے کا ذکر ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ زلزلہ حشر ونشر اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں، قیامت سے پہلے زلزلہ ہونا بھی آیاتِ قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اور حشر ونشر کے بعد ہونا اس حدیثِ مذکور سے ثابت ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

اس زلزلہ قیامت کی جو کیفیت آگے آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ تمام حمل والی عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے اور دودھ پلانے والی عورتیں اپنے دودھ پیتے بچّے کو بھول جائیں گی۔ اگر یہ زلزلہ اسی دُنیا میں قبل القیامۃ ہے تو ایسا واقعہ پیش آنے میں کوئی اشکال نہیں اور اگر حشر ونشر قیامت کے بعد ہے تو اُس کی توجیہ یہ ہوگی کہ جو عورت اس دُنیا میں حالتِ حمل میں مری ہے قیامت کے روز اسی حالت میں اس کا حشر ہوگا۔ اور جو دودھ پلانے کے زمانے میں مرگئی ہے وہ اسی طرح بچّے کے ساتھ اُٹھائی جائے گی۔ (کما ذکرہ القرطبی) [1] وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿۳﴾

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں بے خبری سے اور پیروی کرتا ہے ہر شیطان سرکش کی

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾

جس کے حق میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی اس کا رفیق ہو سو وہ اس کو بہکائے اور لے جائے عذاب میں دوزخ کے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ

اے لوگو اگر تم کو دھوکا ہے جی اُٹھنے میں تو ہم نے تم کو بنایا مٹی سے

ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ

پھر قطرہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کی بوٹی نقشہ بنی ہوئی سے اور بدون نقشہ بنی ہوئی سے

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۴

لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ

اس واسطے کہ تم کو کھول کر سنا دیں اور ٹھہرا رکھتے ہیں ہم پیٹ میں جو کچھ چاہیں ایک وقت معین تک پھر تم کو نکالتے ہیں

طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ

لڑکا پھر جب تک کہ پہنچو اپنی جوانی کے زور کو اور کوئی تم میں سے قبضہ کر لیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے پھر چلایا جاتا ہے

إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ

نکمّی عمر تک تاکہ سمجھنے کے پیچھے کچھ نہ سمجھنے لگے اور تو دیکھتا ہے زمین

هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ

خراب پڑی ہوئی پھر جہاں ہم نے اُتارا اُس پر پانی تازی ہوگئی اور اُبھری اور اُگائیں

مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝٥ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ

ہر قسم رونق کی چیزیں یہ سب کچھ اس واسطے کہ اللہ وہی ہے محقق اور وہ جلاتا ہے مُردوں کو

وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝٦ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ

اور وہ ہر چیز کرسکتا ہے اور یہ کہ قیامت آنی ہے اس میں دھوکا نہیں اور یہ کہ

اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ۝٧ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ

اللہ اُٹھائے گا قبروں میں پڑے ہوؤں کو اور بعضا شخص وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کی بات میں بغیر جانے

وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝٨ ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۖ

اور بغیر دلیل اور بدون روشن کتاب کے اپنی کروٹ موڑ کر تاکہ بہکائے اللہ کی راہ سے،

لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹ ذٰلِكَ

اُس کے لئے دُنیا میں رُسوائی ہے اور چکھائیں گے ہم اُس کو قیامت کے دن جلن کی مار یہ اس وجہ سے

بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰ ع

جو آگے بھیج چکے تیرے دو ہاتھ اور اس وجہ سے کہ اللہ نہیں ظلم کرتا بندوں پر

ع ۸

آسان ترجمۂ قرآن

اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بے جانے بوجھے جھگڑے کرتے ہیں، اور اُس سرکش شیطان کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں ۝۳ جس کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی اُسے دوست بنائے گا، تو وہ اُس کو گمراہ کرے گا، اور اُسے بھڑکتی دوزخ کے عذاب کی طرف لے جائے گا۔ ۝۴ اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں کچھ شک ہے تو (ذرا سوچو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر ایک جمے ہوئے خون سے، پھر ایک گوشت کے لوتھڑے سے جو (کبھی) پورا بن جاتا ہے، اور (کبھی) پورا نہیں بنتا، تاکہ ہم تمہارے لئے (تمہاری) حقیقت کھول کر بتا دیں، اور ہم (تمہیں) ماؤں کے پیٹ میں جب تک چاہتے ہیں، ایک متعین مدّت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تمہیں ایک بچے کی شکل میں باہر لاتے ہیں، پھر (تمہیں پالتے ہیں) تاکہ تم اپنی بھرپور عمر تک پہنچ جاؤ، اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو (پہلے ہی) دُنیا سے اٹھا لئے جاتے ہیں، اور تمہی میں سے بعض وہ ہوتے ہیں جن کو بدترین عمر (یعنی انتہائی بڑھاپے) تک لوٹا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی کچھ نہیں جانتے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین مرجھائی ہوئی پڑی ہے، پھر جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آتی ہے، اُس میں بڑھوتری ہوتی ہے، اور وہ ہر قسم کی خوشنما چیزیں اُگاتی ہے۔ ۝۵ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی کا وجود برحق ہے، اور وہی بے جانوں میں جان ڈالتا ہے، اور وہ ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے، ۝۶ اور اس لئے کہ قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اور اس لئے کہ اللہ اُن سب لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا جو قبروں میں ہیں۔ ۝۷ اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑے کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے پاس نہ کوئی علم ہے، نہ ہدایت، اور نہ کوئی روشنی دینے والی کتاب۔ ۝۸ وہ تکبر سے اپنا پہلو اکڑائے ہوئے ہیں، تاکہ دوسروں کو بھی اللہ کے راستے سے گمراہ کریں۔ ایسے ہی شخص کے لئے دُنیا میں رُسوائی ہے، اور قیامت کے دن ہم اُسے جلتی ہوئی آگ کا مزہ چکھائیں گے ۝۹ (کہ) یہ سب کچھ تیرے اُس کرتوت کا

بدلہ ہے جو تو نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا تھا، اور یہ بات طے ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم ڈھانے والا نہیں ہے۔ ⑩

خلاصۂ تفسیر

اور بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں (یعنی اس کی ذات یا صفات یا افعال کے متعلق) بے جانے بوجھے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کے پیچھے ہو لیتے ہیں (یعنی گمراہی کی ایسی قابلیت ہے کہ جو شیطان جس طرح بہکائے اُس کے بہکانے میں آجاتا ہے پس اس شخص میں انتہائی درجہ کی ضلالت ہوئی کہ اس پر ہر شیطان کی دسترس ہو جاتی ہے) جس کی نسبت (خدا کے یہاں سے) یہ بات لکھی جا چکی ہے (اور طے ہو چکی ہے) کہ جو شخص اس سے تعلق رکھے گا (یعنی اس کا اتباع کرے گا) تو اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اس کو (راہِ حق سے) بے راہ کر دے گا اور اس کو عذاب دوزخ کا راستہ دکھلائے گا (آگے ان مجادلین کو خطاب ہے کہ) اے لوگو اگر تم (قیامت کے روز) دوبارہ زندہ ہونے (کے امکان) سے شک میں ہو تو (ذرا مضمون آئندہ میں غور کر لو تا کہ شک رفع ہو جائے اور وہ یہ کہ) ہم نے (اول بار) تم کو مٹی سے بنایا (کیونکہ غذا جس سے نطفہ بنتا ہے اوّل عناصر سے پیدا ہوتی ہے جس میں ایک جز مٹی بھی ہے) پھر نطفہ سے (جو کہ غذا سے پیدا ہوتا ہے) پھر خون کے لوتھڑے سے (کہ نطفہ میں غلظت اور سُرخی آنے سے حاصل ہوتا ہے) پھر بوٹی سے (کہ علقہ میں سختی آجانے سے حاصل ہوتا ہے) کہ (بعضی) پوری ہوتی ہے (کہ اس میں پورے اعضاء بن جاتے ہیں) اور (بعضی) ادھوری بھی (ہوتی ہے کہ بعض اعضاء ناقص رہ جاتے ہیں یہ اس طرح کی ساخت اور ترتیب اور تفاوت اس لئے بنایا) تا کہ ہم تمہارے سامنے (اپنی قدرت) ظاہر کر دیں (اور اسی سے ظاہر ہے کہ وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے) اور (تتمہ اس مضمون کا یہ ہے جس سے اور زیادہ قدرت ظاہر ہوتی ہے کہ) ہم (ماں کے) رحم میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت معیّن (یعنی وضع حمل کے وقت) تک ٹھہرائے رکھتے ہیں (اور جس کو ٹھہرانا نہیں چاہتے ہیں وہاں اسقاط ہو جاتا ہے) پھر (اس مدّتِ معینہ کے بعد) ہم تم کو بچّہ بنا کر (ماں کے پیٹ سے) باہر لاتے ہیں پھر (اس کے بعد تین قسمیں ہو جاتی ہیں ایک قسم یہ کہ تم میں سے بعض کو جوانی تک مہلت دیتے ہیں) تا کہ تم اپنی بھری جوانی (کی عمر) تک پہنچ جاؤ اور بعضے تم میں وہ بھی ہیں جو (جوانی سے پہلے ہی) مر جاتے ہیں (یہ دوسری قسم ہوئی) اور بعضے تم میں وہ ہیں جو نکمّی عمر (یعنی زیادہ بڑھاپے) تک پہنچا دیئے جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتے ہیں (جیسا اکثر بوڑھوں کو دیکھا کہ ابھی ایک بات بتلائی اور ابھی پھر پوچھ رہے ہیں۔ یہ تیسری قسم ہوئی یہ سب احوال بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کی نشانیاں ہیں ایک استدلال تو یہ تھا) اور (آگے دوسرا استدلال ہے کہ) اے مخاطب تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک (پڑی) ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم (یعنی قسم قسم) کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے (سو یہ بھی دلیل

ہے قدرت کاملہ کی، آگے استدلال کواور واضح کرنے کے لئے تصرفات مذکورہ کی علت اور حکمت کا بیان فرماتے ہیں یعنی) یہ (جو کچھ اوپر دونوں استدلالوں کے ضمن میں اشیاء مذکورہ کا ایجاد واظہار مذکور ہوا یہ سب) اس سبب سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہستی میں کامل ہے (یہ تو اس کا کمالِ ذاتی ہے) اور وہ ہی بے جانوں میں جان ڈالتا ہے (یہ اس کا کمال فعلی ہے) اور وہی ہر چیز پر قادر ہے (یہ اس کا کمالِ وصفی ہے اور یہ تینوں اُمور مل کر اُمور مذکورہ کی علت ہیں کیونکہ اگر کمالاتِ ثلاثہ میں سے ایک بھی غیر متحقق ہوتا تو ایجاد نہ پایا جاتا چنانچہ ظاہر ہے) اور (نیز اس سبب سے ہوا کہ) قیامت آنے والی ہے اُس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ (قیامت میں) قبر والوں کو دوبارہ پیدا کرے گا (یہ اُمور مذکورہ کی حکمت ہیں یعنی ہم نے وہ تصرفاتِ مذکورہ اس لئے ظاہر کئے کہ اس میں منجملہ اور حکمتوں کے ایک حکمت اور غایت یہ تھی کہ ہم کو قیامت کا لانا اور مُردوں کو زندہ کرنا منظور تھا تو ان تصرفات سے اُن کا امکان لوگوں پر ظاہر ہو جائے گا پس ایجاد اشیاء مذکورہ کی تین علتیں اور دو حکمتیں مذکور ہوئیں اور سبب بالمعنی الاعم سب کو عام ہوا اس لئے بِاَنَّ اللّٰہَ کی باءِ سببیہ سب پر داخل ہوگئی) اور (یہاں تک تو مجادلین کی گمراہی اور اُس کے رد میں استدلال مذکور تھا آگے ان کا اضلال۔ یعنی دوسروں کو گمراہ کرنا۔ اور دونوں ضلال واضلال کا وبال عظیم مذکور ہوتا ہے) بعضے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں (یعنی اس کی ذات یا صفات یا افعال کے مقدمہ میں) بدون واقفیت (یعنی علم ضروری) اور بدون دلیل (یعنی علم استدلالی عقلی) اور بدون کسی روشن کتاب (یعنی علم استدلالی نقلی) کے (اور دوسرے محقق کے اتباع وتقلید سے) تکبر کرتے ہوئے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ (دوسرے لوگوں کو بھی) اللہ کی راہ سے (یعنی دین حق سے) بے راہ کر دیں ایسے شخص کے لئے دُنیا میں رُسوائی ہے (خواہ کسی قسم کی رُسوائی ہو چنانچہ بعضے گمراہ قتل وقید وغیرہ سے ذلیل ہوتے ہیں بعضے مناظرۂ اہلِ حق میں مغلوب ہو کر عقلاء کی نظر میں بے عزت ہوتے ہیں) اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی آگ کا عذاب چکھائیں گے (اور اُس سے کہا جائے گا) کہ یہ تیرے ہاتھ کے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور یہ بات ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (پس تجھ کو بلا جرم سزا نہیں دی گئی)۔

معارف ومسائل

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ، یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی جو بڑا جھگڑالو تھا، فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں اور قرآن کو پچھلے لوگوں کے افسانے کہا کرتا تھا اور قیامت اور دوبارہ زندہ ہونے کا منکر تھا۔ (کذا رواہ ابن ابی حاتم عن ابی مالک، مظہری) [1]

[1] تفسیر المظهری ج:٦ ص:٢٥٣، وتفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:١٣٦٣٠

نزول آیت کا اگرچہ ایک خاص شخص کے بارے میں ہوا مگر حکم اس کا سب کے لئے عام ہے جس میں اس طرح کی بُری خصلتیں پائی جائیں۔

بطنِ مادر میں تخلیقِ انسانی کے درجات اور مختلف احوال

فَإِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن تُرَابٍ، اس آیت میں بطن مادر کے اندر انسان کی تخلیق کے مختلف درجات کا بیان ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور وہ سچ بولنے والے اور سچے سمجھے جانے والے ہیں کہ انسان کا مادہ چالیس روز تک رحم میں جمع رہتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ یعنی منجمد خون بن جاتا ہے پھر چالیس ہی دن میں وہ مضغہ یعنی گوشت بن جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونک دیتا ہے اور اُس کے متعلق چار باتیں اُسی وقت فرشتہ کو لکھوادی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کی عمر کتنی ہے دوسرے رزق کتنا ہے، تیسرے عمل کیا کیا کرے گا، چوتھے یہ کہ انجام کار یہ شقی اور بد بخت ہوگا یا سعید خوش نصیب۔ (قرطبی) [1]

دوسری ایک روایت میں جس کو ابن ابی حاتم اور ابنِ جریر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی سے روایت کیا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ نطفہ جب کئی دَور سے گزرنے کے بعد مضغہ گوشت بن جاتا ہے تو اس وقت وہ فرشتہ جو ہر انسان کی تخلیق پر مأمور ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرتا ہے یَا رَبِّ مُخَلَّقَةٌ اَوْ غَیْرُ مُخَلَّقَةٍ؟ (یعنی اس مضغہ سے انسان کا پیدا کرنا آپ کے نزدیک مقدر ہے یا نہیں) اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ یہ غیر مخلّقہ ہے تو رحم اس کو ساقط کر دیتا ہے، تخلیق کے دوسرے مراتب تک نہیں پہنچتا، اور اگر حکم ہوتا ہے کہ یہ مخلّقہ ہے تو پھر فرشتہ سوال کرتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ اور شقی ہے یا سعید؟ اور اس کی عمر کیا ہے؟ اور اس کا عمل کیسا ہے؟ اور کہاں مرے گا؟ (یہ سب چیزیں اُسی وقت فرشتے کو بتلادی جاتی ہیں) (ابن کثیر) [2] مخلّقه وغير مخلّقه کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے۔ (قرطبی) [3]

مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ، حدیثِ مذکور سے ان دونوں کی تفسیر یہ معلوم ہوئی کہ جس نطفۂ انسانی کا پیدا ہونا مقدر ہوتا ہے وہ مخلّقه ہے اور جس کا ضائع اور ساقط ہو جانا مقدر ہے وہ غير مخلّقه ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین مخلّقه اور غير مخلّقه کی یہ تفسیر کرتے ہیں کہ جس بچّے کی تخلیق مکمّل اور تمام اعضاء صحیح سالم اور متناسب ہوں وہ مخلّقه اور جس کے بعض اعضا ناقص ہوں یا قد اور رنگ وغیرہ غیر متناسب ہو وہ غير مخلّقه ہے۔ خلاصۂ تفسیر مذکور میں

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۲ ص:۷، وصحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة ج:۱ ص:۴۵۶

[2] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۳۹۶، وتفسیر ابن ابی حاتم تحت هذه الآیة رقم الحدیث:۱۴۲۳۵، وفتح الباری تحت رقم الحدیث:۳۰۷، ج:۱ ص:۴۹۷

[3] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۹

اسی تفسیر کو لیا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا، یعنی پھر بطنِ مادر سے تم کو نکالتے ہیں طفل ضعیف کی صورت میں، اُس کا بدن بھی کمزور ہوتا ہے، سماعت و بصارت بھی، حواس و عقل بھی، حرکت و گرفت کی قوت بھی، غرضیکہ سب قوتیں انتہائی ضعیف و کمزور ہوتی ہیں، پھر تدریجاً اُن میں ترقی دی جاتی ہے یہاں تک کہ پوری قوت تک پہنچ جاتے ہیں، ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ کے یہی معنے ہیں۔ لفظ اَشُدَّ، شِدَّةٌ کی جمع ہے جیسے اَنْعُمْ نِعْمَةٌ کی جمع آتی ہے معنے یہ ہوئے کہ تدریجی ترقی کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ تمہاری ہر قوّت مکمل نہ ہو جائے جو جوانی کے وقت میں ہوتی ہے۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ، یعنی وہ عمر جس میں انسان کے عقل وشعور اور حواس میں خلل آنے لگے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عمر سے پناہ مانگی ہے۔ نسائی میں بروایت سعدؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسب ذیل الفاظ پر مشتمل یہ دُعا بکثرت مانگتے تھے اور راویٔ حدیث حضرت سعدؓ یہ دُعا اپنی سب اولاد کو یاد کرا دیتے تھے وہ دُعا یہ ہے [۱] اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔ (قرطبی) [۲]

انسان کی ابتدائی تخلیق کے بعد عمر کے مختلف مدارج اور ان کے احوال

مسند احمد اور مسند ابویعلی میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچّہ جب تک بالغ نہیں ہوتا اس کے نیک عمل اس کے والد یا والدین کے حساب میں لکھے جاتے ہیں اور جو کوئی بُرا عمل کرے تو وہ نہ اس کے حساب میں لکھا جاتا ہے نہ والدین کے، پھر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو قلمِ حساب اس کے لئے جاری ہو جاتا ہے اور دو فرشتے جو اس کے ساتھ رہنے والے ہیں ان کو حکم دیدیا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت کریں اور قوت بہم پہنچائیں جب حالتِ اسلام میں چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو (تین قسم کی بیماریوں سے) محفوظ کر دیتے ہیں یعنی جنون اور جذام اور برص سے۔ جب پچاس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب ہلکا کر دیتے ہیں۔ جب ساٹھ سال کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کو اپنی طرف رجوع کی توفیق دیدیتے ہیں۔ جب ستّر سال کو پہنچتا ہے تو سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسّی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حسنات کو لکھتے ہیں اور سیئات کو معاف فرما دیتے ہیں پھر جب نوّے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور اس کو اپنے اہلِ بیت کے معاملے میں شفاعت کرنے کا حق دیتے ہیں اور اس کی شفاعت قبول فرماتے ہیں اور اس کا لقب امین اللہ اور اسیر اللہ

---

[۱] ترجمہ: اے اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں بخل سے اور میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں بزدلی سے اور میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ ناکارہ عمر تک پہنچوں اور میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں دنیا کے فتنے سے اور عذابِ قبر سے۔ [۲] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱۲، وسنن النسائی، کتاب الاِستعاذة، باب الاِستعاذة من البخل ج:۲ ص:۳۱۳

فی الارض (یعنی زمین میں اللہ کا قیدی) ہوجاتا ہے (کیونکہ اس عمر میں پہنچ کر عموماً انسان کی قوت ختم ہوجاتی ہے کسی چیز میں لذت نہیں رہتی، قیدی کی طرح عمر گزارتا ہے) اور جب ارذل عمر کو پہنچ جائے تو اس کے تمام وہ نیک عمل نامۂ اعمال میں برابر لکھے جاتے ہیں جو اپنی صحت وقوت کے زمانے میں کیا کرتا تھا اور اگر اس سے کوئی گناہ ہوجاتا ہے تو وہ لکھا نہیں جاتا۔ [1]

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے مسند ابویعلی سے نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ جِدًّا وَفِيْهِ نَكَارَةٌ شَدِيْدَةٌ (یعنی یہ حدیث غریب ہے اور اس میں سخت نکارت ہے) پھر فرمایا وَمَعَ هٰذَا قَدْ رَوَاهُ الْإِمَامُ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فِيْ مُسْنَدِهٖ مَوْقُوْفًا وَمَرْفُوْعًا (یعنی اس غرابت ونکارت کے باوجود امام احمد نے اپنی مسند میں اس کو موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح روایت کیا ہے) پھر ابن کثیر نے مسند احمد سے یہ دونوں قسم کی روایتیں نقل کی ہیں جن کا مضمون تقریباً وہی ہے جو بحوالہ مسند ابویعلی اوپر نقل ہوا ہے۔ [2] وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

ثَانِيَ عِطْفِهٖ، **عِطْفُ** کے معنے جانب اور کروٹ کے ہیں یعنی کروٹ موڑنے والا۔ اس سے مراد اُس کا اعراض کرنا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ

اور بعضا شخص وہ ہے کہ بندگی کرتا ہے اللہ کی کنارے پر پھر اگر پہنچی اس کو بھلائی تو قائم ہوگیا اس عبادت پر

وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ ۫ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ

اور اگر پہنچ گئی اس کو جانچ پھر گیا اُلٹا اپنے منہ پر گنوائی دُنیا اور آخرت

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ

یہی ہے ٹوٹا صریح پکارتا ہے اللہ کے سوائے ایسی چیز کو کہ نہ اس کا نقصان کرے

وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑫ ۚ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ

اور نہ اس کا فائدہ کرے یہی ہے دُور جاپڑنا گمراہ ہوکر پکارے جاتا ہے اس کو جس کا ضرر پہلے پہنچے

---

[1] مسند احمد، رقم الحدیث: ۵۷۵۹، مسند عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، ومسند ابی یعلی الموصلی، رقم الحدیث: ۴۱۳۶

[2] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذہ الآیۃ ج:۵ ص:۳۹۷

مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑬

نفع سے بیشک بُرا دوست ہے اور بُرا رفیق

آسان ترجمۂ قرآن

اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو ایک کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ چنانچہ اگر اُسے (دُنیا میں) کوئی فائدہ پہنچ گیا تو وہ اُس سے مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر اُسے کوئی آزمائش پیش آگئی تو وہ منہ موڑ کر (پھر کفر کی طرف) چل دیتا ہے۔ ایسے شخص نے دُنیا بھی کھوئی، اور آخرت بھی۔ یہی تو کھلا ہوا گھاٹا ہے۔ ⑪ وہ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتا ہے جو نہ اُسے نقصان پہنچا سکتے ہیں، نہ کوئی فائدہ دے سکتے ہیں۔ یہی تو پرلے درجے کی گمراہی ہے۔ ⑫ یہ ایسے (جھوٹے خدا) کو پکارتے ہیں جس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ قریب ہے۔ ایسا مددگار بھی کتنا بُرا ہے، اور ایسا ساتھی بھی کتنا بُرا! ⑬

خلاصۂ تفسیر

اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کوئی کسی چیز کے) کنارہ پر (کھڑا ہو اور موقع پا کر چل دینے پر تیار ہو) پھر اگر اس کو کوئی (دُنیوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے (ظاہری) قرار پالیا اور اگر اُس پر کچھ آزمائش ہوگئی تو منہ اُٹھا کر (کفر کی طرف) چل دیا (جس سے) دُنیا و آخرت دونوں کو کھو بیٹھا یہی ہے کھلا نقصان (دُنیا کا نقصان تو دُنیاوی آزمائش جو کسی مصیبت سے ہوتی وہ ظاہر ہی ہے اور آخرت کا نقصان یہ ہوا کہ اسلام اور) خدا کو چھوڑ کر اُسی چیز کی عبادت کرنے لگا جو (اس قدر عاجز اور بے بس ہے کہ) نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے نہ نفع پہنچا سکتی ہے (یعنی اس کی عبادت نہ کرو تو کوئی نقصان پہنچانے کی اور کرو تو نفع پہنچانے کی کوئی قدرت نہیں۔ ظاہر ہے کہ قادرِ مطلق کو چھوڑ کر ایسی بے بس چیز کو اختیار کرنا خسارہ ہی خسارہ ہے) یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے (صرف یہی نہیں کہ اس کی عبادت سے کوئی نفع نہ پہنچے بلکہ اُلٹا ضرر اور نقصان ہے کیونکہ) وہ ایسے کی عبادت کر رہا ہے کہ اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے۔ ایسا کارساز بھی بُرا اور ایسا رفیق بھی بُرا (جو کسی طرح کسی حال کسی کے کام نہ آئے کہ اس کو مولیٰ اور آقا بنا لو یا دوست اور ساتھی بنا لو کسی حال اُس سے کچھ نفع نہیں)۔

معارف و مسائل

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ بخاری اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں مقیم ہو گئے تو بعض ایسے لوگ بھی آ کر مسلمان ہو جاتے تھے (جن کے دل میں ایمان کی پختگی نہیں تھی) اگر اسلام لانے کے بعد اس کی اولاد اور مال میں ترقی ہوگئی تو کہتا تھا کہ یہ دین اچھا ہے اور اگر اس کے خلاف ہوا تو کہتا تھا کہ یہ بُرا دین ہے [1] ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ایک کنارہ پر کھڑے ہیں۔ اگر ان کو ایمان کے بعد دنیوی راحت اور مال وسامان مل گیا تو اسلام پر جم گئے اور اگر وہ بطور آزمائش کسی تکلیف و پریشانی میں مبتلا ہو گئے تو دین سے پھر گئے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

اللہ داخل کرے گا اُن کو جو ایمان لائے اور کیں بھلائیاں باغوں میں بہتی ہیں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝۱۴ مَنْ كَانَ يَظُنُّ

نیچے اُن کے نہریں اللہ کرتا ہے جو چاہے جس کو یہ خیال ہو

اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ

کہ ہرگز نہ مدد کرے گا اُس کی اللہ دُنیا میں اور آخرت میں تو تان لے ایک رسّی آسمان کو

ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝۱۵ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ

پھر کاٹ ڈالے اب دیکھے کچھ جاتا رہا اس کی اس تدبیر سے اس کا غصّہ اور یوں اُتارا ہم نے یہ قرآن

اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝۱۶

کھلی باتیں اور یہ ہے کہ اللہ سُجھا دیتا ہے جس کو چاہے

[1] تفسیر ابن ابی حاتم رقم: ۱۴۲۶۵۳، ج: ۹ ص: ۳۵۹، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الحج، باب ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف الخ ج: ۲ ص: ۶۹۴

آسان ترجمۂ قرآن

جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اللہ یقیناً ان کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یقیناً اللہ ہر وہ کام کرتا ہے جس کا ارادہ کر لیتا ہے۔ ⑭ جو شخص یہ سمجھتا تھا کہ اللہ دُنیا اور آخرت میں اس (پیغمبر) کی مدد نہیں کرے گا تو وہ آسمان تک ایک رسّی تان کر رابطہ کاٹ ڈالے، پھر دیکھے کہ کیا اُس کی یہ تدبیر اُس کی جھنجلاہٹ دُور کر سکتی ہے؟ ⑮ اور ہم نے اس (قرآن) کو کھلی کھلی نشانیوں کی صورت میں اسی طرح اُتارا ہے، اور اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ ⑯

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور اللہ جس شخص یا قوم کو کوئی ثواب یا عذاب دینا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ (قادر مطلق ہے) جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے (اور جن لوگوں کے دینِ حق میں مجادلہ کرنے کا ذکر آیا ہے اگلی آیت میں اُن کی ناکامی اور محرومی کا بیان ہے فرمایا) جو شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفت اور مخاصمت کر کے) اس بات کا خیال رکھتا ہو کہ (میں غالب آجاؤں گا اور آپ کے دین کی ترقی کو روک دوں گا اور یہ کہ) اللہ تعالیٰ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (اور آپ کے دین کی) دُنیا و آخرت میں مدد نہ کرے گا تو اس کو چاہئے کہ ایک رسّی آسمان تک تان لے (اور آسمان سے باندھ دے) پھر (اس رسّی کے ذریعہ اگر آسمان پر پہنچ سکے تو پہنچ جائے تاکہ) اس وحی کو موقوف کرادے (اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی نہیں کر سکتا) تو پھر غور کرنا چاہئے آیا اس کی (یہ) تدبیر (جس سے بالکل عاجز ہے) اس کے غیظ و غضب کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کر سکتی ہے اور ہم نے اس (قرآن) کو اسی طرح اُتارا ہے (کہ اس میں ہمارے ارادے اور قدرت کے سوا کسی کا دخل نہیں) جس میں کھلی کھلی دلیلیں (تعیینِ حق کی) ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

معارف و مسائل

مَنْ كَانَ يَظُنُّ، حاصل یہ ہے کہ اسلام کا راستہ روکنے والے معاند جو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اُس کے دین کی مدد نہ کرے اُن کو سمجھنا چاہئے کہ یہ تو جبھی ہو سکتا ہے جبکہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منصبِ نبوّت

سلب ہو جائے اور آپ پر وحی آنا منقطع ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو نبوت و رسالت سپرد فرماتا ہے اور اس کو وحیِ الٰہی سے نوازتا ہے اُس کی مدد تو دنیا و آخرت میں کرنے کا اُس کی طرف سے پختہ عہد ہے اور عقلاً بھی اس کے خلاف نہ ہونا چاہئے تو جو شخص آپ کی اور آپ کے دین کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے اُس کو، اگر اس کے قبضہ میں ہو تو، ایسی تدبیر کرنا چاہئے کہ یہ منصبِ نبوّت سلب ہو جائے اور وحی الٰہی منقطع ہو جائے۔ اس مضمون کو ایک فرضِ محال کے عنوان سے اس طرح تعبیر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی کو منقطع کرنے کا کام کرنا چاہتا ہے تو کسی طرح آسمان پر پہنچے وہاں جا کر اس سلسلہ وحی کو ختم کر دے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ کسی کا اس طرح آسمان پر جانا ممکن نہ اللہ تعالیٰ سے قطع وحی کو کہنا ممکن تو پھر جب تدبیر کوئی کارگر نہیں تو اسلام و ایمان کے خلاف غیظ و غضب کا کیا نتیجہ؟ یہ تفسیر بعینہٖ دُرِّ منثور میں ابنِ زید سے روایت کی ہے[۱] اور میرے نزدیک یہ سب سے بہتر اور صاف تفسیر ہے۔ (بیان القرآن مع تسہیل)[۲]

قرطبی نے اسی تفسیر کو ابوجعفر نحاس سے نقل کر کے فرمایا کہ یہ سب سے احسن تفسیر ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی اس تفسیر کو نقل کیا ہے۔[۳] اور بعض حضرات نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ سماء سے مراد اپنے مکان کی چھت ہے اور مراد آیت کی یہ ہے کہ اگر کسی معاند جاہل کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اس کے دین کی مدد نہ کرے اور وہ اسلام کے خلاف غیظ و غضب لئے ہوئے ہے تو سمجھ لے کہ اس کی یہ مراد تو کبھی پوری نہ ہو گی اس احمقانہ غیظ و غضب کا تو علاج یہی ہے کہ چھت میں رسّی ڈال کر پھانسی لے لے اور مر جائے۔ (مظہری وغیرہ)[۴]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ

جو لوگ مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس

وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ

اور جو شرک کرتے ہیں مقرر اللہ فیصلہ کرے گا ان میں قیامت کے دن

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﭐ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ

اللہ کے سامنے ہے ہر چیز تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی

---

[۱] الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۷ ص:۱۲۶ [۲] تفسير بيان القرآن ج:۷ ص:۲۵
[۳] تفسير القرطبي ج:۱۲ ص:۲۱ [۴] تفسير المظهری ج:۶ ص:۲۵۹

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ

آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ

وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ

اور درخت اور جانور اور بہت آدمی اور بہت ہیں کہ اُن پر ٹھہر چکا عذاب

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ ۩ ﴿١٨﴾ السجدة

السجدة ٦

اور جس کو اللہ ذلیل کرے اُسے کوئی نہیں عزت دینے والا اللہ کرتا ہے جو چاہے

آسان ترجمۂ قرآن

بلاشبہ مؤمن ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا نصرانی اور مجوسی، یا وہ جنہوں نے شرک اختیار کیا ہے، اللہ قیامت کے دن ان سب کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا گواہ ہے۔ ﴿١٧﴾ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے آگے وہ سب سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ سب جو زمین میں ہیں، نیز سورج اور چاند، اور ستارے اور پہاڑ، اور درخت اور جانور، اور بہت سے انسان بھی! اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر عذاب طے ہو چکا ہے۔ اور جسے اللہ ذلیل کردے، کوئی نہیں ہے جو اُسے عزت دے سکے۔ یقیناً اللہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ﴿١٨﴾

خلاصۂ تفسیر

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اور یہود اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس اور مشرکین، اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان میں قیامت کے روز (عملی) فیصلہ کردے گا (کہ مسلمانوں کو جنت میں اور سب اقسام کافروں کو جہنم میں داخل کرے گا) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔

اے مخاطب! کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے (اپنی اپنی حالت کے مناسب) سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور (تمام مخلوقات کے مطیع و فرمانبردار ہونے کے باوجود انسان جو خاص درجہ کی عقل بھی رکھتا ہے وہ سب کے سب مطیع

وفرمانبردار نہیں بلکہ) بہت سے (تو) آدمی بھی (اطاعت اور عاجزی کرتے ہیں) اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب کا استحقاق ثابت ہوگیا ہے اور (سچ یہ ہے کہ) جس کو خدا ذلیل کرے (کہ اُس کو ہدایت کی توفیق نہ ہو) اُس کا کوئی عزّت دینے والا نہیں (اور) اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے اپنی حکمت سے) جو چاہے کرے۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں تمام اقوامِ عالم مؤمنین اور کفار پھر کفار کے مختلف العقائد گروہوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کا فیصلہ فرمادیں گے اور وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے باخبر ہیں۔ فیصلہ کیا ہوگا اس کا ذکر بار بار قرآن میں آچکا ہے کہ مؤمنین صالحین کے لئے ابدی اور لازوال راحت ہے اور کفار کے لئے دائمی عذاب۔ دوسری آیت میں تمام مخلوقات خواہ زندہ ذی روح ہوں یا جمادات ونباتات سب کا حق تعالیٰ کے لئے مطیع اور فرمانبردار ہونا بعنوان سجدہ بیان فرماکر بنی نوع کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک مطیع وفرمانبردار سجدہ میں سب کے ساتھ شریک اور دوسرا سرکش باغی سجدہ سے منحرف۔ اور تابع فرمان ہونے کو سجدہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا ترجمہ خلاصۂ تفسیر میں عاجزی کرنے سے کیا ہے تاکہ مخلوقات کی ہر نوع اور ہر قسم کے سجدہ کو شامل ہوجائے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا سجدہ اُس کے مناسب حال ہوتا ہے انسان کا سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے دوسری مخلوقات کا سجدہ اپنی اپنی خدمت جس کے لئے اُن کو پیدا کیا گیا ہے اس کو انجام دینے کا اور خدمت کا حق ادا کرنے کا نام ہے۔

تمام مخلوقات کے مطیع وفرمانبردار ہونے کی حقیقت

تمام کائنات ومخلوق کا اپنے خالق کے زیرِ حکم اور تابع مشیت ہونا ایک تو تکوینی اور تقدیری طور پر غیر اختیاری ہے جس سے کوئی بھی مخلوق مؤمن یا کافر زندہ یا مُردہ، جمادات یا نباتات مستثنیٰ نہیں اس حیثیت میں سب کے سب یکساں طور پر حق تعالیٰ کے زیرِ حکم ومشیت ہیں۔ جہان کا کوئی ذرہ یا پہاڑ اُس کے اِذن ومشیت کے بغیر کوئی ادنیٰ حرکت نہیں کرسکتا۔ دوسری اطاعت وفرمانبرداری اختیاری ہے کہ کوئی مخلوق اپنے قصد واختیار سے اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی اطاعت کرے اس میں مؤمن وکافر کا فرق ہوتا ہے کہ مؤمن اطاعت شعار فرمانبردار ہوتا ہے کافر اس سے منحرف اور منکر ہوتا ہے۔ اس آیت میں چونکہ مؤمن وکافر کا فرق بیان فرمایا ہے یہ قرینہ اس کا ہے کہ اس میں سجدہ اور فرمانبرداری سے مراد صرف تکوینی وتقدیری اطاعت نہیں بلکہ اختیاری اور ارادی اطاعت ہے۔ اس میں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اختیاری اور ارادی اطاعت تو صرف ذوی العقول انسان اور جنّ وغیرہ میں ہوسکتی ہے۔ حیوانات، نباتات، جمادات میں عقل وشعور ہی نہیں تو پھر قصد وارادہ

کہاں اور اطاعت اختیاری کیسی؟ کیونکہ قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ عقل وشعور اور قصد وارادہ سے کوئی بھی مخلوق خالی نہیں، کمی بیشی کا فرق ہے۔ انسان اور جنّ کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور کا ایک کامل درجہ عطا فرمایا ہے اور اسی لئے ان کو احکام امر ونہی کا مکلّف بنایا گیا ہے ان کے سوا باقی مخلوقات میں سے ہر نوع اور ہر صنف کو اس صنف کی ضروریات کے موافق عقل وشعور دیا گیا، انسان کے بعد سب سے زیادہ یہ عقل وشعور حیوانات میں ہے اس کے دوسرے نمبر میں نباتات ہیں، تیسرے میں جمادات ہیں۔ حیوانات کا عقل وشعور تو عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے نباتات کا عقل وشعور بھی ذرا سا غور وتحقیق کرنے والا پہچان لیتا ہے لیکن جمادات کا عقل وشعور اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام انسان اس کو نہیں پہچان سکتے۔ مگر اُن کے خالق ومالک نے خبر دی ہے کہ وہ بھی عقل وشعور اور قصد وارادے کے مالک ہیں۔ قرآن کریم نے آسمان وزمین کے بارے میں فرمایا ہے قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ⑪ (حٰمٓ السجدة) یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو حکم دیا کہ تم کو ہمارے تابع فرمان رہنا ہے اپنی خوشی سے فرمانبرداری اختیار کرو ورنہ جبراً اور حکماً تابع رہنا ہی ہے تو آسمان وزمین نے عرض کیا کہ ہم اپنے ارادے اور خوشی سے اطاعت وفرمانبرداری قبول کرتے ہیں اور دوسری جگہ پہاڑ کے پتھروں کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ (البقرة: ۷۴) یعنی بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خشیت وخوف کے مارے اوپر سے نیچے لڑھک جاتے ہیں۔ اسی طرح احادیثِ کثیرہ میں پہاڑوں کی باہم گفتگو اور دوسری مخلوقات میں عقل وشعور کی شہادتیں بکثرت ملتی ہیں۔ [1] اس لئے اس آیت میں جس اطاعت وفرمانبرداری کو سجدہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اِس سے اطاعتِ اختیاری وارادی مراد ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ نوعِ انسان کے علاوہ (جن کے ضمن میں جنّات بھی داخل ہیں) باقی تمام مخلوقات اپنے قصد واختیار سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز یعنی تابع فرمان ہیں صرف انسان اور جن ایسے ہیں جن میں دو حصے ہوگئے ایک مؤمن ومطیع سجدہ گزار دوسرے کافر ونافرمان سجدہ سے منحرف جن کو اللہ نے ذلیل کر دیا ہے کہ ان کو سجدہ کی توفیق نہیں بخشی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ

یہ دو مدعی ہیں جھگڑے ہیں اپنے رَبّ پر سو جو منکر ہوئے اُن کے واسطے بیونتے ہیں کپڑے

مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ⑲ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ

آگ کے ڈالتے ہیں اُن کے سر پر جلتا پانی گل کر نکل جاتا ہے اس سے جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہے

[1] ملاحظہ فرمائیں: مجمع الزوائد تحت رقم الحديث: ۱۶۷۸۳

وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا

اور کھال بھی اور اُن کے واسطے ہتھوڑے ہیں لوہے کے جب چاہیں کہ نکل پڑیں

مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ق وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ

دوزخ سے گھٹنے کے مارے پھر ڈال دیئے جائیں اس کے اندر اور چکھتے رہو جلنے کا عذاب بیشک اللہ

يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

داخل کرے گا اُن کو جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں باغوں میں بہتی ہیں اُن کے نیچے

الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ط وَلِبَاسُهُمْ

نہریں گہنا پہنائیں گے اُن کو وہاں کنگن سونے کے اور موتی اور اُن کی پوشاک ہے

فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ج وَهُدُوْٓا اِلٰى

وہاں ریشم کی اور راہ پائی اُنہوں نے ستھری بات کی اور پائی اس

صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

تعریفوں والے کی راہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ (مؤمن اور کافر) دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں ایک دوسرے سے جھگڑا کیا ہے۔ اب (اس کا فیصلہ اس طرح ہوگا کہ) جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے، اُن کے لئے آگ کے کپڑے تراشے جائیں گے۔ اُن کے سروں کے اُوپر سے کھولتا ہوا پانی چھوڑا جائے گا ﴿۱۹﴾ جس سے اُن کے پیٹ کے اندر کی چیزیں اور کھالیں گل جائیں گی، ﴿۲۰﴾ اور اُن کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے، ﴿۲۱﴾ جب کبھی تکلیف سے تنگ آکر وہ اُس سے نکلنا چاہیں گے، تو

اُنہیں پھر اُسی میں لوٹا دیا جائے گا، کہ چکھو جلتی آگ کا مزہ! ۲۲ (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک کام کئے ہیں، اللہ اُن کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں اُنہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے سجایا جائے گا، اور جہاں اُن کا لباس ریشم ہوگا۔ ۲۳ اور (وجہ یہ ہے کہ) ان لوگوں کی رسائی پاکیزہ بات (یعنی کلمہ توحید) تک ہوگئی تھی، اور وہ اُس خدا کے راستے تک پہنچ گئے تھے جو ہر تعریف کا مستحق ہے۔ ۲۴

خلاصۂ تفسیر

(جن کا ذکر اوپر آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں ہوا ہے) یہ دو فریق ہیں (ایک مؤمن دوسرا کافر۔ پھر کافر گروہ کی کئی قسمیں ہیں۔ یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور بُت پرست) جنہوں نے اپنے رَبّ کے بارے میں (اعتقاداً اور کبھی کبھی مباحثۃً بھی) باہم اختلاف کیا (اس اختلاف کا فیصلہ قیامت میں اس طرح ہوگا کہ) جو لوگ کافر تھے اُن کے (پہننے کے لئے) آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے (یعنی آگ اُن کے پورے بدن پر اس طرح محیط ہوگی جیسے لباس) اور اُن کے سر کے اُوپر سے تیز گرم پانی چھوڑا جائے گا جس سے اُن کے پیٹ کی چیزیں (یعنی آنتیں) اور کھالیں سب گل جائیں گی، (یعنی یہ کھولتا ہوا تیز پانی کچھ پیٹ کے اندر چلا جائے گا جس سے آنتیں اور پیٹ کے اندر سب اجزاء و اعضاء گل جائیں گے کچھ اوپر بہے گا جس سے کھال گل جائے گی) اور ان کے (مارنے کے لئے) لوہے کے گرز ہوں گے (اور اس مصیبت سے کبھی نجات نہ ہوگی) وہ لوگ جب (دوزخ میں) گھُٹے گھُٹے (گھبرا جائیں گے اور) اس سے باہر نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جلنے کا عذاب (ہمیشہ کے لئے) چکھتے رہو (کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا اور) اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اُن کو وہاں سونے کے کنگنے اور موتی پہنائے جائیں گے اور پوشاک اُن کی وہاں ریشم ہوگی اور (یہ سب انعام و اکرام ان کے لئے اس سبب سے ہے کہ دُنیا میں اُن کو) کلمہ طیّب (کے اعتقاد) کی ہدایت ہوگئی تھی اور اُن کو اس (خدا) کے رستہ کی ہدایت ہوگئی تھی جو لائق حمد ہے (وہ راستہ اسلام ہے)۔

معارف و مسائل

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا، یہ دو فریق جن کا ذکر اس آیت میں ہے عام مؤمنین اور اُن کے مقابلہ میں تمام گروہِ کفار ہیں خواہ قرنِ اوّل کے ہوں یا قرونِ مابعد کے۔ البتہ نزول اس آیت کا اُن دو فریق کے بارے میں ہوا ہے جو میدانِ بدر کے مبارزہ میں ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزما ہوئے تھے مسلمانوں میں سے حضرت علی و حمزہ و عبیدہ رضوان اللہ علیہم اجمعین

اور کفار میں سے عتبہ بن ربیعہ اور اس کا بیٹا ولید اور اس کا بھائی شیبہ تھے جن میں سے کفار تو تینوں مارے گئے اور مسلمانوں میں سے حضرت علیؓ وحمزہؓ صحیح سالم واپس آئے اور عبیدہؓ شدید زخمی ہو کر آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچ کر دَم توڑ دیا۔ آیت کا نزول ان مبارزینِ بدر کے بارے میں ہونا بخاری [۱] ومسلم کی احادیث سے ثابت ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ حکم ان کے ساتھ مخصوص نہیں پوری اُمت کے لئے عام ہے، کسی بھی زمانے میں ہو۔

اہلِ جنت کو کنگن پہنائے جانے کی حکمت

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ کنگن ہاتھوں میں پہننا عورتوں کا کام اور اُنہیں کا زیور ہے۔ مَردوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا ہے جواب یہ ہے کہ دُنیا کے بادشاہوں کی یہ امتیازی شان رہی ہے کہ سر پر تاج اور ہاتھوں میں کنگن استعمال کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن مالکؓ کو جبکہ وہ مسلمان نہیں تھے اور سفرِ ہجرت میں آپ کو گرفتار کرنے کے لئے تعاقب میں نکلے تھے، جب اُن کا گھوڑا باذنِ خداوندی زمین میں دھنس گیا اور اُس نے توبہ کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے گھوڑا نکل گیا اس وقت سراقہ بن مالکؓ سے وعدہ فرمایا تھا کہ کسریٰ شاہ فارس کے کنگن مالِ غنیمت میں مسلمانوں کے پاس آئیں گے وہ تمہیں دیئے جائیں گے اور جب فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں فارس کا ملک فتح ہوا اور ایران کے یہ کنگن دوسرے اموالِ غنیمت کے ساتھ آئے تو سراقہ بن مالکؓ نے مطالبہ کیا اور ان کو دیدیئے گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جیسے سر پر تاج پہننا عام مَردوں کا رواج نہیں، شاہی اعزاز ہے اسی طرح ہاتھوں میں کنگن بھی شاہی اعزاز سمجھے جاتے ہیں اس لئے اہلِ جنت کو کنگن پہنائے جائیں گے۔ کنگن کے متعلق اس آیت میں اور سورۂ فاطر میں تو یہ ہے کہ وہ سونے کے ہوں گے اور سورۂ دہر میں یہ کنگن چاندی کے بتلائے گئے ہیں اس لئے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اہلِ جنت کے ہاتھوں میں تین طرح کے کنگن پہنائے جائیں گے ایک سونے کا، دوسرا چاندی کا تیسرا موتیوں کا جیسا کہ اس آیت میں موتیوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ (قرطبی) [۲]

ریشم کے کپڑے مَردوں کے لئے حرام ہیں

آیت مذکورہ میں ہے کہ اہلِ جنت کا لباس ریشم کا ہوگا مراد یہ ہے کہ اُن کے تمام ملبوسات اور فرش اور پردے وغیرہ ریشم کے ہوں گے جو دنیا میں سب زیادہ بہتر لباس سمجھا جاتا ہے اور جنت کا ریشم ظاہر ہے کہ دُنیا کے ریشم سے صرف نام کی شرکت رکھتا ہے ورنہ اُس کی عمدگی اور بہتری کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جهل ج:۲ ص:۵۶۵، وصحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب فی قوله تعالیٰ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ الآیة ج:۲ ص:۴۲۲ [۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۲ ص:۲۸،۲۹

امام نسائی اور بزار اور بیہقی نے بسند جیّد حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت کا ریشمی لباس جنت کے پھلوں میں سے نکلے گا [۱] اور حضرت جابرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جنت میں ایک درخت ایسا ہوگا جس سے ریشم پیدا ہوگا اہلِ جنت کا لباس اُسی سے تیار ہوگا۔ (مظہری) [۲]

حدیث میں امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ وَمَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ وَمَنْ شَرِبَ فِيْ اٰنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ لَمْ يَشْرَبْ فِيْهَا فِي الْآخِرَةِ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِبَاسُ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَشَرَابُ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاٰنِيَةُ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔ (از قرطبی بحوالہ نسائی) [۳]

جو شخص ریشمی کپڑا دُنیا میں پہنے گا وہ آخرت میں نہ پہنے گا اور جو دُنیا میں شراب پئے گا وہ آخرت کی شراب سے محروم رہے گا اور جو دُنیا میں سونے چاندی کے برتنوں میں (کھائے) پئے گا وہ آخرت میں سونے چاندی کے برتنوں میں نہ کھائے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تینوں چیزیں اہلِ جنت کے لئے مخصوص ہیں۔

مراد یہ ہے کہ جس شخص نے دُنیا میں یہ کام کئے اور توبہ نہیں کی وہ جنت کی ان تین چیزوں سے محروم رہے گا اگرچہ جنت میں داخل بھی ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے دُنیا میں شراب پی، پھر اُس سے توبہ نہیں کی وہ آخرت میں جنت کی شراب سے محروم رہے گا (رواہ الأئمة، قرطبی) [۴] نیز ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ وَاِنْ دَخَلَ الْجَنَّةَ لَبِسَهٗ اَهْلُ الْجَنَّةِ وَلَمْ يَلْبَسْهُ هُوَ۔ (رواه ابوداؤد الطيالسي في مسنده وقال القرطبي اسناده صحيح) [۵]

جس شخص نے دُنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں نہ پہنے گا اگرچہ جنت میں داخل بھی ہو جائے دوسرے اہلِ جنت ریشم پہنیں گے یہ نہیں پہن سکے گا۔

---

[۱] مسند البزار رقم الحديث:۲۴۳۴، ومجمع الزوائد رقم الحديث:۱۸۷۳۶

[۲] تفسير المظهری ج:۶ ص:۲۶۷

[۳] تفسير القرطبی ج:۱۲ ص:۲۹، والسنن الكبرىٰ للنسائی رقم الحديث:۶۸۶۹

[۴] تفسير القرطبی ج:۱۲ ص:۳۰، وصحيح البخاری، كتاب الأشربة، باب قوله إنما الخمر والميسر إلخ ج:۲ ص:۸۳۶

[۵] تفسير القرطبی ج:۱۲ ص:۳۰، ومسند الطيالسیؒ رقم الحديث:۲۳۱۹، ما روى ابو سعيد الخدری رضی الله عنه۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص جنت میں داخل کر لیا گیا پھر اگر وہ کسی چیز سے محروم کیا گیا تو اس کو حسرت وافسوس رہے گا اور جنت اس کی جگہ نہیں۔ وہاں کسی شخص کو کسی کا غم وافسوس نہ ہونا چاہئے اور اگر یہ حسرت وافسوس نہ ہو تو پھر اس محرومی کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اس کا جواب قرطبی نے اچھا دیا ہے کہ اہلِ جنت کے جس طرح مقامات اور درجات مختلف اور متفاوت اعلیٰ وادنیٰ ہوں گے۔ اُن کے تفاوت کا احساس بھی سب کو ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہٗ اہلِ جنت کے قلوب ایسے بنادے گا کہ اُن میں حسرتِ وافسوس کسی چیز کا نہ رہے گا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ بعض نے فرمایا قرآن مراد ہے (قرطبی) [1] صحیح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس میں داخل ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

جو لوگ منکر ہوئے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے

الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ

جو ہم نے بنائی سب لوگوں کے واسطے برابر ہے اس میں رہنے والا اور باہر سے آنے والا اور جو اُس میں چاہے

بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٥﴾ ع

ٹیڑھی راہ شرارت سے اُسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک وہ لوگ (سزا کے لائق ہیں) جنہوں نے کفر اپنالیا ہے، اور جو دوسروں کو اللہ کے راستے سے اور اُس مسجدِ حرام سے روکتے ہیں جسے ہم نے لوگوں کے لئے ایسا بنایا ہے کہ اُس میں وہاں کے باشندے اور باہر سے آنے والے سب برابر ہیں۔ اور جو کوئی شخص اُس میں ظلم کر کے ٹیڑھی راہ نکالے گا، ہم اُسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ﴿٢٥﴾

[1] تفسیر القرطبی ج:١٢ ص:٣٠

خلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور (مسلمانوں کو) اللہ کے راستہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں (تاکہ مسلمان عمرہ ادا نہ کرسکیں حالانکہ حرم کی حیثیت یہ ہے کہ اس میں کسی کی خصوصیت نہیں بلکہ) اس کو ہم نے تمام آدمیوں کے واسطے مقرر کیا ہے کہ اس میں سب برابر ہیں اس (حرم کے داخل حدود) میں رہنے والا بھی (یعنی جو لوگ وہاں مقیم ہیں) اور باہر سے آنے والا (مسافر) بھی اور جو کوئی اس میں (یعنی حرم شریف میں) ظلم کے ساتھ کوئی بے دینی کا کام کرنے کا ارادہ کرے گا تو ہم اُس شخص کو عذاب دردناک چکھادیں گے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں مؤمنین اور کفار کے دو فریق کی باہمی مخاصمت کا ذکر تھا اسی مخاصمت کی ایک خاص صورت اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ ان میں بعض ایسے کفار بھی ہیں جو خود گمراہی پر جمے ہوئے ہیں دوسروں کو بھی اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کو جبکہ وہ عمرہ کا احرام باندھ کر حرم شریف میں داخل ہونا چاہتے تھے مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روک دیا حالانکہ مسجد حرام اور حرم شریف کا وہ حصّہ جس سے لوگوں کی عبادت عمرہ وحج کا تعلق ہے ان کی مِلک میں داخل نہیں تھا جس کی بِناء پر اُن کو مزاحمت اور مداخلت کا کوئی حق پہنچتا، بلکہ وہ سب لوگوں کے لئے یکساں ہے جہاں باشندگان حرم اور باہر کے مسافر اور شہری اور پردیسی سب برابر ہیں۔ آگے اُن کی سزا کا ذکر ہے کہ جو شخص مسجد حرام (یعنی پورے حرم شریف) میں کوئی بے دینی کا کام کرے گا جیسے لوگوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکنا یا دوسرا کوئی خلافِ دین کام کرنا، اس کو عذاب دردناک چکھایا جائے گا خصوصاً جبکہ اس بے دینی کے کام کے ساتھ ظلم یعنی شرک بھی ملا ہوا ہو جیسا کہ مشرکین مکّہ کا حال تھا جنہوں نے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکا کہ ان کا یہ عمل بھی خلافِ دین ناروا تھا پھر اس کے ساتھ وہ کفر و شرک میں بھی مبتلا تھے۔ اور اگرچہ ہر خلاف دین کام خصوصاً شرک و کفر ہر جگہ ہر زمانے میں حرام اور انتہائی جرم و گناہ اور موجبِ عذاب ہے مگر جو ایسے کام حرم محترم کے اندر کرے اُس کا جرم دوگنا ہو جاتا ہے اس لئے یہاں حرم کی تخصیص کر کے بیان کیا گیا ہے۔

يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، سبیل اللہ سے مراد اسلام ہے معنے آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ خود تو اسلام سے دُور ہیں ہی دوسروں کو بھی اسلام سے روکتے ہیں۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ، یہ اُن کا دوسرا گناہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ مسجد حرام

اصل میں اُس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنائی ہوئی ہے اور یہ حرم مکہ کا ایک اہم جزء ہے لیکن بعض مرتبہ مسجد حرام بول کر پورا حرم مکہ بھی مراد لیا جاتا ہے جیسے خود اسی واقعہ یعنی مسلمانوں کو عمرہ کے لئے حرم میں داخل ہونے سے روکنے کی جو صورت پیش آئی وہ یہی تھی کہ کفارِ مکہ نے آپ کو صرف مسجد میں جانے سے نہیں بلکہ حدود حرم مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور قرآن کریم نے اس واقعہ میں مسجد حرام کا لفظ بمعنے مطلق حرم استعمال فرمایا ہے وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ [۱] (الفتح:۲۵)

تفسیر درمنثور میں اس جگہ مسجد حرام کی تفسیر میں پورا حرم مراد ہونا حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ [۲]

حرم مکہ میں سب مسلمانوں کے مساوی حق کا مطلب

اتنی بات پر تمام اُمّت اور ائمہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ مسجد حرام اور حرم شریف مکہ کے وہ تمام حصے جن سے افعالِ حج کا تعلق ہے جیسے صفا مروہ کے درمیان کا میدان جس میں سعی ہوتی ہے اور منیٰ کا پورا میدان اسی طرح عرفات کا پورا میدان اور مزدلفہ کا پورا میدان، یہ سب زمینیں سب دُنیا کے مسلمانوں کے لئے وقفِ عام ہیں۔ کسی شخص کی ذاتی ملکیت ان پر نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہوسکتی ہے۔ ان کے علاوہ مکہ مکرمہ کے عام مکانات اور باقی حرم کی زمینیں ان کے متعلق بھی بعض ائمہ فقہاء کا یہی قول ہے کہ وہ بھی وقفِ عام ہیں۔ اُن کا فروخت کرنا یا کرایہ دینا حرام ہے ہر مسلمان ہر جگہ ٹھہر سکتا ہے۔ مگر دوسرے فقہاء کا مختار مسلک یہ ہے کہ مکہ کے مکانات مِلکِ خاص ہوسکتے ہیں ان کی خرید وفروخت اور ان کو کرایہ پر دینا جائز ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ سے ثابت ہے کہ اُنہوں نے صفوان بن اُمیہ کا مکان مکہ مکرمہ میں خرید کر اس کو مجرموں کے لئے قید خانہ بنایا تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ سے اس میں دو روایتیں منقول ہیں ایک پہلے قول کے مطابق دوسری دوسرے قول کے مطابق اور فتویٰ دوسرے قول پر ہے۔ کذا فی روح المعانی۔ [۳] یہ بحث کتب فقہ میں مفصّل مذکور ہے [۴] مگر اس آیت میں حرم کے جن حصّوں سے روکنے کا ذکر ہے وہ حصّے بہر حال سب کے نزدیک وقفِ عام ہیں ان سے روکنا حرام ہے آیت مذکورہ سے اسی کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ، الحاد کے معنے لغت میں سیدھے راستے سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اس جگہ الحاد سے

---

[۱] ترجمہ: اور تم کو مسجد حرام سے روکا۔ [۲] الدر المنثور ج:۶ ص:۲۴

[۳] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۳۹،۴۰

[۴] تفصیل کے لئے دیکھئے: الدر المختار، کتاب الحظر والإباحة ج:۶ ص:۱۱۷، وبدائع الصنائع، کتاب البیوع، فصل فی الشرط الذی یرجع إلی المعقود علیه۔

مراد مجاہد و قتادہ کے نزدیک کفر و شرک ہے مگر دوسرے مفسرین نے اس کو اپنے عام معنے میں قرار دیا ہے جس میں ہر گناہ اور اللہ و رسول کی نافرمانی داخل ہے یہاں تک کہ اپنے خادم کو گالی دینا بُرا کہنا بھی۔ اور اسی معنے کے لحاظ سے حضرت عطاء نے فرمایا کہ حرم میں الحاد سے مراد اس میں بغیر احرام کے داخل ہو جانا یا ممنوعات حرم میں سے کسی ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا ہے جیسے حرم کا شکار مارنا یا اُس کا درخت کاٹنا وغیرہ۔ اور جو چیزیں شریعت میں ممنوع ناجائز ہیں وہ سبھی جگہ گناہ اور موجب عذاب ہیں حرم کی تخصیص اس بناء پر کی گئی کہ جس طرح حرم مکہ میں نیکی کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے اسی طرح گناہ کا عذاب بھی بہت بڑھ جاتا ہے (قالہ مجاهد)۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس کی ایک تفسیر یہ بھی منقول ہے کہ حرم کے علاوہ دوسری جگہوں میں محض گناہ کا ارادہ کرنے سے گناہ نہیں لکھا جاتا جب تک عمل نہ کرے اور حرم میں صرف ارادہ پختہ کر لینے پر بھی گناہ لکھا جاتا ہے۔ قرطبی نے یہی تفسیر ابن عمرؓ سے بھی نقل کی ہے اور اس تفسیر کو صحیح کہا ہے۔ [۱] حضرت عبداللہ بن عمرؓ حج کے لئے جاتے تو دو خیمے لگاتے تھے ایک حرم کے اندر دوسرا باہر۔ حرم میں اگر اپنے اہل و عیال یا خدام و متعلقین میں کسی کو کسی بات پر سرزنش اور عتاب کرنا ہوتا تو حرم سے باہر والے خیمے میں جا کر یہ کام کرتے تھے۔ لوگوں نے مصلحت دریافت کی تو فرمایا ہم سے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ انسان جو عتاب و ناراضی کے وقت کَلَّا وَاللّٰهِ یا بَلٰی وَاللّٰهِ کے الفاظ بولتا ہے یہ بھی الحاد فی الحرم میں داخل ہے۔ (مظہری) [۲]

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ

اور جب ٹھیک کر دی ہم نے ابراہیم کو جگہ اُس گھر کی کہ شریک نہ کرنا میرے ساتھ کسی کو اور پاک رکھ میرا گھر

لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ

طواف کرنے والوں کے واسطے اور کھڑے رہنے والوں کے اور رکوع و سجدہ والوں کے اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے

یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾ ۱۸

کہ آئیں تیری طرف پیروں چل کر اور سوار ہو کر دُبلے دُبلے اونٹوں پر چلے آئیں راہوں دُور سے

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۳۱

[۲] تفسیر المظہری تحت ھذہ الآیۃ ج:۶ ص:۲۷۴، والدر المنثور ج:۶ ص:۲۸، واخبار مکۃ للأزرقی رقم الحدیث:۷۳۹

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ

تاکہ پہنچیں اپنے فائدہ کی جگہوں پر اور پڑھیں اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں

عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا

ذبح پر چوپایوں مواشی کے جو اللہ نے دیئے ہیں اُن کو سو کھاؤ اُس میں سے اور کھلاؤ

الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۲۸ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا

بُرے حال کے محتاج کو پھر چاہیئے کہ ختم کردیں اپنا میل کچیل اور پوری کردیں اپنی منتیں اور طواف کریں

بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۲۹

اس قدیم گھر کا

آسان ترجمۂ قرآن

اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم کو اس گھر (یعنی خانہ کعبہ) کی جگہ بتادی تھی، (اور یہ ہدایت دی تھی کہ:) ''میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، اور میرے گھر کو اُن لوگوں کے لئے پاک رکھنا جو (یہاں) طواف کریں، اور عبادت کے لئے کھڑے ہوں، اور رُکوع سجدے بجالائیں۔ ۲۶ اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، کہ وہ تمہارے پاس پیدل آئیں، اور دُور دراز کے راستوں سے سفر کرنے والی اُن اُونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں جو (لمبے سفر سے) دُبلی ہوگئی ہوں، ۲۷ تاکہ وہ اُن فوائد کو آنکھوں سے دیکھیں جو اُن کے لئے رکھے گئے ہیں، اور متعین دنوں میں اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے اُنہیں عطا کئے ہیں۔'' چنانچہ (مسلمانو!) اُن جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ، اور تنگ دست محتاج کو بھی کھلاؤ۔ ۲۸ پھر (حج کرنے والے) لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنا میل کچیل دُور کریں، اور اپنی منتیں پوری کریں، اور اس بیتِ عتیق کا طواف کریں۔ ۲۹

خلاصہ تفسیر

اور (اس قصہ کا تذکرہ کیجئے) جب کہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلادی (کیونکہ اس وقت

خانہ کعبہ بنا ہوا نہ تھا اور حکم دیا) کہ (اس مکان کو عبادت کے لئے تیار کرو اور اس عبادت میں) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا (یہ دراصل ان کے بعد کے لوگوں کو سُنانا تھا اور بناء بیت اللہ کے ساتھ شرک کی ممانعت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ بیت اللہ کی طرف نماز اور اس کا طواف کرنے سے کسی جاہل کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ یہی معبود ہے) اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور (نماز میں) قیام اور رکوع وسجود کرنے والوں کے واسطے (ظاہری اور باطنی نجاسات یعنی کفر وشرک سے) پاک رکھنا (یہ بھی دراصل دوسروں ہی کو سُنانا تھا ابراہیم علیہ السلام سے تو اس کے خلاف کا احتمال ہی نہ تھا) اور (ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے) کا اعلان کردو (اس اعلان سے) لوگ تمہارے پاس (یعنی تمہاری اس مقدس عمارت کے پاس) چلے آئیں گے پیادہ بھی اور (طولِ سفر کی وجہ سے دُبلی ہو جانے والی) اُونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی (اور وہ لوگ اس لئے آئیں گے) تاکہ اپنے (اپنے دینی اور دُنیوی) فوائد کے لئے حاضر ہو جائیں (دینی فوائد تو معلوم ومشہور ہیں دُنیوی فوائد بھی اگر مقصود نہ ہوں مثلاً خرید وفروخت اور قربانی کا گوشت وغیرہ تو یہ بھی کوئی مذموم نہیں) اور (اس لئے آئیں گے) تاکہ ایامِ مقررہ میں (جو قربانی کے ایام دسویں سے بارہویں ذی الحجہ تک ہیں) اُن مخصوص چوپاؤں پر (یعنی قربانی کے جانوروں پر ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں جو خدا تعالیٰ نے اُن کو عطا کئے ہیں (ابراہیم علیہ السلام کے خطاب کا مضمون ہو چکا آگے اُمّتِ محمدیہ مخاطب ہے) ان (قربانی کے) جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو (کہ یہ جائز ہے اور مستحب یہ ہے کہ) مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو پھر (قربانی کے بعد) لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دُور کریں (یعنی احرام کھول ڈالیں سر منڈالیں) اور اپنے واجبات کو (خواہ نذر سے قربانی وغیرہ واجب کرلی ہو یا بلانذر جو افعال حج کے واجب ہیں اُن سب کو) پورا کریں اور (انہی ایام معلومات میں) اس مامون ومحفوظ گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں (یہ طواف زیارت کہلاتا ہے)۔

معارف ومسائل

اس سے پہلی آیت میں مسجد حرام اور حرم سے روکنے والوں پر عذابِ شدید کی وعید آئی ہے آگے اس کی مناسبت سے بیت اللہ کے خاص فضائل اور عظمت کا بیان ہے جس سے اُن کے فعل کی قباحت اور زیادہ واضح ہو جائے۔

بناء بیت اللہ کی ابتدا

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ، بـوّء کا لفظ لغت میں کسی کو ٹھکانا اور رہنے کا مکان دینے کے معنے میں آتا ہے۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ یہ بات قابلِ ذکر اور یاد رکھنے کی ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اُس جگہ کا ٹھکانا دیا جہاں

بیت اللہ ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے اس زمین پر آباد نہ تھے جیسا کہ روایات سے ثابت ہے کہ اُن کو مُلک شام سے ہجرت کرا کر یہاں لایا گیا تھا۔ اور مکان البیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے موجود تھا جیسا کہ معتبر روایات میں ہے کہ اس کی پہلی بناء تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر لانے سے پہلے یا اُس کے ساتھ ہوئی تھی اور آدم علیہ السلام اور اُن کے بعد کے انبیاء بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے وقت بیت اللہ کی تعمیر اُٹھائی گئی تھی بنیادیں اور اس کی معین جگہ موجود تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہیں لاکر ٹھہرایا گیا [۱] اور ان کو حکم دیا گیا اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــًٔا، یعنی میری عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شرک کرنے کا کوئی احتمال نہیں۔ اُن کی بُت شکنی اور شرک کرنے والوں کا مقابلہ اور اس میں سخت ترین آزمائش کے واقعات پہلے ہو چکے تھے اس لئے مراد اس سے عام لوگوں کو سُنانا ہے کہ شرک سے پرہیز کریں۔

دوسرا حکم یہ دیا گیا وَطَهِّرْ بَیْتِیَ (یعنی میرے گھر کو پاک کیجئے) اس وقت اگرچہ گھر موجود نہیں تھا مگر بیت اللہ دراصل درو دیوار اور تعمیر کا نام نہیں، وہ اُس بقعۂ مقدسہ کا نام ہے جس میں بیت اللہ پہلے بنایا گیا تھا اور اب دوبارہ بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ بقعہ اور مکان بہر حال موجود تھا اُس کو پاک کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ اس زمانے میں بھی قوم جُرہم اور عمالقہ نے یہاں کچھ بُت رکھے ہوئے تھے جن کی پوجا پاٹ ہوتی تھی (ذکرہ القرطبی) [۲] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکم آئندہ آنے والوں کو سُنانا ہو اور پاک کرنے سے مراد جیسے کفر و شرک سے پاک رکھنا ہے ایسے ہی ظاہری نجاسات اور گندگیوں سے پاک رکھنا بھی مراد ہے اور ابراہیم علیہ السلام کو اس کا خطاب کرنے سے دوسرے لوگوں کو اہتمام کی فکر دلانا مقصود ہے کہ جب خلیل اللہ کو اس کا حکم ہوا جو خود ہی اس پر عامل تھے تو ہمیں اس کا اہتمام کتنا کرنا چاہئے۔

تیسرا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ دیا گیا کہ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ، یعنی لوگوں میں اعلان کر دیجئے کہ اس بیت اللہ کا حج تم پر فرض کر دیا گیا ہے۔ بغوی۔ [۳] ابن ابی حاتم نے حضرت ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو فرضیت حج کے اعلان کا حکم ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ (یہاں تو جنگلی میدان ہے کوئی سُننے والا نہیں) جہاں آبادی ہے وہاں میری آواز کیسے پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کی ذمہ داری صرف اعلان کرنے کی ہے اس کے ساری دُنیا میں پہنچانے اور پھیلانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مقامِ ابراہیم پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت اُونچا کر دیا [۴] اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے جبل ابی قبیس پر چڑھ کر یہ اعلان کیا، کانوں

---

[۱] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۴۴، والتفسير الكبير للرازیؒ تحت تفسير سورة آل عمران، رقم الآية:۹۶، ج:۴ ص:۳۰۶ [۲] تفسير القرطبی ج:۱۲ ص:۳۷ [۳] تفسير البغوی تحت هذه الآية ج:۵ ص:۳۷۸

[۴] المستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:۳۴۶۴، ومصنف ابن ابی شيبة رقم الحديث:۳۱۸۱۸ (بالإختصار)

میں انگلیاں رکھ کر داہنے اور بائیں اور شرقاً وغرباً ہر طرف یہ نداء دی کہ اے لوگو! تمہارے رَبّ نے اپنا بیت بنایا ہے اور تم پر اس بیت کا حج فرض کیا ہے تو تم سب اپنے رَبّ کے حکم کی تعمیل کرو۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ آواز اللہ تعالیٰ نے ساری دُنیا میں پہنچادی اور صرف اُس وقت کے زندہ انسانوں تک ہی نہیں بلکہ جو انسان آئندہ تا قیامت پیدا ہونے والے تھے بطور معجزہ اُن سب تک یہ آواز پہنچادی گئی اور جس جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے حج کرنا لکھ دیا ہے اُن میں سے ہر ایک نے اس آواز کے جواب میں لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہا یعنی حاضر ہونے کا اقرار کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حج کے تلبیہ کی اصل بنیاد یہی نداء ابراہیمی کا جواب ہے۔ (قرطبی ومظہری) [1]

آگے آیت میں اُس تاثیر کا ذکر ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کو تمام انسانوں تک منجانب اللہ پہنچانے سے قیامت تک کے لئے قائم ہوگئی وہ یہ ہے يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾ یعنی اطرافِ عالم سے لوگ بیت اللہ کی طرف چلے آئیں گے کوئی پیادہ کوئی سوار، اور سواری سے آنے والے بھی دُور دراز ملکوں سے آئیں گے جس سے ان کی سواریاں بھی لاغر ہو جائیں گی۔ چنانچہ اُس وقت سے آج تک کہ ہزار ہا سال گزر چکے ہیں بیت اللہ کی طرف حج کے لئے آنے والوں کی یہی کیفیت ہے۔ بعد میں آنے والے سب انبیاء اور اُن کی اُمتیں بھی اس کی پابند رہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو طویل دَورِ جاہلیت کا گزرا ہے اس میں بھی عرب کے باشندے اگرچہ بُت پرستی کی بلاء میں مبتلا ہوگئے تھے مگر حج کے ارکان کے اُسی طرح پابند تھے جس طرح ابراہیم علیہ السلام سے منقول و مأثور چلا آتا تھا۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ، یعنی اُن کی یہ حاضری دور دراز سفر طے کر کے اپنے ہی منافع کے لئے ہے قرآن میں منافع کو بصیغۂ نکرہ لاکر اس کے عموم کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس میں دینی منافع تو بیشمار ہیں ہی دُنیوی منافع بھی بہت مشاہدہ میں آتے ہیں۔ کم از کم اتنی بات تو خود قابلِ تعجب وحیرت ہے کہ حج کے سفر پر عموماً بڑی رقم خرچ ہوتی ہے جو بعض لوگ ساری عمر محنت کر کے تھوڑی تھوڑی بچا کر جمع کرتے ہیں اور یہاں بیک وقت خرچ کر ڈالتے ہیں لیکن ساری دُنیا کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں بتایا جاسکتا کہ کوئی شخص حج یا عمرہ میں خرچ کرنے کی وجہ سے فقیر ومحتاج ہوگیا ہو۔ اس کے سوا دوسرے کاموں مثلاً بیاہ شادی کی رسموں میں، مکان تعمیر کرنے میں خرچ کر کے ہزاروں آدمی محتاج وفقیر ہونے والے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سفر حج وعمرہ میں یہ خصوصیت بھی رکھی ہے کہ اس سے کوئی شخص دُنیوی فقر وفاقہ میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ بعض روایات میں ہے کہ حج وعمرہ میں خرچ کرنا افلاس ومحتاجی کو دُور کر دیتا ہے [2] غور کیا جائے تو اس کا بھی مشاہدہ عموماً پایا

[1] تفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث: ۱۴۷۱۱، ۱۴۷۱۲، ج:۹ ص:۲۷۳، وتفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۳۸، والمظهری ج:٦ ص:۲۷۵

[2] اس مفہوم کی ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں: جامع الترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء في ثواب الحج والعمرة ج:۱ ص:۱٦۷

جائے گا اور حج کے دینی منافع تو بہت ہیں اُن میں سے ایک یہی کچھ کم نہیں جو حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اللہ کے لئے حج کیا اور اُس میں بے حیائی کی باتوں سے اور گناہ کے کاموں سے بچتا رہا تو وہ حج سے ایسی حالت میں واپس آئے گا کہ گویا یہ اپنی ماں کے پیٹ سے آج برآمد ہوا ہے یعنی جیسے ابتداء ولادت میں بچہ بے گناہ معصوم ہوتا ہے یہ بھی ایسا ہی ہو جائے گا۔ رواہ البخاری ومسلم (مظہری) [1] بیت اللہ کے پاس جمع ہونے والے حجاج کے آنے کا ایک فائدہ تو اوپر مذکور ہوا کہ وہ اپنے دینی اور دُنیوی منافع اور فوائد کا مشاہدہ کرلیں۔ دوسرا فائدہ یہ بتلایا گیا کہ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ یعنی تا کہ وہ اللہ کا نام ذکر کریں ایام معلومات میں اُن چوپایہ جانوروں پر جو اللہ نے اُن کو عطا فرمائے ہیں۔ اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قربانی کے گوشت اور اُس سے حاصل ہونے والے فوائد پر نظر نہ ہونی چاہئے بلکہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے جو اِن دنوں میں قربان کرنے کے وقت جانوروں پر کیا جاتا ہے جو روحِ عبادت ہے۔ قربانی کا گوشت اُن کے لئے حلال کر دیا گیا یہ مزید انعام ہے۔ اور ایام معلومات سے مراد وہی دن ہیں جن میں قربانی جائز ہے یعنی ذی الحجہ کی دسویں، گیارہویں بارہویں تاریخیں۔ اور مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ کے الفاظ عام ہیں اس میں ہر طرح کی قربانی داخل ہے خواہ واجب ہو یا مستحب فَكُلُوْا مِنْهَا، یہاں لفظ كُلُوْا اگرچہ بصیغہ امر آیا ہے مگر مراد اس سے وجوب نہیں بلکہ اباحت و جواز ہے جیسا قرآن کی آیت [2] وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ (المائدۃ:۲) میں شکار کا حکم بمعنے اجازت ہے۔

مسئلہ:- مکہ معظّمہ اور زمانۂ حج میں مختلف قسم کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو کسی جرم کی سزا کے طور پر جانور کی قربانی واجب ہو جاتی ہے جیسے کسی نے حرم شریف کے اندر شکار مار دیا تو اُس پر اُس کی جزاء میں کسی جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں ہے کہ کون سے جانور کے بدلے میں کس طرح کا جانور قربان کرنا ہے۔ اسی طرح جو کام احرام کی حالت میں ممنوع ہیں اگر کسی نے وہ کام کر لیا تو اس پر بھی جانور ذبح کرنا لازم اور واجب ہو جاتا ہے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں دمِ جنایت کہا جاتا ہے اس میں بھی کچھ تفصیل ہے بعض ممنوعات کے کر لینے سے گائے یا اونٹ ہی کی قربانی دینا ضروری ہوتا ہے اور بعض کے لئے بکرے دُنبے کی کافی ہوتی ہے بعض میں دَم واجب نہیں ہوتا صرف صدقہ دینا کافی ہوتا ہے۔ ان تفصیلات کی یہ جگہ نہیں، احقر نے اپنے رسالہ احکام الحج میں بقدر ضرورت لکھ دیا ہے۔ یہ قسم دَم کی جو کسی جنایت اور جُرم کی سزا کے طور پر لازم ہوا ہے اس کا گوشت کھانا خود اس شخص کے لئے جائز نہیں بلکہ یہ صرف فقراء

---

[1] صحیح البخاری، ابواب العمرۃ، باب قول اللہ عز وجل ولا فسوق ولا جدال فی الحج ج:۱ ص:۲۴۵، وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل الحج، ج:۱ ص:۴۳۶، وتفسیر المظہری ج:۲ ص:۲۷۶

[2] ترجمہ: اور جس وقت تم احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کیا کرو۔

ومساکین کا حق ہے کسی دوسرے مالدار آدمی کو بھی اس کا کھانا جائز نہیں۔ اس پر تمام فقہاءِ اُمت کا اتفاق ہے۔ باقی قسمیں قربانی کی خواہ واجب ہوں یا نفلی، واجب میں حنفیہ مالکیہ شافعیہ [۱] کے نزدیک دَمِ تمتع اور دَمِ قران بھی داخل ہے ان سب کا گوشت قربانی کرنے والا، اس کے احباب واعزاء اگرچہ اغنیاء ہوں وہ بھی کھا سکتے ہیں اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور پوری تفصیل اس کے مسائل کی کتب فقہ میں دیکھی جائے۔ عام قربانی کا گوشت ہو یا خاص حج کی قربانیاں ان سب کا حکم یہی ہے کہ قربانی کرنے والا خود اور ہر مسلمان غنی ہو یا فقیر اس میں سے کھا سکتا ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ کم از کم ایک تہائی حصّہ غرباء فقراء کو دیدیا جائے۔ اسی امر مستحب کا بیان آیت کے اگلے جملے میں اس طرح فرمایا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ ﴿۲۹﴾ بائس کے معنے بہت تنگدست مصیبت زدہ اور فقیر کے معنے حاجتمند کے ہیں مطلب یہ ہے کہ قربانی کے گوشت میں سے ان کو بھی کھلانا اور دینا مستحب اور مطلوب ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ، تفث کے لغوی معنے میل کچیل کے ہیں جو انسان کے بدن پر جمع ہو جاتا ہے، حالتِ احرام میں چونکہ بالوں کا مونڈنا، کاٹنا، نوچنا، اسی طرح ناخن تراشنا، خوشبو لگانا یہ سب چیزیں حرام ہوتی ہیں تو ان کے نیچے میل کچیل جمع ہونا طبعی امر ہے، اس آیت میں یہ فرمایا کہ جب حج میں قربانی سے فارغ ہو جاؤ تو اس میل کچیل کو دُور کرو، مطلب یہ ہے کہ اب احرام کھول ڈالو اور سر منڈالو، ناخن تراشو، زیرِ ناف کے بال صاف کرلو۔ آیت مذکورہ میں پہلے قربانی کرنے کا ذکر آیا اس کے بعد احرام کھولنے کا، اِس سے مستفاد ہوتا ہے کہ اسی ترتیب سے کام کرنا چاہئے، قربانی سے پہلے حلق کرنا یا ناخن کاٹنا وغیرہ ممنوع ہے اور جو ایسا کرے گا اُس پر دَمِ جنایت واجب ہوگا۔

افعالِ حج میں ترتیب کا درجہ

جو ترتیب افعال حج کی قرآن وحدیث میں آئی اور فقہاء نے اس کو منضبط کیا اسی ترتیب سے افعال حج ادا کرنا باتفاقِ اُمّت کم از کم سنّت ضرور ہے واجب ہونے میں اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کے نزدیک واجب ہے جس کے خلاف کرنے سے ایک دَم جنایت لازم ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک سنت ہے اس لئے اس کے خلاف کرنے سے ثواب میں کمی آتی ہے مگر دم لازم نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے مَنْ قَدَّمَ شَيْئًا مِّنْ نُّسُكِهٖ اَوْ اَخَّرَهٗ فَلْيُهْرِقْ دَمًا رواه ابن ابى شيبة موقوفًا وهو فى حكم المرفوع (مظہری) [۲] یعنی جس شخص نے افعال حج میں سے

---

[۱] یہاں شافعیہ کا مسلک ذکر کرنے میں تسامح ہوا ہے۔ شافعیہ کے نزدیک دم تمتع اور دمِ قران کا گوشت کھانا دم دینے والے کے لئے جائز نہیں ہے۔ (المجموع شرح المهذب ج:۸ ص:۴۱۷) تفسیر مظہری میں بھی اسی کے مطابق مسئلہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ حنفیہ کے نزدیک نذر قربانی کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں ہے۔ (فتح القدير ج:۳ ص:۸۰ والبحر الرائق ج:۳ ص:۷۶) بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۳/۴/۱۴۳۳ھ

[۲] تفسير المظهرى ج:٦ ص:۲۸۰، ومصنف ابن ابى شيبة، رقم الحديث:۱۴۹۵۸ (باختلاف يسير)

کسی کو مقدم یا مؤخر کر دیا اُس پر لازم ہے کہ ایک دم دے۔ یہ روایت طحاوی نے بھی مختلف طرق سے نقل کی ہے اور حضرت سعید بن جبیرؒ، قتادہؒ، نخعیؒ، حسن بصریؒ کا بھی یہی مذہب ہے کہ خلاف ترتیب کرنے والے پر دم لازم کرتے ہیں۔ تفسیر مظہری میں اس جگہ اس مسئلہ کی پوری تفصیل و تحقیق مذکور ہے۔ نیز دوسرے مسائل حج بھی مفصّل لکھے ہیں۔ [۱]

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ، نذور، نذر کی جمع ہے جس کو اُردو میں مَنّت کہا جاتا ہے اُس کی حقیقت یہ ہے کہ جو کام شرعاً کسی شخص پر لازم، واجب نہیں تھا اگر وہ زبان سے یہ نذر کر لے اور منّت مان لے کہ میں یہ کام کروں گا یا اللہ کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ فلاں کام کروں تو یہ نذر ہو جاتی ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے اگر چہ اصل سے واجب نہیں تھا مگر اس کے واجب ہو جانے کے لئے یہ شرط تو باتفاق اُمت ہے کہ وہ کام شرعاً گناہ اور ناجائز نہ ہو۔ اگر کسی شخص نے گناہ کے کام کی نذر مان لی تو اُس پر وہ گناہ کرنا اس سے لازم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ اس کے خلاف کرنا واجب ہے البتہ اُس پر کفارۂ قسم لازم ہو جائے گا۔ اور ابوحنیفہؒ وغیرہ ائمہ فقہاء کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ وہ کام ایسا ہو جس کی جنس میں کوئی عبادت مقصودہ شرعیہ پائی جاتی ہو جیسے نماز، روزہ، صدقہ، قربانی وغیرہ کہ ان کی جنس میں کچھ شرعی واجبات اور عبادات مقصودہ ہیں۔ تو اگر کوئی شخص نفلی نماز روزے صدقہ وغیرہ کی نذر مان لے تو وہ نفل اس کے ذمہ واجب ہو جاتی ہے اُس کا پورا کرنا اس کے ذمّہ لازم و واجب ہے۔ آیت مذکورہ سے یہی حکم ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں نذر کے ایفاء یعنی پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ

یہ یاد رہے کہ صرف دل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنے سے نذر نہیں ہوتی جب تک زبان سے الفاظ نذر ادا نہ کرے۔ تفسیر مظہری میں اس جگہ نذر اور منّت کے احکام و مسائل بڑی تفصیل سے جمع کر دیئے ہیں جو اپنی جگہ بہت اہم ہیں مگر یہاں اُن کی گنجائش نہیں۔ [۲]

ایک سوال اور جواب

اس آیت سے پہلے بھی اعمالِ حج قربانی اور احرام کھولنے وغیرہ کا ذکر ہوا ہے اور آگے بھی طواف زیارت کا بیان ہے درمیان میں ایفاء نذر کا ذکر کس مناسبت سے ہوا جبکہ ایفائے نذر ایک مستقل حکم ہے حج میں ہو یا حج کے بغیر اور حرم شریف میں ہو یا باہر کسی مُلک میں۔

جواب یہ ہے کہ اگر چہ ایفاء نذر ایک مستقل حکم شرعی ہے ایّامِ حج اور افعال حج یا حرم کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن اس

---

[۱] تفسیر المظھری ج:۶ ص:۲۷۷ تا ۲۸۳ [۲] تفسیر المظھری ج:۶ ص:۲۸۴ تا ۳۰۵

کا ذکر یہاں افعال حج کے ضمن میں شاید اس وجہ سے ہے کہ انسان جب حج کے لئے نکلتا ہے تو دل کا داعیہ ہوتا ہے کہ اس سفر میں زیادہ سے زیادہ نیک کام اور عبادات ادا کرے اس میں بہت سی چیزوں کی نذر بھی کر لیتا ہے خصوصاً جانوروں کی قربانی کی نذر کرنے کا تو عام رواج ہے حضرت ابن عباسؓ نے یہاں نذر سے مراد قربانی ہی کی نذر قرار دی ہے۔ اور ایک مناسبت نذر کی احکامِ حج سے یہ بھی ہے کہ جس طرح نذر اور قسم سے انسان پر بہت سی چیزیں جو اصل شرع کی رُو سے واجب نہیں تھیں واجب ہو جاتی ہیں۔ اور بہت سی چیزیں جو اصل احکام کی رو سے حرام ناجائز نہیں تھیں وہ اس شخص پر ناجائز وحرام ہو جاتی ہیں۔ احرام کے تمام احکام تقریباً ایسے ہی ہیں کہ سلے ہوئے کپڑے، خوشبو کا استعمال، بال مونڈنا، ناخن تراشنا وغیرہ فی نفسہٖ کوئی ناجائز کام نہ تھے مگر اس نے احرام باندھ کر یہ سب کام اپنے اوپر حرام کر لئے۔ اسی طرح حج کے دوسرے اعمال وافعال جو فرض تو عمر میں ایک ہی مرتبہ ہوتے ہیں مگر بعد میں حج وعمرہ کے لئے احرام باندھ کر یہ سب کام اس کے لئے فرض ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے حضرت عکرمہؓ نے اس جگہ نذور کی تفسیر میں یہی فرمایا کہ اس سے مواجب حج مراد ہیں جو حج کی وجہ سے اس پر لازم ہو گئے ہیں۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿۲۹﴾ یہاں طواف سے مراد طوافِ زیارت ہے جو دسویں تاریخ ذی الحجہ کو رمی جمرہ اور قربانی کے بعد کیا جاتا ہے یہ طواف حج کا دوسرا رکن اور فرض ہے پہلا رکن وقوف عرفات ہے جو اس سے پہلے ادا ہو جاتا ہے۔ طواف زیارت پر اِحرام کے سب اَحکام مکمل ہو کر پورا اِحرام کھل جاتا ہے۔ (روی ذلك عن ابن عباس ومجاهد والضحاك وجماعة بل قال الطبری وان لم یسلّم لہٗ لا خلاف بین المتأوّلین فی انہٗ طواف الإفاضة ویکون ذلك یوم النحر ازروح المعانی) [۱]

بَيْتِ عتيق، بیت اللہ کا نام بیت عتیق اس لئے ہے کہ عتیق کے معنے آزاد کے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے گھر کا نام بیت عتیق اس لئے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کفار وجبابرہ کے غلبہ اور قبضہ سے آزاد کر دیا ہے (رواہ الترمذی وحسنہ والحاکم وصححہ وابن جریر والطبرانی وغیرہم ازروح المعانی) [۲] کسی کافر کی مجال نہیں کہ اس پر قبضہ یا غلبہ کر سکے۔ اصحابِ فیل کا واقعہ اس پر شاہد ہے واللہ اعلم۔ تفسیر مظہری میں اس موقع پر طواف کے مفصل احکام ومسائل جمع کر دیئے ہیں جو بہت اہم قابلِ دید ہیں۔ [۳] واللہ اعلم

---

[۱] تفسیر الطبری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۸ ص:۲۱۵، ۲۱۶، وروح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۳ ص:۵۲

[۲] روح المعانی ج:۱۳ ص:۵۲، والمعجم الکبیر للطبرانیؒ رقم الحدیث:۲۸، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الحج ج:۲ ص:۱۵۰، والمستدرك للحاکمؒ رقم الحدیث:۳۴۲۲، تفسیر سورۃ الحج۔

[۳] تفسیر المظھری ج:۶ ص:۳۰۵ تا ۳۱۷

ذٰلِكَ ق وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ط وَاُحِلَّتْ لَكُمُ

یہ سُن چکے اور جو کوئی بڑائی رکھے اللہ کی حرمتوں کی سو وہ بہتر ہے اس کے لئے اپنے رب کے پاس اور حلال ہیں تم کو

الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا

چوپائے مگر جو تم کو سناتے ہیں سو بچتے رہو بتوں کی گندگی سے اور بچتے رہو

قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ لا حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ط وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ

جھوٹی بات سے ایک اللہ کی طرف کے ہوکر نہ کہ اس کے ساتھ شریک بناکر اور جس نے شریک بنایا اللہ کا

فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ

سو جیسے گر پڑا آسمان سے پھر اُچکتے ہیں اس کو اُڑنے والے مردار خوار یا جاڈالا اس کو ہوا نے

فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾ ذٰلِكَ ق وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا

کسی دُور مکان میں یہ سُن چکے اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا سو وہ

مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ

دل کی پرہیزگاری کی بات ہے تمہارے واسطے چوپایوں میں فائدے ہیں ایک مقرر وعدہ تک پھر اُن کو پہنچنا

اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ ع

اس قدیم گھر تک

آسان ترجمۂ قرآن

یہ ساری باتیں یاد رکھو، اور جو شخص اُن چیزوں کی تعظیم کرے گا جن کو اللہ نے حرمت دی ہے، تو اُس کے حق میں یہ

عمل اُس کے پروردگار کے نزدیک بہت بہتر ہے۔ سارے مویشی تمہارے لئے حلال کردیئے گئے ہیں، سوائے اُن جانوروں کے جن کی تفصیل تمہیں پڑھ کر سنادی گئی ہے۔ لہٰذا بتوں کی گندگی سے اور جھوٹی بات سے اس طرح بچ کر رہو ۝۳۰ کہ تم یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف رُخ کئے ہوئے ہو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ مانتے ہو۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر یا تو پرندے اُسے اُچک لے جائیں، یا ہوا اُسے کہیں دُور دراز کی جگہ لا پھینکے۔ ۝۳۱ یہ ساری باتیں یاد رکھو، اور جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو یہ بات دِلوں کے تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ ۝۳۲ تمہیں ایک معین وقت تک ان (جانوروں سے) فوائد حاصل کرنے کا حق ہے، پھر اُن کے حلال ہونے کی منزل اُسی قدیم گھر (یعنی خانۂ کعبہ) کے آس پاس ہے۔ ۝۳۳

خلاصہ تفسیر

یہ بات تو ہو چکی (جو حج کے مخصوص احکام تھے) اور (اب دوسرے عام احکام جن میں حج اور علاوہ حج کے دوسرے مسائل بھی ہیں سنو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے محترم احکام کی وقعت کرے گا سو یہ اس کے حق میں اس کے رَبّ کے نزدیک بہتر ہے (احکام کی وقعت کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ اُن کا علم بھی حاصل کرے اور یہ بھی کہ اُن پر عمل کا اہتمام کرے۔ اور احکامِ خداوندی کی وقعت کا اس کے لئے بہتر ہونا اس لئے ہے کہ وہ عذاب سے نجات اور دائمی راحت کا سامان ہے) اور ہاں مخصوص چوپاؤں کو باستثنائے اُن (بعض بعض) کے جو تم کو پڑھ کر سُنا دیئے گئے ہیں (یعنی سورۂ انعام وغیرہ کی آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا [1] (الانعام: ۱۴۵) میں حرام جانوروں کی تفصیل بتلادی گئی ہے ان کے سوا دوسرے چوپائے) تمہارے لئے حلال کردیے گئے ہیں (اس جگہ چوپایہ جانوروں کے حلال ہونے کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت سے کسی کو احرام کی حالت میں عام چوپائے جانوروں کی ممانعت کا شبہ نہ ہو جائے اور جب دین و دُنیا کی بھلائی احکام خداوندی کی تعظیم میں منحصر ہے) تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہو (کیونکہ بتوں کو خدا کے ساتھ شریک کرنا تو حکم الٰہی سے کھلی بغاوت ہے اس جگہ شرک سے بچنے کی ہدایت خاص طور پر اس لئے کی گئی کہ مشرکینِ مکہ اپنے حج میں جو تلبیہ پڑھتے تھے اُس میں اِلَّا شَرِیْکًا هُوَ لَكَ ملا دیتے تھے یعنی اللہ کا کوئی شریک بجز اُن بتوں کے نہیں ہے جو خود اُسی اللہ کے ہیں) اور جھوٹی بات سے بچتے رہو (خواہ وہ عقائد کا جھوٹ ہو جیسے مشرکین کا اعتقادِ شرک یا دوسری قسم کا جھوٹ) اس طور سے کہ اللہ کی طرف جھکے رہو اس کے ساتھ (کسی کو) شریک مت

[1] ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں اُن میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں۔

ٹھہراؤ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو (اُس کی حالت ایسی ہوگی جیسے) گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اُس کی بوٹیاں نوچ لیں یا اس کو ہوا نے کسی دُور دراز جگہ لے جا کر پٹک دیا۔ یہ بات بھی (جو بطور قاعدہ کلیہ کے تھی) ہو چکی اور (اب ایک ضروری بات قربانی کے جانوروں کے متعلق اور سُن لو کہ) جو شخص دینِ خداوندی کے ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو اُس کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ خدا سے ڈرنے سے حاصل ہوتا ہے (یادگاروں کا لحاظ رکھنے سے مراد احکامِ الٰہیہ کی پابندی ہے جو قربانی کے متعلق ہیں خواہ ذبح سے قبل کے احکام ہوں یا ذبح کے وقت کے ہوں جیسا اُس پر اللہ کا نام لینا یا بعد ذبح کے ہوں جیسے اُس کا کھانا یا نہ کھانا کہ جس کا کھانا جس کے لئے حلال ہے وہ کھائے جس کا کھانا جس کے لئے حلال نہیں وہ نہ کھائے۔ ان احکام میں کچھ تو پہلے بھی ذکر کئے جا چکے اور کچھ یہ ہیں کہ) تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے (یعنی جب تک وہ قواعد شرعیہ کے مطابق ہدی نہ بنائے جائیں تو اُن سے دودھ یا سواری، بار برداری وغیرہ کا فائدہ اُٹھانا جائز ہے مگر جب اُن کو بیت اللہ اور حج یا عمرہ کے لئے ہدی بنا دیا تو پھر اُن سے کوئی نفع اُٹھانا جائز نہیں)۔ پھر (یعنی ہدی بننے کے بعد) اس کے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے (مراد پورا حرم ہے یعنی حرم سے باہر ذبح نہ کریں)۔

معارف و مسائل

حُرُمٰتِ اللّٰهِ سے مراد اللہ کی محترم اور معزز بنائی ہوئی چیزیں یعنی احکامِ شرعیہ ہیں۔ اُن کی تعظیم یعنی اُن کا علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا سرمایۂ سعادتِ دُنیا و آخرت ہے۔

وَاُحِلَّتۡ لَـكُمُ الۡاَنۡعَامُ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ، اَنعام سے مراد اُونٹ، گائے، بکرا، مینڈھا، دُنبہ وغیرہ ہیں کہ یہ جانور حالتِ احرام میں بھی حلال ہیں اور اِلَّا مَا يُتۡلٰى میں جن جانوروں کو مستثنیٰ کرنے کا ذکر ہے اُن کا بیان دوسری آیات میں آیا ہے وہ مردار جانور اور موقوذہ اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو یا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو یہ سب ہمیشہ کے لئے حرام ہیں حالت احرام کی ہو یا غیر احرام کی۔

فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ، رجس کے معنے ناپاک اور گندگی کے ہیں اور اَوۡثَان وَثَنٌ کی جمع ہے بُت کے معنے میں، بتوں کو نجاست اس لئے قرار دیا کہ وہ انسان کے باطن کو شرک کی نجاست سے بھر دیتے ہیں۔

وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ ۝۳۰ قول زُور سے مراد جھوٹ ہے، حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل اور جھوٹ میں داخل ہے خواہ عقائد فاسدہ شرک و کفر ہوں یا معاملات میں اور شہادت میں جھوٹ بولنا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ سب کبیرہ گناہوں میں سے بڑے کبیرہ یہ گناہ ہیں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا اور عام باتوں میں جھوٹ بولنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری لفظ وَقَوْلُ الزُّوْرِ کو بار بار فرمایا۔ (رواہ البخاری) [1]

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ، شعائر، شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنے علامت کے ہیں جو چیزیں کسی خاص مذہب یا جماعت کی علامات خاص سمجھی جاتی ہوں وہ اُس کے شعائر کہلاتے ہیں شعائرِ اسلام اُن خاص احکام کا نام ہے جو عرف میں مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں، حج کے اکثر احکام ایسے ہی ہیں۔

مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دِل کے تقویٰ کی علامت ہے ان کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقویٰ اور خوفِ خدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کا تعلق اصل میں انسان کے دل سے ہے جب اُس میں خوفِ خدا ہوتا ہے تو اس کا اثر سب اعمال افعال میں دیکھا جاتا ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى، یعنی چوپائے جانوروں سے دودھ، سواری، بار برداری ہر قسم کے منافع حاصل کرنا تمہارے لئے اس وقت تک تو حلال ہے جب تک اُن کو حرمِ مکّہ میں ذبح کرنے کے لئے نامزد کر کے ہَدیٰ نہ بنالیا ہو۔ ہَدیٰ اُسی جانور کو کہتے ہیں جو حج یا عمرہ کرنے والا اپنے ساتھ کوئی جانور لے جائے کہ اس کو حرم شریف میں ذبح کیا جائے گا۔ جب اُس کو ہدی حرم کے لئے نامزد اور مقرر کر دیا تو پھر اُس سے کسی قسم کا نفع اُٹھانا بغیر کسی خاص مجبوری کے جائز نہیں جیسے اونٹ کو ہدی بنا کر ساتھ لیا اور خود پیدل چل رہا ہے سواری کے لئے کوئی دوسرا جانور موجود نہیں اور پیدل چلنا اُس کے لئے مشکل ہو جائے تو مجبوری اور ضرورت کی بناء پر اس وقت سوار ہونے کی اجازت ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ یہاں بیت عتیق سے مراد پورا حرم شریف ہے جو درحقیقت بیت اللہ ہی کا حریم خاص ہے جیسے سابقہ آیت میں مسجد حرام کے لفظ سے پورا حرم مراد لیا گیا، یہاں بیتِ عتیق کے لفظ سے بھی پورا حرم مراد ہے اور مَحِلّها میں مَحِلّ کے معنے موضعِ حلولِ اجل کے ہیں مراد اس سے موضعِ ذبح ہے یعنی ہدی کے جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام بیتِ عتیق کے پاس ہے اور مراد پورا حرم ہے کہ وہ بیتِ عتیق ہی کے حکم میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدی کا ذبح کرنا حرم کے اندر ضروری ہے حرم سے باہر جائز نہیں۔ اور پھر حرم عام ہے خواہ منحر منیٰ ہو یا مکہ مکرّمہ کی کوئی اور جگہ ہو۔ (روح المعانی) [2]

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الشهادات، باب ما قیل فی شهادة الزور ج:۱ ص:۳۶۲

[2] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۳ ص:۲۱، ۶۲

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى

اور ہر اُمت کے واسطے ہم نے مقرر کردی ہے قربانی کہ یاد کریں اللہ کے نام

مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ

ذبح پر چوپایوں کے جو اُن کو اللہ نے دیئے سو اللہ تمہارا ایک اللہ ہے سو اسی کے حکم میں رہو

وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ

اور بشارت سُنادے عاجزی کرنے والوں کو وہ کہ جب نام لیجئے اللہ کا ڈر جائیں اُن کے دل اور سہنے والے

عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ ۙ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

اُس کو جو اُن پر پڑے اور قائم رکھنے والے نماز کے اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖۗ فَاذْكُرُوا

اور کعبہ کے چڑھانے کے اونٹ ٹھہرائے ہیں ہم نے تمہارے واسطے نشانی اللہ کے نام کی تمہارے واسطے اس میں بھلائی ہے سو پڑھو

اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا

اُن پر نام اللہ کا قطار باندھ کر پھر جب گر پڑے اُن کی کروٹ تو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ

الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾

صبر سے بیٹھے کو اور بیقراری کرتے کو اسی طرح تمہارے بس میں کردیا ہم نے ان جانوروں کو تاکہ تم احسان مانو

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ

اللہ کو نہیں پہنچتا اُن کا گوشت اور ان کا لہو لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب اسی طرح

سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

اُن کو بس میں کر دیا تمہارے کہ اللہ کی بڑائی پڑھو اس بات پر کہ تم کو راہ سجھائی اور بشارت سُنا دے نیکی والوں کو

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے ہر اُمت کے لئے قربانی اس غرض کے لئے مقرّر کی ہے کہ وہ اُن مویشیوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے اُنہیں عطا فرمائے ہیں۔ لہٰذا تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، چنانچہ تم اُسی کی فرماں برداری کرو، اور خوشخبری سنا دو اُن لوگوں کو جن کے دِل اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں، ﴿۳۴﴾ جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دِلوں پر رُعب طاری ہو جاتا ہے، اور جو اپنے اُوپر پڑنے والی ہر مصیبت پر صبر کرنے والے ہیں، اور نماز کو قائم کرنے والے ہیں، اور جو رزق ہم نے اُنہیں دیا ہے، اُس میں سے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتے ہیں۔ ﴿۳۵﴾ اور قربانی کے اُونٹ اور گائے کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کے شعائر میں شامل کیا ہے، تمہارے لئے اُن میں بھلائی ہے۔ چنانچہ جب وہ ایک قطار میں کھڑے ہوں، اُن پر اللہ کا نام لو، پھر جب (ذبح ہو کر) اُن کے پہلو زمین پر گر جائیں تو اُن (کے گوشت) میں سے خود بھی کھاؤ، اور اُن محتاجوں کو بھی کھلاؤ جو صبر سے بیٹھے ہوں، اور اُن کو بھی جو اپنی حاجت ظاہر کریں۔ اور ان جانوروں کو ہم نے اسی طرح تمہارے تابع بنا دیا ہے تاکہ تم شکر گذار بنو۔ ﴿۳۶﴾ اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے، نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اُس نے یہ جانور اسی طرح تمہارے تابع بنا دیئے ہیں، تاکہ تم اس بات پر اللہ کی تکبیر کرو کہ اُس نے تمہیں ہدایت عطا فرمائی۔ اور جو لوگ خوش اُسلوبی سے نیک عمل کرتے ہیں، اُنہیں خوشخبری سنا دو۔ ﴿۳۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (اُوپر جو قربانی کا حرم میں ذبح کرنے کا حکم ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مقصود اصلی تعظیم حرم کی ہے بلکہ اصل مقصود اللہ ہی کی تعظیم اور اس کے ساتھ تقریب ہے اور مذبوح اور مذبح اس کا ایک آلہ اور ذریعہ ہے اور تخصیص بعض حکمتوں کی وجہ سے ہے اور اگر یہ تخصیصات مقصودِ اصلی ہوتیں تو کسی شریعت میں نہ بدلتیں مگر ان کا بدلتا رہنا ظاہر ہے البتہ تقرب الی اللہ جو اصل مقصود تھا وہ سب شرائع میں محفوظ رہا چنانچہ) ہم نے (جتنے اہلِ شرائع گزرے ہیں ان میں سے) ہر اُمت کے لئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمایا تھا (پس اصلی مقصود یہ نام لینا تھا) سو (اس سے یہ بات نکل آئی کہ) تمہارا معبود (حقیقی) ایک ہی خدا ہے (جس کا ذکر کر کے سب کو

تقرب کا حکم ہوتا رہا) تو تم ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو (یعنی موحد خالص رہو، کسی مکان وغیرہ کو معظّم بالذات سمجھنے سے ذرّہ برابر شرک کا شائبہ اپنے عمل میں نہ ہونے دو) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ ہماری اس تعلیم پر عمل کریں) آپ (ایسے احکامِ الٰہیہ کے سامنے) گردن جھکا دینے والوں کو (جنت وغیرہ کی) خوشخبری سنا دیجئے جو (اس توحید خالص کی برکت سے) ایسے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ (کے احکام وصفات اور وعدہ وعید) کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جو ان مصیبتوں پر کہ اُن پر پڑتی ہیں صبر کرتے ہیں اور جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے (بقدر حکم اور توفیق کے) خرچ کرتے ہیں (یعنی توحید خالص ایسی بابرکت چیز ہے کہ اس کی بدولت کمالاتِ نفسانیہ وبدنیہ ومالیہ پیدا ہو جاتے ہیں) اور (اسی طرح اوپر جو تعظیم شعائر اللہ میں بعض انتفاعات کا ممنوع ہونا معلوم ہوا ہے اس سے بھی ان قربانیوں کے معظّم بالذات ہونے کا شبہ نہ کیا جائے کیونکہ اس سے بھی اصل وہی اللہ تعالیٰ کی اور اس کے دین کی تعظیم ہے اور یہ تخصیصات اس کا ایک طریق ہے پس) قربانی کے اونٹ اور گائے کو (اور اسی طرح بکری بھیڑ کو بھی) ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے (کہ اس کے متعلق احکام کے علم اور عمل سے اللہ کی عظمت اور دین کی وقعت ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے نامزد چیز سے منتفع ہونے میں مالک مجازی کی رائے قابلِ اعتبار نہ رہے جس سے اس کی پوری عبدیت اور مالک حقیقی کی معبودیت ظاہر ہوتی ہے اور اس حکمت دینی کے علاوہ) ان جانوروں میں تمہارے (اور بھی) فائدے ہیں (مثلاً دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا اور اخروی فائدہ ثواب ہے) سو (جب اس میں یہ حکمتیں ہیں تو) تم ان پر کھڑے کر کے (ذبح کرنے کے وقت) اللہ کا نام لیا کرو (یہ صرف اُونٹوں کے اعتبار سے فرمایا کہ ان کا کھڑے کر کے ذبح کرنا بوجہ آسانی ذبح وخروج روح کے بہتر ہے پس اس سے تو اُخروی فائدہ یعنی ثواب حاصل ہوا اور نیز اللہ کی عظمت ظاہر ہوئی کہ اس کے نام پر ایک جان قربان ہوئی جس سے اُس کا خالق اور اس کا مخلوق ہونا ظاہر کر دیا گیا) پس جب وہ (کسی) کروٹ کے بل گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہو جائیں) تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی (محتاج) کو (جو کہ بائس فقیر کی دو قسمیں ہیں) بھی کھانے کو دو۔ (کہ یہ دُنیوی فائدہ بھی ہے اور) ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا (کہ تم باوجود تمہارے ضعف اور اُن کی قوت کے اس طرح اس کے ذبح پر قادر ہو گئے) تا کہ تم (اس تسخیر پر اللہ تعالیٰ کا) شکر کرو (یہ حکمت مطلق ذبح میں ہے۔ قطع نظر اس کی قربانی ہونے کے اور آگے ذبح کی تخصیصات کے مقصود بالذات نہ ہونے کو ایک عقلی قاعدے سے بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو ظاہر بات ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے پاس نہ اُن کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ اُن کا خون، ولیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ (کہ نیتِ تقرب واخلاص اس کے شعبوں میں سے ہے البتہ) پہنچتا ہے (پس وہی تعظیم الٰہی کی مقصودیت ثابت ہوگئی اور جیسے اوپر كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا الخ میں تسخیر کی ایک عام حکمت یعنی قربانی ہونے کی خصوصیت سے قطع نظر کرنے کے اعتبار سے بیان ہوئی تھی آگے تسخیر کی ایک خاص حکمت یعنی بلحاظ قربانی ہونے کے ارشاد

فرماتے ہیں کہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا زیرِ حکم کر دیا کہ تم (اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر کے) اس بات پر اللہ کی بڑائی (بیان) کرو کہ اس نے تم کو (اس طرح قربانی کرنے کی) توفیق دی (ورنہ اگر توفیق الٰہی رہبر نہ ہوتی تو یا تو ذبح ہی میں شبہات نکال کر اس عبادت سے محروم رہتے اور یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے لگتے) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اخلاص والوں کو خوشخبری سُنا دیجئے (اس سے پہلے خوشخبری اخلاص کے شعبوں پر تھی یہ خاص اخلاص پر ہے)۔

معارف ومسائل

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا، لفظ مَنْسَك اور نُسُك، عربی زبان کے اعتبار سے کئی معنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ ایک معنی جانور کی قربانی کے دوسرے معنے تمام افعالِ حج کے اور تیسرے معنی مطلقاً عبادت کے ہیں۔ قرآن کریم میں مختلف مواقع پر یہ لفظ ان تین معنے میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں تینوں معنے مراد ہوسکتے ہیں اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے مجاہد وغیرہ نے اس جگہ منسک کو قربانی کے معنے میں لیا ہے۔ اس پر معنے آیت کے یہ ہوں گے کہ قربانی کا حکم جو اس اُمت کے لوگوں کو دیا گیا ہے کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلی سب اُمتوں کے بھی ذمہ قربانی کی عبادت لگائی گئی تھی۔ اور قتادہؒ نے دوسرے معنے میں لیا ہے جس پر مراد آیت کی یہ ہوگی کہ افعالِ حج جیسے اس اُمت پر عائد کئے گئے ہیں پچھلی اُمتوں پر بھی حج فرض کیا گیا تھا۔ ابن عرفہ نے تیسرے معنے لئے ہیں اس اعتبار سے مراد آیت کی یہ ہوگی کہ ہم نے اللہ کی عبادت گزاری سب پچھلی اُمتوں پر بھی فرض کی تھی طریقہ عبادت میں کچھ کچھ فرق سب اُمتوں میں رہا ہے مگر اصل عبادت سب میں مشترک رہی ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ لفظ خَبْت عربی زبان میں پست زمین کے معنی میں آتا ہے اسی لئے خَبِيْت اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے آپ کو حقیر سمجھے۔ اسی لئے حضرت قتادہ ومجاہد نے مخبتين کا ترجمہ مواضعین سے کیا ہے۔ عمرو بن اوس فرماتے ہیں کہ مخبتين وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم نہیں کرتے اور اگر کوئی اُن پر ظلم کرے تو اُس سے بدلہ نہیں لیتے۔ سفیان نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی قضاء وتقدیر پر راحت وکلفت فراخی اور تنگی ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ [1]

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ، وجل کے اصلی معنے اس خوف وہیبت کے ہیں جو کسی کی عظمت کی بناء پر دل میں پیدا ہو۔ اللہ کے نیک بندوں اور صلحاء کا یہی حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نام سُن کر اُن کے دلوں پر اُس کی عظمت اور بڑائی کے سبب ایک خاص ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، پہلے گزر چکا ہے کہ شعائر اُن خاص احکام وعبادات کا نام ہے جو دینِ اسلام کی علامات سمجھی جاتی ہیں۔ قربانی بھی اُنہیں میں سے ہے ایسے احکام کی پابندی زیادہ اہم ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی ج:۱۳ ص:۲۴

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ صَوَآفَّ بمعنے مصفوفہ ہے یعنی صف بستہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ جانور تین پاؤں پر کھڑا ہوا ایک ہاتھ بندھا ہوا ہو۔ [1] یہ صورت قربانی کی اُونٹ کے ساتھ مخصوص ہے اس کی قربانی کھڑے ہونے کی حالت میں سنت اور بہتر ہے، [2] باقی جانوروں کو لٹا کر ذبح کرنا سنت ہے۔

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا، یہاں وَجَبَتْ بمعنے سقطت آیا ہے جیسے وَجَبَتِ الشَّمْسُ بمعنے سَقَطَتْ کا محاورہ مشہور ہے مراد اس سے جانور کی جان کا نکل جانا ہے۔

الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ پچھلی آیت میں جن لوگوں کو قربانی کا گوشت دینا چاہئے ان کو بائس فقیر کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنے ہیں مصیبت زدہ محتاج۔ اس آیت میں اس کی جگہ قانع اور معتر کے دو لفظوں میں اُس کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قانع سے مراد وہ محتاج فقیر ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا اپنی غربت و فقر کے باوجود اپنی جگہ بیٹھ کر جو مل جائے اُس پر قناعت کرتا ہے اور معتر، جو ایسے مواقع پر جائے جہاں سے کچھ ملنے کی اُمید ہو خواہ زبان سے سوال کرے یا نہ کرے۔ (مظہری) [3]

عبادات کی خاص صورتیں اصل مقصود نہیں بلکہ دل کا اخلاص و اطاعت مقصود ہے

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ قربانی جو ایک عظیم عبادت ہے اللہ کے پاس اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا نہ وہ مقصود قربانی ہے بلکہ مقصود اصلی اس پر اللہ کا نام لینا اور حکم ربّی کی بجا آوری دلی اخلاص کے ساتھ ہے۔ یہی حکم دُوسری تمام عبادات کا ہے کہ نماز کی نشست و برخاست، روزہ میں بھوکا پیاسا رہنا اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود اصلی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل دلی اخلاص و محبت کے ساتھ ہے اگر یہ عبادات اس اخلاص و محبت سے خالی ہیں تو صرف صورت اور ڈھانچہ ہے روح غائب ہے مگر عبادات کی شرعی صورت اور ڈھانچہ بھی اس لئے ضروری ہے کہ حکم ربّانی کی تعمیل کے لئے اُس کی طرف سے یہ صورتیں متعین فرمادی گئی ہیں۔ واللہ اعلم

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ ع ۵ ۱۲

اللہ دشمنوں کو ہٹادے گا ایمان والوں سے اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی دغاباز ناشکر

---

[1] روح المعانی ج:۱۳ ص:۱۶۷

[2] صحیح البخاری، کتاب الحج، باب نحر الإبل مقیدۃ ج:۱ ص:۲۳۱، وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب نحر الإبل قیامًا معقولۃ ج:۱ ص:۴۲۴

[3] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۳۲۴

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک اللہ اُن لوگوں کا دِفاع کرے گا جو اِیمان لے آئے ہیں۔ یقین جانو کہ اللہ کسی دغاباز ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔ (۳۸)

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ان مشرکین کے غلبہ اور ایذاء رسانی کی قدرت کو) ایمان والوں سے (عنقریب) ہٹادے گا (کہ پھر حج وغیرہ سے روک ہی نہ سکیں گے) بیشک اللہ تعالیٰ کسی دغاباز کفر کرنے والے کو نہیں چاہتا (بلکہ ایسے لوگوں سے ناراض ہے اس لئے انجام کار ان لوگوں کو مغلوب اور مؤمنین مخلصین کو غالب کرے گا)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں اس کا ذکر تھا کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو جو عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ کے قریب مقامِ حدیبیہ پر پہنچ چکے تھے حرم شریف اور مسجد حرام میں جانے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تھا اس آیت میں مسلمانوں کو اس وعدہ کے ساتھ تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان مشرکین کی اس قوت کو توڑ دے گا جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں یہ واقعہ ۶ھ میں پیش آیا تھا اس کے بعد سے مسلسل کفار و مشرکین کی طاقت کمزور اور ہمت پست ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا۔ اگلی آیات میں اس کی تفصیل آرہی ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ (۳۹)

حکم ہوا اُن لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اس واسطے کہ اُن پر ظلم ہوا اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ

وہ لوگ جن کو نکالا اُن کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا ربّ اللہ ہے

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ

اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکیئے اور مدرسے اور عبادت خانے

وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ

اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت اور اللہ مقرر مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی

اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۴۰ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا

بیشک اللہ زبردست ہے زور والا وہ لوگ کہ اگر ہم اُن کو قدرت دیں مُلک میں تو وہ قائم رکھیں

الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں بُرائی سے

وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱

اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے، اُنہیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دِفاع میں لڑیں) کیونکہ اُن پر ظلم کیا گیا ہے، اور یقین رکھو کہ اللہ ان کو فتح دِلانے پر پوری طرح قادر ہے۔ ۝۳۹ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں صرف اتنی بات پر اپنے گھروں سے ناحق نکالا گیا ہے کہ اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کے ایک گروہ (کے شر) کو دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں اور کلیسا اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، سب مسمار کردی جاتیں۔ اور اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اُس (کے دِین) کی مدد کریں گے۔ بلاشبہ اللہ بڑی قوت والا، بڑے اقتدار والا ہے۔ ۝۴۰ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور لوگوں کو نیکی کی تاکید کریں، اور بُرائی سے روکیں۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔ ۝۴۱

خلاصۂ تفسیر

(گو اَب تک بمصالح کفار سے لڑنے کی ممانعت تھی لیکن اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دیدی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ اُن پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے (یہ علّت ہے مشروعیت جہاد کی) اور (اس حالتِ اذن میں مسلمانوں کی قلت اور کفار کی کثرت پر نظر نہ کرنا چاہئے کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے (آگے ان کی مظلومیت کا بیان ہے کہ) جو (بیچارے) اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ اللہ ہے (یعنی عقیدہ توحید پر کفار کا یہ تمام تر غیظ وغضب تھا کہ ان کو اس قدر پریشان کیا کہ وطن چھوڑنا پڑا آگے جہاد کی حکمت ہے) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتا رہتا (یعنی اہلِ حق کو اہلِ باطل پر وقتاً فوقتاً غالب نہ کرتا رہتا) تو (اپنے اپنے زمانوں میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم (اور منعدم) ہوگئے ہوتے (آگے اخلاص فی الجہاد پر غلبہ کی بشارت ہے) اور بیشک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو کہ اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا (یعنی اس کے لڑنے میں خالص نیت اعلاء کلمۃ اللہ کی ہو) بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) غلبہ والا ہے (وہ جس کو چاہے قوت وغلبہ دے سکتا ہے آگے ان کی فضیلت ہے) یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دُنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے (پس مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ انجام بھی ان کا یہی رہے گا بلکہ ممکن ہے کہ اس کا عکس ہوجائے چنانچہ ہوا)۔

معارف ومسائل

کفار کے ساتھ جہاد کا پہلا حکم

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار کے مظالم کا یہ حال تھا کہ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ کوئی مسلمان ان کے دستِ ستم سے زخمی اور چوٹ کھایا ہوا نہ آتا ہو۔ قیامِ مکّہ کے آخری دَور میں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہوچکی تھی وہ کفار کے ظلم وجور کی شکایت اور اُن کے مقابلے میں قتل وقتال کی اجازت مانگتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے کہ صبر کرو

مجھے ابھی تک قتال کی اجازت نہیں دی گئی یہ سلسلہ دس سال تک اسی طرح جاری رہا۔ (قرطبی عن ابن عربی) [۱]

جس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وطن مکہ چھوڑنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے اور صدیقِ اکبرؓ آپ کے رفیق تھے تو مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت آپ کی زبان سے نکلا اَخْرَجُوْا نَبِيَّهُمْ لَيَهْلِكُنَّ یعنی ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے اب اُن کی ہلاکت کا وقت آ گیا ہے اس پر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد یہ آیتِ مذکورہ نازل ہوئی (جس میں مسلمانوں کو کفار سے قتال کی اجازت دے دی گئی)۔ (رواہ النسائی والترمذی عن ابن عباس، قرطبی) [۲]

اور حضرت ابن عباسؓ سے ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن فرمایا ہے روایت یہ ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتالِ کفار کے معاملہ میں نازل ہوئی جبکہ اس سے پہلے ستر سے زیادہ آیتوں میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ [۳]

جہاد و قتال کی ایک حکمت

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ، اس میں جہاد و قتال کی حکمت کا اور اس کا بیان ہے کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلے انبیاء اور اُن کی اُمتوں کو بھی قتال کفار کے احکام دیئے گئے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کسی مذہب اور دین کی خیر نہ تھی سارے ہی دین و مذہب اور ان کی عبادت گاہیں ڈھا دی جاتیں۔

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ جتنے دین و مذہب دُنیا میں ایسے ہوئے ہیں کہ کسی زمانے میں اُن کی اصل بنیاد اللہ کی طرف سے اور وحی کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی پھر وہ منسوخ ہو گئے اور اُن میں تحریف ہو کر کفر و شرک میں تبدیل ہو گئے مگر اپنے اپنے وقت میں وہی حق تھے اُن سب کی عبادت گاہوں کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کیونکہ اپنے اپنے وقت میں اُن کی عبادت گاہوں کا احترام اور حفاظت فرض تھی اُن مذاہب کے عبادت خانوں کا ذکر نہیں فرمایا جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوّت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی جیسے آتش پرست مجوس یا بُت پرست ہندو کیونکہ ان کے عبادت خانے کسی وقت بھی قابل احترام نہ تھے۔

آیت میں صَوَامِعُ، صَوْمَعَةٌ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے تارک الدنیا راہبوں کی مخصوص عبادت گاہ کو کہا جاتا ہے اور بِيَعٌ، بِيْعَةٌ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے عام کنیسوں کا نام ہے اور صَلَوٰت صَلُوت کی جمع ہے جو یہود کے عبادت خانہ کا

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۶۹، واحکام القرآن لابن العربی ج:۵ ص:۴۲۹، سورۃ الحج الآیۃ الثالثۃ عشر۔

[۲] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الحج ج:۲ ص:۱۵۰، وسنن النسائی، کتاب الجهاد، باب وجوب الجهاد ج:۲ ص:۵۱

[۳] روح المعانی ج:۱۳ ص:۷۵ تحت هذه الآیة، والبحر المحیط ج:۸ ص:۲۲۴ تحت هذه الآیة، وتفسیر المظهری ج:۶ ص:۳۲۶، والمستدرك للحاکم رقم الحدیث:۲۳۳۷ (ناقصًا)

نام ہے اور مسجد مسلمانوں کی عبادت گاہوں کا نام ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر کفار سے قتال و جہاد کے احکام نہ آتے تو کسی زمانے میں کسی مذہب وملت کے لئے امن کی جگہ نہ ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صلوات اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صوامع اور بیع اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجدیں ڈھادی جاتیں۔ (قرطبی) [1]

خلفائے راشدین کے حق میں قرآن کی پیشین گوئی اور اُس کا ظہور

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ، اس آیت میں اَلَّذِيْنَ صفت ہے اُن لوگوں کی جن کا ذکر اس سے پہلے آیت میں ان الفاظ سے آیا ہے اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ ،یعنی وہ لوگ جن کو اُن کے گھروں سے ظلماً بغیر کسی حق کے نکال دیا گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو زمین میں حکومت واقتدار دیدیا جائے تو یہ لوگ اپنے اقتدار کو ان کاموں میں صرف کریں گے کہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کاموں کی طرف لوگوں کو دعوت دیں بُرے کاموں سے روکیں۔ اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ آیات ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد اُس وقت نازل ہوئی ہیں جبکہ مسلمانوں کو کسی بھی زمین میں حکومت واقتدار حاصل نہیں تھا مگر حق تعالیٰ نے اُن کے بارے میں پہلے ہی یہ خبر دیدی کہ جب اُن کو اقتدارِ حکومت ملے گا تو یہ دین کی مذکورہ اہم خدمات انجام دیں گے اسی لئے حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا ثَنَاءٌ قَبْلَ بَلَاءٍ، یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عمل کے وجود میں آنے سے پہلے اُس کے عمل کرنے والوں کی مدح وثناء ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی اس خبر کا جس کا وقوع یقینی تھا اس دُنیا میں وقوع اس طرح ہوا کہ چاروں خلفائے راشدین اور مہاجرین اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا کے مصداق صحیح تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کو سب سے پہلے زمین کی مکنت وقدرت یعنی حکومت وسلطنت عطا فرمائی اور قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اُن کے اعمال وکردار اور کارناموں نے دُنیا کو دکھلا دیا کہ اُنہوں نے اپنے اقتدار کو اسی کام میں استعمال کیا کہ نمازیں قائم کیں اور زکوٰۃ کا نظام مضبوط کیا اچھے کاموں کو رواج دیا بُرے کاموں کا راستہ بند کیا۔

اسی لئے علماء نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ خلفائے راشدین سب کے سب اسی بشارت کے مصداق ہیں اور جو نظامِ خلافت اُن کے زمانے میں قائم ہوا وہ حق وصحیح اور عین اللہ تعالیٰ کے ارادے اور رضا اور پیشگی خبر کے مطابق ہے۔ (روح المعانی) [2]

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۲ ص:۷۰ [2] روح المعانی ج:۱۳ ص:۷۹

یہ تو اس آیت کے شانِ نزول کا واقعاتی پہلو ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ الفاظِ قرآن جب عام ہوں تو وہ کسی خاص واقعہ میں منحصر نہیں ہوتے اُن کا حکم عام ہوتا ہے۔ اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے ضحاکؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اُن لوگوں کے لئے ہدایت بھی ہے جن کو اللہ تعالیٰ ملک وسلطنت عطا فرمائیں کہ وہ اپنے اقتدار میں یہ کام انجام دیں جو خلفائے راشدین نے اپنے وقت میں انجام دیئے تھے۔ (قرطبی مع توضیح) [۱]

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو اُن سے پہلے جھٹلاچکی ہے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود

وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى

اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم اور مدین کے لوگ اور موسیٰ کو جھٹلایا

فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ

پھر میں نے ڈھیل دی منکروں کو پھر پکڑلیا اُن کو تو کیسا ہوا میرا انکار سو کتنی

مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ

بستیاں ہم نے غارت کرڈالیں اور وہ گنہگار تھیں اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنویں نکمّے پڑے

وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ

اور کتنے محل گچکاری کے کیا سیر نہیں کی ملک کی جو اُن کے دل ہوتے

يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ

جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۷۳

تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿۴۶﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ

اندھے ہوجاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں اور تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب

وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ط وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ

اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ اور ایک دن تیرے رَبّ کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے

مِمَّا تَعُدُّونَ ﴿۴۷﴾ وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا ج

جو تم گنتے ہو اور کتنی بستیاں ہیں کہ میں نے اُن کو ڈھیل دی اور وہ گنہگار تھیں پھر میں نے ان کو پکڑا

وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿۴۸﴾ ع قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿۴۹﴾ ج ع ۱۲

اور میری طرف پھر کر آنا ہے تو کہہ اے لوگو میں تو ڈر سُنا دینے والا ہوں تم کو کھول کر

فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۵۰﴾

سو جو لوگ یقین لائے اور کیں بھلائیاں ان کے گناہ بخش دیتے ہیں اور ان کو روزی ہے عزت کی؛

وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿۵۱﴾

اور جو دوڑے ہماری آیتوں کے ہرانے کو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں، تو ان سے پہلے نوح کی قوم، اور عاد وثمود کی قومیں بھی (اپنے
اپنے پیغمبروں کو) جھٹلا چکی ہیں، (۴۲) نیز ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم (۴۳) اور مدین کے لوگ بھی۔ اور موسیٰ کو بھی جھٹلایا گیا تھا،
چنانچہ ان کافروں کو میں نے کچھ ڈھیل دی، پھر انہیں پکڑ میں لے لیا، اب دیکھ لو کہ میری پکڑ کیسی تھی! (۴۴) غرض کتنی بستیاں
تھیں جن کو ہم نے اُس وقت ہلاک کیا جب وہ ظلم کر رہی تھیں، چنانچہ وہ اپنی چھتوں کے بل گری پڑی ہیں، اور کتنے ہی کنویں

جواَب بیکار ہوئے پڑے ہیں، اور کتنے پکے بنے ہوئے محل (جو کھنڈر بن چکے ہیں) ﴿۴۵﴾ تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں جس سے اُنہیں وہ دِل حاصل ہوتے جو انہیں سمجھ دے سکتے، یا ایسے کان حاصل ہوتے جن سے وہ سن سکتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دِل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔ ﴿۴۶﴾ اور یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا، اور یقین جانو کہ تمہارے رَبّ کے یہاں کا ایک دن تمہاری گنتی کے مطابق ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے۔ ﴿۴۷﴾ اور کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں جنہیں میں نے مہلت دی تھی، اور وہ ظلم کرتی رہیں، پھر میں نے اُنہیں پکڑ میں لے لیا، اور سب کو آخرکار میرے پاس ہی لوٹنا ہوگا۔ ﴿۴۸﴾ (اے پیغمبر!) کہہ دو کہ: ''اے لوگو! میں تو تمہیں وضاحت کے ساتھ خبردار کرنے والا ہوں۔'' ﴿۴۹﴾ پھر جو لوگ ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرنے لگے، تو اُن کے لئے مغفرت ہے، اور باعزت رزق ہے۔ ﴿۵۰﴾ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو نیچا دِکھانے کے لئے دوڑ دُھوپ کی ہے، تو وہ دوزخ کے باسی ہیں۔ ﴿۵۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (مجادلہ کرنے والے لوگ) اگر آپ کی تکذیب کرتے ہوں (تو آپ مغموم نہ ہوں کیونکہ) ان لوگوں سے پہلے قوم نوح اور عاد وثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لُوط اور اہلِ مَدْین بھی (اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی) تکذیب کر چکے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی کاذب قرار دیا گیا (مگر تکذیب کے بعد) میں نے ان کافروں کو (چند روز) مہلت دی جیسے آج کے منکروں کو مہلت دے رکھی ہے پھر میں نے ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا تو (دیکھو) میرا عذاب کیسا ہوا۔ غرض کتنی بستیاں ہیں جن کو ہم نے (عذاب سے) ہلاک کیا جن کی یہ حالت تھی کہ وہ نافرمانی کرتی تھیں تو (اب ان کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں (یعنی ویران ہیں کیونکہ عادۃً اول چھت گرا کرتی ہے پھر دیواریں آپڑتی ہیں) اور (اس طرح ان بستیوں میں) بہت سے بیکار کنویں (جو پہلے آباد تھے) بہت سے پختہ قلعی چونے کے محل (جواَب شکستہ ہوگئے یہ سب ان بستیوں کے ساتھ تباہ ہوئے۔ پس اسی طرح وقت موعود پر اس زمانے کے لوگ بھی عذاب میں پکڑے جائیں گے) تو کیا یہ (سُن کر) لوگ مُلک میں چلے پھرے نہیں جس سے اُن کے دل ایسے ہوجائیں کہ ان سے سمجھنے لگیں یا اُن کے کان ایسے ہوجائیں کہ اُن سے سننے لگیں بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی کچھ) آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں (ان موجودہ منکرین کے بھی دل اندھے ہوگئے ورنہ پچھلی اُمتوں کے حالات سے سبق سیکھ لیتے) اور یہ لوگ (نبوّت میں شبہ ڈالنے کے لئے) آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں (اور عذاب کے جلدی نہ

آنے سے یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ عذاب آنے والا ہی نہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنا وعدہ خلاف نہ کرے گا (یعنی وعدہ کے وقت ضرور عذاب واقع ہوگا) اور آپ کے رَبّ کے پاس کا ایک دن (جس میں عذاب واقع ہوگا یعنی قیامت کا دن اپنے امتداد یا اشتداد میں) ایک ہزار سال کے برابر ہے تم لوگوں کی شمار کے مطابق (تو یہ بڑے بیوقوف ہیں کہ ایسی مصیبت کا تقاضا کرتے ہیں) اور (جواب مذکور کا خلاصہ پھر سُن لو کہ) بہت سی بستیاں ہیں جن کو میں نے مہلت دی تھی اور وہ نافرمانی کرتی تھیں پھر میں نے اُن کو (عذاب میں) پکڑ لیا اور سب کو میری ہی طرف لَوٹنا ہوگا (اُس وقت پوری سزا ملے گی) اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تو تمہارے لئے ایک صاف ڈرانے والا ہوں (عذاب واقع کرنے نہ کرنے میں میرا دخل نہیں نہ میں نے اس کا دعویٰ کیا ہے) تو جو لوگ (اس ڈر کو سن کر) ایمان لے آئے اور اچھے کام کرنے لگے ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے اور جو لوگ ہماری آیتوں کے متعلق (ان کے انکار اور ابطال کی) کوشش کرتے رہتے ہیں (نبی کو اور اہلِ ایمان کو) ہرانے (یعنی عاجز کرنے) کے لئے ایسے لوگ دوزخ میں (رہنے والے) ہیں۔

معارف و مسائل

زمین کی سیر و سیاحت اگر عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مطلوبِ دینی ہے

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ، اس آیت میں زمین کی سیر و سیاحت جبکہ بچشم عبرت ہو اس کی طرف ترغیب ہے اور فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ سے اس طرف اشارہ ہے کہ زمانہ ماضی اور گزشتہ اقوامِ عالم کے حالات و کیفیات کا مشاہدہ انسان کو عقل و بصیرت عطا کرنے والا ہے بشرطیکہ ان حالات کو محض تاریخی سوانح کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبرت کی نظر سے دیکھے تو ہر واقعہ ایک بصیرت کا سبق دے گا۔ ابن ابی حاتم نے کتاب التفکر میں حضرت مالک بن دینارؒ سے نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوہے کے جُوتے بناؤ اور لوہے کی عصا ہاتھ میں لو اور اللہ کی زمین میں اتنے پھرو کہ یہ آہنی جوتے گِھس جائیں اور آہنی عصا ٹوٹ جائے (روح المعانی) [1] اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سیر و سیاحت کا مقصود وہی عبرت و بصیرت حاصل کرنا ہے۔

آخرت کا دن ایک ہزار سال ہونے کا مطلب

آیتِ مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ، یعنی آپ کے رَبّ کے پاس ایک دن دُنیا کے

---

[1] تفسیر روح المعانی ج: ۱۳ ص: ۸۴

ایک ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن لیا جائے اور اُس کا ایک ہزار سال کے برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن کے ہولناک واقعات اور ہیبت ناک حالات کی وجہ سے یہ دن اتنا دراز محسوس ہوگا جیسے ایک ہزار سال خلاصہ تفسیر مذکور میں اسی کو اشتداد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے بہت سے حضرات مفسرین نے اس کے یہی معنے قرار دیئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقع میں عالمِ آخرت کا ایک دن ہمیشہ کے لئے دُنیا کے ایک ہزار سال ہی کے برابر ہو۔ بعض روایاتِ حدیث سے اسی معنے کی شہادت ملتی ہے۔ مسند احمد، ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز فقراء مہاجرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم کو میں قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت دیتا ہوں اور یہ کہ تم اغنیاء اور مالداروں سے آدھا دن پہلے جنت میں جاؤ گے اور اللہ کے یہاں ایک دن ایک ہزار سال کا ہوگا اس لئے فقراء اغنیاء سے پانچسو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ (رواہ الترمذی وحسنہ۔ مظہری) [۱]

خلاصۂ تفسیر میں اسی دوسرے معنے کو بلفظ امتداد تعبیر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

ایک شبہ کا جواب

سورۂ معارج میں جو آخرت کے دن کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا ہے کَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ ۝۴ [۲] (المعارج) اس میں بھی دونوں تفسیریں اشتداد و امتداد کی ہو سکتی ہیں اور ہر شخص کی شدت و مصیبت چونکہ دوسروں سے مختلف اور کم و بیش ہوگی اس لئے وہ دن کسی کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا کسی کو پچاس ہزار سال کا، اور اگر دوسرے معنے لئے جائیں کہ حقیقۃً آخرت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا تو ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہوتا ہے کہ ایک میں ایک ہزار سال اور دوسری میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے تو اس کی تطبیق سیّدی حکیم الامت قدس سرہٗ نے ''بیان القرآن'' میں بیان فرمائی ہے جو اہلِ علم کے لئے علمی اور اصطلاحی الفاظ ہی میں نقل کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تفاوت ایک ہزار سال سے پچاس ہزار سال تک اختلافِ آفاق کے اعتبار سے ہو، جس طرح دُنیا میں معدّل النہار کی حرکت کہیں دولابی ہے، کہیں حمائلی، کہیں رحوی، اور اسی وجہ سے خطِ استواء پر ایک رات دن چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے، اور عرض تسعین (قطب شمالی) پر ایک سال کا، اور ان دونوں کے درمیان مختلف مقادیر پر مختلف ہوتا چلا جاتا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ اوّل شمس کی حرکت جو معدل کے ساتھ ہے بطور خرقِ عادت و اِعجاز اس قدر سست ہو جائے کہ ایک اُفق

---

[۱] تفسیر المظھری ج:۶ ص:۳۳۵، وجامع الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء أن الفقراء المهاجرين إلخ (بالإختصار) ج:۲ ص:۶۰، ومسند احمد، مسند ابی سعيد الخدری رضی الله عنه رقم الحديث: ۱۱۹۱۹ (بالإختصار)

[۲] ترجمہ: جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

پر ایک ہزار سال کا دِن ہو، اور جو اُفق اُس سے پچاس حصے ہٹا ہوا ہو اُس پر پچاس ہزار برس کا ہو، اور درمیان میں اسی نسبت سے متفاوت ہو۔ واللہ اعلم (بیان القرآن) [۱]

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى

اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے

اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ

شیطان نے ملا دیا اُس کے خیال میں پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا پھر پکی کر دیتا ہے

اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۵۲ۙ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ

اپنی باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا اس واسطے کہ جو کچھ شیطان نے مِلایا اُس سے جانچے اُن کو

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ

کہ جن کے دل میں روگ ہیں اور جن کے دل سخت ہیں اور گنہگار تو ہیں

شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝۵۳ۙ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ

مخالفت میں دُور جا پڑے اور اس واسطے کہ معلوم کرلیں وہ لوگ جن کو سمجھ ملی ہے کہ یہ تحقیق ہے تیرے رَبّ کی طرف سے

فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

پھر اس پر یقین لائیں اور نرم ہو جائیں اُس کے آگے دِل اُن کے اور اللہ سمجھانے والا ہے یقین لانے والوں کو

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۴ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ

راہ سیدھی، اور منکروں کو ہمیشہ رہے گا اس میں دھوکا

---

[۱] تفسیر بیان القرآن ج:۷ ص:۷۷ تحت هٰذه الآیة۔

حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾

جب تک آپہنچے اُن پر قیامت بے خبری میں یا آپہنچے اُن پر آفت ایسے دن کی جس میں راہ نہیں خلاصی کی

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

راج اس دن اللہ کا ہے ان میں فیصلہ کرے گا سو جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ

نعمت کے باغوں میں ہیں اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتیں سو اُن کے لئے ہے

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾ ع ۷ ۹ ۱۴

ذلّت کا عذاب

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) تم سے پہلے ہم نے جب بھی کوئی رسول یا نبی بھیجا تو اس کے ساتھ یہ واقعہ ضرور ہوا کہ جب اُس نے (اللہ کا کلام) پڑھا تو شیطان نے اُس کے پڑھنے کے ساتھ ہی (کفار کے دِلوں میں) کوئی رُکاوٹ ڈال دی، پھر جو رُکاوٹ شیطان ڈالتا ہے، اللہ اُسے دُور کر دیتا ہے، پھر اپنی آیتوں کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے، اور اللہ بڑے علم کا، بڑی حکمت کا مالک ہے۔ ﴿۵۲﴾ یہ (شیطان نے رُکاوٹ اس لئے ڈالی) تا کہ جو رُکاوٹ شیطان نے ڈالی تھی، اللہ اُسے ان لوگوں کے لئے فتنہ بنادے جن کے دِلوں میں روگ ہے، اور جن کے دِل سخت ہیں۔ اور یقین جانو کہ یہ ظالم لوگ مخالفت میں بہت دُور چلے گئے ہیں۔ ﴿۵۳﴾ اور (اُس رُکاوٹ کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے دُور کیا) تا کہ جن لوگوں کو علم عطا ہوا ہے، وہ جان لیں کہ یہی (کلام) برحق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے، پھر وہ اُس پر اِیمان لائیں، اور اُن کے دِل اُس کے آگے جھک جائیں۔ اور یقین رکھو کہ اللہ ایمان والوں کو سیدھے راستے کی ہدایت دینے والا ہے۔ ﴿۵۴﴾ اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ اس (کلام) کی طرف سے برابر شک ہی میں پڑے رہیں گے، یہاں تک کہ اُن پر اچانک قیامت آجائے، یا ایسے دن کا عذاب ان تک آپہنچے جو (ان کے لئے) کسی بھلائی کو جنم دینے کی صلاحیت سے خالی ہوگا۔ ﴿۵۵﴾ بادشاہی اُس دن اللہ

کی ہوگی، وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا، چنانچہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، وہ نعمتوں کے باغات میں ہوں گے۔ (۵۶) اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے، تو ایسے لوگوں کے لئے ذلت والا عذاب ہوگا۔ (۵۷)

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ جو شیطان کے اغواءِ سے آپ سے مجادلہ کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ) ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اس کے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہ (اور اعتراض) ڈالا (اور کفار انہی شبہات اور اعتراضات کو پیش کر کے انبیاء سے مجادلہ کیا کرتے جیسا دوسری آیات میں ارشاد ہے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا [1] (الانعام:۱۱۲) وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ [2] (الانعام:۱۲۱)) پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (جواباتِ قاطعہ ودلائل واضحہ سے) نیست ونابود کر دیتا ہے (جیسا کہ ظاہر ہے کہ جواب صحیح کے بعد اعتراض دفع ہو جاتا ہے) پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات (کے مضامین) کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے (گو وہ فی نفسہا بھی مستحکم تھیں لیکن اعتراضات کے جواب سے اس استحکام کا زیادہ ظہور ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ (ان اعتراضات کے متعلق) خوب علم والا ہے (اور اُن کے جواب کے تعلیم میں) خوب حکمت والا ہے (اور یہ سارا قصہ اس لئے بیان کیا ہے) تا کہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو ایسے لوگوں کے لئے آزمائش (کا ذریعہ) بنا دے جن کے دل میں (شک کا) مرض ہے اور جن کے دل (بالکل ہی) سخت ہیں (کہ وہ شک سے بڑھ کر باطل کا یقین کئے ہوئے ہیں، سو ان کی آزمائش ہوتی ہے کہ دیکھیں بعد جواب کے اب بھی شبہات کا اتباع کرتے ہیں یا جواب کو سمجھ کر حق کو قبول کرتے ہیں) اور واقعی (یہ) ظالم لوگ (یعنی اہلِ شک بھی اور اہلِ یقین بالباطل بھی) بڑی مخالفت میں ہیں (کہ حق کو باوجود واضح ہونے کے محض عناد کے سبب قبول نہیں کرتے شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا تصرف تو اس لئے دیا گیا تھا کہ آزمائش ہو) اور (ان شبہات کا اجوبہ صحیحہ ونورِ ہدایت سے ابطال اس لئے ہوتا ہے) تا کہ جن لوگوں کو فہم (صحیح) عطا ہوا ہے وہ (ان اجوبہ ونورِ ہدایت سے) اس امر کا زیادہ یقین کر لیں کہ یہ (جو نبی نے پڑھا ہے وہ) آپ کے

---

[1] ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن میں سے بعضے دوسرے بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تا کہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں۔

[2] ترجمہ: اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کو تعلیم کر رہے ہیں تا کہ یہ تم سے جدال کریں۔

رَبّ کی طرف سے حق ہے سو ایمان پر زیادہ قائم ہو جائیں پھر (زیادہ یقین کی برکت سے) اُس (پر عمل کرنے) کی طرف اُن کے دل اور بھی جھک جائیں اور واقعی ان ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی راہِ راست دکھلاتا ہے (پھر کیونکر ان کو ہدایت نہ ہو۔ یہ تو ایمان والوں کی کیفیت ہوئی) اور (رہ گئے) کافر لوگ (سو وہ) ہمیشہ اُس (پڑھے ہوئے حکم) کی طرف سے شک ہی میں رہیں گے (جو اُن کے دل میں شیطان نے ڈالا تھا) یہاں تک کہ اُن پر دفعۃً قیامت آجائے (جس کی ہول ہی کافی ہے گو عذاب نہ بھی ہوتا) یا (اس سے بڑھ کر یہ کہ) ان پر کسی بے برکت دن کا (کہ قیامت کا دن ہے) عذاب آپہنچے (اور دونوں کا جمع ہونا جو کہ واقع میں ہوگا اور بھی اشد مصیبت ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بدون مشاہدۂ عذاب کفر سے باز نہ آئیں گے مگر اس وقت نافع نہ ہوگا) بادشاہی اس روز اللہ ہی کی ہوگی وہ ان سب (مذکورین) کے درمیان (عملی) فیصلہ فرمادے گا۔ سو جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور اچھے کام کئے ہوں گے وہ چین کے باغوں میں ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا تو ان کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا۔

معارف ومسائل

مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ، ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور نبی دو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں ایک نہیں، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ اس میں اقوال مختلف ہیں مشہور اور واضح یہ ہے کہ نبی تو اُس شخص کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت قوم کی اصلاح کے لئے عطا ہوا ہو اور اُس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آتی ہو خواہ اُس کو کوئی مستقل کتاب اور شریعت دی جائے یا کسی پہلے نبی ہی کی کتاب اور شریعت کی تبلیغ کے لئے مامور ہو۔ پہلے کی مثال حضرت موسیٰ و عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہم السلام کی ہے اور دوسرے کی مثال حضرت ہارون علیہ السلام کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات اور اُنہی کی شریعت کی تبلیغ و تعلیم کے لئے مامور تھے۔ اور رسول وہ ہے جس کو مستقل شریعت اور کتاب ملی ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر رسول کا نبی ہونا ضروری ہے مگر ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں، یہ تقسیم انسانوں کے لئے ہے، فرشتہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر آتا ہے اس کو رسول کہنا اس کے منافی نہیں، اس کی تفصیل سورۂ مریم میں آچکی ہے۔

اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ لفظ تمنّی اس جگہ بمعنے قرأ ہے اور اُمنیہ کے معنی قراءت کے ہیں۔ عربی لغت کے اعتبار سے یہ معنے بھی معروف ہیں۔ اس آیت کی جو تفسیر اوپر خلاصۂ تفسیر میں لکھی ہے وہ بہت صاف بے غبار ہے۔ ابوحیّان نے بحرِ محیط میں اور بہت سے دوسرے حضرات مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] کتب حدیث میں اس جگہ ایک

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۴۳۵ وتفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۳۹۴، وتفسیر الطبری تحت هٰذه الآیة ج:۱۸ ص:۲۶۸

واقعہ نقل کیا گیا ہے جو غرانیق کے نام سے معروف ہے یہ واقعہ جمہور محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ بعض حضرات نے اس کو موضوع ملحدین وزنادقہ کی ایجاد قرار دیا ہے اور جن حضرات نے اس کو معتبر بھی قرار دیا ہے تو اس کے ظاہری الفاظ سے جو شبہات قرآن وسنت کے قطعی اور یقینی احکام پر عائد ہوتے ہیں ان کے مختلف جوابات دیئے ہیں لیکن اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس آیتِ قرآن کی تفسیر اُس واقعہ پر موقوف نہیں بلکہ اس کا سیدھا سادہ مطلب وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے بلاوجہ اس کو اس آیت کی تفسیر کا جزء بنا کر شکوک وشبہات کا دروازہ کھولنا اور پھر جوابدہی کی فکر کرنا کوئی مفید کام نہیں اس لئے اس کو ترک کیا جاتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ

اور جو لوگ گھر چھوڑ آئے اللہ کی راہ میں پھر مارے گئے یا مر گئے البتہ اُن کو دے گا اللہ

رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا

روزی خاصی اور اللہ ہے سب سے بہتر روزی دینے والا البتہ پہنچائے گا اُن کو ایک جگہ جس کو

يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

پسند کریں گے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے تحمل والا

آسان ترجمۂ قرآن

اور جن لوگوں نے اللہ کے راستے میں ہجرت کی، پھر قتل کر دیئے گئے یا اُن کا انتقال ہو گیا، تو اللہ اُنہیں ضرور اچھا رزق دے گا، اور یقین رکھو کہ اللہ ہی بہترین رزق دینے والا ہے۔ ﴿۵۸﴾ وہ انہیں ضرور ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے، اور اللہ یقیناً ہر بات جاننے والا، بڑا بردبار ہے۔ ﴿۵۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں (یعنی دین کی حفاظت کے لئے) اپنا وطن چھوڑا (جن کا ذکر پچھلی آیت میں بھی

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ [1] (الحج: ۴۰) کے الفاظ سے آچکا ہے) پھر وہ لوگ (کفار کے مقابلہ میں) قتل کئے گئے یا (ویسے ہی طبعی موت سے) مرگئے (وہ ناکام ومحروم نہیں، گو اُن کو دُنیاوی فوائد نہ ملے مگر آخرت میں) اللہ تعالیٰ اُن کو ضرور ایک عمدہ رزق دے گا (یعنی جنت کی بیشمار نعمتیں) اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب دینے والوں سے اچھا (دینے والا) ہے (اور اس اچھے رزق کے ساتھ) اللہ تعالیٰ اُن کو (مسکن بھی اچھا دے گا یعنی) ایسی جگہ لے جا کر داخل کرے گا جس کو وہ (بہت ہی) پسند کریں گے (رہی یہ بات کہ بعض مہاجرین اس طرح دُنیاوی فتح ونصرت اور اُس کے فوائد سے محروم کیوں ہوئے اور اُن کے مقابلے کے کفار اُن کے قتل کرنے پر قادر کیوں ہوگئے وہ قہرِ الٰہی سے کیوں نہ ہلاک کردیئے گئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر کام کی حکمت ومصلحت کو) خوب جاننے والا ہے (اُن کی اس ظاہری ناکامی میں بھی بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں اور) بہت حلم والا ہے (اس لئے دشمنوں کو فوراً سزا نہیں دیتا)۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ

یہ سن چکے اور جس نے بدلہ لیا جیسا کہ اُس کو دُکھ دیا تھا پھر اس پر کوئی زیادتی کرے تو البتہ اس کی مدد کرے گا اللہ،

اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰

بیشک اللہ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

یہ بات تو طے ہے، اور (آگے یہ بھی سن لو کہ) جس شخص نے کسی کو بدلے میں اتنی ہی تکلیف پہنچائی جتنی اُس کو پہنچائی گئی تھی، اُس کے بعد پھر اُس سے زیادتی کی گئی، تو اللہ اُس کی ضرور مدد کرے گا۔ یقین رکھو کہ اللہ بہت معاف کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے۔ (۶۰)

خلاصۂ تفسیر

یہ (مضمون تو) ہو چکا اور (آگے یہ سنو کہ) جو شخص (دشمن کو) اسی قدر تکلیف پہنچا دے جس قدر (دشمن کی طرف سے) اس کو تکلیف پہنچائی گئی تھی پھر (اس برابر سرابر ہوجانے کے بعد اگر اس دشمن کی طرف سے) اس شخص پر زیادتی کی

[1] ترجمہ: جو اپنے گھروں سے نکالے گئے۔

جائے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی ضرور امداد کرے گا بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا بہت مغفرت کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

چند آیات پہلے یہ مضمون مذکور ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد کرتا ہے وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝۳۹ مگر مظلوم کی دو قسم ہیں ایک تو وہ جس نے دشمن سے ظلم کا کوئی انتقام اور بدلہ لیا ہی نہیں بلکہ معاف کردیا یا چھوڑ دیا۔ دوسرا وہ شخص جس نے اپنے دشمن سے برابر سرابر بدلہ اور انتقام لے لیا جس کا مقتضی یہ تھا کہ اب دونوں برابر ہوگئے آگے یہ سلسلہ ختم ہو مگر دشمن نے اس کے انتقام لینے کی بنا پر مشتعل ہو کر دوبارہ حملہ کر دیا اور مزید ظلم کیا تو یہ شخص پھر مظلوم ہی رہ گیا۔ اس آیت میں اس دوسری قسم کے مظلوم کی امداد کا بھی وعدہ ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند یہ ہے کہ آدمی پہلے ہی ظلم پر صبر کرے اور معاف کر دے انتقام نہ لے جیسا کہ بہت سی آیات میں اس کا ذکر ہے مثلاً فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ[1] (الشوریٰ: ۴۰) اور وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى[2] (البقرۃ: ۲۳۷) اور وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۴۳[3] (الشوریٰ: ۴۳) ان سب آیات میں ترغیب اس کی دی گئی ہے کہ ظلم کا بدلہ نہ لے بلکہ معاف کر دے اور صبر کرے۔ قرآنِ کریم کی ان ہدایات سے اسی طرز کا افضل و اَولیٰ ہونا ثابت ہوا۔ شخص مذکور جس نے اپنے دشمن سے برابر کا بدلہ لے لیا اُس نے اس افضل و اولیٰ اور قرآنی ہدایات مذکورہ پر عمل ترک کر دیا تو اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ اب یہ شاید اللہ کی نصرت سے محروم ہو جائے اس لئے آخر آیت میں ارشاد فرما دیا اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کی اس کوتاہی پر کہ افضل و اولیٰ پر عمل نہیں کیا اس سے کوئی مواخذہ نہیں فرمائے گا بلکہ اب بھی اگر مخالف نے اس پر دوبارہ ظلم کر دیا تو اس کی امداد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ (روح المعانی)[4]

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ

یہ اس واسطے کہ اللہ لے لیتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور اللہ

سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۶۱ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ

سنتا دیکھتا ہے یہ اس واسطے کہ اللہ وہی ہے صحیح اور جس کو پکارتے ہیں اس کے سوائے

[1] ترجمہ: پھر جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔
[2] ترجمہ: اور تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔
[3] ترجمہ: اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے یہ البتہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔
[4] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۳ ص:۱۱۸

هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ

وہی ہے غلط اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر بڑا، تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اُتارا

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ز فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ط اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾ ج

آسمان سے پانی پھر زمین ہوجاتی ہے سرسبز بیشک اللہ جانتا ہے چھپی تدبیریں خبردار ہے،

۸ ع ۱۵

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶۴﴾ ع

اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ وہی ہے بے پروا تعریفوں والا

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ

تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے بس میں کردیا تمہارے جو کچھ ہے زمین میں اور کشتی کو جو چلتی ہے دریا میں

بِاَمْرِهٖ ط وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ

اُس کے حکم سے اور تھام رکھتا ہے آسمان کو اس سے کہ گر پڑے زمین پر مگر اس کے حکم سے بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ز ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ

لوگوں پر نرمی کرنے والا مہربان ہے اور اسی نے تم کو جلایا پھر مارتا ہے

ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ط اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾

پھر زندہ کرے گا بیشک انسان ناشکر ہے

آسان ترجمۂ قرآن

یہ اس لئے کہ اللہ (کی قدرت اتنی بڑی ہے کہ وہ) رات کو دن میں داخل کردیتا اور دن کو رات میں داخل کردیتا

ہے، اور اس لئے کہ اللہ ہر بات سنتا، ہر چیز دیکھتا ہے۔ ﴿۶۱﴾ یہ اس لئے کہ اللہ ہی حق ہے، اور یہ لوگ اُسے چھوڑ کر جن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، وہ سب باطل ہیں، اور اللہ ہی وہ ہے جس کی شان بھی اُونچی ہے، رُتبہ بھی بڑا۔ ﴿۶۲﴾ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا، جس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا مہربان، ہر بات سے باخبر ہے۔ ﴿۶۳﴾ جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اُسی کا ہے۔ اور یقین رکھو کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جو سب سے بے نیاز ہے، بذاتِ خود قابلِ تعریف۔ ﴿۶۴﴾ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے کام میں لگا رکھی ہیں، اور وہ کشتیاں بھی جو اُس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں؟ اور اُس نے آسمان کو اس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ اُس کی اجازت کے بغیر زمین پر نہیں گر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۶۵﴾ اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی، پھر وہ تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ واقعی انسان بڑا ناشکرا ہے۔ ﴿۶۶﴾

خلاصۂ تفسیر

یہ (مؤمنین کا غالب کر دینا) کہ اللہ تعالیٰ (کی قدرت بڑی کامل ہے وہ) رات (کے اجزاء) کو دن میں اور دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتا ہے (یہ کائناتی انقلاب ایک قوم کو دوسری پر غالب کرنے والے انقلاب سے زیادہ عجیب ہے) اور اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ (ان سب کے اقوال و احوال کو) خوب سننے والا اور خوب دیکھنے والا ہے (وہ کفار کے ظلم اور مؤمنین کی مظلومیت کو سنتا دیکھتا ہے اس لئے وہ سب حالات سے باخبر بھی ہے اور قوت وقدرت بھی اُس کی سب سے بڑی ہے یہ مجموعہ سبب ہو گیا کمزوروں کو غالب کرنے کا) اور (نیز) یہ (نصرت) اس سبب سے (یقینی) ہے کہ (اس میں کسی طاقت کی مجال نہیں جو اس میں اللہ تعالیٰ کی مزاحمت کرے کیونکہ) اللہ ہی ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں وہ بالکل ہی لچر ہیں۔ (کہ وہ خود اپنے وجود میں محتاج بھی ہیں کمزور بھی وہ کیا اللہ کی مزاحمت کر سکتے ہیں) اور اللہ ہی عالیشان سب سے بڑا ہے (اس میں غور کرنے سے توحید کا حق ہونا اور شرک کا باطل ہونا ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس کے علاوہ) کیا تجھ کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین سرسبز ہو گئی (پھر) بیشک اللہ تعالیٰ بہت مہربان سب باتوں کی خبر رکھنے والا ہے (اس لئے بندوں کی ضرورتوں پر مطلع ہو کر اُن کے مناسب مہربانی فرماتا ہے) سب اُسی کا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ایسا ہے جو کسی کا محتاج نہیں ہر طرح کی تعریف کے لائق ہے (اور اے مخاطب) کیا تجھ کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے کام میں لگا رکھا ہے زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو (بھی) کہ وہ دریا میں اُس کے حکم سے چلتی ہے اور وہی آسمانوں کو زمین پر گرنے سے تھامے

ہونے ہے ہاں مگر یہ کہ اُسی کا حکم ہوجائے (تو یہ سب کچھ ہوسکتا ہے اور بندوں کے گناہ اور بُرے اعمال اگرچہ ایسا حکم ہوجانے کے مقتضی ہیں مگر پھر بھی جو ایسا حکم نہیں دیتا تو وجہ یہ ہے کہ) بالیقین اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑی شفقت اور رحمت فرمانے والا ہے اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی دی پھر (وقت موعود پر) تم کو موت دے گا پھر (قیامت میں) تم کو زندہ کرے گا (ان انعامات واحسانات کا تقاضا تھا کہ لوگ توحید اور اللہ کے شکر کو اختیار کرتے مگر) واقعی انسان ہے بڑا ناشکر (کہ اب بھی کفر وشرک سے باز نہیں آتا۔ مراد سب انسان نہیں بلکہ وہی جو اس ناشکری میں مبتلا ہوں)۔

معارف و مسائل

سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ، یعنی زمین کی سب چیزوں کو انسان کا مسخر بنا دیا۔ مسخر بنانے کے ظاہری اور عام معنے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ وہ اس کے حکم کے تابع چلے۔ اس معنے کے لحاظ سے یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ زمین کے پہاڑ اور دریا اور درندے پرندے اور ہزاروں چیزیں انسان کے حکم کے تابع تو نہیں چلتے مگر کسی چیز کو کسی شخص کی خدمت میں لگا دینا جو ہر وقت یہ خدمت انجام دیتی رہے یہ بھی درحقیقت اس کے لئے تسخیر ہی ہے اگرچہ وہ اس کے حکم سے نہیں بلکہ مالک حقیقی کے حکم سے یہ خدمت انجام دے رہی ہے۔ اسی لئے یہاں ترجمہ تسخیر کا کام میں لگا دینے سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ ان سب چیزوں کو انسان کا تابع حکم بھی بنا دیتے مگر اس کا نتیجہ خود انسان کے حق میں مضر پڑتا، کیونکہ انسانوں کی طبائع، خواہشات اور ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں ایک انسان دریا کو اپنا رُخ دوسری طرف موڑنے کا حکم دیتا اور دوسرا اس کے خلاف تو انجام بجز فساد کے کیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لئے ان سب چیزوں کو تابع حکم تو اپنا ہی رکھا مگر تسخیر کا جو اصل فائدہ تھا وہ انسان کو پہنچا دیا۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ

ہر اُمت کے لئے ہم نے مقرر کردی ایک راہ بندگی کی کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں بندگی، سو چاہئے تجھ سے جھگڑا نہ کریں اس کام میں

وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾ وَإِن جَادَلُوكَ

اور تو بُلائے جا اپنے رَبّ کی طرف، بیشک تو ہے سیدھی راہ پر سوجھ والا اور اگر تجھ سے جھگڑنے لگیں

فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۞۶۸ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا

تو تُو کہہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو اللہ فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن جس چیز میں

كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۞۶۹ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ

تمہاری راہ جُدا جُدا تھی کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان

وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۞۷۰

اور زمین میں یہ سب لکھا ہوا ہے کتاب میں یہ اللہ پر آسان ہے

آسان ترجمۂ قرآن

ہم نے ہر اُمت کے لوگوں کے لئے عبادت کا ایک طریقہ مقرر کیا ہے، جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں، لہٰذا (اے پیغمبر!) لوگوں کو تم سے اس معاملے میں جھگڑا نہیں کرنا چاہئے، اور تم اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیتے رہو۔ تم یقیناً سیدھے راستے پر ہو۔ ۞۶۷ اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ: ''جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ ۞۶۸ اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان اُن باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔'' ۞۶۹ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں اللہ کے علم میں ہیں؟ یہ سب باتیں ایک کتاب میں محفوظ ہیں۔ بیشک یہ سارے کام اللہ کے لئے بہت آسان ہیں۔ ۞۷۰

خلاصۂ تفسیر

(جتنی اُمتیں اہلِ شرائع گزری ہیں اُن میں) ہم نے ہر اُمت کے واسطے ذبح کرنے کا طریق مقرر کیا ہے کہ وہ اسی طریقہ پر ذبح کیا کرتے تھے تو (اعتراض کرنے والے) لوگوں کو چاہئے کہ اس امر (ذبح) میں آپ سے جھگڑا نہ کریں (اُن کو تو آپ سے بحث اور جھگڑا کرنے کا حق نہیں مگر آپ کو حق ہے اس لئے) آپ (ان کو) اپنے رَبّ (یعنی اس کے دین) کی طرف بُلاتے رہئے آپ یقیناً صحیح راستہ پر ہیں۔ (صحیح راستہ پر چلنے والے کو حق ہوتا ہے کہ غلط راستے پر چلنے والے

کو اپنی طرف بُلائے غلط راستہ والے کو یہ حق نہیں ہوتا) اور اگر (اس پر بھی) یہ لوگ آپ سے جھگڑا کرتے ہیں تو آپ یہ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے (وہی تم کو سمجھے گا آگے اسی کی توضیح یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن (عملی) فیصلہ فرما دے گا جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے (آگے اسی کی تائید ہے کہ) اے مخاطب کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے (اور علمِ الٰہی میں محفوظ ہونے کے ساتھ یہ بھی) یقینی بات ہے کہ یہ (یعنی ان کے سب اقوال واعمال) نامۂ اعمال میں (بھی محفوظ) ہے (پس) یقیناً (ثابت ہو گیا کہ) یہ (فیصلہ کرنا) اللہ تعالیٰ کے نزدیک آسان ہے۔

معارف ومسائل

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا، یہی مضمون تقریباً اِنہیں الفاظ کے ساتھ اسی سورت کی آیت نمبر ۳۴ میں گزر چکا ہے مگر دونوں جگہ لفظ مَنسک کے معنے اور مراد میں فرق ہے۔ وہاں نسک اور منسک قربانی کے معنے میں بضمن احکامِ حج آیا تھا اور اس لئے وہاں واؤ کے ساتھ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ فرمایا گیا۔ یہاں منسک کے دوسرے معنے (یعنی احکام ذبائح یا علم احکام شرعیہ) اور دوسرا مفہوم مراد ہے اور یہ ایک مستقل حکم ہے اس لئے اس کو عطف کر کے نہیں بیان کیا گیا۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک قول تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ بعض کفار مسلمانوں سے اُن کی ذبائح کے متعلق فضول بحث وجدال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہارے مذہب کا یہ حکم عجیب ہے کہ جس جانور کو تم خود اپنے ہاتھ سے قتل کرو وہ تو حلال اور جس کو اللہ تعالیٰ براہِ راست مار دے یعنی عام مُردار جانور وہ حرام۔ ان کے اس جدال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی (کما رواہ الحاکم وصححہ والبیھقی فی الشعب عن علی بن حسن وابن عباسؓ انها نزلت بسبب قول الخزاعیین۔ رُوح المعانی)[1] تو یہاں منسک کے معنی طریقۂ ذبح کے ہوں گے اور حاصل جواب کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک اُمت اور شریعت کے لئے ذبیحہ کے احکام الگ الگ رکھے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ایک مستقل شریعت ہے اس کے احکام کا معارضہ کسی پہلی شریعت کے احکام سے کرنا بھی جائز نہیں چہ جائیکہ تم اُس کا معارضہ خالص اپنی رائے اور خیال باطل سے کر رہے ہو یعنی مُردار جانور کا حلال نہ ہونا تو اس اُمت وشریعت کے ساتھ مخصوص نہیں سب پچھلی شریعتوں میں بھی حرام رہا ہے تو تمہارا یہ قول تو بالکل ہی بے بنیاد ہے اس بے بنیاد خیال کی بنا پر صاحبِ شریعت نبی سے

[1] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۱۲۹، والمستدرك للحاكم رقم الحديث:۳۴۷۸ (بالاختصار)، وشعب الإيمان رقم الحديث:۷۰۷۳ (بالاختصار)

مجادلہ اور معارضہ کرنا حماقت ہی حماقت ہے (ھکذا بین فی روح المعانی معنی الآیۃ)۔[1] اور جمہور مفسرین نے اس جگہ لفظ نسک عام احکامِ شریعت کے معنے میں لیا ہے کیونکہ اصل لغت میں مَنْسک کے معنی ایک معیّن جگہ کے ہیں جو کسی خاص عملِ خیر یا شر کے لئے مقرر ہو اور اسی لئے احکامِ حج کو مناسک الحج کہا جاتا ہے کہ ان میں خاص خاص مقامات خاص احکام واعمال کے لئے مقرر ہیں (ابن کثیر)[2] اور قاموس[3] میں لفظ نسک کے معنی عبادت کے لکھے ہیں قرآن میں وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا[4] (البقرۃ:۱۲۸) اسی معنے کے لئے آیا ہے مناسک سے مراد عبادات کے اَحکام شرعیہ ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ دوسری تفسیر بھی روایت کی گئی ہے۔ ابنِ جریر، ابن کثیر، قرطبی، رُوح المعانی وغیرہ میں اسی معنی عام کی تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے[5] اور آیت کا سیاق وسباق بھی اسی کا قرینہ ہے کہ مَنسک سے مراد شریعت اور اس کے احکام عام ہیں اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکین اور مخالفینِ اسلام جو شریعت محمدیہ کے احکام میں جدال اور جھگڑے کرتے ہیں اور بنیاد یہ ہوتی ہے کہ اُن کے آبائی مذہب میں وہ احکام نہ تھے تو وہ سُن لیں کہ پچھلی کسی شریعت و کتاب سے نئی شریعت و کتاب کا معارضہ ومجادلہ کرنا باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو اس کے وقت میں ایک خاص شریعت اور کتاب دی ہے جس کا اتباع اُس اُمت پر اُس وقت تک درست تھا جب تک کوئی دوسری اُمت اور دوسری شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ آ گئی۔ اور جب دوسری شریعت آ گئی تو اتباع اس جدید شریعت کا کرنا ہے اگر اُس کا کوئی حکم پہلی شریعتوں کے مخالف ہے تو پہلے حکم کو منسوخ اور اس کو ناسخ سمجھا جائے گا اس لئے اس صاحبِ شریعت سے کسی کو مجادلہ اور منازعت کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ آیت کے آخری الفاظ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ کا یہی حاصل ہے کہ موجودہ زمانہ میں جبکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک مستقل شریعت لے کر آ گئے تو کسی کو اس کا حق نہیں کہ اُن کی شریعت کے احکام میں جدال اور نزاع پیدا کرے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پہلی تفسیر اور اس دوسری تفسیر میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں، ہو سکتا ہے کہ آیت کا نزول کسی خاص نزاع دربارہ ذبائح کے سبب سے ہوا ہو مگر آیت کے عام الفاظ تمام احکامِ شرعیہ پر مشتمل ہیں اور اعتبار عمومِ لفظ کا ہوتا ہے خصوص مورد کا نہیں ہوتا۔ تو حاصل دونوں تفسیروں کا یہی ہو جائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو الگ الگ شریعت دی ہے جن میں احکامِ جزئیہ مختلف بھی ہوتے ہیں تو کسی پچھلی شریعت پر عمل کرنے والے کوئی

---

[1] روح المعانی ج:۱۳ ص:۱۲۸

[2] تفسیر ابن کثیر تحت ھذہ الآیۃ ج:۵ ص:۴۵۱

[3] القاموس ج:۳ ص:۴۳، (مادۃ نسك)

[4] ترجمہ: اور ہم کو ہمارے حج کے احکام بھی بتلا دیجئے۔

[5] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۹۳، وروح المعانی وابن کثیر بحوالۂ بالا۔

شریعت سے معارضہ اور نزاع کا کوئی حق نہیں بلکہ اُس پر اس نئی شریعت کا اتباع واجب ہے اسی لئے آخر آیت میں فرمایا گیا اُدۡعُ اِلٰی رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰی هُدًی مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۶۷﴾ یعنی آپ ان لوگوں کی چہ میگوئیوں اور نزاع وجدال سے متاثر نہ ہوں بلکہ برابر اپنے منصبی فریضہ دعوت الی الحق میں مشغول رہیں کیونکہ آپ حق اور صراط مستقیم پر ہیں آپ کے مخالف ہی راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ شریعتِ محمدیہ کے نزول کے بعد کسی پہلی شریعت پر ایمان رکھنے والے مثلاً یہودی نصرانی وغیرہ کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ خود قرآن نے ہمارے لئے اس آیت میں یہ کہہ کر گنجائش دی ہے کہ ہر شریعت اللہ ہی کی طرف سے ہے اس لئے اگر زمانۂ اسلام میں بھی ہم شریعتِ موسویہ یا عیسویہ پر عمل کرتے رہیں تو مسلمانوں کو ہم سے اختلاف نہ کرنا چاہئے کیونکہ آیت میں ہر اُمت کو شریعتِ خاصہ دینے کا ذکر کرنے کے بعد پوری دُنیا کے لوگوں کو یہ حکم بھی دیدیا گیا ہے کہ شریعت محمدیہ کے قائم ہوجانے کے بعد وہ اس شریعت کی مخالفت نہ کریں۔ یہ نہیں فرمایا کہ مسلمان اُن کی سابقہ شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ بولیں اور اس آیت کے بعد کی آیات سے یہ مضمون اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے جن میں شریعت اسلام کے خلاف مجادلہ کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان حرکتوں کو خوب جانتا ہے وہی اس کی سزا دے گا۔ وَاِنۡ جٰدَلُوۡكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۸﴾

وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا وَّمَا لَيۡسَ لَهُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ

اور پوجتے ہیں اللہ کے سوائے اُس چیز کو جس چیز کی سند نہیں اُتاری اُس نے اور جس کی خبر نہیں اُن کو

وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ نَّصِيۡرٍ ﴿۷۱﴾ وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعۡرِفُ

اور بے انصافوں کا کوئی نہیں مددگار اور جب سنائے اُن کو ہماری آیتیں صاف تو پہچانے

فِىۡ وُجُوۡهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡمُنۡكَرَ ؕ يَكَادُوۡنَ يَسۡطُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ يَتۡلُوۡنَ

تو منکروں کے منہ کی بُری شکل نزدیک ہوتے ہیں کہ حملہ کر پڑیں اُن پر جو پڑھتے ہیں

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ

ان کے پاس ہماری آیتیں تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ایک چیز اس سے بدتر وہ آگ ہے اس کا وعدہ کردیا ہے اللہ نے

ع ۹ ۸ ۱۲ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۷۲ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ

منکروں کو اور وہ بہت بُری ہے پھرجانے کی جگہ اے لوگو ایک مثل کہی ہے

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا

سو اس پر کان رکھو جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ہرگز نہ بناسکیں گے ایک مکھی

وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ

اگرچہ سارے جمع ہوجائیں اور اگر کچھ چھین لے اُن سے مکھی چھڑا نہ سکیں وہ اُس سے

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝۷۳ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

بودا ہے چاہنے والا اور جن کو چاہتا ہے اللہ کی قدر نہیں سمجھے جیسی اس کی قدر ہے بیشک اللہ

لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۷۴

زورآور ہے زبردست

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن (کے معبود ہونے) کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، اور خود ان لوگوں کو بھی اس کے بارے میں کوئی علم حاصل نہیں۔ اور ان ظالموں کا (آخرت میں) کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۝۷۱ اور جب ان کو ہماری آیتیں اپنی پوری وضاحتوں کے ساتھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو تم ان کافروں کے چہروں پر ناگواری کے اثرات صاف پہچان لیتے ہو، ایسا لگتا ہے کہ یہ ان لوگوں پر حملہ کردیں گے جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر

سنا رہے ہیں۔ کہہ دو کہ: "لوگو! کیا میں تمہیں ایسی چیز بتلا دوں جو اس سے زیادہ ناگوار ہے؟ آگ! اللہ نے کافروں سے اس کا وعدہ کر رکھا ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔" (۷۲) لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے، اب اُسے کان لگا کر سنو! تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن جن کو دُعا کے لئے پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، چاہے اس کام کے لئے سب کے سب اِکٹھے ہو جائیں، اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اُس سے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ ایسا دُعا مانگنے والا بھی بودا اور جس سے دُعا مانگی جا رہی ہے وہ بھی! (۷۳) ان لوگوں نے اللہ کی ٹھیک ٹھیک قدر ہی نہیں پہچانی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ قوت کا بھی مالک ہے، اقتدار کا بھی مالک۔ (۷۴)

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (مشرک) لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن (کے جوازِ عبادت) پر اللہ تعالیٰ نے کوئی حجت (اپنی کتاب میں) نہیں بھیجی اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی (عقلی) دلیل ہے اور (قیامت میں) جب ان کو شرک پر سزا ہونے لگے گی تو) ان ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (نہ قولاً کہ ان کے فعل کے استحسان پر کوئی حجت پیش کر سکے نہ عملاً کہ اُن کو عذاب سے بچالے) اور (ان لوگوں کو اسی گمراہی اور اہلِ حق سے عناد رکھنے میں یہاں تک غلو ہے کہ) جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں (متعلق توحید وغیرہ کے) جو کہ (اپنے مضامین میں) خوب واضح ہیں (اہلِ حق کی زبان سے) پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم کافروں کے چہروں میں (بوجہ ناگواری باطنی کے) بُرے آثار دیکھتے ہو (جیسے چہرے پر بَل پڑ جانا۔ ناک چڑھ جانا۔ تیور بدل جانا اور ان آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) قریب ہے کہ اُن لوگوں پر (اب) حملہ کر بیٹھیں (گے) جو ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھ رہے ہیں یعنی حملہ کا شبہ ہمیشہ ہوتا ہے اور گاہ گاہ اس حملہ کا تحقق بھی ہوا ہے پس یَكَادُوْنَ استمرار کے اعتبار سے فرمایا) آپ (ان مشرکین سے) کہیئے کہ (تم کو جو یہ آیات قرآنیہ سُن کر ناگواری ہوئی تو) کیا میں تم کو اس (قرآن) سے (بھی) زیادہ ناگوار چیز بتلا دوں وہ دوزخ ہے (کہ) اس کا اللہ تعالیٰ نے کافروں سے وعدہ کیا ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے (یعنی قرآن سے ناگواری کا نتیجہ ناگوار دوزخ ہے اس ناگواری کا تو غیظ سے غضب سے انتقام سے کچھ تدارک بھی کر لیتے ہو مگر اُس ناگواری کا کیا علاج کرو گے جو دوزخ سے ہوگی۔ آگے ایک بدیہی دلیل سے شرک کا ابطال ہے کہ) اے لوگو ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو (وہ یہ ہے کہ) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ ایک (ادنیٰ) مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی (کیوں نہ) جمع ہو جائیں اور (پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ تو ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کچھ (ان کے چڑھاوے میں سے) چھین لے جائے تو اس کو (تو) اس سے چھڑا (ہی) نہیں سکتے ایسا عابد بھی لچر اور ایسا معبود بھی لچر (افسوس ہے)

ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہئے تھی (کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے) وہ نہ کی (کہ شرک کرنے لگے حالانکہ) اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب ہے (تو عبادت اس کا خالص حق تھا نہ کہ غیر قوی اور غیر عزیز کا جس کی عدم قوت باوضح وجوہ معلوم ہو چکی)۔

معارف و مسائل

شرک و بت پرستی کی احمقانہ حرکت کی ایک مثال سے توضیح

ضُرِبَ مَثَلٌ، ضُرِبَ مَثَلٌ کا لفظ عام طور پر جو کسی خاص قصہ کی تمثیل کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں ضُرِبَ مَثَلٌ سے یہ صورت مراد نہیں بلکہ شرک و بت پرستی کی حماقت کو ایک واضح مثال سے بیان کرنا ہے کہ یہ بت جن کو تم لوگ اپنا کارساز سمجھتے ہو یہ تو ایسے بے کس بے بس ہیں کہ سب ملا کر ایک مکھی جیسی حقیر چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے اور پیدا کرنا تو بڑا کام ہے تم روز ان کے سامنے مٹھائی اور پھل وغیرہ کھانے کی چیزیں رکھتے ہو اور مکھیاں اُس کو کھا جاتی ہیں، ان سے تو اتنا تو ہوتا نہیں کہ مکھیوں سے اپنی چیز ہی کو بچالیں یہ تمہیں کسی آفت سے کیا بچائیں گے اسی لئے آخر آیت میں ان کی جہالت اور بیوقوفی کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ یعنی جس کا معبود ہی ایسا بے بس ہو اس کا عابد اُس سے بھی زیادہ کمزور ہوگا مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ یعنی کیسے بے وقوف احسان فراموش ہیں ان لوگوں نے اللہ کی کچھ قدر نہ پہچانی کہ ایسے عظیم الشان قدرت والے کے ساتھ ایسے بے بس بے شعور پتھروں کو برابر کر دیا۔ واللہ اعلم

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾

اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں اللہ سنتا دیکھتا ہے جانتا ہے

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾

جو کچھ اُن کے آگے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے اور اللہ تک پہنچ ہے ہر کام کی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ

اے ایمان والو رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے ربّ کی اور بھلائی کرو

السجدة ۱۱ عند الشافعی

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ

تاکہ تمہارا بھلا ہو اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسی کہ چاہئے اس کے واسطے محنت، اُس نے تم کو پسند کیا

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ

اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل دین تمہارے باپ ابراہیم کا

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا

اُسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان پہلے سے اور اس قرآن میں تاکہ رسول ہو بتانے والا

عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

تم پر اور تم ہو بتانے والے لوگوں پر سو قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ

ع ۱۰ / ۲ / ۱۷

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ ع

اور مضبوط پکڑو اللہ کو وہ تمہارا مالک ہے سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ فرشتوں میں سے بھی اپنا پیغام پہنچانے والے منتخب کرتا ہے، اور اِنسانوں میں سے بھی۔ یقیناً اللہ ہر بات سنتا ہر چیز دیکھتا ہے۔ ﴿۷۵﴾ وہ اُن کے آگے اور پیچھے کی ساری باتوں کو جانتا ہے، اور اللہ ہی پر تمام معاملات کا دارومدار ہے۔ ﴿۷۶﴾ اے ایمان والو! رُکوع کرو، اور سجدہ کرو، اور اپنے پروردگار کی بندگی کرو، اور بھلائی کے کام کرو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔ ﴿۷۷﴾ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں (اپنے دِین کے لئے) منتخب کرلیا ہے، اور تم پر دِین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ اپنے باپ ابراہیم کے دِین کو مضبوطی سے تھام لو، اُس نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا، اور اس (قرآن) میں بھی، تاکہ یہ رسول تمہارے لئے گواہ بنیں، اور تم دوسرے لوگوں کے لئے گواہ بنو۔ لہٰذا نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو، وہ تمہارا رکھوالا ہے، دیکھو، کتنا اچھا رکھوالا، اور کتنا اچھا مددگار! ﴿۷۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے رسالت کے لئے جس کو چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے (جن فرشتوں کو چاہے) احکام (الٰہیہ نبیوں کے پاس) پہنچانے والے (مقرر فرما دیتا ہے) اور (اسی طرح) آدمیوں میں سے بھی جس کو چاہے عامۂ ناس کے لئے احکام پہنچانے والے مقرر کر دیتا ہے یعنی رسالت کا مدار اصطفاء خداوندی پر ہے اس میں کچھ ملکیت یعنی فرشتہ ہونے کی خصوصیت نہیں بلکہ جس طرح ملکیت کے ساتھ رسالت جمع ہو سکتی ہے جس کو مشرکین بھی مانتے ہیں چنانچہ فرشتوں کے رسول ہونے کی وہ خود تجویز کرتے تھے اسی طرح بشریت کے ساتھ بھی وہ جمع ہو سکتی ہے رہا یہ کہ اصطفاء کسی ایک خاص کے ساتھ کیوں واقع ہوا تو ظاہری سبب تو اس کا خصوصیاتِ احوال ان رُسل کے ہیں اور یہ) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (یعنی) وہ اُن (سب فرشتوں اور آدمیوں) کی آئندہ اور گزشتہ حالتوں کو (خوب) جانتا ہے (تو حالتِ موجودہ کو بدرجۂ اَولیٰ جانے گا غرض سب احوال مسموعہ و مبصرہ اس کو معلوم ہیں ان میں بعض کا حال مقتضی اس اصطفاء کا ہو گیا) اور (حقیقی سبب اس کا یہ ہے کہ) تمام کاموں کا مدار اللہ ہی پر ہے (یعنی وہ مالک مستقل بالذات و فاعل مختار ہے اس کا ارادہ مرجح بالذات ہے۔ اس ارادہ کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں، پس سببِ حقیقی ارادہ خداوندی ہے اور اس کا سبب پوچھنا لغو ہے **وھو معنی قولہ تعالیٰ** لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ (الانبیاء: ۲۳) یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کا سبب دریافت کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

(آگے ختم سورت پر اول فروع و شرائع کا بیان ہے اور ملتِ ابراہیم پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ترغیب کے لئے بعض مضامین ارشاد فرمائے ہیں) اے ایمان والو (تم اُصول کے قبول کرنے کے بعد فروع کی بھی پابندی رکھو۔ خصوصاً نماز کی، پس تم) رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور (عموماً دوسرے فروع بھی بجالا کر) اپنے رَبّ کی عبادت کیا کرو اور نیک کام کیا کرو۔ اُمید (یعنی وعدہ) ہے کہ تم فلاح پاؤ گے اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کوشش کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو (دوسری اُمتوں سے) ممتاز فرمایا (جیسا کہ آیت جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا [1] (البقرۃ: ۱۴۳) وغیرہ میں مذکور ہے) اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی (اور اے ایمان والو، جس اسلام کا تم کو امر کیا گیا ہے کہ احکام کی پوری بجا آوری ہو اور یہی ملتِ ابراہیمی ہے) تم اپنے باپ ابراہیم کی ملّت پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی، تاکہ تمہارے لئے رسول اللہ گواہ ہوں اور (اس شہادتِ رسول کے قبل) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء ہوں گے اور فریقِ ثانی ان کی مخالف قومیں ہوں گی ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو

---

[1] ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو نہایت اعتدال پر ہے۔

(اور رسول کی شہادت سے تمہاری شہادت کی تصدیق ہو اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو) سو (ہمارے احکام کی پوری بجا آوری کرو، پس) تم لوگ (خصوصیت کے ساتھ) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور (بقیہ احکام میں بھی) اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو (یعنی عزم و ہمت کے ساتھ دین کے احکام بجالاؤ، غیر اللہ کی رضا و عدم رضا اور اپنے نفس کی مصلحت و مضرّت کی طرف التفات مت کرو) وہ تمہارا کارساز ہے سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے۔

معارف ومسائل

سورۂ حج کا سجدۂ تلاوت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، سورۂ حج میں ایک آیت تو پہلے گزر چکی ہے جس پر سجدۂ تلاوت کرنا باتفاق واجب ہے۔ اس آیت پر جو یہاں مذکور ہے سجدۂ تلاوت کے وجوب میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری رحمہم اللہ کے نزدیک اس آیت پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں کیونکہ اس میں سجدہ کا ذکر رکوع وغیرہ کے ساتھ آیا ہے جس سے نماز کا سجدہ مراد ہونا ظاہر ہے[۱] جیسے وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴿۴۳﴾[۲] (آل عمران: ۴۳) میں سب کا اتفاق ہے کہ سجدۂ نماز مراد ہے اس کی تلاوت کرنے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا اسی طرح آیتِ مذکورہ پر بھی سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔ امام شافعیؒ امام احمدؒ وغیرہ کے نزدیک اس آیت پر بھی سجدۂ تلاوت واجب ہے اُن کی دلیل ایک حدیث ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ سورۂ حج کو دوسری سورتوں پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدۂ تلاوت ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس روایت کے ثبوت میں کلام ہے۔ تفصیل اس کی کتبِ فقہ وحدیث میں دیکھی جاسکتی ہے۔[۳]

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ لفظ جہاد اور مجاہدہ کسی مقصد کی تحصیل میں اپنی پوری طاقت خرچ کرنے اور اس کے لئے مشقت برداشت کرنے کے معنے میں آتا ہے۔ کفار کے ساتھ قتال میں بھی مسلمان اپنے قول فعل اور ہر طرح کی امکانی طاقت خرچ کرتے ہیں اس لئے اس کو بھی جہاد کہا جاتا ہے اور حق جہاد سے مراد اُس میں پورا اخلاص اللہ کے لئے ہونا ہے جس میں کسی دنیوی نام ونمود یا مالِ غنیمت کی طمع کا شائبہ نہ ہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حق جہاد یہ ہے کہ جہاد میں اپنی پوری طاقت خرچ کرے اور کسی ملامت کرنے

---

[۱] روح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۱۳ ص:۱۴۹

[۲] ترجمہ: اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔

[۳] فتح القدیر، کتاب الصلاۃ، باب سجود التلاوۃ ج:۳ ص:۱۱۲، والمرقاۃ، کتاب الصلاۃ، باب سجود القرآن ج:۴ ص:۱۳۳

والے کی ملامت پر کان نہ لگائے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ جہاد کے معنی عام عبادات اور احکامِ الٰہیہ کی تعمیل میں اپنی پوری طاقت پورے اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے کے لئے ہیں ضحاک اور مقاتل نے فرمایا کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ اِعْمَلُوْا لِلّٰهِ حَقَّ عَمَلِهٖ وَاعْبُدُوْهُ حَقَّ عِبَادَتِهٖ یعنی عمل کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کا حق ہے اور عبادت کرو اللہ کی جیسا کہ اُس کا حق ہے۔ اور حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ یہاں جہاد سے مراد اپنے نفس اور اس کی بیجا خواہشات کے مقابلہ میں جہاد کرنا ہے اور یہی حقّ جہاد ہے۔ امام بغوی [۱] وغیرہ نے اس قول کی تائید میں ایک حدیث بھی حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت جو جہاد کفار کے لئے گئی ہوئی تھی واپس آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قَدِمْتُمْ خَيْرَ مَقْدَمٍ مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ قَالَ (یعنی الراوی) مُجَاهَدَةُ الْعَبْدِ لِهَوَاهُ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَقَالَ هٰذَا اِسْنَادٌ فِيْهِ ضُعْفٌ، یعنی تم لوگ خوب واپس آئے چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف یعنی اپنے نفس کی خواہشات بیجا کے مقابلہ کا جہاد اب بھی جاری ہے۔ اس روایت کو بیہقی نے روایت کیا ہے مگر کہا ہے کہ اس کے اسناد میں ضعف ہے۔ [۲]

فائدہ

تفسیر مظہری میں اس دوسری تفسیر کو اختیار کر کے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ صحابۂ کرام جب مقابلۂ کفار میں جہاد کر رہے تھے خواہشاتِ نفسانی کے مقابلہ کا جہاد تو اس وقت بھی جاری تھا مگر حدیث میں اس کو واپسی کے بعد ذکر کیا ہے اس میں اشارہ یہ ہے کہ اہواءِ نفس کے مقابلہ کا جہاد اگرچہ میدانِ کارزار میں بھی جاری تھا مگر عادۃً یہ جہاد شیخِ کامل کی صحبت پر موقوف ہے اس لئے وہ جہاد سے واپسی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے وقت ہی شروع ہوا۔ [۳]

اُمّتِ محمدیہ اللہ تعالیٰ کی منتخب اُمت ہے

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ، حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمام بنی اسماعیل میں کنانہ کا انتخاب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کا پھر قریش میں سے بنی ہاشم کا پھر بنی ہاشم میں سے میرا انتخاب فرمایا۔ (رواہ مسلم۔ مظہری) [۴]

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ دین میں تنگی

---

[۱] تفسير البغوی تحت هذه الآية ج:۵ ص:۴۰۲

[۲] الجامع الكبير للسيوطیؒ، رقم الحديث:۲۸۰، والزهد الكبير للبيهقیؒ رقم الحديث:۳۸۴

[۳] تفسير المظهری تحت هذه الآية ج:٦ ص:۳۵۴

[۴] صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی (صلی الله عليه وسلم) إلخ ج:۲ ص:۲۴۵

نہ ہونے کا مطلب بعض حضرات نے یہ بیان فرمایا کہ اس دین میں ایسا کوئی گناہ نہیں ہے جو توبہ سے معاف نہ ہو سکے اور عذابِ آخرت سے خلاصی کی کوئی صورت نہ نکلے۔ بخلاف پچھلی اُمتوں کے کہ اُن میں بعض گناہ ایسے بھی تھے جو توبہ کرنے سے بھی معاف نہ ہوتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تنگی سے مراد وہ سخت وشدید احکام ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد کئے گئے تھے جن کو قرآن میں اِصر اور اغلال سے تعبیر کیا گیا ہے اس اُمّت پر ایسا کوئی حکم فرض نہیں کیا گیا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ تنگی سے مراد وہ تنگی ہے جس کو انسان برداشت نہ کر سکے اس دین کے احکام میں کوئی حکم ایسا نہیں جو فی نفسہٖ ناقابلِ برداشت ہو۔ باقی رہی تھوڑی بہت محنت ومشقت تو وہ دُنیا کے ہر کام میں ہوتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے پھر ملازمت، تجارت وصنعت میں کیسی کیسی محنتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں مگر اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کام بڑے سخت وشدید ہیں۔ ماحول کے غلط اور مخالف ہونے یا ملک وشہر میں اُس کا رواج نہ ہونے کے سبب جو کسی عمل میں دشواری پیش آئے وہ عمل کی تنگی اور تشدد نہیں کہلائے گی۔ کرنے والے کو اس لئے بھاری معلوم ہوتی ہے کہ ماحول میں کوئی اُس کا ساتھ دینے والا نہیں۔ جس ملک میں روٹی کھانے پکانے کی عادت نہ ہو وہاں روٹی حاصل کرنا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے وہ سب جانتے ہیں مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روٹی پکانا بڑا سخت کام ہے۔

اور حضرت قاضی ثناء اللہؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ دین میں تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت کو ساری اُمتوں میں سے اپنے لئے منتخب فرمالیا ہے اس کی برکت سے اس اُمّت کے لوگوں کو دین کی راہ میں بڑی سے بڑی مشقت اُٹھانا بھی آسان بلکہ لذیذ ہو جاتا ہے۔ محنت سے راحت ملنے لگتی ہے خصوصاً جب دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جائے تو سارے بھاری کام بھی ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ [1] حدیث صحیح میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ یعنی نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک کردی گئی ہے۔ (رواہ احمد والنسائی والحاکم وصححہ) [2]

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ یعنی یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی۔ یہ خطاب دراصل مؤمنین قریش کو ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں ہیں پھر سب لوگ قریش کے تابع ہو کر اس فضیلت میں شامل ہو جاتے ہیں جیسے حدیث میں ہے "اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَيْشٍ فِي هٰذَا الشَّانِ مُسْلِمُهُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِهِمْ وَكَافِرُهُمْ تَبَعٌ لِكَافِرِهِمْ" رَوَاهُ

---

[1] تفسیر المظہر ج:٦ ص:٣٥٤، ٣٥٥

[2] المستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:٢٦٢٧، وسنن النسائی، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء ج:٢ ص:٩٣، ومسند احمد، مسند انس بن مالك رضي الله عنه، رقم الحديث:١٤٤٠١

اَلْبُخَارِیْ وَمُسْلِمْ (مظہری) [۱] یعنی سب لوگ اس دین میں قریش کے تابع ہیں، مسلمان مسلمان قریش کے تابع اور کافر لوگ کافر قریش کے تابع ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا "اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ" کا خطاب سب اُمت کے مسلمانوں کو ہے اور ابراہیم علیہ السلام کا ان سب کے لئے باپ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے روحانی باپ ہیں [۲] جیسا کہ ازواج مطہرات امہات المؤمنین ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہونا ظاہر ومعروف ہے۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے اُمتِ محمدیہ اور تمام اہلِ ایمان کا نام قرآن سے پہلے مُسْلِمْ تجویز کیا ہے اور خود قرآن میں بھی، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دُعا قرآنِ کریم میں یہ منقول ہے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ [۳] (البقرة:۱۲۸) اور قرآن میں جو اہلِ ایمان کا نام مُسْلِمْ رکھا گیا ہے اس کے رکھنے والے اگرچہ براہِ راست ابراہیم علیہ السلام نہیں مگر قرآن سے پہلے اُن کا یہ نام تجویز کر دینا قرآن میں اسی نام سے موسوم کرنے کا سبب بنا اس لئے اس کی نسبت بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرف کر دی گئی۔

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ یعنی آپ محشر میں گواہی دیں گے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے احکام اس اُمّت کو پہنچا دیئے تھے۔ اور اُمّتِ محمدیہ شہادت دے گی کہ بیشک سب انبیاء نے اپنی اپنی قوم کو اللہ کے احکام پہنچا دیئے تھے دوسری اُمتوں کی طرف سے ان کی شہادت پر یہ جرح ہوگی کہ ہمارے زمانے میں تو اُمّتِ محمدیہ کا وجود بھی نہ تھا یہ ہمارے معاملے میں کیسے گواہ بن سکتے ہیں۔ اُن کی طرف سے جرح کا یہ جواب ہوگا کہ بیشک ہم موجود نہ تھے مگر ہم نے یہ بات اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے جن کے صدق میں کوئی شک وشبہ نہیں اس لئے ہم یہ گواہی دے سکتے ہیں۔ تو اُن کی شہادت قبول کی جائے گی یہ مضمون اس حدیث کا ہے جس کو بخاری وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے۔ [۴]

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں پر ایسے احساناتِ عظیمہ فرمائے ہیں جن کا ذکر اُوپر آیا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ احکامِ الٰہیہ کی پابندی میں پوری کوشش کرو اُن میں سے اس جگہ نماز اور زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا اس لئے کیا گیا کہ بدن کے متعلقہ اعمال واحکام میں نماز سب سے اہم ہے اور مال سے متعلقہ احکام میں زکوٰۃ سب

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب المناقب وقول اللہ تعالیٰ "یٰایها الناس إنا خلقنٰکم" الآیة ج:۱ ص:۴۹۲، وصحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب الناس تبع لقریش إلخ ج:۲ ص:۱۱۹

[۲] جاء فی حدیث "انما انا لکم مثل الوالد" سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب النهی عن الاستطابة بالروث ج:۱ ص:۱۶

[۳] ترجمہ: اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو۔

[۴] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب البقرة، باب قوله "وکذٰلك جعلنٰکم امة وسطًا" الآیة، ج:۲ ص:۶۴۴

سے زیادہ اہم، گویا مراد تمام ہی احکامِ شرعیہ کی پابندی کرنا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ٭ یعنی اپنے سب کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرو، اُسی سے مدد مانگو اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مراد اس اعتصام سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگا کرو کہ تم کو تمام مکروہات دُنیا و آخرت سے محفوظ رکھے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ٭ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن وسنت کے ساتھ تمسک کرو ان کو ہر حال میں لازم پکڑو جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:-

تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ رَوَاهُ مَالِكٌ فِي الْمُوَطَّاءِ مُرْسَلًا۔ (مظہری) [1]

میں نے تمہارے لئے دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں کہ تم جب تک ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب دوسرے اُس کے رسول کی سُنّت۔

تَمَّ تَفْسِيْرُ سُوْرَةِ الْحَجِّ بِعَوْنِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَبِهٖ نَعْتَصِمُ هُوَ مَوْلَانَا وَنِعْمَ النَّصِيْرُ

الحمدللہ سورۂ حج کی تفسیر کا اکثر حصہ اشہرِ حج کے آخری مہینہ ذی الحجہ میں پورا ہوا، پوری سورت کی تفسیر سات روز میں مکمل ہوئی پانچ روز ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے اور دو روز محرّم ۱۳۹۱ھ کے وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ وَبِهٖ اَسْتَعِيْنُ فِيْ تَكْمِيْلِ الْبَاقِيْ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

---

[1] موطا مالکؒ رقم الحدیث:۱۶۲۸، کتاب القدر، باب النهی عن القول بالقدر، والمظهری ج:۶ ص:۳۵۸

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْن

اٰیاتہا ۱۱۸ | ۲۳ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَکِّیَّۃٌ ۷۴ | رکوعاتہا ٦

سورۂ مؤمنون مکہ میں اُتری اور اُس کی ایک سو اٹھارہ آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲

کام نکال لے گئے ایمان والے جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴

اور جو نکمّی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر یا

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝٦ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ

اپنے ہاتھ کے مال باندیوں پر سو ان پر نہیں کچھ الزام پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے سوا

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝٧ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝٨

سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے اور جو اپنی امانتوں سے اور اپنے قرار سے خبردار ہیں

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝٩ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝١٠

اور جو اپنی نمازوں کی خبر رکھتے ہیں وہی ہیں میراث لینے والے

الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝١١

جو میراث پائیں گے باغ ٹھنڈی چھاؤں کے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اُن ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے ۝١ جو اپنی نماز میں دِل سے جھکنے والے ہیں، ۝٢ اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں ۝٣ اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں، ۝٤ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، ۝٥ سوائے اپنی بیویوں اور اُن کنیزوں کے جو اُن کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابلِ ملامت نہیں ہیں، ۝٦ ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں۔ ۝٧ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں، ۝٨ اور جو اپنی نمازوں کی پوری نگرانی رکھتے ہیں۔ ۝٩ یہ ہیں وہ وارث ۝١٠ جنہیں جنت الفردوس کی میراث ملے گی۔ یہ اُس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ۝١١

فضائل وخصوصیات سورۂ مؤمنون

مسند احمد میں حضرت فاروق اعظم عمر بن خطابؓ کی روایت ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو پاس والوں کے کان میں ایسی آواز ہوتی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کی آواز ہوتی ہے۔ ایک روز آپ کے قریب ایسی ہی آواز سُنی گئی تو ہم ٹھہر گئے کہ تازہ آئی ہوئی وحی سُن لیں۔ جب وحی کی خاص کیفیت سے فراغت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رُخ ہو کر بیٹھ گئے اور یہ دُعا کرنے لگے اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَارْضَ عَنَّا وَاَرْضِنَا (یعنی یا اللہ ہمیں زیادہ دے کم نہ کر اور ہماری عزت بڑھا ذلیل نہ کر اور ہم پر بخشش فرما، محروم نہ کر اور ہمیں دوسروں پر ترجیح دے ہم پر دوسروں کو ترجیح نہ دے اور ہم سے راضی ہو اور ہمیں بھی اپنی رضا سے راضی کر دے)۔ اس کے بعد فرمایا کہ مجھ پر اس وقت دس آیتیں ایسی نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص اُن پر پورا پورا عمل کرے تو وہ (سیدھا) جنت میں جائے گا۔ پھر یہ دس آیتیں جو اُوپر لکھی گئی ہیں پڑھ کر سنائیں۔ (ابن کثیر)[1]

اور نسائی نے کتاب التفسیر میں یزید بن بابنوس سے نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق کیسا اور کیا تھا، اُنہوں نے فرمایا آپ کا خُلقُ یعنی طبعی عادت وہ تھی جو قرآن میں ہے اس کے بعد یہ دس آیتیں تلاوت کر کے فرمایا کہ بس یہی خُلق و عادت تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ (ابن کثیر)[2]

خلاصۂ تفسیر

بالتحقیق اُن مسلمانوں نے (آخرت میں) فلاح پائی جو (تصحیح عقائد کے ساتھ صفات ذیل کے ساتھ بھی موصوف ہیں یعنی وہ) اپنی نماز میں (خواہ فرض ہو یا غیر فرض) خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو (یعنی فضول) باتوں سے (خواہ قولی ہوں یا فعلی) برکنار رہنے والے ہیں اور جو (اعمال و اخلاق میں) اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی (حرام شہوت رانی سے) حفاظت رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ اُن پر (اس میں) کوئی الزام نہیں۔ ہاں جو اس کے علاوہ (اور جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا (جو کسی عقد کے ضمن میں کیا ہو یا ویسے ہی ابتداءً کیا ہو) خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی (فرض) نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس (بریں) کے وارث ہوں گے (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

[1] مسند احمد، مسند عمر بن الخطاب رضی الله عنه، رقم الحدیث: ۲۲۸، وتفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج: ۵ ص: ۳۵۹

[2] سنن النسائی الکبریٰ، کتاب التفسیر، سورة المؤمنون، رقم الحدیث: ۱۱۳۵۰

معارف ومسائل

فلاح کیا چیز ہے اور کہاں اور کیسے ملتی ہے؟

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱ لفظ فلاح قرآن وسنت میں بکثرت استعمال ہوا ہے اذان واقامت میں پانچ وقت ہر مسلمان کوفلاح کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔فلاح کے معنے یہ ہیں کہ ہر مراد حاصل ہواور ہر تکلیف دُور ہو (قاموس) [1] یہ لفظ جتنا مختصر ہے اتنا ہی جامع ایسا ہے کہ کوئی انسان اس سے زیادہ کسی چیز کی خواہش کر ہی نہیں سکتا۔اور یہ ظاہر ہے کہ مکمل فلاح کہ ایک مراد بھی ایسی نہ رہے جو پوری نہ ہواور ایک بھی تکلیف ایسی نہ رہے جو دُور نہ ہو، یہ دُنیا میں کسی بڑے سے بڑے انسان کے بس میں نہیں۔چاہے دُنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہفت اقلیم ہو یا سب سے بڑا رسول اور پیغمبر ہو۔اس دُنیا میں کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز خلاف طبع پیش نہ آئے اور جو خواہش جس وقت دل میں پیدا ہو بلا تاخیر پوری ہوجائے۔اگر اور بھی کچھ نہیں تو ہر نعمت کے لئے زوال اور فنا کا کھٹکا اور ہر تکلیف کے واقع ہوجانے کا خطرہ، اس سے کون خالی ہوسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ فلاحِ کامل تو ایسی چیز ہے جو اس مُلک دُنیا میں دستیاب ہی نہیں ہوسکتی کیونکہ دُنیا تو دارُ التکلیف والمحنت بھی ہے اور اس کی کسی چیز کو بقاء وقرار بھی نہیں۔یہ متاعِ گرانمایہ ایک دوسرے عالم میں ملتی ہے جس کا نام جنت ہے۔وہ ہی ایسا ملک ہے جس میں انسان کی ہر مراد ہر وقت بلا انتظار حاصل ہوگی وَ لَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ ۝۵۷ (یٰسٓ:۵۷) (یعنی ان کو ملے گی ہر وہ چیز جو وہ چاہیں گے) اور وہاں کسی ادنیٰ رنج وتکلیف کا گزر نہ ہوگا اور ہر شخص یہ کہتا ہوا وہاں داخل ہوگا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡۤ اَذۡهَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوۡرٌ شَكُوۡرُ ۝۳۴ الَّذِيۡۤ اَحَلَّنَا دَارَ الۡمُقَامَةِ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۚ (فاطر) یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم دُور کردیا بلاشبہ ہمارا ربّ معاف کرنے والا قدردان ہے جس نے ہمیں اپنے فضل سے ایک مقام میں پہنچادیا جس کی ہر چیز قائم ودائم ہے۔اس آیت میں یہ بھی اشارہ موجود ہے کہ دار دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کو کبھی کوئی رنج وغم نہ پہنچا ہو۔اس لئے جنت میں قدم رکھتے ہوئے ہر شخص یہ کہے گا کہ اب ہمارا غم دُور ہوا۔قرآن کریم نے سورۂ اعلیٰ میں جہاں فلاح حاصل کرنے کا نسخہ بتلایا کہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرے [2] قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى ۝۱۴ (الاعلیٰ) اس کے ساتھ ہی یہ بھی اشارہ فرمادیا کہ کامل فلاح کی جگہ اصل میں آخرت ہے صرف دُنیا سے دل لگانا طالب فلاح کا کام نہیں۔فرمایا بَلۡ تُؤۡثِرُوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ۝۱۶ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ وَّ اَبۡقٰى ۝۱۷ (الاعلیٰ) یعنی تم لوگ دُنیا ہی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو

---

[1] القاموس المحیط ج:۱ ص:۲۲۷ (بالاختصار)

[2] ترجمہ: بامراد ہوا جو شخص پاک ہوگیا۔

حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے کہ اُسی میں ہر مراد حاصل اور ہر تکلیف دُور ہوسکتی ہے اور وہ باقی رہنے والی بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کامل و مکمل فلاح تو صرف جنت ہی میں مل سکتی ہے دُنیا اُس کی جگہ ہی نہیں۔ البتہ اکثری حالات کے اعتبار سے فلاح یعنی بامراد ہونا اور تکلیفوں سے نجات پانا یہ دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔ آیاتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے کا وعدہ ان مؤمنین سے کیا ہے جن میں وہ سات صفات موجود ہوں جن کا ذکر ان آیات کے اندر آیا ہے۔ یہ فلاحِ عام اور شامل ہے جس میں آخرت کی کامل مکمل فلاح بھی داخل ہے اور دُنیا میں جس قدر فلاح حاصل ہونا ممکن ہے وہ بھی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ صفات مذکور کے حامل مؤمنین کو آخرت کی کامل فلاح ملنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن دُنیا میں فلاح تو بظاہر کفار و فجّار کا حصہ بنی ہوئی ہے اور ہر زمانے کے انبیاء اور اُن کے بعد صلحاءِ اُمّت عموماً تکلیفوں میں مبتلا رہے ہیں۔ مگر جواب اس کا ظاہر ہے کہ دُنیا میں مکمل فلاح کا تو وعدہ نہیں کہ کوئی تکلیف پیش ہی نہ آئے بلکہ کچھ نہ کچھ تکلیف تو یہاں پر صالح و متقی کو بھی اور ہر کافر فاجر کو بھی پیش آنا ناگزیر ہے اور یہی حال حصولِ مراد کا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہ مقصد بھی ہر انسان کو خواہ وہ صالح و متقی ہو خواہ کافر و بدکار ہو حاصل ہوتا ہی ہے۔ پھر ان دونوں میں فلاح پانے والا کس کو کہا جائے تو اس کا اعتبار عواقب اور انجام پر ہے۔

دُنیا کا تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو اہلِ صلاح ان سات اوصاف کے حامل اور اُن سے متصف اور اُن پر قائم رہیں گو دُنیا میں وقتی تکلیف اُن کو بھی پیش آجائے مگر انجام کار اُن کی تکلیف جلد دُور ہوتی ہے اور مراد حاصل ہوجاتی ہے ساری دُنیا اُن کی عزّت کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور دُنیا میں نیک نام اُنہیں کا باقی رہتا ہے۔ جتنا دُنیا کے حالات کا غور وانصاف سے مطالعہ کیا جائے گا ہر دَور ہر زمانے ہر خطّہ میں اس کی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔

مؤمن کامل کے وہ سات اوصاف جن پر آیاتِ مذکورہ میں فلاحِ دُنیا و آخرت کا وعدہ ہے

سب سے پہلا وصف تو مؤمن ہونا ہے مگر وہ ایک بنیادی چیز اور اصل الاصول ہے اُس کو الگ کر کے سات اوصاف جو یہاں بیان کئے گئے ہیں یہ ہیں:

اوّل نماز میں خشوع، خشوع کے لُغوی معنے سکون کے ہیں اصطلاحِ شرع میں خشوع یہ ہے کہ قلب میں بھی سکون ہو۔ یعنی غیر اللہ کے خیال کو قلب میں بالقصد حاضر نہ کرے اور اعضاء بدن میں بھی سکون ہو کہ عبث اور فضول

حرکتیں نہ کرے (بیان القرآن) [۱] خصوصاً وہ حرکتیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں منع فرمایا ہے اور فقہاء نے اُن کو مکروہات نماز کے عنوان سے جمع کر دیا ہے۔ تفسیر مظہری میں خشوع کی یہی تعریف حضرت عمرو بن دینارؒ سے نقل کی ہے۔ [۲] اور دوسرے بزرگوں سے جو خشوع کی تعریف میں مختلف چیزیں نقل کی گئی ہیں وہ دراصل اسی سکونِ قلب و جوارح کی تفصیلات ہیں۔ مثلاً حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ نظر اور آواز کو پست رکھنے کا نام خشوع ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ دائیں بائیں التفات یعنی گوشۂ چشم سے دیکھنے سے بچنا خشوع ہے حضرت عطاء نے فرمایا کہ بدن کے کسی حصّہ سے کھیل نہ کرنا خشوع ہے۔ حدیث میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نماز کے وقت اپنے بندے کی طرف برابر متوجہ رہتا ہے جب تک وہ دوسری طرف التفات نہ کرے، جب وہ دوسری طرف التفات کرتا ہے یعنی گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سے رُخ پھیر لیتے ہیں۔ (رواہ احمد والنسائی وابوداؤد وغیرھم۔ مظہری) [۳] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ کو حکم دیا کہ اپنی نگاہ اُس جگہ رکھو جس جگہ سجدہ کرتے ہو اور یہ کہ نماز میں دائیں بائیں التفات نہ کرو۔ (رواہ البیہقی فی السنن الکبریٰ مظہری) [۴]

اور حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا ہے تو فرمایا لَوْ خَشَعَ قَلْبُ هٰذَا لَخَشَعَتْ جَوَارِحُهٗ (رواہ الحکیم الترمذی بسند ضعیف) [۵] یعنی اگر اس شخص کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی سکون ہوتا۔ (مظہری) [۶]

نماز میں خشوع کی ضرورت کا درجہ

امام غزالیؒ و قرطبیؒ اور بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ نماز میں خشوع فرض ہے اگر پوری نماز خشوع کے بغیر گزر جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی۔ دوسرے حضرات نے فرمایا کہ اس میں شبہ نہیں کہ خشوع رُوحِ نماز ہے اس کے بغیر نماز بے جان ہے مگر اس کو رُکن نماز کی حیثیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ خشوع نہ ہوا تو نماز ہی نہ ہوئی اور اُس کا عادہ فرض قرار دیا جائے۔

حضرت سیّدی حکیم الاُمۃؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ خشوع صحتِ نماز کے لئے موقوف علیہ تو نہیں اور اس درجہ

---

[۱] تفسیر بیان القرآن ج:۷ ص:۸۶

[۲] تفسیر المظھری ج:۶ ص:۳۶۲

[۳] مسند احمد، حدیث ابی ذر رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۲۱۲۸۱، وسنن النسائی، کتاب السھو، باب التشدید فی الالتفات فی الصلاۃ۔

[۴] السنن الکبریٰ للبیھقیؒ رقم الحدیث:۳۳۶۰، وتفسیر المظھری ج:۶ ص:۳۶۳

[۵] کنز العمال، رقم الحدیث:۲۲۵۳۰

[۶] تفسیر المظھری بحوالۂ بالا۔

میں وہ فرض نہیں مگر قبولِ نماز کا موقوف علیہ اور اس مرتبہ میں فرض ہے۔[۱] حدیث میں طبرانی نے معجم کبیر میں بسند حسن حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو چیز اس اُمت سے اُٹھ جائے گی یعنی سلب ہو جائے گی وہ خشوع ہے یہاں تک کہ قوم میں کوئی خاشع نظر نہ آئے گا۔ کذا فی مجمع الزوائد۔(بیان)[۲]

مؤمن کامل کا **دوسرا وصف** لغو سے پرہیز کرنا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ لغو کے معنے فضول کلام یا کام جس میں کوئی دینی فائدہ نہ ہو۔ لغو کا اعلیٰ درجہ معصیت اور گناہ ہے جس میں فائدہ دینی نہ ہونے کے ساتھ دینی ضرر ونقصان ہے اس سے پرہیز واجب ہے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ نہ مفید ہو نہ مضر، اس کا ترک کم از کم اولیٰ اور موجبِ مدح ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ[۳] یعنی انسان کا اسلام جب اچھا ہو سکتا ہے جبکہ وہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے۔ اسی لئے آیت میں اس کو مؤمن کامل کی خاص صفت قرار دیا ہے۔

تیسرا وصف زکوٰۃ ہے، لفظ زکوٰۃ کے معنے لغت میں پاک کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں شرح مال کا ایک خاص حصہ کچھ شرائط کے ساتھ صدقہ کرنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں عام طور پر یہ لفظ اسی اصطلاحی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ معنے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور اس پر جو شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے مکہ میں زکوٰۃ فرض نہ ہوئی تھی ہجرتِ مدینہ کے بعد فرض ہوئی، اس کا جواب ابن کثیر وغیرہ مفسرین کی طرف سے یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت مکہ ہی میں ہو چکی تھی سورۂ مزمل جو بالاتفاق مکی ہے اس میں بھی اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے ساتھ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (المزمل:۲۰) کا ذکر موجود ہے[۴] مگر سرکاری طور پر اُس کے وصول کرنے کا عام انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ طیبہ جانے کے بعد جاری ہوئیں۔ جن لوگوں نے زکوٰۃ کو مدنی احکام میں شمار کیا ہے ان کا یہی منشاء ہے۔ اور جن حضرات نے فرضیتِ زکوٰۃ کو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد کا حکم قرار دیا ہے اُنہوں نے اس جگہ زکوٰۃ کا مضمون عام لغوی معنی میں اپنے نفس کو پاک کرنا قرار دیا ہے خلاصۂ تفسیر میں یہی لیا گیا ہے اس معنے کا قرینہ اس آیت میں یہ بھی ہے کہ عام طور پر قرآن کریم میں جہاں زکوٰۃ فرض کا ذکر آیا ہے تو اُس کو اِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ (الانبیاء:۷۳) يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (لقمان:۴) اور اٰتُوا الزَّكٰوةَ (المزمل:۲۰) کے عنوان سے بیان کیا گیا، یہاں عنوان بدل کر لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿۴﴾ فرمانا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے وہ اصطلاحی معنے مراد نہیں اس کے علاوہ فاعلون کا بے تکلف تعلق فاعل سے ہوتا ہے اور زکوٰۃ اصطلاحی فعل نہیں بلکہ ایک حصہ مال ہے اس حصہ مال کے لئے فٰعِلُوْنَ کہنا بغیر تاویل کے نہیں ہو سکتا۔ اگر آیت میں زکوٰۃ کے معنی اصطلاحی زکوٰۃ کے لئے جائیں تو اس کا فرض

---

[۱] تفسیر بیان القرآن ج:۷ ص:۸۶

[۲] مجمع الزوائد، رقم الحدیث:۲۸۱۳، والمعجم الکبیر، رقم الحدیث:۷۱۸۳

[۳] جامع الترمذی، ابواب الزھد، بابٌ ج:۲ ص:۵۷

[۴] ترجمہ: اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔

ہونا اور مؤمن کے لئے لازم ہونا کھلا ہوا معاملہ ہے اور اگر مراد زکوٰۃ سے تزکیہ نفس ہے یعنی اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا تو وہ بھی فرض ہی ہے کیونکہ شرک، رِیا، تکبر، حسد، بغض، حرص، بخل جن سے نفس کو پاک کرنا تزکیہ کہلاتا ہے، یہ سب چیزیں حرام اور گناہِ کبیرہ ہیں، نفس کو ان سے پاک کرنا فرض ہے۔

چوتھا وصف شرمگاہوں کی حفاظت حرام سے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ، یعنی وہ لوگ جو اپنی بیویوں اور شرعی لونڈیوں کے علاوہ سب سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ان دونوں کے ساتھ شرعی ضابطہ کے مطابق شہوتِ نفس پوری کرنے کے علاوہ اور کسی سے کسی ناجائز طریقہ پر شہوت رانی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اس آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ یعنی شرعی قاعدے کے مطابق اپنی بیوی یا لونڈی سے شہوتِ نفس کو تسکین دینے والوں پر کوئی ملامت نہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس ضرورت کو ضرورت کے درجہ میں رکھنا ہے مقصدِ زندگی بنانا نہیں، اس کا درجہ اتنا ہی ہے کہ جو ایسا کرے وہ قابلِ ملامت نہیں۔ واللہ اعلم

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ یعنی منکوحہ بیوی یا شرعی قاعدہ سے حاصل شدہ لونڈی کے ساتھ شرعی قاعدے کے مطابق قضاء شہوت کے علاوہ اور کوئی بھی صورت شہوت پورا کرنے کی حلال نہیں۔ اس میں زنا بھی داخل ہے اور جو عورت شرعاً اُس پر حرام ہے اُس سے نکاح بھی بحکم زنا ہے اور اپنی بیوی یا لونڈی سے حیض ونفاس کی حالت میں یا غیر فطری طور پر جماع کرنا بھی اس میں داخل ہے، یعنی کسی مرد یا لڑکے سے یا کسی جانور سے شہوت پوری کرنا بھی۔ اور جمہور کے نزدیک اسْتِمْنَاء بِالْيَد یعنی اپنے ہاتھ سے منی خارج کر لینا بھی اس میں داخل ہے۔ (از تفسیر بیان القرآن، قرطبی، بحر محیط وغیرہ)[1]

پانچواں وصف امانت کا حق ادا کرنا وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ لفظ امانت کے لغوی معنے ہر اُس چیز کو شامل ہیں جس کی ذمہ داری کسی شخص نے اُٹھائی ہو اور اُس پر اعتماد و بھروسہ کیا گیا ہو۔ اس کی قسمیں چونکہ بیشمار ہیں اسی لئے باوجود مصدر ہونے کے اس کو بصیغہ جمع لایا گیا ہے تاکہ امانت کی سب قسموں کو شامل ہو جائے خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے۔ حقوق اللہ سے متعلق امانات تمام شرعی فرائض و واجبات کا ادا کرنا اور تمام محرمات و مکروہات سے پرہیز کرنا ہے اور حقوق العباد سے متعلق امانات میں مالی امانت کا داخل ہونا تو معروف ومشہور ہے کہ کسی شخص نے کسی کے پاس اپنا کوئی مال امانت کے طور پر رکھ دیا۔ یہ اُس کی امانت ہے اس کی حفاظت اُس کے واپس کرنے تک اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ کسی نے کوئی راز کی بات کسی سے کہی وہ بھی اس کی امانت ہے۔ بغیر اذنِ شرعی کے کسی کا راز ظاہر کرنا امانت میں خیانت ہے۔ مزدور، ملازم کو جو کام سپرد کیا گیا اُس کے لئے جتنا وقت مقرر ہے اُس کو اُسی کام میں

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱۰۶، البحر المحیط ج:۷ ص:۵۴۹، بیان القرآن تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۵۳۴

لگانا بھی امانت ہے کام کی چوری یا وقت کی چوری خیانت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امانت کی حفاظت اور اس کا حق ادا کرنا بڑا جامع لفظ ہے۔ سب مذکورہ تفصیلات اُس میں داخل ہیں۔

چھٹا وصف عہد پورا کرنا ہے۔ عہد ایک تو وہ معاہدہ ہے جو دو طرف سے کسی معاملے کے سلسلے میں لازم قرار دیا جائے اُس کا پورا کرنا فرض اور اس کے خلاف کرنا غدر اور دھوکا ہے جو حرام ہے۔ دوسرا وہ جس کو وعدہ کہتے ہیں یعنی یکطرفہ صورت سے کوئی شخص کسی شخص سے کسی چیز کے دینے کا یا کسی کام کے کرنے کا وعدہ کر لے۔ اس کا پورا کرنا بھی شرعاً لازم و واجب ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے اَلْعِدَۃُ دَیْنٌ یعنی وعدہ ایک قسم کا قرض ہے۔ جیسے قرض کی ادائیگی واجب ہے ایسے ہی وعدہ کا پورا کرنا واجب ہے۔ بلا عذر شرعی اس کے خلاف کرنا گناہ ہے۔ فرق دونوں قسموں میں یہ ہے کہ پہلی قسم کے پورا کرنے پر دوسرا آدمی اُس کو بذریعہ عدالت بھی مجبور کر سکتا ہے یکطرفہ وعدہ کو پورا کرنے کے لئے بذریعہ عدالت مجبور نہیں کیا جا سکتا، دیانۃً اُس کا پورا کرنا بھی واجب اور بلا عذر شرعی خلاف کرنا گناہ ہے۔

ساتواں وصف نماز پر محافظت ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹ نماز کی محافظت سے مراد اُس کی پابندی کرنا اور ہر ایک نماز کو اس کے وقت مستحب میں ادا کرنا ہے۔ (کذا فسرہ ابن مسعودؓ۔ روح) یہاں صلوات کا لفظ جمع اس لئے لایا گیا ہے کہ مراد اس سے پانچ وقت کی نمازیں ہیں جن کو اپنے اپنے وقت مستحب میں پابندی سے ادا کرنا مقصود ہے اور شروع میں جہاں مقصود بالذکر خشوع تھا وہاں لفظ مفرد لایا گیا کہ مطلقاً جنس نماز خواہ فرض ہو یا واجب، سنت ہو یا نفل سب کی روح خشوع ہے۔ غور کیا جائے تو ان سات اوصاف مذکورہ میں تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد اور اُن سے متعلقہ احکام آ جاتے ہیں جو شخص ان اوصاف کے ساتھ متصف ہو جائے اور اُس پر جما رہے وہ مؤمن کامل، فلاحِ دُنیا و آخرت کا مستحق ہے۔

یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان سات اوصاف کو شروع بھی نماز سے کیا گیا اور ختم بھی نماز پر کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگر نماز کو نماز کی طرح پابندی اور آدابِ نماز کے ساتھ ادا کیا جائے تو باقی اوصاف اس میں خود بخود پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ اوصافِ مذکورہ کے حامل لوگوں کو اس آیت میں جنت الفردوس کا وارث فرمایا ہے۔ لفظ وارث میں اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح مورث کا مال اس کے وارث کو پہنچنا قطعی اور لازمی ہے اسی طرح ان اوصاف والوں کا جنت میں داخلہ یقینی ہے اور قَدْ اَفْلَحَ کے بعد اوصافِ مفلحین پورے ذکر کرنے کے بعد اس جملے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ فلاحِ کامل اور اصلی فلاح کی جگہ جنت ہی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً

اور ہم نے بنایا آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے پھر ہم نے رکھا اس کو پانی کی بوند کرکے

فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً

ایک جمے ہوئے ٹھکانہ میں پھر بنایا اُس بوند سے لہو جما ہوا پھر بنایا اس لہو جمے ہوئے سے گوشت کی بوٹی

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ

پھر بنائیں اس بوٹی سے ہڈیاں پھر پہنایا ان ہڈیوں پر گوشت پھر اُٹھا کر کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾

سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے پھر تم اس کے بعد مروگے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ

پھر تم قیامت کے دن کھڑے کئے جاؤگے اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر سات رستے

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ

اور ہم نہیں ہیں خلق سے بے خبر اور اُتارا ہم نے آسمان سے پانی ناپ کر

فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ

پھر اس کو ٹھہرادیا زمین میں اور ہم اس کو لے جائیں تو لے جاسکتے ہیں پھر اُگادیئے تمہارے واسطے اس سے

جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾

باغ کھجور اور انگور کے، تمہارے واسطے اُن میں میوے ہیں بہت اور اُنہی میں سے کھاتے ہو

وقف لازم

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور وہ درخت جو نکلتا ہے سینا پہاڑ سے لے اُگتا ہے تیل اور روٹی ڈبونا کھانے والوں کے واسطے

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا

اور تمہارے لئے چوپایوں میں دھیان کرنے کی بات ہے پلاتے ہیں ہم تم کو اُن کے پیٹ کی چیز سے اور تمہارے لئے اُن میں

مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع

بہت فائدے ہیں اور بعضوں کو کھاتے ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا، ﴿۱۲﴾ پھر ہم نے اُسے ٹپکی ہوئی بوند کی شکل میں ایک محفوظ جگہ پر رکھا، ﴿۱۳﴾ پھر ہم نے اُس بوند کو جمے ہوئے خون کی شکل دے دی، پھر اُس جمے ہوئے خون کو ایک لوتھڑا بنا دیا، پھر اُس لوتھڑے کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا، پھر ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا، پھر اُسے ایسی اُٹھان دی کہ وہ ایک دوسری ہی مخلوق بن کر کھڑا ہو گیا۔ غرض بڑی شان ہے اللہ کی جو سارے کاریگروں سے بڑھ کر کاریگر ہے! ﴿۱۴﴾ پھر اس سب کے بعد تمہیں یقیناً موت آنے والی ہے، ﴿۱۵﴾ پھر قیامت کے دن تمہیں یقیناً دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ ﴿۱۶﴾ اور ہم نے تمہارے اُوپر سات تہ بر تہ راستے پیدا کئے ہیں، اور ہم مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔ ﴿۱۷﴾ اور ہم نے آسمان سے ٹھیک اندازے کے مطابق پانی اُتارا، پھر اُسے زمین میں ٹھہرا دیا، اور یقین رکھو، ہم اُسے غائب کر دینے پر بھی قادر ہیں۔ ﴿۱۸﴾ پھر ہم نے اُس سے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کئے جن سے تمہیں بہت سے میوے حاصل ہوتے ہیں، اور اُنہی میں سے تم کھاتے ہو۔ ﴿۱۹﴾ اور وہ درخت بھی پیدا کیا جو طورِ سینا سے نکلتا ہے، جو اپنے ساتھ تیل لے کر اور کھانے والوں کے لئے سالن لے کر اُگتا ہے۔ ﴿۲۰﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے مویشیوں میں بڑی نصیحت کا سامان ہے۔ جو (دُودھ) ان کے پیٹ میں ہے، اُس سے ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں، اور اُن میں تمہارے لئے بہت سے فوائد ہیں، اور انہی سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ ﴿۲۱﴾ اور اُنہی پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار بھی کیا جاتا ہے۔ ﴿۲۲﴾

خلاصۂ تفسیر

(اوّل بیان ہے ایجادِ انسان کا) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی غذا) سے بنایا (یعنی اوّل مٹی ہوتی ہے پھر اس سے بذریعہ نباتات کے غذا حاصل ہوتی ہے) پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک مدّت معیّنہ تک) ایک محفوظ مقام (یعنی رحم) میں رہا (اور وہ غذا سے حاصل ہوا تھا) پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنا دیا پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزاء) کو ہڈیاں بنا دیا پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا (جس سے وہ ہڈیاں ڈھک گئیں) پھر (ان سب انقلابات کے بعد) ہم نے (اس میں روح ڈال کر) اُس کو ایک دوسری ہی (طرح کی) مخلوق بنا دیا (جو حالات سابقہ سے نہایت ہی متمائز و متبائن ہے کیونکہ اس سے پہلے سب انقلابات ایک جماد بے جان میں ہو رہے تھے اور اب یہ ایک ذی حیات زندہ انسان بن گیا) سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صنّاعوں سے بڑھ کر ہے (کیونکہ دوسرے صنّاع تو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں جوڑ توڑ کر کے ہی بنا سکتے ہیں۔ زندگی پیدا کرنا یہ خاص اللہ ہی کا کام ہے۔ اور نطفہ پر مذکورہ انقلابات کی تفصیل اسی ترتیب کے ساتھ قانون وغیرہ کتبِ طبیہ میں بھی مذکور ہے آگے انسان کے آخری انجام فنا کا بیان ہے) پھر تم بعد اس (تمام قصّۂ عجیبہ) کے ضرور ہی مرنے والے ہو (آگے بیان ہے اعادہ کا یعنی) پھر تم قیامت کے روز دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے (اور جس طرح ہم نے تم کو ابتداءً وجود عطا فرمایا اسی طرح تمہاری بقا کا سامان بھی کیا کہ) ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان (جن میں ملائکہ کے آمد و رفت کے لئے راہیں ہیں) بنائے (کہ اس سے تمہاری بھی بعض مصلحتیں متعلق ہیں) اور ہم مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے۔ (بلکہ ہر مخلوق کو مصالح و حکم کی رعایت کر کے بنایا) اور ہم نے (انسان کی بقاء اور نشو و نما کے لئے) آسمان سے (مناسب) مقدار کے ساتھ پانی برسایا پھر ہم نے اس کو (مدت تک) زمین میں ٹھہرایا (چنانچہ کچھ پانی تو زمین کے اوپر رہتا ہے اور کچھ اندر اُتر جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً نکلتا رہتا ہے) اور ہم (جس طرح اُس کے برسانے پر قادر ہیں اسی طرح) اُس (پانی) کے معدوم کر دینے پر (بھی) قادر ہیں (خواہ ہوا کی طرف مستحیل کر کے خواہ اتنی دُور زمین کی گہرائی میں اُتار کر کہ آلات کے ذریعہ سے نہ نکال سکو مگر ہم نے باقی رکھا) پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے باغ پیدا کئے کھجوروں کے اور انگوروں کے تمہارے واسطے اُن (کھجوروں انگوروں) میں بکثرت میوے بھی ہیں (جبکہ ان کو تازہ تازہ کھایا جائے تو میوہ سمجھا جاتا ہے) اور ان میں سے (جو بچا کر خشک کر کے رکھ لیا جاتا ہے اس کو بطور غذا کے) کھاتے بھی ہو اور (اُسی پانی سے) ایک (زیتون کا) درخت بھی (ہم نے پیدا کیا) جو کہ طور سیناء میں (بکثرت) پیدا ہوتا ہے جو اُگتا ہے تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں

کے لئے سالن لئے ہوئے (یعنی اُس کے پھل سے دونوں فوائد حاصل ہوتے ہیں خواہ روشن کرنے کے اور مالش کرنے کے کام میں لاؤ خواہ اُس میں روٹی ڈبو کر کھاؤ۔ یہ سامان مذکور پانی اور نباتات سے تھا) اور (آگے حیوانات کے ذریعہ انسان کے منافع اور آسانیوں کا بیان ہے کہ) تمہارے لئے مواشی میں (بھی) غور کرنے کا موقع ہے کہ ہم تم کو اُن کے جوف میں کی چیز (یعنی دودھ) پینے کو دیتے ہیں اور تمہارے لئے اُن میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کہ ان کے بال اور اُون کام آتی ہے) اور (نیز) اُن میں سے بعض کو کھاتے بھی ہو اور اُن (میں جو بار برداری کے قابل ہیں اُن) پر اور کشتی پر لدے لدے پھرتے (بھی) ہو۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں انسان کی فلاحِ دُنیا و آخرت کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کے احکام کی تعمیل میں اپنے ظاہر و باطن کو پاک رکھنے اور تمام انسانوں کے حقوق ادا کرنے سے بیان کیا گیا تھا۔ آیاتِ مذکورہ میں اللہ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور بنی نوع انسان کی تخلیق میں اُس کے مظاہر خاص کا ذکر ہے جس سے واضح ہو جائے کہ انسان جس کو عقل و شعور ہو وہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ سُلالہ بمعنے خلاصہ اور طین، گیلی مٹّی، جس کے معنے یہ ہیں کہ زمین کی مٹی کے خاص اجزاء نکال کر اُس سے انسان کو پیدا کیا گیا۔ انسان کی تخلیق کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے اور اُن کی تخلیق اس مٹی کے خلاصہ سے ہوئی۔ اس لئے ابتدائی تخلیق کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا۔ اس کے بعد ایک انسان کا نطفہ دوسرے انسان کی تخلیق کا سبب بنا۔ اگلی آیت میں اسی کا بیان ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً سے فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ ابتدائی تخلیق مٹی سے ہوئی پھر آگے سلسلۂ تخلیق اسی مٹی کے جزءِ لطیف یعنی نطفہ سے جاری کر دی گئی۔ جمہور مفسرین نے آیتِ مذکورہ کی تفسیر یہی لکھی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ سے مراد بھی نطفہ انسانی ہو کیونکہ وہ غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا انسانی مٹی سے بنتی ہے۔ واللہ اعلم

تخلیقِ انسانی کے سات مدارج

آیاتِ مذکورہ میں انسان کی تخلیق کی سات دَور ذکر کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ، دوسرے درجہ میں نطفہ، تیسرے میں علقہ، چوتھے میں مضغہ پانچویں میں عظام یعنی ہڈیاں، چھٹے دَور میں ہڈیوں پر گوشت چڑھانا۔ ساتواں دور تکمیلِ تخلیق کا ہے یعنی رُوح پھونکنا۔

ایک لطیفہ عجیبہ از حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

تفسیر قرطبی میں اس جگہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اسی آیت سے استدلال کر کے ایک عجیب لطیفہ شب قدر کی تعیین میں نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ اکابرِ صحابہ کے مجمع سے سوال کیا کہ شبِ قدر رمضان کی کونسی تاریخ میں ہے؟ سب نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ، کوئی تعیین بیان نہیں کی۔ حضرت ابنِ عباسؓ ان سب میں چھوٹے تھے اُن سے خطاب فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں تو ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے آسمان سات پیدا کئے، زمینیں سات پیدا کیں، انسان کی تخلیق سات درجات میں فرمائی۔ انسان کی غذاء سات چیزیں بنائیں اس لئے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ شبِ قدر ستائیسویں شب ہوگی۔ فاروق اعظمؓ نے یہ عجیب استدلال سُن کر اکابرِ صحابہ سے فرمایا کہ آپ سے وہ بات نہ ہوسکی جو اس لڑکے نے کی جس کے سر کے بال بھی ابھی مکمّل نہیں ہوئے۔ یہ حدیث طویل ابن ابی شیبہ کے مُسند میں ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے تخلیق انسانی کے سات درجات سے مراد وہی لیا ہے جو اس آیت میں ہے اور انسان کی غذاء کی سات چیزیں سورۂ عبس کی آیت میں ہیں فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ [1] (عبس) اس آیت میں آٹھ چیزیں مذکور ہیں جن میں پہلی سات انسان کی غذا ہے اور آخری یعنی اَبّ یہ جانوروں کی غذا ہے۔ (قرطبی) [2]

پھر تخلیق انسانی پر جو سات دَور گزرتے ہیں قرآن کریم کی بلاغت دیکھئے کہ ان سب کو ایک ہی انداز سے بیان نہیں فرمایا، بلکہ کہیں ایک دَور سے دوسرے دَور تک انقلاب کو لفظ ثُمَّ سے تعبیر کیا ہے جو تراخی یعنی کچھ دیر سے ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کہیں اس انقلاب کا ذکر حرف فاء سے کیا ہے جو بلا تاخیر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں اشارہ اس ترتیب کی طرف ہے جو ایک انقلاب سے دوسرے انقلاب کے درمیان فطرۃً ہوتی ہے کہ بعض انقلابات انسانی عقل کے لحاظ سے بہت مشکل اور بہت دیر طلب ہوتے ہیں۔ بعض اتنے دیر طلب نہیں ہوتے چنانچہ قرآنِ کریم نے ابتدائی تین دَور کو لفظ ثُمَّ کے ساتھ بیان کیا ہے اوّل سلالہ طین پھر اس کو نطفہ کی صورت میں تبدیل کرنا۔ اس کو لفظ ثُمَّ سے فرمایا ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً کیونکہ مٹی سے غذا کا پیدا ہونا پھر غذا کا جزوِ بدن ہونا پھر اُس میں سے جزءِ خاص کا نطفہ کی صورت میں تبدیل ہونا انسانی قیاس کی رو سے بڑا وقت چاہتا ہے۔ اسی طرح اس کے بعد تیسرا درجہ نطفہ کا گوشت کے ٹکڑے کی شکل میں تبدیل ہونا، یہ بھی ایک طویل وقت چاہتا ہے اس کو بھی ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً سے تعبیر فرمایا۔ اس کے بعد کے تین دور علقہ سے مضغہ مضغہ سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھانا ان سب کا تھوڑی تھوڑی مدت میں ہو جانا مستبعد نہیں معلوم ہوتا تو ان تینوں

[1] ترجمہ: پھر ہم نے اس میں غلّہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱۱۰،۱۱۱

کو حرف فاء سے بیان فرمایا ہے۔ پھر آخری دَور جو نفخ روح اور زندگی پیدا کرنے کا ہے اس کو بھی لفظ ثُمَّ سے تعبیر فرمایا کیونکہ ایک غیر ذی روح جماد میں رُوح اور حیات پیدا کرنا قیاس عقل میں بڑی مدّت چاہتا ہے اس لئے یہاں پھر لفظ ثُمَّ لایا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک دَور سے دوسرے دَور کی طرف انقلاب جن صورتوں میں انسانی عقل وقیاس کے مطابق دیر طلب اور مدّت کا کام تھا وہاں لفظ ثُمَّ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا اور جہاں عام انسانی قیاس کی رُو سے زیادہ مدّت درکار نہیں ہوتی وہاں حرف فاء سے تعبیر کر کے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ اس لئے اس پر اُس حدیث سے شبہ نہیں ہوسکتا جس میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ہر دَور سے دوسرے دَور تک منقلب ہونے میں چالیس چالیس دن صرف ہوتے ہیں [۱] کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا کام ہے جو انسانی قیاس کے تابع نہیں۔

تخلیقِ انسانی کا آخری مقام یعنی اس میں رُوح وحیات پیدا کرنا

اس کا بیان قرآن کریم نے ایک خاص اور ممتاز انداز سے اس طرح فرمایا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ یعنی پھر ہم نے اس کو ایک خاص قسم کی اور پیدائش عطا کی۔ اس امتیازِ بیان کی وجہ یہ ہے کہ پہلے چھ دَور تخلیق کے عالمِ عناصر اور مادیات سے اور اُن میں انقلاب وتبدیل سے متعلق تھے اور یہ آخری ساتواں دَور دوسرے عالم یعنی عالمِ ارواح سے رُوح کو اس کے جسم میں منتقل کرنے کا دَور تھا اس لئے اس کو خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ سے تعبیر کیا گیا۔

رُوحِ حقیقی اور روحِ حیوانی

یہاں خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ، شعبیؒ، عکرمہؒ، ضحاکؒ ابوالعالیہؒ وغیرہ نے نفخِ روح سے فرمائی ہے۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ غالباً مراد اس روح سے رُوحِ حیوانی ہے کہ وہ بھی مادّی اور ایک جسمِ لطیف ہے جو جسمِ حیوانی کے ہر ہر جزء میں سمایا ہوا ہوتا ہے [۲] جس کو اطباء اور فلاسفہ روح کہتے ہیں۔ اُس کی تخلیق بھی تمام اعضاء انسانی کی تخلیق کے بعد ہوتی ہے اس لئے اس کو لفظ ثُمَّ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور روحِ حقیقی جس کا تعلق عالمِ ارواح سے ہے، وہیں سے لا کر اس رُوحِ حیوانی کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ حق تعالیٰ اپنی قدرت سے پیدا فرما دیتے ہیں جس کی حقیقت کا پہچاننا انسان کے بس کا نہیں۔ اس روحِ حقیقی کی تخلیق تو تمام انسانوں کی تخلیق سے بہت پہلے ہے انہیں ارواح کو حق تعالیٰ نے ازل میں جمع کر کے اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ [۳] (الاعراف: ۱۷۲) فرمایا اور سب نے بَلٰی کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ ہاں اس کا تعلق

---

[۱] صحيح البخاری، كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة ج:۱ ص:۴۵۶، وصحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية الخلق الآدمی إلخ ج:۲ ص:۳۳۲

[۲] تفسير المظهری تحت هذه الآية ج:۶ ص:۳۶۹

[۳] ترجمہ: کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں۔

جسم انسانی کے ساتھ تخلیق اعضاء انسانی کے بعد ہوتا ہے۔ اس جگہ نفخِ روح سے اگر یہ مراد لی جائے کہ روحِ حیوانی کے ساتھ روحِ حقیقی کا تعلق اس وقت قائم فرمایا گیا تو یہ بھی ممکن ہے۔ اور درحقیقت حیاتِ انسان اسی رُوحِ حقیقی سے متعلق ہے جب اس کا تعلق روحِ حیوانی کے ساتھ ہو جاتا ہے تو انسان زندہ کہلاتا ہے جب منقطع ہو جاتا ہے تو انسان مردہ کہلاتا ہے وہ روحِ حیوانی بھی اپنا عمل چھوڑ دیتی ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ﴿۱۴﴾ خلق و تخلیق کے اصلی معنے کسی چیز کو از سرِ نو بغیر کسی مادّہ سابقہ کے پیدا کرنا ہے جو حق تعالیٰ جل شانہٗ کی مخصوص صفت ہے اس معنے کے اعتبار سے خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کوئی دوسرا شخص فرشتہ ہو یا انسان کسی ادنیٰ چیز کا خالق نہیں ہوسکتا۔ لیکن کبھی کبھی یہ لفظِ خلق و تخلیق صنعت کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور صنعت کی حقیقت اس سے زائد نہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے جو مواد اور عناصر اس جہان میں اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرما دیئے ہیں ان کو جوڑ توڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ مرکب کر کے ایک نئی چیز بنا دی جائے۔ یہ کام ہر انسان کر سکتا ہے اور اسی معنے کے لحاظ سے کسی انسان کو بھی کسی خاص چیز کا خالق کہہ دیا جاتا ہے۔ خود قرآن کریم نے فرمایا وَتَخۡلُقُوۡنَ اِفۡكًا [1] (العنکبوت: ۱۷) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـئَةِ الطَّيۡرِ [2] (آل عمران: ۴۹) ان تمام مواقع میں لفظ خلق مجازی طور پر صنعت کے معنے میں بولا گیا ہے۔

اسی طرح یہاں لفظ خَالِقِيۡنَ بصیغہ جمع اسی لئے لایا گیا ہے کہ عام انسان جو اپنی صنعت گری کے اعتبار سے اپنے کو کسی چیز کا خالق سمجھتے ہیں اگر ان کو مجازاً خالق کہا بھی جائے تو اللہ تعالیٰ ان سب خالقوں یعنی صنعت گروں میں سب سے بہتر صنعت کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

ثُمَّ اِنَّكُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوۡنَ ﴿۱۵﴾ پچھلی تین آیتوں میں انسان کے مبدأ یعنی ابتداء آفرینش کا ذکر تھا۔ اب دو آیتوں میں اُس کے معاد یعنی انجام کار کا ذکر ہے۔ آیت مذکورہ میں فرمایا کہ پھر تم سب اس دُنیا میں آنے اور رہنے کے بعد موت سے دوچار ہونے والے ہو جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔ پھر فرمایا کہ ثُمَّ اِنَّكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ تُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۶﴾ یعنی مرنے کے بعد پھر قیامت کے روز تم سب زندہ کر کے اُٹھائے جاؤ گے تاکہ تمہارے اعمال کا حساب لے کر اصلی ٹھکانے جنت یا دوزخ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ انسان کا انجام ہوا، آگے آغاز و انجام یعنی مبدأ و معاد کے درمیانی حالات اور اُن میں انسان پر حق تعالیٰ کے احسانات و انعامات کی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ جس کو اگلی آیت میں آسمان کی تخلیق کے ذکر سے شروع فرمایا ہے۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعَ طَرَآئِقَ ۖ طرائق، طَرِيقة کی جمع ہے اس کو بمعنی طبقہ بھی لیا جاسکتا ہے جس کے معنے یہ

---

[1] ترجمہ: تم جھوٹی باتیں تراشتے ہو۔

[2] ترجمہ: میں تم لوگوں کے لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے۔

ہوں گے کہ تہ برتہ سات آسمان تمہارے اُوپر بنائے گئے اور طریقہ کے معنے مشہور راستہ کے ہیں۔ یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ سب آسمان فرشتوں کی گزرگاہیں ہیں جو احکام لے کر زمین پر آتے جاتے ہیں۔

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ اس میں یہ بتلایا کہ ہم نے انسان کو صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا اور اُس سے غافل نہیں ہو سکتے بلکہ اُس کے نشو ونماء اور رہائش و آسائش کے سامان بھی مہیا کئے۔ جس کی ابتداء آسمانوں کی تخلیق سے ہوئی پھر آسمان سے بارش برسا کر انسان کے لئے غذا اور اس کی آسائش کا سامان پھلوں پھولوں سے پیدا کیا جس کا ذکر بعد کی آیت میں اس طرح فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

انسانوں کو آب رسانی کا قدرتی عجیب وغریب نظام

اس آیت میں آسمان سے پانی برسانے کے ذکر کے ساتھ ایک قید بِقَدَرٍ کی بڑھا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسان ایسا ضعیف الخلقت ہے کہ جو چیزیں اس کے لئے مدارِ زندگی ہیں اگر وہ مقدار مقدّر سے زائد ہو جائیں تو وہی اس کے لئے وبالِ جان اور عذاب بن جاتی ہیں۔ پانی جیسی چیز جس کے بغیر کوئی انسان وحیوان زندہ نہیں رہ سکتا اگر ضرورت سے زیادہ برس جائے تو طوفان آجاتا ہے اور انسان اور اس کے سامان کے لئے وبال وعذاب بن جاتا ہے۔ اس لئے آسمان سے پانی برسانا بھی ایک خاص پیمانے سے ہوتا ہے جو انسان کی ضرورت پوری کر دے اور طوفان کی صورت اختیار نہ کرے بجز اُن خاص مقامات کے جن پر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہی کسی وجہ سے طوفان مسلّط کرنے کا سبب ہو جائے۔ اس کے بعد بڑا غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ پانی اگر روزانہ کی ضرورت کا روزانہ برسا کرے تو بھی انسان مصیبت میں آجائے روز کی بارش اُس کے کاروبار اور مزاج کے خلاف ہے۔ اور اگر سال بھر یا چھ مہینے یا تین مہینے کی ضرورت کا پانی ایک دفعہ برسایا جائے اور لوگوں کو حکم ہو کہ اپنا اپنا کوٹہ پانی کا چھ مہینے کے لئے جمع کر کے رکھو اور استعمال کرتے رہو تو ہر انسان کیا اکثر انسان بھی اتنے پانی کے جمع رکھنے کا انتظام کیسے کریں اور کسی طرح بڑے حوضوں اور گڑھوں میں بھر لینے کا انتظام بھی کر لیں تو چند روز کے بعد یہ پانی سڑ جائے گا جس کا پینا بلکہ استعمال کرنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اس لئے قدرتِ حق جلّ شانہٗ نے اس کا نظام یہ بنایا کہ پانی جس وقت برستا ہے اس وقت وقتی طور پر جتنے درخت اور زمینیں سیرابی کے قابل ہیں وہ سیراب ہو جاتے ہیں پھر زمین کے مختلف تالابوں، حوضوں اور قدرتی گڑھوں میں یہ پانی جمع رہتا ہے جس کو انسان اور جانور ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ پانی چند روز میں ختم ہو جاتا ہے۔ دائمی طور پر روزانہ انسان کو تازہ پانی کس طرح پہنچے جو ہر خطّے کے باشندوں کو مل سکے؟ اس کا نظام قدرت نے یہ بنایا کہ پانی کا بہت بڑا حصہ برف کی صورت میں ایک

بحر منجمد بنا کر پہاڑوں کے سروں پر ایسی پاک صاف فضاء میں رکھ دیا جہاں نہ گرد و غبار کی رسائی نہ کسی آدمی اور جانور کی اور جس میں نہ سڑنے کا امکان ہے نہ اُس کے ناپاک یا خراب ہونے کی کوئی صورت ہے۔ پھر یہ برف کا پانی آہستہ آہستہ رِس رِس کر پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر پھیلتا ہے اور یہ قدرتی پائپ لائن پوری زمین کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہے جہاں سے کچھ تو چشمے خود پھوٹ نکلتے ہیں اور ندی نالے اور نہروں کی شکل میں زمین پر بہنے لگتے ہیں، تازہ بتازہ جاری پانی کروڑوں انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرتا ہے اور کچھ یہی پہاڑی برف سے بہنے والا پانی زمین کی تہ میں اُتر کر نیچے نیچے بہتا رہتا ہے اور اُس کو کنواں کھود کر ہر جگہ نکالا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس پورے نظام کو ایک لفظ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ سے بیان فرما دیا ہے آخر میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ زمین کی تہ سے جو پانی کنوؤں کے ذریعہ نکالا جاتا ہے یہ بھی قدرت کی طرف سے آسانی ہے کہ زیادہ گہرائی میں نہیں بلکہ تھوڑی گہرائی میں یہ پانی رکھا گیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا بلکہ پانی کی طبعی خاصیت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ پانی زمین کی گہرائی میں اُترتا چلا جاتا، جہاں تک انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ اسی مضمون کو آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

آگے پانی کے ذریعہ پیدا ہونے والی خاص خاص چیزوں کو عرب کے مزاج و مذاق کے مطابق ذکر فرمایا کہ کھجور اور انگور کے باغات اُس سے پیدا ہوئے اور دوسرے پھلوں کو ایک عام لفظ میں جمع کر کے فرمایا لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ، یعنی ان باغات میں تمہارے لئے کھجور و انگور کے علاوہ ہزاروں قسم کے پھل پیدا کئے ہیں جن کو تم محض تفریحی اور شوقیہ طور پر بھی کھاتے ہو اور اُن میں سے بعض پھلوں کا ذخیرہ کر کے تمہاری مستقل غذا بھی اُن سے تیار ہوتی ہے وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ کا یہی مطلب ہے۔ آگے خصوصیت سے زیتون اور اُس کے تیل کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا کیونکہ اس کے منافع بیشمار ہیں۔ اور چونکہ زیتون کے درخت کوہ طور پر زیادہ پیدا ہوتے ہیں اس لئے اس کی طرف نسبت کر دی گئی وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ، سیناء اور سینین اُس مقام کا نام ہے جس میں کوہ طور واقع ہے۔ زیتون کا تیل تیل کی ضروریات مثلاً بدن کی مالش اور چراغ میں جلانے کے بھی کام آتا ہے اور کھانے میں سالن کا بھی کام دیتا ہے اسی کو فرمایا تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ زیتون کے درخت کے لئے کوہِ طور کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ درخت سب سے پہلے کوہِ طور ہی پر پیدا ہوا ہے اور بعض نے کہا کہ طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلا درخت جو زمین پر اُگا ہے وہ زیتون تھا۔ (مظہری) [1]

اس کے بعد اُن نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے جانوروں، چوپایوں کے ذریعہ انسان کو عطا فرمائیں تا کہ انسان اُن سے عبرت حاصل کرے اور حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور رحمتِ کاملہ پر استدلال کر کے توحید و عبادت میں مشغول ہو۔ اسی لئے فرمایا وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً یعنی تمہارے لئے چوپایہ جانوروں میں ایک عبرت و نصیحت ہے آگے اس کی

[1] تفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۶ ص:۳۷۵، ۳۷۶

کچھ تفصیل اس طرح بتلائی نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا، کہ ان جانوروں کے پیٹ میں ہم نے تمہارے لئے پاکیزہ دودھ تیار کیا جو انسان کی بہترین غذا ہے اور پھر فرمایا کہ صرف دودھ ہی نہیں، ان جانوروں میں تمہارے لئے بہت سے (بیشمار) منافع اور فوائد ہیں وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ، غور کرو تو جانوروں کے جسم کا ایک ایک جزء، رُواں رُواں انسان کے کام آتا ہے اور اُس سے انسان کی معیشت کے لئے بیشمار قسم کے سامان تیار ہوتے ہیں۔ جانوروں کے بال، ہڈی، آنتیں، پٹھے اور سبھی اجزاء سے انسان اپنی معیشت کے کتنے سامان بناتا اور تیار کرتا ہے۔ اُس کا شمار بھی مشکل ہے ان بیشمار منافع کے علاوہ ایک بڑا نفع یہ بھی ہے کہ ان میں سے جو جانور حلال ہیں اُن کا گوشت بھی انسان کی بہترین غذا ہے وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ آخر میں ان جانوروں کا ایک اور عظیم فائدہ ذکر کیا گیا کہ تم اُن پر سوار بھی ہوتے ہو اور بار برداری کا بھی ان سے کام لیتے ہو۔ اس آخری فائدہ میں چونکہ جانوروں کے ساتھ دریا میں چلنے والی کشتیاں بھی شریک ہیں کہ سواری اور بار برداری کا بڑا کام ان سے نکلتا ہے اس لئے کشتیوں کو بھی اس کے ساتھ ذکر فرمادیا۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ فلک یعنی کشتیوں ہی کے حکم میں وہ تمام سواریاں بھی ہیں جو پہیوں کے ذریعہ چلنے والی ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اُس کی قوم کے پاس تو اُس نے کہا اے قوم بندگی کرو اللہ کی تمہارا کوئی حاکم نہیں

غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ

اس کے سوائے کیا تم ڈرتے نہیں تب بولے سردار جو کافر تھے اُس کی قوم میں

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

یہ کیا ہے آدمی ہے جیسے تم چاہتا ہے کہ بڑائی کرے تم پر اور اگر اللہ چاہتا

لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا

تو اُتارتا فرشتے ہم نے یہ نہیں سنا اپنے اگلے باپ دادوں میں اور کچھ نہیں یہ

رَجُلٌ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ

ایک مرد ہے کہ اس کو سودا ہے سو راہ دیکھو اس کی ایک وقت تک بولا اے رَبّ تو مدد کر میری

بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا پھر ہم نے حکم بھیجا اس کو کہ بنا کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ

پھر جب پہنچے ہمارا حکم اور اُبلے تنور تو تو ڈال لے کشتی میں ہر چیز کا جوڑا دو دو

وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ

اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس کی قسمت میں پہلے سے ٹھہر چکی ہے بات اور مجھ سے بات نہ کر

فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ

ان ظالموں کے واسطے بیشک ان کو ڈوبنا ہے پھر جب چڑھ چکے تو اور جو تیرے ساتھ ہے

عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾

کشتی پر تو کہہ شکر اللہ کا جس نے چھڑایا ہم کو گنہگار لوگوں سے

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہہ اے رَبّ اُتار مجھ کو برکت کا اُتارنا اور تو ہے بہتر اُتارنے والا

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾

اس میں نشانیاں ہیں اور ہم ہیں جانچنے والے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے نوح کو اُن کی قوم کے پاس بھیجا تھا، چنانچہ اُنہوں نے (قوم سے) کہا کہ: "میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ بھلا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟" ﴿۲۳﴾ اس پر اُن کی قوم کے کافر سرداروں نے (ایک دوسرے سے) کہا: "اس شخص کی اس کے سوا کوئی حقیقت نہیں کہ یہ تمہی جیسا ایک انسان ہے جو تم پر اپنی برتری جمانا چاہتا ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کر دیتا۔ یہ بات تو ہم نے اپنے پچھلے باپ دادوں میں کبھی نہیں سنی۔ ﴿۲۴﴾ (رہا یہ شخص، تو) یہ اور کچھ نہیں، ایک ایسا آدمی ہے جسے جنون لاحق ہو گیا ہے، اس لئے کچھ وقت تک اس کا انتظار کر کے دیکھ لو (کہ شاید اپنے حواس میں آجائے)" ﴿۲۵﴾ نوح نے کہا: "یا ربّ! ان لوگوں نے مجھے جس طرح جھوٹا بنایا ہے، اُس پر تو ہی میری مدد فرما۔" ﴿۲۶﴾ چنانچہ ہم نے اُن کے پاس وحی بھیجی کہ: "تم ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ پھر جب ہمارا حکم آجائے، اور تنور اُبل پڑے، تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اُسے بھی اُس کشتی میں سوار کر لینا، اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوائے اُن کے جن کے خلاف پہلے ہی حکم صادر ہو چکا ہے۔ اور ان ظالموں کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا، یہ بات طے ہے کہ یہ سب غرق کئے جائیں گے۔ ﴿۲۷﴾ پھر جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں ٹھیک ٹھیک بیٹھ چکیں، تو کہنا: 'شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات عطا فرمائی۔' ﴿۲۸﴾ اور کہنا: 'یا ربّ! مجھے ایسا اُترنا نصیب کر جو برکت والا ہو، اور تو بہترین اُتارنے والا ہے۔'" ﴿۲۹﴾ اس سارے واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں، اور یقینی بات ہے کہ ہمیں آزمائش تو کرنی ہی کرنی تھی۔ ﴿۳۰﴾

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلی آیتوں میں انسان کی تخلیق اور اس کی بقاء و آسائش کے لئے مختلف قسم کے سامان پیدا کرنے کا ذکر تھا آگے اُس کی روحانی تربیت اور دینی فلاح کا جو انتظام فرمایا اُس کا ذکر ہے) اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اُن کی قوم کی طرف پیغمبر کر کے بھیجا سو اُنہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کیا کرو اُس کے سوا کوئی تمہارے لئے معبود بنانے کے لائق نہیں (اور جب یہ ایک بات ثابت ہے تو) پھر کیا تم (دوسروں کے معبود بنانے سے) ڈرتے نہیں ہو پس (نوح علیہ السلام کی یہ بات سُن کر) اُن کی قوم میں جو کافر رئیس تھے (عوام سے) کہنے لگے کہ یہ شخص بجز اس کے کہ تمہاری طرح کا ایک (معمولی) آدمی ہے اور کچھ (رسول وغیرہ) نہیں ہے (اس دعوے سے) اُن کا (اصل) مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے (یعنی اس کا مقصد محض اپنی جاہ و عزّت ہے) اور اگر اللہ کا (رسول بھیجنا) منظور ہوتا تو

(اس کام کے لئے) فرشتوں کو بھیجتا (پس دعویٰ ان کا غلط ہے اسی طرح ان کی دعوت کرنا توحید کی طرف یہ دوسری غلطی ہے کیونکہ) ہم نے یہ بات (کہ اور کسی کو معبود مت قرار دو) اپنے پہلے بڑوں میں (کبھی) نہیں سُنی بس یہ ایک آدمی ہے جس کو جنون ہو گیا ہے (اس واسطے ساری دُنیا کے خلاف باتیں کرتا ہے کہ میں رسول ہوں اور معبود ایک ہے) سو ایک وقت خاص (یعنی اس کے مرنے کے وقت) تک اس (کی حالت) کا اور انتظار کرلو (آخر ایک وقت پر پہنچ کر ختم ہو جائے گا اور سب پاپ کٹ جائے گا) نوح (علیہ السلام) نے (اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہو کر جناب باری تعالیٰ میں) عرض کیا کہ اے میرے رَبّ (اُن سے) میرا بدلہ لے بوجہ اس کے کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا ہے پس ہم نے (اُن کی دُعا قبول کی اور) اُن کے پاس حکم بھیجا کہ تم کشتی تیار کرلو ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے (کہ اب طوفان آئے گا اور تم اور مؤمنین اس کے ذریعہ سے محفوظ رہو گے) پھر جس وقت ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچے اور (علامت اس کی یہ ہے کہ) زمین سے پانی اُبلنا شروع ہو جائے تو (اُس وقت) ہر قسم (کے جانوروں) میں سے (جو کہ انسان کے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے ، جیسا بھیڑ بکری ، گائے بیل اونٹ گھوڑا گدھا وغیرہ) ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو دو عدد اس (کشتی) میں داخل کرلو اور اپنے گھر والوں کو بھی (سوار کرلو) باستثناء اس کے جس پر اُن میں سے (غرق ہونے کا) حکم نافذ ہو چکا ہے (یعنی آپ کے اہل و عیال میں جو کافر ہو اس کو مت سوار کرو) اور (یہ سُن لو کہ عذاب آنے کے وقت) مجھ سے کافروں (کی نجات) کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا (کیونکہ) وہ سب غرق کئے جائیں گے پھر جس وقت تم اور تمہارے ساتھی (مسلمان) کشتی میں بیٹھ چکو تو یوں کہنا کہ شکر ہے خدا کا جس نے ہم کو کافر لوگوں سے (یعنی اُن کے افعال اور اُن کے وبال سے) نجات دی اور (جب بعد فرو ہونے طوفان کے کشتی سے زمین پر آنے لگو تو) یوں کہنا کہ اے میرے رَبّ مجھ کو (زمین پر) برکت کا اُتارنا اُتاریو (یعنی اطمینان ظاہری و باطنی کے ساتھ رکھیو) اور آپ سب (اپنے پاس بطور مہمانی کے) اُتارنے والوں سے اچھے ہیں (یعنی اور لوگ جو مہمان کو اتار لیتے ہیں وہ اپنے مہمان کی مقصد براری اور مصائب سے نجات پر قدرت نہیں رکھتے آپ کو ان سب چیزوں پر قدرت ہے) اس (واقعہ مذکورہ) میں (اہل عقل کے لئے ہماری قدرت کی) بہت سی نشانیاں ہیں اور ہم (یہ نشانیاں معلوم کرا کرا اپنے بندوں کو) آزماتے ہیں (کہ دیکھیں کہ کون ان سے نفع اُٹھاتا ہے کون نہیں اُٹھاتا ، اور نشانیاں یہ ہیں : رسول بھیجنا ، ایمان داروں کو بچالینا ، کافروں کو ہلاک کر دینا واقعۂ طوفان پیدا کر دینا ، کشتی کو محفوظ رکھنا وغیرہ وغیرہ) ۔

معارف و مسائل

وَفَارَ التَّنُّوْرُ تنور اُس خاص جگہ کو بھی کہا جاتا ہے جو روٹی پکانے کے لئے بنائی جاتی ہے اور یہی معنے معروف

ومشہور ہیں۔ دوسرے معنے میں تنور پوری زمین کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ خلاصۂ تفسیر میں اسی معنے کے اعتبار سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات نے اس سے ایک خاص تنور روٹی پکانے والا مراد لیا ہے جو کوفہ کی مسجد میں اور بعض کے نزدیک ملک شام میں کسی جگہ تھا۔ اس تنور سے پانی اُبلنے لگا حضرت نوح علیہ السلام کے لئے طوفان کی علامت یہ قرار دی گئی تھی (مظہری)[1] حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے طوفان اور کشتی کا واقعہ پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

پھر پیدا کی ہم نے اُن سے پیچھے ایک جماعت اور پھر بھیجا ہم نے ان میں ایک رسول اُن میں کا

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع وَقَالَ الْمَلَاُ

کہ بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا حاکم اس کے سوائے پھر کیا تم ڈرتے نہیں اور بولے سردار

مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ

اُس کی قوم کے جو کافر تھے اور جھٹلاتے تھے آخرت کی ملاقات کو اور آرام دیا تھا اُن کو ہم نے

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ

دُنیا کی زندگی میں اور کچھ نہیں یہ ایک آدمی ہے جیسے تم کھاتا ہے جس قسم سے تم کھاتے ہو

وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ

اور پیتا ہے جس قسم سے تم پیتے ہو اور کہیں تم چلنے لگے کہنے پر ایک آدمی کے اپنے برابر کے

اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا

تو تم بیشک خراب ہوئے کیا تم کو وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ اور ہوجاؤ مٹی اور ہڈیاں

[1] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۳۷۸

اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا

تو تم کو نکلنا ہے، کہاں ہوسکتا ہے کہاں ہوسکتا ہے جو تم سے وعدہ ہوتا ہے اور کچھ نہیں یہی جینا ہے ہمارا

الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ افْتَرٰى

دُنیا کا مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو پھر اُٹھنا نہیں اور کچھ نہیں یہ ایک مرد ہے باندھ لایا ہے

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ

اللہ پر جھوٹ اور اُس کو ہم نہیں ماننے والے بولا اے ربّ میری مدد کر

بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ

کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا فرمایا اب تھوڑے دنوں میں صبح کو رہ جائیں گے پچھتاتے پھر پکڑا اُن کو

الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

چنگھاڑ نے تحقیق پھر کر دیا ہم نے اُن کوڑا، سو دُور ہو جائیں گنہگار لوگ

آسان ترجمۂ قرآن

پھر اُن کے بعد ہم نے دوسری نسلیں پیدا کیں، (۳۱) اور اُن کے درمیان اُنہی میں کے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا (جس نے کہا) کہ: "اللہ کی عبادت کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ بھلا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟" (۳۲) اُن کی قوم کے وہ سردار جنہوں نے کفر اپنا رکھا تھا، اور جنہوں نے آخرت کا سامنا کرنے کو جھٹلایا تھا، اور جن کو ہم نے دُنیوی زندگی میں خوب عیش دے رکھا تھا، اُنہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا: "اس شخص کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ تمہی جیسا ایک انسان ہے۔ جو چیز تم کھاتے ہو، یہ بھی کھاتا ہے، اور جو تم پیتے ہو، یہ بھی پیتا ہے۔ (۳۳) اور اگر کہیں تم نے اپنے ہی جیسے ایک انسان کی فرماں برداری قبول کرلی تو تم بڑے ہی گھاٹے کا سودا کرو گے۔ (۳۴) بھلا بتاؤ، یہ شخص تمہیں ڈراتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے، اور مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جاؤ گے، تو تمہیں دوبارہ زمین سے نکالا جائے گا؟ (۳۵) جس بات سے تمہیں

ڈرایا جارہا ہے، وہ تو بہت ہی بعید بات ہے، سمجھ سے بالکل ہی دُور! ۝۳۶ زندگی تو ہماری اس دُنیوی زندگی کے سوا کوئی اور نہیں ہے، (یہیں) ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور ہمیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ ۝۳۷ (رہا یہ شخص، تو) یہ اور کچھ نہیں، ایک ایسا آدمی ہے جس نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑا ہے، اور ہم اس پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔'' ۝۳۸ پیغمبر نے کہا: ''یا ربّ! ان لوگوں نے مجھے جس طرح جھوٹا بنایا ہے، اُس پر تو ہی میری مدد فرما۔'' ۝۳۹ اللہ نے فرمایا: ''اب تھوڑی ہی دیر کی بات ہے کہ یہ لوگ پچھتاتے رہ جائیں گے۔'' ۝۴۰ چنانچہ اس سچے وعدے کے مطابق اُن کو ایک چنگھاڑ نے آپکڑا، اور ہم نے اُنہیں کوڑا کرکٹ بنا کر رکھ دیا۔ پھٹکار ہے ایسے ظالم لوگوں پر! ۝۴۱

خلاصۂ تفسیر

پھر (قوم نوح کے بعد) ہم نے دوسرا گروہ پیدا کیا (مراد عاد ہے یا ثمود) پھر ہم نے اُن میں ایک پیغمبر کو بھیجا جو اُن ہی میں کے تھے (مراد ہود علیہ السلام یا صالح علیہ السلام ہیں، اُن پیغمبر نے کہا کہ) تم لوگ اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود (حقیقی) نہیں، کیا تم (شرک سے) ڈرتے نہیں ہو، اور (اُن پیغمبر کی یہ بات سن کر) ان کی قوم میں سے جو رئیس تھے جنہوں نے (خدا اور رسول کے ساتھ) کفر کیا تھا اور آخرت کے آنے کو جھٹلایا تھا اور ہم نے اُن کو دُنیوی زندگانی میں عیش بھی دیا تھا کہنے لگے کہ بس یہ تو تمہاری طرح ایک (معمولی) آدمی ہیں (چنانچہ) یہ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو اور (جب یہ تمہارے ہی جیسے بشر ہیں تو) اگر تم اپنے جیسے ایک (معمولی) آدمی کے کہنے پر چلنے لگو تو بیشک تم (عقل کے) گھاٹے میں ہو (یعنی بڑی بے وقوفی ہے) کیا یہ شخص تم سے یہ کہتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور (مرکر) مٹی اور ہڈیاں ہوجاؤ گے (چنانچہ جب اجزاءِ لحمیہ خاک ہوجاتے ہیں تو ہڈیاں بے گوشت رہ جاتی ہیں پھر بعد چندے وہ بھی خاک ہوجاتی ہیں تو یہ شخص کہتا ہے کہ جب اس حالت پر پہنچ جاؤ گے) تو (پھر دوبارہ زندہ کرکے زمین سے) نکالے جاؤ گے (تو بھلا ایسا شخص کہیں قابلِ اطاعت و اتباع ہوسکتا ہے اور) بہت ہی بعید اور بہت ہی بعید ہے جو بات تم سے کہی جاتی ہے بس زندگی تو یہی ہماری دُنیوی زندگی ہے کہ ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا ہوتا ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے بس یہ ایک ایسا شخص ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے (کہ اس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور کوئی دوسرا معبود نہیں اور قیامت آئے گی) اور ہم تو ہرگز اس کو سچا نہ سمجھیں گے۔ پیغمبر نے دُعا کی کہ اے میرے ربّ میرا بدلہ لے اس وجہ سے کہ اُنہوں نے مجھ کو جھٹلایا، ارشاد ہوا کہ یہ لوگ عنقریب پشیمان ہوں گے چنانچہ ان کو ایک سخت آواز نے (یا سخت عذاب نے) موافق وعدہ برحق کے (کہ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝۴۰ [1] (المؤمنون)) آپکڑا (جس سے وہ سب ہلاک ہوگئے)

[1] ترجمہ: یہ لوگ عنقریب پشیمان ہوں گے۔

پھر (ہلاک کرنے کے بعد) ہم نے ان کو خس و خاشاک (کی طرح پامال) کردیا سو خدا کی مار کافر لوگوں پر۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بسلسلہ ہدایت ذکر کیا گیا تھا، آگے دوسرے پیغمبروں اور اُن کی اُمتوں کا کچھ حال اجمالاً بغیر نام متعین کئے ذکر کیا گیا ہے۔ آثار و علامات سے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد اُن اُمتوں سے عاد یا ثمود یا دونوں ہیں۔ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا اور ثمود کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ اس قصہ میں ان قوموں کا ہلاک ہونا ایک صَيْحَه یعنی غیبی سخت آواز کے ذریعہ بیان فرمایا ہے اور صَيْحَه کے ذریعہ ہلاک ہونا دوسری آیات میں قوم ثمود کا بیان ہوا ہے اس سے بعض حضرات نے فرمایا کہ ان آیات میں قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ سے مراد ثمود ہیں مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صَيْحَه کا لفظ اس جگہ مطلق عذاب کے معنے میں لیا گیا ہو تو پھر یہ قوم عاد کے ساتھ بھی لگ سکتا ہے۔ واللہ اعلم

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ (اس دُنیا کی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں۔ پس مرنا جینا اسی دُنیا کا ہے اور پھر دوبارہ زندہ ہونا نہیں) یہی قول عام کفار کا ہے جو قیامت کے منکر ہیں۔ یہ انکار جو زبان سے کرتے ہیں وہ تو کھلے کافر ہیں ہی، لیکن افسوس اور بہت فکر کی چیز یہ ہے کہ اب بہت سے مسلمانوں میں بھی عملی طور پر یہ انکار اُن کے ہر قول و فعل سے مترشح ہوتا ہے کہ آخرت اور قیامت کے حساب کی طرف کبھی دھیان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اس مصیبت سے نجات عطا فرمائیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا

پھر پیدا کیا ہم نے ان سے پیچھے جماعتیں اور نہ آگے جائے کوئی قوم اپنے وعدہ سے

وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ

اور نہ پیچھے رہے پھر بھیجتے رہے ہم اپنے رسول لگاتار جہاں پہنچا

اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ

کسی اُمّت کے پاس اُن کا رسول اس کو جھٹلا دیا، پھر چلاتے گئے ہم ایک کے پیچھے دوسرے اور کر ڈالا اُن کو کہانیاں

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ

سو دُور ہوجائیں جو لوگ نہیں مانتے پھر بھیجا ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی ہارون کو

بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا

اپنی نشانیاں دے کر اور کھلی سند فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس پھر لگے بڑائی کرنے

وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا

اور وہ لوگ زور پر چڑھ رہے تھے سو بولے کیا ہم مانیں گے اپنی برابر کے دو آدمیوں کو اور اُن کی قوم

لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى

ہماری تابعدار ہیں پھر جھٹلایا ان دونوں کو پھر ہوگئے غارت ہونے والوں میں اور ہم نے دی موسیٰ کو

الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَآ

کتاب تاکہ وہ راہ پائیں اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے اور اس کی ماں کو ایک نشانی اور ان کو ٹھکانا دیا

اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

ایک ٹیلہ پر جہاں ٹھہرنے کا موقع تھا اور پانی نتھرا

آسان ترجمۂ قرآن

اس کے بعد ہم نے دوسری نسلیں پیدا کیں۔ ﴿۴۲﴾ کوئی اُمت نہ اپنے معین وقت سے پہلے جاسکتی ہے، نہ اُس کے بعد ٹھہر سکتی ہے۔ ﴿۴۳﴾ پھر ہم نے پے در پے اپنے پیغمبر بھیجے۔ جب بھی کسی قوم کے پاس اُس کا پیغمبر آتا تو وہ اُسے جھٹلاتے، چنانچہ ہم نے بھی ایک کے بعد ایک (کو ہلاک کرنے) کا سلسلہ باندھ دیا، اور اُنہیں قصہ کہانیاں بنا ڈالا۔ پھٹکار ہے اُن لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے! ﴿۴۴﴾ پھر ہم نے موسیٰ اور اُن کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور واضح ثبوت کے ساتھ فرعون

اور اُس کے سرداروں کے پاس بھیجا تو اُنہوں نے گھمنڈ کا مظاہرہ کیا، اور وہ بڑے تکبر والے لوگ تھے۔ ﴿۴۵﴾ و ﴿۴۶﴾ چنانچہ کہنے لگے: ''کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں، حالانکہ اُن کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے؟'' ﴿۴۷﴾ اس طرح انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، اور آخر کار وہ بھی اُن لوگوں سے جا ملے جنہیں ہلاک کیا گیا تھا۔ ﴿۴۸﴾ اور موسیٰ کو ہم نے کتاب عطا فرمائی، تاکہ اُن کے لوگ رہنمائی حاصل کریں۔ ﴿۴۹﴾ اور مریم کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو اور اُن کی ماں کو ہم نے ایک نشانی بنایا، اور ان دونوں کو ایک ایسی بلندی پر پناہ دی جو ایک پر سکون جگہ تھی، اور جہاں صاف ستھرا پانی بہتا تھا۔ ﴿۵۰﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (عاد یا ثمود) کے (ہلاک ہونے کے) بعد ہم نے اور اُمتوں کو پیدا کیا (جو کہ تکذیبِ رسول کے سبب وہ بھی ہلاک ہوئے اور اُن کے ہلاک ہونے کی جو مدّت علمِ الٰہی میں مقرر تھی) کوئی اُمّت (ان اُمتوں میں سے) اپنی (اس) مدّتِ معینہ سے (ہلاک ہونے) میں نہ پیش دستی کر سکتی تھی اور نہ (اس مدّت سے) وہ لوگ پیچھے ہٹ سکتے تھے (بلکہ عین وقت پر ہلاک کئے گئے غرض وہ اُمتیں اوّل پیدا کی گئیں) پھر (اُن کے پاس) ہم نے اپنے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے (ہدایت کے لئے) بھیجا (جس طرح وہ اُمتیں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں مگر اُن کی حالت یہ ہوئی کہ) جب کبھی کسی اُمت کے پاس اس اُمّت کا (خاص) رسول (خدا کے احکام لے کر) آیا انہوں نے اس کو جھٹلایا سو ہم نے (بھی ہلاک کرنے میں) ایک کے بعد ایک کا تار باندھ دیا اور ہم نے اُن کی کہانیاں بنا دیں (یعنی وہ ایسے نیست و نابود ہوئے کہ بجز کہانیوں کے ان کا کچھ نام و نشان نہ رہا) سو خدا کی مار ان لوگوں پر جو (انبیاء کے سمجھانے پر بھی) ایمان نہ لاتے تھے۔ پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو اپنے احکام اور کھلی دلیل (یعنی معجزہ صریحہ کہ دلیل نبوّت ہے) دے کر فرعون اور اُس کے درباریوں کے پاس (بھی پیغمبر بنا کر) بھیجا (اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونا بھی معلوم ہے) سو اُن لوگوں نے (اُن کی تصدیق و اطاعت سے) تکبّر کیا اور وہ لوگ تھے ہی متکبر (یعنی پہلے ہی سے ان کا دماغ سڑا ہوا تھا) چنانچہ وہ (باہم) کہنے لگے کہ کیا ہم ایسے دو شخصوں پر جو ہماری طرح کے آدمی ہیں (ان میں کوئی بات امتیاز کی نہیں) ایمان لے آئیں (اور اُن کے فرمانبردار بن جائیں) حالانکہ ان کی قوم کے لوگ (تو خود) ہمارے زیرِ حکم ہیں (یعنی ہم کو تو خود ان کی قوم پر ریاست حاصل ہے پھر ان دونوں کے اقتدار اور ریاست کو ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں، اُن لوگوں نے ریاستِ دینیہ کو ریاستِ دُنیویہ پر قیاس کیا کہ ہم کو ایک قسم کی ریاست یعنی دُنیوی حاصل ہے تو دوسری قسم کے بھی ہم ہی مستحق ہیں اور جب ان کو دُنیوی ریاست نہیں ملی تو دینی کیسے مل سکتی ہے اور فساد اس قیاس کا ظاہر ہے) غرض وہ لوگ ان دونوں کی تکذیب ہی کرتے رہے پس (اس تکذیب کی وجہ سے) ہلاک کئے گئے اور (اُن کے

ہلاک ہونے کے بعد) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توراۃ) عطا فرمائی تا کہ (اُس کے ذریعہ سے) وہ لوگ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل) ہدایت پائیں اور ہم نے (اپنی قدرت وتوحید پر دلالت کے لئے اور نیز بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے) مریم کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو اور اُن کی ماں (حضرت مریم علیہا السلام) کو بڑی نشانی (اپنی قدرت کی اور اُن کے صدق کی) بنایا (کہ بے باپ تولد ہونا دونوں کے متعلق آیتِ عظیمہ ہے) اور (چونکہ اُن کو نبی بنانا منظور تھا اور ایک ظالم بادشاہ بچپن ہی میں اُن کے درپے قتل ہو گیا تھا اس لئے) ہم نے (اس سے بچا کر) ان دونوں کو ایک ایسی بلند زمین پر لے جا کر پناہ دی جو (بوجہ غلّات اور میوہ جات پیدا ہونے کے) ٹھہرنے کے قابل اور (بوجہ نہر جاری ہونے کے) شاداب جگہ تھی (یہاں تک کہ امن وامان سے جوان ہوئے اور نبوّت عطا ہوئی تو توحید و دعوئ رسالت میں اُن کی تصدیق ضروری تھی مگر بعض نے نہ کی)۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا ۖ إِنِّى بِمَا تَعْمَلُونَ

اے رسولو کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا جو تم کرتے ہو میں

عَلِيمٌ ﴿٥١﴾ وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ ﴿٥٢﴾

جانتا ہوں اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں تمہارا ربّ سو مجھ سے ڈرتے رہو

فَتَقَطَّعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٥٣﴾

پھر پھوٹ ڈال کر کرلیا اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے، ہر فرقہ جو اُن کے پاس ہے اس پر ریجھ رہے ہیں

فَذَرْهُمْ فِى غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٥٤﴾ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ مِن مَّالٍ

سو چھوڑ دے اُن کو اُن کی بیہوشی میں ڈوبے ایک وقت تک کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جو ہم اُن کو دیئے جاتے ہیں مال

وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾

اور اولاد سو دَوڑ دَوڑ کر پہنچا رہے ہیں ہم اُن کو بھلائیاں یہ بات نہیں وہ سمجھتے نہیں

آسان ترجمۂ قرآن

اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزوں میں سے (جو چاہو) کھاؤ، اور نیک عمل کرو۔ یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، مجھے اُس کا پورا پورا علم ہے۔ ﴿۵۱﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی تمہارا دِین ہے، (سب کے لئے) ایک ہی دِین! اور میں تمہارا پروردگار ہوں، اس لئے دِل میں (صرف) میرا رُعب رکھو۔ ﴿۵۲﴾ پھر ہوا یہ کہ لوگوں نے اپنے دِین میں باہم پھوٹ ڈال کر فرقے بنالئے۔ ہر گروہ نے اپنے خیال میں جو طریقہ اختیار کرلیا ہے، اُسی پر مگن ہے۔ ﴿۵۳﴾ لہٰذا (اے پیغمبر!) ان کو ایک خاص وقت تک اپنی جہالت میں ڈُوبا رہنے دو۔ ﴿۵۴﴾ کیا یہ لوگ اس خیال میں ہیں کہ ہم ان کو جو دولت اور اولاد دیئے جارہے ہیں، ﴿۵۵﴾ تو اُن کو بھلائیاں پہنچانے میں جلدی دِکھا رہے ہیں؟ نہیں، بلکہ ان کو حقیقت کا شعور نہیں ہے۔ ﴿۵۶﴾

خلاصۂ تفسیر

ہم نے جس طرح تم کو اپنی نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی اور عبادت کا حکم دیا اسی طرح سب پیغمبروں کو اور اُن کے واسطے سے اُن کی اُمّتوں کو بھی حکم دیا کہ) اے پیغمبرو! تم (اور تمہاری اُمتیں) نفیس چیزیں کھاؤ (کہ خدا کی نعمت ہیں) اور (کھا کر شکر ادا کرو کہ) نیک کام کرو (یعنی عبادات اور) میں تم سب کے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں (تو عبادات اور نیک کاموں پر اُن کی جزا اور ثمرات عطا کروں گا) اور (ہم نے اُن سے یہ بھی کہا کہ جو طریقہ تمہیں ابھی بتایا گیا ہے) یہ ہے تمہارا طریقہ (جس پر تم کو چلنا اور رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے سب انبیاء اور اُن کی اُمتوں کا، کسی شریعت میں یہ طریقہ نہیں بدلا) اور (حاصل اُس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمہارا ربّ ہوں تم مجھ سے ڈرتے رہو (یعنی میرے احکام کی مخالفت نہ کرو کیونکہ ربّ ہونے کی حیثیت سے تمہارا خالق و مالک بھی ہوں اور منعم ہونے کی حیثیت سے تم کو بیشمار نعمتیں بھی دیتا ہوں، ان سب چیزوں کا تقاضا اطاعت وفرمانبرداری ہے) سو (اس کا نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ سب ایک ہی طریقۂ مذکورہ پر رہتے مگر ایسا نہ کیا بلکہ) اُن لوگوں نے اپنے دین میں اپنا طریق الگ الگ کر کے اختلاف پیدا کرلیا ہر گروہ کے پاس جو دین (یعنی اپنا بنایا ہوا طریقہ) ہے وہ اُسی پر مگن اور خوش ہے (اُس کے باطل ہونے کے باوجود اُسی کو حق سمجھتا ہے) تو آپ اُن کو ان کی جہالت میں ایک خاص وقت تک رہنے دیجئے (یعنی اُن کی جہالت پر آپ غم نہ کیجئے جب مقرر وقت ان کی موت کا آجائے گا تو سب حقیقت کھل جائے گی اور اب جو فوری طور پر ان پر عذاب نہیں آتا تو) کیا (اس سے) یہ لوگ یوں گمان کر رہے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال و اولاد دیتے ہیں تو ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں (یہ بات ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ (اس ڈھیل دینے کی وجہ) نہیں جانتے (یعنی یہ ڈھیل تو اُن کو بطور استدراج کے دی جارہی

ہے جوانجام کاراُن کے لئے اور زیادہ عذاب کا سبب بنے گی کیونکہ ہماری مہلت اور ڈھیل دینے سے یہ اور مغرور ہوکر سرکشی اور گناہوں میں زیادتی کریں گے اور عذاب زیادہ ہوگا)۔

معارف ومسائل

یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۚ لفظ طیّبات کے لُغوی معنی ہیں پاکیزہ نفیس چیزیں۔اور چونکہ شریعتِ اسلام میں جو چیزیں حرام کردی گئی ہیں نہ وہ پاکیزہ ہیں نہ اہلِ عقل کے لئے نفیس ومرغوب۔اس لئے طیّبات سے مراد صرف حلال چیزیں ہیں جو ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے پاکیزہ ونفیس ہیں۔اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے اپنے وقت میں دو ہدایات دی گئی ہیں ایک یہ کہ کھانا حلال اور پاکیزہ کھاؤ، دوسرے یہ کہ عمل نیک صالح کرو۔اور جب انبیاء علیہم السلام کو یہ خطاب کیا گیا ہے جن کو اللہ نے معصوم بنایا ہے تو اُن کی اُمّت کے لوگوں کے لئے یہ حکم زیادہ قابلِ اہتمام ہے اور اصل مقصود بھی اُمتوں ہی کو اس حکم پر چلانا ہے۔

علماء نے فرمایا کہ ان دونوں حکموں کو ایک ساتھ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حلال غذا کا عمل صالح میں بڑا دخل ہے جب غذا حلال ہوتی ہے تو نیک اعمال کی توفیق خود بخود ہونے لگتی ہے اور غذا حرام ہو تو نیک کام کا ارادہ کرنے کے باوجود بھی اس میں مشکلات حائل ہوجاتی ہیں۔حدیث میں ہے کہ بعض لوگ لمبے لمبے سفر کرتے ہیں اور غبار آلود رہتے ہیں پھر اللہ کے سامنے دُعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یا رَبّ یا رَبّ پکارتے ہیں مگر اُن کا کھانا بھی حرام ہوتا ہے پینا بھی، لباس بھی حرام سے تیار ہوتا ہے اور حرام ہی کی اُن کو غذا ملتی ہے ایسے لوگوں کی دُعا کہاں قبول ہوسکتی ہے۔(قرطبی) [1]

اِس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور دُعا کے قبول ہونے میں حلال کھانے کو بڑا دخل ہے جب غذا حلال نہ ہو تو عبادت اور دُعا کی مقبولیت کا بھی استحقاق نہیں رہتا۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً، لفظ اُمّت، ایک جماعت اور کسی خاص پیغمبر کی قوم کے معنی میں معروف ومشہور ہے اور کبھی یہ لفظ طریقہ اور دین کے معنیٰ میں بھی آتا ہے جیسے قرآن کی ایک آیت وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ [2] (الزخرف:۲۳) اس میں اُمت سے مراد ایک دین اور طریقہ ہے، یہی معنے اس جگہ بھی مراد ہیں۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ۭ زُبُر، زبور کی جمع ہے جو کتاب کے معنے میں آتا ہے اس معنے کے اعتبار سے مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو سب انبیاء اور اُن کی اُمتوں کو اُصول اور عقائد کے مسائل میں ایک ہی دین اور طریقہ پر

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۲ ص:۱۲۷، وصحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب بیان ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف ج:۱ ص:۳۲۶

[2] ترجمہ: ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے۔

چلنے کی ہدایت فرمائی تھی مگر اُمتوں نے اس کو نہ مانا اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے مختلف ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا طریقہ الگ اور اپنی کتاب الگ بنالی۔ اور زُبُر کبھی زُبرہ کی جمع بھی آتی ہے جس کے معنے قطعہ اور فرقہ کے ہیں۔ یہی معنے اس جگہ زیادہ واضح ہیں اور مراد آیت کی یہ ہے کہ یہ لوگ عقائد اور اُصول میں بھی مختلف فرقے بن گئے لیکن فروعی اختلاف ائمہ مجتہدین کا اس میں داخل نہیں، کیونکہ ان اختلافات سے دین وملّت الگ نہیں ہو جاتا اور ایسا اختلاف رکھنے والے الگ الگ فرقے نہیں کہلاتے۔ اور اس اجتہادی اور فروعی اختلاف کو فرقہ واریت کا رنگ دینا خالص جہالت ہے جو کسی مجتہد کے نزدیک جائز نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِ رَبِّهِمْ

البتہ جو لوگ اپنے ربّ کے خوف سے اندیشہ رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے ربّ کی باتوں پر

يُؤْمِنُونَ ﴿٥٨﴾ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴿٥٩﴾ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ

یقین کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانتے اور جو لوگ کہ دیتے ہیں

مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ﴿٦٠﴾ أُولَٰئِكَ

جو کچھ دیتے ہیں اور اُن کے دل ڈر رہے ہیں اس لئے کہ اُن کو اپنے ربّ کی طرف لوٹ کر جانا ہے وہ لوگ

يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ﴿٦١﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا

دوڑ دوڑ کر لیتے ہیں بھلائیاں اور وہ ان پر پہنچے سب سے آگے اور ہم کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے مگر

وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٢﴾

اس کی گنجائش کے موافق اور ہمارے پاس لکھا ہوا ہے جو بولتا ہے سچ اور ان پر ظلم نہ ہوگا

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے پروردگار کے رُعب سے ڈرے رہتے ہیں، ﴿٥٧﴾ اور جو اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، ﴿٥٨﴾ اور جو اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانتے، ﴿٥٩﴾ اور وہ جو عمل بھی کرتے ہیں، اُسے کرتے

وقت ان کے دِل اس بات سے سہمے ہوتے ہیں کہ اُنہیں اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے، ﴿۶۰﴾ وہ ہیں جو بھلائیاں حاصل کرنے میں جلدی دِکھا رہے ہیں، اور وہ ہیں جو اُن کی طرف تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ﴿۶۱﴾ اور ہم کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ کسی کام کی ذمہ داری نہیں دیتے، اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو (سب کا حال) ٹھیک ٹھیک بول دے گی، اور اُن پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ ﴿۶۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اپنے ربّ کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو لوگ اپنے ربّ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے ربّ کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (باوجود اللہ کی راہ میں دینے اور خرچ کرنے کے) ان کے دل اس سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ وہ اپنے ربّ کے پاس جانے والے ہیں (دیکھئے وہاں جا کر ان صدقات کا کیا ثمرہ ظاہر ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دینا حکم کے موافق نہ ہو مثلاً مال حلال نہ ہو یا نیت اللہ کے لئے خالص نہ ہو اور نیت میں اخلاص کامل نہ ہونا یا مال کا حرام ہونا ہمیں معلوم نہ ہو تو اُلٹا اس پر مواخذہ ہونے لگے تو جن لوگوں میں یہ صفات ہوں) یہ لوگ اپنے فائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور وہ اُن کی طرف دوڑ رہے ہیں اور (یہ اعمال مذکورہ کچھ سخت بھی نہیں جن کا کرنا مشکل ہو کیونکہ) ہم کسی کو اُس کی وسعت سے زیادہ کام کرنے کو نہیں کہتے (اس لئے یہ سب کام آسان ہیں اور اس کے ساتھ اُن کا اچھا انجام اور ثمرہ یقینی ہے کیونکہ) ہمارے پاس ایک دفتر (نامۂ اعمال کا محفوظ) ہے جو ٹھیک ٹھیک (سب کا حال) بتلا دے گا اور لوگوں پر ذرا ظلم نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ، لفظ یؤتون، ایتاء سے مشتق ہے جس کے معنے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں اس لئے اس کی تفسیر صدقات کے ساتھ کی گئی ہے اور حضرت صدیقہ عائشہؓ سے ایک قراءت اس کی يَأْتُوْنَ مَآ اَتَوْا بھی منقول ہے یعنی عمل کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اس میں صدقات نماز روزہ اور تمام نیک کام شامل ہو جاتے ہیں اور مشہور قراءت پر اگرچہ ذکر یہاں صدقات ہی کا ہوگا مگر مراد بہر حال عام اعمالِ صالحہ ہیں جیسا کہ ایک حدیث سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کام کر کے ڈرنے والے لوگ وہ ہیں جو شراب پیتے یا چوری کرتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے صدیق کی بیٹی یہ بات نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقات دیتے ہیں اس

کے باوجود اس سے ڈرتے رہتے ہیں کہ شاید ہمارے یہ عمل اللہ کے نزدیک (ہماری کسی کوتاہی کے سبب) قبول نہ ہوں ایسے ہی لوگ نیک کاموں میں مسارعت اور مسابقت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ۔ مظہری)[1] اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیک عمل کر کے اتنے ڈرتے تھے کہ تم بُرے عمل کر کے بھی اتنا نہیں ڈرتے۔ (قرطبی)[2]

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ مسارعت فی الخیرات سے مراد یہ ہے کہ جیسے عام لوگ دُنیا کے منافع کے پیچھے دَوڑتے ہیں اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتے ہیں یہ حضرات دین کے فوائد میں ایسا ہی عمل کرتے ہیں اِسی لئے وہ دین کے کاموں میں دوسروں سے آگے رہتے ہیں۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ

کوئی نہیں اُن کے دل بیہوش ہیں اس طرف سے اور اُن کو اور کام لگ رہے ہیں اس کے سوائے کہ

هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ

وہ اُن کو کر رہے ہیں یہاں تک کہ جب پکڑیں گے ہم اُن کے آسودہ لوگوں کو آفت میں تبھی وہ

يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ؕ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ۟ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

لگیں گے چلّانے مت چلّاؤ آج کے دن تم ہم سے چھوٹ نہ سکوگے

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ۙ

تم کو سُنائی جاتی تھیں میری آیتیں تو تم ایڑیوں پر اُلٹے بھاگتے تھے

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖۗ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ

اس سے تکبّر کر کے ایک قصّہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے سو کیا انہوں نے دھیان نہیں کیا اس کلام میں یا آئی ہے اُن کے پاس

---

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورۃ المؤمنون ج:۲ ص:۱۵۱، ومسند احمد، حدیث السیدۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث:۲۶۴۵۳

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱۳۲

مَا لَمْ يَأْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ

ایسی چیز جو نہ آئی تھی اُن کے پہلے باپ دادوں کے پاس یا پہچانا نہیں اُنہوں نے اپنے پیغام لانے والے کو

فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ

سو وہ اس کو اُوپرا سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں اس کو سودا ہے، کوئی نہیں وہ تو لایا ہے اُن کے پاس سچّی بات

وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ

اور ان میں بہتوں کو سچی بات بُری لگتی ہے اور اگر سچا رَبّ چلے اُن کی خوشی پر تو خراب ہوجائیں

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ

آسمان اور زمین اور جو کوئی اُن میں ہے کوئی نہیں ہم نے پہنچائی ہے اُن کو اُن کی نصیحت سو وہ

عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ

اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے یا تو اُن سے مانگتا ہے کچھ محصول سو محصول تیرے رَبّ کا بہتر ہے

وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ الربع

اور وہ ہے بہتر روزی دینے والا اور تُو تو بُلاتا ہے اُن کو سیدھی راہ پر

وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو راہ سے ٹیڑے ہوگئے ہیں

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور اگر ہم اُن پر رحم کریں اور کھول دیں جو تکلیف پہنچی اُن کو تو بھی برابر لگے رہیں گے اپنی شرارت میں بہکے ہوئے

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾

اور ہم نے پکڑا تھا اُن کو آفت میں پھر نہ عاجزی کی اپنے رَبّ کے آگے اور نہ گڑگڑائے

حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾ ع

یہاں تک کہ جب کھول دیں ہم اُن پر دروازہ ایک سخت آفت کا تب اُس میں اُن کی آس ٹوٹے گی

آسان ترجمۂ قرآن

لیکن ان کے دِل اس بات سے غفلت میں ڈُوبے ہوئے ہیں، اوراس کے علاوہ اُن کی اور بھی کارستانیاں ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں ﴿۶۳﴾ یہاں تک کہ جب ہم اُن کے دولت مند لوگوں کو عذاب میں پکڑلیں گے تو وہ ایک دم بلبلا اُٹھیں گے۔ ﴿۶۴﴾ آج بلبلاؤ نہیں، ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ﴿۶۵﴾ میری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں، تو تم اُلٹے پاؤں مڑ جاتے تھے، ﴿۶۶﴾ بڑے غرور سے اس (قرآن) کے بارے میں رات کو مجلسیں جما کر بے ہودہ باتیں کرتے تھے۔ ﴿۶۷﴾ بھلا کیا ان لوگوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا، یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آگئی ہے جو ان کے پچھلے باپ دادوں کے پاس نہیں آئی تھی؟ ﴿۶۸﴾ یا یہ اپنے پیغمبر کو (پہلے سے) جانتے ہی نہیں تھے، اس وجہ سے ان کا انکار کر رہے ہیں؟ ﴿۶۹﴾ یا ان کا کہنا ہے کہ ان (پیغمبر) کو جنون لاحق ہوگیا ہے؟ نہیں، بلکہ (اصل وجہ یہ ہے کہ) یہ پیغمبر ان کے پاس حق لے کر آئے ہیں، اور ان میں سے اکثر لوگ حق کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿۷۰﴾ اور اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا تو آسمان اور زمین اور اُن میں بسنے والے سب برباد ہو جاتے۔ نہیں، بلکہ ہم ان کے پاس خود ان کے لئے نصیحت کا سامان لے کر آئے ہیں، اور وہ ہیں کہ خود اپنی نصیحت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ﴿۷۱﴾ یا (ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ) تم ان سے کوئی معاوضہ مانگ رہے ہو؟ تو (یہ بات بھی غلط ہے، اس لئے کہ) تمہارے پروردگار کا دیا ہوا معاوضہ (تمہارے لئے) کہیں بہتر ہے، اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ﴿۷۲﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ تم تو اُنہیں سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہو، ﴿۷۳﴾ اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ راستے سے بالکل ہٹے ہوئے ہیں۔ ﴿۷۴﴾ اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور اُس تکلیف کو دُور کردیں جس میں یہ مبتلا ہیں تب بھی یہ بھٹکتے ہوئے اپنی سرکشی پر اَڑے رہیں گے۔ ﴿۷۵﴾ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ان کو (ایک مرتبہ) عذاب میں پکڑا تھا، تو اُس وقت بھی یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے نہیں جھکے۔ اور یہ تو عاجزی کی رَوِش اختیار

کرتے ہی نہیں ہیں۔ (۷۶) یہاں تک کہ جب ہم ان پر سخت عذاب والا دروازہ کھول دیں گے، تو یہ ایک دم اس میں مایوس ہو کر رہ جائیں گے۔ (۷۷)

خلاصۂ تفسیر

(یہ تو اوپر مؤمنین کی حالت سُنی مگر کفار ایسے نہیں ہیں) بلکہ (برعکس) ان کفار کے قلوب اس دین کی طرف سے (جس کا ذکر بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ میں ہے) جہالت (اور شک) میں (ڈوبے ہوئے) ہیں (جن کا حال اُوپر بھی معلوم ہو چکا فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ) اور اس (جہالت وانکار) کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی (بُرے بُرے خبیث) عمل ہیں جن کو (یہ مسلسل) کرتے رہتے ہیں (یہ لوگ شرک اور اعمال سیئہ کے برابر خوگر رہیں گے) یہاں تک کہ جب ہم اُن کے خوشحال لوگوں کو (جن کے پاس مال و دولت اور نوکر چاکر سب کچھ ہے) عذاب (بعد الموت) میں دھر پکڑیں گے (اور غریب غرباء تو کس گنتی میں ہیں اور وہ تو عذاب سے کیا بچاؤ کر سکتے ہیں، غرض یہ کہ جب ان سب پر عذاب نازل ہوگا) تو فوراً چلّا اُٹھیں گے (اور سارا انکار و استکبار جس کے اب عادی ہیں کافور ہو جائے گا اس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ) اب مت چلّاؤ (کہ کوئی فائدہ نہیں کیونکہ) ہماری طرف سے تمہاری مطلق مدد نہ ہوگی (کیونکہ یہ دار الجزاء ہے دار العمل نہیں ہے جس میں چلّانا اور عاجزی کرنا مفید ہو جو دار العمل تھا اس میں تو تمہارا یہ حال تھا کہ) میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر (رسول کی زبان سے) سُنائی جایا کرتی تھیں تو تم اُلٹے پاؤں بھاگتے تھے تکبّر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے (اس قرآن کی شان) میں بیہودہ بکتے ہوئے (کہ کوئی اس کو سحر کہتا تھا کوئی شعر کہتا تھا اور مشغلہ کا یہی مطلب ہے پس تم نے دار العمل میں جیسا کیا آج دار الجزاء میں ویسا بھگتو۔ اور یہ لوگ جو قرآن کی اور صاحب قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کا کیا سبب ہے) کیا ان لوگوں نے اس کلامِ (الٰہی) میں غور نہیں کیا (جس سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جاتا اور یہ ایمان لے آتے) یا (تکذیب کی یہ وجہ ہے کہ) ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو اِن کے پہلے بڑوں کے پاس نہیں آئی تھی (مراد اس سے احکامِ الٰہیہ کا آنا ہے جو کوئی نئی بات نہیں، ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اُن کی اُمتوں کو یہی احکام دیئے جاتے رہے ہیں کقولہ تعالیٰ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ [1] (الاحقاف:۹) پس تکذیب کی یہ وجہ بھی باطل ٹھہری اور یہ دو وجہ تو قرآن کے متعلق ہیں۔ آگے صاحبِ قرآن کے متعلق فرماتے ہیں یعنی) یا (وجہ تکذیب کی یہ ہے کہ) یہ لوگ اپنے رسول (کی صفتِ دیانت و صدق و امانت) سے واقف نہ تھے اس وجہ سے اُن کے منکر ہیں، (یعنی یہ وجہ بھی باطل ہے کیونکہ آپ کے صدق

[1] ترجمہ: میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں۔

ودیانت پر سب کا اتفاق تھا) یا (یہ وجہ ہے کہ) یہ لوگ (نعوذ باللہ) آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں (سو آپ کا اعلیٰ درجہ کا صاحب عقل اور صاحب الرائے ہونا بھی ظاہر ہے۔ سو واقع میں ان میں سے کوئی وجہ بھی معقول نہیں) بلکہ (اصلی وجہ یہ ہے کہ) یہ رسول ان کے پاس حق بات لے کر آئے ہیں اور ان میں اکثر لوگ حق بات سے نفرت رکھتے ہیں۔ (پس یہ تمام تر وجہ ہے تکذیب کی اور عدم اتباعِ حق کی اور یہ لوگ اس دینِ حق کا اتباع تو کیا کرتے یہ تو اور اُلٹا یہ چاہتے ہیں کہ وہ دینِ حق ہی ان کے خیالات کے تابع کر دیا جائے اور جو مضامین قرآن میں ان کے خلاف ہیں اُن کو خارج یا ترمیم کر دیا جائے کقوله تعالیٰ فی سورۃ یونس قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ[1] (یونس: ۱۵)) اور (بفرضِ محال) اگر (ایسا امر واقع ہو جاتا) اور دینِ حق اُن کے خیالات کے تابع (اور موافق) ہو جاتا تو (تمام عالم میں کفر و شرک پھیل جاتا اور اس کا اثر یہ ہوتا کہ حق تعالیٰ کا غضب تمام عالم پر متوجہ ہو جاتا اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ) تمام آسمان اور زمین اور جو ان میں (آباد) ہیں سب تباہ ہو جاتے (جیسا قیامت میں تمام انسانوں میں گمراہی عام ہو جانے کے سبب اللہ تعالیٰ کا غضب بھی سب پر عام ہوگا اور غضبِ الٰہی عام ہونے سے سب کی ہلاکت بھی عام ہوگی اور اوّل تو کسی امر کا حق ہونا مقتضی ہے اُس کے وجوبِ قبول کو گو نافع بھی نہ ہو۔ اور اُس کا قبول نہ کرنا خود عیب ہے مگر ان لوگوں میں صرف یہی ایک عیب نہیں کہ حق سے کراہت ہو) بلکہ (اس سے بڑھ کر دوسرا عیب اور بھی ہے کہ حق کا اتباع جو انہیں کے نفع کا سامان ہے اُس سے دُور بھاگتے ہیں بس) ہم نے اُن کے پاس اُن کی نصیحت (اور نفع) کی بات بھیجی سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں یا (علاوہ وجوہِ مذکورہ کے ان کی تکذیب کی یہ وجہ ہے کہ ان کو یہ شبہ ہوا ہو کہ) آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو (یہ بھی غلط ہے کیونکہ جب آپ جانتے ہیں کہ) آمدنی تو آپ کے رَبّ کی سب سے بہتر ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے (تو آپ لوگوں سے کیوں مانگتے ہیں) اور (خلاصہ ان کی حالت کا یہ ہے کہ) آپ تو ان کو سیدھے رستہ کی طرف (جس کو اُوپر حق کہا ہے) بُلا رہے ہیں اور ان لوگوں کی جو کہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یہ حالت ہے کہ اس (سیدھے) رستہ سے ہٹے جاتے ہیں (مطلب یہ کہ حق ہونا اور مستقیم ہونا اور نافع ہونا یہ سب مقتضیات ایمان کے جمع ہیں اور جو وجوہات مانع ہو سکتی تھیں وہ کوئی موجود نہیں، پھر ایمان نہ لانا اشد درجہ کی جہالت اور ضلالت ہے) اور (ان کی قساوت وعناد کی یہ حالت ہے کہ جس طرح یہ لوگ آیاتِ شرعیہ سے متأثر نہیں ہوتے اِسی طرح آیاتِ قہریہ مصائب و بلیات سے بھی متأثر نہیں ہوتے گو مصیبت کے وقت طبعی طور پر ہم کو پکارتے بھی ہیں لیکن وہ دفع الوقتی ہوتی ہے چنانچہ) اگر ہم ان پر مہربانی فرمائیں اور ان پر جو تکلیف ہے اُس کو ہم دُور بھی کر دیں تو وہ لوگ (پھر) اپنی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے اصرار کرتے رہیں

[1] ترجمہ: یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے۔

(اور وہ قول وقرار جو مصیبت میں کئے تھے سب ختم ہو جائیں کقولہ تعالیٰ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا الخ [۱] (یونس:۱۲) وقولہ تعالیٰ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ الخ [۲] (العنکبوت:۶۵) اور (شاہد اس کا یہ ہے کہ بعض اوقات) ہم نے ان کو گرفتارِ عذاب بھی کیا ہے سو ان لوگوں نے نہ اپنے رَبّ کے سامنے (پورے طور پر) فروتنی کی اور نہ عاجزی اختیار کی (پس جب عین مصیبت میں اور مصیبت بھی ایسی سخت جس کو عذاب کہا جا سکے جیسے قحط جو مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دُعا سے ہوا تھا اُنہوں نے عاجزی اختیار نہیں کی تو بعد زوال مصیبت کے تو بدرجۂ اولیٰ اُن سے اس کی توقع نہیں مگر ان کی یہ ساری بے پروائی و بیباکی ان مصائب تک ہے جن کے عادی ہو چکے ہیں) یہاں تک کہ ہم جب ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے (جو کہ فوق العادۃ ہو خواہ دُنیا ہی میں ہو کہ کوئی غیبی قہر آ پڑے یا بعد الموت کہ ضرور ہی واقع ہوگا) تو اس وقت بالکل حیرت زدہ رہ جائیں گے (کہ یہ کیا ہو گیا اور سب نشہ ہرن ہو جائے گا)۔

معارف و مسائل

غمرۃ، ایسے گہرے پانی کو کہتے ہیں جس میں آدمی ڈوب جائے اور جو اس میں داخل ہونے والے کو اپنے اندر چھپا لے اِسی لئے لفظ غمرہ پردہ اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں اُن کی مشرکانہ جہالت کو غمرہ کہا گیا ہے جس میں اُن کے دل ڈوبے ہوئے اور چھپے ہوئے ہیں کہ کسی طرف سے اُن کو روشنی کی کرن نہیں پہنچتی۔

وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ، یعنی اُن کی گمراہی کے لئے تو ایک شرک و کفر ہی کا پردۂ غفلت کافی تھا مگر اسی پر بس نہیں کرتے اس کے ساتھ دوسرے اعمالِ خبیثہ بھی مسلسل کرتے ہی رہتے ہیں۔

مُتْرَفِيْهِمْ، مُتْرَفٌ، تَرَفٌ سے مشتق ہے جس کے معنے تنعّم اور خوشحالی کے ہیں۔ اس جگہ اس قوم کو عذاب میں پکڑنے کا ذکر ہے جس میں امیر غریب خوشحال بدحال سبھی داخل ہوں گے مگر مترفین اور خوشحالوں کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ ایسے ہی لوگ دُنیا کے مصائب سے اپنے بچاؤ کا کچھ سامان کر لیا کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا عذاب جب آتا ہے تو سب سے پہلے یہی لوگ بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس آیت میں جس عذاب کے اندر اُن کے پکڑے جانے کا ذکر ہے حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تلوار سے ان کے سرداروں پر پڑا تھا۔ اور بعض حضرات نے اس عذاب سے مراد قحط کا عذاب لیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دُعا سے مکہ والوں پر مسلّط کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ وہ مردار جانور اور کتے اور ہڈیاں کھانے پر مجبور ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار

---

[۱] ترجمہ: اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے۔

[۲] ترجمہ: جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔

کے لئے بددُعا بہت کم کی ہے لیکن اس موقع میں مسلمانوں پر اُن کے مظالم کی شدّت سے مجبور ہو کر یہ بددُعا کی تھی۔ [1] اَللّٰھُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَکَ عَلٰی مُضَرَ وَاجْعَلْهَا عَلَیْهِمْ سِنِیْنَ کَسِنِیْ یُوْسُفَ۔ (رواہ البخاری ومسلم) [2] (قرطبی ومظہری) [3]

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ اس میں لفظ بِهٖ کی ضمیر اکثر مفسرین نے حرم کی طرف راجع قرار دی جو اگرچہ اوپر کہیں مذکور نہیں مگر حرم سے قریش مکہ کا گہرا تعلق اور اس پر اُن کا ناز اتنا معروف ومشہور تھا کہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور معنے اس کے یہ ہیں کہ قریش مکہ کا اللہ کی آیتیں سُن کر پچھلے پاؤں بھاگنے اور نہ ماننے کا سبب حرمِ مکّہ کی نسبت اور اُس کی خدمت پر ان کا تکبر اور ناز تھا۔ اور سامِرًا، سمر سے مشتق ہے جس کے اصل معنے چاندنی رات کے ہیں۔ عرب کی عادت تھی کہ چاندنی رات میں بیٹھ کر قصے کہانیاں کہا کرتے تھے اس لئے لفظ سمر قصہ کہانی کے معنے میں استعمال ہونے لگا اور سامر قصہ گو کو کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اگرچہ مفرد ہے مگر معنی میں جمع کے لئے بھی بولا جاتا ہے اِس جگہ سامر بمعنی سامرین جمع کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مشرکین کا ایک حال جو آیاتِ الٰہیہ سے انکار کا سبب بنا ہوا تھا حرمِ مکہ کی نسبت وخدمت پر ان کا ناز تھا۔ دوسرا حال یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ بے اصل اور بے بنیاد قصے کہانیوں میں مشغول رہنے کے عادی ہیں ان کو اللہ کی آیات سے دلچسپی نہیں۔

تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ یہ لفظ ھُجر بضم الہاء سے مشتق ہے جس کے معنے فضول بکواس اور گالی گلوچ کے ہیں یہ تیسرا حال ان مشرکین کا بیان کیا گیا کہ یہ لوگ فضول بکواس اور گالی گلوچ کے عادی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بعض ایسے ہی گستاخانہ کلمات کہتے رہتے ہیں۔

عشاء کے بعد قصّہ گوئی کی ممانعت اور خاص ہدایات

رات کو افسانہ گوئی کا مشغلہ عرب وعجم میں قدیم سے چلا آتا ہے اور اس میں بہت سے مفاسد اور وقت کی اضاعت تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو مٹانے کے لئے عشاء سے پہلے سونے کو اور عشاء کے بعد فضول قصہ گوئی کو منع فرمایا۔ [4] حکمت یہ تھی کہ عشاء کی نماز پر انسان کے اعمالِ یومیہ ختم ہو رہے ہیں جو دن بھر کے گناہوں کا بھی کفارہ ہو سکتا ہے۔ یہی اُس کا آخری عمل اس دن کا ہو تو بہتر ہے اگر بعد عشاء فضول قصہ گوئی میں لگ گیا تو اوّلاً یہ خود فعلِ عبث اور مکروہ ہے اس کے علاوہ اس کے ضمن میں غیبت جھوٹ اور دوسرے طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے اور ایک بُرا

---

[1] ترجمہ: اے اللہ! قومِ مضر پر اپنا سخت عذاب نازل فرما، اور اس عذاب کو ان پر قحط کی صورت میں مسلّط فرما، ایسا قحط جو حضرت یوسف علیہ السلام کے قحط کی مانند ہو۔

[2] صحیح البخاری، کتاب الإستسقاء، باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلخ ج:۱ ص:۱۳۶، وصحیح مسلم، کتاب المساجد إلخ، باب استحباب القنوت إلخ ج:۱ ص:۲۳۷

[3] تفسیر القرطبی، تحت هذه الآیة ج:۱۲ ص:۱۳۵، والمظهری ج:۶ ص:۳۹۰

[4] صحیح البخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب ما یکره من النوم قبل العشاء ج:۱ ص:۸۰

انجام اس کا یہ ہے کہ رات کو دیر تک جاگے گا تو صبح کو سویرے نہیں اُٹھ سکے گا اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ جب کسی کو عشاء کے بعد فضول قصوں میں مشغول دیکھتے تو تنبیہ فرماتے تھے اور بعض کو سزا بھی دیتے تھے اور فرماتے کہ جلد سو جاؤ شاید آخر رات میں تہجد کی توفیق ہو جائے۔ (مظہری) [1]

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ سے اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ تک ایسی پانچ چیزوں کا ذکر ہے جو مشرکین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے کسی درجہ میں مانع ہو سکتی تھی اور اُن میں سے ہر ایک وجہ کے منفی ہونے کا بیان اس کے ساتھ کر دیا ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جو وجوہ ان لوگوں کے لئے ایمان سے مانع ہو سکتی تھیں اُن میں سے کوئی بھی وجہ موجود نہیں اور ایمان لانے کے لئے جو اسباب و وجوہ داعی ہیں وہ سب موجود ہیں اس لئے اب ان کا انکار خالص عناد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں جس کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں اس طرح فرمایا ہے بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ یعنی انکارِ رسالت کی کوئی عقلی یا طبعی وجہ تو موجود نہیں پھر انکار کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق بات لے کر آئے ہیں اور یہ لوگ حق بات ہی کو بُرا سمجھتے ہیں سننا نہیں چاہتے جس کا سبب ہواء و ہوس کا غلبہ اور جاہلوں کو جو ریاست و اقتدار حاصل ہے اس کی محبت اور جاہلوں کی تقلید ہے۔ یہ پانچ وجوہ جن کا ذکر ایمان اور اقرار بالنبوّت سے مانع ہونے کی حیثیت میں کیا گیا ہے اُن میں ایک یہ بھی بیان فرمائی ہے۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ، یعنی اُن کے انکار کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ جو شخص دعوتِ حق اور دعوائے نبوّت لے کر آیا ہے یہ کہیں باہر سے آیا ہوتا تاکہ یہ لوگ اس کے نام ونسب اور عادات وخصال اور کردار سے واقف نہ ہوتے تو یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم اس مدعی کے حالات سے واقف نہیں اس کو کیسے نبی و رسول مان کر اپنا مقتدا بنالیں۔ مگر یہاں تو یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش ہی کے اعلیٰ نسب میں اسی شہر مکہ میں پیدا ہوئے اور بچپن سے لے کر جوانی اور مابعد کا سارا زمانہ اُنہیں لوگوں کے سامنے گزرا۔ آپ کا کوئی عمل کوئی عادت ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی اور دعوائے نبوّت سے پہلے تک سارے کفار مکہ آپ کو صادق وامین کہا کرتے تھے آپ کے کردار وعمل پر کسی نے بھی کبھی کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا تھا تو اب ان کا یہ عذر بھی نہیں چل سکتا کہ وہ ان کو پہچانتے نہیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ اس سے پہلی آیت میں مشرکین کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جو عذاب میں مبتلا ہونے کے وقت اللہ سے یا رسول سے فریاد کرتے ہیں اگر ہم ان کی فریاد پر رحم کھا کر عذاب ہٹا دیں تو اُن کی جبلّی شرارت وسرکشی کا عالم یہ ہے کہ عذاب سے نجات پانے کے بعد پھر اپنی سرکشی اور نافرمانی میں مشغول ہو جائیں گے اس آیت میں اُن کے ایک اسی طرح کے واقعہ کا بیان ہے کہ ان کو ایک عذاب میں

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱۳۸

پکڑا گیا مگر عذاب سے بدعاء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نجات پانے کے بعد بھی یہ اللہ کے سامنے نہیں جھکے اور برابر اپنے کفر و شرک پر جمے رہے۔

اہلِ مکہ پر قحط کا عذاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے اس کا دفع ہونا

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ پر قحط کا عذاب مسلّط ہونے کی دُعا کی تھی، اس کی وجہ سے یہ سخت قحط میں مبتلا ہوئے اور مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ دیکھ کر ابوسفیانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں اور صلہ رحمی کی، کیا آپ نے یہ نہیں کہا کہ میں اہلِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں؟ آپ نے فرمایا: بیشک کہا ہے اور واقعہ بھی یوں ہی ہے! ابوسفیانؓ نے کہا کہ آپ نے اپنی قوم کے بڑوں کو تو بدر کے معرکہ میں تلوار سے قتل کر دیا اور جو اب رہ گئے ہیں اُن کو بھوک سے قتل کر رہے ہیں، اللہ سے دُعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے ہٹ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی، یہ عذاب اُسی وقت ختم ہو گیا، اسی پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی [1] وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ۔

اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ عذاب میں مبتلا ہونے پھر اس سے نجات پانے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے رَبّ کے سامنے نہیں جھکے، چنانچہ واقعہ یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے قحط رفع بھی ہو گیا مگر مشرکینِ مکہ اپنے شرک و کفر پر اُسی طرح جمے رہے۔ (مظہری وغیرہ) [2]

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸

اور اسی نے بنا دیئے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا حق مانتے ہو

وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۷۹ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ

اور اسی نے تم کو پھیلا رکھا ہے زمین میں اور اسی کی طرف جمع ہو کر جاؤ گے اور وہی ہے جلاتا

وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۸۰ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ

اور مارتا اور اُسی کا کام ہے بدلنا رات اور دن کا سو کیا تم کو سمجھ نہیں کوئی بات نہیں یہ تو وہی کہہ رہے جیسا

---

[1] دلائل النبوة للبیہقیؒ رقم الحدیث: ۶۱۴، ۱۴۲۱ [2] تفسیر المظہری ج: ۶ ص: ۳۹۵، ۳۹۶

مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا

کہا کرتے تھے پہلے لوگ کہتے ہیں کیا جب ہم مرگئے اور ہوگئے مٹی اور ہڈیاں

ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ

کیا ہم کو زندہ ہوکر اُٹھنا ہے وعدہ دیا جاتا ہے، ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو یہی پہلے سے

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ

اور کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں پہلوں کی تو کہہ کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے بتاؤ

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اگر تم جانتے ہو اب کہیں گے سب کچھ اللہ کا ہے، تو کہہ پھر تم سوچتے نہیں

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ

تو کہہ کون ہے مالک ساتوں آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا اب بتائیں گے

لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ

اللہ کو تو کہہ پھر تم ڈرتے نہیں تو کہہ کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچالیتا ہے

وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ

اور اس سے کوئی بچا نہیں سکتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو اب بتائیں گے اللہ کو تو کہہ

فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾

پھر کہاں سے تم پر جادو آپڑتا ہے کوئی نہیں ہم نے اُن کو پہنچایا سچ اور وہ البتہ جھوٹے ہیں

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ

اللہ نے کوئی بیٹا نہیں کیا اور نہ اس کے ساتھ کسی کا حکم چلے یوں ہوتا تو لے جاتا ہر حکم والا

بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿۹۱﴾

اپنی بنائی چیز کو اور چڑھائی کرتا ایک پر ایک اللہ نرالا ہے اُن کی بتلائی باتوں سے

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع

جاننے والا چھپے اور کھلے کا وہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو یہ شریک بتلاتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دِل پیدا کئے۔ (مگر) تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ﴿۷۸﴾ اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا، اور اُسی کی طرف تمہیں اِکٹھا کر کے لے جایا جائے گا۔ ﴿۷۹﴾ اور وہی ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے، اور اُسی کے قبضے میں رات اور دن کی تبدیلیاں ہیں۔ کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ ﴿۸۰﴾ اس کے بجائے یہ لوگ بھی ویسی ہی باتیں کرتے ہیں جیسی پچھلے لوگوں نے کی تھیں۔ ﴿۸۱﴾ کہتے ہیں کہ: ''کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہوجائیں گے، تو کیا واقعی ہمیں دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا؟ ﴿۸۲﴾ یہ وہ یقین دہانی ہے جو ہم سے بھی کی گئی ہے، اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادوں سے بھی کی گئی تھی۔ اس کی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں کہ یہ پچھلے لوگوں کے بنائے ہوئے افسانے ہیں۔'' ﴿۸۳﴾ (اے پیغمبر! ذرا ان سے) کہو کہ: ''یہ ساری زمین اور اُس میں بسنے والے کس کی ملکیت ہیں؟ بتاؤ اگر جانتے ہو۔'' ﴿۸۴﴾ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ: ''یہ سب کچھ اللہ کا ہے۔'' کہو کہ: ''کیا پھر بھی تم سبق نہیں لیتے؟'' ﴿۸۵﴾ کہو کہ: ''ساتوں آسمانوں کا مالک اور عالیشان عرش کا مالک کون ہے؟'' ﴿۸۶﴾ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ: ''یہ سب کچھ اللہ کا ہے۔'' کہو کہ: ''کیا پھر بھی تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟'' ﴿۸۷﴾ کہو کہ: ''کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اختیار ہے، اور جو پناہ دیتا ہے، اور اُس کے مقابلے میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر جانتے ہو۔'' ﴿۸۸﴾ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ: ''سارا اختیار اللہ کا ہے۔'' کہو کہ: ''پھر کہاں سے تم پر کوئی جادو چل جاتا ہے؟'' ﴿۸۹﴾ نہیں، (یہ افسانے نہیں) بلکہ ہم نے اُنہیں حق بات پہنچائی ہے، اور یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔ ﴿۹۰﴾ نہ تو اللہ نے کوئی بیٹا بنایا

ہے، اور نہ اُس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا، اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتے۔ پاک ہے اللہ اُن باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں، (۹۱) وہ اللہ جسے تمام چھپی اور کھلی باتوں کا مکمل علم ہے۔ لہٰذا وہ ان کے شرک سے بہت بلند و بالا ہے۔ (۹۲)

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (اللہ) ایسا (قادر اور منعم) ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (کہ آرام بھی برتو اور دین کا بھی ادراک کرو لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (کیونکہ اصلی شکر یہ تھا کہ اس منعم کے پسندیدہ دین کو قبول کرتے اور دوبارہ قیامت میں زندہ کرنے کا انکار نہ کرتے) اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلا رکھا ہے اور تم سب (قیامت میں) اسی کے پاس لائے جاؤ گے (اُس وقت اس کفرانِ نعمت کی حقیقت معلوم ہوگی) اور وہ ایسا ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے اور اُسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کا گھٹنا بڑھنا سو کیا تم (اتنی بات) نہیں سمجھتے (کہ یہ دلائلِ قدرت توحید اور قیامت میں دوسری زندگی، دونوں پر دالّ ہیں مگر) پھر بھی مانتے نہیں، بلکہ یہ بھی ویسی ہی بات کہتے ہیں جو اگلے (کافر) لوگ کہتے چلے آئے ہیں (یعنی) یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم جب مر جائیں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اس کا تو ہم سے اور (ہم سے) پہلے ہمارے بڑوں سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے یہ کچھ بھی نہیں محض بے سند باتیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آتی ہیں (چونکہ اس قول سے انکارِ قدرت لازم آتا ہے اور اس سے مثل انکار بعث کے انکار توحید کا بھی ہوتا ہے اس لئے اس قول کے جواب میں اثبات قدرت کے ساتھ اثبات توحید کا بھی ارشاد ہے یعنی) آپ (جواب میں) یہ کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں کس کی مِلک ہیں، اگر تم کو کچھ خبر ہے۔ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ کے ہیں (تو) ان سے کہئے کہ پھر کیوں نہیں غور کرتے (کہ قدرت علی البعث اور توحید دونوں کے حکم کا ثبوت ہو جائے اور) آپ یہ بھی کہئے کہ (اچھا یہ بتاؤ کہ) ان سات آسمانوں کا مالک اور عالیشان عرش کا مالک کون ہے (اس کا بھی) وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ یہ بھی (سب) اللہ کا ہے آپ (اس وقت) کہئے کہ پھر تم (اس سے) کیوں نہیں ڈرتے (کہ اس کی قدرت اور آیات بعث کا انکار کرتے ہو اور) آپ (ان سے) یہ بھی کہئے کہ (اچھا) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ (جس کو چاہتا ہے) پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا اگر تم کو کچھ خبر ہے (تب بھی جواب میں) وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب صفتیں بھی اللہ ہی کی ہیں آپ (اس وقت) کہئے کہ پھر تم کو کیسا خبط ہو رہا ہے (کہ ان سب مقدمات کو مانتے ہو اور نتیجہ کو کہ توحید اور قیامت کا اعتقاد ہے نہیں مانتے۔ یہ تو استدلال تھا مقصود پر ان کے جواب میں، آگے ان کے

مقدمہ کی دلیل یعنی اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ الخ کا ابطال ہے یعنی یہ جو ان کو بتلایا جا رہا ہے کہ قیامت آئے گی اور مردے زندہ ہوں گے یہ اساطیر الاوّلین نہیں ہے) بلکہ ہم نے ان کو سچی بات پہنچائی ہے اور یقیناً یہ (خود ہی) جھوٹے ہیں (یہاں تک مکالمہ ختم ہو چکا اور توحید و بعثت دونوں ثابت ہو گئے مگر ان دونوں مسئلوں میں چونکہ توحید کا مسئلہ زیادہ مہتم بالشان اور حقیقت میں مسئلہ قیامت و آخرت کا بھی مبنیٰ اور محل کلام بھی زیادہ تھا اس لئے تتمۂ تقریر میں اس کو مستقلاً ارشاد فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا (جیسا مشرکین ملائکہ کی نسبت کہتے تھے) اور نہ اُس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو (تقسیم کر کے) جُدا کر لیتا اور (پھر دُنیا کے بادشاہوں کی عادت کے مطابق دوسرے کی مخلوقات چھیننے کے لئے) ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا (پھر مخلوق کی تباہی کی تو کیا انتہا ہے لیکن نظامِ عالم بدستور قائم ہے اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ ان (مکروہ) باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ (اس کی نسبت) بیان کرتے ہیں، جاننے والا ہے سب پوشیدہ اور آشکارا کا، غرض ان لوگوں کے شرک سے وہ بالاتر (اور منزہ) ہے۔

معارف و مسائل

وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ، یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عذاب اور مصیبت رنج و تکلیف سے پناہ دیدے اور یہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے مقابلہ پر کسی کو پناہ دے کر اُس کے عذاب و تکلیف سے بچالے۔ یہ بات دُنیا کے اعتبار سے بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو کوئی نفع پہنچانا چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو کوئی تکلیف و عذاب دینا چاہے اُس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اور آخرت کے اعتبار سے بھی یہ مضمون صحیح ہے کہ جس کو وہ عذاب میں مبتلا کرے گا اُس کو کوئی بچا نہ سکے گا اور جس کو جنت اور راحت دے گا اُس کو کوئی روک نہ سکے گا۔ (قرطبی) [1]

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ

تو کہہ اے رَبّ اگر تو دکھانے لگے مجھ کو جو اُن سے وعدہ ہوا ہے تو اے رَبّ مجھ کو نہ کرلو

فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

ان گنہگار لوگوں میں اور ہم کو قدرت ہے کہ تجھ کو دکھلاویں جو اُن سے وعدہ کردیا ہے

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱۴۵

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝۹۶ وَقُلْ رَّبِّ

بُری بات کے جواب میں وہ کہہ جو بہتر ہے ہم خوب جانتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں اور کہہ اے رَبّ

اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝۹۷ۙ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝۹۸

میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطان کی چھیڑ سے اور پناہ تیری چاہتا ہوں اے رَبّ اس سے کہ میرے پاس آئیں

حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝۹۹ۙ لَعَلِّيْٓ

یہاں تک کہ جب پہنچے اُن میں کسی کو موت کہے گا اے رَبّ مجھ کو پھر بھیج دو شاید کچھ میں

اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ

بھلا کام کرلوں اس میں جو پیچھے چھوڑ آیا ہرگز نہیں یہ ایک بات ہے کہ وہی کہتا ہے

وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۰۰

اوران کے پیچھے پردہ ہے اُس دن تک کہ اُٹھائے جائیں

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) دُعا کرو کہ: ''میرے پروردگار! جس عذاب کی دھمکی ان (کافروں) کو دی جارہی ہے، اگر آپ اُسے میری آنکھوں کے سامنے لے آئیں، (۹۳) تو اے میرے پروردگار! مجھے ان ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کیجئے گا۔'' (۹۴) اور یقین جانو کہ ہم جس چیز کی انہیں دھمکی دے رہے ہیں، اُسے تمہاری آنکھوں کے سامنے لانے پر پوری طرح قادر ہیں۔ (۹۵) (لیکن جب تک وہ وقت نہ آئے) تم برائی کا دفعیہ ایسے طریقے سے کرتے رہو جو بہترین ہو۔ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں۔ (۹۶) اور دُعا کرو کہ: ''میرے پروردگار! میں شیطان کے لگائے ہوئے چرکوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، (۹۷) اور میرے پروردگار! میں اُن کے اپنے قریب آنے سے بھی آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔'' (۹۸) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت آکھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ: ''میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دیجئے، (۹۹)

تاکہ جس دُنیا کو میں چھوڑ آیا ہوں، اُس میں جا کر نیک عمل کروں۔" ہرگز نہیں! یہ تو ایک بات ہی بات ہے جو وہ زبان سے کہہ رہا ہے، اور ان (مرنے والوں) کے سامنے عالم برزخ کی آڑ ہے جو اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک ان کو دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے۔(۱۰۰)

خلاصۂ تفسیر

آپ (حق تعالیٰ سے) دُعا کیجئے کہ اے میرے رَبّ! جس عذاب کا ان کافروں سے وعدہ کیا جارہا ہے (جیسا اُوپر اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ [1] (المؤمنون:۷۷) سے بھی معلوم ہوا) اگر آپ مجھ کو دکھادیں (مثلاً یہ کہ وہ عذاب اُن پر میری زندگی میں اس طور سے آئے کہ میں بھی دیکھوں کیونکہ اس عذاب موعود کا کوئی وقت خاص نہیں بتلایا گیا ہے چنانچہ آیتِ مذکورہ بھی مبہم ہے جس میں یہ احتمال مذکور بھی ہے غرض اگر ایسا ہوا) تو اے میرے رَبّ مجھ کو ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجئے اور ہم اس بات پر کہ جو اُن سے وعدہ کر رہے ہیں آپ کو بھی دکھلا دیں قادر ہیں (باقی جب تک اُن پر عذاب نہ آئے) آپ (ان کے ساتھ یہ معاملہ رکھئے کہ) ان کی بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کر دیا کیجئے جو بہت ہی اچھا (اور نرم) ہو (اور اپنی ذات کے لئے بدلہ نہ لیجئے بلکہ ہمارے حوالہ کر دیا کیجئے) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ (آپ کی نسبت) کہا کرتے ہیں اور (اگر آپ کو بمقتضائے بشریت غیظ آجایا کرے تو) آپ یوں دُعا کیا کیجئے کہ اے میرے رَبّ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں سے (جو مفضی ہو جائیں کسی ایسے امر کی طرف جو خلاف مصلحت ہو گو خلافِ شریعت نہ ہو) اور اے میرے رَبّ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان میرے پاس بھی آئیں (اور وسوسہ ڈالنا تو در کنار، پس اس سے وہ غیظ جاتا رہے گا۔ یہ کفار اپنے کفر و انکارِ معاد سے باز نہیں آتے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی (کے سر) پر موت آ (کھڑی ہو) تی ہے (اور آخرت کا معائنہ ہونے لگتا ہے) اُس وقت (آنکھیں کھلتی ہیں اور اپنے جہل و کفر پر نادم ہو کر) کہتا ہے کہ اے میرے رَبّ (مجھ سے موت کو ٹال دیجئے اور) مجھ کو (دُنیا میں) پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس (دُنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں اُس میں (پھر جا کر) نیک کام کروں (یعنی تصدیق و طاعت حق تعالیٰ، اس درخواست کو رد فرماتے ہیں کہ) ہرگز (ایسا) نہیں (ہوگا) یہ (اس کی) ایک بات ہی بات ہے جس کو یہ کہے جارہا ہے (اور پوری ہونے والی نہیں) اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) ان لوگوں کے آگے ایک (چیز) آڑ (کی آنے والی) ہے (کہ جس کا آنا ضروری ہے اور وہی دُنیا میں واپس آنے سے مانع ہے مراد اس سے موت ہے کہ اس کا وقوع بھی وقت مقدر پر ضروری ہے وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا [2] (المنافقون:۱۱) اور موت کے بعد دُنیا میں لوٹ کر آنا بھی) قیامت کے دن تک (قانونِ الٰہی کے خلاف ہے)۔

[1] ترجمہ: ہم جب ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے۔ [2] ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا۔

معارف و مسائل

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

مطلب اِن دونوں آیتوں کا یہ ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں مشرکین و کفار پر عذاب کی وعید مذکور ہے جو عام ہے۔ قیامت میں تو اس کا وقوع قطعی اور یقینی ہے دُنیا میں ہونے کا بھی احتمال ہے۔ پھر یہ عذاب اگر دُنیا میں ان پر واقع ہو تو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد آئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ ہی کے سامنے اُن پر اللہ کا کوئی عذاب آ جائے۔ اور دُنیا میں جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو بعض اوقات اُس عذاب کا اثر صرف ظالموں ہی پر نہیں رہتا بلکہ نیک لوگ بھی اُس سے دُنیاوی تکلیف میں متأثر ہوتے ہیں گو آخرت میں ان کو کوئی عذاب نہ ہو بلکہ اس دُنیا کی تکلیف پر جو اُن کو پہنچتی ہے اجر بھی ملے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ (الانفال:۲۵) یعنی ایسے عذاب سے ڈرو جو اگر آ گیا تو صرف ظالموں ہی تک نہیں رہے گا دوسرے لوگ بھی اُس کے لپیٹ میں آئیں گے۔

ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا تلقین فرمائی گئی ہے کہ یا اللہ اگر ان لوگوں پر آپ کا عذاب میرے سامنے اور میرے دیکھتے ہوئے ہی آنا ہے تو مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ رکھئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم اور عذابِ الٰہی سے محفوظ ہونا اگرچہ آپ کے لئے یقینی تھا مگر پھر بھی اس دُعا کی تلقین اس لئے فرمائی گئی کہ آپ ہر حال میں اپنے رَبّ کو یاد رکھیں اُس سے فریاد کرتے رہیں تاکہ آپ کا اجر بڑھے۔ (قرطبی) [۱]

وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ یعنی ہم کو اس پر پوری قدرت ہے کہ ہم آپ کے سامنے ہی آپ کو ان پر عذاب آتا ہوا دکھلا دیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ اس اُمّت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے عذابِ عام نہ آنے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ (الانفال:۳۳) یعنی ہم ان لوگوں کو اس حالت میں ہلاک کرنے والے نہیں کہ آپ ان کے اندر موجود ہوں لیکن خاص خاص لوگوں پر خاص حالات میں عذاب دُنیا ہی میں آ جانا اس کے منافی نہیں۔ اس آیت میں جیسا کہ فرمایا ہے کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ آپ کو بھی ان کا عذاب دکھلا دیں وہ اہلِ مکہ پر قحط اور بھوک کا عذاب پھر غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تلوار کا عذاب آپ کے سامنے ہی ان پر پڑ چکا تھا۔ (قرطبی) [۲]

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ یعنی آپ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ، ظلم کو انصاف کے ذریعہ اور بے رحمی کو رحم کے

[۱] [۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۲ ص:۱۴۷

ذریعہ دفع فرمادیں۔ یہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے جو مسلمانوں کے باہم معاملات کے لئے ہمیشہ جاری ہے البتہ کفار و مشرکین سے اُن کے مظالم کے مقابلے میں عفو و درگزر ہی کرتے رہنا، اُن پر ہاتھ نہ اُٹھانا، یہ حکم آیاتِ جہاد سے منسوخ ہو گیا مگر عین حالتِ جہاد میں بھی اس حُسنِ خلق کے بہت سے مظاہر باقی رکھے گئے کہ عورت کو قتل نہ کیا جائے، بچے کو قتل نہ کیا جائے جو مذہبی لوگ مسلمانوں کے مقابلے پر جنگ میں شریک نہیں اُن کو قتل نہ کیا جائے اور جس کو بھی قتل کریں تو اُس کا مُثلہ نہ بنائیں کہ ناک کان وغیرہ کاٹ لیں، وَغَيْرَ ذٰلِكَ مِنْ اَحْكَامِ مَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ۔ اسی لئے بعد کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شیطان اور اس کے وساوس سے پناہ مانگنے کی دُعا تلقین کی گئی کہ عین میدان قتال میں بھی آپ کی طرف سے عدل و انصاف اور مکارمِ اخلاق کے خلاف کوئی چیز شیطان کے غصّہ دلانے سے صادر نہ ہونے پائے وہ دُعا یہ ہے:-

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ لفظ **همز** کے معنے دھکا دینے اور دبانے کے آتے ہیں۔ اور پیچھے کی طرف سے آواز دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ دُعا اپنے مفہومِ عام کے اعتبار سے ایک جامع دُعا شیطان کے شر اور مکر سے بچنے کے لئے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس دُعا کی تلقین فرمائی ہے تاکہ ایسے غصّے اور غیظ و غضب کی حالت میں جبکہ انسان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا اور اس میں ہمزِ شیطان کا دخل ہوتا ہے اُس سے محفوظ رہیں۔ اس کے علاوہ شیاطین اور جنّات کے دوسرے آثار اور حملوں سے بچنے کے لئے بھی یہ دُعا مجرّب ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو شب میں نیند نہ آتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو یہ کلماتِ دُعا تلقین فرمائے کہ یہ پڑھ کر لیٹا کریں۔ اُنہوں نے پڑھا تو یہ شکایت جاتی رہی وہ دُعا یہ ہے: [1] اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَعِقَابِهٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔ [2]

اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان تمہارے ہر کام میں ہر حال میں تمہارے پاس آتا ہے اور ہر کام میں گناہوں اور غلط کاموں کا وسوسہ دل میں ڈالتا رہتا ہے (قرطبی) [3] اسی سے پناہ مانگنے کے لئے یہ دُعا تلقین فرمائی گئی ہے۔

رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ یعنی موت کے وقت کافر پر جب آخرت کا عذاب سامنے آنے لگتا ہے تو وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش میں پھر دُنیا میں لوٹ جاؤں اور نیک عمل کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کرلوں۔

---

[1] ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تامہ کی پناہ لیتا ہوں اس کے غضب اور غصّے سے، اور اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔

[2] موطا مالك، كتاب الجامع، باب ما يؤمر به من التعوذ رقم الحديث: ۳۴۹۹

[3] تفسير القرطبي ج: ۱۲ ص: ۱۴۹، وصحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب استحباب لعق الأصابع إلخ ج: ۲ ص: ۱۷۵

ابن جریر نے بروایت ابن جریج نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موت کے وقت مؤمن جب رحمت کے فرشتے اور رحمت کے سامان دیکھنے لگتا ہے تو فرشتے اُس سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم چاہتے ہو کہ پھر تمہیں دُنیا میں واپس کر دیا جائے؟ تو وہ کہتا ہے کہ میں اُس غموں اور تکلیفوں کے عالم میں جا کر کیا کروں گا۔ مجھے تو اب اللہ کے پاس لے جاؤ۔ اور کافر سے پوچھتے ہیں تو وہ کہتا ہے: رَبِّ ارْجِعُوْنِ یعنی مجھے دُنیا میں لوٹا دو۔[1]

كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۰۰ بَرْزَخٌ کے لفظی معنے حاجز اور فاصل کے ہیں۔ دو حالتوں یا دو چیزوں کے درمیان جو چیز فاصل ہو اس کو برزخ کہتے ہیں اسی لئے موت کے بعد قیامت اور حشر تک کے زمانے کو برزخ کہا جاتا ہے کہ یہ دُنیاوی حیات اور آخرت کی حیات کے درمیان حدِ فاصل ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ جب مرنے والا کافر، فرشتوں سے دوبارہ دُنیا میں بھیجنے کو کہتا ہے تو یہ کلمہ تو اُس کو کہنا ہی تھا کیونکہ اب عذاب سامنے آچکا ہے مگر اس کلمہ کا اب کوئی فائدہ اس لئے نہیں کہ وہ اب برزخ میں پہنچ چکا ہے جس کا قانون یہ ہے کہ برزخ سے لوٹ کر کوئی دُنیا میں نہیں آتا اور قیامت اور بعث ونشر سے پہلے دوسری زندگی نہیں ملتی۔ واللہ اعلم

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَاۗءَلُوْنَ ۝۱۰۱

پھر جب پھونک ماریں صور میں تو نہ قرابتیں ہیں ان میں اس دن اور نہ ایک دوسرے کو پوچھے

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۲ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ

سو جس کی بھاری ہوئی تول تو وہی لوگ کام لے نکلے اور جس کی ہلکی نکلی تول

فَاُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝۱۰۳ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ

تو وہی لوگ ہیں جو ہار بیٹھے اپنی جان دوزخ ہی میں رہا کریں گے جھلس دے گی اُن کے منہ کو

النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ۝۱۰۴ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا

آگ اور وہ اس میں بدشکل ہو رہے ہوں گے کیا تم کو سُنائی نہ تھیں ہماری آیتیں پھر تم اُن کو

[1] تفسیر الطبری تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۹ ص:۶۹

تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾

جھٹلاتے تھے بولے اے رَبّ زور کیا ہم پر ہماری کم بختی نے اور رہے ہم لوگ بہکے ہوئے

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا

اے ہمارے رَبّ نکال لے ہم کو اس میں سے اگر ہم پھر کریں تو ہم گنہگار فرمایا پڑے رہو پھٹکارے ہوئے اس میں

وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا

اور مجھ سے نہ بولو ایک فرقہ تھا میرے بندوں میں جو کہتے تھے اے رَبّ ہمارے ہم یقین لائے

فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا

سو معاف کر ہم کو اور رحم کر ہم پر اور تو سب رحم والوں سے بہتر ہے پھر تم نے ان کو ٹھٹھوں میں پکڑا

حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ

یہاں تک کہ بھول گئے ان کے پیچھے میری یاد اور تم اُن سے ہنستے رہے میں نے آج دیا اُن کو بدلہ

بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ

اُن کے صبر کرنے کا کہ وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے فرمایا تم کتنی دیر رہے زمین میں

عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

برسوں کی گنتی سے بولے ہم رہے ایک دن یا کچھ دن سے کم تو پوچھ لے گنتی والوں سے

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا

فرمایا تم اُس میں بہت نہیں تھوڑا ہی رہے ہو اگر تم جانتے ہوتے سو کیا تم خیال رکھتے ہو کہ

خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

ہم نے تم کو بنایا کھیلنے کو اور تم ہمارے پاس پھر کر نہ آؤ گے

آسان ترجمۂ قرآن

پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اُس دن نہ ان کے درمیان رشتے ناتے باقی رہیں گے، اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔ ﴿۱۰۱﴾ اُس وقت جن کے پلڑے بھاری نکلے، تو وہی ہوں گے جو فلاح پائیں گے، ﴿۱۰۲﴾ اور جن کے پلڑے ہلکے پڑ گئے، تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے لئے گھاٹے کا سودا کیا تھا، وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۱۰۳﴾ آگ اُن کے چہروں کو جھلس ڈالے گی، اور اُس میں اُن کی صورتیں بگڑ جائیں گی۔ ﴿۱۰۴﴾ (اُن سے کہا جائے گا کہ:) ''کیا میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائی نہیں جاتی تھیں؟ اور تم اُن کو جھٹلایا کرتے تھے۔'' ﴿۱۰۵﴾ وہ کہیں گے: ''ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری بدبختی چھا گئی تھی، اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ ﴿۱۰۶﴾ ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے باہر نکال دیجئے، پھر اگر ہم دوبارہ وہی کام کریں تو بیشک ہم ظالم ہوں گے۔'' ﴿۱۰۷﴾ اللہ فرمائے گا: ''اسی (دوزخ) میں ذلیل ہو کر پڑے رہو، اور مجھ سے بات بھی نہ کرو۔ ﴿۱۰۸﴾ میرے بندوں میں سے ایک جماعت یہ دُعا کرتی تھی کہ: 'اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس ہمیں بخش دیجئے، اور ہم پر رحم فرمایئے، اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والے ہیں' ﴿۱۰۹﴾ تو تم نے ان لوگوں کا مذاق بنایا تھا۔ یہاں تک کہ اُن ہی (کے ساتھ چھیڑ چھاڑ) نے تمہیں میری یاد تک سے غافل کر دیا، اور تم اُن کی ہنسی اُڑاتے رہے۔ ﴿۱۱۰﴾ اُنہوں نے جس طرح صبر سے کام لیا تھا، آج میں نے اُنہیں اُس کا یہ بدلہ دیا ہے کہ اُنہوں نے اپنی مراد پالی ہے۔'' ﴿۱۱۱﴾ (پھر) اللہ (ان دوزخیوں سے) فرمائے گا: ''تم زمین میں گنتی کے کتنے سال رہے؟'' ﴿۱۱۲﴾ وہ کہیں گے کہ: ''ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے ہوں گے۔ (ہمیں پوری طرح یاد نہیں) اس لئے جنہوں نے (وقت کی) گنتی کی ہو، اُن سے پوچھ لیجئے۔'' ﴿۱۱۳﴾ اللہ فرمائے گا: ''تم تھوڑی مدت سے زیادہ نہیں رہے۔ کیا خوب ہوتا اگر یہ بات تم نے (اُس وقت) سمجھ لی ہوتی! ﴿۱۱۴﴾ بھلا کیا تم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہم نے تمہیں یونہی بے مقصد پیدا کر دیا، اور تمہیں واپس ہمارے پاس نہیں لایا جائے گا؟'' ﴿۱۱۵﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر جب (قیامت کا روز ہوگا اور) صور پھونکا جائے گا تو (ایسی ہول و ہیبت میں گرفتار ہوں گے کہ) اُن میں

(جو) باہمی رشتے ناتے (تھے) اُس روز (وہ بھی گویا) نہ رہیں گے (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کرے گا جیسے اجنبی اجنبی ہوتے ہیں) اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا (کہ بھائی تم کس حالت میں ہو، غرض نہ رشتہ ناتا کام آئے گا نہ دوستی اور تعارف، پس وہاں کام کی چیز ایک ایمان ہوگا جس کی عام شناخت کے لئے کہ سب پر ظاہر ہوجائے ایک ترازو کھڑی کی جائے گی اور اس سے اعمال وعقائد کا وزن ہوگا) سو جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مؤمن ہوگا) تو ایسے لوگ کامیاب (یعنی نجات پانے والے) ہوں گے (اور مذکور ہول وہیبت کے حالات کہ نہ کسی کا رشتہ کام آئے نہ دوستی اور نہ کوئی کسی کو پوچھے کہ کس حال میں ہو، یہ ان مؤمنین کو پیش نہ آئیں گے لقولہ تعالیٰ لَا یَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ الآیۃ [۱] (الانبیاء: ۱۰۳)) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کرلیا اور جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے ان کے چہروں کو (اس جہنم کی) آگ جھلستی ہوگی اور اُس (جہنم) میں اُن کے منہ بگڑے ہوں گے (اور ان سے حق تعالیٰ بواسطہ یا بلاواسطہ ارشاد فرمائیں گے کہ) کیوں کیا میری آیتیں (دُنیا میں) تم کو پڑھ کر سُنائی نہیں جایا کرتی تھیں، اور تم اُن کو جھٹلایا کرتے تھے (یہ اُس کی سزا مل رہی ہے) وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رَبّ (واقعی) ہماری بدبختی نے ہم کو (ہمارے ہاتھوں) گھیر لیا تھا اور (بیشک) ہم گمراہ لوگ تھے (یعنی ہم جُرم کا اقرار اور اس پر ندامت ومعذرت کا اظہار کرکے درخواست کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رَبّ ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے (اور دوبارہ دُنیا میں بھیج دیجئے لقولہ تعالیٰ فی الٓمٓ السجدۃ فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا [۲] (السجدۃ: ۱۲)) پھر اگر ہم دوبارہ (ایسا) کریں تو ہم بیشک پورے قصوروار ہیں (اُس وقت ہم کو خوب سزا دیجئے اور اب چھوڑ دیجئے) ارشاد ہوگا کہ اسی (جہنم) میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو (یعنی ہم نہیں منظور کرتے، کیا تم کو یاد نہیں رہا کہ) میرے بندوں میں ایک گروہ (ایمانداروں کا) تھا جو (بیچارے ہم سے) عرض کیا کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو ہم کو بخش دیجئے اور ہم پر رحمت فرمایئے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں سو تم نے (محض اس بات پر جو ہر طرح قابلِ قدر تھی) ان کا مذاق مقرر کیا تھا (اور) یہاں تک (اس کا مشغلہ کیا) کہ ان کے مشغلہ نے تم کو ہماری یاد بھی بھلادی اور تم اُن سے ہنسی کیا کرتے تھے (سو ان کا تو کچھ نہ بگڑا چند روز کی کلفت تھی کہ صبر کرنا پڑا جس کا یہ نتیجہ ملا کہ) میں نے اُن کو آج اُن کے صبر کا یہ بدلہ دیا، کہ وہی کامیاب ہوئے (اور تم اس ناکامی میں گرفتار ہوئے مطلب جواب کا یہ ہوا کہ تمہارا قصور اس قابل نہیں کہ سزا کے وقت اقرار کرنے سے معاف کردیا جائے کیونکہ تم نے ایسا معاملہ کیا جس سے ہمارے حقوق کا بھی اتلاف ہوا اور حقوق العباد کا بھی۔ اور عباد بھی کیسے ہمارے مقبول اور محبوب جو ہم سے خصوصیتِ خاصہ رکھتے تھے کیونکہ ان کو سخریہ بنانے میں اُن کی ایذاء کہ اضاعۃ حق العبد ہے اور تکذیبِ حق جو منشا سخریہ کا ہے کہ اضاعۃ حق اللہ

---

[۱] ترجمہ: ان کو بڑی گھبراہٹ غم میں نہ ڈالے گی۔　[۲] ترجمہ: سو ہم کو پھر بھیج دیجئے ہم نیک کام کیا کریں گے۔

ہے دونوں لازم آئے پس اس کی سزا کے لئے دوام اور تمام ہی مناسب ہے اور مؤمنین کو اُن کے سامنے جنّت کی نعمتوں سے کامیاب کرنا یہ بھی ایک سزا ہے کفار کے لئے کیونکہ اعداء کی کامیابی سے روحانی ایذاء ہوتی ہے۔ یہ تو جواب ہو گیا اُن کی درخواستوں کا آگے تنبیہ ہے اُن کے بطلانِ اعتقاد و مشرب پر تاکہ ذلّت پر ذلّت وحسرت پر حسرت ہونے سے عقوبت میں شدّت ہو، اس لئے) ارشاد ہوگا کہ (اچھا یہ بتلاؤ) تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین میں رہے ہوگے (چونکہ وہاں کے ہول وہیبت سے اُن کے ہوش وحواس گم ہو چکے ہوں گے اور اُس دن کا طول بھی پیشِ نظر ہوگا) وہ جواب دیں گے کہ (برس کیسے، بہت رہے ہوں گے تو) ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ہم رہے ہوں گے (اور سچ یہ ہے کہ ہم کو یاد نہیں) سو گننے والوں سے (یعنی فرشتوں سے کہ اعمال واعمار سب کا حساب کرتے تھے) پوچھ لیجئے، ارشاد ہوگا کہ (یوم اور بعض یوم تو غلط ہے مگر اتنا تو تمہارے اقرار سے جو کہ صحیح بھی ہے ثابت ہو گیا کہ) تم (دُنیا میں) تھوڑی ہی مدّت رہے (لیکن) کیا خوب ہوتا کہ تم (یہ بات اُس وقت) سمجھتے ہوتے (کہ دُنیا کی بقا نا قابلِ اعتبار ہے اور اس کے سوا اور کوئی دار القرار ہے مگر وہاں تو بقاء کو دُنیا ہی میں منحصر سمجھا اور اس عالم کا انکار کرتے رہے وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۹﴾ [1] (الانعام:۲۹) اور اب جو غلطی ظاہر ہوئی اور صحیح سمجھے تو بیکار، اور غلطیٔ اعتقاد پر تنبیہ کے بعد آگے پھر اس اعتقاد پر زجر ہے، جو بطور خلاصہ مضمون فردِ قرارِ جرم کے ہے کہ) ہاں تو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل (خالی از حکمت) پیدا کر دیا ہے اور یہ (خیال کیا تھا) کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے (مطلب یہ کہ جب ہم نے آیات میں جن کا صدق دلائلِ صحیحہ سے ثابت ہے قیامت اور اس میں اعمال کے بدلے کی خبر دی تھی تو معلوم ہو گیا تھا کہ مکلّفین کی تخلیق کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کا مُنکِر ہونا کتنا بڑا امرِ مُنکَر تھا)۔

معارف و مسائل

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ، قیامت کے روز صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا نفخۂ اُولیٰ یعنی پہلے صور کا یہ اثر ہوگا کہ سارا عالم زمین وآسمان اور جو اس کے درمیان ہے فنا ہو جائے گا اور نفخۂ ثانیہ سے پھر سارے مُردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے قرآن کریم کی آیت ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾ [2] (الزمر) میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس آیت میں صور کا نفخۂ اُولیٰ مراد ہے یا نفخۂ ثانیہ، اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بروایت ابنِ جبیرؒ منقول ہے کہ اس آیت میں مراد نفخۂ اُولیٰ ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا اور بروایت عطاؒ یہی بات حضرت

[1] ترجمہ: اور یہ کہتے ہیں کہ جینا اور کہیں نہیں صرف یہی فی الحال کا جینا ہے اور ہم زندہ نہ کئے جائیں گے۔

[2] ترجمہ: پھر اس میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو دفعۃً سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے دیکھنے لگیں گے۔

ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے کہ مراد اس جگہ نفخۂ ثانیہ ہے۔ تفسیر مظہری میں اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔[۱] حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا قول یہ ہے کہ قیامت کے روز ایک ایک بندے مرد و عورت کو محشر کے میدان میں لایا جائے گا اور تمام اوّلین وآخرین کے اس بھرے مجمع کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ایک منادی یہ نداء کرے گا کہ یہ شخص فلاں بن فلاں ہے اگر کسی کا کوئی حق اس کے ذمّہ ہے تو سامنے آجائے اس سے اپنا حق وصول کرلے۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ بیٹا اس پر خوش ہوگا کہ میرا حق باپ کے ذمّہ نکل آیا، اور باپ کا کوئی حق بیٹے پر ہوا تو باپ خوش ہوگا کہ اس سے وصول کروں گا۔ اسی طرح میاں بیوی اور بھائی بہن جس کا جس پر کوئی حق ہوگا یہ منادی سُن کر اُس سے وصول کرنے پر آمادہ اور خوش ہوگا، یہی وہ وقت ہے جس کے متعلق اس آیتِ مذکورہ میں آیا ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ،[۲] یعنی اُس وقت باہمی نسبی رشتے اور قرابتیں کام نہ آئیں گی کوئی کسی پر رحم نہ کرے گا، ہر شخص کو اپنی اپنی فکر ہوگی یہی مضمون اس آیت کا ہے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ (عَبَسَ) یعنی وہ دن جس میں ہر انسان اپنے بھائی سے، ماں اور باپ سے، بیوی اور اولاد سے دُور بھاگے گا۔

محشر میں مؤمنین اور کفار کے حالات میں فرق

مگر یہ حال کافروں کا ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر اس کا ذکر موجود ہے مؤمنین کا یہ حال نہیں ہوگا کیونکہ مؤمنین کا حال خود قرآن نے یہ ذکر کیا ہے اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (الطّور:۲۱) یعنی مؤمنین صالحین کی اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ (بشرطِ ایمان) اپنے آباء صالحین کے ساتھ لگادیں گے اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جس وقت محشر میں سب پیاسے ہوں گے مسلمان بچّے جو نابالغی کی حالت میں مرگئے تھے وہ جنت کا پانی لئے ہوئے نکلیں گے۔ لوگ اُن سے پانی مانگیں گے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو اپنے ماں باپ کو تلاش کررہے ہیں یہ پانی اُن کے لئے ہے۔(رواہ ابن ابی الدّنیا عن عبداللہ بن عمرؓ وعن ابی ذرؓ، مظہری)[۳]

اسی طرح ایک صحیح حدیث میں جس کو ابن عساکر نے بسند صحیح حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ہر نسبی تعلق یا زوجیت کے تعلق سے جو رشتے پیدا ہوں گے وہ سب منقطع ہوجائیں گے (کوئی کسی کے کام نہ آئے گا) بجز میرے نسب اور میری زوجیت کے رشتہ کے۔[۴] علماء نے فرمایا کہ اس نسبِ نبوی میں ساری اُمّت کے مسلمان بھی داخل ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت کے باپ اور آپ کی ازواج مطہرات اُمّت کی مائیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رشتہ اور دوستی کا کوئی تعلق کسی کے کام نہ آنا یہ حال محشر میں کافروں کا ہوگا

[۱] تفسیر المظهری ج:٦ ص:۴۰۲
[۲] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۱۲ ص:۱۵۱
[۳] تفسير المظهري ج:٦ ص:۴۰۲، ۴۰۳
[۴] المعجم الأوسط للطبراني، رقم الحديث:۴۲۸۲

مؤمنین ایک دوسرے کی شفاعت اور مدد کریں گے اور اُن کے تعلقات ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔

وَلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ یعنی آپس میں کوئی کسی کی بات نہ پوچھے گا اور دوسری ایک آیت میں جو یہ مذکور ہے وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ (الطور) یعنی محشر میں لوگ باہم ایک دوسرے سے سوالات کریں گے اور حالات پوچھیں گے۔ اس کے بارہ میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ محشر میں مختلف موقف ہوں گے ہر موقف کا حال مختلف ہوگا۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کوئی کسی کو نہ پوچھے گا پھر کسی موقف میں جب وہ ہیبت اور ہول کا غلبہ کم ہوجائے گا تو باہم ایک دوسرے کا حال بھی دریافت کریں گے (مظہری)۔[1] فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ یعنی میزان عمل میں جس شخص کا نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ ہی فلاح پانے والے ہیں اور جس کا پلہ نیکیوں کا ہلکا رہے گا تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دُنیا میں خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا اور اب وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنے والے ہیں۔ اس آیت میں مقابلہ صرف مؤمنین کاملین اور کفار کا ہے اور اُنہیں کے وزن اعمال کا اور اُن میں سے ہر ایک کے انجام کا ذکر کیا گیا کہ مؤمنین کاملین کا پلّہ بھاری ہوگا ان کو فلاح حاصل ہوگی، کفار کا پلّہ ہلکا رہے گا اُن کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنا پڑے گا۔

اور قرآن کریم کی دوسری تصریحات سے ثابت ہے کہ اس جگہ مؤمنین کاملین کا پلّہ بھاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے پلّے یعنی سیئات و معاصی کے پلّے میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا وہ خالی نظر آئے گا۔ اور کفار کا پلّہ ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے پلّہ میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا بالکل خالی جیسا ہلکا رہے گا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ (الکہف) یعنی ہم کفار اور اُن کے اعمال کا قیامت کے دن کوئی وزن ہی قائم نہ کریں گے۔ یہ حال تو مؤمنین کاملین کا ہوا اور جن سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوئے یا توبہ وغیرہ سے معاف کر دیئے گئے وزنِ اعمال کے وقت سیئات کے پلّہ میں اُن کے نام پر کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف کفار ہیں جن کے نیک اعمال بھی شرطِ ایمان موجود نہ ہونے کے سبب میزانِ عدل میں بے وزن ہوں گے۔ باقی رہا معاملہ گنہگار مسلمانوں کا جن کے نیکیوں کے پلّہ میں بھی اعمال ہوں گے اور سیئات کے پلّہ میں بھی اعمال ہوں گے ان کا ذکر اس آیت میں صراحۃً نہیں کیا گیا بلکہ عموماً قرآن کریم میں گنہگار مسلمانوں کی سزا و جزاء سے سکوت ہی اختیار کیا گیا ہے اِس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں جتنے مؤمنین صحابۂ کرامؓ تھے وہ سب کے سب عدول تھے یعنی عموماً تو وہ کبیرہ گناہوں سے پاک ہی رہے اور اگر کسی سے کوئی گناہ ہو بھی گیا تو اُس نے توبہ کرلی توبہ سے معاف ہوگیا۔ (مظہری)[2]

[1] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۴۰۳ [2] تفسیر مظہری ج:۶ ص:۴۰۵،۴۰۶

قرآن مجید کی ایک آیت خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا [۱] (التوبۃ:۱۰۸) میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کے نیک و بداعمال ملے جُلے ہیں۔ اُن کے متعلق حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قیامت کے روز ان لوگوں کے اعمال کا حساب اس طرح ہوگا کہ جس شخص کی نیکیاں اُس کے گناہوں سے بڑھ جائیں خواہ ایک ہی نیکی کی مقدار سے بڑھے وہ جنت میں جائے گا اور جس شخص کے سیئات اور گناہ نیکیوں سے بڑھ جائیں خواہ ایک ہی گناہ کی مقدار سے بڑھے وہ دوزخ میں جائے گا مگر اس مؤمن گنہگار کا دوزخ میں داخلہ تطہیر اور پاک کرنے کے لئے ہوگا جیسے لوہے، سونے وغیرہ کو آگ میں ڈال کر میل اور زنگ دُور ہو جائے گا تو جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائے گا، جنت میں بھیج دیا جائے گا اور حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ قیامت کی میزانِ عمل ایسا صحیح وزن کرنے والی ہوگی کہ ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کمی بیشی ہوگی تو پلّہ جھک جائے گا یا اُٹھ جائے گا۔ اور جس شخص کی حسنات اور سیئات میزانِ عمل میں بالکل برابر سرابر رہیں گے تو وہ اصحابِ اَعراف میں داخل ہوگا اور ایک زمانہ تک دوزخ اور جنت کے درمیان حکم ثانی کا منتظر رہے گا اور بالآخر اس کو بھی جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ (رواہ ابن ابی حاتم۔ مظھری) [۲]

ابنِ عباسؓ کے اس قول میں کفار کا ذکر نہیں صرف مؤمنین گنہگاروں کا ذکر ہے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت

بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انسان مؤمن و کافر کو میزانِ عدل میں رکھ کر تولا جائے گا۔ کافر کا کوئی وزن نہ ہوگا خواہ وہ کتنا ہی فربہ اور موٹا ہو (بخاری ومسلم من حدیث ابی ھریرۃؓ)۔ [۳] اور بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نامۂ اعمال تولے جائیں گے۔ ترمذی، ابنِ ماجہ، ابنِ حبّان اور حاکم نے یہ مضمون حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ [۴] اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے اعمال جو دُنیا میں بے وزن بے جسم اَعراض ہوتے ہیں محشر میں ان کو مجسّم کر کے میزانِ عمل میں رکھا جائے گا وہ تولے جائیں گے۔ طبرانی وغیرہ نے یہ بروایت ابنِ عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ [۵] ان سب روایاتِ حدیث کے الفاظ اور متن تفسیر مظہری میں مکمل موجود ہیں وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی آخری قول کی تائید میں ایک حدیث عبدالرزاق نے فضل العلم میں ابراہیم نخعیؒ سے

---

[۱] ترجمہ: جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے اور کچھ بُرے۔

[۲] تفسیر مظھری ج:۶ ص:۴۰۵،۴۰۶

[۳] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الکھف، باب اولئك الذین کفروا بأیٰت ربھم الآیۃ ج:۲ ص:۶۹۱، وصحیح مسلم، باب صفۃ القیامۃ إلخ ج:۲ ص:۳۷۰

[۴] جامع الترمذی، ابواب الإیمان، باب ما جاء فیمن یموت وھو یشھد ان لا إلہ إلّا اللہ ج:۲ ص:۹۲

[۵] المعجم الکبیر للطبرانیؒ، رقم الحدیث:۱۳۰۲۴، (بألفاظ مختلفۃ)

نقل کی ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کے اعمال وزن کے لئے لائے جائیں گے اور ترازو کے پلّہ میں رکھے جائیں گے تو یہ پلّہ ہلکا رہے گا۔ پھر ایک چیز ایسی لائی جائے گی جو بادل کی طرح ہوگی اس کو بھی اس کے حسنات کے پلّہ میں رکھ دیا جائے گا تو یہ پلّہ بھاری ہو جائے گا اس وقت اس شخص سے کہا جائے گا کہ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے (جس نے تمہاری نیکیوں کا پلّہ بھاری کر دیا) وہ کہے گا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرا علم ہے جو تو لوگوں کو سکھایا کرتا تھا۔ اور ذہبی نے فضل علم میں حضرت عمران بن حصین ؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز شہیدوں کا خون اور علماء کی روشنائی (جس سے اُنہوں نے علمِ دین کی کتابیں لکھی تھیں) باہم تولے جائیں گے تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون سے زیادہ نکلے گا۔ (مظہری) [1]

وزنِ اعمال کی کیفیت کے متعلق تینوں قسم کی روایات نقل کرنے کے بعد تفسیر مظہری میں فرمایا کہ اس میں کوئی بُعد نہیں کہ خود انسان اور اس کے اعمال کو جسمانی شکل میں تولا جائے یا اس کے نامۂ اعمال کو اس کے ساتھ رکھ کر تولا جائے اس لئے ان تینوں روایتوں میں کوئی تعارض اور اختلاف نہیں۔

وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ كَالِحْ لغت میں اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے دونوں ہونٹ اس کے دانتوں کو نہ چھپائیں ایک اوپر رہے دوسرا نیچے دانت نکلے ہوئے نظر آئیں جو نہایت بدصورت ہے جہنم میں جہنمی کا اوپر کا ہونٹ اُوپر چڑھ جائے گا اور نیچے کا ہونٹ نیچے لٹک جائے گا دانت کھلے نکلے نظر آئیں گے۔

وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اہلِ جہنم کا یہ آخری کلام ہوگا جس کے جواب میں حکم ہو جائے گا کہ ہم سے کلام نہ کرو پھر وہ کسی سے کچھ کلام نہ کر سکیں گے جانوروں کی طرح ایک دوسرے کی طرف بھونکیں گے۔ اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن کعبؒ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں اہلِ جہنم کی پانچ درخواستیں نقل کی گئی ہیں اُن میں سے چار کا جواب دیا گیا اور پانچویں کے جواب میں حکم ہو گیا لَا تُكَلِّمُوْنِ بس یہ اُن کا آخری کلام ہوگا اس کے بعد کچھ نہ بول سکیں گے۔ (مظہری) [2]

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

سو بہت اُوپر ہے اللہ وہ بادشاہ سچا کوئی حاکم نہیں اس کے سوائے مالک اس عزت کے تخت کا

[1] تفسیر المظهری ج:٦ ص:٤٠٤،٤٠٥، وكنز العمال رقم الحديث:٢٨٨٩٩، كتاب العلم، الباب الاول فی الترغيب فيه۔

[2] تفسير المظهری ج:٦ ص:٤٠٨

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ

اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم جس کی سند نہیں اس کے پاس سو اس کا حساب ہے اس کے ربّ کے نزدیک،

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ

بیشک بھلا نہ ہوگا منکروں کا اور تو کہہ اے ربّ معاف کر اور رحم کر اور تو ہے

خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

بہتر سب رحم والوں سے

آسان ترجمۂ قرآن

غرض بہت اُونچی شان ہے اللہ کی جو صحیح معنی میں بادشاہ ہے! اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عزت والے عرش کا مالک ہے۔ ﴿۱۱۶﴾ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور خدا کو پکارے، جس پر اُس کے پاس کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں، تو اُس کا حساب اُس کے پروردگار کے پاس ہے۔ یقین جانو کہ کافر لوگ فلاح نہیں پاسکتے۔ ﴿۱۱۷﴾ اور تم (اے پیغمبر!) یہ کہو کہ: ”میرے پروردگار! ہماری خطائیں بخش دے، اور رحم فرمادے، تو سارے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔“ ﴿۱۱۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور یہ سب مضامین جب معلوم ہو چکے) سو (اس سے یہ کامل طور پر ثابت ہو گیا کہ) اللہ تعالیٰ بہت ہی عالیشان ہے جو کہ بادشاہ (ہے اور بادشاہ بھی) حقیقی ہے اس کے سوا کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں (اور وہ) عرشِ عظیم کا مالک ہے اور جو شخص (اس امر پر دلائل قائم ہونے کے بعد) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی بھی عبادت کرے کہ جس (کے معبود ہونے) پر اس کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں سو اس کا حساب اس کے ربّ کے یہاں ہوگا (جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ) یقیناً کافروں کو فلاح نہ ہوگی (بلکہ ابدالآباد معذّب رہیں گے) اور (جب حق تعالیٰ کی یہ شان ہے تو) آپ (اور دوسرے لوگ بدرجۂ اولیٰ) یوں کہا کریں کہ اے میرے ربّ (میری خطائیں) معاف کر اور (ہر حالت میں مجھ پر) رحم کر (معاش میں

بھی، توفیق طاعات میں بھی، نجاتِ آخرت میں بھی، عطائے جنت میں بھی) اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ مؤمنون کی آخری آیتیں اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ سے آخر سورت تک خاص فضیلت رکھتی ہیں۔ بغوی اور ثعلبی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ اُن کا گزر ایک ایسے بیمار پر ہوا جو سخت امراض میں مبتلا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کے کان میں سورۂ مؤمنون کی یہ آیتیں اَفَحَسِبْتُمْ سے آخر تک پڑھ دیں وہ اُسی وقت اچھا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ نے اس کے کان میں کیا پڑھا؟ عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کیا کہ یہ آیتیں پڑھیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر کوئی آدمی جو یقین رکھنے والا ہو یہ آیتیں پہاڑ پر پڑھ دے تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے۔ (قرطبی و مظہری) [۱]

رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ یہاں اغفر اور ارحم دونوں کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا کہ کیا معاف کریں اور کس چیز پر رحم کریں اِس سے اشارہ عموم کی طرف ہے کہ دُعائے مغفرت شامل ہے ہر مضر اور تکلیف دہ چیز کے ازالہ کو اور دُعائے رحمت شامل ہے ہر مراد اور محبوب چیز کے حاصل ہونے کو۔ کیونکہ دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت جو انسانی زندگی اور اُس کے مقاصد کا خلاصہ ہیں دونوں اس میں شامل ہو گئے (مظہری) [۲] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُعائے مغفرت و رحمت کی تلقین باوجودیکہ آپ معصوم اور مرحوم ہی ہیں دراصل اُمت کو سکھانے کے لئے ہے کہ تمہیں اس دُعا کا کتنا اہتمام کرنا چاہئے۔ (قرطبی) [۳]

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ سورۂ مؤمنون کی ابتدا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ سے ہوئی تھی اور انتہا اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ پر کی گئی، جس سے معلوم ہوا کہ فلاح یعنی مکمل کامیابی مؤمنین ہی کا حصہ ہے کفار اس سے محروم ہیں۔

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ فِيْ ثَمَانِيَةِ اَيَّامٍ مِنْ اَوَّلِ الْمُحَرَّمِ ۱۳۹۱ھ وَذٰلِكَ فِيْ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ وَاِيَّاهُ اَسْاَلُ التَّوْفِيْقَ لِاِتْمَامِ الْبَاقِيْ كَمَا يُحِبُّ وَيَرْضَاهُ وَاَنْ يَّتَقَبَّلَ مِنِّيْ وَيَجْعَلَهٗ ذُخْرًا لِاٰخِرَتِيْ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ۔

---

[۱] تفسير القرطبي ج:۱۲ ص:۱۵۷، ومجمع الزوائد رقم الحديث: ۸۴۶۹

[۲] تفسير المظهري ج:۶ ص:۴۱۲

[۳] تفسير القرطبي ج:۱۲ ص:۱۵۷

سُوْرَةُ النُّوْرِ

اٰیاتها ۶۴ ۲۴ سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۲ رکوعاتها ۹

سورۂ نور مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چونسٹھ آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ

یہ ایک سورت ہے کہ ہم نے اُتاری اور ذمہ پر لازم کی اور اُتاری اس میں باتیں صاف

لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا

تاکہ تم یاد رکھو، بدکاری کرنے والی عورت اور مرد سو مارو ہر ایک کو دونوں میں سے

مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

سو سو دُرّے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں اگر تم یقین رکھتے ہو

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

اللہ پر اور پچھلے دن پر اور دیکھیں اُن کا مارنا کچھ لوگ مسلمان

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

یہ ایک سورت ہے جو ہم نے نازل کی ہے، اور جس (کے اَحکام) کو ہم نے فرض کیا ہے، اور اُس میں کھلی کھلی آیتیں نازل کی ہیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ ﴿۱﴾ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ، اور اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر اِیمان رکھتے ہو، تو اللہ کے دِین کے معاملے میں اُن پر ترس کھانے کا کوئی جذبہ تم پر غالب نہ آئے۔ اور یہ بھی چاہئے کہ مؤمنوں کا ایک مجمع اُن کی سزا کو کھلی آنکھوں دیکھے۔ ﴿۲﴾

سورۂ نور کی بعض خصوصیات

اس سورت میں زیادہ تر احکام عفّت کی حفاظت اور ستر وحجاب کے متعلق ہیں اور اُسی کی تکمیل کے لئے حدِّ زنا کا بیان آیا۔ پچھلی سورت یعنی مؤمنون میں مسلمانوں کی فلاح دُنیا وآخرت کو جن اَوصاف پر موقوف رکھا گیا ہے اُن میں ایک اہم وصف شرمگاہوں کی حفاظت تھی جو خلاصہ ہے ابوابِ عفّت کا۔ اس سورت میں عفت کے اہتمام کے لئے متعلقہ احکام ذکر کئے گئے ہیں، اسی لئے عورتوں کو اس سورت کی تعلیم کی خصوصی ہدایات آئی ہیں۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اہلِ کوفہ کے نام اپنے ایک فرمان میں تحریر فرمایا عَلِّمُوْا نِسَآئَكُمْ سُوْرَةَ النُّوْرِ، یعنی اپنی عورتوں کو سورۂ نور کی تعلیم دو۔ [1]

خود اس سورت کی تمہید جن الفاظ سے کی گئی ہے کہ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا، یہ بھی اس سورت کے خاص اہتمام کی طرف اشارہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

یہ ایک سورت ہے جس (کے الفاظ) کو (بھی) ہم (ہی) نے نازل کیا ہے اور اس (کے معانی یعنی احکام) کو (بھی) ہم (ہی) نے مقرر کیا ہے (خواہ وہ فرض وواجب ہوں یا مندوب ومستحب) اور ہم نے (ان احکام پر دلالت کرنے

[1] تفسير القرطبي ج:۱۲ ص:۱۵۸، وشعب الإيمان، رقم الحديث:۲۴۲۸

کے لئے) اس (سورت) میں صاف صاف آیتیں نازل کی ہیں تا کہ تم سمجھو (اور عمل کرو) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد (دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کے سَو سَو دُرّے مارو اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہئے (کہ رحم کھا کر چھوڑ دو یا سزا میں کمی کر دو) اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے (تا کہ اُن کی رُسوائی ہو اور دیکھنے سننے والوں کو عبرت ہو)۔

معارف و مسائل

اس سورت کی پہلی آیت تو بطور تمہید کے ہے جس سے اس کے احکام کا خاص اہتمام بیان کرنا مقصود ہے اور احکام میں سب سے پہلے زنا کی سزا کا ذکر جو مقصود سورت، عفت اور اُس کے لئے نگاہوں تک کی حفاظت، بغیر اجازت کسی کے گھر میں جانے اور نظر کرنے کی ممانعت کے احکام آگے آنے والے ہیں زنا کا ارتکاب ان تمام احتیاطوں کو توڑ کر عفت کے خلاف انتہائی حد پر پہنچنا اور احکامِ الٰہیہ کی کھلی بغاوت ہے۔ اسی لئے اسلام میں انسانی جرائم پر جو سزائیں (حدود) قرآن میں متعین کر دی گئی ہیں زنا کی سزا بھی ان تمام جرائم کی سزا سے اشد اور زیادہ ہے زنا خود ایک بہت بڑا جرم ہونے کے علاوہ اپنے ساتھ سیکڑوں جرائم لے کر آتا ہے اور اُس کے نتائج پوری انسانیت کی تباہی ہے۔ دُنیا میں جتنے قتل و غارتگری کے واقعات پیش آتے ہیں تحقیق کی جائے تو ان میں بیشتر کا سبب کوئی عورت اور اُس سے حرام تعلق ہوتا ہے اس لئے شروع سورت میں اس انتہائی جرم و بے حیائی کا قلع قمع کرنے کے لئے اس کی حدِ شرعی بتلائی گئی ہے۔

زنا ایک جُرمِ عظیم اور بہت سے جرائم کا مجموعہ ہے اس لئے اسلام میں اُس کی سزا بھی سب سے بڑی رکھی گئی ہے

قرآنِ کریم اور احادیثِ متواترہ نے چار جرائم کی سزا اور اُس کا طریقہ خود متعین کر دیا ہے کسی قاضی یا امیر کی رائے پر نہیں چھوڑا، انہیں متعینہ سزاؤں کو اصطلاحِ شرع میں حدود کہا جاتا ہے اُن کے علاوہ باقی جرائم کی سزا کو اس طرح متعین نہیں کیا گیا بلکہ امیر یا قاضی، مجرم کی حالت اور جرم کی حیثیت اور ماحول وغیرہ کے مجموعہ پر نظر کر کے جس قدر سزا دینے کو انسدادِ جرم کے لئے کافی سمجھے وہ سزا دے سکتا ہے، ایسی سزاؤں کو شریعت کی اصطلاح میں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ حدود شرعیہ پانچ ہیں: چوری[۱]، ڈاکہ[۲]، کسی[۳] پاکدامن عورت پر تہمت رکھنا، شراب[۴] پینا اور زنا کرنا[۵] [1]، ان میں سے ہر جرم اپنی جگہ بڑا

---

[1] ارتداد کی سزا کو ملا کر اکثر فقہاء نے حدود کی تعداد چھ بیان کی ہے۔ محمد تقی عثمانی ۳۰ رجب ۱۴۲۷ھ

سخت اور دُنیا کے امن وامان کو برباد کرنے والا اور بہت سی خرابیوں کا مجموعہ ہے لیکن ان سب میں بھی زنا کے عواقب اور نتائجِ بد جیسے دُنیا کے نظامِ انسانیت کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں وہ شاید کسی دوسرے جُرم میں نہیں۔

۱-کسی شخص کی بیٹی، بہن، بیوی پر ہاتھ ڈالنا اُس کی ہلاکت کا مرادف ہے۔ شریف انسان کو سارا مال وجائیداد اور اپنا سب کچھ قربان کر دینا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے حرم کی عفت پر ہاتھ ڈالنا۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں روزمرہ یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن لوگوں کے حرم پر ہاتھ ڈالا گیا ہے وہ اپنی جان کی پروا کئے بغیر زانی کے قتل وفنا کے درپے ہوتے ہیں اور یہ جوشِ انتقام نسلوں میں چلتا ہے اور خاندانوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

۲-جس قوم میں زنا عام ہوجائے وہاں کسی کا نسب محفوظ نہیں رہتا۔ ماں بہن بیٹی وغیرہ جن سے نکاح حرام ہے جب یہ رشتے بھی غائب ہوگئے تو اپنی بیٹی اور بہن بھی نکاح میں آسکتی ہے جو زنا سے بھی زیادہ اشد جُرم ہے۔

۳-غور کیا جائے تو دُنیا میں جہاں کہیں بدامنی اور فتنہ وفساد ہوتا ہے اس کا بیشتر سبب عورت اور اُس سے کم مال ہوتا ہے۔ جو قانون عورت اور دولت کی حفاظت صحیح انداز میں کر سکے ان کو اُن کے مقررہ حدود سے باہر نہ نکلنے دے وہی قانون امنِ عالم کا ضامن ہوسکتا ہے۔ یہ جگہ زنا کے تمام مفاسد اور خرابیاں جمع کرنے اور تفصیل سے بیان کرنے کی نہیں۔ انسانی معاشرہ کے لئے اُس کی تباہ کاری کے معلوم ہونے کے لئے اتنا بھی کافی ہے اِسی لئے اسلام نے زنا کی سزا کو دوسرے سارے جرائم کی سزاؤں سے اشد قرار دیا ہے۔ وہ سزا آیتِ مذکورہ میں اس طرح بیان کی گئی ہے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ اس میں عورت زانیہ کا ذکر پہلے اور مرد زانی کا بعد میں لایا گیا ہے سزا دونوں کی ایک ہی ہے عام قیاس بیان احکام کا یہ ہے کہ اکثر تو صرف مردوں کو مخاطب کر کے حکم دیدیا جاتا ہے عورتیں بھی اس میں ضمناً شامل ہوتی ہیں اُن کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ سارے قرآن میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے صیغۂ مذکور سے جو احکام بیان کئے گئے ہیں عورتیں بھی اُس میں بغیر ذکر شامل قرار دی گئی ہیں۔ شاید حکمت اس کی یہ ہے کہ جس طرح اللّٰہ تعالیٰ نے عورتوں کو مستور رہنے کا حکم دیا ہے اُن کے ذکر کو بھی ذکرِ رجال کے ضمن میں مستور کر کے بیان کیا گیا ہے اور چونکہ اس طرز سے یہ احتمال تھا کہ کسی کو یہ شبہ ہوجائے کہ یہ سب احکام مَردوں ہی کے لئے ہیں عورتیں ان سے سبکدوش ہیں اِس لئے خاص خاص آیات میں مستقلاً عورتوں کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے: وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ [۱] (الاحزاب: ۳۳) اور جہاں مرد وعورت دونوں ہی کا ذکر کرنا ہوتا ہے تو ترتیب طبعی یہ ہوتی ہے کہ مرد کا ذکر مقدم عورت کا بعد میں ہوتا ہے۔ چوری کی سزا میں اسی ضابطہ عرفیہ کے مطابق وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا [۲] (المائدة: ۳۸) فرمایا ہے جس میں مرد چور کو مقدم اور

[۱] ترجمہ: اور تم نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو۔

[۲] ترجمہ: اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

عورت کو مؤخر ذکر کیا ہے مگر سزائے زنا میں اوّل تو عورت کے ذکر کے ضمنی آجانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ صراحۃً ذکر مناسب سمجھا گیا دوسرے عورت کا ذکر مرد پر مقدم کر کے بیان کیا گیا۔ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں اوّل تو عورت ضعیف الخلقۃ اور طبعی طور پر قابلِ رحم سمجھی جاتی ہے اگر اس کا صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو کسی کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید عورت اس سزا سے مستثنیٰ ہے۔ اور عورت کا ذکر مقدم اس لئے کیا گیا کہ فعل زنا ایک ایسی بے حیائی ہے جس کا صدور عورت کی طرف سے ہونا انتہائی بیباکی اور بے پروائی سے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ قدرت نے اس کے مزاج میں فطری طور پر ایک حیاء اور اپنی عفت کی حفاظت کا جذبہ قویہ ودیعت فرمایا ہے اور اُس کی حفاظت کے لئے بڑے سامان جمع فرمائے ہیں۔ اُس کی طرف سے اس فعل کا صدور بہ نسبت مرد کے زیادہ اشد ہے بخلاف چور کے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے کسب اور کمائی کی قوت دی ہے۔ اپنی ضروریات اپنے عمل سے حاصل کرنے کے مواقع اس کے لئے فراہم کئے ہیں نہ یہ کہ اُن کو چھوڑ کر چوری کرنے پر اُتر آئے، یہ مرد کے لئے بڑا عار اور عیب ہے۔ عورت کے چونکہ یہ حالات نہیں ہیں اگر اُس سے چوری کا صدور ہو جائے تو مرد کی نسبت سے اہون اور کم درجہ ہے۔

فَاجْلِدُوْا لفظ جَلْد کوڑا مارنے کے معنے میں آتا ہے وہ جِلْد سے مشتق ہے کیونکہ کوڑا عموماً چمڑے سے بنایا جاتا ہے۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ لفظ جَلْد سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کوڑوں یا دُرّوں کی ضرب اس حد تک رہنی چاہئے کہ اس کا اثر انسان کی کھال تک رہے گوشت تک نہ پہنچے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوڑے لگانے کی سزا میں اسی توسّط واعتدال کی تلقین عملاً فرمائی ہے کہ کوڑا نہ بہت سخت ہو جس سے گوشت تک اُدھڑ جائے اور نہ بہت نرم ہو کہ اُس سے کوئی خاص تکلیف ہی نہ پہنچے۔ اس جگہ اکثر حضرات مفسرین نے یہ روایاتِ حدیث سند اور الفاظ کے ساتھ لکھ دی ہیں۔ [1]

سو کوڑوں کی مذکورہ سزا صرف غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے مخصوص ہے شادی شدہ لوگوں کی سزا سنگساری ہے

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زنا کی سزا کے احکام بتدریج آئے ہیں اور خفّت سے شدت کی طرف بڑھتے گئے ہیں جیسے شراب کی حرمت میں بھی اسی طرح کی تدریج خود قرآن میں مذکور ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے زنا کی سزا کا سب سے پہلا حکم تو وہ تھا جو سورۂ نساء کی آیات نمبر ۱۵، ۱۶ میں مذکور ہے وہ یہ ہے:

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: موطا مالك، كتاب الحدود، باب ما جاء فيمن اعترف على نفسه بالزنا، رقم الحديث: ۳۰۴۸، والسنن الكبرىٰ للبيهقي، رقم الحديث: ۱۸۰۲۹

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾ (سورۂ نساء)

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ اُن پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دیویں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اُٹھا لے ان کو موت یا مقرر کر دے اللہ تعالیٰ اُن کے لئے کوئی راہ۔ اور جو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو اُن کو ایذا دو پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کا خیال چھوڑ دو۔ بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اِن دونوں آیتوں کی مکمل تفسیر اور ضروری بیان سورۂ نساء میں آچکا ہے۔ یہاں اس لئے اس کا اعادہ کیا گیا ہے کہ زنا کی سزا کا ابتدائی دَور سامنے آجائے۔ اِن آیتوں میں ایک تو ثبوتِ زنا کا خاص طریقہ چار مَردوں کی شہادت کے ساتھ ہونا بیان فرمایا ہے۔ دوسرے زنا کی سزا عورت کے لئے گھر میں قید رکھنا اور دونوں کے لئے ایذا پہنچانا مذکور ہے اور ساتھ اس میں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ سزائے زنا کا یہ حکم آخری نہیں آئندہ اور کچھ حکم آنے والا ہے اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ (النساء) کا یہی مفہوم ہے۔

مذکورہ سزا میں عورتوں کو گھر میں قید رکھنا اُس وقت کافی قرار دیا گیا اور دونوں کو ایذا دینے کی سزا کافی قرار دی گئی مگر اس ایذا اور تکلیف کی کوئی خاص صورت خاص مقدار اور حد بیان نہیں فرمائی ہے بلکہ الفاظِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی ابتدائی سزا صرف تعزیری تھی جس کی مقدار شریعت سے متعین نہیں ہوئی بلکہ قاضی یا امیر کی صوابدید پر موقوف تھی اِس لئے ایذا دینے کا مبہم لفظ اختیار فرمایا گیا مگر ساتھ ہی اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ (النساء) فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ ان مجرموں کے لئے سزا کا کوئی اور طریقہ جاری کیا جائے۔ جب سورۂ نور کی آیت مذکورہ نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ سورۂ نساء میں جو عدہ کیا گیا تھا اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ (النساء) یعنی یہ کہ "یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور سبیل بتادے۔" تو سورۂ نور کی اس آیت نے وہ سبیل بتلا دی یعنی سو کوڑے مارنے کی سزا عورت مرد دونوں کے لئے متعین فرما دی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت ابن عباس نے سو کوڑے مارنے کی سزا کو غیر شادی شدہ مرد عورت کے لئے مخصوص قرار دے کر فرمایا:

[1] يَعْنِيْ اَلرَّجْمُ لِلثَّيِّبِ وَالْجَلْدُ لِلْبِكْرِ۔ (صحيح بخاری، كتاب التفسير ص:٦٥٧)

یعنی وہ سبیل اور سزائے زنا کی تعیین یہ ہے کہ شادہ شدہ مرد عورت سے یہ گناہ سرزد ہو تو اُن کو سنگسار

[1] صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب سورة النساء، ج:٢ ص:٦٥٧

کر کے ختم کیا جائے اور غیر شادی شدہ کے سو کوڑے مارنا سزا ہے۔

ظاہر ہے کہ سورۂ نور کی مذکورہ آیت میں تو بغیر کسی تفصیل کے سزائے زنا سو کوڑے ہونا مذکور ہے۔ اس حکم کا غیر شادی شدہ مرد و عورت کے ساتھ مخصوص ہونا اور شادی شدہ کے لئے رجم یعنی سنگساری کی سزا ہونا اُن کو کسی دوسری دلیل حدیث سے معلوم ہوا ہوگا اور وہ حدیث صحیح مسلم، مسند احمد، سنن نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی روایت سے اس طرح آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

خُذُوْا عَنِّیْ خُذُوْا عَنِّیْ قَدْ جَعَلَ اللهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ وَالثَّيِّبُ بَالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ۔(ابن کثیر)

مجھ سے علم حاصل کرلو مجھ سے علم حاصل کرلو کہ اللہ تعالیٰ نے زانی مرد و عورت کے لئے وہ سبیل جس کا وعدہ سورۂ نساء کی آیات میں ہوا تھا اب سورۂ نور میں فرمادی ہے وہ یہ ہے کہ غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سو کوڑے اور سال بھر جلاوطنی اور شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سو کوڑے اور سنگساری۔ [1]

غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزا سو کوڑے جو آیتِ نور میں مذکور ہے اس حدیث میں اُس کے ساتھ ایک مزید سزا کا ذکر ہے کہ مرد کو سال بھر کے لئے جلاوطن بھی کردیا جائے۔ اس میں فقہاءؒ کا اختلاف ہے کہ یہ سال بھر کی جلاوطنی کی سزا مرد زانی کو سو کوڑوں کی طرح لازمی ہے یا قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ ضرورت سمجھے تو سال بھر کے لئے جلاوطن بھی کردے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہی آخری صورت صحیح ہے یعنی حاکم کی رائے پر موقوف ہے۔ دوسری بات اس حدیث میں یہ ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سنگساری سے پہلے سو کوڑوں کی سزا بھی ہے مگر دوسری روایاتِ حدیث اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر خلفائے راشدینؓ کے تعامل سے ثابت یہ ہے کہ یہ دونوں سزائیں جمع نہیں ہوں گی۔ شادی شدہ پر صرف سزائے سنگساری جاری کی جائے گی۔ اس حدیث میں خاص طور پر یہ بات قابلِ نظر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اَوْ يَجْعَلَ اللهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ (النساء) کی تفسیر فرمائی ہے۔ اور تفسیر میں جو بات سورۂ نور کی آیت میں مذکور ہے یعنی سو کوڑے لگانا۔ اس پر کچھ مزید چیزوں کا اضافہ بھی ہے اوّل سو کوڑے کی سزا کا غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے مخصوص ہونا، دوسرے سال بھر کی جلاوطنی کا اضافہ تیسرے شادی شدہ مرد و عورت کے لئے رجم و سنگساری کا حکم۔ ظاہر ہے کہ اس میں سورۂ نور کی آیت پر جن چیزوں کی زیادتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ بھی وحی الٰہی اور حکم ربّانی ہی سے تھی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ [2] (النجم: ۴)، اور پیغمبر اور اُن سے براہ راست سننے والوں کے حق میں وہ وحی

[1] صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا ج:۲ ص:۶۵، وسنن ابن ماجة، کتاب الحدود، باب حد الزنا، ومسند احمد، حديث عبادة بن الصامت رضي الله عنه رقم الحديث: ۲۲۳۳۴

[2] ترجمہ: ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

جو بصورت قرآن تلاوت کی جاتی ہے اور وہ وحی جس کی تلاوت نہیں ہوتی دونوں برابر ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے مجمع عام کے سامنے اس پر عمل فرمایا۔ ماعز اور غامدیہ پر سزائے رجم وسنگساری جاری فرمائی۔ جو تمام کتب حدیث میں اسانید صحیحہ کے ساتھ مذکور ہے اور حضرت ابوہریرہؓ اور زید بن خالد جہنیؓ کی روایت صحیحین میں ہے کہ ایک غیر شادی شدہ مرد نے جو ایک شادہ شدہ عورت کا ملازم تھا اس کے ساتھ زنا کیا۔ زانی لڑکے کا باپ اس کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واقعہ اقرار سے ثابت ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَاَقْضِیَنَّ بَیْنَکُمَا بِکِتَابِ اللہِ، یعنی میں تم دونوں کے معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ پھر یہ حکم صادر فرمایا کہ زانی لڑکا جو غیر شادی شدہ تھا اس کو سو کوڑے لگائے جائیں اور عورت، شادی شدہ تھی اُس کو رجم وسنگسار کرنے کے لئے حضرت اُنیسؓ کو حکم فرمایا۔ اُنہوں نے خود عورت سے بیان لیا اُس نے اعتراف کرلیا تو اس پر بحکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رجم وسنگساری کی سزا جاری ہوئی۔ (ابن کثیر) [۱]

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو سو کوڑے لگانے کی دوسرے کو سنگسار کرنے کی سزا دی اور دونوں سزاؤں کو قضاء بکتاب اللہ فرمایا، حالانکہ آیت سورۂ نور میں صرف کوڑوں کی سزا کا ذکر ہے، سنگساری کی سزا مذکور نہیں۔ وجہ وہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اس آیت کی مکمل تفسیر وتشریح اور تفصیلی حکم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا تھا وہ سارا کتاب اللہ ہی کے حکم میں ہے گو اس میں سے بعض حصہ کتاب اللہ میں مذکور اور متلو نہیں۔ صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کتب حدیث میں حضرت فاروق اعظمؓ کا خطبہ بروایت ابن عباسؓ مذکور ہے صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں:-

قَالَ عُمَرُ بْنُ خَطَّابٍؓ وَهُوَ جَالِسٌ عَلٰی مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللهُ عَلَيْهِ اٰيَةُ الرَّجْمِ قَرَاْنَاهَا وَعَيَّنَّاهَا وَعَقَلْنَاهَا فَرَجَمَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ فَاَخْشٰى اَنْ طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ اَنْ يَّقُوْلَ قَائِلٌ مَا نَجِدُ الرَّجْمَ فِيْ كِتَابِ اللهِ تَعَالٰى فَيَضِلُّوْا بِتَرْكِهٖ فَرِيْضَةً اَنْزَلَهَا اللهُ وَاَنَّ الرَّجْمَ فِيْ كِتَابِ اللهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنَا اِذَا اَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ اِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ اَوْ كَانَ الْحَبَلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ۔ (مسلم ج:۲ ص:۶۵) [۲]

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر کتاب نازل فرمائی تو جو کچھ کتاب اللہ

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب المحاربين، باب الإعتراف بالزنا ج:۲ ص:۱۰۰۸، ۱۰۰۹، وصحيح مسلم، كتاب الحدود، باب حد الزنا ج:۲ ص:۶۹

[۲] صحيح مسلم، كتاب الحدود، باب حد الزنا ج:۲ ص:۶۵

میں آپ پر نازل ہوا اُس میں آیتِ رجم بھی ہے جس کو ہم نے پڑھا، یاد کیا اور سمجھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا اور ہم نے آپ کے بعد رجم کیا، اب مجھے یہ خطرہ ہے کہ زمانہ گزرنے پر کوئی یوں نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں پاتے تو وہ ایک دینی فریضہ چھوڑ دینے سے گمراہ ہو جائیں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور سمجھ لو کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں حق ہے اُس شخص پر جو مردوں اور عورتوں میں سے محصن ہو یعنی شادی شدہ جبکہ اس کے زنا پر شرعی شہادت قائم ہو جائے یا حمل اور اعتراف پایا جائے۔

یہ روایت صحیح بخاری میں بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے (بخاری ج:۲ ص:۱۰۰۹) اور نسائی میں اس روایت کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

اِنَّا لَا نَجِدُ مِنَ الرَّجْمِ بُدًّا فَاِنَّهٗ حَدٌّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ اَلَا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ رَجَمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ وَلَوْ لَا اَنْ يَّقُوْلَ قَائِلُوْنَ اِنَّ عُمَرَ زَادَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا لَيْسَ فِيْهِ لَكَتَبْتُ فِيْ نَاحِيَةِ الْمُصْحَفِ وَشَهِدَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَفُلَانٌ وَفُلَانٌ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجَمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ اَلْحَدِيْثَ۔(ابن کثیر) [۱]

زنا کی سزا میں ہم شرعی حیثیت سے رجم کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے خوب سمجھ لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رجم کیا اور ہم نے آپ کے بعد بھی رجم کیا۔ اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ کہنے والے کہیں گے کہ عمر نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا تو میں قرآن کے کسی گوشہ میں بھی اس کو لکھ دیتا۔ اور عمر بن خطاب گواہ ہے عبدالرحمٰن بن عوف گواہ ہیں اور فلاں فلاں صحابہ گواہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے رجم کیا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس خطبہ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکم رجم کی کوئی مستقل آیت ہے جو سورۂ نور کی آیتِ مذکورہ کے علاوہ ہے مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے اُس آیت کے الفاظ نہیں بتلائے کہ کیا تھے۔ اور نہ یہ فرمایا کہ اگر وہ اس آیتِ نور کے علاوہ کوئی مستقل آیت ہے تو قرآن میں کیوں نہیں اور کیوں اس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ صرف اتنا فرمایا کہ اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ مجھ پر کتاب اللہ میں زیادتی کا الزام لگائیں گے تو میں اس آیت کو قرآن کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔ (کما رواہ النسائی) [۲]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:٦، ومسند احمد تحت رقم الحديث:١٥٨

[۲] مسند احمد، مسند عمر بن الخطاب رضي الله عنه رقم الحديث:١٥٦، كنز العمال رقم الحديث:١٣٥١٣

اس روایت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر وہ واقعی قرآن کی کوئی آیت ہے اور دوسری آیات کی طرح اُس کی تلاوت واجب ہے تو فاروق اعظمؓ نے لوگوں کی بدگوئی کے خوف سے اُس کو کیسے چھوڑ دیا جبکہ اُن کی شدّت فی امراللہ معروف ومشہور ہے اور یہ بھی قابلِ غور ہے کہ خود حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں داخل کردیتا بلکہ ارشاد یہ فرمایا کہ میں اس کو قرآن کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔

یہ سب اُمور اس کے قرائن ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے سورۂ نور کی آیتِ مذکورہ کی جو تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی جس میں آپ نے سو کوڑے لگانے کے حکم کو غیر شادی شدہ مرد وعورت کے ساتھ مخصوص فرمایا اور شادی شدہ کے لئے رجم کا حکم دیا۔ اس مجموعی تفسیر کو اور پھر اُس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل کو کتاب اللہ اور آیتِ کتاب اللہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا اس معنی میں کہ آپ کی یہ تفسیر وتفصیل بحکمِ کتاب اللہ ہے وہ کوئی مستقل آیت نہیں۔ ورنہ حضرت فاروق اعظمؓ کو کوئی طاقت اس سے نہ روک سکتی کہ قرآن کی جو آیت رہ گئی ہے اس کو اس کی جگہ لکھ دیں۔ حاشیہ پر لکھنے کا جو ارادہ ظاہر فرمایا وہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ درحقیقت وہ کوئی مستقل آیت نہیں بلکہ آیت سورۂ نور ہی کی تشریح میں کچھ تفصیلات ہیں۔ اور بعض روایات میں جو اس جگہ ایک مستقل آیت کے الفاظ مذکور ہیں وہ اسناد وثبوت کے اعتبار سے اس درجہ میں نہیں کہ اُس کی بنا پر قرآن میں اس کا اضافہ کیا جا سکے۔ حضرات فقہاء نے جو اس کو منسوخ التلاوۃ غیر منسوخ الحکم کی مثال میں پیش کیا ہے وہ مثال ہی کی حیثیت میں ہے اُس سے درحقیقت اس کا آیت قرآن ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورۂ نور کی آیت مذکورہ میں جو زانیہ اور زانی کی سزا سو کوڑے لگانا مذکور ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل تشریح وتصریح کی بنا پر غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے مخصوص ہے اور شادی شدہ کی سزا رجم ہے۔ یہ تفصیل اگرچہ الفاظ آیت میں مذکور نہیں مگر جس ذاتِ اقدس پر یہ آیت نازل ہوئی خود اُن کی طرف سے ناقابلِ التباس وضاحت کے ساتھ یہ تفصیل مذکور ہے اور صرف زبانی تعلیم وارشاد ہی نہیں بلکہ متعدد بار اس تفصیل پر عمل بھی صحابۂ کرام کے مجمع کے سامنے ثابت ہے اور یہ ثبوت ہم تک تواتر کے ذریعہ پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے شادی شدہ مرد وعورت پر سزائے رجم کا حکم درحقیقت کتاب اللہ ہی کا حکم اور اُسی کی طرح قطعی اور یقینی ہے۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سزائے رجم کتاب اللہ کا حکم ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سزائے رجم سُنّتِ متواترہ سے قطعی الثبوت ہے جیسا کہ حضرت علیؓ سے یہی الفاظ منقول ہیں کہ رجم کا حکم سُنّت سے ثابت ہے [1] اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

[1] مسند احمد، مسند علي بن ابي طالب رضي الله عنه، رقم الحديث:۷۱۶، ومصنف عبدالرزاق، رقم الحديث:۱۳۳۵۶

ایک ضروری تنبیہ

اس مقام پر جہاں جہاں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے الفاظ احقر نے لکھے ہیں ان الفاظ کو ایک آسان تعبیر کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ اصلی الفاظ مُحْصَنْ اور غَیْرُ مُحْصَنْ، یا ثَیِّب اور بِکْر کے حدیث میں آئے ہیں۔ اور محصن کی شرعی تعریف اصل میں یہ ہے کہ جس شخص نے نکاح صحیح کے ساتھ اپنی زوجہ سے مباشرت کرلی ہو اور وہ عاقل بھی ہو۔ مراد احکام میں سب جگہ یہی مفہوم ہے تعبیر کی سہولت کے لئے شادی شدہ کا لفظ لکھا جاتا ہے۔

سزائے زنا میں تدریج کے تین درجے

مذکورہ بالا روایاتِ حدیث اور آیاتِ قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً زنا کی سزا ہلکی رکھی گئی کہ قاضی یا امیر اپنی صوابدید پر اس جُرم کے مرتکب مرد و عورت کو ایذا پہنچائے، اور عورت کو گھر میں مقیّد رکھا جائے، جیسا کہ سورۂ نساء میں اس کا حکم آیا ہے۔ دوسرا دَور وہ ہے جس کا حکم سورۂ نور کی اس آیت میں آیا ہے کہ دونوں کو سوسو کوڑے لگائے جاویں۔ تیسرا درجہ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ مذکورہ نازل ہونے کے بعد ارشاد فرمایا کہ سو کوڑوں کی سزا پر اُن لوگوں کے لئے اکتفا کیا جائے جو شادی شدہ نہ ہوں اور شادی شدہ مرد و عورت اس کے مرتکب ہوں تو ان کی سزا رجم و سنگساری ہے۔

اسلامی قانون میں جس جرم کی سزا سخت ہے اس کے ثبوت کے لئے شرائط بھی سخت رکھی گئی ہیں

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ زنا کی سزا اسلام میں سب جرائم کی سزاؤں سے زیادہ سخت ہے۔ اس کے ساتھ اسلامی قانون میں اُس کے ثبوت کے لئے شرائط بھی بہت سخت رکھی گئی ہیں جن میں ذرا بھی کمی رہے یا شبہ پیدا ہو جائے تو زنا کی انتہائی سزا جس کو حد کہا جاتا ہے وہ معاف ہو جاتی ہے صرف تعزیری سزا بقدرِ جُرم باقی رہ جاتی ہے۔ تمام معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ثبوت کے لئے کافی ہو جاتی ہے مگر حدِّ زنا جاری کرنے کے لئے چار مرد گواہوں کی عینی شہادت جس میں کوئی التباس نہ ہو شرطِ ضروری ہے جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت میں گزر چکا ہے۔ دوسری احتیاط اور شدّت اِس شہادت میں یہ ہے کہ اگر شہادت زنا کی کوئی شرط مفقود ہونے کی بنا پر شہادت رَد کی گئی تو پھر شہادت دینے والوں کی خیر نہیں۔ اُن پر قذف یعنی زنا کی جھوٹی تہمت کا جرم قائم ہو کر حدِّ قذف اَسّی کوڑے لگائے جانے کی صورت میں جاری کی جاتی ہے۔ اس لئے ذرا سا شبہ ہونے کی صورت میں کوئی شخص اس کی شہادت پر اقدام نہیں کرسکتا۔ البتہ جس صورت میں

صریح زنا کا ثبوت نہ ہو مگر شہادت سے دو مرد و عورت کا غیر مشروع حالت میں دیکھنا ثابت ہو جائے تو قاضی اُن کے جرم کی حیثیت کے مطابق تعزیری سزا کوڑے لگانے وغیرہ کی جاری کر سکتا ہے۔ سزائے زنا اور اس کی شرائط وغیرہ کے مفصل احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں وہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

کسی مرد یا جانور کے ساتھ فعل قبیح کا حکم

یہ مسئلہ کہ مرد کسی مرد کے ساتھ یا جانور کے ساتھ یہ فعل کرے تو وہ زنا میں داخل ہے یا نہیں اور اُس کی سزا بھی سزائے زنا ہے یا کچھ اور؟ اس کی تفصیل سورۂ نساء کی تفسیر میں گزر چکی ہے کہ اگرچہ لُغت اور اصطلاح میں یہ فعل زِنا نہیں کہلاتا اور اسی لئے اس پر حدِ زِنا کا اطلاق نہیں ہوتا مگر اس کی سزا بھی اپنی سختی میں زنا کی سزا سے کم نہیں۔ صحابۂ کرام نے ایسے شخص کو زندہ جلا دینے کی سزا دی ہے۔ [1]

لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ، سزائے زنا چونکہ بہت سخت ہے اور اس کا احتمال ہے کہ سزا جاری کرنے والوں کو ان پر رحم آ جائے سزا کو چھوڑ بیٹھیں یا کم کر دیں اس لئے اُس کے ساتھ یہ حکم بھی دیا گیا کہ دین کے اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں مجرموں پر رحم اور ترس کھانا جائز نہیں۔ رافت و رحمت اور عفو و کرم ہر جگہ محمود ہے مگر مجرموں پر رحم کھانے کا نتیجہ ساری خلقِ خدا کے ساتھ بے رحمی ہے اس لئے ممنوع و ناجائز ہے۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ یعنی سزائے زِنا جاری کرنے کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے۔ اسلام میں سب سزاؤں اور خصوصاً حدود کو منظرِ عام پر جاری کر دینے کا طریقہ رائج ہے تا کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو مگر ایک جماعت کو اس میں حاضر و موجود رہنے کا حکم یہ بھی سزائے زنا کی خصوصیت ہے۔

اسلام میں ابتداً جرائم کی پردہ پوشی کا حکم ہے لیکن جب معاملہ شہادت سے ثابت ہو جائے تو پھر مجرموں کی پوری رُسوائی بھی عین حکمت قرار دی گئی ہے

فواحش اور بے حیائی کی روک تھام کے لئے شریعتِ اسلام نے دُور دُور تک پہرے بٹھائے ہیں عورتوں پر پردہ لازم کر دیا گیا، مردوں کو نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا۔ زیور کی آواز یا عورت کے گانے کی آواز کو ممنوع قرار دیا گیا کہ وہ بے حیائی کے لئے محرک ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جس شخص سے ان معاملات میں کوتاہی دیکھی جائے اس کو خلوت میں تو سمجھانے کا حکم ہے مگر اس کو رُسوا کرنے کی اجازت نہیں۔ لیکن جو شخص ان تمام شرعی احتیاطوں کو توڑ کر اس درجہ میں پہنچ گیا

[1] انظر للتفصيل: سنن البيهقي، كتاب الحدود، باب ما جاء في حد اللوطي، رقم الحديث: ١٧٤٨٤

کہ اس کا جرم شرعی شہادت سے ثابت ہو گیا تو اب اس کی پردہ پوشی دوسرے لوگوں کی جرأت بڑھانے کا موجب ہو سکتی ہے اس لئے اب تک جتنا اہتمام پردہ پوشی کا شریعت نے کیا تھا اب اتنا ہی اہتمام اس کی تفضیح اور رُسوائی کا کیا جاتا ہے اسی لئے زنا کی سزا کو صرف منظرِ عام پر جاری کرنے پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو اُس میں حاضر اور شریک رہنے کا حکم دیا گیا۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ

بدکار مرد نہیں نکاح کرتا مگر عورت بدکار سے یا شرک والی سے اور بدکار عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر بدکار مرد

اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۳

یا مشرک اور یہ حرام ہوا ہے ایمان والوں پر

آسان ترجمۂ قرآن

زانی مرد نکاح کرتا ہے تو زناکار یا مشرک عورت ہی سے نکاح کرتا ہے، اور زناکار عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہی مرد جو خود زانی ہو، یا مشرک ہو، اور یہ بات مؤمنوں کے لئے حرام کر دی گئی ہے۔ (۳)

خلاصۂ تفسیر

(زنا ایسی گندی چیز ہے کہ اس سے انسان کی طبیعت کا مزاج ہی بگڑ جاتا ہے اُس کی رغبت بُری ہی چیزوں کی طرف ہو جاتی ہے ایسے آدمی کی طرف رغبت بھی کسی ایسے ہی خبیث النفس کی ہو سکتی ہے جس کا اخلاقی مزاج بگڑ چکا ہو چنانچہ) زانی (اپنے زانی اور راغب الی الزنا ہونے کی حیثیت سے) نکاح بھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا بجز زانیہ یا مشرکہ عورت کے اور (اسی طرح) زانیہ کے ساتھ بھی (اُس کے زانیہ اور راغب الی الزنا ہونے کی حیثیت سے) اور کوئی نکاح نہیں کرتا بجز زانی یا مشرک کے اور یہ (ایسا نکاح جو زانیہ کے زانیہ ہونے کی حیثیت کے ساتھ ہو جس کا نتیجہ آئندہ بھی اس کا مبتلائے زنا رہنا ہے یا کسی مشرک عورت کے ساتھ ہو) مسلمانوں پر حرام (اور موجبِ گناہ) کیا گیا ہے (گو صحت و عدم صحت میں دونوں میں فرق ہو کہ زانیہ بحیثیت زانیہ سے کوئی نکاح کر ہی لے تو گناہ ہونے کے باوجود نکاح منعقد اور صحیح ہو جائے گا اور مشرکہ سے نکاح کیا تو ناجائز و گناہ ہونے کے علاوہ وہ نکاح ہی نہیں ہوگا بلکہ باطل ہوگا)۔

معارف و مسائل

زنا کے متعلق دوسرا حکم

پہلا حکم سزائے زنا کا تھا جو اس سے پہلی آیت میں بیان ہو چکا، یہ دوسرا حکم زانی اور زانیہ کے ساتھ نکاح کرنے سے متعلق ہے اِس کے ساتھ مشرک مرد یا مشرک عورت سے نکاح کا بھی حکم ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے اقوال بہت مختلف ہیں ان سب میں سہل اور اسلم تفسیر وہی معلوم ہوتی ہے جس کو خلاصۂ تفسیر میں بین القوسین کی وضاحتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آیت کا شروع حصّہ کوئی حکم شرعی نہیں بلکہ ایک عام مشاہدہ اور تجربہ کا بیان ہے جس میں زنا کا فعلِ خبیث ہونا اور اس کے اثرات کی دُوررس مضرتوں کا ذکر ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ زنا ایک اخلاقی زہر ہے اس کے زہریلے اثرات سے انسان کا اخلاقی مزاج ہی بگڑ جاتا ہے اُسے بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی بلکہ بُرائی اور خباثت ہی مرغوب ہو جاتی ہے حلال حرام کی بحث نہیں رہتی۔ اور جو عورت اُس کو پسند آتی ہے اس کا اصلی مقصود اس سے زنا کرنا اور اس کو زنا کاری پر راضی کرنا ہوتا ہے اگر زنا کے ارادے میں ناکام ہو جائے تو مجبوری سے نکاح پر راضی ہوتا ہے مگر نکاح کو دل سے پسند نہیں کرتا کیونکہ نکاح کے جو مقاصد ہیں کہ آدمی عفیف ہو کر رہے اور اولاد صالح پیدا کرے اور اس کے لئے بیوی کے حقوق نفقہ وغیرہ کا ہمیشہ کے لئے پابند ہو جائے یہ ایسے شخص کو وبال معلوم ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ایسے شخص کو دراصل نکاح سے کوئی غرض ہی نہیں اس لئے اس کی رغبت صرف مسلمان عورتوں ہی کی طرف نہیں بلکہ مشرک عورتوں کی طرف بھی ہوتی ہے اور مشرک عورت اگر اپنے مذہب کی وجہ سے یا کسی برادری کی رسم کی وجہ سے نکاح کی شرط لگالے تو مجبوراً وہ اُس سے نکاح پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی اس کو کچھ بحث ہی نہیں کہ یہ نکاح حلال اور صحیح ہوگا یا شرعاً باطل ٹھہرے گا۔ اس لئے اس پر یہ بات صادق آگئی کہ اس کی جس عورت کی طرف اصلی رغبت ہوگی اگر وہ مسلمان ہے تو زانیہ کی طرف رغبت ہوگی خواہ پہلے سے زنا کی عادی ہو یا اسی کے ساتھ زنا کر کے زانیہ کہلائے یا پھر کسی مشرک عورت کی طرف رغبت ہوگی جس کے ساتھ نکاح بھی زنا ہی کے حکم میں ہے یہ معنی ہوئے آیت کے پہلے جملہ کے یعنی اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً۔

اسی طرح جو عورت زنا کی خوگر ہو اور اس سے توبہ نہیں کرتی تو سچے مؤمن مسلمان جن کا مقصود اصلی نکاح اور نکاح کے شرعی فوائد و مقاصد ہیں وہ ایسی عورت سے متوقع نہیں۔ اس لئے ان کو ایسی عورت کی طرف اصلی رغبت نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ یہ عورت نکاح کے بعد بھی اپنی بُری عادتِ زنا نہ چھوڑے گی۔ ہاں ایسی عورت کی طرف رغبت

یا تو زانی کو ہوگی جس کا اصلی مقصد اپنی خواہش پوری کرنا ہے نکاح مقصود نہیں۔ اس میں اگر وہ زانیہ کسی اپنی دُنیوی مصلحت سے اس کے ساتھ ملنے کے لئے نکاح کی شرط لگا دے تو بادلِ ناخواستہ نکاح کو بھی گوارا کر لیتا ہے یا پھر ایسی عورت کے نکاح پر وہ شخص راضی ہوتا ہے جو مشرک ہو۔ اور چونکہ مشرک سے نکاح بھی شرعاً زنا ہی ہے اس لئے اس میں دو چیزیں جمع ہوگئیں کہ مشرک بھی ہے اور زانی بھی۔ یہ معنے ہیں آیت کے دوسرے جملے کے یعنی وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ ۔

مذکورہ تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس آیت میں زانی اور زانیہ سے مراد وہ ہیں جو زنا سے توبہ نہ کریں اور اپنی اس بُری عادت پر قائم رہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی مرد خانہ داری یا اولاد کی مصلحت سے کسی پاکدامن شریف عورت سے نکاح کر لے یا ایسی عورت کسی نیک مرد سے نکاح کر لے تو اس آیت سے اس نکاح کی نفی لازم نہیں آتی۔ یہ نکاح شرعاً درست ہو جائے گا۔ جمہور فقہاءِ اُمت امام اعظم ابوحنیفہ، مالک، شافعی وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے اور صحابہٴ کرام سے ایسے نکاح کرانے کے واقعات ثابت ہیں۔ تفسیر ابنِ کثیر میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی فتویٰ نقل کیا ہے۔[1] اب رہا آیت کا آخری جملہ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۝۳ اس میں بعض حضرات مفسرین نے تو ذٰلِكَ کا اشارہ زنا کی طرف قرار دیا ہے تو معنے جملے کے یہ ہوگئے کہ جب زنا ایسا خبیث فعل ہے تو زنا مؤمنین پر حرام کر دیا گیا۔ اس تفسیر پر معنے میں تو کوئی اشکال نہیں رہتا لیکن ذٰلِكَ سے زنا مراد لینا سیاقِ آیت سے کسی قدر بعید ضرور ہے۔ اس لئے دوسرے مفسرین نے ذٰلِكَ کا اشارہ نکاح زانی وزانیہ اور مشرک ومشرکہ کی طرف قرار دیا ہے۔ اس صورت میں مشرکہ سے مسلمان مرد کا نکاح اور مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح حرام ہونا تو دوسری نصوصِ قرآن سے بھی ثابت ہے اور تمام اُمت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے اور زانی مرد سے پاکدامن عورت کا نکاح یا زانیہ عورت سے عفیف مرد کا نکاح حرام ہونا جو اس جملے سے مستفاد ہوگا وہ اُس صورت کے ساتھ مخصوص ہے کہ عفیف مرد زانیہ عورت سے نکاح کر کے اُس کو زنا سے نہ روکے بلکہ نکاح کے بعد بھی اس کی زناکاری پر راضی رہے کیونکہ اس صورت میں یہ دیوثیت ہوگی جو شرعاً حرام ہے۔ اسی طرح کوئی شریف پاکدامن عورت زنا کے خوگر شخص سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد بھی اس کی زناکاری پر راضی رہے یہ بھی حرام ہے۔ یعنی ان لوگوں کا یہ فعل حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا باہمی نکاح صحیح نہ ہو، باطل ہو جائے۔ لفظ حرام شریعت کی اصطلاح میں دو معنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک یہ کہ وہ گناہ ہے اس کا کرنے والا آخرت میں مستحقِ سزا ہے اور دُنیا میں بھی یہ عمل بالکل باطل کالعدم ہے اس پر کوئی شرعی ثمرہ احکامِ دُنیا کا بھی مرتب نہیں ہوگا۔ جیسے کسی مشرک عورت سے یا جو عورتیں ہمیشہ کے لئے حرام ہیں اُن میں سے کسی سے نکاح کر لیا تو یہ گناہِ عظیم بھی ہے اور ایسا نکاح شرعاً کالعدم ہے زنا میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ دوسرے یہ کہ فعل حرام ہے یعنی گناہ موجب سزا ہے مگر دُنیا میں اس فعل کے کچھ ثمرات

[1] تفسیر ابن كثير تحت هذه الآية ج:۶ ص:۱۳

رہتے ہیں معاملہ صحیح ہو جاتا ہے جیسے کسی عورت کو دھوکہ دے کر یا اغوا کر کے لے آیا پھر شرعی قاعدے کے مطابق دو گواہوں کے سامنے اس کی مرضی سے نکاح کر لیا تو یہ فعل ناجائز و حرام تھا مگر نکاح صحیح ہو گیا اولاد ثابت النسب ہو گی۔ اسی طرح زانیہ اور زانی کا نکاح جبکہ اُن کا مقصود اصلی زنا ہی ہو، نکاح محض کسی دُنیوی مصلحت سے کرتے ہوں اور زنا سے توبہ نہیں کرتے تو ایسا نکاح حرام ہے مگر دُنیوی احکام میں باطل کالعدم نہیں۔ نکاح کے ثمرات شرعیہ نفقہ، مہر، ثبوت نسب اور میراث سب جاری ہوں گے۔ اس طرح لفظ حُرِّمَ اس آیت میں مشرکہ کے حق میں پہلے معنے کے اعتبار سے اور زانیہ اور زانی کے حق میں دوسرے معنے کے اعتبار سے صحیح اور درست ہو گیا۔ اس تفسیر پر آیت کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہ رہی جیسا کہ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

اور جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں کو پھر نہ لائے چار مرد شاہد تو مارو اُن کو

ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴﴾ لا

اسّی دُرّے اور نہ مانو اُن کی کوئی گواہی کبھی اور وہ ہی لوگ ہیں نافرمان

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

مگر جنہوں نے توبہ کر لی اس کے پیچھے اور سنور گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، تو اُن کو اَسّی کوڑے لگاؤ، اور اُن کی گواہی کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود فاسق ہیں۔ ﴿۴﴾ ہاں جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں، اور (اپنی) اصلاح کر لیں، تو اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ﴿۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ (زنا کی) تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں کو (جن کا زانیہ ہونا کسی دلیل یا قرینہ شرعیہ سے ثابت نہیں)

اور پھر چار گواہ (اپنے دعوے پر) نہ لا سکیں تو ایسے لوگوں کو اسّی دُرے لگاؤ اور اُن کی کوئی گواہی کبھی قبول مت کرو (یہ بھی تہمت لگانے کی سزا ہی کا جز ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہو گئے یہ تو دنیا کی سزا کا ذکر تھا) اور یہ لوگ (آخرت میں بھی سزا کے مستحق ہیں کیونکہ) فاسق ہیں لیکن جو لوگ اس کے بعد (خدا کے سامنے) توبہ کر لیں (کیونکہ تہمت لگانے میں اُنہوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور حق اللہ کو ضائع کیا) اور (جس پر تہمت لگائی تھی اُس سے معاف کرا کر بھی) اپنی (حالت کی) اصلاح کر لیں (کیونکہ اس کا حق ضائع کیا تھا) تو اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت کرنے والا رحمت کرنے والا ہے (یعنی سچّی توبہ کرنے سے عذابِ آخرت معاف ہو جائے گا اگرچہ شہادت کا مقبول نہ ہونا جو دُنیوی سزا تھی وہ باقی رہے گی کیونکہ وہ حدِ شرعی کا جز ہے اور ثبوتِ جرم کے بعد توبہ کرنے سے حد شرعی ساقط نہیں ہوتی)۔

معارف و مسائل

زنا کے متعلق تیسرا حکم جھوٹی تہمت کا جرم ہونا اور اُس کی حدِ شرعی

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ زنا چونکہ سارے جرائم سے زیادہ معاشرے میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ ہے اس لئے اس کی سزا شریعتِ اسلام نے دوسرے سب جرائم سے زیادہ سخت رکھی ہے۔ اس لئے عدل و انصاف کا تقاضا تھا کہ اس معاملہ کے ثبوت کو بڑی اہمیت دی جائے بغیر شرعی ثبوت کے کوئی کسی مرد یا عورت پر زنا کا الزام یا تہمت لگانے کی جرأت نہ کرے اس لئے شریعتِ اسلام نے بغیر ثبوت شرعی کے جس کا نصاب چار مرد گواہ عادل ہونا ہے اگر کوئی کسی پر تہمت صریح زنا کی لگائے تو اس تہمت لگانے کو بھی شدید جُرم قرار دیا اور اس جُرم پر بھی حدِّ شرعی اسّی کوڑے مقرر کی۔ جس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ کسی شخص پر زنا کا الزام کوئی شخص اُسی وقت لگانے کی جرأت کرے گا جبکہ اس نے اس فعلِ خبیث کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہو اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کو یہ یقین ہو کہ میرے ساتھ اور تین مردوں نے دیکھا ہے اور وہ گواہی دیں گے۔ کیونکہ اگر دوسرے گواہ ہیں ہی نہیں یا چار سے کم ہیں یا اُن کے گواہی دینے میں شبہ ہے تو اکیلا یہ شخص گواہی دے کر تہمتِ زنا کی سزا کا مستحق بننا کسی حال گوارا نہ کرے گا۔

ایک شبہ اور جواب

رہا یہ معاملہ کہ جب زنا کی شہادت کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا دی گئیں تو مجرموں کو کھلی چھٹی مل گئی نہ کسی کو شہادت کی جرأت ہوگی نہ کبھی ثبوت شرعی بہم پہنچے گا نہ ایسے مجرم کبھی سزایاب ہو سکیں گے۔ مگر یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ زنا کی حد شرعی یعنی سو کوڑے یا رجم و سنگساری کی سزا دینے کے لئے تو یہ شرطیں ہیں لیکن دو غیر محرم مرد و عورت کو یکجا

قابل اعتراض حالت میں یا بے حیائی کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی شہادت دینے پر کوئی پابندی نہیں اور ایسے تمام اُمور جو زنا کے مقدمات ہوتے ہیں یہ بھی شرعاً قابلِ سزائے جُرم ہیں لیکن حدِ شرعی کی سزا نہیں بلکہ تعزیری سزا قاضی یا حاکم کی صوابدید کے مطابق کوڑے لگانے کی دی جاتی ہے۔ اس لئے جس شخص نے دو مرد و عورت کو زنا میں مبتلا دیکھا مگر دوسرے گواہ نہیں ہیں تو صریح زنا کے الفاظ سے تو شہادت نہ دے مگر بے حجابانہ اختلاط کی گواہی دے سکتا ہے اور حاکم قاضی اس پر تعزیری سزا بعد ثبوت جُرم جاری کر سکتا ہے۔

مُحْصَنٰتْ کون ہیں؟

یہ لفظ احصان سے مشتق ہے اصطلاحِ شرع میں احصان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا حدِ زنا میں اعتبار کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جس پر زنا کا ثبوت ہو جائے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور کسی عورت کے ساتھ نکاح صحیح کر چکا ہو اور اُس سے مباشرت بھی ہو چکی ہو تو اس پر سزائے رجم و سنگساری جاری ہوگی۔ دوسری قسم وہ ہے جس کا اعتبار حدِ قذف یعنی تہمتِ زنا میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جس شخص پر زنا کا الزام لگایا گیا ہے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور عفیف ہو یعنی پہلے کبھی اس پر زنا کا ثبوت نہ ہوا ہو۔ اس آیت میں یہی معنے مُحْصَنٰتْ کے ہیں۔ (جصاص) [۱]

مسئلہ:- آیتِ قرآن میں عام معروف عادت کے مطابق یا اُس واقعہ کی وجہ سے جو شانِ نزول اس آیت کا ہے تہمتِ زنا اور اُس کی سزا کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے مرد ہوں اور جس پر تہمت لگائی گئی وہ پاکدامن عورت ہو مگر حکم شرعی اشتراکِ علّت کے سبب سے عام ہے کوئی عورت دوسری عورت پر یا کسی مرد پر یا مرد کسی دوسرے مرد پر تہمتِ زنا لگائے اور ثبوتِ شرعی موجود نہ ہو تو یہ سب بھی اسی سزائے شرعی کے مستحق ہوں گے۔ (جصاص وہدایہ) [۲]

مسئلہ:- یہ حدِ شرعی جو تہمتِ زنا پر ذکر کی گئی ہے صرف اسی تہمت کے ساتھ مخصوص ہے کسی دوسرے جرم کی تہمت کسی شخص پر لگائی جائے تو یہ حدِ شرعی اُس پر جاری نہیں ہوگی۔ ہاں تعزیری سزا حاکم کی صوابدید کے مطابق ہر جرم کی تہمت پر دی جا سکتی ہے۔ الفاظِ قرآن میں اگرچہ صراحۃً اس حد کا تہمتِ زنا کے ساتھ مخصوص ہونا ذکر نہیں مگر چار گواہوں کی شہادت کا ذکر اس خصوصیت کی دلیل ہے کیونکہ چار گواہ کی شرط صرف ثبوتِ زنا ہی کے لئے مخصوص ہے۔ (جصاص وہدایہ) [۳]

مسئلہ:- حدِ قذف میں چونکہ حق العبد یعنی جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کا حق بھی شامل ہے اس لئے یہ حد جبھی جاری کی جائے گی جبکہ مقذوف یعنی جس پر تہمت لگائی گئی وہ حد جاری کرنے کا مطالبہ بھی کرے ورنہ حد ساقط ہو جائے گی (ہدایہ) [۴] بخلاف حدِّ زنا کے کہ وہ خالص حق اللہ ہے اس لئے کوئی مطالبہ کرے یا نہ کرے حدِ زنا جرم ثابت ہونے پر جاری کی جائے گی۔

---

[۱] احکام القرآن للجصاصؒ تحت تفسیر سورۃ النساء ج:۲ ص:۲۲۶،۲۲۷، وتحت تفسیر هٰذه الآیة ج:۸ ص:۳۷

[۲] [۳] احکام القرآن للجصاص ج:۸ ص:۳۷، والهدایة، کتاب الحدود، باب حد القذف۔ [۴] الهدایة، بحوالۂ بالا۔

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا یعنی جس شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانے کا جُرم ثابت ہو جائے اور مقذوف کے مطالبہ سے اُس پر حدقذف جاری ہو جائے تو اُس کی ایک سزا تو فوری ہوگئی کہ اسّی کوڑے لگائے گئے۔ دوسری سزا ہمیشہ کے لئے جاری رہے گی وہ یہ ہے کہ اس کی شہادت کسی معاملے میں قبول نہ کی جائے گی جب تک یہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے ندامت کے ساتھ توبہ نہ کرے اور مقذوف شخص سے معافی حاصل کر کے توبہ کی تکمیل نہ کرے اُس وقت تک تو باجماعِ اُمّت اس کی شہادت کسی بھی معاملہ میں مقبول نہ ہوگی۔ اور اگر توبہ کرلے تب بھی حنفیہ کے نزدیک اس کی شہادت قبول نہیں ہوتی ہاں گناہ معاف ہو جاتا ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں گزرا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ یعنی وہ لوگ جن پر تہمت زنا کی حدشرعی جاری کی گئی ہے اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی حالت درست کرلیں کہ آئندہ اس طرح کے اقدام کا اس سے خطرہ نہ رہے اور جس پر تہمت لگائی تھی اُس سے بھی معاف کرالیں تو اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

یہ استثناء اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا کا امام اعظم ابوحنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک آیت سابقہ کے صرف آخری جملے کی طرف راجع ہے۔ یعنی وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴ تو مطلب اس استثناء کا یہ ہے کہ جس پر حدّ قذف جاری ہوئی ہے وہ فاسق ہے لیکن اگر وہ صدق دل سے توبہ کرے اور اپنی حالت کی اصلاح بھی مقذوف سے معافی لے کر کرے تو پھر وہ فاسق نہیں رہے گا اور آخرت کی سزا اُس سے معاف ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دُنیا میں جو اس پر دو سزاؤں کا ذکر اس آیت کے شروع میں ہے یعنی اسّی کوڑے لگانا اور مردود الشہادت کر دینا یہ سزائیں توبہ کے باوجود اپنی جگہ رہیں گی کیونکہ ان میں ایک بڑی سزا کوڑے لگانے کی وہ تو جاری ہو ہی چکی ہے دوسری سزا بھی چونکہ اُسی حدِشرعی کا جزو ہے اور یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ توبہ سے حدِشرعی معاف نہیں ہوتی اگرچہ آخرت کا عذابِ گناہ معاف ہو کر ٹل جاتا ہے۔ تو جب مردود الشہادت ہونا بھی حدِشرعی کا جزو ہے تو وہ توبہ سے معاف نہ ہوگا۔ امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے استثناء مذکور کو آیت سابقہ کے سب جملوں کی طرف راجع کیا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ توبہ کرلینے سے جیسا کہ وہ فاسق نہیں رہا اس لئے مردود الشہادت بھی نہیں رہے گا۔ جصاص اور مظہری میں دونوں طرف کے دلائل اور جوابات کی تفصیل مذکور ہے اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔[1] واللہ اعلم

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ

اور جو لوگ عیب لگائیں اپنی جوروؤں کو اور شاہد نہ ہوں اُن کے پاس سوائے اُن کی جان کے

[1] تفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۶ ص:۴۴۸ تا ۴۵۰، واحکام القرآن للجصاصؒ ج:۸ ص:۵۴ تا ۷۰

فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑥

تو ایسے شخص کی گواہی کی یہ صورت ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر، کہ مقرر وہ شخص سچا ہے

وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑦ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا

اور پانچویں بار یہ کہ اللہ کی پھٹکار ہو اُس شخص پر اگر ہو وہ جھوٹا اور عورت سے ٹل جائے گی

الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑧ ۙ

مار یوں کہ وہ گواہی دے چار گواہی اللہ کی قسم کھا کر کہ مقرر وہ شخص جھوٹا ہے

وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑨

اور پانچویں یہ کہ اللہ کا غضب آئے اس عورت پر اگر وہ شخص سچا ہے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ⑩ ع ۷/۱

اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تمہارے اوپر اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ معاف کرنے والا ہے حکمتیں جاننے والا تو کیا کچھ نہ ہوتا

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں، اور خود اپنے سوا اُن کے پاس کوئی اور گواہ نہ ہوں تو ایسے کسی شخص کو جو گواہی دینی ہوگی وہ یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ بیان دے کہ وہ (بیوی پر لگائے ہوئے الزام میں) یقیناً سچا ہے۔ ⑥ اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ: "اگر میں (اپنے الزام میں) جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔" ⑦ اور عورت سے (زنا کی) سزا دُور کرنے کا راستہ یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ گواہی دے کہ اُس کا شوہر (اس الزام میں) جھوٹا ہے۔ ⑧ اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ: "اگر وہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔" ⑨ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ کثرت سے توبہ قبول کرنے والا، حکمت والا ہے (تو خود سوچ لو کہ تمہارا کیا بنتا؟)۔ ⑩

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ اپنی بیبیوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں اور اُن کے پاس بجز اپنے (ہی دعوے کے) اور کوئی گواہ نہ ہوں (جو عدد میں چار ہونے ضروری ہیں) تو اُن کی شہادت (جو کہ دافع حبس یا حد قذف ہو) یہی ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہدے کہ بیشک میں سچا ہوں اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اور (اس کے بعد) اُس عورت سے سزا (یعنی حبس یا حدِ زنا) اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ قسم کھا کر کہے کہ بیشک یہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ مرد سچا ہو (اس طریق سے دونوں میاں بیوی سزائے دُنیوی سے بچ سکتے ہیں البتہ وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جائے گی) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُس کا کرم ہے (کہ ایسے ایسے احکام مقرر کئے جس میں انسان کے فطری جذبات کی پوری رعایت ہے) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا حکمت والا ہے (تو تم بڑی مضرتوں میں پڑ جاتے جن کا بیان آگے آتا ہے)۔

معارف و مسائل

زنا کے متعلقات میں چوتھا حکم لِعان کا ہے

لِعَان اور ملاعنت کے معنے ایک دوسرے پر لعنت اور غضبِ الٰہی کی بددُعا کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں میاں اور بیوی دونوں کو چند خاص قَسمیں دینے کو لِعَان کہا جاتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے یا اپنے بچّے کو کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے اور یہ عورت جس پر الزام لگایا گیا ہے اُس کو جھوٹا بتلائے اور اُس کا مطالبہ کرے کہ مجھ پر جھوٹی تہمت لگائی ہے اس لئے شوہر پر تہمتِ زنا کی سزا اسّی کوڑے جاری کی جائے تو اس وقت شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا کہ الزامِ زنا پر چار گواہ پیش کرے۔ اگر اس نے گواہ پیش کر دیئے تو عورت پر حدِّ زنا لگائی جائے گی۔ اور اگر وہ چار گواہ نہ لا سکا تو ان دونوں میں لعان کرایا جائے گا۔ یعنی اوّل مرد سے کہا جائے گا کہ وہ چار مرتبہ اُن الفاظ سے جو قرآن میں مذکور ہیں یہ شہادت دے کہ میں اس الزام میں سچّا اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

اگر شوہر ان الفاظ کے کہنے سے رُکے تو اُس کو قید کر دیا جائے گا کہ یا تو اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرو یا مذکورہ الفاظ کے ساتھ پانچ مرتبہ یہ قسمیں کھاؤ اور جب تک وہ ان دونوں میں سے کوئی کام نہ کرے اُس کو قید رکھا جائے گا۔ اگر

اُس نے اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کرلیا تو اس پر حدِقذف یعنی تہمت زنا کی شرعی سزا جاری ہوگی اور اگر الفاظِ مذکورہ کے ساتھ پانچ مرتبہ قسمیں کھالیں تو پھر اس کے بعد عورت سے اُن الفاظ میں پانچ قسمیں لی جائیں گی جو قرآن میں عورت کے لئے مذکور ہیں اگر وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اُس کو اُس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک کہ وہ یا تو شوہر کی تصدیق کرے اور اپنے جُرم زنا کا اقرار کرے تو اس پر حدِّ زِنا جاری کردی جائے اور یا پھر الفاظِ مذکورہ کے ساتھ پانچ قسمیں کھائے۔ اگر وہ الفاظِ مذکورہ سے قسمیں کھانے پر راضی ہوجائے اور قسمیں کھالے تو اب لِعَان پورا ہوگیا۔ جس کے نتیجہ میں دُنیا کی سزا سے دونوں بچ گئے آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی ہے کہ اُن میں سے کون جھوٹا ہے جھوٹے کو آخرت میں سزا ملے گی، لیکن دنیا میں بھی جب دو میاں بیوی میں لعان کا معاملہ ہوگیا تو یہ ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتے ہیں شوہر کو چاہئے کہ اس کو طلاق دے کر آزاد کردے۔ اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم ان دونوں میں تفریق کرسکتا ہے جو بحکم طلاق ہوگی۔ بہرحال اب ان دونوں کا آپس میں دوبارہ نکاح بھی کبھی نہیں ہوسکتا معاملہ لِعَان کی یہ تفصیل کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔ [1]

لِعَان کا قانون شریعتِ اسلام میں شوہر کے جذبات ونفسیات کی رعایت کی بنا پر نافذ ہوا ہے۔ کیونکہ کسی شخص پر الزامِ زنا لگانے کا قانون جو پہلی آیات میں گزر چکا ہے اُس کی رُو سے یہ ضروری ہے کہ الزامِ زنا لگانے والا چار گواہ عینی پیش کرے اور جو یہ نہ کرسکے تو اُلٹی اسی پر تہمت زنا کی حد جاری کی جائے گی۔ عام آدمی کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ جب چار گواہ میسر نہ ہوں تو وہ الزام زنا لگانے سے خاموش رہے تاکہ تہمتِ زنا کی سزا سے محفوظ رہ سکے لیکن شوہر کے لئے یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ جب اُس نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا اور گواہ موجود نہیں اگر وہ بولے تو تہمت زنا کی سزا پائے اور نہ بولے تو ساری عمر خون کے گھونٹ پیتا رہے اور اس کی زندگی وبال ہوجائے۔ اس لئے شوہر کے معاملہ کو عام قانون سے الگ کرکے اس کا مستقل قانون بنادیا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لِعَان صرف میاں بیوی کے معاملہ میں ہوسکتا ہے دوسروں کا حکم وہی ہے جو پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔ کتبِ حدیث میں اس جگہ دو واقعے ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے آیاتِ لِعَان کا شانِ نزول کونسا واقعہ ہے اس میں ائمۂ تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ قرطبی نے آیات کا نزول مکرر مان کر دونوں کو شانِ نزول قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر شارح بخاری اور نووی شارح مسلم نے دونوں میں تطبیق دے کر ایک ہی نزول میں دونوں کو شانِ نزول آیات لعان کا قرار دیا ہے ان کی توجیہ زیادہ صاف ہے جو آگے آجائے گی۔ ایک واقعہ ہلال بن اُمیّہ اور اُن کی بیوی کا ہے جو صحیح بخاری میں بروایت ابنِ عباسؓ مذکور ہے اور اس واقعہ کا ابتدائی حصہ حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت سے مسند احمد میں اس طرح آیا ہے۔

[1] المبسوط، باب اللعان، ج:۸ ص:۳٦۴، وبدائع الصنائع، کتاب اللعان ج:۸ ص:۵۱

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں حدِ قذف کے احکام کی آیات نازل ہوئیں یعنی وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً جس میں کسی عورت پر زنا کا الزام لگانے والے مرد پر لازم کیا گیا ہے کہ یا تو اس الزام پر چار گواہ پیش کرے جن میں ایک یہ خود ہوگا اور جو ایسا نہ کر سکے تو اس کو جھوٹا قرار دے کر اس پر اسّی کوڑوں کی حد اور ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہونے کی سزا جاری کی جائے گی۔ یہ آیات سُن کر انصار مدینہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ کیا یہ آیات اسی طرح نازل ہوئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کو سعد بن عبادہؓ کی زبان سے ایسی بات سُن کر بڑا تعجب ہوا) آپ نے حضرات انصار کو خطاب کرکے فرمایا کہ آپ سُن رہے ہیں کہ آپ کے سردار کیا بات کہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ، آپ اُن کو ملامت نہ فرمائیں۔ ان کے اس کلام کی وجہ ان کی شدّتِ غیرت ہے۔ پھر سعد بن عبادہؓ نے خود عرض کیا یا رسول اللہ! میرے باپ اور ماں آپ پر قربان، میں پوری طرح جانتا ہوں یہ آیات حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ اگر میں بے حیا بیوی کو اس حال میں دیکھوں کہ غیر مرد اُس پر چڑھا ہوا ہے تو کیا میرے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ میں اس کو وہاں ڈانٹوں اور وہاں سے ہٹادوں بلکہ میرے لئے یہ ضروری ہوگا کہ میں چار آدمیوں کو لاکر یہ حالت دکھلاؤں اور اس پر گواہ بناؤں اور جب تک میں گواہوں کو جمع کروں وہ اپنا کام کرکے بھاگ جائے۔ (حضرت سعدؓ کے الفاظ اس جگہ مختلف منقول ہیں خلاصہ سب کا ایک ہی ہے۔ قرطبی[1])

آیات حدِ قذف نازل ہونے اور سعد بن عبادہؓ کے اس کلام پر تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ہلال بن اُمیہؓ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ عشاء کے وقت اپنی زمین سے واپس ہوئے تو اپنی بیوی کے ساتھ ایک مرد کو بچشم خود دیکھا اور ان کی باتیں اپنے کانوں سے سُنیں مگر کوئی اقدام نہیں کیا یہاں تک کہ صبح ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ سُن کر دل بُرا ہوا اور بڑا بھاری محسوس کیا۔ ادھر حضرات انصار جمع ہوگئے اور آپس میں تذکرہ کرنے لگے کہ جو بات ہمارے سردار سعدؓ بن عبادہ نے کہی تھی ہم اُسی میں مبتلا ہوگئے اب قانونِ شرعی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلال بن اُمیّہ کو اسّی کوڑے حدِ قذف کے لگائیں گے اور لوگوں میں ان کو ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت قرار دیدیں گے۔ مگر ہلال بن اُمیہؓ نے کہا کہ خدا کی قسم مجھے پوری اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مصیبت سے نکالیں گے۔ اور صحیح بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال کا معاملہ سن کر قرآنی حکم کے مطابق ہلالؓ سے فرما بھی دیا کہ یا تو اپنے اس دعوے پر بینہ (چار گواہ) لاؤ ورنہ تمہاری پیٹھ پر حدِ قذف جاری ہوگی۔ ہلال بن اُمیہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے عرض کیا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اپنے کلام میں سچا ہوں اور ضرور ہے

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۱۸۳

کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نازل فرمائیں گے جو میری پیٹھ کو حدِ قذف کی سزا سے بَری کر دے گا۔ یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ جبرئیل امین یہ آیات جن میں لِعان کا قانون ہے لے کر نازل ہوئے وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ الآیۃ۔

ابویعلی نے یہی روایت حضرت انسؓ سے بھی نقل کی ہے اُس میں یہ بھی ہے کہ جب آیات لِعان نازل ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال ابن اُمیّہ کو بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری مشکل کا حل نازل فرما دیا۔ ہلالؓ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اسی کی اُمید لگائے ہوئے تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیّہؓ کی بیوی کو بھی بُلوایا اور جب دونوں میاں بیوی جمع ہو گئے تو بیوی سے معاملہ کے متعلق پوچھا گیا۔ اُس نے کہا کہ میرا شوہر ہلال بن اُمیّہؓ مجھ پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے کوئی ایک جھوٹا ہے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو (اللہ کے عذاب سے ڈر کر) توبہ کرے اور سچّی بات ظاہر کر دے۔ اس پر ہلال بن اُمیّہؓ نے عرض کیا ''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے بالکل سچ بات کہی ہے اور جو کچھ کہا ہے حق کہا ہے۔'' تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ نازل شدہ آیاتِ قرآن کے مطابق دونوں میاں بیوی سے لعان کرایا جائے۔ پہلے حضرت ہلالؓ سے کہا گیا کہ تم چار مرتبہ ان الفاظ سے شہادت دو جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یعنی میں اللہ کو حاضر ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ میں اپنے الزام میں سچّا ہوں۔ ہلالؓ نے اس کے مطابق چار مرتبہ اس کی شہادت دی۔ جب پانچویں شہادت کا نمبر آیا جس کے الفاظِ قرآنی یہ ہیں کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے طور پر ہلال بن اُمیّہؓ سے فرمایا کہ دیکھو ہلال! خدا سے ڈرو کیونکہ دُنیا کی سزا آخرت کے عذاب سے ہلکی ہے اور اللہ کا عذاب لوگوں کی دی ہوئی سزا سے کہیں زیادہ سخت ہے اور یہ پانچویں شہادت آخری شہادت ہے اسی پر فیصلہ ہونا ہے مگر ہلال بن اُمیّہؓ نے عرض کیا کہ میں بقسم کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس شہادت پر آخرت کا عذاب نہیں دیں گے (کیونکہ بالکل سچی شہادت ہے) جیسا کہ اللہ کے رسول مجھے دُنیا میں حدِ قذف کی سزا نہیں دیں گے اور پھر یہ پانچویں شہادت کے الفاظ ادا کر دیئے۔ اس کے بعد آپ نے ہلال کی بیوی سے اسی طرح کی چار شہادات یا چار قسمیں لیں اس نے بھی ہر دفعہ میں قرآنی الفاظ کے مطابق یہ شہادت دی کہ میرا شوہر جھوٹا ہے۔ جب پانچویں شہادت کا نمبر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذرا ٹھہرو! پھر اس عورت سے فرمایا کہ خدا سے ڈرو کہ یہ پانچویں شہادت آخری بات ہے اور خدا کا عذاب لوگوں کے عذاب یعنی زنا کی حدِ شرعی سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ یہ سُن کر وہ قسم کھانے سے جھجکنے لگی، کچھ دیر اسی کیفیت میں رہی مگر پھر آخر میں کہا کہ وَاللہ میں اپنی قوم کو رُسوا نہیں کروں گی اور پانچویں شہادت بھی ان لفظوں کے ساتھ ادا کر دی کہ اگر میرا شوہر سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ یہ لِعان کی کارروائی مکمل ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میاں بیوی میں تفریق کر دی

یعنی ان کا نکاح توڑ دیا اور یہ فیصلہ فرمایا کہ اس حمل سے جو بچہ پیدا ہو وہ اس عورت کا بچہ کہلائے گا، باپ کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا مگر بچے کو مطعون بھی نہ کیا جائے گا۔ انتہیٰ (تفسیر مظہری بحوالہ مسند احمد عن ابن عباسؓ) [۱]

دُوسرا واقعہ بھی صحیحین بخاری و مسلم میں مذکور ہے اور واقعہ کی تفصیل امام بغوی نے بروایت ابن عباسؓ اس طرح نقل فرمائی ہے کہ زنا کی تہمت لگانے والے پر حدِ قذف جاری کرنے کے احکام جن آیات میں نازل ہوئے یعنی وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الآیۃ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ آیات لوگوں کو سنائیں۔ مجمع میں عاصم بن عدی انصاریؓ بھی موجود تھے یہ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میری جان آپ پر قربان ہو اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی عورت کو کسی مرد کے ساتھ مبتلا دیکھے تو اگر وہ اپنے دیکھے ہوئے واقعہ کو بیان کرے تو اُس کو کوڑے لگائے جائیں گے اور ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت کر دیا جائے گا اور مسلمان اس کو فاسق کہا کریں گے ایسی حالت میں ہم گواہ کہاں سے لائیں گے اور اگر گواہوں کی تلاش میں نکلیں گے تو گواہ آنے تک وہ اپنا کام کر کے بھاگ چکا ہوگا۔ یہ وہی سوال تھا جو پہلے واقعہ میں حضرت سعد بن عبادہؓ نے کیا تھا اس دوسرے واقعہ میں عاصم بن عدیؓ نے کیا ہے۔

یہ سوال ایک جمعہ کے دن کیا گیا تھا اس کے بعد یہ قصہ پیش آیا کہ عاصم بن عدیؓ کا ایک چچازاد بھائی عویمر تھا جس کا نکاح بھی عاصم بن عدیؓ کی چچازاد بہن خولہؓ سے ہوا تھا۔ عویمرؓ نے ایک روز دیکھا کہ اُن کی بیوی خولہ شریک بن سحماء کے ساتھ مبتلا ہے اور یہ شریک بن سحماء بھی عاصم کا چچازاد بھائی تھا۔ عویمرؓ نے یہ واقعہ آ کر عاصم بن عدیؓ سے بیان کیا، عاصمؓ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور اگلے روز جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ پچھلے جمعہ میں مَیں نے آپ سے جو سوال کیا تھا افسوس ہے کہ میں خود اس میں مبتلا ہو گیا کیونکہ میرے ہی اہلِ بیت میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا۔ بغویؒ نے ان دونوں کو حاضر کرنے اور پھر آپس میں لعان کرانے کا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے (مظہری) [۲] اور صحیحین میں اس کا خلاصہ حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی کی روایت سے یہ مذکور ہے کہ عویمر عجلانیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو دیکھے تو کیا وہ اس کو قتل کر دے جس کے نتیجہ میں لوگ اس کو قتل کریں گے یا پھر وہ کیا کرے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے معاملے میں حکم نازل فرما دیا ہے۔ جاؤ بیوی کو لے کر آؤ۔ حضرت سہل بن سعدؓ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو بُلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر

---

[۱] تفسیر المظهری ج:٦ ص:۴۵۳، ۴۵۴، ومسند احمد، مسند عبدالله بن عباس رضی الله عنهما رقم الحديث:۲۱۶٦

[۲] تفسير البغوی تحت هذه الآية ج:٦ ص:۱۴، ۱۵، والمظهری ج:٦ ص:۴۵۴، ۴۵۵

لِعان کرایا (جس کی صورت واقعہ سابقہ میں بیان ہو چکی ہے) جب دونوں طرف سے پانچوں شہادات پوری ہو کر لِعان ختم ہوا تو عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! اگر میں اب اس کو بیوی بنا کر رکھوں تو گویا میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے اس لئے میں اسے تین طلاق دیتا ہوں۔ (مظہری بحوالہ صحیحین) [۱]

ان دونوں واقعوں میں سے ہر ایک میں یہ مذکور ہے کہ آیاتِ لِعان اس کے بارے میں نازل ہوئی ہیں حافظ ابن حجر اور شیخ اسلام نووی رحمہ اللہ نے دونوں میں تطبیق کی یہ صورت بیان کی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا واقعہ ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کا تھا اور آیاتِ لِعان کا نزول اُسی واقعہ کے بارے میں ہوا اس کے بعد عویمر رضی اللہ عنہ کو ایسا ہی واقعہ پیش آ گیا اور اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ان کو ہلال بن اُمیہ کا معاملہ سابقہ معلوم نہ ہوگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بتلایا کہ تمہارے معاملہ کا فیصلہ یہ ہے اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں تو الفاظ حدیث کے یہ ہیں فَنَزَلَ جِبْرَئِیْلُ اور عویمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں الفاظ یہ ہیں قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْکَ جس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے واقعہ جیسے ایک واقعہ میں اس کا حکم نازل فرما دیا ہے۔ واللہ اعلم (مظہری) [۲]

مسئلہ:- جب دو میاں بیوی کے درمیان حاکم کے سامنے لِعان ہو جائے تو یہ عورت اس مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے جیسے حرمت رضاعت ابدی ہوتی ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَلْمُتَلَاعِنَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ اَبَدًا، [۳] حرمت تو لِعان ہونے ہی سے ثابت ہو جاتی ہے لیکن عورت کو دوسرے شخص سے بعد عدت نکاح کرنا امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک جب جائز ہوگا جبکہ مرد طلاق دیدے یا زبان سے کہہ دے کہ میں نے اس کو چھوڑ دیا اور اگر مرد ایسا نہ کرے تو حاکم قاضی ان دونوں میں تفریق کا حکم کر دے گا وہ بھی بحکم طلاق ہو جائے گا پھر عدت طلاق تین حیض پورے ہونے کے بعد عورت آزاد ہوگی اور دوسرے کسی شخص سے نکاح کر سکے گی۔ (مظہری وغیرہ) [۴]

مسئلہ:- جب لِعان ہو چکا اس کے بعد اس حمل سے جو بچہ پیدا ہو وہ اُس کے شوہر کی طرف منسوب نہیں ہوگا بلکہ اُس کی نسبت اُس کی ماں کی طرف کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیہ اور عویمر عجلانی دونوں کے معاملات میں یہی فیصلہ فرمایا۔ [۵]

---

[۱] تفسیر المظهری ج:٦ ص:۴۵۲، وصحیح البخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان ج:۲ ص:۷۹۹، وصحیح مسلم، کتاب اللعان، ج:۱ ص:۴۸۹

[۲] تفسیر المظهری ج:٦ ص:۴۵۱، وفتح الباری، کتاب التفسیر، سورة النور، باب قوله ویدرأ عنها العذاب الآیة ج:۱۳ ص:۲۵۴، وشرح النووی علی صحیح مسلم، کتاب اللعان ج:۵ ص:۲٦۰

[۳] سنن الدارقطنی، رقم الحدیث: ۳۷۴۹

[۴] تفسیر المظهری ج:٦ ص:۴٦۳، وبدائع الصنائع، کتاب اللعان، فصل فی حکم اللعان ج:۸ ص:۷۸

[۵] مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث: ۲۹۰٦۷

مسئلہ: - لعان کے بعد اگرچہ اُن میں جو جھوٹا ہے اُس کا عذابِ آخرت پہلے سے زیادہ بڑھ گیا مگر دُنیا کی سزا اس سے ساقط ہوگئی۔ اسی طرح دُنیا میں اُس کو زانیہ اور بچّے کو ولد الزنا کہنا بھی کسی کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ ہلال ابن اُمیہؓ کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ میں یہ حکم بھی فرمایا۔[1] وَقَضیٰ بِاَنْ لَّا تُرْمٰی وَلَا وَلَدُھَا۔[2]

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ

جو لوگ لائے ہیں یہ طوفان تمہیں میں ایک جماعت ہیں تم اس کو نہ سمجھو بُرا اپنے حق میں

بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ

بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں ہر آدمی کے لئے اُن میں سے وہ ہے جتنا اُس نے گناہ کمایا

وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ

اور جس نے اُٹھایا ہے اس کا بڑا بوجھ اس کے واسطے بڑا عذاب ہے کیوں نہ جب تم نے اس کو سُنا تھا

ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾

خیال کیا ہوتا ایمان والے مَردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلا خیال اور کہا ہوتا یہ صریح طوفان ہے

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ

کیوں نہ لائے وہ اس بات پر چار شاہد پھر جب نہ لائے شاہد تو وہ لوگ

عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِی الدُّنْیَا

اللہ کے یہاں وہی ہیں جھوٹے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دُنیا

---

[1] ترجمہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا کہ نہ تو اس عورت پر تہمت زنا لگائی جائے گی اور نہ ہی بچے کو ولد الزنا کہا جائے گا۔

[2] سنن الکبریٰ للبیھقیؒ، رقم الحدیث: ۱۵۰۶۹، ومصنف ابن ابی شیبۃ، رقم الحدیث: ۲۹۰۶۷

وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ

اور آخرت میں تو تم پر پڑتی اس چرچا کرنے میں کوئی آفت بڑی جب لینے لگے تم اس کو

بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ

اپنی زبانوں پر اور بولنے لگے اپنے منہ سے جس چیز کی تم کو خبر نہیں اور تم سمجھتے ہو اس کو ہلکی بات

وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ

اور یہ اللہ کے یہاں بہت بڑی ہے اور کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا کہا ہوتا ہم کو نہیں لائق کہ منہ پر لائیں

بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ

یہ بات اللہ تو پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ پھر نہ کرو ایسا کام

اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

کبھی اگر تم ایمان رکھتے ہو اور کھولتا ہے اللہ تمہارے واسطے پتے کی باتیں، اور اللہ سب جانتا ہے

حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

حکمت والا ہے جو لوگ چاہتے ہیں کہ چرچا ہو بدکاری کا ایمان والوں میں

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

اُن کے لئے عذاب ہے دردناک دُنیا اور آخرت میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ ع النصف ع ۲ ۸

اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ نرمی کرنے والا ہے مہربان

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ

تو کیا کچھ نہ ہوتا، اے ایمان والو نہ چلو قدموں پر شیطان کے اور جو کوئی چلے گا قدموں پر

الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

شیطان کے سو وہ تو یہی بتلائے گا بے حیائی اور بُری بات اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر

وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

اور اس کی رحمت تو نہ سنورتا تم میں ایک شخص بھی کبھی ولیکن اللہ سنوارتا ہے جس کو چاہے

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا

اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے اور قسم نہ کھائیں بڑے درجہ والے تم میں سے اور کشائش والے اس پر کہ دیں

اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڝ وَلْيَعْفُوْا

قرابتیوں کو اور محتاجوں کو اور وطن چھوڑنے والوں کو اللہ کی راہ میں اور چاہئے کہ معاف کریں

وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا

جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں بے خبر ایمان والیوں کو، ان کو پھٹکار ہے دُنیا میں

وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ ۙ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ

اور آخرت میں اور اُن کے لئے ہے بڑا عذاب جس دن کہ ظاہر کردیں گی اُن کی زبانیں

وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ

اور ہاتھ اور پاؤں جو کچھ وہ کرتے تھے اُس دن پوری دے گا اُن کو اللہ

دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ

اُن کی سزا جو چاہئے، اور جان لیں گے کہ اللہ وہی ہے سچا کھولنے والا گندیاں ہیں گندوں کے واسطے

وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ج وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ج

اور گندے واسطے گندیوں کے اور ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے اور ستھرے واسطے ستھریوں کے

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾ ع ۳ ۹

وہ لوگ بے تعلق ہیں ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں اُن کے واسطے بخشش ہے اور روزی ہے عزت کی

آسان ترجمۂ قرآن

یقین جانو کہ جو لوگ یہ جھوٹی تہمت گھڑ کر لائے ہیں، وہ تمہارے اندر ہی کا ایک ٹولہ ہے۔ تم اس بات کو اپنے لئے بُرا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہی بہتر ہے۔ ان لوگوں میں سے ہر ایک کے حصے میں اپنے کئے کا گناہ آیا ہے۔ اور ان میں سے جس شخص نے اس (بہتان) کا بڑا حصہ اپنے سر لیا ہے، اُس کے لئے تو زبردست عذاب ہے۔ ﴿۱۱﴾ جس وقت تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ مؤمن مرد بھی اور مؤمن عورتیں بھی اپنے بارے میں نیک گمان رکھتے اور کہہ دیتے کہ یہ کھلم کھلا جھوٹ ہے؟ ﴿۱۲﴾ وہ (بہتان لگانے والے) اس بات پر چار گواہ کیوں نہیں لے آئے؟ اب جبکہ وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ ﴿۱۳﴾ اور اگر تم پر دُنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے، اُن کی وجہ سے تم پر اُس وقت سخت عذاب آپڑتا، ﴿۱۴﴾ جب تم اپنی زبانوں سے اس بات کو ایک دوسرے سے نقل کر رہے تھے، اور اپنے منہ سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تھا، اور تم اس بات کو معمولی سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بڑی سنگین بات تھی۔ ﴿۱۵﴾ اور جس وقت تم نے یہ بات سنی تھی، اُسی وقت تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ: "ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم یہ بات منہ سے نکالیں، یا اللہ! آپ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے، یہ تو بڑا

زبردست بہتان ہے۔'' ⑯ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا، اگر واقعی تم مؤمن ہو۔ ⑰ اور اللہ تمہارے سامنے ہدایت کی باتیں صاف صاف بیان کر رہا ہے۔ اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ⑱ یاد رکھو کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیلے، اُن کے لئے دُنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔ ⑲ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہے، اور اللہ بڑا شفیق، بڑا مہربان ہے (تو تم بھی نہ بچتے) ⑳ اے ایمان والو! تم شیطان کے پیچھے نہ چلو، اور اگر کوئی شخص شیطان کے پیچھے چلے، تو شیطان تو ہمیشہ بے حیائی اور بدی کی تلقین کرے گا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک صاف نہ ہوتا، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، پاک صاف کر دیتا ہے، اور اللہ ہر بات سنتا، ہر چیز جانتا ہے۔ ㉑ اور تم میں سے جو لوگ اہلِ خیر ہیں اور مالی وسعت رکھتے ہیں، وہ ایسی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ کے راستے میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیں گے، اور اُنہیں چاہئے کہ معافی اور درگذر سے کام لیں۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ اللہ تمہاری خطائیں بخش دے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ㉒ یاد رکھو کہ جو لوگ پاک دامن بھولی بھالی مسلمان عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، اُن پر دُنیا اور آخرت میں پھٹکار پڑ چکی ہے، اور اُن کو اُس دن زبردست عذاب ہوگا ㉓ جس دن خود اُن کی زبانیں، اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں اُن کے خلاف اُس کرتوت کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ㉔ اُس دن اللہ اُن کو وہ بدلہ پورا پورا دیدے گا جس کے وہ مستحق ہیں، اور اُن کو پتہ چل جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے، اور وہی ساری بات کھول دینے والا ہے۔ ㉕ گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہیں، اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق۔ اور پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لائق ہیں، اور پاکباز مرد پاکباز عورتوں کے لائق۔ یہ (پاکباز مرد اور عورتیں) اُن باتوں سے بالکل مبرّا ہیں جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ اُن (پاکبازوں) کے حصے میں تو مغفرت ہے اور باعزّت رزق۔ ㉖

ربطِ آیات

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور کا بیشتر حصّہ اُن احکام سے متعلق ہے جو عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے جاری کئے گئے ہیں۔ اُس کے بالمقابل عفت وعصمت پر دست اندازی اور اس کی خلاف ورزی کی دُنیوی سزائیں اور اُن پر آخرت کا وبالِ عظیم ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے حدِّ زنا پھر حدّ قذف اور پھر لعان کا بیان آچکا ہے۔ حدِ قذف کے ضمن میں کسی پاکدامن عورت پر جب تک چار گواہوں کی شہادت نہ ہو زنا کا الزام لگانا گناہِ عظیم قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے کے لئے حدِّ شرعی اسّی کوڑے لگانے کی جاری فرمائی ہے۔ یہ مسئلہ عام مسلمان پاکدامن عورتوں سے متعلق تھا۔ اور چونکہ ۶ھ میں بعض منافقین نے اُمّ المؤمنین حضرتِ صدیقہ عائشہؓ پر ایسی تہمت گھڑی تھی، اور تقلیداً بعض مسلمان بھی اُس

کا تذکرہ کرنے لگے تھے یہ معاملہ عام مسلمان پاکدامن عورتوں کے معاملہ سے کہیں زیادہ اشد تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی براءت اور پاکی کے بیان میں اس جگہ دس آیتیں مذکور الصدر نازل فرمائیں جن میں حضرت صدیقہؓ کی براءت ونزاہت کا اعلان اور اُن کے معاملہ میں جن لوگوں نے افتراء و بہتان میں کسی طرح کا حصہ لیا تھا ان سب کو تنبیہ اور دُنیا و آخرت میں اُن کے وبال کا بیان ہے۔ یہ بہتان بندی کا واقعہ قرآن وحدیث میں واقعہ اِفک کے نام سے مشہور ہے۔ اِفک کہتے ہیں بدترین قسم کے جھوٹ وافترا و بہتان کو۔ ان آیات کی تفسیر سمجھنے میں قصّہ افک کے معلوم ہونے کو بڑا دخل ہے اس لئے مناسب ہے کہ پہلے مختصر طور پر یہ قصہ بیان کر دیا جائے۔

قصّہ اِفک و بہتان

صحیحین [1] اور دوسری کتبِ حدیث میں یہ واقعہ غیر معمولی طویل تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی المصطلق میں جس کو غزوۂ مریسیع بھی کہا جاتا ہے ۶ھ میں تشریف لے گئے تو امہات المؤمنین میں سے حضرت صدیقہ عائشہؓ ساتھ تھیں، حضرت عائشہؓ کا اونٹ جس پر اُن کا ہودج (پردہ دار شغدف) ہوتا تھا اور چونکہ اُس وقت احکام پردہ کے نازل ہو چکے تھے تو معمول یہ تھا کہ صدیقہ عائشہؓ اپنے ہودج میں سوار ہو جاتیں پھر لوگ اُس ہودج کو اُٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ غزوہ سے فراغت اور مدینہ طیبہ کی طرف واپسی میں ایک روز یہ قصّہ پیش آیا کہ ایک منزل میں قافلہ ٹھہرا آخر شب میں کوچ سے کچھ پہلے اعلان کیا گیا کہ قافلہ روانہ ہونے والا ہے تاکہ لوگ اپنی اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر تیار ہو جائیں۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ کو قضاء حاجت کی ضرورت تھی اُس سے فراغت کے لئے جنگل کی طرف چلی گئیں وہاں اتفاق سے اُن کا ہار ٹوٹ کر گر گیا اس کی تلاش میں اُن کو دیر لگ گئی۔ جب واپس اپنی جگہ پہنچیں تو دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو چکا ہے اُن کے اونٹ کا قصّہ یہ ہوا کہ جب کوچ ہونے لگا تو عادت کے مطابق حضرت صدیقہ عائشہؓ کا ہَوْدج یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا گیا کہ حضرت صدیقہؓ اس میں موجود ہیں اُٹھاتے وقت بھی کچھ شبہ اس لئے نہ ہوا کہ اُس وقت حضرت صدیقہؓ کی عمر کم اور بدن میں نحیف تھیں کسی کو یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے چنانچہ اونٹ کو ہانک دیا گیا۔ حضرت صدیقہؓ نے اپنی جگہ واپس آکر قافلہ کو نہ پایا تو بڑی دانشمندی اور وقار واستقلال سے کام لیا کہ قافلہ کے پیچھے دوڑنے یا ادھر اُدھر تلاش کرنے کے بجائے اپنی جگہ چادر اوڑھ کر بیٹھ گئیں اور خیال کیا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور رفقاء کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو مجھے تلاش کرنے کے لئے یہاں پہنچیں گے، اگر میں اِدھر اُدھر

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الإفك ج:۲ ص:۵۹۳، وصحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الإفك، ومسند احمد، حدیث السیدة عائشة رضی الله تعالیٰ عنها، رقم الحدیث: ۲۶۳۷۱

کہیں اور گئی تو اُن کو تلاش میں مشکل ہوگی اس لئے اپنی جگہ پر چادر میں لپٹ کر بیٹھ رہیں۔ آخر رات کا وقت تھا نیند کا غلبہ ہوا وہیں لیٹ کر آنکھ لگ گئی۔

دوسری طرف قدرت نے یہ سامان کیا کہ حضرت صفوان بن معطل صحابیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خدمت کے لئے مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ قافلہ کے پیچھے رہیں اور قافلہ روانہ ہونے کے بعد گری پڑی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اُس کو اُٹھا کر محفوظ کرلیں۔ وہ صبح کے وقت اس جگہ پہنچے، ابھی روشنی پوری نہ تھی اتنا دیکھا کہ کوئی آدمی پڑا سو رہا ہے۔ قریب آئے تو حضرت صدیقہ عائشہؓ کو پہچان لیا کیونکہ اُنہوں نے پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے اُن کو دیکھا تھا۔ پہچاننے کے بعد انتہائی افسوس کے ساتھ اُن کی زبان سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ نکلا، یہ کلمہ صدیقہؓ کے کان میں پڑا تو آنکھ کھل گئی اور چہرہ ڈھانپ لیا، حضرت صفوانؓ نے اپنا اُونٹ قریب لا کر بٹھا دیا، حضرت صدیقہؓ اُس پر سوار ہوگئیں اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلنے لگے یہاں تک کہ قافلہ میں مِل گئے۔

عبداللہ بن اُبیّ بڑا خبیث منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا، اس کو ایک بات ہاتھ لگ گئی اور کم بخت نے واہی تباہی بکنا شروع کیا، اور بعض بھولے بھالے مسلمان بھی سُنی سُنائی اُس کا تذکرہ کرنے لگے۔ جیسے حضرت حسانؓ وحضرت مسطحؓ مردوں میں سے اور حضرت حمنہؓ عورتوں میں سے، تفسیر دُرِّ منثور میں بحوالہ ابنِ مردویہ حضرت ابنِ عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے کہ

[۱] اَعَانَهٗ اَیْ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ اُبَیٍّ حَسَّانُ وَمِسْطَحٌ وَحَمْنَةُ۔ [۲]

جب اس منافق کے بہتان کا چرچا ہوا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت صدمہ پہنچا، صدیقہ عائشہؓ کو تو انتہائی صدمہ پہنچنا ظاہر ہی ہے، عام مسلمانوں کو بھی اس سے سخت رنج وافسوس ہوا۔ ایک مہینہ تک یہی قصّہ چلتا رہا، آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیقہؓ کی براءت اور بہتان باندھنے یا اس میں شریک ہونے والوں کی مذمت میں مذکورہ بالا آیات نازل فرمادیں جن کی تفسیر آگے آتی ہے۔ قرآنی ضابطہ کے مطابق جس کا ذکر ابھی حدِّ قذف کے تحت میں آچکا ہے تہمت لگانے والوں سے شہادت کا مطالبہ کیا گیا وہ تو ایک بالکل ہی بے بنیاد خبر تھی، گواہ کہاں سے آتے، نتیجہ یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تہمت لگانے والوں پر شرعی ضابطہ کے مطابق حدِّ قذف جاری کی، ہر ایک کو اسّی اسّی کوڑے لگائے۔ بزار اور ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مسلمانوں پر حدِّ قذف جاری فرمائی: مسطحؓ، حمنہ، حسانؓ۔ اور طبرانی نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر عبداللہ بن اُبیّ منافق جس نے اصل تہمت گھڑی تھی، اس پر دُہری حد جاری فرمائی۔ پھر مؤمنین نے

---

[۱] ترجمہ: حضرت حسانؓ، حضرت مسطحؓ اور حضرت حمنہؓ نے عبداللہ بن اُبی کا ساتھ دیا۔

[۲] الدر المنثور (بألفاظ مختلفة) ج:۷ ص:۲۵۶ تحت هذه الآية۔

توبہ کرلی اور منافقین اپنے حال پر قائم رہے۔ (بیان القرآن) [1]

خلاصۂ تفسیر

(اے مسلمانو! تم جو صدیقہ عائشہؓ کے متعلق جھوٹی تہمت کی شہرت سے رنجیدہ ہو اس میں خود صدیقہؓ بھی داخل ہیں تو تم زیادہ غم نہ کرو کیونکہ) جن لوگوں نے یہ طوفان (حضرت صدیقہ عائشہؓ کی نسبت) برپا کیا ہے وہ تمہارے میں کا ایک (چھوٹا سا) گروہ ہے (کیونکہ تہمت لگانے والے کُل چار تھے، ایک بالذات اور جھوٹی تہمت گھڑنے والا یعنی عبداللہ بن اُبیّ منافق، اور تین بالواسطہ جو اس کی خبر سے متاثر ہوگئے یعنی حسّان، مِسْطَحْ وَحَمْنَہْ جو مؤمن مخلص تھے ان سب کو قرآن نے (مِنْكُمْ) میں داخل کیا یعنی مسلمانوں میں، حالانکہ عبداللہ بن اُبیّ منافق تھا اس کی وجہ اُن کا ظاہری دعوائے اسلام تھا۔ مطلب آیت کا تسلی دینا ہے کہ زیادہ غم نہ کرو، اوّل تو خبر جھوٹی، پھر ناقل بھی کُل چار ہی آدمی، اور زیادہ آدمی تو اس کے مخالف ہی ہیں پس عُرفاً بھی یہ موجب زیادہ غم کا نہ ہونا چاہئے، آگے ایک اور طریقہ پر تسلّی ہے کہ) تم اس (بہتان بندی) کو اپنے حق میں بُرا نہ سمجھو (گو ظاہر میں غم کی بات ہے مگر واقع میں اس سے تمہارا ضرر نہیں) بلکہ یہ (باعتبار انجام کے) تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے (کیونکہ اس غم سے تم کو صبر کا ثواب ملا، تمہارے درجے بڑھے، خصوصاً متہم حضرات کی براءۃ کے لئے نصِ قطعی آئی اور آئندہ بھی مسلمانوں کے حق میں خیر ہے کہ ایسے مصیبت زدہ اس واقعہ سے تسلی حاصل کیا کریں گے پس تمہارا تو کوئی ضرر نہ ہوا البتہ ان چرچا کرنے والوں کا ضرر ہوا کہ) ان میں سے ہر شخص کو جتنا کسی نے کچھ کیا تھا گناہ ہوا (مثلاً زبان سے کہنے والوں کو زیادہ گناہ اور سُن کر خاموش رہ جانے والوں کو یا دل سے بدگمانی کرنے والوں کو اس کے موافق گناہ ہوا) اور ان میں جس نے اس (بہتان) میں سب سے بڑا حصّہ لیا (کہ اس کو اختراع کیا مراد اس سے عبداللہ بن اُبیّ منافق ہے) اس کو (سب سے بڑھ کر) سخت سزا ہوگی (مراد اس سے جہنم ہے جس کا استحقاق پہلے سے بوجہ کفر ونفاق وعداوتِ رسول کے بھی تھا اب اور زیادہ سزا کا مستحق ہوگیا، یہ تو غم زدوں کے ضرر کی نفی اور بہتان باندھنے والوں کے ضرر کا اثبات تھا آگے ان میں جو مؤمنین تھے اُن کو ناصحانہ ملامت ہے کہ) جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں (جن میں حسّان وَمِسْطَح بھی آگئے) اور مسلمان عورتوں نے (جن میں حَمنہ بھی آگئیں) اپنے آپس والوں کے ساتھ (یعنی حضرت صدیقہؓ اور ان صحابی کے ساتھ دل سے) گمان نیک کیوں نہ کیا اور (زبان سے) یہ کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے (جیسا کہ دُرِّ منثور میں ابو ایوبؓ اور اُن کی زوجہ کا یہی قول مروی ہے۔ [2] اس میں بہتان باندھنے والوں کے ساتھ وہ

---

[1] بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۸، والمعجم الکبیر، رقم الحدیث:۱۹۱۸۲

[2] الدر المنثور تحت هٰذه الآیة ج:۷ ص:۲۶۵

بھی شامل ہیں جو سُن کر خاموش رہے یا شک میں پڑ گئے ان سب پر بھی ملامت ہے جن میں عام مؤمنین ومؤمنات بھی داخل ہوگئے۔ آگے اس تہمت کو رَد کرنے اور نیک گمان رکھنے کے وجوب کی وجہ ارشاد ہے کہ) یہ (بہتان لگانے والے) لوگ اس (اپنے قول) پر چار گواہ کیوں نہ لائے (جو کہ اثباتِ زنا کے لئے شرط ہے) سو جس حالت میں یہ لوگ گواہ (موافق قاعدہ کے) نہیں لائے تو بس اللہ کے نزدیک (جو قانون ہے اس کے اعتبار سے) یہ جھوٹے ہیں (آگے بہتان لگانے والوں میں جو مؤمن تھے اُن پر بھی رحمت کا ذکر ہے) اور اگر (اے حسّان و مِسطح وحَمنہ) تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم نہ ہوتا دُنیا میں (بھی کہ توبہ کی مہلت دی) اور آخرت میں (بھی کہ توبہ کی توفیق دی اور اس کو قبول بھی کرلیا اگر یہ نہ ہوتا) تو جس شغل میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا (جیسا عبداللہ بن اُبیّ کو بوجہ عدم توبہ کے ہوگا گو اس وقت مہلت دُنیا میں اس کو بھی دیدی گئی مگر مجموعہ دارین میں رحمت نہیں ہے اور اس سے معلوم ہوگیا کہ صحابہؓ مقبول التوبہ اور پاک ہوکر آخرت میں مرحوم ہیں اور عَلَیْکُمْ میں خطاب مؤمنین کو ہونے کا قرینہ اولاً اوپر کی آیت میں یہ ارشاد ہے: ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ (النور:۱۲)، ثانیاً فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (النور:۱۴) فرمانا کہ منافق تو آخرت میں جہنم کے درک اسفل یعنی نچلے طبقہ کا مستحق ہے وہ یقیناً مَرْحُوْمٌ فِی الْاٰخِرَةِ نہیں ہوسکتا۔ ثالثاً آگے یَعِظُکُمْ، لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ میں طبرانی نے ابنِ عباسؓ کا قول نقل کیا ہے: یُرِیْدُ مِسْطَحًا وَحَمْنَةَ وَحَسَّانًا۔ کذا فی الدر المنثور [1] یعنی لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ کے مخاطب صرف تین مؤمن ہیں، یعنی مِسطح، حَمنہ، حسّان۔ آگے اس کا بیان ہے کہ مؤمنین پر اگر اللہ کا خاص فضل نہ ہوتا کہ اُن کو توبہ کی توفیق دی اور توبہ بھی کرلی تو جو کام اُنہوں نے کیا تھا وہ اپنی ذات میں عذابِ عظیم کا موجب تھا فرمایا) جبکہ تم اس (جھوٹ بات) کو اپنی زبانوں سے نقل درنقل کررہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو (کسی دلیل سے) مطلق خبر نہیں (اور ایسی خبر کے ناقل کا کاذب ہونا فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْکٰذِبُوْنَ ⑬ [2] (النور) میں بیان ہو چکا ہے) اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات (یعنی موجبِ گناہِ عظیم) تھی (اول تو کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت خود بڑی معصیت ہے پھر وہ بھی کون، ازواج مطہرات میں سے کہ اُن پر تہمت لگانا جنابِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا سبب بنا۔ پس اس میں بہت سے اسباب معصیت کے جمع تھے) اور تم نے جب اس (بات) کو (اوّل) سُنا تھا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ایسی بات منہ سے بھی نکالیں۔ معاذ اللہ یہ تو بڑا بہتان ہے (جیسا کہ بعض صحابہ نے اسی طرح کہا تھا جیسا کہ سعد بن معاذ، زید بن حارثہ وابی ایوب سے اسی طرح کا قول منقول ہے اور زائد کی نفی نہیں ہے ممکن ہے اور بہتوں نے کہا ہو۔ مطلب یہ کہ قاذفین اور ساکتین سب کو یہی کہنا چاہئے تھا۔ یہاں تک تو ماضی پر ملامت تھی اب مستقبل کے لئے نصیحت ہے جو کہ اصل مقصود ہے ملامت کا، پس ارشاد ہے کہ) اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت

[1] الدر المنثور ج:۷ ص:۲۵۷، والمعجم الکبیر، رقم الحدیث:۱۹۱۲۲ [2] ترجمہ: تو بس اللہ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔

کرتا ہے کہ پھر ایسی حرکت مت کرنا اگر تم ایمان والے ہو اور اللہ تعالیٰ تم سے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے (جس میں نصیحت اور حدِ قذف اور قبولِ توبہ جو اوپر مذکور ہو چکے ہیں سب داخل ہیں) اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (تمہارے دل کی ندامت کا حال بھی اس کو معلوم ہے اس لئے توبہ قبول کرلی اور سیاست کی حکمت بھی خوب جانتا ہے اس لئے تمہیں سیاستۂ دُنیا میں سزا دی گئی بھذا فسّرہ ابن عباسؓ رواہ فی الدر[1]۔ یہاں تک نزولِ براءۃ سے قبل تہمت کا تذکرہ کرنے والوں کا ذکر تھا۔ آگے ان کا ذکر ہے جو قرآن میں نزولِ براءۃ کے بعد بھی باز نہ آئیں اور ظاہر ہے ایسا شخص بے ایمان ہی ہوگا پس ارشاد ہے) جو لوگ (بعد نزول ان آیات کے بھی) چاہتے ہیں (یعنی اس کی کوشش عملی کرتے ہیں) کہ بے حیائی کی بات کا مسلمانوں میں چرچا ہو۔ (یعنی یہ خبر شائع ہو کہ ان مسلمانوں میں بے حیائی کی بات ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ جو لوگ ان حضرات مقدسین کی طرف زنا کی نسبت کرتے ہیں) اُن کے لئے دُنیا وآخرت میں سزائے دردناک (مقرر) ہے اور (اس امر پر سزا کا تعجب مت کرو کیونکہ) اللہ تعالیٰ جانتا ہے (کہ کون معصیت کس درجہ کی ہے) اور تم (اس کی حقیقت پوری) نہیں جانتے (رواہ فی الدّر عن ابن عباسؓ[2] آگے ان لوگوں کو خطاب ہے جنہوں نے توبہ کرلی اور اس پر آخرت کے عذابِ عظیم سے محفوظ ہو گئے) اور (اے تائبین) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے (جس نے تم کو توفیق توبہ کی دی) اور یہ کہ اللہ بڑا شفیق بڑا رحیم ہے (جس نے تمہاری توبہ قبول کرلی) تو تم بھی (اس وعید سے) نہ بچتے (آگے مسلمانوں کو اپنی رحمت سے بلاتخصیص اس معصیت مذکورہ کے، تمام معاصی سے احتراز رکھنے کا امر اور تزکیہ بالتوبہ کی تصریح ہے جو اہتمام کے واسطے بعنواناتِ مختلفہ مکرر ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اے ایمان والو تم شیطان کے قدم بقدم مت چلو (یعنی اس کے اغواء واضلال پر عمل مت کرو) اور جو شخص شیطان کے قدم بقدم چلتا ہے تو وہ (ہمیشہ ہر شخص کو) بے حیائی اور نامعقول ہی کام کرنے کو کہے گا (جیسا اس واقعۂ اِفک میں تم نے دیکھ لیا) اور (شیطان کے قدم بقدم چل چکنے کے اور گناہ سمیٹ لینے کے بعد اس کے وبال وضرر سے جو کہ ثابت ہو ہی چکا تھا نجات دیدینا یہ بھی ہمارا ہی فضل تھا ورنہ) اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا (یا تو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوتی جیسا منافقین کو نہ ہوئی اور یا توبہ قبول نہ کی جاتی، کیونکہ ہم پر کوئی چیز واجب تو ہے نہیں) ولیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک وصاف کردیتا ہے (اور بعد توبہ کے اپنے فضل سے وعدہ قبولیت کا بھی فرمالیا ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (پس تمہاری توبہ سُن لی اور تمہاری ندامت جان لی اس لئے فضل فرمادیا۔ آگے اس کا بیان ہے کہ بعد نزولِ آیات براءۃ کے بعض صحابہ نے (جن میں ابوبکر صدیقؓ بھی ہیں، رواہ البخاری[3] اور دوسرے صحابہ بھی ہیں۔ کذا فی الدر المنثور عن ابنِ عباسؓ)[4]

[1] [2] الدر المنثور ج:۷ ص:۲۵۷ [3] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الإفك ج:۲ ص:۵۹۲

[4] الدر المنثور تحت هذه الآية ج:۷ ص:۲۷۲

شدتِ غیظ میں قسم کھالی کہ جس جس نے یہ چرچا کیا ہے جن میں حاجت مند بھی تھے اُن کو اب سے کسی قسم کی مالی امداد نہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عفو تقصیر اور امداد جاری کر دینے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں) اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنیوی) وسعت والے ہیں وہ اہلِ قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں (یعنی اس قسم کے مقتضٰی پر قائم نہ رہیں بلکہ توڑ ڈالیں یہ مطلب ہے ورنہ قسم تو ہو ہی چکی تھی، یعنی ان صفات کا مقتضٰی ہے امداد کرنا خصوصاً جس میں کوئی سبب امداد کرنے کا ہو جیسے حضرت مسطحؓ کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک کے رشتہ دار بھی ہیں اور مسکین اور مہاجر بھی ہیں، آگے ترغیب کے لئے فرماتے ہیں کہ) اور چاہئے کہ یہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے (سو تم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کر دو) بیشک اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے (سو تم کو بھی تخلُّق باخلاق الٰہیہ چاہئے آگے منافقین کی وعید کی تفصیل ہے جس کا اوپر اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ الخ میں اجمالاً ذکر تھا یعنی) جو لوگ (بعد نزول آیات کے بدکاری کی) تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاکدامن ہیں (اور) ایسی باتوں (کے کرنے اور اس کے ارادے) سے (بھی محض) بے خبر ہیں (اور) ایمان والیاں ہیں (اور جن کی براءۃ نصِ قرآن سے ثابت ہو چکی ہے اور جمع لانا اس لئے ہے کہ سب ازواج مطہرات کو شامل ہو جائے کہ الطیبات سے سب کی طہارت ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جو ایسی مطہرات کو متہم کریں کافر اور منافق ہی ہو سکتے ہیں) ان پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی رحمتِ خاصہ سے دارین میں بوجہ کفر کے دُور ہوں گے) اور ان کو (آخرت میں) بڑا عذاب ہوگا جس روز ان کے خلاف ان کی زبانیں گواہی دیں گی اور اُن کے ہاتھ اور ان کے پاؤں بھی (گواہی دیں گے) ان کاموں کی جو کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے (مثلاً زبان کہے گی کہ اس نے میرے ذریعہ سے فلاں فلاں کفر کی بات بکی۔ اور ہاتھ پاؤں کہیں گے کہ اس نے ترویج کفریات کے لئے یوں تگاپو کی) اس روز اللہ تعالیٰ اُن کو ان کا واجبی بدلہ پورا پورا دے گا اور (اس روز ٹھیک ٹھیک) ان کو معلوم ہوگا کہ اللہ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا (اور) بات (کی حقیقت) کو کھول دینے والا ہے (یعنی اب تو بوجہ کفر کے اس بات کا اعتقاد ان کو کما حقہٗ نہیں مگر قیامت کے روز معلوم ہو جائے گا اور یہ معلوم کر کے بالکل نجات سے مایوس ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے مناسب فیصلہ عذاب ابدی ہے یہ آیتیں غیر تائبین کے بارے میں ہیں جو نزول آیات براءت کے بعد بھی اعتقادِ تہمت سے باز نہیں آئے۔ تائبین کو فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ (النور: ۲۰) میں مرحوم دارین فرمایا اور غیر تائبین کو لُعِنُوْا میں ملعون دارین فرمایا۔ تائبین کو لَمَسَّکُمْ فِیْ مَآ اَفَضْتُمْ فِیْہِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ میں عذاب سے محفوظ بتلایا تھا اور غیر تائبین کو لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ میں و نیز اس سے قبل وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ الخ میں مبتلائے عذاب بتلایا۔ تائبین کے لئے وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (النور: ۲۲) میں بشارت عفو و غفران اور فضیحت کی فرمائی۔ تائبین کو مَازَکٰی مِنْکُمْ الخ میں طاہر بتلایا تھا غیر تائبین کو اگلی آیت میں خبیث فرمایا جس میں مضمون براءت پر

استدلال کر کے قصہ کو ختم فرمایا ہے یعنی یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ) گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لائق ہوتے ہیں (ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ ضروریات سے ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز آپ کے لائق اور مناسب ہی دی گئی ہے اور وہ ستھری ہی چیزیں ہیں تو ضرور اس مقدمہ ضروریہ کے اعتبار سے آپ کی بی بی بھی ستھری ہیں اور اُن کے ستھرے ہونے سے اس تہمت خاص سے حضرت صفوانؓ کا منزہ ہونا بھی لازم آیا اسی لئے آگے فرماتے ہیں کہ) یہ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں، ان (حضرات) کے لئے (آخرت میں) مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے۔

معارف و مسائل

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خصوصی فضائل و کمالات اور قصہ افک کا کچھ بقیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے آپ کے خلاف اپنی ساری ہی تدبیریں صرف کر ڈالیں اور آپ کو ایذا پہنچانے کی جو جو صورتیں کسی کے ذہن میں آسکتی تھیں وہ سبھی جمع کی گئیں۔ کفار کی طرف سے جو ایذائیں آپ کو پہنچی ہیں اُن میں شاید یہ آخری سخت اور روحانی ایذا تھی کہ ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ عالم و فاضل اور مقدس ترین اُمّ المؤمنین صدیقہ عائشہؓ پر اور اُن کے ساتھ حضرت صفوان بن معطلؓ جیسے مقدس صحابی پر عبداللہ بن اُبیّ منافق نے تہمت گھڑی۔ منافقین نے اس کو رنگ دیئے اور پھیلا دیا۔ اس میں سب سے زیادہ رنج دِہ یہ بات ہوئی کہ چند سیدھے سادے مسلمان بھی اُن کی سازِش سے متأثر ہو کر تہمت کے تذکرے کرنے لگے۔ اس بے اصل و بے دلیل ہوائی تہمت کی چند روز میں خود ہی حقیقت کھل جاتی مگر اُمّ المؤمنینؓ کو اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اس تہمت سے رُوحانی ایذا پہنچی تھی حق تعالیٰ نے اُس کے ازالہ اور صدیقہؓ کی براءت کے لئے وحیِ الٰہی کے کسی اشارہ پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قرآن کے تقریباً دو رکوع ان کی براءت میں نازل فرمائے۔ اور جن لوگوں نے یہ تہمت گھڑی یا جن لوگوں نے اس کے تذکرے میں حصّہ لیا ان سب پر عذابِ دنیا و آخرت کی ایسی وعیدیں بیان فرمائیں کہ شاید اور کسی موقع پر ایسی وعیدیں نہیں آئیں۔

درحقیقت اس واقعہ افک نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی عفت و تقدس کے ساتھ اُن کی اعلیٰ عقل و فہم کے کمالات کو بھی روشن کر دیا۔ اسی لئے اس واقعہ میں جو آیات اُوپر مذکور ہوئیں اُن میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس حادثہ کو اپنے لئے شر نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے خیر ہے اس سے بڑی خیر کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے دس آیات میں اُن کی پاکی

اور نزاہت کی شہادت دی جو قیامت تک تلاوت کی جائے گی۔ خود صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے اپنی جگہ یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر میری صفائی اور براءت ظاہر فرمادیں گے مگر میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے معاملہ میں قرآن کی آیات نازل ہو جائیں گی جو ہمیشہ پڑھی جائیں گی۔ اس جگہ واقعہ کی کچھ مزید تفصیل جان لینا بھی آیات کے سمجھنے میں معین ہوگا اس لئے اس کو مختصراً لکھا جاتا ہے:

اس سفر سے واپس آنے کے بعد حضرت صدیقہؓ اپنے گھریلو کام میں مشغول ہو گئیں ان کو کچھ خبر نہیں تھی کہ منافقین نے اُن کے بارے میں کیا خبریں اُڑائی ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت میں خود حضرت صدیقہؓ کا بیان ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد کچھ میری طبیعت خراب ہوگئی اور سب سے بڑی وجہ طبیعت خراب ہونے کی یہ ہوگئی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم اپنے ساتھ نہ دیکھتی تھی جو ہمیشہ سے معمول تھا بلکہ اس عرصہ میں آپ کا معاملہ یہ رہا کہ گھر میں تشریف لاتے اور سلام کرتے پھر پوچھ لیتے کیا حال ہے اور واپس تشریف لے جاتے تھے۔ مجھے چونکہ اس کی کچھ خبر نہ تھی کہ میرے بارے میں کیا خبر مشہور کی جارہی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کا راز مجھ پر نہ کھلتا تھا۔ میں اسی غم میں گھلنے لگی۔ ایک روز اپنی کمزوری کی وجہ سے مِسطحؓ صحابیؓ کی والدہ اُمِّ مِسطحؓ کو ساتھ لے کر میں نے قضاء حاجت کے لئے باہر جانے کا ارادہ کیا کیونکہ اُس وقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا۔ جب میں قضاء حاجت سے فارغ ہو کر گھر کی طرف آنے لگی تو اُمِّ مِسطحؓ کا پاؤں اُن کی بڑی چادر میں الجھا اور یہ گر پڑیں۔ اس وقت ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلا [1] تَعِسَ مِسْطَحٌ یہ ایسا کلمہ ہے جو عرب میں بددعا کے لئے استعمال ہوتا ہے اس میں ماں کی زبان سے اپنے بیٹے مِسطح کے لئے بددعا کا کلمہ سُن کر صدیقہ عائشہؓ کو تعجب ہوا۔ ان سے فرمایا کہ یہ بہت بُری بات ہے تم ایک نیک آدمی کو بُرا کہتی ہو جو غزوۂ بدر کا شریک تھا یعنی ان کا بیٹا مِسطح، اس پر اُمِّ مِسطحؓ نے تعجب سے کہا کہ بیٹی کیا تم کو خبر نہیں کہ مِسطحؓ میرا بیٹا کیا کہتا پھرتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے تب اُن کی والدہ نے مجھے یہ سارا واقعہ اہلِ افک کی چلائی ہوئی تہمت کا اور مسطح کا اس میں شریک ہونا بیان کیا۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ سُن کر میرا مرض دوگنا ہو گیا۔ جب میں گھر میں واپس آئی اور حسبِ معمول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے سلام کیا اور مزاج پُرسی فرمائی تو صدیقہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں۔ آپ نے اجازت دیدی۔ منشاء یہ تھا کہ والدین سے اس معاملہ کی تحقیق کریں۔ میں نے جا کر والدہ سے پوچھا، اُنہوں نے تسلّی دی کہ تم جیسی عورتوں کے دشمن ہوا کرتے ہیں اور ایسی چیزیں مشہور کیا کرتے ہیں تم اس کے غم میں نہ پڑو خود بخود معاملہ صاف ہو جائے گا۔ میں نے کہا، سبحان اللہ! لوگوں میں اس کا چرچا ہو چکا میں اس پر کیسے صبر کروں۔ میں ساری رات روتی رہی، نہ میرا آنسو تھما نہ آنکھ لگی۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس خبر

[1] ترجمہ: ہلاک ہو مسطح۔

کے پھیلنے سے سخت غمگین تھے اور اس عرصہ میں اس معاملے کے متعلق کوئی وحی بھی آپ پر نہ آئی تھی اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور اُسامہ بن زیدؓ جو دونوں گھر کے ہی آدمی تھے ان سے مشورہ لیا کہ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟ حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے تو کھل کر عرض کیا کہ جہاں تک ہمارا علم ہے ہمیں عائشہ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں، ان کی کوئی بات ایسی نہیں جس سے بدگمانی کی راہ پیدا ہو، آپ ان افواہوں کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے (آپ کو غم واضطراب سے بچانے کے لئے) یہ مشورہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کچھ تنگی نہیں فرمائی، اگر افواہوں کی بناء پر عائشہ کی طرف سے کچھ تکدّر طبعی ہو گیا ہے تو عورتیں اور بہت ہیں، اور آپ کا یہ تکدّر اس طرح بھی رفع ہو سکتا ہے کہ بریرۃؓ جو صدیقہ عائشہؓ کی کنیز ہیں اُن سے ان کے حالات کی تحقیق فرمالیجئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرۃؓ سے پوچھ گچھ فرمائی بریرۃؓ نے عرض کیا کہ اور تو کوئی بات عیب کی مجھے ان میں نظر نہیں آئی بجز اس کے کہ نوعمر لڑکی ہیں، بعض اوقات آٹا گوندھ کر رکھ دیتی ہیں خود سو جاتی ہیں، بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے (اس کے بعد حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ دینا اور برسرِ منبر تہمت گھڑنے والوں اور افواہ پھیلانے والوں کی شکایت کا ذکر فرمانا اور طویل قصہ مذکور ہے۔ آگے کا مختصر قصہ یہ ہے کہ) صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے یہ سارا دن پھر دوسری رات بھی مسلسل روتے ہوئے گزری میرے والدین بھی میرے پاس آگئے تھے وہ ڈر رہے تھے کہ رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھ گئے اور جب سے یہ قصہ چلا تھا اس سے پہلے آپ میرے پاس آکر نہ بیٹھے تھے، پھر آپ نے ایک مختصر خطبۂ شہادت پڑھا اور فرمایا: اے عائشہ! مجھے تمہارے بارے میں یہ باتیں پہنچی ہیں، اگر تم بَری ہو تو ضرور اللہ تعالیٰ تمہیں بَری کر دیں گے (یعنی براءت کا اظہار بذریعہ وحی فرما دیں گے) اور اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہے تو اللہ سے توبہ واستغفار کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کلام پورا فرما لیا تو میرے آنسو بالکل خشک ہو گئے، میری آنکھوں میں ایک قطرہ نہ رہا، میں نے اپنے والد ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ ابوبکرؓ نے عذر کیا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ جواب دیجئے، انہوں نے بھی عذر کر دیا کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اب مجبور ہو کر مجھے ہی بولنا پڑا، میں ایک کم عمر لڑکی تھی اب تک قرآن بھی زیادہ نہیں پڑھ سکی تھی، اس وقت اس رنج وغم اور انتہائی صدمہ کی حالت میں جبکہ اچھے اچھے عقلاء کو بھی کوئی معقول کلام کرنا آسان نہیں ہوتا حضرت صدیقہؓ نے جو کچھ فرمایا، وہ ایک عجیب وغریب عاقلانہ، فاضلانہ کلام ہے، اس کے الفاظ بعینہٖ لکھے جاتے ہیں:

وَاللهِ لَقَدْ عَرَفْتُ لَقَدْ سَمِعْتُمْ هٰذَا الْحَدِيْثَ حَتّٰى اسْتَقَرَّ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ وَصَدَّقْتُمْ بِهٖ، وَلَئِنْ قُلْتُ لَكُمْ اِنِّيْ بَرِيْٓئَةٌ -وَاللهُ يَعْلَمُ اَنِّيْ بَرِيْٓئَةٌ- لَا تُصَدِّقُوْنِيْ، وَلَئِنِ اعْتَرَفْتُ لَكُمْ بِاَمْرٍ

وَاللهُ يَعْلَمُ اَنِّیْ مِنْهُ بَرِیْئَةٌ لَتُصَدِّقُوْنِیْ، وَاللهِ لَا اَجِدُ لِیْ وَلَکُمْ مَثَلًا اِلَّا کَمَا قَالَ اَبُوْ یُوْسُفَ: فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ۔

بخدا! مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ آپ نے اس بات کو سُنا اور سُنتے رہے یہاں تک کہ آپ کے دل میں بیٹھ گئی اور آپ نے اُس کی (عملاً) تصدیق کردی۔ اب اگر میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بَری ہوں -جیسا کہ اللہ جانتا ہے کہ واقع میں بَری ہوں- تو آپ میری تصدیق نہ کریں گے، اور اگر میں ایسے کام کا اعتراف کرلوں جس سے میرا بَری ہونا اللہ تعالیٰ جانتا ہے تو آپ میری بات مان لیں گے۔ واللہ! اب میں اپنے اور آپ کے معاملہ کی کوئی مثال بجز اس کے نہیں پاتی جو یوسف علیہ السلام کے والد یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی غلط بات سُن کر فرمائی تھی کہ میں صبرِ جمیل اختیار کرتا ہوں اور اللہ سے اُس معاملہ میں مدد طلب کرتا ہوں جو تم بیان کر رہے ہو۔

صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اتنی بات کر کے میں الگ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی اور فرمایا کہ مجھے یقین تھا کہ جیسا کہ میں فی الواقع بَری ہوں اللہ تعالیٰ میری براءت کا اظہار بذریعہ وحی ضرور فرمائیں گے۔ لیکن یہ وہم وخیال بھی نہ تھا کہ میرے معاملے میں قرآن کی آیات نازل ہوں گی جو ہمیشہ تلاوت کی جائیں گی کیونکہ میں اپنا مقام اس سے بہت کم محسوس کرتی تھی۔ ہاں یہ خیال تھا کہ غالباً آپ کو خواب میں میری براءت ظاہر کردی جائے گی۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس مجلس سے ابھی نہیں اُٹھے تھے اور گھر والوں میں بھی کوئی نہیں اُٹھا تھا کہ آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو نزولِ وحی کے وقت ہوا کرتی تھی، جس سے سخت سردی کے زمانے میں آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ پھوٹنے لگتا تھا، جب یہ کیفیت رفع ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے ہوئے اُٹھے اور سب سے پہلا کلمہ جو فرمایا وہ یہ تھا اَبْشِرِیْ یَا عَائِشَةُ اَمَّا اللهُ فَقَدْ اَبْرَأَكِ یعنی اے عائشہ! خوشخبری سنو، اللہ تعالیٰ نے تو تمہیں بَری کر دیا۔ میری والدہ نے کہا کہ کھڑی ہو جاؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو، میں نے کہا کہ نہ میں اس معاملہ میں اللہ کے سوا کسی کا احسان مانتی ہوں نہ کھڑی ہوں گی، میں اپنے رَبّ کی شکرگزار ہوں کہ اُسی نے مجھے بَری فرمایا۔[1]

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی چند خصوصیات

امام بغویؒ نے اِنہیں آیات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو اِن کے علاوہ کسی دوسری عورت کو نصیب نہیں ہوئیں اور صدیقہ عائشہؓ بھی (بطور تحدیث بالنعمة) ان چیزوں کو فخر کے ساتھ بیان

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الإفك ج:۲ ص:۵۹۶

فرمایا کرتی تھیں۔ **ایک** یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے جبرئیل امین ایک ریشمی کپڑے میں میری تصویر لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ یہ تمہاری زوجہ ہے (رواہ الترمذی [۱] عن عائشۃؓ) اور بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل امین اپنی ہتھیلی میں یہ صورت لے کر تشریف لائے تھے۔ [۲]

دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوا کسی کنواری لڑکی سے نکاح نہیں کیا۔ **تیسری** یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اُن کی گود میں ہوئی۔ **چوتھی** یہ کہ بیتِ عائشہؓ ہی میں آپ مدفون ہوئے۔ **پانچویں** یہ کہ آپ پر اُس وقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جبکہ آپ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک لحاف میں ہوتے تھے دوسری کسی بی بی کو یہ خصوصیت حاصل نہ تھی۔ **چھٹی** یہ کہ آسمان سے اُن کی براءت نازل ہوئی۔ **ساتویں** یہ کہ وہ خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں اور صدیقہ ہیں اور اُن میں سے ہیں جن سے دُنیا ہی میں مغفرت اور رزقِ کریم کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے۔ (مظہری) [۳]

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فقیہانہ اور عالمانہ تحقیقات اور فاضلانہ تقریر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ بن طلحہؓ نے فرمایا کہ میں نے صدیقہ عائشہؓ سے زیادہ فصیح و بلیغ نہیں دیکھا۔ (رواہ الترمذی) [۴]

تفسیر قرطبی میں نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچّے کو گویائی دے کر اُس کی شہادت سے اُن کی براءت ظاہر فرمائی، اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت سے اُن کو بَری کیا، اور حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دسؔ آیات نازل کر کے اُن کی براءت کا اعلان کیا، جس نے اُن کے فضل و عزت کو اور بڑھا دیا۔ [۵]

آیاتِ مذکورہ کی اجمالی تفسیر خلاصۂ تفسیر کے عنوان میں آچکی ہے اب آیات کے خاص خاص جملوں سے متعلق کچھ مباحث ہیں وہ دیکھئے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡكِ عُصۡبَةٌ مِّنۡكُمۡ **اِفۡك** کے اصل لغوی معنے پلٹ دینے اور بدل دینے کے ہیں۔ بدترین قسم کا جھوٹ جو حق کو باطل سے اور باطل کو حق سے بدل دے پاکباز متقی کو فاسق، فاسق کو متقی پرہیزگار بنادے اس جھوٹ کو بھی اِفک کہتے ہیں۔ **عُصۡبَہ** کے معنے جماعت کے ہیں جو دس سے چالیس تک ہو، اس سے کم وبیش کے لئے بھی استعمال کیا

[۱] جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشة رضی الله عنها ج:۲ ص:۲۲۶

[۲] مجمع الزوائد، رقم الحدیث:۱۵۳۰۷

[۳] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:۶ ص:۴۸۵

[۴] جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشة رضی الله تعالیٰ عنها ج:۲ ص:۲۲۷

[۵] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱۲ ص:۲۱۲

جاتا ہے مِنْكُمْ سے مراد مؤمنین ہیں۔ اس تہمت کا اصل گھڑنے والا اگرچہ مسلمان نہیں بلکہ منافق عبداللہ ابن اُبیّ تھا جو مؤمنین میں داخل نہیں مگر منافقین جو دعویٰ اسلام کا کرتے تھے اُن پر بھی ظاہری احکام مؤمنین کے جاری ہوتے تھے اس لئے مِنْكُمْ کے لفظ میں اس کو بھی شامل کرلیا گیا۔ مسلمانوں میں سے دو مرد اور ایک عورت اس میں مبتلا ہوئے جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات نازل ہونے کے بعد حدِ قذف جاری فرمائی۔ كَمَا مَرَّ سَابِقًا۔ [1] مگر مؤمنین سب تائب ہوگئے اور اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اُن میں سے حضرت حسانؓ اور مسطحؓ دونوں شرکائے بدر میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مغفرت کا اعلان فرمادیا ہے۔ اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہؓ کے سامنے کوئی حضرت حسانؓ کی بُرائی کرتا تو وہ پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ یہ بھی اُن دو مَردوں میں شامل تھے جن پر حدِ قذف لگائی گئی تھی اور صدیقہؓ فرماتی تھیں کہ حسان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار کا شاعرانہ مقابلہ خوب کیا ہے اس لئے ان کو بُرا نہیں کہنا چاہئے۔ اور وہ جب صدیقہ عائشہؓ کے پاس حاضر ہوتے تو اُن کو تعظیم تکریم کے ساتھ بٹھاتی تھیں۔ (مظہری وغیرہ) [2]

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۗ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقہ عائشہؓ اور صفوانؓ اور تمام مؤمنین کو ہے جن کو اس افواہ کی اشاعت سے صدمہ پہنچا۔ اور معنے یہ ہیں کہ اس واقعہ کو آپ بُرا نہ سمجھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں براءت نازل فرما کر ان کا اعزاز اور بڑھادیا۔ اور جن لوگوں نے یہ حرکات کی تھیں اُن کی وعید شدید نازل فرمادی جو قیامت تک محرابوں میں پڑھی جائے گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ یعنی جن لوگوں نے اس بہتان میں جتنا حصہ لیا اُسی مقدار سے اس کا گناہ لکھا گیا ہے اور اُسی تناسب سے اُس کو عذاب ہوگا۔ جس نے یہ خبر گھڑی اور چلتی کی جس کا ذکر آگے آتا ہے وہ سب سے زیادہ عذاب کا مستحق ہے، جس نے خبر سُن کر تائید کی وہ اُس سے کم، جس نے سُن کر سکوت کیا وہ اُس سے کم۔

وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑪ لفظ كِبْر بکسر الکاف کے معنے بڑے کے ہیں مراد یہ ہے جس نے اس تہمت میں بڑا کام کیا یعنی اس کو گھڑا اور چلتا کیا اس کے لئے عذابِ عظیم ہے مراد اس سے عبداللہ بن اُبیّ منافق ہے۔ (رواہ البغوی وغیرہ) [3]

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ⑫ یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس تہمت کی خبر سنی تھی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اپنے بارے میں یعنی اپنے مسلمان بھائی بہن کے بارے

---

[1] ترجمہ: جیسا کہ یہ بات پیچھے گزر چکی ہے۔

[2] تفسیر المظهری ج:۶ ص:۴۷۵

[3] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورة النور، باب اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ الآیة ج:۲ ص:۶۹۶

میں نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ کھلا جھوٹ ہے۔ اس آیت میں کئی چیزیں قابلِ غور ہیں اوّل یہ کہ بِاَنْفُسِهِمْ کے لفظ سے قرآن کریم نے یہ اشارہ کیا کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو بدنام ورُسوا کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی کو رُسوا کرتا ہے کیونکہ اسلام کے رشتہ نے سب کو ایک بنا دیا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے تمام مواقع میں یہ اشارہ استعمال فرمایا ہے جیسا ایک جگہ فرمایا وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (الحجرات:۱۱) یعنی عیب نہ لگاؤ اپنے آپ کو۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کسی بھائی مسلمان مرد یا عورت کو۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء:۲۹) اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ مراد وہی ہے کہ کسی بھائی مسلمان کو قتل نہ کرو۔ تیسری جگہ فرمایا وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (البقرۃ:۸۴) یعنی نہ نکالو اپنے آپ کو اپنے گھروں سے۔ یہاں بھی کسی مسلمان بھائی کو اُس کے گھر سے نکالنا مراد ہے۔ چوتھی جگہ فرمایا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (النور:۶۱) یعنی اپنے آپ کو سلام کرو۔ مراد وہی بھائی مسلمان کو سلام کرنا ہے۔ یہ سب آیاتِ قرآن یہ ضمنی ہدایت دیتی ہیں کہ ایک مسلمان جو دوسرے کسی بھی مسلمان پر عیب لگاتا یا اس کو ایذاو نقصان پہنچاتا ہے حقیقت کے اعتبار سے خود اپنے کو عیب دار کرتا ہے اور خود نقصان و تکلیف اُٹھاتا ہے کیونکہ اس کا انجام پوری قوم کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے بقول سعدی ؎

[1] چو از قومے یکے بے دانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

قرآن کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب مسلمان اُبھرے تو پوری قوم کے ساتھ اُبھرے، اُن کا ہر فرد اُبھرا۔ اور اسی کے چھوڑنے کا نتیجہ آج آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ سب گرے اور ہر فرد گرا۔ دوسری بات اس آیت میں یہ قابل نظر ہے کہ مقام کا تقاضا یہ تھا کہ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَنْتُمْ بِاَنْفُسِكُمْ خَيْرًا بصیغہ خطاب کہا جاتا جیسا کہ شروع میں سَمِعْتُمُوْهُ بصیغہ خطاب آیا ہے۔ مگر قرآن کریم نے اس مختصر جملے کو چھوڑ اس جگہ طرز بدلا کہ صیغہ خطاب یعنی ظَنَنْتُمْ کے بجائے ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ فرمایا۔ اس میں ہلکا سا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ فعل جن لوگوں سے سرزد ہوا وہ اس فعل کی حد تک مؤمنون کہلانے کے مستحق نہیں کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے حُسنِ ظن قائم رکھتا۔

تیسری بات یہ قابلِ نظر ہے کہ اس آیت کے آخری جملے وَقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تقاضا ایمان کا یہ تھا کہ مسلمان اس خبر کو سنتے ہی کہہ دیتے کہ یہ کھلا جھوٹ ہے اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان کے بارے میں جب تک کسی گناہ یا عیب کا علم کسی دلیلِ شرعی سے نہ ہو جائے اُس وقت تک اُس کے ساتھ نیک گمان رکھنا اور بلا کسی دلیل کے عیب و گناہ کی بات اُس کی طرف منسوب کرنے کو جھوٹ قرار دینا عین تقاضائے ایمان ہے۔

مسئلہ:- اس سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان مرد و عورت کے ساتھ اچھا گمان رکھنا واجب ہے جب تک کسی دلیلِ شرعی سے اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ اور جو شخص بلا دلیلِ شرعی کے اُس پر الزام لگاتا ہے اُس کی بات کو رد کرنا

---

[1] ترجمہ: جب کسی قوم میں سے کوئی ایک شخص بھی ناسمجھی کرتا ہے تو نہ چھوٹے کا کوئی مقام رہتا ہے نہ بڑے کا۔

اور جھوٹا قرار دینا بھی واجب ہے کیونکہ وہ محض ایک غیبت اور مسلمان کو بلا وجہ رُسوا کرنا ہے۔ (مظہری)[1]

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ اس آیت کے پہلے جملہ میں تو اس کی تلقین ہے کہ ایسی خبر مشہور کرنے والوں کے بارہ میں مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ اُن کی بات کو چلتا کرنے کے بجائے اُن سے مطالبہ دلیل کا کرتے اور چونکہ تہمت زنا کے معاملے میں دلیل شرعی چار گواہوں کے بغیر قائم نہیں ہوتی. اس لئے اُن سے مطالبہ یہ کرنا چاہئے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اُس پر چار گواہ پیش کرو یا زبان بند کرو۔ دوسرے جملے میں فرمایا کہ جب وہ چار گواہ نہیں لا سکے تو اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کہ ایک شخص نے اپنی آنکھ سے ایک واقعہ دیکھا مگر اُس کو اس پر دوسرے گواہ نہیں ملے تو اگر یہ شخص اپنے چشم دید واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اس کو جھوٹا کیسے کہا جا سکتا ہے خصوصاً اللہ کے نزدیک جھوٹا کہنا تو کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب واقعات کے حقائق معلوم ہیں اور یہ واقعہ وجود میں آنا بھی معلوم ہے تو وہ عنداللہ جھوٹ بولنے والا کیسے قرار پایا۔ اس کے دو جواب ہیں اوّل یہ کہ یہاں عنداللہ سے مراد حکم اللہ اور قانونِ الٰہی ہے یعنی یہ شخص قانونِ الٰہی اور حکمِ خداوندی کی رو سے جھوٹا قرار دیا جائے گا اور اس پر حدِ قذف جاری کی جائے گی کیونکہ حکمِ ربّانی یہ تھا کہ جب چار گواہ نہ ہوں تو واقعہ دیکھنے کے باوجود اس کو بیان نہ کرو اور جو بغیر چار گواہوں کے بیان کرے گا وہ قانوناً اور حکماً جھوٹا قرار پا کر سزا پائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ کوئی کام فضول نہ کرے جس کا کوئی فائدہ نتیجہ نہ ہو خصوصاً ایسا کام جس میں دوسرے مسلمان پر کوئی الزام عائد ہوتا ہو۔ تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی عیب و گناہ کی شہادت صرف اس نیت سے دے سکتا ہے کہ جُرم و گناہ کا انسداد مقصود ہو کسی کو رُسوا کرنا یا ایذا دینا مقصود نہ ہو۔ تو جس شخص نے چار گواہوں کے بغیر اس قسم کی شہادت زبان سے نکالی گویا اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ میں یہ کام اصلاحِ خلق اور معاشرہ کو بُرائی سے بچانے اور انسداد جرائم کی نیت سے کر رہا ہوں۔ مگر جب شریعت کا قانون اس کو معلوم ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ایسی شہادت دینے سے نہ اُس شخص پر کوئی حد و سزا جاری ہوگی اور نہ ثبوت بہم پہنچے گا بلکہ اُلٹی جھوٹ بولنے کی سزا کا میں مستحق ہو جاؤں گا تو اس وقت وہ عنداللہ اپنی اس نیت کے دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ میں اصلاحِ خلق اور انسدادِ جرائم کی نیت سے یہ شہادت دے رہا ہوں کیونکہ شرعی ضابطہ کے مطابق شہادت نہ ہونے کی صورت میں یہ نیت ہو ہی نہیں سکتی۔ (مظہری)[2]

ایک اہم اور ضروری تنبیہ

مذکورہ دونوں آیتوں میں ہر مسلمان کو دوسرے مسلمانوں سے حُسنِ ظن رکھنے کی ہدایت اور اس کے خلاف بے دلیل

[1] [2] تفسیر المظہری تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:٤٧٦

باتوں کی تردید کو واجب قرار دیا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سے اس خبر کے غلط ہونے پر یقین کیوں نہ فرمایا اور اس خبر کی تردید کیوں نہ کر دی اور ایک مہینہ تک تردّد کی حالت میں کیوں رہے یہاں تک کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہو تو توبہ کر لینا چاہئے۔ (کما رواہ البخاری) [1]

وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حُسنِ ظن رکھنے کا جو حکم ہے وہ اس تردد کے منافی نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا، کیونکہ آپ نے اس خبر کی نہ تصدیق فرمائی اور نہ اس کے مقتضا پر کوئی عمل فرمایا، نہ اس کا چرچا کرنا پسند فرمایا بلکہ صحابہ کرام کے مجمع میں یہی فرمایا کہ مَا عَلِمْتُ عَلٰی اَهْلِیْ اِلَّا خَيْرًا۔ (رواہ البخاری) [2] یعنی میں اپنی اہلیہ کے بارے میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ یہ سب انہیں آیاتِ مذکورہ کے مقتضا پر عمل اور حُسنِ ظن رکھنے کے شواہد ہیں۔ البتہ قطعی اور یقینی علم جس سے طبعی تردّد بھی رفع ہو جائے وہ اُس وقت ہوا جب آیات براءت نازل ہوگئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دل میں کوئی شک و تردّد پیدا ہو جانا اور احتیاطی تدابیر استعمال کرنا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حُسنِ ظن بالمؤمنین کے منافی نہیں تھا جبکہ اُس کے مقتضا پر کوئی عمل نہ کیا گیا ہو۔ جن مسلمانوں پر اس معاملے میں حد قذف کی سزا جاری کی گئی اور ان دو آیتوں میں ان پر عتاب کیا گیا اُنہوں نے اس خبر کے مقتضا پر عمل کیا تھا کہ اُس کا چرچا کیا اور پھیلایا وہ نزولِ آیات سے پہلے بھی ناجائز و موجبِ سزا تھا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ یہ آیت اُن مؤمنین کے بارے میں نازل ہوئی جو غلطی سے اس تہمت میں کسی قسم کی شرکت کر بیٹھے تھے پھر توبہ کر لی اور بعض پر سزا بھی جاری ہوئی۔ ان سب کو اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جو جُرم تم سے سرزد ہوا وہ بہت بڑا جُرم تھا اُس پر دُنیا میں بھی عذاب آسکتا تھا جیسے پچھلی قوموں کے مجرموں پر آیا ہے اور آخرت میں بھی اُس پر عذابِ شدید ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کا معاملہ تم مؤمنین کے ساتھ فضل و رحمت کا ہے، دُنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ اس لئے یہ عذاب تم سے ٹل گیا۔ دُنیا میں اللہ کے فضل و رحمت کے مظاہر یہ ہوئے کہ اوّل اسلام و ایمان کی توفیق بخشی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف عطا فرمایا جو کہ نزولِ عذاب سے مانع ہے اور پھر جو گناہ ہو گیا تھا اُس سے سچّی توبہ کی توفیق بخشی پھر اُس توبہ کو قبول فرما لیا۔ اور آخرت میں اللہ کے فضل و رحمت کا اثر یہ ہے کہ تم سے عفو و درگزر اور مغفرت کا وعدہ فرما لیا۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ، تَلَقّی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بات پوچھے اور نقل کرے، یہاں بات کو سُن کر بے دلیل اور بلا تحقیق آگے چلتی کر دینا مراد ہے۔

---

[1] [2] صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب حديث الإفك ج:۲ ص:۵۹۶

وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ⑮ یعنی تم تو اس کو معمولی بات خیال کرتے تھے کہ ہم نے جیسا سُنا ویسا دوسرے سے نقل کر دیا مگر وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا کہ بے دلیل اور بے تحقیق ایسی بات کو چلتا کر دیا جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ایذا ہو، اُس کی رُسوائی ہو اور اُس کے لئے زندگی دُوبھر ہو جائے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ⑯ یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سُنی تھی تو یوں کہہ دیتے کہ ہمارے لئے ایسی بات زبان سے نکالنا جائز نہیں۔ پاک ہے اللہ، یہ تو بڑا بہتان ہے۔ اس آیت میں مکرر وہی ہدایت ہے جو اس سے پہلی ایک آیت میں آچکی ہے اس میں یہ مزید وضاحت ہے کہ مسلمانوں کو ایسی خبر سُننے کے وقت کیا عمل کرنا چاہئے وہ یہ کہ صاف کہہ دیں کہ ایسی بات بلا کسی دلیل کے زبان سے نکالنا بھی ہمارے لئے جائز نہیں یہ تو بہتانِ عظیم ہے۔

ایک شبہ اور جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جیسے کسی واقعہ کا صدق بغیر دلیل کے معلوم نہیں ہوتا اِس لئے اُس کا زبان سے نکالنا اور چرچا کرنا ناجائز قرار پایا، اسی طرح کسی کلام کا کاذب ہونا بھی تو بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا کہ اس کو بہتانِ عظیم کہہ دیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو گناہوں سے پاک صاف سمجھنا اصل شرعی ہے جو دلیل سے ثابت ہے اس کے خلاف جو بات بغیر دلیل کے کہی جائے اُس کو جھوٹا سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کافی ہے کہ ایک مؤمن مسلمان پر بغیر کسی دلیلِ شرعی کے الزام لگایا گیا ہے لہٰذا یہ بہتان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ اس آیت میں پھر اُن لوگوں کی مذمت اور اُن پر دُنیا و آخرت کے عذاب کی وعید ہے جنہوں نے اس تہمت میں کسی طرح کا حصّہ لیا۔ اس آیت میں یہ بات زیادہ ہے کہ جو لوگ ایسی خبریں مشہور کرتے ہیں گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بدکاری اور فواحش پھیل جائیں۔

انسدادِ فواحش کا قرآنی نظام اور ایک اہم تدبیر جس کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ آج کل فواحش کی کثرت ہے

قرآنِ حکیم نے فواحش کے انسداد کا یہ خاص نظام بنایا ہے کہ اوّل تو اس قسم کی خبر کہیں مشہور نہ ہونے پائے اور شہرت ہو تو ثبوتِ شرعی کے ساتھ ہوتا کہ اُس شہرت کے ساتھ ہی مجمع عام میں حدِّ زنا اُس پر جاری کر کے اُس شہرت ہی کو سببِ انسداد بنا دیا جائے۔ اور جہاں ثبوتِ شرعی نہ ہو وہاں اس طرح کی بے حیائی کی خبروں کو چلتا کر دینا اور شہرت دینا جبکہ

اس کے ساتھ کوئی سزا نہیں طبعی طور پر لوگوں کے دلوں سے بے حیائی اور فواحش کی نفرت کم کر دینے اور جرائم پر اقدام کرنے اور شائع کرنے کا موجب ہوتی ہے جس کا مشاہدہ آج کل کے اخبارات میں روزانہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں ہر روز ہر اخبار میں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ نوجوان مرد اور عورتیں اُن کو دیکھتے رہتے ہیں روزانہ ایسی خبروں کے سامنے آنے اور اُس پر کسی خاص سزا کے مرتب نہ ہونے کا لازمی اور طبعی اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے وہ فعلِ خبیث نظروں میں ہلکا نظر آنے لگتا ہے اور پھر نفس میں ہیجان پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے ایسی خبروں کی تشہیر کی اجازت صرف اُس صورت میں دی ہے جبکہ وہ ثبوت شرعی کے ساتھ ہو اُس کے نتیجہ میں خبر کے ساتھ ہی اس بے حیائی کی ہولناک پاداش بھی دیکھنے سُننے والوں کے سامنے آجائے۔ اور جہاں ثبوت اور سزا نہ ہو تو ایسی خبروں کی اشاعت کو قرآن نے مسلمانوں میں فواحش پھیلانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ کاش مسلمان اس پر غور کریں۔ اس آیت میں ایسی خبریں بلا ثبوت مشہور کرنے والوں پر دُنیا و آخرت دونوں میں عذابِ الیم ہونے کا ذکر ہے۔ آخرت کا عذاب تو ظاہر ہے کہ قیامت کے بعد ہوگا جس کا یہاں مشاہدہ نہیں ہوسکتا مگر دُنیا کا عذاب تو مشاہدہ میں آنا چاہئے سو جن لوگوں پر حدِّ قذف (تہمت کی سزا) جاری کردی گئی اُن پر تو دُنیا کا عذاب آہی گیا۔ اور اگر کوئی شخص شرائط اجراء حد موجود نہ ہونے کی وجہ سے حدِّ قذف سے بچ نکلا تو وہ دُنیا میں بھی فی الجملہ مستحقِ عذاب تو ٹھہرا آیت کے مصداق کے لئے یہ بھی کافی ہے۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۲﴾

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم

وَلَا يَأْتَلِ، ائتلاء کے معنے قسم کھانے کے ہیں۔ حضرت صدیقہؓ پر تہمت کے واقعہ میں مسلمانوں میں سے مسطحؓ اور حسانؓ مبتلا ہوگئے تھے جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نزولِ آیات براءت کے بعد حدِّ قذف جاری فرمائی۔ مسطحؓ اور حسانؓ دونوں ہی جلیل القدر صحابی غزوۂ بدر کے شرکاء میں سے ہیں مگر ایک لغزش ہوگئی جس سے توبہ صادقہ نصیب ہوئی اور حق تعالیٰ نے جس طرح حضرت صدیقہؓ کی براءت نازل فرمادی اسی طرح ان مؤمنین کی توبہ قبول کرنے اور معاف کرنے کا بھی اعلان فرمادیا۔

مسطحؓ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عزیز بھی تھے اور مفلس بھی۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ اُن کی مالی مدد فرمایا کرتے تھے۔ جب واقعہ اِفک میں اُن کی گونہ شرکت ثابت ہوئی تو صدیقہؓ کے والد کی شفقتِ پدری اور بیٹی کو ایسا سخت صدمہ پہنچانے کی وجہ سے طبعی طور پر مسطحؓ سے رنج پیدا ہوگیا اور قسم کھا بیٹھے کہ آئندہ ان کی کوئی مالی مدد نہیں کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی خاص

فقیر کی مالی امداد کرنا کسی خاص مسلمان پر علی التعیین واجب نہیں، اور جس کی مالی مدد کوئی کرتا ہے اگر وہ اُس کو روک لے تو گناہ کی کوئی وجہ نہیں مگر صحابۂ کرام کی جماعت کو حق تعالیٰ دُنیا کے لئے ایک مثالی معاشرہ بنانے والے تھے اس لئے ایک طرف جن لوگوں سے لغزش ہوئی ان کو سچی توبہ اور آئندہ اصلاحِ حال کی نعمت سے نوازا۔ دوسری طرف جن بزرگوں نے طبعی رنج و ملال کے سبب ایسے غریب فقیر کی مدد ترک کرنے کی قسم کھالی اُن کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم اس آیت میں دی گئی کہ اُن کو یہ قسم توڑ دینا اور اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہئے۔ اُن کی مالی امداد سے دستکش ہو جانا اُن کے مقامِ بلند کے مناسب نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف کر دیا اُن کو بھی عفو و درگزر سے کام لینا چاہئے۔

چونکہ حضرت مسطحؓ کی مالی امداد کرنا کوئی شرعی واجب حضرت صدیقؓ کے ذمہ نہیں تھا اسی لئے قرآنِ کریم نے عنوان یہ اختیار فرمایا کہ اہلِ علم و فضل جن کو اللہ نے دینی کمالات عطا فرمائے ہیں اور جن کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی وسعت و گنجائش بھی ہے ان کو ایسی قسم نہیں کھانی چاہئے۔ آیت میں دو لفظ أُولُوا الْفَضْلِ اور وَالسَّعَةِ اسی معنے کے لئے آئے ہیں۔

اس آیت کے آخری جملے میں جو ارشاد ہوا کہ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ یعنی کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرمادے تو صدیق اکبرؓ نے فوراً کہا: وَاللهِ إِنِّيْ أُحِبُّ أَنْ يَّغْفِرَ اللهُ لِيْ (رواہ الشیخان) [1] یعنی بخدا میں ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے اور فوراً حضرت مسطحؓ کی مالی امداد جاری فرمادی اور یہ بھی فرمایا اب کبھی یہ امداد بند نہ ہوگی۔ (بخاری و مسلم) [2]

یہ وہ مکارمِ اخلاق ہیں جن سے صحابۂ کرام کی تربیت کی گئی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِيْ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِيْ إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا۔ (از مظہری) [3]

یعنی صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو رشتہ داروں کے صرف احسان کا بدلہ کر دے بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ رشتہ داروں کے قطع تعلق کرنے کے باوجود یہ تعلق قائم رکھے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ اس آیت میں بظاہر مکرر وہ مضمون بیان ہوا ہے جو اس سے پہلے آیاتِ قذف میں آچکا ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سوۃ النور، باب قولہ ان الذین یحبون الآیۃ ج:۲ ص:۷۰۰، وصحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی حدیث الإفك ج:۲ ص:۳۶۶

[2] صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی حدیث الإفك ج:۲ ص:۳۶۶ [3] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافئ ج:۲ ص:۸۸۶

شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ لیکن درحقیقت ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ کیونکہ آیاتِ حدِّ قذف کے آخر میں توبہ کرنے والوں کا استثناء اور اُن کے لئے مغفرت کا وعدہ ہے۔ اس آیت میں ایسا نہیں بلکہ دُنیا وآخرت کی لعنت اور عذابِ عظیم بلا استثناء مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جنہوں نے حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی اور پھر اُس سے توبہ نہیں کی، یہاں تک کہ قرآن میں اُن کی براءت نازل ہونے کے بعد بھی وہ اپنے اس افتراء پر قائم اور تہمت کا چرچا کرنے میں مشغول رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی مسلمان سے ممکن نہیں۔ اور جو مسلمان بھی نصوص قرآن کا ایسا خلاف کرے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس لئے یہ مضمون اُن منافقین کے بارے میں آیا ہے جنہوں نے آیات براءت صدیقہ نازل ہونے کے بعد بھی اس مشغلۂ تہمت کو نہیں چھوڑا اُن کے کافر منافق ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ تائبین کے لئے اللہ تعالیٰ نے فَضْلُ اللّٰهِ، وَرَحْمَتُهٗ فرما کر مرحوم دارین قرار دیا اور جنہوں نے توبہ نہیں کی اُن کو اس آیت میں ملعون دُنیا وآخرت فرمایا۔ تائبین کو عذاب سے نجات کی بشارت دی اور غیر تائبین کے لئے عذابِ عظیم کی وعید فرمائی۔ تائبین کو فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ فرما کر مغفرت کی بشارت دی اور غیر تائبین کو اگلی آیت يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ میں معافی نہ ہونے کی وعید فرمائی۔ (کذا ذکرہ سیّدی فی بیان القرآن)[1]

ایک اہم تنبیہ

حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت کے قضیہ میں جو بعض مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے یہ قضیہ اس وقت کا تھا جب تک آیات براءت قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھیں۔ آیات براءت نازل ہونے کے بعد جو شخص حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائے وہ بلاشبہ کافر منکرِ قرآن ہے جیسا کہ شیعوں کے بعض فرقے اور بعض افراد اس میں مبتلا پائے جاتے ہیں اُن کے کافر ہونے میں کوئی شک وشبہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں وہ باجماعِ اُمّت کافر ہیں۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲۴ یعنی اُس روز جبکہ اُن کے خلاف خود اُن کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور اُن کے جرائم کی شہادت دیں گے جیسا کہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جو گنہگار اپنے گناہ کا اعتراف کرلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے اور محشر کے مجمع عام کی نظروں سے اُس کے گناہ کو چھپادیں گے اور جو وہاں بھی انکار کرے گا کہ میں نے تو یہ کام نہیں کیا، نگراں فرشتوں نے غلط میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیا ہے۔ تو اس وقت اُن کے منہ بند کردیئے جائیں گے اور ہاتھ پاؤں سے گواہی لی جائے گی وہ بولیں گے اور شہادت

[1] تفسیر بیان القرآن ج:۸ ص:۱۱

دیں گے [1] اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ (یٰسٓ:۶۵) میں اسی کا بیان ہے۔ اس آیت میں یہ فرمایا کہ اُن کے مونہوں پر مہر لگادی جائے گی مگر آیت مذکورہ میں یہ ہے کہ خود اُن کی زبانی شہادت دیں گی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض اس لئے نہیں کہ وہ اپنی زبان کو اپنے اختیار سے استعمال نہ کرسکیں گے کہ اُس وقت جو چاہیں جھوٹی یا سچی بات کہہ دیں جیسے دنیا میں اس کا اختیار ہے بلکہ اُن کی زبان اُن کے ارادہ اور قصد کے خلاف حق بات کا اعتراف کرے گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت میں منہ اور زبان بالکل بند کردی جائیں پھر خود زبان کو بھی حکم ہو کہ سچّی بات بولے۔ واللہ اعلم

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾ یعنی گندی عورتیں گندے مَردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور پاک صاف عورتیں پاک صاف مَردوں کے لائق ہوتی ہیں اور پاک صاف مرد پاک صاف عورتوں کے لائق ہوتے ہیں۔

اس آخری آیت میں اوّل تو عام ضابطہ یہ بتلا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے طبائع میں طبعی طور پر جوڑ رکھا ہے۔ گندی اور بدکار عورتیں بدکار مَردوں کی طرف اور گندے بدکار مرد گندی بدکار عورتوں کی طرف رغبت کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح پاک صاف عورتوں کی رغبت پاک صاف مَردوں کی طرف ہوتی ہے اور پاک صاف مَردوں کی رغبت پاک صاف عورتوں کی طرف ہوا کرتی ہے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی رغبت کے مطابق اپنا جوڑ تلاش کرتا ہے اور قدرۃً اُس کو وہی مل جاتا ہے۔

اس عام عادتِ کلیہ اور ضابطہ سے واضح ہوگیا کہ انبیاء علیہم السلام جو دُنیا میں پاکی اور صفائی ظاہری و باطنی میں مثالی شخصیت ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اُن کو ازواج بھی اُن کے مناسب عطا فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء کے سردار ہیں اُن کو ازواج مطہرات بھی اللہ تعالیٰ نے پاکی اور صفائی ظاہری اور اخلاقی برتری میں آپ ہی کی مناسب شان عطا فرمائی ہیں۔ اور صدیقہ عائشہؓ اُن سب میں ممتاز ہیں۔ اُن کے بارے میں شک وشبہ وہی کرسکتا ہے جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہو۔ اور حضرت نوح وحضرت لوط علیہما السلام کی بیبیوں کے بارے میں جو قرآنِ کریم میں اُن کا کافر ہونا مذکور ہے تو اُن کے متعلق بھی یہ ثابت ہے کہ کافر ہونے کے باوجود فسق و فجور میں مبتلا نہیں تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَا بَغَتِ امْرَاَةُ نَبِيٍّ قَطُّ، یعنی کسی نبی کی عورت نے کبھی زنا نہیں کیا (ذکر فی الدر المنثور) [2] اس سے معلوم ہوا کہ کسی نبی کی بیوی کافر ہوجائے اس کا تو امکان ہے مگر بدکار فاحشہ ہوجائے یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ بدکاری طبعی طور پر موجبِ نفرتِ عوام ہے کفر طبعی نفرت کا موجب نہیں۔ (بیان القرآن) [3]

---

[1] ترجمہ: آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے۔　[2] الدر المنثور، تفسیر سورة هود رقم الآية:۴۵، ج:۵ ص:۳۱۱

[3] تفسیر بیان القرآن ج:۸ ص:۱۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا

اے ایمان والو مت جایا کرو کسی گھر میں اپنے گھر کے سوائے جب تک بول چال نہ کرلو،

وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۷

اور سلام کرلو اُن گھر والوں پر یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو،

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ

پھر اگر نہ پاؤ اس میں کسی کو تو اس میں نہ جاؤ جب تک کہ اجازت نہ ملے تم کو

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اور اگر تم کو جواب ملے کہ پھر جاؤ تو پھر جاؤ اس میں خوب ستھرائی ہے تمہارے لئے اور اللہ جو تم کرتے ہو

عَلِيْمٌ ۝۲۸ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ

اُس کو جانتا ہے نہیں گناہ تم پر اس میں کہ جاؤ اُن گھروں میں جہاں کوئی نہیں بستا،

فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

اس میں کچھ چیز ہو تمہاری اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اُس وقت تک داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو، اور اُن میں بسنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہی طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے، اُمید ہے کہ تم خیال رکھو گے۔ (۲۷) اور اگر تم اُن گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تب بھی اُن میں اُس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمہیں اجازت نہ دے دی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ: ''واپس چلے جاؤ'' تو واپس چلے جاؤ۔ یہی تمہارے لئے پاکیزہ ترین طریقہ ہے، اور تم جو عمل بھی کرتے ہو،

اللہ کو اُس کا پورا پورا علم ہے۔ (۲۸) تمہارے لئے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم ایسے گھروں میں (اجازت لئے بغیر) داخل ہو جن میں کوئی رہتا نہ ہو، اور اُن سے تمہیں فائدہ اُٹھانے کا حق ہو۔ اور تم جو کام علانیہ کرتے ہو، اور جو چھپ کر کرتے ہو، اللہ اُن سب کو جانتا ہے۔ (۲۹)

خلاصۂ تفسیر

حکم پنجم استیذان اور آداب ملاقات باہمی، کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنا

سورۂ نور کے شروع ہی سے فواحش اور بے حیائی کی روک تھام کے لئے اُن سے متعلقہ جرائم کی سزاؤں کا ذکر اور بے دلیل کسی پر تہمت لگانے کی مذمّت کا بیان تھا آگے اُنہی فواحش کے انسداد اور عفّت وعصمت کے تحفظ کے لئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن سے ایسے حالات ہی پیدا نہ ہوں جہاں سے بے حیائی کو راستہ ملے اِنہی احکام میں سے استیذان کے مسائل واحکام ہیں کہ کسی شخص کے مکان میں بغیر اُس کی اجازت کے داخل ہونا یا اندر جھانکنا ممنوع کر دیا گیا جس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر نہ پڑے۔ آیات مذکورہ میں مختلف قسم کے مکانات کے مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں۔

مکانات کی چار قسمیں ہیں۔ ایک خاص اپنے رہنے کا مکان، جس میں کسی دوسرے کے آنے کا احتمال نہیں۔ دوسرے وہ مکان جس میں کوئی اور بھی رہتا ہو خواہ وہ اپنے محارم ہی کیوں نہ ہوں یا کسی اور کے اس میں آجانے کا احتمال ہو۔ تیسری قسم وہ مکان جس میں کسی کا بالفعل رہنا یا نہ رہنا دونوں کا احتمال ہو۔ چوتھی قسم وہ مکان جو کسی خاص شخص کی رہائش کے لئے مخصوص نہ ہو جیسے مسجد، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ عام لوگوں کے انتفاع اور آمد ورفت کی جگہیں۔ ان میں قسم اوّل کا حکم تو ظاہر تھا کہ اس میں جانے کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں اس لئے اُس کا ذکر ان آیات میں صراحۃً نہیں کیا گیا باقی تین قسموں کے مکانات کے احکام اگلی آیتوں میں بیان فرماتے ہیں کہ) اے ایمان والو تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں (جن میں دوسرے لوگ رہتے ہوں خواہ وہ اُن کی مِلک ہوں یا کسی سے عاریۃً رہنے کو لے لئے ہوں یا کرایہ پر لئے ہوں) داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو (اور اجازت لینے سے پہلے) اُن کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (یعنی اوّل باہر سے سلام کر کے پھر اُن سے پوچھو کہ کیا ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے اور بغیر اجازت لئے ویسے ہی مت گھس جاؤ۔ اور اگر چہ بعض لوگ اجازت لینے کو اپنی شان کے خلاف سمجھیں لیکن واقع میں)

یہ ہی تمہارے لئے بہتر ہے (کہ اجازت لے کر جاؤ اور یہ بات تم کو اس لئے بتائی) تاکہ تم خیال رکھو (اور اس پر عمل کرو کہ اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ یہ حکم ہوا مکانات کی قسم دوم کا) پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو (خواہ واقع میں وہاں کوئی ہو یا نہ ہو) تو (بھی) ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے (کیونکہ اوّل تو یہ احتمال ہے کہ اُس میں کوئی آدمی موجود ہو اگرچہ تمہیں معلوم نہیں۔ اور واقع میں کوئی موجود نہ ہو تو دوسرے کے خالی مکان میں بھی بلا اجازت گھس جانا، دوسرے کی ملک میں اُس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا ہے جو ناجائز ہے۔ یہ حکم ہوا قسم سوم کا) اور اگر (اجازت طلب کرنے کے وقت) تم سے یہ کہہ دیا جائے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آیا کرو یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے (اس بات سے کہ وہیں جم جاؤ کہ کبھی تو باہر نکلیں گے کیونکہ اس میں اپنی ذلت اور دوسرے پر بلاوجہ دباؤ ڈال کر تکلیف پہنچانا ہے اور کسی مسلمان کو ایذاء دینا حرام ہے) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے (اگر خلاف حکم کرو گے سزا پاؤ گے اور یہی حکم اُس صورت کا ہے کہ گھر والوں نے اگرچہ لوٹ جانے کو کہا نہیں مگر کوئی بولا بھی نہیں۔ ایسی حالت میں تین مرتبہ استیذان اس احتیاط پر کر لیا جائے کہ شاید سُنا نہ ہو۔ تین مرتبہ تک جب کوئی جواب نہ آئے تو لوٹ آنا چاہئے جیسا کہ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے)[1] اور تم کو ایسے مکانات میں (بغیر خاص اجازت کے) چلے جانے میں گناہ نہ ہوگا جن میں (گھر کے طور پر) کوئی نہ رہتا ہو (اور) اُن میں تمہاری برت ہو (یعنی ان مکانات کے برتنے اور استعمال کرنے کا تمہیں حق ہو، یہ حکم ہے قسم چہارم کا جو رفاہِ عام کے مکانات ہیں اور جن سے عام لوگوں کے منافع متعلق ہیں۔ تو وہاں جانے کی عادۃً عام اجازت ہوتی ہے) اور تم جو کچھ علانیہ کرتے ہو یا پوشیدہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۔ (اس لئے ہر حال میں تقویٰ اور خوفِ خدا لازم ہے)۔

معارف و مسائل

قرآنی آداب معاشرت کا ایک اہم باب کسی کی ملاقات کو جاؤ تو پہلے اجازت لو بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہو

افسوس ہے کہ شریعتِ اسلام نے جس قدر اس معاملے کا اہتمام فرمایا کہ قرآن حکیم میں اس کے مفصّل احکام نازل ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اُس کی بڑی تاکید فرمائی، اُتنا ہی آج کل مسلمان اس سے غافل ہو گئے۔ لکھے پڑھے نیک لوگ بھی نہ اس کو کوئی گناہ سمجھتے ہیں نہ اس پر عمل کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ دُنیا کی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب الإستئذان ج:۲ ص:۲۱۰

دوسری مہذّب قوموں نے اس کو اختیار کر کے اپنے معاشرہ کو درست کر لیا مگر مسلمان ہی اس میں سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ اسلامی احکام میں سب سے پہلے سُستی اسی حکم میں شروع ہوئی بہر حال استیذان قرآن کریم کا وہ واجب التعمیل حکم ہے کہ اس میں ذرا سی سُستی اور تبدیلی کو بھی حضرات ابنِ عباسؓ انکار آیت قرآن کے شدید الفاظ سے تعبیر فرما رہے ہیں اور اب تو لوگوں نے واقعی ان احکام کو ایسا نظر انداز کر دیا ہے کہ گویا اُن کے نزدیک یہ قرآن کے احکام ہی نہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

استیذان کی حکمتیں اور مصالح مہمہ

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے ہر انسان کو جو اس کے رہنے کی جگہ عطا فرمائی خواہ مالکانہ ہو یا کرایہ وغیرہ پر بہر حال اُس کا گھر اُس کا مسکن ہے اور مسکن کی اصل غرض سکون و راحت ہے قرآنِ عزیز نے جہاں اپنی اس نعمت گراں مایہ کا ذکر فرمایا ہے اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے فرمایا جَعَلَ لَکُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا (النحل:۸۰) یعنی اللہ نے تمہارے گھروں سے تمہارے لئے سکون و راحت کا سامان دیا۔ اور یہ سکون و راحت جبھی باقی رہ سکتا ہے کہ انسان دوسرے کسی شخص کی مداخلت کے بغیر اپنے گھر میں اپنی ضرورت کے مطابق آزادی سے کام اور آرام کر سکے۔ اس کی آزادی میں خلل ڈالنا گھر کی اصل مصلحت کو فوت کرنا ہے جو بڑی ایذاء و تکلیف ہے۔ اسلام نے کسی کو بھی ناحق تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ استیذان کے احکام میں ایک بڑی مصلحت لوگوں کی آزادی میں خلل ڈالنے اور اُن کی ایذا رسانی سے بچنا ہے جو ہر شریف انسان کا عقلی فریضہ بھی ہے۔ دوسری مصلحت خود اس شخص کی ہے جو کسی کی ملاقات کے لئے اُس کے پاس گیا ہے کہ جب وہ اجازت لے کر شائستہ انسان کی طرح ملے گا تو مخاطب بھی اس کی بات قدر و منزلت سے سُنے گا اور اگر اس کی کوئی حاجت ہے تو اُس کے پورا کرنے کا داعیہ اُس کے دل میں پیدا ہوگا۔ بخلاف اس کے کہ وحشیانہ طرز سے کسی شخص پر بغیر اس کی اجازت کے مسلّط ہو گیا تو مخاطب اس کو ایک بلائے ناگہانی سمجھ کر دفع الوقتی سے کام لے گا خیر خواہی کا داعیہ اگر ہوا بھی تو مضمحل ہو جائے گا اور اس کو ایذاءِ مسلم کا گناہ الگ ہوگا۔

تیسری مصلحت فواحش اور بے حیائی کا انسداد ہے کہ بلا اجازت کسی کے مکان میں داخل ہو جانے سے یہ بھی احتمال ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر پڑے اور شیطان دل میں کوئی مرض پیدا کر دے اور اسی مصلحت سے احکام استیذان کو قرآنِ کریم میں حدِّ زِنا، حدِّ قذف وغیرہ احکام کے متصل لایا گیا ہے۔

چوتھی مصلحت یہ ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے گھر کی تنہائی میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جس پر دوسروں کو اطلاع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے گھر میں آجائے تو وہ جس چیز کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا

چاہتا تھا اُس پر مطلع ہو جائے گا۔ کسی کے پوشیدہ راز کو زبردستی معلوم کرنے کی فکر بھی گناہ اور دوسروں کے لئے موجب ایذا ہے۔ استیذان کے کچھ مسائل تو خود آیاتِ مذکورہ میں آ گئے ہیں پہلے اُن کی تفصیل وتشریح دیکھئے باقی متفرق مسائل بعد میں لکھے جاویں گے:

مسئلہ:- ان آیات میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا جو مَردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر عورتیں بھی اس حکم میں داخل ہیں جیسا کہ عام احکامِ قرآنیہ اسی طرح مَردوں کو مخاطب کر کے آتے ہیں عورتیں بھی اُس میں شامل ہوتی ہیں بجز مخصوص مسائل کے جن کی خصوصیت مَردوں کے ساتھ بیان کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ نساءِ صحابہ کا بھی یہی معمول تھا کہ کسی کے گھر جائیں تو پہلے اُن سے استیذان کریں۔ حضرت اُمّ ایاسؓ فرماتی ہیں کہ ہم چار عورتیں اکثر حضرت صدیقہ عائشہؓ کے پاس جایا کرتی تھیں اور گھر میں جانے سے پہلے اُن سے استیذان کرتی تھیں جب وہ اجازت دیتی تو اندر جاتی تھیں۔ (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم) [۱]

مسئلہ:- اسی آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانے سے پہلے استیذان کا حکم عام ہے مرد عورت محرم غیر محرم سب کو شامل ہے۔ عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد مرد کے پاس، سب کو استیذان کرنا واجب ہے، اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ماں اور بہن یا دوسری محرم عورتوں کے پاس جائے تو بھی استیذان کرنا چاہئے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں مرسلاً عطاء بن یسارؒ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں اپنی والدہ کے پاس جانے وقت بھی استیذان کروں آپ نے فرمایا ہاں استیذان کرو۔ اُس شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں تو اپنی والدہ ہی کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ۔ اُس نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ہر وقت اُن کی خدمت میں رہتا ہوں آپ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ اپنی والدہ کو ننگی دیکھو اس نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا اسی لئے استیذان کرنا چاہئے کیونکہ یہ احتمال ہے کہ وہ گھر میں کسی ضرورت سے ستر کھولے ہوئے ہوں۔ (مظہری) [۲]

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ آیا ہے اس میں بُیُوْتِكُمْ سے مراد وہ بیوت اور گھر ہیں جن میں انسان تنہا خود ہی رہتا ہو۔ والدین، بہن بھائی وغیرہ اُس میں نہ ہوں۔

مسئلہ:- جس گھر میں صرف اپنی بیوی رہتی ہو اُس میں داخل ہونے کے لئے اگرچہ استیذان واجب نہیں مگر

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:٦ ص:٣٩، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث:١٥١٨٨

[۲] تفسیر المظهری ج:٦ ص:٤٨٨ والموطا، کتاب الجامع، باب الإستئذان، رقم الحدیث:١٢٥٣٨

مستحب اور طریقِ سنت یہ ہے کہ وہاں بھی اچانک بغیر کسی اطلاع کے اندر نہ جائے بلکہ داخل ہونے سے پہلے اپنے پاؤں کی آہٹ سے یا کھنکار سے کسی طرح پہلے باخبر کردے پھر داخل ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ فرماتی ہیں کہ عبداللہ جب کبھی باہر سے گھر میں آتے تھے تو دروازہ میں کھنکار کر پہلے اپنے آنے سے باخبر کردیتے تھے تاکہ وہ ہمیں کسی ایسی حالت میں نہ دیکھیں جو ان کو پسند نہ ہو (ابن کثیر بحوالہ ابن جریر وقال اسنادہ صحیح) [۱] اور اس صورت میں استیذان کا واجب نہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریج نے حضرت عطاءؒ سے دریافت کیا کہ کیا ایک شخص کو اپنی بیوی کے پاس جانے کے وقت بھی استیذان ضروری ہے اُنہوں نے فرمایا کہ نہیں۔ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ واجب نہیں لیکن مستحب اور اَولیٰ وہاں بھی ہے۔ [۲]

استیذان کا مسنون طریقہ

آیت میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ ہے "حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا" یعنی کسی کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک دو کام نہ کرلو، اوّل استیناس، اس کے لفظی معنی طلب اُنس کے ہیں۔ مراد اس سے جمہور مفسرین کے نزدیک استیذان یعنی اجازت حاصل کرنا ہے۔ استیذان کو بلفظ استیناس ذکر کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنے میں مخاطب مانوس ہوتا ہے اس کو وحشت نہیں ہوتی۔ دوسرا کام یہ ہے کہ گھر والوں کو سلام کرو۔ اس کا مفہوم بعض حضرات مفسرین نے تو یہ لیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو اور جب گھر میں جاؤ تو سلام کرو۔ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے آیت میں کوئی تقدیم تاخیر نہیں پہلے استیذان کیا جائے جب اجازت مل جائے اور گھر میں جائیں تو سلام کریں۔ [۳] اور اسی کو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث کا مقتضیٰ قرار دیا ہے۔ [۴] اور ماوردی نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ اگر اجازت لینے سے پہلے گھر کے کسی آدمی پر نظر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے پھر اجازت طلب کرے ورنہ پہلے اجازت لے اور جب گھر میں جائے تو سلام کرے مگر عام روایاتِ حدیث سے جو طریقہ مسنون معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ پہلے باہر سے سلام کرے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اس کے بعد اپنا نام لے کر کہے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

امام بخاری نے اَلْاَدَبُ الْمُفْرَدْ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا کہ جو شخص سلام

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۲ ص:۳۹، ومسند احمد، مسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رقم الحدیث:۳۶۸۲

[۲] تفسیر ابن کثیر بحوالۂ بالا۔

[۳] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۲ ص:۲۱۴

[۴] انظر للتفصیل: سنن ابن ماجۃ ص:۲۶۳، ابواب الأدب، باب الإستئذان۔

سے پہلے استیذان کرے اس کو اجازت نہ دو (کیونکہ اُس نے مسنون طریقہ کو چھوڑ دیا) (روح المعانی) [۱] اور ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ بنی عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح استیذان کیا کہ باہر سے کہا ءَاَلِجُ کیا میں گھس جاؤں۔ آپ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ یہ شخص استیذان کا طریقہ نہیں جانتا باہر جا کر اس کو طریقہ سکھلاؤ کہ یوں کہے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ءَاَدْخُلُ یعنی کیا میں داخل ہوسکتا ہوں۔ ابھی یہ خادم باہر نہیں گیا تھا کہ اُس نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات سُن لئے اور اس طرح کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ءَاَدْخُلُ؟ تو آپ نے اندر آنے کی اجازت دیدی۔ (ابن کثیر) [۲] اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَاْذَنُوْا لِمَنْ لَمْ یَبْدَاْ بِالسَّلَامِ یعنی جو شخص پہلے سلام نہ کرے اس کو اندر آنے کی اجازت نہ دو (مظہری)، [۳] اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو اصلاحیں فرمائیں ایک یہ کہ پہلے سلام کرنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اَدْخُلُ کے بجائے اَلِجُ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ نامناسب تھا کیونکہ اَلِجُ وُلُوْجٌ سے مشتق ہے جس کے معنے کسی تنگ جگہ میں گھسنے کے ہیں یہ تہذیبِ الفاظ کے خلاف تھا۔ بہر حال ان روایات سے یہ معلوم ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو سلام کرنے کا ارشاد ہے یہ سلام استیذان ہے جو اجازت حاصل کرنے کے لئے باہر سے کیا جاتا ہے تاکہ اندر جو شخص ہے وہ متوجہ ہوجائے اور جو الفاظ اجازت طلب کرنے کے لئے کہے گا وہ سُن لے۔ گھر میں داخل ہونے کے وقت حسبِ معمول دوبارہ سلام کرے۔

مسئلہ:- پہلے سلام اور پھر داخل ہونے کی اجازت لینے کا جو بیان اوپر احادیث سے ثابت ہوا اس میں بہتر یہ ہے کہ اجازت لینے والا خود اپنا نام لے کر اجازت طلب کرے جیسا کہ حضرت فاروق اعظم کا عمل تھا کہ اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر آکر یہ الفاظ کہے: اَلسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَیَدْخُلُ عُمَرُ یعنی سلام کے بعد کہا کہ کیا عمر داخل ہوسکتا ہے (رواہ قاسم بن اصبغ وابن عبدالبر فی التمہید عن ابن عباس عن عمرؓ۔ ابن کثیر) [۴] اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو استیذان کے لئے یہ الفاظ فرمائے: [۵] اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ھٰذَا اَبُوْ مُوْسٰی اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ھٰذَا الْاَشْعَرِیُّ (قرطبی) [۶] اس میں بھی پہلے اپنا نام ابوموسیٰ بتلایا پھر مزید

[۱] روح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۳ ص:۳۹۷، والأدب المفرد، رقم الحدیث:۱۱۰۶ کتاب الإستئذان، باب الإستئذان غیر السلام۔

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب کیف الإستئذان ج:۲ ص:۳۵۶

[۳] شعب الإیمان للبیھقیؒ رقم الحدیث:۸۵۴۶

[۴] التمھید لا بن عبدالبرؒ ج:۳ ص:۳۰۲، وسنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرجل یفارق الرجل إلخ۔

[۵] ترجمہ: السلام علیکم یہ ابوموسیٰ ہیں، السلام علیکم یہ اشعری ہیں۔

[۶] صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب الإستئذان ج:۲ ص:۲۱۱

وضاحت کے لئے اشعری کا ذکر کیا۔ اور یہ اس لئے کہ جب تک آدمی اجازت لینے والے کو پہچانے نہیں تو جواب دینے میں تشویش ہوگی۔ اس تشویش سے بھی مخاطب کو بچانا ہے۔

مسئلہ:- اور اس معاملہ میں سب سے بُرا وہ طریقہ ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ باہر سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اندر سے مخاطب نے پوچھا کون صاحب ہیں؟ تو جواب میں کہہ دیا کہ میں ہوں، کیونکہ یہ مخاطب کی بات کا جواب نہیں، جس نے اوّل آواز سے نہیں پہچانا وہ مَیں کے لفظ سے کیا پہچانے گا۔

خطیب بغدادی نے اپنے جامع میں علی بن عاصم واسطی سے نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ گئے تو حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کی ملاقات کو حاضر ہوئے، دروازہ پر دستک دی۔ حضرت مغیرہؓ نے اندر سے پوچھا کون ہے؟ تو جواب دیا اَنَا (یعنی مَیں ہوں) تو حضرت مغیرہ نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں تو کوئی بھی ایسا نہیں جس کا نام ''اَنَا'' ہو پھر باہر تشریف لائے اور اُن کو حدیث سنائی کہ ایک روز حضرت جابر بن عبداللہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت لینے کے لئے دروازہ پر دستک دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر سے پوچھا کون صاحب ہیں؟ تو جابرؓ نے یہی لفظ کہہ دیا اَنَا یعنی میں ہوں۔ آپ نے بطور زجر وتنبیہ کے فرمایا انا انا یعنی انا انا کہنے سے کیا حاصل ہے اس سے کوئی پہچانا نہیں جاتا۔ [1]

مسئلہ:- اس سے بھی زیادہ بُرا یہ طریقہ ہے جو آج کل بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں کہ دروازہ پر دستک دی جب اندر سے پوچھا گیا کہ کون صاحب ہیں تو خاموش کھڑے ہیں کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ یہ مخاطب کو تشویش میں ڈالنے اور ایذا پہنچانے کا بدترین طریقہ ہے جس سے استیذان کی مصلحت ہی فوت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:- روایاتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ استیذان کا یہ طریقہ بھی جائز ہے کہ دروازہ پر دستک دیدی جائے بشرطیکہ ساتھ ہی اپنا نام بھی ظاہر کر کے بتلا دیا جائے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

مسئلہ:- لیکن اگر دستک ہو تو اتنی زور سے نہ دے کہ جس سے سُننے والا گھبرا اُٹھے بلکہ متوسط انداز سے دے جس سے اندر تک آواز تو چلی جائے لیکن کوئی سختی ظاہر نہ ہو۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر دستک دیتے تھے تو اُن کی عادت یہ تھی کہ ناخنوں سے دروازہ پر دستک دیتے تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو (رواه الخطيب فى جامعه۔ قرطبی) [2] جو شخص استیذان کے مقصد کو سمجھ لے کہ اصل اُس سے استیناس ہے یعنی مخاطب کو مانوس کر کے اجازت حاصل کرنا وہ خود بخود ان سب چیزوں کی رعایت کو ضروری سمجھے گا جن چیزوں سے مخاطب کو تکلیف ہو اُس سے بچے گا۔ اپنا نام ظاہر کرے اور دستک دے تو متوسط انداز سے دے یہ سب چیزیں اُس میں شامل ہیں۔

---

[1] تفسير القرطبى تحت هٰذه الآية ج:۱۲ ص:۲۱۷، والجامع لأخلاق الراوى وآداب السامع للخطيبؒ رقم الحديث: ۲۳۰

[2] الجامع للخطيبؒ رقم الحديث:۲۲۵، ومجمع الزوائد، رقم الحديث:۱۲۸۰۲

تنبیہ ضروری

آج کل اکثر لوگوں کو تو استیذان کی طرف کوئی توجہ ہی باقی نہیں رہی جو صریح ترک واجب کا گناہ ہے اور جو لوگ استیذان کرنا چاہیں اور مسنون طریقہ کے مطابق باہر سے پہلے سلام کریں پھر اپنا نام بتلا کر اجازت لیں۔ اُن کے لئے اس زمانے میں بعض دشواریاں یوں بھی پیش آتی ہیں کہ عموماً مخاطب جس سے اجازت لیتا ہے وہ دروازہ سے دُور ہے۔ وہاں تک سلام کی آواز اور اجازت لینے کے الفاظ پہنچنا مشکل ہیں اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اصل واجب یہ بات ہے کہ بغیر اجازت کے گھر میں داخل نہ ہو۔ اجازت لینے کے طریقے ہر زمانے اور ہر مُلک میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک طریقہ دروازہ پر دستک دینے کا تو خود روایاتِ حدیث سے ثابت ہے اسی طرح جو لوگ اپنے دروازوں پر گھنٹی لگا لیتے ہیں اُس گھنٹی کا بجا دینا بھی واجب استیذان کی ادائیگی کے لئے کافی ہے۔ بشرطیکہ گھنٹی کے بعد اپنا نام بھی ایسی آواز سے ظاہر کر دے جس کو مخاطب سُن لے۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ جو کسی جگہ رائج ہو اس کا استعمال کر لینا بھی جائز ہے آج کل جو شناختی کارڈ کا رواج یورپ سے چلا ہے یہ رسم اگرچہ اہلِ یورپ نے جاری کی مگر مقصد استیذان اس میں بہت اچھی طرح پورا ہو جاتا ہے کہ اجازت دینے والے کو اجازت چاہنے والے کا پورا نام و پتہ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے بغیر کسی تکلیف کے معلوم ہو جاتا ہے اس لئے اس کو اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مسئلہ:- اگر کسی شخص نے کسی شخص سے استیذان کیا اور اُس نے جواب میں کہہ دیا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی لَوٹ جائیے تو اس سے بُرا نہ ماننا چاہئے کیونکہ ہر شخص کے حالات اور اُس کے مقتضیات مختلف ہوتے ہیں بعض وقت وہ مجبور ہوتا ہے باہر نہیں آسکتا نہ آپ کو اندر بلا سکتا ہے تو ایسی حالت میں اُس کے عذر کو قبول کرنا چاہئے۔ آیت مذکورہ میں یہی ہدایت ہے وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ یعنی جب آپ سے کہا جائے کہ اس وقت لَوٹ جائیں تو آپ کو خوشدلی سے لوٹ آنا چاہئے اس سے بُرا ماننا یا وہیں جم کر بیٹھ جانا دونوں چیزیں درست نہیں بعض حضرات سلف سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں عمر بھر اس تمنّا میں رہا کہ کسی کے پاس جا کر استیذان کروں اور وہ مجھے یہ جواب دے کہ لَوٹ جاؤ تو میں اس حکم قرآن کی تعمیل کا ثواب حاصل کروں مگر عجیب اتفاق ہے کہ مجھے کبھی یہ نعمت نصیب نہ ہوئی۔

مسئلہ:- شریعتِ اسلام نے حُسن معاشرت کے آداب سکھانے اور سب کو ایذا و تکلیف سے بچانے کا دوطرفہ معتدل نظام قائم فرمایا ہے اس آیت میں جس طرح آنے والے کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر استیذان کرنے پر آپ کو اجازت نہ ملے اور کہا جائے کہ اس وقت لَوٹ جاؤ تو کہنے والے کو معذور سمجھو اور خوشدلی کے ساتھ واپس لَوٹ جاؤ بُرا

نہ مانو اسی طرح ایک حدیث میں اس کا دوسرا رُخ اِس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا [1] یعنی جو شخص آپ سے ملاقات کے لئے آئے اُس کا بھی آپ پر حق ہے یعنی اس کا یہ حق ہے کہ اس کو اپنے پاس بلاؤ یا باہر آ کر اُس سے ملو، اس کا اکرام کرو، بات سنو بلا کسی شدید مجبوری اور عذر کے ملاقات سے انکار نہ کرو۔

مسئلہ:- اگر کسی کے دروازے پر جا کر استیذان کیا اور اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو سنت یہ ہے کہ دوبارہ پھر استیذان کرے اور پھر بھی جواب نہ آئے تو تیسری مرتبہ کرے۔ اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ آئے تو اس کا حکم وہی ہے جو اِرْجِعُوْا کا ہے۔ یعنی لَوٹ جانا چاہئے کیونکہ تین مرتبہ کہنے سے تقریباً یہ تو متعین ہو جاتا ہے کہ آواز سن لی مگر یا تو وہ شخص ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا مثلاً نماز پڑھ رہا ہے یا بیت الخلاء میں ہے یا غسل کر رہا ہے اور یا پھر اس کو اس وقت ملنا منظور نہیں دونوں حالتوں میں وہیں جمے رہنا اور مسلسل دستک وغیرہ دیتے رہنا بھی موجبِ ایذا ہے جس سے بچنا واجب ہے اور استیذان کا اصل مقصد ہی ایذا سے بچنا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا اسْتَأْذَنَ اَحَدُكُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ يُؤْذَنْ لَهٗ فَلْيَرْجِعْ۔ یعنی جب کوئی آدمی تین مرتبہ استیذان کرے اور کوئی جواب نہ آوے تو اس کو لَوٹ جانا چاہئے (ابن کثیر بحوالہ صحیح بخاری) [2] اور مسند احمد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور سنت کے مطابق باہر سے استیذان کے لئے سلام کیا اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ حضرت سعد بن عبادہ نے سلام کا جواب تو دیا مگر آہستہ کہ حضور نہ سُنیں، آپ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ سلام کیا۔ حضرت سعدؓ سنتے اور آہستہ جواب دیتے رہے۔ تین مرتبہ ایسا کرنے کے بعد آپ لوٹ گئے جب سعدؓ نے دیکھا کہ اب آواز نہیں آ رہی تو گھر سے نکل کر پیچھے دوڑے اور یہ عذر پیش کیا کہ یارسول اللہ میں نے ہر مرتبہ آپ کی آواز سُنی اور جواب بھی دیا مگر آہستہ دیا تاکہ زبان مبارک سے زیادہ سے زیادہ سلام کے الفاظ میرے بارے میں نکلیں وہ میرے لئے موجبِ برکت ہوگا (آپ نے اُن کو طریقۂ سنت بتلا دیا کہ تین مرتبہ جواب نہ آنے پر لَوٹ جانا چاہئے) اس کے بعد حضرت سعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر ساتھ لے گئے اُنہوں نے کچھ مہمانی کی، آپ نے اس کو قبول فرمایا۔ [3]

حضرت سعدؓ کا یہ عمل غلبۂ عشق و محبت کا اثر تھا کہ اس وقت ذہن اس طرف نہ گیا کہ سردارِ دو عالم دروازے پر تشریف فرما ہیں مجھے فوراً جا کر ان کے قدم چوم لینے چاہئیں بلکہ ذہن اس طرف متوجہ ہو گیا کہ آپ کی زبانِ مبارک

[1] صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب حق الضيف ج:۲ ص:۹۰۵

[2] صحيح البخاري، كتاب الإستئذان، باب التسليم والإستئذان ثلاثًا ج:۲ ص:۹۲۳

[3] مسند احمد، مسند انس بن مالك رضي الله عنه، رقم الحديث: ۱۲۷۴۱

سے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ جتنی مرتبہ زیادہ نکلے گا میرے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ بہرحال اس سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ تین مرتبہ استیذان کے بعد جواب نہ آئے تو سنت یہ ہے کہ لوٹ جائے وہیں جم کر بیٹھ جانا خلاف سنت اور مخاطب کے لئے موجبِ ایذا ہے کہ اس کو دباؤ ڈال کر نکلنے پر مجبور کرنا ہے۔

مسئلہ:- یہ حکم اس وقت ہے جبکہ سلام یا دستک وغیرہ کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کی کوشش تین مرتبہ کرلی ہو کہ اب وہاں جم کر بیٹھ جانا موجبِ ایذا ہے لیکن اگر کوئی کسی عالم یا بزرگ کے دروازہ پر بغیر استیذان کئے ہوئے اور بغیر ان کو اطلاع دیئے ہوئے انتظار میں بیٹھ رہے کہ جب اپنی فرصت کے مطابق باہر تشریف لائیں گے تو ملاقات ہو جائے گی یہ اس میں داخل نہیں بلکہ عین ادب ہے۔ خود قرآن کریم نے لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں ہوں تو اُن کو آواز دے کر بُلانا ادب کے خلاف ہے بلکہ لوگوں کو چاہئے کہ انتظار کریں جس وقت آپ اپنی ضرورت کے مطابق باہر تشریف لائیں اُس وقت ملاقات کریں۔ آیت یہ ہے [1] وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (الحجرات:۵) اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں بعض اوقات کسی انصاری صحابی کے دروازہ پر پورے دوپہر انتظار کرتا رہتا ہوں کہ جب وہ باہر تشریف لائیں تو اُن سے کسی حدیث کی تحقیق کروں اور اگر میں اُن سے ملنے کے لئے اجازت مانگتا تو وہ ضرور مجھے اجازت دیدیتے مگر میں اس کو خلافِ ادب سمجھتا تھا اس لئے انتظار کی مشقت گوارا کرتا تھا۔ (صحیح بخاری) [2]

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ لفظ مَتَاعٌ کے لغوی معنی کسی چیز کے برتنے، استعمال کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کے ہیں اور جس چیز سے فائدہ اُٹھایا جائے اس کو بھی متاع کہا جاتا ہے اس آیت میں متاع کے لُغوی معنی ہی مراد ہیں جس کا ترجمہ بَرَت سے کیا گیا ہے یعنی برتنے کا استحقاق۔ حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ جب استیذان کی آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جن میں بغیر اجازت کے کسی مکان میں داخل ہونے کی ممانعت ہے تو صدیقِ اکبرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ، اس ممانعت کے بعد قریش کے تجارت پیشہ لوگ کیا کریں گے کیونکہ مکہ اور مدینہ سے ملک شام تک اُن کے تجارتی سفر ہوتے ہیں اور اس راستہ میں جابجا اُن کے مسافر خانے بنے ہوتے ہیں جن میں دورانِ سفر وہ لوگ قیام کرتے ہیں۔ ان میں کوئی مستقل رہنے والا نہیں ہوتا تو وہاں استیذان کی کیا صورت ہوگی اجازت کس سے حاصل کی جائے گی۔ اس پر آیتِ مذکورہ

---

[1] ترجمہ: اور اگر یہ لوگ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔

[2] یہ روایت صحیح بخاری میں نہیں ملی، البتہ مستدرک حاکم میں یہ روایت مذکور ہے اور اس روایت کے بعد امام حاکمؒ نے فرمایا: "هٰذا حديث صحيح على شرط البخاري" المستدرك، رقم الحديث: ۶۳۵۵ و ۶۲۹۴، وسنن الدارمي، رقم الحديث: ۵۸۱

نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم۔ مظہری) [1] اس شانِ نزول کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ آیت میں بیوت غیر مسکونہ سے مراد وہ مکانات اور مقامات ہیں جو کسی خاص فرد یا قوم کے لئے خصوصی طور پر رہائش گاہ نہیں بلکہ افرادِ قوم کو عام اجازت وہاں جانے، ٹھہرنے اور استعمال کرنے کی ہے جیسے وہ مسافر خانے جو شہروں اور جنگلوں میں اسی غرض کے لئے بنائے گئے ہوں اور باشتراکِ علت عام مسجدیں، خانقاہیں، دینی مدارس، ہسپتال، ڈاک خانہ، ریلوے اسٹیشن، ہوائی جہازوں کے مستقر اور قومی تفریحات کے لئے جو مکانات بنائے گئے ہوں غرض رفاہِ عام کے سب ادارے اسی حکم میں ہیں کہ وہاں ہر شخص بلا اجازت جا سکتا ہے۔

مسئلہ:- رفاہِ عام کے اداروں میں جس مقام پر اُس کے مالکان یا متولیان کی طرف سے داخلہ کے لئے کچھ شرائط اور پابندیاں ہوں اس کی پابندی شرعاً واجب ہے مثلاً ریلوے اسٹیشن پر اگر بغیر پلیٹ فارم کے جانے کی اجازت نہیں ہے تو پلیٹ فارم ٹکٹ حاصل کرنا ضروری ہے اس کی خلاف ورزی ناجائز ہے۔ ایرڈروم (ہوائی اڈّے) کے جس حصہ میں جانے کی محکمہ کی طرف سے اجازت نہ ہو وہاں بغیر اجازت کے جانا شرعاً جائز نہیں۔

مسئلہ:- اسی طرح مساجد، مدارس، خانقاہوں، ہسپتالوں وغیرہ میں جو کمرے وہاں کے منتظمین یا دوسرے لوگوں کی رہائش کے لئے مخصوص ہوں جیسے مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے خاص حجرے یا ریلوے، ایرڈروم اور ہسپتالوں کے دفاتر اور مخصوص کمرے جو مریضوں یا دوسروں لوگوں کی رہائش گاہ ہیں وہ بیوت غیر مسکونہ کے حکم میں نہیں، بلکہ مسکونہ کے حکم میں ہیں ان میں بغیر اجازت جانا شرعاً ممنوع اور گناہ ہے۔

استیذان سے متعلق چند دوسرے مسائل

جبکہ یہ معلوم ہو چکا کہ استیذان کے احکامِ شرعیہ کا اصل مقصد لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنا اور حُسنِ معاشرت کے آداب سکھانا ہے تو اشتراکِ علت سے مسائل ذیل کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔

ٹیلیفون سے متعلق بعض مسائل

مسئلہ:- کسی شخص کو ایسے وقت ٹیلیفون پر مخاطب کرنا جو عادۃً اُس کے سونے یا دوسری ضروریات میں یا نماز میں مشغول ہونے کا وقت ہو بلا ضرورتِ شدیدہ جائز نہیں کیونکہ اس میں بھی وہی ایذا رسانی ہے جو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے اور اُس کی آزادی میں خلل ڈالنے سے ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۴۹۰، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث:۱۵۱۹۳

مسئلہ:- جس شخص سے ٹیلیفون پر بات چیت اکثر کرنا ہوتو مناسب یہ ہے کہ اُس سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ٹیلیفون پر بات چیت کرنے میں کس وقت سہولت ہوتی ہے پھر اُس کی پابندی کرے۔

مسئلہ:- ٹیلیفون پر اگر کوئی طویل بات کرنا ہوتو پہلے مخاطب سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ذرا سی فرصت ہوتو میں اپنی بات عرض کروں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی آنے پر آدمی طبعاً مجبور ہوتا ہے کہ فوراً معلوم کرے کہ کون کیا کہنا چاہتا ہے اور اس ضرورت سے وہ کسی بھی حال میں اور اپنے ضروری کام میں ہوتو اُس کو چھوڑ کر ٹیلیفون اُٹھاتا ہے۔ کوئی بے رحم آدمی اُس وقت لمبی بات کرنے لگے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

مسئلہ:- بعض لوگ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور کوئی پروانہیں کرتے نہ پوچھتے ہیں کہ کون ہے کیا کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی اخلاق کے خلاف اور بات کرنے والے کی حق تلفی ہے جیسے حدیث میں آیا ہے اِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا [۱] یعنی جو شخص آپ کی ملاقات کو آئے اُس کا تم پر حق ہے کہ اس سے بات کرو اور بلاضرورت ملاقات سے انکار نہ کرو اسی طرح جو آدمی ٹیلیفون پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اس کا حق ہے کہ آپ اس کو جواب دیں۔

مسئلہ:- کسی کے مکان پر ملاقات کے لئے جاؤ اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے ہوتو گھر کے اندر نہ جھانکو کیونکہ استیذان کی مصلحت تو یہی ہے کہ دوسرا آدمی جو چیز آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا آپ کو اس کی اطلاع نہ ہونی چاہئے اگر پہلے ہی گھر میں جھانک کر دیکھ لیا تو یہ مصلحت فوت ہوجائے گی حدیث میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے (رواہ البخاری ومسلم عن سهل بن سعد الساعدی) [۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ کسی کے پاس جاتے اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو دروازے کے بالمقابل کھڑے ہونے کے بجائے دائیں یا بائیں کھڑے ہوکر استیذان فرماتے تھے دروازہ کے بالمقابل کھڑے ہونے سے اس لئے اجتناب فرماتے کہ اوّل تو اُس زمانے میں دروازوں پر پردے بہت کم تھے اور پردہ بھی ہوتو ہوا سے کھل جانے کا احتمال بہرحال ہے۔ (مظہری) [۳]

مسئلہ:- جن مکانوں میں داخل ہونا آیاتِ مذکورہ میں بغیر اجازت کے ممنوع قرار دیا ہے یہ عام حالات میں ہے اگر اتفاقاً کوئی حادثہ آگ لگنے یا مکان منہدم ہونے کا پیش آجائے تو اجازت لئے بغیر اس میں جاسکتے ہیں اور امداد کے لئے جانا چاہئے۔ (مظہری) [۴]

---

[۱] صحيح البخاری، کتاب الأدب، باب حق الضيف ج:۲ ص:۹۰۵

[۲] صحيح البخاری، کتاب الإستئذان، باب الإستئذان من اجل البصر ج:۲ ص:۹۲۲، وصحيح مسلم، کتاب الآداب، باب تحريم النظر فی بيت غيره ج:۲ ص:۲۱۲

[۳] تفسير المظهری ج:۶ ص:۴۹۰ [۴] تفسير المظهری ج:۶ ص:۴۸۸

مسئلہ:- جس شخص کو کسی نے بُلا کر بھیجا ہے اگر وہ اس کے قاصد کے ساتھ ہی آ گیا تو اب اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں قاصد کا آنا اجازت ہے۔ ہاں اگر اس وقت نہ آیا کچھ دیر کے بعد پہنچا تو اجازت لینا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ فَجَاءَ مَعَ الرَّسُوْلِ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَهٗ اِذْنٌ، یعنی جو آدمی بُلایا جائے اور وہ قاصد کے ساتھ ہی آ جائے تو یہی اُس کے لئے اندر آنے کی اجازت ہے۔ (رواہ ابوداؤد، مظہری) [1]

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى

کہدے ایمان والوں کو نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتے رہیں اپنے ستر کو اس میں خوب ستھرائی ہے

لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۞ (۳۰) وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ

اُن کے لئے، بیشک اللہ کو خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں اور کہدے ایمان والیوں کو نیچی رکھیں ذرا

اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا

اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار مگر جو کھلی چیز ہے اس میں سے

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا

اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر

لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے یا اپنے خاوند کے باپ کے یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے کے

اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ

یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے یا

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب في الرجل يدعى أيكون ذالك إذنه؟ ج:۲ ص:۳۵۷

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ

اپنے ہاتھ کے مال کے یا کاروبار کرنے والوں کے جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے یا لڑکوں کے

الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ

جنہوں نے ابھی نہیں پہچانا عورتوں کے بھید کو اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو

لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۗ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ

کہ جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنے سنگار اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب مل کر اے ایمان والو

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

تاکہ تم بھلائی پاؤ

آسان ترجمۂ قرآن

مؤمن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہی اُن کے لئے پاکیزہ ترین طریقہ ہے۔ وہ جو کارروائیاں کرتے ہیں، اللہ اُن سب سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۳۰﴾ اور مؤمن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی سجاوٹ کو کسی پر ظاہر نہ کریں، سوائے اُس کے جو خود ہی ظاہر ہو جائے، اور اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے گریبانوں پر ڈال لیا کریں، اور اپنی سجاوٹ اور کسی پر ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے شوہروں کے، یا اپنے باپ، یا اپنے شوہروں کے باپ کے، یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے، یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے، یا اپنی عورتوں کے، یا اُن کے جو اپنے ہاتھوں کی ملکیت میں ہیں، یا اُن خدمت گذاروں کے جن کے دِل میں کوئی (جنسی) تقاضا نہیں ہوتا، یا اُن بچوں کے جو ابھی عورتوں کے چھپے ہوئے حصوں سے آشنا نہیں ہوئے۔ اور مسلمان عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ ماریں کہ اُنہوں نے جو زینت چھپا رکھی ہے، وہ معلوم ہو جائے۔ اور اے مؤمنو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔ ﴿۳۱﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم ششم عورتوں کے پردہ کے احکام

آپ مسلمان مردوں سے کہد یجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کی طرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اُس کو بالکل نہ دیکھیں اور جس کو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور لواطت سب داخل ہے) یہ اُن کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے (اور اس کے خلاف میں آلودگی ہے زنا یا مقدمۂ زنا میں) بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں (پس خلاف کرنے والے سزایابی کے مستحق ہوں گے) اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے کہد یجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کی طرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اس کو بالکل نہ دیکھیں اور جس کو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا و سحاق سب داخل ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں (زینت سے مراد زیور جیسے کنگن، چوڑی، خلخال باز و بند طوق، جھومر، پٹی، بالیاں وغیرہ اور ان کے مواقع سے مراد ہاتھ، پنڈلی، بازو، گردن، سر، سینہ کان، یعنی ان سب مواقع کو سب سے چھپائے رکھیں بلحاظ ان دو استثناؤں کے جو آگے آتے ہیں اور جب ان مواقع کو اجانب سے پوشیدہ رکھنا واجب ہے جن کا ظاہر کرنا محارم کے روبرو جائز ہے جیسا آگے آتا ہے تو اور مواقع واعضاء جو بدن کے رہ گئے جیسے پشت وشکم وغیرہ جن کا کھولنا محارم کے روبرو بھی جائز نہیں ان کا پوشیدہ رکھنا بدلالۃ النص واجب ہوگیا۔ حاصل یہ ہوا کہ سر سے پاؤں تک تمام بدن اپنا پوشیدہ رکھیں۔ دو استثناء جن کا ذکر اوپر آیا ہے اُن میں سے پہلا استثناء مواقع ضرورت کے لحاظ سے ہے کہ روزمرّہ کے کام کاج میں جن اعضاء کے کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے اُن کو مستثنٰی قرار دیا گیا اُس کی تفصیل یہ ہے) مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا (ہی) رہتا ہے (جس کے چھپانے میں ہر وقت حرج ہے مراد اس موقع زینت سے چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں اور اصح قول کے مطابق دونوں قدم بھی، کیونکہ چہرہ تو قدرتی طور پر مجمع زینت ہے اور بعض زینتیں قصداً بھی اس میں کی جاتی ہیں مثلاً سرمہ وغیرہ اور ہتھیلیاں اور انگلیاں انگوٹھی چھلّے مہندی کا موقع ہے اور قدمین بھی چھلّوں اور مہندی کا موقع ہے پس ان مواقع کو اس ضرورت سے مستثنٰی فرمایا ہے کہ ان کو کھولے بغیر کام کاج نہیں ہوسکتا اور مَاظَهَرَ کی تفسیر وجہ اور کفین کے ساتھ حدیث میں آئی ہے اور قدمین کو فقہاء نے اس پر قیاس کر کے اس حکم میں شامل قرار دیا ہے) اور (خصوصاً سر اور سینہ ڈھکنے کا بہت اہتمام کریں اور) اپنے دوپٹے (جو سر ڈھانکنے کے لئے ہیں)

اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں (گو سینہ قمیص سے ڈھک جاتا ہے لیکن اکثر قمیص میں سامنے سے گریبان کھلا رہتا ہے اور سینہ کی ہیئت قمیص کے باوجود ظاہر ہوتی ہے اس لئے اہتمام کی ضرورت ہوئی آگے دوسرا استثناء بیان کیا جاتا ہے جن میں محرم مردوں وغیرہ کو پردہ کے حکم مذکور سے مستثنیٰ کیا گیا ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع مذکورہ) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا (اپنے محارم پر یعنی) اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے (حقیقی وعلاتی واخیافی) بھائیوں پر (نہ کہ چچازاد ماموں زاد وغیرہ بھائیوں پر) یا اپنے (مذکورہ) بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی (حقیقی وعلاتی واخیافی) بہنوں کے بیٹوں پر (نہ کہ چچازاد خالہ زاد بہنوں کی اولاد پر) یا اپنی (یعنی دین کی شریک) عورتوں پر (مطلب یہ کہ مسلمان عورتوں پر کیونکہ کافر عورتوں کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے رواہ فی الدر [1] عن طاؤس ومجاھد وعطاء وسعید بن المسیب وابراھیم) یا اپنی لونڈیوں پر (مطلقاً گو وہ کافر ہی ہوں کیونکہ مرد غلام کا حکم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مثل اجنبی مرد کے ہے اُس سے بھی پردہ واجب ہے رواہ فی الدر عن طاؤس ومجاھد وعطاء وسعید بن المسیب وابراھیم) [2] یا اُن مردوں پر جو (محض کھانے پینے کے واسطے) طفیلی (کے طور پر رہتے) ہوں اور ان کو (بوجہ حواس درست نہ ہونے کے عورتوں کی طرف) ذرا توجہ نہ ہو (تابعین کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس وقت ایسے ہی لوگ موجود تھے کذا فی الدر عن ابن عباس اور اسی حکم میں ہے ہر مسلوب العقل، پس مدار حکم کا سلبِ حواس پر ہے نہ کہ تابع اور طفیلی ہونے پر مگر اس وقت وہ تابع ایسے ہی تھے اس لئے تابع کا ذکر کر دیا گیا [3] لِقَوْلِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ فِي الدُّرِّ مُغَفَّلٌ فِيْ عَقْلِهٖ اَحْمَقُ لَا يَكْتَرِثُ لِلنِّسَاءِ [4] اور جو سمجھ رکھتا ہو وہ تو بہر حال اجنبی مرد ہے گو بوڑھا یا خصی یا مجبوب ہی کیوں نہ ہو اُس سے پردہ واجب ہے) یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے (مراد وہ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب نہیں پہنچے اور اُنہیں شہوت کی کچھ خبر نہیں۔ پس ان سب کے سامنے وجہ وکفین وقدمین کے علاوہ زینت کے مواقع مذکورہ کا ظاہر کرنا بھی جائز ہے یعنی سر اور سینہ اور شوہر کے روبرو کسی جگہ کا بھی اخفاء واجب نہیں گو خاص بدن کو دیکھنا خلاف اولیٰ ہے۔ [5] قَالَتْ سَيِّدَتُنَا اُمُّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَائِشَةُؓ مَا مُحَصَّلُهٗ لَمْ اَرَ مِنْهُ وَلَمْ يَرَ مِنِّيْ ذٰلِكَ الْمَوْضِعَ اَوْرَدَهٗ فِي الْمُشْكٰوةِ [6] وَرَوٰى بَقِيُّ بْنُ مُخَلَّدٍ وَابْنُ عَدِيٍّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا اِذَا جَامَعَ اَحَدُكُمْ زَوْجَتَهٗ اَوْ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں: الدر المنثور تحت ھذه الآیة ج:۷ ص:۲۸۷

[2] الدر المنثور ج:۷ ص:۲۸۸

[3] ترجمہ: کیونکہ الدر المنثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فرمان موجود ہے کہ ''تابع'' اسے کہتے ہیں جو عقلمند نہ ہو، احمق ہو، عورتوں کی پرواہ نہ کرتا ہو۔

[4] الدر المنثور بحوالۂ بالا۔

[5] ترجمہ: اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ نہ میں نے آپ کی شرمگاہ کو دیکھا نہ آپ نے میری شرمگاہ کو دیکھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی یا باندی سے جماع کرے تو اس کی شرمگاہ کی طرف نہ دیکھے کیونکہ اس سے بینائی متاثر ہوتی ہے۔

[6] تفسیر روح البیان، سورۃ الأعراف آیت:۲۰، ج:۴ ص:۱۱۹

جَارِيَتَهٗ فَلَا يَنْظُرُ اِلٰى فَرْجِهَا فَاِنَّ ذٰلِكَ يُوْرِثُ الْعَمٰى [۱] قَالَ ابْنُ صَلَاحٍ جَيِّدُ الْاِسْنَادِ كَذَا فِي الْجَامِعِ الصَّغِيْرِ [۲])اور (پردے کا یہاں تک اہتمام رکھیں کہ چلنے میں) اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے (یعنی زیور کی آواز غیر محرموں کے کان تک پہنچے) اور مسلمانو (تم سے جو ان احکام میں کوتاہی ہوگئی ہو تو) تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (ورنہ معصیت مانع فلاحِ کامل ہو جاتی ہے)۔

معارف و مسائل

انسدادِ فواحش اور حفاظتِ عصمت کا ایک اہم باب پردۂ نسواں

عورتوں کے لئے حجاب اور پردہ کے احکام کی پہلی آیات وہ ہیں جو سورۂ احزاب میں اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آنے کے وقت نازل ہوئیں، جس کی تاریخ بعض حضرات نے ۳ھ اور بعض نے ۵ھ بتلائی ہے تفسیر ابن کثیر اور نیل الاوطار میں ۵ھ کو ترجیح دی ہے [۳] اور روح المعانی میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ذی قعدہ ۵ھ میں یہ عقد ہوا ہے [۴] اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پہلی آیتِ حجاب اسی موقع پر نازل ہوئی۔ اور سورۂ نور کی یہ آیات قصہ افک کے ساتھ نازل ہوئی ہیں جو غزوہ بنی المصطلق یا مریسیع سے واپسی میں پیش آیا، یہ غزوہ ۶ھ میں ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور کی آیات پردہ و حجاب نزول کے اعتبار سے بعد میں آئی ہیں سورۂ احزاب کی چار آیتیں متعلقۂ حجاب نزول کے اعتبار سے مقدم ہیں اور شرعی پردہ کے احکام اُسی وقت سے شروع ہوئے جبکہ سورۂ احزاب کی آیات نازل ہوئیں، اس لئے حجاب اور پردہ کی پوری بحث تو ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں آئے گی۔ یہاں صرف ان آیات کی تفسیر لکھی جاتی ہے جو سورۂ نور میں آئی ہیں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ **یغضوا**، غض سے مشتق ہے جس کے معنی کم کرنے اور پست کرنے کے ہیں (راغب) [۵] نگاہ پست اور نیچی رکھنے سے مراد نگاہ کو اُن چیزوں سے پھیر لینا ہے جن کی طرف دیکھنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ ابن کثیر، ابنِ حبان نے یہی تفسیر فرمائی ہے [۶] اس میں

---

[۱] سنن الکبریٰ للبیھقیؒ، رقم الحدیث:۱۳۳۱۸

[۲] الجامع الصغیر، رقم الحدیث:۱۴۶۵

[۳] تفسیر ابن کثیر، سورة الأحزاب، آیة:۵۳، ونیل الأوطار ج:۹ ص:۴۶۲، کتاب النکاح، باب النھی عن الخلوة بالأجنبیة إلخ۔

[۴] روح المعانی، سورة الأحزاب آیت:۴۰، ج:۱۲ ص:۱۳۷، وسورة الأحزاب آیت:۵۳، ج:۱۲ ص:۱۹۲

[۵] مفردات القرآن للراغبؒ ج:۱ ص:۳۶۱

[۶] تفسیر ابن کثیر تحت ھذہ الآیة ج:۶ ص:۴۱، وتفسیر البحر المحیط تحت ھذہ الآیة ج:۸ ص:۳۰۴

غیر محرم عورت کی طرف بُری نیت سے دیکھنا تحریماً اور بغیر کسی نیت کے دیکھنا کراہۃً داخل ہے اور کسی عورت یا مرد کے ستر شرعی پر نظر ڈالنا بھی اس میں داخل ہے (مواضع ضرورت جیسے علاج معالجہ وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں) کسی کا راز معلوم کرنے کے لئے اُس کے گھر میں جھانکنا اور تمام وہ کام جن میں نگاہ کے استعمال کرنے کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے اس میں داخل ہیں۔

وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش پورا کرنے کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں اُن سب سے اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں۔ اس میں زنا، لواطت اور دو عورتوں کا باہمی سحاق جس سے شہوت پوری ہوجائے، ہاتھ سے شہوت پوری کرنا یہ سب ناجائز و حرام چیزیں داخل ہیں۔ مراد اس آیت کی ناجائز و حرام شہوت رانی اور اُس کے تمام مقدمات کو ممنوع کرنا ہے جن میں سے ابتدا اور انتہا کو تصریحاً بیان فرمادیا باقی درمیانی مقدمات سب اس میں داخل ہوگئے۔ فتنۂ شہوت کا سب سے پہلا سبب اور مقدمہ نگاہ ڈالنا اور دیکھنا ہے اور آخری نتیجہ زنا ہے ان دونوں کو صراحۃً ذکر کر کے حرام کردیا گیا اُن کے درمیانی حرام مقدمات مثلاً باتیں سُننا، ہاتھ لگانا وغیرہ یہ سب ضمناً آگئے۔

ابن کثیر نے حضرت عبیدہؒ سے نقل کیا ہے کہ كُلُّ مَا عُصِيَ اللهُ بِهٖ فَهُوَ كَبِيْرَةٌ وَقَدْ ذَكَرَ الطَّرَفَيْنِ۔ [1] یعنی جس چیز سے بھی اللہ کے حکم کی مخالفت ہوتی ہو سب کبیرہ ہی ہیں لیکن آیت میں اُن کے دو طرف ابتدا و انتہاء کو ذکر کردیا گیا۔ ابتداء نظر اُٹھا کر دیکھنا اور انتہا زنا ہے۔ طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلنَّظْرُ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ مَنْ تَرَكَهَا مَخَافَتِيْ اَبْدَلْتُهٗ اِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهٗ فِيْ قَلْبِهٖ۔ (از ابن کثیر) [2]

نظر ایک زہریلا تیر شیطان کے تیروں میں سے ہے جو شخص باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نظر پھیر لے تو میں اس کے بدلے اس کو ایسا پختہ ایمان دوں گا جس کی لذت وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اگر بلا ارادہ اچانک کسی غیر محرم پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اپنی نظر اُس طرف سے پھیر لو (ابن کثیر) [3] حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ پہلی نظر تو معاف ہے دوسری گناہ ہے، [4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:٦ ص:۴۲ [2] المعجم الكبير للطبرانیؒ، رقم الحديث: ١٠٢١١

[3] صحیح مسلم، كتاب الآداب، باب نظر الفجاءة ج:٢ ص:٢١٢

[4] سنن ابی داوٗد، كتاب النكاح، باب فيما يؤمر به من غض البصر ج:١ ص:٢٩٩

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ پہلی نظر جو بلا ارادہ اچانک پڑ جائے وہ غیر اختیاری ہونے کے سبب معاف ہے ورنہ بالقصد پہلی نظر بھی معاف نہیں۔

بے ریش لڑکوں کی طرف قصداً نظر کرنا بھی اسی حکم میں ہے

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ بہت سے اسلافِ اُمت کسی امرد (بے ریش) لڑکے کی طرف دیکھتے رہنے سے بڑی سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے اور بہت سے علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے[۱] (غالباً یہ اُس صورت میں ہے جبکہ بُری نیت اور نفس کی خواہش کے ساتھ نظر کی جائے واللہ اعلم-ش)۔

غیر محرم کی طرف نظر کرنا حرام ہے اس کی تفصیل

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ الآیۃ، اس طویل آیت کے ابتدائی حصہ میں تو وہی حکم ہے جو اس سے پہلی آیت میں مردوں کو دیا گیا ہے کہ اپنی نظریں پست رکھیں یعنی نگاہ پھیرلیں۔ مَردوں کے حکم میں عورتیں بھی داخل تھیں مگر اُن کا ذکر علیحدہ تاکید کے لئے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو اپنے محارم کے سوا کسی مرد کو دیکھنا حرام ہے۔ بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ غیر محرم مرد کو دیکھنا عورت کے لئے مطلقاً حرام ہے خواہ شہوت اور بُری نیت سے دیکھے یا بغیر کسی نیت وشہوت کے، دونوں صورتیں حرام ہیں اور اس پر حضرت اُمِّ سلمہؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک روز اُمِّ سلمہ اور میمونہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں اچانک عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم نابینا صحابی آ گئے اور یہ واقعہ احکام حجاب نازل ہونے کے بعد پیش آیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو حکم دیا کہ ان سے پردہ کرو۔ اُمِّ سلمہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، وہ تو نابینا ہیں نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں نہ ہمیں پہچانتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم تو نابینا نہیں ہو، تم تو اُن کو دیکھ رہی ہو (رواہ ابوداؤد والترمذی وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)[۲] اور دوسرے بعض فقہاء نے کہا کہ بغیر شہوت کے غیر مرد کو دیکھنے میں عورت کے لئے مضائقہ نہیں۔ ان کا استدلال صدیقہ عائشہؓ کی اُس حدیث سے ہے جس میں مذکور ہے کہ مسجد نبوی کے احاطہ میں کچھ حبشی نوجوان عید کے روز اپنا سپاہیانہ کھیل دکھا رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھنے لگے اور صدیقہ عائشہؓ نے آپ کی آڑ میں کھڑے ہو کر اُن کا کھیل دیکھا اور اُس وقت تک دیکھتی رہیں جب تک کہ خود ہی اُس سے اُکتا گئیں۔[۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہیں روکا۔ اور اس

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۲ ص:۴۴

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی قولہ تعالیٰ: وقل للمؤمنٰت الآیۃ، ج:۲ ص:۲۱۴، وجامع الترمذی، ابواب الأدب، باب إحتجاب النساء من الرجال ج:۲ ص:۱۰۶

[۳] صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب نظر المرأۃ إلی الحبش إلخ، ج:۲ ص:۷۸۸

پر سب کا اتفاق ہے کہ نظرِ شہوت تو حرام ہے اور بلا شہوت نظر کرنا بھی خلافِ اولیٰ ہے اور ایک عورت کو دوسری عورت کے مواضع ستر کو دیکھنا بغیر خاص ضرورتوں کے یہ بھی اسی آیت کے الفاظ سے حرام ہے کیونکہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کہ موضع ستر یعنی مردوں کا ناف سے گھٹنوں تک اور عورتوں کا کُل بدن بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے، یہ مواضع ستر ہیں اُن کا چھپانا سب سے فرض ہے نہ کوئی مرد دوسرے مرد کا ستر دیکھ سکتا ہے نہ کوئی عورت دوسری عورت کا ستر دیکھ سکتی ہے اور مرد کسی عورت کا یا عورت کسی مرد کا ستر دیکھے یہ بدرجۂ اَولیٰ حرام ہے اور آیت مذکورہ کے حکم غضِ بصر کے خلاف ہے کیونکہ آیت کا مطلب جو اوپر بیان ہو چکا ہے اس میں ہر ایسی چیز سے نظر پست رکھنا اور ہٹالینا مراد ہے جس کی طرف دیکھنے کو شرع میں ممنوع کیا گیا ہے اس میں عورت کے لئے عورت کا ستر دیکھنا بھی داخل ہے۔ [۱]

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ الآیۃ،

زینت لُغوی معنے کے اعتبار سے اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مزیّن اور خوش منظر بنائے۔ وہ عمدہ کپڑے بھی ہو سکتے ہیں، زیور بھی۔ یہ چیزیں جبکہ کسی عورت کے بدن پر نہ ہوں علیحدہ ہوں تو باتفاقِ اُمت اُن کا دیکھنا مَردوں کے لئے حلال ہے جیسے بازار میں بکنے والے زنانہ کپڑے اور زیور کہ اُن کے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے جمہور مفسرین نے اس آیت میں زینت سے مرادِ محلِ زینت یعنی وہ اعضاء جن میں زینت کی چیزیں زیور وغیرہ پہنی جاتی ہیں وہ مراد لئے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ عورتوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی زینت یعنی مواقع زینت کو ظاہر نہ کرے (کذا فی الروح) [۲] اس آیت میں جو عورت کے لئے اظہارِ زینت کو حرام قرار دیا ہے آگے اس حکم سے دو استثناء بیان فرمائے گئے ایک منظور کے اعتبار سے ہے یعنی جس کی طرف دیکھا جائے دوسرا ناظر یعنی دیکھنے والوں کے اعتبار سے۔

اَحکامِ پردہ سے استثناء

پہلا استثناء مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا ہے یعنی عورت کے لئے اپنی زینت کی کسی چیز کو مَردوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں بجز اُن چیزوں کے جو خود بخود ظاہر ہو ہی جاتی ہیں یعنی کام کاج اور نقل و حرکت کے وقت جو چیزیں عادۃً کھل ہی جاتی ہیں اور عادۃً اُن کا چھپانا مشکل ہے وہ مستثنیٰ ہیں اُن کے اظہار میں کوئی گناہ نہیں (ابن کثیر) [۳] مراد اس سے کیا ہے اس میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس کی تفسیریں مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اوپر کے کپڑے ہیں جیسے برقع یا لمبی چادر جو برقع کے قائم مقام ہوتی ہے۔ یہ کپڑے

[۱] یعنی تمام نامحرموں سے، محرم کا حکم آگے آرہا ہے۔ (محمد تقی عثمانی ۱۴۱۹ھ)

[۲] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۱۳ ص:۴۰۴

[۳] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۴۵

زینت کے کپڑوں کو چھپانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ زینت کی کسی چیز کو ظاہر کرنا جائز نہیں۔ بجز اُن اوپر کے کپڑوں کے جن کا چھپانا بضرورت باہر نکلنے کے وقت ممکن نہیں جیسے برقع وغیرہ۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں کیونکہ جب عورت کسی ضرورت سے باہر نکلنے پر مجبور ہو تو نقل وحرکت اور لین دین کے وقت چہرے اور ہتھیلیوں کو چھپانا مشکل ہے۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر کے مطابق تو غیر محرم مردوں کے سامنے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنا بھی جائز نہیں صرف اوپر کے کپڑے برقع وغیرہ کا اظہار بضرورت مستثنیٰ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق چہرہ اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے۔ اس لئے فقہاء اُمت میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں پردے سے مستثنیٰ اور اُن کا غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر ڈالنے سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو اُن کا دیکھنا بھی جائز نہیں اور عورت کو اُن کا کھولنا بھی جائز نہیں اسی طرح اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ ستر عورت جو نماز میں اجماعاً اور خارج نماز علی الاصح فرض ہے اُس سے چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں، اگر ان کو کھول کر نماز پڑھی تو نماز باتفاق صحیح ودرست ہو جائے گی۔

قاضی بیضاوی اور خازن نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مقتضا آیات کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے اصل حکم یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کی کسی چیز کو بھی ظاہر نہ ہونے دے، بجز اُس کے جو نقل وحرکت اور کام کاج کرنے میں عادۃً کھل ہی جاتی ہیں ان میں برقع اور چادر بھی داخل ہیں اور چہرہ اور ہتھیلیاں بھی کہ جب عورت کسی مجبوری اور ضرورت سے باہر نکلتی ہے تو برقع چادر وغیرہ کا ظاہر ہونا تو متعیّن ہی ہے لین دین کی ضرورت میں بعض اوقات چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں بھی کھل جاتی ہیں تو وہ بھی معاف ہیں گناہ نہیں۔ لیکن اس آیت سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ مردوں کو چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھنا بھی بلاضرورت جائز ہے بلکہ مردوں کا تو وہی حکم ہے کہ نگاہ پست رکھیں اگر عورت کہیں چہرہ اور ہاتھ کھولنے پر مجبور ہو جائے تو مردوں کو لازم ہے کہ بلا عذر شرعی اور بلاضرورت کے اس کی طرف نہ دیکھیں۔ [1] اس توجیہ میں دونوں روایتیں اور تفسیریں جمع ہو جاتی ہیں۔ امام مالکؒ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کہ غیر محرم عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر کرنا بھی بغیر ضرورت مبیحہ کے جائز نہیں۔ اور زواجر میں ابن حجر مکّی شافعیؒ نے امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے کہ اگرچہ عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں سترِ عورت کے فرض میں داخل نہیں ان کو کھول کر بھی نماز ہو جاتی ہے مگر غیر محرم مَردوں کو ان کا دیکھنا بلاضرورتِ شرعیہ جائز نہیں۔ اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جن فقہاء نے چہرہ اور ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز قرار دیا ہے وہ بھی اس پر متفق ہیں کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو چہرہ وغیرہ دیکھنا بھی ناجائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حُسن اور زینت کا اصل مرکز انسان کا چہرہ

[1] تفسیر البیضاوی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۳۷۷، وتفسیر الخازن تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۴۹۹

ہے اور زمانہ فتنہ وفساد اور غلبۂ ہویٰ اور غفلت کا ہے اس لئے بجز مخصوص ضرورتوں کے مثلاً علاج معالجہ یا کوئی خطرہ شدیدہ وغیرہ عورت کو غیر محارم کے سامنے قصداً چہرہ کھولنا بھی ممنوع ہے اور مَردوں کو اُس کی طرف قصداً نظر کرنا بھی بغیر ضرورت شرعیہ کے جائز نہیں۔

آیتِ مذکورہ میں زینتِ ظاہرہ کے استثناء کے بعد ارشاد ہے: وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ یعنی آنچل مارلیا کریں اپنے دوپٹوں کا اپنے سینوں پر۔ خُمُر، خمار کی جمع ہے اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو عورت سر پر استعمال کرے اور اُس سے گلا اور سینہ بھی چھپ جائے۔ جیوب جیب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گریبان۔ چونکہ زمانہ قدیم سے گریبان سینہ ہی پر ہونے کا معمول ہے اس لئے جیوب کے چھپانے سے مراد سینہ کا چھپانا ہے شروع آیت میں اظہارِ زینت کی ممانعت تھی اس جملہ میں اخفاء زینت کی تاکید اور اس کی ایک صورت کا بیان ہے جس کی اصل وجہ ایک رسمِ جاہلیت کا مٹانا ہے زمانۂ جاہلیت میں عورتیں دوپٹہ سر پر ڈال کر اس کے دونوں کنارے پشت پر چھوڑ دیتی تھیں جس سے گریبان اور گلا اور سینہ اور کان کھلے رہتے تھے اس لئے مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسا نہ کریں بلکہ دوپٹے کے دونوں پلّے ایک دوسرے پر اُلٹ لیں تاکہ یہ سب اعضاء چھپ جائیں (رواہ ابن ابی حاتم عن ابی جبیرؒ، روح) آگے دوسرا استثناء اُن مردوں کا بیان کیا گیا ہے جن سے شرعاً پردہ نہیں جس کے دو سبب ہیں اوّل تو جن مردوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اُن سے کسی فتنہ کا خطرہ نہیں وہ محارم ہیں جن کی طبائع کو حق تعالیٰ نے خلقۃً ایسا بنایا ہے کہ وہ ان عورتوں کی عصمت کے محافظ ہوتے ہیں اُن سے خود کوئی فتنہ کا احتمال نہیں۔ دوسرے ہر وقت ایک جگہ رہنے سہنے کی ضرورت بھی سہولت پیدا کرنے کی مقتضی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شوہر کے سوا دوسرے محارم کو جو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ احکامِ حجاب و پردہ سے استثناء ہے۔ سترِ عورت سے استثناء نہیں، عورت کا جو بدن ستر میں داخل ہے جس کا کھولنا نماز میں جائز نہیں اُس کا دیکھنا محارم کے لئے بھی جائز نہیں۔ [1]

اس آیت میں آٹھ قسم کے محرم مَردوں کا اور چار دوسری اقسام کا پردہ سے استثناء کیا گیا ہے اور سورۂ احزاب کی آیت جو نزول میں اس سے مقدم ہے اس میں صرف سات اقسام کا ذکر ہے پانچ کا اضافہ سورۂ نور کی آیت میں کیا گیا ہے جو اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔

تنبیہ

یاد رہے کہ اس جگہ لفظ محرم عام معنی میں استعمال ہوا ہے جو شوہر پر بھی مشتمل ہے فقہاء کی اصطلاح میں محرم کی جو

[1] یہاں مسئلے میں تھوڑی سی تفصیل ہے جو بیان ہونے سے رہ گئی ہے۔ وہ تفصیل یہ ہے کہ عورت کے ستر کا وہ حصہ جو ناف اور گھٹنوں کے درمیان ہے نیز پیٹ اور کمر محرم کے لئے بھی دیکھنا جائز نہیں۔ البتہ اس کے علاوہ بدن کے دوسرے حصے، مثلاً سر، کلائیاں پنڈلی وغیرہ محرم کے سامنے کھولی جاسکتی ہے۔ البتہ زمانہ چونکہ فتنے کا ہے۔ اس لئے بلاضرورت کھولنے کی عادت ڈالنا مناسب نہیں۔ شاید اسی وجہ سے حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے ستر ہی کو محرم کا ستر قرار دیا ہے، واللہ اعلم (محمد تقی عثمانی ۱۴۱۹ھ)

خاص تفسیر ہے کہ جس سے کبھی نکاح جائز نہ ہو وہ یہاں مراد نہیں۔ تفصیل ان بارہ مستثنیات کی جو سورۂ نور کی مذکورۂ آیت میں ہے یہ ہے: سب سے پہلے شوہر ہے جس سے بیوی کے کسی عضو کا پردہ نہیں اگرچہ اعضاء مخصوصہ کو بلاضرورت دیکھنا خلافِ اَولیٰ ہے حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا مَا رَاٰی مِنِّیْ وَلَا رَاَیْتُ مِنْهُ یعنی نہ آپ نے میرے خاص عضو کو دیکھا نہ میں نے آپ کے۔ [1]

دوسرے اپنے باپ ہیں، جس میں دادا، پردادا سب داخل ہیں۔ تیسرے شوہر کا باپ ہے اس میں بھی دادا، پردادا سب داخل ہیں۔ چوتھے اپنے لڑکے جو اپنی اولاد میں ہیں۔ پانچویں شوہر کے لڑکے جو کسی دوسری بیوی سے ہوں۔ چھٹے اپنے بھائی، اس میں حقیقی بھی داخل ہیں اور باپ شریک یعنی علاتی اور ماں شریک یعنی اخیافی بھی۔ لیکن ماموں، خالہ یا چچا، تایا اور پھوپی کے لڑکے جن کو عام عرف میں بھائی کہا جاتا ہے وہ اس میں داخل نہیں وہ غیر محرم ہیں۔ ساتویں بھائیوں کے لڑکے یہاں بھی صرف حقیقی یا علاتی یا اخیافی بھائی کے لڑکے مراد ہیں دوسرے عُرفی بھائیوں کے لڑکے شامل نہیں۔ آٹھویں بہنوں کے لڑکے۔ اس میں بھی بہنوں سے حقیقی اور علاتی اخیافی بہنیں مراد ہیں۔ ماموں زاد چچا زاد بہنیں داخل نہیں یہ آٹھ قسمیں تو محارم کی ہیں۔

نویں قسم اَوْ نِسَآئِهِنَّ یعنی اپنی عورتیں جس سے مراد مسلمان عورتیں ہیں کہ اُن کے سامنے بھی وہ تمام اعضاء کھولنا جائز ہے جو اپنے باپ بیٹوں کے سامنے کھولے جا سکتے ہیں اور یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ استثناء احکام حجاب و پردہ سے ہے، احکام ستر سے نہیں۔ اس لئے جو اعضاء ایک عورت اپنے محرم مردوں کے سامنے نہیں کھول سکتی اُن کا کھولنا کسی مسلمان عورت کے سامنے بھی جائز نہیں۔ علاج معالجہ وغیرہ کی ضرورتیں مستثنیٰ ہیں۔

نِسَآئِهِنَّ، مسلمان عورتوں کی قید سے یہ معلوم ہوا کہ کافر مشرک عورتوں سے بھی پردہ واجب ہے وہ غیر محرم مَردوں کے حکم میں ہیں۔ ابنِ کثیر نے حضرت مجاہدؒ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں کہ کسی کافر عورت کے سامنے اپنے اعضاء کو کھولے [2] لیکن احادیث صحیحہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں کافر عورتوں کا ازواج مطہرات کے پاس جانا ثابت ہے۔ اس لئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ بعض نے کافر عورتوں کو مثل غیر محرم مَردوں کے قرار دیا ہے بعض نے اس معاملہ میں مسلمان اور کافر دونوں قسم کی عَورتوں کا ایک ہی حکم رکھا ہے کہ اُن سے پردہ نہیں۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ لفظ نِسَآئِهِنَّ میں تو سبھی عورتیں مسلم اور کافر داخل ہیں اور سلف صالحین سے جو کافر عورتوں سے پردہ کرنے کی روایات منقول ہیں وہ استحباب پر مبنی ہیں۔ روح المعانی

---

[1] تفسیر روح البیان، سورۃ الأعراف آیت:۲۰، ج:۳ ص:۱۱۹

[2] تفسیر ابن کثیر تحت ھذہ الآیۃ ج:۶ ص:۴۷

میں مفتی بغداد علامہ آلوسیؒ نے اسی قول کو اختیار فرما کر کہا ہے:

هٰذَا الْقَوْلُ اَرْفَقُ بِالنَّاسِ الْيَوْمَ فَاِنَّهٗ لَا يَكَادُ يُمْكِنُ احْتِجَابُ الْمُسْلِمَاتِ عَنِ الذِّمِّيَّاتِ۔ (روح المعانی) [۱]

یہی قول آج کل لوگوں کے مناسب حال ہے کیونکہ اس زمانے میں مسلمان عورتوں کا کافر عورتوں سے پردہ تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔

دسویں قسم اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ہے یعنی وہ جو اِن عورتوں کے مملوک ہوں۔ ان الفاظ کے عموم میں تو غلام اور لونڈیاں دونوں داخل ہیں لیکن اکثر ائمہ فقہاء کے نزدیک اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں، غلام اس میں داخل نہیں۔ اُن سے عام محارم کی طرح پردہ واجب ہے حضرت سعید بن مسیّبؒ نے اپنے آخری قول میں فرمایا لَا يَغُرَّنَّكُمْ اٰيَةُ النُّوْرِ فَاِنَّهٗ فِي الْاِنَاثِ دُوْنَ الذُّكُوْرِ یعنی تم لوگ کہیں سورۂ نور کی اس آیت سے مغالطہ میں نہ پڑ جاؤ کہ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ عام ہیں۔ مرد غلاموں کو بھی شامل ہیں لیکن واقعہ ایسا نہیں یہ آیت صرف عورتوں یعنی کنیزوں کے حق میں ہے مرد غلام اس میں داخل نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ غلام مرد کے لئے اپنی آقا عورت کے بال دیکھنا جائز نہیں (روح المعانی) [۲] باقی رہا یہ سوال کہ جب لفظ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ سے صرف عورتیں لونڈیاں ہی مراد ہیں تو وہ اس سے پہلے لفظ نِسَآىِٕهِنَّ میں داخل ہیں ان کو علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی اس کا جواب جصاصؒ نے یہ دیا ہے کہ لفظ نِسَآىِٕهِنَّ اپنے ظاہر کے اعتبار صرف مسلمان عورتوں کے لئے ہے۔ اور مملوکہ باندیوں میں اگر کافر بھی ہوں تو اُن کو مستثنیٰ کرنے کے لئے یہ لفظ علیحدہ لایا گیا ہے۔ [۳]

گیارہویں قسم اَوِالتّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مغفّل اور بدحواس قسم کے لوگ ہیں جن کو عورتوں کی طرف کوئی رغبت و دلچسپی ہی نہ ہو (ابن کثیر) [۴] اور یہی مضمون ابن جریر نے ابوعبداللہؒ، ابن جُبَیرؒ، ابن عطیہؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ [۵] اس لئے اس سے مراد وہ مرد ہیں جو عورتوں کی طرف نہ کوئی رغبت و شہوت رکھتے ہوں، نہ اُن کے اَوصافِ حُسن اور حالات سے کوئی دلچسپی رکھتے ہوں کہ دوسرے لوگوں سے بیان کردیں۔ بخلاف مُخَنَّثْ قسم کے لوگوں کے جو عورتوں کے اوصافِ خاص سے تعلق رکھتے ہوں اُن سے بھی پردہ واجب

[۱] تفسیر روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۱۳ ص:۴۰۹

[۲] روح المعانی بحوالۂ بالا۔

[۳] احکام القرآن للجصاصؒ، سورة النور، باب ما يجب من غض البصر عن المحرمات ج:۸ ص:۱۷۰، ۱۷۱

[۴] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۶ ص:۴۸

[۵] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآية ج:۱۹ ص:۱۶۲، ۱۶۳

ہے جیسا کہ صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک مُخَنَّث ازواج مطہرات کے پاس آیا کرتا تھا اور اُمہات المؤمنین اس کو غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ جو اس آیت میں مذکور ہے اس میں داخل سمجھ کر اُس کے سامنے آجاتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُس کو دیکھا اور اُس کی باتیں سُنیں تو گھروں میں داخل ہونے سے اس کو روک دیا۔ (روح المعانی) [۱]

اسی لئے ابن حجر مکیؒ نے شرح منہاج میں فرمایا ہے کہ مرد اگرچہ عنین (نامرد) یا مجبوب (مقطوع العضو) یا بہت بوڑھا ہو وہ اس غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَةِ کے لفظ میں داخل نہیں ان سب سے پردہ واجب ہے۔ [۲] اس میں غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَةِ کے لفظ کے ساتھ جو التّٰبِعِیۡنَ کا لفظ مذکور ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ ایسے مغفّل بدحواس لوگ جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں چلے جائیں وہ مستثنیٰ ہیں۔ اس کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ اس وقت ایسے مغفّل قسم کے کچھ مرد ایسے ہی تھے جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں جاتے تھے اصل مدار حکم کا ان کے مغفّل بدحواس ہونے پر ہے تابع اور طفیلی ہونے پر نہیں۔ وَاللّٰہُ اَعۡلَم

بارہویں قسم اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِیۡنَ ہے۔ اس سے مراد وہ نابالغ بچّے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب بھی نہیں پہنچے اور عورتوں کے مخصوص حالات وصفات اور حرکات وسکنات سے بالکل بے خبر ہوں۔ اور جو لڑکا ان اُمور سے دلچسپی لیتا ہو وہ مراہق یعنی قریب البلوغ ہے اُس سے پردہ واجب ہے (ابن کثیر) [۳] امام جصاصؒ نے فرمایا کہ یہاں طفل سے مراد وہ بچّے ہیں جو مخصوص معاملات کے لحاظ سے عورتوں اور مَردوں میں کوئی امتیاز نہ کرتے ہو (ذکرہ عن المجاھد) [۴] پردہ سے مستثنیات کا بیان ختم ہوا۔

وَلَا یَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِیُعۡلَمَ مَا یُخۡفِیۡنَ مِنۡ زِیۡنَتِهِنَّ ؕ یعنی عورتوں پر لازم ہے کہ اپنے پاؤں اتنی زور سے نہ رکھیں جس سے زیور کی آواز نکلے اور ان کی مخفی زینت مردوں پر ظاہر ہو۔

زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا جائز نہیں

شروع آیت میں عورتوں کو اپنی زینت غیر مَردوں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا تھا، آخر میں اس کی مزید تاکید ہے کہ مواضع زینت سر اور سینہ وغیرہ کا چھپانا تو واجب تھا ہی۔ اپنی مخفی زینت کا اظہار خواہ کسی ذریعہ سے ہو وہ بھی جائز نہیں۔ زیور کے اندر خود کوئی چیز ایسی ڈالی جائے جس سے وہ بجنے لگے یا ایک زیور دوسرے زیور سے ٹکرا کر بجے یا پاؤں زمین پر اس

[۱] روح المعانی ج:۱۳ ص:۱۴۰، حدیث کی تفصیل کے لئے دیکھئے: صحیح مسلم، کتاب السلام، باب منع المخنث من الدخول علی النساء الأجانب ج:۲ ص:۲۱۸

[۲] نهاية المحتاج شرح المنهاج، كتاب النكاح ج:۲۰ ص:۱۹۲

[۳] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۲ ص:۴۹

[۴] احكام القرآن للجصاصؒ ج:۸ ص:۱۷۲

طرح مارے جس سے زیور کی آواز نکلے اور غیر محرم مرد سُنیں یہ سب چیزیں اس آیت کی رُو سے ناجائز ہیں۔ اور اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا اس آیت سے ناجائز ثابت ہوا تو خود عورت کی آواز کا سُنانا اُس سے بھی زیادہ سخت اور بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا۔ اس لئے عورت کی آواز کو بھی ان حضرات نے ستر میں داخل قرار دیا ہے اور اسی بناء پر نوازل میں فرمایا کہ عورتوں کو جہاں تک ممکن ہو قرآن کی تعلیم بھی عورتوں ہی سے لینا چاہئے۔ مُردوں سے تعلیم لینا بدرجۂ مجبوری جائز ہے۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ نماز میں اگر کوئی سامنے سے گزرنے لگے تو مرد کو چاہئے کہ بلند آواز سے سبحان اللہ کہہ کر گزرنے والے کو متنبہ کردے مگر عورت آواز نہ نکالے بلکہ اپنی ایک ہتھیلی کو پشت پر دوسرا ہاتھ مار کر اس کو متنبہ کرے۔ [۱]

عورت کی آواز کا مسئلہ

کیا عورت کی آواز فی نفسہٖ ستر میں داخل ہے اور غیر محرم کو آواز سُنانا جائز ہے؟ اس معاملے میں حضرات ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کی کتب میں عورت کی آواز کو ستر میں داخل نہیں کیا گیا۔ حنفیہ کے نزدیک بھی مختلف اقوال ہیں۔ ابنِ ہمامؒ نے نوازل کی روایت کی بناء پر ستر میں داخل قرار دیا ہے۔ اسی لئے حنفیہ کے نزدیک عورت کی اذان مکروہ ہے لیکن حدیث سے ثابت ہے کہ ازواج مطہرات نزولِ حجاب کے بعد بھی پسِ پردہ غیر محارم سے بات کرتی تھیں اس مجموعہ سے راجح اور صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس موقع پر جس محل میں عورت کی آواز سے فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ ہو وہاں ممنوع ہے جہاں یہ نہ ہو جائز ہے (بصاص) [۲] اور احتیاط اسی میں ہے کہ بلاضرورت عورتیں پسِ پردہ بھی غیر محرموں سے گفتگو نہ کریں۔ واللہ اعلم

خوشبو لگا کر باہر نکلنا

اسی حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو خوشبو لگا کر نہ نکلے کیونکہ وہ بھی اس کی مخفی زینت ہے غیر محرم تک یہ خوشبو پہنچے تو ناجائز ہے ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے جس میں خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کو بُرا کہا گیا ہے۔ [۳]

---

[۱] صحيح البخاری، كتاب الجنائز، قبيل باب الإشارة في الصلاة ج:۱ ص:۱۶۵، وصحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب تقديم الجماعة إلخ ج:۱ ص:۱۷۹

[۲] احكام القرآن للجصاصؒ، تفسير سورة النور، باب ما يجب من غض البصر عن المحرمات ج:۸ ص:۱۷۳

[۳] جامع الترمذی، ابواب الإستئذان والأدب، باب ما جاء في كراهية خروج امرأة المتعطرة ج:۲ ص:۱۰۶

مزیّن برقع پہن کر نکلنا بھی ناجائز ہے

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز تک کو قرآن نے اظہارِ زینت میں داخل قرار دے کر ممنوع کیا ہے تو مزیّن رنگوں کے کامدار برقعے پہن کر نکلنا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں مگر وہ زینت کا سب سے بڑا مرکز ہے اس لئے اس کا بھی غیر محرموں سے چھپانا واجب ہے اِلّا بضرورت۔ (جصاص) [1]

وَتُوبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ یعنی توبہ کرو اللہ سے تم سب کے سب اے مؤمن بندو۔
اس آیت میں اوّل مَردوں کو نظریں پست رکھنے کا حکم پھر عورتوں کو ایسا ہی حکم پھر عورتوں کو غیر محرموں سے پَردہ کرنے کا حکم الگ الگ دینے کے بعد اس جملے میں سب مرد و عورت کو شامل کر کے ہدایت کی گئی ہے کہ شہوتِ نفسانی کا معاملہ دقیق ہے دوسروں کو اس پر اطلاع ہونا مشکل ہے مگر اللہ تعالیٰ پر ہر ہر چھپا ہوا اور کھلا ہوا یکساں ظاہر ہے اس لئے اگر کسی سے احکامِ مذکورہ میں کسی وقت کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اس پر لازم ہے کہ اس سے توبہ کرے گزشتہ پر ندامت کے ساتھ اللہ سے مغفرت مانگے اور آئندہ اُس کے پاس نہ جانے کا عزم مصمّم کرے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ

اور نکاح کردو رانڈوں کا اپنے اندر اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

اگر وہ ہوں گے مفلس اللہ اُن کو غنی کردے گا اپنے فضل سے اور اللہ کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے،

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

اور اپنے آپ کو تھامتے رہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا جب تک کہ مقدور دے اُن کو اللہ اپنے فضل سے

آسان ترجمۂ قرآن

تم میں سے جن (مردوں یا عورتوں) کا اس وقت نکاح نہ ہو، اُن کا بھی نکاح کراؤ، اور تمہارے غلاموں اور

[1] احکام القرآن للجصاصؒ، تفسیر سورۃ النور، باب ما یجب من غض البصر عن المحرمات ج:۸ ص:۴۶۵ تا ۱۶۷

باندیوں میں سے جو نکاح کے قابل ہوں، اُن کا بھی۔ اگر وہ تنگ دست ہوں تو اللہ اپنے فضل سے اُنہیں بے نیاز کر دے گا۔ اور اللہ بہت وسعت والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ ۳۲ اور جن لوگوں کو نکاح کے مواقع میسر نہ ہوں، وہ پاک دامنی کے ساتھ رہیں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُنہیں بے نیاز کر دے۔

خلاصۂ تفسیر

(احرار میں سے) جو بے نکاح ہوں (خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور بے نکاح ہونا بھی عام ہے خواہ ابھی تک نکاح ہوا ہی نہ ہو یا ہونے کے بعد بیوی کی موت یا طلاق کے سبب بے نکاح رہ گئے) تم اُن کا نکاح کر دیا کرو اور (اسی طرح) تمہارے غلام اور لونڈیوں میں جو اس (نکاح) کے لائق ہوں (یعنی حقوق نکاح ادا کر سکتے ہوں) ان کا بھی (نکاح کر دیا کرو محض اپنی مصلحت سے اُن کی خواہشِ نکاح کی مصلحت کو فوت نہ کیا کرو۔ اور احرار کے نکاح پیغام دینے والے کے فقر وافلاس پر نظر کر کے انکار نہ کر دیا کرو جبکہ اُس میں کسبِ معاش کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ) اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا) اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا (خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مالدار نہ ہونے کی وجہ سے نکاح سے انکار کرو اور نہ یہ خیال کرو کہ نکاح ہو گیا تو خرچ بڑھ جائے گا جو موجودہ حالت میں غنی و مالدار ہے وہ بھی نکاح کرنے سے محتاج ومفلس ہو جائے گا، کیونکہ رزق کا مدار اصل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے وہ کسی مالدار کو بغیر نکاح کے بھی فقیر ومحتاج کر سکتا ہے، اور کسی غریب نکاح والے کو نکاح کے باوجود فقر وافلاس سے نکال سکتا ہے) اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے (جس کو چاہے مالدار کر دے اور سب کا حال) خوب جاننے والا ہے (جس کو غنی کرنا مقتضائے حکمت ومصلحت ہوگا اس کو غنی کر دیا جائے گا اور جس کے محتاج وفقیر رہنے ہی میں اس کی مصلحت ہے اُس کو فقیر رکھا جائے گا) اور (اگر کسی کو اپنے فقر وافلاس کی وجہ سے نکاح کا سامان میسر نہ ہو تو) ایسے لوگوں کو جن کو نکاح کا مقدور نہیں اُن کو چاہئے کہ (اپنے نفس کو) قابو میں رکھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (اگر چاہے تو) ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے (اُس وقت نکاح کر لیں)۔

معارف ومسائل

بعض احکام نکاح

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق عفت وعصمت کی حفاظت اور فواحش وبے حیائی کی روک تھام سے ہے۔ اس سلسلہ میں زنا اور اُس کے متعلقات کی شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا پھر استئیذان کا، پھر

عورتوں کے پردے کا۔ شریعتِ اسلام چونکہ ایک معتدل شریعت ہے اس کے احکام سب ہی اعتدال پر اور انسان کے فطری جذبات وخواہشات کی رعایت کے ساتھ تعدّی اور حد سے نکلنے کی ممانعت کے اصول پر دائر ہیں۔ اس لئے جب ایک طرف انسان کو ناجائز شہوت رانی سے سختی کے ساتھ روکا گیا تو ضروری تھا کہ فطری جذبات وخواہشات کی رعایت سے اس کا کوئی جائز اور صحیح طریقہ بھی بتلایا جائے۔ اس کے علاوہ بقاءِ نسل کا عقلی اور شرعی تقاضا بھی یہی ہے کہ کچھ حدود کے اندر رہ کر مرد وعورت کے اختلاط کی کوئی صورت تجویز کی جائے۔ اسی کا نام قرآن وسنت کی اصطلاح میں نکاح ہے۔ آیتِ مذکورہ میں اس کے متعلق حرّہ عورتوں کے اولیاء اور کنیزوں غلاموں کے آقاؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ اُن کا نکاح کر دیا کریں۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ الآیۃ۔

اَيَامٰى، اَيِّمٌ کی جمع ہے جو ہر اُس مرد وعورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کا نکاح موجود نہ ہو۔ خواہ اوّل ہی سے نکاح نہ کیا ہو یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت سے یا طلاق سے نکاح ختم ہو چکا ہو۔ ایسے مَردوں وعورتوں کے نکاح کے لئے اُن کے اولیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اُن کے نکاح کا انتظام کریں۔

آیتِ مذکورہ کے طرزِ خطاب سے اتنی بات تو باتفاق ائمہ فقہاء ثابت ہے کہ نکاح کا مسنون اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ خود اپنا نکاح کرنے کے لئے کوئی مرد یا عورت بلا واسطہ اقدام کے بجائے اپنے اولیاء کے واسطے سے یہ کام انجام دے۔ اس میں دین ودُنیا کے بہت سے مصالح اور فوائد ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے معاملہ میں کہ لڑکیاں اپنے نکاح کا معاملہ خود طے کریں، یہ ایک قسم کی بے حیائی بھی ہے اور اس میں فواحش کے راستے کھل جانے کا خطرہ بھی۔ اسی لئے بعض روایاتِ حدیث میں عورتوں کو خود اپنا نکاح بلا واسطہ ولی کرنے سے روکا بھی گیا ہے۔ [1] امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ حکم ایک خاص سنت اور شرعی ہدایت کی حیثیت میں ہے اگر کوئی بالغ لڑکی اپنا نکاح بغیر اجازت ولی کے اپنے کفو میں کرے تو نکاح صحیح ہو جائے گا اگرچہ خلاف سنت کرنے کی وجہ سے وہ موجبِ ملامت ہوگی جبکہ اُس نے کسی مجبوری سے اس پر اقدام نہ کیا ہو۔

امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کا نکاح ہی باطل کالعدم ہوگا جب تک ولی کے واسطہ سے نہ ہو۔ یہ جگہ اختلافی مسائل کی مکمل تحقیق اور دونوں فقہاء کے دلائل بیان کرنے کی نہیں لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ مذکورہ آیت سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ نکاح میں اولیاء کا واسطہ ہونا چاہئے باقی یہ صورت کہ کوئی بلا واسطہ اولیاء نکاح کرے تو اُس کا کیا حکم ہوگا یہ آیتِ قرآن اُس سے ساکت ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ لفظ اَيَامٰى میں بالغان مرد وعورت دونوں داخل ہیں اور بالغ لڑکوں کا نکاح بلا واسطہ ولی سب کے نزدیک صحیح ہو جاتا ہے اس کو کوئی باطل نہیں کہتا۔

[1] جامع الترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء لا نکاح إلا بولی، ج:۱ ص:۲۰۸

اسی طرح ظاہر یہ ہے کہ لڑکی بالغ اگر اپنا نکاح خود کرے تو وہ بھی صحیح اور منعقد ہو جائے۔ ہاں خلافِ سنت کام کرنے پر ملامت دونوں کو کی جائے گی۔

نکاح واجب ہے یا سنت یا مختلف حالات میں حکم مختلف ہے

اس پر ائمہ مجتہدین تقریباً سبھی متفق ہیں کہ جس شخص کو نکاح نہ کرنے کی صورت میں غالب گمان یہ ہو کہ وہ حدودِ شریعت پر قائم نہیں رہ سکے گا گناہ میں مبتلا ہو جائے گا اور نکاح کرنے پر اُس کو قدرت بھی ہو کہ اُس کے وسائل موجود ہوں تو ایسے شخص پر نکاح کرنا فرض یا واجب ہے جب تک نکاح نہ کرے گا گنہگار رہے گا۔ ہاں اگر نکاح کے وسائل موجود نہیں کہ کوئی مناسب عورت میسر نہیں یا اس کے لئے مہرِ معجّل وغیرہ کی حد تک ضروری خرچ اُس کے پاس نہیں تو اس کا حکم اگلی آیت میں یہ آیا ہے کہ اس کو چاہئے کہ وسائل کی فراہمی کی کوشش کرتا رہے اور جب تک وہ میسر نہ ہوں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور صبر کرنے کی کوشش کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ مسلسل روزے رکھے۔[۱] اس سے غلبۂ شہوت کو سکون ہو جاتا ہے۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عکافؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تمہاری زوجہ ہے؟ اُنہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کوئی شرعی لونڈی ہے؟ کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے دریافت کیا کہ تم صاحبِ وسعت ہو یا نہیں؟ اُنہوں نے عرض کیا کہ صاحبِ وسعت ہوں۔ مراد یہ تھی کہ کیا تم نکاح کے لئے ضروری نفقات کا انتظام کر سکتے ہو جس کے جواب میں اُنہوں نے اقرار کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو تم شیطان کے بھائی ہو اور فرمایا کہ ہماری سنت نکاح کرنا ہے، تم میں بدترین آدمی وہ ہیں جو بے نکاح ہوں اور تمہارے مُردوں میں سب سے رذیل وہ ہیں جو بے نکاح مر گئے۔ (مظہری)[۲]

اس روایت کو بھی جمہور فقہاء نے اُسی حالت پر محمول فرمایا ہے جبکہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ کا خطرہ غالب ہو۔ عکافؓ کا حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگا کہ وہ صبر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کرنے کا حکم دیا اور تبتّل یعنی بے نکاح رہنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا (مظہری)[۳] اسی طرح کی اور بھی روایاتِ حدیث ہیں۔ ان سب کا محمل جمہور فقہاء کے نزدیک وہی صورت ہے کہ نکاح نہ کرنے میں ابتلاءِ معصیت کا خطرہ غالب ہو۔ اسی طرح اس پر بھی تقریباً سبھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس شخص کو

[۱] تفصیل کے لئے دیکھیں: جامع الترمذی، ابواب النکاح ج:۱ ص:۲۰۶

[۲] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية، ج:۶ ص:۵۰۷،۵۰۸، ومسند احمد، رقم الحدیث:۲۲۰۲۶

[۳] تفسیر المظهری ج:۶ ص:۵۰۹، ومسند احمد، رقم الحدیث:۱۲۹۴۸، مسند انس بن مالك رضی الله عنه۔

بظنِ غالب یہ معلوم ہو کہ وہ نکاح کرنے کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائے گا مثلاً بیوی کے حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قدرت نہیں اُس پر ظلم کا مرتکب ہوگا یا اس کے لئے نکاح کرنے کی صورت میں کوئی دوسرا گناہ یقینی طور پر لازم آجائے گا ایسے شخص کو نکاح کرنا حرام یا مکروہ ہے۔

اب اُس شخص کا حکم باقی رہا جو حالت اعتدال میں ہے کہ نہ تو ترکِ نکاح سے گناہ کا خطرہ قوی ہے اور نہ نکاح کی صورت میں کسی گناہ کا اندیشہ غالب ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں کہ اس کو نکاح کرنا افضل ہے یا ترکِ نکاح کر کے نفلی عبادات میں مشغول ہونا افضل ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک نفلی عبادات میں لگنے سے افضل نکاح کرنا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اشتغالِ عبادت افضل ہے۔[1] وجہ اس اختلاف کی اصل میں یہ ہے کہ نکاح اپنی ذات کے اعتبار سے ایک تو مباح ہے، جیسے کھانا، پینا، سونا وغیرہ ضروریاتِ زندگی سب مباح ہیں۔ اس میں عبادت کا پہلو اس نیت سے آجاتا ہے کہ اس کے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو گناہ سے بچا سکے گا اور اولاد صالح پیدا ہوگی تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔ اور ایسی نیک نیت سے جو مباح کام بھی انسان کرتا ہے وہ اُس کے لئے بالواسطہ عبادت بن جاتی ہے کھانا پینا اور سونا بھی اسی نیت سے عبادت ہو جاتا ہے اور اشتغال بالعبادت اپنی ذات میں عبادت ہے۔ اس لئے امام شافعیؒ عبادت کے لئے خلوت گزینی کو نکاح سے افضل قرار دیتے ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح میں عبادت کا پہلو بہ نسبت دوسرے مباحات کے غالب ہے احادیث صحیحہ میں اُس کو سنت المرسلین اور اپنی سنت قرار دے کر تاکیدات بکثرت آئی ہیں۔ اُن روایاتِ حدیث کے مجموعہ سے اتنا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نکاح عام مباحات کی طرح مباح نہیں بلکہ سنتِ انبیاء ہے جس کی تاکیدات بھی حدیث میں آئی ہیں صرف نیت کی وجہ سے عبادت کی حیثیت اس میں نہیں بلکہ سنتِ انبیاء ہونے کی حیثیت سے بھی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس طرح تو کھانا پینا سونا بھی سنتِ انبیاء ہے کہ سب نے ایسا کیا ہے مگر جواب واضح ہے کہ ان چیزوں پر سب انبیاء کا عمل ہونے کے باوجود یہ کسی نے نہیں کہا نہ کسی حدیث میں آیا کہ کھانا پینا اور سونا سنتِ انبیاء ہے بلکہ اس کو عام انسانی عادت کے تابع انبیاء کا عمل قرار دیا ہے بخلاف نکاح کے کہ اس کو صراحۃً سنت المرسلین اور اپنی سنت فرمایا ہے۔

تفسیر مظہری میں اس موقع پر ایک معتدل بات یہ کہی ہے کہ جو شخص حالتِ اعتدال میں ہو کہ نہ غلبۂ شہوت سے مجبور و مغلوب ہو اور نہ نکاح کرنے سے کسی گناہ میں پڑنے کا اندیشہ رکھتا ہو۔ یہ شخص اگر یہ محسوس کرے کہ نکاح کرنے کے باوجود نکاح اور اہل وعیال کی مشغولیت میرے لئے کثرتِ ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ سے مانع نہیں ہوگی تو اُس کے لئے نکاح افضل ہے اور انبیاء علیہم السلام اور صلحاء اُمت کا عام حال یہی تھا۔ اور اگر اس کا اندازہ یہ ہے کہ نکاح اور اہل وعیال کے

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: الشامیة، کتاب النکاح، وبدائع الصنائع، کتاب النکاح۔

مشاغل اس کو دینی ترقی، کثرتِ ذکر وغیرہ سے روک دیں گے تو بحالت اعتدال اُس کے لئے عبادت کے لئے خلوت گزینی اور ترکِ نکاح افضل ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس کی تطبیق پر شاہد ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے [۱] یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (المنافقون:۹) اس میں یہی ہدایت ہے کہ انسان کے مال واولاد اُس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دینے کا سبب نہ بننے چاہئیں۔ [۲] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ یعنی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صالح ہوں اُن کے نکاح کرا دیا کرو۔ یہ خطاب اُن کے آقاؤں اور مالکوں کو ہے اس جگہ صالحین کا لفظ اپنے لُغوی معنے میں آیا ہے یعنی ان میں جو شخص نکاح کی صلاحیت واستطاعت رکھتا ہو اس کا نکاح کرا دینے کا حکم ان کے آقاؤں کو دیا گیا ہے مراد اس صلاحیت سے وہی ہے کہ بیوی کے حقوقِ زوجیت اور نفقہ ومہر معجّل ادا کرنے کے قابل ہوں۔ اور اگر صالحین کو معروف یعنی نیک لوگوں کے معنے میں لیا جائے تو پھر ان کی تخصیص بالذکر اس وجہ سے ہوگی کہ نکاح کا اصل مقصد حرام سے بچنے کا وہ صالحین ہی میں ہوسکتا ہے۔

بہر حال اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صلاحیت نکاح کی رکھنے والے ہوں اُن کے نکاح کا حکم اُن کے آقاؤں کو دیا گیا ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ اگر وہ اپنی نکاح کی ضرورت ظاہر کریں اور خواہش کریں کہ اُن کا نکاح کر دیا جائے تو آقاؤں پر بعض فقہاء کے نزدیک واجب ہوگا کہ ان کے نکاح کر دیں اور جمہور فقہاء کے نزدیک اُن پر لازم ہے کہ ان کے نکاح میں رکاوٹ نہ ڈالیں بلکہ اجازت دیدیں کیونکہ مملوک غلاموں اور کنیزوں کا نکاح بغیر مالکوں کی اجازت کے نہیں ہوسکتا۔ تو یہ حکم ایسا ہی ہوگا جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے [۳] فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (البقرۃ:۲۳۲) یعنی عورتوں کے اولیاء پر لازم ہے کہ اپنی زیرِ ولایت عورتوں کو نکاح سے نہ روکیں اور جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص منگنی لے کر آئے جس کا دین اور اخلاق آپ کو پسند ہوں تو ضرور نکاح کر دو اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور وسیع پیمانے کا فساد پیدا ہو جائے گا۔ (رواہ الترمذی) [۴]

خلاصہ یہ ہے کہ یہ حکم آقاؤں کو اس لئے دیا گیا کہ وہ اجازت نکاح دینے میں کوتاہی نہ کریں۔ خود نکاح کرانا ان کے ذمہ واجب ہو یہ ضروری نہیں۔ واللہ اعلم

اِنْ یَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اس میں اُن غریب فقیر مسلمانوں کے لئے بشارت ہے جو اپنے دین کی

---

[۱] ترجمہ: اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پاویں۔

[۲] تفسیر المظہری تحت هذه الآية ج:۶ ص:۵۰۶، ۵۰۷

[۳] ترجمہ: تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں۔

[۴] جامع الترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء إذا جاءكم من ترضون دينه فزوجوه، ج:۱ ص:۲۰۷

حفاظت کے لئے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر وسائلِ مالیہ اُن کے پاس نہیں کہ جب وہ اپنے دین کی حفاظت اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کی نیت صالحہ سے نکاح کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کو مالی غنا بھی عطا فرما دیں گے اور اس میں اُن لوگوں کو بھی ہدایت ہے جن کے پاس ایسے غریب لوگ منگنی لے کر جائیں کہ وہ محض ان کے فی الحال غریب فقیر ہونے کی وجہ سے رشتہ سے انکار نہ کر دیں۔ مال آنے جانے والی چیز ہے اصل چیز صلاحیت عمل ہے اگر وہ ان میں موجود ہے تو اُن کے نکاح سے انکار نہ کریں۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو نکاح کرنے کی ترغیب دی ہے، اس میں آزاد اور غلام سب کو داخل فرمایا ہے اور نکاح کرنے پر اُن سے غنا کا وعدہ فرمایا ہے۔ (ابن کثیر)[1] اور ابن ابی حاتم نے حضرت صدیق اکبرؓ سے نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم نکاح کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو تو اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ غناء عطا فرمانے کا کیا ہے وہ پورا فرما دیں گے پھر یہ آیت پڑھی۔ اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ[2] اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم غنی ہونا چاہتے ہو تو نکاح کر لو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ۔ (رواه ابن جرير وذكر البغوى عن عمرؓ نحوه۔ ابن كثير)[3]

تنبیہ

تفسیر مظہری میں ہے کہ مگر یہ یاد رہے کہ نکاح کرنے والے کو غنی اور مال عطا فرمانے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی حال میں ہے جبکہ نکاح کرنے والے کی نیت اپنی عفت کی حفاظت اور سنت پر عمل ہو اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل و اعتماد ہو اس کی دلیل اگلی آیت کے یہ الفاظ ہیں:

وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ[4] یعنی جو لوگ مال و اسباب کے لحاظ سے نکاح پر قدرت نہیں رکھتے اور نکاح کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ بیوی کے حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہو جائیں گے اُن کو چاہئے کہ عفت اور صبر کے ساتھ اس کا انتظار کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے۔ اور اس صبر کے لئے ایک تدبیر بھی حدیث میں یہ بتلا دی گئی ہے کہ کثرت سے روزے رکھا کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو اتنے مالی وسائل عطا فرمائیں گے جن سے نکاح پر قدرت ہو جائے۔

---

[1] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:٦ ص:٥١

[2] تفسير ابن ابى حاتم رقم الحديث:١٥٢٧٧

[3] تفسير ابن كثير ج:٦ ص:٥١، وتفسير الطبرى، تحت هذه الآية ج:١٩ ص:١٦٦

[4] تفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:٦ ص:٥١١

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ

اور جو لوگ چاہیں لکھت آزادی کی مال دے کر اُن میں سے کہ جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں تو ان کو لکھ کر دیدو

اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ

اگر سمجھو ان میں کچھ نیکی اور دو اُن کو اللہ کے مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا

اور نہ زبردستی کرو اپنی چھوکریوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے رہنا کہ تم کمانا چاہو

عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ

اسباب دُنیا کی زندگانی کا اور جو کوئی اُن پر زبردستی کرے گا تو اللہ اُن کی بے بسی کے پیچھے

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۳

بخشنے والا مہربان ہے

آسان ترجمۂ قرآن

اور تمہاری ملکیت کے غلام باندیوں میں سے جو مکاتبت کا معاہدہ کرنا چاہیں، اگر اُن میں بھلائی دیکھو تو اُن سے مکاتبت کا معاہدہ کرلیا کرو، اور (مسلمانو!) اللہ نے تمہیں جو مال دے رکھا ہے، اُس میں سے ایسے غلام باندیوں کو بھی دیا کرو۔ اور اپنی باندیوں کو دُنیوی زندگی کا ساز و سامان حاصل کرنے کے لئے بدکاری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ پاک دامنی چاہتی ہوں۔ اور جو کوئی اُنہیں مجبور کرے گا تو اُن کو مجبور کرنے کے بعد اللہ (اُن باندیوں کو) بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ۝۳۳

خلاصہ تفسیر

اور تمہارے مملوکوں میں سے (غلام ہوں یا لونڈیاں) جو مکاتب ہونے کے خواہاں ہوں تو (بہتر ہے کہ) اُن کو

مکاتب بنادیا کرو اگر اُن میں بہتری (کے آثار) پاؤ اور اللہ کے (دیئے ہوئے) اس مال میں سے اُن کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے (تاکہ جلدی آزاد ہوسکیں) اور اپنی (مملوکہ) لونڈیوں کو زنا کرانے پر مجبور نہ کرو (بالخصوص) جب وہ پاکدامن رہنا چاہیں (اور تمہاری یہ ذلیل حرکت) محض اس لئے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ (یعنی مال) تم کو حاصل ہوجائے اور جو شخص اُن کو مجبور کرے گا (اور وہ بچنا چاہیں گی) تو اللہ تعالیٰ اُن کے مجبور کئے جانے کے بعد (اُن کے لئے) بخشنے والا مہربان ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں مملوک غلاموں اور لونڈیوں کو اگر نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو آقاؤں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اُن کو نکاح کی اجازت دیدینا چاہئے اپنی مصلحت کے لئے اُن کے طبعی مصالح کو مؤخر نہ کریں یہ اُن کے لئے افضل اور بہتر ہے۔ خلاصہ اس ہدایت کا اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کے ساتھ حسنِ معاملہ اور اُن کو تکلیف سے بچانا ہے۔ اس کی مناسبت سے آیتِ مذکورہ میں ایک دوسری ہدایت ان کے آقاؤں کے لئے یہ دی گئی ہے کہ اگر یہ مملوک غلام یا لونڈی آقاؤں سے معاملہ مکاتبت کا کرنا چاہیں تو ان کی اس خواہش کو پورا کردینا بھی آقاؤں کے لئے افضل اور مستحب، موجبِ ثواب ہے۔ صاحبِ ہدایہ اور عامۂ فقہاء نے اس حکم کو حکم استحباب ہی قرار دیا ہے [1] یعنی آقا کے ذمہ واجب تو نہیں کہ اپنے مملوک کو مکاتب بنادے لیکن مستحب اور افضل ہے۔ اور معاملہ مکاتبت کی صورت یہ ہے کہ کوئی مملوک اپنے آقا سے کہے کہ آپ مجھ پر کچھ رقم مقرر کردیں کہ وہ رقم میں اپنی محنت وکسب سے حاصل کرکے آپ کو ادا کردوں تو میں آزاد ہوجاؤں اور آقا اس کو قبول کرے، یا معاملہ برعکس ہو کہ آقا چاہے کہ اُس کا غلام کچھ معینہ رقم اس کو دیدے تو آزاد ہوجائے اور غلام اس کو قبول کرلے۔ اگر آقا اور مملوک کے درمیان ایجاب وقبول کے ذریعہ یہ معاملہ مکاتبت کا طے ہوجاتا ہے تو وہ شرعاً لازم ہوجاتا ہے آقا کو اُس کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا جس وقت بھی غلام معینہ رقم کما کر اس کو دیدے گا خود بخود آزاد ہوجائے گا۔

یہ رقم جو بدلِ کتابت کہلاتی ہے شریعت نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی خواہ غلام کی قیمت کے برابر ہو یا اُس سے کم یا زیادہ جس پر فریقین میں بات طے ہوجائے وہ بدل کتابت ٹھہرے گا۔ اپنے مملوک غلام یا لونڈی کو مُکاتَب بنادینے کی ہدایت اور اس کو مستحب اور افضل قرار دینا شریعتِ اسلام کے اُن ہی احکامؑ میں سے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جو لوگ شرعی حیثیت سے غلام ہیں اُن کی آزادی کے زیادہ سے زیادہ راستے کھولے جائیں۔ تمام کفارات میں اُن کے آزاد کرنے کے احکام دیئے گئے ہیں۔ ویسے بھی غلام آزاد کرنے میں بہت بڑے ثواب

[1] بدائع الصنائع، كتاب المكاتب، بيان جواز المكاتبة ج:۹ ص:۱۱۱، والهداية، كتاب المكاتب۔

کا وعدہ ہے۔ مُکاتَبت کا معاملہ بھی اسی کا ایک راستہ ہے اس لئے اُس کی ترغیب دی گئی۔ البتہ اُس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی کہ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡهِمۡ خَيۡرًا یعنی مکاتب بنانا جب درست ہوگا جبکہ تم اُن میں بہتری کے آثار دیکھو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور اکثر حضرات ائمہ نے اس بہتری سے مراد قوتِ کسب بتلائی ہے یعنی جس شخص میں یہ دیکھو کہ اگر اس کو مکاتب بنا دیا تو کما کر معینہ رقم جمع کرے گا اس کو مکاتب بناؤ ورنہ جو اس قابل نہ ہو اس کو مکاتب بنا دینے سے غلام کی محنت بھی ضائع ہوگی آقا کا نقصان بھی ہوگا۔ اور صاحبِ ہدایہ نے فرمایا کہ خیر اور بہتری سے مراد اس جگہ یہ ہے کہ اُس کے آزاد ہونے سے مسلمانوں کو کسی نقصان کے پہنچنے کا خطرہ نہ ہو مثلاً یہ کہ وہ کافر ہو اور اپنے کافر بھائیوں کی مدد کرتا ہو۔ [1] اور صحیح بات یہ ہے کہ لفظ خیر اس جگہ دونوں چیزوں پر حاوی ہے کہ غلام میں قوتِ کسب بھی ہو اور اُس کی آزادی سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ بھی نہ ہو۔ (مظہری) [2]

وَاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىكُمۡ یعنی بخشش کرو ان پر اُس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو عموماً اور آقاؤں کو خصوصاً کیا گیا ہے کہ جب اس غلام کی آزادی ایک معیّنہ رقم جمع کر کے آقا کو دینے پر موقوف ہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس میں اُس کی مدد کریں۔ زکوٰۃ کا مال بھی اُن کو دے سکتے ہیں۔ اور آقاؤں کو اس کی ترغیب ہے کہ خود بھی اُن کی مالی امداد کریں یا بدلِ کتابت میں سے کچھ کم کر دیں۔ صحابۂ کرام کا معمول اسی لئے یہ رہا کہ بدلِ کتابت میں جو رقم اُس پر لگائی جاتی تھی اُس میں سے تہائی چوتھائی یا اس سے کم حسبِ استطاعت کم کر دیا کرتے تھے۔ (مظہری) [3]

فنِ معاشیات کا ایک اہم مسئلہ اور اُس میں قرآنی فیصلہ

آج کل دُنیا میں مادہ پرستی کا دَور دَورہ ہے۔ ساری دُنیا معاد و آخرت کو بھلا کر صرف معاش کے جال میں پھنس گئی ہے اُن کی علمی تحقیقات اور غور و فکر کا دائرہ صرف معاشیات ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس میں بحث و تحقیق کے زور نے ایک ایک معمولی مسئلہ کو ایک مستقل فن بنا دیا ہے۔ ان فنون میں سب سے بڑا فن معاشیات کا ہے۔

اس معاملہ میں آج کل عقلاءِ دُنیا کے دو نظریے زیادہ معروف و مشہور ہیں اور دونوں باہمی متصادم ہیں اُن کے تصادم نے اقوامِ دُنیا میں تصادم اور جنگ و جدال کے ایسے دروازے کھول دیئے ہیں کہ ساری دُنیا امن و اطمینان سے محروم ہوگئی۔

ایک نظام سرمایہ دارانہ نظام ہے جس کو اصطلاح میں کیپٹل ازم کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظام اشتراکیت کا ہے جس کو کمیونزم یا سوشل ازم کہا جاتا ہے۔ اتنی بات تو مشاہدہ کی ہے جس کا دونوں نظاموں میں سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس دُنیا میں انسان اپنی محنت اور کوشش سے جو کچھ کماتا اور پیدا کرتا ہے اُس سب کی اصل بنیاد قدرتی وسائل پیداوار زمین، پانی

[1] الهداية، كتاب المكاتب۔ [2] تفسير المظهري ج:٦ ص:٥١٦ [3] تفسير المظهري ج:٦ ص:٥١٧، ٥١٨

اور معادن میں پیدا ہوانے والی قدرتی اشیاء پر ہے۔ انسان اپنے غور وفکر اور محنت ومشقت کے ذریعہ انہی وسائلِ پیداوار میں جوڑ توڑ اور تحلیل وترکیب کے ذریعہ اپنی ضرورت کی لاکھوں اشیاء پیدا کرتا اور بناتا ہے۔ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ دونوں نظام پہلے یہ سوچتے کہ یہ قدرتی وسائل خود تو پیدا نہیں ہو گئے ان کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کا اصل مالک بھی وہی ہوگا جو اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہم ان وسائل پر قبضہ کرنے اور اُن کے مالک بننے یا استعمال کرنے میں آزاد نہیں بلکہ اصل مالک وخالق نے اگر کچھ ہدایات دی ہیں تو اُن کے تابع چلنا ہمارا فرض ہے۔ مگر مادہ پرستی کے جنون نے ان سبھی کو اصل خالق ومالک کے تصوّر ہی سے غافل کر دیا۔ اُن کے نزدیک اب بحث صرف یہ رہ گئی کہ وسائلِ پیداوار پر قبضہ کر کے اُن سے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے والا اُن سب چیزوں کا خود بخود آزاد مالک ومختار ہو جاتا ہے، یا یہ سب چیزیں وقفِ عام اور مشترک ہیں ہر ایک کو اُن سے نفع اُٹھانے کا یکساں حق حاصل ہے؟

پہلا نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کا ہے جو انسان کو ان چیزوں پر آزاد ملکیت کا حق دیتا ہے۔ کہ جس طرح چاہے اس کو حاصل کرے اور جہاں چاہے اس کو خرچ کرے اس میں اُس پر کوئی روک ٹوک برداشت نہیں۔ یہی نظریہ قدیم زمانے کے مشرکین وکفّار کا تھا جنہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام پر یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ مال ہمارے ہیں ہم ان کے مالک ہیں آپ کو کیا حق ہے کہ ہم پر پابندی لگائیں کہ فلاں کام میں خرچ کرنا جائز اور فلاں میں حرام ہے۔ آیتِ قرآن [1] اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود: ۸۷) کا یہی مطلب ہے۔ اور دوسرا نظریہ اشتراکیت کا ہے جو کسی کو کسی چیز پر ملکیت کا حق نہیں دیتا بلکہ ہر چیز کو تمام انسانوں میں مشترک اور سب کو اُس سے فائدہ اُٹھانے کا یکساں حق دار قرار دیتا ہے اور اصل نظریۂ اشتراکیت کی بنیاد یہی ہے۔ مگر پھر جب دیکھا کہ یہ ناقابلِ عمل تصوّر ہے اس پر کوئی نظام نہیں چلایا جاسکتا تو پھر کچھ اشیاء کو ملکیت کے لئے مستثنیٰ بھی کر دیا ہے۔

قرآن کریم نے ان دونوں بیہودہ نظریوں پر رد کر کے اُصول یہ بنایا کہ کائنات کی ہر چیز دراصل اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے جو اُن کا خالق ہے۔ پھر اُس نے اپنے فضل وکرم سے انسان کو ایک خاص قانون کے تحت ملکیت عطا فرمائی ہے جن چیزوں کا اس قانون کی رُو سے وہ مالک بنادیا گیا ہے اس میں دوسروں کے تصرّف کو بغیر اس کی اجازت کے حرام قرار دیا مگر مالک بننے کے بعد بھی اس کو آزاد ملکیت نہیں دی کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے خرچ کرے بلکہ دونوں طرف ایک عادلانہ اور حکیمانہ قانون رکھا ہے کہ فلاں طریقہ کمانے کا حلال ہے فلاں حرام اور فلاں جگہ خرچ کرنا حلال ہے اور فلاں حرام۔ اور یہ کہ جو چیز اس کی ملکیت میں دی ہے اُس میں کچھ اور لوگوں کے حقوق بھی لگادیئے ہیں جن کو ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

[1] ترجمہ: یا اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں۔

آیتِ مذکورہ اگرچہ ایک اور مضمون کے لئے آئی ہے مگر اس کے ضمن میں اسی اہم معاشی مسئلہ کے چند اُصول بھی آ گئے ہیں الفاظ آیت پر نظر کیجئے وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ یعنی دو ان حاجتمند لوگوں کو اللہ کے اُس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دے دیا ہے اِس میں تین باتیں ثابت ہوئیں۔ اوّل یہ کہ اصل مالک مال اور ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسی نے اپنے فضل سے اس کے ایک حصے کا تمہیں مالک بنا دیا ہے تیسرے یہ کہ جس چیز کا تم کو مالک بنایا ہے اُس پر کچھ پابندیاں بھی اُس نے لگائی ہیں، بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو ممنوع قرار دیا اور بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو لازم و واجب اور بعض میں مستحب اور افضل قرار دیا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

دوسرا حکم اس آیت میں ایک جاہلیت کی رسم مٹانے اور زِنا و فواحش کے انسداد کے لئے یہ دیا گیا ہے: وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ، یعنی اپنی لونڈیوں کو اس پر مجبور نہ کرو کہ وہ زناکاری کے ذریعہ مال کما کر تمہیں دیا کریں۔ جاہلیت میں بہت سے لوگ لونڈیوں کو اسی کام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اسلام نے جب زنا پر سخت سزائیں جاری کیں، آزاد اور غلام سب کو اس کا پابند کیا تو ضروری تھا کہ جاہلیت کی اس رسم کو مٹانے کے لئے خاص احکام دے۔

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا، یعنی جبکہ وہ لونڈیاں زنا سے بچنے اور پاکدامن رہنے کا ارادہ کریں تو تمہارا اُن کو مجبور کرنا بڑی بے حیائی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ یہ الفاظ اگرچہ بصورت شرط آئے ہیں مگر باجماعِ اُمت درحقیقت مراد ان سے شرط نہیں کہ لونڈیاں زنا سے بچنا چاہیں تو اُن کو زنا پر مجبور نہ کیا جائے ورنہ مجبور کرنا جائز ہے بلکہ بتلانا یہ ہے کہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے لونڈیوں میں حیا اور پاکدامنی زمانہ جاہلیت میں نابود تھی۔ اسلام کے احکام کے بعد اُنہوں نے توبہ کی۔ اُن کے آقاؤں نے مجبور کرنا چاہا تو اس پر یہ احکام آئے کہ جب وہ زنا سے بچنا چاہتی ہیں تو تم مجبور نہ کرو۔ اس میں ان کے آقاؤں کو زجر و تنبیہ اور تشنیع کرنا ہے کہ بڑی بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے کہ لونڈیاں تو پاک رہنے کا ارادہ کریں اور تم اُنہیں زنا پر مجبور کرو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۳ اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنا حرام ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا اور وہ آقا کے جبر و اکراہ سے مغلوب ہو کر زنا میں مبتلا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ کو معاف فرما دیں گے اور اس کا سارا گناہ مجبور کرنے والے پر ہوگا۔ (مظہری) [1] واللہ اعلم

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

اور ہم نے اُتاریں تمہاری طرف آیتیں کھلی ہوئی اور کچھ حال اُن کا جو ہو چکے تم سے پہلے

[1] تفسير المظهری ج:٦ ص:٥١٩

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٤﴾ ع اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ ع ٤ ٨ ١٠

اور نصیحت ڈرنے والوں کو اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی مثال اُس کی روشنی کی

كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ

جیسے ایک طاق اس میں ہو ایک چراغ وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشہ میں وہ شیشہ ہے جیسے ایک تارہ

دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا

چمکتا ہوا تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف،

يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِي اللّٰهُ

قریب ہے اُس کا تیل کہ روشن ہوجائے، اگرچہ نہ لگی ہو اس میں آگ روشنی پر روشنی اللہ راہ دکھلا دیتا ہے

لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

اپنی روشنی کی جس کو چاہے، اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ سب چیز کو

عَلِيْمٌ ﴿٣٥﴾ لا فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ لا يُسَبِّحُ لَهٗ

جانتا ہے ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا اُن کو بلند کرنے کا اور وہاں اُس کا نام پڑھنے کا، یاد کرتے ہیں اس کی

فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿٣٦﴾ لا رِجَالٌ لا لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ

وہاں صبح اور شام وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں

عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ صلے يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ

اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے ڈرتے رہتے ہیں اُس دن سے جس میں اُلٹ جائیں گے

فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا

دل اور آنکھیں تاکہ بدلہ دے اُن کو اللہ اُن کے بہتر سے بہتر کاموں کا

وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

اور زیادتی دے اُن کو اپنے فضل سے اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ۗ

اور جو لوگ منکر ہیں اُن کے کام جیسے ریت جنگل میں پیاسا جانے اس کو پانی

حَتّٰى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللّٰهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ

یہاں تک کہ جب پہنچا اُس پر اس کو کچھ نہ پایا، اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اُس کو پورا پہنچادیا اس کا لکھا،

وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ

اور اللہ جلد لینے والا ہے حساب یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی آتی ہے اُس پر ایک لہر اس پر

مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ۗ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۗ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ

ایک اور لہر اس کے اوپر بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب نکالے اپنا ہاتھ

لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ ﴿۴۰﴾

لگتا نہیں کہ اُس کو وہ سوجھے اور جس کو اللہ نے نہ دی روشنی اُس کے واسطے کہیں نہیں روشنی

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے وہ آیتیں بھی اُتار کر تم تک پہنچادی ہیں جو ہر بات کو واضح کرنے والی ہیں، اور اُن لوگوں کی مثالیں بھی

جوتم سے پہلے گذر چکے ہیں، اور وہ نصیحت بھی جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے کارآمد ہے۔ (۳۴) اللہ تمام آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال کچھ یوں ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہو، چراغ ایک شیشے میں ہو۔ شیشہ ایسا ہو جیسے ایک ستارا، موتی کی طرح چمکتا ہوا! وہ چراغ ایسے برکت والے درخت یعنی زیتون سے روشن کیا جائے جو نہ (صرف) مشرقی ہو نہ (صرف) مغربی، ایسا لگتا ہو کہ اُس کا تیل خود ہی روشنی دیدے گا، چاہے اُسے آگ بھی نہ لگے۔ نور بالائے نور! اللہ اپنے نور تک جسے چاہتا ہے، پہنچا دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے فائدے کے لئے تمثیلیں بیان کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ (۳۵) جن گھروں کے بارے میں اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ اُن کو بلند مقام دیا جائے، اور اُن میں اُس کا نام لے کر ذکر کیا جائے، اُن میں صبح و شام وہ لوگ اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں کوئی تجارت یا کوئی خرید و فروخت نہ اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے نہ نماز قائم کرنے سے اور نہ زکوٰۃ دینے سے۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دِل اور نگاہیں اُلٹ پلٹ کر رہ جائیں گی۔ (۳۶) - (۳۷) نتیجہ یہ ہے کہ اللہ ان لوگوں کو ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے گا، اور اپنے فضل سے مزید کچھ اور بھی دے گا، اور اللہ جس کو چاہتا ہے، بے حساب دیتا ہے۔ (۳۸) اور (دوسری طرف) جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا ہے، اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹیل صحرا میں ایک سراب ہو جسے پیاسا آدمی پانی سمجھ بیٹھتا ہے، یہاں تک کہ جب اُس کے پاس پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا، اور اُس کے پاس اللہ کو پاتا ہے، چنانچہ اللہ اُس کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔ اور اللہ بہت جلدی حساب لے لیتا ہے۔ (۳۹) یا پھر اُن (اعمال) کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں پھیلے ہوئے اندھیرے، کہ سمندر کو ایک موج نے ڈھانپ رکھا ہو، جس کے اُوپر ایک اور موج ہو، اور اُس کے اُوپر بادل، غرض اُوپر تلے اندھیرے ہی اندھیرے! اگر کوئی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اُسے بھی نہ دیکھ پائے۔ اور جس شخص کو اللہ ہی نور عطا نہ کرے، اُس کے نصیب میں کوئی نور نہیں۔ (۴۰)

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے اس سورت میں یا قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے) تمہارے پاس کھلے کھلے احکام (علمیہ و عملیہ) بھیجے ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں اُن کی (یا اُن جیسے لوگوں کی) بعض حکایات اور (خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کی باتیں (بھیجی ہیں) اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں (میں رہنے والوں) کا اور زمین (میں رہنے والوں) کا (یعنی اہلِ آسمان و زمین میں جن کو ہدایت ہوئی ہے ان سب کو اللہ ہی نے ہدایت دی ہے اور مراد آسمان و زمین سے کل عالم ہے پس جو مخلوقات آسمان و زمین سے باہر ہے وہ

بھی داخل ہوگئی جیسے حاملانِ عرش) اُس کے نور (ہدایت) کی حالتِ عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے (اور) اُس میں ایک چراغ (رکھا) ہے (اور) وہ چراغ (خود طاق میں نہیں رکھا بلکہ) ایک قندیل میں ہے (اور قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پورب رُخ ہے اور نہ (کسی آڑ کے) پچھّم رُخ ہے۔ (یعنی نہ اس کی جانبِ شرقی میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ شروع دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے اور نہ اس کی جانبِ غربی میں کوئی آڑ پہاڑ ہے کہ آخر دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے بلکہ کھلے میدان میں ہے جہاں تمام دن دھوپ رہتی ہے ایسے درخت کا روغن بہت لطیف اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور) اس کا تیل (اس قدر صاف اور سُلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نورٌ علیٰ نور ہے (یعنی ایک تو اس میں خود قابلیت نور کی اعلیٰ درجہ کی تھی پھر اُوپر سے فاعل یعنی آگ کے ساتھ اجتماع ہوگیا اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کے ساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہو ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر بہت تیز روشنی ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو صاف روشنی اور دھواں کم ہونے میں مشہور ہے تو اس قدر تیز روشنی ہوگی جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہوگئی ہوں اس کو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ فرمایا۔ یہاں مثال ختم ہوگئی۔ پس اسی طرح مؤمن کے قلب میں اللہ تعالیٰ جب نورِ ہدایت ڈالتا ہے تو روز بروز اسی کا انشراح قبولِ حق کے لئے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ گو یا بالفعل بعض احکام کا علم بھی نہ ہوا ہو کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے جیسے وہ روغنِ زیتون آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لئے مستعد تھا، مؤمن بھی علم احکام سے پہلے ہی اُن پر عمل کے لئے مستعد ہوتا ہے اور جب اُس کو علم حاصل ہوتا ہے تو نورِ عمل یعنی عمل کے پختہ ارادہ کے ساتھ نورِ علم بھی مل جاتا ہے جس سے وہ فوراً ہی قبول کر لیتا ہے۔ پس عمل و علم جمع ہو کر نورٌ علیٰ نور صادق آجاتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ علمِ احکام کے بعد اس کو کچھ تأمل و تردّد ہو کہ اگر موافق نفس کے پایا تو قبول کر لیا ورنہ رد کر دیا۔ اسی انشراح اور نور کو دوسری آیت میں اِس طرح بیان فرمایا ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (الزمر: ۲۲)، یعنی جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے رَبّ کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے اور ایک جگہ فرمایا ہے
[1] فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (الانعام: ۱۲۵)۔ غرض نور ہدایت الٰہیہ کی یہ مثال ہے اور) اللہ تعالیٰ اپنے (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے (اور پہنچا دیتا ہے) اور (ہدایت کی جو یہ مثال دی گئی اسی طرح

[1] ترجمہ: سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں۔

قرآن میں بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں تو اس سے بھی لوگوں کی ہدایت ہی مقصود ہے اس لئے) اللہ تعالیٰ لوگوں (کی ہدایت) کے لئے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ مضامین عقلیہ محسوس چیزوں کی طرح قریب الی الفہم ہو جائیں) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (اس لئے جو مثال افادہ مقصود کے لئے کافی ہو اور جس میں اغراض مثال کے پورے مرعی ہوں اُسی کو اختیار کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ مثال نہایت مناسب ہوتی ہے تاکہ خوب ہدایت ہو۔ آگے اہلِ ہدایت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) وہ ایسے گھروں میں (جا کر عبادت کرتے) ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اُن کا ادب کیا جائے اور اُن میں اللہ کا نام لیا جائے (مراد اُن گھروں سے مسجدیں ہیں اور ان کا ادب یہ کہ اُن میں جُنُب وحائض داخل نہ ہوں اور اُن میں کوئی نجس چیز داخل نہ کی جائے، وہاں غُل نہ مچایا جائے۔ دُنیا کے کام اور باتیں کرنے کے لئے وہاں نہ بیٹھیں۔ بدبو کی چیز کھا کر اُن میں نہ جائیں وغیرذٰلک، غرض) اُن (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح وشام اللہ کی پاکی (نمازوں میں) بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کی یاد (یعنی بجا آوری احکام) سے (جس وقت کے متعلق جو حکم ہو) اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے (کہ یہ احکام فرعیہ میں سب سے اہم ہیں) نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور باوجود اطاعت وعبادت کے اُن کی خشیت کا یہ حال ہے کہ) وہ ایسے دن (کی دارو گیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی (جیسا دوسری آیت میں ہے [۱] یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ (المؤمنون)، یعنی یہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اس کے باوجود اُن کے دل قیامت کی بازپُرس سے ڈرتے رہتے ہیں اور مقصود اس سے اہلِ نور کے اوصاف اعمال کا بیان فرمانا ہے اور آگے ان کے انجام کا ذکر ہے کہ) انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا (جزا وہ جس کا وعدہ مفصل مذکور ہے اور زیادہ وہ جس کا مفصّل وعدہ نہیں گو مجمل عنوانوں سے ہوا ہو۔) اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بیشمار (یعنی بہت کثرت سے) دے دیتا ہے (پس ان لوگوں کو جنت میں اسی طرح بیشمار دے گا۔ یہاں تک تو ہدایت اور اہلِ ہدایت کا بیان تھا آگے ضلالت اور اہلِ ضلالت کا ذکر ہے یعنی) اور جو لوگ کافر (اور اہلِ ضلال اور نورِ ہدایت سے دُور) ہیں اُن کے اعمال (بوجہ کافروں کی دو قسمیں ہونے کے دو مثالوں کے مشابہ ہیں کیونکہ ایک قسم تو وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے قائل ہیں اور اپنے بعض اعمال پر یعنی جو اُن کے گمان کے مطابق کارِ ثواب اور حسنات ہیں توقع جزائے آخرت کی رکھتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ کفّار ہیں جو آخرت اور قیامت کے منکر ہیں۔ قسم اوّل کفار کے اعمال تو) ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ

[۱] ترجمہ: دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رَبّ کے پاس جانے والے ہیں۔

پیاسا (آدمی) اُس کو (دُور سے) پانی خیال کرتا ہے (اور اُس کی طرف دوڑتا ہے) یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اُس کو (جو سمجھ رکھا تھا) کچھ بھی نہ پایا اور (غایت پیاس، پھر نہایت یاس سے جو جسمانی اور روحانی صدمہ پہنچا اور اُس سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تو یوں کہنا چاہئے کہ بجائے پانی کے) قضاء الٰہی یعنی موت کو پایا سو اللہ تعالیٰ نے اُس (کی عمر) کا حساب اس کو برابر سرابر چُکا دیا (اور بیباق کر دیا یعنی عمر کا خاتمہ کر دیا) اور اللہ تعالیٰ (جس چیز کی میعاد آ جاتی ہے اس کا) دم بھر میں حساب (فیصل) کر دیتا ہے (اُس کو کچھ بکھیڑا نہیں کرنا پڑتا کہ دیر لگے اور میعاد سے کچھ بھی توقف ہو جائے بس یہ مضمون ایسا ہے جیسا دوسری جگہ ارشاد ہے [۱] اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ (نوح: ۴) وقولہ [۲] وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُہَا (المنافقون: ۱۱)۔ حاصل اس مثال کا یہ ہوا کہ جیسے پیاسا ریت کو ظاہری چمک سے پانی سمجھا اسی طرح یہ کافر اپنے اعمال کو ظاہری صورت سے مقبول اور مثمر نافع آخرت سمجھا اور جیسا وہ پانی نہیں اسی طرح یہ اعمال شرطِ قبول یعنی ایمان نہ ہونے کے سبب مقبول اور نافع نہیں ہیں اور جب وہاں جا کر اُس پیاسے کو حقیقت معلوم ہوئی اسی طرح اُس کو آخرت میں پہنچ کر حقیقت معلوم ہوگی اور جس طرح یہ پیاسا اپنی توقع کے غلط ہونے سے حسرت و افسوس میں خائب ہو کر مر گیا اسی طرح یہ کافر بھی اپنی توقع کے غلط ہونے پر اس وقت حسرت میں اور ہلاکتِ ابدی یعنی عقابِ جہنم میں مبتلا ہوگا۔ ایک قسم کی مثال تو یہ ہوئی۔ آگے دوسری قسم کے کافروں کے اعمال کی مثال ہے یعنی) یا وہ (اعمال باعتبار خصوصیت منکرین قیامت کے) ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے (جن کا ایک سبب دریا کی گہرائی ہے اور پھر یہ) کہ اُس (سمندر کی اصلی سطح) کو ایک بڑی موج نے ڈھانک لیا ہو (پھر وہ موج بھی اکیلی نہیں بلکہ) اُس (موج) کے اوپر دوسری موج (ہو پھر) اُس کے اوپر بادل (ہو جس سے ستارہ وغیرہ کی روشنی بھی نہ پہنچتی ہو غرض) اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہیں کہ اگر (ایسی حالت میں کوئی آدمی دریا کی تہ میں) اپنا ہاتھ نکالے (اور اس کو دیکھنا چاہے) تو (دیکھنا تو درکنار) دیکھنے کا احتمال بھی نہیں (اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کافر جو آخرت اور قیامت کے اور اس میں جزاء و سزا ہی کے منکر ہیں اُن کے پاس وہمی نور بھی نہیں جیسے قسم اوّل کے کافروں کے پاس ایک وہمی اور خیالی نور تھا۔ کیونکہ اُنہوں نے بعض نیک اعمال کو اپنی آخرت کا سامان سمجھا تھا مگر وہ شرط ایمان نہ ہونے کے سبب حقیقی نور نہ تھا ایک وہمی نور تھا۔ یہ لوگ جو منکرِ آخرت ہیں انہوں نے اپنے اعتقاد و خیال کے مطابق بھی کوئی کام آخرت کے لئے کیا ہی نہیں جس کے نور کا ان کو وہم و خیال ہو۔ غرض ان کے پاس ظلمت ہی ظلمت ہے نور کا وہم و خیال بھی نہیں ہوسکتا جیسا کہ تہ دریا کی مثال میں ہے۔ اور نظر نہ آنے میں ہاتھ کی تخصیص شاید اس لئے کہ انسانی اعضاء و جوارح میں ہاتھ نزدیک تر ہے پھر اس کو جتنا نزدیک کرنا چاہو

[۱] اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجائے گا تو ٹلے گا نہیں۔ [۲] ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد آ جاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتے۔

نزدیک آجاتا ہے اور جب ہاتھ ہی نظر نہ آیا تو دوسرے اعضاء کا معاملہ ظاہر ہے) اور (آگے ان کفار کے اندھیرے میں ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ) جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے اُس کو (کہیں سے بھی) نور نہیں (میسر آ سکتا)۔

معارف ومسائل

آیتِ مذکورہ کو اہلِ علم آیتِ نور لکھتے ہیں کیونکہ اس میں نورِ ایمان اور ظلمتِ کفر کو بڑی تفصیلی مثال سے سمجھایا گیا ہے۔

نور کی تعریف

امام غزالیؒ نے یہ فرمائی اَلظَّاهِرُ بِنَفْسِهٖ وَالْمُظْهِرُ لِغَيْرِهٖ، یعنی خود اپنی ذات سے ظاہر اور روشن ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر و روشن کرنے والا ہو۔ اور تفسیر مظہری میں ہے کہ نور دراصل اُس کیفیت کا نام ہے جس کو انسان کی قوّتِ باصرہ پہلے ادراک کرتی ہے اور پھر اُس کے ذریعہ اُن تمام چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں جیسے آفتاب اور چاند کی شعاعیں اُن کے مقابل اجسامِ کثیفہ پر پڑ کر اوّل اُس چیز کو روشن کر دیتی ہیں پھر اُس سے شعاعیں منعکس ہو کر دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ نور کا اپنے لغوی اور عرفی معنے کے اعتبار سے حق تعالیٰ جل شانہٗ کی ذات پر اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جسم اور جسمانیات سب سے بَری اور وراء الوریٰ ہے۔ اس لئے آیتِ مذکورہ میں جو حق تعالیٰ کے لئے لفظ نور کا اطلاق ہوا ہے اس کے معنے باتفاق ائمۂ تفسیر مُنَوِّر یعنی روشن کرنے والے کے ہیں یا پھر صیغۂ مبالغہ کی طرح صاحبِ نور کو نور سے تعبیر کر دیا گیا جیسے صاحبِ کرم کو کرم اور صاحبِ عدل کو عدل کہہ دیا جاتا ہے۔ [۱] اور معنے آیت کے وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نور بخشنے والے ہیں آسمان و زمین کو اور اس میں بسنے والی سب مخلوق کو۔ اور مراد اس نور سے نورِ ہدایت ہے۔ ابن کثیرؒ نے حضرت ابنِ عباسؓ سے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے

[۲] اَللهُ هَادِيْ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ [۳]

نورِ مؤمن

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الآية، اللہ تعالیٰ کا نورِ ہدایت جو مؤمن کے قلب میں آتا ہے۔ یہ اُس کی ایک عجیب مثال ہے

---

[۱] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۵۲۱

[۲] ترجمہ: اللہ تعالیٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو ہدایت دینے والا ہے۔

[۳] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۵۷

جیسا کہ ابن جریر نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے هُوَ الْمُؤْمِنُ الَّذِىْ جَعَلَ اللّٰهُ الْاِيْمَانَ وَالْقُرْاٰنَ فِىْ صَدْرِهٖ فَضَرَبَ اللّٰهُ مِثْلَهٗ فَقَالَ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ فَبَدَأَ بِنُوْرِ نَفْسِهٖ ثُمَّ ذَكَرَ نُوْرَ الْمُؤْمِنِ فَقَالَ مَثَلُ نُوْرِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ فَكَانَ اُبَیُّ بْنُ كَعْبٍ يَقْرَأُهَا مَثَلُ نُوْرِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ۔ [1] (ابن کثیر)

یعنی یہ مثال اُس مؤمن کی ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن کا نورِ ہدایت ڈال دیا ہے اس آیت میں پہلے تو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نور کا ذکر فرمایا اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ پھر قلبِ مؤمن کے نور کا ذکر فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ۔ اور اس آیت کی قراءت بھی حضرت اُبی ابن کعبؓ کی مَثَلُ نُوْرِهٖ کے بجائے مَثَلُ نُوْرِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ کی ہے اور سعید بن جُبیرؒ نے یہی قراءت اور آیت کا یہی مفہوم حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ ابن کثیرؒ [2] نے یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مَثَلُ نُوْرِهٖ کی ضمیر کے متعلق ائمہ تفسیر کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ کا نورِ ہدایت جو مؤمن کے قلب میں فطرۃً رکھا گیا ہے اُس کی مثال یہ ہے كَمِشْكٰوةٍ الخ یہ قول حضرت ابنِ عباسؓ کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر ہی مؤمن کی طرف راجع ہو جس پر سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے حاصل اس مثال کا یہ ہے کہ مؤمن کا سینہ ایک طاق کی مثال ہے اس میں اس کا دل ایک قندیل کی مثال ہے اس میں نہایت شفاف روغنِ زیتون فطری نورِ ہدایت کی مثال ہے جو مؤمن کی فطرت میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ جس کا خاصہ خود بخود بھی قبولِ حق کا ہے پھر جس طرح روغنِ زیتون آگ کے شعلہ سے روشن ہو کر دوسروں کو روشن کرنے لگتا ہے اسی طرح فطری نورِ ہدایت جو قلبِ مؤمن میں رکھا گیا ہے جب وحی الٰہی اور علمِ الٰہی کے ساتھ اُس کا اتصال ہو جاتا ہے تو روشن ہو کر عالم کو روشن کرنے لگتا ہے۔ اور حضرات صحابہ و تابعین نے جو اس مثال کو قلبِ مؤمن کے ساتھ مخصوص فرمایا وہ بھی غالباً اس لئے ہے کہ فائدہ اس نور کا صرف مؤمن ہی اُٹھاتا ہے۔ ورنہ وہ فطری نورِ ہدایت جو ابتداءِ تخلیق کے وقت انسان کے قلب میں رکھا جاتا ہے وہ مؤمن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر انسان کی فطرت اور جبلّت میں وہ نورِ ہدایت رکھا جاتا ہے اسی کا یہ اثر دُنیا کی ہر قوم ہر خطہ ہر مذہب و مشرب کے لوگوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے وجود کو اور اُس کی عظیم قدرت کو فطرۃً مانتا ہے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کے تصوّر اور تعبیر میں خواہ کیسی ہی غلطیاں کرتا ہو مگر اللہ تعالیٰ کے نفسِ وجود کا ہر انسان فطرۃً قائل ہوتا ہے بجز چند مادہ پرست افراد کے جن کی فطرت مسخ ہو گئی ہے کہ وہ خدا ہی کے وجود کے منکر ہیں۔

ایک صحیح حدیث سے اس عموم کی تائید ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے: كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، [3] یعنی

[1] تفسیر ابن کثیر ج:٦ ص:٥٧، وتفسير الطبری ج:١٩ ص:١٧٩ [2] تفسير ابن کثیر ج:٦ ص:٥٨

[3] صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين ج:١ ص:١٨٥

ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو فطرت کے تقاضوں سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس فطرت سے مراد ہدایت ایمان ہے۔ یہ ہدایتِ ایمان اور اس کا نور ہر انسان کی پیدائش کے وقت اُس میں رکھا جاتا ہے اور اسی نورِ ہدایت کی وجہ سے اُس میں قبولِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جب انبیاء اور اُن کے نائبوں کے ذریعہ وحیِ الٰہی کا علم اُن کو پہنچتا ہے تو وہ اس کو بسہولت قبول کر لیتے ہیں بجز اُن ممسوخ الفطرت لوگوں کے جنہوں نے اُس فطری نور کو اپنی حرکتوں سے مٹا ہی ڈالا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو عطاءِ نور کو عام بیان فرمایا ہے جو تمام آسمان والوں اور زمین والوں کو شامل ہے مؤمن کافر کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ اور آخر آیت میں یہ فرمایا: يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے یہاں مشیتِ الٰہی کی قید اُس نورِ فطرت کے لئے نہیں جو ہر انسان میں رکھا ہے بلکہ نورِ قرآن کے لئے ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا بجز اُس خوش نصیب کے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق نصیب ہو۔ ورنہ انسان کی کوشش بھی بلا توفیقِ الٰہی بیکار بلکہ بعض اوقات مضر بھی پڑ جاتی ہے ۔

اِذَا لَمْ يَكُنْ عَوْنٌ مِّنَ اللّٰهِ لِلْفَتٰى فَاَوَّلُ مَا يَجْنِيْ عَلَيْهِ اجْتِهَادُهٗ

یعنی اگر اللہ کی طرف سے بندہ کی مدد نہ ہو تو اُس کی کوشش ہی اُس کو اُلٹا نقصان پہنچا دیتی ہے۔

نورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اور امام بغویؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کعب احبار سے پوچھا کہ اس آیت کی تفسیر میں آپ کیا کہتے ہیں مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الآیۃ کعب احبار جو تورات وانجیل کے بڑے عالم مسلمان تھے اُنہوں نے فرمایا کہ یہ مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بیان کی گئی ہے۔ مشکوٰۃ آپ کا سینہ اور زجاجہ (قندیل) آپ کا قلبِ مبارک، اور مِصْبَاح (چراغ) نبوّت ہے۔ اور اس نورِ نبوّت کا خاصہ یہ ہے کہ نبوّت کے اظہار واعلان سے پہلے ہی اس میں لوگوں کے لئے روشنی کا سامان ہے پھر وحیِ الٰہی اور اس کے اعلان کا اس کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے تو یہ ایسا نور ہوتا ہے کہ سارے عالم کو روشن کرنے لگتا ہے۔ [1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ نبوّت و بعثت بلکہ آپ کی پیدائش سے بھی پہلے جو بہت سے عجیب وغریب واقعات عالم میں ایسے پیش آئے جو آپ کی نبوّت کی بشارت دینے والے تھے جن کو اصطلاحِ محدثین میں ارہاصات کہا جاتا ہے۔ کیونکہ معجزات کا لفظ تو اس قسم کے اُن واقعات کے لئے مخصوص ہے جو دعوائے نبوّت کی تصدیق کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی پیغمبر کے ہاتھ پر جاری کئے جاتے ہیں۔ اور دعوائے نبوّت سے پہلے جو اس قسم کے واقعات دُنیا میں ظاہر

[1] تفسیر البغوی تحت ھذہ الآیۃ ج:۶ ص:۴۸

ہوں ان کو ارہاصات کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے واقعات عجیبہ صحیح روایات سے ثابت ہیں جن کو شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے خصائص کبری میں اور ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں اور دوسرے علماء نے بھی اپنی مستقل کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ اس کا ایک کافی حصہ اس جگہ تفسیر مظہری میں بھی نقل کر دیا ہے۔

روغنِ زیتون کی برکات

شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ، اس سے زیتون اور اس کے درخت کا مبارک اور نافع و مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں بیشمار منافع اور فوائد رکھے ہیں۔ اس کو چراغوں میں روشنی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی روشنی ہر تیل کی روشنی سے زیادہ صاف شفاف ہوتی ہے اس کو روٹی کے ساتھ سالن کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے پھل کو بطور تفکّہ کے کھایا بھی جاتا ہے اور یہ ایسا تیل ہے جس کے نکالنے کے لئے کسی مشین یا چرخی وغیرہ کی ضرورت نہیں خود بخود اس کے پھل سے نکل آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روغن زیتون کو کھاؤ بھی اور بدن پر مالش بھی کرو کیونکہ یہ شجرۂ مبارکہ ہے۔ (رواه البغوی والترمذی عن عمرؓ مرفوعاً، مظہری) [1]

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ﴿۳۶﴾ الآیۃ، سابقہ آیت میں حق تعالیٰ نے قلبِ مؤمن میں اپنا نورِ ہدایت ڈال دینے کی ایک خاص مثال بیان فرمائی تھی اور آخر میں یہ فرمایا تھا کہ اس نور سے فائدہ وہی لوگ اُٹھاتے ہیں جن کو اللہ چاہتا اور توفیق دیتا ہے۔ اس آیت میں ایسے مؤمنین کا مستقر اور محل بیان فرمایا گیا ہے کہ ایسے مؤمنین کا اصل مقام و مستقر جہاں وہ اکثر اوقات خصوصاً پانچ نمازوں کے اوقات میں دیکھے جاتے ہیں وہ بیوت یعنی مکانات ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اُن کو بلند و بالا رکھا جائے اور اُن میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے اور ان بیوت و مکانات کی شان یہ ہے کہ اُن میں اللہ کے نام کی تسبیح و تقدیس صبح شام یعنی تمام اوقات میں ایسے لوگ کرتے رہتے ہیں جن کی خاص صفات کا بیان آگے آتا ہے۔

اس تقریر کی بناء اس پر ہے کہ نحوی ترکیب میں فِيْ بُيُوْتٍ کا تعلق آیت کے جملہ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ کے ساتھ ہو (کما یستفاد من ابن کثیر وغیرہ من المفسرین) بعض حضرات نے اس کا تعلق لفظ یُسبّح محذوف کے ساتھ کیا ہے جس پر آگے آنے والا لفظ يُسَبِّحُ دلالت کرتا ہے۔ مگر پہلا احتمال نسقِ کلام کے اعتبار سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مثالِ سابق میں اللہ تعالیٰ کے جس نور ہدایت کا ذکر ہوا ہے اُس کے ملنے کی جگہ وہ بیوت و مکانات ہیں جہاں صبح شام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک ان بیوت سے مراد مساجد ہیں۔

[1] جامع الترمذی، ابواب الأطعمة، باب ما جاء في أكل الزيت ج:۲ ص:۶، وتفسير البغوی تحت هذه الآية ج:۶ ص:۴۷

مساجد اللہ کے گھر ہیں ان کی تعظیم واجب ہے

قرطبی نے اسی کو ترجیح دی اور استدلال میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَحَبَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ فَلْيُحِبَّنِيْ وَمَنْ اَحَبَّنِيْ فَلْيُحِبَّ اَصْحَابِيْ وَمَنْ اَحَبَّ اَصْحَابِيْ فَلْيُحِبَّ الْقُرْاٰنَ وَمَنْ اَحَبَّ الْقُرْاٰنَ فَلْيُحِبَّ الْمَسَاجِدَ فَاِنَّهَا اَفْنِيَةُ اللهِ اَذِنَ اللهُ فِيْ رَفْعِهَا وَبَارَكَ فِيْهَا مَيْمُوْنَةٌ مَيْمُوْنٌ اَهْلُهَا مَحْفُوْظَةٌ مَحْفُوْظٌ اَهْلُهَا، هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ وَاللهُ عَزَّ وَجَلَّ فِيْ حَوَائِجِهِمْ هُمْ فِي الْمَسَاجِدِ وَاللهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ۔ (قرطبی) [1]

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ مجھ سے محبت کرے۔ اور جو مجھ سے محبت رکھنا چاہے اُس کو چاہئے کہ میرے صحابہ سے محبت کرے۔ اور جو صحابہ سے محبت رکھنا چاہے اُس کو چاہئے کہ قرآن سے محبت کرے۔ اور جو قرآن سے محبت رکھنا چاہے اُس کو چاہئے کہ مسجدوں سے محبت کرے کیونکہ وہ اللہ کے گھر ہیں، اللہ نے اُن کی تعظیم کا حکم دیا ہے اور اُن میں برکت رکھی ہے وہ بھی بابرکت ہیں اور اُن کے رہنے والے بھی بابرکت۔ وہ بھی اللہ کی حفاظت میں ہیں اور اُن کے رہنے والے بھی حفاظت میں۔ وہ لوگ اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے کام بناتے اور حاجتیں پوری کرتے ہیں وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے پیچھے اُن کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (قرطبی)

رفع مساجد کے معنی

اَذِنَ اللهُ اَنْ تُرْفَعَ، اَذِنَ، اذن سے مشتق ہے جس کے معنی اجازت دینے کے ہیں اور تُرْفَعَ، رفع سے مشتق ہے جس کے معنے بلند کرنے اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے مسجدوں کو بلند کرنے کی۔ اجازت دینے سے مراد اُس کا حکم کرنا ہے اور بلند کرنے سے مراد اُن کی تعظیم کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بلند کرنے کے حکم میں اللہ تعالیٰ نے مسجدوں میں لغو کام کرنے اور لغو کلام کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) [2]

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۲ ص:۲۶۶

[2] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۲۲

عکرمہ ومجاہدؒ امامِ تفسیر نے فرمایا کہ رفع سے مراد مسجد کا بنانا ہے جیسے بِناء کعبہ کے متعلق قرآن میں آیا ہے [۱] وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (البقرۃ:۱۲۷) کہ اس میں رفع قواعد سے مراد بِناء قواعد ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ رفع مساجد سے مراد مساجد کی تعظیم واحترام اور اُن کو نجاستوں اور گندی چیزوں سے پاک رکھنا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مسجد میں جب کوئی نجاست لائی جائے تو مسجد اُس سے اس طرح سمٹتی ہے جیسے انسان کی کھال آگ سے۔ [۲] حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے مسجد میں سے ناپاکی اور گندگی اور ایذا کی چیز کو نکال دیا اللہ تعالیٰ اُس کے لئے جنت میں گھر بنادیں گے، رواہ ابن ماجہ۔ [۳] اور حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنے گھروں میں (بھی) مسجدیں (یعنی نماز پڑھنے کی مخصوص جگہیں) بنائیں اور اُن کو پاک صاف رکھنے کا اہتمام کریں۔ (قرطبی) [۴]

اور اصل بات یہ ہے کہ لفظ تُرْفَعَ میں مسجدوں کا بنانا بھی داخل ہے اور اُن کی تعظیم وتکریم اور پاک صاف رکھنا بھی۔ پاک صاف رکھنے میں یہ بھی داخل ہے کہ ہر نجاست اور گندگی سے پاک رکھیں۔ اور یہ بھی داخل ہے کہ اُن کو ہر بدبو کی چیز سے پاک رکھیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لہسن یا پیاز کھا کر بغیر منہ صاف کئے ہوئے مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے جو عام کتبِ حدیث میں معروف ہے۔ [۵] سگرٹ، حُقّہ، پان کا تمبا کو کھا کر مسجد میں جانا بھی اسی حکم میں ہے۔ مسجد میں مٹی کا تیل جلانا جس میں بدبو ہوتی ہے وہ بھی اسی حکم میں ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت فاروق اعظمؓ سے روایت ہے، فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شخص کے منہ سے لہسن یا پیاز کی بدبو محسوس فرماتے تھے اس کو مسجد سے نکال کر بقیع میں بھیج دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس کو لہسن پیاز کھانا ہی ہو تو اُس کو خوب اچھی طرح پکا کر کھائے کہ اُن کی بدبو ماری جائے۔ [۶] حضرات فقہاء نے اس حدیث سے استدلال کر کے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی ایسی بیماری ہو کہ اُس کے پاس کھڑے ہونے والوں کو اُس سے تکلیف پہنچے اُس کو بھی مسجد سے ہٹایا جاسکتا ہے اُس کو خود چاہئے کہ جب تک ایسی بیماری میں ہے نماز گھر میں پڑھے۔

رفع مساجد کا مفہوم جمہور صحابہ وتابعین کے نزدیک یہی ہے کہ مسجدیں بنائی جائیں اور اُن کو ہر بُری چیز سے

[۱] ترجمہ: اور جب کہ اٹھارہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی۔

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۲۶۶، وتنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ لابن العراق، رقم الحدیث:۱۰۱

[۳] سنن ابن ماجۃ، ابواب المساجد والجماعات، باب تطہیر المساجد وتطییبہا، ص:۵۵

[۴] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۲۶۶، وسنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب إتخاذ المساجد فی الدور ج:۱ ص:۷۲

[۵] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب نہی من أکل الثوم إلخ ج:۱ ص:۲۰۹

[۶] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب نہی من اکل الثوم إلخ ج:۱ ص:۲۱۰

پاک صاف رکھا جائے۔ بعض حضرات نے اس میں مسجدوں کی ظاہری شان وشوکت اور تعمیری بلندی کو بھی داخل قرار دیا ہے اور استدلال کیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر سال کی لکڑی سے شاندار بنائی تھی اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے مسجدِ نبوی میں نقش ونگار اور تعمیری خوبصورتی کا کافی اہتمام فرمایا تھا اور یہ زمانہ اجلّۂ صحابہ کا تھا کسی نے اُن کے اس فعل پر انکار نہیں کیا اور بعد کے بادشاہوں نے تو مسجدوں کی تعمیرات میں بڑے اموال خرچ کئے ہیں۔ ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانۂ خلافت میں دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر وتزیین پر پورے ملک شام کی سالانہ آمدنی سے تین گنا زیادہ مال خرچ کیا تھا اُن کی بنائی ہوئی یہ مسجد آج تک قائم ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر نام ونمود اور شہرت کے لئے نہ ہو اللہ کے نام اور اللہ کے گھر کی تعظیم کی نیت سے کوئی شخص مسجد کی تعمیر شاندار بلند ومستحکم خوبصورت بنائے تو کوئی ممانعت نہیں بلکہ اُمید ثواب کی ہے۔

بعض فضائل مساجد

ابوداؤد نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے فرض نماز کے لئے مسجد کی طرف نکلا اُس کا ثواب اُس شخص جیسا ہے جو احرام باندھ کر گھر سے حج کے لئے نکلا ہو اور جو شخص نماز اشراق کے لئے اپنے گھر سے وضو کر کے مسجد کی طرف چلا تو اس کا ثواب عمرہ کرنے والے جیسا ہے۔ اور ایک نماز کے بعد دوسری بشرطیکہ ان دونوں کے درمیان کوئی کام یا کلام نہ کرے، علّیین میں لکھی جاتی ہے۔ [۱] اور حضرت بریدہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اندھیرے میں مساجد کو جاتے ہیں اُن کو قیامت کے روز مکمّل نور کی بشارت سُنا دیجئے۔ (رواہ مسلم) [۲]

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا، گھر میں یا دُکان میں نماز پڑھنے کی نسبت بیس سے زائد درجہ افضل ہے اور یہ اس لئے کہ جب کوئی شخص وضو کرے اور اچھی طرح (سنت کے مطابق) وضو کرے پھر مسجد کو صرف نماز کی نیت سے چلے اور کوئی غرض نہ ہو تو ہر قدم پر اس کا مرتبہ ایک درجہ بلند ہو جاتا ہے اور ایک گناہ معاف ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ مسجد میں پہنچ جائے۔ پھر جب تک جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہے گا اس کو نماز ہی کا ثواب ملتا رہے گا اور فرشتے اس کے لئے یہ دُعا کرتے رہیں گے کہ یا اللہ! اس پر رحمت نازل فرما اور اس کی مغفرت فرما، جب تک کہ وہ کسی کو ایذا نہ پہنچائے اور اس کا وضو نہ ٹوٹے۔ [۳] اور

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی فضل المشی إلی الصلاة، ج:۱ ص:۸۹

[۲] جامع الترمذی، ابواب الصلاة، باب ما جاء فی فضل العشاء والفجر فی الجماعة ج:۱ ص:۵۳

[۳] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة وانتظار الصلاة ج:۱ ص:۲۳۱

حضرت حکم بن عُمَیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا میں مہمانوں کی طرح رہو اور مسجدوں کو اپنا گھر بناؤ اور اپنے دِلوں کو رقّت کی عادت ڈالو (یعنی رقیق القلب نرم دل بنو) اور (اللہ کی نعمتوں میں) کثرت سے تفکر وغور کیا کرو اور بکثرت (اللہ کے خوف سے) رویا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ خواہشاتِ دُنیا تمہیں اس حال سے مختلف کر دیں کہ تم گھروں کی فضول تعمیرات میں لگ جاؤ جن میں رہنا بھی نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنے کی فکر میں لگ جاؤ اور مستقبل کے لئے ایسی فضول تمناؤں میں مبتلا ہو جاؤ جو پا نہ سکو۔ [۱] اور حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ تمہارا گھر مسجد ہونا چاہئے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ مساجد متقی لوگوں کے گھر ہیں جس شخص نے مساجد کو (کثرتِ ذکر کے ذریعہ) اپنا گھر بنالیا، اللہ تعالیٰ اُس کے لئے راحت وسکون اور پُل صراط پر آسانی سے گزرنے کا ضامن ہوگیا۔ [۲] اور ابو صادق ازدی نے شعیب بن الحجاب کو خط لکھا کہ مسجدوں کو لازم پکڑو کیونکہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ مساجد ہی انبیاء کی مجالس تھیں۔ [۳]

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو مسجدوں میں آ کر جگہ جگہ حلقے بنا کر بیٹھ جائیں گے اور وہاں دُنیا ہی کی اور اُس کی محبت کی باتیں کریں گے تم ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے مسجد میں آنے والوں کی ضرورت نہیں۔ [۴]

اور حضرت سعید بن مسیّبؒ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں بیٹھا گویا وہ اپنے رَبّ کی مجلس میں بیٹھا ہے اس لئے اُس کے ذمّہ ہے کہ زبان سے سوائے کلمۂ خیر کے اور کوئی کلمہ نہ نکالے۔ (قرطبی) [۵]

مساجد کے پندرہ آداب

علماء نے آدابِ مساجد میں پندرہ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اوّل یہ کہ مسجد میں پہنچنے پر اگر کچھ لوگوں کو بیٹھا دیکھے تو اُن کو سلام کرے اور کوئی نہ ہو تو [۶] اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ کہے (لیکن یہ اُس صورت میں ہے کہ جبکہ مسجد کے حاضرین نفلی نماز یا تلاوت وتسبیح وغیرہ میں مشغول نہ ہوں ورنہ اس کو سلام کرنا درست نہیں۔ ش) دوسرے یہ کہ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد کی پڑھے (یہ بھی جب ہے کہ اس وقت نماز پڑھنا مکروہ نہ ہو، مثلاً عین

---

[۱] جامع الأحاديث للسيوطيؒ، رقم الحديث: ۱۵۸۴۳

[۲] كنز العمال، رقم الحديث: ۲۰۷۸۵

[۳] جامع الأحاديث، رقم الحديث: ۳۴۸۷۰، وكنز العمال، رقم الحديث: ۲۳۰۹۷

[۴] المعجم الكبير للطبرانيؒ، رقم الحديث: ۱۰۳۰۰

[۵] تفسير القرطبي ج: ۱۲ ص: ۲۷۷

[۶] ترجمہ: سلامتی نازل ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔

آفتاب کے طلوع یا غروب یا استواءِ نصف النہار کا وقت نہ ہو۔ ۱۲ ش) تیسرے یہ کہ مسجد میں خرید وفروخت نہ کرے۔ چوتھے یہ کہ وہاں تیر تلوار نہ نکالے۔ پانچویں یہ کہ مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کرنے کا اعلان نہ کرے۔ چھٹے یہ کہ مسجد میں آواز بلند نہ کرے۔ ساتویں یہ کہ وہاں دُنیا کی باتیں نہ کرے آٹھویں یہ کہ مسجد میں بیٹھنے کی جگہ میں کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ نویں یہ کہ جہاں صف میں پوری جگہ نہ ہو وہاں گھس کر لوگوں پر تنگی پیدا نہ کرے۔ دسویں یہ کہ کسی نماز پڑھنے والے کے آگے سے نہ گزرے گیارھویں یہ کہ مسجد میں تھوکنے ناک صاف کرنے سے پرہیز کرے۔ بارھویں اپنی اُنگلیاں نہ چٹخائے۔ تیرھویں یہ کہ اپنے بدن کے کسی حصّہ سے کھیل نہ کرے۔ چودھویں نجاسات سے پاک صاف رہے اور کسی چھوٹے بچّے یا مجنون کو ساتھ نہ لے جائے۔ پندرھویں یہ کہ وہاں کثرت سے ذکر اللہ میں مشغول رہے۔ قرطبی نے یہ پندرہ آداب لکھنے کے بعد فرمایا ہے کہ جس نے یہ کام کر لئے اُس نے مسجد کا حق ادا کر دیا اور مسجد اُس کے لئے حرز وامان کی جگہ بن گئی۔

احقر نے مساجد کے آداب واحکام ایک مستقل رسالہ بنام آدابُ المساجد میں جمع کر دیئے ہیں جن کو ضرورت ہو اُس کا مطالعہ فرمائیں۔

جو مکانات، ذکر اللہ، تعلیمِ قرآن تعلیمِ دین کے لئے مخصوص ہوں وہ بھی مساجد کے حکم میں ہیں

تفسیر بحرِ محیط میں ابوحیان نے فرمایا کہ فِىْ بُيُوْتٍ کا لفظ قرآن میں عام ہے جس طرح مساجد اس میں داخل ہیں اسی طرح وہ مکانات جو خاص تعلیمِ قرآن تعلیمِ دین یا وعظ ونصیحت یا ذکر وشغل کے لئے بنائے گئے ہوں جیسے مدارس اور خانقاہیں، وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں اُن کا بھی ادب واحترام لازم ہے۔ [۱]

اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ میں لفظ اَذِنَ کی خاص حکمت

علماءِ تفسیر کا اتفاق ہے کہ اس جگہ اَذِنَ بمعنے اَمر وحکم ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر لفظ اَذِنَ کے اس جگہ لانے میں کیا مصلحت ہے روح المعانی میں ایک لطیف مصلحت یہ بیان کی ہے کہ اس میں مؤمنین صالحین کو اس ادب کی تعلیم وترغیب دینا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنے کے ہر کام کے لئے ایسے مستعد اور تیار ہونے چاہئیں کہ حکم کی ضرورت نہ پڑے صرف اس کے منتظر ہوں کہ کب ہمیں اس کام کی اجازت ملے تو ہم یہ سعادت حاصل کریں۔ [۲]

يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ یہاں اللہ کا نام ذکر کرنے میں ہر قسم کا ذکر شامل ہے۔ تسبیح وتحمید وغیرہ بھی، نفلی نماز بھی،

---

[۱] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۸ ص:۳۱۷

[۲] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۴۴۷

تلاوتِ قرآن وعظ ونصیحت، تعلیم علمِ دین، اور علومِ دینیہ کے سب مشاغل اس میں داخل ہیں۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، اس میں اُن مؤمنین کی خاص صفات بیان کی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نورِ ہدایت کے خاص مورد اور مسجدوں کو آباد رکھنے والے ہیں۔ اس میں لفظ رجال کی تعبیر میں اس طرف اشارہ ہے کہ مساجد کی حاضری دراصل مَردوں کے لئے ہے عورتوں کی نماز اُن کے گھروں میں افضل ہے۔

مسند احمد اور بیہقی میں حضرت اُمّ سلمہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خَيْرُ مَسَاجِدِ النِّسَاءِ قَعْرُ بُيُوْتِهِنَّ، [۱] یعنی عورتوں کی بہترین مساجد اُن کے گھروں کے تنگ وتاریک گوشے ہیں۔ اس آیت میں مؤمنین صالحین کی یہ صفت بیان کی ہے کہ ان کو تجارت اور بیع کا مشغلہ اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔ لفظ تجارت میں چونکہ بیع بھی داخل ہے اس لئے بعض مفسرین نے مقابلہ کی وجہ سے اس جگہ تجارت سے مراد خریداری اور بیع سے مراد فروخت کرنا لیا ہے اور بعض نے تجارت کو اپنے مفہوم عام میں رکھا ہے یعنی لین دین خرید وفروخت کے معاملات، پھر بیع کو الگ کر کے بیان کرنے کی حکمت یہ بتلائی ہے کہ معاملات تجارت تو ایک وسیع مفہوم ہے جس کے فوائد ومنافع کبھی مدتوں میں وصول ہوتے ہیں اور کسی چیز کو فروخت کر دینے اور قیمت مع نفع کے نقد وصول کر لینے کا فائدہ فوری اور نقد ہے اُس کو خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ اللہ کے ذکر اور نماز کے مقابلہ میں وہ کسی بڑے سے بڑے دُنیوی فائدہ کا بھی خیال نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ آیت بازار والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اُن کے صاحبزادے حضرت سالمؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ بازار سے گزرے تو نماز کا وقت ہو گیا تھا لوگوں کو دیکھا کہ دُکانیں بند کر کے مسجد کی طرف جا رہے ہیں تو فرمایا کہ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد ہے رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔

اور عہدِ رسالت میں دو صحابی تھے ایک تجارت کرتے تھے دوسرے صنعت وحرفت یعنی لوہار کا کام کرتے اور تلواریں بنا کر بیچتے تھے۔ پہلے صحابی کی تجارت کا حال یہ تھا کہ اگر سودا تولنے کے وقت اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ دوسرے بزرگ کا یہ عالم تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہے ہیں اور کان میں آواز اذان کی آ گئی تو اگر ہتھوڑا مونڈھے پر اُٹھائے ہوئے ہیں تو وہیں مونڈھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کو چل دیتے تھے اُٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لینا بھی گوارا نہ تھا۔ اُن کی مدح میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (قرطبی) [۲]

[۱] مسند احمد، حديث ام سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث: ۲۷۳۰۱

[۲] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۱۲ ص:۲۷۹

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اکثر تجارت پیشہ تھے

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام زیادہ تر تجارت پیشہ یا صنعت پیشہ تھے جو کام کہ بازاروں سے متعلق ہیں کیونکہ تجارت وبیع کا مانع از یادِ خدا نہ ہونا اُنہی لوگوں کا وصف ہوسکتا ہے جن کا مشغلہ تجارت وبیع کا ہو ورنہ یہ کہنا فضل ہوگا۔ (رواہ الطبرانی عن ابن عباسؓ۔ روح) [1]

یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (۳۷) یہ مؤمنین جن کا ذکر اُوپر آیت میں آیا ہے اُن کا آخری وصف ہے جس میں بتلایا ہے کہ یہ حضرات ہر وقت ذکر اللہ اور طاعات وعبادات میں مشغول ہونے کے باوجود بے فکر اور بے ڈر بھی نہیں ہوجاتے بلکہ قیامت کے حساب کا خوف اُن پر مسلّط رہتا ہے۔ اور یہ اُس نورِ ہدایت کا کمال ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو عطا ہوا ہے جس کا ذکر اوپر آیت میں یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ میں فرمایا۔ آخر میں ایسے حضرات کی جزاء کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے عمل کی بہترین جزاء عطا فرمادیں گے اور پھر فرمایا وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ یعنی صرف جزاءِ عمل دینے پر اکتفا نہیں ہوگا بلکہ اپنی طرف سے مزید انعامات بھی اُن کو ملیں گے وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۳۸) یعنی اللہ تعالیٰ نہ کسی قانون کا پابند ہے نہ اُس کے خزانے میں کبھی کمی آتی ہے وہ جس کو چاہے بے حساب رزق دیدیتا ہے۔ یہاں تک مؤمنین صالحین جن کے سینے نورِ ہدایت کے مشکوٰۃ ہوتے ہیں اور جو نورِ ہدایت کو خاص طور سے قبول کرتے ہیں اُن کا ذکر تھا۔ آگے اُن کفّار کا ذکر ہے جن کی فطرت میں تو اللہ تعالیٰ نے نورِ ہدایت کا مادہ رکھا تھا مگر جب اس مادّہ کو روشن کرنے والی وحیِ الٰہی اُن کو پہنچی تو اُس سے روگردانی اور انکار کرکے نور سے محروم ہوگئے اور اندھیرے ہی اندھیرے میں رہ گئے اور ان میں چونکہ کافر ومنکر دو قسم کے تھے اس لئے ان کی دو مثالیں بیان کی گئیں جن کی تفصیل خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے۔ دونوں مثالیں بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۴۰) یہ جملہ کفار کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا مؤمنین کے بارے میں یہ ارشاد ہوا تھا: یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ کفار کے لئے اس جملہ میں نورِ ہدایت سے محرومی کا ذکر ہے کہ انہوں نے احکامِ الٰہیہ سے انحراف کرکے اپنا فطری نور بھی فنا کرلیا اب جبکہ اللہ کے نورِ ہدایت سے محروم ہوگئے تو نور کہاں سے آئے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی شخص محض اسباب علم وبصیرت جمع ہونے سے عالم مبصر نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے آدمی جو دُنیا کے کاموں میں بالکل ناواقف بے خبر سمجھے

---

[1] روح المعانی ج:۱۳ ص:۴۵۳

جاتے ہیں آخرت کے معاملہ میں وہ بڑے مبصر عقلمند ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بہت سے آدمی جو دُنیا کے کاموں میں بڑے ماہر اور مبصر محقق مانے جاتے ہیں مگر آخرت کے معاملہ میں بڑے بے وقوف جاہل ثابت ہوتے ہیں۔ (مظہری) [1]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ کی یاد کرتے ہیں جو کوئی ہیں آسمان وزمین میں اور اُڑتے جانور پَر کھولے ہوئے

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی بندگی اور یاد، اور اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ

اور اللہ کی حکومت ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ ہی تک پھر جانا ہے تو نے نہ دیکھا کہ اللہ

يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ

ہانک لاتا ہے بادل کو پھر اُن کو ملادیتا ہے پھر اُن کو رکھتا ہے تہ بر تہ پھر تو دیکھے مینہ نکلتا ہے

مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ

اس کے بیچ سے اور اُتارتا ہے آسمان سے اس میں جو پہاڑ ہیں اولوں کے پھر وہ ڈالتا ہے

مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ

جس پر چاہے اور بچادیتا ہے جس سے چاہے ابھی اس کی بجلی کی کوند لے جائے

[1] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۵۳۸ (باختصار)

بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً

آنکھوں کو اللہ بدلتا ہے رات اور دن کو اس میں دھیان کرنے کی جگہ ہے

لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ

آنکھ والوں کو اور اللہ نے بنایا ہر پھرنے والے کو ایک پانی سے پھر کوئی ہے کہ چلتا ہے

عَلٰي بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓي

اپنے پیٹ پر اور کوئی ہے کہ چلتا ہے دو پاؤں پر اور کوئی ہے کہ چلتا ہے

اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

چار پر بناتا ہے اللہ جو چاہتا ہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں، اور وہ پرندے بھی جو پر پھیلائے ہوئے اُڑتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی نماز اور اپنی تسبیح کا طریقہ معلوم ہے۔ اور اللہ ان کے سارے کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۴۱﴾ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے، اور اللہ ہی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے۔ ﴿۴۲﴾ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ بادلوں کو ہنکاتا ہے، پھر ان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے، پھر انہیں تہ بر تہ گھٹا میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بارش اُس کے درمیان سے برس رہی ہے۔ اور آسمان میں (بادلوں کی شکل میں) جو پہاڑ کے پہاڑ ہوتے ہیں، اللہ ان سے اولے برساتا ہے، پھر جس کے لئے چاہتا ہے، ان کو مصیبت بنا دیتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے، اُن کا رُخ پھیر دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُس کی بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی اُچک لے جائے گی۔ ﴿۴۳﴾ وہی اللہ رات اور دن کا اُلٹ پھیر کرتا ہے۔ یقیناً ان سب باتوں میں اُن لوگوں کے لئے نصیحت کا سامان ہے جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہیں۔ ﴿۴۴﴾ اور اللہ نے زمین پر چلنے والے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں

جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو چار (پاؤں) پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔ (۴۵)

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو (دلائل اور مشاہدہ سے) معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (خواہ قالاً جو بعض مخلوقات میں مشاہد بھی ہے خواہ حالاً جو کُل مخلوقات میں بدلالت عقل معلوم ہے) اور (بالخصوص) پرند (بھی) جو پَر پھیلائے ہوئے (اُڑتے پھرتے) ہیں (کہ ان کی دلالت علیٰ وجود الصانع اور زیادہ عجیب ہے کہ باوجود اُن کے ثِقلِ اجسام کے پھر فضاء میں رُکے ہوئے ہیں اور) سب (پرندوں) کو اپنی اپنی دُعا (اور التجاء اللہ سے) اور اپنی تسبیح (وتقدیس کا طریقہ الہام سے) معلوم ہے اور (باوجود ان دلائل کے پھر بھی بعضے توحید کو نہیں مانتے تو) اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے (اس انکار واعراض پر ان کو سزا دے گا) اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں (اب بھی) اور (انتہا میں) اللہ ہی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے (اس وقت بھی حاکمانہ تصرّف اُسی کا ہوگا چنانچہ حکومت کا ایک اثر بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اے مخاطب) کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ (ایک) بادل کو (دوسرے بادل کی طرف) چلتا کرتا ہے (اور) پھر اُس بادل (کے مجموعہ) کو باہم ملا دیتا ہے پھر اس کو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اُس (بادل) کے بیچ میں سے نکل (نکل کر) آتی ہے اور اس بادل سے یعنی اُس کے بڑے بڑے حصوں میں سے اولے برساتا ہے پھر اُن کو جس (کی جان پر یا مال) پر چاہتا ہے گراتا ہے (کہ اس کا نقصان ہو جاتا ہے) اور جس سے چاہتا ہے اُس کو ہٹا دیتا ہے (اور اُس کے جان و مال کو بچا لیتا ہے اور) اُس بادل (میں سے بجلی بھی پیدا ہوتی ہے اور ایسی چمکدار کہ اس بادل) کی بجلی کی چمک کی یہ حالت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس نے اب بینائی کو اُچک لیا (یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے تصرفات میں سے ہے اور) اللہ تعالیٰ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے (یہ بھی منجملہ تصرفات الٰہیہ کے ہے) اس (سب مجموعہ) میں اہلِ دانش کے لئے استدلال (کا موقع) ہے (جس سے مضمون توحید اور مضمون لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پر استدلال کرتے ہیں) اور اللہ (ہی کا یہ تصرف بھی ہے کہ اُس) نے ہر چلنے والے جاندار کو (برّی ہو یا بحری) پانی سے پیدا کیا ہے پھر اُن (جانوروں) میں بعضے تو وہ (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں (جیسے سانپ مچھلی) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں (جیسے انسان اور پرندے جبکہ ہوا میں نہ ہوں) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں (جیسے مواشی، اسی طرح بعضے زیادہ پر بھی اصل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پورا قادر ہے (اُس کو کچھ بھی مشکل نہیں)۔

معارف و مسائل

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ شروع آیت میں یہ فرمایا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر مخلوق اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرنے میں مشغول ہے۔ اس تسبیح کا مفہوم حضرت سفیانؒ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی ہر چیز آسمان، زمین، آفتاب و ماہتاب اور کُل سیّارے اور ستارے اور زمین کے عناصر آگ، پانی، مٹی، ہوا سب کو خاص خاص کاموں کے لئے پیدا فرمایا ہے اور جس کو جس کام کے لئے پیدا فرمایا ہے وہ برابر اُس پر لگا ہوا ہے اُس سے سرِ مو خلاف نہیں کرتا۔ اسی اطاعت و انقیاد کو ان چیزوں کی تسبیح فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اُن کی تسبیح حالی ہے مقالی نہیں۔ اُن کی زبانِ حال بول رہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو پاک و برتر سمجھ کر اُس کی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

زمخشری اور دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کے اندر اتنا فہم و شعور رکھا ہو جس سے وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے اور اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ اُن کو کسی خاص قسم کی گویائی عطا فرمائی ہو اور خاص قسم کی تسبیح و عبادت اُن کو سکھا دی ہو جس میں وہ مشغول رہتے ہوں[1] آخری جملے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور نماز میں ساری مخلوق لگی ہوئی ہے مگر ہر ایک کی نماز اور تسبیح کا طریقہ اور صورت مختلف ہے۔ فرشتوں کا اور طریقہ، انسان کا دوسرا، اور نباتات کسی اور طرح سے عبادت نماز و تسبیح ادا کرتے ہیں جمادات کسی اور طریق سے۔ قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰ (طٰہٰ) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کو ہدایت دی۔ وہ ہدایت یہی ہے کہ وہ ہر وقت حق تعالیٰ کی اطاعت میں لگی ہوئی اپنی مفوضہ ڈیوٹی کو پورا کر رہی ہے اس کے علاوہ اس کی اپنی ضروریاتِ زندگی کے متعلق بھی اس کو ایسی ہدایت دیدی ہے کہ بڑے بڑے عقلاء کی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اپنے رہنے بسنے کے لئے کیسے کیسے گھونسلے اور بل وغیرہ بناتے ہیں اور اپنی غذا وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کرتے ہیں۔

مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا، یہاں سماء سے مراد بادل ہے اور جبال سے مراد بڑے بڑے بادل ہیں اور بَرَدٌ اولے کو کہا جاتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

ہم نے اُتاریں آیتیں کھول کھول کر بتلانے والی، اور اللہ چلائے جس کو چاہے

[1] تفسیر کشاف تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۸۴۴

اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴۶﴾ وَیَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا

سیدھی راہ پر اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے مانا اللہ کو اور رسول کو اور حکم میں آگئے

ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۷﴾

پھر پھر جاتا ہے ایک فرقہ ان میں سے اس کے پیچھے اور وہ لوگ نہیں ماننے والے

وَاِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور جب اُن کو بُلایئے اللہ اور رسول کی طرف کہ ان میں قضیہ چکایئے تبھی ایک فرقہ کے لوگ اُن میں منہ موڑتے ہیں

وَاِنْ یَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْۤا اِلَیْهِ مُذْعِنِیْنَ ﴿۴۹﴾ ؕ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

اور اگر اُن کو کچھ پہنچتا ہو تو چلے آئیں اُس کی طرف قبول کرکر کیا اُن کے دِلوں میں روگ ہے

اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ

یا دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ بے انصافی کرے گا اُن پر اللہ اور اُس کا رسول کچھ نہیں

اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْۤا ع ۶ ۱۲ الثلثة

وہی لوگ بے انصاف ہیں ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب بُلایئے اُن کو

اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ

اللہ اور رسول کی طرف فیصلہ کرنے کو ان میں تو کہیں ہم نے سُن لیا اور حکم مان لیا

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَخْشَ اللّٰهَ وَیَتَّقْهِ

اور وہ لوگ کہ انہی کا بھلا ہے اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور اس کے رسول کے اور ڈرتا رہے اللہ سے اور بچ کر چلے اُس سے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ

سو وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچنے والے اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی اپنی تاکید کی قسمیں کہ اگر تو حکم کرے

لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ

تو سب کچھ چھوڑ کر نکل جائیں، تو کہہ قسمیں نہ کھاؤ حکم برداری چاہئے جو دستور ہے، البتہ اللہ کو خبر ہے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا

جو تم کرتے ہو تو کہہ حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا پھر اگر تم منہ پھیروگے

فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ

تو اس کا ذمّہ ہے جو بوجھ اس پر رکھا اور تمہارا ذمّہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا اور اگر اُس کا کہا مانو تو راہ پاؤ،

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

اور پیغام لانے والے کا ذمّہ نہیں مگر پہنچا دینا کھول کر

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک ہم نے وہ آیتیں نازل کی ہیں جو حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے والی ہیں، اور اللہ جس کو چاہتا ہے،
سیدھے راستے تک پہنچا دیتا ہے۔ ﴿۴۶﴾ اور یہ (منافق) لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم
فرماں بردار ہوگئے ہیں، پھر ان میں سے ایک گروہ اس کے بعد بھی منہ موڑ لیتا ہے۔ یہ لوگ (حقیقت میں) مؤمن نہیں
ہیں۔ ﴿۴۷﴾ اور جب انہیں اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان میں
سے کچھ لوگ ایک دم رُخ پھیر لیتے ہیں۔ ﴿۴۸﴾ اور اگر خود اُنہیں حق وصول کرنا ہو تو وہ بڑے فرماں بردار بن کر رسول کے
پاس چلے آتے ہیں۔ ﴿۴۹﴾ کیا ان کے دِلوں میں کوئی روگ ہے، یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، یا انہیں یہ اندیشہ ہے کہ
اللہ اور اُس کا رسول ان پر ظلم ڈھائے گا؟ نہیں، بلکہ ظلم ڈھانے والے تو خود یہ لوگ ہیں۔ ﴿۵۰﴾ مؤمنوں کی بات تو یہ ہوتی

ہے کہ جب انہیں اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول اُن کے درمیان فیصلہ کریں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ: ''ہم نے (حکم) سن لیا، اور مان لیا'' اور ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ ۞ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کریں، اللہ سے ڈریں، اور اس کی نافرمانی سے بچیں، تو وہی لوگ کامیاب ہیں۔ ۞ اور یہ (منافق لوگ) بڑے زوروں سے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر (اے پیغمبر!) تم انہیں حکم دو گے تو یہ نکل کھڑے ہوں گے۔ (ان سے) کہو کہ: ''قسمیں نہ کھاؤ۔ (تمہاری) فرماں برداری کا سب کو پتہ ہے۔ یقین جانو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔'' ۞ (ان سے) کہو کہ: ''اللہ کا حکم مانو، اور رسول کے فرماں بردار بنو، پھر بھی اگر تم نے منہ پھیرے رکھا تو رسول پر تو اتنا ہی بوجھ ہے جس کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی ہے، اور جو بوجھ تم پر ڈالا گیا ہے، اُس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ اگر تم اُن کی فرماں برداری کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے، اور رسول کا فرض اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ صاف صاف بات پہنچا دیں۔'' ۞

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (حق کے) سمجھانے والے دلائل (ہدایت عام کے لئے) نازل فرمائے ہیں اور (ان عام میں سے) جس کو اللہ چاہتا ہے راہ راست کی طرف (خاص) ہدایت فرماتا ہے (کہ وہ اُلوہیت کے حقوق علمیہ یعنی عقائد صحیحہ اور حقوقِ عملیہ یعنی طاعت کو بجالاتا ہے ورنہ بہت سے محروم ہی رہتے ہیں) اور یہ منافق لوگ (زبان سے) دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لے آئے اور (خدا اور سول کا) حکم (دل سے) مانا پھر اس کے بعد (جب عمل کر کے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کا وقت آیا تو) ان میں کا ایک گروہ (جو بہت زیادہ شریر ہے خدا اور سول کے حکم سے) سرتابی کرتا ہے (اس وقت سے وہ صورت مراد ہے کہ جب ان کے ذمّہ کسی کا حق چاہتا ہو اور صاحبِ حق اس منافق سے درخواست کرے کہ چلو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے چلیں اس موقع پر یہ سرتابی کرتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ آپ کے اجلاس میں جب حق ثابت ہوجائے گا تو اسی کے موافق آپ فیصلہ کریں گے جیسا عنقریب آیت وَاِذَا دُعُوْٓا میں اس موقع کا یہی بیان آتا ہے اور تخصیص ایک فریق کی باوجودیکہ تمام منافقین ایسے ہی تھے اس لئے ہے کہ غریب غرباء کو باوجود کراہت قلبی کے صاف انکار کرنے کی جرأت وہمت نہیں ہوا کرتی یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کو کچھ وجاہت اور قوّت حاصل ہو) اور یہ لوگ بالکل ایمان نہیں رکھتے (یعنی دل میں تو کسی منافق کے بھی ایمان نہیں مگر ان کا تو وہ ظاہری ملمع شدہ ایمان بھی نہ رہا جیسا اس آیت میں ہے [۱] وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ (التوبۃ: ۷۴) اور اس آیت میں ہے [۲] قَدْ كَفَرْتُمْ

[۱] ترجمہ: حالانکہ یقیناً انہوں نے کفر کی بات کہی تھی اور اپنے اسلام کے بعد کافر ہو گئے۔ [۲] ترجمہ: تم اپنے کو مؤمن کہہ کر کفر کرنے لگے۔

بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (التوبۃ:٦٦) اور بیان اس حکم عدولی کا یہ ہے کہ) یہ لوگ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف اس غرض سے بلائے جاتے ہیں کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے (اور ان کے خصوم کے) درمیان میں فیصلہ کر دیں تو ان میں کا ایک گروہ (وہاں حاضر ہونے سے) پہلو تہی کرتا ہے (اور ٹالتا ہے اور یہ بلانا اگر چہ رسول ہی کی طرف ہے مگر چونکہ آپ کا فیصلہ حکمِ خداوندی کی بناء پر ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی نسبت کر دی گئی غرض جب ان کے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہے تب تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے) اور اگر (اتفاق سے) ان کا حق (کسی دوسرے کے ذمہ ہو) تو سرِ تسلیم خم کئے ہوئے (بے تکلف آپ کے بُلانے پر) آپ کے پاس چلے آتے ہیں (کیونکہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں حق کا فیصلہ ہوگا اس میں ہمارا فائدہ ہے۔ آگے ان لوگوں کے اعراض اور حاضر نہ ہونے کی وجہ واسباب چند احتمالات کے طور پر بیان کر کے اور سب احتمالات کی نفی اور ایک احتمال کا اثبات ہے) آیا (اس اعراض کا سبب یہ ہے کہ) ان کے دِلوں میں (کفر یقینی کا) مرض ہے (یعنی ان کو اس کا یقین ہے کہ آپ اللہ کے رسول نہیں) یا یہ (نبوّت کی طرف سے) شک میں پڑے ہیں (کہ رسول نہ ہونے کا یقین تو نہیں مگر رسول ہونے کا بھی یقین نہیں) یا ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرنے لگیں (اور ان کے ذمہ جو حق ہے اس سے زائد دلا دیں، سو واقعہ یہ ہے کہ ان اسباب میں سے کوئی بھی سبب) نہیں (ہے) بلکہ (اصلی سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ (ان مقدمات میں) برسرِ ظلم (ہوتے) ہیں (اس لئے حضور نبوی میں مقدمہ لانا پسند نہیں کرتے کہ ہم ہار جائیں گے اور باقی اسباب سابقہ سب منفی ہیں) مسلمانوں (کی شان اور ان) کا قول تو جب ان کو (کسی مقدمہ میں) اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ (خوشی خوشی) کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے (تمہارا کلام) سُن لیا اور (اس کو) مان لیا (اور پھر فوراً چلے جاتے ہیں یہ ہے علامت اس کی کہ ایسوں کا آمنّا اور اَطعنا کہنا دُنیا میں بھی صادق ہے) اور ایسے (ہی) لوگ (آخرت میں بھی) فلاح پائیں گے اور (ہمارے یہاں کا تو قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے بس ایسے لوگ بامراد ہوں گے اور (نیز ان منافقین کی یہ حالت ہے کہ) وہ لوگ بڑا زور لگا کر قسمیں کھایا کرتے ہیں کہ واللہ (ہم ایسے فرمانبردار ہیں کہ) اگر آپ ان کو (یعنی ہم کو) حکم دیں (کہ گھر بار سب چھوڑ دو) تو وہ (یعنی ہم) ابھی (سب چھوڑ چھاڑ) نکل کھڑے ہوں آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ بس قسمیں نہ کھاؤ (تمہاری) فرمانبرداری کی حقیقت معلوم ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس نے مجھ کو بتلا دیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے [1] قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (التوبۃ:۹۴) اور) آپ (ان سے) کہئے کہ (باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا کام کرو یعنی) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو (آگے اللہ تعالیٰ اہتمام شانِ مضمون کے واسطے خود ان لوگوں کو خطاب فرماتا ہے کہ رسول کے اس

[1] ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ یہ عذر مت پیش کرو ہم کبھی تم کو سچا نہ سمجھیں گے، اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری خبر دے چکے ہیں۔

کہنے کے اور تبلیغ کے بعد) پھر اگر تم لوگ (اطاعت سے) روگردانی کرو گے تو سمجھ رکھو کہ (رسول کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) رسول کے ذمّہ وہی تبلیغ (کا کام) ہے جس کا ان پر بار رکھا گیا ہے (جس کو وہ کر چکے اور سبکدوش ہو گئے) اور تمہارے ذمّہ وہ (اطاعت کا کام) ہے جس کا تم پر بار رکھا گیا ہے (جس کو تم نہیں بجا لائے پس تمہارا ہی ضرر ہوگا) اور اگر (روگردانی نہ کی بلکہ) تم نے ان کی اطاعت کر لی (جو عین اطاعت اللہ ہی کی ہے) تو راہ پر جا لگو گے اور (بہرحال) رسول کے ذمّہ صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے (آگے تم سے بازپُرس ہوگی کہ قبول کیا یا نہیں)۔

معارف و مسائل

یہ آیات ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ طبری وغیرہ نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ منافقین میں سے ایک شخص بِشر نامی تھا اس کے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین کے متعلق جھگڑا اور خصومت تھی۔ یہودی نے اس کو کہا کہ چلو تمہارے ہی رسول سے ہم فیصلہ کرا لیں مگر بِشر منافق ناحق پر تھا یہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ گیا تو آپ حق کے موافق فیصلہ کریں گے اور میں ہار جاؤں گا۔ اس نے اس سے انکار کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے کعب بن اشرف یہودی کے پاس مقدمہ لے جانے کو کہا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ [1] اور آیت اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ الآیۃ میں جو ان کے دِلوں میں کفر یقینی کا مرض یا نبوّت میں شک ہونے کی نفی کی گئی ہے اس کی مراد یہ ہے کہ یہ کفر یقینی یا شک ان کے دربارِ نبوی میں مقدمہ لانے سے گریز کرنے کا سبب نہیں اگرچہ کفر و شرک کا ہونا منافقین میں ثابت اور واضح ہے مگر مقدمہ نہ لانا اصل میں اس سبب سے ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ حق کا فیصلہ ہوگا تو ہم ہار جائیں گے۔

فوز و فلاح کے لئے چار شرطیں

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ اس آیت میں چار چیزیں بیان کر کے فرمایا ہے کہ جو ان چار چیزوں کے پابند ہیں وہ ہی بامراد اور دین و دُنیا میں کامیاب ہیں۔

ایک واقعہ عجیبہ

تفسیر قرطبی میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ کا نقل کیا جس سے ان چاروں چیزوں کے مفہوم کا فرق اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ ایک روز مسجد نبوی میں کھڑے تھے اچانک ایک رومی دہقانی آدمی بالکل آپ کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اَنَا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، حضرت

[1] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۳ ص:۲۷۹، وتفسیر کشاف ج:۱ ص:۸۴۴

فاروق اعظمؓ نے پوچھا کیا بات ہے؟ تو کہا میں اللہ کے لئے مسلمان ہوگیا ہوں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے پوچھا کیا اس کا کوئی سبب ہے اس نے کہا ہاں۔ بات یہ ہے کہ میں نے تورات، انجیل، زبور اور انبیاء سابقین کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر حال میں ایک مسلمان قیدی قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا وہ سُنی تو معلوم ہوا کہ اس چھوٹی سی آیت نے تمام کتبِ قدیمہ کو اپنے اندر سمو لیا ہے تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ فاروق اعظمؓ نے پوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے؟ تو اس رومی دہقان نے یہی آیتِ مذکورہ تلاوت کی اور اُس کے ساتھ اس کی تفسیر بھی عجیب وغریب اس طرح بیان کی کہ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ فرائضِ الٰہیہ کے متعلق ہے۔ وَرَسُوْلَهٗ سنتِ نبوی کے متعلق ہے وَيَخْشَ اللّٰهَ گزشتہ عمر کے متعلق ہے وَيَتَّقْهِ آئندہ باقی عمر کے متعلق ہے۔ جب انسان ان چار چیزوں کا عامل ہوجائے تو اس کو فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ کی بشارت ہے اور فائز وہ شخص ہے جو جہنم سے نجات پائے اور جنت میں اُس کو ٹھکانا ملے۔ فاروق اعظمؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (کے کلام میں اس کی تصدیق موجود ہے آپ) نے فرمایا ہے اُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ [1] یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے جامع کلمات عطا فرمائے ہیں جن کے الفاظ مختصر اور معانی نہایت وسیع ہیں۔ (قرطبی) [2]

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

وعدہ کرلیا اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں اُنہوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کردے گا ان کو مُلک میں

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي

جیسا حاکم کیا تھا اُن سے اگلوں کو اور جمادے گا اُن کے لئے دین اُن کا جو

ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ

پسند کردیا اُن کے واسطے اور دے گا اُن کو اُن کے ڈر کے بدلے میں امن، میری بندگی کریں گے شریک نہ کریں گے میرا

شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

کسی کو اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے پیچھے سو وہی لوگ ہیں نافرمان اور قائم رکھو نماز

[1] مشكوٰة المصابيح، باب فضائل سيد المرسلين صلى الله عليه وسلم، الفصل الأوّل ص: ۵۱۲

[2] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج: ۱۲ ص: ۲۷۰

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ

اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو رسول کے تاکہ تم پر رحم ہو نہ خیال کر کہ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۖ

یہ جو کافر ہیں تھکادیں گے بھاگ کر مُلک میں اور اُن کا ٹھکانا آگ ہے

وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع ۱۳

اور وہ بُری جگہ ہے پھر جانے کی

آسان ترجمۂ قرآن

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا، اور اُن کے لئے اُس دِین کو ضرور اِقتدار بخشے گا جسے اُن کے لئے پسند کیا ہے، اور اُن کو جو خوف لاحق رہا ہے، اُس کے بدلے اُنہیں ضرور اَمن عطا کرے گا۔ (بس) وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور جو لوگ اس کے بعد بھی ناشکری کریں گے، تو ایسے لوگ نافرمان ہوں گے۔ ﴿۵۵﴾ اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور رسول کی فرماں برداری کرو، تاکہ تمہارے ساتھ رحمت کا برتاؤ کیا جائے۔ ﴿۵۶﴾ یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ جن لوگوں نے کفر کا راستہ اپنالیا ہے، وہ زمین میں (کہیں بھاگ کر ہمیں) بے بس کردیں گے۔ اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور یقیناً وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ ﴿۵۷﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مجموعہ اُمّت) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں (یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نورِ ہدایت کا کامل اتباع کریں) اُن سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے (اہلِ ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی (مثلاً بنی اسرائیل کو فرعون اور اُس کی قوم قبطیوں پر غالب کیا پھر ملک شام میں عمالقہ جیسی بہادر قوم پر اُن کو غلبہ عطا فرمایا اور مصر و شام کی حکومت کا ان کو وارث بنایا) اور (مقصود اس حکومت دینے

سے یہ ہوگا کہ) جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) اُن کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام جیسا کہ دوسری آیت میں ہے [1] رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ:۳)) اُس کو اُن کے (نفع آخرت کے) لئے قوت دے گا اور (اُن کو جو دشمنوں سے طبعی خوف ہے) اُن کے اس خوف کے بعد اُس کو امن سے بدل دے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں (نہ جلی نہ خفی جس کو ریاء کہتے ہیں ۔ یعنی یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کا مشروط ہے دین پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کے ساتھ ۔ اور یہ وعدہ تو دُنیا میں ہے اور آخرت میں ایمان اور عمل صالح پر جو جزائے عظیم اور دائمی راحت کا وعدہ ہے وہ اس کے علاوہ ہے) اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدہ) کے ناشکری کرے گا (یعنی دین کے خلاف راستہ اختیار کرے گا) تو (ایسے شخص کے لئے یہ وعدہ نہیں کیونکہ) یہ لوگ نافرمان ہیں (اور وعدہ تھا فرمانبرداروں کے لئے اس لئے اُن سے دُنیا میں بھی وعدہ حکومت دینے کا نہیں ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے) اور (اے مسلمانوں جب ایمان اور عمل صالح کے دُنیوی اور دینی فوائد سُن لئے تو تم کو چاہئے کہ خوب) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (باقی احکام میں بھی) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کیا کرو تاکہ تم پر (کامل) رحم کیا جائے (آگے کفر و معصیت کا انجام ذکر کیا گیا ہے کہ اے مخاطب) کافروں کی نسبت یہ خیال مت کرنا کہ زمین (کے کسی حصّہ) میں (بھاگ جائیں گے اور ہم کو) ہرا دیں گے (اور ہمارے قہر سے بچ جائیں گے نہیں بلکہ وہ خود ہاریں گے اور مقہور و مغلوب ہوں گے ۔ یہ تو نتیجہ دُنیا میں ہے) اور (آخرت میں) اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے ۔

معارف و مسائل

شانِ نزول

قرطبی نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی اور اعلانِ نبوّت کے بعد دس سال مکہ مکرمہ میں رہے تو ہر وقت کفار و مشرکین کے خوف میں رہے پھر ہجرتِ مدینہ کا حکم ہوا تو یہاں بھی مشرکین کے حملوں سے ہر وقت کے خطرہ میں رہے ۔ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ کبھی ہم پر ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم ہتھیار کھول کر امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت جلد ایسا وقت آنے والا ہے ۔ اُس پر یہ آیات نازل ہوئیں (قرطبی و بحر) [2] حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے

---

[1] ترجمہ: اور میں نے اسلام کو تمہارے دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۲۷۲، والبحر المحیط تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۳۳۰

جو اُسؐ نے اُمّتِ محمدیہ سے اُن کے وجود میں آنے سے پہلے ہی تورات وانجیل میں فرمایا تھا۔ (بحر محیط) [1]

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا کہ آپ کی اُمّت کو زمین کے خلفاء اور حکمران بنایا جائے گا اور اللہ کے پسندیدہ دینِ اسلام کو غالب کیا جائے گا اور مسلمانوں کو اتنی قوت وشوکت دی جائے گی کہ اُن کو دشمنوں کا کوئی خوف نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ اس طرح پورا فرمادیا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں مکہ، خیبر، بحرین اور پورا جزیرۃ العرب اور پورا مُلکِ یمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ فتح ہوا اور ہجر کے مجوسیوں اور ملک شام کے بعض اطراف سے آپ نے جزیہ وصول فرمایا۔ اور شاہِ روم ہرقل نے اور شاہ مصر واسکندریہ مقوقس اور شاہانِ عمان اور بادشاہ حبشہ نجاشی وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایا بھیجے اور آپ کی تعظیم وتکریم کی۔ پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو وفات کے بعد جو کچھ فتنے پیدا ہوگئے تھے اُن کو ختم کیا اور بلادِ فارس اور بلادِ شام ومصر کی طرف اسلامی لشکر بھیجے اور بُصریٰ اور دمشق آپ ہی کے زمانے میں فتح ہوئے اور دوسرے ملکوں کے بھی بعض حصے فتح ہوئے۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کی وفات کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ بنانے کا الہام فرمایا۔ عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے نظامِ خلافت ایسا سنبھالا کہ آسمان نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ایسا نظام کہیں نہ دیکھا تھا۔ اُن کے زمانے میں ملک شام پورا فتح ہوگیا اسی طرح پورا ملک مصر اور ملک فارس کا اکثر حصہ، اُنہیں کے زمانے میں قیصر وکسریٰ کی قیصری اور کسروی کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد خلافتِ عثمانی کا وقت آیا تو اسلامی فتوحات کا دائرہ مشارق ومغارب تک وسیع ہوگیا۔ بلادِ مغرب، اندلس اور قبرص تک اور مشرق اقصیٰ میں بلادِ چین تک اور عراق، خراسان، اہواز سب آپ کے زمانے میں فتح ہوئے۔ اور صحیح حدیث میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے پوری زمین کے مشارق ومغارب سمیٹ کر دکھائے گئے ہیں اور میری اُمّت کی حکومت اُن تمام علاقوں تک پہنچے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ [2] اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ خلافتِ عثمانی کے دَور ہی میں پورا فرمادیا (یہ سب مضمون تفسیر ابنِ کثیر سے لیا گیا ہے)۔ [3] اور ایک حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی [4] اس کی مراد خلافتِ راشدہ ہے جو بالکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر قائم رہی اور حضرت علیؓ مرتضیٰ تک چلی کیونکہ یہ تیس سال کی مدّت حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے زمانے تک پوری ہوئی۔

---

[1] تفسیر البحر المحیط ج:۸ ص:۳۳۰

[2] صحیح مسلم، کتاب الفتن، فصل إذا التقی المسلمان إلخ ج:۲ ص:۳۹۰

[3] تفسیر ابن کثیر تحت ھذہ الآیة ج:۶ ص:۷۷،۸۷

[4] صحیح ابن حبان، رقم الحدیث:۲۹۴۳

ابن کثیرؒ نے اس جگہ صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری اُمت کا کام چلتا رہے گا جب تک بارہ خلیفہ رہیں گے۔[1] ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ حدیث بارہ خلیفہ عادل اس اُمت میں ہونے کی خبر دے رہی ہے جس کا وقوع ضروری ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب مسلسل اور متصل ہی ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ وقفوں کے بعد ہوں۔ ان میں سے چار تو یکے بعد دیگرے ہو چکے جو خلفائے راشدین تھے پھر کچھ وقفہ کے بعد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ہوئے اُن کے بعد بھی مختلف زمانوں میں ایسے خلیفہ ہوتے رہے اور تا قیامت رہیں گے آخری خلیفہ حضرت مہدی ہوں گے۔ روافض نے جن بارہ خلفاء کو متعین کیا ہے اس کی کوئی دلیل حدیث میں نہیں بلکہ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کا خلافت سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔[2] اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان سب کے درجات برابر ہوں اور سب کے زمانے میں امن وسکون دُنیا کا یکساں ہو۔ بلکہ اس وعدہ کا مدار ایمان و عمل صالح پر استقامت اور مکمل اتباع پر ہے اس کے درجات کے اختلاف سے حکومت کی نوعیت وقوت میں بھی فرق واختلاف لازمی ہے۔ اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں جب اور جہاں کوئی مسلمان عادل اور صالح بادشاہ ہوا ہے اس کو اپنے عمل وصلاح کے پیمانے پر اس وعدۂ الٰہیہ کا حصہ ملا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المجادلۃ: ۲۲) یعنی اللہ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

آیتِ مذکورہ سے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت اور مقبولیت عنداللہ کا ثبوت

یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورسالت کی دلیل بھی ہے کیونکہ جو پیش گوئی اس آیت میں فرمائی گئی تھی وہ بالکل اُسی طرح پوری ہوئی۔ اسی طرح یہ آیت حضرات خلفائے راشدین کی خلافت کے حق وصحیح اور مقبول عنداللہ ہونے کی بھی دلیل ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ اپنے رسول اور اس کی اُمت سے فرمایا تھا اُس کا پورا پورا ظہور انہیں حضرات کے زمانے میں ہوا۔ اگر ان حضرات کی خلافت کو حق وصحیح نہ مانا جائے جیسے روافض کا خیال ہے تو پھر قرآن کا یہ وعدہ ہی کہیں پورا نہیں ہوا۔ اور روافض کا یہ کہنا کہ یہ وعدہ حضرت مہدی کے زمانے میں پورا ہوگا ایک مضحکہ خیز چیز ہے اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ چودہ برس تو پوری اُمت ذلت وخواری میں رہے گی اور قربِ قیامت میں جو چند روز کے لئے اُن کو حکومت ملے گی وہی حکومت اس وعدہ سے مراد ہے معاذ اللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے جن شرائطِ ایمان وعمل صالح کی بنیاد پر کیا تھا وہ شرائط بھی انہیں حضرات میں سب سے زیادہ کامل ومکمل تھیں اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پورا پورا

[1] صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب الناس تبع لقریش ج:۲ ص:۱۱۹

[2] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۷۸

انہیں کے عہد میں پورا ہوا اُن کے بعد نہ ایمان وعمل کا وہ درجہ قائم رہا نہ خلافت وحکومت کا وہ وقار کبھی قائم ہوا۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ لفظ کفر کے لغوی معنے ناشکری کے اور اصطلاحی معنے ایمان کی ضد ہیں۔ یہاں لفظی معنے بھی مراد ہوسکتے ہیں اور اصطلاحی بھی۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ اپنا یہ وعدہ پورا کردے، مسلمانوں کو حکومت قوت اور امن واطمینان اور دین کو استحکام حاصل ہوجائے اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص کفر کرے یعنی اسلام سے پھر جائے یا ناشکری کرے کہ اس اسلامی حکومت کی اطاعت سے گریز کرے تو ایسے لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں۔ پہلی صورت میں ایمان ہی سے نکل گئے اور دوسری صورت میں اطاعت سے نکل گئے۔ کفر اور ناشکری ہر وقت ہر حال میں گناہِ عظیم ہے مگر اسلام اور مسلمانوں کی قوت وشوکت اور حکومت قائم ہونے کے بعد یہ چیزیں دوہرے جرم ہوجاتی ہیں اس لئے بَعْدَ ذٰلِكَ سے مؤکد فرمایا گیا۔ امام بغوی نے فرمایا کہ علماء تفسیر نے کہا ہے کہ قرآن کے اس جملے کے سب سے پہلے مصداق وہ لوگ ہوئے جنہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان غنیؓ کو قتل کیا اور جب وہ اس جُرمِ عظیم کے مرتکب ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے مذکورہ انعامات میں بھی کمی آگئی آپس کے قتل وقتال سے خوف وہراس میں مبتلا ہوگئے اور بعد اس کے کہ سب آپس میں بھائی بھائی تھے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔[1] بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن سلام کا یہ خطبہ نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف ہنگامہ کے وقت دیا تھا۔ خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اللہ کے فرشتے تمہارے شہر کے گرد احاطہ کئے ہوئے حفاظت میں اُس وقت سے مشغول تھے جب سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف فرما ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ خدا کی قسم اگر تم نے عثمان کو قتل کردیا تو یہ فرشتے واپس چلے جائیں گے اور پھر کبھی نہ لوٹیں گے۔ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص ان کو قتل کردے گا وہ اللہ کے سامنے دست بُریدہ حاضر ہوگا اُس کے ہاتھ نہ ہوں گے۔ اور سمجھ لو کہ اللہ کی تلوار اب تک میان میں تھی، خدا کی قسم اگر وہ تلوار میان سے نکل آئی تو پھر کبھی میان میں نہ جائے گی۔ کیونکہ کوئی نبی قتل کیا جاتا ہے تو اُس کے بدلے میں ستر ہزار آدمی مارے جاتے ہیں اور جب کسی خلیفہ کو قتل کیا جاتا ہے تو پینتیس ہزار آدمی مارے جاتے ہیں۔'' (مظہری)[2]

چنانچہ قتل عثمان غنیؓ سے جو باہمی خونریزی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اُمت میں چلتا ہی رہا ہے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کی نعمتِ استخلاف اور استحکامِ دین کی مخالفت اور ناشکری قاتلانِ عثمان نے کی تھی اُن کے بعد روافض اور خوارج کی جماعتوں

[1] تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:٦ ص:٥٩

[2] تفسیر البغوی بحوالۂ بالا، وتفسیر المظهری ج:٦ ص:٥٥٣، ومصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث:٢٠٩٦٣

نے خلفاء راشدین کی مخالفت میں گروہ بنالئے۔ اسی سلسلے میں حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کا عظیم حادثہ پیش آیا۔ نَسْأَلُ اللّٰهَ الْهِدَايَةَ وَشُكْرَ نِعْمَتِهٖ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اے ایمان والو اجازت لے کر آئیں تم سے جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں

وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ

اور جو کہ نہیں پہنچے تم میں عقل کی حد کو تین بار فجر کی نماز سے پہلے

وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ڜ

اور جب اُتار رکھتے ہو اپنے کپڑے دوپہر میں اور عشاء کی نماز سے پیچھے

ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ

یہ تین وقت بدن کھلنے کے ہیں تمہارے، کچھ تنگی نہیں تم پر اور نہ اُن پر ان وقتوں کے پیچھے،

طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ

پھرا ہی کرتے ہو ایک دوسرے کے پاس یوں کھولتا ہے اللہ تمہارے آگے باتیں

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۵۸ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور جب پہنچیں لڑکے تم میں کے عقل کی حد کو تو اُن کو ویسی ہی اجازت لینی چاہیے

كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ۭ

جیسے لیتے رہے ہیں اُن سے اگلے، یوں کھول کر سُناتا ہے اللہ تم کو اپنی باتیں

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتوں میں سے جن کو توقع نہیں رہی نکاح کی

فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِيْنَةٍ ۭ

اُن پر گناہ نہیں کہ اُتار رکھیں اپنے کپڑے یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں اپنا سنگار

وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

اور اس سے بھی بچیں تو بہتر ہے اُن کے لئے اور اللہ سب باتیں سُنتا جانتا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جو غلام لونڈیاں تمہاری ملکیت میں ہیں، اور تم میں سے جو بچے ابھی بلوغ تک نہیں پہنچے، ان کو چاہئے کہ وہ تین اوقات میں (تمہارے پاس آنے کے لئے) تم سے اجازت لیا کریں: نمازِ فجر سے پہلے، اور جب تم دوپہر کے وقت اپنے کپڑے اُتار کر رکھا کرتے ہو، اور نمازِ عشاء کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے پردے کے اوقات ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ نہ تم پر کوئی تنگی ہے، نہ اُن پر۔ اُن کا بھی تمہارے پاس آنا جانا لگا رہتا ہے، تمہارا بھی ایک دوسرے کے پاس۔ اللہ اسی طرح آیتوں کو تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ﴿۵۸﴾ اور جب تمہارے بچے بلوغ کو پہنچ جائیں، تو وہ بھی اُسی طرح اجازت لیا کریں جیسے اُن سے پہلے بالغ ہونے والے اجازت لیتے رہے ہیں۔ اللہ اسی طرح اپنی آیتیں کھول کھول کر تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ﴿۵۹﴾ اور جن بڑی بوڑھی عورتوں کو نکاح کی کوئی توقع نہ رہی ہو، اُن کے لئے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے، (مثلاً چادریں نامحرموں کے سامنے) اُتار کر رکھ دیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش نہ کریں، اور اگر وہ احتیاط ہی رکھیں تو اُن کے لئے اور زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ سب کچھ سنتا، ہر بات جانتا ہے۔ ﴿۶۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تمہارے پاس آنے کے لئے) تمہارے مملوکوں کو اور جو تم میں حدِ بلوغ کو نہیں پہنچے اُن کو تین

وقتوں میں اجازت لینا چاہئے (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب دوپہر کو (سونے لیٹنے کے لئے) اپنے (زائد) کپڑے اُتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد یہ تین وقت تمہارے پردے کے ہیں (یعنی یہ اوقات چونکہ عام عادت کے مطابق تخلیہ اور آرام کے ہیں، جس میں آدمی بے تکلفی سے رہنا چاہتا ہے اور تنہائی میں کسی وقت اعضائے مستورہ بھی کھل جاتے ہیں، یا کسی ضرورت سے کھولے جاتے ہیں اس لئے اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کو اور اپنے نابالغ بچوں کو سمجھا دو کہ بے اطلاع اور بغیر اجازت لئے ہوئے ان اوقات میں تمہارے پاس نہ آیا کریں اور) ان اوقات کے علاوہ نہ (تو بلا اجازت آنے دینے اور منع نہ کرنے میں) تم پر کوئی الزام ہے اور نہ (بلا اجازت چلے آنے میں) اُن پر کچھ الزام ہے (کیونکہ) وہ بکثرت تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں کوئی کسی کے پاس اور کوئی کسی کے پاس (پس ہر وقت اجازت لینے میں تکلیف ہے اور چونکہ یہ وقت پردے کے نہیں ہیں اس لئے ان میں اپنے اعضاء مستورہ کو چھپائے رکھنا کچھ مشکل نہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے اور جس وقت تم میں کے (یعنی احرار میں کے) وہ لڑکے (جن کا اُوپر حکم آیا ہے) حدِ بلوغ کو پہنچیں (یعنی بالغ یا قریب بہ بلوغ ہو جائیں) تو ان کو بھی اسی طرح اجازت لینا چاہئے جیسا ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے) لوگ اجازت لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے، اور (ایک بات یہ جاننا چاہئے کہ پردہ کے احکام میں شدت، فتنہ کے خوف پر مبنی ہے جہاں فتنہ کا عادۃً احتمال نہ ہو مثلاً جو) بڑی بوڑھی عورتیں جن کو (کسی کے) نکاح (میں آنے) کی اُمید نہ رہی ہو (یعنی وہ محلِ رغبت نہیں رہیں یہ تفسیر ہے بڑی بوڑھی ہونے کی) اُن کو اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے (جس سے چہرہ وغیرہ چھپا رہتا ہے غیر محرم کے روبرو بھی) اُتار رکھیں بشرطیکہ زینت (کے مواقع) کا اظہار نہ کریں (جن کا ظاہر کرنا غیر محرم کے سامنے بالکل ناجائز ہے پس مراد اس سے چہرہ ہتھیلیاں اور بقول بعض دونوں قدم بھی، بخلاف جوان عورت کے کہ بوجہ احتمال فتنہ اس کے چہرہ وغیرہ کا بھی پردہ ضروری ہے) اور (اگرچہ بڑی بوڑھی عورتوں کے لئے غیر محرموں کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے لیکن) اس سے بھی احتیاط رکھیں تو ان کے لئے اور زیادہ بہتر ہے (کیونکہ اوّل تو "ہر گندہ پُرے را گندہ خورے"[1]، مثل مشہور ہے دوسرے بالکل ہی بے پردگی کا سدِ باب مقصود ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور کے بیشتر احکام بے حیائی اور فواحش کے انسداد کے لئے آئے

[1] ترجمہ: ہر گندی چیز کو کھانے کے لئے کوئی نہ کوئی گندا شخص ہوتا ہے۔

ہیں اور اُنہیں کی مناسبت سے کچھ احکام آداب معاشرت اور ملاقات باہمی کے بھی بیان ہوئے ہیں۔ پھر عورتوں کے پردے کے احکام بیان کئے گئے۔

اقارب ومحارم کے لئے خاص اوقات میں استیذان کا حکم

آدابِ معاشرت اور ملاقات باہمی کے آداب اس سے پہلے اسی سورت کی آیت ۲۷، ۲۸، ۲۹ میں احکامِ استیذان کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں کہ کسی سے ملاقات کو جاؤ تو بغیر اجازت لئے اُس کے گھر میں داخل نہ ہو۔ گھر زنانہ ہو یا مردانہ، آنے والا مرد ہو یا عورت سب کے لئے کسی کے گھر میں جانے سے پہلے اجازت کو واجب قرار دیا گیا ہے مگر یہ احکام استیذان اجانب کے لئے تھے جو باہر سے ملاقات کے لئے آئے ہوں۔

آیاتِ مذکورہ میں ایک دوسرے استیذان کے احکام کا بیان ہے جن کا تعلق اُن اقارب اور محارم سے ہے جو عموماً ایک گھر میں رہتے اور ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور اُن سے عورتوں کا پردہ بھی نہیں ایسے لوگوں کے لئے بھی اگر چہ گھر میں داخل ہونے کے وقت اس کا حکم ہے کہ اطلاع کر کے یا کم از کم قدموں کی آہٹ کو ذرا تیز کر کے یا کھانس کھنکار کر گھر میں داخل ہوں اور یہ استیذان ایسے اقارب کے لئے واجب نہیں مستحب ہے جس کو ترک کرنا مکروہ تنزیہی ہے تفسیر مظہری میں ہے [1] فَمَنْ اَرَادَ الدُّخُوْلَ فِيْ بَيْتِ نَفْسِهٖ وَفِيْهِ مُحَرَّمَاتُهٗ يُكْرَهُ لَهُ الدُّخُوْلُ فِيْهِ مِنْ غَيْرِ اِسْتِيْذَانٍ تَنْزِيْهًا لِاِحْتِمَالِ رُؤْيَةِ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ عُرْيَانَةً وَهُوَ اِحْتِمَالٌ ضَعِيْفٌ وَمُقْتَضَاهُ التَّنَزُّهُ (مظہری)۔ [2] یہ حکم تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے کا تھا لیکن گھر میں داخل ہو کر پھر یہ سب ایک جگہ ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ اُن کے لئے تین خاص اوقات میں جو انسان کے خلوت میں رہنے کے اوقات ہیں ایک اور استیذان کا حکم ان آیات میں دیا گیا ہے وہ تین اوقات صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو آرام کرنے کے وقت اور عشاء کی نماز کے بعد کے اَوقات ہیں۔ ان میں محارم اور اقارب کو یہاں تک کہ سمجھدار نابالغ بچّوں اور مملوکہ لونڈیوں کو بھی اس استیذان کا پابند کیا گیا ہے کہ ان تین اوقاتِ خلوت میں ان میں سے بھی کوئی کسی کی خلوت گاہ میں بغیر اجازت کے نہ جائے۔ کیونکہ ایسے اوقات میں ہر انسان آزاد بے تکلف رہنا چاہتا ہے زائد کپڑے بھی اُتار دیتا ہے اور کبھی اپنی بیوی کے ساتھ بے تکلف اختلاط میں مشغول ہوتا ہے۔ ان اوقات میں کوئی ہوشیار بچہ یا گھر کی کوئی عورت یا اپنی اولاد میں سے کوئی بغیر اجازت کے اندر آجائے تو بسا اوقات وہ ایسی حالت میں پائے گا جس کے ظاہر ہونے سے انسان شرماتا ہے اس کو سخت تکلیف پہنچے گی اور کم

[1] ترجمہ: جو شخص اپنے گھر میں داخل ہونا چاہے اور گھر میں محرم عورتیں ہوں تو اس کے لئے اجازت لئے بغیر گھر میں داخل ہونا اچھا نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ گھر میں کوئی محرم عورت برہنہ حالت میں ہو، یہ ایک ضعیف احتمال ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسا کرنا اچھا نہیں ہے۔

[2] المظهری ج:٦ ص:۵۵۸

ازکم اس کی بے تکلفی اور آرام میں خلل پڑنا تو ظاہر ہی ہے۔ اس لئے آیاتِ مذکورہ میں اُن کے لئے خصوصی استیذان کے احکام آئے ہیں کہ ان تین وقتوں میں کوئی کسی کے پاس بغیر اجازت کے نہ جائے۔ ان احکام کے بعد پھر یہ بھی فرمایا کہ:

لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ وَ لَا عَلَیۡہِمۡ جُنَاحٌۢ بَعۡدَہُنَّ ؕ یعنی ان وقتوں کے علاوہ کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک دوسرے کے پاس بلا اجازت جایا کریں کیونکہ وہ اوقات عموماً ہر شخص کے کام کاج میں مشغول ہونے اور اعضاءِ مستورہ کو چھپائے رہنے کے ہیں جن میں عادۃً آدمی بیوی کے ساتھ اختلاط بھی نہیں کرتا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بالغ مرد و عورت کو استیذان کا حکم دینا تو ظاہر ہے مگر نابالغ بچے جو شرعاً کسی حکم کے مکلّف نہیں ان کو بھی اس حکم کا پابند کرنا بظاہر اُصول کے خلاف ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس کے مخاطب دراصل بالغ مرد و عورت ہیں کہ وہ چھوٹے بچّوں کو بھی سمجھا دیں کہ ایسے وقت میں بغیر پوچھے اندر نہ آیا کرو۔ جیسے حدیث میں ہے کہ بچّوں کو جب وہ سات سال کے ہو جائیں تو نماز سکھاؤ اور پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر کے بعد اُن کو سختی سے نماز کا پابند کرو نہ مانیں تو مار کر نماز پڑھاؤ۔ [۱] اسی طرح اس استیذان کا اصل حکم بالغ مرد و عورت کو ہے۔ اور مذکورہ جملے میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ان وقتوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں نہ تم پر جناح ہے کہ اُن کو بلا اجازت آنے دو اور نہ ان پر کوئی جُناح ہے کہ وہ بلا اجازت آجائیں اس میں اگرچہ لفظ جُناح آیا ہے جو عموماً گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر کبھی مطلقاً حرج اور مضائقہ کے معنے میں بھی آتا ہے یہاں لَا جُنَاحَ کے معنی یہی ہیں کہ کوئی مضائقہ اور تنگی نہیں ہے۔ اس سے بچّوں کے مکلّف اور گناہگار ہونے کا شبہ ختم ہو گیا۔ (بیان القرآن) [۲]

مسئلہ:- آیتِ مذکورہ میں جو اَلَّذِیۡنَ مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ کا لفظ آیا ہے جس کے معنے مملوک غلام اور لونڈی دونوں پر حاوی ہیں۔ ان میں مملوک غلام جو بالغ ہو وہ تو شرعاً اجنبی غیر محرم کے حکم میں ہے۔ اس کی آقا اور مالک عورت کو بھی اس سے پردہ کرنا واجب ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اس لفظ سے مراد لونڈیاں یا مملوک غلام جو بالغ نہ ہو وہ ہے جو ہر وقت گھر میں آنے جانے کے عادی ہیں۔

مسئلہ:- اس میں علماء وفقہاء کا اختلاف ہے کہ یہ خاص استیذان اقارب کے لئے واجب ہے یا استحبابی حکم ہے اور یہ کہ یہ حکم اب بھی جاری ہے یا منسوخ ہو گیا۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ آیت محکم غیر منسوخ ہے اور حکم وجوب کے لئے ہے مَردوں کے واسطے بھی عورتوں کے واسطے بھی (قرطبی)۔ [۳] لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کے وجوب کی علّت اور وجہ وہ ہے جو

---

[۱] سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ ج:۱ ص:۷۷

[۲] بیان القرآن ج:۸ ص:۳۲

[۳] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۲ ص:۳۰۴

اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ان تین اوقات میں عام آدمی خلوت چاہتا ہے اور اس میں بسا اوقات اپنی بیوی کے ساتھ بھی مشغول ہوتا ہے، بعض اوقات اعضاءِ مستورہ بھی کھلے ہوتے ہیں، اگر کچھ لوگ اس کی احتیاط کر لیں کہ ان اوقات میں بھی اعضاء مستورہ کو چھپانے کی عادت ڈالیں اور بیوی سے اختلاط بھی بجز اُس صورت کے نہ کریں کہ کسی کے آنے کا احتمال نہ رہے، جیسے عموماً یہی عادت بن گئی ہے تو اس صورت میں ان پر یہ بھی واجب نہیں رہتا کہ اپنے اقارب اور بچّوں کو استیذان کا پابند کریں، اور نہ اقارب پر واجب رہتا ہے، البتہ اس کا مستحسن اور مستحب ہونا ہر حال میں ہے۔ مگر عام طور پر عمل اس پر زمانۂ دراز سے متروک سا ہو گیا ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں تو اس پر بڑی شدّت کے الفاظ استعمال فرمائے اور ایک روایت میں عمل نہ کرنے والے لوگوں کا کچھ عذر بیان کر دیا۔

پہلی روایت ابن کثیر نے بسند ابن ابی حاتم [۱] یہ نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتیں ایسی ہیں جن پر لوگوں نے عمل کو چھوڑ ہی دیا ہے۔ ایک یہی آیت استیذان یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ، جس میں اقارب اور نابالغ بچّوں کو بھی استیذان کی تعلیم ہے دوسری آیت وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی (النساء:۸) جس میں تقسیم میراث کے وقت وارثوں کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر مال وراثت تقسیم کرنے کے وقت کچھ ایسے رشتہ دار بھی موجود ہو جاویں جن کا ضابطۂ میراث سے کوئی حصہ نہیں ہے تو اُن کو بھی کچھ دیدیا کرو کہ اُن کی دل شکنی نہ ہو۔ تیسری آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات: ۱۳) ہے جس میں بتلایا ہے کہ سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور آج کل لوگ معزز و مکرم اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس پیسہ بہت ہو جس کا مکان کوٹھی بنگلہ شاندار ہو۔ بعض روایات کے الفاظ اس میں یہ بھی ہیں کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتوں کے معاملہ میں لوگوں پر شیطان غالب آ گیا ہے اور پھر فرمایا کہ میں نے تو اپنی لونڈی کو بھی اس کا پابند کر رکھا ہے کہ ان تین وقتوں میں بغیر اجازت میرے پاس نہ آیا کرے۔ [۲]

دوسری روایت ابن ابی حاتم ہی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ سے یہ منقول ہے کہ دو شخصوں نے حضرت ابنِ عباسؓ سے اس استیذانِ اقارب کے متعلق سوال کیا کہ اس پر لوگ عمل نہیں کرتے تو ابن عباسؓ نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ سَتِیْرٌ یُحِبُّ السِّتْرَ، یعنی اللہ بہت ستر رکھنے والا ہے اور ستر کی حفاظت کو پسند فرماتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت معاشرت بہت سادہ تھی نہ لوگوں کے دروازوں پر پردے تھے نہ گھر کے اندر پردہ دار مسہریاں تھیں اُس وقت کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آدمی کا نوکر یا بیٹا بیٹی اچانک آ جاتے اور یہ آدمی اپنی بیوی کے سات مشغول ہوتا، اس لئے اللہ جل شانہٗ نے ان آیات

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۵۵۸۵

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:٦ ص:٨٢

میں تین وقتوں میں استیذان کی پابندی لگادی تھی۔ اور اب چونکہ دروازوں پر پردے اور گھر میں پردہ دار مسہریاں ہونے لگیں اس لئے لوگوں نے یوں سمجھ لیا کہ بس یہ پردہ کافی ہے اب استیذان کی ضرورت نہیں (ابن کثیر نے یہ روایت نقل کرکے فرمایا ہے ھٰذَا اِسۡنَادٌ صَحِیۡحٌ اِلَی ابۡنِ عَبَّاسٍ)۔[1] بہرحال حضرت ابن عباسؓ کی اس دوسری روایت سے اتنی بات نکلتی ہے کہ جب اس طرح کے واقعات کا اندیشہ نہ ہو کہ آدمی بیوی کے ساتھ مشغول یا اعضاء مستورہ کھولے ہوئے ہو اور کسی کے آنے کا احتمال ہو ایسے حالات میں کچھ مساہلت ہے۔ لیکن:

قرآن نے پاکیزہ معاشرت کی تعلیم دی ہے

کہ کوئی کسی کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو سب آرام وراحت سے رہیں جو لوگ اس طرح کے استیذان کا گھر والوں کو پابند نہیں بناتے وہ خود تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں، اپنی ضرورت وخواہش کا کام کرنے میں تنگی برتتے ہیں۔

عورتوں کے احکام، پردہ کی تاکید اور اُس میں ایک اور استثناء

اس سے پہلے عورتوں کے حجاب اور پردہ کے احکام دو آیتوں میں مفصّل آچکے ہیں اور اُن میں دو استثنا بھی ذکر کئے گئے۔ ایک استثناء ناظر یعنی دیکھنے والے کے اعتبار سے، دوسرا استثناء منظور یعنی جس کو دیکھا جائے اُس کے اعتبار سے۔ ناظر کے اعتبار سے تو محارم کو اور اپنی مملوکہ کنیزوں نابالغ بچّوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا اور منظور یعنی جس چیز کو نظروں سے چھپانا مقصود ہے اُس کے اعتبار سے زینت ظاہرہ کو مستثنیٰ کیا گیا، جس میں اُوپر کے کپڑے برقع یا بڑی چادر باتفاق مراد ہیں اور بعض کے نزدیک عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی اس استثناء میں داخل ہیں۔

یہاں اگلی آیت میں ایک تیسرا استثناء عورت کے شخصی حال کے اعتبار سے یہ کیا گیا کہ جو عورت بڑی بوڑھی ایسی ہو جائے کہ نہ اُس کی طرف کسی کو رغبت ہو اور نہ وہ نکاح کے قابل ہو تو اُس کے لئے پردہ کے احکام میں یہ سہولت دیدی گئی ہے کہ اجانب بھی اس کے حق میں مثل محارم کے ہوجاتے ہیں۔ جن اعضاء کا چھپانا اپنے محرموں سے ضروری نہیں ہے اس بوڑھی عورت کے لئے غیر مردوں غیر محرموں سے بھی اُن کا چھپانا ضروری نہیں۔ اس لئے فرمایا:

وَالۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیۡ، الآیۃ جس کی مختصر تفسیر اوپر گزر چکی ہے مگر ایسی بڑی بوڑھی عورت کے لئے بھی ایک قید تو یہ ہے کہ جو اعضاء محرم کے سامنے کھولے جائیں یہ عورت غیر محرم کے سامنے بھی کھول سکتی ہے بشرطیکہ بن سنور کر زینت کرکے نہ بیٹھے۔ دوسری بات آخر میں یہ فرمائی وَاَنۡ یَّسۡتَعۡفِفۡنَ خَیۡرٌ لَّھُنَّ یعنی اگر وہ غیر محرموں کے سامنے آنے سے بالکل ہی بچیں تو یہ اُن کے لئے بہتر ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۸۳، ورواہ ابوداؤد فی سننہ (بألفاظ مختلفة) کتاب الأدب، باب الإستئذان في العورات الثلاث ج:۲ ص:۳۵۹

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ

نہیں ہے اندھے پر کچھ تکلیف اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار پر تکلیف

وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ

اور نہیں تکلیف تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ کے گھر سے

اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ

یا اپنی ماں کے گھر سے یا اپنے بھائی کے گھر سے یا اپنی بہن کے گھر سے

اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ

یا اپنے چچا کے گھر سے یا اپنی پھوپھی کے گھر سے یا اپنے ماموں کے گھر سے یا اپنی خالہ کے گھر سے

اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا

یا جس گھر کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے، نہیں گناہ تم پر کہ کھاؤ

جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ

آپس میں مل کر یا جدا ہوکر پھر جب کبھی جانے لگو گھروں میں تو سلام کہو اپنے لوگوں پر

تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

نیک دعا ہے اللہ کے یہاں سے برکت والی ستھری یوں کھولتا ہے اللہ تمہارے آگے اپنی باتیں

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع ۸ ۱۴

تاکہ تم سمجھ لو

آسان ترجمۂ قرآن

نہ کسی نابینا کے لئے اس میں کوئی گناہ ہے، نہ کسی پاؤں سے معذور شخص کے لئے کوئی گناہ ہے، نہ کسی بیمار شخص کے لئے کوئی گناہ ہے، اور نہ خود تمہارے لئے کہ تم اپنے گھروں سے کچھ کھالو، یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماؤں کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا اُن گھروں سے جن کی چابیاں تمہارے اختیار میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔ اس میں بھی تمہارے لئے کوئی گناہ نہیں ہے کہ سب مل کر کھاؤ، یا الگ الگ۔ چنانچہ جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، کہ یہ ملاقات کی وہ بابرکت پاکیزہ دُعا ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہے۔ اللہ اسی طرح آیتوں کو تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ (۶۱)

خلاصۂ تفسیر

(اگر تم کسی اندھے لنگڑے بیمار غریب کو اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کے گھر لے جا کر کچھ کھلا پلا دو، یا خود کھا پی لو تو جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ عزیز ملاقاتی ہمارے کھانے اور کھلانے پر راضی ہوگا اس کو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو ان صورتوں میں) نہ تو اندھے آدمی کے لئے کوئی مضائقہ ہے اور نہ لنگڑے آدمی کے لئے اور نہ بیمار آدمی کے لئے کچھ مضائقہ ہے اور نہ خود تمہارے لئے اس بات میں (کچھ مضائقہ ہے) کہ تم (خواہ خود یا تم مع اُن معذورین کے سب) اپنے گھروں سے (جن میں بی بی، اولاد کے گھر بھی آ گئے) کھانا کھالو یا (اُن گھروں میں جن کا ذکر آگے آتا ہے کھالو، یعنی نہ تم کو خود کھانے میں گناہ ہے اور نہ اُن معذورین کو کھلانے میں۔ اسی طرح تمہارے کھلا دینے سے اُن معذورین کو بھی کھا لینے میں کوئی گناہ نہیں اور وہ گھر یہ ہیں۔ مثلاً) اپنے باپ کے گھر سے (کھالو کھلا دو) یا اپنی ماؤں کے گھر سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اُن گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے (پھر اُس میں بھی) کہ سب مِل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ پھر (یہ بھی معلوم کر رکھو کہ) جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو (یعنی وہاں جو مسلمان ہوں اُن کو) سلام کر لیا کرو (جو کہ) دُعا کے طور پر (ہے اور) جو خدا کی طرف سے مقرر ہے اور (بوجہ

اس پر ثواب ملنے کے) برکت والی (اور بوجہ مخاطب کا دل خوش کرنے کے) عمدہ چیز ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے) احکام بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف و مسائل

گھروں میں داخل ہونے کے بعد کے بعض احکام اور آدابِ معاشرت

پچھلی آیتوں میں کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے استیذان کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس آیت میں وہ احکام و آداب مذکور ہیں جو اجازت ملنے پر گھر میں جانے کے بعد مستحب یا واجب ہیں۔ اس آیت کا مفہوم اور اس میں مذکورہ احکام کو سمجھنے کے لئے پہلے اُن حالات کو معلوم کر لینا مناسب ہے جن میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

قرآنِ کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام تعلیمات میں حقوق العباد کی حفاظت و رعایت کے لئے جتنی تاکیدات آئی ہیں اُن سے کوئی مسلمان بے خبر نہیں۔ کسی دوسرے کے مال میں بغیر اُس کی اجازت کے کوئی تصرف کرنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے ایسے خوش نصیب لوگوں کو چُن لیا تھا کہ وہ اللہ و رسول کے فرمان پر ہر وقت گوش برآواز رہتے اور ہر حکم کی تعمیل میں اپنی پوری توانائی صرف کرتے تھے۔ قرآنی تعلیمات پر عمل اور اُس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کیمیا اثر سے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی تھی کہ فرشتے بھی اُن پر فخر کرتے ہیں۔ دوسروں کے مال میں اُن کی مرضی و اجازت کے بغیر ادنیٰ قسم کا تصرف گوارا نہ ہونا کسی کو ادنیٰ سی تکلیف پہنچانے سے پرہیز کرنا اور اس میں تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر قائم ہونا سبھی صحابہ کا وصف تھا۔ اسی سلسلے کے چند واقعات عہدِ رسالت میں پیش آئے جن کی وجہ سے آیتِ مذکورہ کے احکام نازل ہوئے۔ حضرات مفسرین نے یہ سب واقعات لکھے ہیں۔ کسی نے اُن میں سے کسی کو شانِ نزول قرار دیا کسی نے کسی دوسرے واقعہ کو مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، یہ مجموعۂ واقعات ہی اس آیت کا شانِ نزول ہے۔ واقعات یہ ہیں:

۱- امام بغویؒ نے حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے کہ دُنیا کی عرف عام اور اکثر لوگوں کی طبائع کا حال یہ ہے کہ لنگڑے لُولے اندھے اور بیمار آدمی کے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے گھن کرتے ہیں اور ناپسند کرتے ہیں۔ حضرات صحابہ میں سے جو ایسے معذور تھے اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہم کسی کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں گے تو شاید اس کو تکلیف ہو اس لئے یہ لوگ تندرست آدمیوں کے ساتھ کھانے میں شرکت سے گریز کرنے لگے۔ نیز نابینا آدمی کو یہ بھی فکر ہوئی کہ جب چند آدمی کھانے میں شریک ہوں تو تقاضائے عدل و مروّت یہ ہے کہ کوئی شریک دوسرے سے زیادہ نہ کھائے

سب کو برابر حصہ ملے اور میں نابینا ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ نہیں کرسکتا ممکن ہے کہ میں دوسروں سے زیادہ کھالوں اس میں دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔ لنگڑے آدمی نے خیال کیا کہ عام تندرست لوگوں کی طرح بیٹھ نہیں سکتا دو آدمی کی جگہ لیتا ہوں، کھانے پر دوسروں کے ساتھ بیٹھوں گا تو ممکن ہے کہ اُن کو تنگی اور تکلیف پیش آئے، ان کی اس غایت احتیاط میں ظاہر ہے کہ خود ان کو تنگی اور تکلیف پیش آتی تھی اِس لئے یہ آیت نازل ہوئی جس میں اُن کو دوسروں کے ساتھ مل کر کھانے کی اجازت اور ایسی دقیق احتیاط کو چھوڑنے کی تلقین فرمائی جس سے تنگی میں پڑ جائیں۔ [1] اور بغوی نے بروایت ابن جریر حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسرا واقعہ نقل کیا ہے جو واقعہ مذکورہ کا دوسرا رُخ ہے وہ یہ کہ قرآنِ کریم کی جب یہ آیت نازل ہوئی لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء:۲۹) یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر۔ تو لوگوں کو اندھے، لنگڑے بیمار لوگوں کے ساتھ مل کر کھانے میں یہ تردّد پیش آنے لگا کہ بیمار تو عادۃً کم کھاتا ہے، نابینا کو کھانے کی چیزوں میں یہ امتیاز نہیں ہوتا کہ کونسی چیز عمدہ ہے لنگڑے کو اپنی نشست ہموار نہ ہونے کے سبب کھانے میں تکلّف ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ یہ لوگ کم کھائیں ہمارے پاس زیادہ آجائے تو ان کی حق تلفی ہوئی کیونکہ مشترک کھانے میں سب کا حصّہ مساوی ہونا چاہئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس تعمق اور تکلف میں پڑنے سے اُن کو آزاد کردیا گیا کہ سب مِل کر کھاؤ معمولی کمی بیشی کی فکر نہ کرو۔ [2] اور سعید بن مسیّبؒ نے فرمایا کہ مسلمان جب کسی جہاد وغزوہ کے لئے جاتے تو اپنے گھروں کی کنجیاں ان معذوروں کے سپرد کردیتے تھے اور یہ کہہ دیتے تھے کہ گھر میں جو کچھ ہے وہ تم لوگ کھاپی سکتے ہو۔ مگر یہ لوگ اس احتیاط کی بنا پر اُن کے گھروں میں سے کچھ نہ کھاتے کہ شاید اُن کی منشاء کے خلاف خرچ ہوجائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [3] مسند بزار میں بسند صحیح حضرت عائشہؓ سے بھی یہی مضمون نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ میں تشریف لے جاتے تو عام صحابہؓ کی دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ سب آپ کی رفاقت میں شریکِ جہاد ہوں اور اپنے مکانوں کی کنجیاں ان غریب معذورین کے سپرد کردیتے تھے اور اُن کو اجازت دیتے تھے کہ ہمارے پیچھے آپ ہمارے گھروں میں جو کچھ ہے کھاپی سکتے ہو مگر یہ لوگ غایت تقویٰ سے اس اندیشہ پر کہ شاید اُن کی یہ اجازت بطیبِ خاطر نہ ہو اس سے پرہیز کرتے تھے۔ [4] بغوی نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آیتِ مذکورہ میں جو لفظ صَدِيْقِكُمْ کا آیا ہے یعنی اپنے دوست کے گھر سے بھی کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ حارث بن عمروؓ کے واقعہ میں نازل ہوا کہ وہ کسی جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے اور اپنے دوست مالک بن زیدؓ کو اپنے گھر اور گھر والوں کی نگرانی سپرد کردی۔ جب حارثؓ

[1] تفسیر البغوی تحت ہذہ الآیۃ ج:۶ ص:۶۳

[2] تفسیر الطبری تحت ہذہ الآیۃ ج:۱۹ ص:۲۱۹، والبغوی ج:۶ ص:۶۲،۶۳

[3] تفسیر البغوی ج:۶ ص:۶۳،۶۴

[4] مجمع الزوائد (وقال رواہ البزار) رقم الحدیث:۱۱۲۳۸

واپس آئے تو دیکھا کہ مالک بن زیدؓ بہت ضعیف کمزور ہو رہے ہیں وجہ دریافت کرنے پر اُنہوں نے کہا کہ میں نے آپ کے گھر سے کچھ کھانا آپ کے پیچھے مناسب نہیں سمجھا (یہ سب روایات تفسیر مظہری میں ہیں)[1] اور صاف بات یہی ہے کہ اس قسم کے تمام واقعات اس آیت کے نزول کا سبب ہوئے ہیں۔

مسئلہ:- جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جن گھروں میں سے بغیر اجازت خاص کے کھانے پینے کی اجازت اس آیت میں دی گئی ہے اس کی بناء اس پر ہے کہ عرب کی عام عادت کے مطابق ایسے قریبی رشتہ داروں میں کوئی تکلف بالکل نہ تھا ایک دوسرے کے گھر سے کچھ کھاتے پیتے تو گھر والے کو کسی قسم کی تکلیف یا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ اس سے خوش ہوتا تھا۔ اسی طرح اس سے بھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی معذور بیمار مسکین کو بھی کھلا دے۔ ان سب چیزوں کی گو صراحۃً اجازت نہ دی ہو مگر عادۃً اجازت تھی اس علتِ جواز سے ثابت ہوا کہ جس زمانے یا جس مقام میں ایسا رواج نہ ہو اور مالک کی اجازت مشکوک ہو وہاں بغیر صریح اجازت مالک کے کھانا پینا حرام ہے۔ جیسا کہ آج کل عام طور پر نہ یہ عادت رہی نہ کوئی اس کو گوارہ کرتا ہے کہ کوئی عزیز قریب اُن کے گھر میں جو چاہے کھائے پیئے یا دوسروں کو کھلائے پلائے۔ اس لئے آج کل عام طور پر اس اجازت پر عمل کرنا جائز نہیں بجز اس کے کہ کسی دوست عزیز کے متعلق کسی کو یقینی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس کے کھانے پینے یا دوسروں کو کھلانے پلانے سے کوئی تکلیف یا ناگواری محسوس نہ کرے گا بلکہ خوش ہوگا تو خاص اس کے گھر سے کھانے پینے میں اس آیت کے مقتضیٰ پر عمل جائز ہے۔

مسئلہ:- مذکورہ بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا بلکہ حکم اوّل سے آج تک جاری ہے البتہ شرط اس کی مالک کی اجازت کا یقین ہے جب یہ نہ ہو تو وہ مقتضائے آیت میں داخل ہی نہیں۔ (مظہری)[2]

مسئلہ:- اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ حکم صرف ان مخصوص رشتہ داروں ہی میں منحصر نہیں بلکہ دوسرے شخص کے بارے میں اگر یہ یقین ہو کہ اُس کی طرف سے ہمارے کھانے پینے اور کھلانے پلانے کی اجازت ہے وہ اس سے خوش ہوگا اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی تو اس کا بھی یہی حکم ہے (مظہری)[3] احکام مذکورہ کا تعلق اُن کاموں سے ہے جو کسی کے گھر میں باجازت داخل ہونے کے بعد جائز یا مستحب ہیں ان کاموں میں بڑا مسئلہ کھانے پینے کا تھا اُس کو پہلے ذکر فرما دیا۔

دوسرا مسئلہ:- گھر میں داخل ہونے کے آداب کا یہ ہے کہ جب گھر میں باجازت داخل ہو تو گھر میں جو مسلمان

[1] تفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:٦ ص:٥٦١، والبغوی ج:٦ ص:٦٥، والدر المنثور ج:٧ ص:٣٢٤

[2] [3] تفسیر المظهری ج:٦ ص:٥٦٢

ہوں اُن کو سلام کرو۔ آیت عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ سے یہی مراد ہے کیونکہ مسلمان سب ایک جماعت متحدہ ہیں۔ احادیث کثیرہ صحیحہ میں مسلمان کے باہم ایک دوسرے کو سلام کرنے کی بڑی تاکید اور فضیلت آئی ہے۔ [۱]

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ

ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے ہیں اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جب ہوتے ہیں اس کے ساتھ

عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ

کسی جمع ہونے کے کام میں تو چلے نہیں جاتے جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں، جو لوگ تجھ سے اجازت لیتے ہیں

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ

وہی ہیں جو مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو پھر جب اجازت مانگیں تجھ سے اپنے کسی

شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

کام کے لئے تو اجازت دے جس کو ان میں سے تو چاہے اور معافی مانگ اُن کے واسطے اللہ سے، اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ

مہربان ہے مت کرلو بُلانا رسول کا اپنے اندر برابر اُس کے جو بُلاتا ہے تم میں ایک دوسرے کو

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ

اللہ جانتا ہے اُن لوگوں کو تم میں سے جو سٹک جاتے ہیں آنکھ بچاکر سو ڈرتے رہیں وہ لوگ

يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

جو خلاف کرتے ہیں اُس کے حکم کا اس سے کہ آپڑے اُن پر کچھ خرابی یا پہنچے اُن کو عذاب دردناک

[۱] ان احادیث کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، ابواب السلام۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ ؕ

سنتے ہو اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اُس کو معلوم ہے جس حال پر تم ہو

وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۶۴﴾ ع ۹ / ۱۵

اور جس دن پھیرے جائیں گے اُس کی طرف تو بتائے گا اُن کو جو کچھ اُنہوں نے کیا، اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

مؤمن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول کو دِل سے مانتے ہیں، اور جب رسول کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں شریک ہوتے ہیں تو اُن سے اجازت لئے بغیر کہیں نہیں جاتے۔ (اے پیغمبر!) جو لوگ تم سے اجازت لیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول کو دِل سے مانتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے کسی کام کے لئے تم سے اجازت مانگیں تو اُن میں سے جن کو چاہو، اجازت دے دیا کرو، اور اُن کے لئے اللہ سے مغفرت کی دُعا کیا کرو۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۶۲﴾ (اے لوگو!) اپنے درمیان رسول کے بلانے کو ایسا (معمولی) نہ سمجھو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلالیا کرتے ہو۔ اللہ تم میں سے اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لے کر چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ اُس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اُن کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں اُن پر کوئی آفت نہ آپڑے، یا اُنہیں کوئی دردناک عذاب نہ آپکڑے۔ ﴿۶۳﴾ یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ ہی کا ہے۔ تم جس حالت پر بھی ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے، اور جس دن سب کو اُس کے پاس لوٹایا جائے گا، اُس دن وہ اُن کو بتادے گا کہ انہوں نے کیا عمل کیا تھا، اور اللہ کو ہر بات کا پورا پورا علم ہے۔ ﴿۶۴﴾

خلاصۂ تفسیر

بس مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسول کے پاس کسی ایسے کام پر جمع ہوتے ہیں جس کے لئے مجمع کیا گیا ہے (اور اتفاقاً وہاں سے کہیں جانے کی ضرورت پڑتی ہے) تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں (اور آپ اس پر اجازت نہ دیدیں مجلس سے اُٹھ کر) نہیں جاتے (اے پیغمبر) جو لوگ آپ سے

(ایسے مواقع پر) اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں (آگے ایسے لوگوں کو اجازت دینے کا بیان ہے) تو جب یہ (اہلِ ایمان) لوگ (ایسے مواقع پر) اپنے کسی کام کے لئے آپ سے (جانے کی) اجازت طلب کریں تو ان میں آپ جس کے لئے (مناسب سمجھیں اور اجازت دینا) چاہیں اجازت دیدیا کریں (اور جس کو مناسب نہ سمجھیں اجازت نہ دیں۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اجازت طلب کرنے والے اُس کام کو ضروری سمجھتے ہوں جس کے لئے اجازت طلب کر رہے ہیں اور وہ واقع میں ضروری نہ ہو یا ضروری بھی ہو مگر اس کے جانے سے اُس سے بڑا کوئی ضرر پیدا ہونے کا خطرہ ہو اس لئے اجازت وعدم اجازت کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا) اور (اجازت دے کر بھی) آپ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دُعا کیا کیجئے (کیونکہ اُن کا یہ رخصت چاہنا اگرچہ قوی عذر ہی کی وجہ سے ہو مگر اُس میں دُنیا کو دین پر مقدم رکھنے کی صورت تو لازم آتی ہے جس میں ایک کوتاہی کا شائبہ ہے اس کے لئے آپ کی دُعائے مغفرت درکار رہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اجازت چاہنے والے نے جس عذر وضرورت کو قوی سمجھ کر اجازت لی ہے اُس میں اُس سے خطاء اجتہادی ہوگئی ہو کہ غیر ضروری کو ضروری سمجھ لیا اور یہ خطاء اجتہادی ایسی ہو کہ ذرا غور وتامل سے رفع ہوسکتی ہو تو ایسی صورت میں غور وفکر کی کمی بھی ایک کوتاہی ہے اس سے استغفار کی ضرورت ہوئی۔) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (چونکہ اُن کی نیت اچھی تھی اس لئے ایسے دقائق پر مواخذہ نہیں فرماتا) تم لوگ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بلانے کو (جب وہ کسی اسلامی ضرورت کے لئے تم کو جمع کریں) ایسا (معمولی بُلانا) مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بُلا لیتا ہے (کہ چاہے آیا یا نہ آیا پھر آ کر بھی جب تک چاہا بیٹھا جب چاہا اُٹھ کر بے اجازت چل دیا۔ رسول کا بُلانا ایسا نہیں بلکہ اُن کے اس حکم کی تعمیل واجب ہے اور بے اجازت واپس جانا حرام اور اگر کوئی بِلا اجازت چلا گیا تو یہ تو ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کا جانا مخفی رہ جائے لیکن یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسرے کی) آڑ میں ہو کر تم میں سے (مجلسِ نبوی سے) کھسک جاتے ہیں تو جو لوگ اللہ کے حکم کی (جو بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہنچا ہے) مخالفت کرتے ہیں اُن کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ ان پر (دُنیا میں) کوئی آفت آن پڑے یا اُن پر (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے (اور یہ بھی ممکن ہے کہ دُنیا و آخرت دونوں میں عذاب ہو اور یہ بھی) یاد رکھو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اللہ تعالیٰ اُس حالت کو بھی جانتا ہے جس پر تم (اب) ہو اور اُس دن کو بھی جس میں سب اُس کے پاس (دوبارہ زندہ کر کے) لائے جائیں گے تو وہ اُن کو سب جتلا دے گا جو کچھ اُنہوں نے کیا تھا (اور تمہاری موجودہ حالت اور روزِ قیامت ہی کی کچھ تخصیص نہیں) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے خصوصاً اور عام معاشرت کے بعض آداب و احکام

آیاتِ مذکور میں دو حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کسی دینی جہاد وغیرہ کے لئے جمع کریں تو مقتضائے ایمان یہ ہے کہ سب جمع ہو جائیں اور پھر آپ کی مجلس سے بغیر آپ کی اجازت کے نہ جائیں۔ کوئی ضرورت پیش آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرلیں اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہے کہ کوئی خاص حرج اور ضرورت نہ ہو تو اجازت دیدیا کریں۔ اسی ضمن میں اُن منافقین کی مذمت ہے جو اس تقاضائے ایمان کے خلاف بدنامی سے بچنے کے لئے حاضر تو ہو جاتے ہیں مگر پھر کسی کی آڑ لے کر چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

یہ آیت غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مشرکین عرب اور دوسری جماعتوں کے متحدہ محاذ نے یکبارگی مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بمشورہ صحابہ اُن کے حملے سے بچاؤ کے لئے خندق کھودی تھی اسی لئے اس جہاد کو غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ یہ غزوہ شوال ۵ھ ہجری میں ہوا ہے۔ (قرطبی) [1]

بیہقی اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ اس وقت رسول اللہ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اور تمام صحابہ خندق کھودنے میں مصروفِ کار تھے مگر منافقین اول تو آنے میں سستی کرتے اور پھر آ کر بھی معمولی سا کام دکھانے کو کر لیتے اور پھر چپکے سے غائب ہو جاتے تھے۔ اس کے خلاف مؤمنین سب کے سب محنت کے ساتھ لگے رہتے اور کوئی مجبوری اور ضرورت پیش آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر جاتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (مظہری) [2]

ایک سوال و جواب

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے بغیر آپ کی اجازت کے چلے جانا حرام ہے حالانکہ صحابہ کرام کے بیشمار واقعات ہیں جن میں وہ آپ کی مجلس میں ہوتے اور پھر جب چاہتے چلے جاتے تھے اجازت لینا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ جواب یہ ہے کہ یہ عام مجلسوں کا حکم نہیں بلکہ اس وقت کا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی ضرورت سے جمع کیا ہو جیسا کہ واقعہ خندق میں ہوا تھا۔ اس تخصیص کی طرف خود آیت کے لفظ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ میں اشارہ موجود ہے۔

[1] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۱۲ ص:۳۲۱

[2] تفسير المظهري ج:۶ ص:۵۲۵، ۵۲۶، ودلائل النبوة للبيهقيّ، باب تخريب الأحزاب إلخ، رقم الحديث:۱۲۹۳

اَمْرٍ جَامِعٍ سے کیا مراد ہے؟

اس میں اقوال مختلف ہیں مگر واضح بات یہ ہے کہ اَمْرٍ جَامِعٍ سے مراد وہ کام ہے جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو جمع کرنا ضروری سمجھیں اور کسی خاص کام کے لئے جمع فرمادیں جیسے غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے کا کام تھا۔ (قرطبی، مظہری) [۱]

یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص ہے یا عام؟

باتفاق فقہاء چونکہ یہ حکم ایک دینی اور اسلامی ضرورت کے لئے جاری کیا گیا ہے اور ایسی ضرورتیں ہر زمانے میں ہوسکتی ہیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر امام وامیر جس کے قبضہ میں زمامِ حکومت ہو اُس کا اور اس کی ایسی مجلس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ سب کو جمع ہونے کا حکم دیں تو اس کی تعمیل واجب اور واپس جانا بغیر اجازت ناجائز ہے (قرطبی، مظہری، بیان القرآن) [۲] اور یہ ظاہر ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کی مجلس کے لئے یہ حکم زیادہ مؤکد اور اس کی مخالفت کھلی شقاوت ہے جیسے منافقین سے صادر ہوئی۔ اور اسلامی آدابِ معاشرت کے لحاظ سے یہ حکم باہمی اجتماعات اور عام مجلسوں کے لئے بھی کم از کم مستحب اور مستحسن ضرور ہے کہ جب مسلمان کسی مجلس میں کسی اجتماعی معاملہ میں غور کرنے یا عمل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہوں تو جب جانا ہو میر مجلس سے اجازت لے کر جائیں۔

دوسرا حکم آخری آیت میں یہ دیا گیا ہے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ الآیۃ اس کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر میں بیان کی گئی ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو بلانا ہے (جو نحوی قاعدہ سے اضافت الی الفاعل ہے) اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو بلائیں تو اس کو عام لوگوں کے بُلانے کی طرح نہ سمجھو کہ اُس میں آنے نہ آنے کا اختیار رہتا ہے بلکہ اس وقت آنا فرض ہوجاتا ہے اور بغیر اجازت جانا حرام ہوجاتا ہے۔ آیت کے سیاق وسباق سے یہ تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی ہے اسی لئے مظہری اور بیان القرآن میں اس کو اختیار کیا ہے۔ [۳] اور اس کی ایک دوسری تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ابن کثیر اور قرطبی وغیرہ نے یہ نقل کی ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد لوگوں کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کام کے لئے پکارنا اور بُلانا ہے [۴] (جو نحوی ترکیب میں اضافت الی المفعول ہوگی)۔

---

[۱] تفسیر المظہری ج:۶ ص:۵۶۶، والقرطبی ج:۱۲ ص:۳۲۰

[۲] القرطبی ج:۱۲ ص:۳۲۰، والمظہری ج:۶ ص:۵۶۷، وبیان القرآن ج:۸ ص:۳۸

[۳] المظہری ج:۶ ص:۵۶۷

[۴] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۸۹، وتفسیر القرطبی ج:۱۲ ص:۳۲۲

اس تفسیر کی بناء پر معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ضرورت سے بُلاؤ یا مخاطب کرو تو عام لوگوں کی طرح آپ کا نام لے کر "یا محمد!" نہ کہو کہ بے ادبی ہے بلکہ تعظیمی القاب کے ساتھ "یا رسول اللہ!" "یا نبی اللہ!" وغیرہ کہا کرو۔ اس کا حاصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کا مسلمانوں پر واجب ہونا اور ہر ایسی چیز سے بچنا ہے جو ادب کے خلاف ہو یا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے۔ یہ حکم ایسا ہوگا جیسے سورۂ حجرات میں اسی طرح کے کئی حکم دیئے گئے ہیں مثلاً [1] وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ (الحجرات:۲) یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو تو ادب کی رعایت رکھو، ضرورت سے زیادہ اونچی آواز سے باتیں نہ کرو جیسے لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور مثلاً یہ کہ جب آپ گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر سے آواز دے کر نہ بلاؤ بلکہ آپ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرو [2] اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ (الحجرات:۴) میں اسی کا بیان ہے۔

تنبیہ

اس دوسری تفسیر میں ایک عام ادب بزرگوں اور بڑوں کا بھی معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں بڑوں کو اُن کا نام لے کر پکارنا اور بُلانا بے ادبی ہے تعظیمی لقب سے مخاطب کرنا چاہئے۔

***

[1] ترجمہ: نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولتے ہو۔

[2] ترجمہ: بے شک جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں۔

سورة الفرقان

آیاتہا ۷۷ — ۲۵ سورۃ الفرقان مکیۃ ۴۲ — رکوعاتہا ۶

سورۂ فرقان مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ ①

بڑی برکت ہے اُس کی جس نے اُتاری فیصلہ کی کتاب اپنے بندہ پر تاکہ رہے جہان والوں کے لئے ڈرانے والا

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ

وہ کہ جس کی ہے سلطنت آسمان اور زمین میں اور نہیں پکڑا اُس نے بیٹا اور نہیں کوئی اس کا

شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ② وَاتَّخَذُوْا

ساجھی سلطنت میں اور بنائی ہر چیز پھر ٹھیک کیا اُس کو ماپ کر اور لوگوں نے پکڑ رکھے ہیں

مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ

اس سے ورے کتنے حاکم جو نہیں بناتے کچھ چیز اور وہ خود بنائے گئے ہیں اور نہیں مالک اپنے حق میں

ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾

بُرے کے اور نہ بھلے کے اور نہیں مالک مرنے کے اور نہ جینے کے اور نہ جی اُٹھنے کے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

بڑی شان ہے اُس ذات کی جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کا فیصلہ کر دینے والی یہ کتاب نازل کی، تاکہ وہ دُنیا جہان کے لوگوں کو خبردار کر دے۔ ﴿۱﴾ وہ ذات جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کی تنہا مالک ہے اور جس نے نہ تو کوئی بیٹا بنایا ہے، اور نہ اُس کی بادشاہت میں کوئی شریک ہے، اور جس نے ہر چیز کو پیدا کر کے اُس کو ایک نپا تلا انداز عطا کیا ہے۔ ﴿۲﴾ اور لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے خدا بنا رکھے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، اور جن کا خود اپنے نقصان یا فائدے پر بھی کوئی بس نہیں چلتا، اور نہ کسی کا مرنا یا جینا اُن کے اختیار میں ہے، نہ کسی کو دوبارہ زندہ کرنا۔ ﴿۳﴾

خلاصۂ تفسیر

بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے خاص بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی تاکہ وہ تمام دُنیا جہان والوں کے لئے (ایمان نہ لانے کی صورت میں عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والا ہو، ایسی ذات جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت حاصل ہے اور اس نے کسی کو (اپنی) اولاد قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اُس کا شریک ہے حکومت میں اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا (کہ کسی چیز کے آثار و خواص کچھ ہیں کسی کے کچھ ہیں) اور ان مشرکین نے خدا کو چھوڑ کر اور ایسے معبود قرار دے لئے ہیں جو (کسی طرح معبود ہونے کے قابل نہیں کیونکہ وہ) کسی چیز کے خالق نہیں اور بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور خود اپنے لئے نہ کسی نقصان (کے رفع کرنے) کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور نہ کسی کے مرنے کا اختیار رکھتے ہیں (کہ کسی جاندار کی جان نکال سکیں) اور نہ کسی

کے جینے کا (اختیار رکھتے ہیں کہ کسی بے جان میں جان ڈال دیں) اور نہ کسی کو (قیامت میں) دوبارہ زندہ کرنے کا (اختیار رکھتے ہیں۔ اور جو شخص ان چیزوں پر قدرت نہیں رکھتا وہ معبود نہیں ہوسکتا)۔

معارف و مسائل

خصوصیات سُورت

یہ پوری سورت جمہور مفسرین کے نزدیک مکی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ وقتادہ نے تین آیتوں کے متعلق بیان فرمایا کہ یہ مکی نہیں، مدنی ہیں۔ باقی سورت مکی ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے اور اس میں کچھ آیات مکی ہیں (قرطبی) [1] اور خلاصہ اس سورت کے مضامین کا قرآنِ کریم کی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورسالت کی حقانیت کا بیان اور دشمنوں کی طرف سے اس پر جو اعتراضات تھے اُن کا جواب ہے۔

تَبٰرَكَ، برکت سے مشتق ہے، برکت کے معنے خیر کی کثرت کے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر خیر وبرکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ فرقان، قرآن کریم کا لقب ہے لغوی معنے اس کے تمیز اور فرق کرنے کے ہیں۔ قرآن چونکہ اپنے واضح ارشادات کے ذریعہ حق و باطل میں تمیز اور فرق بتلاتا ہے اور معجزہ کے ذریعہ اہلِ حق واہلِ باطل میں امتیاز کر دیتا ہے اس لئے اس کو فرقان کہا جاتا ہے۔

لِلْعٰلَمِيْنَ، اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوّت سارے عالم کے لئے ہے بخلاف پچھلے انبیاء کے کہ اُن کی نبوّت ورسالت کسی مخصوص جماعت یا مخصوص مقام کے لئے ہوتی تھی۔ صحیح مسلم کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے چھ خصوصی فضائل کا ذکر فرمایا ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت سارے جہان کے لئے عام ہے۔ [2]

فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ② تخلیق کے بعد تقدیر کا ذکر فرمایا گیا۔ تخلیق کے معنی تو اتنے ہیں کہ بغیر کسی سابق مادّہ وغیرہ کے ایک چیز کو عدم سے وجود میں لایا جائے وہ کیسی بھی ہو۔

مخلوقات میں سے ہر ایک چیز میں خاص خاص حکمتیں

اور تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو بھی پیدا فرمایا اس کے اجزاء کی ساخت اور شکل وصورت اور آثار وخواص بڑی

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۳ ص:۱

[2] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، ج:۱ ص:۱۹۹

حکمت کے ساتھ اُس کام کے مناسب پیدا کئے جس کام کے لئے اس چیز کو پیدا کیا گیا ہے۔ آسمان کی ساخت اُس کے اجزاء ترکیبی اُس کی ہیئت اُس کام کے مناسب ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان بنایا ہے۔ سیّاروں اور ستاروں کی تخلیق میں وہ چیزیں رکھی گئیں جو اُن کے منشاء وجود کے مناسب ہیں۔ زمین اور اس کے پیٹ میں پیدا ہونے والی ہر چیز جس پر نظر ڈالو ہر ایک کی ساخت، شکل وصورت، نرمی، سختی اُس کام کے مناسب بنائی گئی ہے جس کام کے لئے قدرت نے اس کو پیدا کیا ہے۔ زمین کو نہ اتنا رقیق مادّہ پانی کی طرح بنایا کہ جو کچھ اُس پر رکھا جائے وہ اس کے اندر ڈوب جائے، نہ اتنا سخت پتھر اور لوہے کی طرح بنایا کہ اس کو کھود نہ سکیں کیونکہ اُس سے یہی ضرورتیں متعلق تھیں کہ اس کو کھود کر پانی بھی نکالا جا سکے۔ اِس میں بنادیں کھود کر بڑی اُونچی عمارتیں اِس پر کھڑی کی جاسکیں۔ پانی کو سیّال بنایا جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں۔ ہوا بھی سیّال ہی ہے مگر پانی سے مختلف، پانی ہر جگہ خود بخود نہیں پہنچتا اُس میں انسان کو کچھ محنت بھی کرنا پڑتی ہے ہوا کو قدرت نے اپنا جبری انعام بنایا کہ وہ بغیر کسی محنت وعمل کے ہر جگہ پہنچ جاتی ہے بلکہ کوئی شخص ہوا سے بچنا چاہے تو اُس کو اس کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ جگہ مخلوقاتِ الٰہیہ کی حکمتوں کی تفصیل بیان کرنے کی نہیں۔ ایک ایک مخلوق کو دیکھوان میں سے ہر ایک قدرت وحکمت کا شاہکار ہے۔ امامِ غزالیؒ نے اپنی ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی ہے بنام الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ۔

ان آیات میں شروع ہی سے قرآن کی عظمت اور جس ذاتِ گرامی پر وہ نازل ہوا ہے اُس کو عبدہ کا خطاب دے کر اُس کی عزّت وعظمت کا عجیب وغریب بیان ہے۔ کیونکہ کسی مخلوق کے لئے اس سے بڑا کوئی شرف نہیں ہوسکتا کہ خالق اُس کو یہ کہدے کہ یہ میرا ہے ؎

بندہ حسن بصد زباں گفت کہ بندۂ توام — تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی [۱]

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ

اور کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں ہے یہ مگر طوفان باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے اُس کا اس میں

قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ۚ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ

اور لوگوں نے سو آگئے بے انصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے یہ نقلیں ہیں پہلوں کی

معانقۃ ۱۰

[۱] ترجمہ: تیرا بندہ حسن اپنی زبان سے سو بار کہتا ہے کہ میرے تیرا بندہ ہوں تو بھی اپنی زبان سے بتادے کہ تو کس پر احسان کرتا ہے۔

اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ

جن کو اُس نے لکھ رکھا ہے سو وہ ہی لکھوائی جاتی ہیں اس کے پاس صبح اور شام تو کہہ اس کو اُتارا ہے اُس نے جو جانتا ہے

السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۶ وَقَالُوْا

چھپے ہوئے بھید آسمانوں میں اور زمین میں بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے اور کہنے لگے

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ

یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا اور پھرتا ہے بازاروں میں کیوں نہ اُترا

اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝۷ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ

اُس کی طرف کوئی فرشتہ کہ رہتا اس کے ساتھ ڈرانے کو یا آپڑتا اس کے پاس خزانہ یا ہو جاتا اس کے لئے ایک باغ

يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۸

کہ کھایا کرتا اس میں سے، اور کہنے لگے بے انصاف تم پیروی کرتے ہو اس ایک مرد جادو مارے کی

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۹ ع

دیکھ کیسی بٹھلاتے ہیں تجھ پر مثلیں سو بہک گئے اب پا نہیں سکتے راستہ

ع ۱۶

آسان ترجمۂ قرآن

اور جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ''یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں، بس ایک من گھڑت چیز ہے جو اس شخص نے گھڑلی ہے، اور اس کام میں کچھ اور لوگ بھی اس کے مددگار بنے ہیں۔'' اس طرح (یہ بات کہہ کر) یہ لوگ بڑے ظلم اور کھلے جھوٹ پر اُتر آئے ہیں۔ ۝۴ اور کہتے ہیں کہ: ''یہ تو پچھلے لوگوں کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں جو اس شخص نے لکھوالی ہیں، اور صبح وشام وہی اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔'' ۝۵ کہہ دو کہ: ''یہ کلام تو اُس (اللہ) نے نازل کیا

ہے جو ہر بھید کو پوری طرح جانتا ہے، آسمانوں میں بھی، زمین میں بھی۔ بیشک وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔'' ⑥ اور یہ کہتے ہیں کہ: ''یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے، اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے؟ اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا؟ ⑦ یا اس کے اُوپر کوئی خزانہ ہی آپڑتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس میں سے یہ کھایا کرتا۔'' اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ: ''تم جس کے پیچھے چل رہے ہو، وہ اور کچھ نہیں، بس ایک شخص ہے جس پر جادو ہوگیا ہے۔'' ⑧ (اے پیغمبر!) دیکھو ان لوگوں نے تمہارے بارے میں کیسی کیسی باتیں بنائی ہیں، چنانچہ ایسے بھٹکے ہیں کہ راستے پر آنا ان کے بس سے باہر ہے۔ ⑨

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ (قرآن کے بارے میں) یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں نرا جھوٹ (ہی جھوٹ) ہے جس کو اس شخص (یعنی پیغمبر) نے گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس (گھڑت) میں اس کی مدد کی ہے (مراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو مسلمان ہوگئے تھے یا آپ کی خدمت میں ویسے ہی حاضر ہوا کرتے تھے) سو (ایسی بات کہنے سے) یہ لوگ بڑے ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (اس کا ظلم اور جھوٹ ہونا آگے بیان میں آئے گا) اور یہ (کافر) لوگ (اپنے اسی اعتراض کی تائید میں) یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) بے سند باتیں ہیں جو اگلے لوگوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں جن کو اس شخص (پیغمبر) نے (عمدہ عبارت میں سوچ سوچ کر اپنے صحابہ کے ہاتھ سے) لکھوالیا ہے (تاکہ محفوظ رہے) پھر وہی (مضامین) اس کو صبح وشام پڑھ کر سُنائے جاتے ہیں (تاکہ یاد رہیں، پھر وہی یاد کیئے ہوئے مضامین مجمع میں بیان کر کے خدا کی طرف منسوب کردیئے جاتے ہیں) آپ (اس کے جواب میں) کہہ دیجئے کہ اس (قرآن) کو تو اُس ذات (پاک) نے اُتارا ہے جس کو سب چھپی باتوں کی خواہ وہ آسمانوں میں ہوں یا زمین میں ہوں خبر ہے (خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ اس کلام کا اعجاز اس کی کھلی دلیل ہے کہ کفّار کا یہ اعتراض غلط اور جھوٹ اور ظلم ہے کیونکہ اگر قرآن اساطیر الاوّلین، یعنی پُرانے لوگوں کی کہانیاں ہوتا یا کسی دوسرے کی مدد سے تصنیف کیا گیا ہوتا تو ساری دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز کیوں ہوتی) واقعی اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے (اس لئے ایسے ایسے جھوٹ اور ظلم پر فوری سزا نہیں دیتا)۔

اور یہ کافر لوگ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا (بھی) کھاتا ہے اور (انتظامِ معاش کے لئے ہماری ہی طرح) بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (مطلب یہ ہے کہ رسول وپیغمبر انسان کے بجائے فرشتہ ہونا چاہئے جو کھانے پینے وغیرہ کی ضروریات سے مستغنی ہو اور کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہئے کہ رسول اگر خود فرشتہ نہیں ہے تو اس کا مصاحب ومشیر کوئی فرشتہ ہونا چاہئے اس لئے کہا کہ) اس (رسول) کے پاس

کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر (لوگوں کو عذابِ الٰہی سے) ڈراتا (اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم رسول کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات سے تو بے فکری ہوتی اس طرح) کہ اس کے پاس (غیب سے) کوئی خزانہ آپڑتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھایا (پیا) کرتا۔ اور (مسلمانوں سے یہ ظالم یوں (بھی) کہتے ہیں کہ (جب ان کے پاس نہ کوئی فرشتہ ہے نہ خزانہ نہ باغ، اور پھر بھی یہ نبوّت کا دعویٰ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عقل میں فتور ہے اس لئے) تم لوگ ایک مسلوب العقل آدمی کی راہ پر چل رہے ہو۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسی عجیب عجیب باتیں بیان کر رہے ہیں سو (ان خرافات سے) وہ (بالکل) گمراہ ہوگئے پھر وہ راہ نہیں پا سکتے۔

معارف ومسائل

کفار ومشرکین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور قرآن پر اعتراضات کیا کرتے تھے یہاں سے اُن کے اعتراضات اور پھر جوابات کا سلسلہ شروع ہوکر کچھ دُور تک چلا ہے۔

پہلا اعتراض یہ تھا کہ قرآن کوئی اللہ کی طرف سے نازل کیا ہوا کلام نہیں بلکہ آپ نے اس کو خود ہی جھوٹ گھڑ لیا ہے یا پچھلے لوگوں کے قصّے یہود ونصاریٰ وغیرہ سے سُن کر اپنے صحابہؓ سے لکھوا لیتے ہیں اور چونکہ خود اُمّی ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا اس لئے ان لکھے ہوئے قصوں کو صبح شام سنتے رہتے ہیں تاکہ وہ یاد ہو جائیں پھر لوگوں کے سامنے جا کر یہ کہہ دیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

اس اعتراض کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ کلام خود اس کا شاہد ہے کہ اس کی نازل کرنے والی وہ ذات پاک حق تعالیٰ کی ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب خفیہ رازوں سے واقف وباخبر ہے۔ اسی لئے قرآن کو ایک کلام معجز بنایا اور ساری دُنیا کو چیلنج کیا کہ اگر اس کو تم خدا کا کلام نہیں مانتے کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک سورۃ بلکہ ایک آیت ہی بنا کر دکھلا دو۔ اور یہ چیلنج جس کا جواب دینا عرب کے فصیح وبلیغ لوگوں کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں مگر اُنہوں نے اس سے راہِ فرار اختیار کی۔ کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ قرآن کی ایک آیت کے مقابلہ میں اُس جیسی دوسری آیت لکھ لائے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنا مال ومتاع بلکہ اپنی اولاد اور اپنی جان تک خرچ کرنے کو تیار ہو گئے۔ یہ مختصر سی بات نہ کر سکے کہ قرآن کی مثل ایک سورت لکھ لاتے یہ دلیل واضح اس امر کی ہے کہ یہ کلام کسی انسان کا نہیں، ورنہ دوسرے انسان بھی ایسا کلام لکھ سکتے، صرف اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہی کا ہے۔ علاوہ فصاحت وبلاغت کے اس کے تمام معانی ومضامین بھی ایسے علوم پر مشتمل ہیں جو اُس ذات کی طرف سے ہو سکتے ہیں جو ہر ظاہر وباطن کا جاننے والا ہے (اس مضمون کی پوری تفصیل

سورۂ بقرہ میں اعجازِ قرآن پر مکمل بحث کی صورت میں بیان ہو چکی ہے اس کو معارف القرآن جلد اوّل میں دیکھ سکتے ہیں)۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ رسول ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں بلکہ فرشتوں کی طرح کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی اور الگ ہوتے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم ان کے پاس اللہ کی طرف سے اتنا خزانہ یا باغات ہوتے کہ ان کو اپنے معاش کی فکر نہ کرنا پڑتی، بازاروں میں چلنا پھرنا نہ پڑتا۔ اس کے علاوہ ان اک اللہ کی طرف سے رسول ہونا ہم کیسے مان لیں کہ اوّل تو یہ فرشتہ نہیں، دوسرے کوئی فرشتہ بھی ان کے ساتھ نہیں رہتا جو ان کے ساتھ اُن کے کلام کی تصدیق کیا کرتا، اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس سے ان کا دماغ چل گیا اور یہ ایسی بے سروپا باتیں کہتے ہیں۔ اس کا اجمالی جواب تو اس آیت میں یہ دیا گیا، اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾ یعنی دیکھو تو یہ لوگ آپ کی شان میں کیسی کیسی عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب گمراہ ہو گئے اور اب ان کو راہ ملنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ تفصیلی جواب اگلی آیات میں آیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

بڑی برکت ہے اُس کو جو چاہے تو کر دے تیرے واسطے اس سے بہتر باغ کہ نیچے بہتی ہیں اُن کے

الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا

نہریں اور کر دے تیرے واسطے محل کچھ نہیں وہ جھٹلاتے ہیں قیامت کو اور ہم نے تیار کی ہے

لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾ ۚ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا

اس کے واسطے کہ جھٹلاتا ہے قیامت کو آگ، جب وہ دیکھے گی ان کو دُور کی جگہ سے سنیں گے اس کا

تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ

جھنجھلانا اور چلّانا اور جب ڈالے جائیں گے اس کے اندر ایک جگہ تنگ میں ایک زنجیر میں کئی بندھے ہوئے پکاریں گے اُس جگہ

ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ ۭ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾

موت کو مت پکارو آج ایک مرنے کو اور پکارو بہت سے مرنے کو

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً

تو کہہ بھلا یہ چیز بہتر ہے یا باغ ہمیشہ رہنے کا جس کا وعدہ ہوچکا پرہیزگاروں سے وہ ہوگا ان کا بدلہ

وَّمَصِيْرًا ۝۱۵ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ

اور پھر جانے کی جگہ اُن کے واسطے وہاں ہے جو وہ چاہیں رہا کریں ہمیشہ ہوچکا تیرے ربّ کے ذمہ

وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ۝۱۶ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ

وعدہ مانگا ملتا اور جس دن جمع کر بُلائے گا اُن کو اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے پھر اُن سے کہے گا

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝۱۷ۭ قَالُوْا

کیا تم نے بہکایا میرے ان بندوں کو یا وہ آپ بہکے راہ سے بولیں گے

سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنْ

تو پاک ہے ہم سے بن نہ آتا تھا کہ پکڑلیں کسی کو تیرے بغیر رفیق لیکن

مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰي نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ۝۱۸

تو اُن کو فائدہ پہنچاتا رہا اور ان کے باپ دادوں کو یہاں تک کہ بھلا بیٹھے تیری یاد اور یہ تھے لوگ تباہ ہونے والے،

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ

سو وہ تو جھٹلا چکے تم کو تمہاری بات میں اب نہ تم لوٹا سکتے ہو اور نہ مدد کرسکتے ہو

وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ۝۱۹ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ

اور جو کوئی تم میں گنہگار ہے اُس کو ہم چکھائیں گے بڑا عذاب اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے

مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ

رسول سب کھاتے تھے کھانا اور پھرتے تھے بازاروں میں

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۱ ۷

اور ہم نے رکھا ہے تم میں ایک دوسرے کے جانچنے کو، دیکھیں ثابت بھی رہتے ہو اور تیرا ربّ سب کچھ دیکھتا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

بڑی شان ہے اُس (اللہ) کی جو اگر چاہے تو تمہیں ان سب سے کہیں بہتر چیز، (ایک باغ کے بجائے) بہت سے باغات دیدے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور تمہیں بہت سے محلات کا مالک بنا دے۔ ﴿۱۰﴾ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے قیامت کی گھڑی کو جھٹلایا ہوا ہے، اور جو کوئی قیامت کی گھڑی کو جھٹلائے، اُس کے لئے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ﴿۱۱﴾ جب وہ ان کو دُور سے دیکھے گی تو یہ لوگ اُس کے بپھرنے اور پھنکارنے کی آوازیں سنیں گے۔ ﴿۱۲﴾ اور جب ان کو اچھی طرح باندھ کر اُس کی ایک تنگ جگہ میں پھینکا جائے گا تو وہاں یہ موت کو آواز دے کر پکاریں گے۔ ﴿۱۳﴾ (اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ:) "آج تم موت کو صرف ایک بار نہ پکارو، بلکہ بار بار موت کو پکارتے ہی رہو۔" ﴿۱۴﴾ کہو کہ یہ انجام بہتر ہے یا ہمیشہ رہنے والی جنت، جس کا وعدہ متقی لوگوں سے کیا گیا ہے؟ وہ اُن کے لئے اِنعام ہوگی، اور اُن کا آخری انجام۔ ﴿۱۵﴾ وہاں اُنہیں ہمیشہ ہمیشہ بستے ہوئے ہر وہ چیز ملے گی جو وہ چاہیں گے۔ یہ وہ ذمہ دارانہ وعدہ ہے جو تمہارے ربّ نے اپنے اُوپر لازم کرلیا ہے۔ ﴿۱۶﴾ اور وہ دن (انہیں یاد دِلاؤ) جب اللہ ان (کافروں) کو بھی حشر میں جمع کرے گا اور اُن (معبودوں) کو بھی جن کی یہ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے، اور (ان کے معبودوں) سے کہے گا کہ: "کیا تم نے میرے ان بندوں کو بہکایا تھا، یا یہ راستے سے خود بھٹکے تھے؟" ﴿۱۷﴾ وہ کہیں گے کہ: "آپ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ ہماری مجال نہیں تھی کہ ہم آپ کو چھوڑ کر دوسرے رکھوالوں کے قائل ہوں، لیکن ہوا یہ کہ آپ نے اِن کو اور اِن کے باپ دادوں کو دُنیا کا ساز و سامان دیا، یہاں تک کہ جو بات یاد رکھنی تھی، یہ اُسے بھلا بیٹھے، اور (اس طرح) یہ خود برباد ہو کر رہے۔" ﴿۱۸﴾ لو، (اے کافرو!) انہوں نے تو تمہاری وہ ساری باتیں جھٹلا دیں جو تم کہا کرتے ہو۔ اب نہ (عذاب کو) ٹالنا تمہارے بس میں ہے، نہ کوئی مدد حاصل کرنا۔ اور تم میں سے جو کوئی ظلم کا مرتکب ہے، ہم اُسے بڑے بھاری عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ﴿۱۹﴾ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے، وہ سب ایسے تھے کہ کھانا بھی کھاتے تھے،

اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔ اور ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کی آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے۔ بتاؤ کیا صبر کرو گے؟ اور تمہارا پروردگار ہر بات دیکھ رہا ہے۔ (۲۰)

خلاصہ تفسیر

وہ ذات بڑی عالی شان ہے کہ اگر وہ چاہتا تو آپ کو (کفار کی) اس (فرمائش) سے (بھی) اچھی چیز دیدے یعنی بہت سے (غیبی) باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں (بہتر اس لئے کہا کہ وہ تو مطلق باغ کی فرمائش کرتے تھے گو ایک ہی ہو اور متعدد باغ کا ایک سے بہتر ہونا ظاہر ہے) اور (بلکہ ان باغوں کے ساتھ اور بھی مناسب چیزیں دیدے جن کی اُنہوں نے فرمائش بھی نہیں کی یعنی) آپ کو بہت سے محل دیدے (جو ان باغوں میں بنے ہوں یا باہر ہی ہوں جس سے اُن کی فرمائش اور بھی زیادہ نعمتوں کے ساتھ پوری ہو جائے۔ مطلب یہ کہ جو جنت میں ملے گا اگر اللہ چاہے تو آپ کو دُنیا ہی میں دیدے لیکن بعض حکمتوں سے نہیں چاہا اور فی نفسہ ضروری تھا نہیں پس شبہ محض بیہودہ ہے۔ ان کفار کے ان شبہاتِ مذکورہ کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کو حق کی طلب اور فکر ہوئی ہے اور اس دَوران میں قبل تحقیق ایسے شبہات واقع ہو گئے ہوں بلکہ وجہ اعتراضات کی محض شرارت اور طلبِ حق سے بےفکری ہے اور اس بےفکری اور شرارت کا سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ قیامت کو جھوٹ سمجھ رہے ہیں (اس لئے فکرِ انجام نہیں ہے اور جو جی میں آتا ہے کر لیتے ہیں بک دیتے ہیں) اور (انجام اس کا یہ ہو گا کہ) ہم نے ایسے شخص (کی سزا) کے لئے جو کہ قیامت کو جھوٹا سمجھے دوزخ تیار کر رکھی ہے (کیونکہ قیامت کی تکذیب سے اللہ ورسول کی تکذیب لازم آتی ہے جو اصل سبب ہے دوزخ میں جانے کا اور اس دوزخ کی یہ کیفیت ہوگی کہ) وہ (دوزخ) ان کو دُور سے دیکھے گی تو (دیکھتے ہی غضبناک ہو کر اس قدر جوش مارے گی کہ) وہ لوگ (دُور ہی سے) اس کا جوش وخروش سُنیں گے اور (پھر) جب وہ اس (دوزخ) کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں جکڑ کر ڈال دیئے جائیں گے تو وہاں موت ہی موت پکاریں گے (جیسا مصیبت میں عادت ہے کہ موت کو بُلاتے اور اس کی تمنّا کرتے ہیں اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) ایک موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو (کیونکہ موت کے پکارنے کی علّت مصیبت ہے اور تمہاری مصیبت غیر متناہی ہے اور ہر مصیبت کا مقتضا موت کا پکارنا ہے تو پکارنا بھی کثیر ہوا اور اسی کی کثرت کو موت کی کثرت کہا گیا) آپ (ان کو یہ مصیبت سنا کر) کہئے کہ (یہ بتلاؤ کہ) کیا یہ (مصیبت کی) حالت اچھی ہے (جو کہ مقتضٰی ہے تمہارے کفر وانکار کا) یا وہ ہمیشہ کے رہنے کی جنت (اچھی ہے) جس کا خدا سے ڈرنے والوں سے (یعنی اہلِ ایمان سے) وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے لئے (ان کی اطاعت کا) صلہ ہے اور ان کا (آخری) ٹھکانا (اور) ان کو وہاں وہ سب چیزیں ملیں گی جو کچھ وہ چاہیں گے (اور) وہ (اس میں) ہمیشہ رہیں گے (اے پیغمبر) یہ ایک وعدہ ہے جو (بطور فضل وعنایت کے) آپ

کے رَبّ کے ذمّہ ہے اور قابلِ درخواست ہے (اور ظاہر ہے کہ جنت الخلد ہی بہتر ہے سو اس میں ترہیب کے بعد ترغیب ایمان کی ہوگئی) اور (وہ دن ان کو یاد دلائیے کہ) جس روز اللہ تعالیٰ ان (کافر) لوگوں کو اور جن کو وہ لوگ خدا کے سوا پوجتے تھے (جنہوں نے اپنے اختیار سے کسی کو گمراہ نہیں کیا خواہ صرف بُت مراد ہوں یا ملائکہ وغیرہم بھی) ان (سب) کو جمع کرے گا پھر (ان معبودین سے ان عابدین کی رُسوائی کے لئے) فرمائے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو (راہِ حق سے) گمراہ کیا تھا یا یہ (خود ہی) راہ (حق) سے گمراہ ہوگئے تھے (مطلب یہ کہ اُنہوں نے تمہاری عبادت جو واقع میں گمراہی ہے تمہارے امر و رضا سے کی تھی جیسا ان لوگوں کا زعم تھا کہ یہ معبودین ہماری اس عبادت سے خوش ہوتے ہیں اور خوش ہو کر اللہ تعالیٰ سے شفاعت کریں گے یا اپنی رائے فاسد سے اختراع کرلی تھی) وہ (معبودین) عرض کریں گے کہ معاذ اللہ ہماری کیا مجال تھی کہ ہم آپ کے سوا اور کارسازوں کو (اپنے اعتقاد میں) تجویز کریں (عام اس سے کہ وہ کارساز ہم ہوں یا ہمارے سوا اور کوئی ہو۔ مطلب یہ کہ جب خدائی کو آپ میں منحصر سمجھتے ہیں تو ہم شرک کرنے کا ان کو امر یا اس پر رضامندی کیوں ظاہر کرتے) ولیکن (یہ خود ہی گمراہ ہوئے اور گمراہ بھی ایسے نامعقول طور پر ہوئے کہ اسبابِ شکر کو اُنہوں نے اسبابِ کفر بنایا چنانچہ) آپ نے (تو) ان کو اور ان کے بڑوں کو (خوب) آسودگی دی (جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ نعمت دینے والے کو پہچانتے اور اس کا شکر و اطاعت کرتے مگر یہ لوگ) یہاں تک (شہوات و تلذّذات میں منہمک ہوئے) کہ (آپ کی) یاد (ہی) کو بھلا بیٹھے اور یہ لوگ خود ہی گمراہ ہوئے ہم نے نہیں کیا۔ اور اُن کی گمراہی کو اللہ کی بڑی نعمتیں ان پر مبذول ہونے کا ذکر کر کے اور زیادہ واضح کردیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ان عابدین کو لاجواب کرنے کے لئے جو اصل مقصود تھا سوال مذکور سے یہ فرمائے گا) لو تمہارے ان معبودوں نے تو تم کو تمہاری (سب) باتوں میں جھوٹا (ہی) ٹھہرا دیا (اور انہوں نے بھی تمہارا ساتھ نہ دیا اور جُرم پُورے طور پر قائم ہوگیا) سو (اب) تم نہ تو خود (عذاب کو اپنے اوپر سے) ٹال سکتے ہو اور نہ (کسی دوسرے کی طرف سے) مدد دیئے جاسکتے ہو (حتیٰ کہ جن پر پورا بھروسہ تھا وہ بھی صاف جواب دے رہے ہیں اور تمہاری صریح مخالفت کررہے ہیں) اور جو (جو) تم میں ظالم (یعنی مشرک) ہوگا ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے (اور گو اس وقت مخاطبین سب مشرک ہی ہوں گے مگر اس طرح فرمانے کی یہ وجہ ہے کہ ظلم کا مقتضیٰ عذاب ہونا بیان فرمانا مقصود ہے) اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے (مطلب یہ کہ نبوّت و اکلِ طعام وغیرہ میں تنافی نہیں چنانچہ جن کی نبوّت دلائل سے ثابت ہے گو معترضین اعتراف نہ کریں، ان سب سے اس کا صدور ہوا ہے پس آپ پر بھی یہ اعتراض غلط ہے) اور (اے پیغمبر اور اے تابعینِ پیغمبر ان کفار کے ایسے بیہودہ اقوال سے غمگین مت ہو کیونکہ) ہم نے تم (مجموعہ مکلفین) میں ایک کو دوسرے کے لئے آزمائش بنایا ہے (پس اسی عادت مستمرہ کے موافق انبیاء کو ایسی حالت پر بنایا کہ اُمت کی آزمائش ہو کہ کون ان کے حالاتِ بشریہ پر نظر کر کے تکذیب کرتا ہے اور کون

اُن کے کمالاتِ نبوّت پر نظر کر کے تصدیق کرتا ہے سو جب یہ بات معلوم ہوگئی تو) کیا تم (اب بھی) صبر کرو گے (یعنی صبر کرنا چاہئے) اور (یہ بات یقینی ہے کہ) آپ کا رَبّ خوب دیکھ رہا ہے (تو وقت موعود پر ان کو سزا دے گا، پھر آپ کیوں ہم وغم میں واقع ہوں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت پر جو شبہات پیش کئے گئے تھے اور وہاں اُن کا اجمالی جواب دیا گیا تھا ان آیات میں اس کی کچھ تفصیل مذکور ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے اپنی جہالت اور حقیقت شناسی سے دُوری کی وجہ سے ایک بات یہ کہی ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہوتے تو اُن کے پاس بہت دولت کے خزانے ہوتے بہت بڑی جائیداد اور باغات ہوتے تاکہ یہ کسبِ معاش سے مستغنی رہتے اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ایسا کر دینا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں کہ اپنے رسول کو دولت کے خزانے دیدیں، بلکہ بڑی سے بڑی حکومت وسلطنت کا مالک بنا دیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو ایسی دولت اور پوری دُنیا پر بے مثال حکومت عطا فرما کر اپنی اس قدرتِ کاملہ کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے۔ مگر عامّہ خلق کی مصلحت اور بیشمار حکمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ گروہِ انبیاء کو مادّی اور دنیوی مال و دولت سے الگ ہی رکھا جائے۔ خصوصاً سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حق تعالیٰ کو یہی پسند ہوا کہ وہ عام غریب مسلمانوں کی صفوف میں اور اُنہی جیسے حالات میں رہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے اسی حالت کو پسند فرمایا۔ جیسا کہ مسند احمد اور ترمذی میں حضرت ابواُمامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رَبّ نے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کے لئے پورے بطحاء مکہ اور اس کے پہاڑوں کو سونا بنا دیتا ہوں، تو میں نے عرض کیا نہیں، اے میرے پروردگار مجھے تو یہ پسند ہے کہ مجھے ایک روز پیٹ بھرائی کھانا ملے (جس پر اللہ کا شکر ادا کروں) اور ایک روز بھوکا رہوں (اُس پر صبر کروں) [1] اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ پھرا کرتے۔ (مظہری) [2]

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا عام طور پر فقر و فاقہ میں رہنا اللہ تعالیٰ کی ہزاروں حکمتوں اور عام انسانوں کی مصالح کی بناء پر ہے اور اس میں بھی وہ اس حالت پر مجبور نہیں ہوتے اگر وہ چاہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو بڑا مالدار

---

[1] جامع الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی الکفاف والصبر علیہ ج:۲ ص:۶۰، ومسند احمد، حدیث ابی امامة رضی اللہ تعالٰی عنه، رقم الحدیث:۲۲۸۴۷ [2] مجمع الزوائد، رقم الحدیث:۱۴۲۱۰، والمظهری ج:۷ ص:۱۳

صاحبِ جائیداد بنا سکتے ہیں مگر اُن کی ذات کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ مال و دولت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے، فقر وفاقہ ہی کو پسند کرتے ہیں۔

دوسری بات کفّار نے یہ کہی تھی کہ یہ پیغمبر ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں، اور کسبِ معاش کے لئے بازاروں میں نہ پھرتے اس اعتراض کی بنیاد بہت سے کفار کا یہ خیال ہے کہ اللہ کا رسول انسان نہیں ہوسکتا، فرشتہ ہی رسول ہوسکتا ہے۔ جس کا جواب قرآن کریم میں جابجا آیا ہے اور یہاں اس کا یہ جواب دیا گیا کہ جن انبیاء کو تم بھی نبی ورسول مانتے ہو وہ بھی تو انسان ہی تھے انسانوں کی طرح کھاتے پیتے بازاروں میں پھرتے تھے جس سے تمہیں یہ نتیجہ نکال لینا چاہئے تھا کہ کھانا پینا اور بازار میں پھرنا منصبِ نبوّت ورسالت کے خلاف نہیں۔ آیاتِ مذکورہ میں وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّآ اِنَّهُمۡ لَيَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ الآیۃ میں اسی مضمون کا بیان ہے۔

مخلوق میں معاشی مساوات کا نہ ہونا بڑی حکمت پر مبنی ہے

وَجَعَلۡنَا بَعۡضَكُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَةً اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ حق تعالیٰ کو قدرت تو سب کچھ تھی وہ سارے انسانوں کو یکساں مالدار بنا دیتے، سب کو تندرست رکھتے، کوئی بیمار نہ ہوتا۔ سب کو عزّت وجاہ کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دیتے کوئی ادنیٰ یا کم رُتبہ نہ رہ جاتا مگر نظامِ عالم میں اس کی وجہ سے بڑے رخنے پیدا ہوتے اس لئے حق تعالیٰ نے کسی کو مالدار بنایا، کسی کو غریب مفلس، کسی کو قوی، کسی کو ضعیف، کسی کو تندرست، کسی کو بیمار کسی کو صاحبِ عزّت وجاہ، کسی کو گمنام۔ اس اختلافِ انواع واصناف اور اختلافِ احوال میں ہر طبقے کا امتحان اور آزمائش ہے۔ غنی کے شکر کا غریب کے صبر کا امتحان ہے اسی طرح بیمار وتندرست کا حال ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ جب تمہاری نظر کسی ایسے شخص پر پڑے جو مال ودولت میں تم سے زیادہ ہے یا صحت وقوت اور عزت وجاہ میں تم سے بڑا ہے تو تم فوراً ایسے لوگوں پر نظر کرو جو اِن چیزوں میں تم سے کم حیثیت رکھتے ہیں (تاکہ تم حسد کے گناہ سے بھی بچ جاؤ اور اپنی موجودہ حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے کی توفیق ہو۔ (رواہ البخاری ومسلم، مظہری)۔ [1]

وَقَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا لَوۡلَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا الۡمَلٰٓئِكَةُ

اور بولے وہ لوگ جو اُمید نہیں رکھتے کہ ہم سے ملیں گے کیوں نہ اُترے ہم پر فرشتے

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب لینظر إلی من هو أسفل منه إلخ، ج:۲ ص:۹۶۰، وصحیح مسلم، کتاب الزهد، باب ولینظر فی الدنیا إلی من هو أسفل منه إلخ ج:۲ ص:۴۰۷

اَوْ نَرٰی رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِیْرًا ﴿۲۱﴾

یا ہم دیکھ لیتے اپنے رَبّ کو، بہت بڑائی رکھتے ہیں اپنے جی میں اور سر چڑھ رہے ہیں بڑی شرارت میں

یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ

جس دن دیکھیں گے فرشتوں کو کچھ خوشخبری نہیں اُس دن گنہگاروں کو اور کہیں گے

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

کہیں روک دی جائے کوئی آڑ

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں کو یہ توقع ہی نہیں ہے کہ وہ (کسی وقت) ہم سے آملیں گے، وہ یوں کہتے ہیں کہ: "ہم پر فرشتے کیوں نہیں اُتارے جاتے؟ یا پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہم خود اپنے پروردگار کو دیکھ لیں؟" حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے دِلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھے ہوئے ہیں، اور انہوں نے بڑی سرکشی اختیار کی ہوئی ہے۔ ﴿۲۱﴾ جس دن ان کو فرشتے نظر آ گئے، اُس دن ان مجرموں کے لئے کوئی خوشی کا موقع نہیں ہوگا، بلکہ یہ کہتے پھریں گے کہ خدایا! ہمیں ایسی پناہ دے کہ یہ ہم سے دُور ہو جائیں۔ ﴿۲۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (کیونکہ وہ قیامت اور اس کی پیشی اور حساب کے منکر ہیں) وہ (انکار رسالت کے لئے) یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے (کہ اگر فرشتے آکر ہم سے کہیں کہ یہ رسول ہیں) یا ہم اپنے رَبّ کو دیکھ لیں (اور وہ خود ہم سے کہدے کہ یہ رسول ہیں جب ہم تصدیق کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (کہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فرشتے آکر ان سے خطاب کریں یا خود حق تعالیٰ سے ہم کلام ہوں) اور (بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دُنیا میں دیکھنے

اور اُس سے ہم کلام ہونے کی فرمایش میں تو) یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دُور نکل گئے ہیں (کیونکہ ملائکہ اور انسان کی تو بعض چیزوں میں شرکت بھی ہے کہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں مگر اللہ تعالیٰ اور انسان میں تو کوئی مشارکت اور مشابہت نہیں۔ اور یہ لوگ خدا کو دیکھنے کے لائق تو کیا ہوتے مگر فرشتے ان کو ایک روز دکھلائی دیں گے مگر جس طرح یہ چاہتے ہیں اس طرح نہیں بلکہ اُن کے عذاب و مصیبت اور پریشانی لے کر) چنانچہ جس روز یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے (اور وہ دن قیامت کا ہے) اُس روز مجرموں (یعنی کافروں) کے لئے کوئی خوشی کی بات (نصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو جب سامان عذاب کے ساتھ آتا دیکھیں گے تو گھبرا کر) کہیں گے پناہ ہے پناہ ہے۔

معارف ومسائل

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا، لفظ رجا کے عام معنے کسی محبوب ومرغوب چیز کی اُمید کے آتے ہیں اور کبھی یہ لفظ بمعنے خوف بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ابن الانباری نے کتاب الاضداد میں لکھا ہے اس جگہ بھی یہی معنے خوف کے زیادہ واضح ہیں یعنی وہ لوگ جو ہمارے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دوراز کار اور جاہلانہ سوالات اور فرمائشوں کی جرأت اُسی شخص کو ہوسکتی ہے جو آخرت کا بالکل منکر ہو۔ آخرت کے قائل پر آخرت کی فکر ایسی غالب ہوتی ہے کہ اُس کو ایسے سوال وجواب کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ آج کل جو تعلیم جدید کے اثر سے اسلام اور اس کے احکام کے بارے میں بہت سے لوگ شبہات اور بحث ومباحثہ میں مشغول نظر آتے ہیں یہ بھی علامت اس کی ہوتی ہے کہ معاذ اللہ دل میں آخرت کا سچا یقین نہیں ہے۔ اور یہ ہوتا تو اس قسم کے فضول سوالات دل میں پیدا ہی نہ ہوتے۔

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ حِجْر کے لفظی معنے محفوظ جگہ کے ہیں اور محجورًا اُس کی تاکید ہے۔ یہ لفظ محاورہ عرب میں اُس وقت بولا جاتا تھا جب کوئی مصیبت سامنے ہو، اُس سے بچنے کے لئے لوگوں سے کہتے تھے کہ پناہ ہے پناہ، یعنی ہمیں اس مصیبت سے پناہ دو، تو قیامت کے روز بھی جب کفار فرشتوں کو سامان عذاب لاتا ہوا دیکھیں گے دُنیا کی عادت کے مطابق یہ لفظ کہیں گے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس لفظ کے یہ معنے منقول ہیں حَرَامًا مُحَرَّمًا، اور مراد یہ ہے کہ قیامت کے روز جب یہ لوگ فرشتوں کو عذاب کے ساتھ دیکھیں گے اور اُن سے معاف کرنے اور جنت میں جانے کی درخواست کریں گے یا تمنا ظاہر کریں گے تو فرشتے اُن کے جواب میں کہیں گے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ یعنی جنت کافروں پر حرام اور ممنوع ہے۔ (مظہری)[1]

[1] تفسیر المظهری، تحت هٰذه الآیة ج:۷ ص:۲۰

وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا۟ مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا ﴿٢٣﴾

اور ہم پہنچے اُن کے کاموں پر جو انہوں نے کئے تھے پھر ہم نے کر ڈالا اُس کو خاک اُڑتی ہوئی

أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا ﴿٢٤﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ

بہشت کے لوگوں کا اس دن خوب ہے ٹھکانا، اور خوب ہے جگہ دوپہر کے آرام کی اور جس دن پھٹ جائے

ٱلسَّمَآءُ بِٱلْغَمَٰمِ وَنُزِّلَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ تَنزِيلًا ﴿٢٥﴾ ٱلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ ٱلْحَقُّ

آسمان بادل سے اور اُتارے جائیں فرشتے تار لگا کر بادشاہی اس دن سچی ہے

لِلرَّحْمَٰنِ ۚ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ عَسِيرًا ﴿٢٦﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ ٱلظَّالِمُ

رحمٰن کی اور ہے وہ دن منکروں پر مشکل اور جس دن کاٹ کاٹ کھائے گا گنہگار

عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَٰلَيْتَنِى ٱتَّخَذْتُ مَعَ ٱلرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾ يَٰوَيْلَتَىٰ

اپنے ہاتھوں کو کہے گا اے کاش کہ میں نے پکڑا ہوتا رسول کے ساتھ رستہ اے خرابی میری

لَيْتَنِى لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿٢٨﴾ لَّقَدْ أَضَلَّنِى عَنِ ٱلذِّكْرِ

کاش کہ نہ پکڑا ہوتا میں نے فلانے کو دوست اُس نے تو بہکا دیا مجھ کو نصیحت سے

بَعْدَ إِذْ جَآءَنِى ۗ وَكَانَ ٱلشَّيْطَٰنُ لِلْإِنسَٰنِ خَذُولًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ ٱلرَّسُولُ

مجھ تک پہنچ چکنے کے پیچھے، اور ہے شیطان آدمی کو وقت پر دغا دینے والا اور کہا رسول نے

يَٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِى ٱتَّخَذُوا۟ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ مَهْجُورًا ﴿٣٠﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ

اے میرے ربّ میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک اور اسی طرح رکھے ہیں ہم نے ہر

نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ هَادِیًا وَّ نَصِیْرًا ﴿۳۱﴾

نبی کے لئے دشمن گنہگاروں میں سے اور کافی ہے تیرا رَبّ راہ دکھلانے کو اور مدد کرنے کو

آسان ترجمۂ قرآن

اور انہوں نے (دُنیا میں) جو عمل کئے ہیں، ہم اُن کا فیصلہ کرنے پر آئیں گے تو اُنہیں فضا میں بکھرے ہوئے گرد و غبار (کی طرح بے قیمت) بنا دیں گے۔ ﴿۲۳﴾ اُس دن جنّتی لوگ ہوں گے جن کا مستقر بھی بہترین ہوگا، اور آرام گاہ بھی خوب ہوگی۔ ﴿۲۴﴾ اور جس دن آسمان پھٹ کر ایک بادل کو راہ دے گا، اور فرشتے اس طرح اُتارے جائیں گے کہ اُن کا تار بندھ جائے گا۔ ﴿۲۵﴾ اُس دن صحیح معنی میں بادشاہی خدائے رحمٰن کی ہوگی، اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔ ﴿۲۶﴾ اور جس دن ظالم انسان (حسرت سے) اپنے ہاتھوں کو کاٹ کھائے گا، اور کہے گا: ''کاش میں نے پیغمبر کی ہمراہی اختیار کرلی ہوتی! ﴿۲۷﴾ ہائے میری بربادی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا! ﴿۲۸﴾ میرے پاس نصیحت آچکی تھی، مگر اس (دوست) نے مجھے اُس سے بھٹکا دیا۔'' اور شیطان تو ہے ہی ایسا کہ وقت پڑنے پر اِنسان کو بے کس چھوڑ جاتا ہے۔ ﴿۲۹﴾ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہیں گے کہ: ''یا ربّ! میری قوم اس قرآن کو بالکل چھوڑ بیٹھی تھی۔'' ﴿۳۰﴾ اور ہم نے اسی طرح مجرم لوگوں کو ہر نبی کا دُشمن بنایا ہے۔ اور تمہارا پروردگار ہدایت دینے اور مدد کرنے کے لئے کافی ہے۔ ﴿۳۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم (اس روز) ان کے (یعنی کفار کے) ان (نیک) کاموں کی طرف جو کہ وہ (دُنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو (علانیہ طور پر) ایسا (بیکار) کردیں گے جیسے پریشان غبار (کہ کسی کام نہیں آتا، اسی طرح ان کفّار کے اعمال پر کچھ ثواب نہ ہوگا البتہ) اہل جنت اس روز قیام گاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرام گاہ میں بھی خوب اچھے ہوں گے (مراد مستقر اور مقیل سے جنت ہے یعنی جنت اُن کے لئے جائے قیام اور جائے آرام ہوگی اور اچھا ہونا اس کا ظاہر ہے) اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور (اُس بدلی کے ساتھ آسمان سے) فرشتے (زمین پر) بکثرت اُتارے جائیں گے (اور اسی وقت حق تعالیٰ حساب وکتاب کے لئے تجلّی فرمائیں گے اور) اس روز حقیقی حکومت (حضرت) رحمٰن (ہی) کی ہوگی (یعنی حساب وکتاب و جزا وسزا میں کسی کو دخل نہ ہوگا جیسا دُنیا میں ظاہری تصرّف تھوڑا بہت دوسروں کے لئے بھی حاصل ہے) اور وہ (دن) کافروں پر بڑا سخت دن ہوگا (کیونکہ ان کے حساب کا انجام جہنم ہی ہے)

اور جس روز ظالم (یعنی کافر آدمی غایت حسرت سے) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا (اور) کہے گا کیا اچھا ہوتا میں رسول کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ لیتا ہائے میری شامت (کہ ایسا نہ کیا اور) کیا اچھا ہوتا کہ میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا اُس (کم بخت) نے مجھ کو نصیحت آئے پیچھے اس سے بہکا دیا (اور ہٹا دیا) اور شیطان تو انسان کو (عین وقت پر) امداد کرنے سے جواب دیدیتا ہے (چنانچہ اُس کافر کی اس حسرت کے وقت اُس نے کوئی ہمدردی نہ کی، گو کرنے سے بھی کچھ نہ ہوتا صرف دُنیا ہی میں بہکانے کو تھا) اور (اس دن) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے کافروں کی شکایت کے طور پر) کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری (اس قوم) نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظر انداز کر رکھا تھا (اور التفات ہی نہ کرتے تھے عمل تو درکنار، مطلب یہ کہ خود کفّار بھی اپنی ضلالت کا اقرار کریں گے اور رسول بھی شہادت دیں گے۔ کقولہ تعالیٰ [1] وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾ (النساء) اور ثبوتِ جُرم کی یہی دو صورتیں معتاد ہیں، اقرار اور شہادت اور دونوں کے اجتماع سے یہ ثبوت اور بھی مؤکد ہو جائے گا اور سزایاب ہوں گے) اور ہم اسی طرح مجرم لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بناتے رہتے ہیں (یعنی یہ لوگ جو انکار قرآن کر کے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں جس کا غم کیا جائے) اور (جس کو ہدایت دینا منظور ہو اُس کی) ہدایت کرنے کو اور (جو ہدایت سے محروم ہے اُس کے مقابلہ میں آپ کی) مدد کرنے کو آپ کا ربّ کافی ہے۔

معارف ومسائل

خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿٢٤﴾ مستقر، مستقل جائے قیام کو کہا جاتا ہے اور مَقِیل قیلولہ سے مشتق ہے دوپہر کو آرام کرنے کی جگہ کو مقیل کہتے ہیں اس جگہ مقیل کا ذکر خصوصیت سے شاید اس لئے بھی ہوا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ نصف النہار کے وقت ساری مخلوقات کے حساب کتاب سے فارغ ہو جائیں گے اور دوپہر کے سونے کے وقت اہلِ جنت جنت میں پہنچ جائیں گے اور اہلِ جہنم جہنم میں۔ (قرطبی) [2]

تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ، اَیْ عَنِ الْغَمَامِ۔ (قرطبی) [3] معنے یہ ہیں کہ آسمان شق ہو کر اُس میں سے ایک رقیق بادل اُترے گا جس میں فرشتے ہوں گے۔ یہ ابر بشکل سائبان آسمان سے آئے گا اور اس میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی اور اُس کے گرداگرد ملائکہ ہوں گے۔ یہ حساب شروع ہونے کا وقت ہوگا اور اُس وقت آسمان کا پھٹنا صرف کھلنے کے طور پر ہوگا یہ وہ پھٹنا نہیں ہوگا جو پہلی مرتبہ نفخۂ صور کے وقت آسمان زمین کو فنا کرنے کے لئے ہوگا کیونکہ یہ نزولِ غمام جس کا ذکر آیت

[1] ترجمہ: اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے حاضر لاویں گے۔

[2] تفسیر القرطبی ج:١٣ ص:٢٣، وشعب الإیمان للبیهقیؒ، رقم الحدیث: ٣٦٣ [3] القرطبی ج:١٣ ص:٢٣

میں ہے نفخۂ ثانیہ کے بعد ہے جبکہ سب زمین وآسمان دوبارہ درست ہو چکے ہوں گے۔ (بیان القرآن) [۱]

يٰوَيۡلَتٰى لَيۡتَنِىۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِيۡلًا ﴿۲۸﴾ یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے مگر حکم عام ہے واقعہ یہ تھا کہ عقبہ ابن ابی معیط مکّہ کے مشرک سرداروں میں سے تھا اس کی عادت تھی کہ جب کسی سفر سے واپس آتا تو شہر کے معزز لوگوں کی دعوت کرتا تھا اور اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ملا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حسبِ عادت اُس نے معززینِ شہر کی دعوت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بُلایا۔ جب اُس نے آپ کے سامنے کھانا رکھا تو آپ نے فرمایا کہ میں تمہارا کھانا اُس وقت تک نہیں کھا سکتا جب تک تم اس کی گواہی نہ دو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اُس کا کوئی شریک عبادت میں نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ عقبہ نے یہ کلمہ پڑھ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط کے مطابق کھانا تناول فرمایا۔

عقبہ کا ایک گہرا دوست اُبَیّ بن خلف تھا جب اُس کو خبر لگی کہ عقبہ مسلمان ہو گیا تو یہ بہت برہم ہوا۔ عقبہ نے عذر کیا کہ قریش کے معزز مہمان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے گھر پر آئے ہوئے تھے اگر وہ بغیر کھانا کھائے میرے گھر سے چلے جاتے تو میرے لئے بڑی رُسوائی تھی اس لئے میں نے ان کی خاطر سے یہ کلمہ کہہ لیا۔ اُبَیّ بن خلف نے کہا کہ میں تیری ایسی باتوں کو قبول نہیں کروں گا جب تک تو جا کر اُن کے منہ پر نہ تھوکے۔ یہ کمبخت بدنصیب دوست کے کہنے سے اس گستاخی پر آمادہ ہو گیا اور کر گزرا اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں بھی ان دونوں کو ذلیل کیا کہ غزوۂ بدر میں دونوں مارے گئے (بغوی) [۲] اور آخرت میں اُن کے عذاب کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ جب آخرت کا عذاب سامنے دیکھے گا تو اس وقت ندامت وافسوس سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے گا اور کہے گا کاش میں فلاں یعنی اُبَیّ بن خلف کو دوست نہ بناتا۔ (مظہری وقرطبی) [۳]

غلط کار اور بے دین دوستوں کی دوستی قیامت کے روز حسرت وندامت کا باعث ہوگی

تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ آیات اگرچہ خاص عقبہ کے واقعہ میں نازل ہوئی تھیں لیکن جیسا کہ الفاظ آیت کے عام ہیں حکم بھی عام ہے اور شاید اس جگہ اُس دوست کے نام کے بجائے قرآن میں فُلَانًا کا لفظ اسی عموم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ ان آیات نے یہ بتلایا ہے کہ جو دو دوست کسی معصیت اور گناہ پر جمع ہوں اور خلافِ شرع اُمور میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہوں [۴] ان سب کا یہی حکم ہے کہ قیامت کے روز اُس گہرے دوست

---

[۱] بیان القرآن ج:۸ ص:۴۷

[۲] تفسیر البغوی تحت هذه الآية ج:٦ ص:۸۰، ۸۱، والقرطبی ج:۱۳ ص:۲۵، ۲۶

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲٦

[۴] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۲۴

کی دوستی پر روئیں گے۔ مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ (مظہری) [۱] کسی غیر مسلم کو اپنا ساتھی نہ بناؤ، اور تمہارا مال (بطور دوستی کے) صرف متقی آدمی کھائے۔ یعنی غیر متقی سے دوستی نہ کرو، اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ مَنْ يُّخَالِل۔ (رواه البخاری) [۲]

ہر انسان (عادۃً) اپنے دوست کے دین اور طریقہ پر چلا کرتا ہے اس لئے دوست بنانے سے پہلے خوب غور کرلیا کرو کہ کس کو دوست بنا رہے ہو۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے مجلسی دوستوں میں کون لوگ بہتر ہیں تو آپ نے فرمایا:

مَنْ ذَكَّرَكُمْ بِاللّٰهِ رُؤْيَتُهٗ وَزَادَ فِيْ عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهٗ وَذَكَّرَكُمْ بِالْاٰخِرَةِ عَمَلُهٗ رواه البزار۔ (قرطبی) [۳]

وہ شخص جس کو دیکھ کر خدا یاد آئے اور جس کی گفتگو سے تمہارا علم بڑھے اور جس کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی یاد تازہ ہو۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ یعنی کہیں گے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو مہجور و متروک کر دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شکایت بارگاہِ حق تعالیٰ میں قیامت کے روز ہوگی یا اسی دُنیا میں آپ نے یہ شکایت فرمائی؟ ائمہ تفسیر اس میں مختلف ہیں، احتمال دونوں ہیں۔ اگلی آیت بظاہر قرینہ اس کا ہے کہ یہ شکایت آپ نے دُنیا ہی میں پیش فرمائی تھی جس کے جواب میں آپ کو تسلی دینے کے لئے اگلی آیت میں فرمایا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ یعنی اگر آپ کے دشمن قرآن کو نہیں مانتے تو آپ کو اس پر صبر کرنا چاہئے کیونکہ سنت اللہ ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ہر نبی کے کچھ مجرم لوگ دشمن ہوا کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اس پر صبر کرتے رہے ہیں۔

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی صحبة المؤمن ج:۲ ص:۶۵، وسنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب من يؤمر ان يجالس ج:۲ ص:۳۱۶، ومسند احمد، مسند ابی سعید رضی الله تعالیٰ عنه رقم الحديث:۱۱۳۳۶

[۲] ما وجدت فی صحیح البخاری، لکن رواه فی جامع الترمذی، ابواب الزهد، بابٌ ج:۲ ص:۶۳، ومسند احمد، مسند ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه، رقم الحديث:۸۳۴۹

[۳] تفسير القرطبی ج:۱۳ ص:۲۷، ومجمع الزوائد، رقم الحديث:۱۷۶۸۶

قرآن کو عملاً ترک کردینا بھی گناہِ عظیم ہے

اس سے ظاہر یہ ہے کہ قرآن کو مہجور ومتروک کردینے سے مراد قرآن کا انکار ہے جو کفار ہی کا کام ہے۔ مگر بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر نہ اس کی تلاوت کی پابندی کرتے ہیں نہ اُس پر عمل کرنے کی وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّقَ مُصْحَفَهٗ لَمْ يَتَعَاهَدْهُ وَلَمْ يَنْظُرْ فِيْهِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُتَعَلِّقًا بِهٖ يَقُوْلُ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ اِنَّ عَبْدَكَ هٰذَا اتَّخَذَنِيْ مَهْجُوْرًا فَاقْضِ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ۔ ذَكَرَهُ الثَّعْلَبِيُّ۔[1] (قرطبی)

جس شخص نے قرآن پڑھا مگر پھر اس کو بند کرکے گھر میں معلق کردیا نہ اس کی تلاوت کی پابندی کی نہ اس کے احکام میں غور کیا، قیامت کے روز قرآن اُس کے گلے میں پڑا ہوا آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرے گا کہ آپ کے اس بندہ نے مجھے چھوڑ دیا تھا اب آپ میرے اور اس کے معاملہ کا فیصلہ فرمادیں۔

مع وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ

اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اُترا اس پر قرآن سارا ایک جگہ ہوکر اسی طرح اُتارا

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾

تاکہ ثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل اور پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ: ''ان پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ میں کیوں نازل نہیں کردیا گیا؟'' (اے پیغمبر!) ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تمہارا دِل مضبوط رکھیں، اور ہم نے اُسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھوایا ہے۔ ﴿٣٢﴾

[1] تفسیر القرطبی ج:١٣ ص:٢٧، وروح المعانی تحت هٰذه الآية ج:١٤ ص:٨٦

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا (مقصود اس اعتراض سے یہ ہے کہ اگر خدا کا کلام ہوتا تو بتدریج نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بتدریج نازل کرنے سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی سوچ سوچ کر تھوڑا تھوڑا بنا لیتے ہیں آگے اس اعتراض کا جواب ہے کہ) اس طرح (تدریجاً) اس لئے (ہم نے نازل کیا) ہے تا کہ ہم اس کے ذریعہ آپ کے دل کو قوی رکھیں اور (اسی لئے) ہم نے اس کو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر اُتارا ہے (چنانچہ تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ پورا ہوا)۔

معارف و مسائل

یہ وہی سلسلہ کفار و مشرکین کے اعتراضات و جوابات کا ہے جو شروع سورت سے چلا آ رہا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی ایک حکمت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ آپ کے دل کو قوی رکھنا مقصود ہے۔ نزول تدریجی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقویت قلب کی چند وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ یاد رکھنا آسان ہو گیا، ایک ضخیم کتاب بیک وقت نازل ہو جاتی تو یہ آسانی نہ رہتی اور آسانی کے ساتھ یاد ہوتے رہنے سے دل میں کوئی پریشانی نہیں رہتی۔ دُوسرے جب کفار آپ پر کوئی اعتراض یا آپ کے ساتھ کوئی ناگوار معاملہ کرتے تو اُسی وقت آپ کی تسلّی کے لئے قرآن میں آیت نازل ہو جاتی، اور اگر پورا قرآن ایک دفعہ آ گیا ہوتا اور اس خاص واقعہ پر تسلّی کا ذکر بھی نازل ہو گیا ہوتا تو بہرحال اس کو قرآن میں تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی اور ذہن کا اُس طرف متوجہ ہو جانا بھی عادۃً ضروری نہیں تھا۔ تیسرے پیغامِ خداوندی آنا تازہ شہادت ہے معیتِ خداوندی کی جو مدار اعظم ہے قوتِ قلب کا۔ اور اس جگہ جو حکمت تقویتِ قلب کی بتلائی گئی ہے نزولِ تدریجی کی حکمت اس میں منحصر نہیں دوسری حکمتیں بھی ہیں جن میں سے بعض سورۂ بنی اسرائیل کی آیت [1] وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (بنی اسرائیل:۱۰۶) میں پہلے آ چکی ہے۔ (بیان القرآن) [2]

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ

اور نہیں لاتے تیرے پاس کوئی مثل کہ ہم نہیں پہنچا دیتے تجھ کو ٹھیک بات اور اس سے بہتر کھول کر جو لوگ

[1] ترجمہ: اور قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا تا کہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔

[2] بیان القرآن ج:۸ ص:۴۸، ۴۹

يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ

کہ گھیر کر لائیں جائیں گے اوندھے پڑے ہوئے اپنے منہ پر دوزخ کی طرف، اُنہی کا بُرا درجہ ہے اور بہت بہکے ہوئے ہیں

سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ

راہ سے اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کردیا ہم نے اس کے ساتھ اس کا بھائی ہارون

وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ

کام بٹانے والا پھر کہا ہم نے تم دونوں جاؤ اُن لوگوں کے پاس جنہوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو

فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾

پھر دے مارا ہم نے ان کو اُکھاڑ کر

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب کبھی یہ لوگ تمہارے پاس کوئی انوکھی بات لے کر آتے ہیں، ہم تمہیں (اُس کا) ٹھیک ٹھیک جواب اور زیادہ وضاحت کے ساتھ عطا کر دیتے ہیں۔ ﴿۳۳﴾ جن لوگوں کو گھیر کر منہ کے بل دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا، وہ بدترین مقام پر ہیں، اور اُن کا راستہ بدترین گمراہی کا راستہ ہے۔ ﴿۳۴﴾ بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی، اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ہارون کو مددگار کے طور پر مقرر کیا تھا۔ ﴿۳۵﴾ چنانچہ ہم نے کہا تھا کہ: "تم دونوں اُن لوگوں کے پاس جاؤ جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہے۔" آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اُن کو تباہ کر کے نیست و نابود کر دیا۔ ﴿۳۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں مگر ہم (اُس کا) ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو عنایت کر دیتے ہیں (تا کہ آپ مخالفین کو جواب دے سکیں۔ یہ بظاہر بیان اُس تقویت قلب کا ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہوا ہے کہ بتدریج نازل کرنے میں ایک حکمت آپ کی دلجمعی اور تقویتِ قلب ہے کہ جب کفار کی طرف سے

کوئی اعتراض آئے تو اُسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب نازل کر دیا جائے) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے (یعنی گھسیٹ کر) یہ لوگ جگہ میں بھی بدتر ہیں اور طریقہ میں بھی بہت گمراہ ہیں۔ (یہاں تک انکارِ رسالت پر وعید اور قرآن پر اعتراضات کے جواب تھے، آگے اس کی تائید میں زمانہ ماضی کے بعض واقعات نقل کئے گئے ہیں جن میں منکرینِ رسالت کا انجام اور عبرت انگیز حالات مذکور ہیں اور اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلّی اور تقویتِ قلب کا سامان ہے کہ پچھلے انبیاء کی اللہ تعالیٰ نے جس طرح مدد فرمائی اور دشمنوں پر غالب فرمایا وہ آپ کے لئے بھی ہونے والا ہے۔ اس میں پہلا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا کہ) اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب (یعنی تورات) دی تھی اور (اس کتاب کے ملنے سے پہلے) ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (اُن کا) معین (و مددگار) بنایا تھا پھر ہم نے (دونوں کو) حکم دیا کہ دونوں آدمی اُن لوگوں کے پاس (ہدایت کرنے کے لئے) جاؤ جنہوں نے ہماری (توحید کی) دلیلوں کو جھٹلایا ہے (مراد اس سے فرعون اور اس کی قوم ہے چنانچہ یہ دونوں حضرات وہاں پہنچے اور سمجھایا مگر اُنہوں نے نہ مانا) سو ہم نے اُن کو (اپنے قہر سے) بالکل ہی غارت کر دیا (یعنی دریا میں غرق کئے گئے)۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اس میں قوم فرعون کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اُنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے۔ حالانکہ اس وقت تک تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل بھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اس تکذیب سے آیات تورات کی تکذیب تو مراد نہیں ہوسکتی، بلکہ مراد آیات سے یا تو توحید کے دلائل عقلیہ ہیں جو ہر انسان کو اپنی عقل کے مطابق سمجھ میں آسکتے ہیں اُن میں غور نہ کرنے کو تکذیبِ آیات فرمایا اور یا یہ کہ انبیاء سابقین کی روایات جو کچھ نہ کچھ ہر قوم میں نقل ہوتی آئی ہیں اُن کا انکار مراد ہے جیسے قرآن کریم میں فرمایا [1] وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ (المؤمن: ۳۴)، اس میں انبیاء سابقین کی تعلیم کا ان لوگوں تک منقول چلا آنا بتلایا گیا ہے۔ (بیان القرآن) [2]

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ

اور نوح کی قوم کو جب اُنہوں نے جھٹلایا پیغام لانے والوں کو ہم نے ان کو ڈبا دیا اور کیا اُن کو لوگوں کے حق میں نشانی

[1] ترجمہ: اور اس کے قبل تم لوگوں کے پاس یوسف دلائل لے کر آچکے ہیں۔

[2] بیان القرآن ج:۸ ص:۵۰

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۳۷ صلے وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے گنہگاروں کے واسطے عذاب دردناک اور عاد کو اور ثمود کو اور کنوئیں والوں کو

وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ۝۳۸ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ز وَكُلًّا

اور اس کے بیچ میں بہت سی جماعتوں کو اور سب کو کہہ سنائیں ہم نے مثالیں اور سب کو

تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝۳۹ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ط

کھو دیا ہم نے غارت کر کر اور یہ لوگ ہو آئے ہیں اُس بستی کے پاس جن پر برسا بُرا برساؤ

اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ج بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝۴۰ وَاِذَا رَاَوْكَ

کیا دیکھتے نہ تھے اس کو، نہیں پر اُمید نہیں رکھتے جی اُٹھنے کی اور جہاں تجھ کو دیکھیں

اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ط اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝۴۱

کچھ کام نہیں اُن کو تجھ سے مگر ٹھٹھے کرنے کیا یہی ہے جس کو بھیجا اللہ نے پیغام دے کر

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ط وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

یہ تو ہم کو بچلا ہی دیتا ہمارے معبودوں سے اگر ہم نہ جمے رہتے اُن پر اور آگے جان لیں گے

حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۴۲ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ

جس وقت دیکھیں گے عذاب کو کہ کون بہت بچلا ہوا ہے راہ سے بھلا دیکھ تو اس شخص کو جس نے پوجنا اختیار کیا

هَوٰىهُ ط اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝۴۳ لا اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ

اپنی خواہش کا، کہیں تو لے سکتا ہے اس کا ذمّہ یا تو خیال رکھتا ہے کہ بہت سے ان میں

يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۴۴ ع

سنتے یا سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں راہ سے

آسان ترجمۂ قرآن

اور نوح کی قوم نے جب پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے اُنہیں غرق کر دیا، اور اُن کو لوگوں کے لئے عبرت کا سامان بنا دیا۔ اور ہم نے اُن ظالموں کے لئے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۝۳۷ اسی طرح ہم نے عاد و ثمود اور اَصحاب الرس کو اور اُن کے درمیان بہت سی نسلوں کو تباہ کیا۔ ۝۳۸ ان میں سے ہر ایک کو سمجھانے کے لئے ہم نے مثالیں دیں، اور (جب وہ نہ مانے تو) ہر ایک کو ہم نے پیس کر رکھ دیا۔ ۝۳۹ اور یہ (کفارِ مکہ) اُس بستی سے ہو کر گذرتے رہے ہیں جس پر بری طرح (پتھروں کی) بارش برسائی گئی تھی۔ بھلا کیا یہ اُس بستی کو دیکھتے نہیں رہے؟ (پھر بھی انہیں عبرت نہیں ہوئی) بلکہ ان کے دِل میں دوسری زندگی کا اندیشہ تک پیدا نہیں ہوا۔ ۝۴۰ اور (اے پیغمبر!) جب یہ لوگ تمہیں دیکھتے ہیں تو ان کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہوتا کہ یہ تمہارا مذاق بناتے ہیں کہ: ''کیا یہی وہ صاحب ہیں جنہیں اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ ۝۴۱ اگر ہم اپنے خداؤں (کی عقیدت) پر مضبوطی سے جمے نہ رہتے تو اِن صاحب نے تو ہمیں اُن سے بھٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' (جو لوگ یہ باتیں کہہ رہے ہیں) جب اُنہیں عذاب آنکھوں سے نظر آجائے گا تب انہیں پتہ چلے گا کہ کون راستے سے بالکل بھٹکا ہوا تھا؟ ۝۴۲ بھلا بتاؤ جس شخص نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنا لیا ہو، تو (اے پیغمبر!) کیا تم اُس کی ذمہ داری لے سکتے ہو؟ ۝۴۳ یا تمہارا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں! ان کی مثال تو بس چار پاؤں کے جانوروں کی سی ہے، بلکہ یہ اُن سے زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ ۝۴۴

خلاصۂ تفسیر

اور قوم نوح کو بھی (ان کے زمانہ میں) ہم ہلاک کر چکے ہیں (جن کی ہلاکت اور سببِ ہلاکت کا بیان یہ ہے کہ) جب اُنہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (طوفان سے) غرق کر دیا اور ہم نے ان (کے واقعہ) کو لوگوں (کی عبرت) کے لئے نشان بنا دیا (یہ تو دُنیا میں سزا ہوئی) اور (آخرت میں) ہم نے (اُن) ظالموں کے لئے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور ہم نے عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور اُن کے بیچ بیچ میں بہت سی اُمتوں کو ہلاک کیا اور ہم نے (اُمم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی مؤثر اور بلیغ) مضامین بیان کئے اور (جب نہ مانا تو)

ہم نے سب کو بالکل ہی برباد کر دیا۔ اور یہ (کفار ملک شام کے سفر میں) اس بستی پر ہو کر گزرتے ہیں جس پر بُری طرح پتھر برسائے گئے تھے (مراد قریہ قوم لوط کا ہے) سو کیا یہ لوگ اس کو دیکھتے نہیں رہتے (پھر بھی عبرت نہیں پکڑتے کہ کفر و تکذیب کو چھوڑ دیں جس کی بدولت قوم لوط کو سزا ہوئی سو بات یہ ہے کہ عبرت نہ پکڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس قریہ کو دیکھتے نہ ہوں) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ مر کر جی اُٹھنے کا احتمال ہی نہیں رکھتے (یعنی آخرت کے منکر ہیں اس لئے کفر کو موجب سزا ہی قرار نہیں دیتے اور اس لئے اُن کی ہلاکت کو کفر کا وبال نہیں سمجھتے بلکہ اُمور اتفاقیہ میں سے سمجھتے ہیں یہ وجہ عبرت نہ پکڑنے کی ہے) اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ کیا یہی (بزرگ) ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا غریب آدمی رسول نہ ہونا چاہئے۔ اگر رسالت کوئی چیز ہے تو کوئی رئیس مالدار ہونا چاہئے تھا پس یہ رسول نہیں البتہ) اس شخص (کی جادو بیانی اس غضب کی ہے کہ اس) نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم اُن پر (مضبوطی سے) قائم نہ رہتے (یعنی ہم تو ہدایت پر ہیں اور یہ ہم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اللہ تعالیٰ اُن کی تردید کے لئے فرماتے ہیں کہ یہ ظالم اب تو اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور ہمارے پیغمبر کو گمراہ بتلا رہے ہیں) اور (مرنے کے بعد) جلد ہی ان کو معلوم ہو جائے گا جب عذاب کا معائنہ کریں گے کہ کون شخص گمراہ تھا (آیا وہ خود یا نعوذ باللہ پیغمبر، اس میں اُن کے بیہودہ اعتراض کے جواب کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نبوّت اور مالداری میں کوئی جوڑ نہیں مالدار نہ ہونے کے سبب نبوّت سے انکار جہالت و گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر دُنیا میں جو چاہیں خیال پکالیں مگر قیامت میں سب حقیقت کھل جائے گی) اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہشِ نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا آپ اُس کی نگرانی کر سکتے ہیں یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں (مطلب یہ کہ آپ ان کی ہدایت نہ ہونے سے مغموم نہ ہوجئے کیونکہ آپ ان پر مسلّط نہیں کہ خواہی نخواہی ان کو راہ پر لائیں اور نہ ہدایت کی ان سے توقع کیجئے نہ یہ حق بات کو سنتے ہیں نہ عقل ہے کہ غور کریں) یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات کو نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) بلکہ یہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ وہ احکامِ دین کے مکلّف نہیں تو ان کا نہ سمجھنا مذموم نہیں اور یہ مکلّف ہیں پھر بھی نہیں سمجھتے پھر یہ کہ وہ اگر معتقد ان ضروریاتِ دین کے نہیں ہیں تو منکر بھی تو نہیں اور یہ تو منکر ہیں اور اَرَءَیْتَ الخ میں ان کی گمراہی کا منشاء بھی بیان کر دیا کہ کسی شبہ و دلیل سے ان کو اشتباہ نہیں ہوا بلکہ اتباعِ ہوٰی اس کا سبب ہے۔)

معارف و مسائل

قوم نوح علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد کہ اُنہوں نے رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ پہلے رسول نہ اُن کے زمانے میں تھے

نہ اُنہوں نے جھٹلایا، تو منشاء اس کا یہ ہے کہ اُنہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا اور چونکہ اُصولِ دین سب انبیاء کے مشترک ہیں اس لئے ایک کو جھٹلانا سبھی کے جھٹلانے کے حکم میں ہے۔

اَصْحٰبَ الرَّسِّ، رس، لُغت میں کچّے کنویں کو کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم اور کسی صحیح حدیث میں ان لوگوں کے تفصیلی حالات مذکور نہیں۔ اسرائیلی روایات مختلف ہیں۔ راجح یہ ہے کہ قوم ثمود کے کچھ باقی ماندہ لوگ تھے جو کسی کنویں پر آباد تھے (کذا فی القاموس والدّر[1] عن ابن عبّاسؓ) ان کے عذاب کی کیفیت بھی قرآن میں منصوص اور کسی صحیح حدیث میں بھی مذکور نہیں۔ (بیان القرآن)[2]

خلافِ شرع خواہشات کی پیروی ایک قسم کی بُت پرستی ہے

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اس آیت میں اُس شخص کو جو اسلام وشریعت کے خلاف اپنی خواہشات کا پیرو ہو یہ کہا گیا ہے کہ اُس نے اپنی خواہشات کو معبود بنالیا ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ خلاف شرع خواہشاتِ نفسانی بھی ایک بُت ہے جس کی پرستش کی جاتی ہے پھر استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (قرطبی)[3]

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا

تو نے نہیں دیکھا اپنے رَبّ کی طرف کیسے دراز کیا سایہ کو اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا پھر ہم نے مقرر کیا

الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ

سورج کو اس کا راہ بتلانے والا پھر کھینچ لیا ہم نے اس کو اپنی طرف سہج سہج سمیٹ کر اور وہی ہے

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

جس نے بنادیا تمہارے واسطے رات کو اوڑھنا اور نیند کو آرام اور دن کو بنادیا اُٹھ نکلنے کے لئے

---

۱ الدر المنثور ج:۷ ص:۳۵۲، مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۳۲

۲ بیان القرآن ج:۲ ص:۵۰

۳ تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۳ ص:۳۵

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا

اور وہی ہے جس نے چلائیں ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اس کی رحمت سے آگے اور اُتارا ہم نے

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿٤٨﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ

آسمان سے پانی پاکی حاصل کرنے کا کہ زندہ کردیں اُس سے مرے ہوئے دیس کو اور پلائیں اُس کو اپنے پیدا کئے ہوئے

اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿٤٩﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ

بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو اور طرح طرح سے تقسیم کیا ہم نے اس کو ان کے بیچ میں تا دھیان رکھیں

فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٥٠﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ

پھر بھی نہیں رہتے بہت لوگ بدون ناشکری کئے اور اگر ہم چاہتے تو اُٹھاتے ہر بستی میں

نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ ۖ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾

کوئی ڈرانے والا، سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر اُن کا اس کے ساتھ بڑے زور سے

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے چلائے دو دریا یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ

اور رکھا ان دونوں کے بیچ پردہ اور آڑ روکی ہوئی اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے

بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿٥٤﴾ وَيَعْبُدُوْنَ

آدمی پھر ٹھہرایا اس کے لئے جد اور سسرال اور تیرا رب سب کچھ کرسکتا ہے اور پوجتے ہیں

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾

اللہ کو چھوڑ کر وہ چیز جو نہ بھلا کرے اُن کا نہ بُرا اور ہے کافر اپنے رَبّ کی طرف سے پیٹھ پھیر رہا

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ

اور تجھ کو ہم نے بھیجا یہی خوشی اور ڈر سنانے کے لئے تو کہہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری

اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ

مگر جو کوئی چاہے کہ پکڑلے اپنے رَبّ کی طرف راہ اور بھروسہ کر اُوپر اس زندہ کے

الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۗ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۸﴾

جو نہیں مرتا اور یاد کر اس کی خوبیاں اور وہ کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں سے خبردار

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں پھر قائم ہوا

عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا

عرش پر وہ بڑی رحمت والا سو پوچھ اس سے جو اس کی خبر رکھتا ہو اور جب کہئے ان سے سجدہ کرو

لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾

رحمٰن کو کہیں رحمٰن کیا ہے کیا سجدہ کرنے لگیں ہم جس کو تو فرمائے اور بڑھ جاتا ہے ان کا بدکنا

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا

بڑی برکت ہے اس کی جس نے بنائے آسمان میں بُرج اور رکھا اس میں چراغ اور چاند

مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ

اُجالا کرنے والا اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن بدلتے سدلتے اُس شخص کے واسطے کہ چاہے دھیان رکھنا

اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

یا چاہے شکر کرنا

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح سائے کو پھیلاتا ہے؟ اور اگر وہ چاہتا تو اُسے ایک جگہ ٹھہرا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اُس کے لئے رہنما بنا دیا ہے ﴿۴۵﴾ پھر ہم اُسے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ ﴿۴۶﴾ اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے رات کو لباس بنایا، اور نیند کو سراپا سکون، اور دن کو دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے کا ذریعہ بنا دیا۔ ﴿۴۷﴾ اور وہی ہے جس نے اپنی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے ہوائیں بھیجیں جو (بارش کی) خوشخبری لے کر آتی ہیں، اور ہم نے ہی آسمان سے پاکیزہ پانی اُتارا ہے، ﴿۴۸﴾ تاکہ ہم اُس کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی بخشیں، اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے مویشیوں اور اِنسانوں کو اُس سے سیراب کریں۔ ﴿۴۹﴾ اور ہم نے لوگوں کے فائدے کے لئے اُس (پانی) کی اُلٹ پھیر کر رکھی ہے، تاکہ وہ سبق حاصل کریں۔ لیکن اکثر لوگ ناشکری کے سوا ہر بات سے انکاری ہیں۔ ﴿۵۰﴾ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک الگ آگاہ کرنے والا (پیغمبر) بھیج دیتے۔ ﴿۵۱﴾ لہٰذا (اے پیغمبر!) تم ان کافروں کا کہنا نہ مانو، اور اِس قرآن کے ذریعے اُن کے خلاف پوری قوت سے جدوجہد کرو۔ ﴿۵۲﴾ اور وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو اس طرح ملا کر چلایا ہے کہ ایک میٹھا ہے جس سے تسکین ملتی ہے، اور ایک نمکین ہے، سخت کڑوا۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ اور ایسی رُکاوٹ حائل کردی ہے جس کو (دونوں میں سے) کوئی عبور نہیں کرسکتا۔ ﴿۵۳﴾ اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اُس کو نسبی اور سسرالی رشتے عطا کئے، اور تمہارا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔ ﴿۵۴﴾ اور یہ لوگ ہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کر رہے ہیں جو نہ ان کو کوئی فائدہ پہنچاتی ہیں، نہ نقصان۔ اور کافر اِنسان نے اپنے پروردگار ہی کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ ﴿۵۵﴾ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں کسی اور کام کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے بھیجا ہے کہ تم لوگوں کو خوشخبری دو، اور خبردار کرو۔ ﴿۵۶﴾ کہہ دو کہ: ''میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، ہاں جو شخص یہ چاہے کہ اپنے ربّ تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرلے (تو یہی میری اُجرت

ہے)''۵۷ اور تم اُس ذات پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی، اور اُسی کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہو، اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے کے لئے کافی ہے۔ ۵۸ وہ ذات جس نے چھ دن میں سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں پیدا کیں، پھر اُس نے عرش پر اِستواء فرمایا، وہ رحمٰن ہے، اس لئے اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھو۔ ۵۹ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو یہ کہتے ہیں کہ: ''رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا جسے بھی تم کہہ دو، ہم اُسے سجدہ کیا کریں؟'' اور اس بات سے وہ اور زیادہ بدکنے لگتے ہیں۔ ۶۰ بڑی شان ہے اُس کی جس نے آسمان میں برج بنائے، اور اُس میں ایک روشن چراغ اور نور پھیلانے والا چاند پیدا کیا۔ ۶۱ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایسا بنایا کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلے آتے ہیں، (مگر یہ ساری باتیں) اُس شخص کے لئے (کارآمد ہیں) جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو یا شکر بجالانا چاہتا ہو۔ ۶۲

خلاصۂ تفسیر

اے مخاطب! کیا تو نے اپنے پروردگار (کی اس قدرت) پر نظر نہیں کی کہ اُس نے (جب آفتاب اُفق سے طلوع کرتا ہے اس وقت کھڑی ہوئی چیزوں کے) سایہ کو کیونکر (دُور تک) پھیلایا ہے (کیونکہ طلوع کے وقت ہر چیز کا سایہ لمبا ہوتا ہے) اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرایا ہوا رکھتا (یعنی آفتاب کے بلند ہونے سے بھی نہ گھٹتا اس طرح پر کہ اتنی دُور تک آفتاب کی شعاعوں کو نہ آنے دیتا کیونکہ آفتاب کی شعاعوں کا زمین کے حصّوں پر پہنچنا بارادۂ حق ہے نہ کہ بالاضطرار مگر ہم نے اپنی حکمت سے اس کو ایک حالت پر نہیں رکھا بلکہ اس کو پھیلا ہوا بنا کر) پھر ہم نے آفتاب کو (یعنی اُس کے اُفق کے قریب ہونے اور پھر اُفق سے بلند ہونے کو) اس (سایہ کی درازی وکوتاہی) پر (ایک ظاہری) علامت مقرر کیا (مطلب یہ کہ اگرچہ روشنی اور سایہ اور ان کے گھٹنے بڑھنے کی اصل علت حق تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہے، آفتاب یا کوئی دوسری چیز مؤثر حقیقی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کے لئے کچھ ظاہری اسباب بنا دیئے ہیں اور اسباب کے ساتھ اُن کے مسببات کا ایسا رابطہ قائم کر دیا کہ سبب کے تغیر سے مسبّب میں تغیر ہوتا ہے) پھر (اس تعلق ظاہری کی وجہ سے) ہم نے اس (سایہ) کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا (یعنی جوں جوں آفتاب اونچا ہوا وہ سایہ زائل اور معدوم ہوتا گیا اور چونکہ اس کا غائب ہونا محض قدرتِ الٰہیہ سے بلاشرکتِ غیرے ہے اور عام لوگوں کی رؤیت سے غائب ہونے کے باوجود علمِ الٰہی سے غائب نہیں ہے اس لئے یہ فرمایا گیا کہ اپنی طرف سمیٹ لیا) اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پردہ کی چیز اور نیند کو راحت کی چیز بنایا اور دن کو (اس اعتبار سے کہ سونا مشابہ موت کے ہے اور دن کا وقت جاگنے کا ہے گویا) زندہ ہونے کا وقت بنایا اور وہ ایسا ہے کہ اپنی بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی اُمید دلا کر دل کو) خوش

کردیتی ہیں اور ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں جو پاک صاف کرنے کی چیز ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چار پایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کریں اور ہم اُس (پانی) کو (بقدر مصلحت) ان لوگوں کے درمیان تقسیم کردیتے ہیں تاکہ لوگ غور کریں (کہ یہ تصرفات کسی بڑے قادر کے ہیں کہ وہی مستحقِ عبادت ہے) سو (چاہئے تھا کہ غور کرکے اس کا حق ادا کرتے لیکن) اکثر لوگ بغیر ناشکری کئے نہ رہے (جس میں سب سے بڑھ کر کفر و شرک ہے لیکن آپ ان کی اور بالخصوص اکثر کی ناشکری سن کریا دیکھ کر سعی فی التبلیغ سے ہمت نہ ہارئیے کہ میں تنہا اِن سب سے کیسے عہدہ برآ ہوں گا بلکہ آپ تنہا ہی اپنا کام کئے جائیے کیونکہ آپ کو تنہا ہی نبی بنانے سے خود ہمارا مقصود یہ ہے کہ آپ کا اجر اور قرب بڑھے) اور اگر ہم چاہتے تو (آپ کے علاوہ اسی زمانہ میں) ہر بستی میں ایک ایک پیغمبر بھیج دیتے (اور تنہا آپ پر تمام کام نہ ڈالتے لیکن چونکہ آپ کا اجر بڑھانا مقصود ہے اس لئے ہم نے ایسا نہیں کیا تو اس طور پر اتنا کام آپ کے سپرد کرنا خدا تعالیٰ کی نعمت ہے) سو (اس نعمت کے شکریہ میں) آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے (یعنی کافر تو اس سے خوش ہوں گے کہ تبلیغ نہ ہو یا کمی ہوجائے اور ان کی آزادی سے تعرض نہ کیا جائے) اور قرآن (میں جو دلائل حق کے مذکور ہیں جیسا اسی مقام پر دلائل توحید کے ارشاد ہوئے ہیں اُن) سے اُن کا زور شور سے مقابلہ کیجئے (یعنی عام اور مکمل دعوت و تبلیغ کیجئے، یعنی سب سے کہئے اور بار بار کہئے اور ہمت قوی رکھئے جیسا اب تک آپ کرتے رہے ہیں اس پر قائم رہیئے۔ آگے پھر بیان ہے دلائلِ توحید کا) اور وہ ایسا ہے جس نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا جن میں ایک (کا پانی) تو شیریں تسکین بخش ہے اور ایک (کا پانی) شور تلخ ہے اور (باوجود اختلاط صوری کے حقیقۃً) اُن کے درمیان میں (اپنی قدرت سے) ایک حجاب اور (اختلاط حقیقی سے) ایک مانع قوی رکھ دیا (جو خود خفی غیر محسوس ہے مگر اُس کا اثر یعنی امتیاز دونوں پانی کے مزہ میں محسوس اور مشاہد ہے۔ مراد ان دو دریاؤں سے وہ مواقع ہیں جہاں شیریں ندیاں اور نہریں بہتے بہتے سمندر میں آکر گرتی ہیں وہاں باوجود اس کے کہ اوپر سے دونوں کا سطح ایک معلوم ہوتا ہے لیکن قدرتِ الٰہیہ سے ان میں ایک ایسی حدِّ فاصل ہے کہ ملتقیٰ کے ایک جانب سے پانی لیا جائے تو شیریں اور دوسری جانب سے جو کہ جانبِ اوّل سے بالکل قریب ہے پانی لیا جائے تو تلخ۔ دُنیا میں جہاں جس جگہ شیریں پانی کی نہریں چشمے سمندر کے پانی میں گرتے ہیں وہاں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ میلوں دُور تک میٹھا اور کھاری پانی الگ الگ چلتے ہیں، دائیں طرف میٹھا بائیں طرف تلخ کھاری یا اوپر نیچے شیریں اور تلخ پانی الگ الگ پائے جاتے ہیں (حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ بیان القرآن میں دو معتبر بنگالی علماء کی شہادت نقل کی ہے کہ ارکان سے چاٹگام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبین بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں ایک کا پانی سفید ہے اور ایک کا سیاہ، سیاہ میں سمندر کی طرح طوفانی تلاطم

اور تموّج ہوتا ہے اور سفید بالکل ساکن رہتا ہے کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے بیچ ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقیٰ ہے لوگ کہتے ہیں کہ سفید پانی میٹھا ہے اور سیاہ کڑوا۔ اھ۔ اور مجھ سے باریسال کے بعض طلباء نے بیان کیا کہ ضلع باریسال میں دوندیاں ہیں جو ایک ہی دریا سے نکلی ہیں، ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔ یہاں گجرات میں راقم الحروف جس جگہ آج کل مقیم ہے (ڈابھیل سملک ضلع سورت) سمندر وہاں سے تقریباً دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ادھر کی ندیوں میں برابر مدوجزر (جوار بھاٹا) ہوتا رہتا ہے بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے۔ اوپر کھاری رہتا ہے نیچے میٹھا، جزر کے وقت اوپر سے کھاری اُتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں میٹھا باقی رہ جاتا ہے واللہ اعلم، ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی خدا کی قدرت دیکھو کہ کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مل جانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے سے ممتاز رہتے ہیں[1] ۔) اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اُس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا (چنانچہ باپ دادا وغیرہ شرعی خاندان اور ماں، نانی وغیرہ عرفی خاندان ہیں جن سے پیدائش کے ساتھ ہی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں پھر شادی کے بعد سسرالی رشتے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ دلیل قدرت بھی ہے کہ نطفہ کیا چیز تھا پھر اس کو کیسا بنادیا کہ وہ اتنی جلد خون والا ہو گیا اور نعمت بھی ہے کہ ان تعلقات پر تمدّن اور امداد باہمی کی تعمیر قائم ہے) اور (اے مخاطب) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے اور (باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں ایسا کامل ہے جیسا بیان ہوا اور یہ کمالات مقتضی ہیں کہ اسی کی عبادت کی جائے مگر) یہ (مشرک) لوگ (ایسے) خدا کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں (جو عبادت کرنے پر) نہ اُن کو کچھ نفع پہنچاسکتی ہیں اور نہ (درصورت عبادت نہ کرنے کے) اُن کو کچھ ضرر پہنچاسکتی ہیں اور کافر تو اپنے رَبّ کا مخالف ہے (کہ اُس کو چھوڑ کر دوسرے کی عبادت کرتا ہے اور کفّار کی مخالفت معلوم کر کے آپ نہ تو اُن کے ایمان نہ لانے سے غمگین ہوں کیونکہ) ہم نے آپ کو صرف اس لئے بھیجا ہے کہ (ایمان والوں کو جنت کی) خوشخبری سنائیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا کیا نقصان ہے، پھر آپ کیوں غم کریں اور نہ آپ اُس مخالفت کو معلوم کر کے فکر میں پڑیں کہ جب یہ حق تعالیٰ کے مخالف ہیں تو میں جو حق تعالیٰ کی طرف دعوت کرتا ہوں اِس دعوت کو یہ لوگ خیر خواہی کب سمجھیں گے بلکہ میری خودغرضی پر محمول کر کے التفات بھی نہ کریں گے تو اُن کے گمان کی کیونکر اصلاح کی جائے تاکہ مانع مرتفع ہو۔ سو اگر آپ کو اُن کا یہ خیال قرینہ سے یا زبانی گفتگو سے معلوم ہو تو) آپ (جواب میں اتنا) کہہ دیجئے

[1] تفسیر عثمانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:٢ ص:٢١١

(اور بے فکر ہو جائیے) کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ (مالی یا جاہی) نہیں مانگتا ہاں جو شخص یوں چاہے کہ اپنے رَبّ تک (پہنچنے کا) رستہ اختیار کر لے (تو البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں چاہے اس کو معاوضہ کہو یا نہ کہو۔) اور (نہ اُس مخالفت کفار کو دریافت کر کے اُن کی ضرر رسانی سے اندیشہ کیجئے بلکہ تبلیغ میں) اُس حیّ لا یموت پر توکل رکھئے اور (اطمینان کے ساتھ) اُس کی تسبیح وتحمید میں لگے رہیئے اور (نہ مخالفت سُن کر تعجیل عقوبت کی اس خیال سے تمنّا کیجئے کہ ان کا ضرر دوسروں کو نہ پہنچ جائے کیونکہ) وہ (خدا) اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی (طور پر) خبردار ہے (وہ جب مناسب سمجھے گا سزا دیدے گا۔ پس ان جملوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حزن وفکر اور خوف کو زائل فرمایا ہے آگے پھر توحید کا بیان ہے) وہ ایسا ہے جس نے آسمان وزمین اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے سب چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اُس کی شان کے لائق ہے جس کا بیان سورۂ اعراف کے رکوع ہفتم کے شروع آیت میں گزر چکا) وہ بڑا مہربان ہے سو اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہئے (کہ وہ کیسا ہے کافر مشرک کیا جانیں اور اس معرفتِ صحیحہ کے نہ ہونے سے شرک کرتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ [1] وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (الزمر: ۶۷)) اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو (بوجہ جہل وعناد کے) کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے (جس کے سامنے ہم کو سجدہ کرنے کو کہتے ہو) کیا ہم اُس کو سجدہ کرنے لگیں گے جس کو تم سجدہ کرنے کے لئے ہم کو کہو گے اور اس سے اُن کو اور زیادہ نفرت ہوتی ہے (لفظ رحمٰن ان میں کم مشہور تھا مگر یہ نہیں کہ جانتے نہ ہوں مگر اسلامی تعلیم سے جو مخالفت بڑھی ہوئی تھی تو محاورات اور بول چال میں بھی مخالفت کو نباہتے تھے۔ قرآن میں جو یہ لفظ بکثرت آیا وہ اس کی بھی مخالفت کر بیٹھے۔) وہ ذات بہت عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور (اُن ستاروں میں سے دو بڑے نورانی اور فائدہ بخش ستارے بنائے یعنی) اُس (آسمان) میں ایک چراغ (یعنی آفتاب) اور نورانی چاند بنایا (شاید آفتاب کو سراج بوجہ تیزی کے کہا) اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ سب کچھ جو دلائل توحید اور اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہوا ہے) اُس شخص کے (سمجھنے کے) لئے (ہیں) جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے (کہ اس میں سمجھنے والے کی نظر میں استدلالات ہیں اور شکر گزاری کرنے والے کی نظر میں انعامات ہیں) ورنہ۔

[2] اگر صد بابِ حکمت پیشِ ناداں ۔۔۔ بخوانی آیدش بازیچہ درگوش

---

[1] ترجمہ: اور ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنا چاہئے تھا۔

[2] ترجمہ: اگر تم کسی نادان کے سامنے حکمت کے سو باب بھی پیش کر دو تو بھی وہ انہیں کھیل ہی سمجھے گا۔

معارف و مسائل

مخلوقاتِ الٰہیہ میں اسباب و مسببات کا رشتہ اور ان سب کا قدرتِ حق کا تابع ہونا

مذکور الصدر آیات میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور بندوں پر اس کے انعامات و احسانات کا ذکر ہے جس سے حق تعالیٰ کی توحید اور استحقاق عبادت میں اُس کے ساتھ کسی کا شریک نہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ دھوپ اور چھاؤں دونوں ایسی نعمتیں ہیں کہ اُن کے بغیر انسانی زندگی اور اس کے کاروبار نہیں چل سکتے۔ ہر وقت ہر جگہ دھوپ ہی دھوپ ہو جائے تو انسان اور ہر جاندار کے لئے کیسی مصیبت ہو جائے۔ یہ تو ظاہر ہے اور سایہ کا بھی یہی حال ہے کہ اگر ہر جگہ ہر وقت سایہ ہی رہے کبھی دھوپ نہ آئے تو انسان کی صحت و تندرستی نہیں رہ سکتی، اور بھی ہزاروں کاموں میں خلل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمائیں اور انسانوں کے لئے ان کو مُوجبِ راحت و سکون بنایا۔ لیکن حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے اس دُنیا میں پیدا ہونے والی تمام اشیاء کو خاص خاص اسباب کے ساتھ مربوط کر دیا ہے کہ جب وہ اسباب موجود ہوتے ہیں تو یہ چیزیں موجود ہو جاتی ہیں جب نہیں ہوتے تو یہ چیزیں بھی موجود نہیں رہتیں۔ اسباب قوی یا زیادہ ہوتے ہیں تو اُن کے مسببات کا وجود قوی اور زیادہ ہو جاتا ہے، وہ کمزور یا کم ہوتے ہیں تو مُسبّبات بھی کمزور یا کم ہو جاتے ہیں۔ غلّہ اور گھاس اُگانے کا سبب زمین اور پانی اور ہوا کو بنا رکھا ہے روشنی کا سبب آفتاب ماہتاب کو بنا رکھا ہے۔ بارش کا سبب بادل اور ہواؤں کو بنا رکھا ہے۔ اور ان اسباب اور اُن پر مرتب ہونے والے اثرات میں ایسا مستحکم اور مضبوط ربط قائم فرما دیا ہے کہ ہزاروں سال سے بغیر کسی ادنیٰ فرق کے چل رہے ہیں۔ آفتاب اور اس کی حرکت اور اس سے پیدا ہونے والے دن رات اور دھوپ چھاؤں پر نظر ڈالو تو ایسا مستحکم نظام ہے کہ صدیوں بلکہ ہزاروں سال میں ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ نہ کبھی آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی مشینری میں کوئی کمزوری آتی ہے، نہ کبھی ان کو اصلاح و مرمت کی ضرورت ہوتی ہے جب سے دُنیا وجود میں آئی ایک انداز ایک رفتار سے چل رہے ہیں حساب لگا کر ہزار سال بعد تک کی چیزوں کا وقت بتلایا جا سکتا ہے۔

سبب اور مُسبّب کا یہ مستحکم نظام جو حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا عجیب و غریب شاہکار اور اُس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی بُرہان قطعی ہے اس کے استحکام ہی نے لوگوں کو غفلت میں ڈال دیا کہ اُن کی نظروں میں صرف یہ اسبابِ ظاہرہ ہی رہ گئے اور انہی اسباب کو تمام چیزوں اور تاثیرات کا خالق و مالک سمجھنے لگے۔ مسبّب الاسباب کی اصلی قوت جو ان اسباب کی پیدا کرنے والی ہے وہ اسباب کے پردوں میں مستور ہو گئی۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی

کتابیں انسان کو بار بار اس پر تنبیہ کرتی ہیں کہ ذرا نظر کو بلند اور تیز کرو، اسباب کے پردوں کے پیچھے دیکھو کون اس نظام کو چلا رہا ہے تاکہ حقیقت تک راہ پاؤ۔ اسی سلسلے کے یہ ارشادات ہیں جو آیات مذکورہ میں آئے۔ آیت اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ میں غافل انسان کو اس پر تنبیہ کیا گیا ہے کہ تو روزانہ دیکھتا ہے کہ صبح کو ہر چیز کا سایہ جانبِ غرب دراز ہوتا ہے، پھر وہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ نصف النہار کے وقت معدوم یا کالعدم ہو جاتا ہے پھر زوال کے بعد یہی سایہ اسی تدریجی رفتار کے ساتھ مشرق کی جانب میں پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ ہر انسان اس دھوپ اور چھاؤں کے فوائد ہر روز حاصل کرتا ہے اور اُس کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ یہ سب کچھ آفتاب کے طلوع ہونے پھر بلند ہونے پھر غروب کی طرف مائل ہونے کے لازمی نتائج وثمرات ہیں، لیکن آفتاب کے کرہ کی تخلیق پھر اُس کے ایک خاص نظام کے تحت باقی رکھنے کا کام کس نے کیا، یہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا اس کے لئے دل کی آنکھیں اور بصیرت درکار ہے۔

آیتِ مذکورہ میں یہی بصیرت انسان کو دینا مقصود ہے کہ یہ سایوں کا بڑھنا گھٹنا اگرچہ تمہاری نظروں میں آفتاب سے متعلق ہے مگر اس پر بھی تو غور کرو کہ آفتاب کو اس شان کے ساتھ کس نے پیدا کیا اور اس کی حرکت کو ایک خاص نظام کے اندر کس نے باقی رکھا، جس کی قدرتِ کاملہ نے یہ سب کچھ کیا ہے وہی درحقیقت اس دھوپ چھاؤں کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اگر وہ چاہتا تو اس دھوپ چھاؤں کو ایک حالت پر قائم کر دیتا جہاں دھوپ ہے وہاں ہمیشہ دھوپ رہتی، جہاں چھاؤں ہے ہمیشہ چھاؤں رہتی مگر اس کی حکمت نے انسانی ضروریات وفوائد پر نظر کر کے ایسا نہیں کیا وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا کا یہی مطلب ہے۔

انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے سایہ کے واپس لوٹنے اور گھٹنے کو آیتِ مذکورہ میں اس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے کہ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ یعنی پھر سایہ کو ہم نے اپنی طرف سمیٹ لیا، یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جسم اور جسمانیت اور جہت اور سمت سے بالاتر ہے، اس کی طرف سایہ کا سمٹنا، اس کا مفہوم یہی ہے کہ اُس کی قدرتِ کاملہ سے یہ سب کام ہوا۔

رات میں نیند اور دن میں کام کی تخصیصات بھی بڑی حکمت پر مبنی ہیں

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ اس آیت میں رات کو لباس کے لفظ سے تعبیر فرمایا کہ جس طرح لباس انسان کے پورے بدن کا ساتر ہے اسی طرح رات ایک قدرتی پردہ کی چادر ہے جو پوری کائنات پر ڈال دی جاتی ہے۔ سُبَاتًا، سبت سے مشتق ہے جس کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں، سُبَات وہ چیز ہے جس سے کسی دوسری چیز کو قطع کیا جائے۔

نیند کو اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز بنایا ہے کہ دن بھر کی محنتوں کا تکان اور کمزوری اس سے قطع ہوجاتی ہے۔ افکار وخیالات منقطع ہوکر دماغ کو آرام ملتا ہے اس لئے سُبَات کا ترجمہ راحت کا کیا جاتا ہے۔ معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ ہم نے رات کو ایک چھپانے والی چیز بنایا پھر اُس میں انسان اور سارے جانداروں پر نیند مسلّط کردی جو اُن کے آرام وراحت کا سامان ہے۔

یہاں کئی چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ نیند کا راحت ہونا بلکہ راحت کی جان ہونا تو ہر شخص جانتا ہے مگر انسانی فطرت یہ ہے کہ روشنی میں نیند آنا مشکل ہوتا ہے اور آ بھی جائے تو جلد آنکھ کھل جاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے نیند کے مناسب رات کو تاریک بھی بنایا اور ٹھنڈا بھی۔ اسی طرح رات خود ایک نعمت ہے اور نیند دوسری نعمت، اور تیسری نعمت یہ ہے کہ سارے جہان کے انسانوں جانوروں کی نیند ایک ہی وقت رات میں جبری کردی۔ ورنہ اگر ہر انسان کی نیند کے اوقات دوسرے انسان سے مختلف ہوتے تو جس وقت کچھ لوگ سونا چاہتے دوسرے لوگ کاموں میں مصروف اور شور وشغب کا سبب بنے رہتے، اسی طرح جب دوسروں کے سونے کی باری آتی تو اس وقت کام کرنے والے چلنے پھرنے والے ان کی نیند میں خلل انداز ہوتے۔ اس کے علاوہ ہر انسان کی ہزاروں حاجتیں دوسرے انسانوں سے وابستہ ہوتی ہیں، باہمی تعاون وتناصر اور کاموں میں بھی شدید حرج ہوتا کہ جس شخص سے آپ کو کام ہے اُس کے سونے کا وقت ہے اور جب اُس کے جاگنے کا وقت آئے گا تو آپ کے سونے کا وقت ہوگا۔

اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بین الاقوامی معاہدہ سے کام لیا جاتا کہ سب لوگ اپنے سونے کا وقت ایک ہی مقرر کرلیں، اوّل تو ایسا معاہدہ اربوں کروڑوں انسانوں میں ہونا آسان نہ تھا پھر اُس پر کاربند رکھنے کے لئے ہزاروں محکمے کھولنے پڑتے اس کے باوجود عام قانونی اور معاہداتی طریقوں سے طے ہونے والی چیزوں میں جو خلل ہر جگہ رشوت، رعایت وغیرہ کے سبب پایا جاتا ہے وہ پھر بھی باقی رہتا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی قدرت کاملہ سے نیند کا ایک وقت جبری طور پر مقرر کردیا ہے کہ ہر انسان اور ہر جانور کو اُسی وقت نیند آتی ہے کبھی کسی ضرورت سے جاگنا بھی چاہے تو اُس کے لئے مشکل سے انتظام کرپاتا ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

اسی طرح وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ میں دن کو نشور یعنی زندگی فرمایا کیونکہ اس کا مقابل یعنی نیند ایک قسم کی موت ہے اور اس زندگی کے وقت کو بھی سارے انسانوں میں جبری طور پر ایک کردیا ہے ورنہ کچھ کارخانے اور دُکانیں دن کو بند رہتیں، رات کو کھلتیں، اور جب وہ کھلتیں تو دوسری بند ہوجاتیں۔ اس لحاظ سے دونوں میں کاروباری مشکلات پیش آتیں۔

جس طرح رات کو نیند کے لئے مخصوص فرما کر ایک بڑا انعام حق تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح دوسری ضروریاتِ زندگی

جو باہم اشتراک چاہتی ہیں اُن کے لئے بھی تقریبی طور پر ایسے ہی متحد اور مشترک وقت مقرر کر دیئے۔ مثلاً بھوک اور کھانے کی ضرورت صبح شام ایک امر مشترک ہے سب کو ان اوقات میں اس کی فکر ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں سب ضروریات کی فراہمی ہر ایک کے لئے آسان ہو جاتی ہیں کھانے کے ہوٹل اور دُکانیں ان وقتوں میں تیار کھانے سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر گھر میں یہ اوقات کھانے کی مصروفیت کے لئے متعین ہیں۔ یہ تعیین کی بڑی نعمت ہے جو حق تعالیٰ ہی کی حکمت بالغہ نے فطری طور پر انسان کی طبیعت میں رکھ دی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ طَهُوْرًا کا لفظ عربی زبان میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ طہور اُس کو کہا جاتا ہے جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیزوں کو بھی اُس سے پاک کیا جا سکے۔ حق تعالیٰ نے پانی کو یہ خاص صفت عطا فرمائی ہے کہ جیسے وہ خود پاک ہے اُس سے دوسری ہر قسم کی نجاست حقیقی و معنوی کو بھی دُور کیا جا سکتا ہے۔ اور جس پانی کو آدمی استعمال کرتے ہیں وہ عموماً وہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ کبھی بارش کی صورت میں کبھی برف اور اولے کی صورت میں۔ پھر وہی پانی پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ قدرتی پائپ لائن کی صورت میں ساری زمین پر پھیلتا ہے جو کہیں خود بخود چشموں کی صورت میں نکل کر زمین پر بہنے لگتا ہے۔ کہیں زمین کھود کر کنویں کی صورت میں نکالا جاتا ہے یہ سب پانی اپنی ذات سے پاک اور دوسری چیزوں کو پاک کرنے والا ہے اس پر قرآن و سنت کی نصوص بھی ناطق ہیں اور اُمّت کا اجماع بھی۔

یہ پانی جب تک کثیر مقدار میں ہو، جیسے تالاب، حوض، نہر کا پانی اس میں کوئی نجاست بھی گر جائے تو ناپاک نہیں ہوتا اس پر بھی سب کا اتفاق ہے بشرطیکہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو اور اس کا رنگ ذائقہ، بُو متغیر نہ ہو، لیکن تھوڑا پانی ہو اور اس میں نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے اسی طرح پانی کی کثیر و قلیل کی مقدار معیّن کرنے میں اقوال مختلف ہیں۔ تفسیر مظہری اور قرطبی میں اس جگہ پانی سے متعلق تمام مسائل تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں [1] اور یہ مسائل عام کتبِ فقہ میں بھی مذکور ہیں اس لئے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ اَنَاسِيَّ، اِنْسِیٌّ کی جمع ہے اور بعض نے فرمایا کہ انسان کی جمع ہے۔ آیت میں یہ بتلایا ہے کہ آسمان سے نازل کردہ پانی سے اللہ تعالیٰ زمین کو بھی سیراب کرتا ہے اور جانوروں کو بھی اور بہت سے انسانوں کو بھی۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جس طرح جانور سب کے سب اس پانی سے سیراب ہوتے ہیں اسی طرح انسان بھی سبھی اس پانی سے فائدہ اُٹھاتے اور سیراب ہوتے ہیں۔ پھر ان میں یہ تخصیص کہ بہت سے انسانوں کو سیراب کیا اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ بہت سے انسان اس سیرابی سے محروم اور الگ ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں بہت

[1] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۳۲ تا ۴۱ والقرطبی ج:۱۳ ص:۴۱ تا ۵۶

سے انسانوں سے وہ جنگل کے رہنے والے لوگ مراد ہیں جن کا عموماً گزارہ بارش کے پانی پر ہوتا ہے۔ شہری آبادی والے تو نہروں کے کناروں پر کنوؤں کے قریب آباد ہوتے ہیں بارش کے منتظر نہیں رہتے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ، مطلب آیت کا یہ ہے کہ بارش کو ہم بدلتے اور پھیرتے رہتے ہیں کبھی ایک شہر میں کبھی دوسرے میں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ جو لوگوں میں شہرت ہوتی ہے کہ اس سال بارش زیادہ ہے اس سال کم ہے یہ حقیقت کے اعتبار سے صحیح نہیں بلکہ بارش کا پانی تو ہر سال اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکساں نازل ہوتا ہے البتہ بحکمِ الٰہی یہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کی مقدار کسی شہر بستی میں زیادہ کر دی کسی میں کم کر دی۔ بعض اوقات کمی کر کے کسی بستی کے لوگوں کو سزا دینا اور متنبہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات زیادتی بھی عذاب بن جاتی ہے۔[1] تو یہی پانی جو خالص رحمت ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کرتے ہیں اُن کے لئے اسی کو عذاب اور سزا بنا دیا جاتا ہے۔

جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہادِ کبیر ہے

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾ یہ آیت مکی ہے جبکہ احکام کفار سے قتال و جنگ کے نازل نہیں ہوئے تھے اسی لئے یہاں جہاد کو بِهٖ کے ساتھ مقید کیا گیا۔ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفین اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد، قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلقِ خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دوسرے طریقوں سے اس سب کو یہاں جہاد کبیر فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ لفظ مَرَجَ آزاد چھوڑ دینے کے معنے میں آتا ہے اسی وجہ سے مَرَج چراگاہ کو کہتے ہیں جہاں جانور آزادی سے چلیں پھریں اور چریں۔ عَذْبٌ میٹھے پانی کو کہا جاتا ہے۔ فُرَاتٌ خوش ذائقہ اور خوشگوار اور مِلْحٌ نمکین، اُجَاجٌ تیز و تلخ۔

حق تعالیٰ نے اپنے فضل اور حکمتِ بالغہ سے دنیا میں دو طرح کے دریا پیدا فرمائے ہیں۔ ایک سب سے بڑا بحرِ محیط جس کو سمندر کہتے ہیں اور زمین کے سب اطراف اس میں گھرے ہوئے ہیں ایک چوتھائی کے قریب حصّہ ہے جو اس سے کھلا ہوا ہے اس میں ساری دُنیا آباد ہے۔ یہ سب سے بڑا دریا بتقاضائے حکمت سخت نمکین تلخ اور بدمزہ ہے۔ زمین کے آباد حصّے پر آسمان سے اُتارے ہوئے پانی کے چشمے، ندیاں نہریں اور بڑے بڑے دریا ہیں یہ سب میٹھے خوشگوار اور خوش ذائقہ ہیں۔ انسان کو اپنی پینے اور پیاس بجھانے اور روزمرّہ کے استعمال میں ایسے ہی شیریں پانی کی ضرورت ہے جو حق تعالیٰ نے زمین کے آباد حصّہ میں مختلف صورتوں میں مہیا فرما دیا ہے۔ لیکن بحرِ محیط سمندر اگر میٹھا ہوتا تو میٹھے پانی کا خاصہ ہے کہ بہت

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۵۷، وتفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۶ ص:۱۱۶

جلد سڑ جاتا ہے، خصوصاً سمندر جس میں خشکی کی آبادی سے زیادہ دریائی انسانوں جانوروں کی آبادی بھی ہے، جو اس میں مرتے ہیں، وہیں سڑتے اور مٹی ہو جاتے ہیں اور پوری زمین کے پانی اور اُس میں بہنے والی ساری گندگیاں بھی بالآخر سمندر میں جا کر پڑتی ہیں۔ اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو دو چار دن میں ہی سڑ جاتا، اور یہ سڑتا تو اس کی بدبو سے زمین والوں کو زمین پر رہنا مصیبت ہو جاتا، اس لئے حکمتِ خداوندی نے اس کو اتنا سخت نمکین اور کڑوا اور تیز بنا دیا کہ دُنیا بھر کی گندگیاں اس میں جا کر بھسم ہو جاتی ہیں اور خود اس میں رہنے والی مخلوق بھی جو اسی میں مرتی ہے وہ بھی سڑنے نہیں پاتی۔

آیتِ مذکورہ میں ایک تو اس انعام و احسان کا ذکر ہے کہ انسان کی ضرورت کا لحاظ فرما کر دو قسم کے دریا پیدا فرمائے۔ دوسرے اس قدرتِ کاملہ کا کہ جس جگہ میٹھے پانی کا دریا یا نہر سمندر میں جا کر گرتے ہیں اور میٹھا اور کڑوا دونوں پانی یکجا ہو جاتے ہیں وہاں یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دونوں پانی میلوں دُور تک اس طرح ساتھ لگے ہوئے چلتے ہیں کہ ایک طرف میٹھا، دوسری طرف کڑوا اور ایک دوسرے سے نہیں ملتے، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کوئی آڑ حائل نہیں ہوتی۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا نسب اس رشتہ اور قرابت کو کہا جاتا ہے جو باپ یا ماں کی طرف سے ہو، اور صہر سے وہ رشتہ و تعلق ہے جو بیوی کی طرف سے ہو جس کو عرف میں سسرال بولتے ہیں۔ یہ سب تعلقات اور قرابتیں اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جو انسان کی خوشگوار زندگی کے لئے لازمی ہیں، اکیلا آدمی کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿۵۷﴾ یعنی تمہیں ایمان کی دعوت اور اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے اور دُنیا و آخرت میں تمہارے لئے فلاح کی کوشش کرنے میں میرا کوئی دُنیوی فائدہ نہیں۔ میں اپنی اس محنت کا تم سے کوئی اجر و معاوضہ نہیں مانگتا، میرا فائدہ اس کے سوا نہیں کہ جس کا جی چاہے اللہ کا راستہ اختیار کر لے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص راہ پر آ جائے تو فائدہ اُسی کا ہے اس کو اپنا فائدہ قرار دینا پیغمبرانہ شفقت کی طرف اشارہ ہے کہ میں تمہارے فائدہ ہی کو اپنا فائدہ سمجھتا ہوں۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی بوڑھا ضعیف باپ اولاد کو کہے کہ تم کھاؤ پیو اور خوش رہو، یہی میرا کھانا پینا اور خوش رہنا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کو اپنا فائدہ اس لحاظ سے فرمایا ہو کہ اس کا ثواب آپ کو ملے گا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ جو شخص کسی کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا ہے اور وہ اس کے کہنے کے مطابق نیک عمل کرے تو اس کے عمل کا ثواب خود کرنے والے کو بھی پورا پورا ملے گا اور اتنا ہی ثواب ہدایت کرنے والے شخص کو بھی ملے گا۔ (مظہری) [1]

فَسْئَلْ بِهِ خَبِيرًا ﴿۵۹﴾ یعنی آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنا پھر اپنی شان کے مطابق اُن پر جلوہ افروز ہونا سب اللہ رحمٰن کا کام ہے اس کی تصدیق و تحقیق مطلوب ہو تو کسی باخبر سے پوچھئے۔ باخبر سے مراد حق تعالیٰ یا جبرئیل امین ہیں اور یہ احتمال بھی

[1] تفسير المظهري ج:۷ ص:۴۳، وصحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب الحث على الصدقة إلخ ج:۱ ص:۳۲۷

ہے کہ اس سے مراد کتبِ سابقہ کے علماء ہوں جن کو اپنے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس معاملہ کی اطلاع ملی ہے۔ (مظہری) [1]

قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۚ لفظ رحمٰن عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی سب عرب جانتے تھے مگر یہ لفظ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ بولتے تھے اسی لئے یہاں یہ سوال کیا کہ رحمٰن کون اور کیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

مقصود ان آیات سے انسان کو یہ بتلانا ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے اور شمس و قمر اور اُن کے ذریعہ رات دن کا انقلاب اور ان کی تاریکی اور روشنی اور زمین و آسمان کی تمام کائنات اس لئے پیدا کئے ہیں کہ غور و فکر کرنے والے کو اس میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور توحید کے دلائل فراہم ہوں۔ اور شکر گزار کے لئے شکر کے مواقع ملیں تو جس شخص کا وقت دُنیا میں ان دونوں چیزوں سے خالی گزر گیا اس کا وقت ضائع ہو گیا اور اس کا راس المال بھی فنا ہو گیا [2] اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الذّٰكِرِيْنَ الشّٰكِرِيْنَ۔

ابنِ عربی فرماتے ہیں کہ میں نے شہیدِ اکبر سے سنا ہے کہ بڑے غبن اور خسارہ میں ہے وہ آدمی جس کی عمر ساٹھ سال ہوئی۔ اس میں سے آدھا وقت تیس سال رات کو سونے میں گزر گئے اور چھٹا حصّہ یعنی دس سال دن کو آرام کرنے میں گزر گیا تو ساٹھ میں سے صرف بیس سال کام میں لگے۔ [3] قرآنِ حکیم نے اس جگہ بڑے بڑے ستاروں اور سیاروں اور فلکیات کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن ان چیزوں کا ذکر بار بار اس لئے کرتا ہے کہ تم ان کی تخلیق اور ان کی حرکات اُن سے پیدا ہونے والے آثار میں غور کر کے اُن کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے کو پہچانو اور شکر گزاری کے ساتھ اُسے یاد کرتے رہو۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اجرام سماویہ اور فلکیات کی حقیقت اور ہیئت کیا ہے یہ آسمانوں کے جرم کے اندر سمائے ہوئے ہیں یا اُن سے باہر کی فضائے آسمانی میں ہیں۔ انسان کے معاش یا معاد کا کوئی مسئلہ اس سے وابستہ نہیں اور ان کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے لئے آسان بھی نہیں۔ جن لوگوں نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کی ہیں ان کے اقرار سے ثابت ہے کہ وہ بھی کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہیں کر سکے اور جو فیصلے کئے وہ بھی خود دوسرے حکماء کی مخالف تحقیقات نے مخدوش و مجروح کر دیئے، اس لئے تفسیرِ قرآن میں اس سے زیادہ کسی بحث میں پڑنا بھی کوئی قرآن کی ضروری خدمت نہیں۔ لیکن اس زمانے کے ماہرین سائنس نے مصنوعی سیارات اُڑانے اور چاند تک پہنچ جانے اور وہاں کی مٹی پتھر،

---

[1] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۴۴

[2] ترجمہ: اے اللہ ہمیں ذکر کرنے اور شکر کرنے کی توفیق عطا فرما۔

[3] احکام القرآن لابن العربیؒ تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:١٦٩

غاروں، پہاڑوں کے فوٹو فراہم کرنے میں بلاشبہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے مگر افسوس ہے کہ قرآن حکیم ان چیزوں سے انسان کو جس حقیقت شناسی کا سبق دینا چاہتا ہے یہ لوگ اپنی تحقیقی کاوشوں کے غرور میں مست ہو کر اُس سے اور زیادہ دُور ہو گئے اور عام لوگوں کے ذہنوں کو بھی بُری طرح اُلجھا دیا، کوئی ان چیزوں کو قرآن کے خلاف سمجھ کر مشاہدات کا ہی انکار کر دیتا ہے کوئی قرآن کریم میں تاویلات کرنے لگتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو واضح کر دیا جائے۔ سورۂ حجر کی آیت [۱] وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا (الحجر:۱۶) کے تحت اس کا وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ سورۂ فرقان میں اس کی تفصیل لکھی جائے گی وہ حسب ذیل ہے: وَاللّٰہُ الموفق۔

ستارے اور سیّارے آسمانوں کے اندر ہیں یا باہر قدیم وجدید علمِ ہیئت کے نظریات اور قرآنِ کریم کے ارشادات

جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا کے الفاظ سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بُروج یعنی سیّارے آسمانوں کے اندر ہیں کیونکہ حرف فی ظرفیت کے مستعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح سورۂ نوح میں ہے [۲] اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ (نوح) اس میں فِيْهِنَّ کی ضمیر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کی طرف راجع ہے جس سے ظاہراً یہی مفہوم ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں کے اندر ہے۔ لیکن یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن کریم میں لفظ سماء جس طرح اس عظیم الشان اور وہم وگمان سے زائد وسعت رکھنے والی مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں قرآن کی تصریحات کے مطابق دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کے پہرے ہیں جو خاص خاص اوقات میں کھولے جاتے ہیں اور جن کی تعداد قرآن کریم نے سات بتلائی ہے اسی طرح یہ لفظ سماء ہر بلند چیز جو آسمان کی طرف ہو اُس پر بھی بولا جاتا ہے۔ آسمان وزمین کے درمیان کی فضاء اور اُس سے آگے جس کو آج کل کی اصطلاح میں خلا بولتے ہیں یہ سب دوسرے معنی کے اعتبار سے لفظ سماء کے مفہوم میں داخل ہیں۔ [۳] وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ (الفرقان) اور اسی طرح کی دوسری آیتیں جن میں آسمان سے پانی برسانے کا ذکر ہے ان کو اکثر مفسرین نے اسی دوسرے معنی پر محمول فرمایا ہے۔ کیونکہ عام مشاہدات سے بھی یہ ثابت ہے کہ بارش ان بادلوں سے برستی ہے جو آسمان کی بلندی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے اور خود قرآن کریم نے بھی دوسری آیات میں بادلوں سے پانی برسانے کی تصریح فرمائی ہے ارشاد ہے [۴] ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ

---

[۱] ترجمہ: اور بے شک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے۔

[۲] ترجمہ: کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے اور ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔

[۳] ترجمہ: اور ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں جو پاک صاف کرنے کی چیز ہے۔

[۴] ترجمہ: اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں۔

نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ (الواقعہ) اس میں مُزْنٌ، مُزْنَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی سفید بادل کے آتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ کیا بارش کو سفید بادلوں سے تم نے اُتارا ہے یا ہم نے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے [1] وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ (النبا: ۱۴) اس میں معصرات کے معنی پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے ہی پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا۔ قرآن مجید کی ان واضح تصریحات اور عام مشاہدات کی بناء پر جن آیاتِ قرآن میں بارش کا آسمان سے برسانا مذکور ہے اُن میں بھی اکثر مفسرین نے لفظ سماء کے یہی دوسرے معنی لئے ہیں یعنی فضاء آسمانی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم اور لُغت کی تصریحات کے مطابق لفظ سماء فضائے آسمانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور خود جرم آسمان کے لئے بھی۔ تو ایسی صورت میں جن آیات میں کواکب اور سیّارات کے لئے فِي السَّمَآءِ کا لفظ استعمال ہوا ہے اُن کے مفہوم میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ یہ کواکب اور ستارے جرم آسمان کے اندر ہوں یا فضائے آسمانی میں آسمانوں کے نیچے ہوں۔ اور دو احتمالوں کے ہوتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن نے ستاروں اور سیاروں کو آسمان کے اندر قرار دیا ہے یا اُن سے باہر فضائے آسمانی میں۔ بلکہ الفاظِ قرآن کے اعتبار سے دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ کائنات کی تحقیقات اور تجربے اور مشاہدے سے جو صورت بھی ثابت ہو جائے قرآن کی کوئی تصریح اس کے منافی نہیں ہے۔

حقائقِ کونیہ اور قرآن

یہاں ایک بات اُصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جس کا موضوعِ بحث حقائق کائنات یا آسمان اور ستاروں کی ہیئت و حرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ آسمان و زمین اور اُن کے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے اُن میں غور و فکر کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآنِ عزیز ان حقائقِ کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتا ہے جن کا تعلق اس کے عقیدے اور نظریے کی درستی سے ہو یا اس کے دینی اور دنیوی منافع اُن سے متعلق ہوں۔ مثلاً قرآنِ کریم نے آسمان و زمین اور ستاروں، سیاروں کا اور اُن کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب و غریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہو گئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحبِ قدرت و قوت ہے۔ اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائی مخلوقات اور ستاروں، سیاروں کے مادّے کی حقیقت

[1] ترجمہ: اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا۔

اور اُن کی اصلی ہیئت وصورت اور اُن کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جس کو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس وقمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہوجانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب وغریب نظام سے، جس میں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان سب اُمور سے ایک ادنیٰ عقل وبصیرت رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا، کوئی اس کو بنانے چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اس کی طرف دعوت دی۔ قرآن کی دعوت صرف اُسی حد تک ان چیزوں میں غور وفکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیّا کرنے اور اجرامِ سماویہ کی ہیئتیں دریافت کرنے کا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر ان آیاتِ کونیہ میں تدبر اور غور وفکر کا یہ مطلب ہوتا کہ اُن کے حقائق اور ہیئات اور اُن کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اہتمام نہ فرماتے، خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم اور تعلّم کا سلسلہ دُنیا میں اُس وقت موجود بھی تھا۔ مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے فیثاغورس کا اور اُس کے کچھ بعد بطلیموس کا نظریہ دُنیا میں شائع اور رائج ہوچکا تھا اور اُس زمانے کے حالات کے مناسب آلاتِ رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہوچکے تھے مگر جس ذاتِ قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابۂ کرام نے بلاواسطہ آپ سے ان کو پڑھا اُنہوں نے کبھی اس طرف التفات تک نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیاتِ کونیہ میں تدبّر اور غور وفکر کا وہ منشاء ہرگز نہ تھا جو آج کل کے بعض تجدد پسند علماء نے یورپ اور اُس کی تحقیقات سے متأثر ہوکر اختیار کیا ہے کہ خلائی سفر، چاند اور مریخ وزہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ اُن سے بحث کرتا ہے اور نہ اُن کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول واسلوب کائنات ومخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اُسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جس قدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کرسکتا ہے اور جس کے حصول پر تخمیناً اس کو اطمینان بھی ہوسکتا ہے۔ فلسفیانہ دور از کار بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کرلینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں، ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں اُلجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزلِ مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات ومخلوقات سے آگے اپنے خالق کی

مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائقِ کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پورا عبور انسان کے بس میں ہے۔ ہر زمانے کے فلاسفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے اکتشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جاسکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون، فلکیات، کائنات فضا، ابر و باراں، خلا، طبقات الارض، پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات سے اور عام انسان اور انسانی علوم وفنون، تجارت، زراعت صنعت وغیرہ ان سب میں سے قرآنِ حکیم صرف اُن کی رُوح اور مشاہداتی حصہ کو اس قدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دُنیوی ضرورت متعلق ہے، دور از کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت بھی پائی جاتی ہے۔

تفسیرِ قرآن میں فلسفی نظریات کی موافقت یا مخالفت کا صحیح معیار

علمائے اہلِ حق قدیم وجدید اس پر متفق ہیں کہ ان مسائل کے متعلق جو بات قرآنِ کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے، اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اُس سے مختلف ہو تو اس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں، اس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا، البتہ جن مسائل میں قرآنِ کریم کی کوئی تصریح موجود نہیں الفاظ قرآنی میں دونوں معنے کی گنجائش ہے وہاں اگر مشاہدات اور تجربے سے کسی ایک نظریہ کو قوت حاصل ہو جائے تو آیتِ قرآن کو بھی اُسی معنی پر محمول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جیسے اسی آیت جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا (الفرقان:٦١) میں ہے کہ قرآن کریم نے اس بارہ میں کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا کہ ستارے آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضائے آسمانی میں ہیں۔ آج کل جبکہ خلائی تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان سیّارات تک پہنچا جاسکتا ہے تو اس سے فیثاغورسی نظریہ کی تائید ہوگئی کہ ستارے آسمانوں میں پیوست نہیں کیونکہ قرآنِ کریم اور احادیث صریحہ کی تصریحات کی رُو سے آسمان ایک ایسا حصار ہے جس میں دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے اُن میں ہر شخص داخل نہیں ہوسکتا۔ اس مشاہدے اور تجربے کی بناء آیت مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا جائے گا کہ کواکب کو فضائے آسمانی میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ کوئی تاویل نہیں بلکہ دو مفہوم میں سے ایک کی تعیین ہے۔ لیکن اگر کوئی سرے سے آسمانوں کے وجود کا انکار کرے جیسے بعض ہیئتِ جدید والے کہتے ہیں یا کوئی یہ دعویٰ کرے کہ راکٹوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ آسمانوں کے اندر داخلہ ہوسکتا ہے تو از روئے قرآن اُس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں یہ بات واضح طور پر بتلائی ہے کہ آسمانوں میں دروازے ہیں اور وہ دروازے خاص خاص حالات میں کھولے جاتے ہیں ان دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ مسلّط ہے۔ آسمانوں میں داخلہ ہر شخص کا جب چاہے نہیں ہوسکتا، اس دعوے کی وجہ سے اُن آیات میں کوئی تاویل نہیں کی جائے گی اور اس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا۔

اسی طرح جبکہ قرآن کریم کی آیت [1] وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾ (یٰسٓ) سے ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے تو اس معاملہ میں بطلیموسی نظریہ کو غلط قرار دیا جائے گا جس کی رُو سے ستارے آسمان کے جرم میں پیوست ہیں وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ آسمان کی حرکت کے تابع اُن کی حرکت ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قدیم مفسرین میں سے بعض لوگ جو فلکیات کے متعلق بطلیموسی نظریے کے معتقد تھے اُنہوں نے اُن آیاتِ قرآنی میں تاویلات سے کام لیا جن سے بطلیموسی نظریہ کے خلاف کوئی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح آج کے بعض مصنّفین جن آیات کو جدید ہیئت کے نظریات سے مختلف سمجھتے ہیں ان میں تاویلات کرکے اُس کے مطابق بنانے کی فکر کرتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں درست نہیں سلف صالحین کے طریقے کے خلاف اور قابلِ تردید ہے۔ البتہ واقعہ یہی ہے کہ اس وقت تک ہیئتِ جدید نے جو نئی تحقیقات پیش کی ہیں اُن میں آسمانوں کے انکار کے سوا کوئی بھی قرآن وسنت کے خلاف نہیں، بعض لوگ اپنے قصورِ علم سے اُن کو قرآن یا سنت کے خلاف سمجھ کر تاویلات کے درپے ہوجاتے ہیں۔

زمانۂ حال کے سب سے بڑے مفسرِ قرآن سیّد محمود آلوسی بغدادی جن کی تفسیر روح المعانی علماءِ سلف کی تفاسیر کا بہترین خلاصہ اور عرب وعجم مشرق ومغرب میں مقبول ومستند تفسیر ہے۔ موصوف جس طرح قرآن وسنت کے متبحر عالم ہیں اسی طرح فلسفہ وہیئت قدیم وجدید کے بھی بڑے عالم ہیں۔ اُنہوں نے اپنی تفسیر میں تحقیقات فلسفیہ کے متعلق یہی اُصول قرار دیا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اُن کے پوتے علامہ سیّد محمود شکری آلوسی نے ان مسائل پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے مَا دَلَّ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ مِمَّا یَعْضِدُ الْهَیْئَةَ الْجَدِیْدَةَ الْقَوِیْمَةَ الْبُرْهَانُ، جس میں ہیئت جدیدہ کے نظریات کی تائید قرآن کریم کی روشنی میں کی گئی ہے مگر دوسرے تجدد پسند علماء کی طرح قرآنی آیات میں کسی قسم کی تاویل کو روا نہیں رکھا۔ اُن کے چند جملے اس جگہ نقل کردینا کافی ہیں جو ہیئتِ جدیدہ کی تائید میں لکھے ہیں وہ فرماتے ہیں:

رَاَیْتُ كَثِیْرًا مِّنْ قَوَاعِدِهَا لَا یُعَارِضُ النُّصُوْصَ الْوَارِدَةَ فِی الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ عَلٰی اَنَّهَا لَوْ خَالَفَتْ شَیْئًا مِّنْ ذٰلِكَ لَمْ یُلْتَفَتْ اِلَیْهَا وَلَمْ نُؤَوِّلِ النُّصُوْصَ لِاَجْلِهَا وَالتَّاْوِیْلُ فِیْهَا لَیْسَ مِنْ مَذْهَبِ السَّلَفِ الْحَرِیَّةِ بِالْقُبُوْلِ بَلْ لَا بُدَّ اَنْ نَّقُوْلَ اِنَّ الْمُخَالِفَ لَهَا مُشْتَمِلٌ عَلٰی خَلَلٍ فِیْهِ فَاِنَّ الْعَقْلَ الصَّرِیْحَ لَا یُخَالِفُ النَّقْلَ الصَّحِیْحَ بَلْ كُلٌّ مِّنْهُمَا یُصَدِّقُ الْاٰخَرَ وَیُؤَیِّدُهٗ (مَا دَلَّ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ)۔

میں نے ہیئتِ جدیدہ کے بہت سے قواعد کو دیکھا ہے وہ قرآن وسنت کی نصوص کے خلاف نہیں۔ اور اس کے باوجود اگر وہ قرآن وسنت کی کسی نص کے خلاف ہو تو ہم اس کی طرف رُخ نہ کریں گے اور

[1] ترجمہ: اور دونوں ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

قرآن وسنت کی نصوص میں اس کی وجہ سے تاویل نہ کریں گے کیونکہ ایسی تاویل سلف صالحین کے مذہب مقبول میں نہیں ہے بلکہ ہم اُس وقت یہ کہیں گے کہ جو نظریہ قرآن وسنت کے خلاف ہے اس میں ہی کوئی خلل ہے کیونکہ عقلِ سلیم اور نقلِ صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فلکیات اور ستاروں، سیّاروں کی حرکات اور ہیئات کے متعلق بحث وتحقیق کوئی نیا فن نہیں، ہزاروں سال پہلے سے ان مسائل پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کا چرچا قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے اس فن کا بڑا معلّم فیثاغورس گزرا ہے جو اطالیہ کے مدرسہ کروتونا میں باقاعدہ اس کی تعلیم دیتا تھا، اس کے بعد میلاد مسیح علیہ السلام سے تقریباً ایک سو چالیس سال پہلے اس فن کا دوسرا محقق بطلیموس رومی آیا اور اسی زمانے میں ایک دوسرے فلاسفر ہیئر خوس کی شہرت ہوئی جس نے زاویے ناپنے کے آلات ایجاد کئے۔

فیثاغورس اور بطلیموس کے نظریات ہیئتِ افلاک کے متعلق بالکل ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ بطلیموس کو اپنے زمانے کی حکومت اور عوام کا تعاون حاصل ہوا۔ اس کا نظریہ اتنا پھیلا کہ فیثاغورس کا نظریہ گوشۂ گمنامی میں جا پڑا۔ اور جب یونانی فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو یہی بطلیموس کا نظریہ ان کتابوں میں منتقل ہوا اور اہلِ علم میں عام طور سے یہی نظریہ جانا پہچانا گیا۔ بہت سے مفسرین نے آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر میں بھی یہی نظریہ سامنے رکھ کر کلام کیا۔ گیارہویں صدی ہجری اور پندرہویں صدی عیسوی جس میں اقوام یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا اور یوروپین محققین نے ان مسائل پر کام کرنا شروع کیا جن میں سب سے پہلے کوپرنک پھر جرمنی میں کیلر اور اطالیہ میں گلیلیو وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ انہوں نے ازسرنو ان مباحث کا جائزہ لیا، یہ سب اس پر متفق ہوگئے کہ ہیئت افلاک کے متعلق بطلیموسی نظریہ غلط اور فیثاغورس کا نظریہ صحیح ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری میں اسحٰق نیوٹن کی شہرت ہوئی۔ اس کی تحقیقات وایجادات نے اس کو مزید تقویت پہنچائی۔ اس نے یہ تحقیق کی کہ وزنی چیزیں اگر ہوا میں چھوڑی جائیں تو اُن کے زمین پر آگرنے کا سبب وہ نہیں جو بطلیموسی نظریہ میں بتلایا گیا ہے کہ زمین کے وسط میں مرکزِ عالم ہے اور تمام وزنی چیزیں مرکز کی طرف فطرۃً رجوع کرتی ہیں بلکہ اُس نے بتلایا کہ جتنے ستارے اور سیّارات ہیں سب میں ایک جذب وکشش کا مادہ ہے زمین بھی اسی طرح کا ایک سیّارہ ہے اس میں بھی کشش ہے۔ جس حد تک زمین کی کشش کا اثر رہتا ہے وہاں سے ہر وزنی چیز زمین پر آئے گی لیکن اگر کوئی چیز اس کی کشش کے دائرہ سے باہر نکل جائے تو وہ پھر نیچے نہیں آئے گی۔

حال میں روسی اور امریکی ماہرین نے قدیم اسلامی فلاسفر ابوریحان بیرونی کی تحقیقات کی امداد سے راکٹ وغیرہ

ایجاد کر کے اس کا عملی تجربہ اور مشاہدہ کر لیا کہ راکٹ جب اپنی شدید قوت اور تیز رفتاری کے سبب زمین کی کشش کو توڑ کر اس کے دائرہ سے باہر نکل گیا تو پھر یہ نیچے نہیں آتا بلکہ ایک مصنوعی سیارے کی صورت اختیار کر لیتا اور اپنے مدار پر چکّر لگاتا ہے۔ پھر ان مصنوعی سیّاروں کا تجربہ کرتے کرتے اس کے ماہرین نے سیّارات تک پہنچنے کی تدبیریں شروع کیں اور بالآخر چاند پر پہنچ گئے جس کی تصدیق اس زمانے کے تمام ماہرین فن موافق ومخالف نے کی اور اب تک چاند پر بار بار جانے، وہاں کے پتھر، خاک وغیرہ لانے اور اس کے فوٹو مہیّا کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے سیّارات تک پہنچنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں اور خلانوردی خلا پیمائی کی مشقیں جاری ہیں۔

ان میں سے امریکن خلانورد جان گلین جو کامیابی کے ساتھ خلا کا سفر کر کے واپس آیا اور اس کی کامیابی پر اس کے موافق ومخالف سبھی نے اعتماد کیا، اس کا ایک بیان امریکہ کے مشہور ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ میں اور اس کا اُردو ترجمہ امریکہ کے اُردو ماہنامہ سیربین میں مفصّل شائع ہوا ہے، یہاں اس کے اہم اقتباسات ماہنامہ سیربین سے نقل کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے زیر بحث مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے جان گلین نے اپنے طویل مقالہ میں خلاء کے عجائب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہی وہ ایک واحد شئ ہے جو خلاء میں خدا کے وجود پر دلالت کرتی ہے، اور یہ کہ کوئی طاقت ہے جو ان سب کو مرکز ومحور سے وابستہ رکھتی ہے۔''

آگے لکھا ہے کہ:

''اس کے باوجود خلا میں پہلے ہی سے جو عمل جاری ہے اُس کو دیکھتے ہوئے ہماری کوششیں انتہائی حقیر ہیں۔ سائنسی اصطلاحات وپیمانوں میں خلائی پیمائش ناممکن ہے۔''

آگے ہوائی جہاز کی مشینی قوت کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ:

''لیکن ایک یقینی اور غیر محسوس قوت کے بغیر اس کا استعمال بھی محدود اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ جہاز کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تعینِ رُخ کی حاجت ہوتی ہے اور یہ کام قطب نما سے لیا جاتا ہے۔ وہ قوت جو قطب نما کو متحرک رکھتی ہے ہمارے تمام حواس خمسہ کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ سُن سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں نہ چکھ سکتے ہیں نہ سونگھ سکتے ہیں حالانکہ نتائج کا ظہور اس پر واضح دلالت کر رہا ہوتا ہے کہ یہاں کوئی پوشیدہ قوت ضرور موجود ہے۔''

آگے سب سیر وسفر کے نتیجہ کے طور پر لکھتا ہے:

''عیسائیت کے اُصول ونظریات کی حقیقت بھی ٹھیک یہی کچھ ہے۔ اگر ہم ان کو اپنا رہنما بنائیں تو

باوجودیکہ ہمارے حواس ان کے ادراک سے عاجز ہوتے ہیں لیکن اس رہنما قوت کے نتائج وتأثرات اپنے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی زندگیوں میں کھلی آنکھیں دیکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور اس بناء پر کہتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک رہنما قوت موجود ہے۔''

یہ ہیں خلاء کے مسافروں اور سیّارات پر کمند پھینکنے والوں کی کمائی کے حاصلات جو آپ نے امریکی خلانورد کے بیان میں پڑھ لیں کہ اس تمام تگ ودَو کے نتیجہ میں رازِ کائنات اور اس کی حقیقت تک رسائی تو کیا ہوتی، بے حد وبے حساب سیّارات ونجوم کی گردوں کا ادراک ہوکر اور حیرانی بڑھ گئی۔ سائنسی آلات سے ان کی پیائش کے ناممکن ہونے اور اپنی سب کوششوں کی اس کے مقابلہ میں حقارت کا اقرار واعتراف کرنا پڑا۔ بس حاصل اتنی بات ہوئی کہ یہ سب نظامِ کائنات اور نجوم وسیّارات خود بخود نہیں، بلکہ کسی عظیم اور غیر محسوس طاقت کے زیرِ فرمان چل رہے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس کو انبیاء علیہم السلام نے پہلے قدم پر عام انسانوں کو بتلا دیا تھا اور قرآن کریم کی بیشمار آیات میں اسی چیز کا یقین دلانے کے لئے آسمان وزمین، نجوم وسیّارات وغیرہ کے حالات پر غور وفکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ جس طرح زمین میں بیٹھ کر آسمانی فضاؤں اور نجوم وسیّارات کی تحقیقات وہیئات پر فلسفیانہ بحثیں کرنے والے ان چیزوں کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے اور بالآخر اپنے عجز وبے بسی کا اعتراف کیا۔ اسی طرح یہ زمین سے لاکھوں میل اُوپر کا سفر کرنے والے اور چاند کے پتھر اور مٹی اور وہاں کے فوٹو لانے والے بھی حقیقت شناسی کے میدان میں کچھ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ان تحقیقات نے انسان اور اِنسانیت کو کیا بخشا

جہاں تک انسانی جدوجہد اور فکری ارتقاء اور اس کی اعجوبہ کاری اور حیرت انگیز انکشافات کا معاملہ ہے وہ اپنی جگہ درست اور عام نظروں کے اعتبار سے قابلِ تحسین بھی ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ بے مصرف شعبدہ گری اور تماش بینی جس سے انسان اور انسانیت کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو وہ حکماء وعقلاء کا کام نہیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اس پچاس سال کی جدوجہد اور اربوں کھربوں روپیہ جو بہت سے انسانوں کے مصائب دُور کرنے کے لئے کافی ہوتا اُس کو آگ کی نذر کردینے اور چاند تک پہنچ کر وہاں کی خاک اور پتھر سمیٹ لانے سے انسان اور انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا۔ انسان کی بڑی بھاری تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بھوک سے مرتے ہیں اُن کو لباس اور سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں، کیا اس جدوجہد نے ان کے افلاس ومصیبت کا کوئی حل نکالا، یا ان کے امراض وآفات سے صحت وعافیت کا کوئی انتظام کیا یا ان کے لئے قلبی سکون وراحت کا کوئی سامان فراہم کیا؟ تو یقین ہے کہ کسی کے پاس اس کا جواب بجز نفی کے نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت انسان کو ایسے لایعنی مشغلے میں مبتلا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور کائناتِ عالم میں غور وفکر اور تدبیر کی دعوت صرف دو حیثیتوں سے دیتے ہیں۔ پہلی حیثیت جو اصل مقصود ہے یہ ہے کہ ان آثار عجیبہ کو دیکھ کر مؤثر حقیقی اور اُس غیر محسوس قوت کا یقین کرلیں جو اس سارے نظام کو چلا رہی ہے، اُسی کا نام خدا ہے۔ دوسرے ان زمینی اور آسمانی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لئے ہر ضرورت کی چیز ودیعت فرمادی ہے انسان کا کام یہ ہے کہ اپنی عقل وشعور اور جدوجہد سے کام لے کر اُن چیزوں کو زمین کے خزائن سے نکالنے اور استعمال کرنے کے طریقے سیکھ لے۔ پہلی حیثیت اصل مقصود ہے اور دوسری حیثیت ثانوی رفع ضرورت کے لئے ہے اس لئے ضرورت سے زائد اس میں انہماک پسندیدہ نہیں اور کائناتِ عالم میں غور وفکر اور تدبر کی دونوں حیثیتیں انسان کے لئے آسان بھی ہیں نتیجہ خیز بھی۔ اور ان دونوں حیثیتوں کے نتائج میں قدیم وجدید فلاسفہ کا کوئی اختلاف بھی نہیں۔ ان کے سب اختلافات افلاک اور سیّارات کی ہیئت وحقیقت سے متعلق ہیں جن کو قرآن نے بے ضرورت اور ناقابلِ حصول قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے۔ علامہ بخیت مفتیٔ مصر نے اپنی کتاب توفیق الرحمٰن میں علم ہیئت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصّہ وصفی ہے جو اجرامِ سماویہ کی حرکات اور حسابات سے متعلق ہے۔ دوسرا عملی جو ان حسابات کو معلوم کرنے کے لئے آلاتِ قدیمہ وجدیدہ سے متعلق ہے۔ تیسرا طبعی، جو افلاک وسیّارات کی ہیئت وحقیقت سے متعلق ہے اور لکھا ہے کہ پہلی دونوں قسموں میں ماہرین قدیم وجدید میں اختلاف کالعدم ہے۔ آلات ادراک میں بہت بڑا اختلاف ہونے کے باوجود نتائج پر اکثر اُمور میں سب کا اتفاق ہے ان کا شدید اختلاف صرف تیسری قسم میں ہے۔

غور کیجئے تو انسانی ضرورت کے متعلق بھی یہی پہلی دو قسمیں ہیں۔ تیسری قسم دور از کار بھی ہے اور مشکل بھی۔ اسی لئے قرآن وسنت اور عام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات نے انسان کو اس تیسری بحث میں نہیں اُلجھایا، اور بزرگانِ سلف نے یہ نصیحت فرمائی۔

[1] زباں تازہ کردن باقرارِ تو | نینگیختن علّت از کارِ تو

[2] مہندس بسے جوید از رازِ شاں | نداند کہ چُوں کردی آغازِ شاں

صوفیائے کرام جو نظر کشفی سے ان چیزوں کو دیکھتے ہیں ان کا فیصلہ بھی انجام کار وہی ہے جو شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا۔

[3] چہ شبہا نشستم دریں سیر گُم | کہ حیرت گرفت آستینم کہ قُم

---

۱ ترجمہ: آپ کے اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کام میں کوئی علت نکالنا۔

۲ ترجمہ: علم ہندسہ کا ماہر چیزوں کے بہت سارے راز تلاش کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ تو نے ان چیزوں کا آغاز کیسے کیا تھا۔

۳ ترجمہ: اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے میں بہت عرصہ پریشان رہا، آخر کار حیرت نے میری آستین پکڑ کر کہا کہ کھڑے ہوجاؤ۔

حافظ شیرازی نے اپنی لَے میں فرمایا۔

[۱] سخن از مطرب ومی گوی راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمّا را

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات افلاک وفضاء اور کائنات ارضی میں غور وفکر اس حیثیت سے کہ اُن سے پیدا کرنے والے کے وجود اور توحید اور اس کی بے مثال علم وقدرت پر استدلال کیا جا سکے عین مقصود قرآنی ہے اور قرآن جا بجا اس کی دعوت دے رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ ان چیزوں سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ بھی ضرورت کی حد تک منشاء قرآنی ہے اور قرآن اس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ معاش اور معاشی ضروریات کو اصل مقصد قرار دے کر اُس میں انہماک نہ کرے بلکہ اس موجودہ زندگی کو اصلی زندگی کی طرف ایک سفر کا درجہ قرار دے کر اس کے مطابق اس میں مشغول ہو۔ اور تیسری حیثیت چونکہ انسانی ضرورت سے زائد بھی ہے اور اس کا حصول بھی مشکل ہے اُس میں عمر عزیز صرف کرنے سے گُریز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ موجودہ سائنس کی جدید ترقیات وتحقیقات کو عین منشاء قرآنی سمجھنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض تجدد پسند علماء نے لکھا ہے اور قرآن کو اُن کا مخالف کہنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض قدامت پسند علماء نے کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ ان چیزوں کے بیان کے لئے آیا ہے نہ یہ اس کا موضوعِ بحث ہے نہ انسان کے لئے اُن کا حاصل کرنا آسان نہ انسانی ضروریات سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں ساکت ہے تجربات ومشاہدات سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو اس کو قرآن کے منافی کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے اوپر پہنچنا، رہنا بسنا اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اُٹھانا وغیرہ سب اس میں داخل ہیں ان میں سے کوئی چیز مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہو جائے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جب تک ثابت نہ ہو خواہ مخواہ اس کے تصورات باندھنا اور اس میں عمر عزیز کے اوقات صرف کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں۔ واللہ سُبحانہ وتعالیٰ اعلم

[۲] عِبَادُ الرَّحْمٰنِ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ

اور بندے رحمٰن کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں اور جب بات کرنے لگیں اُن سے

---

[۱] ترجمہ: ساقی اور مے کے بارے میں باتیں کرو اور زمانے کے راز مت تلاش کرو کیونکہ یہ ایک ایسا معما ہے جسے حکمت کے ذریعہ نہ تو کوئی حل کر سکا ہے اور نہ ہی حل کر سکے گا۔

[۲] یہاں یہ عنوان اس لئے قائم کر دیا گیا ہے کہ اس کو مستقل رسالہ کی صورت میں اس نام سے شائع کیا جا سکتا ہے اور جب ایسا کیا جائے تو اس کے شروع میں ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' لکھ دی جائے۔ ۱۲ محمد شفیع

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾

بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رَبّ کے آگے سجدہ میں اور کھڑے

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا

اور وہ لوگ کہ کہتے ہیں اے رَبّ ہٹا ہم سے دوزخ کا عذاب بیشک اس کا عذاب

كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ ۖ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا

چمٹنے والا ہے وہ بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی اور بُری جگہ رہنے کی اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرنے لگیں

لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِیْنَ

نہ بے جا اُڑائیں اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ ایک سیدھی گزران اور وہ لوگ

لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ

کہ نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ دوسرے حاکم کو اور نہیں خون کرتے جان کا جو منع کردی اللہ نے

اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ ۙ یُّضٰعَفْ لَهُ

مگر جہاں چاہیئے اور بدکاری نہیں کرتے اور جو کوئی کرے یہ کام وہ جا پڑا گناہ میں دُونا ہوگا اس کو

الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ ۖ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ

عذاب قیامت کے دن اور پڑا رہے گا اس میں خوار ہوکر مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کیا

عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا

کچھ کام نیک سو اُن کو بدل دے گا اللہ بُرائیوں کی جگہ بھلائیاں اور ہے اللہ بخشنے والا

رَّحِيمًا ﴿٧٠﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾

مہربان اور جو کوئی توبہ کرے اور کرے کام نیک سو وہ پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر آنے کی جگہ

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ ۙ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿٧٢﴾

اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں کھیل کی باتوں پر نکل جائیں بزرگانہ

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾

اور وہ لوگ کہ جب اُن کو سمجھایئے ان کے رَبّ کی باتیں نہ پڑیں اُن پر بہرے اندھے ہوکر

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ

اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رَبّ دے ہم کو ہماری عورتوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿٧٤﴾ أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا

اور کر ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا ان کو بدلہ ملے گا کوٹھوں کے جھروکے اس لئے کہ وہ ثابت قدم رہے

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿٧٥﴾ لا خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا

اور لینے آئیں گے ان کو وہاں دُعا اور سلام کہتے ہوئے سدا رہا کریں اُن میں خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی

وَمُقَامًا ﴿٧٦﴾ قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۖ ج فَقَدْ كَذَّبْتُمْ

اور خوب جگہ رہنے کی تو کہہ پرواہ نہیں رکھتا میرا رَبّ تمہاری اگر تم اس کو نہ پکارا کرو سو تم تو جھٹلا چکے

فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾ ع

اب آگے کو ہونی ہے مٹھ بھیڑ

ع ٦ الربع

آسان ترجمۂ قرآن

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ اُن سے (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں۔ (۶۳) اور جو راتیں اس طرح گذارتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے آگے (کبھی) سجدے میں ہوتے ہیں، اور (کبھی) قیام میں۔ (۶۴) اور جو یہ کہتے ہیں کہ: "ہمارے پروردگار! جہنم کے عذاب کو ہم سے دُور رکھئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا عذاب وہ تباہی ہے جو چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ (۶۵) یقیناً وہ کسی کا مستقر اور قیام گاہ بننے کے لئے بدترین جگہ ہے۔" (۶۶) اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ اُن کا طریقہ اس (اِفراط و تفریط) کے درمیان اِعتدال کا طریقہ ہے۔ (۶۷) اور جو اللہ کے ساتھ کسی بھی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے، اور جس جان کو اللہ نے حرمت بخشی ہے، اُسے ناحق قتل نہیں کرتے، اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو شخص بھی یہ کام کرے گا، اُسے اپنے گناہ کے وبال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (۶۸) قیامت کے دن اُس کا عذاب بڑھا بڑھا کر دُگنا کر دیا جائے گا، اور وہ ذلیل ہو کر اُس عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ (۶۹) ہاں مگر جو کوئی توبہ کرلے، ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۷۰) اور جو کوئی توبہ کرتا اور نیک عمل کرتا ہے تو وہ درحقیقت اللہ کی طرف ٹھیک ٹھیک لوٹ آتا ہے۔ (۷۱) اور (رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو ناحق کاموں میں شامل نہیں ہوتے، اور جب کسی لغو چیز کے پاس سے گذرتے ہیں تو وقار کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔ (۷۲) اور جب انہیں اپنے رَبّ کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گرتے (۷۳) اور جو (دُعا کرتے ہوئے) کہتے ہیں کہ: "ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بیوی بچوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما، اور ہمیں پرہیزگاروں کا سربراہ بنادے۔" (۷۴) یہ لوگ ہیں جنہیں اُن کے صبر کے بدلے جنت کے بالاخانے عطا ہوں گے، اور وہاں دُعاؤں اور سلام سے اُن کا استقبال کیا جائے گا۔ (۷۵) وہ وہاں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کسی کا مستقر اور قیام گاہ بننے کے لئے وہ بہترین جگہ ہے۔ (۷۶) (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ: "میرے پروردگار کو تمہاری ذرا بھی پروا نہ ہوتی، اگر تم اُس کو نہ پکارتے۔ اب جبکہ (اے کافرو!) تم نے حق کو جھٹلا دیا ہے تو یہ جھٹلانا تمہارے گلے پڑ کر رہے گا۔" (۷۷)

خلاصۂ تفسیر

اور (حضرت) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں (مطلب یہ کہ ان کے

مزاج میں تواضع ہے تمام اُمور میں، اور اسی کا اثر چلنے میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور خاص چال کی ہیئت بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ دماغ داری کے ساتھ نرم رفتاری موجب مدح نہیں اور یہ تواضع تو ان کا طرز خاص اپنے اعمال میں ہے) اور (دوسروں کے ساتھ ان کا طرز یہ ہے کہ) جب ان سے جہالت والے لوگ (جہالت کی) بات (چیت) کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں (مطلب یہ کہ اپنے نفس کے لئے انتقام قولی یا فعلی نہیں لیتے اور جو خشونت تادیب واصلاح وسیاست شرعیہ یا اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہو اس کی نفی مقصود نہیں) اور جو (اللہ کے ساتھ اپنا یہ طرز رکھتے ہیں کہ) راتوں کو اپنے رَبّ کے آگے سجدہ اور قیام (یعنی نماز) میں لگے رہتے ہیں اور جو (باوجود ادائے حقوق اللہ وحقوق العباد کے اللہ تعالیٰ سے اس قدر ڈرتے ہیں کہ) دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کے عذاب کو دُور رکھئے کیونکہ اس کا عذاب پوری تباہی ہے، بیشک وہ جہنم بُرا ٹھکانا اور بُرا مقام ہے (یہ تو ان کی حالت طاعات بدنیہ میں ہے) اور (طاعات مالیہ میں ان کا یہ طریقہ ہے کہ) وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں (کہ معصیت میں صرف کرنے لگیں) اور نہ تنگی کرتے ہیں (کہ طاعت ضروریہ میں بھی خرچ کی کوتاہی کریں، اور اسراف میں وہ خرچ بھی آ گیا کہ بلاضرورت استطاعت سے زیادہ مباحات میں یا طاعات غیر ضروریہ میں خرچ کریں جس کا انجام اخیر میں بے صبری اور حرص وبدنیتی ہو۔ کیونکہ یہ اُمور معصیت ہیں اور جو چیز معصیت کا سبب بنے وہ بھی معصیت ہے اس لئے وہ بھی معصیت ہی میں خرچ کرنا انجام کار ہو گیا۔ اسی طرح طاعات ضروریہ میں بالکل خرچ نہ کرنے کی مذمت لَمْ يَقْتُرُوْا سے مفہوم ہو گئی کیونکہ جب خرچ میں کمی کرنا جائز نہیں تو عدم انفاق تو بدرجۂ اَولیٰ ناجائز ہوگا پس یہ شبہ نہ رہا کہ خرچ میں کمی کرنے کی تو نفی اور نہی ہو گئی لیکن عدم الانفاق بالکل کی نفی اور نہی نہ ہوئی۔ غرض وہ انفاق میں افراط وتفریط دونوں سے مبرا ہیں) اور ان کا خرچ کرنا اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (اور یہ حالت مذکورہ تو طاعات کی ادائیگی سے متعلق تھی) اور جو (گناہ سے بچنے میں یہ شان رکھتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے (جو معصیت متعلق عقائد کے ہے) اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے (قواعد شرعیہ کی رو سے) حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر (یعنی جب قتل کے وجوب یا اباحت کا کوئی سبب شرعی پایا جائے اس وقت اور بات ہے) اور وہ زنا نہیں کرتے (کہ یہ قتل وزنا اعمال کے متعلق گناہوں میں سے ہیں) اور جو شخص ایسے کام کرے گا (کہ شرک کرے یا شرک کے ساتھ قتل ناحق بھی کرے یا زنا بھی کرے جیسے مشرکین مکہ تھے) تو سزا سے اس کو سابقہ پڑے گا کہ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا (جیسا کفار کے حق میں دوسری آیات میں آیا ہے [1] زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (النحل: ۸۸)) اور وہ اس (عذاب)

[1] اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: جو لوگ کفر کرتے تھے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے ان کے لئے ہم ایک سزا پر دوسری سزا بمقابلہ ان کے فساد کے بڑھائیں گے۔

میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل (وخوار) ہوکر رہے گا (تا کہ عذابِ جسمانی کے ساتھ ذلت کا عذابِ روحانی بھی ہو اور شدتِ عذاب یعنی تضاعف کے ساتھ مقدار کی زیادتی یعنی خلود بھی ہو اور مراد اس وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ سے کفار و مشرکین ہیں بقرینۂ یضاعف و یخلد ومہاناً و آمن کیونکہ مؤمن گناہگار کے لئے عذاب میں زیادتی اور خلود نہ ہوگا بلکہ اس کا عذاب اس کو پاک صاف کرنے کے لئے ہوگا نہ کہ اہانت کے لئے، اور اس کے لئے تجدید ایمان کی ضرورت نہیں صرف توبہ کافی ہے جس کا آگے بیان ہے وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ الخ نیز قرائنِ مذکورہ کے سوا صحیحین میں ابن عباسؓ سے شانِ نزول بھی اس کا یہی منقول ہے کہ مشرکین کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی) مگر جو (شرک و معاصی سے) توبہ کرلے اور (اس توبہ کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ) ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے (یعنی ضروری طاعات کو بجالاتا رہے) تو (اس کو جہنم میں خلود تو کیا ہوتا جہنم سے ذرا بھی مس نہ ہوگا بلکہ) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں (کومحو کرکے ان) کی جگہ (آئندہ) نیکیاں عنایت فرمائے گا (یعنی چونکہ گزشتہ کفر و گناہ زمانہ کفر کے بعد اسلام کی برکت سے معاف ہوجائیں گے اور آئندہ بوجہ اعمال صالحہ کے حسنات لکھی جاتی رہیں گی اور ان پر ثواب ملے گا اس لئے جہنم سے ان کا کچھ تعلق نہ ہوگا، پس اِلَّا استثناء منقطع ہے اور مَنْ تَابَ کی خبر فَاُولٰٓئِكَ الخ ہے اور مقصود بالحکم تبدیل سیئات بالحسنات ہے جو مجموعۂ ایمان وتوبہ وعمل صالح پر مرتب ہے اور جہنم کی آگ سے محفوظ رہنا اس کا لازمی اثر ہے اور جہنم میں دخول ہی نہیں تو خلود نہ ہونا ظاہر ہے، یا استثناء متصل ہو اور عدم خلود کے لئے مجموعۂ ایمان وتوبہ وعمل صالح شرط نہ ہو مگر مجموعہ کے ساتھ عدم خلود کا پایا جانا اس آیت میں مذکور ہوا اور صرف ایمان پر عدم خلود کا مرتب ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہو) اور (یہ محوسیئات وثبت حسنات اس لئے ہوا کہ) اللہ تعالیٰ غفور ہے (اس لئے سیئات کو محو کردیا اور) رحیم ہے (اس لئے حسنات کو قائم فرمایا۔ یہ تو تائب عن الکفر کا بیان تھا) اور (آگے اُس مؤمن کا ذکر ہے جو گناہ سے توبہ کرے تا کہ مضمون توبہ کا پورا ہوجائے ونیز مقبول بندوں کے بقیہ اوصاف کا بیان ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ طاعات کے پابند اور سیئات سے پرہیز کے عادی رہتے ہیں لیکن اگر احیاناً صدورِ معصیت ہوجائے تو توبہ کرلیتے ہیں اس لئے تائبین کا حال ارشاد فرمایا یعنی) جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے (یعنی آئندہ معصیت سے بچتا ہے) تو وہ (بھی عذاب سے بچا رہے گا کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور پر رجوع کررہا ہے (یعنی خوف و اخلاص کے ساتھ کہ شرط توبہ ہے آگے پھر عباد الرحمٰن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں یعنی) اور (ان میں یہ بات ہے کہ) وہ بیہودہ باتوں میں (جیسے لہو ولعب خلاف شرع) شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً بلا قصد) بیہودہ مشغلوں کے پاس کو ہوکر گزریں تو سنجیدگی (وشرافت) کے ساتھ گزر جاتے ہیں (یعنی نہ اس کی طرف مشغول

ہوتے ہیں اور نہ ان کے آثار سے گناہگاروں کی تحقیر اور اپنا ترفع اور تکبر ظاہر ہوتا ہے) اور وہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان (احکام) پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے (جس طرح کافر قرآن پر ایک نئی بات سمجھ کر تماشے کے طور پر اور نیز اس میں اعتراضات پیدا کرنے کے لئے اس کے حقائق و معارف سے اندھے بہرے ہو کر اندھا دھند بے ترتیب ہجوم کر لیتے تھے جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کا ارشاد ہے [1] كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾ (الجن) (على بعض التفاسير) سو عباد مذکورین ایسا نہیں کرتے، بلکہ عقل و فہم کے ساتھ قرآن پر متوجہ اور اُس کی طرف دوڑتے ہیں جس کا ثمرہ زیادۃ ایمان و عمل بالاحکام ہے پس مقصود آیت میں اندھے بہرے ہونے کی نفی کرنا ہے نہ کہ قرآن کی طرف شوق کے ساتھ متوجہ ہونے اور اُس پر گرنے کی، کیونکہ وہ عین مطلوب ہے۔ اور اس سے کفّار کے لئے بھی قرآن پر گرنا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ مخالفت اور مزاحمت کے طور پر اور اندھے بہروں کی طرح تھا اس لئے وہ مذموم ہے) اور وہ ایسے ہیں کہ (خود جیسے دین کے عاشق ہیں اسی طرح اپنے اہل و عیال کے لئے بھی اس کے ساعی اور داعی ہیں، چنانچہ عملی کوشش کے ساتھ حق تعالیٰ سے بھی) دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) عطا فرما (یعنی ان کو دیندار بنادے اور ہم کو ہماری اس سعی دینداری میں کامیاب فرما کہ ان کو دینداری کی حالت میں دیکھ کر راحت اور سرور ہو) اور (تو نے ہم کو ہمارے خاندان کا افسر تو بنایا ہی ہے مگر ہماری دُعا یہ ہے کہ ان سب کو متقی کر کے) ہم کو متقیوں کا افسر بنادے (تو اصل مقصود افسری مانگنا نہیں ہے گو اس میں بھی قباحت نہیں مگر مقام دلالت نہیں کرتا بلکہ اصل مقصود اپنے خاندان کے متقی ہونے کی درخواست ہے یعنی بجائے اس کے کہ ہم صرف خاندان کے افسر ہیں ہم کو متقی خاندان کا افسر بنا دیجئے، یہاں تک عباد الرحمٰن کے اوصاف کا بیان تھا آگے ان کی جزا ہے یعنی) ایسے لوگوں کو (بہشت میں رہنے کو) بالاخانے ملیں گے بوجہ ان کے (دین و طاعت پر) ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس (بہشت) میں (فرشتوں کی جانب سے) بقاء کی دُعا اور سلام ملے گا (اور) اس (بہشت) میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہ کیسا اچھا ٹھکانا اور مقام ہے (جیسا جہنم کے بارے میں [2] سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (الفرقان:٦٦) فرمایا ہے، اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا ربّ تمہاری ذرا بھی پروا نہ کرے گا اگر تم عبادت نہ کرو گے سو (اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ اے کفار) تم تو (احکامِ الٰہیہ کو) جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب یہ (جھوٹا سمجھنا تمہارے لئے) وبالِ (جان) ہو (کر رہے) گا، (خواہ دُنیا میں جیسے واقعہ بدر میں کفار پر مصیبت آئی یا آخرت میں اور وہ ظاہر ہے)۔

١ ترجمہ: اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو ہو جاتے ہیں۔
٢ ترجمہ: وہ جہنم بُرا ٹھکانا ہے اور بُرا مقام ہے۔

معارف ومسائل

سورۂ فرقان کے بیشتر مضامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوّت کے ثبوت اور کفار ومشرکین جو اس پر اعتراض کرتے تھے اُن کے جوابات پر مشتمل تھے اور اس میں کفار ومشرکین اور احکام کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب وسزا کا بھی ذکر تھا۔ آخر سورت میں اپنے اُن مخصوص اور مقبول بندوں کا ذکر فرماتے ہیں جن کا رسالت پر ایمان بھی مکمل ہے اور اُن کے عقائد، اعمال، اخلاق، عادات سب اللہ ورسول کی مرضی کے تابع اور احکام شرعیہ کے مطابق ہیں۔

قرآنِ کریم نے ایسے مخصوص بندوں کو عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کا لقب عطا فرمایا جو اُن کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یوں تو ساری ہی مخلوق تکوینی اور جبری طور پر اللہ کی بندگی اور اس کی مشیت وارادہ کے تابع ہے اُس کے ارادے کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ مگر یہاں بندگی سے مراد تشریعی اور اختیاری بندگی ہے یعنی اپنے اختیار سے اپنے وجود اور اپنی تمام خواہشات اور تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنادینا ایسے مخصوص بندے جن کو حق تعالیٰ نے خود اپنا بندہ کہہ کر عزّت بخشی ہے اُن کے اوصاف آخر سورت تک بیان کئے گئے ہیں درمیان میں کفر ومعصیت سے توبہ اور اس کے اثرات کا ذکر آیا ہے۔

یہاں ان مخصوص بندوں کو اپنا بندہ فرما کر ان کو اعزازی لقب دینا تھا مگر اپنی طرف نسبت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سب اسماءِ حسنٰی اور صفاتِ کمال میں سے اس جگہ لفظ رحمٰن کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا کہ مقبولین کی عادات وصفات اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کی ترجمان اور مظہر ہونا چاہئیں اس کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی مخصوص صفات وعلامات

آیات مذکورہ میں اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی تیرہ صفات وعلامات کا ذکر آیا ہے جن میں عقائد کی درستی اور اپنے ذاتی اعمال میں خواہ وہ بدن سے متعلق ہوں یا مال سے، سب میں اللہ ورسول کے احکام اور مرضی کی پابندی، دوسرے انسان کے ساتھ معاشرت اور تعلقات کی نوعیت، رات دن کی عبادت گزاری کے ساتھ خوفِ خدا، تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور اپنے ساتھ اپنی اولاد وازواج کی اصلاح کی فکر وغیرہ شامل ہیں۔

ان کا سب سے **پہلا وصف** عباد ہونا ہے۔ عباد عبد کی جمع ہے عبد کا ترجمہ ہے بندہ جو اپنے آقا کا مملوک ہو، اس کا وجود اور اس کے تمام اختیارات واعمال آقا کے حکم ومرضی پر دائر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا مستحق وہی شخص ہوسکتا ہے جو اپنے عقائد وخیالات کو اور اپنے ہر ارادے اور خواہش کو اور اپنی ہر حرکت وسکون کو اپنے رَبّ کے حکم اور مرضی کے تابع رکھے ہر وقت گوش برآواز رہے کہ جس کام کا حکم ہو وہ بجالاؤں۔

دوسری صفت :- يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا، یعنی چلتے ہیں وہ زمین پر تواضع کے ساتھ۔ لفظ ہَوْن کا مفہوم اس جگہ سکینت ووقار اور تواضع ہے کہ اکڑ کر نہ چلے، قدم متکبرانہ انداز سے نہ رکھے بہت آہستہ چلنا مراد نہیں، کیونکہ وہ بلاضرورت ہو تو خلافِ سنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی جو صفت شمائلِ نبویہ میں منقول ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چلنا بہت آہستہ نہیں بلکہ کسی قدر تیزی کے ساتھ تھا۔ حدیث میں ہے كَاَنَّمَا الْاَرْضُ تُطْوٰى لَهٗ، یعنی آپ ایسا چلتے تھے کہ گویا زمین آپ کے لئے سمٹتی ہے (ابن کثیر)[1] اسی لئے سلف صالحین نے بتکلف مریضوں کی طرح آہستہ چلنے کو علامتِ تکبّر وتصنّع ہونے کے سبب مکروہ قرار دیا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت آہستہ چل رہا ہے، پوچھا: کیا تم بیمار ہو۔ اُس نے کہا نہیں، تو آپ نے اُس پر دُرّہ اُٹھایا اور حکم دیا کہ قوت کے ساتھ چلا کرو۔ (ابن کثیر)[2]

حضرت حسن بصریؒ نے اس آیت يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا، کی تفسیر میں فرمایا کہ مؤمنین مخلصین کے تمام اعضاء وجوارح آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں سب اللہ کے سامنے ذلیل وعاجز ہوتے ہیں۔ ناواقف اُن کو دیکھ کر معذور عاجز سمجھتا ہے حالانکہ نہ وہ بیمار ہیں نہ معذور بلکہ تندرست قوی ہیں مگر اُن پر حق تعالیٰ کا خوف ایسا طاری ہے جو دوسروں پر نہیں ہے۔ اُن کو دُنیا کے دھندوں سے آخرت کی فکر نے روکا ہوا ہے۔ اور جو شخص اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور اس کی ساری فکر دُنیا ہی کے کاموں میں لگی رہتی ہے تو وہ ہمیشہ حسرت ہی حسرت میں رہتا ہے (کہ دُنیا تو ساری ملتی نہیں اور آخرت میں اُس نے حصّہ نہیں لیا) اور جس شخص نے اللہ کی نعمت صرف کھانے پینے کی ہی چیزوں کو سمجھا ہے اور اعلیٰ اخلاق کی طرف دھیان نہیں دیا، اُس کا علم بہت تھوڑا ہے اور عذاب اُس کے لئے تیار ہے۔ (از ابن کثیر ملخصاً)[3]

تیسری صفت :- وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ یعنی جب جہالت والے اُن سے خطاب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، سلام۔ یہاں جاہلون کا ترجمہ جہالت والوں سے کر کے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مراد اس سے بے علم آدمی نہیں بلکہ وہ جو جہالت کے کام اور جاہلانہ باتیں کرے خواہ واقع میں وہ ذی علم بھی ہو۔ اور لفظ سلام سے مراد یہاں عرفی سلام نہیں بلکہ سلامتی کی بات ہے۔ قرطبی نے نحاس سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ سلام تسلیم سے مشتق نہیں بلکہ تَسَلُّم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سلامت رہنا۔ مراد یہ ہے کہ جاہلوں کے جواب میں وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں جس سے دوسروں کو ایذا نہ پہنچے اور یہ گناہگار نہ ہو۔ یہی تفسیر حضرت مجاہد، مقاتل وغیرہ سے منقول ہے۔ (مظہری)[4]

حاصل یہ ہے کہ بے وقوف جاہلانہ باتیں کرنے والوں سے یہ حضرات انتقامی معاملہ نہیں کرتے بلکہ اُن سے درگزر کرتے ہیں۔

---

[1] جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۲ ص:۲۰۵، وتفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۶ ص:۱۲۲

[2] [3] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۶ ص:۱۲۲ [4] تفسير المظهری ج:۷ ص:۴۶، وتفسير القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۶۹

چوتھی صفت:- وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ یعنی وہ رات گزارتے ہیں اپنے رَبّ کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے۔ عبادت میں شب بیداری کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا گیا کہ یہ وقت سونے آرام کرنے کا ہے اس میں نماز وعبادت کے لئے کھڑا ہونا خاص مشقت بھی ہے اور اس میں ریا ونمود کے خطرات بھی نہیں ہیں۔ منشاء یہ ہے کہ ان کا لیل ونہار اللہ کی طاعت میں مشغول ہے دن کو تعلیم وتبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے کام ہیں رات کو اللہ کے سامنے عبادت گزاری کرنا ہے۔ تہجد کی نماز کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابواُمامہؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیام اللیل، تہجد کی پابندی کرو کیونکہ وہ تم سے پہلے بھی سب نیک بندوں کی عادت رہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے تم کو قریب کرنے والی اور سیئات کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے والی چیز ہے۔ (مظہری) [1]

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کے بعد دو یا زیادہ رکعتیں پڑھ لیں وہ بھی اس حکم میں داخل ہے کہ بَاتَ لِلّٰهِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا [2] (مظہری از بغوی) [3] اور حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر لی تو آدھی رات عبادت میں گزارنے کے حکم میں ہو گیا اور جس نے صبح کی نماز جماعت سے ادا کر لی وہ باقی آدھی رات بھی عبادت میں گزارنے والا سمجھا جائے گا۔ (رواہ احمد ومسلم فی صحیحہ از مظہری) [4]

پانچویں صفت:- وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ الآیہ یعنی یہ مقبولین بارگاہ شب وروز عبادت وطاعت میں مصروف رہنے کے باوجود بے خوف ہو کر نہیں بیٹھ رہتے۔ بلکہ ہر وقت خدا کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہیں جس کے لئے عملی کوشش بھی جاری رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دُعائیں بھی۔

چھٹی صفت:- وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا الآیۃ، یعنی اللہ کے مقبول بندے مال خرچ کرنے کے وقت نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل وکوتاہی، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ آیت میں اسراف اور اس کے بالمقابل اِقتار کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

اسراف کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، ابن جریجؒ

---

[1] تفسیر المظھری ج:۷ ص:۴۶، وجامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۲ ص:۱۹۵

[2] ترجمہ: اس نے اللہ کے سامنے سجدے اور قیام کی حالت میں رات گزاری۔

[3] تفسیر المظھری ج:۷ ص:۴۷، والبغوی ج:۶ ص:۹۴

[4] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب فضل صلاۃ الجماعۃ إلخ ج:۱ ص:۲۳۲، ومسند احمد، مسند عثمان بن عفان رضی اللہ تعالی عنہ، رقم الحدیث:۴۱۶

کے نزدیک اللہ کی معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے اگرچہ ایک پیسہ ہی ہو، اور بعض حضرات نے فرمایا، جائز اور مباح کاموں میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا جو تبذیر یعنی فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے وہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کیونکہ تبذیر یعنی فضول خرچی بنصِ قرآن حرام و معصیت ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے [1] اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ط (بنی اسرائیل: ۲۷) اس لحاظ سے اس تفسیر کا حاصل بھی حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی مذکورہ تفسیر ہو گیا، یعنی معصیت و گناہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔ (مظہری) [2]

اور اِقتار کے معنے خرچ میں تنگی اور بخل کرنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں اس کے معنے یہ ہیں کہ جن کاموں میں اللہ و رسول نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اُن میں خرچ کرنے میں تنگی برتنا (اور بالکل خرچ نہ کرنا بدرجہ اولیٰ اس میں داخل ہے)۔ یہ تفسیر بھی حضرت ابن عباسؓ، قتادہ وغیرہ سے منقول ہے (مظہری) [3] آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کے مقبول بندوں کی صفت مال خرچ کرنے میں یہ ہوتی ہے کہ اسراف اور اِقتار کے درمیان اعتدال اور میانہ روی پر عمل کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهٗ فِيْ مَعِيْشَتِهٖ، یعنی انسان کی دانشمندی کی علامت یہ ہے کہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرے (نہ اسراف میں مبتلا ہو نہ بخل میں)۔ (رواہ الإمام احمد عن ابی الدرداء، ابن کثیر) [4]

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ، یعنی جو شخص خرچ میں میانہ روی اور اعتدال پر قائم رہتا ہے وہ کبھی فقیر و محتاج نہیں ہوتا۔ (رواہ الإمام احمد، ابن کثیر) [5]

ساتویں صفت:- وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ، پہلی چھ صفات میں طاعت و فرمانبرداری کے اُصول آ گئے ہیں اب معصیت و نافرمانی کے اُصولِ مہمہ کا بیان ہے جن میں پہلی چیز عقیدہ سے متعلق ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو عبادت میں شریک نہیں کرتے جس سے شرک کا سب سے بڑا گناہ ہونا معلوم ہوا۔

آٹھویں اور نویں صفت:- لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الآیہ، یہ عملی گناہوں میں سے بڑے بڑے اور سخت گناہوں کا بیان ہے کہ اللہ کے مقبول بندے ان کے پاس نہیں جاتے، کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا کے پاس نہیں جاتے۔ یہ تین

---

[1] ترجمہ: بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں۔

[2] تفسیر المظھری ج:۷ ص:۴۷

[3] تفسیر المظھری ج:۷ ص:۴۷، ۴۸

[4] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۱۲۴، ومسند احمد باقی حدیث ابی الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ، (بألفاظ مختلفة) رقم الحدیث: ۲۲۳۴۴

[5] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۱۲۴، ومسند احمد، حدیث العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رقم الحدیث: ۴۲۶۹

عقیدہ اور عمل کے بڑے گناہ بیان فرمانے کے بعد آیت میں ارشاد ہے وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾ یعنی جو شخص ان مذکورہ گناہوں کا مرتکب ہوگا وہ اس کی سزا پائے گا۔ ابوعبیدہ نے اس جگہ لفظ اثام کی تفسیر سزائے گناہ سے کی ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اثام جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جو سخت و شدید عذابوں سے پُر ہے۔ بعض روایاتِ حدیث بھی اس کی شہادت میں لکھی ہیں۔ (تفسیر مظہری) [۱]

آگے اُس عذاب کا بیان ہے جو جرائم مذکورہ کے کرنے والوں پر ہوگا اور آیات کے سیاق وسباق سے یہ بات متعیّن ہے کہ یہ عذاب کفار کے لئے مخصوص ہے جنہوں نے شرک وکفر بھی کیا اور اس کے ساتھ قتل وزنا میں بھی مبتلا ہوئے۔ کیونکہ اوّل تو يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ کے الفاظ مسلمان گناہگاروں کے لئے نہیں ہوسکتے کیونکہ اُن کے ایک گناہ پر ایک ہی سزا کا وعدہ قرآن وسنت میں منصوص ہے۔ سزا میں تضاعف یعنی کیفیت یا کمیت میں زیادتی مؤمنین کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ کفار کی خصوصیت ہے کہ کفر پر جو عذاب ہونا تھا اگر کفر کے ساتھ اور گناہ بھی کئے تو عذاب دوہرا ہوجائے گا۔ دوسرے اس عذاب میں یہ بھی مذکور ہے وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ یعنی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اس عذاب میں ذلیل وخوار ہوکر۔ کوئی مؤمن ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں نہیں رہے گا، کتنا ہی بڑا گناہگار ہو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ شرک وکفر میں بھی مبتلا ہوئے اور قتل وزنا میں بھی، اُن کا عذاب مضاعف یعنی دوہرا، شدید بھی ہوگا اور پھر یہ عذاب دائمی بھی رہے گا۔ آگے یہ بیان ہے کہ ایسے سخت مجرم جن کا عذاب یہاں مذکور ہوا ہے اگر وہ توبہ کرلیں اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ ان کے سیئات کو حسنات سے یعنی بُرائیوں کو بھلائیوں سے تبدیل کردیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس توبہ کے بعد ان کے اعمال نامہ میں حسنات ہی حسنات رہ جائیں گی کیونکہ شرک وکفر سے توبہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ بحالتِ شرک وکفر جتنے گناہ کئے ہوں اسلام وایمان قبول کرلینے سے وہ پچھلے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں اس لئے پچھلے زمانے میں جو ان کا نامۂ اعمال سیئات اور معاصی ہی سے لبریز تھا اب ایمان لانے سے وہ تو سب معاف ہوگئے آگے ان معاصی اور سیئات کی جگہ ایمان اور اُس کے بعد کے اعمالِ صالحہ نے لے لی۔ سیئات کو حسنات میں تبدیل کرنے کی یہ تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ، حسن بصریؒ، سعید بن جُبیر، مجاہد وغیرہ ائمۂ تفسیر سے منقول ہے۔ (مظہری) [۲]

ابنِ کثیرؒ نے اس کی ایک دوسری تفسیر یہ بھی نقل کی ہے کہ اُنہوں نے جتنے گناہ زمانۂ کفر وجاہلیت میں کئے تھے، ایمان لانے کے بعد اُن سب گناہوں کے بجائے نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد جب کبھی ان لوگوں کو اپنے پچھلے گناہ یاد آئیں گے تو اُن پر نادم ہوں گے اور توبہ کی تجدید کریں گے ان کے اس عمل سے وہ گناہ نیکیوں میں تبدیل ہوجائیں گے، اس کی دلیل میں بعض روایاتِ حدیث بھی پیش فرمائی ہیں۔ [۳]

---

[۱] تفسیر المظہری ج:۷ ص:۴۸، ۴۹ [۲] تفسیر المظہری ج:۷ ص:۵۰ [۳] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۱۲۷، ۱۲۸

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ بظاہر یہ اسی مضمون کا تکرار ہے جو اس سے پہلے آیت میں آیا ہے اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا۔ اور قرطبی نے قفال سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ توبہ پہلی توبہ سے مختلف اور الگ ہے کیونکہ پہلا معاملہ کفار و مشرکین کا تھا جو قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے تھے، پھر ایمان لے آئے تو اُن کی سیئات حسنات سے بدل دی گئیں۔ اور یہاں مسلمان گناہگاروں کی توبہ کا ذکر ہے اسی لئے پہلی توبہ کے ساتھ وَاٰمَنَ یعنی اس کے ایمان لانے کا ذکر تھا، اس دوسری توبہ میں وہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توبہ اُن لوگوں کی ذکر کی گئی ہے جو پہلے سے مؤمن ہی تھے مگر غفلت سے قتل وزنا میں مبتلا ہو گئے تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی[1] کہ ایسے لوگ اگر توبہ کر لینے کے بعد صرف زبانی توبہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ آئندہ کے لئے اپنے عمل کو بھی صالح اور درست بنالیں تو اُن کا توبہ کرنا صحیح اور درست سمجھا جائے گا۔ اسی لئے بطور شرط کے توبہ کر لینے کے ابتدائی حال ذکر کرنے کے بعد اس کی جزاء میں پھر يَتُوْبُ کا ذکر کرنا صحیح ہو گیا کیونکہ شرط میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ صرف زبانی توبہ ہے اور جزاء میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ عمل صالح پر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہو گیا کہ جس نے توبہ کر لی پھر اپنے عمل سے بھی اُس توبہ کا ثبوت دیا تو وہ صحیح طور پر اللہ کی طرف رجوع کرنے والا سمجھا جائے گا بخلاف اُس کے جس نے پچھلے گناہ سے توبہ تو کی مگر آئندہ عمل میں اس کا کوئی ثبوت نہ فراہم کیا تو اُس کی توبہ گویا توبہ ہی نہیں۔ خلاصۂ مضمون اس آیت کا یہ ہو گیا کہ جو مسلمان غفلت سے گناہ میں مبتلا ہو گیا پھر توبہ کر لی اور اس توبہ کے بعد اپنے عمل کی بھی ایسی اصلاح کر لی کہ اس کے عمل سے توبہ کا ثبوت ملنے لگا تو یہ بھی توبہ عند اللہ مقبول ہو گی اور بظاہر اس کا فائدہ بھی وہی ہو گا جو پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ اس کے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا۔

اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی خاص صفات کا بیان اوپر سے ہو رہا تھا، درمیان میں گناہ کے بعد توبہ کر لینے کے احکام کا بیان آیا اس کے بعد باقی صفات کا بیان ہے۔

دسویں صفت:- وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ یعنی یہ لوگ جھوٹ اور باطل کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے۔ سب سے بڑا جھوٹ اور باطل تو شرک و کفر ہے اُس کے بعد عام جھوٹ اور گناہ کے کام ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ایسی مجلسوں میں شرکت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد مشرکین کی عیدیں اور میلے ٹھیلے ہیں۔ حضرت مجاہد اور محمد بن حنفیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد گانے بجانے کی محفلیں ہیں۔ عمرو بن قیس نے فرمایا کہ بے حیائی اور ناچ رنگ کی محفلیں مراد ہیں۔ زہری، امام مالک نے فرمایا کہ شراب پینے پلانے کی مجلسیں مراد ہیں (ابن کثیر)[2] اور حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ساری ہی مجلسیں مجلس زُور کی مصداق ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کو ایسی محفلوں ہی سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ لغو باطل کا بالقصد

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۷۹ [2] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:٦ ص:۱۳۰

دیکھنا بھی اس کی شرکت کے حکم میں ہے (مظہری) [١] اور بعض حضرات مفسرین نے لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں یشہدون کو شہادت بمعنے گواہی سے لیا ہے اور معنی آیت کے یہ قرار دیئے کہ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی کا گناہِ کبیرہ اور وبالِ عظیم ہونا قرآن وسنت میں معروف ومشہور ہے۔ بخاری ومسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔ [٢]

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اُس نے جھوٹی شہادت دی ہے تو اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی جائے اور اس کا منہ کالا کر کے بازار میں پھرایا جائے اور رُسوا کیا جائے پھر طویل زمانے تک قید میں رکھا جائے۔ (رواہ ابن ابی شیبۃ وعبدالرزاق، مظہری) [٣]

گیارھویں صفت:- وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾ یعنی اگر لغو اور بیہودہ مجلسوں پر کبھی ان کا گزر اتفاقاً ہو جائے تو وہ سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی مجلسوں میں یہ لوگ جس طرح بقصد وارادہ شریک نہیں ہوتے اسی طرح اگر کہیں اتفاقی طور پر ان کا کسی ایسی مجلس پر گزر ہو جائے تو اس فسق وفجور اور گناہ کی مجلس پر سے شرافت کے ساتھ گزرے چلے جاتے ہیں۔ یعنی اُن کے اس فعل کو بُرا اور قابلِ نفرت جانتے ہوئے، نہ گناہوں میں مبتلا لوگوں کی تحقیر کرتے ہیں اور نہ خود اپنے آپ کو اُن سے افضل وبہتر سمجھ کر تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اتفاق سے ایک روز کسی بیہودہ لغو مجلس پر گزر ہو گیا تو وہاں ٹھہرے نہیں گزرے چلے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ ابن مسعود کریم ہو گئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی جس میں بیہودہ مجلس سے کریموں شریفوں کی طرح گزر جانے کا حکم ہے۔ (ابن کثیر) [٤]

بارھویں صفت:- وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ یعنی ان مقبول بندوں کی یہ شان ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات اور آخرت کی یاد دلائی جاتی ہے تو وہ ان آیات کی طرف اندھے بہروں کی طرح متوجہ نہیں ہوتے بلکہ سمیع وبصیر انسان کی طرح ان میں غور کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ غافل اور مغفل لوگوں کی طرح ایسا معاملہ نہیں کرتے کہ اُنہوں نے سُنا ہی نہیں یا دیکھا ہی نہیں۔ اس آیت میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک آیاتِ الٰہیہ پر گر پڑنا یعنی اہتمام کے ساتھ متوجہ ہونا یہ تو امر محمود ومقصود اور بہت بڑی نیکی ہے۔ دوسرے اندھے بہروں کی طرح گرنا کہ قرآن کی آیات پر توجہ تو دیں مگر یا تو اُس پر عمل کرنے میں معاملہ ایسا کریں کہ گویا اُنہوں نے سُنا اور دیکھا ہی نہیں اور یا آیاتِ قرآن

---

[١] تفسیر المظہری ج:٧ ص:٥٤

[٢] صحیح البخاری، کتاب الشهادات، باب ما قیل فی شهادة الزور ج:١ ص:٣٦٢، وصحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب الکبائر واکبرها ج:١ ص:٦٤

[٣] مصنف ابن ابی شیبة، رقم الحدیث:٢٨٧١٣، ومصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث:١٥٣٩٢

[٤] تفسیر ابن کثیر ج:٦ ص:١٣١، وتفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث:١٢٢٥٠

پر عمل بھی کریں مگر اُن کو اُصولِ صحیحہ اور تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ کے خلاف اپنی رائے یا سُنی سُنائی باتوں کے تابع کر کے غلط عمل کریں یہ بھی ایک طرح سے اندھے بہرے ہو کر ہی گرنے کے حکم میں ہے۔

احکامِ دین کا صرف مطالعہ کافی نہیں بلکہ اسلاف کی تفسیر کے مطابق سمجھ کر عمل کرنا ضروری ہے

آیاتِ مذکورہ میں جس طرح اس امر کی سخت مذمّت ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ ہی نہ دیں، اندھے بہروں کا سا معاملہ کریں، اسی طرح اس کی بھی مذمت ہے کہ توجہ تو دیں اور عمل بھی کریں مگر بے سمجھے بے بصیرتی کے ساتھ اپنی رائے سے جس طرح چاہیں عمل کرنے لگیں۔ ابن کثیرؒ نے ابن عون سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت شعبیؒ سے پوچھا کہ اگر میں کسی مجلس میں پہنچوں جہاں لوگ سجدہ میں پڑے ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ کیسا سجدہ ہے تو کیا میں بھی اُن کے ساتھ سجدہ میں شریک ہو جاؤں۔ حضرت شعبیؒ نے فرمایا نہیں۔ مؤمن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ بے سمجھے کسی کام میں لگ جائے بلکہ اُس پر لازم ہے کہ بصیرت کے ساتھ عمل کرے۔ جب تم نے وہ آیتِ سجدہ نہیں سُنی جس کی بناء پر یہ لوگ سجدہ کر رہے ہیں اور تمہیں ان کے سجدہ کی حقیقت بھی معلوم نہیں تو اس طرح ان کے ساتھ سجدہ میں شریک ہونا جائز نہیں۔ [1]

اس زمانے میں یہ بات تو قابلِ شکر ہے کہ نوجوان اور نوتعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن پڑھنے اور اس کے سمجھنے کی طرف کچھ توجہ پیدا ہوئی ہے اور اس کے تحت وہ بطور خود قرآن کا ترجمہ یا کسی کی تفسیر دیکھ کر قرآن کو خود سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہ کوشش بالکل بے اُصول ہے۔ اس لئے قرآن کو صحیح سمجھنے کے بجائے بہت سے مغالطوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اُصول کی بات یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی معمولی سے معمولی فن بھی نری کتاب کے مطالعہ سے کسی کو معتد بہ نہیں حاصل ہو سکتا جب تک اس کو کسی استاد سے نہ پڑھے۔ معلوم نہیں قرآن اور علومِ قرآن ہی کو کیوں ایسا سمجھ لیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے خود ترجمہ دیکھ کر جو چاہے اس کی مراد متعین کر لے۔ یہ بے اصول مطالعہ جس میں کسی ماہر استاد کی رہنمائی شامل نہ ہو یہ بھی آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہرے ہو کر گرنے کے مفہوم میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم کی توفیق بخشیں۔

تیرھویں صفت:- وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾
اس میں اپنی اولاد اور ازواج کے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ اُن کو میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے سے مراد حضرت حسن بصریؒ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ اُن کو اللہ کی طاعت میں مشغول دیکھے، یہی ایک

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۱۳۲

انسان کے لئے آنکھوں کی اصلی ٹھنڈک ہے اور اگر اولاد و ازواج کی ظاہری صحت و عافیت اور خوشحالی بھی اس میں شامل کی جائے تو وہ بھی درست ہے۔

یہاں اس دُعا سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے صرف اپنے نفس کی اصلاح اور اعمالِ صالحہ پر قناعت نہیں کر لیتے بلکہ اپنی اولاد اور بیبیوں کی بھی اصلاحِ اعمال و اخلاق کی فکر کرتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی کوشش میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کی صلاحیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتا رہے۔ اس آیت کے اگلے جملے میں دُعا کا یہ جزء بھی ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٤﴾ یعنی ہمیں متقی لوگوں کا امام اور پیشوا بنا دے، اس میں بظاہر اپنے لئے جاہ و منصب اور بڑائی حاصل کرنے کی دُعا ہے جو دوسری نصوصِ قرآن کی رُو سے ممنوع ہے جیسے قرآن کا ارشاد ہے [١] تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (القصص: ۸۳) یعنی ہم نے دارِ آخرت کو مخصوص کر رکھا ہے اُن لوگوں کے لئے جو زمین میں اپنا عُلو اور بڑائی نہیں چاہتے اور نہ زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے بعض علماء نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر شخص اپنے اہل و عیال کا قدرتی طور پر امام و پیشوا ہوتا ہی ہے اس لئے اس دُعا کا حاصل یہ ہو گیا کہ ہمارے اولاد اور اہل و عیال کو متقی بنا دیجئے اور جب وہ متقی ہو جائیں گے تو طبعی طور پر یہ شخص متقین کا امام و پیشوا کہلائے گا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں اپنی بڑائی کی دُعا نہیں بلکہ اولاد و ازواج کے متقی بنانے کی دُعا ہے۔ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ اس دُعاء میں اپنے لئے کوئی ریاست و امامت اور پیشوائی طلب کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود اس دُعا کا یہ ہے کہ ہمیں ایسا بنا دیجئے کہ لوگ دین و عمل میں ہماری اقتداء کیا کریں اور ہمارے علم و عمل سے اُن کو نفع پہنچے تاکہ اس کا ثواب ہمیں حاصل ہو۔ اور حضرت مکحول شامیؒ نے فرمایا کہ دُعا کا مقصود اپنے لئے تقویٰ کا ایسا اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے کہ دُنیا کے متقی لوگوں کو بھی ہمارے عمل سے فائدہ پہنچے۔ قرطبی نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ ریاست و امامت کی طلب جو دین کے لئے اور آخرت کے فائدہ کے لئے ہو وہ مذموم نہیں بلکہ جائز ہے۔ [٢] اور آیت لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا (القصص: ۸۳) میں اس ریاست و اقتدار کی خواہش کی مذمت ہے جو دُنیوی عزت و جاہ کے لئے ہو۔ واللہ اعلم، یہاں تک عِبَادُ الرَّحْمٰنِ یعنی مؤمنین کاملین کی اہم صفات کا بیان پورا ہو گیا، آگے اُن کی جزاء اور آخرت کے درجات کا ذکر ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ، غرفہ کے لغوی معنی بالاخانہ کے ہیں۔ جنت میں مقربینِ خاص کے لئے ایسے غرفات ہوں

---

[١] ترجمہ: یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔

[٢] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۸۳

گے جو عام اہلِ جنت کو ایسے نظر آئیں گے جیسے زمین والے ستاروں کو دیکھتے ہیں (رواہ البخاری ومسلم وغیرھما۔ مظہری)۔ [۱]
مسند احمد، بیہقی، ترمذی، حاکم میں حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایسے غرفے ہوں گے جن کا اندرونی حصہ باہر سے اور بیرونی حصہ اندر سے نظر آتا ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ، یہ غرفے کن لوگوں کے لئے ہیں، آپ نے فرمایا، جو شخص اپنے کلام کو نرم اور پاک رکھے اور ہر مسلمان کو سلام کرے اور لوگوں کو کھانا کھلائے، اور رات کو اس وقت تہجد کی نماز پڑھے جب لوگ سور ہے ہوں۔ (مظہری) [۲]

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ یعنی جنت کی دوسری نعمتوں کے ساتھ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ فرشتے اُن کو مبارک باد دیں گے اور سلام کریں گے۔ یہاں تک مؤمنین مخلصین کی خصوصی عادات واعمال اور اُن کی جزاء وثواب کا ذکر تھا، آخری آیت میں پھر کفار ومشرکین کو عذاب سے ڈرا کر سورت کو ختم کیا گیا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں زیادہ واضح اور سہل وہ ہے جس کو خلاصۂ تفسیر میں اوپر لکھا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک تمہاری کوئی وقعت وحیثیت نہ ہوتی اگر تمہاری طرف سے اللہ کو پکارنا اور اس کی عبادت کرنا نہ ہوتا۔ کیونکہ انسان کی تخلیق کا منشاء ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے جیسے دوسری آیت میں ہے [۳] وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (الذاریات) یعنی میں نے انسان اور جن کو اور کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ تو ایک عام ضابطہ بیان ہوا کہ بغیر عبادت کے انسان کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت وحیثیت نہیں ہے اس کے بعد کفار ومشرکین جو رسالت اور عبادت ہی کے منکر ہیں اُن کو خطاب ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ، یعنی تم نے تو سب چیزوں کو جھٹلا ہی دیا ہے اب تمہاری کوئی وقعت اللہ کے نزدیک نہیں فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ یعنی اب یہ تکذیب وکفر تمہارے گلے کا ہار بن چکے ہیں اور تمہارے ساتھ لگے رہیں گے یہاں تک کہ جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا کر کے چھوڑیں گے۔ ونعوذ باللہ من حال اھل النّار

تَمَّ بِحَمْدِ اللهِ سُبْحَانَهٗ تَفْسِيْرُ سُوْرَةِ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْاَحَدِ لِثَالِثِ عَشَرَ مِنْ صَفَرَ الْمُظَفَّرِ ۱۳۹۱ھ وَبِاِتْمَامِهٖ تَمَّ بِعَوْنِ اللهِ وَكَرَمِهِ الْحِزْبُ الرَّابِعُ مِنَ الْاَحْزَابِ السَّبْعَةِ الْقُرْاٰنِيَّةِ وَاللهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَرْجُوْ وَاَسْاَلُ اِتْمَامَ الْبَاقِيْ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيْزٍ۔

---

[۱] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۵۵، وسنن الدارمی، رقم الحدیث:۲۸۸۶، وصحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، ج:۲ ص:۹۷۰، وصحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب ترائی اهل الجنة إلخ ج:۲ ص:۳۷۸

[۲] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۵۵، وجامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب فی ما جاء فی القول المعروف ج:۲ ص:۱۹، وسنن البیهقیؒ، رقم الحدیث:۸۷۴۲، ومسند احمد، مسند علی بن ابی طالب رضی الله تعالیٰ عنه، رقم الحدیث:۱۳۵۱، والمستدرك للحاكمؒ، رقم الحدیث:۲۴۸

[۳] ترجمہ: اور میں نے جن اور انسان کو اس واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

سورۃ الشعرآء

آیاتها ۲۲۷ ۲۶ سورۃ الشعرآء مکیۃ ۴۷ رکوعاتها ۱۱

سورۂ شعراء مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دو سو ستائیس آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

طٰسٓمّٓ یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی شاید تو گھونٹ مارے اپنی جان

اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۳﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ

اس بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے اگر ہم چاہیں اُتاریں اُن پر آسمان سے ایک نشانی پھر رہ جائیں

اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ ﴿۴﴾ وَمَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ

اُن کی گردنیں اُس کے آگے نیچی اور نہیں پہنچتی ان کے پاس کوئی نصیحت رحمٰن سے نئی

اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۝۵ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ

جس سے منہ نہیں موڑتے سو یہ تو جھٹلا چکے اب پہنچے گی اُن پر حقیقت اس بات کی جس پر

يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ

ٹھٹھے کرتے تھے کیا نہیں دیکھتے وہ زمین کو کتنی اُگائیں ہم نے اس میں ہر ایک قسم کی

زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝۷ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸

خاص چیزیں اس میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۹ ع

اور تیرا ربّ وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۵

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

طٰسٓمّٓ ۝۱ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو حق کو واضح کرنے والی ہے۔ ۝۲ (اے پیغمبر!) شاید تم اس غم میں اپنی جان ہلاک کئے جا رہے ہو کہ یہ لوگ ایمان (کیوں) نہیں لاتے! ۝۳ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی ایسی نشانی اُتار دیں کہ اُس کے آگے ان کی گردنیں جھک کر رہ جائیں۔ ۝۴ (ان کا حال تو یہ ہے کہ) ان کے پاس خدائے رحمٰن کی طرف سے جو کوئی نئی نصیحت آتی ہے، یہ اُس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ۝۵ اس طرح انہوں نے حق کو جھٹلا دیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ جن باتوں کا مذاق اُڑاتے رہے ہیں، اب عنقریب اُن کے ٹھیک ٹھیک حقائق ان کے سامنے آ جائیں گے۔ ۝۶ اور کیا انہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں ہر نفیس قسم کی کتنی چیزیں اُگائی ہیں؟ ۝۷ یقیناً ان سب چیزوں میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، ۝۸ اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بہت مہربان بھی۔ ۝۹

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓمّٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر نازل ہوتے ہیں) کتاب واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (اور یہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے تو آپ اتنا غم کیوں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ) شاید آپ اُن کے ایمان نہ لانے پر (تأسف کرتے کرتے) اپنی جان دے دیں گے (اصل یہ ہے کہ یہ عالم ابتلاء ہے اس میں حق کے اثبات پر وہی دلائل قائم کئے جاتے ہیں جن کے بعد بھی ایمان لانا بندہ کے اختیار میں رہتا ہے ورنہ) اگر ہم (جبراً واضطراراً ان کو مؤمن کرنا) چاہیں تو اُن پر آسمان سے ایک (ایسی) بڑی نشانی نازل کر دیں (کہ ان کا اختیار ہی بالکل سلب ہو جائے) پھر اُن کی گردنیں اس نشانی (کے آنے) سے پست ہو جائیں (اور بالاضطرار مؤمن بن جائیں لیکن ایسا کرنے سے آزمائش باقی نہ رہے گی اس لئے ایسا نہیں کیا جاتا اور معاملہ جبر و اختیار کے درمیان رہتا ہے) اور (اُن کی یہ حالت ہے کہ) اُن کے پاس کوئی تازہ فہمائش (حضرت) رحمٰن (جل شانہٗ) کی طرف سے ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رُخی نہ کرتے ہوں سو (اس بے رُخی کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ) انہوں نے (دینِ حق کو) جھوٹا بتلا دیا (جو اعراض کا انتہائی درجہ ہے اور صرف اس کے ابتدائی درجہ یعنی بے التفاتی پر اکتفاء نہیں کیا اور پھر تکذیب بھی خالی نہیں بلکہ استہزاء کے ساتھ) سو اب عنقریب اُن کو اس بات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے تھے (یعنی جب عذابِ الٰہی کا موت کے وقت یا قیامت میں معائنہ ہوگا، اس وقت قرآن کے اور مافی القرآن یعنی عذاب وغیرہ کے حق ہونے کا انکشاف ہو جائے گا) کیا اُنہوں نے زمین کو نہیں دیکھا (جو اُن سے بہت قریب اور ہر وقت پیشِ نظر ہے) کہ ہم نے اس میں کس قدر عمدہ عمدہ قسم قسم کی بُوٹیاں اُگائی ہیں (جو مثل جمیع مصنوعات کے اپنے بنانے والے کے وجود اور اُس کی یکتائی اور کمالِ قدرت پر دلالت کرتی ہیں کہ) اس میں (توحیدِ ذاتی وصفاتی وافعالی کی) ایک بڑی نشانی (عقلی) ہے (اور یہ مسئلہ بھی عقلی ہے کہ خدائی کے لئے کمالِ ذاتی وصفاتی شرط ہے اور کمال مذکور کے لوازم میں سے ہے کہ وہ خدائی میں اکیلا ہو) اور (باوجود اس کے) ان میں کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (اور شرک کرتے ہیں، غرض شرک کرنا انکارِ نبوّت سے بھی بڑھ کر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے عناد نے ان کی فطرت کو بالکل مختل کر دیا پھر ایسوں کے پیچھے کیوں جان کھوئی جائے) اور (اگر ان کو شرک کے مذموم عند اللہ ہونے میں یہ شبہ ہو کہ ہم پر عذاب فوراً کیوں نہیں آجاتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ آپ کا رَبّ (باوجود اس کے کہ) غالب (اور کامل القدرت) ہے (مگر اس کے ساتھ ہی) رحیم (بھی) ہے (اور اس کی رحمتِ عامّہ دنیا میں کفار سے بھی متعلق ہے اس کا اثر یہ ہے کہ ان کو مہلت دے رکھی ہے ورنہ کفر یقیناً مذموم اور عذاب کا مقتضی ہے)۔

معارف ومسائل

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الآیۃ، بَاخِعٌ بَخْعٌ سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذبح کرتے کرتے بِخَاعْ تک پہنچ جائے جو گردن کی ایک رگ ہے۔ اور اس جگہ بَاخِعٌ سے مراد اپنے آپ کو تکلیف اور مشقت میں ڈالنا ہے۔ علامہ عسکری نے فرمایا کہ اس جیسے مقامات میں اگرچہ صورت جملہ خبریہ کی ہے مگر حقیقۃً اس سے مراد نہی اور ممانعت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر، اپنی قوم کے کفر اور اسلام سے انحراف کے سبب اتنا رنج نہ کیجئے کہ جان گھُلنے لگے۔ اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ کسی کافر کے بارے میں اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اس کی تقدیر میں ایمان لانا نہیں ہے تب بھی اس کو تبلیغ کرنے سے رُکنا نہیں چاہئے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ مشقت میں اعتدال چاہئے اور جو شخص ہدایت نہ پائے اُس پر زیادہ حزن وغم نہ کیا جائے۔

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ④ علامہ زمخشری نے فرمایا کہ اصل کلام فَظَلُّوْا لَهَا خَاضِعِيْنَ ہے۔ یعنی کفار اس بڑی نشانی کو دیکھ کر تابع ہو جائیں اور جھک جائیں لیکن یہاں اعناق کا لفظ یہ ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ موضع خضوع ظاہر ہو جائے[1] کیونکہ جھکنا وغیرہ اور عاجزی کرنا سب سے پہلے گردن پر ظاہر ہوتا ہے۔ مضمون اس آیت کا یہ ہے کہ ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ اپنی توحید اور قدرتِ کاملہ کی کوئی نشانی ظاہر کر دیں جس سے احکامِ شرعیہ اور حقائقِ الٰہیہ بدیہی ہو کر سامنے آ جائیں اور کسی کو مجال انکار نہ رہے مگر حکمت کا مقتضاء یہ ہے کہ یہ احکام ومعارف بدیہی نہ ہوں بلکہ نظری رہیں کہ غور وفکر پر موقوف رہیں اور یہی غور وفکر انسان کی آزمائش ہے اسی پر ثواب وعذاب مرتب ہے۔ بدیہی چیزوں کا اقرار تو ایک طبعی اور ضروری امر ہے اس میں تعبّد اور اطاعت کی شان نہیں۔ (قرطبی)[2]

زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑦ زَوْج کے لفظی معنے جوڑے کے ہیں اسی لئے مرد وعورت، نر و مادہ کو زوج کہا جاتا ہے بہت سے درختوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں اُن کو اس مناسبت سے بھی زوج کہا جا سکتا ہے اور کبھی لفظ زَوْج ایک خاص نوع اور صنف کے معنی میں بھی آتا ہے اس معنے کے لحاظ سے درختوں کی ہر نوع کو زوج کہا جا سکتا ہے اور کریم کے معنی ہیں عمدہ اور پسندیدہ چیز۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑩ قَوْمَ فِرْعَوْنَ

اور جب پکارا تیرے ربّ نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس قوم فرعون کے پاس

[1] تفسیر الکشاف للزمخشری تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۴۹۲ [2] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۳ ص:۸۹

اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ ط وَ يَضِيْقُ

کیا وہ ڈرتے نہیں بولا اے رَبّ میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں اور رُک جاتا ہے

صَدْرِیْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ

میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان سو پیغام دے ہارون کو، اور اُن کو مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ،

فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ ج قَالَ كَلَّا ج فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ

سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں فرمایا کبھی نہیں تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم ساتھ تمہارے

مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ لا

سنتے ہیں سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ ط قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا

یہ کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بولا کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر لڑکا سا

وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ لا وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ

اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس اور کرگیا تو اپنی وہ کرتوت جو کرگیا

وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ ط فَفَرَرْتُ

اور تو ہے ناشکر، کہا کیا تو تھا میں نے وہ کام اور میں تھا چوکنے والا پھر بھاگا میں

مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾

تم سے جب تمہارا ڈر دیکھا پھر بخشا مجھ کو میرے رَبّ نے حکم اور ٹھہرایا مجھ کو پیغام پہنچانے والا

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ

اور کیا وہ احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے کہ غلام بنایا تو نے بنی اسرائیل کو بولا فرعون

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ

کیا معنی پروردگار عالم کا کہا پروردگار آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے

اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ

اگر تم یقین کرو بولا اپنے گرد والوں سے کیا تم نہیں سنتے ہو کہا پروردگار تمہارا

وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ

اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا بولا تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا

لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ

ضرور باؤلا ہے کہا پروردگار مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم

تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ

سمجھ رکھتے ہو بولا اگر تو نے ٹھہرایا کوئی اور حاکم میرے سوائے تو مقرر ڈالوں گا تجھ کو

مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ ج قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ

قید میں کہا اور اگر لے کر آیا ہوں تیرے پاس ایک چیز کھول دینے والی بولا تو وہ چیز لا

اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ ۚ

اگر تو سچ کہتا ہے پھر ڈال دیا اپنا عصا، سو اسی وقت وہ اژدہا ہوگیا صریح

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿٣٣﴾ ع

اور اندر سے نکالا اپنا ہاتھ، سو اسی وقت وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے سامنے

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُس وقت کا حال سنو جب تمہارے پروردگار نے موسیٰ کو آواز دے کر کہا تھا کہ: ''اس ظالم قوم کے پاس جاؤ، ⑩ یعنی فرعون کی قوم کے پاس۔ کیا ان کے دِل میں خدا کا خوف نہیں ہے؟'' ⑪ موسیٰ نے کہا کہ: ''میرے پروردگار! مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے جھوٹا بنائیں گے۔ ⑫ اور میرا دِل تنگ ہونے لگتا ہے، اور میری زبان نہیں چلتی۔ اس لئے آپ ہارون کو بھی (نبوّت کا) پیغام بھیج دیجئے۔ ⑬ اور میرے خلاف ان لوگوں نے ایک جرم بھی عائد کر رکھا ہے، جس کی وجہ سے مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل نہ کر ڈالیں۔'' ⑭ اللہ نے فرمایا کہ: ''ہرگز نہیں! تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ۔ یقین رکھو کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ساری باتیں سنتے رہیں گے۔ ⑮ اب تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اور کہو کہ: ''ہم دونوں ربّ العالمین کے پیغمبر ہیں ⑯ (اور یہ پیغام لائے ہیں) کہ تم بنو اِسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔'' ⑰ فرعون نے (جواب میں موسیٰ علیہ السلام سے) کہا: ''کیا ہم نے تمہیں اُس وقت اپنے پاس رکھ کر نہیں پالا تھا جب تم بالکل بچے تھے؟ اور تم نے اپنی عمر کے بہت سے سال ہمارے یہاں رہ کر گذارے، ⑱ اور جو حرکت تم نے کی تھی وہ بھی کر گذرے، اور تم بڑے ناشکرے آدمی ہو۔'' ⑲ موسیٰ نے کہا: ''اُس وقت وہ کام میں ایسی حالت میں کر گذرا تھا کہ مجھے پتہ نہیں تھا۔ ⑳ چنانچہ جب مجھے تم لوگوں سے خوف ہوا تو میں تمہارے پاس سے فرار ہو گیا، پھر اللہ نے مجھے حکمت عطا فرمائی، اور پیغمبروں میں شامل فرما دیا۔ ㉑ اور وہ احسان جو تم مجھ پر رکھ رہے ہو، (اُس کی حقیقت) یہ ہے کہ تم نے سارے بنو اِسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔'' ㉒ فرعون نے کہا: ''اور یہ ربّ العالمین کیا چیز ہے؟'' ㉓ موسیٰ نے کہا: ''وہ سارے آسمانوں اور زمین کا، اور اُن ساری چیزوں کا پروردگار ہے جو ان کے درمیان پائی جاتی ہیں، اگر تم کو واقعی یقین کرنا ہو۔'' ㉔ فرعون نے اپنے اِردگرد کے لوگوں سے کہا: ''سن رہے ہو کہ نہیں؟'' ㉕ موسیٰ نے کہا: ''وہ تمہارا بھی پروردگار ہے، اور تمہارے پچھلے باپ دادوں کا بھی۔'' ㉖ فرعون بولا: ''تمہارا یہ پیغمبر جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے، یہ تو بالکل ہی دیوانہ ہے۔'' ㉗ موسیٰ نے کہا: ''وہ مشرق و مغرب کا بھی پروردگار ہے، اور اُن کے درمیان ساری چیزوں کا بھی، اگر تم عقل سے کام لو۔'' ㉘ کہنے لگا: ''یاد رکھو، اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو میں تمہیں ضرور اُن لوگوں میں شامل کر دوں گا جو جیل خانے میں پڑے ہوئے ہیں۔'' ㉙ موسیٰ بولے: ''اور اگر میں تمہیں کوئی ایسی چیز لا دِکھاؤں جو حق کو واضح کر دے، پھر؟'' ㉚ فرعون نے کہا: ''اچھا،

اگر واقعی سچے ہو تو لے آؤ وہ چیز۔'' ﴿٣١﴾ چنانچہ موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھلا ہوا اژدھا بن گیا، ﴿٣٢﴾ اور انہوں نے اپنا ہاتھ (بغل میں سے) کھینچ کر نکالا تو پل بھر میں وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے سفید ہو گیا۔ ﴿٣٣﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (ان لوگوں سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جب آپ کے رَبّ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالم لوگوں کے یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ (اور اے موسیٰ دیکھو) کیا یہ لوگ (ہمارے غضب سے) نہیں ڈرتے (یعنی ان کی حالت عجیب اور شنیع ہے اس لئے ان کی طرف تم کو بھیجا جاتا ہے) انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار، (میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں لیکن اس خدمت کی تکمیل کے لئے ایک مددگار چاہتا ہوں کیونکہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو (اپنی پوری بات کہنے سے پہلے ہی) جھٹلانے لگیں اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی اس لئے ہارون کے پاس (بھی وحی) بھیج دیجئے (اور ان کو نبوّت عطا فرما دیجئے کہ اگر میری تکذیب کی جائے تو وہ تصدیق کرنے لگیں تاکہ دل شگفتہ اور زبان رواں رہے اور اگر میری زبان کسی وقت بند ہو جائے تو وہ تقریر کرنے لگیں اور ہر چند کہ یہ غرض ویسے بھی ہارون علیہ السلام کو بلا نبوّت عطا ہوئے ساتھ رکھنے سے حاصل ہو سکتی تھی مگر عطائے نبوّت میں اور زیادہ باکمل وجوہ پوری ہوئی) اور (ایک امر یہ قابلِ عرض ہے کہ) میرے ذمّہ اُن لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی قتل ہو گیا تھا جس کا قصہ سورۂ قصص میں آئے گا) سو (اس لئے) مجھ کو (ایک) یہ اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو (قبل تبلیغ رسالت) قتل کر ڈالیں (تب بھی تبلیغ نہ کر سکوں گا تو اس کی بھی کوئی تدبیر فرما دیجئے) ارشاد ہوا کہ کیا مجال ہے (جو ایسا کر سکیں اور ہم نے ہارون کو بھی پیغمبری دی، اب تبلیغ کے دونوں مانع مرتفع ہو گئے) سو (اب) تم دونوں میرے احکام لے کر جاؤ (کہ ہارون بھی نبی ہو گئے اور) ہم (نصرت و امداد سے) تمہارے ساتھ ہیں (اور جو گفتگو تمہاری اور ان لوگوں کی ہوگی اُس کو) سنتے ہیں سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور (اس) سے کہو کہ ہم رَبّ العالمین کے فرستادہ ہیں (اور دعوت الی التوحید کے ساتھ یہ حکم بھی لائے ہیں) کہ تو بنی اسرائیل کو (اپنے بیگار اور ظلم سے رہائی دے کر ان کے اصلی وطن ملک شام کی طرف) ہمارے ساتھ جانے دے (خلاصہ اس دعوت کا حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ظلم و تعدّی کا ترک کرنا ہے، چنانچہ یہ دونوں حضرات گئے اور فرعون سے سب مضامین کہہ دیئے) فرعون (یہ سب باتیں سُن کر اوّل موسیٰ علیہ السلام کی طرف ان کو پہچان کر متوجہ ہوا اور) کہنے لگا کہ (اہا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم اپنی (اس) عمر میں برسوں ہم میں رہا سہا کئے اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل

کیا تھا) اور تم بڑے ناسپاس ہو (کہ میرا ہی کھایا، میرا ہی آدمی قتل کیا اور پھر مجھ کو اپنا تابع بنانے آئے ہو، چاہئے تو یہ تھا کہ تم میرے سامنے دب کر رہتے) موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ (واقعی) اس وقت وہ حرکت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہوگئی تھی (یعنی عمداً میں نے قتل نہیں کیا، اُس کی ظالمانہ رَوِش سے اس کو روکنا مقصود تھا اتفاق سے وہ مر گیا) پھر جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے ہاں سے مفرور ہوگیا، پھر مجھ کو میرے رَبّ نے دانشمندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں میں شامل کر دیا (اور وہ دانشمندی اسی نبوّت کے لوازم سے ہے۔ خلاصۂ جواب یہ ہے کہ میں پیغمبری کی حیثیت سے آیا ہوں جس میں دبنے کی کوئی وجہ نہیں اور پیغمبری اس واقعہ قتلِ خطاء کے منافی نہیں کیونکہ یہ قتل خطاءً صادر ہوا تھا جو نبوّت کی اہلیت وصلاحیت کے منافی نہیں۔ یہ تو جواب ہے اعتراضِ قتل کا) اور (رہا احسان جتلانا پرورش کا سو) وہ یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت (اور ظلم) میں ڈال رکھا تھا (کہ اُن کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا جس کے خوف سے میں صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالا گیا اور تیرے ہاتھ لگ گیا اور تیری پرورش میں رہا تو اس پرورش کی اصلی وجہ تو تیرا ظلم ہی ہے تو ایسی پرورش کا کیا احسان جتلاتا ہے بلکہ اس سے تو تجھے اپنی ناشائستہ حرکات کو یاد کر کے شرمانا چاہئے) فرعون (اس بات پر لاجواب ہوا اور گفتگو کا پہلو بدل کر اُس) نے کہا کہ (جس کو تم) رَبّ العالمین (کہتے ہو لقولہ تعالیٰ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء:۱۶) اس) کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ (مخلوقات) اُن کے درمیان میں ہے اس (سب) کا اگر تم کو یقین (حاصل) کرنا ہو (تو یہ پتہ بہت ہے، مطلب یہ کہ اس کی حقیقت کا ادراک انسان نہیں کر سکتا اس لئے جب ان کا سوال ہوگا صفات سے ہی جواب ملے گا) فرعون نے اپنے اردگرد (بیٹھنے) والوں سے کہا کہ تم لوگ (کچھ) سنتے ہو (کہ سوال کچھ جواب کچھ) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا (اس جواب میں مکرر تنبیہ ہے اس مطلب مذکور پر مگر) فرعون (نہ سمجھا اور) کہنے لگا کہ یہ تمہارا رسول جو (بزعمِ خود) تمہاری طرف رسول ہو کر آیا ہے مجنون (معلوم ہوتا) ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کا بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے مان لو) فرعون (آخر مجبور ہو کر) کہنے لگا کہ اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا اگر کوئی میں صریح دلیل پیش کروں تب بھی (نہ مانے گا) فرعون نے کہا اچھا تو وہ دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو، تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو دفعۃً ایک نمایاں اژدہا بن گیا (اور دوسرا معجزہ دکھلانے کے لئے) اپنا ہاتھ (گریبان میں دے کر) باہر نکالا تو وہ دفعۃً سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہوگیا (کہ اس کو بھی سب نے نظرِ حسّی سے دیکھا)۔

معارف و مسائل

اطاعت کے لئے معاون اسباب کی طلب بہانہ جوئی نہیں

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی ھٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَھُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ ان آیاتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ کسی حکم کے بجالانے میں کچھ ایسی چیزوں کی درخواست کرنا جو تعمیلِ حکم میں مددگار ثابت ہوں کوئی بہانہ جوئی نہیں ہے بلکہ جائز ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ خداوندی پاکر اُس کی بجاآوری کو سہل اور مفید کرنے کے لئے خدائے ذوالجلال سے درخواست کی۔ لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی کو بلاتوقّف بسروچشم قبول کیوں نہ کیا؟ اور توقف کیوں فرمایا؟ کیونکہ حضرت موسیٰ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ تعمیلِ حکم ہی کے سلسلہ میں کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ ضلال کا مفہوم

قَالَ فَعَلْتُھَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۲۰﴾ فرعون کے اس سوال پر کہ تم نے اے موسیٰ ایک قبطی کو قتل کیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا کہ ہاں میں نے قتل ضرور کیا تھا لیکن وہ قتل ارادۃً اور قصد سے نہ تھا بلکہ اُس قبطی کو اُس کی خطا پر متنبہ کرنے کے لئے گھونسہ مارا جس سے وہ ہلاک ہوگیا۔ خلاصہ یہ کہ نبوّت کے منافی قتل عمد ہے اور یہ قتل بلا ارادہ ہوا تھا جو منافی نبوّت نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ یہاں ''ضلال'' کا مطلب ''بےخبری'' ہے اور اس سے مراد قبطی کا بلاارادہ قتل ہوجانا ہے۔ اس معنی کی تائید حضرت قتادہؒ اور ابن زیدؒ کی روایات سے بھی ہوتی ہے کہ دراصل عربی میں ضلال کے کئی معنی آتے ہیں، اور ہر جگہ اس کا مطلب گمراہی نہیں ہوتا۔ یہاں بھی اس کا ترجمہ ''گمراہ'' کرنا درست نہیں۔

خدائے ذوالجلال کی ذات وحقیقت کا علم انسان کے لئے ناممکن ہے

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۳﴾ اس آیتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ خدائے ذوالجلال کی کنہ وحقیقت کا جاننا ممکن نہیں کیونکہ فرعون کا سوال خداتعالیٰ کی حقیقت، ماہیت کے متعلق تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجائے ماہیتِ باری تعالیٰ بتلانے کے خداتعالیٰ کے اوصاف بیان فرمائے جس سے اشارہ فرمادیا کہ خداتعالیٰ کی کُنہ اور حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور ایسا سوال ہی کرنا بیجا ہے۔ (کذا فی الروح) [1]

---

[1] روح المعانی تحت ھذہ الآیة ج:۱۴ ص:۱۸۵

اَنۡ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۷﴾ بنی اسرائیل ملک شام کے باشندے تھے، وہاں جانا چاہتے تو فرعون ان کو جانے نہ دیتا تھا اس طرح چار سو سال سے وہ اس کی قید میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان کی تعداد اس وقت چھ لاکھ تیس ہزار تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو پیغامِ حق پہنچانے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل پر جو ظلم اُس نے کر رکھا تھا اُس سے باز آنے اور اُن کو آزاد چھوڑ دینے کی ہدایت فرمائی۔ (قرطبی)[1]

پیغمبرانہ مناظرہ کا ایک نمونہ - مناظرے کے مؤثر آداب

دو مختلف الخیال شخصوں اور جماعتوں میں نظریاتی بحث و مباحثہ جس کو اصطلاح میں مناظرہ کہا جاتا ہے، زمانۂ قدیم سے رائج ہے مگر عام طور پر مناظرہ ایک ہار جیت کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگوں کی نظر میں مناظرہ کا حاصل اتنا ہی ہے کہ اپنی بات اونچی ہو، چاہے اس کی غلطی خود بھی معلوم ہو چکی ہو، اُس کو صحیح اور قوی ثابت کرنے کے لئے دلائل اور ذہانت کا سارا زور خرچ کیا جائے۔ اسی طرح مخالف کی کوئی بات سچی اور صحیح بھی ہو تو بہر حال رَد ہی کرنا اور اس کی تردید میں پوری توانائی صرف کرنا ہے۔ اسلام ہی نے اس کام میں خاص اعتدال پیدا کیا ہے اُس کے اصول و قواعد اور حدود متعین کر کے اس کو ایک مفید و مؤثر آلۂ تبلیغ و اصلاح بنایا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں اس کا ایک مختصر سا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے جب فرعون جیسے جبار خدائی کے مدعی کو اُس کے دربار میں دعوتِ حق پہنچائی تو اُس نے مخالفانہ بحث کا آغاز اوّل دو ایسی باتوں سے کیا جن کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے تھا۔ جیسا ہوشیار مخالف عموماً جب اصل بات کے جواب پر قادر نہیں ہوتا تو مخاطب کی ذاتی کمزوریاں ڈھونڈا اور بیان کیا کرتا ہے تا کہ وہ کچھ شرمندہ ہو جائے اور لوگوں میں اُس کی ہوا اُکھڑ جائے، یہاں بھی فرعون نے دو باتیں کہیں۔ اوّل تو یہ کہ تم ہمارے پَروردہ ہمارے گھر میں پل کر جوان ہوئے ہو۔ ہم نے تم پر احسانات کئے ہیں۔ تمہاری کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے بولو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے ایک قبطی شخص کو بلا وجہ قتل کر ڈالا ہے جو علاوہ ظلم کے حق ناشناسی اور ناشکری بھی ہے کہ جس قوم میں پلے اور جوان ہوئے اُسی کے آدمی کو مار ڈالا۔ اس کے بالمقابل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغمبرانہ جواب دیکھئے کہ اوّل تو جواب میں سوال کی ترتیب کو بدلا یعنی قبطی کے قتل کا قصہ جو فرعون نے بعد میں بیان کیا تھا اُس کا جواب پہلے آیا۔ اور خانہ پروردہ ہونے کے احسان کا ذکر جو پہلے کیا تھا اُس کا جواب بعد میں۔ اس ترتیب بدلنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ واقعہ قبطی میں ایک اپنی کمزوری ضرور واقع ہوئی تھی آج کل کے مناظروں کے طرز پر تو ایسی چیز کے ذکر ہی کو رَلا مِلا دیا جاتا ہے اور دوسری باتوں کی طرف توجّہ پھیرنے کی کوشش کی

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۹۴

جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے رسول نے اُسی کے جواب کو اوّلیت دی۔ اور جواب بھی فی الجملہ اعترافِ کمزوری کے ساتھ دیا۔ اس کی قطعاً پروانہ کی کہ مخالف لوگ کہیں گے کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہار مان لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں اس کا تو اعتراف کر لیا کہ اس قتل میں مجھ سے غلطی اور خطا ہوگئی مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ یہ غلطی قصداً نہیں تھی ایک صحیح اقدام تھا جو اتفاقاً غلط انجام پر پہنچ گیا کہ مقصد تو قبطی کو اسرائیلی شخص پر ظلم سے روکنا تھا اسی قصد سے اس کو ایک ضرب لگائی تھی اتفاقاً اسی سے مر گیا اس لئے یہ فعل خطا ہونے کے باوجود ہمارے اصل معاملہ یعنی نبوّت کے دعوے اور اُس کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ مجھے اس غلطی پر تنبہ ہوا اور قانونی گرفت کے خوف سے شہر سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر کرم فرمایا اور نبوّت و رسالت سے سرفراز فرما دیا۔

غور کیجئے کہ اس وقت دشمن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کا سیدھا صاف جواب یہ تھا کہ مقتول قبطی کو واجب القتل ثابت کرتے، اس پر ایسے الزامات لگاتے جس سے اُس کا واجب القتل ہونا ثابت ہوتا۔ کوئی دوسرا آدمی تکذیب کرنے والا بھی وہاں موجود نہ تھا جس سے تردید کا اندیشہ ہوتا، اور اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوتا مگر وہاں تو خدا تعالیٰ کا ایک اولوالعزم رسول صدقِ مجسّم تھا جو حق و صدق اور حقیقت کے اظہار ہی کو اپنی فتح سمجھتا تھا۔ دشمن کے بھرے دربار میں اپنی خطا کا اعتراف بھی کر لیا اور اُس سے جو نبوّت و رسالت پر شبہ ہو سکتا تھا اس کا جواب بھی دیدیا۔ اس کے بعد پہلی بات یعنی خانہ پرورده ہونے کے احسان جتلانے کے جواب کی طرف توجہ فرمائی تو اس کے اس ظاہری احسان کی اصل حقیقت کی طرف توجہ دلا دی کہ ذرا سوچو، میں کہاں اور دربارِ فرعون کہاں؟ میری پرورش تمہارے گھر میں ہونے کے سبب پر غور کرو تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ تم جو پوری قوم بنی اسرائیل پر یہ خلافِ انسانیت ظلم توڑ رہے تھے کہ ان کے بے گناہ معصوم لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے، بظاہر تو تمہارے اس ظلم و ستم سے بچنے کے لئے میری والدہ نے مجھے دریا میں ڈالا اور تم نے اتفاقی طور پر میرا تابوت دریا سے نکال کر گھر میں رکھ لیا اور حقیقۃً یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ انتظام اور تمہارے ظلم کی غیبی سزا تھی کہ جس بچّے کے خطرہ سے بچنے کے لئے تم نے ہزاروں بچّے قتل کر ڈالے تھے قدرت نے اُس بچّے کو تمہارے ہی ہاتھوں پلوایا۔ اب سوچو کہ یہ میری پرورش تمہارا کیا احسان تھا۔ اسی پیغمبرانہ طرزِ جواب کا یہ اثر تو طبعی اور عقلی طور پر حاضرین پر ہونا ہی تھا کہ یہ بزرگ کوئی بات بنانے والے نہیں، سچ کے سوا کچھ نہیں کہتے، اس کے بعد جب معجزات دیکھے تو اور زیادہ اس کی تصدیق ہوگئی۔ اور گو اقرار نہیں کیا مگر مرعوب اتنا ہو گیا کہ یہ صرف دو آدمی جن کے آگے پیچھے کوئی تیسرا مددگار نہیں، دربار سارا اُس کا، شہر اور مُلک اُس کا، مگر یہ خوف اس پر طاری ہے کہ یہ دو آدمی ہمیں اپنے اس ملک و مملکت سے نکال دیں گے۔

یہ ہوتا ہے خدا داد رُعب اور صدق و حق اور سچائی کی ہیبت۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے مجادلات و مناظرات بھی

صدق وسچائی اور مخاطب کی دینی خیر خواہی کے جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ وہی دلوں میں گھر کرتے ہیں اور بڑے بڑے سرکشوں کو رام کر لیتے ہیں۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ

بولا اپنے گرد کے سرداروں سے یہ تو کوئی جادوگر ہے پڑھا ہوا چاہتا ہے کہ نکال دے تم کو

مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ

تمہارے دیس سے اپنے جادو کے زور سے، سو اب کیا حکم دیتے ہو بولے ڈھیل دے اس کو اور اس کے بھائی کو اور بھیج دے

فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ

شہروں میں نقیب لے آئیں تیرے پاس جو بڑا جادوگر ہو پڑھا ہوا پھر اکٹھے کئے جادوگر

لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾

وعدہ پر ایک مقرر دن کے اور کہدیا لوگوں کو کیا تم بھی اکٹھے ہوگے

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا

شاید ہم راہ قبول کرلیں جادوگروں کی اگر ہو اُن کو غلبہ پھر جب آئے جادوگر کہنے لگے

لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ

فرعون سے بھلا کچھ ہمارا حق بھی ہے اگر ہو ہم کو غلبہ بولا البتہ اور تم

اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾

اس وقت مقربوں میں ہوگے کہا اُن کو موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو

فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٤٤﴾

پھر ڈالیں اُنہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں اور بولے فرعون کے اقبال سے ہماری ہی فتح ہے

فَأَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ

پھر ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا پھر تبھی وہ نگلنے لگا جو سانگ انہوں نے بنایا تھا پھر اوندھے گرے جادوگر

سٰجِدِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿٤٨﴾

سجدہ میں بولے ہم نے مان لیا جہان کے رَبّ کو جو رَبّ ہے موسیٰ اور ہارون کا

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ أَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ إِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ

بولا تم نے اُس کو مان لیا ابھی میں نے حکم نہیں دیا تم کو، مقرر وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو سکھلایا

السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۥ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ

جادو سو اب معلوم کرلوگے البتہ کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں

وَّلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿٤٩﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ إِنَّا إِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿٥٠﴾

اور سُولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو بولے کچھ ڈر نہیں ہم کو اپنے رَبّ کی طرف پھر جانا ہے

إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَا أَنْ كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥١﴾

ہم غرض رکھتے ہیں کہ بخش دے ہم کو رَبّ ہمارا تقصیریں ہماری اس واسطے کہ ہم ہوئے پہلے قبول کرنے والے

آسان ترجمۂ قرآن

فرعون نے اپنے اِرد گرد کے سرداروں سے کہا: ’’یقیناً یہ کوئی ماہر جادوگر ہے۔ ﴿٣٤﴾ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے

ذریعے تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال باہر کرے۔ اب بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟" (۳۵) انہوں نے کہا: "ان کو اور ان کے بھائی کو کچھ مہلت دیجئے، اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے (۳۶) جو ہر ماہر جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں (اور ان جادوگروں کا مقابلہ کریں)" (۳۷) چنانچہ ایک دن مقررہ وقت پر سارے جادوگر جمع کر لئے گئے۔ (۳۸) اور لوگوں سے کہا گیا کہ: "کیا تم لوگ جمع ہو رہے ہو؟ (۳۹) شاید اگر یہ جادوگر ہی غالب آگئے تو ہم انہی کے راستے پر چلیں۔" (۴۰) پھر جب جادوگر آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا: "یہ بات تو یقینی ہے نا کہ اگر ہم غالب آگئے تو ہمیں کوئی انعام ملے گا؟" (۴۱) فرعون نے کہا: "ہاں ہاں، اور تمہیں اُس صورت میں مقرّب لوگوں میں بھی ضرور شامل کر لیا جائے گا۔" (۴۲) موسیٰ نے اُن جادوگروں سے کہا: "جو کچھ تمہیں پھینکنا ہے، پھینکو۔" (۴۳) اس پر اُن جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر ڈال دیں، اور کہا کہ: "فرعون کی عزّت کی قسم! ہم ہی ہم غالب آئیں گے۔" (۴۴) اب موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر ڈالا، تو اچانک اُس نے (اژدھا بن کر) اُس تماشے کو نگلنا شروع کر دیا جو وہ جھوٹ موٹ بنا رہے تھے۔ (۴۵) بس پھر وہ جادوگر سجدے میں گرا دیئے گئے۔ (۴۶) کہنے لگے کہ: "ہم ربّ العالمین پر ایمان لے آئے، (۴۷) جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔" (۴۸) فرعون بولا: "تم میرے اجازت دینے سے پہلے ہی موسیٰ پر ایمان لے آئے۔ ثابت ہوا کہ یہ تم سب کا سرغنہ ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا ابھی تمہیں پتہ چل جائے گا۔ میں تم سب کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹواؤں گا، اور تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔" (۴۹) جادوگروں نے کہا: "ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا، ہمیں یقین ہے کہ ہم لوٹ کر اپنے پروردگار کے پاس چلے جائیں گے۔ (۵۰) ہم تو شوق سے اُمید لگائے ہوئے ہیں کہ ہمارا پروردگار اس وجہ سے ہماری خطائیں بخش دے گا کہ ہم سب سے پہلے ایمان لائے تھے۔" (۵۱)

خلاصۂ تفسیر

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزات ظاہر ہوئے تو) فرعون نے اہلِ دربار سے جو اس کے آس پاس (بیٹھے) تھے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے اس کا (اصل) مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے (خود رئیس ہو جائے اور) تم کو تمہاری زمین سے باہر کر دے (تا کہ بلا مزاحمت غیرے اپنی قوم کو لے کر ریاست کرے) سو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو؟ درباریوں نے کہا کہ آپ ان کو اور ان کے بھائی کو (چندے) مہلت دیجئے اور (اپنے ملک کے حدود کے) شہروں میں (گرداوروں کو یعنی) چپراسیوں کو (حکم نامے دے کر) بھیج دیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کر کے) آپ کے پاس لا کر حاضر کر دیں، غرض وہ جادوگر ایک معین دن کے خاص وقت پر جمع کر لئے گئے (معین دن سے مراد یوم الزینت ہے اور خاص وقت سے مراد وقت چاشت ہے جیسے سورۂ طٰہٰ

کے شروع رکوع سوم میں مذکور ہے، یعنی اس وقت کے قریب تک سب لوگ جمع کر لئے گئے اور فرعون کو جمع ہونے کی اطلاع دے دی گئی) اور (فرعون کی جانب سے بطور اعلان عام کے) لوگوں کو یہ اشتہار دیا گیا کہ کیا تم لوگ (فلاں موقع پر واقعہ دیکھنے کے لئے) جمع ہو گے (یعنی جمع ہو جاؤ) تا کہ اگر جادوگر غالب آ جائیں (جیسا کہ غالب توقع ہے) تو ہم اُنہیں کی راہ پر رہیں (یعنی وہی راہ جس پر فرعون تھا اور دوسروں کو بھی اس پر رکھنا چاہتا تھا۔ مطلب یہ کہ جمع ہو کر دیکھو، اُمید ہے کہ جادوگر غالب رہیں گے تو ہم لوگوں کے طریق کا حق ہونا حجت سے ثابت ہو جائے گا) پھر جب وہ جادوگر (فرعون کی پیشی میں) آئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر (موسیٰ علیہ السلام) پر ہم غالب آ گئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا، فرعون نے کہا ہاں (انعام مالی بھی بڑا ملے گا) اور (مزید برآں یہ مرتبہ ملے گا کہ) تم اس صورت میں (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے (غرض اس گفتگو کے بعد عین موقع مقابلہ پر آئے اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور مقابلہ شروع ہوا اور ساحروں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اپنا عصا پہلے ڈالئے گا یا ہم ڈالیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے اُن سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا (منظور) ہو (میدان میں) ڈالو، سو اُنہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں (جو جادو کے اثر سے سانپ معلوم ہوتے تھے) اور کہنے لگے کہ فرعون کے نصیب کی قسم بے شک ہم ہی غالب آئیں گے، پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے (بحکم خداوندی) اپنا عصا ڈالا، ڈالنے کے ساتھ ہی (اژدہا بن کر) اُن کے تمام تر بنے بنائے دھندے کو نگلنا شروع کر دیا سو (یہ دیکھ کر) جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سب سجدہ میں گر پڑے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے رَبّ العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رَبّ ہے، (فرعون بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری رعایا ہی مسلمان ہو جائے تو ایک مضمون گھڑ کر بصورتِ عتاب ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بغیر اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں ضرور (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جادو میں) تم سب کا اُستاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے (اور تم اس کے شاگرد ہو اس لئے باہم خفیہ سازش کر لی ہے کہ تم یوں کرنا ہم یوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے تا کہ قبطیوں سے سلطنت لے کر بفراغِ خاطر خود ریاست کرو کقولہ تعالیٰ [1] اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ (الاعراف: ۱۲۳)) سو اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر ٹانگ دُوں گا (تا کہ اوروں کو عبرت ہو) اُنہوں نے جواب دیا کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے (جہاں ہر طرح امن و راحت ہے پھر ایسے مرنے سے نقصان ہی کیا اور) ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اس وجہ سے کہ ہم (اس موقع پر حاضرین میں سے) سب سے پہلے ایمان لائے (پس اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان سے پہلے بعضے ایمان لا چکے تھے جیسے

[1] ترجمہ: بے شک یہ کارروائی تھی جس پر تمہارا عملدرآمد ہوا ہے اس شہر میں تا کہ تم سب اس شہر سے وہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو۔

آسیہ اور مؤمن آلِ فرعون اور بنی اسرائیل)۔

معارف ومسائل

اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے کہا کہ ''آپ جو کچھ جادو دکھانا چاہتے ہو وہ دکھاؤ۔'' اس پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کو جادو کا حکم دے رہے ہیں، لیکن ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جادو دکھانے کا حکم نہیں تھا بلکہ جو کچھ وہ کرنے والے تھا اس کا ابطال مقصود تھا لیکن اس کا باطل ہونا بغیر اس کے ظاہر کرنے کے ناممکن تھا اس لئے آپ نے ان کو اظہار جادو کا حکم دیا جیسے کہ ایک زندیق کو کہا جائے کہ تم اپنے زندقہ اور بے دینی کے دلائل پیش کرو تا کہ میں ان کو باطل ثابت کرسکوں ظاہر ہے کہ اسے کفر پر رضامندی نہیں کہا جا سکتا۔

بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ، یہ کلمہ ان جادوگروں کے لئے بمنزلہ قسم ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی۔ افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اب ایسی قسمیں رائج ہوگئی ہیں جو اس سے زیادہ شنیع اور قبیح ہیں مثلاً بادشاہ کی قسم، تیرے سر کی قسم، تیری ڈاڑھی کی قسم یا تیرے باپ کی قبر کی قسم، اس قسم کی قسمیں کھانا شرعاً جائز نہیں، بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے میں جو گناہِ عظیم ہے، ان ناموں کی سچی قسم بھی گناہ میں اُس سے کم نہیں۔ (کما فی الروح)[1]

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ یعنی جب فرعون نے جادوگروں کو قبولِ ایمان پر قتل کی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سُولی چڑھانے کی دھمکی دی تو جادوگروں نے بڑی بے پروائی سے یہ جواب دیا کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو کرلو، ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم قتل بھی ہوں گے تو اپنے رَبّ کے پاس چلے جائیں گے جہاں آرام ہی آرام ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ جادوگر جو عمر بھر جادوگری کے کفر میں مبتلا، اُس پر مزید فرعون کے دعوائے خدائی کو ماننے والے اور اس کی پرتش کرنے والے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر اپنی پوری قوم کے خلاف، فرعون جیسے ظالم جابر بادشاہ کے خلاف ایمان کا اعلان کر دیں یہی ایک حیرت انگیز چیز تھی مگر یہاں تو صرف ایمان کا اعلان ہی نہیں بلکہ ایمان کا وہ گہرا رنگ چڑھ جانے کا مظاہرہ ہے کہ قیامت وآخرت گویا ان کے سامنے نظر آنے لگی۔ آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہونے لگا ہے جس کے مقابلے میں دُنیا کی ہر سزا اور مصیبت سے بے نیاز ہو کر[2] فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ (طٰہٰ:۷۲) کہہ دیا یعنی جو تیرا جی چاہے کرلے ہم تو ایمان سے پھرنے والے نہیں۔ یہ بھی درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کا معجزہ ہے جو معجزۂ عصا اور یدِ بیضاء سے کم نہیں، اسی طرح کے بہت سے واقعات ہمارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] روح المعانی ج:۱۴ ص:۲۰۶ [2] ترجمہ: تجھ کو جو کچھ کرنا ہو کر ڈال۔

ہاتھوں ظاہر ہوئے ہیں کہ ایک منٹ میں ستر برس کے کافر میں ایسا انقلاب آ گیا کہ صرف مؤمن ہی نہیں ہو گیا بلکہ غازی بن کر شہید ہونے کی تمنا کرنے لگا۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے پھر بھیجے

فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ﴿۵۴﴾

فرعون نے شہروں میں نقیب یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی سی

وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ

اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں اور ہم سارے اُن سے خطرہ رکھتے ہیں پھر نکال باہر کیا ہم نے اُن کو

مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا

باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں

بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ

بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے اُن کے سورج نکلنے کے وقت پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے

اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۶۲﴾

موسیٰ کے لوگ ہم تو پکڑے گئے کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ ہے میرا ربّ وہ مجھ کو راہ بتلائے گا

فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ

پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ مار اپنے عصا سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی ہر پھانک

كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ

جیسے بڑا پہاڑ اور پاس پہنچادیا ہم نے اُسی جگہ دوسروں کو اور بچادیا ہم نے موسیٰ کو اور جو

مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ

لوگ تھے اس کے ساتھ سب کو پھر ڈبادیا ہم نے اُن دوسروں کو اس چیز میں ایک نشانی ہے اور نہیں تھے

اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾ ع

بہت لوگ اُن میں ماننے والے اور تیرا ربّ وہی ہے زبردست رحم والا

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ: ''میرے بندوں کو لے کر راتوں رات روانہ ہو جاؤ، تمہارا پیچھا یقیناً کیا جائے گا۔'' ﴿۵۲﴾ اس پر فرعون نے شہروں میں ہرکارے بھیج دیئے ﴿۵۳﴾ (اور یہ کہلا بھیجا کہ:) ''یہ (بنی اسرائیل) ایک چھوٹی سی ٹولی کے تھوڑے سے لوگ ہیں ﴿۵۴﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے دِل جلائے ہوئے ہیں، ﴿۵۵﴾ اور ہم سب احتیاطی تدبیریں کئے ہوئے ہیں (لہٰذا سب مل کر ان کا تعاقب کرو)'' ﴿۵۶﴾ اس طرح ہم انہیں باہر نکال لائے باغوں اور چشموں سے بھی ﴿۵۷﴾ اور خزانوں اور باعزّت مقامات سے بھی ﴿۵۸﴾ ان کا معاملہ تو اسی طرح ہوا، اور (دوسری طرف) ان چیزوں کا وارث ہم نے بنی اسرائیل کو بنا دیا۔ ﴿۵۹﴾ غرض ہوا یہ کہ یہ سب لوگ سورج نکلتے ہی اُن کا پیچھا کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ﴿۶۰﴾ پھر جب دونوں جتھے ایک دوسرے کو نظر آنے لگے تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا کہ: ''اب تو پکی بات ہے کہ ہم پکڑ ہی لئے گئے۔'' ﴿۶۱﴾ موسیٰ نے کہا: ''ہرگز نہیں، میرے ساتھ یقینی طور سے میرا پروردگار ہے، وہ مجھے راستہ بتائے گا۔'' ﴿۶۲﴾ چنانچہ ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ اپنی لاٹھی سمندر پر مارو۔ بس پھر سمندر پھٹ گیا، اور ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ ﴿۶۳﴾ اور دوسرے فریق کو بھی ہم اُس جگہ کے نزدیک لے آئے۔ ﴿۶۴﴾ اور موسیٰ اور اُن کے تمام ساتھیوں کو ہم نے بچالیا، ﴿۶۵﴾ پھر دوسروں کو غرق کر ڈالا۔ ﴿۶۶﴾ یقیناً اس سارے واقعے میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، ﴿۶۷﴾ اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔ ﴿۶۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (جب فرعون کو اس واقعہ سے بھی ہدایت نہ ہوئی اور اُس نے بنی اسرائیل کی آزار دہی نہ چھوڑی تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم بھیجا کہ میرے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) شباشب (مصر سے باہر) نکال لے جاؤ (اور فرعون کی جانب سے) تم لوگوں کا تعاقب (بھی) کیا جائے گا (چنانچہ وہ موافق حکم کے بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چل دیئے صبح یہ خبر مشہور ہوئی تو) فرعون نے (تعاقب کی تدبیر کرنے کے لئے جابجا آس پاس کے) شہروں میں چپراسی دوڑا دیئے (اور یہ کہلا بھیجا) کہ یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل ہماری نسبت) تھوڑی سی جماعت ہے (ان کے مقابلہ سے کوئی اندیشہ نہ کرے) اور اُنہوں نے (اپنی کاروائی سے) ہم کو بہت غصہ دلایا ہے (وہ کاروائی یہ ہے کہ خفیہ چالاکی سے نکل گئے یا یہ کہ زیور بھی ہمارا بہت سا عاریت کے بہانے سے لے گئے غرض ہم کو احمق بنا کر گئے ضرور ان کا تدارک کرنا چاہئے) اور ہم سب ایک مُسلّح جماعت (اور با قاعدہ فوج) ہیں، غرض (دو چار روز میں جب سامان اور فوج سے درست ہو گیا تو لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چلا اور یہ خبر نہ تھی کہ اب لوٹنا نصیب نہ ہوگا تو اس حساب سے گویا) ہم نے اُن کے باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مکانات سے نکال باہر کیا (ہم نے ان کے ساتھ تو) یوں کیا اور اُن کے بعد بنی اسرائیل کو اُن کا مالک بنا دیا (یہ جملہ معترضہ تھا آگے قصّہ ہے) غرض (ایک روز) سورج نکلنے کے وقت اُن کو پیچھے سے جالیا (یعنی قریب پہنچ گئے اس وقت بنی اسرائیل دریائے قلزم سے اُترنے کی فکر میں تھے کہ کیا سامان کریں) پھر جب دونوں جماعتیں (باہم ایسی قریب ہوئیں کہ) ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ہمراہی (گھبرا کر) کہنے لگے کہ (اے موسیٰ) بس ہم تو اُن کے ہاتھ آ گئے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو ابھی (دریا سے نکلنے کا) رستہ بتلائے گا (کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو روانگی کے وقت ہی کہہ دیا گیا تھا کہ سمندر میں خشک راستہ پیدا ہو جائے گا، [1] فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ (طٰهٰ) گو خشک ہونے کی کیفیت اس وقت نہ بتلائی تھی، پس موسیٰ علیہ السلام اس وعدہ پر مطمئن تھے اور بنی اسرائیل کیفیت معلوم نہ ہونے سے مضطرب تھے) پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو، چنانچہ (انہوں نے اس پر عصا مارا جس سے) وہ (دریا) پھٹ (کر کئی حصے ہو) گیا (یعنی پانی کئی جگہ سے اِدھر اُدھر ہٹ کر بیچ میں متعدد سڑکیں کھل گئیں) اور ہر حصہ اتنا (بڑا) تھا جیسا بڑا پہاڑ (یہ لوگ دریا میں امن و اطمینان سے پار ہو گئے) اور ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس موقع کے قریب پہنچا دیا

[1] ترجمہ: پھر ان کے لئے دریا میں خشک راستہ بنا دینا نہ تو تم کو کسی کے تعاقب کا اندیشہ ہوگا اور نہ اور کسی قسم کا خوف ہوگا۔

(یعنی فرعون اور فرعونی بھی دریا کے نزدیک پہنچے اور موافق پیشین گوئی سابق [۱] وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ (الدخان: ۲۴) دریا اُس وقت تک اسی حال پر ٹھہرا ہوا تھا، اس لئے کھلے رستے کو غنیمت سمجھا اور آگا پیچھا کچھ سوچا نہیں، سارا لشکر اندر گھس گیا، اور چاروں طرف سے پانی سمٹنا شروع ہوا اور سارے لشکر کا کام تمام ہوا) اور (انجام قصہ کا یہ ہوا کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ان کے ساتھ والوں سب کو (غرق ہونے سے) بچالیا، پھر دوسروں کو (یعنی ان کے مخالفوں کو) غرق کردیا (اور) اس واقعہ میں بھی بڑی عبرت ہے (یعنی اس قابل ہے کہ کفار اس سے استدلال کریں کہ مخالفتِ احکام ورسل موجب عذابِ خداوندی ہے اور اس کو سمجھ کر مخالفت سے بچیں) اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور آپ کا رَبّ بڑا زبردست ہے (اگر چاہتا دنیا میں ہی ان کو عذاب دیتا لیکن) بڑا مہربان (بھی) ہے (اس لئے اپنی رحمتِ عامہ سے عذاب کی مہلت مقرر کردی ہے، پس تعجیلِ عذاب سے بے فکر نہ ہونا چاہئے)۔

معارف ومسائل

[۲] وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ اس آیت میں بظاہر یہ تصریح ہے کہ قومِ فرعون کی چھوڑی ہوئی املاک اور جائیداد، باغات وخزائن کا مالک غرقِ فرعون کے بعد بنی اسرائیل کو بنادیا گیا، لیکن اس میں ایک تاریخی اشکال یہ ہے کہ خود قرآن کی متعدد آیات اس پر شاہد ہیں کہ قومِ فرعون کی ہلاکت کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف نہیں لوٹے بلکہ اپنے اصلی وطن ارضِ مقدس شام کی طرف روانہ ہوئے، وہیں ان کو ایک کافر قوم سے جہاد کرکے ان کے شہر کو فتح کرنے کا حکم ملا، جس کی تعمیل سے بنی اسرائیل نے انکار کردیا اس پر بطور عذاب کے اس کھلے میدان میں جس میں بنی اسرائیل موجود تھے ایک قدرتی جیل خانہ بنادیا گیا، کہ وہ اس میدان سے نکل نہیں سکتے تھے، اسی حال میں چالیس سال گزارے اور اسی وادیِ تیہ میں ان کے دونوں پیغمبروں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد بھی کتبِ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی وقت بنی اسرائیل اجتماعی اور قومی صورت سے مصر میں داخل ہوئے ہوں کہ قومِ فرعون کی جائیداد وخزائن پر ان کا قبضہ ہوا ہو ـــــ تفسیر روح المعانی [۳] میں سورۂ شعراء کی اسی آیت کے تحت اس کے دو جواب ائمۂ تفسیر حضرت حسنؒ وقتادہؒ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں، حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ آیتِ مذکورہ میں بنی اسرائیل کو فرعونی متروکہ جائیداد کا وارث بنانے

[۱] ترجمہ: اور تم اس دریا کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا۔

[۲] یہ مضمون پہلی اشاعت میں لکھنے سے رہ گیا تھا طبع جدید کے وقت آج ۱۲ رشعبان ۱۳۹۵ھ میں لکھا گیا، جبکہ احقر کی عمر اسّی سال پورے ہونے میں صرف آٹھ دن باقی ہیں۔ ۱۲ منہ

[۳] روح المعانی ج: ۱۴ ص: ۲۲۳ (بالاختصار)

کا ذکر ہے مگر یہ کہیں مذکور نہیں کہ یہ واقعہ ہلاکِ فرعون کے فوراً بعد ہو جائے گا، وادیٔ تیہ کے واقعہ اور چالیس پچاس سال کے بعد بھی اگر وہ مصر میں داخل ہوئے ہوں تو آیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ رہا یہ امر کہ تاریخ سے ان کا اجتماعی داخلہ مصر ثابت نہیں، تو یہ اعتراض اس لئے قابلِ التفات نہیں کہ اُس زمانہ کی تاریخ یہود و نصاریٰ کی لکھی ہوئی اکاذیب سے بھرپور ہے جو کسی طرح قابلِ اعتماد نہیں، اس کی وجہ سے آیتِ قرآن میں کوئی تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اس واقعہ کے متعلق جتنی آیات قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں آئی ہیں مثلاً سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۲۸ و نمبر ۱۳۷ اور سورۂ قصص آیت نمبر ۵ اور سورۂ دخان کی آیات نمبر ۲۵ تا نمبر ۲۸ اور سورۂ شعراء کی آیت مذکورہ نمبر ۵۹ ان سب کے ظاہر سے اگرچہ ذہن اس طرف جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو خاص انہیں باغات اور جائیدادوں کا مالک بنایا گیا تھا جو قومِ فرعون نے ارضِ مصر میں چھوڑی تھیں جس کے لئے بنی اسرائیل کا مصر کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ لیکن ان سب آیتوں کے الفاظ میں اس کی بھی واضح گنجائش موجود ہے کہ مراد اُن سے یہ ہو کہ بنی اسرائیل کو اسی طرح کے خزائن اور باغات وغیرہ کا مالک بنا دیا گیا جس طرح کے باغات قومِ فرعون کے پاس تھے۔ جس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ارضِ مصر ہی میں پہنچ کر حاصل ہوں بلکہ ارضِ شام میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں، اور سورۂ اعراف کی آیت میں الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (الاعراف: ۷: ۱۳۷) کے الفاظ سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارضِ شام مراد ہے، کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں بٰرَكْنَا وغیرہ کے الفاظ اکثر ارضِ شام ہی کے بارے میں آئے ہیں، اس لئے حضرت قتادہؒ کا قول یہ ہے کہ بلا ضرورت آیاتِ قرآن کو ایسے محمل پر محمول کرنا جو تاریخ عالم سے متصادم ہو درست نہیں ـــــ خلاصہ یہ ہے کہ اگر واقعات سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہلاکِ فرعون کے بعد کسی وقت بھی بنی اسرائیل اجتماعی صورت سے مصر پر قابض نہیں ہوئے تو حضرت قتادہؒ کی تفسیر کے مطابق ان تمام آیات میں ارضِ شام اور اس کے باغات و خزائن کا وارث ہونا مراد لیا جا سکتا ہے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾ اس وقت جبکہ فرعونی لشکر جو ان کے تعاقب میں تھا جب بالکل سامنے آ گیا تو پوری قوم بنی اسرائیل چلا اٹھی کہ ہم تو پکڑ لئے گئے اور پکڑے جانے میں شبہ اور دیر ہی کیا تھی کہ پیچھے یہ لشکرِ جرّار اور آگے دریا حائل، یہ صورتِ حال موسیٰ علیہ السلام سے بھی غائب نہ تھی مگر وہ کوہِ استقامت اللہ کے وعدہ پر یقین کئے ہوئے اس وقت بھی بڑے زور سے کہتے ہیں كَلَّا ۚ ہرگز نہیں پکڑے جا سکتے اور وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٢﴾ میرے ساتھ میرا پروردگار ہے جو مجھے راستہ دے گا۔ ایمان کا امتحان ایسے ہی مواقع میں ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ذرا ہراس نہیں تھا، وہ گویا راستہ بچنے کا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح کا بعینہٖ واقعہ ہجرت کے وقت غارِ ثور میں چھپنے کے وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا تھا کہ دشمن جو آپ کے تعاقب میں تھے اس غار کے

دہانے پر آ کھڑے ہوئے، ذرا نیچے نظر کریں تو آپ ان کے سامنے آجائیں، اس وقت صدیق اکبرؓ کو گھبراہٹ ہوئی تو آپ نے بعینہٖ یہی جواب دیا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبۃ: ۴۰) کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے، ان دونوں واقعات میں ایک بات یہ بھی قابلِ نظر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دینے کے لئے کہا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ ''میرے ساتھ میرا ربّ ہے'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب مَعَنَا فرمایا کہ ہم دونوں کے ساتھ ہمارا ربّ ہے، یہ امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ اس کے افراد بھی اپنے رسول کے ساتھ معیتِ الٰہیہ سے سرفراز ہیں۔

وقف لازم

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور سُنا دے اُن کو خبر ابراہیم کی جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ

وہ بولے ہم پوجتے ہیں مورتوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں، کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا

اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا

جب تم پکارتے ہو، یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا بُرا، بولے نہیں، پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو

كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ

یہی کام کرتے کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو تم

وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور تمہارے باپ دادے اگلے سو وہ میرے غنیم ہیں مگر جہان کا ربّ

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ هُوَ يُطْعِمُنِیْ وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾

جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور وہ مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾

اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے اور وہ جو مجھ کو مارے گا اور پھر جلائے گا

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا

اور وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن اے میرے رَبّ دے مجھ کو حکم

وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾

اور ملا مجھ کو نیکوں میں اور رکھ میرا بول سچا پچھلوں میں

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ

اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ تھا

مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا

راہ بھولے ہوؤں میں اور رُسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اُٹھیں جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ

بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾

بیٹے مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر دل چنگا اور پاس لائیں بہشت کو واسطے ڈر والوں کے

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾

اور نکالیں دوزخ کو سامنے بے راہوں کے اور کہیں اُن کو کہاں ہیں جن کو تم پوجتے تھے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ

اللہ کے سوائے کیا کچھ مدد کرتے ہیں تمہاری یا بدلہ لے سکتے ہیں پھر اوندھے ڈالیں اُس میں ان کو

وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ۙ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ؕ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا

اور سب بے راہوں کو، اور ابلیس کے لشکر کو سبھوں کو کہیں گے جب وہ وہاں

يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ۙ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ۙ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ

باہم جھگڑنے لگیں قسم اللہ کی ہم تھے صریح غلطی میں جب ہم تم کو برابر کرتے تھے

بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ۙ

پروردگار عالم کے اور ہم کو راہ سے بہکایا سو ان گنہگاروں نے پھر کوئی نہیں ہماری سفارش کرنے والے

وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾

اور نہ کوئی دوست محبت کرنے والا سو کسی طرح ہم کو پھر جانا ملے تو ہم ہوں ایمان والوں میں

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ

اس بات میں نشانی ہے اور بہت لوگ اُن میں نہیں ماننے والے اور تیرا ربّ وہی ہے

الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ع (ع ٥ ٦ ٣ ٩)

زبردست رحم والا

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) ان کو ابراہیم کا واقعہ سناؤ، ﴿٦٩﴾ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ''تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟'' ﴿٧٠﴾ انہوں نے کہا کہ: ''ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور اُنہی کے آگے دھرنا دیئے رہتے ہیں۔'' ﴿٧١﴾ ابراہیم نے کہا: ''جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ ﴿٧٢﴾ یا تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچاتے ہیں؟'' ﴿٧٣﴾ انہوں نے کہا: ''اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے۔'' ﴿٧٤﴾

ابراہیم نے کہا: ''بھلا کبھی تم نے ان چیزوں کو غور سے دیکھا بھی جن کی تم عبادت کرتے رہے ہو؟ ﴿۷۵﴾ تم بھی اور تمہارے
پُرانے باپ دادے بھی! ﴿۷۶﴾ میرے لئے تو یہ سب دُشمن ہیں، سوائے ایک ربّ العالمین کے ﴿۷۷﴾ جس نے مجھے پیدا کیا
ہے، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے، ﴿۷۸﴾ اور جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے ﴿۷۹﴾ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے، ﴿۸۰﴾
اور جو مجھے موت دے گا، پھر زندہ کرے گا، ﴿۸۱﴾ اور جس سے میں یہ اُمید لگائے ہوئے ہوں کہ وہ حساب و کتاب کے دن
میری خطا بخش دے گا۔'' ﴿۸۲﴾ میرے پروردگار! مجھے حکمت عطا فرما، اور مجھے نیک لوگوں میں شامل فرمالے، ﴿۸۳﴾ اور آنے
والی نسلوں میں میرے لئے وہ زبانیں پیدا فرمادے جو میری سچائی کی گواہی دیں۔ ﴿۸۴﴾ اور مجھے اُن لوگوں میں سے
بنادے جو نعمتوں والی جنت کے وارث ہوں گے۔ ﴿۸۵﴾ اور میرے باپ کی مغفرت فرما۔ یقیناً وہ گمراہ لوگوں میں سے
ہے۔ ﴿۸۶﴾ اور اُس دن مجھے رُسوا نہ کرنا جس دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، ﴿۸۷﴾ جس دن نہ کوئی مال کام آئے گا، نہ
اولاد، ﴿۸۸﴾ ہاں جو شخص اللہ کے پاس سلامتی والا دِل لے کر آئے گا، (اس کو نجات ملے گی) ﴿۸۹﴾ اور جنت متقی لوگوں کے
لئے قریب کردی جائے گی، ﴿۹۰﴾ اور دوزخ کھلے طور پر گمراہوں کے سامنے کردی جائے گی ﴿۹۱﴾ اور اُن سے کہا جائے گا کہ:
''کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے؟ کیا وہ تمہاری مدد کریں گے یا خود اپنا بچاؤ کرلیں
گے؟'' ﴿۹۲﴾ و ﴿۹۳﴾ پھر اُن کو اور گمراہوں کو بھی اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، ﴿۹۴﴾ اور اِبلیس کے سارے لشکروں کو
بھی۔ ﴿۹۵﴾ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑتے ہوئے (اپنے معبودوں سے) کہیں گے ﴿۹۶﴾ کہ: ''اللہ کی قسم ہم تو اُس زمانے
میں کھلی گمراہی میں مبتلا تھے ﴿۹۷﴾ جب ہم نے تمہیں ربّ العالمین کے برابر قرار دے رکھا تھا ﴿۹۸﴾ اور ہمیں تو ان بڑے
بڑے مجرموں نے ہی گمراہ کیا تھا۔ ﴿۹۹﴾ نتیجہ یہ ہے کہ نہ تو ہمیں کسی قسم کی سفارش کرنے والے میسر ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور نہ کوئی ایسا
دوست جو ہمدردی کرسکے ﴿۱۰۱﴾ اب کاش کہ ہمیں ایک مرتبہ دُنیا میں واپس جانے کا موقع مل جائے تو ہم مؤمن بن
جائیں!'' ﴿۱۰۲﴾ یقیناً اس سارے واقعے میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، ﴿۱۰۳﴾
اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بہت مہربان بھی۔ ﴿۱۰۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان لوگوں کے سامنے ابراہیم (علیہ السلام) کا قصّہ بیان کیجئے (تاکہ ان کو شرک کی مذمت کے دلائل معلوم ہوں، خصوص ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہوکر، کیونکہ یہ مشرکینِ عرب اپنے کو ملتِ ابراہیمیہ پر بتلاتے ہیں اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھے) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو، انہوں نے کہا ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم انہی (کی عبادت) پر جمے رہتے ہیں،

ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم ان کو (اپنی عرضِ حاجت کے وقت) پکارا کرتے ہو یا (تم جو اِن کی عبادت کرتے ہو تو کیا) یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں یا (اگر تم ان کی عبادت ترک کر دو تو کیا) یہ تم کو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں (یعنی استحقاقِ الوہیت کے لئے علم اور قدرتِ کاملہ تو ضروری ہے) ان لوگوں نے کہا نہیں (یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ کچھ سنتے ہوں یا نفع وضرر پہنچا سکتے ہوں اور ان کی عبادت کرنے کی یہ وجہ نہیں) بلکہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے (اس لئے ہم بھی وہی کرتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا تم نے ان (کی حالت) کو (غور سے) دیکھا بھی جن کی تم عبادت کیا کرتے ہو تم بھی اور تمہارے پُرانے بڑے بھی کہ یہ (معبودین) میرے (یعنی تمہارے لئے) باعثِ ضرر ہیں (یعنی اگر ان کی عبادت کی جائے، خواہ نعوذ باللہ میں کروں یا تم کرو تو بجز ضرر کے اور کوئی نتیجہ نہیں) مگر ہاں رَبّ العالمین (ایسا ہے کہ وہ اپنے عابدین کا دوست ہے اور اس کی عبادت سرتا سر نافع ہے) جس نے مجھ کو (اور اسی طرح سب کو) پیدا کیا، پھر وہی مجھ کو (میری مصلحتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (یعنی عقل وفہم دیتا ہے جس سے نفع وضرر کو سمجھتا ہوں) اور جو مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں (جس کے بعد شفاء ہو جاتی ہے) تو وہی مجھ کو شفاء دیتا ہے اور جو مجھ کو (وقت پر) موت دے گا پھر (قیامت کے روز) مجھ کو زندہ کرے گا اور جس سے مجھ کو یہ امید ہے کہ میری غلط کاری کو قیامت کے روز معاف کر دے گا (یہ تمام تر صفات اس لئے سنائیں کہ قوم کو خدا تعالیٰ کی عبادت کی رغبت ہو پھر صفاتِ کمال بیان فرماتے فرماتے غلبۂ حضور سے حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے کہ) اے میرے پروردگار مجھ کو حکمت (یعنی جامعیت بین العلم والعمل میں زیادہ کمال) عطا فرما (کیونکہ نفسِ حکمت تو وقتِ دعاء کے بھی حاصل ہے) اور (مراتبِ قرب میں) مجھ کو (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما (مراد انبیاء عالیشان ہیں) اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھ (تاکہ میرے طریقہ پر چلیں جس میں مجھ کو زیادہ ثواب ملے) اور مجھ کو جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر اور میرے باپ (کو توفیق ایمان کی دے کر اُس) کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں ہے اور جس روز سب زندہ ہو کر اُٹھیں گے اُس روز مجھ کو رُسوا نہ کرنا۔ (آگے اس دن کے بعض واقعات ہائلہ کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ قوم سُنے اور ڈرے یعنی وہ ایسا دِن ہوگا) جس دن میں کہ (نجات کے لئے) نہ مال کام آئے گا نہ اولاد مگر ہاں (اس کو نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر وشرک سے) پاک دل لے کر آئے گا اور (اس روز) خدا ترسوں (یعنی ایمان والوں) کے لئے جنت نزدیک کر دی جائے گی (کہ اس کو دیکھیں اور یہ معلوم کر کے کہ ہم اس میں جائیں گے خوش ہوں) اور ان گمراہوں (یعنی کافروں) کے لئے دوزخ سامنے ظاہر کی جائے گی (کہ اُس کو دیکھ کر غمزدہ ہوں کہ ہم اس میں جائیں گے) اور (اس روز) ان (گمراہوں) سے کہا جائے گا کہ وہ معبود کہاں گئے جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا کرتے تھے کیا (اس وقت) وہ تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں یا اپنا ہی بچاؤ کر سکتے ہیں پھر (یہ کہہ کر) وہ (عابدین) اور گمراہ لوگ اور ابلیس کا لشکر سب کے سب دوزخ میں اوندھے منہ ڈال

دیئے جائیں گے (بس وہ بت اور شیاطین نہ اپنے کو بچا سکے نہ اپنے عابدین کو) وہ کفار اس دوزخ میں گفتگو کرتے ہوئے (ان معبودین سے) کہیں گے کہ بخدا بے شک ہم صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو (عبادت میں) رَبّ العالمین کے برابر کرتے تھے اور ہم کو تو بس ان بڑے مجرموں نے (جو کہ بانیٔ ضلالت تھے) گمراہ کیا سو (اب) نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے (کہ چھڑا لے) اور نہ کوئی مخلص دوست (کہ خالی دلسوزی ہی کرے) سو کیا اچھا ہوتا کہ ہم کو (دُنیا میں) پھر واپس جانا ملتا کہ ہم مسلمان ہو جاتے (یہاں تک ابراہیم علیہ السلام کی تقریر ہوگئی آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) ایک عبرت ہے (کہ مضامین مناظرہ میں غور کر کے توحید کا اعتقاد کریں اور واقعاتِ قیامت سے ڈریں اور ایمان لائیں) اور (باوجود اس کے) ان (مشرکین مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے بے شک آپ کا رَبّ بڑا زبردست رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

قیامت تک انسانوں میں ذکرِ خیر رکھنے کی دُعا

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ اس آیۃ مبارکہ میں ''لسان'' سے مراد ذکر ہے اور ''لی'' کا لام نفع کے لئے ہے آیۃ کے معنی یہ ہوئے کہ اے خدایا! مجھے ایسے پسندیدہ طریقے اور عمدہ نشانیاں عطا فرما جس کی دوسرے لوگ قیامت تک پیروی کریں، اور مجھے ذکر خیر اور عمدہ صفت سے یاد کیا کریں۔ (ابن کثیر و روح المعانی)[1] خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا قبول فرمائی۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ تک ملتِ ابراہیمی سے محبت و اُلفت رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگرچہ ان کا طریقہ ملتِ ابراہیمی کے خلاف کفر و شرک ہے، مگر وہ دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں، اور اُمتِ محمدیہ تو بجا طور پر بھی ملتِ ابراہیمی پر ہونے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہے۔

حُبِّ جاہ مذموم مگر چند شرائط کے ساتھ جائز ہے

حُبِّ جاہ یعنی لوگوں سے اپنی عزّت کرنے اور مدح کرنے کی خواہش شرعاً مذموم ہے قرآن کریم نے دارِ آخرت کی نعمتوں کو حُبِّ جاہ کے ترک پر موقوف قرار دیا ہے (قال تعالیٰ[2] تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ (القصص: ۸۳)) اس جگہ آیت (وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام

[1] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۴ ص:۲۵۵، وابن کثیر ج:۶ ص:۱۴۷
[2] ترجمہ: یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔

کی یہ دُعا کہ آنے والی نسلوں میں میری تعریف وثنا ہوا کرے بظاہر حُبِّ جاہ میں داخل معلوم ہوتی ہے لیکن آیت کے الفاظ میں غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس دُعا کا اصل مقصد حُبِّ جاہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی دُعا ہے کہ ایسے نیک اعمال کی توفیق بخشیں جو میری آخرت کا سامان بنیں اور اس کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو بھی اعمالِ صالحہ کی رغبت ہو اور میرے بعد بھی لوگ اعمال صالحہ میں میری پیروی کرتے رہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے کوئی وجاہت کا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہی نہیں، جس کو حُبِّ جاہ کہا جا سکے۔ قرآن و حدیث میں جہاں طلبِ جاہ کو ممنوع اور مذموم قرار دیا ہے اس کی مراد وہی دُنیوی وجاہت اور اُس سے دُنیوی منافع حاصل کرنا ہے۔

امام ترمذی و نسائی نے حضرت کعبؓ بن مالک کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں کے گلّے میں چھوڑ دیئے جائیں وہ بکریوں کے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا دو خصلتیں انسان کے دین کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ایک مال کی محبت دوسرے اپنی عزت و جاہ کی طلب (ورواہ الطبرانی عن ابی سعید الخدریؓ والبزار عن ابی ہریرۃؓ) [۱] اور حضرت ابن عباسؓ سے بسند ضعیف دیلمی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہ وثنا کی محبت انسان کو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ [۲] ان تمام روایات سے مراد وہ حُبِّ جاہ اور طلبِ ثناء ہے جو دُنیوی مقاصد کے لئے مطلوب ہو یا جس کی خاطر دین میں مداہنت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے اور جب یہ صورت نہ ہو تو طلبِ جاہ مذموم نہیں۔ حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا منقول ہے (اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا) [۳] یعنی یا اللہ مجھے خود اپنی نگاہ میں تو چھوٹا اور حقیر بنا دیجئے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنا دیجئے۔ یہاں بھی لوگوں کی نظر میں بڑا بنانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ نیک اعمال میں میری پیروی کریں۔ اسی لئے امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص واقع میں صالح اور نیک ہو، لوگوں کی نظر میں نیک بننے کے لئے ریاکاری نہ کرے اس کے لئے لوگوں کی طرف سے مدح وثنا کی محبت مذموم نہیں۔

ابن عربی نے فرمایا کہ آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ جس نیک عمل سے لوگوں میں تعریف ہوتی ہو اُس نیک عمل کی طلب و خواہش جائز ہے۔ [۴] اور امام غزالیؒ نے فرمایا کہ دُنیا میں عزت و جاہ کی محبت تین شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔ اوّل یہ کہ اس سے مقصود اپنے آپ کو بڑا اور اُس کے بالمقابل دوسرے کو چھوٹا یا حقیر قرار دینا نہ ہو بلکہ آخرت کے فائدہ کے لئے ہو کہ لوگ میرے معتقد ہو کر نیک اعمال میں میرا اتباع کریں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹی ثنا خوانی مقصود نہ ہو کہ جو صفت اپنے اندر

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الزهد، بابٌ (بعد باب ما جاء فی أخذ المال بحقه) ج:۲ ص:۶۲، والمعجم الأوسط للطبرانی، رقم الحديث: ۷۸۳

[۲] کنز العمال، رقم الحديث: ۷۴۲۹، وجامع الأحاديث للسيوطیؒ، رقم الحديث: ۱۱۵۰۶

[۳] مجمع الزوائد، رقم الحديث: ۱۷۴۱۲

[۴] احکام القرآن لابن العربیؒ تحت هذه الآية ج:۶ ص:۱۷۹

نہیں ہے لوگوں سے اس کی خواہش رکھے کہ وہ اس صفت میں اُس کی تعریف کریں۔ تیسرے یہ کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کسی گناہ یا دین کے معاملے میں مداہنت اختیار نہ کرنی پڑے۔

مشرکین کے لئے دُعائے مغفرت جائز نہیں

وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿٨٦﴾ قرآن مجید کے اس فرمان کے بعد (مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿١١٣﴾ (التوبۃ) اب کسی ایسے شخص کے لئے جس کا کفر پر مرنا یقینی ہو استغفار اور دُعائے مغفرت طلب کرنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ آیتِ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے کہ کسی نبی اور ایمانداروں کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں خواہ وہ اس کے رشتہ دار اور قریبی ہی کیوں نہ ہوں جبکہ اُن کا جہنمی ہونا بالکل واضح ہو چکا ہو۔

ایک سوال و جواب

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ اس نہی اور ممانعت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے لئے کیوں دُعائے مغفرت مانگی؟ اس کا جواب خود اللہ رَبّ العزت نے قرآن مجید میں دیدیا کہ[1] وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ﴿١١٤﴾ (التوبۃ)

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے ان کی زندگی میں استغفار اس نیت اور خیال سے کی تھی کہ اللہ رَبّ العزت ان کو ایمان لانے کی توفیق دے جس کے بعد مغفرت یقینی ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خیال تھا کہ میرا باپ خفیہ طور پر ایمان لے آیا ہے اگرچہ اس کا اظہار اور اعلان نہیں کیا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہوگیا کہ میرا باپ تو کفر پر مرا ہے تو انہوں نے اپنی پوری بیزاری اور براٗۃ کا اظہار فرمایا۔ (فائدہ) اس بات کی تحقیق کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باپ کا کفر اور شرک اپنے باپ کی زندگی میں معلوم ہوگیا تھا یا مرنے کے بعد یا قیامت کے روز ہوگا، اس کی پوری تفصیل سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿٨٩﴾ یعنی قیامت کے اُس دن میں جس میں نہ کوئی مال کسی کو فائدہ دے گا نہ اُس کی نرینہ اولاد بجز اُس شخص کے جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر پہنچے۔ اس آیت کی تفسیر بعض حضرات نے استثناء کو استثنائے منقطع قرار دے کر یہ کی ہے کہ اُس روز کسی کو نہ اس کا مال کام آئے گا نہ اولاد، ہاں کام آئے گا تو صرف اپنا قلبِ سلیم جس میں شرک و کفر نہ ہو۔ اور اس جملے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص زید کے متعلق کسی سے پوچھے

[1] ترجمہ: اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا وہ صرف وعدہ کے سبب تھا جو انہوں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہوگئے واقعی ابراہیم بڑے رحیم المزاج حلیم الطبع تھے۔

کہ کیا زید کے پاس مال اور اولاد بھی ہے وہ اس کے جواب میں کہے اس کا مال و اولاد تو اس کا قلبِ سلیم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مال و اولاد تو کچھ نہیں مگر ان سب کے بدلے اس کے پاس اپنا قلبِ سلیم موجود ہے۔ خلاصۂ مضمون آیت کا اس تفسیر پر یہ ہوتا ہے کہ مال یا اولاد تو اُس روز کچھ کام نہ آئیں گے، کام صرف اپنا ایمان اور عمل صالح آئے گا جس کو قلبِ سلیم سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ اور مشہور تفسیر اکثر مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ استثناء متصل ہے اور معنے یہ ہیں کہ مال اور اولاد قیامت کے روز کسی شخص کے کام نہ آئیں گے بجز اُس شخص کے جس کا قلب سلیم ہے یعنی وہ مؤمن ہے اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ سب چیزیں قیامت میں بھی مفید و نافع ہو سکتی ہیں مگر صرف مؤمن کے لئے نفع بخش ہوں گی کافر کو کچھ نفع نہ دیں گی۔

یہاں ایک بات یہ قابلِ نظر ہے کہ اس جگہ قرآن کریم نے وَلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فرمایا جس کے معنے نرینہ اولاد کے ہیں عام اولاد کا ذکر غالباً اس لئے نہیں کیا کہ آڑے وقت میں کام آنے کی توقع دُنیا میں بھی نرینہ اولاد یعنی لڑکوں ہی سے ہو سکتی ہے لڑکیوں سے کسی مصیبت کے وقت امداد ملنے کا تو یہاں بھی احتمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اس لئے قیامت میں بالتخصیص لڑکوں کے غیر نافع ہونے کا ذکر کیا گیا جن سے دُنیا میں توقع نفع کی رکھی جاتی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قلبِ سلیم کے لفظی معنے تندرست دل کے ہیں۔ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ قلب ہے جو کلمۂ توحید کی گواہی دے اور شرک سے پاک ہو، یہی مضمون مجاہد حسن بصری سعید بن مسیّب سے بعنوان مختلف منقول ہے۔ سعید بن مسیّبؒ نے فرمایا کہ تندرست دل صرف مؤمن کا ہو سکتا ہے کافر کا دل بیمار ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے [1] فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (البقرة:۱۰)

مال و اولاد اور خاندانی تعلقات آخرت میں بھی بشرطِ ایمان نفع پہنچا سکتے ہیں

آیتِ مذکورہ کی مشہور تفسیر کے مطابق معلوم ہوا کہ انسان کا مال قیامت کے روز بھی اُس کے کام آ سکتا ہے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جس شخص نے دُنیا میں اپنا مال اللہ کی راہ اور نیک کاموں میں خرچ کیا تھا یا کوئی صدقہ جاریہ کر کے چھوڑا تھا، اگر اُس کا خاتمہ ایمان پر ہوا محشر میں مؤمنین کی فہرست میں داخل ہوا تو یہاں کا خرچ کیا ہوا مال اور صدقۂ جاریہ کا ثواب اس کو میدانِ حشر اور میزانِ حساب میں بھی کام آئے گا۔ اور اگر یہ شخص مسلمان نہیں تھا یا خدانخواستہ مرنے سے پہلے ایمان سے نکل گیا تو اب دُنیا میں کیا ہوا کوئی نیک عمل اس کے کام نہ آئے گا اور اولاد کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اگر یہ شخص مسلمان ہے تو آخرت میں بھی اس کو اولاد کا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس طرح سے کہ اس کے بعد اس کی اولاد اس کے لئے دُعائے مغفرت کرے یا ایصالِ ثواب کرے، اور اس طرح بھی کہ اُس نے اولاد کو نیک بنانے کی کوشش کی تھی اس لئے

---

[1] ترجمہ: ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے۔

اُن کے نیک عمل کا ثواب اس کو بھی خود بخود ملتا رہا اور اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہا۔ اور اس طرح بھی کہ اولاد محشر میں اس کی شفاعت کر کے بخشوالے جیسا کہ بعض روایات حدیث میں ایسی شفاعت کرنا اور اس کا قبول ہونا ثابت ہے خصوصاً نابالغ اولاد کا۔[1] اسی طرح اولاد کو ماں باپ سے بھی آخرت میں بشرطِ ایمان یہ نفع پہنچے گا کہ اگر یہ مسلمان ہوئے مگر اُن کے اعمالِ صالحہ ماں باپ کے درجے کو نہیں پہنچے تو اللہ تعالیٰ اُن کے باپ دادا کی رعایت کر کے ان کو بھی اُسی مقامِ بلند میں پہنچا دیں گے جو اُن کے باپ دادا کا مقام ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح اس طرح مذکور ہے اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (الطّور:۲۱) یعنی ہم ملا دیں گے اپنے نیک بندوں کے ساتھ اُن کی ذرّیت کو بھی۔ اس آیت کی مذکور الصدر مشہور تفسیر سے معلوم ہوا کہ قرآن حدیث میں جہاں کہیں یہ مذکور ہے کہ قیامت میں خاندانی تعلق کچھ کام نہ آئے گا اس کی مراد یہ ہے کہ غیر مؤمن کو کام نہ آئے گا، یہاں تک کہ پیغمبر کی اولاد اور بیوی بھی اگر مؤمن نہیں تو ان کی پیغمبری سے ان کو قیامت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور لوط علیہ السلام کی بیوی اور ابراہیم علیہ السلام کے والد کا معاملہ ہے۔ آیاتِ قرآن [2] فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ (المؤمنون:۱۰۱) اور [3] يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ (عبس) اور [4] لَا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ (لقمان:۳۳) ان سب آیات کا یہی مفہوم ہوسکتا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ

جھٹلایا نوح کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی نوح نے

اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾

کیا تم کو ڈر نہیں میں تمہارے واسطے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور مانگتا نہیں میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر

---

۱ اس قسم کی بعض روایات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: مجمع الزوائد، رقم الحدیث: ۳۹۹۹ و ۴۰۰۰، ومسند احمد، رقم الحدیث: ۱۷۴۳۴

۲ ترجمہ: پھر جب صور پھونکا جائے گا تو ان میں باہمی رشتے ناتے اس روز نہ رہیں گے۔

۳ ترجمہ: جس روز ایسا آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے بھاگے گا۔

۴ ترجمہ: نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے ذرا بھی مطالبہ ادا کر دے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿١١١﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو بولے کیا ہم تجھ کو مان لیں اور تیرے ساتھ ہو رہے ہیں کمینے

قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٢﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ

کہا مجھ کو کیا جاننا ہے اس کا جو کام وہ کر رہے ہیں ان کا حساب پوچھنا میرے ربّ کا ہی کام ہے اگر

تَشْعُرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٤﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٥﴾

تم سمجھ رکھتے ہو اور میں ہانکنے والا نہیں ایمان لانے والوں کو میں تو بس یہی ڈر سنا دینے والا ہوں کھول کر

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٦﴾ قَالَ رَبِّ

بولے اگر تو نہ چھوڑے گا اے نوح تو ضرور سنگسار کردیا جائے گا کہا اے ربّ

اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ النصف

میری قوم نے تو مجھ کو جھٹلایا سو فیصلہ کر دے میرے ان کے بیچ میں کسی طرح کا فیصلہ اور بچا لے مجھ کو اور جو میرے ساتھ ہیں

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿١١٩﴾

ایمان والے پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اس لدی ہوئی کشتی میں

ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

پھر ڈبا دیا ہم نے اس کے پیچھے ان باقی رہے ہوؤں کو البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٢﴾ ع ۶/۱۰

ماننے والے اور تیرا ربّ وہی ہے زبردست رحم والا

آسان ترجمۂ قرآن

نوح کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿۱۰۵﴾ جبکہ اُن کے بھائی نوح نے اُن سے کہا کہ: ''کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۰۶﴾ یقین جانو کہ میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں، ﴿۱۰۷﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ ﴿۱۰۸﴾ اور میں تم سے اس کام پر کسی قسم کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اَجر تو صرف اُس ذات نے اپنے ذمے لے رکھا ہے جو سارے دُنیا جہان کی پرورِش کرتی ہے۔ ﴿۱۰۹﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔'' ﴿۱۱۰﴾ وہ لوگ بولے: ''کیا ہم تم پر ایمان لے آئیں، حالانکہ بڑے نیچے درجے کے لوگ تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟'' ﴿۱۱۱﴾ نوح نے کہا: ''میں کیا جانوں کہ وہ کیا کام کرتے ہیں؟ ﴿۱۱۲﴾ اُن کا حساب لینا کسی اور کا نہیں، میرے پروردگار کا کام ہے۔ کاش! تم سمجھ سے کام لو! ﴿۱۱۳﴾ اور میں ان مؤمنوں کو دُھتکار کر اپنے سے دُور نہیں کرسکتا۔ ﴿۱۱۴﴾ میں تو بس ایک خبردار کرنے والا ہوں جو (تمہارے سامنے) حقیقت کھول کر رکھ رہا ہے۔'' ﴿۱۱۵﴾ وہ کہنے لگے: ''اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کردیا جائے گا۔'' ﴿۱۱۶﴾ نوح نے کہا: ''میرے پروردگار! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ ﴿۱۱۷﴾ اب آپ میرے اور ان کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردیجئے، اور مجھے اور میرے مؤمن ساتھیوں کو بچالیجئے۔'' ﴿۱۱۸﴾ چنانچہ ہم نے اُنہیں اور اُن کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں بچالیا، ﴿۱۱۹﴾ پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کردیا۔ ﴿۱۲۰﴾ یقیناً اس سارے واقعے میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، ﴿۱۲۱﴾ اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بہت مہربان بھی۔ ﴿۱۲۲﴾

خلاصۂ تفسیر

قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب سے سب کی تکذیب لازم آتی ہے) جبکہ اُن سے ان کی برادری کے بھائی نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں (کہ بعینہٖ پیغامِ خداوندی بلا کمی بیشی پہنچا دیتا ہوں) سو (اس کا مقتضٰی یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور (نیز) میں تم سے کوئی (دُنیوی) صلہ (بھی) نہیں مانگتا میرا صلہ تو بس رَبّ العالمین کے ذمّہ ہے سو (میری اس بے غرضی کا مقتضٰی بھی یہ ہے کہ تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا ہم تم کو مانیں گے، حالانکہ رذیل لوگ تمہارے ساتھ ہولئے ہیں (جن کی موافقت سے شرفاء کو عار آتی ہے اور نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کا مقصد کسی کے ساتھ لگنے سے کچھ مال یا جاہ حاصل کرنا ہوتا ہے، اِن کا دعوائے ایمان بھی قابلِ اعتبار نہیں۔) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اُن کے (پیشہ ورانہ) کام سے مجھ کو کیا بحث (خواہ شریف ہوں یا رذیل ہوں دین میں اس تفاوت کا کیا اثر؟ رہا یہ احتمال کہ ان کا ایمان دل سے

نہیں سواس پر) ان سے حساب و کتاب لینا بس خدا کا کام ہے۔ کیا خوب ہو کہ تم اس کو سمجھو اور (رذالت پیشہ لوگوں کو اپنے ایمان کا مانع قرار دینے سے جو اشارۃً یہ درخواست نکلتی ہے کہ میں ان کو اپنے پاس سے دُور کر دوں تو) میں ایمانداروں کو دُور کرنے والا نہیں ہوں (خواہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صاف طور پر ایک ڈرانے والا ہوں (اور تبلیغ سے میرا فرضِ منصبی پورا ہو جاتا ہے، آگے اپنا نفع و نقصان تم لوگ دیکھ لو) وہ لوگ کہنے لگے اگر تم (اس کہنے سننے سے) اے نوح باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے (غرض جب سالہا سال اس طرح گزر گئے تب) نوح (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار میری قوم مجھ کو (برابر) جھٹلا رہی ہے سو آپ میرے اور ان کے درمیان ایک (عملی) فیصلہ کر دیجئے (یعنی ان کو ہلاک کر دیجئے) اور مجھ کو اور جو ایماندار میرے ساتھ ہیں ان کو (اس ہلاکت سے) نجات دیجئے تو ہم نے (ان کی دُعا قبول کی اور) ان کو اور جو اُن کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے اُن کو نجات دی پھر اس کے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، بیشک آپ کا رَبّ زبردست (اور) مہربان ہے (کہ باوجود عذاب پر قادر ہونے کے اُن کو مہلت دیئے ہوئے ہے)۔

معارف و مسائل

طاعات پر اُجرت لینے کا حکم

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبلیغ پر اُجرت لینا درست نہیں ہے اس لئے سلف صالحین نے اُجرت لینے کو حرام کہا ہے لیکن متأخرین نے اس کو بحالتِ مجبوری جائز قرار دیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل آیت [1] وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرۃ: ۴۱) کے تحت میں بیان ہو چکی ہے۔

فائدہ:- اس جگہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ کی آیت دو دفعہ تاکید کے لئے اور یہ بتلانے کے لئے لائی گئی ہے کہ اطاعتِ رسول اور خدا تعالیٰ سے ڈرنے کے لئے صرف رسول کی امانت و دیانت یا صرف تبلیغ و تعلیم پر اُجرت نہ طلب کرنا ہی کافی تھا لیکن جس رسول میں یہ سب صفتیں پائی جائیں اس کی اطاعت اور اس کے خدا سے ڈرنا تو اور لازمی ہو جاتا ہے۔

شرافت و رذالت اعمال و اخلاق سے ہے نہ کہ خاندان اور جاہ و حشم سے

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اس آیت میں اوّل مشرکین کا یہ

[1] ترجمہ: اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر کو۔

قول نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ آپ کے ماننے والے سارے رذیل لوگ ہیں ہم عزّت دار شریف اُن میں کیسے مل جائیں؟ نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ مجھے ان کے اعمال کا حال معلوم نہیں۔ اس میں اشارہ فرمادیا کہ تم لوگ جو خاندانی شرافت یا مال و دولت اور عزت و جاہ کو شرافت کی بنیاد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ مدار عزّت و ذلّت یا شرافت و رذالت کا دراُصل اعمال و اخلاق پر ہے۔ تم نے جن پر یہ حکم لگادیا کہ یہ سب رذیل ہیں، یہ تمہاری جہالت ہے چونکہ ہم ہر شخص کے اعمال و اخلاق کی حقیقت سے واقف نہیں، اس لئے ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ حقیقۃً کون رذیل ہے کون شریف۔ (قرطبی) [1]

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾

جھٹلایا عاد نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی ہود نے کیا تم کو ڈر نہیں

اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٢٥﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٢٦﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ

میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر

مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٧﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً

کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے مالک پر کیا بناتے ہو ہر اونچی زمین پر ایک نشان

تَعْبَثُوْنَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿١٢٩﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ

کھیلنے کو اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہوگے اور جب ہاتھ ڈالتے ہو

بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٣١﴾ وَاتَّقُوا الَّذِىْٓ اَمَدَّكُمْ

تو پنجہ مارتے ہو ظلم سے سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:١٣ ص:١٢٠، ١٢١

بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾

جو تم جانتے ہو پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے اور باغ اور چشمے

اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿١٣٥﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَوَعَظْتَ

میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے بولے ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے

اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ﴿١٣٦﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿١٣٧﴾

یا نہ بنے تو نصیحت کرنے والا اور کچھ نہیں یہ باتیں عادت ہے اگلے لوگوں کی

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿١٣٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ

اور ہم پر آفت نہیں آنے والی پھر اُس کو جھٹلانے لگے تو ہم نے ان کو غارت کردیا، اس بات میں البتہ نشانی ہے

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿١٣٩﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿١٤٠﴾ ع ۸ / ۱۱

اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا رَبّ وہی ہے زبردست رحم والا

آسان ترجمۂ قرآن

عاد کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿١٢٣﴾ جبکہ اُن کے بھائی ہود نے اُن سے کہا کہ: ''کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿١٢٤﴾ یقین جانو کہ میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں، ﴿١٢٥﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ ﴿١٢٦﴾ اور میں تم سے اس کام پر کسی قسم کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف اُس ذات نے اپنے ذمے لے رکھا ہے جو سارے دُنیا جہان کی پرورِش کرتی ہے۔ ﴿١٢٧﴾ کیا تم ہر اُونچی جگہ پر کوئی یادگار بنا کر فضول حرکتیں کرتے ہو؟ ﴿١٢٨﴾ اور تم نے بڑی کاریگری سے بنائی ہوئی عمارتیں اس طرح رکھ چھوڑی ہیں جیسے تمہیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے؟ ﴿١٢٩﴾ اور جب کسی کی پکڑ کرتے ہو تو پکے ظالم وجابر بن کر پکڑ کرتے ہو۔ ﴿١٣٠﴾ اب اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ ﴿١٣١﴾ اور اُس ذات سے ڈرو جس نے اُن چیزوں سے نواز کر تمہاری قوّت میں اضافہ کیا ہے جو تم خود جانتے ہو۔ ﴿١٣٢﴾ اُس نے تمہیں مویشیوں اور اولاد سے بھی نوازا ہے، ﴿١٣٣﴾ اور

باغوں اور چشموں سے بھی۔ (۱۳۴) حقیقت یہ ہے کہ مجھے تم پر ایک زبردست دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔'' (۱۳۵) وہ کہنے لگے: ''چاہے تم نصیحت کرو، یا نہ کرو، ہمارے لئے سب برابر ہے۔ (۱۳۶) یہ باتیں تو وہی ہیں جو پچھلے لوگوں کی عادت رہی ہیں۔ (۱۳۷) اور ہم عذاب کا نشانہ بننے والے نہیں ہیں۔'' (۱۳۸) غرض ان لوگوں نے ہود کو جھٹلایا، جس کے نتیجے میں ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا۔ یقیناً اس سارے واقعے میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، (۱۳۹) اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔ (۱۴۰)

خلاصۂ تفسیر

قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کی (برادری کے) بھائی ہود (علیہ السلام) نے کہا کہ کیا تم (خدا سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو، اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا، بس میرا صلہ تو ربّ العالمین کے ذمّہ ہے، کیا تم (علاوہ شرک کے تکبر و تفاخر میں بھی اس درجہ مصروف ہو کہ) ہر اُونچے مقام پر ایک یادگار (کے طور پر عمارت) بناتے ہو (تا کہ خوب اُونچی نظر آئے) جس کو محض فضول (بلاضرورت) بناتے ہو اور (اس کے علاوہ جو رہنے کے مکان ہیں جن کی ایک درجہ ضرورت بھی ہے اُن میں بھی یہ غلو ہے) کہ بڑے بڑے محل بناتے ہو (حالانکہ اس سے کم میں آرام مل سکتا ہے) جیسے دُنیا میں تم کو ہمیشہ رہنا ہے (یعنی توسیع مکانات اور ایسے بلند محل اور ایسی مضبوطی اور ایسی یادگار تعمیرات اُس وقت مناسب تھیں جبکہ دنیا میں ہمیشہ رہنا ہوتا، تو یہ خیال ہوتا کہ فراخ مکان بناؤ تا کہ آئندہ نسل میں تنگی نہ ہو کیونکہ ہم بھی رہیں گے اور وہ بھی رہیں گے اور بلند بھی بناؤ تا کہ نیچے جگہ نہ رہے تو ادھر رہنے لگیں گے اور مضبوط بناؤ تا کہ ہماری عمر طویل کے لئے کافی ہو اور یادگاریں بناؤ تا کہ ہمارے زندہ رہنے سے ہمارا ذکر زندہ رہے اور اب تو سب فضول ہے۔ بڑی بڑی یادگاریں بنی ہیں اور بنانے والے کا نام تک نہیں۔ موت نے سب کا نام مٹا دیا کسی کا جلدی اور کسی کا دیر میں) اور (اس تکبر کے سبب طبیعت میں سختی اور بے رحمی اس درجہ رکھتے ہو کہ) جب کسی پر دارو گیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر (اور ظالم) بن کر دارو گیر کرتے ہو (ان بُرے اخلاق کا اس لئے بیان کیا گیا کہ یہ بُرے اخلاق اکثر ایمان اور اطاعت کی راہ میں رُکاوٹ بنتے ہیں) سو (چونکہ شرک اور گزشتہ بُرے اخلاق خدا تعالیٰ کی ناخوشی اور عذاب کا سبب ہیں اس لئے) تم (کو چاہئے کہ) اللہ سے ڈرو اور (چونکہ میں رسول ہوں اس لئے) میری اطاعت کرو اور اس (اللہ) سے ڈرو (یعنی جس سے ڈرنے کو میں کہتا ہوں وہ ایسا ہے) جس نے تمہاری ان چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو (یعنی) چوپائے اور بیٹوں اور باغوں اور چشموں سے تمہاری امداد کی (تو منعم ہونے کا مقتضا یہ ہے کہ اس کے احکام کی بالکل مخالفت نہ کی جائے) مجھ کو تمہارے حق میں (اگر تم ان حرکات سے باز

نہ آئے) ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ ترہیب ہے اور اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ الخ میں ترغیب تھی) وہ لوگ بولے کہ ہمارے نزدیک تو دونوں باتیں برابر ہیں خواہ تم نصیحت کرو اور خواہ ناصح نہ بنو (یعنی ہم دونوں حالتوں میں اپنے کردار سے باز نہ آئیں گے اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو) یہ تو بس اگلے لوگوں کی ایک (معمولی) عادت (ہے اور رسم) ہے (کہ ہر زمانہ میں لوگ مدعی نبوّت ہو کر لوگوں کو یوں ہی کہتے سنتے رہے) اور (تم جو ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو تو) ہم کو ہرگز عذاب نہ ہوگا غرض ان لوگوں نے ہود (علیہ السلام) کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (سخت آندھی کے عذاب سے) ہلاک کر دیا، بیشک اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے (کہ احکام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا) اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رَبّ زبردست (اور) مہربان ہے (کہ عذاب دینے پر قادر بھی ہے اور رحمت سے مہلت بھی دے رکھی ہے)۔

معارف ومسائل

چند مشکل الفاظ کی تشریح

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ (الرِّیع) ابن جریر نے حضرت مجاہدؒ سے نقل فرمایا ہے کہ رِیْعٌ دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ کو کہتے ہیں۔[۱] حضرت ابن عباس سے اور جمہور سے منقول ہے کہ ریع بلند جگہ کو کہتے ہیں اور اسی سے رِیْعُ النَّبَاتِ نکلا ہے یعنی بڑھنے اور چڑھنے والی نباتات، (اٰيَةً) اس کے اصل معنی علامت کے ہیں اس جگہ بلند محل مراد ہے۔ (تَعْبَثُوْنَ) یہ عبث سے ہے اور عبث اس کو کہتے ہیں جس میں نہ حقیقۃً کوئی فائدہ ہو اور نہ حکماً۔ اس جگہ معنی یہ ہوں گے کہ وہ بے فائدہ بلند بلند محلات بناتے تھے جن کی ان کو کوئی ضرورت نہیں تھی صرف فخریہ بناتے تھے۔ (مَصَانِعَ) مصنع کی جمع ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ مَصَانِعَ سے پانی کے حوض مراد ہیں لیکن حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ اس سے مضبوط محل مراد ہیں۔ (لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں بیان فرمایا کہ اس آیت میں لَعَلَّ تشبیہ کے لئے ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ یہ فرمایا كَاَنَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ، یعنی گویا تم ہمیشہ رہو گے۔ (کما فی الروح)[۲]

بلا ضرورت عمارت بنانا مذموم ہے

اس آیت سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کے مکان بنانا اور تعمیرات کرنا شرعاً بُرا ہے۔ اور یہی معنی اس حدیث کے

۱ تفسیر الطبری ج:۱۹ ص:۳۷۴

۲ تفسیر روح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۴ ص:۲۹۸، ۲۹۹، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء، (بالاختصار) ج:۲ ص:۷۰۲

جو امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ اَلنَّفَقَةُ كُلُّهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اِلَّا الْبِنَاءُ فَلَا خَيْرَ فِيْهِ،[1] یعنی وہ عمارت جو ضرورت سے زائد بنائی گئی ہو اس میں کوئی بہتری اور بھلائی نہیں۔ اور اس معنی کی تصدیق حضرت انسؓ کی دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ اِنَّ كُلَّ بِنَاءٍ وَبَالٌ عَلٰى صَاحِبِهٖ اِلَّا مَا لَا، اِلَّا مَا لَا يعنى اِلَّا مَا لَا بُدَّ مِنْهُ (ابوداؤد)۔[2] یعنی ہر تعمیر صاحبِ تعمیر کے لئے مصیبت ہے مگر وہ عمارت جو ضروری ہو وہ وبال نہیں ہے۔ روح المعانی میں فرمایا کہ بغیر غرض صحیح کے بلند عمارت بنانا شریعت محمدیہ میں بھی مذموم اور برا ہے۔[3]

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٤١﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٤٢﴾

جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح نے کیا تم ڈرتے نہیں

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٤٤﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ

میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر

مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ

کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے پالنے والے پر کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں

اٰمِنِيْنَ ﴿١٤٦﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٤٧﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿١٤٨﴾

بے کھٹکے باغوں میں اور چشموں میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا گابھا ملائم ہے

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿١٤٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٥٠﴾

اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف کے سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

---

[1] جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ج:٢ ص:٧٥

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب ما جاء فی البناء ج:٢ ص:٣٦٢

[3] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:١٤ ص:٢٩٨

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ

اور نہ مانو حکم بے باک لوگوں کا جو خرابی کرتے ہیں ملک میں

وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ

اور اصلاح نہیں کرتے بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے تو بھی ایک آدمی ہے

مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ

جیسے ہم سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لئے پانی پینے کی ایک باری

وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ

اور تمہارے لئے باری ایک دن کی مقرر اور مت چھیڑیو اُس کو بُری طرح سے پھر پکڑے تم کو آفت

يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ

ایک بڑے دن کی پھر کاٹ ڈالا اُس اونٹنی کو پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے پھر آ پکڑا اُن کو عذاب نے

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ

البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا ربّ وہی ہے

الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾ ع ۸ ۱۹ ۱۲

زبردست رحم کرنے والا

آسان ترجمۂ قرآن

قومِ ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا، (۱۴۱) جبکہ اُن کے بھائی صالح نے اُن سے کہا کہ: ’’کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں

ہو؟ (۱۴۲) یقین جانو کہ میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں، (۱۴۳) لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ (۱۴۴) اور میں تم سے اس کام پر کسی قسم کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اَجر تو صرف اُس ذات نے اپنے ذمے لے رکھا ہے جو سارے دُنیا جہان کی پروَرِش کرتی ہے۔ (۱۴۵) کیا تمہیں اطمینان کے ساتھ ان ساری نعمتوں میں ہمیشہ رہنے دیا جائے گا جو یہاں موجود ہیں؟ (۱۴۶) ان باغوں اور چشموں میں؟ (۱۴۷) اور ان کھیتیوں اور ان نخلستانوں میں جن کے خوشے ایک دوسرے میں پیوست ہیں؟ (۱۴۸) اور کیا پہاڑوں کو بڑے ناز کے ساتھ تراش کر تم (ہمیشہ) گھر بناتے رہوگے؟ (۱۴۹) اب اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ (۱۵۰) اور اُن حد سے گذرے ہوئے لوگوں کا کہنا مت مانو (۱۵۱) جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اور اِصلاح کا کام نہیں کرتے۔" (۱۵۲) وہ کہنے لگے کہ: "تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے، (۱۵۳) تمہاری حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ تم ہم جیسے ہی ایک انسان ہو۔ لہٰذا اگر سچے ہو تو کوئی نشانی لے کر آؤ۔" (۱۵۴) صالح نے کہا: "(لو) یہ اُونٹنی ہے۔ پانی پینے کے لئے ایک باری اس کی ہوگی، اور ایک معین دن میں ایک باری تمہاری۔ (۱۵۵) اور اس کو بری نیت سے ہاتھ بھی نہ لگانا، ورنہ ایک زبردست دن کا عذاب تمہیں آ پکڑے گا۔" (۱۵۶) پھر ہوا یہ کہ انہوں نے اس اُونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، اور آخرکار پشیمان ہوئے۔ (۱۵۷) چنانچہ عذاب نے اُنہیں آ پکڑا۔ یقیناً اس سارے واقعے میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، (۱۵۸) اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔ (۱۵۹)

خلاصۂ تفسیر

قومِ ثمود نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے، میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کچھ صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رَبّ العالمین کے ذمّہ ہے (اور تم جو خوشحالی کی وجہ سے اس درجہ اللہ سے غافل ہو تو) کیا تم کو ان ہی چیزوں میں بے فکری سے رہنے دیا جائے گا جو یہاں (دُنیا میں) موجود ہیں، یعنی باغوں میں اور چشموں میں اور ان کھجوروں میں جن کے گُچھّے خوب گوندھے ہوئے ہیں (یعنی ان کھجوروں میں خوب کثرت سے پھل آتا ہے) اور کیا (اسی غفلت کی وجہ سے) تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے (اور فخر کرتے) ہوئے مکانات بناتے ہو سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور اُن حدود (بندگی) سے نکل جانے والوں کا کہنا مت مانو جو سرزمین میں فساد کیا کرتے ہیں اور (کبھی) اصلاح (کی بات) نہیں کرتے (مراد رؤساء کفار ہیں جو گمراہی پر لوگوں کو آمادہ کرتے تھے اور فساد اور عدمِ اصلاح سے یہی مراد ہے) ان لوگوں نے کہا کہ تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل میں خرابی آ گئی ہے کہ نبوّت کا دعویٰ کرتے ہو حالانکہ) تم بس ہماری طرح کے ایک (معمولی) آدمی ہو۔ (اور آدمی نبی ہوتا نہیں) سو کوئی معجزہ پیش کرو اگر تم (دعوئ نبوّت میں) سچّے ہو،

صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ ایک اونٹنی ہے (جو بوجہ خلافِ عادت پیدا ہونے کے معجزہ ہے جیسا کہ پارۂ ہشتم کے ختم کے قریب گزرا اور علاوہ اس کے کہ یہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں چنانچہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ) پانی پینے کے لئے ایک باری اس کی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمہاری (یعنی تمہارے مواشی کی) اور (ایک یہ ہے کہ) اس کو بُرائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو ایک بھاری دن کا عذاب آ پکڑے سو انہوں نے (نہ رسالت کی تصدیق کی نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اونٹنی کو مار ڈالا، پھر (جب عذاب کے نشان ظاہر ہوئے تو اپنی حرکت پر) پشیمان ہوئے (مگر اوّل تو عذاب دیکھ لینے کے وقت پشیمانی بیکار، دوسرے خالی طبعی پشیمانی سے کیا ہوتا ہے جب تک اختیاری تدارک یعنی توبہ وایمان نہ ہو) پھر (آخر) عذاب نے ان کو آلیا، بیشک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رَبّ بڑا زبردست بہت مہربان ہے (کہ باوجود قدرت کے مہلت دیتا ہے)۔

معارف ومسائل

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ حضرت ابن عباسؓ سے فَارِهِيْنَ کی تفسیر بَطِرِيْنَ منقول ہے یعنی اترانے اور تکبّر کرنے والے، لیکن ابوصالح نے فرمایا، اور یہی امام راغب نے تفسیر کی ہے کہ فٰرِهِيْنَ کے معنی حَاذِقِيْنَ [۱] یعنی ماہرین کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ نعمت فرمائی کہ تم کو ایسی صنعت کاری سکھلا دی کہ پہاڑوں کو مکانات بنانا تمہارے لئے آسان کر دیا۔ حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرو اور زمین پر فساد نہ کرو۔

مفید پیشے خدائی انعامات ہیں بشرطیکہ اُن کو بُرے کاموں میں استعمال نہ کریں

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عمدہ پیشے خدا تعالیٰ کے انعامات ہیں اور ان سے نفع اُٹھانا جائز ہے لیکن اگر اُن سے کوئی گناہ یا حرام فعل یا بلاضرورت اُن میں انہماک لازم آتا ہو تو پھر وہ پیشہ اختیار کرنا ناجائز ہے جیسے کہ ابھی اس سے پہلی آیتوں میں بلاضرورت عمارت کی بلندی کی مذمت گزری ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ

جھٹلایا لُوط کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی لُوط نے

[۱] مفردات القرآن للراغب الاصفہانیؒ ج:۱ ص:۳۷۹

أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۶۱﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۶۳﴾

کیا تم ڈرتے نہیں میں تمہارے لئے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۴﴾

اور مانگتا نہیں میں تم سے اس کا کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اُسی پروردگار عالم پر

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُم

کیا تم دوڑتے ہو جہان کے مردوں پر اور چھوڑتے ہو جو تمہارے واسطے بنادی ہیں تمہارے رَبّ نے

مِّنْ أَزْوَاجِكُم ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا لُوطُ

تمہاری جورؤیں بلکہ تم لوگ ہو حد سے بڑھنے والے بولے اگر نہ چھوڑے گا تو اے لوط

لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِي

تو تُو نکال دیا جائے گا کہا میں تمہارے کام سے البتہ بیزار ہوں اے رَبّ خلاص کر مجھ کو

وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿۱۷۰﴾ إِلَّا عَجُوزًا

اور میرے گھر والوں کو ان کاموں سے جو یہ کرتے ہیں پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی

فِي الْغَابِرِينَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿۱۷۲﴾ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَسَاءَ

رہنے والوں میں پھر اُٹھا مارا ہم نے اُن دوسروں کو اور برسایا اُن پر ایک برساؤ سو کیا بُرا

مَطَرُ الْمُنذَرِينَ ﴿۱۷۳﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم

برساؤ تھا اُن ڈرائے ہوؤں کا البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾ ع

ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

آسان ترجمۂ قرآن

لوط کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا، ﴿۱۶۰﴾ جبکہ اُن کے بھائی لوط نے اُن سے کہا کہ: "کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۶۱﴾ یقین جانو کہ میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں، ﴿۱۶۲﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ ﴿۱۶۳﴾ اور میں تم سے اس کام پر کسی قسم کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اَجر تو صرف اُس ذات نے اپنے ذمے لے رکھا ہے جو سارے دُنیا جہان کی پرورش کرتی ہے۔ ﴿۱۶۴﴾ کیا دُنیا جہان کے سارے لوگوں میں تم ہو جو مردوں کے پاس جاتے ہو، ﴿۱۶۵﴾ اور تمہاری بیویاں جو تمہارے رَبّ نے تمہارے لئے پیدا کی ہیں، اُن کو چھوڑے بیٹھے ہو؟ حقیقت تو یہ ہے کہ تم حد سے بالکل گذرے ہوئے لوگ ہو۔" ﴿۱۶۶﴾ کہنے لگے: "لوط! اگر تم باز نہ آئے تو تم بھی اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے جنہیں (بستی سے) نکال باہر کیا جاتا ہے۔" ﴿۱۶۷﴾ لوط نے کہا: "یقین جانو، میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو تمہارے اس کام سے بالکل بیزار ہیں۔ ﴿۱۶۸﴾ میرے پروردگار! جو حرکتیں یہ لوگ کر رہے ہیں، مجھے اور میرے گھر والوں کو اُن سے نجات دیدے۔" ﴿۱۶۹﴾ چنانچہ ہم نے اُن کو اور اُن کے سب گھر والوں کو نجات دی، ﴿۱۷۰﴾ سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل رہی۔ ﴿۱۷۱﴾ پھر اور سب کو ہم نے تباہ کر دیا۔ ﴿۱۷۲﴾ اور اُن پر ایک زبردست بارش برسا دی۔ غرض بہت بُری بارش تھی جو اُن پر برسی جنہیں پہلے سے ڈرا دیا گیا تھا۔ ﴿۱۷۳﴾ یقیناً اُس سارے واقعے میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، ﴿۱۷۴﴾ اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔ ﴿۱۷۵﴾

خلاصۂ تفسیر

قومِ لُوط نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے ان کے بھائی لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رَبّ العالمین کے ذمہ ہے، کیا تمام دُنیا جہان والوں میں سے تم (یہ حرکت کرتے ہو کہ) مَردوں سے بدفعلی کرتے ہو اور تمہارے رَبّ نے جو تمہارے لئے بیبیاں پیدا کی ہیں ان کو نظر انداز کئے رہتے ہو (یعنی اور کوئی آدمی تمہارے سوا یہ حرکت نہیں کرتا اور یہ نہیں ہے کہ اس کے قبیح ہونے میں کچھ شبہ ہے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم

حدِ (انسانیت) سے گزر جانے والے لوگ ہو، وہ لوگ کہنے لگے اے لُوط، اگر تم (ہمارے کہنے سننے سے) باز نہیں آؤ گے تو ضرور (بستی سے) نکال دیئے جاؤ گے، لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں اس دھمکی پر اپنے کہنے سے نہ رکوں گا کیونکہ) میں تمہارے اس کام سے سخت نفرت رکھتا ہوں (تو کہنا کیسے چھوڑ دوں گا، جب کسی طرح اُن لوگوں نے نہ مانا اور عذاب آتا ہوا معلوم ہوا تو) لُوط (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے رَبّ مجھ کو اور میرے (خاص) متعلقین کو ان کے اس کام (کے وبال) سے (جو اُن پر آنے والا ہے) نجات دے، سو ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی سوائے ایک بڑھیا کے (مراد اس سے زوجہ ہے لُوط علیہ السلام کی) کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لُوطؑ اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا (یعنی پتھروں کا) مینہ برسایا، سو کیا بُرا مینہ تھا جو ان لوگوں پر برسا جن کو (عذابِ الٰہی سے) ڈرایا گیا تھا بے شک اس (واقعہ) میں (بھی) عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، اور بے شک آپ کا رَبّ بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا تھا مگر ابھی نہیں دیا)۔

معارف و مسائل

غیر فطری فعل اپنی بیوی سے بھی حرام ہے

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ لفظ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ میں حرف مِنْ اصطلاحی الفاظ میں بیانیہ بھی ہوسکتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ تمہاری خواہش نفسانی کے لئے جو اللہ نے بیویاں پیدا فرمائی ہیں تم اُن کو چھوڑ کر اپنے ہم جنس مردوں کو اپنی شہوتِ نفس کا نشانہ بناتے ہو جو خباثتِ نفس کی دلیل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حرفِ مِنْ کو تبعیض کے لئے قرار دیں تو اشارہ اس طرف ہوگا کہ تمہاری بیبیوں کا جو مقام تمہارے لئے بنایا گیا ہے اور جو امر فطری ہے اس کو چھوڑ کر بیویوں سے خلافِ فطرت عمل کرتے ہو جو کہ قطعاً حرام ہے۔ غرض اس دوسرے معنے کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ اپنی زوجہ سے خلافِ فطرت عمل حرام ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے[1] **نعوذ باللہ منہ**۔ (کذا فی الروح)

اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ عجوز سے مراد حضرت لُوط علیہ السلام کی بیوی ہے جو کہ قوم لُوط کے اس فعل سے راضی تھی اور کافرہ تھی۔ لُوط علیہ السلام کی یہ کافر بیوی اگر واقع میں بڑھیا تھی تو اس کے لئے لفظ عجوز استعمال کرنا ظاہر ہی ہے اور

[1] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۴ ص:۳۲۵، اور حدیث کے لئے دیکھئے: المعجم الأوسط للطبرانیؒ، رقم الحدیث:۲۰۰۴، ومجمع الزوائد، رقم الحدیث:۷۵۹۵

اگر یہ عمر کے لحاظ سے بڑھیا نہ تھی تو اس کو عجوز کے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا گیا کہ پیغمبر کی بیوی اُمت کے لئے ماں کی جگہ ہوتی ہے جو عورت کثیر الاولاد ہو اُس کو بڑھیا کہہ دینا کچھ مستبعد نہیں۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اس آیت سے ثابت ہوا کہ لوطی پر دیوار گرانے یا بلند مقام سے نیچے پھینکنے کی تعزیر جائز ہے جیسے حنفیہ کا مسلک ہے کیونکہ قوم لُوط اسی طرح ہلاک کی گئی تھی کہ ان کی بستیوں کو اُوپر اُٹھا کر اُلٹا زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ (شامی کتاب الحدود) [1]

كَذَّبَ أَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ ج إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ ج

جھٹلایا بَن کے رہنے والوں نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو شعیب نے کیا تم ڈرتے نہیں

إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ لا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ ج وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ

میں تم کو پیغام پہنچانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر

مِنْ أَجْرٍ ج إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ ط أَوْفُوا الْكَيْلَ

کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر پورا بھر کر دو ماپ

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ ج وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ ج

اور مت ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ ج

اور مت گھٹادو لوگوں کو اُن کی چیزیں اور مت دوڑو ملک میں خرابی ڈالتے ہوئے

وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ ط قَالُوْٓا إِنَّمَآ أَنْتَ

اور ڈرو اُس سے جس نے بنایا تم کو اور اگلی خلقت کو بولے تجھ پر

---

[1] شامی مع الدر، کتاب الحدود، باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه، مطلب فی حکم اللواطة ج:۶ ص:۴۳، ۴۴

مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾

تو کسی نے جادو کر دیا ہے اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم اور ہمارے خیال میں تو تُو جھوٹا ہے

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْٓ

سو گرا دے ہم پر کوئی ٹکڑا آسمان کا اگر تو سچّا ہے کہا میرا رب

اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ

خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو پھر اس کو جھٹلایا پھر پکڑ لیا اُن کو آفت نے سائبان والے دن کی بیشک وہ تھا

عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

عذاب بڑے دن کا البتہ اس بات میں نشانی ہے اور اُن میں بہت سے لوگ

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ ع

نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

آسان ترجمۂ قرآن

اَیکہ کے باشندوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا، ﴿۱۷۶﴾ جبکہ شعیب نے اُن سے کہا کہ: ''کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۷۷﴾ یقین جانو کہ میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں، ﴿۱۷۸﴾ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ ﴿۱۷۹﴾ اور میں تم سے اس کام پر کسی قسم کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اَجر تو صرف اُس ذات نے اپنے ذمے لے رکھا ہے جو سارے دُنیا جہان کی پرورش کرتی ہے۔ ﴿۱۸۰﴾ پورا پورا ناپ دیا کرو، اور اُن لوگوں میں سے نہ بنو جو دوسروں کو گھاٹے میں ڈالتے ہیں۔ ﴿۱۸۱﴾ اور سیدھی ترازو سے تولا کرو، ﴿۱۸۲﴾ اور لوگوں کو اُن کی چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو، اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو۔ ﴿۱۸۳﴾ اور اُس ذات سے ڈرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے، اور پچھلی خلقت کو بھی۔'' ﴿۱۸۴﴾ کہنے لگے: ''تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے، ﴿۱۸۵﴾ تمہاری حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ تم ہم جیسے ہی ایک انسان ہو، اور ہم تمہیں

پورے یقین کے ساتھ جھوٹا سمجھتے ہیں۔ (۱۸۶) لہٰذا اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو۔'' (۱۸۷) شعیب نے کہا: ''میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔'' (۱۸۸) غرض ان لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں سائبان والے دن کے عذاب نے آپکڑا۔ بیشک وہ ایک زبردست دن کا عذاب تھا۔ (۱۸۹) یقیناً اس سارے واقعے میں عبرت کا بڑا سامان ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، (۱۹۰) اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحبِ اقتدار بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔ (۱۹۱)

خلاصۂ تفسیر

اَصحابُ الأیکہ نے (بھی جن کا ذکر سورۂ حجر کے اخیر میں گزر چکا ہے) پیغمبروں کو جھٹلایا، جبکہ اُن سے شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رَبّ العالمین کے ذمّہ ہے تم لوگ پورا ناپا کرو اور (صاحبِ حق کا) نقصان مت کیا کرو اور (اسی طرح تولنے کی چیزوں میں) سیدھی ترازو سے تولا کرو (یعنی ڈنڈی نہ مارا کرو نہ باٹوں میں فرق کیا کرو) اور لوگوں کا اُن کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور سرزمین میں فساد مت مچایا کرو اور اس (خدائے قادر) سے ڈرو جس نے تم کو اور تمام اگلی مخلوقات کو پیدا کیا وہ لوگ کہنے لگے کہ بس تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل مختل ہو گئی اور نبوّت کا دعویٰ کرنے لگے) اور تم تو محض ہماری طرح (کے) ایک (معمولی) آدمی ہو اور ہم تو تم کو جھوٹے لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں، سو اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو (تاکہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ واقعی تم نبی تھے تمہاری تکذیب سے ہم کو یہ سزا ہوئی) شعیب (علیہ السلام) بولے کہ (میں عذاب کا لانے والا یا اس کی کیفیت کی تعیین کرنے والا کون ہوں) تمہارے اعمال کو میرا رَبّ (ہی) خوب جانتا ہے (اور اس عمل کا جو مقتضاء ہے کہ کیا عذاب ہو اور کب ہو اس کو بھی وہی جانتا ہے اس کو اختیار ہے) سو وہ لوگ (برابر) اُن کو جھٹلاتے گئے پھر ان کو سائبان کے واقعہ عذاب نے آپکڑا بیشک وہ بڑے سخت دن کا عذاب تھا (اور) اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رَبّ بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب نازل کر سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (۱۸۲) قسطاس کو بعض حضرات نے رُومی لفظ قرار دیا جس کے معنے عدل و انصاف کے

ہیں، بعض نے عربی لفظ قسط سے ماخوذ قرار دیا ہے، قسط کے معنے بھی انصاف کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ترازو اور اسی طرح دوسرے ناپنے تولنے کے وسائل کو مستقیم اور سیدھے طور پر استعمال کرو جس میں کمی کا خطرہ نہ رہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ، یعنی نہ کمی کرو لوگوں کی اپنی چیزوں میں۔ مراد یہ ہے کہ معاہدہ کے مطابق جتنا کسی کا حق ہے اُس سے کمی کرنا حرام ہے خواہ وہ ناپنے تولنے کی چیز ہو یا کوئی دوسری۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ملازم مزدور اگر اپنے مقررہ وقت میں چوری کرتا ہے وقت کم لگاتا ہے وہ بھی اس وعید میں داخل ہے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز عصر میں شریک نہیں ہوا، وجہ پوچھی تو اس نے کچھ عذر کیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا طَفَّفْتَ یعنی تو نے تولنے میں کمی کر دی، چونکہ نماز کوئی تولنے کی چیز نہیں اس لئے یہ حدیث نقل فرما کر امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وَفَاءٌ وَتَطْفِيْفٌ [1] یعنی حق کے مطابق کرنا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے یعنی صرف ناپ تول ہی کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں بلکہ کسی کے حق میں کمی کرنا خواہ کسی صورت سے ہو وہ تطفیف میں داخل ہے جس کا حرام ہونا [2] وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾ (المطففین) میں بیان فرمایا گیا ہے۔

خدا کا مجرم اپنے پاؤں چل کر آتا ہے اُسے وارنٹ کی ضرورت نہیں

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ، جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اُن کی قوم پر سخت گرمی مسلّط فرمائی کہ نہ مکان کے اندر چین آتا نہ باہر، پھر اُن کے قریبی جنگل میں ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی، ساری قوم گرمی سے پریشان تھی سب دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے جب ساری قوم بادل کے نیچے آ گئی تو اس بادل نے ان پر پانی کے بجائے آگ برسا دی جس سے سب بھسم ہو کر رہ گئے۔ (کذا روی عن ابن عباس۔ روح) [3]

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ

اور یہ قرآن ہے اُتارا ہوا پروردگار عالم کا لے کر اُترا ہے اُس کو فرشتہ معتبر تیرے دل پر

---

[1] موطا مالکؒ، رقم الحدیث: ۲۹، کتاب وقوت الصلاۃ، باب جامع الوقوت۔

[2] ترجمہ: بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔

[3] تفسیر روح المعانی ج:۱۴ ص:۳۴۲، والمستدرك للحاکم، رقم الحدیث: ۴۰۷۴

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿١٩٥﴾ وَ اِنَّهٗ لَفِيْ

کہ تو ہو ڈر سُنا دینے والا کھلی عربی زبان میں اور یہ لکھا ہے

زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٩٦﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا

پہلوں کی کتابوں میں کیا ان کے واسطے نشانی نہیں یہ بات کہ اس کی خبر رکھتے ہیں پڑھے لوگ

بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٩٧﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿١٩٨﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ

بنی اسرائیل کے اور اگر اُتارتے ہم یہ کتاب کسی اوپری زبان والے پر اور وہ اس کو پڑھ کر سُناتا

مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿١٩٩﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٢٠٠﴾

تو بھی اس پر یقین نہ لاتے اسی طرح گھسا دیا ہم نے اُس انکار کو گنہگاروں کے دل میں

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٢٠١﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

وہ نہ مانیں گے اس کو جب تک نہ دیکھ لیں گے عذاب دردناک پھر آئے اُن پر اچانک اور اُن کو

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾ اَفَبِعَذَابِنَا

خبر بھی نہ ہو پھر کہنے لگیں کچھ بھی ہم کو فرصت ملے گی کیا ہمارے عذاب کو

يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٢٠٤﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ

جلد مانگتے ہیں بھلا دیکھ تو اگر فائدہ پہنچاتے رہیں ہم اُن کو برسوں پھر پہنچے اُن پر

مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿٢٠٧﴾

جس چیز کا اُن سے وعدہ تھا تو کیا کام آئے گا اُن کے جو کچھ فائدہ اُٹھاتے رہے

مع

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿٢٠٨﴾ قلے ذِكْرٰى قف وَمَا كُنَّا

اور کوئی بستی نہیں غارت کی ہم نے جس کے لئے نہیں تھے ڈر سُنا دینے والے یاد دلانے کو اور ہمارا کام نہیں

ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٠٩﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢١٠﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ

ظلم کرنا اور اس قرآن کو نہیں لے کر اُترے شیطان اور نہ ان سے بَن آئے

وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٢١١﴾ ط اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿٢١٢﴾ ط فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ

اور نہ وہ کرسکیں اُن کو تو سننے کی جگہ سے دُور کردیا ہے سو تو مت پکار اللہ کے ساتھ

اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿٢١٣﴾ ج وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾ لا

دوسرا معبود پھر تو پڑے عذاب میں اور ڈر سنادے اپنے قریب کے رشتہ داروں کو

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾ ج فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ

اور اپنے بازو نیچے رکھ اُن کے واسطے جو تیرے ساتھ ہیں ایمان والے پھر اگر تیری نافرمانی کریں تو کہدے

اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾ ج وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٢١٧﴾ لا الَّذِيْ يَرٰىكَ

میں بے زار ہوں تمہارے کام سے اور بھروسہ کر اس زبردست رحم والے پر جو دیکھتا ہے تجھ کو

حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٢١٨﴾ لا وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿٢١٩﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٢٠﴾

جب اُٹھتا ہے اور تیرا پھرنا نمازیوں میں بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢٢١﴾ ط تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٢٢﴾ لا

میں بتلاؤں تم کو کس پر اُترتے ہیں شیطان اُترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴿٢٢٣﴾ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ﴿٢٢٤﴾

لا ڈالتے ہیں سُنی ہوئی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ﴿٢٢٥﴾ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴿٢٢٦﴾

تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا

مگر وہ لوگ جو یقین لائے اور کام کئے اچھے اور یاد کی اللہ کی بہت اور بدلہ لیا

مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴿٢٢٧﴾

اُس کے پیچھے کہ اُن پر ظلم ہوا اور اب معلوم کرلیں گے ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ اُلٹتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک یہ قرآن ربّ العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ ﴿١٩٢﴾ امانت دار فرشتہ اسے لے کر اُترا ہے ﴿١٩٣﴾ (اے پیغمبر!) تمہارے قلب پر اُترا ہے تاکہ تم اُن (پیغمبروں) میں شامل ہو جاؤ جو لوگوں کو خبردار کرتے ہیں، ﴿١٩٤﴾ ایسی عربی زبان میں اُترا ہے جو پیغام کو واضح کردینے والی ہے۔ ﴿١٩٥﴾ اور اس (قرآن) کا تذکرہ پچھلی (آسمانی) کتابوں میں بھی موجود ہے۔ ﴿١٩٦﴾ بھلا کیا ان لوگوں کے لئے یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ بنو اِسرائیل کے علماء اس سے واقف ہیں؟ ﴿١٩٧﴾ اور اگر ہم یہ کتاب عجمی لوگوں میں سے کسی پر نازل کردیتے، ﴿١٩٨﴾ اور وہ ان کے سامنے پڑھ بھی دیتا تو یہ لوگ تب بھی اُس پر اِیمان نہ لاتے۔ ﴿١٩٩﴾ مجرموں کے دِلوں میں تو ہم نے اس کو اسی طرح داخل کیا ہے، ﴿٢٠٠﴾ یہ لوگ اِس پر اُس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، ﴿٢٠١﴾ اور وہ ان کے پاس اس طرح اچانک آ کھڑا ہو کہ ان کو پتہ بھی نہ چلے، ﴿٢٠٢﴾ پھر یہ کہہ اُٹھیں کہ کیا ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے؟ ﴿٢٠٣﴾ تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں؟ ﴿٢٠٤﴾ بھلا بتاؤ اگر ہم کئی سال تک انہیں عیش کا سامان مہیا کرتے رہیں، ﴿٢٠٥﴾ پھر وہ (عذاب) ان کے اُوپر آ کھڑا

ہو جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے (۲۰۶) تو عیش کا جو سامان ان کو دیا جاتا رہا وہ انہیں (عذاب کے وقت) کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ (۲۰۷) اور ہم نے کسی بستی کو اس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ (پہلے) اُس کے لئے خبردار کرنے والے موجود تھے، (۲۰۸) تاکہ وہ نصیحت کریں، اور ہم ایسے تو نہیں ہیں کہ ظلم کریں۔ (۲۰۹) اور اس قرآن کو شیاطین لے کر نہیں اُترے، (۲۱۰) نہ یہ قرآن اُن کے مطلب کا ہے، اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں، (۲۱۱) اُنہیں تو (وحی کے) سننے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ (۲۱۲) لہٰذا اللہ کے ساتھ کوئی معبود نہ مانو، کبھی تم بھی اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤ جنہیں عذاب ہوگا۔ (۲۱۳) اور (اے پیغمبر!) تم اپنے قریب ترین خاندان کو خبردار کرو، (۲۱۴) اور جو مؤمن تمہارے پیچھے چلیں، اُن کے لئے انکساری کے ساتھ اپنی شفقت کا بازو جھکا دو، (۲۱۵) اور اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ: "جو کچھ تم کر رہے ہو، اُس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" (۲۱۶) اور اُس (اللہ) پر بھروسہ رکھو جو بڑا اقتدار والا، بہت مہربان ہے، (۲۱۷) جو تمہیں اُس وقت بھی دیکھتا ہے جب تم (عبادت کے لئے) کھڑے ہوتے ہو، (۲۱۸) اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان تمہاری آمد و رفت کو بھی دیکھتا ہے، (۲۱۹) یقین رکھو کہ وہی ہے جو ہر بات سنتا ہر چیز جانتا ہے۔ (۲۲۰) کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کن لوگوں پر اُترتے ہیں؟ (۲۲۱) وہ ہر ایسے شخص پر اُترتے ہیں جو پرلے درجے کا جھوٹا گنہگار ہو، (۲۲۲) وہ سنی سنائی بات لا ڈالتے ہیں، اور اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ (۲۲۳) رہے شاعر لوگ، تو اُن کے پیچھے تو بے راہ لوگ چلتے ہیں (۲۲۴) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ (۲۲۵) اور یہ کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں، (۲۲۶) ہاں مگر وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، اور انہوں نے نیک عمل کئے، اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا، اور اپنے اُوپر ظلم ہونے کے بعد اُس کا بدلہ لیا۔ اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ وہ کس انجام کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ (۲۲۷)

خلاصہ تفسیر

اور یہ قرآن رَبّ العالمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہو جائیں (یعنی جس طرح اور پیغمبروں نے اپنی اُمت کو احکامِ الٰہیہ پہنچائے آپ بھی پہنچائیں) اور اس (قرآن) کا ذکر پہلی اُمتوں کی (آسمانی) کتابوں میں (بھی) ہے (کہ ایک ایسی شان کا پیغمبر ہوگا اور اُس پر ایسا کلام نازل ہوگا چنانچہ تفسیر حقانی کے اس مقام کے حواشی میں چند بشارتیں کتبِ سابقہ تورات و انجیل کی نقل کی ہیں۔ آگے اس مضمون وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ کی توضیح ہے یعنی) کیا ان لوگوں کے لئے (اس پر) یہ بات دلیل نہیں ہے کہ اس (پیشین گوئی) کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں (چنانچہ ان میں جو لوگ اسلام لے آئے ہیں وہ تو علی الاعلان اس کا

اعتراف کرتے ہیں اور جو اسلام نہیں لائے وہ بھی خاص خاص لوگوں کے سامنے اس کا اقرار کرتے ہیں جیسے کہ پارہ اوّل کے رُبع پر آیت [1] اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (البقرة: ۴۴) کی تفسیر میں اس کا بیان آچکا ہے اور ان اقرار کرنے والوں کی تعداد اور کثرت اس وقت اگر خبر واحد تک بھی مان لی جائے تاہم قرائن کی وجہ سے معنوی تواتر حاصل تھا، اور یہ دلیل قائم کرنا اَن پڑھ عربیوں کے لئے ہے ورنہ لکھے پڑھے لوگ خود اصل کتاب سے دیکھ سکتے تھے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کتبِ سابقہ میں تحریف نہیں ہوئی، کیونکہ باوجود تحریف کے ایسے مضامین کا باقی رہ جانا اور زیادہ حجت ہے اور یہ احتمال کہ یہ مضامین ہی تحریف کا نتیجہ ہوں اس لئے غلط ہے کہ اپنے نقصان کے لئے کوئی تحریف نہیں کیا کرتا۔ یہ مضامین تو تحریف کرنے والوں کے لئے نقصان دِہ ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہاں تک تو دعویٰ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ کی دو نقلی دلیلیں بیان فرمائی ہیں یعنی پہلی کتابوں میں ذکر اور بنی اسرائیل کا جاننا کہ ان میں بھی ثانی اوّل کی دلیل ہے اور آگے انکار کرنے والوں کے عناد کے بیان کے ضمن میں اسی دعویٰ کی عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے یعنی اعجازِ قرآن، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے معاند ہیں کہ) اگر (بالفرض) ہم اس (قرآن) کو کسی عجمی (غیر عربی) پر نازل کر دیتے پھر وہ (عجمی) ان کے سامنے اُس کو پڑھ بھی دیتا (اس کا معجزہ ہونا اور زیادہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جس پر نازل ہوا اس کو عربی زبان پر بالکل قدرت نہ ہوتی، لیکن) یہ لوگ (بوجہ انتہائی ضد کے) تب بھی اس کو نہ مانتے (آگے حضور کی تسلّی کے واسطے ان کے ایمان لانے سے نا اُمیدی دلاتے ہیں یعنی) ہم نے اسی طرح (شدت واصرار کے ساتھ) اس ایمان نہ لانے کو ان نافرمانوں کے دِلوں میں ڈال رکھا ہے (یعنی کفر میں، اور اس پر مصر ہیں اور اس شدت واصرار کی وجہ سے) یہ لوگ اس (قرآن) پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ سخت عذاب کو (مرنے کے وقت یا برزخ میں یا آخرت میں) نہ دیکھ لیں گے جو اچانک ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہوگی پھر (اس وقت جان کو بنے گی تو) کہیں گے کہ کیا (کسی طور پر) ہم کو (کچھ) مہلت مل سکتی ہے (لیکن وہ وقت نہ مہلت کا ہے نہ قبول ایمان کا اور وہ کفّار ایسے مضامین وعید وعذاب کے سُن کر براہِ انکار عذاب کا تقاضا کیا کرتے تھے مثلاً کہتے تھے [2] رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا (ص:۱۶) اور [3] اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً (الانفال: ۳۲) یعنی اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا اور مہلت کو، جو در حقیقت ڈھیل ہے، عذاب نہ واقع ہونے کی دلیل ٹھہراتے تھے، آگے اس کا جواب ہے کہ) کیا (ہماری وعیدوں کو سن کر) یہ لوگ ہمارے عذاب کی تعجیل چاہتے ہیں (جس کا منشاء انکار ہے یعنی باوجود قیام دلیل یعنی ایک سچّے بزرگ کی خبر کے پھر بھی انکار

---

[1] ترجمہ: کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے۔

[2] ترجمہ: اے ہمارے رَبّ ہمارا حصہ ہم کو روز حساب سے پہلے دیدے۔

[3] ترجمہ: اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایئے۔

کرتے ہیں؟ رہا مہلت کو بناء انکار قرار دینا سو یہ سخت غلطی ہے کیونکہ) اے مخاطب ذرا بتلاؤ تو اگر ہم ان کو (چند سال تک) عیش میں رہنے دیں پھر جس (عذاب) کا اُن سے وعدہ ہے وہ ان کے سر آپڑے تو ان کا وہ عیش کس کام آسکتا ہے (یعنی یہ عیش کی جو مہلت دی گئی اس سے ان کے عذاب میں کوئی خفت یا کمی نہیں ہوسکتی) اور (مہلت دینا حکمت کی وجہ سے چندروز تک خواہ کم یا زیادہ کچھ ان ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اُممِ سابقہ کو بھی مہلتیں ملی ہیں چنانچہ) جتنی بستیاں (منکرین کی) ہم نے (عذاب سے) غارت کی ہیں سب میں نصیحت کے واسطے ڈرانے والے (پیغمبر) آئے (جب نہ مانے تو عذاب نازل ہوا) اور ہم (صورۃً بھی) ظالم نہیں ہیں (مطلب یہ کہ مہلت دینے سے جو مقصود ہے یعنی حجت پورا کرنا اور عذر کو ختم کرنا وہ سب کے لئے رہا۔ پیغمبروں کا آنا سمجھانا خود یہ بھی ایک مہلت ہی دینا ہے مگر پھر بھی ہلاکت کا عذاب آکر رہا۔ ان واقعات سے مہلت دینے کی حکمت بھی معلوم ہوگئی اور مہلت دینے اور عذاب میں تضاد نہ ہونا بھی ثابت ہوگیا اور صورۃً اس لئے کہا گیا کہ حقیقۃً تو کسی حالت میں بھی ظلم نہ ہوتا۔ آگے پھر مقصود اوّل یعنی مضمون وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ الـخ کی طرف رجوع ہے۔ اور درمیان میں یہ مضامین منکرین کی حالت کے مناسب ہونے کی وجہ سے مذکور ہوئے تھے اور حاصل مضمون آئندہ آیات کا ان شبہات کا دفع کرنا ہے جو قرآن کی حقانیت کے متعلق تھے پس ایک شبہ تو قرآن کے اللہ کے کلام اور اس کی طرف سے بھیجا ہوا ماننے پر اس لئے تھا کہ عرب میں پہلے سے کاہن ہوتے آئے تھے وہ بھی کچھ مختلف قسم کے جملے بولا کرتے تھے۔ نعوذ باللہ آپ کی نسبت بھی بعضے کفار یہی کہتے تھے (کما فی الدر[1] عن ابن زید) اور بخاری میں ایک عورت کا قول نقل کیا ہے جس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے میں کچھ دیر ہوئی تو اس عورت نے کہا کہ آپ کو آپ کے شیطان نے چھوڑ دیا ہے[2] کیونکہ کاہنوں کو شیطان ہی کی تعلیم وتلقین سے کچھ حاصل ہوا کرتا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ رَبّ العالمین کا نازل کیا ہوا ہے) اور اس کو شیاطین (جو کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے) لے کر نہیں آئے (کیونکہ اس کے دو مانع قوی موجود ہیں ایک اس کی صفت شیطنت جس کے سبب) یہ (قرآن) ان (کی حالت) کے مناسب ہی نہیں (کیونکہ قرآن سب کا سب ہدایت اور شیطان سب کا سب گمراہی ہے نہ ان کو ایسے مضامین کی آمد ہوسکتی ہے اور نہ ایسے مضامین شائع کرنے سے ان کی غرض یعنی مخلوق کو گمراہ کرنا پورا ہوسکتا ہے ایک مانع تو یہ ہوا) اور (دوسرا مانع یہ کہ وہ) اس پر قادر بھی نہیں کیونکہ وہ شیاطین (وحی آسمانی) سننے سے روک دیئے گئے ہیں (چنانچہ کاہنوں اور مشرکوں سے ان کے جِنّات نے اپنی ناکامی کا خود اعتراف کیا جس کی اُنہوں نے اَوروں کو بھی خبر دی چنانچہ بخاری میں ایسے قصّے باب اسلامِ عمرؓ[3] میں

---

[1] الدر المنثور ج:۷ ص:۴۰۹

[2] صحیح البخاری، کتاب التهجد، باب ترك القيام للمريض ج:۱ ص:۱۵۱

[3] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب اسلام عمر بن الخطاب رضی الله عنه، ج:۱ ص:۵۴۵

مذکور ہیں۔ پس شیطانوں کی تلقین کا کسی طرح احتمال نہ رہا۔ اور اس جواب کا پورا ہونا اور ایک دوسرے شبہ کا جواب ختم سورت کے قریب آئے گا۔ درمیان میں تنزیل من اللہ ہونے پر بطور تفریع کے ایک مضمون ہے یعنی جب اس کا منزّل من اللہ ہونا ثابت ہے تو اس کی تعلیم واجب العمل ہوئی اور منجملہ اُس کے اہم امر اور اعظم توحید ہے) سو (اے پیغمبر ہم اس کے وجوب کی ایک خاص طریق سے تاکید کرتے ہیں کہ ہم آپ کو مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ) تم خدا کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کبھی تم کو سزا ہونے لگے (حالانکہ آپ میں نعوذ باللہ نہ احتمال شرک کا ہے نہ تعذیب کا مگر لوگوں کو یہ بات جتلانا مقصود ہے کہ جب غیر اللہ کی عبادت پر آپ کے لئے بھی سزا کا حکم ہے تو اور بیچارے تو کس شمار میں ہیں؟ شرک سے ان کو کیسے منع نہ کیا جائے اور شرک کر کے عذاب سے کیونکر بچیں گے) اور (اسی مضمون سے) آپ (سب سے پہلے) اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرائیے (چنانچہ آپ نے سب کو پکار کر جمع کیا اور شرک پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا جیسا حدیثوں میں ہے) اور (آگے انذار یعنی دعوتِ نبوّت کو قبول کرنے والے اور رَد کرنے والوں کے ساتھ معاملہ کا طرز بتلاتے ہیں یعنی) ان لوگوں کے ساتھ (تو مشفقانہ) فروتنی سے پیش آیئے جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں (خواہ کنبہ کے ہوں یا غیر کنبہ کے) اور اگر یہ لوگ (جن کو آپ نے ڈرایا ہے) آپ کا کہنا نہ مانیں (اور کفر پر اڑے رہیں) تو آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے افعال سے بیزار ہوں (ان دونوں امر یعنی اِخْفِضْ و قُلْ الخ میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی پوری تعلیم ہے اور کبھی ان مخالفین کی طرف سے ایذا اور نقصان دینے کا خطرہ نہ لائیے) اور خدائے رحیم پر توکل رکھئے جو آپ کو جس وقت کہ آپ (نماز کے لئے) کھڑے ہوتے ہیں اور (نیز نماز شروع کرنے کے بعد) نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست کو دیکھتا ہے (اور نماز کے علاوہ بھی وہ دیکھتا بھالتا ہے کیونکہ) وہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (پس جب اس کو علم بھی کامل ہے جیسے یراك اور سمیع، علیم اس پر دال ہیں اور وہ آپ پر مہربان بھی ہے، جیسا الرّحیم اس پر دال ہے اور اس کو سب قدرت ہے جیسا العزیز سے مفہوم ہوتا ہے تو ضرور وہ لائقِ توکل ہے وہ آپ کو ضرر حقیقی سے بچائے گا اور جو متوکل کو ضرر پہنچتا ہے وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ضرر ہوتا ہے جس کے تحت میں ہزاروں منافع ہوتے ہیں جن کا کبھی دُنیا میں کبھی آخرت میں ظہور ہوتا ہے آگے کہانت کے شبہ کے جواب کا تتمہ ہے کہ اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) کیا میں تم کو بتلاؤں کس پر شیطان اُترا کرتے ہیں (سنو) ایسے شخصوں پر اُترا کرتے ہیں جو (پہلے سے) دروغ گفتار بڑے بدکردار ہوں اور جو (اخبار شیاطین کے وقت اُن شیطانوں کی طرف) کان لگا دیتے ہیں اور (لوگوں سے اُن چیزوں کے بیان کرنے کے وقت) وہ بکثرت جھوٹ بولتے ہیں (چنانچہ سفلی عاملوں کو اب بھی اسی حالت میں دیکھا جاتا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ فائدہ لینے والے اور فائدہ دینے والے کے درمیان مناسبت ضروری ہے تو شیطان کا شاگرد بھی وہ ہوگا جو جھوٹا اور گنہگار ہوگا، نیز شیطان کی طرف قلب سے متوجہ بھی ہو کہ بغیر توجہ کے استفادہ نہیں ہوتا اور چونکہ اکثر یہ علومِ شیطانی

ناتمام ہوتے ہیں اس لئے ان کو رنگین اور باوقعت کرنے کے لئے کچھ حاشیہ بھی ظن وتخمین سے چڑھانا پڑتا ہے جو کہ کہانت کے لئے عادۃً ضروری ہے اور یہ ساری باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہونے کا کوئی دُور کا بھی احتمال نہیں کیونکہ آپ کا سچا ہونا سب کو معلوم ہے۔ آپ کا پرہیزگار ہونا اور شیاطین سے بغض رکھنے والا ہونا دشمن کو بھی مسلّم تھا اور مشہور و معروف تھا تو پھر کہانت کا احتمال کہاں رہا) اور (آگے شبہ شاعریت کا جواب ہے کہ آپ شاعر بھی نہیں ہیں جیسا کفار کہتے تھے بَلْ هُوَ شَاعِرٌ [1] (الانبیاء:۵) یعنی ان کے مضامین خیالی غیر واقعی ہیں گو منظوم نہ ہوں سو یہ احتمال اس لئے غلط ہے کہ) شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں (مراد راہ سے شعر گوئی ہے یعنی مضامین خیالی شاعرانہ نثر میں یا نظم میں کہنا ان لوگوں کا طریقہ ہے جو مسلک تحقیق سے دُور ہوں آگے اس دعویٰ کی وضاحت ہے کہ) اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر) لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران (ٹکریں مارتے تلاشِ مضامین میں) پھرا کرتے ہیں اور (جب مضمون مِل جاتا ہے تو چونکہ اکثر خلافِ واقعہ ہوتا ہے اس لئے) زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں (چنانچہ شاعروں کی گپوں کا ایک نمونہ لکھا جاتا ہے ؎

اے رشکِ مسیحا تری رفتار کے قرباں	ٹھوکر سے مری لاش کئی بار جلادی
اے بادِ صبا ہم تجھے کیا یاد کریں گے	اُس گل کی خبر تو نے کبھی ہم کو نہ لادی
؎ صبا نے اس کے کوچہ سے اُڑا کر	خدا جانے ہماری خاک کیا کی

وغیرہ وغیرہ، حتیٰ کہ کبھی کفریات بکنے لگتے ہیں۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ مضامین شعریہ کے لئے خیالی اور غیر متحقق ہونا لازمی ہے اور مضامینِ قرآنیہ جس باب سے بھی متعلق ہیں سب کے سب تحقیقی، غیر خیالی ہیں اس لئے آپ کو شاعر کہنا سوائے جنونِ شاعرانہ کے اور کیا ہے، حتیٰ کہ اکثر چونکہ نظم میں ایسے ہی مضامین ہوا کرتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظم پر قدرت بھی نہیں دی اور اوپر چونکہ شعراء کی مذمت ارشاد ہوئی ہے جس کے عموم میں بظاہر سب نظم کہنے والے آگئے، گو اِن کے مضامین عینِ حکمت اور تحقیق ہوں اس لئے آگے ان کا استثناء فرماتے ہیں کہ) ہاں مگر جو لوگ (ان شاعروں میں سے) ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کئے (یعنی شرع کے خلاف نہ ان کا قول ہے نہ فعل، یعنی اُن کے اشعار میں بیہودہ مضامین نہیں ہیں) اور اُنہوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا (یعنی تائید دین اور اشاعتِ علم میں ان کے اشعار ہیں کہ یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں) اور (اگر کسی شعر میں بظاہر کوئی نامناسب مضمون بھی ہے جیسے کسی کی ہجو اور مذمّت جو بظاہر اخلاقِ حسنہ کے خلاف ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ) اُنہوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے (اس کا) بدلہ لیا (ہے یعنی کفار یا فسّاق نے اول ان کو زبانی تکلیف پہنچائی، مثلاً ان کی ہجو کی یا دین کی توہین کی جوا پنی ہجو سے

[1] ترجمہ: بلکہ یہ تو ایک شاعر شخص ہیں۔

بھی بڑھ کر تکلیف کا سبب ہے، یا ان کے مال کو یا جان کو ضرر پہنچایا، یعنی یہ لوگ مستثنیٰ ہیں کیونکہ انتقامی طور پر جو شعر کہے گئے ہیں اُن میں بعض تو مباح ہیں اور بعضے اطاعت و کارِ ثواب ہیں۔) اور (یہاں تک رسالت کے متعلق شبہات کے جوابات پورے ہوئے اور اس سے پہلے رسالت دلائل سے ثابت ہو چکی تھی اب آگے ان لوگوں کی وعید ہے جو اس کے باوجود منکرِ نبوّت رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتے ہیں یعنی) عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا جنہوں نے (حقوق اللہ، حقوق الرسول یا حقوق العباد میں) ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی (بُری اور مصیبت کی) جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے (مراد اس سے جہنم ہے)۔

معارف و مسائل

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

قرآن اُس کے الفاظ و معانی کے مجموعہ کا نام ہے

آیاتِ مذکورہ میں بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وہی ہے جو عربی زبان میں ہو، کسی مضمون قرآن کا ترجمہ خواہ کسی زبان میں وہ قرآن نہیں کہلائے گا، اور وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ کے الفاظ سے بظاہر اس کے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بھی ہوں وہ بھی قرآن ہیں، کیونکہ اِنَّهٗ کی ضمیر ظاہر یہ ہے کہ قرآن کی طرف راجع ہے اور زُبُر، زَبُوْرٌ کی جمع ہے جس کے معنے ہیں کتاب۔ معنے آیت کے یہ ہوئے کہ قرآن کریم سابقہ کتابوں میں بھی ہے اور یہ ظاہر ہے پچھلی کتابیں تورات، انجیل، زَبور وغیرہ عربی زبان میں نہیں تھیں تو صرف معانی قرآن کے اُن میں مذکور ہونے کو اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی ہے۔ اور حقیقت میں جس پر جمہور اُمّت کا عقیدہ ہے وہ یہ ہے کہ صرف مضامینِ قرآن کو بھی بعض اوقات توسعاً قرآن کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ اصل مقصود کسی کتاب کا اس کے مضامین ہی ہوتے ہیں۔ کتبِ اوّلین میں قرآن کا مذکور ہونا بھی اسی حیثیت سے ہے کہ بعض مضامینِ قرآنیہ اُن میں بھی مذکور ہیں، اس کی تائید بہت سی روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

مستدرک حاکم میں حضرت معقل بن یسارؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سورۂ بقرہ ذکرِ اوّل سے دی گئی ہے اور سورۂ طٰهٰ اور طواسین یعنی جتنی سورتیں طٰسٓ سے شروع ہوتی ہیں اور حوامیم یعنی جو سورتیں حٰمٓ سے شروع ہیں یہ سب سورتیں الواحِ موسیٰ میں سے دی گئی ہیں اور سورۂ فاتحہ مجھے تحت عرش سے دی گئی ہے۔[1] اور طبرانی،

[1] المستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث: ۲۰۴۳، كتاب فضائل القرآن، باب ذكر فضائل سور، وآي متفرقة۔

حاکم، بیہقی وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ سورۂ ملک تورات میں موجود ہے۔[۱] الحدیث، اور سورۂ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی میں تو خود قرآن کی تصریح یہ ہے [۲] اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ (الاعلیٰ) یعنی یہ مضامین سورت حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی ہیں، لیکن تمام آیات و روایات کا حاصل یہی ہے کہ بہت سے مضامینِ قرآن کتبِ سابقہ میں بھی موجود تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان مضامین کی وجہ سے کتبِ سابقہ کے اُن حصوں کو جن میں یہ مضامینِ قرآن آئے ہیں قرآن کا نام دیدیا جائے۔ نہ اُمت میں کوئی اس کا قائل ہے کہ اُن صحیفوں اور کتابوں کو جن میں مضامین قرآن مذکور ہیں قرآن کہا جائے۔ بلکہ عقیدہ جمہورِ اُمت کا یہی ہے کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآن کا نام ہے نہ صرف معانی قرآن کا۔ اگر کوئی شخص قرآن ہی کے الفاظ مختلف جگہوں سے چُن کر ایک عبارت بنادے مثلاً کوئی یہ عبارت بنالے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَهُوَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ یہ سارے الفاظ قرآن ہی کے ہیں مگر اس عبارت کو کوئی قرآن نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح صرف معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بیان کئے جائیں وہ بھی قرآن نہیں۔

نماز میں ترجمہ قرآن پڑھنا باجماعِ اُمّت ناجائز ہے

اسی وجہ سے اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز میں فرض تلاوت کی جگہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کسی زبان فارسی، اُردو، انگریزی میں پڑھ لینا بدون اضطرار کے کافی نہیں۔ بعض ائمہ سے جو اس میں توسّع کا قول منقول ہے اُن سے بھی اپنے اس قول سے رجوع ثابت ہے۔

قرآن کے اُردو ترجمہ کو اُردو قرآن کہنا جائز نہیں

اسی طرح قرآن کا صرف ترجمہ کسی زبان میں بغیر عربی متن کے لکھا جائے تو اس کو اس زبان کا قرآن کہنا جائز نہیں۔ جیسے آج کل بہت سے لوگ صرف اُردو ترجمہ قرآن کو اُردو کا قرآن اور انگریزی کو انگریزی کا قرآن کہہ دیتے ہیں یہ ناجائز اور بے ادبی ہے۔ قرآن کو بغیر متن عربی کے کسی دوسری زبان میں بنام قرآن شائع کرنا اور اس کی خرید و فروخت سب ناجائز ہے اس مسئلہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ ''تَحْذِيْرُ الْاِخْوَانِ عَنْ تَغْيِيْرِ رَسْمِ الْقُرْاٰنِ'' میں مذکور ہے۔

اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ اس آیت میں اشارہ ہے کہ دُنیا میں کسی کو عمر دراز ملنا بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت

---

[۱] المستدرك للحاكمؒ، كتاب التفسير، باب تفسير سورة الملك، رقم الحديث: ۳۷۹۸، وشعب الإيمان للبيهقيؒ، رقم الحديث: ۲۴۰۶، والمعجم الكبير للطبرانيؒ، رقم الحديث: ۸۵۷۲

[۲] ترجمہ: یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ہے لیکن جو لوگ اس نعمت کی ناشکری کریں ایمان نہ لائیں اُن کو عمر دراز کی عافیت و مہلت کچھ کام نہ آئے گی۔ امام زہریؒ نے نقل فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ روز صبح کو اپنی داڑھی پکڑ کر اپنے نفس کو خطاب کر کے یہ آیت پڑھا کرتے تھے اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ الآیۃ اس کے بعد ان پر گریہ طاری ہو جاتا اور یہ اشعار پڑھتے تھے:

نَهَارُكَ يَا مَغْرُوْرُ سَهْوٌ وَغَفْلَةٌ وَلَيْلُكَ نَوْمٌ وَالرَّدٰى لَكَ لَازِمٌ

فَلَا اَنْتَ فِي الْاَيْقَاظِ يَقْظَانُ حَازِمٌ وَلَا اَنْتَ فِي النَّوْمِ نَاجٍ وَسَالِمٌ

وَتَسْعٰى اِلٰى مَا سَوْفَ تَكْرَهُ غِبَّهُ كَذٰلِكَ فِي الدُّنْيَا تَعِيْشُ الْبَهَائِمُ [1]

(ترجمہ) اے فریب خوردہ تیرا سارا دن غفلت میں اور رات نیند میں صرف ہوتی ہے حالانکہ موت تیرے لئے لازمی ہے۔ نہ تو بیدار لوگوں میں ہوشیار و بیدار ہے اور نہ سونے والوں میں اپنی نجات پر مطمئن ہے۔ تیری کوشش ایسے کاموں میں رہتی ہے جس کا انجام عنقریب ناگوار صورت میں سامنے آئے گا، دُنیا میں چوپائے جانور ایسے ہی جیا کرتے ہیں۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ عشیرہ کے معنے کنبہ اور خاندان، اقربین کی قید سے ان میں سے بھی قریبی رشتہ دار مراد ہیں۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ رسالت اور انذار پوری اُمت کے لئے فرض ہے اس جگہ خاندان کے لوگوں کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟ غور کیا جائے تو اس میں تبلیغ و دعوت کے آسان اور مؤثر بنانے کا ایک خاص طریقہ بتلایا گیا ہے جس کے آثار دُور رس ہیں۔ وہ یہ کہ اپنے کنبہ اور خاندان کے لوگ اپنے سے قریب ہونے کی بناء پر اس کے حقدار بھی ہیں کہ ہر خیر اور اچھے کام میں اُن کو دوسروں سے مقدم کیا جائے اور باہمی تعلقات اور ذاتی ناواقفیت کی بناء پر ان میں کوئی جھوٹا دعویدار نہیں کھپ سکتا اور جس کی سچائی اور اخلاقی برتری خاندان کے لوگوں میں معروف ہے اس کی سچی دعوت قبول کر لینا ان کے لئے آسان بھی ہے۔ اور قریبی رشتہ دار جب کسی اچھی تحریک کے حامی بن گئے تو ان کی اخوّت و امداد بھی پختہ بنیاد پر قائم ہوتی ہے وہ خاندان جمعیت کے اعتبار سے بھی ان کی تائید و اخوت پر مجبور ہوتے ہیں اور جب قریبی رشتہ داروں، عزیزوں کا ایک ماحول حق و صداقت کی بنیادوں پر تیار ہو گیا تو روزمرہ کی زندگی میں ہر ایک کو دین کے احکام پر عمل کرنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے اور پھر ایک مختصر سی طاقت تیار ہو کر دوسروں تک دعوت و تبلیغ کے پہنچانے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:۶) یعنی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اس میں اہل و عیال کے جہنم سے بچانے کی ذمّہ داری خاندان کے ہر ہر فرد پر ڈال دی گئی ہے جو اصلاحِ اعمال و اخلاق کا آسان اور سیدھا راستہ ہے۔ اور غور کیا جائے تو کسی انسان کا خود اعمال و اخلاقِ صالحہ کا

---

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۳ ص:۱۴۱

پابند ہونا اور پھر اس پر قائم رہنا اس وقت تک عادۃً ممکن نہیں ہوتا جب تک اس کا ماحول اس کے لئے ساز گار نہ ہو، سارے گھر میں اگر ایک آدمی نماز کی پوری پابندی کرنا چاہے تو اس پکے نمازی کو بھی اپنے حق کی ادائیگی میں مشکلات حائل ہوں گی۔ آج کل جو حرام چیزوں سے بچنا دشوار ہو گیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ فی الواقع اس کا چھوڑنا کوئی بڑا مشکل کام ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ سارا ماحول ساری برادری جب ایک گناہ میں مبتلا ہے تو اکیلے ایک آدمی کو بچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے تمام خاندان کے لوگوں کو جمع فرما کر پیغامِ حق سُنایا اس وقت اگرچہ لوگوں نے قبولِ حق سے انکار کیا مگر رفتہ رفتہ خاندان کے لوگوں میں اسلام و ایمان داخل ہونا شروع ہو گیا اور آپ کے چچا حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے سے اسلام کو ایک بڑی قوت حاصل ہوگئی۔

شعر کی تعریف

وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اصل لُغت میں شعر ہر اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں محض خیالی اور غیر تحقیقی مضامین بیان کئے گئے ہوں، جس میں کوئی بحر، وزن، ردیف اور قافیہ کچھ شرط نہیں، فنِ منطق میں بھی ایسے ہی مضامین کو ادلہ شعریہ اور قضایا شعریہ کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی شعر و غزل میں بھی چونکہ عموماً خیالات کا ہی غلبہ ہوتا ہے اس لئے اصطلاحِ شعراء میں کلام موزوں مقفّٰی کو شعر کہنے لگے۔ بعض مفسرین نے آیاتِ قرآن [1] بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (الانبیاء:۵)، [2] لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾ (الصّٰفّٰت)، [3] شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ (الطور:۳۰) وغیرہ میں شعر اصطلاحی کے معنی میں مراد لے کر کہا کہ کفار مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وزن دار، قافیہ دار کلام لانے والے کہتے تھے لیکن بعض نے کہا کہ کفار کا مقصد یہ نہ تھا، اس لئے کہ وہ شعر کے طرز و طریق سے واقف تھے، اور ظاہر ہے کہ قرآن اشعار کا مجموعہ نہیں اس کا قائل تو ایک عجمی بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ فصیح و بلیغ عرب، بلکہ کفار آپ کو شاعر شعر کے اصلی معنےٰ یعنی خیالی مضامین کے لحاظ سے کہتے تھے۔ مقصد ان کا دراصل آپ کو نعوذ باللہ جھوٹا کہنا تھا کیونکہ شعر بمعنی کذب بھی استعمال ہوتا ہے اور شاعر کاذب کو کہا جاتا ہے اس لئے ادلہ کاذبہ کو ادلہ شعریہ کہا جاتا ہے خلاصہ یہ کہ جیسے موزوں اور مقفّٰی کلام کو شعر کہتے ہیں اسی طرح ظنی اور تخمینی کلام کو بھی شعر کہتے ہیں جو اہلِ منطق کی اصطلاح ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اس آیت میں شعر کے اصطلاحی اور معروف معنے ہی مراد ہیں۔ یعنی موزوں و مقفّٰی کلام کہنے والے، اس کی تائید فتح الباری کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ،

---

[1] ترجمہ: بلکہ یہ تو ایک شاعر شخص ہیں۔

[2] اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ کی وجہ سے چھوڑ دیں گے۔''

[3] ترجمہ: یہ شاعر ہیں ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

حسان بن ثابتؓ اور کعب بن مالکؓ جو شعراء صحابہ میں مشہور ہیں روتے ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدائے ذوالجلال نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اور ہم بھی شعر کہتے ہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آیت کے آخری حصہ کو پڑھو۔[۱] مقصد یہ تھا کہ تمہارے اشعار بیہودہ اور غلط مقصد کے لئے نہیں ہوتے اس لئے تم اس استثناء میں داخل ہو جو آخر آیت میں مذکور ہے اس لئے مفسرین نے فرمایا کہ ابتدائی آیت میں مشرکین شعراء مراد ہیں کیونکہ گمراہ لوگ سرکش شیطان اور نافرمان جنّ انہی کے اشعار کی اتباع کرتے تھے اور روایت کرتے تھے۔ (کما فی فتح الباری)[۲]

شریعتِ اسلام میں شعر و شاعری کا درجہ

آیاتِ مذکورہ کے شروع سے شعر و شاعری کی سخت مذمت اور اس کا عند اللہ مبغوض ہونا معلوم ہوتا ہے مگر آخر سورت میں جو استثناء مذکور ہے اس سے ثابت ہوا کہ شعر مطلقاً بُرا نہیں بلکہ جب جس شعر میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی یا اللہ کے ذکر سے روکنا یا جھوٹ، ناحق کسی انسان کی مذمّت اور توہین ہو یا فحش کلام اور فواحش کے لئے محرک ہو وہ مذموم و مکروہ ہے۔ اور جو اشعار ان معاصی اور مکروہات سے پاک ہوں اُن کو اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیۃ کے ذریعہ مستثنیٰ فرما دیا ہے۔ اور بعض اشعار تو حکیمانہ مضامین اور وعظ و نصیحت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے طاعت و ثواب میں داخل ہیں جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً، یعنی بعض شعر حکمت ہوتے ہیں (رواہ البخاری)[۳] حافظ ابنِ حجر نے فرمایا کہ حکمت سے مراد سچی بات ہے جو حق کے مطابق ہو۔[۴] ابنِ بطال نے فرمایا، جس شعر میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت، اس کا ذکر، اسلام سے اُلفت کا بیان ہو وہ شعر مرغوب و محمود ہے اور حدیث مذکور میں ایسا ہی شعر مراد ہے اور جس شعر میں جھوٹ اور فحش بیان ہو وہ مذموم ہے۔[۵] اس کی مزید تائید مندرجہ ذیل روایات سے ہوتی ہے: ۱- عمر بن الشرید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجھ سے اُمیہ بن ابی الصلت کے سَو ۱۰۰ قافیہ تک اشعار سنے۔ ۲- مطرف فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ سے بصرہ تک حضرت عمران بن حصینؓ کے ساتھ سفر کیا اور ہر منزل پر وہ شعر سناتے تھے۔ ۳- طبری نے کبارِ صحابہ اور کبار تابعین کے متعلق کہا کہ وہ شعر کہتے تھے اور سناتے تھے۔ ۴- امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ شعر کہا کرتی تھیں۔ ۵- ابو یعلی نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ شعر ایک کلام ہے اگر

[۱] مصنف ابن ابی شیبۃ، رقم الحدیث: ۲۶۰۵۱

[۲] فتح الباری، کتاب الأدب، باب ما یجوز من الشعر والرجز إلخ ج:۱۷ ص:۳۳۷

[۳] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما یجوز من الشعر إلخ، ج:۲ ص:۹۰۸

[۴] فتح الباری ج:۱۷ ص:۳۳۸

[۵] شرح ابن بطال ج:۱۷ ص:۳۹۶، کتاب الأدب، باب ما یجوز من الشعر والرجز إلخ۔

اس کا مضمون اچھا اور مفید ہے تو شعر اچھا ہے اور مضمون بُرا یا گناہ کا ہے تو شعر بُرا ہے۔ (فتح الباری)[1]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ مدینہ منورہ کے فقہاء عشرہ جو اپنے علم و فضل میں معروف ہیں اُن میں سے عبید اللہ بن عتبہ بن مسعودؓ مشہور قادر کلام شاعر تھے اور قاضی زبیر بن بکار کے اشعار ایک مستقل کتاب میں جمع تھے۔ پھر قرطبی نے لکھا کہ ابو عمرو نے فرمایا ہے کہ اچھے مضامین پر مشتمل اشعار کو اہلِ علم اور اہلِ عقل میں سے کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اکابر صحابہ جو دین کے مقتدا ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے خود شعر نہ کہے ہوں یا دوسروں کے اشعار نہ پڑھے یا سنے ہوں اور پسند کیا ہو۔[2]

جن روایات میں شعر شاعری کی مذمت مذکور ہے ان سے مقصود یہ ہے کہ شعر میں اتنا مصروف اور منہمک ہو جائے کہ ذکر اللہ عبادت اور قرآن سے غافل ہو جائے۔ امام بخاری نے اس کو ایک مستقل باب میں بیان فرمایا ہے اور اس باب میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے: لَاَنْ يَّمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا يَرِيْهِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يَّمْتَلِئَ شِعْرًا،[3] یعنی کوئی آدمی پیپ سے اپنا پیٹ بھرے یہ اس سے بہتر ہے کہ اشعار سے پیٹ بھرے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ شعر جب ذکر اللہ اور قرآن اور علم کے اشتغال پر غالب آ جائے، اور اگر شعر مغلوب ہے تو پھر بُرا نہیں ہے۔ اسی طرح وہ اشعار جو فحش مضامین یا لوگوں پر طعن و تشنیع یا دوسرے خلاف شرع مضامین پر مشتمل ہوں وہ باجماعِ اُمت حرام و ناجائز ہیں، اور یہ کچھ شعر کے ساتھ مخصوص نہیں جو نثر کلام ایسا ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (قرطبی)[4]

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے گورنر عدی بن نضلہ کو اُن کے عہدہ سے اس لئے برخاست کر دیا کہ وہ فحش اشعار کہتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عمرو بن ربیعہ اور ابو الاحوص کو اسی جرم میں جلا وطن کرنے کا حکم دیا۔ عمرو بن ربیعہ نے توبہ کر لی وہ قبول کی گئی۔ (قرطبی)[5]

خدا و آخرت سے غافل کر دینے والا ہر علم اور فن مذموم ہے

ابن ابی جمرہ نے فرمایا کہ بہت قافیہ بازی اور ہر ایسا علم و فن جو دلوں کو سخت کر دے اور خدا تعالیٰ کے ذکر سے انحراف و اعراض کا سبب بنے اور اعتقادات میں شکوک و شبہات اور روحانی بیماریاں پیدا کرے اس کا بھی وہی حکم ہے جو مذموم اشعار کا حکم ہے۔

١ فتح الباری ج:١٧ ص:٣٣٨

٢ تفسير القرطبى تحت هٰذه الآية ج:١٣ ص:١٤٧،١٤٨

٣ صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب ما يكره ان يكون الغالب على الإنسان الشعر إلخ ج:٢ ص:٩٠٩

٤ تفسير القرطبى ج:١٣ ص:١٥١

٥ تفسير القرطبى ج:١٣ ص:١٤٩

اکثر اتباع کرنے والوں کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت ہوتی ہے

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اس آیت میں شعراء پر یہ عیب لگایا گیا کہ اُن کے متبعین گمراہ ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گمراہ تو ہوئے متبعین اُن کے فعل کا الزام متبوعین یعنی شعراء پر کیسے عائد ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ عموماً اتباع کرنے والوں کی گمراہی علامت اور نشانی ہوتی ہے متبوع کی گمراہی کی لیکن سیّدی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حکم اس وقت ہے جب تابع کی گمراہی میں اس متبوع کے اتباع کا دخل ہو مثلاً متبوع کو جھوٹ اور غیبت سے بچنے بچانے کا اہتمام نہیں ہے اس کی مجلس میں اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں وہ روک ٹوک نہیں کرتا، اس سے تابع کو بھی جھوٹ اور غیبت کی عادت پڑگئی تو یہ تابع کا گناہ خود متبوع کے گناہ کی علامت قرار دیا جائے گا لیکن اگر گمراہی متبوع کی ایک وجہ سے اور اتباع کسی دوسری وجہ سے ہو تو یہ تابع کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک شخص عقائد و مسائل میں کسی عالم کا اتباع کرتا ہے اور اُن میں کوئی گمراہی نہیں، اعمال و اخلاق میں اس عالم کا اتباع نہیں کرتا اُنہیں میں یہ گمراہ ہے تو اس کی عملی اور اخلاقی گمراہی اس عالم کی گمراہی پر دلیل نہیں ہوگی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تَمَّتْ سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ بِعَوْنِ اللهِ وَفَضْلِهٖ لِنِصْفِ الرَّبِيْعِ الثَّانِیْ ۱۳۹۱ھ
يَوْمَ الْخَمِيْسِ وَيَتْلُوْهَا اِنْ شَآءَ اللهُ تَعَالٰى سُوْرَةُ النَّمْلِ

سورۃ النمل

آیاتها ۹۳ | ۲۷ سورۃ النمل مکیۃ ۴۸ | رکوعاتها ۷

سورۂ نمل مکہ میں اُتری اور اس کی ترانوے آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝۱ لا هُدًى وَّبُشْرٰى

طٰسٓ یہ آیتیں ہیں قرآن اور کھلی کتاب کی ہدایت اور خوشخبری

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲ لا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ

ایمان والوں کے واسطے جو قائم رکھتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور اُن کو

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۳ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ

آخرت پر یقین ہے جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو اچھے دکھلائے ہم نے ان کی نظروں میں

أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ ۝٤ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوٓءُ الْعَذَابِ

ان کے کام سو وہ بہکے پھرتے ہیں وہی ہیں جن کے واسطے بُری طرح کا عذاب ہے

وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۝٥ وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ

اور آخرت میں وہی ہیں خراب اور تجھ کو تو قرآن پہنچتا ہے

مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝٦

ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

طٰسٓ۔ یہ قرآن کی اور ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو حقیقت کھول دینے والی ہے، ① یہ اُن مؤمنوں کے لئے سراپا ہدایت اور خوشخبری بن کر آئی ہے ② جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور وہی ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ③ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے اُن کے اعمال کو اُن کی نظروں میں خوشنما بنا دیا ہے، اس لئے وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ④ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے برا عذاب ہے، اور وہی ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ⑤ اور (اے پیغمبر!) بلاشبہ تمہیں یہ قرآن اُس (اللہ) کی طرف سے عطا کیا جا رہا ہے جو حکمت کا بھی مالک ہے، علم کا بھی مالک۔ ⑥

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (آیتیں جو آپ پر نازل کی جاتی ہیں) آیتیں ہیں قرآن کی اور ایک واضح کتاب کی (یعنی اس میں دو صفتیں ہیں قرآن ہونا اور کتاب مبین ہونا) یہ (آیتیں) ایمان والوں کے لئے (موجبِ) ہدایت اور (اس ہدایت پر جزائے نیک کا) مژدہ سُنانے والی ہیں جو (مسلمان) ایسے ہیں کہ (عملاً بھی ہدایت پر چلتے ہیں چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں (جو کہ عبادت بدنیہ میں سب سے بڑی ہے) اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ عباداتِ مالیہ میں

سب سے بڑی ہے) اور (عقیدہ کے لحاظ سے بھی ہدایت یافتہ ہیں چنانچہ) وہ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں (یہ تو ایمان والوں کی صفت ہے اور) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ہم نے اُن کے اعمال (بد) ان کی نظر میں مرغوب کر رکھے ہیں سو وہ (اپنے جہلِ مرکب میں حق سے دُور) بھٹکتے پھرتے ہیں (چنانچہ نہ اُن کے عقائد درست ہیں نہ اعمال اس لئے وہ قرآن کو بھی نہیں مانتے تو جیسے قرآن اہلِ ایمان کو بشارت سُناتا تھا منکروں کو وعید بھی سُناتا ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے (دُنیا میں مرنے کے وقت بھی) سخت عذاب (ہونے والا) ہے اور وہ لوگ آخرت میں (بھی) سخت خسارہ میں ہیں (کہ کبھی نجات ہی نہ ہوگی) اور (گو یہ منکر قرآن کو نہ مانیں مگر) آپ کو بالیقین ایک بڑی حکمت والے علم والے کی طرف سے قرآن دیا جا رہا ہے (آپ اس نعمت کے سرور میں ان کے انکار سے غمگین نہ ہوجئے)۔

معارف و مسائل

زَیَّنَّا لَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ، یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے ان کے اعمالِ بد ان کی نظروں میں مزیّن کر دیئے ہیں۔ اس لئے وہ انہی کو بہتر سمجھ کر گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں اور بعض مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ اَعۡمَالَہُمۡ سے مراد نیک اعمال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو نیک اعمال کو مزیّن کر کے ان کے سامنے رکھ دیا تھا مگر ان ظالموں نے ان کی طرف التفات نہ کیا بلکہ کفر و شرک میں مبتلا رہے اس لئے گمراہی میں بھٹکنے لگے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے، اوّل تو اس لئے کہ مزیّن کرنے کے الفاظ عموماً اعمالِ بد کے لئے استعمال ہوئے ہیں جیسے [1] زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ (آل عمران: ۱۴)، [2] زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا (البقرۃ: ۲۱۲)، [3] زَیَّنَ لِکَثِیۡرٍ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ الـخ (الانعام: ۱۳۷) اور اچھے اعمال کے لئے اس لفظ کا استعمال بہت کم ہے جیسے [4] حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ الآیۃ (الحجرات: ۷) دوسرے آیت میں اَعۡمَالَہُمۡ (ان کے اعمال) کا لفظ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مراد اعمالِ بد ہیں نہ کہ اعمالِ صالحہ۔

اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِاَهۡلِهٖۤ اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡهَا بِخَبَرٍ

جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر

[1] ترجمہ: خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی۔

[2] ترجمہ: دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے۔

[3] ترجمہ: بہت سے مشرکین کے خیال میں ان کے معبودوں نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے۔

[4] ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا۔

أَوْ آتِيكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿٧﴾ فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ

یا لاتا ہوں انگارا سُلگا کر شاید تم سینکو پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی

أَنْ بُورِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ط وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨﴾

کہ برکت ہے اس پر جو کوئی کہ آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے اور پاک ہے ذات اللہ کی جو ربّ سارے جہان کا

يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ لا وَأَلْقِ عَصَاكَ ط فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ

اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا اور ڈال دے لاٹھی اپنی پھر جب دیکھا اس کو پھنپھناتے

كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ ط يَا مُوسَىٰ لَا تَخَفْ قف إِنِّي

جیسے سانپ کی سٹک لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا اے موسیٰ مت ڈر میں جو ہوں

لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ ﴿١٠﴾ صلے إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ

میرے پاس نہیں ڈرتے رسول مگر جس نے زیادتی کی پھر بدلے میں نیکی کی بُرائی کے پیچھے

فَإِنِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١﴾ وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ

تو میں بخشنے والا مہربان ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے سفید ہو کر

مِنْ غَيْرِ سُوءٍ قف فِي تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ ط إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا

نہ کسی بُرائی سے یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لے کر جا فرعون اور اس کی قوم کی طرف بیشک وہ تھے لوگ

فَاسِقِينَ ﴿١٢﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿١٣﴾ ج

نافرمان پھر جب پہنچیں ان کے پاس ہماری نشانیاں سمجھانے کو بولے یہ جادو ہے صریح

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ

اور اُن کا انکار کیا اور ان کا یقین کر چکے تھے اپنے جی میں بے انصافی اور غرور سے، سو دیکھ لے کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤﴾ ع

انجام خرابی کرنے والوں کا

ع ۲ - ۱۶

آسان ترجمۂ قرآن

اُس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا کہ: ''مجھے ایک آگ نظر آئی ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں، یا پھر تمہارے پاس آگ کا کوئی شعلہ اُٹھا کر لے آؤں گا، تاکہ تم آگ سے گرمی حاصل کر سکو۔'' ﴿٧﴾ چنانچہ جب وہ اُس آگ کے پاس پہنچے تو اُنہیں آواز دی گئی کہ: ''برکت ہو اُن پر بھی جو اس آگ کے اندر ہیں، اور اُس پر بھی جو اس کے آس پاس ہے، اور پاک ہے اللہ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ ﴿٨﴾ اے موسیٰ! بات یہ ہے کہ میں اللہ ہوں، بڑے اقتدار والا، بڑی حکمت والا، ﴿٩﴾ اور ذرا اپنی لاٹھی کو نیچے پھینکو۔'' پھر جب اُنہوں نے لاٹھی کو دیکھا کہ وہ اس طرح حرکت کر رہی ہے جیسے وہ کوئی سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے، اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا:) ''موسیٰ! ڈرو نہیں، جن کو پیغمبر بنایا جاتا ہے، ان کو میرے حضور کوئی اندیشہ نہیں ہوتا، ﴿١٠﴾ اِلّا یہ کہ کسی نے کوئی زیادتی کی ہو۔ پھر وہ برائی کے بعد اُسے بدل کر اچھے کام کر لے، تو میں بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہوں۔ ﴿١١﴾ اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرو، تو وہ کسی بیماری کے بغیر سفید ہو کر نکلے گا۔ یہ دونوں باتیں اُن نو نشانیوں میں سے ہیں جو فرعون اور اُس کی قوم کی طرف (تمہارے ذریعے) بھیجی جا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نافرمان لوگ ہیں۔'' ﴿١٢﴾ پھر ہوا یہ کہ جب اُن کے پاس ہماری نشانیاں اس طرح پہنچیں کہ وہ آنکھیں کھولنے والی تھیں، تو اُنہوں نے کہا کہ: ''یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔'' ﴿١٣﴾ اور اگرچہ اُن کے دِلوں کو ان (کی سچائی) کا یقین ہو چکا تھا، مگر انہوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے اُن کا انکار کیا۔ اب دیکھ لو کہ ان فساد مچانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿١٤﴾

خلاصۂ تفسیر

(اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ (مدین سے آتے ہوئے کوہِ طور کے قریب رات کو سردی کے وقت پہنچے اور مصر

کی راہ بھی بھول گئے تھے تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے (طور کی طرف) آگ دیکھی ہے میں ابھی (جا کر) وہاں سے (یا تو راستہ کی) کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے پاس (وہاں سے) آگ کا شعلہ کسی لکڑی وغیرہ میں لگا ہوا لاتا ہوں تا کہ تم سینک لو سو جب اُس (آگ) کے پاس پہنچے تو ان کو (منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہیں (یعنی فرشتے) اُن پر بھی برکت ہو اور جو اس (آگ) کے پاس ہے (یعنی موسیٰ) اس پر بھی (برکت ہو، یہ دُعا بطور تحیۃ وسلام کے ہے جیسے ملاقاتی آپس میں سلام کرتے ہیں۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام جانتے نہ تھے کہ یہ نورانوار الٰہیہ سے ہے اس لئے خود سلام نہیں کر سکے تو منجانب اللہ ان کے اُنس کے لئے سلام ارشاد ہوا اور فرشتوں کو ملا لینا شاید اس لئے ہو کہ جس طرح فرشتوں کو سلام حق تعالیٰ کے قربِ خاص کی علامت ہوتی ہے یہ سلام بھی موسیٰ علیہ السلام کو قربِ خاص کی بشارت ہو گیا) اور (اس امر کے بتلانے کے لئے کہ یہ نور جو بشکلِ نار ہے خود حق تعالیٰ کی ذات نہیں ارشاد فرمادیا کہ) اللہ رَبّ العالمین (رنگ، جہات، مقدار اور حد بندی وغیرہ سے) پاک ہے (اور اس نور میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، پس یہ نور ذاتِ خداوندی نہیں اور موسیٰ علیہ السلام اگر اس مسئلہ سے خالی الذہن ہوں تو اس کی تعلیم ہے اور اگر دلائلِ عقلیہ اور فطرتِ صحیحہ کی بنا پر ان کو پہلے سے معلوم ہو تو زیادہ سمجھانا ہے اس کے بعد ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ بات یہ ہے کہ میں (جو کہ بے کیف کلام کر رہا ہوں) اللہ ہوں زبردست حکمت والا اور (اے موسیٰ) تم اپنا عصا (زمین پر) ڈال دو (چنانچہ انہوں نے ڈال دیا تو وہ اژدہا بن کر لہرانے لگا) سو جب اُنہوں نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا (ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ ڈرو نہیں (کیونکہ ہم نے تم کو پیغمبری دی ہے) اور ہمارے حضور میں (یعنی پیغمبری کا اعزاز عطا ہونے کے وقت) پیغمبر (ایسی چیزوں سے جو کہ خود اس کی پیغمبری کی دلیل یعنی معجزات ہوں) نہیں ڈرا کرتے (یعنی تم کو بھی ڈرنا نہ چاہئے) ہاں مگر جس سے کوئی قصور (لغزش سرزد) ہو جائے (اور وہ اس لغزش کو یاد کر کے ڈرے تو مضائقہ نہیں لیکن اس کی نسبت بھی یہ قاعدہ ہے کہ اگر قصور ہو جائے اور) پھر بُرائی (ہو جانے) کے بعد بُرائی کی جگہ نیک کام کرے (توبہ کرے) تو میں (اس کو بھی معاف کر دیتا ہوں کیونکہ میں) مغفرت والا رحمت والا ہوں (یہ اس لئے فرمادیا کہ عصا کے معجزہ سے مطمئن ہو جانے کے بعد کبھی اپنا قصہ قبطی کو قتل کرنے کا یاد کر کے پریشان ہوں اس لئے اس سے بھی مطمئن فرمادیا تا کہ وحشت جاتی رہے) اور (اے موسیٰ اس معجزۂ عصا کے سوا ایک معجزہ اور بھی عطا ہوتا ہے وہ یہ کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر لے جاؤ (اور پھر نکالو تو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بغیر کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا (اور یہ دونوں معجزے اُن) نو معجزوں میں (سے ہیں جن کے ساتھ تم کو) فرعون اور اس کی قوم کی طرف (بھیجا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے حد سے نکل جانے والے لوگ ہیں غرض جب اُن لوگوں کے پاس ہمارے (دیے ہوئے) معجزے پہنچے (جو) نہایت واضح تھے (یعنی ابتدائے دعوت میں دو معجزے دکھلائے گئے پھر وقتاً فوقتاً

باقی (دکھلائے جاتے رہے) تو وہ لوگ (ان سب کو دیکھ کر بھی) بولے یہ صریح جادو ہے اور (غضب تو یہ تھا کہ ظلم) اور تکبر کی راہ سے ان (معجزاتِ) کے (بالکل) منکر ہو گئے حالانکہ (اندر سے) ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا سو دیکھئے کیسا (بُرا) انجام ہوا ان مفسدوں کا (دُنیا میں غرق ہوئے اور آخرت میں جلنے کی سزا پائی)۔

معارف و مسائل

اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَهْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۞

انسان کو اپنی ضروریات کے لئے اسبابِ طبعیہ کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس جگہ دو ضرورتیں پیش آئیں ایک راستہ پوچھنا، جو آپ بھول گئے تھے، دوسرا آگ سے گرمی حاصل کرنا کہ سردی کی رات تھی اس کے لئے آپ نے کوہِ طور کی طرف جانے کی سعی وکوشش کی لیکن اس کے ساتھ ہی اس مقصد میں کامیابی پر یقین اور دعویٰ کرنے کے بجائے ایسے الفاظ اختیار فرمائے جس میں اپنی بندگی اور حق تعالیٰ سے اُمید ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ضروریات کے حصول کے لئے جدوجہد توکل کے منافی نہیں۔ لیکن بھروسہ اپنی کوشش کے بجائے اللہ پر ہونا چاہئے اور آگ آپ کو دکھلائے جانے میں بھی شاید یہی حکمت ہو کہ اس سے آپ کے دونوں مقصود پورے ہو سکتے تھے، راستہ کا مل جانا اور آگ سے گرمی حاصل کرنا۔ (کما فی الروح)[1]

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُمْكُثُوْٓا اور تَصْطَلُوْنَ جمع کے صیغے بولے حالانکہ آپ کے ساتھ صرف آپ کی بیوی یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھیں ان کے لئے لفظ جمع استعمال فرمانا بطور اکرام کے ہوا جیسے معزز لوگوں میں کسی ایک فرد سے بھی خطاب ہوتا ہے تو صیغہ جمع کا استعمال کیا جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنی ازواج مطہرات کے لئے صیغۂ جمع استعمال فرمانا روایاتِ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

تخصیص کے ساتھ بیوی کا ذکر عام مجالس میں نہ کرنا بلکہ کنایہ سے کام لینا بہتر ہے

آیتِ مذکورہ میں قَالَ مُوْسٰی لِاَهْلِهٖ فرمایا گیا ہے لفظ اَهْل عام ہے جس میں بیوی اور گھر کے دوسرے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس مقام میں اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تنہا اہلیہ محترمہ ہی تھیں، کوئی دوسرا نہ تھا مگر تعبیر میں یہ عام لفظ استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ پایا گیا کہ مجالس میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا ذکر کرے تو عام لفظوں سے کرنا بہتر ہے جیسے ہمارے عرف میں کہا جاتا ہے میرے گھر والوں نے یہ کہا ہے۔

---

[1] روح المعانی (بالاختصار) ج:۱۴ ص:۲۱۲

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگ دیکھنے اور آگ کے اندر سے ایک ندا سننے کی تحقیق

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بہت سی سورتوں میں مختلف عنوانات کے ساتھ آیا ہے۔ سورۂ نمل کی مذکورہ آیات میں اس سلسلے کے دو جملے غور طلب ہیں۔ اوّل (بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ) دوسرا (اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ) اور سورۂ طٰہٰ میں جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے اس واقعہ سے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں ([1] اِذْ رَاٰ نَارًا الی قولہ تعالیٰ: نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ (طٰہٰ: ۱۰ تا ۱۴)) ان آیات میں بھی دو جملے خاص طور سے غور طلب ہیں (اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ) اور (اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ الخ) اور سورۂ قصص میں اس واقعہ کے یہ الفاظ ہیں ([2] نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّىْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (القصص))۔ ان تینوں مواقع میں عنوانِ تعبیر اگرچہ مختلف ہے مگر مضمون تقریباً ایک ہی ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس رات میں کئی وجہ سے آگ کی ضرورت تھی حق تعالیٰ نے ان کو کوہِ طور کے ایک درخت پر آگ دکھلائی۔ اُس آگ یا درخت سے یہ آواز سنی گئی اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ، اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ، اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا، اِنِّىْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، یہ ہوسکتا ہے کہ یہ نداء بار بار ہوئی ہو، کبھی ایک لفظ سے کبھی دوسرے لفظ سے۔ اور آواز سننے کی جو کیفیت تفسیر بحر محیط میں ابوحیان نے اور روح المعانی میں آلوسی نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آواز اس طرح سُنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی جس کی کوئی جہت متعین نہیں ہوسکتی تھی۔ اور سننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کان نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں وغیرہ تمام اعضائے بدن اس کو سُن رہے تھے جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔[3]

یہ ایک غیبی آواز تھی جو بلا کیف وبلا سمت سنی جارہی تھی لیکن مبدا اس کا وہ آگ یا درخت تھا جس سے آگ کی شکل اُن کو دکھائی گئی۔ ایسے ہی مواقع عام طور پر لوگوں کے لئے مغالطے اور بت پرستی کا سبب بن جاتے ہیں اس لئے ہر عنوان میں مضمون توحید کی طرف ہدایت اور تنبیہ ساتھ ساتھ کی گئی ہے زیرِ بحث آیت میں لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ اسی تنبیہ کے لئے بڑھایا گیا۔ سورۂ طٰہٰ میں لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا اور سورۂ قصص میں اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اسی مضمون کی تاکید کے لئے لایا گیا

---

[1] ترجمہ: جب کہ انہوں نے ایک آگ دیکھی سو اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم ٹھہرے رہو میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید میں اس میں سے تمہارے پاس ایک شعلہ لاؤں یا آگ کے پاس راستے کا پتہ مجھ کو مل جائے، سو وہ جب اس کے پاس پہنچے تو آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! میں تمہارا رَبّ ہوں، پس تم اپنی جوتیاں اُتار ڈالو، تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو، اور میں نے تم کو منتخب فرمایا ہے، سو جو کچھ وحی کی جارہی ہے اُس کو سُن لو، میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو تم میری ہی عبادت کیا کرو۔

[2] ترجمہ: ان کو اس میدان کے داہنی جانب سے اس مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ رَبّ العالمین ہوں۔

[3] روح المعانی تفسیر سورۃ طٰہٰ، ج:۱۳ ص:۱۱۶، ج:۱۵ ص:۱۲۲

ہے۔اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ آگ کی شکل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس لئے دکھائی گئی تھی کہ وہ اس وقت آگ اور روشنی کے حاجتمند تھے ورنہ اس کلامِ ربانی اور ذاتِ ربانی کا آگ سے یا شجرۂ طور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آگ اللہ تعالیٰ کی عام مخلوقات کی طرح ایک مخلوق تھی اسی لئے زیر بحث آیات میں جو یہ ارشاد ہے اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ یعنی مبارک ہے وہ جو آگ کے اندر ہے اور وہ جو اس کے آس پاس ہے، اس کی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں جس کی تفصیل روح المعانی میں ہے۔ [1] ایک قول حضرت ابن عباس مجاہد، عکرمہ سے منقول ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں کیونکہ آگ کوئی حقیقی آگ تو تھی نہیں جس بقعہ مبارکہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے تھے وہ دُور سے پورا آگ معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے اندر ہوئے اور وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ سے مراد فرشتے ہیں جو آس پاس وہاں موجود تھے اور بعض حضرات نے اس کے برعکس یہ فرمایا کہ مَنْ فِي النَّارِ سے فرشتے اور وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ تفسیر بیان القرآن کے خلاصۂ تفسیر مذکور میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ آیاتِ مذکورہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری کی ایک روایت اور اُس کی تحقیق

یہاں ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابنِ مردویہ وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسن بصری اور سعید بن جُبیرؒ سے مَنْ فِي النَّارِ کی تفسیر میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے خود ذات حق سبحانہ وتعالیٰ مراد ہے۔ [2] یہ تو ظاہر ہے کہ آگ ایک مخلوق ہے اور کسی مخلوق میں خالق کا حلول نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس روایت کا یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا کہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آگ کے اندر حلول فرمایا تھا جیسا کہ بہت سے بت پرست مشرکین بتوں کے وجود میں ذاتِ حق کے حلول کے قائل ہیں اور یہ توحید کے قطعاً خلاف ہے۔ بلکہ مراد ظہور ہے جیسا آئینہ میں جس چیز کو دیکھا جاتا ہے وہ آئینہ میں حلول کئے ہوئے نہیں ہوتی اس سے الگ اور خارج ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ظہور جس کو تجلّی بھی کہا جاتا ہے خود ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلّی نہیں تھی ورنہ اگر ذاتِ حق تعالیٰ کا مشاہدہ موسیٰ علیہ السلام نے کرلیا ہوتا تو بعد میں ان کے اس سوال کی کوئی وجہ نہیں رہتی رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ (الاعراف: ۱۴۳) (یعنی اے میرے پروردگار مجھے اپنی ذات پاک دکھا کہ میں دیکھ سکوں) اور اس کے جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے لَنْ تَرٰىنِيْ کا ارشاد بھی پھر کوئی معنے نہیں رکھتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں حق تعالیٰ جل شانہٗ کا ظہور مراد ہے یعنی تجلّی جو آگ کی صورت میں ہوئی یہ جس طرح حلول نہیں تھا اسی طرح تجلّی ذات بھی نہیں تھی بلکہ لَنْ تَرٰىنِيْ الآیۃ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عالمِ دُنیا میں تجلّی

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:١٤ ص:٣١٥

[2] تفسیر الطبری لابن جریرؒ تحت هذه الآية ج:١٩ ص:٣٢٨، وتفسیر ابن ابی حاتم تحت هذه الآية، رقم الحدیث:١٦٨٨٥

ذاتی کا کوئی شخص مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ پھر اس ظہور و تجلّی کا کیا مفہوم ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تجلّی مثالی تھی جو حضرات صوفیہ کرام میں معروف ہے اس کی حقیقت کا سمجھنا تو انسان کے لئے مشکل ہے۔ بقدر ضرورت تقریب الی الفہم کے لئے احقر نے اپنی کتاب احکام القرآن بزبان عربی سورۂ قصص میں اس کی کچھ تفصیل لکھی ہے اہلِ علم اس میں دیکھ سکتے ہیں عوام کی ضرورت کی چیز نہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ⑪ اس سے پہلی آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا کا ذکر ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عصا جب سانپ بن گیا تو موسیٰ خود بھی اُس سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ آگے بھی موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزہ یدِ بیضاء کا بیان ہے درمیان میں اس استثناء کا ذکر کس لئے کیا گیا اور یہ استثناء منقطع ہے یا متصل؟ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں بعض حضرات نے استثناء کو منقطع قرار دیا ہے تو مضمون آیت کا یہ ہوگا کہ پہلی آیت میں انبیاء علیہم السلام پر خوف نہ ہونے کا ذکر تھا بسبیلِ تذکرہ اُن لوگوں کا بھی ذکر کر دیا کہ جن پر خوف طاری ہونا چاہئے، یعنی وہ لوگ جن سے کوئی خطا سرزد ہوئی پھر توبہ کر کے نیک عمل اختیار کر لئے ایسے حضرات کی اگرچہ اللہ تعالیٰ خطا معاف کر دیتے ہیں مگر معافی کے بعد بھی گناہ کے بعض آثار باقی رہنے کا احتمال ہے اس سے یہ حضرات ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ اور اس استثناء کو متصل قرار دیں تو معنے آیت کے یہ ہوں گے کہ اللہ کے رسول ڈرا نہیں کرتے بجز اُن کے جن سے کوئی خطا یعنی گناہ صغیرہ سرزد ہو گیا ہو پھر اُس سے بھی توبہ کر لی ہو، تو اس توبہ سے یہ صغیرہ گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ اور صحیح تر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جو لغزشیں ہوئی ہیں وہ درحقیقت گناہ ہی نہ تھے نہ صغیرہ نہ کبیرہ، البتہ صورت گناہ کی تھی اور درحقیقت وہ اجتہادی خطائیں ہوئی ہیں۔ اس مضمون میں اشارہ اس طرف پایا گیا کہ حضرت موسیٰ سے جو ایک لغزش قبطی کے قتل کی ہوگئی وہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دی مگر اس کا یہ اثر اب بھی رہا کہ موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہوگیا، اگر یہ لغزش نہ ہوتی تو یہ وقتی خوف بھی نہ ہوتا۔ (قرطبی)[1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا

اور ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو ایک علم اور بولے شکر اللہ کا جس نے ہم کو بزرگی دی

عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑮ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ

اپنے بہت سے بندوں ایمان والوں پر اور قائم مقام ہوا سلیمان داؤد کا اور بولا

---

1 تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱٦١

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ

اے لوگو ہم کو سکھائی ہے بولی اُڑتے جانوروں کی اور دیا ہم کو ہر چیز میں سے بیشک یہی ہے

الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ

فضیلت صریح اور جمع کئے گئے سلیمان کے پاس اس کے لشکر جن اور انسان

وَ الطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ

اور اُڑتے جانور پھر اُن کی جماعتیں بنائی جاتیں یہاں تک کہ جب پہنچے چیونٹیوں کے میدان پر کہا ایک چیونٹی نے

يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ

اے چیونٹیو گھس جاؤ اپنے گھروں میں نہ پیس ڈالے تم کو سلیمان اور اس کی فوجیں

وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ

اور اُن کو خبر بھی نہ ہو پھر مسکرا کر ہنس پڑا اس کی بات سے اور بولا اے میرے ربّ میری قسمت میں دے

اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا

کہ شکر کروں تیرے احسان کا جو تو نے کیا مجھ پر اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں کام نیک

تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

جو تو پسند کرے اور ملا لے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے داود اور سلیمان کو علم عطا کیا۔ اور انہوں نے کہا: ”تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جس نے ہمیں اپنے بہت

سے مؤمن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔'' ⑮ اور سلیمان کو داود کی وراثت ملی، اور انہوں نے کہا: ''اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے، اور ہمیں ہر (ضرورت کی) چیز عطا کی گئی ہے۔ یقیناً یہ (اللہ تعالیٰ کا) کھلا ہوا فضل ہے۔'' ⑯ اور سلیمان کے لئے اُن کے سارے لشکر جمع کر دیئے گئے تھے جو جنات، انسانوں اور پرندوں پر مشتمل تھے، چنانچہ اُنہیں قابو میں رکھا جاتا تھا۔ ⑰ یہاں تک کہ ایک دن جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ''چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اُن کا لشکر تمہیں پیس ڈالے، اور اُنہیں پتہ بھی نہ چلے۔'' ⑱ اُس کی بات پر سلیمان مسکرا کر ہنسے، اور کہنے لگے: ''میرے پروردگار! مجھے اس بات کا پابند بنا دیجئے کہ میں آپ کی اُن نعمتوں کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں، اور وہ نیک عمل کروں جو آپ کو پسند ہو، اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما لیجئے۔'' ⑲

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) کو (شریعت اور حکمرانی کا) علم عطا فرمایا اور اُن دونوں نے (ادائے شکر کے لئے) کہا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) کے قائم مقام سلیمان (علیہ السلام) ہوئے (یعنی ان کو سلطنت وغیرہ ملی) اور اُنہوں نے (اظہار شکر کے لئے) کہا کہ اَے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے (جو دوسرے بادشاہوں کو حاصل نہیں) اور ہم کو (سامانِ سلطنت کے متعلق) ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں (جیسے فوج، لشکر، مال، اور آلاتِ جنگ وغیرہ) واقعی یہ (اللہ تعالیٰ کا) کُھلا ہوا فضل ہے اور سلیمان (علیہ السلام کے پاس سامانِ سلطنت بھی عجیب وغریب تھا چنانچہ ان) کے لئے (جو) ان کا لشکر جمع کیا گیا (تھا ان میں) جن بھی (تھے) اور انسان بھی اور پرندے بھی (جو کسی بادشاہ کے تابع نہیں ہوتے) اور (پھر تھے بھی اس کثرت سے کہ) ان کو (چلنے کے وقت) روکا جا (یا کر) تا تھا (تا کہ متفرق نہ ہو جائیں پیچھے والے بھی پہنچ جائیں یہ بات عادۃً نہایت کثرت میں ہوتی ہے کیونکہ تھوڑے مجمع میں تو اگلا آدمی خود ہی ایسے وقت رُک جاتا ہے اور بڑے مجمع میں اگلوں کو پچھلوں کی خبر بھی نہیں ہوتی اس لئے اس کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے) یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں سے) کہا کہ اے چیونٹیو، اپنے اپنے سُوراخوں میں جا گھسو، کہیں تم کو سلیمان اور اُن کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے سو سلیمان (علیہ السلام نے اس کی بات سنی اور) اُس کی بات سے (متعجب ہو کر کہ اس چھوٹے وجود پر یہ ہوشیاری اور احتیاط) مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور (یہ دیکھ کر کہ میں اس کی بولی سمجھ

گیا جو کہ معجزہ ہونے کی وجہ سے ایک نعمتِ عظیمہ ہے اور نعمتیں بھی یاد آگئیں اور) کہنے لگے کہ اے میرے رَبّ مجھ کو اس پر ہیشگی دیجئے کہ میں آپ کی اُن نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں (یعنی ایمان اور عمل سب کو اور نبوّت خود کو اور اپنے والد داؤد علیہ السلام کو) اور (اُس پر بھی ہیشگی دیجئے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں (یعنی عمل مقبول ہو کیونکہ اگر حقیقت میں عمل نیک ہو اور آداب و شرائط کی کمی کی وجہ سے مقبول نہ ہو وہ مقصود نہیں ہے) اور مجھ کو اپنی رحمت (خاصہ) سے اپنے (اعلیٰ درجہ کے) نیک بندوں (انبیاء) میں داخل رکھئے (یعنی قرب کو بُعد میں تبدیل نہ کیجئے)۔

معارف ومسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ ظاہر ہے کہ اس سے مراد علومِ انبیاء ہیں جو نبوّت و رسالت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کے عموم میں دوسرے علوم و فنون بھی شامل ہوں تو بعید نہیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی گئی تھی۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام زمرۂ انبیاء میں ایک خاص امتیاز یہ رکھتے ہیں کہ ان کو نبوّت و رسالت کے ساتھ سلطنت بھی دی گئی تھی اور سلطنت بھی ایسی بے نظیر کہ صرف انسانوں پر نہیں بلکہ جنّات اور جانوروں پر بھی ان کی حکمرانی تھی ان سب عظیم الشان نعمتوں سے پہلے حق تعالیٰ کے نعمتِ علم کا ذکر فرمانے سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ نعمتِ علم تمام دوسری نعمتوں سے فائق اور بالاتر ہے۔ (قرطبی) [۱]

انبیاء میں مال کی وراثت نہیں ہوتی

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ، وَرِثَ سے وراثتِ علم اور نبوّت مراد ہے وراثتِ مال نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَآءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ) [۲] یعنی انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ مورث، حضرت ابوالدرداءؓ سے ترمذی اور ابوداؤد میں روایت ہے: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ [۳] یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں، لیکن انبیاء میں وراثت علم اور نبوّت کی ہوتی ہے مال کی نہیں ہوتی۔ حضرت ابوعبداللہ (جعفر صادق) کی روایت اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۳ ص:۱۶۵

[۲] ما وجدت بهٰذه الألفاظ إلّا في القرطبي (بالإختصار) ج:۱۱ ص:۸۱، وفي روح المعاني ج:۱۴ ص:۴۲۹

[۳] جامع الترمذي، ابواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، ج:۲ ص:۹۷، وسنن ابي داوٗد، كتاب العلم، باب فضل العلم ج:۲ ص:۱۵۷

علیہ السلام کے وارث ہوئے (روح عن الکلینی)[1] عقلی طور بھی یہاں وراثت مال مراد نہیں ہوسکتی کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے وقت آپ کی اولاد میں اُنیس بیٹوں کا ذکر آتا ہے اگر وراثتِ مال مراد ہوتو یہ بیٹے سب کے سب وارث ٹھہریں گے پھر وراثت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ وراثت وہ مراد ہے جس میں بھائی شریک نہ تھے بلکہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام وارث بنے اور وہ صرف علم اور نبوّت کی وراثت ہی ہوسکتی ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا ملک وسلطنت بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمادیا اور اس میں مزید اضافہ اس کا کردیا کہ آپ کی حکومت جنات اور وُحوش وطیور تک عام کردی، ہوا کو آپ کے لئے مسخر کردیا۔ ان دلائل کے بعد طبرسی کی وہ روایت غلط ہوجائے گی جس میں انہوں نے بعض ائمہ اہلِ بیت کے حوالے سے مال کی وارثت مراد لی ہے۔ (روح)[2]

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا فاصلہ ہے اور یہود یہ فاصلہ ایک ہزار چار سو سال کا بتلاتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر ہوئی ہے۔ (قرطبی)[3]

اپنے لئے جمع کا صیغہ بولنا جائز ہے بشرطیکہ تکبّر اُنہ ہو

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا الخ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے باوجود خود اکیلے ہونے کے اپنے لئے جمع کا صیغہ شاہانہ محاورہ کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ رعایا پر رُعب پڑے اور رعایا اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ سلیمان علیہ السلام میں سُستی نہ کریں۔ اسی طرح امراء، حکام اور افسران کو اپنی رعایا کی موجودگی میں اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں جبکہ وہ سیاسۃً اور اظہارِ نعمت کی غرض سے ہو تکبّر وتعلّی کے لئے نہ ہو۔

پرندوں اور چوپاؤں میں بھی عقل وشعور ہے

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ پرندے، چرندے اور تمام حیوانات میں بھی عقل وشعور کسی درجہ میں موجود ہے۔ البتہ ان کی عقول اس درجہ کی نہیں کہ ان کو احکام شرع کا مکلّف بنایا جاتا اور انسان اور جنات کو عقل وشعور کا وہ کامل درجہ عطا ہوا ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہوسکیں اور ان پر عمل کرسکیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کبوتر سب پرندوں میں زیادہ عقلمند ہے۔ ابنِ عطیہ نے فرمایا کہ چیونٹی ذہین عقلمند جانور ہے اس کی قوتِ شامّہ بڑی تیز ہے جو کوئی دانہ اس کے قبضہ میں آتا ہے اس کے دوٹکڑے کردیتی ہے تاکہ اُگے نہیں اور سردی کے زمانے کے لئے اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرتی ہے۔ (قرطبی)[4]

---

[1]، [2] روح المعانی ج:۱۴ ص:۴۲۹ [3] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۶۴، ۱۶۵ [4] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۶۵

فائدہ:- آیت میں منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولی کی تخصیص ہُد ہُد کے واقعہ کی وجہ سے ہے جو پرندہ ہے ورنہ حضرت سلیمانؑ کو پرندے، چرندے اور تمام حشرات الارض کی بولیاں سکھائی گئی تھیں جیسا کہ اگلی آیت میں چیونٹی کی بولی سمجھنے کا ذکر موجود ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس مقام پر مختلف پرندوں کی بولیاں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اُس پر یہ فرمانا کہ یہ پرندہ یہ بات کہہ رہا ہے تفصیل سے نقل کیا ہے اور تقریباً ہر پرندہ کی بولی کوئی نصیحت کا جملہ ہے۔[۱]

وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۚ لفظ کُل اصل لغت کے اعتبار سے تمام افرادِ جنس کو عام ہوتا ہے مگر بسا اوقات عموم کُلّی مراد نہیں ہوتا بلکہ کسی خاص مقصد کی حد تک عموم مراد ہوتا ہے جیسا یہاں مراد اُن اشیاء کا عموم ہے جن کی سلطنت وحکومت میں ضرورت ہوتی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہوائی جہاز، موٹر، ریل وغیرہ اُن کے پاس نہ تھے۔ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ، وزع سے مشتق ہے جس کے لفظی معنے روکنے کے ہیں۔ مطلب اس جگہ یہ ہے کہ مجھے اس کی توفیق دیدیجئے کہ میں شکرِ نعمت کو ہر وقت ساتھ رکھوں اُس سے کسی وقت جُدا نہ ہوں، جس کا حاصل مداومت اور پابندی ہے۔ اس سے پہلی آیت میں فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ اسی معنی میں آیا ہے کہ لشکر کو کثرت کی وجہ سے انتشار سے بچانے کے لئے روکا جاتا تھا۔

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ، یہاں رضا بمعنے قبول ہے۔ معنے یہ ہیں کہ یا اللہ مجھے ایسے عمل صالح کی توفیق دیجئے جو آپ کے نزدیک مقبول ہو۔ روح المعانی[۲] میں اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عمل صالح کے لئے قبولیت لازم نہیں ہے بلکہ قبولیت کچھ شرائط پر موقوف ہوتی ہے، اور فرمایا کہ صالح اور مقبول ہونے میں نہ عقلاً کوئی لزوم ہے نہ شرعاً۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے کہ اپنے اعمالِ صالحہ کے مقبول ہونے کی بھی دُعا کرتے تھے جیسے حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت دُعا فرمائی، [۳] رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ (البقرۃ: ۱۲۷)۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عمل نیک ہے صرف اُس کو کر کے بے فکر ہونا نہیں چاہئے، اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دُعا کرے کہ اس کو قبول فرمائے۔

عملِ صالح اور مقبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا بغیر فضلِ خداوندی کے نہیں ہوگا

وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ عمل صالح اور اس کے مقبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا خداتعالیٰ کے فضل وکرم ہی سے ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے اعمال کے بھروسہ پر جنت میں

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۶۵ [۲] روح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۴ ص:۴۴۳
[۳] ترجمہ: اے ہمارے پروردگار ہم سے قبول فرمایئے۔

داخل نہیں ہوگا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی، لیکن مجھے میرے خدا کی رحمت اور فضل گھیرے ہوئے ہے۔ (روح المعانی)[1]

حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ان کلمات میں دخولِ جنت کے لئے فضلِ ربّی کی دُعا فرما رہے ہیں یعنی اے اللہ، مجھے وہ فضل بھی عطا فرما جس سے جنت کا مستحق ہو جاؤں۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝٢٠

اور خبر لی اُڑتے جانوروں کی تو کہا کیا ہے، جو میں نہیں دیکھتا ہُدہُد کو یا ہے وہ غائب

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝٢١

اس کو سزا دوں گا سخت سزا یا ذبح کرڈالوں گا یا لائے میرے پاس کوئی سند صریح

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۢ

پھر بہت دیر نہ کی کہ آ کر کہا میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ تجھ کو اس کی خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے

بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝٢٢ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ

ایک خبر لے کر تحقیق میں نے پایا ایک عورت کو جو اُن پر بادشاہی کرتی ہے اور اس کو ہر ایک چیز ملی ہے

وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝٢٣ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور اس کا ایک تخت ہے بڑا میں نے پایا کہ وہ اور اس کی قوم سجدہ کرتے ہیں سورج کو اللہ کے سوائے

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝٢٤ لا

اور بھلے دکھلا رکھے ہیں ان کو شیطان نے ان کے کام پھر روک دیا ہے اُن کو رستہ سے سو وہ راہ نہیں پاتے

[1] روح المعانی ج:۱۴ ص:۲۲۳، وصحیح البخاری، کتاب المرضی، باب نهی تمنی المریض الموت ج:۲ ص:۸۴۷

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا

کیوں نہ سجدہ کریں اللہ کو جو نکالتا ہے چھپی ہوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو

تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة

چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوائے پروردگار تخت بڑے کا

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا

سلیمان نے کہا ہم اب دیکھتے ہیں تو نے سچ کہا یا تو جھوٹا ہے لے جا میرا یہ خط

فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور ڈال دے اُن کی طرف پھر اُن کے پاس سے ہٹ آ پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

اور انہوں نے (ایک مرتبہ) پرندوں کی حاضری لی تو کہا: ''کیا بات ہے، مجھے ہدہد نظر نہیں آرہا، کیا وہ کہیں غائب ہوگیا ہے؟ ﴿۲۰﴾ میں اُسے سخت سزا دُوں گا، یا اُسے ذبح کرڈالوں گا، اِلاَّ یہ کہ وہ میرے سامنے کوئی واضح وجہ پیش کرے۔'' ﴿۲۱﴾ پھر ہدہد نے زیادہ دیر نہیں لگائی، اور (آکر) کہا کہ: ''میں نے ایسی معلومات حاصل کی ہیں جن کا آپ کو علم نہیں ہے، اور میں ملکِ سبأ سے آپ کے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔ ﴿۲۲﴾ میں نے وہاں ایک عورت کو پایا جو اُن لوگوں پر بادشاہت کررہی ہے، اور اُس کو ہر طرح کا ساز و سامان دیا گیا ہے، اور اُس کا ایک شاندار تخت بھی ہے۔ ﴿۲۳﴾ میں نے اُس عورت اور اُس کی قوم کو پایا ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر سورج کے آگے سجدے کرتے ہیں، اور شیطان نے اُن کو یہ بجھا دیا ہے کہ اُن کے اعمال بہت اچھے ہیں، چنانچہ اُس نے اُنہیں صحیح راستے سے روک رکھا ہے اور اس طرح وہ ہدایت سے اتنے دُور ہیں ﴿۲۴﴾ کہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو باہر نکال لاتا ہے، اور تم جو کچھ چھپاؤ، اور جو کچھ ظاہر کرو، سب کو جانتا ہے۔ ﴿۲۵﴾ اللہ تو وہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، (اور) جو عرشِ عظیم کا مالک ہے۔'' ﴿۲۶﴾ سلیمان نے کہا: ''ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تم نے سچ کہا ہے، یا جھوٹ بولنے

والوں میں تم بھی شامل ہو گئے ہو۔ (۲۷) میرا یہ خط لے کر جاؤ، اور اُن کے پاس ڈال دینا، پھر الگ ہٹ جانا، اور دیکھنا کہ وہ جواب میں کیا کرتے ہیں۔'' (۲۸)

خلاصۂ تفسیر

(اور ایک بار یہ قصہ ہوا کہ) سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کی حاضری لی تو (ہُد ہُد کو نہ دیکھا) فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہُد ہُد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب ہو گیا ہے (اور جب معلوم ہوا کہ واقع میں غائب ہے تو فرمانے لگے کہ) میں اس کو (غیر حاضری پر) سخت سزا دُوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف دلیل (اور غیر حاضری کا عذر) میرے سامنے پیش کر دے (تو خیر چھوڑ دوں گا) تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور سلیمان (علیہ السلام سے) کہنے لگا کہ ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور (اجمالی بیان اس کا یہ ہے کہ) میں آپ کے پاس قبیلۂ سبا کی ایک پختہ خبر لایا ہوں (جس کا تفصیلی بیان یہ ہے کہ) میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ان لوگوں پر بادشاہی کر رہی ہے اور اس کو (بادشاہی کے لوازم میں سے) ہر قسم کا سامان حاصل ہے اور اس کے پاس ایک بڑا تخت ہے (اور مذہبی حالت ان کی یہ ہے کہ) میں نے اس (عورت) کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ خدا (کی عبادت) کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے اُن کے (ان) اعمال (کفر) کو ان کی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے (اور ان اعمالِ بد کو مزیّن کرنے کے سبب) ان کو راہ (حق) سے روک رکھا ہے اس لئے وہ راہِ (حق) پر نہیں چلتے کہ اس خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو (ایسا قدرت والا ہے کہ) آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو (جن میں سے بارش اور زمین کی نباتات بھی ہیں) باہر لاتا ہے اور (ایسا جاننے والا ہے کہ) تم لوگ (یعنی تمام مخلوق) جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو اور جو کچھ (زبان اور جسم کے اعضاء سے) ظاہر کرتے ہو وہ سب کو جانتا ہے (اس لئے) اللہ ہی ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے سلیمان (علیہ السلام) نے (یہ سُن کر) فرمایا کہ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے (اچھا) میرا یہ خط لے جا اور اس کو اُن کے پاس ڈال دینا پھر (ذرا وہاں سے) ہٹ جانا، پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال و جواب کرتے ہیں (پھر تو یہاں چلے آنا وہ لوگ جو کچھ کارروائی کریں گے اُس سے تیرا سچ جھوٹ معلوم ہو جائے گا)۔

معارف و مسائل

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ، تَفَقَّدَ کے لفظی معنے کسی مجمع کے متعلق حاضر و غیر حاضر کی تحقیق کرنے کے ہیں۔ اس لئے اس کا ترجمہ خبر گیری اور نگہبانی سے کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے انسانوں کے علاوہ جنات اور وحوش وطیور

پر حکومت عطا فرمائی تھی اور جیسا کہ حکمرانی کا اُصول ہے رعایا کے ہر طبقہ کی نگرانی اور خبر گیری حاکم کے فرائض میں سے ہے اس کے مطابق اس آیت میں بیان فرمایا تَفَقَّدَ الطَّيْرَ یعنی سلیمان علیہ السلام نے اپنی رعایا کے طیور کا معائنہ فرمایا اور یہ دیکھا کہ ان میں کون حاضر ہے کون غیر حاضر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ صحابہ کرام کے حالات سے باخبر رہنے کا اہتمام فرماتے تھے جو شخص غیر حاضر ہوتا اگر بیمار ہے تو عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے تیمارداری کرتے اور کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو اس کے لئے تدبیر فرماتے تھے۔

حاکم کو اپنی رعیت کی اور مشائخ کو اپنے شاگردوں اور مُریدوں کی خبر گیری ضروری ہے

آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی رعایا کے ہر طبقہ پر نظر رکھتے اور ان کے حالات سے اتنے باخبر رہتے تھے کہ ہُد ہُد جو طیور میں چھوٹا اور کمزور بھی ہے اور اس کی تعداد بھی دُنیا میں بہ نسبت دوسرے طیور کے کم ہے وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا، بلکہ خاص ہُد ہُد کے متعلق جو سوال آپ نے فرمایا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ زمرۂ طیور میں کم تعداد اور کمزور ہے، اس لئے اپنی رعیت کے کمزوروں پر نظر رکھنے کا زیادہ اہتمام فرمایا۔ صحابہ کرام میں حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس سنتِ انبیاء کو پوری طرح جاری کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرتے تھے کہ سب لوگوں کے حالات سے باخبر رہیں۔ جس شخص کو کسی مصیبت و تکلیف میں گرفتار پاتے اُس کی امداد فرماتے تھے جس کے بہت سے واقعات ان کی سیرت میں مذکور ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر دریائے فرات کے کنارہ پر کسی بھیڑیے نے کسی بکری کے بچّے کو پھاڑ ڈالا تو اس کا بھی عمر سے سوال ہوگا۔" [1] (قرطبی)

یہ تھے وہ اُصولِ جہانبانی و حکمرانی جو انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو سکھائے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُن کو عملاً جاری کر کے دکھلایا اور جس کے نتیجہ میں پوری مسلم و غیر مسلم رعایا امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی، اور اُن کے بعد زمین و آسمان نے ایسے عدل و انصاف اور عام دُنیا کے امن و سکون اور اطمینان کا یہ منظر نہیں دیکھا۔

مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِينَ ۝۲۰ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں ہُد ہُد کو مجمع میں نہیں دیکھتا۔

اپنے نفس کا محاسبہ

یہاں موقع تو یہ فرمانے کا تھا کہ ہُد ہُد کو کیا ہو گیا کہ وہ مجمع میں حاضر نہیں۔ عنوان شاید اس لئے بدلا کہ ہُد ہُد اور تمام طیور کا مسخر ہونا حق تعالیٰ کا ایک انعام خاص تھا۔ ہُد ہُد کی غیر حاضری پر ابتداء میں یہ خوف دل میں پیدا ہوا کہ شاید

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱۳ ص:۱۷۸، والمنتظم لابن الجوزی ج:۳ ص:۲۰۳، في تذكرة سنة خمسة وتسعين ومائة۔

میرے کسی قصور سے اس نعمت میں کمی آئی کہ ایک صنف طیور کی یعنی ہُد ہُد غائب ہوگیا اس لئے اپنے نفس سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ جیسا کہ مشائخِ صوفیہ کا معمول ہے کہ جب اُن کو کسی نعمت میں کمی آئے یا کوئی تکلیف یا پریشانی لاحق ہو تو وہ اس کے ازالہ کے لئے مادّی اسباب کی طرف توجّہ کرنے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے تھے کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کے حق شکر میں کونسی کوتاہی ہوئی جس کے سبب یہ نعمت ہم سے لے لی گئی۔ قرطبی نے اس جگہ بحوالہ ابن عربی ان بزرگوں کا یہ حال نقل کیا ہے۔

اِذَا فَقَدُوْا اٰمَالَهُمْ تَفَقَّدُوْا اَعْمَالَهُمْ۔

یعنی ان حضرات کو جب اپنی مراد میں کامیابی نہیں ہوتی تو یہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہیں کہ ہم سے کیا قصور سرزد ہوا۔[۱]

اس ابتدائی محاسبۂ نفس اور غور وفکر کے بعد فرمایا اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝۲۰ اس جگہ حرف اَمْ بمعنے بَلْ ہے (قرطبی) معنے یہ ہیں کہ یہ بات نہیں کہ ہُد ہُد کے دیکھنے میں میری نظر نے خطاء کی بلکہ وہ حاضر ہی نہیں۔

طیور میں سے ہُد ہُد کی تخصیص کی وجہ اور ایک اہم عبرت

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ تمام پرندوں میں ہدہد کی تفتیش کی کیا وجہ پیش آئی؟ تو آپ نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے کسی ایسے مقام میں قیام فرمایا جہاں پانی نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہُد ہُد کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ زمین کے اندر کی چیزوں کو اور زمین کے اندر بہنے والے چشموں کو دیکھ لیتا ہے۔ مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ تھا کہ ہُد ہُد سے یہ معلوم کریں کہ اس میدان میں پانی کتنی گہرائی میں ہے اور کس جگہ زمین کھود کر پانی کافی مِل سکتا ہے۔ ہُد ہُد کی اس نشاندہی کے بعد وہ جنّات کو حکم دیدیتے کہ اس زمین کو کھود کر پانی نکالو وہ بڑی جلد کھود کر پانی نکال لیتے تھے۔ ہُد ہُد اپنی اتنی تیز نظر اور بصیرت کے باوجود شکاری کے جال میں پھنس جاتا ہے اس پر حضرت ابنِ[۲] عباسؓ نے فرمایا:-

قِفْ يَا وَقَّافُ كَيْفَ يَرَى الْهُدْهُدُ بَاطِنَ الْاَرْضِ وَهُوَ لَا يَرَى الْفَخَّ حِيْنَ يَقَعُ فِيْهِ۔ (قرطبی)[۳]

جاننے والو اس حقیقت کو پہچانو کہ ہدہد زمین کی گہرائی کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے مگر زمین کے اوپر پھیلا

---

[۱] تفسير القرطبي ج:۱۳ ص:۱۷۹، واحكام القرآن لابن العربيؒ ج:٦ ص:۲۰٦

[۲] یہاں بظاہر معمولی تسامح ہوا ہے۔ قف یا وقاف الخ کا جملہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا نہیں، نافع بن الازرق کا سوال ہے جس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: ''اِذَا جَاءَ الْقَدَرُ عَمِيَ الْبَصَرُ'' یعنی جب تقدیر آجاتی ہے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ (دیکھئے تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۶۰) محمد تقی عثمانی ۳/ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

[۳] تفسير القرطبي ج:۱۳ ص:۱۷۸

ہوا جال اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے جس میں پھنس جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو امر تکلیف یا راحت کا کسی کے لئے مقدر کر دیا ہے تو تقدیرِ الٰہی نافذ ہو کر رہتی ہے کوئی شخص اپنی فہم و بصیرت یا زور و زر کی طاقت کے ذریعہ اُس سے نہیں بچ سکتا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ، ابتدائی غور و فکر کے بعد یہ حاکمانہ سیاست کا مظاہرہ ہے کہ غیر حاضر رہنے والے کو سزا دی جائے۔

جو جانور کام میں سُستی کرے اس کو معتدل سزا دینا جائز ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے حق تعالیٰ نے جانوروں کو ایسی سزائیں دینا حلال کر دیا تھا جیسا عام اُمتوں کے لئے جانوروں کو ذبح کر کے ان کے گوشت پوست وغیرہ سے فائدہ اُٹھانا اب بھی حلال ہے۔ اسی طرح پالتو جانور گائے، بیل، گدھا، گھوڑا، اونٹ وغیرہ اپنے کام میں سُستی کرے اُس کو تادیب کے لئے بقدرِ ضرورت مارنے کی معتدل سزا اب بھی جائز ہے۔ دوسرے جانوروں کو سزا دینا ہماری شریعت میں ممنوع ہے۔ (قرطبی) [1]

اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ یعنی اگر ہُد ہُد نے اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر واضح پیش کر دیا تو وہ اس سزا سے محفوظ رہے گا۔ اس میں اشارہ ہے کہ حاکم کو چاہئے کہ جن لوگوں سے کوئی قصورِ عمل میں سرزد ہو جائے اُن کو عذر پیش کرنے کا موقع دے، عذر صحیح ثابت ہو تو سزا کو معاف کر دے۔

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ، یعنی ہُد ہُد نے اپنا عذر بتلاتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ چیز معلوم ہے جو آپ کو معلوم نہیں، یعنی میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے علم نہیں تھا۔

انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے جس سے اُن کو ہر چیز کا علم ہو سکے۔ [2]

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ سَبَاء، یمن کا ایک مشہور شہر جس کا ایک نام مآرب بھی ہے، اُس کے اور یمن کے دار الحکومت صنعاء کے درمیان تین دن کی مسافت تھی۔

کیا چھوٹے آدمی کو یہ حق ہے کہ اپنے بڑوں سے کہے کہ مجھے آپ سے زیادہ علم ہے

ہُد ہُد کی مذکورہ گفتگو سے بعض لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ کوئی شاگرد اپنے استاد سے یا غیر عالم، عالم سے

[1] تفسیر القرطبی (باختصار) ج:۱۳ ص:۱۸۰ [2] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۸۱

کہہ سکتا ہے کہ اس مسئلہ کا علم مجھے آپ سے زیادہ ہے بشرطیکہ اس کو اس مسئلہ کا واقعی طور پر مکمل علم دوسروں سے زائد ہو۔ مگر روح المعانی میں فرمایا کہ یہ طرز گفتگو اپنے مشائخ اور بڑوں کے سامنے خلافِ ادب ہے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ اور ہُدہُد کے قول سے اس پر استدلال اس لئے نہیں ہوسکتا کہ اُس نے یہ بات اپنے آپ کو سزا سے بچانے اور عذر کے قوی ہونے کے لئے کہی ہے تا کہ اس کی غیر حاضری کا عُذر پوری طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آجائے [1] ایسی ضرورت میں ادب کی رعایت رکھتے ہوئے کوئی بات کی جائے تو مضائقہ نہیں۔

اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَۃً تَمْلِکُھُمْ، یعنی میں نے ایک عورت کو پایا جو قوم سبا کی مالک ہے یعنی اُن پر حکومت کرتی ہے۔ اس عورت یعنی ملکہ سبا کا نام تاریخ میں بلقیس بنت شراحیل بتلایا گیا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کی والدہ جِنّات میں سے تھی جس کا نام بلعمہ بنت شیصان بتلایا جاتا ہے (رواه وهيب بن جرير عن الخليل بن احمد۔ قرطبی) [2] اور اُن کا دادا ہُداہد پورے ملکِ یمن کا ایک عظیم الشان بادشاہ تھا جس کی اولاد میں چالیس لڑکے ہوئے سب کے سب مُلوک اور بادشاہ بنے۔ ان کے والد سراح نے ایک جنّیہ عورت سے نکاح کرلیا تھا اُسی کے بطن سے بلقیس پیدا ہوئی۔ جنّیہ سے نکاح کرنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ اپنی حکومت وسلطنت کے غرور میں لوگوں سے کہتا تھا کہ تم میں کوئی میرا کفو نہیں اس لئے میں نکاح ہی نہ کروں گا کیونکہ غیر کفو میں نکاح مجھے پسند نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اس کا نکاح ایک جنّیہ عورت سے کرادیا (قرطبی) [3] شاید یہ اُسی فخر وغرور کا نتیجہ تھا کہ اس نے انسانوں کو جو درحقیقت کفو تھے حقیر وذلیل سمجھا اور اپنا کفو تسلیم نہ کیا تو قدرت نے اس کا نکاح ایک ایسی عورت سے مقدر کردیا جو نہ اس کی کفو تھی نہ اس کی جنس وقوم سے تھی۔

کیا انسان کا نکاح جنّی عورت سے ہوسکتا ہے

اس معاملہ میں بعض لوگوں نے تو اس لئے شبہ کیا ہے کہ جنّات کو انسان کی طرح توالد وتناسل کا اہل نہیں سمجھا۔ ابن عربی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہ خیال باطل ہے۔ [4] احادیث صحیحہ سے جِنّات میں توالد وتناسل اور مرد وعورت کی تمام وہ خصوصیات جو انسانوں میں ہیں جنّات میں بھی موجود ہونا ثابت ہے۔

دوسرا سوال شرعی حیثیت سے ہے کہ کیا عورت جنّیہ کسی انسان مرد کے لئے نکاح کرکے حلال ہوسکتی ہے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بہت حضرات نے جائز قرار دیا ہے، بعض نے غیر جنس مثل جانوروں کے ہونے کی بناء پر حرام فرمایا ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل ''آکام المرجان فی احکام الجان'' میں مذکور ہے اُس میں بعض ایسے واقعات بھی ذکر کئے

[1] روح المعانی (بالإختصار) ج:١٤ ص:٣٤٩ [2] تفسیر القرطبی ج:١٣ ص:١٨٢، ١٨٣

[3] تفسیر القرطبی تحت الآیۃ رقم:٢٣، ج:١٣ ص:٢١١ [4] احکام القرآن لابن العربیؒ ج:٦ ص:٢١٠

ہیں کہ مسلمان مرد سے مسلمان جنّیہ کا نکاح ہوا اور اُس سے اولاد بھی ہوئی۔ یہاں یہ مسئلہ اس لئے زیادہ قابلِ بحث نہیں کہ نکاح کرنے والا بلقیس کا والد مسلمان ہی نہ تھا اس کے عمل سے کوئی استدلال جواز یا عدم جواز پر نہیں ہوسکتا۔ اور چونکہ شرع اسلام میں اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے اور بلقیس کے والد انسان تھے اس لئے بلقیس انسان ہی قرار پائے گی۔ اس لئے بعض روایات میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بلقیس سے نکاح کرنا مذکور ہے، اگر وہ روایت صحیح ہو تو بھی اس سے نکاح جنّیہ کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا کیونکہ بلقیس خود جنّیہ نہ تھیں اگرچہ اُن کی والدہ جنّیہ ہو۔ واللہ اعلم اور نکاح سلیمان علیہ السلام کے متعلق مزید بیان آگے آئے گا۔

کیا کسی عورت کا بادشاہ ہونا یا کسی قوم کا امیر و امام ہونا جائز ہے؟

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے اپنے ملک کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو بنا دیا ہے تو آپ نے فرمایا لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً، [۱] یعنی وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے اقتدار کا مالک عورت کو بنا دیا۔ اسی لئے علماءِ اُمّت اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کو امامت و خلافت یا سلطنت و حکومت سپرد نہیں کی جاسکتی، بلکہ نماز کی امامت کی طرح امامتِ کبریٰ بھی صرف مَردوں کو سزاوار ہے۔ رہا بلقیس کا ملکۂ سبا ہونا تو اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہوسکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے خود نکاح اور پھر اس کو حکومت و سلطنت پر برقرار رکھا، اور یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جس پر احکامِ شرعیہ میں اعتماد کیا جاسکے۔

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ، مراد یہ ہے کہ سب ضروری سامان جو کسی بادشاہ و امیر کو درکار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے مطابق ہوسکتا ہے موجود تھا جو چیزیں اُس زمانے میں ایجاد ہی نہ ہوئی تھیں اُن کا نہ ہونا اس آیت کے منافی نہیں۔

وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ عَرْش کے لفظی معنے تختِ سلطنت کے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ عرشِ بلقیس کا طول اسّی ۸۰ ہاتھ اور عرض چالیس ہاتھ اور بلندی تیس ۳۰ ہاتھ تھی جس پر موتی اور یاقوت احمر، زبرجد، اخضر کا کام تھا اور اس کے پائے موتیوں اور جواہرات کے تھے اور پردے ریشم اور حریر کے، اندر باہر یکے بعد دیگر سات مقفّل عمارتوں میں محفوظ تھا۔ [۲]

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ، معلوم ہوا کہ اس کی قوم نجوم پرست تھی آفتاب کی عبادت کرتی تھی، بعض نے

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلٰی کسریٰ وقیصر ج:۲ ص:۶۳۷

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۸۴

فرمایا کہ مجوس میں سے تھی جو آگ اور ہر روشنی کی پرستش کرتے ہیں۔ (قرطبی) [۱]

اَلَّا يَسْجُدُوْا کا تعلق زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ یا فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ سے ہے یعنی شیطان نے اُن کے ذہنوں میں یہی بٹھلا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں یا یہ کہ اُن کو حق کے راستہ سے اس طرح روک دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں۔

تحریر اور خط بھی عام معاملات میں حجتِ شرعیہ ہے

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے نام خط بھیجنے کو اس پر اتمامِ حجت کے لئے کافی سمجھا اور اسی پر عمل فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام معاملات میں تحریر و خط قابلِ اعتبار ثبوت ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے صرف اُن مواقع میں خط کو کافی نہیں سمجھا جہاں شہادت شرعیہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ خط اور ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ شہادت نہیں لی جاسکتی۔ شہادت کا مدار شاہد کا عدالت کے سامنے آکر بیان دینے پر رکھا گیا جس میں بڑی حکمتیں مضمر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بھی دُنیا کی کسی عدالت میں خط اور ٹیلیفون پر شہادت لینے کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔

مشرکین کو خط لکھنا اور اُن کے پاس بھیجنا جائز ہے

دوسرا مسئلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خط سے یہ ثابت ہوا کہ تبلیغِ دین اور دعوتِ اسلام کے لئے مشرکین اور کفار کو خطوط لکھنا جائز ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مختلف کفار کو خطوط بھیجنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

انسانی اخلاق کی رعایت ہر مجلس میں چاہئے اگرچہ وہ مجلس کفار ہی کی ہو

فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد سے نامہ بری کا کام لیا تو اس کو یہ ادب مجلس بھی سکھایا کہ خط ملکۂ سبا کو پہنچا کر وہیں سر پر سوار نہ رہے بلکہ وہاں سے ذرا ہٹ جائے جو عام شاہی مجلسوں کا طریقہ ہے۔ اس میں آدابِ معاشرت اور انسانی اخلاق کا عام مخلوقات کے ساتھ مطلوب ہونا معلوم ہوا۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ

کہنے لگی اے دربار والو میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزّت کا وہ خط ہے سلیمان کی طرف سے

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۸۴

وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ

اور وہ یہ ہے شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے کہ زور نہ کرو میرے مقابلہ میں اور چلے آؤ میرے سامنے

مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً

حکم بردار ہوکر کہنے لگی اے دربار والو مشورہ دو مجھ کو میرے کام میں میں طے نہیں کرتی

اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ

کوئی کام تمہارے حاضر ہونے تک وہ بولے ہم لوگ زورآور ہیں اور سخت لڑائی والے

وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا

اور کام تیرے اختیار میں ہے سو تو دیکھ لے جو حکم کرے کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں

قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾

کسی بستی میں اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں کے سرداروں کو بے عزت اور ایسا ہی کچھ کریں گے

وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور میں بھیجتی ہوں اُن کی طرف کچھ تحفہ پھر دیکھتی ہوں کیا جواب لے کر پھرتے ہیں بھیجے ہوئے

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ

پھر جب پہنچا سلیمان کے پاس بولا کیا تم میری اعانت کرتے ہو مال سے، سو جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے بہتر ہے اس سے جو تم کو دیا ہے،

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ

بلکہ تم ہی اپنے تحفہ سے خوش رہو پھر جا اُن کے پاس اب ہم پہنچتے ہیں اُن پر ساتھ لشکروں کے

لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

جن کا مقابلہ نہ ہو سکے اُن سے اور نکال دیں گے اُن کو وہاں سے بے عزّت کر کے اور وہ خوار ہوں گے

آسان ترجمۂ قرآن

(چنانچہ ہدہد نے ایسا ہی کیا اور) ملکہ نے (اپنے درباریوں سے) کہا: ''قوم کے سردارو! میرے سامنے ایک باوقار خط ڈالا گیا ہے، ﴿۲۹﴾ وہ سلیمان کی طرف سے آیا ہے، اور وہ اللہ کے نام سے شروع کیا گیا ہے جو رحمٰن و رحیم ہے، ﴿۳۰﴾ (اُس میں لکھا ہے) کہ: ''میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو، اور میرے پاس تابع دار بن کر چلے آؤ۔'' ﴿۳۱﴾ ملکہ نے کہا: ''قوم کے سردارو! جو مسئلہ میرے سامنے آیا ہے، اُس میں مجھے فیصلہ کن مشورہ دو۔ میں کسی مسئلے کا حتمی فیصلہ اُس وقت تک نہیں کرتی جب تک تم میرے پاس موجود نہ ہو۔'' ﴿۳۲﴾ انہوں نے کہا: ''ہم طاقت ور اور ڈٹ کر لڑنے والے لوگ ہیں، آگے معاملہ آپ کے سپرد ہے، اب آپ دیکھ لیں کہ کیا حکم دیتی ہیں۔'' ﴿۳۳﴾ ملکہ بولی: ''حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں گھس آتے ہیں تو اُسے خراب کر ڈالتے ہیں، اور اُس کے باعزت باشندوں کو ذلیل کر کے چھوڑتے ہیں، اور یہی کچھ یہ لوگ بھی کریں گے۔ ﴿۳۴﴾ اور میں ان کے پاس ایک تحفہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھوں گی کہ ایلچی کیا جواب لے کر واپس آتے ہیں؟'' ﴿۳۵﴾ چنانچہ جب ایلچی سلیمان کے پاس پہنچا تو اُنہوں نے کہا: ''کیا تم مال سے میری امداد کرنا چاہتے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ اُس سے کہیں بہتر ہے جو تمہیں دیا ہے، البتہ تم ہی لوگ اپنے تحفے پر خوش ہوتے ہو۔ ﴿۳۶﴾ اُن کے پاس واپس جاؤ، کیونکہ اب ہم اُن کے پاس ایسے لشکر لے کر پہنچیں گے جن کے مقابلے کی اُن میں تاب نہیں ہوگی، اور اُنہیں وہاں سے اس طرح نکالیں گے کہ وہ ذلیل ہوں گے، اور ماتحت بن کر رہیں گے۔'' ﴿۳۷﴾

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے ہُد ہُد سے یہ گفتگو کر کے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون آگے قرآن میں مذکور ہے اور ہُد ہُد کے حوالہ کیا وہ اس کو چونچ میں لے کر چلا اور اکیلے یا مجلس میں بلقیس کے پاس ڈال دیا) بلقیس نے (پڑھ کر اپنے سرداروں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور) کہا کہ اے اہلِ دربار میرے پاس ایک خط (جس کا مضمون نہایت) باوقعت (اور عظیم الشان ہے) ڈالا گیا ہے (باوقعت اس لئے کہا کہ حاکمانہ مضمون ہے جس میں باوجود انتہائی اختصار کے اعلیٰ درجہ کی

بلاغت ہے اور) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں یہ (مضمون) ہے (اوّل) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (اور اس کے بعد یہ کہ) تم لوگ (یعنی بلقیس اور سب ارکانِ بادشاہت جن کے ساتھ عوام بھی وابستہ ہیں) میرے مقابلہ میں تکبر مت کرو اور میرے پاس تابعدار ہو کر چلے آؤ۔ (مقصود تمام کو دعوت دینا ہے اور یہ لوگ سلیمان علیہ السلام کا یا تو پہلے حال سُن چکے ہوں گے گو سلیمان علیہ السلام ان لوگوں کو نہ جانتے ہوں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے چھوٹوں کو نہیں جانتے اور چھوٹے بڑوں کو جانا کرتے ہیں اور یا خط آنے کے بعد تحقیق کر لیا ہوگا اور خط کے مضمون کی اطلاع دینے کے بعد) بلقیس نے (یہ) کہا کہ اے اہلِ دربار تم مجھ کو میرے اس معاملہ میں رائے دو (کہ مجھ کو سلیمان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے) اور میں (کبھی) کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو (اور اس میں شریک و مشیر نہ ہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم (اپنی ذات سے ہر طرح سے حاضر ہیں، اگر مقابلہ اور لڑنا مصلحت سمجھا جائے تو ہم) بڑے طاقتور اور بڑے لڑنے والے ہیں (اور آگے) اختیار تم کو ہے سو تم ہی (مصلحت) دیکھ لو جو کچھ (تجویز کر کے) حکم دینا ہو۔ بلقیس کہنے لگی کہ (میرے نزدیک لڑنا تو مصلحت نہیں کیونکہ سلیمان بادشاہ ہیں اور) بادشاہوں (کا قاعدہ ہے کہ وہ) جب کسی بستی میں (مخالفانہ طور پر) داخل ہوتے ہیں تو اُس کو تہ و بالا کر دیتے ہیں اور اُس کے رہنے والوں میں جو عزّت دار ہیں ان کو (ان کا زور گھٹانے کے لئے) ذلیل (وخوار) کیا کرتے ہیں اور (اُن سے لڑائی کی جائے تو ممکن ہے کہ ان ہی کو غلبہ ہو تو پھر) یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے (تو بے ضرورت پریشانی میں پڑنا خلافِ مصلحت ہے لہٰذا جنگ کو تو ابھی ملتوی کیا جائے) اور (سرِدست یوں مناسب ہے کہ) میں ان لوگوں کے پاس کچھ ہدیہ (کسی آدمی کے ہاتھ بھیجتی ہوں) پھر دیکھوں گی کہ وہ بھیجے ہوئے (وہاں سے) کیا (جواب) لے کر آتے ہیں (اس وقت دوبارہ غور کیا جائے گا۔ چنانچہ ہدیوں اور تحفوں کا سامان درست ہوا اور قاصد اس کو لے کر روانہ ہوا) جب وہ قاصد سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا (اور تمام ہدیے پیش کئے) تو سلیمان (علیہ السلام نے) فرمایا کیا تم لوگ (یعنی بلقیس اور بلقیس والے) مال سے میری امداد کر (نا چاہ) تے ہو (اس لئے ہدیے لائے ہو) سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم کو دے رکھا ہے (کیونکہ تمہارے پاس صرف دُنیا ہے اور میرے پاس دین بھی اور دُنیا بھی تم سے زیادہ، لہٰذا میں تو ان چیزوں کا حریص نہیں ہوں) ہاں تم ہی اپنے ہدیے پر فخر کرتے ہو گے (لہٰذا یہ ہدیے ہم نہ لیں گے) تم (ان کو لے کر) ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ (اگر وہ اب بھی ایمان لے آئیں تو درست ورنہ) ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے ان کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ (ذلّت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے) ماتحت (اور رعایا) ہو جائیں گے (یہ نہیں کہ نکالنے کے بعد آزادی سے چھوڑ دیئے جائیں کہ جہاں چاہیں چلے جائیں بلکہ ہمیشہ کی ذلت ان کے لئے لازمی ہو جائے گی)۔

معارف و مسائل

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ کریم کے لفظی معنی معزز مکرم کے ہیں اور محاورہ میں کسی خط کو معزز مکرم جب کہا جاتا ہے جبکہ اُس پر مہر لگائی گئی ہو۔ اسی لئے اس آیت میں كِتٰبٌ كَرِيْمٌ کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، زہیرؒ وغیرہ نے کتاب مختوم سے کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط پر اپنی مہر ثبت فرمائی تھی۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ملوکِ عجم کی یہ عادت معلوم ہوئی کہ جس خط پر مہر نہ ہو اُس کو نہیں پڑھتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کے خطوط کے لئے مہر بنائی اور قیصر و کسریٰ وغیرہ کو جو خطوط تحریر فرمائے اُن پر مہر ثبت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خط پر مہر لگانا مکتوب الیہ کا بھی اکرام ہے اور اپنے خط کا بھی۔ آج کل عادت خط کو لفافہ میں بند کر کے بھیجنے کی ہوگئی ہے یہ بھی مہر کے قائم مقام ہے۔ جس جگہ مکتوب الیہ کا اکرام منظور ہو، کھلا خط بھیجنے کے بجائے لفافہ میں بند کر کے بھیجنا اقرب الی السُّنَّة ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط کس زبان میں تھا؟

حضرت سلیمان علیہ السلام گو عربی نہ تھے لیکن عربی زبان جاننا اور سمجھنا آپ سے کوئی بعید بھی نہیں۔ جبکہ آپ پرندوں تک کی زبان جانتے تھے اور عربی زبان تو تمام زبانوں سے افضل و اشرف ہے لہٰذا ہوسکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ علیہ السلام نے خط عربی زبان میں لکھا ہو کیونکہ مکتوب الیہ (بلقیس) عربی النسل تھی اس نے خط کو پڑھا بھی اور سمجھا بھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط اپنی ہی زبان میں تحریر فرمایا ہو اور بلقیس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبان کا ترجمان ہو جس نے پڑھ کر خط سُنایا اور سمجھایا ہو۔ (روح)[1]

خط نویسی کے چند آداب

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر ہدایات نہ دی ہوں۔ خط و کتابت اور مراسلت کے ذریعہ باہمی گفت و شنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے۔ اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکۂ سبا (بلقیس) پورا کا پورا نقل فرمایا گیا۔ یہ ایک پیغمبر و رسول کا خط ہے اور قرآن کریم نے اس کو بطور استحسان کے نقل کیا ہے اس لئے اس خط میں جو ہدایات خط و کتابت کے معاملے میں پائی جاتی ہیں وہ مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ اتباع ہیں۔

[1] روح المعانی ج: ۱۴ ص: ۴۶۳

کاتب اپنا نام پہلے لکھے پھر مکتوب الیہ کا

سب سے پہلی ایک ہدایت تو اس خط میں یہ ہے کہ خط کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام سے شروع کیا، مکتوب الیہ کا نام کس طرح لکھا قرآن کریم کے الفاظ میں وہ مذکور نہیں۔ مگر اتنی بات اس سے معلوم ہوئی کہ خط لکھنے والے کے لئے سنتِ انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے جس میں بہت سے فوائد ہیں۔ مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آجائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تاکہ وہ اُسی ماحول میں خط کے مضمون کو پڑھے اور غور کرے مخاطب کو یہ تکلیف نہ اُٹھانی پڑے کہ کاتب کا نام خط میں تلاش کرے کہ کس کا خط ہے کہاں سے آیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے مکاتیب منقول اور شائع شدہ عالم میں موجود ہیں اُن سب میں بھی آپ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ [1] (مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) سے شروع فرمایا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی اپنے چھوٹے کو خط لکھے اس میں تو اپنے نام کی تقدیم پر کوئی اشکال نہیں، لیکن کوئی چھوٹا اپنے باپ، اُستاد، شیخ یا اور کسی بڑے کو خط لکھے اُس میں اپنے نام کو مقدّم کرنا کیا اس کے ادب کے خلاف نہ ہوگا اور اس کو ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟ اس معاملے میں حضرات صحابہ کرام کا عمل مختلف رہا ہے اکثر حضرات نے تو اتباعِ سنتِ نبوی کو ادب پر مقدم رکھ کر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطوط لکھے اُن میں بھی اپنے نام کو مقدم لکھا ہے۔ رُوح المعانی میں بحر محیط کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

مَا كَانَ اَحَدٌ اَعْظَمَ حُرْمَةً مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ اَصْحَابُهٗ اِذَا كَتَبُوْا اِلَيْهِ كِتَابًا بَدَأُوْا بِاَنْفُسِهِمْ قُلْتُ وَكِتَابُ عَلَاءِ الْحَضْرَمِيِّ يَشْهَدُ لَهٗ عَلٰى مَا رُوِيَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی انسان قابلِ تعظیم نہیں، مگر صحابہ کرام جب آپ کو بھی خط لکھتے تو اپنا نام ہی شروع میں لکھا کرتے تھے اور حضرت علاء حضرمی کا خط جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام معروف ہے، وہ اس پر شاہد ہے۔

البتہ روح المعانی میں مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ سب کلام افضلیت میں ہے جواز میں نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا نام شروع کے بجائے اخیر میں لکھ دے تو یہ بھی جائز ہے۔ فقیہ ابواللیث کی بستان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مکتوب الیہ کے نام سے شروع کردے تو اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ اُمت میں یہ طریقہ بھی چلا آرہا ہے اس پر نکیر نہیں کی گئی۔ (رُوح المعانی وقرطبی) [2]

---

[1] ترجمہ: اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی طرف سے۔

[2] روح المعانی ج:۱۴ ص:۴۶۶، وتفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۹۲، ۱۹۳

خط کا جواب دینا بھی سنتِ انبیاء ہے

تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اُس کے لئے مناسب ہے کہ اُس کا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے اِسی لئے حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ وہ خط کے جواب کو جوابِ سلام کی طرح واجب قرار دیتے تھے۔ (قرطبی)[1]

خطوط میں بسم اللہ لکھنا

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مذکورہ خط سے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مکاتیب سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ خط کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنا سنتِ انبیاء ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو اپنے نام سے پہلے لکھے یا بعد میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اس پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدم، اس کے بعد کاتب کا نام، پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے۔ اور قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اور بسم اللہ بعد میں مذکور ہے اس کے ظاہر سے جواز اس کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ اپنے نام کے بعد لکھی جائے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اس طرح لکھا تھا:

[2] بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - مِنْ سُلَيْمَانُ بْنِ دَاوٗدَ اِلٰى بِلْقِيْسَ ابْنَةِ ذِيْ شَرْحٍ وَقَوْمِهَا۔ اَنْ لَّا تَعْلُوْا الخ بلقیس نے جب یہ خط اپنی قوم کو سُنایا تو اُس نے قوم کی آگاہی کے لئے سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا۔ قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بلقیس کا قول ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصل خط میں بسم اللہ مقدم تھی یا سلیمان علیہ السلام کا نام۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا نام لفافہ کے اُوپر لکھا ہو اور اندر بسم اللہ سے شروع ہو، بلقیس نے جب اپنی قوم کو خط سُنایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا۔

مسئلہ:- خط نویسی کی اصل سنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے، لیکن قرآن وسنت کے نصوص واشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے اگر اُس جگہ اُس کاغذ کے بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور ایسی چیز میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہو جائے گا۔ آج کل جو عموماً ایک دوسرے

---

۱ تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۹۳

۲ ترجمہ: شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ سلیمان بن داؤد کی طرف سے ذی شرح کی بیٹی بلقیس اور اس کی قوم کی طرف۔

کو خطوط لکھے جاتے ہیں ان کا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ ادائے سنت کے لئے زبان سے بسم اللہ کہہ لے تحریر میں نہ لکھے۔

ایسی تحریر جس میں کوئی آیتِ قرآنی لکھی ہو، کیا کسی کافر مشرک کے ہاتھ میں دینا جائز ہے؟

یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اس وقت بھیجا جبکہ وہ مسلمان نہیں تھیں حالانکہ اس خط میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ملوک عجم کو لکھے ہیں اور وہ مشرک تھے، اُن میں بعض آیاتِ قرآن لکھی ہیں۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا کسی کافر کے ہاتھ میں دینا تو جائز نہیں لیکن ایسی کوئی کتاب یا کاغذ جس میں کسی مضمون کے ضمن میں کوئی آیت آگئی ہے وہ عرف میں قرآن نہیں کہلاتا اس لئے اس کا حکم بھی قرآن کا حکم نہیں ہوگا وہ کسی کافر کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں اور بے وضو کے ہاتھ میں بھی۔ [۱] (عالمگیری کتاب الحظر والاباحۃ)

خط مختصر، جامع، بلیغ اور مؤثر انداز میں لکھنا چاہئے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس والا نامہ کو دیکھئے تو چند سطروں میں تمام اہم اور ضروری مضامین بھی جمع کر دیئے اور بلاغت کا اعلیٰ معیار بھی قائم ہے۔ کافر کے مقابلے میں اپنی شاہانہ شوکت کا اظہار بھی ہے۔ اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا بیان اور اسلام کی طرف دعوت بھی، اور ترفّع و تکبّر کی مذمّت بھی۔ درحقیقت یہ خط بھی اعجازِ قرآنی کا ایک نمونہ ہے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ خط نویسی میں انبیاء علیہم السلام کی سنت بھی وہی ہے کہ تحریر میں طول نہ ہو، مگر ضروری کوئی مضمون چھوٹے بھی نہیں۔ [۲] (روح المعانی)

اہم اُمور میں مشورہ کرنا سنت ہے اس میں دوسروں کی رائے سے فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور لوگوں کی دلجوئی بھی ہوتی ہے

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ اَفْتُوْنِيْ، فتویٰ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی خاص مسئلہ کا جواب دینا۔ یہاں مشورہ دینا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا مراد ہے۔ ملکہ بلقیس کو جب

---

[۱] عالمگیری، کتاب الکراھیۃ، الباب الخامس فی آداب المسجد والقبلۃ والمصحف وما کتب فیه شیءٌ من القرآن إلخ ج:۵ ص:۳۲۳ (بالإختصار)

[۲] روح المعانی ج:۱۴ ص:۴۶۷

حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پہنچا تو اُس نے اپنے ارکانِ حکومت کو جمع کر کے اس واقعہ کا اظہار کیا اور اُن سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس نے ان کی رائے دریافت کرنے سے پہلے اُن کی دلجوئی اور ہمت افزائی کے لئے یہ بھی کہا کہ "میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی" اسی کا نتیجہ تھا کہ فوج اور وزراء نے اس کے جواب میں اپنی مستعدی کے ساتھ تعمیلِ حکم کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کردی (نَحْنُ أُولُوا قُوَّةٍ وَّأُولُوا بَأْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْأَمْرُ إِلَيْكِ)۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ہم سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ بلقیس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان تین سو تیرہ تھے اور ان میں سے ہر ایک آدمی دس ہزار آدمیوں کا امیر اور نمائندہ تھا۔ (قرطبی) [1]

اس سے معلوم ہوا کہ اہم اُمور میں مشورہ لینے کا دستور پُرانا ہے۔ اسلام نے مشورہ کو خاص اہمیت دی اور عُمّالِ حکومت کو مشورہ کا پابند کیا۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو وحیِ الٰہی کے مورد تھے۔ اور آسمانی ہدایات آپ کو ملتی تھیں اس کی وجہ سے آپ کو کسی رائے مشورہ کی درحقیقت ضرورت نہ تھی، مگر اُمت کے لئے سنت قائم کرنے کے واسطے آپ کو بھی حکم دیا گیا ([2] وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ (آل عمران:۱۵۹)) یعنی آپ اہم اُمور میں صحابہ کرام سے مشورہ لیا کریں۔ اس میں صحابہ کرام کی دلجوئی اور عزت افزائی بھی ہے اور آئندہ آنے والے عُمّالِ حکومت کو اس کی تاکید بھی کہ مشورہ سے کام کیا کریں۔

مکتوبِ سلیمانی کے جواب میں ملکۂ بلقیس کا ردِّ عمل

اربابِ حکومت کو مشورہ میں شریک کر کے ان کا تعاون حاصل کر لینے کے بعد ملکۂ بلقیس نے خود ہی ایک رائے قائم کی جس کا حاصل یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتحان لے اور تحقیق کرے کہ وہ واقعی اللہ کے رسول اور نبی ہیں اور جو کچھ حکم دے رہے ہیں وہ اللہ کے احکام کی تعمیل ہے یا وہ ایک ملک گیری کے خواہشمند بادشاہ ہیں، اس امتحان سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر واقعی وہ نبی و رسول ہیں تو ان کے حکم کا اتباع کیا جائے اور مخالفت کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے اور اگر بادشاہ ہیں اور ملک گیری کی ہوس میں ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں تو پھر غور کیا جائے گا کہ ان کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس امتحان کا طریقہ اُس نے یہ تجویز کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس کچھ ہدیے تحفے بھیجے اگر وہ ہدیے تحفے لے کر راضی ہوگئے تو علامت اس کی ہوگی کہ وہ ایک بادشاہ ہی ہیں، اور اگر وہ واقع میں نبی و رسول ہیں تو وہ اسلام و ایمان کے بغیر کسی چیز پر راضی نہ ہوں گے، یہ مضمون ابن جریر نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، ابن جُریجؒ، ابن وہبؒ سے نقل کیا ہے اسی کا بیان اس آیت میں ہے:

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۹۴

[2] ترجمہ: اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے۔

وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ یعنی میں حضرت سلیمان اور اُن کے ارکان دولت کے پاس ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ جو قاصد یہ ہدیہ لے کر جائیں گے وہ واپس آ کر کیا صورتِ حال بیان کرتے ہیں۔

بلقیس کے قاصدوں کی دربارِ سلیمانی میں حاضری

تاریخی اسرائیلی روایات میں بلقیس کی طرف سے آنے والے قاصدوں اور تحفوں کی بڑی تفصیلات مذکور ہیں۔ اتنی بات پر سب روایات متفق ہیں کہ تحفہ میں کچھ سونے کی اینٹیں تھیں کچھ جواہرات اور ایک سو غلام اور ایک سو کنیزیں تھیں مگر کنیزوں کو مردانہ لباس میں اور غلاموں کو زنانہ لباس میں بھیجا تھا اور ساتھ ہی بلقیس کا ایک خط بھی تھا جس میں سلیمانؑ کے امتحان کے لئے کچھ سوالات بھی تھے، تحفوں کے انتخاب میں بھی ان کا امتحان مطلوب تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس کے تحفوں کی تفصیلات اُن کے پہنچنے سے پہلے بتلا دی تھیں۔ سلیمان علیہ السلام نے جنات کو حکم دیا کہ دربار سے نوفرسخ تقریباً تیس میل کی مسافت میں سونے چاندی کی اینٹوں کا فرش کر دیا جائے اور راستہ میں دو طرفہ عجیب الخلقت جانوروں کو کھڑا کر دیا جائے جن کا بول و براز بھی سونے چاندی کے فرش پر ہو۔ اسی طرح اپنے دربار کو خاص اہتمام سے مزیّن فرمایا، دائیں بائیں چار چار ہزار سونے کی کُرسیاں ایک طرف علماء کے لئے، دوسری طرف وزراء اور عمّالِ سلطنت کے لئے بچھائی گئیں۔ جواہرات سے پورا ہال مزین کیا گیا۔ بلقیس کے قاصدوں نے جب سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو کھڑا دیکھا تو اپنے تحفہ سے شرما گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنی سونے کی اینٹیں وہیں ڈال دیں، پھر جُوں جُوں آگے بڑھتے گئے دو طرفہ وُحوش وطیور کی صفیں دیکھیں، پھر جنّات کی صفیں دیکھیں تو بے حد مرعوب ہو گئے مگر جب دربار تک پہنچے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ خندہ پیشانی سے پیش آئے، اُن کی مہمانی کا اکرام کیا مگر اُن کے تحفے واپس کر دیئے اور بلقیس کے سب سوالات کے جوابات دیئے۔ (ملخصاً از تفسیر قرطبی) [1]

حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہدیۂ بلقیس کی واپسی

قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ یعنی جب بلقیس کے قاصد اس کے ہدایا اور تحفے لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچے تو اُنہوں نے قاصدوں سے فرمایا کہ کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اللہ نے جو مال و دولت دیا ہے وہ تمہارے مال و سامان سے کہیں زیادہ بہتر ہے اس لئے میں یہ مال کا ہدیہ قبول نہیں کرتا اس کو واپس لے جاؤ اور اپنے ہدیہ پر تم ہی خوش رہو۔

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۹۶ تا ۱۹۸

کسی کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے یا نہیں اس کی تفصیل و تحقیق

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں یا بہتر نہیں۔ اور تحقیق اس مسئلے میں یہ ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنے میں اگر اپنی یا مسلمانوں کی کسی مصلحت میں خلل آتا ہو یا ان کے حق میں رائے کی کمزوری پیدا ہوتی ہو تو ان کا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں۔ (روح المعانی) [1] ہاں اگر کوئی دینی مصلحت اس ہدیہ کے قبول کرنے کی داعی ہو، مثلاً اس کے ذریعہ کافر کے مانوس ہو کر اسلام سے قریب آنے پھر مسلمان ہونے کی اُمید ہو یا اُس کے کسی شر و فساد کو اس کے ذریعہ دفع کیا جا سکتا ہو تو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملے میں یہی رہی ہے کہ بعض کفار کا ہدیہ قبول فرمالیا، بعض کا رد کر دیا۔ عمدۃ القاری شرح بخاری کتاب الہبۃ میں اور شرح سیر کبیر میں حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ براء کا بھائی عامر بن ملک مدینہ طیبہ میں کسی ضرورت سے پہنچا جبکہ وہ مشرک کافر تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو گھوڑے اور دو جوڑے کپڑے کا ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے اس کا ہدیہ یہ فرما کر واپس کر دیا کہ ہم مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔ اور عیاض بن حماد مجاشعی نے آپ کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اُس سے سوال کیا کہ تم مسلمان ہو؟ اُس نے کہا کہ نہیں آپ نے ان کا ہدیہ بھی یہ کہہ کر رَد فرما دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے عطایا لینے سے منع فرمایا ہے اس کے بالمقابل یہ روایات بھی موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مشرکین کے ہدایا قبول فرمائے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابوسفیان نے بحالتِ شرک آپ کو ایک چمڑا ہدیہ میں بھیجا آپ نے قبول فرمالیا اور ایک نصرانی نے ایک ریشمی حریر کا بہت چمکتا ہوا کپڑا ہدیہ میں پیش کیا، آپ نے قبول فرمالیا۔

شمس الائمہؒ اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض کا ہدیہ رَد کر دینے میں اُس کے اسلام کی طرف مائل ہونے کی اُمید تھی وہاں رَد کر دیا اور بعض کا ہدیہ قبول کرنے میں اس کے مسلمان ہو جانے کی اُمید تھی تو قبول کر لیا۔ (از عمدۃ القاری کتاب الھبۃ) [2]

اور بلقیس نے جو رد ہدیہ کو نبی ہونے کی علامت قرار دیا اس کا سبب یہ نہ تھا کہ نبی کے لئے ہدیہ قبول کرنا مشرک کا جائز نہیں بلکہ سبب یہ تھا کہ اُس نے اپنا ہدیہ درحقیقت ایک رشوت کی حیثیت سے بھیجا تھا کہ اس کے ذریعہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حملے سے محفوظ رہے۔

[1] روح المعانی ج:۱۴ ص:۲۷۴

[2] عمدۃ القاری، کتاب الھبۃ، باب قبول الھبۃ من المشرکین ج:۲۰ ص:۱۵۸، وشرح السیر الکبیر، باب صلۃ المشرک ج:۱ ص:۱۰۷

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾

بولا اے دربار والو تم میں کوئی ہے کہ لے آوے میرے پاس اس کا تخت پہلے اس سے کہ وہ آئیں میرے پاس حکم بردار ہوکر

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ

بولا ایک دیو جنوں میں سے میں لائے دیتا ہوں وہ تجھ کو پہلے اس سے کہ تو اُٹھے اپنی جگہ سے

وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ

اور میں اس پر زورآور ہوں معتبر بولا وہ شخص جس کے پاس تھا ایک علم کتاب کا

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ

میں لائے دیتا ہوں تیرے پاس اس کو پہلے اس سے کہ پھر آئے تیری طرف تیری آنکھ، پھر جب دیکھا اُس کو دھرا ہوا اپنے پاس

قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ

کہا یہ میرے رَبّ کا فضل ہے میرے جانچنے کو کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری، اور جو کوئی شکر کرے

فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا

سو شکر کرے اپنے واسطے اور جو کوئی ناشکری کرے سو میرا رَبّ بے پرواہ ہے کرم والا کہا روپ بدل دکھلاؤ اس عورت کے آگے

عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

اس کے تخت کا ہم دیکھیں سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کو سمجھ نہیں

آسان ترجمۂ قرآن

سلیمانؑ نے کہا: ”اے اہلِ دربار! تم میں سے کون ہے جو اُس عورت کا تخت ان کے تابع دار بن کر آنے سے پہلے

ہی میرے پاس لے آئے؟'' ۳۸ ایک قوی ہیکل جن نے کہا: ''آپ اپنی جگہ سے اُٹھے بھی نہ ہوں گے کہ میں اُس سے پہلے ہی اُسے آپ کے پاس لے آؤں گا، اور یقین رکھئے کہ میں اس کام کی پوری طاقت رکھتا ہوں، (اور) امانت دار بھی ہوں۔'' ۳۹ جس کے پاس کتاب کا علم تھا، وہ بول اُٹھا: ''میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی اُسے آپ کے پاس لے آتا ہوں۔'' چنانچہ جب سلیمان نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا: ''یہ میرے پروردگار کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری؟ اور جو کوئی شکر کرتا ہے، تو وہ اپنے ہی فائدے کے لئے شکر کرتا ہے، اور اگر کوئی ناشکری کرے تو میرا پروردگار بے نیاز ہے، کریم ہے۔'' ۴۰ سلیمان نے (اپنے خدام سے) کہا کہ: ''اس ملکہ کے تخت کو اس کے لئے اجنبی بنا دو، دیکھیں وہ اُسے پہچانتی ہے، یا وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو حقیقت تک نہیں پہنچتے؟'' ۴۱

خلاصۂ تفسیر

(غرض وہ قاصد اپنے ہدایا لے کر واپس گیا اور سارا قصہ بلقیس سے بیان کیا تو حالات سے اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم اور نبوّت کے کمالات کا یقین ہوگیا اور حاضر ہونے کے ارادہ سے اپنے ملک سے چلی) سلیمان (علیہ السلام) کو وحی سے یا اور کسی پرندے وغیرہ کے ذریعہ اس کا چلنا معلوم ہوا تو انہوں) نے (اپنے درباروالوں سے) فرمایا کہ اے درباروالوتم میں کوئی ایسا ہے جو اُس (بلقیس) کا تخت پہلے اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس مطیع ہوکر آئیں حاضر کردے (مسلمین کی قید اظہار واقعہ کے لئے ہے کیونکہ وہ لوگ اسی قصد سے آرہے تھے تخت کا منگانا غالبًا اس غرض سے ہے کہ وہ لوگ میرا معجزہ بھی دیکھ لیں کیونکہ اتنا بڑا تخت اور پھر اس کا ایسے سخت پہروں میں اس طور پر اچانک آجانا کہ اطلاع تک نہ ہو عادتِ بشریہ سے باہر ہے اگر جنوں کی تسخیر یعنی تابع ہونے سے ہو تب بھی جنوں کا خودبخود تابع ہوجانا بھی ایک معجزہ ہی ہے اور اگر کسی ولیِ اُمت کی کرامت کے ذریعہ ہے تو ولی کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہوتا ہے اور اگر بغیر کسی واسطہ کے ہے تو پھر معجزہ ہونا ظاہر ہے۔ بہرحال ہر طور پر یہ معجزہ اور نبوّت کی دلیل ہے لہٰذا مقصود یہ ہوگا کہ اندرونی کمالات کے ساتھ ساتھ یہ معجزہ کے کمالات بھی دیکھ لیں تاکہ ایمان واطمینان زیادہ ہو) ایک قوی ہیکل جن نے جواب (میں) عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا پہلے اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اُٹھیں اور (گو وہ بہت بھاری ہے مگر) میں اس (کے لانے) پر طاقت رکھتا ہوں (اور گو بڑا قیمتی اور موتیوں سے مزیّن ہے مگر میں) امانت دار (بھی) ہوں (اس میں کوئی خیانت نہ کروں گا) جس کے پاس کتاب (الٰہی یعنی تورات کا یا اور وحی کی ہوئی کسی کتاب کا جس میں اللہ کے ناموں کی تاثیرات ہوں اُس) کا علم تھا (اقرب یہ ہے کہ اس سے خود سلیمان علیہ السلام مراد ہیں غرض) اُس (علم والے) نے (اس جن سے) کہا کہ (بس تجھ میں تو اتنی ہی قوت ہے اور) میں اس کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لاکھڑا کرسکتا ہوں

(کیونکہ معجزہ کی طاقت سے لاؤں گا، چنانچہ آپ نے حق تعالیٰ سے دُعا کی ویسے ہی یا کسی اسمِ الٰہی کے ذریعہ سے اور تخت فوراً سامنے آموجود ہوا) جب سلیمان (علیہ السلام) نے اس کو اپنے روبرو دیکھا تو (خوش ہوکر شکر کے طور پر) کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے (کہ میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر کیا) تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا (خدانخواستہ) ناشکری کرتا ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں) اور (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے (وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میرا ربّ غنی ہے کریم ہے (اس کے بعد) سلیمان (علیہ السلام) نے (بلقیس کی عقل آزمانے کے لئے) حکم دیا کہ اس (کی عقل آزمانے) کے لئے اس کے تخت کی صورت بدل دو (جس کے بہت سے طریقے ہوسکتے ہیں مثلاً موتیوں کی جگہیں بدل دو یا کسی اور طرح) ہم دیکھیں اس کو اس کا پتہ لگتا ہے یا اُس کا اُنہیں میں شمار ہے جن کو (ایسی باتوں کا) پتہ نہیں لگتا (پہلی صورت میں معلوم ہوگا کہ وہ عقلمند ہے اور عقلمند سے حق بات سمجھنے کی زیادہ اُمید ہے اور اس کے حق کو پہچاننے کا اثر دُور تک بھی پہنچے گا اور دوسری صورت میں اس سے حق پہچاننے کی اُمید کم ہے)۔

معارف و مسائل

بلقیس کی حاضری دربارِ سلیمانی میں

قرطبی [۱] نے تاریخی روایات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلقیس کے قاصد خود بھی مرعوب ومبہوت ہوکر واپس ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اعلانِ جنگ سُنا دیا تو بلقیس نے اپنی قوم سے کہا کہ پہلے بھی میرا یہی خیال تھا کہ سلیمان دُنیا کے بادشاہوں کی طرح بادشاہ نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے کوئی خاص منصب بھی ان کو ملا ہے اور اللہ کے نبی ورسول سے لڑنا اللہ کا مقابلہ ہے، جس کی ہم میں طاقت نہیں۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضری کی تیاری شروع کردی۔ بارہ ہزار سرداروں کو اپنے ساتھ لیا جن کے تحت ایک ایک لاکھ افواج تھیں۔ [۲] حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بلقیس ان کی دعوت سے متأثر ہونے کی بناء پر مطیع بن کر آرہی ہے۔ تو ارادہ فرمایا کہ وہ شاہانہ قوت وشوکت کے ساتھ ایک پیغمبرانہ معجزہ بھی دیکھ لے تو اُس کے ایمان لانے کے لئے زیادہ معین ہوگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تسخیرِ جنات کا عام معجزہ عطا فرمایا ہوا تھا شاید حق تعالیٰ کی طرف سے اشارہ پاکر انہوں نے یہ ارادہ فرمایا

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۰۲، وانظر تفسیر روح المعانی ج:۱۴ ص:۴۷۷

[۲] حضرت مصنفؒ نے پہلے ہی فرمادیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں، جن پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، خاص طور سے یہ روایت بعید از عقل اور علامہ آلوسیؒ کے فرمانے کے مطابق جھوٹ سے زیادہ قریب ہے۔ محمد تقی ۱؍۱؍۱۴۲۳ھ

کہ کسی طرح بلقیس کا تخت شاہی اُس کے یہاں پہنچنے سے پہلے حاضر ہو جائے۔ اس لئے حاضرین کو جن میں جنات بھی تھے خطاب فرما کر یہ تخت لانے کے لئے فرمادیا اور اس کے تمام اموال و دولت میں تخت شاہی کا انتخاب بھی شاید اس لئے کیا گیا کہ وہ اس کی سب سے زیادہ محفوظ چیز تھی جس کو سات محلاّت شاہی کے وسط میں ایک محفوظ محل کے اندر مقفل کر کے رکھا تھا کہ اس کے اپنے آدمیوں کا بھی وہاں تک گزر نہ تھا۔ اُس کا بغیر دروازہ یا قفل توڑے ہوئے منتقل ہو جانا اور اتنی مسافتِ بعیدہ پر پہنچ جانا حق تعالیٰ شانہٗ کی ہی قدرتِ کاملہ سے ہوسکتا ہے یہ اس کو حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت عظیمہ پر یقین کا سب سے بڑا ذریعہ ہوسکتا تھا اُس کے ساتھ اس پر بھی یقین لازم تھا کہ سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے کوئی خاص منصب حاصل ہے کہ ان کے ہاتھ پر ایسی فوق العادت چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ (ذکرہ واختارہ ابن جریر) [1]

قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ مُسْلِمِيْنَ، مُسْلِمٌ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی مطیع وفرمانبردار کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں مؤمن کو مسلم کہا جاتا ہے۔ یہاں بقول ابن عباسؓ اُس کے لغوی معنی مراد ہیں، یعنی مطیع وفرمانبردار۔ کیونکہ ملکہ بلقیس کا اسلام لانا اس وقت ثابت نہیں بلکہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہونے اور کچھ گفتگو کرنے کے بعد مسلمان ہوئی ہے جیسا کہ خود قرآن کریم کے آنے والے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ، یعنی کہا اُس شخص نے جس کے پاس علم تھا کتاب میں سے۔ یہ کون شخص تھا؟ اس کے متعلق ایک احتمال تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم اُنہیں کو حاصل تھا۔ اس صورت میں یہ سارا معاملہ بطور معجزہ کے ہوا اور یہی مقصود تھا کہ بلقیس کو پیغمبرانہ اعجاز کا مشاہدہ ہو جائے اور کوئی اشکال اس معاملے میں نہ رہے۔ مگر اکثر ائمۂ تفسیر قتادہ وغیرہ سے ابنِ جریر نے نقل کیا ہے اور قرطبی نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے کہ یہ کوئی شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھا۔ [2] ابن اسحاق نے اس کا نام آصف بن بَرخیا بتلایا ہے اور یہ کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دوست تھا۔ اور بعض روایات کے اعتبار سے اُن کا خالہ زاد بھائی بھی تھا جس کو اسم اعظم کا علم تھا [3] جس کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جو بھی دُعا کی جائے قبول ہوتی ہے اور جو کچھ مانگا جائے اللہ کی طرف سے عطا کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسم اعظم کا علم نہیں تھا کیونکہ یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مصلحت اس میں دیکھی ہو کہ یہ عظیم کارنامہ ان کی اُمّت کے کسی آدمی کے ذریعہ ظاہر ہو جس سے بلقیس پر اور زیادہ اثر پڑے اس لئے بجائے خود یہ عمل کرنے

---

[1] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآیة ج:۱۹ ص:۴۶۳

[2] تفسیر الطبری ج:۱۹ ص:۴۶۵، ۴۶۶

[3] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۰۴

کے اپنے اصحاب کو خطاب فرمایا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ (کذا فی فصوص الحکم) اس صورت میں یہ واقعہ آصف بن بُرخیا کی کرامت ہوگی۔

معجزہ اور کرامت میں فرق

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى[1] (الانفال:۱۷)، اسی طرح کرامت میں بھی اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہوجاتا ہے۔ اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ وکرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارق عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے غیر نبی کے ذریعہ اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔ اس واقعہ میں اگر یہ روایت صحیح ہے کہ یہ عمل حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے آصف بن برخیا کے ذریعہ ہوا تو یہ اُن کی کرامت کہلائے گی اور ہر ولی کے کمالات چونکہ اُن کے رسول وپیغمبر کے کمالات کا عکس اور اُنہی سے مستفاد ہوتے ہیں اس لئے اُمت کے اولیاء اللہ کے ہاتھوں جتنی کرامتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے یہ سب رسول کے معجزات میں شمار ہوتے ہیں۔

تختِ بلقیس کا واقعہ کرامت تھی یا تصرّف

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اس کو آصف بن برخیا کا تصرف قرار دیا ہے۔ تصرف اصطلاح میں خیال ونظر کی طاقت استعمال کر کے حیرت انگیز کام صادر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے لئے نبی یا ولی بلکہ مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، وہ مسمریزم جیسا ایک عمل ہے۔ صوفیائے کرام نے اصلاحِ مریدین کے لئے کبھی کبھی اس کو استعمال کیا ہے۔ ابن عربی نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ تصرف کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام آصف بن برخیا سے لیا۔ مگر قرآنِ کریم نے اس تصرف کو عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کا نتیجہ بتلایا ہے اس سے ترجیح اس کو ہی ہوتی ہے کہ یہ کسی دُعا یا اسم اعظم کا اثر تھا جس کا تصرف سے کوئی واسطہ نہیں، وہ کرامت ہی کے مفہوم میں داخل ہے۔

رہا یہ شبہ کہ ان کا یہ کہنا کہ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ یعنی میں یہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے لادوں گا۔ یہ علامت اس کی ہے کہ یہ کام اُن کے قصد واختیار سے ہوا جو علامت تصرف کی ہے کیونکہ کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ تو اس کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اطلاع کردی ہو کہ تم ارادہ کرو گے تو ہم یہ کام اتنی جلدی کردیں گے۔ یہ تقریر حضرت سیّدی حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جو احکام القرآن میں سورۂ نمل کی

---

[1] ترجمہ: اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی۔

تفسیر لکھنے کے وقت حضرت نے ارشاد فرمائی تھی۔ اور تصرّف کی حقیقت اور اُس کے احکام پر حضرتؒ کا ایک مستقل رسالہ بنام "التصرّف" عربی زبان میں تھا، جس کا اُردو ترجمہ احقر نے لکھا تھا وہ جُدا گانہ شائع ہو چکا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ

پھر جب وہ آپہنچی کسی نے کہا کیا ایسا ہی ہے تیرا تخت بولی گویا یہ وہی ہے اور ہم کو معلوم ہو چکا

مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ

پہلے سے اور ہم ہو چکے حکم بردار اور روک دیا اس کو ان چیزوں سے جو پوجتی تھی اللہ کے سوائے

اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ

البتہ وہ تھی منکر لوگوں میں کسی نے کہا اس عورت کو اندر چل محل میں پھر جب دیکھا اس کو

حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ

خیال کیا کہ وہ پانی ہے گہرا اور کھولیں اپنی پنڈلیاں کہا یہ تو ایک محل ہے جڑے ہوئے ہیں

مِّنْ قَوَارِيْرَ ڛ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ

اس میں شیشے بولی اے ربّ میں نے بُرا کیا ہے اپنی جان کا اور میں حکم بردار ہوئی ساتھ سلیمان کے

لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع (ركوع ۳ / ۱۸)

اللہ کے آگے جو ربّ ہے سارے جہان کا

آسان ترجمۂ قرآن

غرض جب وہ آئی تو اُس سے پوچھا گیا: "کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟" کہنے لگی: "ایسا لگتا ہے کہ یہ تو بالکل وہی

ہے۔ہمیں تو اس سے پہلے ہی (آپ کی سچائی کا) علم عطا ہو گیا تھا، اور ہم سر جھکا چکے تھے۔'' ﴿۴۲﴾ اور (اب تک) اُس کو (ایمان لانے سے) اس بات نے روک رکھا تھا کہ وہ اللہ کے بجائے دوسروں کی عبادت کرتی تھی، آخر وہ ایک کافر قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ ﴿۴۳﴾ اُس سے کہا گیا کہ: ''اس محل میں داخل ہو جاؤ'' اُس نے جو دیکھا تو یہ سمجھی کہ یہ پانی ہے، اس لئے اُس نے (پائینچے چڑھا کر) اپنی پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے کہا کہ: ''یہ تو محل ہے جو شیشوں کی وجہ سے شفاف نظر آ رہا ہے۔'' ملکہ بول اُٹھی: ''میرے پروردگار! حقیقت یہ ہے کہ میں نے (اب تک) اپنی جان پر ظلم کیا ہے، اور اَب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رَبّ العالمین کی فرماں برداری قبول کر لی ہے۔'' ﴿۴۴﴾

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے یہ سب سامان کر رکھا تھا، پھر بلقیس پہنچی) سو جب بلقیس آئی تو اس سے (تخت دکھا کر) کہا گیا (خواہ سلیمان علیہ السلام نے خود کہا ہو یا کسی سے کہلوایا ہو) کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ ہاں ہے تو ویسا ہی (بلقیس سے اس طور پر اس لئے سوال کیا کہ ہیئت تو بدل دی گئی تھی اپنی اصل کے اعتبار سے تو وہی تخت تھا اور صورت وہ نہ تھی۔ اس لئے یوں نہیں کہا کہ کیا یہی تمہارا تخت ہے بلکہ یہ کہا کہ ایسا ہی تمہارا تخت ہے اور بلقیس اس کو پہچان گئی اور اس کے بدل دینے کو بھی سمجھ گئی اس لئے جواب بھی مطابق سوال کے دیا) اور (یہ بھی کہا کہ) ہم لوگوں کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی (آپ کی نبوّت کی) تحقیق ہو چکی ہے اور ہم (اُسی وقت سے دل سے) مطیع ہو چکے ہیں (جب قاصد سے آپ کے کمالات معلوم ہوئے تھے اس معجزہ کی چنداں حاجت نہ تھی) اور (چونکہ اس معجزہ سے قبل تصدیق واعتقاد کر لینا کمالِ عقل کی دلیل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کے عاقل ہونے کی تقریر فرماتے ہیں کہ فی الواقع وہ تھی سمجھ دار مگر چند روز تک جو ایمان نہ لائی تو وجہ اس کی یہ ہے کہ) اس کو (ایمان لانے سے) غیر اللہ کی عبادت نے (جس کی اس کو عادت تھی) روک رکھا تھا (اور وہ عادت اس لئے پڑ گئی تھی کہ) وہ کافر قوم میں کی تھی (پس جو سب کو دیکھا وہی آپ کرنے لگی اور قومی عادات اکثر اوقات انسان کے سوچنے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں مگر چونکہ عاقل تھی اس لئے جب تنبیہ کی گئی تو سمجھ گئی۔ اس کے بعد سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ علاوہ اعجاز وشانِ نبوّت دکھلانے کے اس کو ظاہری شانِ سلطنت بھی دکھلا دی جائے تاکہ اپنے کو دُنیا کے اعتبار سے بھی عظیم نہ سمجھے اس لئے ایک شیش محل بنوا کر اس کے صحن میں حوض بنوایا اور اس میں پانی اور مچھلیاں بھر کر اس کو شیشہ سے پاٹ دیا۔ اور شیشہ ایسا شفاف تھا کہ ظاہر نظر میں نظر نہ آتا تھا اور وہ حوض ایسے موقع پر تھا کہ اس محل میں جانے والے کو لامحالہ اُس پر سے عبور کرنا پڑے۔ چنانچہ اس تمام سامان کے بعد) بلقیس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو (ممکن ہے وہی قیام کے لئے تجویز کیا ہو، غرض وہ چلیں راہ میں حوض آیا) تو جب اس کا

صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور (چونکہ قرینہ سے پایاب گمان کیا اس لئے اس کے اندر گھسنے کے لئے دامن اُٹھائے اور) اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں (اس وقت) سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تو محل ہے جو (سب کا سب مع صحن) شیشوں سے بنایا گیا ہے (اور یہ حوض بھی شیشہ سے پٹا ہوا ہے۔ دامن اُٹھانے کی ضرورت نہیں اس وقت) بلقیس (کو معلوم ہوگیا کہ یہاں پر دُنیوی صنعت کاری کے عجائب بھی ایسے ہیں جو آج تک میں نے آنکھ سے نہیں دیکھے تو اُن کے دل میں ہر طرح سے سلیمان علیہ السلام کی عظمت پیدا ہوئی اور بے ساختہ) کہنے لگی کہ اے میرے پروردگار میں نے (اب تک) اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں (اب) سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی ان کے طریق پر) ہوکر ربّ العالمین پر ایمان لائی۔

معارف و مسائل

کیا بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آ گئی تھیں؟

آیاتِ مذکورہ میں بلقیس کا واقعہ اسی پر ختم ہوگیا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوگئی۔ اس کے بعد کیا حالات پیش آئے؟ قرآنِ کریم نے اس سے سکوت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص نے جب عبداللہ بن عُیَیْنَہ سے پوچھا کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے ساتھ نکاح کرلیا تھا؟ تو اُنہوں نے فرمایا کہ اُس کا معاملہ اس پر ختم ہوگیا: اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾ مطلب یہ تھا کہ قرآن نے یہیں تک اس کا حال بیان کیا ہے اس کے بعد کا حال بتلانا قرآن نے چھوڑ دیا تو ہمیں بھی اس کی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ابن عساکر نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ اس کے بعد بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آ گئی اور اس کو اس کے ملک پر برقرار رکھ کر یمن واپس بھیج دیا۔ ہر مہینے حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں تشریف لے جاتے اور تین روز قیام فرماتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے لئے یمن میں تین عمدہ محلّات ایسے تیار کرادیئے تھے جس کی مثال ونظیر نہیں تھی۔ [1] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ

اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو فرقے ہوکر

[1] مزید تفصیل کے لئے تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۰۹، ۲۱۰ ملاحظہ فرمائیں۔

يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ

لگے جھگڑنے کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو بُرائی کو پہلے بھلائی سے

لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ

کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہوجائے بولے ہم نے منحوس قدم دیکھا تجھ کو

وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور تیرے ساتھ والوں کو، کہا تمہاری بُری قسمت اللہ کے پاس ہے، کچھ نہیں تم لوگ جانچے جاتے ہو

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور تھے اُس شہر میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور اصلاح نہ کرتے

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ

بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اُس پر اور اس کے گھر پر، پھر کہہ دیں گے اس کے دعویٰ کرنے والے کو،

مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا

ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اس کا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں اور انہوں نے بنایا ایک فریب اور ہم نے بنایا

مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ

ایک فریب اور اُن کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام اُن کے فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے اُن کو

وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

اور اُن کی قوم کو سب کو سو یہ پڑے ہیں اُن کے گھر ڈھیر ہوئے بسبب اُن کے انکار کے البتہ اس میں نشانی ہے

لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٣﴾

اُن لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں اور بچادیا ہم نے اُن کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے قومِ ثمود کے پاس اُن کے بھائی صالح کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو، تو اچانک وہ دو گروہ بن گئے جو آپس میں جھگڑنے لگے۔ ﴿٤٥﴾ صالح نے کہا: "میری قوم کے لوگو! اچھائی سے پہلے بُرائی کو کیوں جلدی مانگتے ہو۔ تم اللہ سے معافی کیوں نہیں مانگتے تاکہ تم پر رحم فرمایا جائے؟" ﴿٤٦﴾ اُنہوں نے کہا: "ہم نے تو تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے بُرا شگون لیا ہے۔" صالح نے کہا: "تمہارا شگون تو اللہ کے قبضے میں ہے، البتہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔" ﴿٤٧﴾ اور شہر میں نو آدمی ایسے تھے جو زمین میں فساد مچاتے تھے، اور اصلاح کا کام نہیں کرتے تھے۔ ﴿٤٨﴾ اُنہوں نے (آپس میں ایک دوسرے سے) کہا: "سب مل کر اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم صالح اور اُس کے گھر والوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے، پھر اُس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم ان گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود ہی نہ تھے، اور یقین جانو ہم بالکل سچے ہیں۔" ﴿٤٩﴾ اُنہوں نے یہ چال چلی، اور ہم نے بھی ایک چال اس طرح چلی کہ اُن کو پتہ بھی نہ لگ سکا۔ ﴿٥٠﴾ اب دیکھو کہ اُن کی چال بازی کا انجام کیسا ہوا کہ ہم نے اُنہیں اور اُن کی ساری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ﴿٥١﴾ چنانچہ وہ رہے اُن کے گھر جو اُن کے ظلم کی وجہ سے ویران پڑے ہیں! یقیناً اس واقعے میں اُن لوگوں کے لئے عبرت کا سامان ہے جو علم سے کام لیتے ہیں۔ ﴿٥٢﴾ اور جو لوگ ایمان لائے تھے، اور تقویٰ اختیار کئے ہوئے تھے، اُن سب کو ہم نے بچا لیا۔ ﴿٥٣﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس ان کے (برادری کے) بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ تم (شرک کو چھوڑ کر) اللہ کی عبادت کرو (چاہئے تو یہ تھا کہ سب ایمان لے آتے مگر خلاف توقع) اچانک ان میں دو فریق ہو گئے جو دین کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے (یعنی ایک فرقہ تو ایمان لایا اور ایک نہ لایا اور ان میں جو جھگڑا اور کلام ہوا بعض اس میں کا سورۂ اعراف میں مذکور ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا [1] (الاعراف: ۷۵) اور بعض اس میں کا آگے مذکور ہے قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ الخ (النمل: ۴۷) اور جب ان لوگوں نے

[1] ترجمہ: ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے پوچھا۔

کفر پر اصرار کیا تو صالح علیہ السلام نے موافق عادت انبیاء علیہم السلام کے ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسا سورۂ اعراف میں ہے فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ [۱] (الاعراف) تو انہوں نے کہا کہ لاؤ وہ عذاب کہاں ہے جیسا سورۂ اعراف میں ہے قَالُوا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ [۲] (الاعراف) اس پر) صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ارے بھائیو تم نیک کام (یعنی توبہ وایمان) سے پہلے عذاب کیوں جلدی مانگتے ہو (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ عذاب کی وعید سُن کر ایمان لے آتے نہ یہ کہ ایمان تو نہ لائے اور بالعکس اس عذاب ہی کی درخواست کرنے لگے بڑی بیبا کی کی بات ہے۔ بجائے اس استعجالِ عذاب کے) تم لوگ اللہ کے سامنے (کفر سے) معافی کیوں نہیں چاہتے جس سے توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جائے (یعنی عذاب سے محفوظ رہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو اور تمہارے ساتھ والوں کو منحوس سمجھتے ہیں (کہ جب سے تم نے یہ مذہب نکالا ہے اور تمہاری یہ جماعت پیدا ہوئی ہے قوم میں نا اتفاقی ہوگئی اور نا اتفاقی کی جو مضرتیں اور خرابیاں ہوتی ہیں وہ سب مرتب ہونے لگیں۔ بس سبب ان تمام خرابیوں کے تم لوگ ہو) صالح (علیہ السلام) نے (جواب میں) فرمایا کہ تمہاری (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی تمہارے اعمال کفریہ اللہ کو معلوم ہیں یہ خرابیاں ان ہی اعمال پر مرتب ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ نا اتفاقی مذموم وہی ہے جو حق کے خلاف کرنے سے ہو تو اس کا الزام ایمان والوں پر نہیں ہوسکتا بلکہ اہلِ کفر پر ہوگا۔ اور بعض تفاسیر میں ہے کہ اُن پر قحط ہوا تھا اور تمہارے کفر کی مضرت کچھ ان شرور ہی تک ختم نہیں ہوئی) بلکہ تم وہ لوگ ہو کہ (اس کفر کی بدولت) عذاب میں مبتلا ہوگئے اور (یوں تو کافر اس قوم میں بہت تھے لیکن سرغنہ) اس بستی (یعنی حجر) میں نو شخص تھے جو سرزمین (یعنی بستی سے باہر تک بھی) فساد کیا کرتے تھے اور (ذرا) اصلاح نہ کرتے تھے (یعنی بعضے مفسد ایسے ہوتے ہیں کہ کچھ فساد کیا کچھ اصلاح کر لی مگر وہ ایسے نہ تھے بلکہ خالص مفسد تھے چنانچہ ایک بار یہ فساد کیا کہ) انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ آپس میں سب (اس پر) اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم شب کے وقت صالح اور ان کے متعلقین (یعنی ایمان والوں) کو جا ماریں گے پھر (اگر تحقیق کی نوبت آئی تو) ہم اُن کے وارث سے (جو خون کا دعویٰ کرے گا) کہدیں گے کہ ان کے متعلقین کے (اور خود ان کے) مارے جانے میں موجود (بھی) نہ تھے (مارنا تو درکنار) اور (تاکید کے لئے یہ بھی کہدیں گے کہ) ہم بالکل سچے ہیں۔ (اور گواہ کوئی معائنہ کا ہوگا نہیں۔ بس بات دب دبا جائے گی) اور (یہ مشورہ کر کے) انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی (کہ شب کے وقت اس کارروائی کے لئے چلے) اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی اور اُن کو خبر بھی نہ ہوئی (وہ یہ کہ ایک پہاڑ پر سے ایک پتھر اُن پر لڑھک آیا اور وہ سب وہاں ہی کھیت رہے یعنی ہلاک ہوئے۔ کذا فی الدر المنثور) سو دیکھئے ان کی شرارت کا کیا

[۱] ترجمہ: کبھی تم کو دردناک عذاب آ پکڑے۔
[۲] ترجمہ: کہنے لگے کہ اے صالح جس کی آپ ہم کو دھمکی دیتے ہیں اس کو منگوایئے اگر آپ پیغمبر ہیں۔

انجام ہوا کہ ہم نے ان کو (بطریقِ مذکور) اور (پھر) ان کی (باقی) قوم کو (آسمانی عذاب سے) سب کو غارت کر دیا (جس کا قصہ دوسری آیات میں ہے [1] فَعَقَرُوا النَّاقَةَ (الاعراف:۷۷) الی فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (الاعراف:۷۸)۔ [2] وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (ہود:۶۷)) سو یہ اُن کے گھر ہیں جو ویران پڑے ہیں ان کے کفر کے سبب سے (جو اہلِ مکہ کو ملک شام کے سفر میں ملتے ہیں) بلاشبہ اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے دانشمندوں کے لئے اور ہم نے ایمان اور تقویٰ والوں کو (اس قتل سے بھی جس کا مشورہ ہوا تھا اور عذابِ قہری سے بھی) نجات دی۔

معارف و مسائل

تِسْعَةُ رَهْطٍ، لفظ رھط، جماعت کے معنے میں آتا ہے، یہاں نو اشخاص میں سے ہر شخص کو رھط کے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے مال و دولت اور جاہ و حشم کے سبب قوم کے بڑے مانے جاتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ الگ الگ جماعتیں تھیں اس لئے ان نو آدمیوں کو نو جماعتیں فرمایا۔ یہ لوگ صالح علیہ السلام کی بستی یعنی حجر کے بڑے مانے جاتے تھے۔ حجر ملک شام میں معروف مقام ہے۔ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَاشَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ مطلب یہ تھا کہ ہم سب مل کر رات کے اندھیرے میں ان پر اور ان کے متعلقین پر چھاپہ ماریں، سب کو ہلاک کر دیں، پھر ان کے خون کا دعویدار وارث تحقیق و تفتیش کے لئے کھڑا ہوگا تو ہم یہ کہہ دیں گے کہ ہم نے تو فلاں آدمی کو نہ مارا، نہ مارتے کسی کو دیکھا۔ اور ہم اپنے اس قول میں اس لئے سچے ہوں گے کہ رات کے اندھیرے میں یہ تعیین کہ کس نے کس کو مارا ہمیں معلوم نہیں ہوگی۔

اس میں ایک بات یہ قابلِ نظر ہے کہ یہ کفار اور ان میں سے بھی چیدہ بدمعاش جو فساد میں معروف تھے یہ سارے کام شرک کفر اور قتل و غارت گری کے کر رہے ہیں اور کوئی فکر نہیں، مگر ان کو بھی یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہم جھوٹ نہ بولیں یا جھوٹے قرار نہ دیئے جائیں۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ جھوٹ کیسا بڑا گناہ ہے کہ سارے بڑے بڑے جرائم کے مرتکب بھی اپنی شرافتِ نفس اور عزت کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے پر اقدام نہ کرتے تھے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ قابلِ غور ہے کہ جس شخص کو ان لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا ولی قرار دیا ہے وہ تو اُنہی اہلِ صالح میں شامل تھا اس کو قتل کے ارادہ سے کیوں چھوڑ دیا۔ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ ولی خاندانی اعتبار سے ولی ہو مگر کافر ہو کافروں کے ساتھ ملا

---

[1] یہ سورۂ اعراف کی دو آیتوں کی طرف اشارہ ہے۔ دونوں کا ترجمہ یہ ہے: غرض اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے کہ اے صالح جس کی آپ ہم کو دھمکی دیتے تھے اس کو منگوایئے اگر آپ پیغمبر ہیں پس آ پکڑا ان کو زلزلہ نے سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔

[2] ترجمہ: اور ان ظالموں کو ایک نعرہ نے آ دبایا۔

ہوا ہو صالح علیہ السلام اور اُن کے متعلقین کے قتل کے بعد وہ ان کے خون کا دعویٰ اپنے نسبی تعلق کی بناء پر کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہی ہو مگر کوئی بڑا آدمی ہو جس کے قتل کرنے سے اپنی قوم میں اختلاف و انتشار کا خطرہ ہو اس لئے اس کو چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور لُوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو بے حیائی اور تم دیکھتے ہو

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

کیا تم دوڑتے ہو مَردوں پر للچاکر عورتوں کو چھوڑ کر کوئی نہیں تم لوگ

تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ

بے سمجھ ہو پھر اور کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ کہتے تھے نکال دو لُوط کے گھر کو

مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ

اپنے شہر سے یہ لوگ ہیں ستھرے رہا چاہتے پھر بچادیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو، مگر اس کی عورت

قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ

مقرر کردیا تھا ہم نے اس کو رہ جانے والوں میں اور برسادیا ہم نے اُن پر برساؤ پھر کیا بُرا برساؤ تھا

ع ۴ ۱۹
الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ ع قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰي عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ

اُن ڈرائے ہوؤں کا تو کہہ تعریف ہے اللہ کو اور سلام ہے اس کے بندوں پر جن کو اُس نے پسند کیا

آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ ۭ

بھلا اللہ بہتر ہے یا جن کو وہ شریک کرتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے لوط کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ''کیا تم کھلی آنکھوں دیکھتے ہوئے بھی بے حیائی کا یہ کام کرتے ہو؟ (۵۴) کیا یہ کوئی یقین کرنے کی بات ہے کہ تم اپنی جنسی خواہش کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم بڑی جہالت کے کام کرنے والے لوگ ہو۔'' (۵۵) اس پر یہ کہنے کے سوا ان کی قوم کا کوئی جواب نہیں تھا کہ: ''لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔'' (۵۶) پھر ہوا یہ کہ ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو بچالیا، سوائے اُن کی بیوی کے جس کے بارے میں ہم نے یہ طے کر دیا تھا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی۔ (۵۷) اور ہم نے اُن پر ایک زبردست بارش برسائی، چنانچہ بہت بری بارش تھی جو اُن لوگوں پر برسی جنہیں پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا۔ (۵۸) (اے پیغمبر!) کہو: ''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اور سلام ہو اُس کے اُن بندوں پر جن کو اُس نے منتخب فرمایا ہے! بتاؤ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو ان لوگوں نے اللہ کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے؟ (۵۹)

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (پیغمبر کر کے اُن کی قوم کے پاس) بھیجا تھا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو حالانکہ سمجھدار ہو (کیا اس کی بُرائی نہیں سمجھتے، آگے اُس بے حیائی کا بیان ہے یعنی) کیا تم مَردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اس کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی) بلکہ (اس معاملے میں) تم (محض) جہالت کر رہے ہو (اس تقریر کا) اُن کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اس کے کہ آپس میں کہنے لگے کہ لوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو (یعنی ان پر ایمان لانے والوں کو مع ان کے) تم اپنی بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں سو (جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی تو) ہم نے (اُس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو (اس عذاب سے) بچالیا بجز اُن کی بیوی کے کہ اس کو (بوجہ ایمان نہ لانے کے) ہم نے اُنہیں لوگوں میں تجویز کر رکھا تھا جو عذاب میں رہ گئے تھے اور (وہ عذاب جو اُن پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے اُن پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی) سو اُن لوگوں کا کیسا بُرا مینہ تھا جو (اوّل عذاب خدا سے) ڈرائے گئے تھے (جس پر انہوں نے التفات نہ کیا) آپ (بیانِ توحید کے لئے بطور خطبہ کے) کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام (نازل) ہو جن کو اُس نے منتخب فرمایا ہے (یعنی انبیاء وصلحاء۔ آگے مضمون ہماری طرف سے بیان کیجئے وہ یہ کہ لوگو یہ بتلاؤ کہ) کیا (کمالات اور احسانات میں) اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں (بہتر ہیں) جن کو (الوہیت میں) شریک

ٹھہراتے ہیں (یعنی ظاہر اور مسلّم ہے کہ اللہ ہی بہتر ہے پس مستحقِ عبادت بھی وہی ہوگا)۔

معارف ومسائل

اس قصے کے متعلق قرآن میں متعدد جگہ خصوصاً سورۂ اعراف میں ضروری مضامین بیان ہو چکے ہیں وہاں دیکھ لئے جائیں۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ، انبیاء سابقین اور اُن کی اُمتوں کے کچھ حالات اور اُن پر عذاب آنے کے واقعات کا ذکر کرنے کے بعد یہ جملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ آپ کی اُمت کو دُنیا کے عذابِ عام سے مامون کر دیا گیا ہے۔ اور انبیاء سابقین اور اللہ کے برگزیدہ بندوں پر سلام بھیجئے، جمہور مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے اور بعض نے اس کا مخاطب بھی حضرت لُوط علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ اصْطَفٰى کے الفاظ سے ظاہر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مراد ہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے [۱] وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ (الصّٰفّٰت) اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام ہیں۔ سُفیان ثوری نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ [۲] (اخرجه عبد بن حمید والبزار وابن جریر وغیرهم)

اگر آیت میں اَلَّذِيْنَ اصْطَفٰى سے مراد صحابۂ کرام لئے جائیں جیسا کہ ابنِ عباسؓ کی روایت میں ہے تو اس آیت سے غیر انبیاء پر سلام بھیجنے کے لئے اُنہیں علیہ السلام کہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق سورۂ احزاب میں آیت [۳] صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا (الاحزاب:۵۶) کی تفسیر میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ:- اس آیت سے خطبہ کے آداب بھی ثابت ہوئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور انبیاء علیہم السلام پر درود وسلام سے شروع ہونا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے تمام خطبات میں یہی معمول رہا ہے بلکہ ہر اہم کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام مسنون ومستحب ہے۔ [۴] (کذا فی الروح)

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ

بھلا کس نے بنائے آسمان اور زمین اور اُتار دیا تمہارے لئے آسمان سے پانی

---

[۱] ترجمہ: اور سلام ہو پیغمبروں پر۔

[۲] تفسیر الطبری ج:۱۹ ص:۴۸۲، ۴۸۳

[۳] ترجمہ: تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔

[۴] تفسیر روح المعانی ج:۱۵ ص:۶

فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ

پھر اُگائے ہم نے اس سے باغ رونق والے تمہارا کام نہ تھا کہ اُگاتے اُن کے درخت

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝۶۰ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا

اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کے لائق

وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ

اور بنائیں اس کے بیچ میں ندیاں اور رکھے اس کے ٹھہرانے کو بوجھ اور رکھا دو دریا میں

حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۱ اَمَّنْ يُّجِيْبُ

پردہ اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ کوئی نہیں بہتوں کو ان میں سمجھ نہیں بھلا کون پہنچتا ہے

الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ

بے کس کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے اور دُور کر دیتا ہے سختی اور کرتا ہے تم کو نائب اگلوں کا زمین پر اب کوئی حاکم ہے

مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۶۲ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

اللہ کے ساتھ تم بہت کم دھیان کرتے ہو بھلا کون راہ بتاتا ہے تم کو اندھیروں میں جنگل کے اور دریا کے

وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ

اور کون چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اس کی رحمت سے پہلے اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ

تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۶۳ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ

اللہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو شریک بتلاتے ہیں بھلا کون سرے سے بناتا ہے پھر اس کو دُہرائے گا

وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا

اور کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ تو کہہ لاؤ

بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

اپنی سند اگر تم سچے ہو

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اُتارا؟ ـــــ پھر ہم نے اُس پانی سے بارونق باغ اُگائے، تمہارے بس میں نہیں تھا کہ تم اُن کے درختوں کو اُگا سکتے۔ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان لوگوں نے راستے سے منہ موڑ رکھا ہے۔ ﴿۶۰﴾ بھلا وہ کون ہے جس نے زمین کو قرار کی جگہ بنایا، اور اُس کے بیچ بیچ میں دریا پیدا کئے، اور اُس (کو ٹھہرانے) کے لئے (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں، اور دو سمندروں کے درمیان ایک آڑ رکھ دی؟ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ﴿۶۱﴾ بھلا وہ کون ہے کہ جب کوئی بے قرار اُسے پکارتا ہے تو وہ اُس کی دُعا قبول کرتا ہے، اور تکلیف دُور کر دیتا ہے، اور جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔ ﴿۶۲﴾ بھلا وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں تمہیں راستہ دِکھاتا ہے، اور جو اپنی رحمت (کی بارش) سے پہلے ہوائیں بھیجتا ہے جو تمہیں (بارش کی) خوشخبری دیتی ہیں؟ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ (نہیں! بلکہ) اللہ اُس شرک سے بہت بالا و برتر ہے جس کا ارتکاب یہ لوگ کر رہے ہیں۔ ﴿۶۳﴾ بھلا وہ کون ہے جس نے ساری مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا، پھر وہ اُس کو دوبارہ پیدا کرے گا، اور جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق فراہم کرتا ہے؟ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ کہو: ''لاؤ اپنی کوئی دلیل، اگر تم سچے ہو۔'' ﴿۶۴﴾

خلاصہ تفسیر

(پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ یعنی کیا اللہ بہتر ہے یا وہ بت وغیرہ جن کو یہ لوگ

اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، یہ مشرکین کی بے وقوفی بلکہ کج فہمی پر نکیر تھی، آگے توحید کے دلائل کا بیان ہے، اے لوگو یہ بتلاؤ کہ) وہ ذات (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا، اور اُس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ ہم نے رونق دار باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم اُن (باغوں) کے درختوں کو اُگا سکو (یہ سُن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ (دوسروں کو) خدا کی برابر ٹھہراتے ہیں (اچھا پھر اور کمالات سُن کر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جس نے زمین کو (مخلوق کی) قرارگاہ بنایا اور اس کے درمیان درمیان نہریں بنائیں اور اس (زمین) کے (ٹھہرانے کے) لئے پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان حدّ فاصل بنائی (جیسا سورۂ فرقان میں[1] مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ (الفرقان: ۵۳) آچکا ہے یہ سُن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (خدائی کا شریک ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین نہیں مانتے) بلکہ اُن میں زیادہ تو (اچھی طرح) سمجھتے بھی نہیں (اچھا پھر اور کمالات سُن کر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو بے قرار آدمی کی دُعا سنتا ہے جب وہ اُس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) مصیبت کو دُور کر دیتا ہے اور تم کو زمین میں صاحبِ تصرّف بناتا ہے (یہ سُن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر) تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو (اچھا پھر اور کمالات سُن کر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں رستہ سُوجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے جو (بارش کی اُمید دلا کر دلوں کو) خوش کر دیتی ہیں (یہ سُن کر اب بتلاؤ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (ہرگز نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے برتر ہے (اچھا پھر دوسرے کمالات و احسانات سُن کر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو مخلوقات کو اوّل بار پیدا کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ پیدا کر دے گا اور جو آسمان اور زمین سے (پانی برسا کر اور نباتات نکال کر) تم کو رزق دیتا ہے (یہ سُن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (اور اگر وہ یہ سُن کر بھی کہیں کہ ہاں اور معبود بھی مستحقِ عبادت ہیں تو) آپ کہئے کہ (اچھا) تم (اُن کے استحقاقِ عبادت پر) اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اس دعویٰ میں) سچے ہو۔

معارف و مسائل

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ، اَلْمُضْطَرَّ، اضطرار سے مشتق ہے کسی ضرورت سے مجبور و بے قرار ہونے کو اضطرار کہا جاتا ہے۔ اور وہ جبھی ہوتا ہے جب اس کا کوئی یار و مددگار اور سہارا نہ ہو۔ اس لئے **مضطر** وہ شخص ہے جو سب دُنیا کے سہاروں سے مایوس ہو کر خالص اللہ تعالیٰ ہی کو فریاد رس سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو۔ **مضطر** کی یہ تفسیر سُدی،

[1] ترجمہ: اور وہ ایسا ہے جس نے دو دریاؤں کو ملایا۔

ذوالنون مصری، سہل بن عبداللہ وغیرہ سے منقول ہے (قرطبی) [1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے ان الفاظ سے دُعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّاَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (ترجمہ) یا اللہ میں تیری رحمت کا اُمیدوار ہوں اس لئے مجھے ایک لحظہ کے لئے بھی میرے اپنے نفس کے حوالہ نہ کیجئے اور آپ ہی میرے سب کاموں کو درست کر دیجئے آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (قرطبی) [2]

مضطر کی دُعا اخلاص کی بناء پر ضرور قبول ہوتی ہے

امام قرطبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دُعا قبول کرنے کا ذمّہ لے لیا ہے اور اس آیت میں اس کا اعلان بھی فرما دیا ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دُنیا کے سب سہاروں سے مایوس اور علائق سے منقطع ہو کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو کارساز سمجھ کر دُعا کرنا سرمایۂ اخلاص ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاص کا بڑا درجہ ہے وہ جس کسی بندہ سے پایا جائے وہ مؤمن ہو یا کافر، اور متقی ہو یا فاسق فاجر اس کے اخلاص کی برکت سے اس کی طرف رحمتِ حق متوجہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے کفار کا حال ذکر فرمایا ہے کہ جب یہ لوگ دریا میں ہوتے ہیں اور کشتی سب طرف سے موجوں کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور یہ گویا آنکھوں کے سامنے اپنی موت کو کھڑا دیکھ لیتے ہیں اس وقت یہ لوگ پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں کہ اگر ہمیں اس مصیبت سے آپ نجات دیدیں تو ہم شکر گزار رہوں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کی دُعا قبول کر کے خشکی پر لے آتے ہیں تو یہ پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں [3] دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ (العنکبوت) ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین دُعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، ایک مظلوم کی دُعا، دوسرے مسافر کی دُعا، تیسرے باپ جو اپنی اولاد کے لئے بددُعا کرے۔ [4] قرطبی نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا کہ ان تینوں دُعاؤں میں بھی وہی صورت ہے جو دُعائے مضطر میں اوپر لکھی گئی ہے کہ جب کوئی مظلوم دُنیا کے سہاروں اور مددگاروں سے مایوس ہو کر دفعِ ظلم کے لئے اللہ کو پکارتا ہے وہ بھی مضطر ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح مسافر حالتِ سفر میں اپنے خویش و عزیز اور ہمدردوں غمگساروں سے الگ بے سہارا ہوتا ہے۔ اسی طرح باپ اولاد کے لئے اپنی فطرت اور پدری شفقت کی بناء پر کبھی بددعا نہیں کر سکتا بجز اس کے کہ اس کا دل بالکل ٹوٹ جائے اور اپنے آپ کو مصیبت سے بچانے کے لئے اللہ کو پکارے۔ امامِ حدیث آجری نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۲۳

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۲۳، ومسند ابی داؤد الطیالسی، رقم الحدیث:۹۰۰

[3] ترجمہ: خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں۔

[4] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب ما ذکر فی دعوۃ المسافر ج:۲ ص:۱۸۲، ومسند احمد، مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رقم الحدیث: ۷۷۲۱

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ میں مظلوم کی دُعا کو کبھی رد نہیں کروں گا اگرچہ وہ کسی کافر کے منہ سے ہو۔ (قرطبی)[1] اگر کسی مضطر یا مظلوم یا مسافر وغیرہ کو کبھی یہ محسوس ہو کہ اس کی دُعا قبول نہیں ہوئی تو بدگمان اور مایوس نہ ہو بعض اوقات دُعا قبول تو ہو جاتی ہے مگر کسی حکمت و مصلحت ربّانی سے اس کا ظہور دیر میں ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اپنے نفس کو ٹٹولے کہ اس کے اخلاص اور توجہ الی اللہ میں کمی کوتاہی رہی ہے۔ واللہ اعلم

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ط وَمَا يَشْعُرُوْنَ

تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ اور اُن کو خبر نہیں

اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ قف بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ

کب جلائے جائیں گے بلکہ تھک کر گر گیا اُن کا فکر آخرت کے بارے میں بلکہ ان کو شبہ ہے

مِّنْهَا قف بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا

اس میں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں اور بولے وہ لوگ جو منکر ہیں کیا جب ہم ہو جائیں مٹی

وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ لا

اور ہمارے باپ دادے کیا ہم کو زمین سے نکالیں گے وعدہ پہنچ چکا ہے اس کا ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا

کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں اگلوں کی تو کہدے پھرو ملک میں تو دیکھو

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ

کیسا ہوا انجام کار گنا ہگاروں کا اور غم نہ کر ان پر اور نہ خفا ہو

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۲۳، ۲۲۴

مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾

ان کے فریب بنانے سے اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو

قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾

تو کہہ کیا بعید ہے جو تمہاری پیٹھ پر پہنچ چکی ہو بعضی وہ چیز جس کی جلدی کر رہے ہو

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور تیرا رَبّ تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر پَر اُن میں بہت لوگ شکر نہیں کرتے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ

اور تیرا رَبّ جانتا ہے جو چھپ رہا ہے اُن کے سینوں میں اور جو کچھ کہ ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز نہیں جو غائب ہو

فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾

آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے کھلی کتاب میں

آسان ترجمۂ قرآن

کہہ دو کہ: "اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے، اور لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ اُنہیں کب دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔" ﴿۶۵﴾ بلکہ آخرت کے بارے میں ان (کافروں) کا علم بے بس ہو کر رہ گیا ہے، بلکہ وہ اُس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں، بلکہ اُس سے اندھے ہو چکے ہیں۔ ﴿۶۶﴾ جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: "کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادے مٹی ہو چکے ہوں گے تو کیا اُس وقت واقعی ہمیں (قبروں سے) نکالا جائے گا؟ ﴿۶۷﴾ ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے اس قسم کے وعدے پہلے بھی کئے گئے تھے، (لیکن) ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ قصہ کہانیاں ہیں جو پرانے زمانے کے لوگوں سے نقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔" ﴿۶۸﴾ کہو کہ: "ذرا زمین میں سفر کر کے دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیسا ہوا ہے۔" ﴿۶۹﴾ اور (اے پیغمبر!) تم ان لوگوں پر غم نہ کرو، اور یہ جس مکاری کا مظاہرہ کر رہے

ہیں، ان کی وجہ سے گھٹن محسوس نہ کرو۔ (۷۰) یہ (تم سے) یوں کہتے ہیں کہ: "یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو؟" (۷۱) کہہ دو کہ: "کچھ بعید نہیں ہے کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو، اُس کا کچھ حصہ تمہارے بالکل پاس آ لگا ہو۔" (۷۲) اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار لوگوں پر بہت فضل کرنے والا ہے، لیکن اُن میں سے اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (۷۳) اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار وہ ساری باتیں بھی جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں، اور وہ باتیں بھی جو وہ علانیہ کرتے ہیں۔ (۷۴) اور آسمان اور زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں درج نہ ہو۔ (۷۵)

خلاصۂ تفسیر

ربط آیات

اُوپر نبوّت کے بعد توحید کا ذکر ہو چکا، آگے معاد یعنی قیامت اور آخرت کا ذکر ہے جس کی طرف دلائلِ توحید میں اس قول سے اجمالی اشارہ بھی ہوا (ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ [1] (النمل: ۶۴)) اور چونکہ کفار اس کی تکذیب کی ایک وجہ یہ بھی قرار دیتے تھے کہ قیامت کا معیّن وقت پوچھنے پر بھی نہیں بتلایا جاتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یعنی وہ عدمِ تعیین کو عدمِ وقوع کی دلیل بناتے تھے اس لئے اس مضمون کو اس بات سے شروع کیا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے فرمایا قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ الخ (جس میں اُن کے شبہ کا جواب بھی ہو گیا) قیامت کی تعیین کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر ان کے شک و انکار پر تشنیع ہے (بَلِ ادّٰرَکَ) پھر اُن کے ایک انکاری قول کی نقل ہے (وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا) پھر اس انکار پر تہدید ہے (قُلۡ سِیۡرُوۡا) پھر اس انکار پر آپ کی تسلّی ہے وَلَا تَحۡزَنۡ پھر اس تہدید کے متعلق ان کے ایک شبہ کا جواب ہے (وَیَقُوۡلُوۡنَ الخ) پھر تہدید کی تاکید ہے وَاِنَّ رَبَّکَ لَیَعۡلَمُ الخ جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہوگا۔

(یہ لوگ جو قیامت کا وقت نہ بتلانے سے اس کے عدم وقوع پر استدلال کرتے ہیں اس کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا لازم آیا کہ مجھ سے اور تم سے اس تعیین کا علم غائب رہا سو اس میں اسی کی کیا تخصیص ہے غیب کی نسبت تو قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین (یعنی عالم) میں موجود ہیں (ان میں سے) کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور (اسی وجہ سے) ان (مخلوقات) کو یہ خبر (بھی) نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کئے جائیں گے (یعنی اللہ تعالیٰ کو تو بے بتلائے سب معلوم ہے اور کسی کو بے بتلائے کچھ بھی معلوم نہیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے اُمور جن کا پہلے سے علم نہیں ہوتا واقع ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز

[1] ترجمہ: پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا۔

کا علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود ہی نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حکمت سے بعض علوم کا پردہ غیب میں رکھنا منظور ہے قیامت کی تعیین بھی انہی اُمور میں ہے اسی لئے مخلوق کو اس کا علم نہیں دیا گیا مگر اس سے عدم وقوع کیسے لازم آگیا اور یہ عدم علم بالتعیین تو سب میں امر مشترک ہے لیکن ان کفار منکرین میں صرف یہی نہیں کہ وہ بالتعیین قیامت کو نہیں مانتے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ) آخرت کے بارے میں (خود) ان کا (نفس) علم (بالوقوع ہی) نیست ہو گیا (یعنی خود اس کے وقوع ہی کا علم نہیں جو تعیین کے علم نہ ہونے سے بھی اشد ہے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ لوگ اس (کے وقوع) سے شک میں ہیں، بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (یعنی جیسے اندھے کو راستہ نظر نہیں آتا اس لئے مقصود تک پہنچنا مستبعد ہے اسی طرح تصدیق بالآخرت کا جو ذریعہ ہے یعنی دلائل صحیحہ یہ لوگ انتہائی عناد کی وجہ سے ان دلائل میں غور و تأمل ہی نہیں کرتے اس لئے وہ دلائل ان کو نظر نہیں آتے جس سے مطلوب تک پہنچ جانے کی اُمید ہوتی۔ پس یہ شک سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ شک والا بعض اوقات دلائل میں نظر کر کے رفع شک کر لیتا ہے اور یہ نظر بھی نہیں کرتے) اور (اس تشنیع علی الکفار کے بعد آگے ان کا ایک انکاری قول نقل فرماتے ہیں کہ) یہ کافریوں کہتے ہیں کہ کیا ہم لوگ جب (مرکر) خاک ہو گئے اور (اسی طرح) ہمارے بڑے بھی تو کیا (پھر) ہم (زندہ کر کے قبروں سے) نکالے جائیں گے اس کا تو ہم سے اور ہمارے بڑوں سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) پہلے سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے (کیونکہ تمام انبیاء کا یہ قول مشہور ہے لیکن نہ آج تک ہوا اور نہ کسی نے بتلایا کہ کب ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ) یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں آپ کہہ دیجئے کہ (جب اس کے امکان پر دلائل عقلیہ اور وقوع پر دلائلِ نقلیہ جابجا بار بار تم کو سُنا دیئے گئے ہیں تو تم کو تکذیب سے باز آنا چاہئے ورنہ جو اور مکذبین کا حال ہوا ہے کہ عذاب میں گرفتار ہوئے وہی تمہارا حال ہوگا۔ اگر ان کی حالت میں کچھ شبہ ہو تو) تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا (کیونکہ اُن کے ہلاک ہونے اور عذاب آنے کے آثار اب تک باقی تھے) اور (اگر باوجود ان مواعظِ بلیغہ کے پھر مخالفت پر کمر بستہ رہیں تو) آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کر رہے ہیں اس سے دل تنگ نہ ہو جیئے (کہ اور انبیاء کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے) اور (قُلْ سِيْرُوْا الخ (النمل:۶۹) میں اور اس کے امثال دوسری آیات میں جو ان کو وعیدِ عذاب سُنائی جاتی ہے تو چونکہ دل میں تصدیق نہیں اس لئے) یہ لوگ (بے باکانہ) یوں کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (عذاب وقہر کا) کب ہوگا اگر تم سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہہ دیجئے کہ عجب نہیں کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہی آلگا ہو اور (اب تک جو دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کا رَبّ لوگوں پر (اپنا) بڑا فضل رکھتا ہے (اس رحمتِ عامّہ کی وجہ سے قدرے مہلت دے رکھی ہے) ولیکن اکثر آدمی (اس بات پر) شکر نہیں کرتے (کہ تاخیر کو غنیمت سمجھیں اور اس مہلت میں حق کی طلب کریں اور اس کو قبول کرلیں کہ عذاب سے نجات ابدی حاصل ہو بلکہ بالعکس

انکار اور بطور استہزاء کے جلد بازی کرتے ہیں) اور (یہ تاخیر چونکہ بمصلحت ہے اس لئے یہ نہ سمجھیں کہ ان افعال کی کبھی سزا ہی نہ ہوگی کیونکہ) آپ کے رَبّ کو سب خبر ہے جو کچھ اُن کے دلوں میں مخفی ہے اور جس کو وہ علانیہ کرتے ہیں اور (یہ صرف علم خداوندی ہی نہیں بلکہ دفتر خداوندی میں لکھا ہوا ہے جس میں کچھ ان ہی کے افعال کی تخصیص نہیں بلکہ) آسمان اور زمین میں ایسی کوئی مخفی چیز نہیں جو لوح محفوظ میں نہ ہو (اور دفتر خداوندی یہی لَوحِ محفوظ ہے اور جب مخفی چیزیں جن کو کوئی نہیں جانتا اس میں موجود ہیں تو ظاہر چیزیں تو بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں۔ غرض ان کے اعمالِ بد کی اللہ تعالیٰ کو خبر ہے اور آسمانی دفتر میں بھی محفوظ ہیں اور وہ اعمال خود سزا کے مقتضی بھی ہیں اور سزا کے واقع ہونے پر سب انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اخبار صادقہ بھی متفق ہیں۔ پھر یہ سمجھنے کی کیا گنجائش ہے کہ سزا نہ ہوگی، البتہ دیر ہونا ممکن ہے چنانچہ بعض سزائیں ان منکرین کو دُنیا میں بھی ہوئیں جیسے قحط، قتل و قید وغیرہ اور کچھ قبر و برزخ میں ہوں گی جو کچھ دُور نہیں، اور کچھ آخرت میں ہوں گی)۔

معارف و مسائل

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ لوگوں کو بتا دیں کہ جتنی مخلوق آسمانوں میں ہے جیسے فرشتے اور جتنی مخلوق زمین میں ہے جیسے بنی آدم اور جنّات وغیرہ ان میں سے کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔ آیتِ مذکورہ نے پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے جس میں کوئی فرشتہ یا نبی و رسول بھی شریک نہیں ہوسکتا۔ اس مسئلہ کی ضروری تفصیل سورۂ انعام کی آیت نمبر ۵۹ کے تحت صفحہ ۳۷۷ جلد ۳ پر آچکی ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ بنام کشف الریب عن علم الغیب، احکام القرآن (عربی) کا جزء بن کر شائع ہو چکا ہے۔ اہلِ علم اس کی مراجعت فرما سکتے ہیں۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ لفظ ادّٰرَكَ میں قرأتیں بھی مختلف ہیں اور اس کے معنی میں بھی کئی قول ہیں۔ اہلِ علم اس کی تفصیل تفاسیر میں دیکھ سکتے ہیں، یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ادّٰرَكَ کے معنے بعض مفسرین نے تَكَامَلَ کے کئے ہیں اور فی الاخرہ کو ادّٰرَكَ سے متعلق کر کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ آخرت میں ان کا علم اس معاملہ میں مکمل ہو جائے گا کیونکہ اس وقت ہر چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی مگر اس وقت علم ہونا اُن کے کچھ کام نہ آئے گا کیونکہ دُنیا میں وہ آخرت کی تکذیب کرتے رہے تھے۔ اور بعض مفسرین نے لفظ ادّٰرَكَ کے معنے ضَلَّ وَغَابَ کے لئے اور فِي الْاٰخِرَةِ کو عِلْمُهُمْ سے متعلق کیا کہ آخرت کے معاملہ میں اُن کا علم غائب ہو گیا اس کو نہ سمجھ سکے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ

یہ قرآن سُناتا ہے بنی اسرائیل کو بہت چیزیں جس میں وہ

يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷٦﴾ وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ

جھگڑ رہے ہیں اور بیشک وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے واسطے تیرا ربّ

يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ

اُن میں فیصلہ کرے گا اپنی حکومت سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا سو تو بھروسہ کر اللہ پر

اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾

بیشک تو ہے صحیح کھلے رستہ پر

آسان ترجمۂ قرآن

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن بنو اِسرائیل کے سامنے اکثر اُن باتوں کی حقیقت واضح کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ (۷٦) اور یقیناً یہ ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔ (۷۷) اور تمہارا پروردگار یقیناً اُن کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا، اور وہ بڑا اِقتدار والا، بڑا علم والا ہے۔ (۷۸) لہٰذا (اے پیغمبر!) تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔ یقیناً تم کھلے کھلے حق پر ہو۔ (۷۹)

خلاصۂ تفسیر

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر اُن باتوں (کی حقیقت) کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ایمانداروں کے لئے (خاص) ہدایت اور (خاص) رحمت ہے (ہدایت باعتبار طاعات واعمال کے اور رحمت باعتبار ثمرات ونتائج کے) بالیقین آپ کا ربّ اُن کے درمیان اپنے حکم سے (وہ عملی) فیصلہ (قیامت کے دن) کرے گا (اُس وقت معلوم ہو جائے گا کہ دینِ حق کیا تھا اور باطل کیا، تو ایسے لوگوں پر کیا افسوس کیا جائے) اور وہ زبردست علم والا ہے

(بدون اس کی مشیت کے کوئی کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتا) تو آپ اللہ پر توکل رکھئے (اللہ کی مدد ضرور ہوگی کیونکہ) آپ صریح حق پر ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیات میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو مختلف مثالوں سے ثابت کر کے یہ بات ثابت کردی گئی ہے کہ قیامت کا وقوع اور اُس میں مُردوں کا دوبارہ زندہ ہونا عقلاً ممکن ہے اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں۔ عقلی امکان کے ساتھ اس کا ضرور واقع ہونا یہ انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی نقل سے ثابت ہے اور کسی خبر کا صحیح اور ثابت ہونا اس پر موقوف ہے کہ اس کا ناقل مخبر اور روایت کرنے والا صادق اور سچا ہو۔ اس لئے اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اس کا مخبر قرآن ہے اور اُس کا مخبر صادق ہونا ناقابلِ انکار ہے، یہاں تک کہ علماء بنی اسرائیل جن مسائل میں باہم اختلافات رکھتے تھے اور وہ حل نہ ہوتے تھے۔ قرآن حکیم نے اُن مسائل میں محاکمہ کر کے صحیح فیصلوں کی ہدایت فرمائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے اختلاف میں محاکمہ اور فیصلہ کرنے والا ان سب علماء سے اعلم اور اعلیٰ ہونا ضروری ہے اس لئے قرآن کا مخبرِ صادق ہونا واضح ہوگیا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلّی کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کی مخالفت سے تنگدل نہ ہوں، اللہ تعالیٰ خود آپ کا فیصلہ کرنے والا ہے آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد حق کے ساتھ ہے اور آپ کا طریق حق پر ہونا یقینی ہے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾

البتہ تو نہیں سُنا سکتا مُردوں کو اور نہیں سُنا سکتا بہروں کو اپنی پکار جب لوٹیں وہ پیٹھ پھیر کر

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا

اور نہ تو دکھلا سکے اندھوں کو جب وہ راہ سے بچلیں تو تو سُناتا ہے اُس کو جو یقین رکھتا ہو ہماری باتوں پر،

فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

سو وہ حکم بردار ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

یادرکھو کہ تم مُردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے، اور نہ تم بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو، جب وہ پیٹھ پھیر کر چل کھڑے ہوں۔ ﴿٨٠﴾ اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گمراہی سے بچا کر راستے پر لا سکتے ہو۔ تم تو اُنہی لوگوں کو اپنی بات سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں، پھر وہی لوگ فرماں بردار ہوں گے۔ ﴿٨١﴾

خلاصۂ تفسیر

آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سُنا سکتے ہیں (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلدیں اور نہ آپ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے (بچا کر) رستہ دکھانے والے ہیں، آپ تو صرف اُن ہی کو سُنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں۔

معارف و مسائل

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے ساتھ جو شفقت و ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اُس کا تقاضا تھا کہ سب کو اللہ کا پیغام سُنا کر جہنم سے بچالیں جو لوگ اس پیغام کو قبول نہ کرتے تو آپ کو سخت صدمہ پہنچتا تھا اور آپ ایسے غمگین ہوتے تھے جیسے کسی کی اولاد اس کے کہنے کے خلاف آگ میں جا رہی ہو۔ اس لئے قرآن نے جابجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلّی کے لئے مختلف عنوانات اختیار فرمائے ہیں۔ سابقہ آیات میں [1] وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ (النمل: ٧٠)، اسی سلسلہ کا ایک عنوان تھا۔ مذکور الصدر آیت میں بھی تسلّی کا مضمون دوسرے انداز سے بیان فرمایا ہے کہ آپ کا کام پیغامِ حق کو پہنچا دینے کا وہ آپ پورا کر چکے ہیں جن لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا اس میں آپ کا کوئی قصور اور کوتاہی نہیں جس پر آپ غم کریں بلکہ وہ اپنی صلاحیتِ قبول ہی کو کھو چکے ہیں۔ ان کے گُم کردہ صلاحیت ہونے کو اس آیت میں قرآن کریم نے تین مثالوں میں ثابت کیا ہے۔ اوّل یہ کہ یہ لوگ قبولِ حق کے معاملہ میں بالکل مُردہ لاش کی طرح ہیں جو کسی کی بات سُن کر کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ دوسرے یہ کہ ان کی مثال اُس بہرے آدمی کی ہے جو بہرا ہونے کے ساتھ بات سننا بھی نہیں چاہتا بلکہ جب کوئی سُنانا چاہے تو اُس سے پیٹھ موڑ کر بھاگتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کی مثال اندھوں کی سی ہے کہ کوئی ان کو راستہ دکھانا بھی چاہے تو وہ نہیں دیکھ سکتے ان تین مثالوں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرمایا:

---

[1] ترجمہ: اور آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کر رہے ہیں ان سے تنگدل نہ ہوجیئے۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ یعنی آپ تو صرف ایسے ہی لوگوں کو سُنا سکتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں اور اطاعت قبول کریں۔ اس پورے مضمون میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس جگہ سُننے سُنانے سے مراد محض کانوں میں آواز پہنچانا نہیں بلکہ مراد اس سے وہ سماع اور سُننا ہے جو نفع بخش ہو۔ جو سماع نافع نہ ہو اس کو قرآن نے مقصد کے اعتبار سے عدم سماع سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آخر آیت میں یہ ارشاد کہ آپ تو صرف اُن لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ایمان لائیں۔ اگر اس میں سُنانے سے مراد محض اُن کے کان تک آواز پہنچانا ہوتا تو قرآن کا یہ ارشاد خلاف مشاہدہ اور خلاف واقع ہو جاتا کیونکہ کافروں کے کانوں تک آواز پہنچانے اور اُن کے سُننے جواب دینے کی شہادتیں بے شمار ہیں کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس سے واضح ہوا کہ سُنانے سے مراد سماع نافع ہے۔ ان کو مُردہ لاش سے تشبیہ دے کر جو یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اس کے معنے بھی یہی ہوئے کہ جیسے مُردے اگر کوئی بات حق کی سُن بھی لیں اور اس وقت وہ حق کو قبول کرنا بھی چاہیں تو یہ ان کے لئے نافع نہیں، کیونکہ وہ دُنیا کے دار العمل سے گزر چکے ہیں جہاں ایمان و عمل نافع ہو سکتا تھا مرنے کے بعد برزخ یا محشر میں تو سبھی کافر منکر ایمان و عمل صالح کی تمنائیں کریں گے مگر وہ وقت ایمان و عمل کے قبول ہونے کا وقت نہیں۔ اس لئے اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مُردے کوئی کلام کسی کا سُن ہی نہیں سکتے۔ اس لئے سماع اموات کے مسئلہ سے درحقیقت یہ آیت ساکت ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ قابلِ نظر ہے کہ مُردے کسی کلام کو سُن سکتے ہیں یا نہیں؟

مسئلہ سماعِ اموات

یہ مسئلہ کہ مُردے کوئی کلام سُن سکتے ہیں یا نہیں اُن مسائل میں سے ہے جن میں خود صحابہ کرام کا باہم اختلاف رہا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سماع موتی کو ثابت قرار دیتے ہیں اور حضرت ام المؤمنین صدیقہ عائشہؓ اس کی نفی کرتی ہیں۔ اسی لئے دوسرے صحابہ و تابعین میں بھی دو گروہ ہو گئے بعض اثبات کے قائل ہیں بعض نفی کے۔ اور قرآن کریم میں یہ مضمون ایک تو اسی موقع پر سورۂ نمل میں آیا ہے دوسرے سورۂ روم میں تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ دوسری آیت آئی ہے اور سورۂ فاطر میں یہ مضمون ان الفاظ سے آیا ہے وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ (فاطر) یعنی آپ اُن لوگوں کو نہیں سُنا سکتے جو کہ قبروں میں ہیں۔

ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ مُردے سُن نہیں سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سُنا سکتے۔ تینوں آیتوں میں اسی تعبیر و عنوان کو اختیار کرنے سے اس طرف واضح اشارہ نکلتا ہے کہ مردوں میں سُننے کی صلاحیت تو ہو سکتی ہے مگر ہم باختیار خود اُن کو نہیں سُنا سکتے۔

ان تینوں آیتوں کے بالمقابل ایک چوتھی آیت جو شہداء کے بارے میں آئی ہے وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ شہداء کو اپنی قبروں میں ایک خاص قسم کی زندگی عطا ہوتی ہے اور اس زندگی کے مطابق رزق بھی ان کو ملتا ہے اور اپنے پسماندہ متعلقین کے متعلق بھی منجانب اللہ ان کو بشارت سُنائی جاتی ہے آیت یہ ہے [1] وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ؁ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ؁ (آل عمران) یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد بھی رُوح انسانی میں شعور اور ادراک باقی رہ سکتا ہے بلکہ شہداء کے معاملہ میں اس کے وقوع کی شہادت بھی یہ آیت دے رہی ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ یہ حکم تو شہیدوں کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے اموات کے لئے نہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوگیا کہ مرنے کے بعد بھی روحِ انسانی میں شعور وادراک اور اس دُنیا کے ساتھ علاقہ باقی رہ سکتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہداء کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اُن کی ارواح کا تعلق ان کے اجساد اور قبور کے ساتھ قائم رہتا ہے اسی طرح جب اللہ تعالیٰ چاہیں تو دوسرے اموات کو یہ موقع دے سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو سماعِ اموات کے قائل ہیں، ان کا یہ قول بھی ایک صحیح حدیث کی بناء پر ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ منقول ہے وہ یہ ہے:

مَا مِنْ اَحَدٍ يَمُرُّ بِقَبْرِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ كَانَ يَعْرِفُهٗ فِي الدُّنْيَا فَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ رُوْحَهٗ حَتّٰى يَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ۔ [2] (ذکرہ ابن کثیر فی تفسیرہ مصححا عن ابن عمرؓ)

جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی قبر پر گزرتا ہے جس کو وہ دُنیا میں پہچانتا تھا اور وہ اس کو سلام کرے تو اللہ تعالیٰ اُس مُردے کی روح اس میں واپس بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ سلام کا جواب دے۔

اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص اپنے مُردہ مسلمان بھائی کی قبر پر جا کر سلام کرتا ہے تو وہ مردہ اس کے سلام کو سُنتا ہے اور جواب دیتا ہے اور اُس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس وقت اس کی رُوح اس دُنیا میں واپس بھیج دیتے ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں اول یہ کہ مُردے سُن سکتے ہیں دوسرے یہ کہ اُن کا سننا اور ہمارا سُنانا ہمارے اختیار میں نہیں البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہیں سُنادیں، جب نہ چاہیں نہ سُنائیں۔ مسلمان کے سلام کرنے کے وقت تو اس حدیث نے بتلادیا کہ حق تعالیٰ مُردہ کی روح واپس لاکر اس کو سلام سُنادیتے ہیں اور اس کو سلام کا جواب دینے کی بھی قدرت دیتے ہیں۔ باقی حالات وکلمات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ مُردہ ان کو سُنے گا یا نہیں۔ اسی لئے امام غزالی اور

[1] ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں اُن کی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

[2] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:٦ ص:٣٢٥، وكنز العمال، رقم الحديث:٤٢٥٥٦، وجامع الأحاديث للسيوطيؒ، رقم الحديث:٢٠٦٣٢

علامہ سبکی وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ اتنی بات تو احادیثِ صحیحہ اور قرآن کی آیت مذکورہ سے ثابت ہے کہ بعض اوقات میں مُردے زندوں کا کلام سُنتے ہیں لیکن یہ ثابت نہیں کہ ہر مُردہ ہر حال میں ہر شخص کے کلام کو ضرور سُنتا ہے اس طرح آیات وروایات کی تطبیق بھی ہوجاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مُردے ایک وقت میں اَحیاء کے کلام کو سُن سکیں دوسرے وقت نہ سُن سکیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کے کلام کو سُنیں بعض کے کلام کو نہ سُنیں، یا بعض مردے سُنیں بعض نہ سُنیں، کیونکہ سورۂ نمل، سورۂ روم، سورۂ فاطر کی آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مُردوں کو سُنانا ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں سُنا دیتے ہیں۔ اس لئے جن مواقع میں حدیث کی روایات صحیحہ سے سُننا ثابت ہے وہاں سُننے پر عقیدہ رکھا جائے اور جہاں ثابت نہیں وہاں دونوں احتمال ہیں اس لئے نہ قطعی اثبات کی گنجائش ہے نہ قطعی نفی کی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اس مسئلہ کی مکمل تحقیق میں احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام تکمیل الحبور بسماع اہلِ القبور لکھا ہے جو احکام القرآن سورۂ روم حزب خامس میں بزبان عربی شائع ہوا ہے جس میں آیات وروایات اور اقوال سلف وخلف اور شرح الصدور وغیرہ سے بہت سے واقعات ومخاطبات اہلِ قبور کے نقل کئے گئے ہیں۔ اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے یہاں اس کا ضروری خلاصہ لکھا گیا ہے۔

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ

اور جب پڑ چکے گی اُن پر بات نکالیں گے ہم اُن کے آگے ایک جانور زمین سے اُن سے باتیں کرے گا

أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾ ع

اس واسطے کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان لوگوں پر آپہنچے گا تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے بات کرے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ (۸۲)

خلاصۂ تفسیر

اور جب وعدہ (قیامت کا) ان (لوگوں) پر پورا ہونے کو ہوگا (یعنی قیامت کا زمانہ قریب آپہنچے گا) تو ہم اُن کے

لئے زمین سے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے کہ وہ اُن سے باتیں کرے گا کہ (کافر) لوگ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) آیتوں پر (خصوصاً اُن آیتوں پر جو قیامت کے متعلق ہیں) یقین نہیں لاتے تھے (مگر اب قیامت آ پہنچی اُس کی علامتوں میں ایک علامت میرا ظہور بھی ہے)۔

معارف و مسائل

دابۃ الارض کیا ہے اور کہاں اور کب نکلے گا؟

مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو: ۱- آفتاب کا جانب مغرب سے طلوع ہونا، ۲- دُخان، ۳- دابہّ، ۴- خروجِ یأجوج وماجوج، ۵- نزولِ عیسیٰ علیہ السلام، ۶- دجّال، ۷، ۸، ۹- تین خسوف، ایک مغرب میں دوسرا مشرق میں تیسرا جزیرۃ العرب میں ہوگا، ۱۰- ایک آگ جو قعرِ عدن سے نکلے گی لوگوں کو ہنکا کر میدانِ حشر کی طرف لے آئے گی جس مقام پر لوگ رات گزارنے کے لئے ٹھہریں گے یہ آگ بھی ٹھہر جائے گی پھر اُن کو لے چلے گی۔ (ھکذا رواہ مسلم واھل السنن من طرق وقال الترمذی حدیث حسن صحیح) [۱]

اس حدیث سے قربِ قیامت میں زمین سے ایک ایسے جانور کا نکلنا ثابت ہوا جو لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اور لفظ دَآبَّةً کی تنوین میں اس جانور کے عجیب الخلقت ہونے کی طرف بھی اشارہ پایا گیا، اور یہ بھی کہ یہ عام جانوروں کی طرح توالد وتناسل کے طریق پر پیدا نہیں ہوگا بلکہ اچانک زمین سے نکلے گا اور یہ بات بھی اسی حدیث سے سمجھ میں آتی ہے کہ دابۃ الارض کا خروج بالکل آخری علامات میں سے ہوگا جس کے بعد بہت جلد قیامت آجائے گی۔ ابنِ کثیر نے بحوالہ ابوداؤد طیالسی حضرت طلحہ بن عمر سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ یہ دابۃ الارض مکہ مکرمہ میں کوہِ صفا سے نکلے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا مسجد حرام میں حجرِ اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان پہنچ جائے گا لوگ اس کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے ایک جماعت رہ جائے گی یہ دابہ اُن کے چہروں کو ستاروں کی طرح روشن کردے گا۔ اس کے بعد وہ زمین کی طرف نکلے گا، ہر کافر کے چہرے پر کفر کا نشان لگادے گا۔ کوئی اس کی پکڑ سے بھاگ نہ سکے گا یہ ہر مؤمن وکافر کو پہچانے گا (ابن کثیر) [۲]

---

[۱] مسند احمد، (مسند حذیفۃ بن اسید الغفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رقم الحدیث:۱۶۲۴۴، وجامع الترمذی، ابواب الفتن، با ما جاء فی الخسف ج:۲ ص:۴۱، وصحیح مسلم، کتاب الفتن، باب فی عشر آیات ج:۲ ص:۳۹۳

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۲۱۱، ۲۱۲، ومسند الطیالسیؒ، رقم الحدیث:۱۱۵۲

اور مسلم بن حجاج نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی تھی جس کو میں کبھی بھولتا نہیں وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی آخری علامات میں سب سے پہلے آفتاب کا طلوع مغرب کی طرف سے ہوگا اور آفتاب بلند ہونے کے بعد دابۃ الارض نکلے گا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہو جائے اس کے فوراً بعد قیامت آجائے گی۔ (ابن کثیر) [1]

شیخ جلال الدین محلی نے فرمایا کہ خروجِ دابہ کے وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام منقطع ہو جائیں گے اور اس کے بعد کوئی کافر اسلام قبول نہ کرے گا۔ یہ مضمون بہت سی احادیث و آثار سے مستنبط ہوتا ہے (مظہری) [2] ابن کثیر وغیرہ نے اس جگہ دابۃ الارض کی ہیئت اور کیفیات وحالات کے متعلق مختلف روایات نقل کی ہیں جن میں سے اکثر قابلِ اعتماد نہیں اس لئے جتنی بات قرآن کی آیات اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ عجیب الخلقت جانور ہوگا۔ بغیر توالد وتناسل کے زمین سے نکلے گا۔ اس کا خروج مکہ مکرمہ میں ہوگا پھر ساری دنیا میں پھرے گا۔ یہ کافر و مؤمن کو پہچانے گا۔ اور اُن سے کلام کرے گا۔ بس اتنی بات پر عقیدہ رکھا جائے، زائد کیفیات وحالات کی تحقیق و تفتیش نہ ضروری ہے نہ اس سے کچھ فائدہ ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ دابۃ الارض لوگوں سے کلام کرے گا اس کا کیا مطلب ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ اُس کا کلام یہی ہوگا جو قرآن میں مذکور ہے اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾ یہ کلام وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو سُنائے گا، بہت سے لوگ آج سے پہلے ہماری آیتوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور مطلب یہ ہوگا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اُن سب کو یقین ہو جائے گا مگر اس وقت کا یقین شرعاً معتبر نہیں ہوگا۔ اور حضرت ابنِ عباسؓ، حسن بصریؒ، قتادہؒ سے منقول ہے اور ایک روایت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بھی ہے کہ یہ دابہ لوگوں سے خطاب اور کلام کرے گا جس طرح عام کلام ہوتا ہے۔ (ابن کثیر) [3]

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جس دن گھیر بُلا لائیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے ایک جماعت جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو پھر ان کی جماعت بندی ہوگی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن باب ذکر خروج الدجال۔

[2] تفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۷ ص:۱۳۴

[3] تفسیر ابن کثیر (باختصار) ج:۶ ص:۲۱۴

حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ

یہاں تک کہ جب حاضر ہو جائیں فرمائے گا کیوں جھٹلایا تم نے میری باتوں کو اور نہ آچکی تھیں تمہاری سمجھ میں یا بولو کہ کیا

تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٨٥﴾

کرتے تھے اور پڑ چکی اُن پر بات اس واسطے کہ انہوں نے شرارت کی تھی اب وہ کچھ نہیں بول سکتے

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنائی رات کہ اس میں چین حاصل کریں اور دن بنایا دیکھنے کو البتہ اس میں

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٨٦﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں اور جس دن پھونکی جائے گی صور تو گھبرا جائے جو کوئی ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿٨٧﴾

آسمان میں اور جو کوئی ہے زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے اور سب چلے آئیں اس کے آگے عاجزی سے

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْۤ

اور تو دیکھے پہاڑوں کو سمجھے کہ وہ جم رہے ہیں اور وہ چلیں گے جیسے چلے بادل کاری گری اللہ کی جس نے

اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٨٨﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ

درست کیا ہے ہر چیز کو اس کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو جو کوئی لے کر آیا بھلائی تو اُس کو ملے

خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ

اُس سے بہتر اور ان کو گھبراہٹ سے اس دن امن ہے اور جو کوئی لے کر آیا بُرائی سو اوندھے ڈالیں

وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٠﴾

اُن کے منہ آگ میں وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُس دن کو نہ بھولو جب ہم ہر اُمت میں سے اُن لوگوں کی پوری فوج کو گھیر لائیں گے جو ہماری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے، پھر اُن کی جماعت بندی کی جائے گی۔ ﴿۸۳﴾ یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے تو اللہ کہے گا کہ: ''کیا تم نے میری آیتوں کو پوری طرح سمجھے بغیر ہی جھٹلا دیا تھا، یا کیا کرتے رہے تھے؟'' ﴿۸۴﴾ اور اُنہوں نے جو ظلم کیا تھا، اُس کی وجہ سے اُن پر عذاب کی بات پوری ہو جائے گی، چنانچہ وہ کچھ بول نہیں سکیں گے۔ ﴿۸۵﴾ کیا اُنہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے رات اس لئے بنائی ہے کہ وہ اُس میں سکون حاصل کریں، اور دن اس طرح بنایا ہے کہ اُس میں چیزیں دِکھائی دیں؟ یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ ﴿۸۶﴾ اور جس دن صور پھونکا جائے گا، تو آسمانوں اور زمین کے سب رہنے والے گھبرا اُٹھیں گے، ___ سوائے اُن کے جنہیں اللہ چاہے گا، ___ اور سب اُس کے پاس جھکے ہوئے حاضر ہوں گے۔ ﴿۸۷﴾ تم (آج) پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو سمجھتے ہو کہ یہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں، حالانکہ (اُس وقت) وہ اس طرح پھر رہے ہوں گے جیسے بادل پھرتے ہیں۔ یہ سب اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مستحکم طریقے سے بنایا ہے۔ یقیناً اُسے پوری خبر ہے کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ ﴿۸۸﴾ جو کوئی نیکی لے کر آئے گا اُسے اُس سے بہتر بدلہ ملے گا، اور ایسے لوگ اُس دن ہر قسم کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ ﴿۸۹﴾ اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا، تو ایسے لوگوں کو منہ کے بل آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ تمہیں کسی اور بات کی نہیں، اُنہی اعمال کی سزا دی جائے گی جو تم کیا کرتے تھے۔ ﴿۹۰﴾

خلاصۂ تفسیر

جس دن (قبروں سے زندہ کرنے کے بعد) ہم ہر اُمت میں سے (یعنی اُمم سابقہ میں سے بھی اور اس اُمت میں سے بھی) ایک ایک گروہ اُن لوگوں کا (حساب کے لئے) جمع کریں گے جو میری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے (پھر اُن کو موقف کی طرف حساب کے لئے روانہ کیا جائے گا اور چونکہ یہ کثرت سے ہوں گے اس لئے) اُن کو (چلنے میں پچھلوں سے آملنے کے واسطے) روکا جائے گا (تاکہ آگے پیچھے نہ رہیں سب ساتھ ہو کر موقف حساب کی طرف چلیں۔ مراد اس سے کثرت کا

بیان ہے کیونکہ بڑے مجمع میں عادۃً ایسا ہوتا ہے خواہ روک ٹوک ہو یا نہ ہو) یہاں تک کہ جب (چلتے چلتے موقف میں) حاضر ہو جائیں گے تو (حساب شروع ہوگا اور) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم اُن کو اپنے احاطۂ علمی میں بھی نہیں لاتے (جس کے بعد غور کرنے کا موقع ملتا اور غور کر کے اُس پر کچھ رائے قائم کرتے، مطلب یہ کہ سنتے ہی بلا تدبّر و تفکر، اُن کی تکذیب کر دی اور تکذیب ہی پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ (یاد تو کرو اس کے علاوہ) اور بھی کیا کیا کام کرتے رہے (مثلاً انبیاء کو اور اہلِ ایمان کو ایذائیں دیں جو تکذیب سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اور عقائدِ کفریہ اور فسق و فجور میں مبتلا رہے) اور (اب وہ وقت ہے کہ) اُن پر (بوجہ قائم ہو جانے جُرم کے) وعدہ (عذاب کا) پورا ہو گیا (یعنی سزا کا استحقاق ثابت ہو گیا) بوجہ اس کے کہ (دُنیا میں) اُنہوں نے (بڑی بڑی) زیادتیاں کی تھیں (جن کا آج ظہور ثابت ہو گیا) سو (چونکہ ثبوت قوی ہے اس لئے) وہ لوگ (عذر وغیرہ کے متعلق) بات بھی نہ کر سکیں گے (اور بعض آیات میں جو ان کا عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ ابتداء میں ہوگا پھر بعد اقامتِ حجت کوئی بات نہ کہہ سکیں گے۔ اور یہ لوگ جو امکانِ قیامت کے منکر ہیں تو حماقتِ محضہ ہے کیونکہ علاوہ دلائلِ نقلیہ صادقہ کے اس پر دلیلِ عقلی بھی تو قائم ہے مثلاً) کیا انہوں نے اس پر نظر نہیں کی ہم نے رات بنائی تاکہ لوگ اس میں آرام کریں (اور یہ آرام مشابہ موت کے ہے) اور دن بنایا جس میں دیکھیں بھالیں (جو کہ موقوف ہے بیداری پر اور وہ مشابہ حیات بعد الموت کے ہے پس) بلاشبہ اس (روزانہ خواب و بیداری) میں (امکانِ بعث پر اور ان آیات کے حق ہونے پر جو اس پر دال ہیں) بڑی دلیلیں ہیں (کیونکہ موت کی حقیقت یہ ہے کہ روح کا تعلق جسم سے زائل ہو جائے، اور حیاتِ ثانیہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلق پھر عود کر آئے، اور نیند بھی ایک حیثیت سے زوال ہے اس تعلق کا، کیونکہ نیند میں یہ تعلق ضعیف ہو جاتا ہے اور ضعف جبھی ہوتا ہے جبکہ اس کے مراتبِ وجود میں کوئی مرتبہ زائل ہو جائے، اور بیداری اس زائل شدہ مرتبۂ وجود کے عود کا نام ہے اس لئے دونوں میں تشابہ تام ہو گیا۔ اور نیند کے بعد بیداری پر اللہ تعالیٰ کی قدرت روزانہ مشاہدہ میں آتی ہے تو موت کے بعد زندگی بھی اُس کی نظیر ہے وہ کیوں اللہ کی قدرت سے خارج ہوگا اور یہ دلیلِ عقلی ہر شخص کے لئے عام ہے مگر باعتبار انتفاع کے) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہے) جو ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ وہ غور و فکر کرتے ہیں، اور دوسرے تدبّر نہیں کرتے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے نظر و فکر ضروری ہے اس لئے دوسرے اس سے منتفع نہیں ہوتے) اور (ایک واقعہ ہولناک اس حشر مذکور سے پہلے ہوگا جس کا آگے ذکر ہے اُس کی ہیبت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی (یہ نفخۂ اولیٰ ہے اور حشر مذکور نفخۂ ثانی کے بعد تھا) سو جتنے آسمان اور زمین میں (فرشتے اور آدمی وغیرہ) ہیں سب گھبرا جائیں گے (اور پھر مر جائیں گے اور جو مر چکے ہیں ان کی روحیں بیہوش ہو جائیں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس گھبراہٹ سے اور موت سے محفوظ رہے گا۔

مرادان سے حسب حدیث مرفوع جبرئیل ومیکائیل واسرافیل وملک الموت وحاملانِ عرش ہیں۔ پھران سب کی بھی بدون اثر نفخه وفات ہوجائے گی۔ كذا في الدر المنثور، [1] سورة الزمر) اور (دُنیا میں جیسے عادت ہے کہ جس سے گھبراہٹ اور ڈر ہوتا ہے اس سے بھاگ جاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ سے کوئی بھاگ نہ سکے گا بلکہ) سب کے سب اُسی کے سامنے دبے جھکے حاضر رہیں گے (یہاں تک کہ زندہ آدمی مُردہ اور مُردے بیہوش ہوجائیں گے) اور (نفخه کی یہ تغیر وتاثیر جانداروں میں ہوگی اور آگے بے جان چیزوں میں جو تاثیر ہوگی اس کا بیان ہے وہ یہ کہ اے مخاطب) تو (اس وقت) پہاڑوں کو ایسی حالت میں دیکھ رہا ہے جس سے (ان کے ظاہری استحکام کے سبب بادی النظر میں) تجھ کو خیال ہوتا ہے کہ یہ (ہمیشہ یوں ہی رہیں گے اور کبھی اپنی جگہ سے) جنبش نہ کریں گے حالانکہ (اس وقت ان کی یہ حالت ہوگی کہ) وہ بادلوں کی طرح (متخلخل اور خفیف اوراجزاءِ منتشرہ ہوکر فضائے آسمانی میں) اُڑے اُڑے پھریں گے (كقوله تعالى [2] وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴿۶﴾ (الواقعة) اور اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے کہ ایسی ثقیل اور سخت چیز کا یہ حال کیسے ہوجائے گا، وجہ یہ کہ) یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) بنا رکھا ہے (اور ابتداء میں کسی شئ میں کوئی مضبوطی نہ تھی کیونکہ خود اس شئے کی ذات ہی نہ تھی، پس مضبوطی کی صفت تو بدرجۂ اولیٰ نہ تھی سو جیسے اس نے معدوم سے موجود اور ضعیف سے قوی بنایا اسی طرح اس کا عکس بھی کرسکتا ہے کیونکہ قدرتِ ذاتیہ کی نسبت تمام مقدورات کے ساتھ یکساں ہے، بالخصوص جو چیزیں ایک دوسرے کی نظیر اور مشابہ ہیں ان میں تو زیادہ واضح ہے۔ اِسی طرح دوسری مخلوقاتِ قویّہ آسمان وزمین وغیرہ میں تغیرِ عظیم ہونا دوسری آیات میں مذکور ہے [3] وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ الخ (الحاقة) پھر اس کے بعد نفخۂ ثانیہ ہوگا جس سے ارواح ہوش میں آکر اپنے ابدان سے متعلق ہوجائیں گی اور پورا عالم نئے سرے سے درست ہوجائے گا اور اوپر جو حشر کا ذکر تھا وہ اسی نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا۔ آگے اصل مقصود یعنی قیامت میں جزاء وسزا کا بیان ہے۔ پس اوّل اس کی تمہید کے طور پر ارشاد ہے کہ) یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب افعال کی پوری خبر ہے (جو جزاء وسزا کی پہلی شرط ہے اور دوسری شرائط بھی مثل قدرت وغیرہا مستقل دلائل سے ثابت ہیں، پس مجازات کا ممکن ہونا تو اس سے ظاہر ہے اور پھر حکمت مقتضی ہے وقوع مجازات کو، اس سے جزاء وسزا کا واقع ہونا ثابت ہوگیا، تمہید کے بعد آگے اس کا وقوع مع اس کے قانون اور طریقہ کے بیان فرماتے ہیں

---

[1] الدر المنثور ج:۸ ص:۴۷۵، تفسير سورة الزمر، آيت:۶۸

[2] ترجمہ: اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہوجائیں گے پھر وہ پراگندہ غبار ہوجائیں گے۔

[3] ترجمہ: اور زمین اور پہاڑ اٹھالئے جائیں گے پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے تو اس روز وہ ہونے والی چیز ہوپڑے گی اور آسمان پھٹ جائے گا۔

کہ) جو شخص نیکی (یعنی ایمان) لائے گا سو (وہ ایمان لانے پر جس اجر کا مستحق ہے) اس شخص کو اس (نیکی کے اجر مذکور) سے بہتر (اجر) ملے گا اور وہ لوگ بڑی گھبراہٹ سے اس روز امن میں رہیں گے (جیسا کہ سورۂ انبیاء میں ہے [1] لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ الآیۃ (الانبیاء: ۱۰۳)) اور جو شخص بدی (یعنی کفر و شرک) لائے گا تو وہ لوگ اوندھے منہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے (اور اُن سے کہا جائے گا کہ) تم کو تو اُنہی اعمال کی سزا دی جارہی ہے جو تم (دُنیا میں) کیا کرتے تھے (یہ عذاب بے وجہ نہیں) ۔

معارف و مسائل

فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿۸۳﴾ وزع سے مشتق ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگلے حصّہ کو روکا جائے گا تا کہ پیچھے رہے ہوئے لوگ ساتھ ہو جائیں اور بعض حضرات نے وزع کے معنی یہاں دفع کے لئے ہیں یعنی ان کو دھکّے دے کر موقف کی طرف لایا جائے گا وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب خود ایک بڑا جرم و گناہ ہے خصوصاً جبکہ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی طرف توجہ کئے بغیر ہی تکذیب کرنے لگیں تو یہ جُرم دوہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ غور و فکر کرنے کے باوجود حق کو نہ پاسکیں کہ اُن کی نظر و فکر ہی گمراہی کی طرف لے جائے تو اُن کا جرم کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے اگر چہ اللہ کے وجود اور توحید وغیرہ کی تکذیب پھر بھی کفر و ضلال اور دائمی عذاب سے نہیں بچائے گی کیونکہ یہ ایسے بدیہی اُمور ہیں جن میں نظر و فکر کی غلطی معاف نہیں۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ، فزع کے معنے گھبرانے اور پریشان ہونے کے ہیں، اور ایک دوسری آیت میں اس جگہ فَزِعَ کے بجائے صَعِقَ آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں۔ اگر یہ دونوں آیتیں پہلے نفخۂ صور کے متعلق قرار دی جائیں تو ان دونوں لفظوں کا حاصل یہ ہوگا کہ صور پھونکنے کے وقت اول تو سب گھبرائیں گے اور پریشان ہوں گے پھر بیہوش ہو جائیں گے بالآخر مر جائیں گے۔ اور قتادہ وغیرہ ائمۂ تفسیر نے اس آیت کو نفخۂ ثانیہ کے متعلق قرار دیا ہے جس سے سب مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ سب زندہ ہونے کے وقت گھبرائے ہوئے اُٹھیں گے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صُور تین مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلا نفخہ نفخہ فزع ہوگا جس سے سب پریشانی گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ دوسرا نفخۂ صعق ہوگا جس سے سب مر جائیں گے، تیسرا نفخہ نفخہ حشر و نشر ہوگا جس سے سب مُردے زندہ ہو جائیں گے۔ مگر آیاتِ قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثبوت دو ہی

[1] ترجمہ: ان کو بڑی گھبراہٹ غم میں نہ ڈالے گی۔

نفخوں کا ملتا ہے (قرطبی وابن کثیر) [۱] ابن مبارک نے حضرت حسن بصری سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ (قرطبی) [۲]

إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۚ یہ استثناء فزع سے ہے جس کے معنے گھبراہٹ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن پر کوئی گھبراہٹ حشر کے وقت نہیں ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ یہ لوگ شہداء ہوں گے حشر کی دوبارہ زندگی کے وقت ان پر کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی (صححہ الحدیث ابن العربی (قرطبی) [۳] سعید بن جبیرؒ نے بھی یہی فرمایا کہ مراد اس سے شہداء ہیں جو حشر کے وقت اپنی تلواریں باندھے ہوئے عرش کے گرد جمع ہوں گے اور قشیری نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام ان میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں کیونکہ ان کو مقامِ شہادت بھی حاصل ہے اور مقامِ نبوّت مزید براں ہے۔ (قرطبی) [۴]

اور سورۂ زُمر میں آگے آئے گا [۵] وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۚ (الزمر:٦٨) اس میں فزع کے بجائے صعق کا لفظ آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں۔ اور مراد اس جگہ بیہوش ہونا پھر مرجانا ہے اور اس میں بھی إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۚ کا استثناء ہے اور اس استثناء سے مراد مرفوع حدیث کے مطابق چھ فرشتے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حملۃ العرش ہیں کہ یہ نفخۂ صور سے نہ مریں گے، [۶] بعد میں حسب تصریح حدیث ان سب کو بھی موت آئے گی۔ جن حضرات مفسرین نے فزع اور صعق کو ایک ہی قرار دیا ہے، انہوں نے سورۂ زمر کی طرح یہاں بھی استثناء سے مراد مخصوص فرشتے لئے ہیں خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا اور جنہوں نے فزع اور صعق کو الگ الگ مانا ہے ان کے نزدیک فزع سے مستثنیٰ شہداء ہیں جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ مراد یہ ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر اس طرح چلیں گے جیسے بادل کہ دیکھنے والا اس کو اپنی جگہ جما ہوا سمجھتا ہے حالانکہ وہ تیزی سے چل رہے ہیں۔ تمام بڑے اجسام جن کی ابتداء وانتہاء انسان کی نظر کے سامنے نہیں ہوتی جب وہ کسی ایک سمت کی طرف حرکت کریں تو خواہ حرکت کتنی بھی تیز ہو دیکھنے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:٦ ص:٢١٦، وتفسير القرطبي ج:١٣ ص:٢٤٠، ومسند اسحاق بن راهويه، رقم الحديث:١٠

[۲] تفسير القرطبي ج:١٣ ص:٢٤٠

[۳] تفسير القرطبي ج:١٣ ص:٢٤١، وشعب الإيمان للبيهقيؒ، رقم الحديث:٣٦٠، والمستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث:٣٠٠٠

[۴] تفسير القرطبي ج:١٣ ص:٢٤١

[۵] ترجمہ: اور صور میں پھونک ماری جائے گی سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے۔

[۶] قد مرّ تخريجه۔

والوں کو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں جس کا مشاہدہ سب کو گہرے بادل اور دُور تک چھائی ہوئی گھٹا سے ہوتا ہے کہ یہ بادل اپنی جگہ جمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوتے ہیں مگر ان کی حرکت دیکھنے والوں کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب وہ اتنی دُور چلے جائیں کہ افق کا کنارہ اس سے کھل جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہاڑوں کا جامد ہونا دیکھنے والے کی نظر کے اعتبار سے ہے اور اس کا حرکت کرنا حقیقت کے اعتبار سے۔ عامۂ مفسرین نے آیت کا مطلب یہی قرار دیا ہے اور خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ یہ دو حال دو وقتوں کے ہیں۔ جامد ہونا اس وقت کے اعتبار سے جس کو دیکھ کر ہر دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے، اور تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ قیامت کے دن کے اعتبار سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ قرآن کریم میں قیامت کے روز پہاڑوں کے حالات مختلف بیان ہوئے ہیں۔ پہلا حال اندکاک اور زلزلہ ہے جو پوری زمین کے پہاڑوں کو محیط ہوگا۔ اِذَا دُكَّتِ الۡاَرۡضُ دَكًّا (الفجر:۲۱)

اور اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝۱ (الزلزال)، دوسرا حال اس کی بڑی بڑی چٹانوں کا دُھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جانا ہے وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝۵ (القارعۃ) اور یہ اس وقت ہوگا جب اوپر سے آسمان بھی پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا زمین سے پہاڑ روئی کی طرح اوپر جائیں گے اُوپر سے آسمان نیچے آئیں گے اور دونوں مل جائیں گے یَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ۝۸ وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ ۝۹ (المعارج)۔ تیسرا حال یہ ہے کہ وہ دُھنکی ہوئی روئی کے ایک جسم متصل کے بجائے ریزہ ریزہ اور ذرّہ ذرّہ ہو جائے۔ وَبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۝۵ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۝۶ (الواقعۃ)۔ چوتھا حال یہ ہے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر پھیل جائے فَقُلۡ يَنۡسِفُهَا رَبِّىۡ نَسۡفًا ۝۱۰۵ (طٰہٰ)۔ پانچواں حال یہ ہے کہ یہ پہاڑ جو ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح زمین پر پھیل گئے ہیں ان کو ہوائیں اوپر اُٹھا کر لے جائیں اور چونکہ یہ غبار ساری زمین پر چھایا ہوگا تو اگرچہ یہ بادل کی طرح تیز حرکت کرتا ہوگا مگر دیکھنے والا اس کو اپنی جگہ جما ہوا دیکھے گا وَتَرَى الۡجِبَالَ تَحۡسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِىَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ان میں سے بعض حالات صور کے نفخہ اولیٰ کے وقت ہوں گے اور بعض نفخۂ ثانیہ کے بعد اس وقت جبکہ زمین کو ایک سطح مستوی بنا دیا جائے کہ نہ اس میں کوئی غار رہے گا نہ پہاڑ نہ کوئی عمارت نہ درخت۔ فَقُلۡ يَنۡسِفُهَا رَبِّىۡ نَسۡفًا ۝۱۰۵ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفۡصَفًا ۝۱۰۶ لَّا تَرٰى فِيۡهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا ۝۱۰۷ (طٰہٰ) (از قرطبی وروح المعانی) [1] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَىۡءٍ صُنع بمعنے صنعت ہے اور اتقن، اتقان سے مشتق ہے جس کے معنے کسی چیز کو

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۴۲ و۲۴۳، وروح المعانی ج:۱۵ ص:۶۰

مضبوط اور مستحکم کرنے کے آتے ہیں۔ بظاہر یہ جملہ تمام مضامین سابقہ کے ساتھ متعلق ہے جن میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور صنعتِ عجیبہ کا ذکر ہے جس میں لیل ونہار کا انقلاب بھی ہے اور نفخ صور سے لے کر حشر ونشر تک کے سب حالات بھی اور مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں کچھ حیرت اور تعجب کی نہیں کیونکہ ان کا صانع کوئی محدود علم وقدرت والا انسان یا فرشتہ نہیں، بلکہ رَبّ العالمین ہے۔ اور اگر اس کا تعلق قریبی جملے تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً الآیۃ سے کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہاڑوں کا یہ حال کہ دیکھنے والے ان کو جما ہوا دیکھیں اور وہ واقع میں چل رہے اور حرکت کر رہے ہوں کچھ مستبعد اور جائے تعجب نہیں کیونکہ یہ صنعت اللہ رَبّ العزّت کی ہے۔ جس کی قدرت میں سب کچھ ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا یہ حشر ونشر اور حساب کتاب کے بعد پیش آنے والے انجام کا ذکر ہے اور حسنہ سے مراد کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے (کما قال ابراھیم) یا اخلاص ہے (کما قال قتادہ) اور بعض حضرات نے مطلق طاعت کو اس میں داخل قرار دیا ہے۔ معنے یہ ہیں کہ جو شخص نیک عمل کرے گا اور نیک عمل اُسی وقت نیک کہلانے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اس کی پہلی شرط ایمان موجود ہو تو اُس کو اپنے عمل سے بہتر چیز ملے گی مراد اس سے جنت کی لازوال نعمتیں اور عذاب اور ہر تکلیف سے دائمی نجات ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ خیر سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کی جزاء دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گی۔ (مظہری) [1]

وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ فزع، سے مراد ہر بڑی مصیبت اور پریشانی اور گھبراہٹ ہے مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں تو ہر متقی پرہیزگار بھی انجام سے ڈرتا ہی رہتا ہے اور ڈرنا ہی چاہئے جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے [2] اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ (المعارج) یعنی رَبّ کا عذاب ایسا نہیں کہ اُس سے کوئی بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ واولیاءِ اُمت ہمیشہ خائف ولرزاں رہتے تھے مگر اس روز جبکہ حساب کتاب سے فراغت ہو چکے گی تو حسنہ لانے والے نیک لوگ ہر خوف وغم سے بے فکر اور مطمئن ہوں گے۔ واللہ اعلم

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ز

مجھ کو یہی حکم ہے کہ بندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی اور اسی کی ہے ہر ایک چیز

[1] تفسیر المظہری ج:۷ ص:۱۴۰، ۱۴۱

[2] ترجمہ: واقعی ان کے رَبّ کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں۔

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ

اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں حکم برداروں میں اور یہ کہ سُنادوں قرآن

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ

پھر جو کوئی راہ پر آیا سو راہ پر آئے گا اپنے ہی بھلے کو اور جو کوئی بہکا رہا تو کہدے کہ

اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ

میں تو یہی ہوں ڈر سُنادینے والا اور کہہ تعریف ہے سب اللہ کو آگے دکھائے گا تم کو اپنے نمونے

فَتَعْرِفُوْنَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

تو ان کو پہچان لوگے اور تیرا ربّ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ:) ''مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر کے رَبّ کی عبادت کروں جس نے اس شہر کو حرمت بخشی ہے، اور ہر چیز کا مالک وہی ہے، اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں فرماں برداروں میں شامل رہوں۔ ﴿۹۱﴾ اور یہ کہ میں قرآن کی تلاوت کروں۔'' اب جو شخص ہدایت کے راستے پر آئے، وہ اپنے ہی فائدے کے لئے راستے پر آئے گا، اور جو گمراہی اختیار کرے، تو کہہ دینا کہ: ''میں تو بس اُن لوگوں میں سے ہوں جو خبردار کرتے ہیں۔'' ﴿۹۲﴾ اور کہہ دو کہ: ''تمام تعریفیں اللہ کی ہیں، وہ تمہیں اپنی نشانیاں دِکھائے گا، پھر تم اُنہیں پہچان بھی لوگے۔ اور تمہارا پروردگار تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔'' ﴿۹۳﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہد یجئے کہ) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے مالک

(حقیقی) کی عبادت کیا کروں جس نے اس (شہر) کو محترم بنایا ہے (کہ حرم ہونا اسی احترام پر مرتب ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت میں کسی کو شریک نہ کروں) اور (اس کی عبادت کیوں نہ کی جائے جبکہ) سب چیزیں اسی کی (مِلک) ہیں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ میں (عقائد واعمال سب میں) فرمانبردار رہوں (یہ تو توحید کا حکم ہوا) اور (مجھ کو) یہ (بھی حکم ملا ہے) کہ میں (تم کو) قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں (یعنی احکامِ الٰہیہ کی تبلیغ کروں جو نبوّت کے لوازم میں سے ہے) سو (میری تبلیغ کے بعد) جو شخص راہ پر آئے گا تو اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آئے گا (یعنی اُس کو عذاب سے نجات اور جنت کی لازوال نعمتیں ملیں گی، میں اُس سے کسی اپنے مالی یا جاہی نفع کا خواہاں نہیں) اور جو شخص گمراہ رہے گا تو آپ کہہ دیجئے کہ (میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صرف ڈرانے والے (یعنی حکم سُنانے والے) پیغمبروں میں سے ہوں (یعنی میرا کام تو حکم پہنچا دینا ہے، اس کے بعد میری ذمہ داری ختم ہے نہ مانو گے تو وبال تمہیں ہی بھگتنا پڑے گا) اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم جو قیامت کے آنے میں دیر کو اُس کے نہ ہونے کی دلیل سمجھ کر انکار کرتے ہو یہ تمہاری بیوقوفی ہے کسی چیز کے واقع ہونے میں دیر لگنا اس کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ وہ کبھی واقع ہو ہی گی نہیں۔ اس کے علاوہ تم جو مجھ سے کہتے ہو کہ میں جلد قیامت لے آؤں یہ دوسری غلطی ہے کیونکہ میں نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ قیامت کا واقع کرنا میرے اختیار میں ہے بلکہ) سب خوبیاں خالص اللہ ہی کے لئے ثابت ہیں (قدرت بھی، علم بھی، حکمت بھی۔ جب اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا قیامت کو واقع کر دے گا۔ ہاں اتنی بات ہمیں بھی بتلا دی گئی ہے کہ قیامت میں زیادہ دیر نہیں بلکہ) وہ تم کو عنقریب اپنی نشانیاں (یعنی قیامت کے واقعات) دکھلا دے گا سو تم (وقوع کے وقت) اُن کو پہچانو گے (جبکہ پہچاننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا) اور (صرف یہ علامات دکھلانے ہی پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ اپنے بُرے اعمال کی سزا بھی بھگتنا پڑے گی کیونکہ) آپ کا رَبّ اُن کاموں سے بے خبر نہیں جو تم سب لوگ کر رہے ہو۔

معارف ومسائل

رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ، بلدۃ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک مکہ مکرمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تو رَبّ العالمین اور رَبُّ السمٰوات والارض ہے مکہ مکرمہ کی تخصیص اس جگہ اس کی عظمتِ شان اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم ومحترم ہونے کا اظہار ہے۔ لفظ حرم تحریم سے مشتق ہے اس کے معنے مطلق احترام واکرام کے بھی ہیں اور اس احترام واکرام کی وجہ سے جو خاص احکامِ شرعیہ مکہ مکرمہ اور ارضِ حرم سے متعلق ہیں وہ بھی اس میں داخل ہیں مثلاً جو شخص حرم میں پناہ لے وہ مأمون ہو جاتا

ہے۔حرم میں کسی دشمن سے انتقام لینا اور قتل کرنا جائز نہیں اور ارضِ حرم میں شکار کو قتل کرنا بھی جائز نہیں، درختوں کا کاٹنا جائز نہیں، ان احکام کا بیان آیت [1] وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (آل عمران: ۹۷) کے تحت میں اور کچھ سورۂ مائدہ کی شروع میں اور کچھ آیت [2] لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ (المائدۃ: ۹۵) کے تحت پہلے بیان ہو چکا ہے۔

الحمدللہ سورۂ نمل کی تفسیر آج شب دوشنبہ ۲۴ر شوال ۱۳۹۱ھ میں تمام ہوئی جبکہ ۱۴ر شوال سے ہندوستان کے ہندوؤں نے مغربی پاکستان پر بھرپور حملے میدانی اور بحری اور ہوائی کردیئے ہیں، کراچی خاص طور سے اس کا نشانہ ہے ہر رات بمباری ہوتی ہے، شہری آبادی پر بھی بم گرتے ہیں تمام رات مکمل اندھیرا رکھنا پڑتا ہے اور بموں کے دھماکے سے مکان لرزتے ہیں، مگر اللہ کا فضل وکرم ہے کہ اُس نے ان حالات میں بھی سلسلہ اس تفسیر کا جاری رکھا، اور اس جنگ کے دس روز میں بھی تفسیر کے تقریباً چالیس صفحات لکھے گئے۔

***

[1] ترجمہ: اور جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے۔

[2] ترجمہ: وحشی شکار کو قتل مت کرو جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو۔

سُورَةُ الْقَصَصِ

آیاتھا ۸۸ ۲۸ سُوْرَۃُ الْقَصَصِ مَکِّیَّۃٌ ۴۹ رکوعاتھا ۹

سورۂ قصص مکی ہے اور اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى

طٰسٓمّٓ یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی ہم سُناتے ہیں تجھ کو کچھ احوال موسیٰ

وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ

اور فرعون کا تحقیقی ان لوگوں کے واسطے جو یقین کرتے ہیں فرعون چڑھ رہا تھا ملک میں اور کر رکھا تھا

اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ

وہاں کے لوگوں کو کئی فرقے، کمزور کر رکھا تھا ایک فرقہ کو ان میں ذبح کرتا تھا اُن کے بیٹوں کو اور زندہ رکھتا تھا

نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ

ان کی عورتوں کو بیشک وہ تھا خرابی ڈالنے والا اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو

اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ لا

کمزور ہوئے پڑے تھے ملک میں اور کردیں اُن کو سردار اور کردیں اُن کو قائم مقام

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا

اور جمادیں اُن کو ملک میں اور دکھادیں فرعون اور ہامان کو اور ان کے لشکروں کو

مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ج

ان کے ہاتھ سے جس چیز کا اُن کو خطرہ تھا اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ

فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ج اِنَّا رَآدُّوْهُ

پھر جب تجھ کو ڈر ہو اس کا تو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو ہم پھر پہنچادیں گے اس کو

اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷﴾ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ

تیری طرف اور کردیں گے اُس کو رسولوں سے پھر اُٹھالیا اُس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو اُن کا

عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ﴿۸﴾

دشمن اور غم میں ڈالنے والا بیشک فرعون اور ہامان اور اُن کے لشکر تھے چوکنے والے

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰٓى

اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لئے اور تیرے لئے اس کو مت مارو، کچھ بعید نہیں

اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ وَاَصْبَحَ

جو ہمارے کام آئے یا ہم اس کو کرلیں بیٹا اور ان کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو

فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا

موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا قریب تھی کہ ظاہر کردے بیقراری کو، اگر نہ ہم نے گرہ دی ہوتی اس کے دل پر

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ

اس واسطے کہ رہے یقین کرنے والوں میں اور کہدیا اس کی بہن کو پیچھے چلی جا پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہوکر

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۱ۙ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ

اور اُن کو خبر نہ ہوئی اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ سے دائیوں کو پہلے سے پھر بولی

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝۱۲ فَرَدَدْنٰهُ

میں بتلاؤں تم کو ایک گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لئے اور وہ اس کا بھلا چاہنے والے ہیں پھر ہم نے پہنچا دیا اس کو

اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

اس کی ماں کی طرف کہ ٹھنڈی رہے اس کی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ ع

پر بہت لوگ نہیں جانتے

آسان ترجمۂ قرآن

طٰسٓمّٓ - ① یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو حقیقت واضح کرنے والی ہے۔ ② ہم ایمان والے لوگوں کے

فائدے کے لئے تمہیں موسیٰ اور فرعون کے کچھ حالات ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں۔ ③ واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی، اور اُس نے وہاں کے باشندوں کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا جن میں سے ایک گروہ کو اُس نے اتنا دبا کر رکھا ہوا تھا کہ اُن کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا، اور اُن کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو فساد پھیلایا کرتے ہیں۔ ④ اور ہم یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو زمین میں دبا کر رکھا گیا ہے، اُن پر احسان کریں، اُن کو پیشوا بنائیں، اُنہی کو (ملک و مال کا) وارث بنادیں، ⑤ اور اُنہیں زمین میں اقتدار عطا کریں، اور فرعون، ہامان اور اُن کے لشکروں کو وہی کچھ دکھا دیں جس سے بچاؤ کی وہ تدبیریں کر رہے تھے۔ ⑥ اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ: ”تم اس (بچے) کو دودھ پلاؤ، پھر جب تمہیں اس کے بارے میں کوئی خطرہ ہو تو اُسے دریا میں ڈال دینا، اور ڈرنا نہیں، اور نہ صدمہ کرنا، یقین رکھو ہم اُسے واپس تمہارے پاس پہنچا کر رہیں گے، اور اُس کو پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر بنائیں گے۔“ ⑦ اس طرح فرعون کے لوگوں نے اُس بچے (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام) کو اُٹھا لیا، تاکہ آخرکار وہ اُن کے لئے دُشمن اور غم کا ذریعہ بنے۔ بیشک فرعون، ہامان اور اُن کے لشکر بڑے خطا کار تھے۔ ⑧ اور فرعون کی بیوی نے (فرعون سے) کہا کہ: ”یہ بچہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اسے قتل نہ کرو، کچھ بعید نہیں کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے، یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔“ اور (یہ فیصلہ کرتے وقت) اُنہیں انجام کا پتہ نہیں تھا۔ ⑨ ادھر موسیٰ کی والدہ کا دِل بے قرار تھا۔ قریب تھا کہ وہ یہ سارا راز کھول دیتیں، اگر ہم نے ان کے دِل کو سنبھالا نہ ہوتا، تاکہ وہ (ہمارے وعدے پر) یقین کئے رہیں۔ ⑩ اور اُنہوں نے موسیٰ کی بہن سے کہا کہ: ”اس بچے کا کچھ سراغ لگاؤ۔“ چنانچہ اُس نے بچے کو دُور سے اس طرح دیکھا کہ اُن لوگوں کو پتہ نہیں چلا۔ ⑪ اور ہم نے موسیٰ پر پہلے ہی سے یہ بندش لگا دی تھی کہ دُودھ پلانے والیاں اُنہیں دُودھ نہ پلاسکیں، اس لئے اُن کی بہن نے کہا: ”کیا میں تمہیں ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ تمہارے لئے اس بچے کی پرورش کریں، اور اس کے خیر خواہ رہیں؟“ ⑫ اس طرح ہم نے موسیٰ کو اُن کی ماں کے پاس لوٹا دیا، تاکہ اُن کی آنکھ ٹھنڈی رہے، اور وہ غمگین نہ ہوں، اور تاکہ اُنہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ⑬

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓمٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر وحی کئے جاتے ہیں) کتاب واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جن میں اس مقام پر) ہم آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر (یعنی نازل کرکے) سُناتے ہیں ان لوگوں کے (نفع کے) لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ مقاصد قصص کے یعنی عبرت اور ان

سے نبوّت پر استدلال وغیرہ یہ مؤمنین ہی کے ساتھ خاص ہیں خواہ اس وقت مؤمن ہوں یا ایمان کا ارادہ رکھتے ہوں اور اجمال تو اس قصّہ کا یہ ہے کہ) فرعون سرزمینِ (مصر) میں بہت چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا (اس طرح کہ قبطیوں یعنی مصری لوگوں کو معزز بنا رکھا تھا اور سبطیوں یعنی بنی اسرائیل کو پست اور خوار کر رکھا تھا جس کا آگے بیان ہے) کہ ان (باشندوں) میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا (اس طرح سے کہ) ان کے بیٹوں کو (جو نئے پیدا ہوتے تھے جلّادوں کے ہاتھوں) ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو زندہ رہنے دیتا تھا (تاکہ ان سے خدمت لی جائے و نیز ان سے اندیشہ بھی نہ تھا) واقعی وہ بڑا مفسد تھا (غرض فرعون تو اس خیال میں تھا) اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین (مصر) میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر (دُنیوی و دینی) احسان کریں اور (وہ احسان یہ کہ) ان کو (دین میں) پیشوا بنا دیں اور (دُنیا میں) ان کو (اس ملک کا) مالک بنائیں اور (مالک ہونے کے ساتھ) ان کو (مُلک بھی بنائیں یعنی) زمین میں ان کو حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان (بنی اسرائیل) کی جانب سے وہ (ناگوار) واقعات دکھلائیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے (مراد اس سے زوالِ سلطنت و ہلاکت ہے کہ اسی سے بچاؤ کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے بچوں کو ایک تعبیر خواب کی بناء پر جو فرعون نے دیکھا تھا اور نجومیوں نے تعبیر دی تھی قتل کر رہا تھا (کذا فی الدر المنثور)[1] پس ہمارے قضاء و قدر کے سامنے ان لوگوں کی تدبیر کچھ کام نہ آئی، یہ اجمال قصّہ کا ہوا) اور (تفصیل اس کی اوّل سے یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اسی پُر آشوب زمانہ میں پیدا ہوئے تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو الہام کیا کہ (جب تک ان کا اِخفا ممکن ہو) تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو (بے خوف و خطر) ان کو (صندوق میں رکھ کر) دریا (یعنی نیل) میں ڈال دینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت پر) غم کرنا (کیونکہ) ہم ضرور ان کو پھر تمہارے ہی پاس واپس پہنچا دیں گے اور (پھر اپنے وقت پر) ان کو پیغمبر بنا دیں گے (غرض وہ اسی طرح دودھ پلاتی رہیں۔ پھر جب افشائے راز کا خوف ہوا تو صندوق میں بند کر کے اللہ کے نام پر نیل میں چھوڑ دیا، اس کی کوئی شاخ فرعون کے محل میں جاتی تھی یا تفریحاً فرعون کے متعلقین دریا کی سیر کو نکلے تھے۔ غرض وہ صندوق کنارے پر لگا) تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (یعنی مع صندوق کے) اُٹھا لیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنیں، بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین (اس بارہ میں) بہت چُوکے (کہ اپنے دشمن کو اپنی بغل میں پالا) اور (جب وہ صندوق سے نکال کر فرعون کے سامنے لائے گئے تو) فرعون کی بی بی (حضرت آسیہ) نے (فرعون) سے کہا کہ یہ (بچہ) میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (یعنی اس کو دیکھ کر جی خوش ہوا کرے گا تو) اس کو قتل مت کرو عجب نہیں کہ (بڑا ہو کر) ہم کو کچھ فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو (اپنا) بیٹا ہی بنا لیں اور ان لوگوں کو

[1] الدر المنثور ج:۷ ص:۴۶۸

(انجام کی) خبر نہ تھی (کہ یہ وہی بچہ ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت غارت ہوگی) اور (ادھر یہ قصہ ہوا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (خیالات مختلفہ کے ہجوم سے) بیقرار ہوگیا (اور بیقراری بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ ایسی سخت بیقراری کہ) قریب تھا کہ (غایت بیقراری سے) وہ موسیٰ (علیہ السلام) کا حال (سب پر) ظاہر کر دیتیں اگر ہم اُن کے دل کو اس غرض سے مضبوط نہ کئے رہیں کہ یہ (ہمارے وعدہ پر) یقین کئے (بیٹھی) رہیں (غرض بمشکل اُنہوں نے دل کو سنبھالا اور تدبیر شروع کی وہ یہ کہ) انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کی بہن (یعنی اپنی بیٹی سے) کہا ذرا موسیٰ کا سراغ تو لگا سو (وہ چلیں اور یہ معلوم کر کے کہ صندوق محل میں کھلا ہے محل میں پہنچیں، یا تو ان کی آمد و رفت ہوگی یا کسی حیلہ سے پہنچیں، اور) انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دُور سے دیکھا اور ان لوگوں کو یہ خبر نہ تھی (کہ یہ ان کی بہن ہیں اور اس فکر میں آئی ہیں) اور ہم نے پہلے ہی سے (یعنی جب سے صندوق سے نکلے تھے) موسیٰ (علیہ السلام) پر دودھ پلائیوں کی بندش کر رکھی تھی (یعنی کسی کا دودھ نہ لیتے تھے) سو وہ (اس حال کو دیکھ کر موقع پا کر) کہنے لگیں کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں جو تمہارے لئے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ (اپنی جبلّت کے موافق دل سے) اس کی خیر خواہی کریں (ان لوگوں نے ایسے وقت میں کہ دودھ پلانے کی مشکل پڑ رہی تھی اس مشورہ کو غنیمت سمجھا اور ایسے گھرانہ کا پتہ پوچھا انہوں نے اپنی والدہ کا پتہ بتلا دیا چنانچہ وہ بُلائی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام ان کی گود میں دیئے گئے۔ جاتے ہی دودھ پینا شروع کر دیا اور ان لوگوں کی اجازت سے چین سے اپنے گھر لے آئیں اور گاہے گاہے لے جا کر ان کو دکھلا آتیں) غرض ہم نے موسیٰ (علیہ السلام کو اس طرح) ان کی والدہ کے پاس (اپنے وعدہ کے موافق) واپس پہنچا دیا تاکہ (اپنی اولاد کو دیکھ کر) ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور تاکہ (فراق کے) غم میں نہ رہیں اور تاکہ (مرتبہ معائنہ میں) اس بات کو (اور زیادہ یقین کے ساتھ) جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے لیکن (افسوس کی بات ہے کہ) اکثر لوگ (اس کا) یقین نہیں رکھتے (یہ تعریض ہے کفار پر)۔

معارف و مسائل

سورۂ قصص مکی سورتوں میں سب سے آخری سورت ہے جو ہجرت کے وقت مکہ مکرمہ اور جحفہ (رابغ) کے درمیان نازل ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ سفر ہجرت میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جحفہ یعنی رابغ کے قریب پہنچے تو جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو آپ کا وطن جس میں آپ پیدا ہوئے یاد آتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں ضرور یاد آتا ہے۔ اس پر جبرئیل امین نے یہ سورت قرآن سنائی جس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت ہے کہ انجام کار مکہ مکرمہ فتح ہو کر آپ کے قبضہ میں آئے۔ وہ آیت یہ

ہے [۱] اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (القصص:۸۵)، سورۂ قصص میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصّہ پہلے اجمال کے ساتھ پھر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ نصف سورت تک موسیٰ علیہ السلام کا قصّہ فرعون کے ساتھ اور آخر سورت میں قارون کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پورے قرآن میں کہیں مختصر کہیں مفصّل بار بار آیا ہے۔ سورہ کہف میں تو ان کے اُس قصّہ کی تفصیل آئی ہے جو خضر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا، پھر سورۂ طٰہٰ میں پورے قصّہ کی تفصیل ہے اور یہی تفصیل سورۂ نمل میں بھی کچھ آئی ہے پھر سورۂ قصص میں اس کا اعادہ ہوا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کے لئے ارشاد ربّانی یہ آیا ہے کہ [۲] وَ فَتَنّٰکَ فُتُوْنًا (طٰہٰ:۴۰)۔ حضرات محدثین امام نسائی وغیرہ نے اس پورے قصے کی مکمل تفصیل وہاں لکھی ہے احقر نے بھی ابن کثیر کے حوالہ سے یہ مکمل تفصیل سورۂ طٰہٰ میں بیان کر دی ہے۔ اس قصہ کے متعلقہ اجزاء کی تمام بحثیں اور ضروری مسائل اور فوائد کچھ سورۂ کہف میں باقی سورۂ طٰہٰ میں ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ مسائل ومباحث کے لئے اُن کو دیکھنا کافی ہوگا یہاں صرف الفاظ آیات کی مختصر تفسیر پر اکتفا کیا جائے گا۔

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً الآیۃ، اس آیت میں تدبیر فرعونی کا بمقابلہ تقدیر الٰہی کے نہ صرف خائب وخاسر ہونا بلکہ فرعون اور اس کے سب اہلِ دربار کو انتہائی بے وقوف بلکہ اندھا بنانے کا ذکر ہے کہ جس لڑکے کے متعلق خواب اور تعبیر خواب کی بناء پر فرعون کو خطرہ لاحق ہوا تھا اور جس کی بناء پر بنی اسرائیل کے لاتعداد نوزائیدہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا قانون جاری کیا تھا اس کو حق تعالیٰ نے اسی فرعون کے گھر میں اسی کے ہاتھوں پرورش کرایا اور والدہ کے اطمینان کے لئے اُنہی کی گود میں حیرت انگیز طریقہ پر پہنچا دیا اور فرعون سے رضاعت کا خرچ جو بعض روایات میں ایک دینار روزانہ بتلایا گیا ہے مزید وصول کیا گیا۔ اور دودھ پلانے کا یہ معاوضہ چونکہ ایک کافر حربی سے اس کی رضامندی کے ساتھ لیا گیا ہے اس لئے اس کے جواز میں بھی کوئی اشکال نہیں۔ اور بالآخر جس خطرہ کے دُور کرنے کے لئے ساری قوم پر یہ مظالم ڈھائے تھے وہ اُسی کے گھر کے اندر سے ایک شدید لاوا بن کر پھوٹا اور خواب کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے اُس کو آنکھوں سے دکھادی وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ الیٰ مَا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ ۝ کا یہی حاصل ہے۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی، وحی کا لفظ اس جگہ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، وحی نبوّت مراد نہیں اس کی تحقیق سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

---

[۱] ترجمہ: جس خدا نے آپ پر قرآن کو فرض کیا ہے وہ آپ کو اصلی وطن میں پھر پہنچادے گا۔

[۲] ترجمہ: اور ہم نے تم کو خوب خوب محنتوں میں ڈالا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى

اور جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا دی ہم نے اس کو حکمت اور سمجھ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٤﴾ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ

نیکی والوں کو اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ پھر پائے

فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ

اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اس کے دشمنوں میں

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى

پھر فریاد کی اُس سے اُس نے جو تھا اس کے رفیقوں میں اس کی جو تھا اس کے دشمنوں میں پھر مُکّا مارا اس کو موسیٰ نے

فَقَضٰى عَلَيْهِ ۫ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾

پھر اس کو تمام کردیا بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے بیشک وہ دشمن ہے بہکانے والا صریح

قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ

بولا اے میرے رَبّ میں نے بُرا کیا اپنی جان کا، سو بخش مجھ کو پھر اس کو بخش دیا بیشک وہی ہے بخشنے والا

الرَّحِيْمُ ﴿١٦﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا

مہربان بولا اے رَبّ جیسا تو نے فضل کردیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہوں گا مددگار

لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٧﴾ فَاَصْبَحَ فِى الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِى

گناہگاروں کا پھر صبح کو اُٹھا اس شہر میں ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا پھر ناگہاں جس نے

اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

کل مدد مانگی تھی اُس سے آج پھر فریاد کرتا ہے اُس سے کہا موسیٰ نے بیشک تو بے راہ ہے صریح

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ

پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اُس پر جو دشمن تھا ان دونوں کا بول اُٹھا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے

اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ

کہ خون کرے میرا جیسے خون کرچکا ہے کل ایک جان کا تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ

جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

زبردستی کرتا پھرے ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرادینے والا

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ

اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا کہا اے موسیٰ دربار والے

يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

مشورہ کرتے ہیں تجھ پر کہ تجھ کو مارڈالیں سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ع

پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا بولا اے ربّ بچالے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب موسیٰ اپنی بھرپور توانائی کو پہنچے، اور پورے جوان ہوگئے تو ہم نے اُنہیں حکمت اور علم سے نوازا، اور

نیک لوگوں کو ہم یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ ⑭ اور (ایک دن) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوئے جب اُس کے باشندے غفلت میں تھے، تو اُنہوں نے دیکھا کہ وہاں دو آدمی لڑ رہے ہیں، ایک تو اُن کی اپنی برادری کا تھا، اور دوسرا اُن کی دُشمن قوم کا۔ اب جو شخص اُن کی برادری کا تھا، اُس نے اُنہیں اُن کی دُشمن قوم کے آدمی کے مقابلے میں مدد کے لئے پکارا، اس پر موسیٰ نے اُس کو ایک مکا مارا جس نے اُس کا کام تمام کردیا۔ (پھر) انہوں نے (پچھتا کر) کہا کہ: ''یہ تو کوئی شیطان کی کارروائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک کھلا دُشمن ہے جو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔'' ⑮ کہنے لگے: ''میرے پروردگار! میں نے اپنی جان پر ظلم کرلیا، آپ مجھے معاف فرمادیجئے۔'' چنانچہ اللہ نے اُنہیں معاف کردیا۔ یقیناً وہی ہے جو بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ⑯ موسیٰ نے کہا: ''میرے پروردگار! آپ نے جو مجھ پر انعام کیا ہے، تو میں آئندہ کبھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔'' ⑰ پھر صبح کے وقت وہ شہر میں ڈرتے ڈرتے حالات کا جائزہ لے رہے تھے، اتنے میں دیکھا کہ جس شخص نے کل اُن سے مدد مانگی تھی، وہ پھر اُنہیں فریاد کے لئے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے اُس سے کہا کہ: ''معلوم ہوا کہ تم تو کھلم کھلا شریر آدمی ہو۔'' ⑱ پھر جب اُنہوں نے اُس شخص کو پکڑنے کا ارادہ کیا جو ان دونوں کا دُشمن تھا تو اُس (اسرائیلی) نے کہا: ''موسیٰ! کیا تم مجھے بھی اسی طرح قتل کرنا چاہتے ہو جیسے تم نے کل ایک آدمی کو قتل کردیا تھا؟ تمہارا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم زمین میں اپنی زبردستی جماؤ، اور تم مصلح بننا نہیں چاہتے۔'' ⑲ اور (اُس کے بعد یہ ہوا کہ) شہر کے بالکل دُور دراز علاقے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اُس نے کہا کہ: ''موسیٰ! سردار لوگ تمہارے بارے میں مشورے کر رہے ہیں کہ تمہیں قتل کرڈالیں، اس لئے تم یہاں سے نکل جاؤ، یقین رکھو میں تمہارے خیرخواہوں میں سے ہوں۔'' ⑳ چنانچہ موسیٰ ڈرتے ڈرتے، حالات کا جائزہ لیتے شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے: ''میرے پروردگار! مجھے ظالم لوگوں سے بچالے۔'' ㉑

خلاصۂ تفسیر

اور جب (پرورش پاکر) اپنی بھری جوانی (کی عمر) کو پہنچے اور (قوتِ جسمانیہ وعقلیہ سے) درست ہوگئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا (یعنی نبوّت سے پہلے ہی فہم سلیم وعقلِ مستقیم جس سے حسن وقبح میں امتیاز کرسکیں عنایت فرمائی) اور ہم نیکوکاروں کو یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں (یعنی عمل صالح سے فیضانِ علمی میں ترقی ہوتی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ فرعون کے مشرب کو موسیٰ علیہ السلام نے کبھی اختیار نہ کیا تھا بلکہ اس سے نفور رہے) اور (اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار) موسیٰ (علیہ السلام) شہر میں (یعنی مصر میں کذا فی الروح [1] عن ابن اسحاق کہیں باہر سے) ایسے وقت پہنچے

---

[1] روح المعانی ج:۱۵ ص:۹۱

کہ وہاں کے (اکثر) باشندے بے خبر (پڑے سورہے) تھے (اکثر روایات سے یہ وقت دوپہر کا معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے کچھ رات گئے کا وقت معلوم ہوتا ہے کذا فی الدر المنثور [۱]) تو انہوں نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا، ایک تو ان کی برادری (یعنی بنی اسرائیل) میں کا تھا اور دوسرا اُن کے مخالفین (یعنی فرعون کے متعلقین ملازمین) میں سے تھا (دونوں کسی بات پر اُلجھ رہے تھے اور زیادتی اس فرعونی کی تھی) سو وہ جوان کی برادری کا تھا اس نے (جو) موسیٰ (علیہ السلام کو دیکھا تو ان) سے اس کے مقابلہ میں جو کہ ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی (موسیٰ علیہ السلام نے اوّل اس کو سمجھایا جب اس پر بھی وہ باز نہ آیا) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے (تادیباً دفع ظلم کے لئے) اس کو (ایک) گھونسا مارا سو اس کا کام بھی تمام کر دیا (یعنی اتفاق سے وہ مر ہی گیا) موسیٰ (علیہ السلام اس خلاف توقع نتیجہ سے بہت پچھتائے اور) کہنے لگے کہ یہ تو شیطانی حرکت ہوگئی بیشک شیطان (بھی آدمی کا) کھلا دشمن ہے کسی غلطی میں ڈال دیتا ہے (اور نادم ہو کر حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ سے قصور ہوگیا آپ معاف کر دیجئے سو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، بلاشبہ وہ غفور رحیم ہے (گو ظہور اور علم اس معافی کا قطعی طور پر وقت عطاء نبوّت کے ہوا کما فی النمل [۲] اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱﴾، اور اس وقت خواہ الہام سے معلوم ہو گیا ہو یا بالکل نہ معلوم ہوا ہو) موسیٰ (علیہ السلام) نے (توبہ عن الماضی کے ساتھ مستقبل کے متعلق یہ بھی) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار چونکہ آپ نے مجھ پر (بڑے بڑے) انعامات فرمائے ہیں (جن کا ذکر طٰہٰ میں ہے [۳] وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰۤی ﴿۳۷﴾ الیٰ قولہ وَلَا تَحۡزَنَ) سو کبھی میں مجرموں کی مدد نہ کروں گا (یہاں مجرمین سے مراد وہ ہیں جو دوسروں سے گناہ کا کام کرانا چاہیں، کیونکہ گناہ کرانا کسی سے یہ بھی جرم ہے پس اس میں شیطان بھی داخل ہو گیا کہ وہ گناہ کراتا ہے اور گناہ کرنے والا اس کی مدد کرتا ہے خواہ عمداً یا خطاءً جیسے اس آیت میں ہے [۴] وَكَانَ الۡكَافِرُ عَلٰی رَبِّهٖ ظَهِیۡرًا ﴿۵۵﴾ (الفرقان) ای للشیطان، مطلب یہ ہوا کہ میں شیطان کا کہنا کبھی نہ مانوں گا یعنی مواقع محتملہ خطاء میں احتیاط و تیقظ سے کام لوں گا اور اصل مقصود اتنا ہی ہے مگر شمول حکم کے لئے مجرمین جمع کا صیغہ لایا گیا کہ اوروں کو بھی عام ہو جائے۔ غرض اس اثناء میں اس کا چرچا ہو گیا مگر بجز اسرائیلی کے کوئی واقفِ راز نہ تھا اور چونکہ اسی کی حمایت میں یہ واقعہ ہوا تھا اس لئے اُس نے اظہار نہیں کیا اس وجہ سے کسی کو اطلاع نہ ہوئی مگر موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ رہا، یہاں تک رات گزری) پھر موسیٰ (علیہ السلام) کو شہر میں صبح ہوئی خوف اور وحشت کی حالت میں کہ اچانک (دیکھتے کیا ہیں کہ) وہی شخص جس نے کل گزشتہ میں ان سے امداد چاہی ہے وہ پھر ان کو (مدد کے لئے) پکار رہا ہے کہ (کسی اور سے اُلجھ پڑا تھا) موسیٰ (علیہ السلام یہ دیکھ کر اور کل کی حالت یاد کر کے اس پر ناخوش ہوئے اور) اس سے فرمانے لگے بیشک تو صریح بدراہ

---

[۱] الدر المنثور ج:۷ ص:۴۷۷ [۲] ترجمہ: ہاں مگر جس سے کوئی قصور ہو جائے پھر بُرائی کے بعد بجائے اس کے نیک کام کرے تو میں مغفرت والا رحمت والا ہوں۔

[۳] ترجمہ: اور ہم تو اور دفعہ اور بھی تم پر احسان کر چکے ہیں۔ [۴] ترجمہ: اور کافر تو اپنے رَبّ کا مخالف ہے۔

(آدمی) ہے کہ روز لوگوں سے لڑا کرتا ہے موسیٰ علیہ السلام کو قرائن سے معلوم ہوا ہوگا کہ اس کی طرف سے بھی کوئی غصہ ہوا ہے لیکن زیادتی فرعونی کی دیکھ کر اس کو روکنے کا ارادہ کیا) سو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اس پر ہاتھ بڑھایا جو دونوں کا مخالف تھا (مراد فرعونی ہے کہ وہ اسرائیلی کا بھی مخالف تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں اور وہ لوگ سب بنی اسرائیل کے مخالف تھے گو بالتعیین موسیٰ علیہ السلام کو اسرائیلی نہ سمجھا ہو اور یا موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون کے طریقہ سے نفور تھے یہ امر مشہور ہوگیا ہو اس لئے فرعون والے ان کے مخالف ہوگئے ہوں۔ بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعونی پر ہاتھ لپکایا اور اس سے پہلے اسرائیلی پر خفا ہو چکے تھے تو اس سے اس اسرائیلی کو شبہ ہوا کہ شاید آج مجھ پر دارو گیر کریں گے تو گھبرا کر) وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ کیا (آج) مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہو جیسا کہ کل ایک آدمی کو قتل کر چکے ہو (معلوم ہوتا ہے کہ) بس تم دُنیا میں اپنا زور بٹھلانا چاہتے ہو اور صلح (اور ملاپ) کروانا نہیں چاہتے (یہ کلمہ اس فرعونی نے سُنا، قاتل کی تلاش ہو رہی تھی اتنا سراغ لگ جانا بہت ہے فوراً فرعون کو خبر پہنچادی۔ فرعون اپنے آدمی کے مارے جانے سے برہم تھا یہ سُن کر آشفتہ ہوا اور شاید اس سے اس کا وہ خواب کا اندیشہ قوی ہوگیا ہو کہ کہیں وہ شخص یہی نہ ہو، خصوصاً اگر موسیٰ علیہ السلام کا فرعونی طریقہ کو ناپسند کرنا بھی فرعون کو معلوم ہو تو کچھ عداوت اس سبب سے ہوگی اس پر یہ مزید ہوا۔ بہرحال اس نے اپنے درباریوں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور اخیر رائے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کی قرار پائی) اور (اس مجمع میں) ایک شخص (موسیٰ علیہ السلام کے محبّ اور خیر خواہ تھے وہ) شہر کے (اس) کنارے سے (جہاں یہ مشورہ ہو رہا تھا موسیٰ علیہ السلام کے پاس نزدیک کی گلیوں سے) دوڑتے ہوئے آئے (اور) کہنے لگے کہ اے موسیٰ اہلِ دربار آپ کے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں سو آپ (یہاں سے) چل دیجئے میں آپ کی خیر خواہی کر رہا ہوں پس (یہ سُن کر) موسیٰ (علیہ السلام) وہاں سے (کسی طرف کو) نکل گئے، خوف اور وحشت کی حالت میں (اور چونکہ راستہ معلوم نہ تھا دُعا کے طور پر) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو ان ظالم لوگوں سے بچا لیجئے (اور امن کی جگہ پہنچا دیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى، اَشُدَّ کے لفظی معنے قوت وشدّت کی انتہاء پر پہنچنا ہے یعنی انسان بچپن کے ضعف سے تدریجاً قوت وشدّت کی طرف بڑھتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کے وجود میں جتنی قوت وشدت آسکتی تھی وہ پوری ہوجائے اس وقت کو اَشُدَّ کہا جاتا ہے اور یہ زمین کے مختلف خطوں اور قوموں کے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کسی کا اَشُدَّ کا زمانہ جلد آجاتا ہے کسی کا دیر میں۔ لیکن حضرت ابنِ عباسؓ اور مجاہد سے بروایت عبد ابن حُمَیْد یہ منقول

ہے کہ اَشُدَّ عمر کے تینتیس سال میں ہوتا ہے اسی کو سنِ کمال یا سنِ وقوف کہا جاتا ہے جس میں بدن کا نشو ونما ایک حد پر پہنچ کر رُک جاتا ہے اس کے بعد چالیس کی عمر تک وقوف کا زمانہ ہے اسی کو استویٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے چالیس سال کے بعد انحطاط اور کمزوری شروع ہوجاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمر کا اَشُدَّ تینتیس سال کی عمر سے شروع ہوکر چالیس سال تک رہتا ہے۔ (روح وقرطبی) [۱]

اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا حکم سے مراد نبوّت ورسالت ہے اور علم سے مراد احکامِ الٰہیہ شرعیہ کا علم ہے۔ وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰى حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا، المدینہ سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک شہر مصر ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لفظ سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام مصر سے باہر کہیں گئے ہوئے تھے پھر ایک روز اس شہر میں ایسے وقت داخل ہوئے جو عام لوگوں کی غفلت کا وقت تھا۔ آگے قتل قبطی کے قصہ میں اس کا بھی تذکرہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوّت ورسالت کا اور دینِ حق کا اظہار شروع کردیا تھا اسی کے نتیجہ میں کچھ لوگ اُن کے مطیع وفرمانبردار ہوگئے تھے جو اُن کے متبعین کہلاتے تھے مِنْ شِیْعَتِهٖ کا لفظ اس پر شاہد ہے۔ ان تمام قرائن سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے جو ابن اسحاق اور ابن زید سے منقول ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ہوش سنبھالا اور دینِ حق کی کچھ باتیں لوگوں سے کہنے لگے تو فرعون ان کا مخالف ہوگیا اور قتل کا ارادہ کیا مگر فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کی درخواست پر ان کے قتل سے باز آیا مگر اُن کو شہر سے نکالنے کا حکم دیدیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں کسی جگہ رہنے لگے اور کبھی کبھی چھپ کر مصر شہر میں آتے تھے، اور عَلٰى حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک دوپہر کا وقت ہے جبکہ لوگ قیلولہ میں تھے۔ (قرطبی) [۲]

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى، وکز کے معنے مُکّا مارنے کے ہیں فَقَضٰى عَلَیْهِ قضاہٗ اور وقضیٰ علیہ کا محاورہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کا بالکل کام تمام کردے اور فارغ ہوجائے۔ اسی لئے یہاں اس کے معنی قتل کردینے کے ہیں۔ (مظہری) [۳]

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اس قبطی کافر کا قتل جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلا ارادہ صادر ہوگیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بھی اپنے منصب نبوّت ورسالت اور پیغمبرانہ عظمتِ شان کے لحاظ سے اپنا گناہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قبطی کافر شرعی اصطلاح کے لحاظ سے ایک حربی کافر تھا جس کا قتل عمداً بھی مباح اور جائز تھا کیونکہ نہ یہ کسی اسلامی حکومت کا ذمّی تھا نہ موسیٰ علیہ السلام سے اس کا کوئی معاہدہ تھا پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس کو عملِ شیطان اور گناہ کیوں قرار دیا؟ اس کا قتل تو بظاہر موجبِ اجر ہونا چاہئے تھا کہ ایک مسلمان پر ظلم کر رہا تھا اس کو بچانے کے لئے یہ قتل واقع ہوا۔

---

[۱] روح المعانی ج:۱۵ ص:۸۹، وتفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۵۸ [۲] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۶۰
[۳] تفسیر المظہری ج:۷ ص:۱۵۲

جواب یہ ہے کہ معاہدہ جیسے قولی اور تحریری ہوتا ہے جیسے عموماً اسلامی حکومتوں میں اہلِ ذمّہ سے معاہدہ یا کسی غیر مسلم حکومت سے صلح کا معاہدہ اور یہ معاہدہ باتفاق واجب العمل اور اس کی خلاف ورزی غدر اور عہد شکنی کے سبب حرام ہوتی ہے اسی طرح معاہدہ عملی بھی ایک قسم کا معاہدہ ہی ہوتا ہے اس کی بھی پابندی لازمی اور خلاف ورزی عہد شکنی کے مرادف ہے۔

معاہدہ عملی کی صورت یہ ہے کہ جس جگہ مسلمان اور کچھ غیر مسلم کسی دوسری حکومت میں باہمی امن واطمینان کے ساتھ رہتے بستے ہوں، ایک دوسرے پر حملہ کرنا یا لُوٹ مار کرنا طرفین سے غدّاری سمجھا جاتا ہو تو اس طرح کی معاشرت اور معاملات بھی ایک قسم کا عملی معاہدہ ہوتے ہیں ان کی خلاف ورزی جائز نہیں اس کی دلیل حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی وہ طویل حدیث ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الشروط میں مفصل روایت کیا ہے اور واقعہ اس کا یہ تھا کہ حضرت مغیرہ ابن شعبہ قبل از اسلام اپنے زمانۂ جاہلیت میں ایک جماعت کفار کے ساتھ مصاحبت اور معاشرت رکھتے تھے پھر ان کو قتل کر کے ان کے اموال پر قبضہ کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے اور جو مال ان لوگوں کا لیا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا اس پر آپ نے ارشاد فرمایا، اَمَّا الْاِسْلَامُ فَاَقْبَلُ وَاَمَّا الْمَالُ فَلَسْتُ مِنْهُ فِيْ شَيْءٍ اور ابوداؤد کی روایت میں اس کے الفاظ یہ ہیں، اَمَّا الْمَالُ فَمَالُ غَدْرٍ لَا حَاجَةَ لَنَا فِيْهِ، یعنی آپ کا اسلام تو ہم نے قبول کر لیا اور اب آپ مسلمان ہیں مگر یہ مال ایسا مال ہے جو غدر اور عہد شکنی سے حاصل ہوا ہے اس لئے ہمیں اس مال کی کوئی حاجت نہیں۔ [1] شارح بخاری حافظ ابن حجر نے شرح میں فرمایا کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ کفار کا مال حالتِ امن میں لُوٹ لینا حلال نہیں کیونکہ ایک بستی کے رہنے والے یا ایک ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھتے ہیں اُن کا یہ عملی معاہدہ بھی ایک امانت ہے جس کا صاحبِ امانت کو ادا کرنا فرض ہے چاہے وہ کافر ہو یا مسلم۔ اور کفار کے اموال جو مسلمانوں کے لئے حلال ہوتے ہیں تو وہ صرف محاربہ اور مغالبہ کی صورت میں حلال ہوتے ہیں، حالتِ امن وامان میں جبکہ ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھ رہا ہو کسی کافر کا مال لُوٹ لینا جائز نہیں [2] اور قسطلانی نے شرح بخاری میں فرمایا:

اِنَّ اَمْوَالَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنْ كَانَتْ مَغْنُوْمَةً عِنْدَ الْقَهْرِ فَلَا يَحِلُّ اَخْذُهَا عِنْدَ الْاَمْنِ فَاِذَا كَانَ الْاِنْسَانُ مُصَاحِبًا لَهُمْ فَقَدْ اَمِنَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ صَاحِبَهٗ فَسَفْكُ الدِّمَاءِ وَاَخْذُ الْمَالِ مَعَ ذٰلِكَ غَدْرٌ حَرَامٌ اِلَّا اَنْ يَّنْبَذَ اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ عَلٰى سَوَاءٍ۔

بیشک مشرکین کے اموال جنگ اور جہاد کے وقت مغنوم ومباح ہیں لیکن امن کی حالت میں حلال نہیں

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد إلخ ج:۱ ص:۳۷۹

[2] فتح الباری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد ج:۸ ص:۲۸۳

اس لئے جو مسلمان کفار کے ساتھ رہتا سہتا ہو کہ عملی طور پر ایک دوسرے سے مأمون ہو تو ایسی حالت میں کسی کافر کا خون بہانا یا مال زبردستی لینا غدر حرام ہے جب تک کہ اُن کے اس عملی معاہدہ سے دست برداری کا اعلان نہ کر دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبطی کا قتل اس عملی معاہدہ کی بناء پر اگر بالقصد ہوتا تو جائز نہیں تھا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ اسرائیلی شخص کو اس کے ظلم سے بچانے کے لئے ہاتھ کی ضرب لگائی جو عادۃً سببِ قتل نہیں ہوتی مگر قبطی اس ضرب سے مر گیا تو موسیٰ علیہ السلام کو یہ احساس ہوا کہ اس کو دفع کرنے کے لئے اس ضرب سے کم درجہ بھی کافی تھا یہ زیادتی میرے لئے درست نہ تھی، اسی لئے اس کو عمل شیطان قرار دے کر اُس سے مغفرت طلب فرمائی۔

فائدہ

یہ تحقیق حکیم الأمۃ مجدد الملۃ سیّدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جو آپ نے بزبانِ عربی احکام القرآن سورۂ قصص لکھتے وقت ارشاد فرمائی تھی، اور یہ آخری علمی تحقیق ہے جس کا استفادہ احقر نے حضرتؒ سے کیا کیونکہ آپ نے یہ ارشاد ۲ / رجب ۱۳۶۲ھ میں فرمایا تھا اس کے بعد مرض کی شدت بڑھی اور ۱۶ / رجب کو یہ آفتابِ عالم غروب ہو گیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ قبطی کا قتل مباح تھا مگر انبیاء علیہم السلام مباحات میں بھی اہم معاملات میں اس وقت تک اقدام نہیں کرتے جب تک خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت و اشارہ نہ ملے، اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خصوصی اجازت کا انتظار کئے بغیر یہ اقدام فرمایا تھا اس لئے اپنی شان کے مطابق اس کو گناہ قرار دے کر استغفار کیا۔ (کذا فی الروح وغیرہ ولہٗ وجہ)[1]

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ۝ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس لغزش کو جب حق تعالیٰ نے معاف فرما دیا تو آپ نے اس نعمت کے شکر میں یہ عرض کیا کہ میں آئندہ کسی مجرم کی مدد نہ کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس اسرائیلی کی مدد کے لئے یہ اقدام کیا تھا دوسرے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ وہ خود ہی جھگڑالو ہے، جھگڑا لڑائی اس کی عادت ہے اس لئے اس کو مجرم قرار دے کر آئندہ کسی ایسے شخص کی مدد نہ کرنے کا عہد فرمایا۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ مجرمین کی تفسیر کافرین کے ساتھ منقول ہے اور قتادہ نے بھی تقریباً ایسا ہی فرمایا ہے

---

[1] روح المعانی ج:۱۵ ص:۹۴

اس تفسیر کی بناء پر واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسرائیلی جس کی امداد موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی یہ بھی مسلمان نہ تھا مگر اُس کو مظلوم سمجھ کر امداد فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد سے دو مسئلے ثابت ہوئے۔

مسئلہ:- اوّل یہ کہ مظلوم اگرچہ کافر یا فاسق ہی ہو اُس کی امداد کرنا چاہئے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کسی مجرم ظالم کی مدد کرنا جائز نہیں۔ علماء نے اس آیت سے استدلال فرما کر ظالم حکّام کی ملازمت کو بھی ناجائز قرار دیا ہے کہ وہ بھی اُن کے ظلم کے شریک سمجھے جائیں گے اور اس پر سلف صالحین سے متعدد روایات نقل کی ہیں (کما فی روح المعانی)[1] کفار یا ظالموں کی امداد و اعانت کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کے احکام کتب فقہ میں مفصّل مذکور ہیں۔ احقر نے احکام القرآن میں بزبان عربی اسی آیت کے ذیل میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح لکھ دی ہے اہل علم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ

اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا اُمید ہے کہ میرا ربّ لے جائے مجھ کو

سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ

سیدھی راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی

يَسْقُوْنَ ۝ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ

پانی پلاتے ہوئے، اور پایا اُن سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں، بولا تمہارا کیا حال ہے

قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۫ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى

بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لے جانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا پھر اُس نے پانی پلا دیا

لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

ان کے جانوروں کو پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف، بولا اے ربّ تو جو چیز اُتارے میری طرف اچھی میں اُسی کا محتاج ہوں

[1] روح المعانی ج:۱۵ ص:۹۶

فَجَآءَتۡهُ اِحۡدٰىهُمَا تَمۡشِىۡ عَلَى اسۡتِحۡيَآءٍ ۫ قَالَتۡ اِنَّ اَبِىۡ يَدۡعُوۡكَ

پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بُلاتا ہے

لِيَجۡزِيَكَ اَجۡرَ مَا سَقَيۡتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيۡهِ الۡقَصَصَ ۙ

کہ بدلے میں دے حق اس کا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو پھر جب پہنچا اس کے پاس اور بیان کیا اُس سے احوال،

قَالَ لَا تَخَفۡ ٚ نَجَوۡتَ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتۡ اِحۡدٰىهُمَا

کہا مت ڈر بچ آیا تو اس قوم بے انصاف سے بولی ان دونوں میں سے ایک

يٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡهُ ۫ اِنَّ خَيۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِىُّ الۡاَمِيۡنُ ﴿۲۶﴾

اے باپ اس کو نوکر رکھ لے البتہ بہتر نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے جو زورآور ہو امانتدار

قَالَ اِنِّىۡۤ اُرِيۡدُ اَنۡ اُنۡكِحَكَ اِحۡدَى ابۡنَتَىَّ هٰتَيۡنِ عَلٰٓى اَنۡ تَاۡجُرَنِىۡ

کہا میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے

ثَمٰنِىَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيۡدُ اَنۡ

آٹھ برس پھر اگر تو پورے کردے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ

اَشُقَّ عَلَيۡكَ ؕ سَتَجِدُنِىۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ

تجھ پر تکلیف ڈالوں، تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے بولا یہ وعدہ ہوچکا

بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكَ ؕ اَيَّمَا الۡاَجَلَيۡنِ قَضَيۡتُ فَلَا عُدۡوَانَ عَلَىَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى

میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان دونوں میں پوری کردوں، سو زیادتی نہ ہو مجھ پر اور اللہ پر

مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ ع

بھروسہ اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب اُنھوں نے مدین کی طرف رُخ کیا تو کہا کہ: ''مجھے پوری اُمید ہے کہ میرا پروردگار مجھے سیدھے راستے پر ڈال دے گا۔'' ﴿۲۲﴾ اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچے تو دیکھا کہ اُس پر ایسے لوگوں کا ایک مجمع ہے جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں، اور دیکھا کہ اُن سے پہلے دو عورتیں ہیں جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ہیں۔ موسیٰ نے اُن سے کہا: ''تم کیا چاہتی ہو؟'' اُن دونوں نے کہا: ''ہم اپنے جانوروں کو اُس وقت تک پانی نہیں پلاسکتیں جب تک سارے چرواہے پانی پلاکر نکل نہیں جاتے، اور ہمارے والد بہت بوڑھے آدمی ہیں۔'' ﴿۲۳﴾ اس پر موسیٰ نے اُن کی خاطر اُن کے جانوروں کو پانی پلادیا، پھر مڑ کر ایک سائے کی جگہ چلے گئے، اور کہنے لگے: ''میرے پروردگار! جو کوئی بہتری تو مجھ پر اُوپر سے نازل کردے، میں اُس کا محتاج ہوں۔'' ﴿۲۴﴾ تھوڑی دیر بعد اُن دونوں عورتوں میں سے ایک اُن کے پاس شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی آئی، کہنے لگی: ''میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں، تاکہ آپ کو اس بات کا اِنعام دیں کہ آپ نے ہماری خاطر جانوروں کو پانی پلایا ہے۔'' چنانچہ جب وہ عورتوں کے والد کے پاس پہنچے اور اُن کو ساری سرگزشت سنائی، تو اُنھوں نے کہا: ''کوئی اندیشہ نہ کرو، تم ظالم لوگوں سے بچ آئے ہو۔'' ﴿۲۵﴾ اُن دونوں عورتوں میں سے ایک نے کہا: ''ابا جان! آپ ان کو اُجرت پر کوئی کام دے دیجئے۔ آپ کسی سے اُجرت پر کام لیں تو اس کے لئے بہترین شخص وہ ہے جو طاقتور بھی ہو، امانت دار بھی۔'' ﴿۲۶﴾ اُن کے باپ نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو لڑکیوں میں سے ایک سے تمہارا نکاح کردوں، بشرطیکہ تم آٹھ سال تک اُجرت پر میرے پاس کام کرو، پھر اگر تم دس سال پورے کردو تو یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ اور میرا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ تم پر مشقت ڈالوں، اِن شاء اللہ تم مجھے اُن لوگوں میں سے پاؤ گے جو بھلائی کا معاملہ کرتے ہیں۔'' ﴿۲۷﴾ موسیٰ نے کہا: ''یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگئی۔ دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کردوں، تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی، اور جو بات ہم کر رہے ہیں، اللہ اُس کا رکھوالا ہے۔'' ﴿۲۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب موسیٰ (علیہ السلام یہ دُعا کرکے ایک سمت کو توکلاً علی اللہ چلے اور بتائید غیبی) مدین کی طرف ہولئے

(چونکہ راستہ معلوم نہ تھا اس لئے تقویت وتوکّل اور نفس کو تسکین دینے کے لئے آپ ہی آپ) کہنے لگے کہ اُمید ہے کہ میرا رَبّ مجھ کو (کسی مقامِ امن کا) سیدھا رستہ چلائے گا (چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مدین جا پہنچے) اور جب مدین کے پانی (یعنی کنویں) پر پہنچے تو اس پر (مختلف) آدمیوں کا ایک مجمع دیکھا جو (اس کنویں سے کھینچ کھینچ کر اپنے مواشی کو) پانی پلا رہے تھے اور ان لوگوں سے ایک طرف (الگ) دو عورتیں دیکھیں کہ وہ (اپنی بکریاں) روکے کھڑی ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے (ان سے) پوچھا تمہارا کیا مطلب ہے وہ دونوں بولیں کہ (ہمارا معمول یہ ہے کہ) ہم (اپنے جانوروں کو) اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک کہ یہ چرواہے (جو کنویں پر پانی پلا رہے ہیں) پانی پلا کر (جانوروں کو) ہٹا کر نہ لے جائیں (ایک تو حیا کے سبب، دوسرے مردوں سے مزاحمت ناتوانوں سے کب ہو سکتی ہے) اور (اس حالت میں ہم آتے بھی نہیں مگر) ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں (اور گھر پر اور کوئی کام کرنے والا ہے نہیں اور کام ضروری ہے اس مجبوری کو ہم کو آنا پڑتا ہے) پس (یہ سُن کر) موسیٰ (علیہ السلام کو رحم آیا اور اُنہوں نے) ان کے لئے پانی (کھینچ کر ان کے جانوروں کو) پلایا (اور ان کو انتظار اور پانی کھینچنے کی تکلیف سے بچایا) پھر (وہاں سے) ہٹ کر (ایک) سایہ (کی جگہ) میں جا بیٹھے (خواہ کسی پہاڑ کا سایہ ہو یا کسی درخت کا) پھر (جناب باری میں) دُعا کی کہ اے میرے پروردگار (اس وقت) جو نعمت بھی (قلیل یا کثیر) آپ مجھ کو بھیج دیں میں اس کا (سخت) حاجت مند ہوں (کیونکہ اس سفر میں کچھ کھانے پینے کو نہ ملا تھا۔ حق تعالیٰ نے اس کا یہ سامان کیا کہ وہ دونوں بیبیاں اپنے گھر لوٹ کر گئیں تو باپ نے معمول سے جلدی آجانے کی وجہ دریافت کی، اُنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پورا قصہ بیان کیا انہوں نے ایک لڑکی کو بھیجا کہ اُن کو بلا لاؤ) موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لڑکی آئی کہ شرماتی ہوئی چلتی تھی (جو کہ اہلِ شرف کی طبعی حالت ہے اور آکر) کہنے لگی کہ میرے والد تم کو بُلاتے ہیں تاکہ تم کو اس کا صلہ دیں جو تم نے ہماری خاطر (ہمارے جانوروں کو) پانی پلا دیا تھا (یہ ان صاحبزادی کو اپنے والد کی عادت سے معلوم ہوا ہوگا کہ احسان کی مکافات کیا کرتے ہوں گے۔ موسیٰ علیہ السلام ساتھ ہو لئے گو مقصود موسیٰ علیہ السلام کا بالیقین اپنی خدمت کا معاوضہ لینا نہ تھا، لیکن مقامِ امن اور کسی رفیق شفیق کے ضرور باقتضائے وقت جویاں تھے، اور اگر بھوک کی شدّت بھی اس جانے کا ایک جزوِ علّت ہو تو مضائقہ نہیں اور اس کو اُجرت سے کچھ تعلق نہیں اور ضیافت کی تو استدعاء بھی بالخصوص حاجت کے وقت اور خصوصاً کریم وشریف آدمی سے کچھ ذلت نہیں چہ جائیکہ دوسرے کی استدعاء پر ضیافت کا قبول کر لینا، راہ میں موسیٰ علیہ السلام نے ان بی بی سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ میں اولادِ ابراہیم سے ہوں، اجنبیہ کو بے وجہ بے قصد دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، غرض اسی طرح ان بزرگ کے پاس پہنچے) سو جب اُن کے پاس پہنچے اور ان سے تمام حال بیان کیا تو اُنہوں نے (تسلّی دی اور) کہا کہ (اب) اندیشہ نہ کرو تم ظالم لوگوں سے بچ آئے (کیونکہ اس مقام پر فرعون کی عملداری نہ تھی کذا فی الروح، پھر) ایک لڑکی نے کہا کہ ابّا جان (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے اور ہم سیانی ہو گئیں اب گھر میں

رہنا مناسب ہے تو) آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط (ہو اور) امانت دار (بھی) ہو (اور ان میں دونوں صفتیں ہیں، چنانچہ قوت ان کے پانی کھینچنے سے اور امانت ان کے برتاؤ سے، خصوصاً راہ میں عورت کو پیچھے کر دینے سے ظاہر ہوتی تھی اور اپنے باپ سے بھی بیان کیا تھا اس پر) وہ (بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (اور اس نوکری کا بدلہ وہی نکاح ہے، حاصل یہ کہ آٹھ سال کی خدمت اس نکاح کا مہر ہے) پھر اگر تم دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے (احسان) ہے (یعنی میری طرف سے جبر نہیں) اور میں (اس معاملہ میں) تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا (یعنی کام لینے اور وقت کی پابندی وغیرہ معاملہ کی فروعات میں آسانی برتوں گا اور) تم مجھ کو انشاء اللہ تعالیٰ خوش معاملہ پاؤ گے موسیٰ (علیہ السلام رضامند ہو گئے اور) کہنے لگے کہ (بس تو) یہ بات میرے اور آپ کے درمیان (پکی) ہو چکی، میں ان دونوں مدتوں میں سے جس (مدت) کو بھی پورا کر دوں مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا اور ہم جو (معاملہ) کی بات چیت کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا گواہ (کافی) ہے (اس کو حاضر ناظر سمجھ کر عہد پورا کرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ، مَدْيَنَ ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے جو مدین بن ابراہیمؑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ فرعونی حکومت سے خارج تھا۔ مصر سے مدین کی مسافت آٹھ منزل کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعونی سپاہیوں کے تعاقب کا طبعی خوف پیش آیا، جو نہ نبوّت و معرفت کے منافی ہے نہ توکّل کے، تو مصر سے ہجرت کا ارادہ کیا اور مَدْيَنَ کی سمت شاید اس لئے متعین کی کہ مَدْيَنَ بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام کی بستی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن کی اولاد میں تھے۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل بے سروسامانی کے ساتھ اس طرح مصر سے نکلے کہ نہ کوئی توشہ ساتھ تھا نہ کوئی سامان اور نہ راستہ معلوم، اسی اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ یعنی امید ہے کہ میرا ربّ مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا قبول فرمائی۔ مفسرین کا بیان ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غذا صرف درختوں کے پتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سب سے پہلا ابتلاء اور امتحان تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ابتلاءات اور امتحانات کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں ایک طویل حدیث کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۠ مَآءَ مَدْيَنَ سے مراد وہ کنواں ہے جس سے اس بستی

کے لوگ اپنے مواشی کو پانی پلاتے تھے وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ یعنی دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی کی طرف جانے سے روک رہی تھیں تا کہ اُن کی بکریاں دوسرے لوگوں کی بکریوں میں رَل نہ جائیں۔

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ لفظ خطب شان اور حال کے معنے میں جبکہ وہ کوئی مہم کام ہو۔ معنے یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں سے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے کہ تم اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہو دوسرے لوگوں کی طرح کنویں کے پاس لاکر پانی نہیں پلاتیں؟ ان دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہماری عادت یہی ہے کہ ہم مردوں کے ساتھ اختلاط سے بچنے کے لئے اس وقت تک اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاتیں جب تک یہ لوگ کنویں پر ہوتے ہیں، جب یہ چلے جاتے ہیں تو ہم اپنی بکریوں کو پلاتے ہیں اور اس میں جو یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا تمہارا کوئی مرد نہیں جو عورتوں کو اس کام کے لئے نکالا؟ اس کا جواب بھی ان عورتوں نے ساتھ ہی دیدیا کہ ہمارے والد بوڑھے ضعیف العمر ہیں وہ یہ کام نہیں کر سکتے اس لئے ہم مجبور ہوئے۔

اس واقعہ سے چند اہم فوائد حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ ضعیفوں کی امداد انبیاء کی سنت ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو عورتوں کو دیکھا کہ بکریوں کو پانی پلانے کے لئے لائی ہیں مگر اُن کو لوگوں کے ہجوم کے سبب موقع نہیں مل رہا تو ان سے حال دریافت کیا۔ دوسرا یہ کہ اجنبی عورت سے بوقت ضرورت بات کرنے میں مضائقہ نہیں جب تک کہ کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ اگرچہ یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جبکہ عورتوں پر پردہ لازم نہیں تھا جس کا سلسلہ اسلام کے بھی ابتدائی زمانہ تک جاری رہا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد عورتوں کے لئے پردہ کے احکام نازل ہوئے، لیکن اس وقت بھی پردہ کا جو اصل مقصد ہے وہ طبعی شرافت اور حیاء کے سبب عورتوں میں موجود تھا کہ ضرورت کے باوجود مردوں کے ساتھ اختلاط گوارا نہ کیا اور تکلیف اُٹھانا قبول کیا۔ چوتھا یہ کہ عورتوں کا اس طرح کے کاموں کے لئے باہر نکلنا اس وقت بھی پسندیدہ نہیں تھا اسی لئے اُنہوں نے اپنے والد کے معذور ہونے کا عذر بیان کیا۔

فَسَقٰى لَهُمَا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں پر رحم کھا کر کنویں سے پانی نکال کر ان کی بکریوں کو سیراب کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ چرواہوں کی عادت یہ تھی کہ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد کنویں کو ایک بھاری پتھر سے بند کر دیتے تھے اور یہ عورتیں اپنی بکریوں کے لئے بچے کچے پانی پر اکتفاء کرتی تھیں۔ یہ بھاری پتھر ایسا تھا جس کو دس آدمی مل کر اُٹھاتے تھے مگر موسیٰؑ نے اس کو تنہا اُٹھا کر الگ کر دیا اور کنویں سے پانی نکالا۔ شاید اسی وجہ سے ان عورتوں میں سے ایک نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے والد سے یہ کہا کہ یہ قوی ہیں۔ (قرطبی) [1]

ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سات روز سے کوئی

[1] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۲۶۹

غذا نہیں چکھی تھی، اس وقت ایک درخت کے سائے میں آ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حالت اور حاجت پیش کی جو دُعا کرنے کا ایک لطیف طریقہ ہے۔ لفظ خیر کبھی مال کے معنے میں آتا ہے جیسا [۱] اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ (البقرة:۱۸۰) میں ہے، کبھی قوت کے معنے میں آتا ہے جیسے [۲] اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ (الدخان:۳۷) میں، کبھی کھانے کے معنے میں بھی آتا ہے جو اس جگہ مراد ہے۔ (قرطبی) [۳]

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قرآنی اُسلوب کے مطابق یہاں قصہ کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ پورا واقعہ یہ ہوا کہ یہ عورتیں اپنے مقررہ وقت سے پہلے جلدی سے گھر پہنچ گئیں تو ان کے والد نے وجہ دریافت کی، لڑکیوں نے واقعہ بتلایا، والد نے چاہا کہ اس شخص نے احسان کیا ہے اس کی مکافات کرنا چاہئے اس لئے انہیں لڑکیوں میں سے ایک کو اُن کے بُلانے کے لئے بھیجا۔ یہ حیاء کے ساتھ چلتی ہوئی پہنچی۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ باوجود پردہ کے باقاعدہ احکام نازل نہ ہونے کے نیک عورتیں مَردوں سے بے محابا خطاب نہ کرتی تھیں۔ ضرورت کی بناء پر یہ وہاں پہنچی تو حیاء کے ساتھ بات کی جس کی صورت بعض مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ اپنے چہرہ کو آستین سے چھپا کر گفتگو کی۔ روایاتِ تفسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کے ساتھ چلنے لگے تو لڑکی سے کہا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ اور زبان سے مجھے راستہ بتاتی رہو۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی نظر لڑکی پر نہ پڑے شاید اسی سبب سے لڑکی نے اپنے والد سے ان کے متعلق ان کے امین ہونے کا ذکر کیا۔ ان لڑکیوں کے والد کون تھے اس میں مفسرین نے اختلاف نقل کیا ہے مگر آیاتِ قرآن سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعیب علیہ السلام تھے جیسا کہ قرآن میں ہے: [۴] وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا (ہود:۸۴) (قرطبی) [۵]

اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ، یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی خود ہی اپنی طرف سے ان کو دعوت دیتی مگر ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے والد کا پیغام سُنایا کیونکہ کسی اجنبی مرد کو خود دعوت دینا حیاء کے خلاف تھا۔

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ یعنی شعیب علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ کو گھر کے کاموں کے لئے ملازم کی ضرورت ہے آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ ملازم میں دو صفتیں ہونا چاہئیں ایک کام کی قوت وصلاحیت دوسرے امانت داری۔ ہمیں ان کے پتھر اُٹھا کر پانی پلانے سے ان کی قوت وقدرت کا، اور راستہ میں لڑکی کو اپنے پیچھے کر دینے سے امانت داری کا تجربہ ہو چکا ہے۔

---

[۱] ترجمہ: اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو والدین اور اقارب کے لئے معقول طور پر کچھ کچھ بتلا جائے جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری ہے۔

[۲] ترجمہ: یہ لوگ زیادہ بڑھے ہوئے ہیں یا تُبَّع کی قوم۔

[۳] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۷۰

[۴] ترجمہ: اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔

[۵] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۷۰

کوئی ملازمت یا عہدہ سُپرد کرنے کے لئے اہم شرطیں دُو ہیں

حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کی بات جاری فرمائی۔ آج کل سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کے لئے کام کی صلاحیت اور ڈگریوں کو تو دیکھا جاتا ہے مگر دیانت و امانت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام دفتروں اور عہدوں کی کارروائی میں پوری کامیابی کے بجائے رشوت خوری، اقرباء پروری وغیرہ کی وجہ سے قانون معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ کاش لوگ اس قرآنی ہدایت کی قدر کریں تو سارا نظام درست ہو جائے۔

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ، یعنی لڑکیوں کے والد حضرت شعیب علیہ السلام نے خود ہی اپنی طرف سے اپنی لڑکی کو ان کے نکاح میں دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں کے ولی کو چاہئے کہ کوئی مرد صالح ملے تو اس کا انتظار نہ کرے کہ اس کی طرف سے نکاح کے معاملہ کی تحریک ہو، بلکہ خود بھی پیش کر دینا سنتِ انبیاء ہے جیسا کہ عمر بن خطابؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد از خود ہی صدیقِ اکبرؓ اور عثمان غنیؓ سے اُن کے نکاح کی پیشکش کی تھی۔ (قرطبی) [1]

اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ، حضرت شعیب علیہ السلام نے دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو معیّن کر کے گفتگو نہیں فرمائی بلکہ اس کو مبہم رکھا کہ ان میں سے کسی ایک کو آپ کے نکاح میں دینے کا ارادہ ہے مگر چونکہ یہ گفتگو باقاعدہ عقد نکاح کی گفتگو نہ تھی جس میں ایجاب وقبول گواہوں کے سامنے ہونا شرط ہے بلکہ معاملہ کی گفتگو تھی کہ آپ کو آٹھ سال کی نوکری اس نکاح کے عوض میں منظور ہو تو ہم نکاح کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر معاہدہ کر لیا۔ آگے یہ خود بخود ظاہر ہے کہ باقاعدہ نکاح کیا گیا ہوگا۔ اور قرآن کریم عموماً قصہ کے اُن اجزاء کو ذکر نہیں کرتا جن کا وقوع سیاق وسباق سے ظاہر اور یقینی ہو۔ اس تحقیق کی بناء پر یہاں یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ زوجہ منکوحہ کو متعین کئے بغیر نکاح کیسے ہو گیا یا گواہوں کے بغیر کیسے ہو گیا۔ (کذا فی الروح وبیان القرآن) [2]

عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ یہ آٹھ سال کی ملازمت وخدمت نکاح کا مہر قرار دیا گیا اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی خدمت وملازمت کو اس کا مہر قرار دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی مکمل تحقیق مع دلائل کے بزبان عربی احکام القرآن سورۂ قصص میں مفصل لکھ دی گئی ہے اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر یہ معاملہ مہر کا شریعتِ محمدیہ کے لحاظ سے درست نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ شریعت شعیب علیہ السلام میں درست ہو اور شرائع انبیاء میں ایسے فروعی فرق ہونا نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۷۱، وصحیح البخاری، کتاب المغازی، بابٌ ج:۲ ص:۵۷۱

[2] روح المعانی ج:۵ ص:۱۱۴، وبیان القرآن ج:۲ ص:۱۰۷

امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ظاہر الروایت میں یہی صورت منقول ہے کہ خدمتِ زوجہ کو مہر نہیں بنایا جا سکتا مگر ایک روایت جس پر علماء متأخرین نے فتویٰ دیا ہے یہ ہے کہ خود بیوی کی خدمت کو مہر بنانا تو شوہر کی تکریم واحترام کے خلاف ہے مگر بیوی کا کوئی ایسا کام جو گھر سے باہر کیا جاتا ہے جیسے مواشی چرانا یا کوئی تجارت کرنا اگر اس میں شرائط اجارہ کے مطابق مدت معین کر دی گئی ہو جیسا کہ اس واقعہ میں آٹھ سال کی مدّت معین ہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اس مدت کی ملازمت کی تنخواہ جو بیوی کے ذمہ لازم ہو تو اس تنخواہ کو مہر قرار دینا جائز ہے۔ (ذکرہ فی البدائع عن نوادر ابن سماعة) [1]

ہاں ایک دوسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ مہر تو بیوی کا حق ہے بیوی کے باپ یا کسی عزیز کو بغیر اجازت زوجہ مہر کی رقم نقد بھی دے دی جائے تو مہر ادا نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ کے الفاظ اس پر شاہد ہیں کہ والد نے ان کو اپنے کام کے لئے ملازم رکھا تو ملازمت کا جو معاوضہ ہے وہ والد کو ملا، تو یہ زوجہ کا مہر کیسے بن گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بکریاں لڑکیوں ہی کی مِلک ہوں اور یہ ملازمت کا فائدہ اس حیثیت سے خود لڑکی کو پہنچا۔ دوسرے اگر باپ ہی کا کام انجام دیا اور اس کی تنخواہ والد کے ذمہ لازم ہوئی تو یہ زر مہر لڑکی کا ہوگیا لڑکی کی اجازت سے والد کو بھی اس کا استعمال درست ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ یہ معاملہ لڑکی کی اجازت سے ہوا ہے۔

مسئلہ:- لفظ اُنۡكِحَكَ سے ثابت ہوا کہ نکاح کا معاملہ والد نے کیا ہے باجماع فقہاء ایسا ہی ہونا چاہئے کہ لڑکی کا ولی اُس کے نکاح کے معاملہ کی کفالت کرے، لڑکی خود اپنا نکاح نہ کرے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی لڑکی نے خود اپنا نکاح کسی ضرورت ومجبوری سے کر لیا تو وہ منعقد ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور یہ آیت اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیتی۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوۡسَى الۡاَجَلَ وَسَارَ بِاَهۡلِهٖۤ اٰنَسَ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ نَارًا ۚ

پھر جب پوری کر چکا موسیٰ وہ مدت اور لے کر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک آگ

قَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡكُمۡ مِّنۡهَا بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَةٍ

کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں کی کچھ خبر یا انگارا

---

[1] بدائع الصنائع، کتاب النکاح، فصل بیان ما یصح تسمیته مهرًا وما لا یصح، ج:۵ ص:۴۷۹

مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ

آگ کا تاکہ تم تاپو پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے

فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ

برکت والے تختہ میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰ مَیں ہوں مَیں اللہ

رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ

جہان کا رَبّ اور یہ کہ ڈال دے اپنی لاٹھی پھر جب دیکھا اس کو پھنپھناتے جیسے سانپ کی سٹک

وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۟ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

اُلٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھرکر اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ

ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکل آئے سفید ہوکر نہ کہ کسی بُرائی سے اور ملالے اپنی طرف

جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ

اپنا بازو ڈر سے سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رَبّ کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں پر

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا

بیشک وہ تھے لوگ نافرمان بولا اے رَبّ میں نے خون کیا ہے اُن میں ایک جان کا

فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ

سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون اس کی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج

مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۫ۙ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ

میرے ساتھ مدد کو کہ میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں فرمایا ہم مضبوط کر دیں گے

معانقہ ۱۱

عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَآ ۚۛ

تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے

اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے

آسان ترجمۂ قرآن

پھر جب موسیٰ نے وہ مدّت پوری کر لی، اور اپنی اہلیہ کو لے کر چلے تو اُنہوں نے کوہِ طور کی طرف سے ایک
آگ دیکھی۔ اُنہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا: "ٹھہرو! میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے تمہارے
پاس کوئی خبر لے آؤں، یا آگ کا کوئی انگارہ اُٹھا لاؤں، تاکہ تم گرمائی حاصل کر سکو۔" ﴿۲۹﴾ چنانچہ جب وہ اُس آگ کے
پاس پہنچے تو دائیں وادی کے کنارے پر جو برکت والے علاقے میں واقع تھی، ایک درخت سے آواز آئی کہ: "اے
موسیٰ! میں ہی اللہ ہوں، تمام جہانوں کا پروردگار!" ﴿۳۰﴾ اور یہ کہ: "اپنی لاٹھی نیچے ڈال دو۔" پھر ہوا یہ کہ جب اُنہوں
نے اُس لاٹھی کو دیکھا کہ وہ اس طرح حرکت کر رہی ہے جیسے وہ سانپ ہو، تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے، اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔
(اُن سے کہا گیا:) "موسیٰ! سامنے آؤ، اور ڈرو نہیں، تم بالکل محفوظ ہو۔ ﴿۳۱﴾ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو، وہ کسی
بیماری کے بغیر چمکتا ہوا نکلے گا، اور ڈر دُور کرنے کے لئے اپنا بازو اپنے جسم سے لپٹا لینا۔ اب یہ دو زبردست دلیلیں ہیں
جو تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اُس کے درباریوں کے پاس بھیجی جا رہی ہیں۔ وہ بڑے نافرمان لوگ
ہیں۔" ﴿۳۲﴾ موسیٰ نے کہا: "میرے پروردگار! میں نے اُن کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا، اس لئے مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل نہ
کر دیں۔ ﴿۳۳﴾ اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ صاف ہے، اس لئے اُن کو بھی میرے ساتھ مددگار بنا کر
بھیج دیجئے کہ وہ میری تائید کریں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔" ﴿۳۴﴾ ارشاد ہوا: "ہم تمہارے بھائی
کے ذریعے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے دیتے ہیں، اور تم دونوں کو ایسا دبدبہ عطا کر دیتے ہیں کہ اُن کو ہماری نشانیوں کی

برکت سے تم پر دسترس حاصل نہیں ہوگی، تم اور تمہارے پیرو کار ہی غالب رہو گے۔'' (۳۵)

خلاصۂ تفسیر

غرض جب موسیٰ (علیہ السلام) اس مدّت کو پورا کر چکے اور (باجازت شعیب علیہ السلام کے) اپنی بی بی کو لے کر (مصر کو یا شام کو) روانہ ہوئے تو (ایک شب میں ایسا اتفاق ہوا کہ سردی بھی تھی اور راہ بھی بھول گئے اس وقت) ان کو کوہ طور کی طرف سے ایک (روشنی بشکل) آگ دکھلائی دی، اُنہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں تمہارے پاس وہاں سے (رستہ کی) کچھ خبر لاؤں یا کوئی آگ کا (دہکتا ہوا) انگارا لے آؤں تا کہ تم سینک لو، سو وہ جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو اس میدان کے داہنی جانب سے (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کی داہنی جانب تھی) اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ میں رَبّ العالمین ہوں اور یہ (بھی آواز آئی) کہ تم اپنا عصا ڈال دو (چنانچہ انہوں نے ڈال دیا اور وہ سانپ بن کر چلنے لگا) سو اُنہوں نے جب اس کو لہراتا ہوا دیکھا جیسا پتلا سانپ (تیز) ہوتا ہے تو پشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (حکم ہوا کہ) اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت (ہر طرح) امن میں ہو (اور یہ کوئی ڈر کی بات نہیں بلکہ تمہارا معجزہ ہے اور دوسرا معجزہ اور عنایت ہوتا ہے کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر ڈالو (اور پھر نکالو) وہ بلا کسی مرض کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا اور (اگر مثل انقلابِ عصا کے اس معجزہ سے بھی طبعاً خوف اور حیرت پیدا ہو تو) خوف (دفع کرنے) کے واسطے اپنا (وہ) ہاتھ (پھر) اپنے (گریبان اور بغل) سے (بدستور سابق) ملا لینا (تا کہ وہ پھر اصلی حالت پر ہو جائے اور پھر طبعی خوف بھی نہ ہوا کرے) سو یہ (تمہاری نبوّت کی) دو سندیں (اور دلیلیں) ہیں تمہارے رَبّ کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جانے کے واسطے (جس کا تم کو حکم کیا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رَبّ (میں جانے کے لئے حاضر ہوں مگر آپ کی خاص امداد کی ضرورت ہے کیونکہ) میں نے ان میں سے ایک آدمی کا خون کر دیا تھا سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ (کہیں پہلے ہی) وہ لوگ مجھ کو قتل کر دیں (تبلیغ بھی نہ ہونے پائے) اور (دوسری بات یہ ہے کہ زبان بھی زیادہ رواں نہیں ہے اور) میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے تو اُن کو بھی میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ رسالت دے دیجئے کہ (وہ میری تقریر کی تائید اور) تصدیق (مفصّل اور مکمل طور سے) کریں گے (کیونکہ) مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون اور اس کے درباری) میری تکذیب کریں (تو اس وقت مناظرہ کی ضرورت ہوگی اور زبانی مناظرہ کے لئے عادۃً وہ آدمی زیادہ مفید ہوتا ہے جو رواں زبان ہو) ارشاد ہوا کہ (بہتر ہے) ہم ابھی تمہارے بھائی کو تمہارا قوتِ بازو بنائے دیتے ہیں (ایک درخواست تو یہ منظور ہوئی) اور (دوسری درخواست کی منظوری اس طرح ہوئی کہ) ہم تم دونوں کو

ایک خاص شوکت (وہیبت) عطا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کو تم پر دسترس نہ ہوگی (پس) ہمارے معجزے لے کر جاؤ تم دونوں اور جو تمہارا پیرو ہوگا (اُن لوگوں پر) غالب رہو گے۔

معارف ومسائل

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ، یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدّتِ معینہ ملازمت کی پوری کردی جو آٹھ سال لازمی اور دو سال اختیاری تھی سو یہاں سوال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صرف آٹھ سال پورے کئے یا دس سال؟ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اُنہوں نے زیادہ مدّت یعنی دس سال پورے کئے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہی شان ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت شریفہ تھی کہ حقدار کو اُس کے حق سے زائد ادا فرماتے تھے اور اُمّت کو اسی کی ہدایت فرمائی ہے کہ ملازمت، اُجرت اور خرید وفروخت میں مساہلت اور ایثار سے کام لیا جائے۔

نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (الی) اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۳۰ یہ مضمون بضمن قصہ موسیٰ علیہ السلام سورۂ طٰہٰ میں ہے اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ (طٰہٰ:۱۲) اور سورۂ نمل میں ہے نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ (النمل:۸) اور اس سورت میں ہے اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۳۰ یہ الفاظ اگرچہ مختلف ہیں مگر معنی تقریباً ایک ہی ہیں، واقعہ کی حکایت ہر مقام کے مناسب الفاظ سے کی گئی ہے (کذا قال الامام) اور یہ تجلّی بشکلِ نار تجلی مثالی تھی کیونکہ تجلّی ذاتی کا مشاہدہ کرنا اس دُنیا میں کسی کو نہیں ہوسکتا اور خود موسیٰ علیہ السلام کو اس تجلّی ذاتی کے اعتبار سے لَنْ تَرٰىنِیْ (الاعراف:۱۴۳) فرمایا گیا ہے یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے مراد مشاہدۂ ذاتِ حق ہے۔

نیک عمل سے جگہ بھی متبرک ہوجاتی ہے

فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ، کوہِ طور کے اس مقام کو قرآنِ کریم نے بقعہ مبارکہ فرمایا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس کے مبارک ہونے کا سبب یہ تجلّی خداوندی ہے جو اس مقام پر بشکلِ نار دکھائی دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس مقام میں کوئی نیک عمل اہم واقع ہوتا ہے وہ مقام بھی متبرک ہوجاتا ہے۔

وعظ میں اچھی خطابت اور فصاحت مطلوب ہے

هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا، اس سے معلوم ہوا کہ وعظ وتبلیغ میں فصاحتِ کلام اور مقبول طرزِ خطابت محمود اور مطلوب ہے۔ اس کی تحصیل میں کوشش بھی مذموم نہیں۔

[1] صحیح البخاری، کتاب الشهادات، باب من امر بانجاز الوعد ج:۱ ص:۳۶۸

فَلَمَّا جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِـَٔايَٰتِنَا بَيِّنَٰتٍ قَالُوا۟ مَا هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى

پھر جب پہنچا ان کے پاس موسیٰ لے کر ہماری نشانیاں کھلی ہوئی بولے اور کچھ نہیں یہ جادو ہے باندھا ہوا

وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِىٓ ءَابَآئِنَا ٱلْأَوَّلِينَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّىٓ أَعْلَمُ

اور ہم نے سنا نہیں یہ اپنے اگلے باپ دادوں میں اور کہا موسیٰ نے میرا رب تو خوب جانتا ہے

بِمَن جَآءَ بِٱلْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِۦ وَمَن تَكُونُ لَهُۥ عَٰقِبَةُ ٱلدَّارِ ۖ

جو کوئی لایا ہے ہدایت کی بات اُس کے پاس سے اور جس کو ملے گا آخرت کا گھر

إِنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم

بیشک بھلا نہ ہوگا بے انصافوں کا اور بولا فرعون اے دربار والو مجھ کو تو معلوم نہیں تمہارا

مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِى ۚ فَأَوْقِدْ لِى يَٰهَٰمَٰنُ عَلَى ٱلطِّينِ فَٱجْعَل لِّى صَرْحًا

کوئی حاکم ہو میرے سوا سو آگ دے اے ہامان میرے واسطے گارے کو پھر بنا میرے واسطے ایک محل

لَّعَلِّىٓ أَطَّلِعُ إِلَىٰٓ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّى لَأَظُنُّهُۥ مِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ﴿۳۸﴾ وَٱسْتَكْبَرَ

تاکہ میں جھانک کر دیکھ لوں موسیٰ کے رب کو اور میری اٹکل میں تو وہ جھوٹا ہے اور بڑائی کرنے لگے

هُوَ وَجُنُودُهُۥ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ﴿۳۹﴾

وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ آئیں گے

فَأَخَذْنَٰهُ وَجُنُودَهُۥ فَنَبَذْنَٰهُمْ فِى ٱلْيَمِّ ۖ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ

پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو، پھر پھینک دیا ہم نے اُن کو دریا میں سو دیکھ لے کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
انجام گنہگاروں کا اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور قیامت کے دن

لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
ان کو مدد نہ ملے گی اور پیچھے رکھ دی ہم نے ان پر اس دُنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن

هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ ع
اُن پر بُرائی ہے

آسان ترجمۂ قرآن

چنانچہ جب موسیٰ اُن کے پاس ہماری کھلی ہوئی نشانیاں لے کر پہنچے تو اُنہوں نے کہا: ''یہ کچھ نہیں، بس بناوٹی جادو ہے، اور ہم نے یہ بات اپنے پچھلے باپ دادوں میں نہیں سنی۔'' ﴿۳۶﴾ اور موسیٰ نے کہا: ''میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اُس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے، اور آخر کار بہتر ٹھکانا کس کے ہاتھ آئے گا، یہ یقینی بات ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔'' ﴿۳۷﴾ اور فرعون بولا: ''اے دربار والو! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی اور خدا سے واقف نہیں ہوں۔ ہامان! تم ایسا کرو کہ میرے لئے گارے کو آگ دے کر پکواؤ، اور میرے لئے ایک اُونچی عمارت بناؤ، تاکہ میں اُس پر سے موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، اور میں تو پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔'' ﴿۳۸﴾ غرض یہ کہ اُس نے اور اُس کے لشکروں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ اُنہیں ہمارے پاس واپس نہیں لایا جائے گا۔ ﴿۳۹﴾ اس لئے ہم نے اُس کو اور اُس کے لشکروں کو پکڑ میں لے کر سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔ ﴿۴۰﴾ ہم نے اُنہیں قائد بنایا تھا جو لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے، اور قیامت کے دن اُن کو کسی کی مدد نہیں پہنچے گی۔ ﴿۴۱﴾ دُنیا میں ہم نے لعنت اُن کے پیچھے لگا دی ہے، اور قیامت کے دن وہ اُن لوگوں میں شامل ہوں گے جن کی بُری حالت ہونے والی ہے۔ ﴿۴۲﴾

خلاصۂ تفسیر

غرض جب ان لوگوں کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہماری صریح دلیلیں لے کر آئے تو ان لوگوں نے (معجزات

دیکھ کر) کہا کہ یہ تو محض ایک جادو ہے کہ (خواہ مخواہ خدا تعالیٰ پر) افترا کیا جاتا ہے (کہ یہ اس کی جانب سے معجزات اور دلیلِ رسالت ہیں) اور ہم نے ایسی بات کبھی نہیں سنی کہ ہمارے اگلے باپ دادوں کے وقت میں بھی ہوئی ہو اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (اس کے جواب میں) فرمایا کہ (جب باوجود دلائلِ صحیحہ قائم ہونے کے اور اس میں کوئی شبہ معقول نہ نکال سکنے کے بعد بھی نہیں مانتے تو یہ ہٹ دھرمی ہے اور اس کا اخیر جواب یہی ہے کہ) میرا پروردگار اس شخص کو خوب جانتا ہے جو صحیح دین اس کے پاس سے لے کر آیا ہے اور جس کا انجام (یعنی خاتمہ) اس عالم (دُنیا) سے اچھا ہونے والا ہے (اور) بالیقین ظالم لوگ (جو کہ ہدایت اور دین صحیح پر نہ ہوں) کبھی فلاح نہ پائیں گے (کیونکہ ان کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ خدا کو خوب معلوم ہے کہ ہم میں اور تم میں کون اہلِ ہدیٰ ہے اور کون ظالم اور کون محمود العاقبت ہے اور کون محروم عن الفلاح پس ہر ایک کی حالت اور ثمرہ کا جلد ہی مرنے کے ساتھ ہی ظہور ہو جائے گا اب نہیں مانتے تم جانو) اور (دلائل موسویہ دیکھ کر اور سُن کر) فرعون (کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ہمارے معتقدین ان کی طرف مائل نہ ہو جائیں تو لوگوں کو جمع کر کے) کہنے لگا اے اہلِ دربار مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا (اس کے بعد تلبیس کے واسطے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر اس سے ان لوگوں کا اطمینان نہ ہو تو) اے ہامان تم ہمارے لئے مٹی (کی اینٹیں بنوا کر اُن) کو آگ میں پزاوہ لگا کر پکواؤ پھر (ان پختہ اینٹوں سے) میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ تا کہ (میں اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو (اس دعویٰ میں کہ کوئی اور خدا ہے) موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور فرعون اور اس کے تابعین نے ناحق دُنیا میں سر اُٹھا رکھا تھا اور یوں سمجھ رہے تھے کہ ان کو ہمارے پاس لَوٹ کر آنا نہیں ہے تو ہم نے (اس تکبّر کی سزا میں) اس کو اور اس کے تابعین کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) سو دیکھئے ظالموں کا انجام کیسا ہوا (اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کا ظہور ہو گیا[1] مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۳۷ (القصص) اور ہم نے ان لوگوں کو ایسا رئیس بنایا تھا جو (لوگوں کو) دوزخ کی طرف بُلاتے رہے اور (اسی واسطے) قیامت کے روز (ایسے بے کس رہ جائیں گے کہ) ان کا کوئی ساتھ نہ دے گا اور (یہ لوگ دونوں عالم میں خائب وخاسر ہوئے چنانچہ) دنیا میں بھی ہم نے ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی بدحال لوگوں میں سے ہوں گے۔

معارف ومسائل

فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ ، فرعون نے بہت اونچا بلند محل تیار کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے وزیر ہامان کو اس کی تیاری کے لئے پہلے یہ حکم دیا کہ مٹی کی اینٹوں کو پکا کر پختہ کیا جائے کیونکہ کچی اینٹوں پر کوئی بڑی اور اونچی بنیاد قائم نہیں ہوسکتی۔

[1] ترجمہ: جس کا انجام اس عالم سے اچھا ہونے والا ہے، بالیقین ظالم لوگ کبھی فلاح نہ پائیں گے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ فرعون کے اس واقعہ سے پہلے پختہ اینٹوں کی تعمیر کا رواج نہ تھا سب سے پہلے فرعون نے یہ ایجاد کرائی۔ تاریخی روایات میں ہے کہ ہامان نے اس محل کی تعمیر کے لئے پچاس ہزار معمار جمع کئے مزدور اور لکڑی لوہے کا کام کرنے والے ان کے علاوہ تھے اور محل کو اتنا اُونچا بنایا کہ اُس زمانے میں اس سے زیادہ بلند کوئی تعمیر نہیں تھی۔ پھر جب یہ تیاری مکمّل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا، اُنہوں نے ایک ضرب میں اس محل کے تین ٹکڑے کر کے گرا دیا جس میں فرعونی فوج کے ہزاروں آدمی دب کر مر گئے۔ (قرطبی) [۱]

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ یعنی فرعون کے درباریوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کا پیشوا بنا دیا تھا مگر یہ غلط کار پیشوا اپنی قوم کو آگ یعنی جہنم کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ یہاں اکثر مفسرین نے آگ کی طرف دعوت دینے کو ایک استعارہ اور مجاز قرار دیا ہے کہ مراد آگ سے وہ اعمالِ کفریہ ہیں جن کا نتیجہ جہنم کی آگ میں جانا تھا مگر اُستاذِ محترم نادرۂ روزگار حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی تحقیق تبعاً لابن عربی یہ تھی کہ آخرت کی جزا عین عمل ہے۔ انسان کے اعمال جو وہ دُنیا میں کرتا ہے برزخ پھر محشر میں شکلیں بدلیں گے اور جوہری صورتوں میں نیک اعمال گل وگلزار بن کر جنت کی نعمتیں بن جائیں گے اور اعمال کفر وظلم آگ اور سانپ بچھوؤں اور طرح طرح کے عذابوں کی شکل اختیار کرلیں گے اس لئے جو شخص اس دُنیا میں کسی کو کفر وظلم کی طرف بلا رہا ہے وہ حقیقۃً اس کو آگ ہی کی طرف بُلا رہا ہے۔ اگرچہ اس دُنیا میں اس کی شکل آگ کی نہیں مگر حقیقت اس کی آگ ہی ہے۔ اسی طرح آیت میں کوئی مجاز یا استعارہ نہیں، اپنی حقیقت پر محمول ہے۔ یہ تحقیق اختیار کی جائے تو قرآن کی بے شمار آیات میں مجاز واستعارہ کا تکلّف نہیں کرنا پڑے گا۔ مثلاً [۲] وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (الکہف:۴۹) اور [۳] فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال) وغیرہ۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ۝۴۲ مَقْبُوْحِيْنَ، مقبوح کی جمع ہے جس کے معنے ہیں بگاڑا ہوا۔ مراد یہ ہے کہ قیامت کے روز ان کے چہرے مسخ ہو کر سیاہ اور آنکھیں نیلی ہو جائیں گی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب بعد اس کے کہ ہم غارت کرچکے پہلی جماعتوں کو

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۸۸، ۲۸۹

[۲] ترجمہ: اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب موجود پائیں گے۔ [۳] ترجمہ: جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَمَا كُنْتَ
سجھانے والی لوگوں کو اور راہ بتانے والی اور رحمت تاکہ وہ یاد رکھیں اور تو نہ تھا
بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾
غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا تو دیکھنے والا
وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا
لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی اُن پر مدّت اور تو نہ رہتا تھا
فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾
مدین والوں میں کہ اُن کو سُناتا ہماری آیتیں پر ہم رہے ہیں رسول بھیجتے
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ
اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی لیکن یہ انعام ہے تیرے ربّ کا تاکہ تو ڈر سُناوے
قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْلَآ
اُن لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈر سُنانے والا تجھ سے پہلے تاکہ وہ یاد رکھیں اور اتنی بات کے لئے
اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ
کہ کبھی آن پڑے اُن پر آفت اُن کاموں کی وجہ سے جن کو بھیج چکے ہیں ان کے ہاتھ، تو کہنے لگیں اے ربّ ہمارے کیوں
اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾
نہ بھیج دیا ہمارے پاس کسی کو پیغام دے کر تو ہم چلتے تیری باتوں پر اور ہوتے ایمان والوں میں

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ

پھر جب پہنچی اُن کو ٹھیک بات ہمارے پاس سے کہنے لگے کیوں نہ ملا اس رسول کو جیسا ملا تھا موسیٰ کو

اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۗ

کیا ابھی منکر نہیں ہو چکے اس سے جو موسیٰ کو ملا تھا اس سے پہلے کہنے لگے دونوں جادو ہیں آپس میں موافق

وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اور کہنے لگے ہم دونوں کو نہیں مانتے تو کہہ اب تم لاؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس کی

هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ

جو ان دونوں سے بہتر ہو کہ میں اس پر چلوں، اگر تم سچے ہو پھر اگر نہ کرلائیں تیرا کہا

فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ

تو جان لے کہ وہ چلتے ہیں نری اپنی خواہشوں پر اور اس سے گمراہ زیادہ کون جو چلے اپنی خواہش پر بدون

هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ وَصَّلْنَا

راہ بتلائے اللہ کے بیشک اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو اور ہم پے در پے بھیجتے رہے ہیں

لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ ؕ

اُن کو اپنے کلام تا کہ وہ دھیان میں لائیں

آسان ترجمۂ قرآن

ہم نے پچھلی اُمتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو ایسی کتاب دی تھی جو لوگوں کے لئے بصیرت کی باتوں پر

مشتمل، اور سراپا ہدایت و رحمت تھی، تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ ۴۳ اور (اے پیغمبر!) تم اُس وقت (کوہِ طور کی) مغربی جانب موجود نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ کو اَحکام سپرد کئے تھے، اور نہ تم اُن لوگوں میں سے تھے جو اس کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔ ۴۴ ــــ بلکہ اُن کے بعد ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں، جن پر طویل زمانہ گذر گیا ــــ اور تم مدین کے بسنے والوں کے درمیان بھی مقیم نہیں تھے کہ اُن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہو، بلکہ (تمہیں) رسول بنانے والے ہم ہیں، ۴۵ اور نہ تم اُس وقت طور کے کنارے موجود تھے جب ہم نے (موسیٰ کو) پکارا تھا، بلکہ یہ تمہارے رَبّ کی رحمت ہے (کہ تمہیں وحی کے ذریعے یہ باتیں بتائی جارہی ہیں) تا کہ تم اُس قوم کو خبردار کرو جس کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا، شاید وہ نصیحت قبول کرلیں۔ ۴۶ اور تا کہ جب ان لوگوں پر ان کے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے کوئی مصیبت آئے تو وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ: "ہمارے پروردگار! آپ نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم آپ کی آیتوں کی پیروی کرتے اور ایمان والوں میں ہم بھی شامل ہوجاتے؟" ۴۷ پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آگیا تو کہنے لگے کہ: "اس پیغمبر کو اُس جیسی چیز کیوں نہیں دی گئی جیسی موسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی تھی؟" حالانکہ جو چیز موسیٰ کو دی گئی تھی، کیا انہوں نے پہلے ہی اُس کا انکار نہیں کردیا تھا؟ انہوں نے کہا تھا کہ: "یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں، اور انہوں نے کہا کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے منکر ہیں۔" ۴۸ (ان سے) کہو: "اچھا، اگر تم سچے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی اور ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت پر مشتمل ہو، میں اُس کی اِتباع کرلوں گا۔" ۴۹ پھر اگر یہ تمہاری فرمائش پوری نہ کریں، تو سمجھ لو کہ درحقیقت یہ لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اور اُس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہش کے پیچھے چلے؟ بیشک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ۵۰ اور واقعہ یہ ہے کہ ہم ان کے فائدے کے لئے ایک کے بعد ایک (نصیحت کی) بات بھیجتے رہے ہیں، تا کہ وہ متنبہ ہوں۔ ۵۱

خلاصۂ تفسیر

اور (رسالت کا سلسلہ خلق کے محتاج اصلاح ہونے کے سبب ہمیشہ سے چلا آیا ہے چنانچہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (جن کا قصہ ابھی پڑھ چکے ہو) اگلی اُمتوں (یعنی قوم نوح و عاد و ثمود) کے ہلاک ہونے کے پیچھے (جبکہ ان زمانوں کے انبیاء کی تعلیمات نایاب ہوگئی تھیں اور لوگ ہدایت کے سخت حاجتمند تھے) کتاب (یعنی تورات) دی تھی جو لوگوں کے (یعنی بنی اسرائیل کے) لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھی تا کہ وہ (اس سے) نصیحت حاصل کریں (طالبِ حق کی اوّل فہم درست ہوتی ہے یہ بصیرت ہے، پھر احکام قبول کرتا ہے یہ ہدایت ہے، پھر ہدایت کا ثمرہ یعنی قرب و قبول عنایت ہوتا ہے یہ رحمت ہے) اور (اسی طرح جب یہ دَورہ بھی ختم ہو چکا اور لوگ پھر محتاج تجدید ہدایت ہوئے

تو اپنی سنتِ مستمرہ کے موافق ہم نے آپ کو رسول بنایا جس کے دلائل میں سے ایک یہی واقعہ موسویہ کی یقینی خبر دینا ہے کیونکہ قطعی خبر دینے کے لئے کوئی طریق علم کا ضروری ہے اور وہ طریق منحصر ہے چار میں، اُمور عقلیہ میں عقل، سو یہ واقعہ اُمور عقلیہ میں سے تو ہے نہیں، اور اُمورِ نقلیہ میں یا سماع اہلِ علم سے جو کہ دوسرا طریقہ ہے سو یہ بھی بوجہ عدم مخالطت وعدم مدارست اہلِ اخبار کے منتفی ہے اور یا اپنا مشاہدہ جو کہ تیسرا طریق ہے سو اس کی نفی نہایت ہی اظہر ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ (طُور کے) مغربی جانب میں موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو احکام دیئے تھے (یعنی توراۃ دی تھی) اور (وہاں خاص تو کیا موجود ہوتے) آپ (تو) ان لوگوں میں سے (بھی) نہ تھے جو (اس زمانہ میں) موجود تھے (پس احتمال مشاہدہ کا بھی نہ رہا) ولیکن (بات یہ کہ) ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کے بعد) بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا (جس سے پھر علوم صحیحہ نایاب ہوگئے اور پھر لوگ محتاجِ ہدایت ہوئے اور گو درمیان درمیان انبیاء علیہم السلام آیا کئے مگر ان کے علوم بھی اس طرح نایاب ہوئے اس لئے ہماری رحمت مقتضی ہوئی کہ ہم نے آپ کو وحی و رسالت سے مشرف فرمایا جو کہ چوتھا طریق ہے خبر یقینی کا اور دوسرے طُرق علم ظنی کے ہیں جو مبحث ہی سے خارج ہے کیونکہ آپ کی یہ خبریں بالکل یقینی اور قطعی ہیں حاصل یہ کہ علم یقینی کے چار طریقے ہیں اور تین منتفی پس چوتھا متعین اور یہی مطلوب ہے) اور (جیسے آپ نے عطاء توراۃ کا مشاہدہ نہیں کیا اور صحیح ویقینی خبر دے رہے ہیں اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قیام مدین کا مشاہدہ نہیں فرمایا چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ اہلِ مدین میں بھی قیام پذیر نہ تھے کہ آپ (وہاں کے حالات دیکھ کر ان حالات کے متعلق) ہماری آیتیں (اپنے) ان (معاصر) لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سُنا رہے ہوں ولیکن ہم ہی (آپ کو) رسول بنانے والے ہیں (کہ رسول بنا کر یہ واقعات وحی سے بتلا دیئے) اور (اسی طرح) آپ طور کی جانب (غربی مذکور) میں اس وقت بھی موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) پکارا تھا (کہ ''[1] اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿٣٠﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ '' (القصص: ٣٠، ٣١) جو کہ ان کو نبوّت عطا ہونے کا وقت تھا) ولیکن (اس کا علم بھی اسی طرح حاصل ہوا کہ) آپ اپنے رَبّ کی رحمت سے نبی بنائے گئے تا کہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا، کیا عجب ہے کہ نصیحت قبول کرلیں (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین بلکہ ان کے آباء اقربین نے بھی کسی نبی کو نہیں دیکھا تھا گو بعض شرائع بالخصوص توحید بواسطہ ان تک بھی پہنچی تھی پس "[2] وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (النحل: ٣٦) سے تعارض نہ رہا) اور (اگر یہ لوگ ذرا تامل کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ پیغمبر بھیجنے سے ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان ہی لوگوں کا فائدہ ہے کہ یہ لوگ حُسن وقُبح پر مطلع ہو کر عقوبت سے بچ سکتے ہیں ورنہ جن اُمور کا قُبح عقل سے دریافت ہوسکتا ہے اس پر عذاب بلا ارسالِ رسول بھی ہونا ممکن تھا لیکن اس وقت ان کو ایک گونہ حسرت ہوتی کہ ہائے اگر رسول آجاتا تو ہم کو زیادہ تنبہ ہوجاتا

[1] ترجمہ: اے موسیٰ میں اللہ ربّ العالمین ہوں اور یہ کہ تم اپنا عصا ڈال دو۔ [2] ترجمہ: اور ہم ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے ہیں۔

اور اس مصیبت میں نہ پڑتے اس لئے رسول بھی بھیج دیا تاکہ اس حسرت سے بچنا ان کو آسان ہو ورنہ احتمال تھا کہ) ہم رسول نہ بھی بھیجتے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے کرداروں کے سبب (جو عقلاً قبیح ہیں) کوئی مصیبت (دُنیا یا آخرت میں) نازل ہوتی (جس کی نسبت ان کو عقل کے یا فرشتے کے ذریعہ سے یقین ہو جاتا کہ یہ سزائے اعمال ہے) تو یہ کہنے لگتے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم آپ کے احکام کا اتباع کرتے اور (ان احکام اور رسول پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوتے سو (اس امر کا مقتضا تو یہ تھا کہ رسول کے آنے کو غنیمت سمجھتے اور اس کے دینِ حق کو قبول کرتے لیکن ان کی یہ حالت ہوئی کہ) جب ہماری طرف سے ان لوگوں کے پاس امرِ حق (یعنی رسولِ حق اور دینِ حق) پہنچا تو (اس میں شبہ نکالنے کے لئے یوں) کہنے لگے کہ ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی (یعنی قرآن واحدۃً مثل توراۃ کے کیوں نہ نازل ہوا، آگے جواب ہے کہ) کیا جو کتاب موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی اس کے قبل یہ لوگ اس کے منکر نہیں ہوئے (چنانچہ ظاہر ہے کہ مشرکین موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو بھی نہ مانتے تھے کیونکہ وہ سرے سے اصل نبوّت ہی کے منکر تھے) یہ لوگ تو (قرآن اور توراۃ دونوں کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں (یہ اس لئے کہا کہ اُصول شرائع میں دونوں متفق ہیں) اور یوں بھی کہتے ہیں کہ ہم تو دونوں میں کسی کو نہیں مانتے (خواہ یہی عبارت ان کا مقولہ ہو اور خواہ ان کے اقوال سے لازم آتا ہو اور خواہ ایک ہی ساتھ دونوں کا انکار کیا ہو یا مختلف قول جمع کئے گئے ہوں۔ تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا منشاء قصد ایمان بالقرآن بصورت تماثل توراۃ کے نہیں بلکہ یہ بھی ایک حیلہ اور شرارت ہے۔ آگے اس کا جواب ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ اچھا تو (علاوہ توراۃ وقرآن کے) تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں سے بہتر ہو میں اسی کی پیروی کرنے لگوں گا، اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (کہ سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ، جس سے مقصود ان دونوں کتابوں کا نعوذ باللہ مفتری اور غلط ہونا ہے۔ یعنی مقصود تو اتباع حق کا ہے پس اگر کتب الٰہیہ کو حق مانتے ہو تو ان کی پیروی کرو، قرآن کی تو مطلقاً اور توراۃ کی توحید وبشاراتِ محمدیہ میں۔ اور اگر ان کو حق نہیں مانتے تو تم کوئی حق پیش کرو اور اس کا حق ہونا ثابت کردو جس کو اہدیٰ ہونے سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ مقصود حق سے اس کا وسیلۂ ہدایت ہونا ہے۔ اگر فرضاً ثابت کردو گے تو میں اس کی پیروی کرلوں گا، غرض یہ کہ میں حق ثابت کردوں تو تم اس کا اتباع کرو، اور اگر تم حق ثابت کردو تو میں اتباع کے لئے آمادہ ہوں اور چونکہ قضیہ شرطیہ میں محض حکم اتصال کا ہوتا ہے اس لئے اتباع غیر کتبِ الٰہیہ کا اشکال لازم نہیں آتا) پھر (اس احتجاج کے بعد) اگر یہ لوگ آپ کا (یہ) کہنا (کہ فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ الخ) نہ کرسکیں (اور ظاہر ہے کہ نہ کرسکیں گے کقولہ تعالیٰ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا [1] (البقرۃ: ۲۴) اور پھر بھی آپ کا اتباع نہ کریں) تو آپ سمجھ لیجئے کہ (ان سوالات کا منشاء کوئی

[1] ترجمہ: پھر تم اگر یہ کام نہ کرسکے اور قیامت تک بھی نہ کرسکو گے۔

اشتباہ وتر دد وحق جوئی نہیں ہے بلکہ) یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں (ان کا نفس کہتا ہے کہ جس طرح بن پڑے انکار ہی کرنا چاہئے، پس یہ ایسا ہی کر رہے ہیں گو حق بھی واضح ہو جائے) اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو بدون اس کے کہ منجانب اللہ کوئی دلیل (اس کے پاس) ہو (اور) اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو (جو کہ وضوحِ حق کے بعد بدون کسی متمسک صحیح کے بھی اپنی گمراہی سے باز نہ آئے) ہدایت نہیں کیا کرتا (جس کا سبب اس شخص کا خود قصد کرنا ہے اپنے گمراہ رہنے کا اور قصد کے بعد خلق فعل عادت ہے اللہ تعالیٰ کی، اس لئے ایسا شخص ہمیشہ گمراہ رہتا ہے، یہاں تک تو جواب الزامی تھا ان کے اس قول کا لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی) اور (آگے تحقیقی جواب ہے جس میں قرآن کے دفعۃً واحدۃً نازل نہ ہونے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ) ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کے لئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا تا کہ یہ لوگ (بار بار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں (یعنی ہم تو دفعۃً واحدۃً بھیجنے پر بھی قادر ہیں مگر ان ہی کی مصلحت سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں پھر اندھیر ہے کہ اپنی ہی مصلحت کی مخالفت کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ، قرونِ اُولیٰ سے اقوامِ نوح و ہود و صالح ولوط علیہم السلام مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اپنی سرکشی کی وجہ سے ہلاک کی گئی تھیں، اور بصائر، بصیرت کی جمع ہے جس کے لفظی معنے تو دانش و بینش کے ہیں۔ مراد اس سے وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ انسانوں کے قلوب میں پیدا فرماتے ہیں جن سے وہ حقائقِ اشیاء کو دیکھ سکیں اور حق و باطل کا امتیاز کر سکیں۔ (مظہری) [1]

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ میں اگر لفظ ناس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمّت ہے تو بات صاف ہے اُس اُمت کے لئے کتاب تورات ہی مجموعۂ بصائر تھی۔ اور اگر لفظ ناس سے تمام انسان مراد ہیں جن میں اُمتِ محمدیہ بھی داخل ہے تو یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ اُمّتِ محمدیہ کے زمانے میں جو تورات موجود ہے وہ تحریفات کے ذریعہ مسخ ہو چکی ہے تو ان کے لئے اس کا بصائر کہنا کیسے درست ہوگا، اور یہ کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی تورات سے فائدہ اُٹھانا چاہئے حالانکہ حدیث میں یہ واقعہ معروف ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت طلب کی کہ وہ تورات میں جو نصائح وغیرہ ہیں ان کو پڑھیں تا کہ ان کے علم میں ترقی ہو، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] تفسیر المظہری ج:۷ ص:۱۶۷

غضبناک ہو کر فرمایا کہ اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو اُن کو بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا[1] (جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ آپ کو صرف میری تعلیمات کو دیکھنا چاہئے، تورات وانجیل کا دیکھنا آپ کے لئے درست نہیں)۔ مگر اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تورات کا جو اس وقت اہلِ کتاب کے پاس نسخہ تھا وہ تحریف شدہ تھا اور زمانہ ابتداء اسلام کا تھا جس میں نزولِ قرآن کا سلسلہ جاری تھا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی مکمّل حفاظت کے پیشِ نظر اپنی احادیث لکھنے سے بھی بعض حضرات کو روک دیا تھا کہ ایسا نہ ہو لوگ قرآن کے ساتھ احادیث کو جوڑ دیں، ان حالات میں کسی دوسری منسوخ شدہ آسمانی کتاب کا پڑھنا پڑھانا ظاہر ہے کہ احتیاط کے خلاف تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً تورات وانجیل کے مطالعے اور پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ ان کتابوں کے وہ حصّے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں پر مشتمل ہیں ان کا مطالعہ کرنا اور نقل کرنا صحابۂ کرام سے ثابت اور معروف ومشہور ہے حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار اس معاملہ میں سب سے زیادہ معروف ہیں، دوسرے صحابۂ کرام نے بھی ان پر نکیر نہیں کیا۔ اس لئے حاصل آیت کا یہ ہو جائے گا کہ تورات وانجیل میں جو غیر محرف مضامین اب بھی موجود ہیں اور بلاشبہ بصائر ہیں، ان سے استفادہ درست ہے مگر ظاہر ہے کہ ان سے استفادہ صرف ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جو محرّف اور غیر محرّف میں فرق کر سکیں اور صحیح وغلط کو پہچان سکیں وہ علماء ماہرین ہی ہو سکتے ہیں، عوام کو بے شک اس سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ کسی مغالطے میں نہ پڑ جائیں، یہی حکم اُن تمام کتابوں کا ہے جس میں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے کہ عوام کو ان کے مطالعہ سے پرہیز کرنا چاہئے علماء ماہرین دیکھیں تو مضائقہ نہیں۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ، یہاں اس قوم سے عرب مراد ہیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور ان کے بعد سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ان میں کوئی پیغمبر مبعوث نہ ہوا تھا یہی مضمون سورۂ یٰسٓ میں بھی آنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری جگہ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ[2] وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾ (فاطر) کہ "کوئی امت ایسی نہیں جس میں اللہ کا کوئی پیغمبر نہ آیا۔" یہ اس آیت کے منافی نہیں کیونکہ مراد اس آیت کی یہ ہے کہ زمانہ دراز سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ان میں کوئی نبی نہیں آیا مگر نبی ورسول کے آنے سے بالکل خالی یہ اُمّت بھی نہیں رہی۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَصَّلْنَا، توصیل سے مشتق ہے جس کے اصلی لغوی معنے رسّی کے

[1] مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الحدیث بالکراسیس، باب من کرہ النظر فی کتب اھل الکتاب، رقم الحدیث: ۲۶۴۲۱

[2] ترجمہ: اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرسنانے والا نہ گزرا ہو۔

تاروں میں اور تار ملا کر اس کے مضبوط کرنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رکھا اور بہت سے نصیحت کے مضامین کا بار بار تکرار بھی کیا گیا تاکہ سُننے والے متاثر ہوں۔

تبلیغ ودعوت کے بعض آداب

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا اہم پہلو یہ تھا کہ وہ حق بات کو مسلسل کہتے اور پہنچاتے ہی رہتے تھے۔ لوگوں کا انکار وتکذیب اُن کے اپنے عمل اور اپنی لگن میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ حق کو، اگر ایک مرتبہ نہ مانا گیا تو دوسری مرتبہ، پھر بھی نہ مانا گیا تو تیسری چوتھی مرتبہ برابر پیش کرتے ہی رہتے تھے۔ کسی کے دل میں ڈال دینا تو کسی ناصح ہمدرد کے بس میں نہیں مگر اپنی کوشش کو بغیر کسی تکان اور اکتاہٹ کے جاری رکھنا جو ان کے قبضہ میں تھا اس کو مسلسل انجام دیتے۔ آج بھی تبلیغ ودعوت کے کام کرنے والوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۲ وَاِذَا يُتْلٰى

جن کو ہم نے دی ہے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب اُن کو سُنائے

عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ

تو کہیں ہم یقین لائیں اس پر یہی ہے ٹھیک ہمارے رَبّ کا بھیجا ہوا ہم ہیں اس سے پہلے کے

مُسْلِمِيْنَ ۝۵۳ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا

حکم بردار وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دوہرا اس بات پر کہ قائم رہے

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۵۴ وَاِذَا سَمِعُوا

اور بھلائی کرتے ہیں بُرائی کے جواب میں اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اور جب سُنیں

اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ز سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ز

نکمّی باتیں اس سے کنارہ کریں اور کہیں ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام، سلامت رہو

لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

ہم کو نہیں چاہئیں بے سمجھ لوگ

آسان ترجمۂ قرآن

جن کو ہم نے قرآن سے پہلے آسمانی کتابیں دی ہیں، وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں، ﴿۵۲﴾ اور جب وہ اُن کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ: ''ہم اس پر ایمان لائے، یقیناً یہ برحق کلام ہے جو ہمارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے۔ ہم تو اس سے پہلے بھی اسے مانتے تھے۔ ﴿۵۳﴾ ایسے لوگوں کو اُن کا ثواب دُہرا دیا جائے گا، کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا، اور وہ نیکی سے برائی کا دفعیہ کرتے ہیں، اور ہم نے جو کچھ اُن کو دیا ہے، اُس میں سے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتے ہیں۔ ﴿۵۴﴾ اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اُسے ٹال جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ: ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ ہم تمہیں سلام کرتے ہیں۔ ہم نادان لوگوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔'' ﴿۵۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اُن بشارتوں سے بھی ثابت ہے جن کی اُن علماء نے تصدیق کی ہے جن کو تورات وانجیل میں ان بشارتوں کا علم ہے۔ چنانچہ) جن لوگوں کو ہم نے قرآن سے پہلے (آسمانی) کتابیں دی ہیں (اُن میں جو منصف ہیں) وہ اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب قرآن اُن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے بے شک یہ حق ہے (جو) ہمارے رَبّ کی طرف سے (نازل ہوا ہے اور) ہم تو اس (کے آنے) سے پہلے بھی (اپنی کتابوں کی بشارتوں کی بِناء پر) مانتے تھے (اب نزول کے بعد تجدید عہد کرتے ہیں۔ یعنی ہم ان لوگوں کی طرح نہیں جو نزولِ قرآن سے پہلے تو اس کی تصدیق کرتے تھے بلکہ اس کے آنے کے منتظر اور شائق تھے مگر جب قرآن آیا تو اس کے منکر ہوگئے (فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ [1] (البقرة:۸۹) اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ تورات وانجیل کی بشارتوں کے مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جیسا کہ سورۂ شعراء کے آخر میں فرمایا ہے [2] اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ (الشعراء)۔ یہاں تک رسالتِ محمدیہ پر علماءِ بنی اسرائیل کی شہادت کا بیان ہوا آگے مؤمنین اہلِ کتاب کی

[1] ترجمہ: پھر جب وہ چیز آپہنچی جس کو وہ پہچانتے ہیں تو اس کا انکار کر بیٹھے۔

[2] ترجمہ: کیا ان لوگوں کے لئے یہ بات دلیل نہیں ہے کہ اس کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

فضیلت کا بیان ہے کہ) اُن لوگوں کو اُن کی پختگی کی وجہ سے دوہرا ثواب ملے گا (کیونکہ وہ پہلی کتاب پر ایمان رکھنے کے ضمن میں بھی قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور بعد نزول کے بھی اس پر قائم رہے اور اس کی تجدید کی، یہ تو ان کے اعتقاد اور جزاء کا بیان تھا آگے اعمال و اخلاق کا ذکر ہے کہ) اور وہ لوگ نیکی (اور تحمل) سے بدی (اور ایذاء) کا دفعیہ کر دیتے ہیں اور ہم نے جو کچھ اُن کو دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور (جس طرح یہ لوگ عملی ایذاؤں پر صبر کرتے ہیں اسی طرح) جب کسی سے (اپنے متعلق) کوئی لغو بات سُنتے ہیں (جو قولی ایذاء ہے) تو اس کو (بھی) ٹال جاتے ہیں اور (سلامت روی کے طور پر) کہہ دیتے ہیں کہ (ہم کچھ جواب نہیں دیتے) ہمارا عمل ہمارے سامنے آئے گا اور تمہارا عمل تمہارے سامنے (بھائی) ہم تو تم کو سلام کرتے ہیں (ہم کو جھگڑے سے معاف رکھو) ہم بے سمجھ لوگوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ اس آیت میں اُن اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت اور نزولِ قرآن سے پہلے ہی تورات و انجیل کی دی ہوئی بشارتوں کی بناء پر نزولِ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر یقین رکھتے تھے۔ پھر آپ مبعوث ہوئے تو اپنے سابق یقین کی بناء پر ایمان لے آئے۔ حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے درباریوں میں سے چالیس آدمی مدینہ طیبہ میں اس وقت حاضر ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر میں مشغول تھے یہ لوگ بھی جہاد میں شریک ہوگئے، بعض کو کچھ زخم بھی لگے مگر ان میں سے کوئی مقتول نہیں ہوا۔ اُنہوں نے جب صحابۂ کرام کی معاشی تنگی کا حال دیکھا تو آپ سے درخواست کی کہ ہم اللہ کے فضل سے مالدار اصحابِ جائیداد ہیں ہم اپنے ملک واپس جا کر صحابۂ کرام کے لئے مال فراہم کر کے لائیں آپ اجازت دے دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ (الی قولہ) وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ (اخرجه ابن مردويه والطبرانی فی الأوسط۔ مظهری)[1] اور حضرت سعید بن جبیرؒ کی روایت ہے کہ حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب ہجرتِ مدینہ سے پہلے حبشہ گئے تھے اور نجاشی کے دربار میں اسلام کی تعلیمات پیش کیں تو نجاشی اور اس کے اہلِ دربار جو اہلِ کتاب تھے اور تورات و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور علامتیں دیکھے ہوئے تھے ان کے دلوں میں اسی وقت اللہ نے ایمان ڈال دیا۔ (مظہری)[2]

[1] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۱۷۱، والمعجم الأوسط للطبرانیؒ رقم الحديث: ۶۶۲۰

[2] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۱۷۲

لفظ مسلمین اُمتِ محمدیہ کا مخصوص لقب ہے یا تمام اُمتوں کے لئے عام ہے

اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلِهٖ مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۵۳﴾ یعنی ان حضرات اہلِ کتاب نے کہا کہ ہم تو قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے یہاں لفظ مسلم اگر اپنے لغوی معنے میں لیا جائے یعنی مطیع وفرمانبردار تو بات صاف ہے کہ ان کو جو یقین قرآن اور نبی آخر الزماں پر اپنی کتابوں کی وجہ سے حاصل تھا اس یقین کو لفظ اسلام اور مسلمین سے تعبیر فرمایا کہ ہم تو پہلے ہی سے اس کو مانتے تھے۔ اور اگر لفظ مسلمین اس جگہ اُس معنے میں لیا جائے جس کے لحاظ سے اُمتِ محمدیہ کا لقب مسلمین ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسلام اور مسلمین کا لفظ صرف اُمتِ محمدیہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا اور وہ سب مسلمین ہی تھے مگر قرآن کریم کی بعض آیات سے اسلام اور مسلمین کا اس اُمت کے لئے مخصوص لقب ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول خود قرآن نے نقل کیا ہے [۱] هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ (الحج:۷۸) اور علامہ سیوطی اسی خصوصیت کے قائل ہیں اور اس مضمون پر اُن کا ایک مستقل رسالہ ہے ان کے نزدیک اس آیت میں مسلمین سے مراد یہ ہے کہ ہم تو پہلے ہی سے اسلام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ اور اگر غور کیا جائے تو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کے دین کا مشترک نام بھی ہو اور اس اُمت کے لئے مخصوص لقب بھی۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اسلام اپنے معنی وصفی کے اعتبار سے سب میں مشترک ہو مگر مسلم کا لقب صرف اس اُمّت کے لئے مخصوص ہو جیسے صدیق اور فاروق وغیرہ کے القاب ہیں جن کا مصداقِ خاص اس اُمت میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں، حالانکہ اپنے معنے وصفی کے اعتبار سے دوسرے حضرات بھی صدیق اور فاروق ہوسکتے ہیں [۲] (هذا ما سَنَحَ لی والله اعلم)

اُولٰٓئِكَ يُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ، یعنی مؤمنین اہلِ کتاب کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اسی طرح کا وعدہ ازواج مطہرات کے متعلق بھی آیا ہے [۳] وَمَنۡ يَّقۡنُتۡ مِنۡكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتَعۡمَلۡ صَالِحًا نُّؤۡتِهَآ اَجۡرَهَا مَرَّتَيۡنِ ۙ (الاحزاب:۳۱)، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تین شخصوں کے لئے دوہرے اجر کا ذکر فرمایا ہے ایک وہ اہلِ کتاب جو پہلے اپنے سابق نبی پر ایمان لایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، دوسرا وہ شخص جو کسی کا مملوک غلام ہو اور وہ اپنے آقا کی بھی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی بھی، تیسرا وہ شخص جس کی ملک میں کوئی کنیز تھی جس سے بلا نکاح صحبت اس کے لئے حلال تھی اس نے اس کو اپنی غلامی سے آزاد کردیا پھر اس کو منکوحہ زوجہ بنالیا۔ [۴]

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ان چند قسموں کو دو مرتبہ اجر دینے کی علّت کیا ہے اگر کہا جائے کہ ان دونوں کے دو

---

[۱] ترجمہ: اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا۔ [۲] یہ بات میرے ذہن میں آئی اور اللہ زیادہ جانتا ہے۔

[۳] ترجمہ: اور جو کوئی تم میں اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی تو ہم اس کو اس کا ثواب دہرا دیں گے۔

[۴] صحیح البخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امته واهله ج:۱ ص:۲۰

عمل اس دوہرے اجر کا سبب ہیں کیونکہ مؤمنین اہلِ کتاب کے دو عمل یہ ہیں کہ پہلے ایک نبی اور اس کی کتاب پر ایمان لائے پھر دوسرے نبی اور اس کی کتاب پر، اور ازواج مطہرات کے دو عمل یہ ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ومحبت بحیثیت رسول بھی کرتی ہیں اور بحیثیت شوہر بھی، اور مملوک غلام کے دو عمل اس کی دوہری اطاعت وفرمانبرداری ہے، اللہ ورسول کی بھی اور آقا کی بھی، اور کنیز کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے والے کا ایک عمل صالح اس کو آزاد کرنا دوسرا اس کو منکوحہ زوجہ بنالینا ہے۔ مگر اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو عمل کے دو اجر ہونا تو مقتضائے عدل وانصاف ہونے کی وجہ سے سب کے لئے عام ہے اس میں مؤمنین اہلِ کتاب یا ازواج مطہرات وغیرہ کی کیا خصوصیت ہے جو شخص بھی دو عمل کرے گا دو اجر پائے گا؟ اس سوال کے جواب کی مکمل تحقیق احقر نے احکام القرآن سورۂ قصص میں لکھی ہے اس میں جو بات خود الفاظِ قرآن کی دلالت سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام اقسام میں مراد صرف دو اجر نہیں، کیونکہ وہ تو ہر عمل کرنے والے کے لئے عام ضابطۂ قرآنیہ ہے [1] لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ (آل عمران: ۱۹۵)، یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ جتنے نیک عمل کرے گا اُسی کے حساب سے اجر پائے گا۔ بلکہ ان اقسامِ مذکورہ میں دو اجر سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کے ہر عمل کا دوہرا ثواب ملے گا۔ ہر نماز پر اس کا دوہرا، ہر روزہ پر اس کا دوہرا، ہر صدقہ اور حج وعمرہ پر اس کا دوہرا ثواب پائیں گے۔ قرآن کے الفاظ پر غور کریں تو دو اجر دینے کے لئے مختصر لفظ اجرین کا تھا مگر قرآن نے اس کو چھوڑ کر **اجر مرتین** کا لفظ اختیار کیا جس میں صاف اشارہ اس کا پایا جاتا ہے کہ اجر مرتین سے مراد یہ ہے کہ ان کا ہر عمل مکرر لکھا جائے گا اور ہر عمل پر دوہرا ثواب ملے گا۔

رہا یہ معاملہ کہ ان کی اتنی بڑی فضیلت اور خصوصیت کا سبب کیا ہے تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ کسی خاص عمل کو دوسرے اعمال سے افضل قرار دیدے اور اس کا اجر بڑھا دے، کسی کو اس سوال کا حق نہیں ہے کہ روزہ کا ثواب اللہ تعالیٰ نے اتنا زیادہ کیوں کر دیا، زکوٰۃ وصدقہ کا کیوں ایسا نہ کیا؟ ہوسکتا ہے کہ یہ اعمال جن کا ذکر آیاتِ مذکورہ اور حدیث بخاری میں ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ دوسرے اعمال سے ایک حیثیت میں بڑھا ہوا ہو اس پر یہ انعام فرمایا۔ اور بعض اکابر علماء نے جو اس کا سبب ان لوگوں کی دوہری مشقت کو قرار دیا ہے وہ بھی اپنی جگہ محتمل ہے اور اسی آیت کے آخر میں لفظ بِمَا صَبَرُوْا سے اس پر استدلال ہوسکتا ہے کہ علّت اس دوہرے اجر کی اُن کا مشقت پر صبر کرنا ہے۔ واللہ اعلم

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ، یعنی یہ لوگ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ دُور کرتے ہیں۔ اس بُرائی اور بھلائی کی تعبیر میں ائمۂ تفسیر کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ بھلائی سے طاعت اور بُرائی سے معصیت مراد ہے کیونکہ نیکی

---

[1] ترجمہ: میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا۔

بدی کو مٹا دیتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا۔ [1] یعنی بدی اور گناہ کے بعد نیکی کرو تو وہ گناہ کو مٹا دے گی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا حسنہ سے مراد علم وحلم اور سیئہ سے مراد جہل وغفلت ہے یعنی یہ لوگ دوسروں کی جہالت کا جواب جہالت کے بجائے حلم و بُردباری سے دیتے ہیں اور درحقیقت ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ لفظ حسنہ اور سیئہ یعنی بھلائی اور بُرائی کے الفاظ ان سب چیزوں کو شامل ہیں۔

اس آیت میں دو اہم ہدایتیں ہیں

اوّل یہ کہ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ خطاءً سرزد ہو جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس کے بعد نیک عمل کی فکر کرے تو نیک عمل اس گناہ کا کفارہ ہو جائے گا جیسا کہ حدیث معاذؓ کے حوالے سے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کسی کے ساتھ ظلم اور بُرائی سے پیش آئے اگرچہ قانون شرع کی رُو سے اس کو اپنا انتقام لے لینا جائز ہے بشرطیکہ انتقام برابر سرابر ہو کہ جتنا نقصان یا تکلیف اس کو پہنچائی ہے اُتنا ہی یہ اپنے حریف کو پہنچا دے مگر اولیٰ اور احسن یہ ہے کہ انتقام کے بجائے بُرائی کے بدلہ میں بھلائی اور ظلم کے بدلہ میں احسان کرے کہ یہ اعلیٰ درجہ مکارمِ اخلاق کا ہے اور دُنیا و آخرت میں اس کے منافع بیشمار ہیں۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں یہ ہدایت بہت واضح الفاظ میں اس طرح آئی ہے [2] اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ (حٰمٓ السجدۃ)، یعنی بُرائی اور ظلم کو ایسے طریقہ سے دفع کرو جو کہ بہتر ہے۔ (یعنی ظلم کے بدلہ میں احسان کرو)۔ تو جس شخص کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے وہ تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾ یعنی ان لوگوں کی ایک عمدہ خصلت یہ ہے کہ جب یہ کسی جاہل دشمن سے لغو بات سنتے ہیں تو اس کا جواب دینے کے بجائے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا سلام لو، ہم جاہل لوگوں سے اُلجھنا پسند نہیں کرتے۔ امام جصاصؒ نے فرمایا کہ سلام کی دو قسمیں ہیں، ایک سلام تحیّہ جو مسلمان باہم ایک دوسرے کو کرتے ہیں، دوسرا سلام مسالمت و متارکت یعنی اپنے حریف کو یہ کہہ دینا کہ ہم تمہاری لغو بات کا کوئی انتقام تم سے نہیں لیتے، یہاں سلام سے یہی دوسرے معنے مراد ہیں۔ [3]

[1] مسند احمد، حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۲۱۰۴۷

[2] ترجمہ: آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے۔

[3] احکام القرآن للجصاصؒ تحت هذه الآية ج:۸ ص:۲۶۱

اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ

تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے پر اللہ راہ پر لائے۔ جس کو چاہے

وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾

اور وہی خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) حقیقت یہ ہے کہ تم جس کو خود چاہو، ہدایت تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت تک پہنچا دیتا ہے، اور ہدایت قبول کرنے والوں کو وہی خوب جانتا ہے۔ ﴿۵۶﴾

خلاصۂ تفسیر

آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے (اور ہدایت کرنے کی قدرت تو کسی کو کیا ہوتی اللہ کے سوا کسی کو اس کا علم تک بھی نہیں کہ کون کون ہدایت پانے والا ہے بلکہ) ہدایت پانے والوں کا علم اُسی کو ہے۔

معارف و مسائل

لفظ ہدایت کئی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنے صرف راستہ دکھا دینے کے ہیں، جس کے لئے ضروری نہیں کہ جس کو راستہ دکھایا گیا وہ منزل مقصود پر پہنچے اور ایک معنی ہدایت کے یہ بھی آتے ہیں کہ کسی کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا جائے۔ پہلے معنے کے اعتبار سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کا ہادی ہونا اور یہ ہدایت اُن کے اختیار میں ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ ہدایت ہی اُن کا فرض منصبی ہے اگر اس کی اُن کو قدرت نہ ہو تو فریضہ رسالت و نبوّت کیسے ادا کریں۔ اس آیت میں جو آپ کا ہدایت پر قادر نہ ہونا بیان فرمایا ہے اس سے مرادِ دوسرے معنے کی ہدایت ہے، یعنی مقصود پر پہنچا دینا۔ اور مطلب یہ ہے کہ اپنی تبلیغ و تعلیم کے ذریعہ آپ کسی کے دل میں ایمان ڈال دیں اس کو مؤمن بنا دیں یہ آپ

کا کام نہیں یہ تو براہِ راست حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ہدایت کے معنی اور اُس کی اقسام کی مکمل تحقیق سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے [۱] کہ آپ کی بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ کسی طرح ایمان قبول کرلیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا گیا کسی کو مؤمن بنا دینا آپ کی قدرت میں نہیں۔ تفسیر رُوح المعانی میں ہے کہ ابوطالب کے ایمان و کفر کے معاملے میں بے ضرورت گفتگو اور بحث و مباحثہ سے اور اُن کو بُرا کہنے سے اجتناب کرنا چاہئے کہ اُس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی ایذاء کا احتمال ہے۔ [۲] وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

وَقَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ

اور کہنے لگے اگر ہم راہ پر آئیں تیرے ساتھ اُچک لئے جائیں اپنے ملک سے کیا ہم نے جگہ نہیں دی

لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ

اُن کو حرمت والے پناہ کے مکان میں کھنچے چلے آتے ہیں اس کی طرف میوے ہر چیز کے روزی ہماری طرف سے پر

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ

بہت ان میں سمجھ نہیں رکھتے اور کتنی غارت کردیں ہم نے بستیاں جو اِترا چلی تھیں اپنی گزران میں

فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾

اب یہ ہیں اُن کے گھر آباد نہیں ہوئے اُن کے پیچھے مگر تھوڑے اور ہم ہیں آخر کو سب کچھ لینے والے

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اور تیرا ربّ نہیں غارت کرنے والا بستیوں کو جب تک نہ بھیج لے ان کی بڑی بستی میں کسی کو پیغام دے کر جو سُنائے اُن کو

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی صحة الإسلام من حضره الموت إلخ ج:۱ ص:۴۰

[۲] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۵ ص:۱۶۱

اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ

ہماری باتیں اور ہم ہرگز نہیں غارت کرنے والے بستیوں کو مگر جبکہ وہاں کے لوگ گناہگار ہوں اور جو تم کو ملی ہے

مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ

کوئی چیز سو فائدہ اُٹھالینا ہے دُنیا کی زندگی میں اور یہاں کی رونق ہے، اور جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے اور باقی رہنے والا

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

کیا تم کو سمجھ نہیں

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ''اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں گے تو ہمیں اپنی زمین سے کوئی اُچک کر لے جائے گا۔'' بھلا کیا ہم نے ان کو اُس حرم میں جگہ نہیں دے رکھی جو اتنا پُر امن ہے کہ ہر قسم کے پھل اُس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، جو خاص ہماری طرف سے دیا ہوا رزق ہے؟ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ﴿۵۷﴾ اور کتنی ہی بستیاں وہ ہیں جو اپنی معیشت پر اِتراتی تھیں، ہم نے اُن کو تباہ کر ڈالا، اب وہ اُن کی رہائش گاہیں تمہارے سامنے ہیں، جو اُن کے بعد تھوڑے عرصے کو چھوڑ کر کبھی آباد ہی نہ ہوسکیں، اور ہم ہی تھے جو اُن کے وارث بنے۔ ﴿۵۸﴾ اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیاں یونہی ہلاک کر ڈالے جب تک اُس نے اُن بستیوں کے مرکزی مقام پر کوئی رسول نہ بھیجا ہو جو اُن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے، اور ہم بستیوں کو اُس وقت تک ہلاک کرنے والے نہیں ہیں جب تک اُن کے باشندے ظالم نہ بن جائیں۔ ﴿۵۹﴾ اور تم کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے، وہ دُنیوی زندگی کی پونجی اور اُس کی سجاوٹ ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ کہیں زیادہ بہتر اور کہیں زیادہ پائیدار ہے۔ کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ ﴿۶۰﴾

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر دُور سے کفار کے ایمان نہ لانے کا ذکر چلا آرہا ہے ان آیات میں اُن موانع کا ذکر ہے جو کفار کو ایمان لانے کی راہ میں حائل سمجھے جاتے تھے، مثلاً ایک مانع کا بیان یہ ہے کہ) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے ساتھ ہو کر (اس

دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے جائیں (کہ بے وطنی کی بھی مضرّت ہو اور معاش کی پریشانی الگ ہو، لیکن اس عذر کا بطلان ہی بالکل ظاہر ہے) کیا ہم نے ان کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے (یعنی ہماری قدرت اور رزاقی سے) کھانے کو ملتے ہیں (پس حرم ہونے کی وجہ سے جس کا سب احترام کرتے ہیں مضرّت کا بھی اندیشہ نہیں اور اس مضرت کے منتفی ہونے کی وجہ سے احتمال فوتِ منفعتِ رزق کا بھی نہیں، پس ان کو چاہئے تھا کہ اس حالت کو غنیمت سمجھتے اور اس کو نعمت سمجھ کر قدر کرتے اور ایمان لے آتے) ولیکن ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے (یعنی اس کا خیال نہیں کرتے) اور (ایک سبب اُن کے ایمان نہ لانے کا یہ ہے کہ یہ اپنی خوش عیشی پر نازاں ہیں لیکن یہ بھی حماقت ہے کیونکہ) ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامانِ عیش پر نازاں تھے، سو (دیکھ لو) یہ ان کے گھر (تمہاری آنکھوں کے سامنے پڑے) ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے (کہ کسی مسافر وارد وصادر کا ادھر کو اتفاقاً گزر ہو جائے اور وہ تھوڑی دیر وہاں ستانے کو یا تماشا دیکھنے کو بیٹھ جائے یا شب کو رہ جائے) اور آخر کار (ان کے سب سامانوں کے) ہم ہی مالک رہے (کوئی ظاہری وارث بھی ان کا نہ ہوا۔) اور (ایک شبہ ان کو یہ ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں کی ہلاکت بسبب کفر کے ہے تو ہم مدت سے کفر کرتے آرہے ہیں ہم کو کیوں نہ ہلاک کیا جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے [1] وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ الخ (یونس: ۴۸) اور اس شبہ کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے سو اس کا حل یہ ہے کہ) آپ کا رَبّ بستیوں کو (اول ہی بار میں) ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک کہ (بستیوں) کے صدر مقام میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج لے اور (پیغمبر کو بھیجنے کے بعد بھی فوراً) ہم ان بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اسی حالت میں کہ وہاں کے باشندے بہت ہی شرارت کرنے لگیں (یعنی ایک مدّتِ معتد بہ تک بار بار کی تذکیر سے تذکّر حاصل نہ کریں تو اس وقت ہلاک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جن بستیوں کی ہلاکت کا اوپر ذکر تھا وہ بھی اسی قانون کے موافق ہلاک ہوئیں سو اسی قانون کے موافق تمہارے ساتھ عملدرآمد ہو رہا ہے اس لئے نہ رسول سے پہلے ہلاک کیا اور نہ بعد رسول کے ابھی تک ہلاک کیا مگر چند روز گزرنے دو۔ اگر تمہارا یہی عناد رہا تو سزا ہو ہی گی چنانچہ بدر وغیرہ میں ہوئی) اور (ایک وجہ ایمان نہ لانے کی یہ ہے کہ دُنیا نقد ہے اس لئے مرغوب ہے اور آخرت اُدھار ہے اس لئے غیر مرغوب ہے، پس دُنیا کی رغبت سے دل خالی نہیں ہوتا کہ اس میں آخرت کی رغبت سمائے پھر اس کی تحصیل کا طریقہ تلاش کیا جائے جو کہ ایمان ہے سو اس کی نسبت یہ سُن رکھو کہ) جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دُنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی (زیب و) زینت ہے (کہ خاتمہ عمر کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا) اور جو (اجر وثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیۃً بھی) بہتر ہے اور (کمیۃً بھی) زیادہ (یعنی ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے سو کیا تم

[1] ترجمہ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔

لوگ (اس تفاوت کو یا اس تفاوت کے اقتضاء کو) نہیں سمجھتے (غرض تمہارے اعذار اور اسباب پر اصرار علی الکفر سب محض بے بنیاد اور لغو ہیں سمجھو اور مانو)۔

معارف و مسائل

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا یعنی کفارِ مکہ حارث بن عثمان وغیرہ نے اپنے ایمان نہ لانے کی ایک وجہ یہ بیان کی کہ اگرچہ ہم آپ کی تعلیمات کو حق مانتے ہیں مگر ہمیں خطرہ یہ ہے کہ اگر ہم آپ کی ہدایات پر عمل کر کے آپ کے ساتھ ہو جائیں تو سارا عرب ہمارا دشمن ہو جائے گا اور ہمیں ہماری زمین مکہ سے اُچک لے گا (اخرجہ النسائی وغیرہ)[1] قرآن کریم نے ان کے اس عُذرِ لنگ کے تین جواب دیئے اوّل یہ کہ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ، یعنی اُن کا یہ عذر اس لئے باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اہلِ مکہ کی حفاظت کا ایک قدرتی سامان پہلے سے یہ کر رکھا ہے کہ ارضِ مکہ کو حَرَم بنا دیا اور پورے عرب کے قبائل کفر و شرک اور باہمی عداوتوں کے باوجود اس پر متفق تھے کہ زمین حرمِ مکہ میں قتل و قتال سخت حرام ہے۔ حرم میں باپ کا قاتل بیٹے کو ملتا تو انتہائی جوشِ انتقام کے باوجود کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ حرم کے اندر اپنے دشمن کو قتل کر دے یا اُس سے کوئی انتقام لے لے، اس لئے ایمان لانے میں اُن کو یہ خطرہ محسوس کرنا کس قدر جہالت ہے کہ جس مالک نے اپنے رحم و کرم سے اُن کے کفر و شرک کے باوجود اس زمین میں امن دے رکھا ہے تو ایمان لانے کی صورت میں وہ اُن کو کیسے ہلاک ہونے دے گا۔ یحییٰ بن سلام نے فرمایا کہ معنے آیت کے یہ ہیں کہ تم حرم کی وجہ سے مأمون و محفوظ تھے، میرا دیا ہوا رزق فراخی کے ساتھ کھا رہے تھے اور عبادت میرے سوا دوسروں کی کرتے تھے اپنی اس حالت سے تو تمہیں خوف نہ ہوا اُلٹا خوف اللہ پر ایمان لانے سے ہوا۔ (قرطبی)[2] آیتِ مذکورہ میں حرمِ مکہ کے دو وصف بیان فرمائے ہیں ایک یہ کہ وہ جائے امن ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں اطرافِ دُنیا سے ہر چیز کے ثمرات لائے جاتے ہیں تاکہ مکہ کے باشندے اپنی تمام ضروریات آسانی سے پوری کر سکیں۔

حرمِ مکہ میں ہر چیز کے ثمرات کا جمع ہونا خاص آیاتِ قدرت میں سے ہے

مکہ مکرمہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کے لئے ساری دُنیا میں سے منتخب فرمایا ایک ایسا مقام ہے کہ وہاں دُنیا کی معیشت کی کوئی چیز آسانی سے نہ ملنا چاہئے۔ کیونکہ گیہوں، چنا، چاول وغیرہ جو عام انسانی غذا ہے، ان چیزوں کی پیداوار بھی وہاں نہ ہونے کے حکم میں تھی۔ پھل اور ترکاریوں وغیرہ کا تو کہنا کیا ہے مگر یہ سب چیزیں جس افراط کے ساتھ مکہ مکرمہ

[1] سنن النسائی الکبریٰ، کتاب التفسیر، سورة القصص، رقم الحدیث: ۱۱۳۸۵

[2] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیة ج: ۱۳ ص: ۳۰۰

میں ملتی ہیں عقل حیران رہ جاتی ہے کہ موسم حج کے موقع پر مکہ کی دوتین لاکھ کی آبادی پر بارہ پندرہ لاکھ مسلمانوں کا اضافہ ہر سال ہوجاتا ہے جو اوسطاً دو ڈھائی مہینے تک رہتا ہے۔ کبھی نہیں سُنا گیا کہ ان میں سے کسی کو کسی زمانے میں غذائی ضروریات نہ ملی ہوں بلکہ رات دن کے تمام اوقات میں تیار شدہ غذا ہر وقت ملتے رہنے کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اور قرآنِ کریم کے لفظ (ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ) میں غور کریں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرفِ عام کے اعتبار سے ثمرات کا تعلق درختوں کے ساتھ ہے مقام اس کا تھا کہ ثمرات کُلِّ شجر فرمایا جاتا، اس کے بجائے ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ فرماتے ہیں۔ بعید نہیں کہ اشارہ اس طرف ہو کہ لفظ ثمرات یہاں صرف پھلوں کے معنے میں نہیں بلکہ مطلقاً حاصل اور پیداوار کے معنی میں ہے ملوں اور کارخانوں کی مصنوعات بھی اُن کے ثمرات ہیں، اس طرح حاصل اس آیت کا یہ ہوگا کہ حرمِ مکہ میں صرف کھانے پینے ہی کی چیزیں جمع نہیں ہوں گی بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی جمع کردی جائیں گی جس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہورہا ہے کہ شاید دُنیا کے کسی بھی ملک میں یہ بات نہ ہو کہ ہر ملک اور ہر خطّے کی غذائیں اور وہاں کی مصنوعات اس افراط کے ساتھ وہاں ملتی ہوں جیسی مکہ مکرمہ میں ملتی ہیں۔ یہ تو کفارِ مکہ کے عذر کا ایک جواب ہوا کہ جس مالک نے تمہاری حالتِ کفر وشرک میں تم پر یہ انعامات برسائے کہ تمہاری زمین کو ہر خطرہ سے مأمون ومحفوظ کردیا اور باوجودیکہ اس زمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، ساری دُنیا کی پیداوار یہاں لاکر جمع کردی تو تمہارا یہ خطرہ کیسی بڑی جہالت ہے کہ خالقِ کائنات پر ایمان لانے کی صورت میں تم سے یہ نعمتیں سلب ہوجائیں گی۔ اس کے بعد دوسرا جواب اس عذر کا یہ ہے وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کی دوسری کافر قوموں کے حالات پر نظر ڈالو کہ اُن کے کفر وشرک کے وبال سے کس طرح اُن کی بستیاں تباہ ہوئیں اور مضبوط ومستحکم قلعے اور حفاظتی سامان سب خاک میں مِل گئے تو اصل خوف کی چیز کفر وشرک ہے جو تباہی وبربادی کا سبب ہوتا ہے۔ تم کیسے بے خبر بے وقوف ہو کہ کفر وشرک سے خطرہ محسوس نہیں کرتے ایمان سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔

تیسرا جواب اس آیت میں دیا گیا وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الآیۃ جس میں یہ بتلایا گیا کہ اگر بالفرض ایمان لانے کے نتیجہ میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچ ہی جائے تو وہ چندروزہ ہے اور جس طرح دُنیا کی عیش وعشرت مال ودولت سب چندروزہ متاع ہے کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہتی، اسی طرح یہاں کی تکلیف بھی چندروزہ ہے جلد ختم ہوجانے والی ہے اس لئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ فکر اُس تکلیف وراحت کی کرے جو پائیدار اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ہمیشہ رہنے والی دولت ونعمت کی خاطر چندروزہ تکلیف ومشقّت برداشت کرلینا ہی عقلمندی کی دلیل ہے۔ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ یعنی پچھلی قوموں کی جن بستیوں کو عذابِ الٰہی سے برباد کیا گیا تھا، اب تک بھی اُن میں آبادی نہیں ہوئی بجز قدرِ قلیل کے۔ اس قدرِ قلیل سے مراد اگر مساکن اور مقامات قلیلہ لئے جائیں جیسا کہ زجاج کا قول ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان تباہ شدہ

بستیوں میں کوئی مقام اور کوئی مکان پھر آباد نہیں ہوسکا بجز عدد قلیل کے کہ وہ آباد ہوئے مگر حضرت ابن عباس سے آیت کی یہ تفسیر منقول ہے کہ قدر قلیل سے مقامات اور مکانات قلیلہ کا استثناء نہیں بلکہ زمانِ سکونت کا استثناء مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر ان بستیوں میں کوئی رہتا بھی ہے تو بہت تھوڑی دیر کے لئے جیسے کوئی راہگیر مسافر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جائے جس کو بستیوں کی آبادی نہیں کہا جاسکتا۔

حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا، لفظ اُمّ کے مشہور معنے والدہ اور ماں کے ہیں اور ماں چونکہ تخلیقِ انسانی کی بنیاد ہے اس لئے لفظ اُمّ اصل اور اساس کے معنے میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اُمّھا کی ضمیر قُریٰ کی طرف راجع ہے امّھا سے مراد اُم القریٰ ہے یعنی بستیوں کی اصل اور مدار کار، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اُس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک اُس قوم کے بڑے شہروں میں اپنے کسی رسول کے ذریعہ پیغامِ حق نہ پہنچادے، جب دعوتِ حق پہنچ جائے اور لوگ اُس کو قبول نہ کریں اُس وقت ان بستیوں پر عذاب آتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے انبیاء اور رُسل عموماً بڑے شہروں میں مبعوث ہوتے ہیں وہ چھوٹے قصبات و دیہات میں نہیں آتے کیونکہ ایسے قصبات و دیہات عادۃً شہر کے تابع ہوتے ہیں اپنی معاشی ضروریات میں بھی اور تعلیمی ضروریات میں بھی۔ اور شہر میں جو بات پھیل جائے اس کا تذکرہ ملحقہ قصبات و دیہات میں خود بخود پھیل جاتا ہے اسی لئے جب کسی بڑے شہر میں رسول مبعوث ہوا اور اُس نے دعوتِ حق پیش کر دی تو یہ دعوت ان قصبات و دیہات میں بھی عادۃً پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح ان سب پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور انکار و تکذیب کیا جائے تو سب پر عذاب آتا ہے۔

احکام وقوانین میں قصبات و دیہات شہروں کے تابع ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے معاشی ضروریات میں چھوٹی بستیاں بڑے شہر کے تابع ہوتی ہیں وہیں سے اُن کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اسی طرح جب کسی حکم کا اعلان شہر میں کر دیا جائے تو اس حکم کی تعمیل اس کی ملحقہ بستیوں پر بھی لازم ہو جاتی ہے، نہ جاننے یا نہ سُننے کا عذر مسموع نہیں ہوتا۔

ہلالِ رمضان وعید کے مسئلے میں بھی فقہاء نے یہی فرمایا ہے کہ ایک شہر میں اگر شہادتِ شرعیہ کے ساتھ قاضی شہر کے حکم سے چاند کی رؤیت ثابت ہو جائے تو ملحقہ بستیوں کو بھی اُس پر عمل کرنا لازم ہے۔ لیکن دوسرے شہر والوں پر اُس وقت تک لازم نہیں ہوگا جب تک خود اس شہر کا قاضی شہادت کو تسلیم کر کے اس کا حکم نہ دے۔ (کذا فی الفتاوی الغیاثیه)

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۔ یعنی دنیا کا مال و متاع اور عیش و عشرت سب فانی ہے اور یہاں کے اعمال کا جو بدلہ آخرت میں ملنے والا ہے وہ یہاں کے مال و اسباب اور عیش و عشرت سے اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت بہتر ہے

کہ دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی راحت ولذّت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور پھر وہ ہمیشہ باقی رہنے والی بھی ہے بخلاف متاعِ دُنیا کے کہ وہ کتنا ہی بہتر ہو مگر بالآخر فانی اور زائل ہونے والا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند آدمی ایسے عیش کو جو کم درجہ بھی ہو اور چند روزہ بھی اُس عیش وآرام پر ترجیح نہیں دے سکتا جو راحت ولذّت میں اس سے زیادہ بھی ہو اور ہمیشہ رہنے والا بھی ہو۔

عقلمند کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ دُنیا کے دھندوں میں زیادہ منہمک نہ ہو بلکہ آخرت کی فکر میں لگے

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے مال وجائیداد کے متعلق یہ وصیت کر کے مر جائے کہ میرا مال اُس شخص کو دیدیا جائے جو سب سے زیادہ عقلمند ہو تو اس مال کے مصرف شرعی وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت میں مشغول ہوں، کیونکہ عقل کا تقاضا یہی ہے اور دُنیاداروں میں سے سب سے زیادہ عقل والا وہی ہے۔ یہی مسئلہ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب دُرِّ مختار باب الوصیت میں بھی مذکور ہے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

بھلا ایک شخص جس سے ہم نے وعدہ کیا ہے اچھا وعدہ سو وہ اُس کو پانے والا ہے برابر ہے اس کے جس کو ہم نے فائدہ دیا دُنیا کی زندگی کا

ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ

پھر وہ قیامت کے دن پکڑا ہوا آیا اور جس دن اُن کو پکارے گا تو کہے گا

اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ

کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے بولے جن پر ثابت ہوچکی

الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ

بات اے رَبّ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا اُن کو بہکایا جیسے ہم آپ بہکے

تَبَرَّأْنَآ اِلَيْكَ ۬ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ

ہم منکر ہوئے تیرے آگے وہ ہم کو نہ پوجتے تھے اور کہیں گے پکارو اپنے شریکوں کو

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ

پھر پکاریں گے اُن کو تو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو اور دیکھیں گے عذاب کسی طرح وہ

كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾

راہ پائے ہوئے ہوتے اور جس دن اُن کو پکارے گا تو فرمائے گا کیا جواب دیا تھا تم نے پیغام پہنچانے والوں کو

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ

پھر بند ہوجائیں گی اُن پر باتیں اُس دن سو وہ آپس میں بھی نہ پوچھیں گے سو جس نے کہ توبہ کی

وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور یقین لایا اور عمل کئے اچھے سو اُمید ہے کہ ہو چھوٹنے والوں میں

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا بتاؤ کہ جس شخص سے ہم نے اچھا سا وعدہ کر رکھا ہے، اور وہ اُس وعدے کو پا کر رہے گا، کیا وہ اُس جیسا ہوسکتا ہے جسے ہم نے دُنیوی زندگی کی پونجی کے کچھ مزے دے دیئے ہیں، پھر وہ اُن لوگوں میں شامل ہونے والا ہے جو قیامت کے دن دھر لئے جائیں گے؟ ﴿۶۱﴾ اور وہ دن (کبھی نہ بھولو) جب اللہ ان لوگوں کو پکارے گا، اور کہے گا: ''کہاں ہیں (خدائی میں) میرے وہ شریک جن کا تم دعویٰ کیا کرتے تھے؟'' ﴿۶۲﴾ جن کے خلاف (اللہ کی) بات پوری ہوچکی ہوگی، وہ کہیں گے: ''اے ہمارے پروردگار! یہ لوگ جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا، ہم نے ان کو اُسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے ان سے دست بردار ہوتے ہیں، یہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔'' ﴿۶۳﴾ اور (ان کافروں سے) کہا جائے گا کہ: ''پکارو اُن کو جنہیں تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا تھا!'' چنانچہ وہ اُن کو پکاریں گے، مگر وہ ان کو جواب نہیں

دیں گے، اور یہ عذاب آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ کاش یہ ایسے ہوتے کہ ہدایت کو قبول کر لیتے! ﴿۶۴﴾ اور وہ دن (بھی ہرگز نہ بھولو) جب اللہ ان کو پکارے گا، اور کہے گا: ''تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا؟'' ﴿۶۵﴾ اس پر ساری باتیں (جو یہ بنایا کرتے ہیں) اُس دن بے نشان ہو چکی ہوں گی، چنانچہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکیں گے۔ ﴿۶۶﴾ البتہ جن لوگوں نے توبہ کر لی، اور ایمان لے آئے، اور نیک عمل کئے، تو پوری اُمید ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہوں گے جنہیں فلاح حاصل ہوگی۔ ﴿۶۷﴾

خلاصۂ تفسیر

بھلا وہ شخص جس سے ہم نے ایک پسندیدہ وعدہ کر رکھا ہے پھر وہ شخص اس (وعدہ کی چیز) کو پانے والا ہے کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دُنیوی زندگی کا چندروزہ فائدہ دے رکھا ہے پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں ہوگا جو گرفتار کر کے لائے جائیں گے (مراد پہلے شخص سے مؤمن ہے جس سے جنت کا وعدہ ہے اور دوسرے سے مراد کافر جو مجرم ہو کر آئے گا اور چونکہ متاعِ دُنیا ہی ان لوگوں کی بھول کا سبب ہے اس لئے اس کی تصریح فرما دی، ورنہ ان دونوں کا برابر نہ ہونا تو دراصل اس وجہ سے ہے کہ وہ گرفتار کر کے حاضر کئے جائیں گے یہ جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے) اور (آگے اس تفاوت اور کیفیت احضار کی تفصیل ہے کہ وہ دن قابل یاد کرنے کے ہے) جس دن خدا تعالیٰ ان کافروں کو (بطور سزا کے) پکار کر کہے گا کہ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کو تم (ہمارا شریک) سمجھ رہے تھے (مراد اس سے شیاطین ہیں کہ اُنہی کی اطاعت مطلقہ سے شرک کرتے تھے اس لئے ان کو شرکاء کہا اس کو سُن کر شیاطین) جن پر (لوگوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے) خدا کا فرمودہ (یعنی استحقاقِ عذاب اس قول سے کہ [۱] لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ (ہود:۱۱۹)) ثابت ہو چکا ہوگا وہ (بطور عذر کے) بول اُٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار بیشک یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا (یہ جواب کی تمہید ہے اس حکایت کی تصریح اس لئے فرمائی گئی کہ جن کی شفاعت کی ان کو اُمید ہے وہ برعکس ان کے خلاف شہادت دیں گے اور آگے جواب ہے کہ ہم نے بہکایا تو ضرور لیکن) ہم نے اُن کو ویسا ہی (بلا جبر و اکراہ) بہکایا جیسا ہم خود (بلا جبر و اکراہ) بہکے تھے (یعنی جس طرح ہم خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے کسی نے ہمیں مجبور نہیں کیا اسی طرح ہم کو اُن پر جابرانہ تسلّط نہ تھا ہمارا کام صرف بہکانا تھا پھر اس کو انہوں نے اپنی رائے اور اختیار سے قبول کر لیا جیسا سورۂ ابراہیم میں ہے [۲] وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُكُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِيۡ ۚ الآیۃ (ابراہیم:۲۲))، مطلب یہ ہے کہ ہم بھی مجرم ہیں مگر یہ بھی بَری نہیں) اور

---

[۱] ترجمہ: میں جہنم کو جنات اور انسانوں سے دونوں سے بھر دوں گا۔

[۲] ترجمہ: اور میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا بجز اس کے کہ میں نے تم کو بلایا تھا سو تم نے میرا کہنا مان لیا۔

ہم آپ کی پیشی میں ان کے (تعلقات) سے دست برداری کرتے ہیں (اور) یہ لوگ (درحقیقت صرف) ہم کو (ہی) نہ پوجتے تھے (یعنی جب یہ اپنے اختیار سے بہکے ہیں تو یہ خودخواہش پرست ہوئے نہ کہ صرف شیطان پرست، مقصود اس سب حکایت سے یہ ہے کہ جن کے بھروسے بیٹھے ہیں وہ قیامت کے روز ان سے دست بردار ہوجائیں گے) اور (جب وہ شرکاء اس طرح ان سے بیزاری و بےرُخی کریں گے تو اس وقت ان مشرکین سے) کہا جائے گا کہ (اب) اپنے ان شرکاء کو بلاؤ چنانچہ وہ (فرطِ حیرت سے بالاضطرار) ان کو پکاریں گے سو وہ جواب بھی نہ دیں گے اور (اس وقت) یہ لوگ (اپنی آنکھوں) سے عذاب کو دیکھ لیں گے، اے کاش یہ لوگ دُنیا میں راہ راست پر ہوتے (تو یہ مصیبت نہ دیکھتے) اور جس دن ان کافروں سے پکار کر پوچھے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا، سو اس روز ان (کے ذہن) سے سارے مضامین گم ہوجائیں گے تو وہ (خود بھی نہ سمجھ سکیں گے اور) آپس میں پوچھ پاچھ بھی نہ کرسکیں گے البتہ جو شخص (کفروشرک سے دُنیا میں) توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کیا کرے تو ایسے لوگ اُمید ہے کہ (آخرت میں) فلاح پانے والوں سے ہوں گے (اور ان آفات سے محفوظ رہیں گے)۔

معارف و مسائل

محشر میں کفار و مشرکین سے پہلا سوال شرک کے متعلق ہوگا کہ جن شیاطین وغیرہ کو تم ہمارا شریک کہا کرتے تھے اور اُن کا کہا مانتے تھے آج وہ کہاں ہیں، کیا وہ تمہاری کچھ مدد کرسکتے ہیں؟ اس کے جواب میں ظاہر یہ تھا کہ مشرکین یہ جواب دیں کہ ہمارا کوئی قصور نہیں، ہم نے ازخود شرک نہیں کیا بلکہ ہمیں تو ان شیاطین نے بہکایا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ خود ان شیاطین کی زبانوں سے کہلوا دیں گے کہ ہم نے بہکایا ضرور تھا مگر مجبور تو ہم نے نہیں کیا۔ اس لئے مجرم ہم بھی ہیں مگر جُرم سے بَری یہ بھی نہیں کیونکہ جس طرح ہم نے اُن کو بہکایا تھا اس کے بالمقابل انبیاء علیہم السلام اور اُن کے نائبوں نے ان کو ہدایت بھی تو کی تھی اور دلائل کے ساتھ ان پر حق واضح کردیا تھا، اُنہوں نے اپنے اختیار سے انبیاء کی بات نہ مانی ہماری مان لی تو یہ کیسے بری ہوسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے سامنے حق کے دلائل واضحہ موجود ہوں اور وہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے بجائے گمراہ کرنے والوں کی بات مان کر گمراہی میں پڑ جائے تو یہ کوئی عذر معتبر نہیں۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ

اور تیرا رَبّ پیدا کرتا ہے جو چاہے اور پسند کرے جس کو چاہے اُن کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا، اللہ نرالا ہے

وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۶۸ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ

اور بہت اُوپر ہے اس چیز سے کہ شریک بتلاتے ہیں، اور تیرا رَبّ جانتا ہے جو چھپ رہا ہے ان کے سینوں میں

وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۶۹ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ز

اور جو کچھ کہ ظاہر میں کرتے ہیں، اور وہی اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اُسی کی تعریف ہے دُنیا اور آخرت میں

وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۷۰ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ

اور اسی کے ہاتھ حکم ہے اور اسی کے پاس پھیرے جاؤگے۔ تو کہہ دیکھو تو اگر اللہ رکھ دے تم پر رات

سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ

ہمیشہ کو قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے کہ لائے تم کو کہیں سے روشنی،

اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝۷۱ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا

پھر کیا تم سُنتے نہیں تو کہہ دیکھو تو اگر رکھ دے اللہ تم پر دن ہمیشہ کو

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ

قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے کہ لائے تم کو رات جس میں آرام کرو،

اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۷۲ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ

پھر کیا تم نہیں دیکھتے اور اپنی مہربانی سے بنادیئے تمہارے واسطے رات اور دن کہ اس میں چین بھی کرو

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۳

اور تلاش بھی کرو کچھ اس کا فضل اور تا کہ تم شکر کرو

آسان ترجمۂ قرآن

اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور (جو چاہتا ہے) پسند کرتا ہے۔ ان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ ان کے شرک سے پاک اور بہت بالا و برتر ہے۔ ﴿۶۸﴾ اور تمہارا پروردگار اُن باتوں کو بھی جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں، اور اُن باتوں کو بھی جو یہ کھلم کھلا کرتے ہیں۔ ﴿۶۹﴾ اللہ وہی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تعریف اُسی کی ہے، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور حکم اُسی کا چلتا ہے، اور اُسی کی طرف تم سب واپس بھیجے جاؤ گے۔ ﴿۷۰﴾ (اے پیغمبر! ان سے) کہو: ''ذرا یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تم پر رات کو ہمیشہ کے لئے قیامت کے دن تک مسلط رکھے تو اللہ کے سوا کونسا معبود ہے جو تمہارے پاس روشنی لے کر آئے؟ بھلا کیا تم سنتے نہیں ہو؟'' ﴿۷۱﴾ کہو: ''ذرا یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تم پر دن کو ہمیشہ کے لئے قیامت کے دن تک مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کونسا معبود ہے جو تمہیں وہ رات لا کر دیدے جس میں تم سکون حاصل کر سکو؟ بھلا کیا تمہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا؟ ﴿۷۲﴾ یہ تو اُسی نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات بھی بنائی ہے اور دن بھی، تاکہ تم اُس میں سکون حاصل کرو، اور اِس میں اللہ کا فضل تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ﴿۷۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کا رَبّ (بالانفراد صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف ہے چنانچہ وہ) جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (تو تکوینی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) اور جس حکم کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے (اور انبیاء کے ذریعہ نازل فرماتا ہے پس تشریعی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) ان لوگوں کو تجویز (احکام) کا کوئی حق (حاصل) نہیں (کہ جو حکم چاہیں تجویز کر لیں جیسے یہ مشرک اپنی طرف سے شرک کو جائز تجویز کر رہے ہیں اور اس خصوصی اختیار سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ اُن کے شرک سے پاک اور برتر ہے (کیونکہ جب تکویناً وتشریعاً خالق اور مختار ہونے میں وہ منفرد ہے تو عبادت کا بھی تنہا وہی مستحق ہے کیونکہ معبود ہونا صرف اس کا حق ہے جو تکوینی اور تشریعی دونوں اختیار رکھتا ہو) اور آپ کا رَبّ (علم ایسا کامل رکھتا ہے کہ وہ) سب چیزوں کی خبر رکھتا ہے جو اُن کے دلوں میں پوشیدہ رہتا ہے اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں (اور کسی کا ایسا علم بھی نہیں اس سے بھی انفراد ثابت ہوا) اور (آگے اس کی تصریح ہے کہ) اللہ وہی (ذات کمال الصّفات) ہے اس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں حمد (وثناء) کے لائق دُنیا و آخرت میں وہی ہے (کیونکہ اس کے تصرفات دونوں عالم میں ایسے ہیں جو اس کے جامع کمالات اور مستحقِ حمد ہونے پر شاہد ہیں) اور (اختیاراتِ سلطنت اس کے ایسے ہیں کہ) حکومت بھی (قیامت میں) اسی کی ہوگی اور (قوت و وسعتِ سلطنت اس کی ایسی ہے) کہ تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (یہ نہیں

کہ بچ جاؤ یا اور کہیں جا کر پناہ لے لو اور اس کے اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آئے (پس قدرت میں بھی وہی منفرد ہے) تو کیا تم (توحید کے ایسے صاف دلائل کو) سنتے نہیں (اور اسی اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان سے اس کے عکس کی نسبت بھی) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لے آئے جس میں تم آرام پاؤ کیا تم (اس شاہد قدرت کو) دیکھتے نہیں (قدرت میں اس کا منفرد ہونا بھی اس کو مقتضی ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو) اور (وہ منعم ایسا ہے کہ) اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تا کہ تم رات میں آرام کرو اور تا کہ دن میں اس کی روزی تلاش کرو اور تا کہ (ان دونوں نعمتوں پر) تم (اللہ کا) شکر کرو (تو انعام واحسان میں بھی وہی منفرد ہے یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو)۔

معارف ومسائل

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ اس آیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ یختار سے مراد اختیار احکام ہے کہ حق تعالیٰ جبکہ تخلیق کائنات میں منفرد ہے کوئی اس کا شریک نہیں تو اجرائے احکام میں بھی منفرد ہے جو چاہے اپنی مخلوق میں حکم نافذ فرمائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اختیار تکوینی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اسی طرح اختیار تشریعی میں بھی کوئی شریک نہیں اور اس کا ایک دوسرا مفہوم وہ ہے جو امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد کے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ اس اختیار سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہیں اپنے اکرام واعزاز کے لئے انتخاب فرما لیتے ہیں اور بقول بغوی یہ جواب ہے مشرکین مکہ کے اس قول کا کہ [1] لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝۳۱ (الزخرف) یعنی یہ قرآن اللہ کو نازل ہی کرنا تھا تو عرب کے دو بڑے شہروں مکہ اور طائف میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل فرماتا کہ اس کی قدر ومنزلت پہچانی جاتی، ایک یتیم مسکین پر نازل فرمانے میں کیا حکمت تھی؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ جس مالک نے تمام مخلوقات کو بغیر کسی شریک کی امداد کے پیدا فرمایا ہے یہ اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے کہ اپنے کسی خاص اعزاز کے لئے اپنی مخلوق میں سے کسی کو منتخب کرے اس میں وہ تمہاری تجویزوں کا کیوں پابند ہو کہ فلاں اس کا مستحق ہے فلاں نہیں۔ [2]

---

[1] یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔

[2] تفسیر البغوی تحت هذه الآية ج:٦ ص:٢١٨، وزاد المعاد مقدمة المؤلف ج:١ ص:٣٦

ایک چیز کو دوسری چیز پر یا ایک شخص کو دوسرے پر فضیلت کا معیارِ صحیح اختیارِ خداوندی ہے

حافظ ابنِ قیّم نے اس آیت سے ایک عظیم الشان ضابطہ اخذ کیا ہے کہ دُنیا میں جو ایک جگہ کو دوسری جگہ پر یا ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دی جاتی ہے یہ اُس چیز کے کسب وعمل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بلا واسطہ خالقِ کائنات کے انتخاب واختیار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اُس نے سات آسمان پیدا کئے اُن میں سے سماءِ عُلیا کو دوسروں پر فضیلت دیدی حالانکہ مادہ ساتوں آسمانوں کا ایک ہی تھا، پھر اُس نے جنت الفردوس کو دوسری سب جنتوں پر اور جبرئیل ومیکائیل واسرافیل وغیرہ خاص فرشتوں کو دوسرے فرشتوں پر، اور انبیاء علیہم السلام کو دوسرے سارے بنی آدم پر اور اُن میں سے اولوالعزم رسولوں پر، پھر اولادِ اسماعیل علیہ السلام کو دوسری ساری دُنیا کے لوگوں پر پھر قریش کو اُن سب پر اور بنی ہاشم کو سب قریش پر اور سیّد ولدِ آدم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب بنی ہاشم پر پھر اسی طرح صحابۂ کرام اور دوسرے اسلافِ اُمّت کو دوسروں پر فضیلت دینا یہ سب حق تعالیٰ جل شانہٗ کے انتخاب واختیار کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح زمین کے بہت سے مقامات کو دوسرے مقامات پر اور بہت دنوں اور راتوں کو دوسرے دنوں اور راتوں پر فضیلت دینا یہ سب اُسی اختیار اور انتخابِ حق جل شانہ کا اثر ہے۔ غرض افضلیت ومفضولیت کا اصل معیار تمام کائنات میں یہی انتخاب واختیار ہے البتہ افضلیت کا ایک دوسرا سبب انسانی اعمال وافعال بھی ہوتے ہیں اور جن مقامات میں نیک اعمال کئے جائیں وہ مقامات بھی ان اعمال صالحہ یا صالحین عباد کی سکونت سے متبرک ہوجاتے ہیں۔ یہ فضیلت کسب واختیار اور عمل صالح سے حاصل ہوسکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا میں مدارِ فضیلت دو چیزیں ہیں ایک غیر اختیاری ہے جو صرف حق تعالیٰ کا انتخاب ہے دوسرا اختیاری جو اعمال صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ سے حاصل ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیّم نے اس موضوع پر بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور آخر میں صحابہ کرام میں سے خلفاء راشدین کو تمام دوسرے صحابہ پر اور خلفاء راشدین میں صدیقِ اکبر ان کے بعد عمر بن خطاب ان کے بعد عثمانِ غنی ان کے بعد علیؓ مرتضٰی رضی اللہ عنہم کی ترتیب کو ان دونوں معیاروں سے ثابت کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک مستقل رسالہ فارسی زبان میں اس موضوع پر ہے جس کا اُردو ترجمہ احقر نے بنام بعض التفصیل لمسئلۃ التفضیل شائع کردیا ہے اور احکام القرآن سورۂ قصص میں بھی اس کو بزبان عربی مفصّل لکھ دیا ہے۔ اہلِ علم کے ذوق کی چیز ہے وہاں مطالعہ فرمائیں۔

اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ الَّیۡلَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۷۱﴾ الیٰ قولہ بِلَیۡلٍ تَسۡکُنُوۡنَ فِیۡہِ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ اس آیت میں حق تعالیٰ نے رات کے ساتھ تو اُس کا ایک فائدہ ذکر فرمایا، بِلَیۡلٍ تَسۡکُنُوۡنَ فِیۡہِ ؕ یعنی رات میں انسان کو سکون ملتا ہے اس کے بالمقابل دن کے ذکر میں بِضِیَآءٍ کے ساتھ کوئی فائدہ ذکر نہیں فرمایا۔ سبب ظاہر ہے کہ دن کی روشنی اپنی ذات میں افضل ہے اور ظلمت سے روشنی کا بہتر ہونا معلوم و معروف ہے۔ روشنی کے بیشمار فوائد اتنے معروف ہیں کہ اُن کے بیان کی ضرورت نہیں، بخلاف رات کے کہ وہ ظلمت اور اندھیری ہے جو اپنی ذات میں کوئی فضیلت نہیں رکھتی بلکہ اس کی فضیلت لوگوں کے سکون و آرام کے سبب سے ہے اس لئے اس کو بیان فرمادیا۔

اور اسی لئے دن کے معاملہ کا ذکر کر کے آخر میں فرمایا اَفَلَا تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۷۱﴾ اور رات کا معاملہ ذکر کرے فرمایا اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ اس میں یہ اشارہ ہوسکتا ہے کہ دن کے فضائل و برکات اور اس کے فوائد و ثمرات بیشمار ہیں جو احاطۂ بصر میں نہیں آسکتے البتہ سُنے جاسکتے ہیں اس لئے اَفَلَا تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۷۱﴾ فرمایا۔ کیونکہ انسانی علم و ادراک کا بڑا ذخیرہ کانوں ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، آنکھوں سے دیکھی ہوئی اشیاء ہمیشہ کانوں سے سُنی ہوئی اشیاء سے بہت کم ہوئی ہیں اور رات کے فوائد بہ نسبت دن کے فوائد کے کم ہیں وہ دیکھے بھی جاسکتے ہیں اس لئے یہاں اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ کا کلمہ اختیار فرمایا۔ (مظہری)[1]

وَیَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ فَیَقُوۡلُ اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۷۴﴾

اور جس دن اُن کو پکارے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

وَنَزَعۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا فَقُلۡنَا ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ فَعَلِمُوۡۤا اَنَّ الۡحَقَّ

اور جُدا کر دیں گے ہم ہر فرقے میں سے ایک احوال بتلانے والا، پھر کہیں گے لاؤ اپنی سند تب جان لیں گے کہ سچ بات ہے

لِلّٰہِ وَضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۷۵﴾ ع ١٥ ١٠

اللہ کی اور کھوئی جائیں گی اُن سے جو باتیں وہ جوڑتے تھے

آسان ترجمۂ قرآن

اور وہ دن (نہ بھولو) جب وہ ان (مشرکوں) کو پکارے گا، اور کہے گا کہ: ''کہاں ہیں (خدائی میں) میرے وہ

[1] تفسیر المظہری ج:٧ ص:١٧٨

شریک جن کا تم دعویٰ کیا کرتے تھے؟'' ﴿۷۴﴾ اور ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہی دینے والا نکال لائیں گے، پھر کہیں گے کہ: ''لاؤ اپنی کوئی دلیل!'' اُس وقت اُن کو پتہ چل جائے گا کہ سچی بات اللہ ہی کی تھی، اور وہ ساری باتیں جو انہوں نے گھڑ رکھی تھیں، سب گم ہو کر رہ جائیں گی۔ ﴿۷۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جس دن اللہ تعالیٰ اُن کو پکار کر فرمائے گا (تاکہ سب لوگ اُن کی رُسوائی سُن لیں) کہ جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے وہ کہاں گئے اور (اگرچہ حجت تمام کرنے کے لئے خود اس کا اقرار کافی تھا مگر مزید تاکید کے لئے ان پر شہادت بھی قائم کر دی جائے گی اس طرح کہ) ہم ہر اُمت میں سے ایک ایک گواہ (بھی) نکال کر لائیں گے (مراد اس سے انبیاء ہیں جو اُن کے کفر کی گواہی دیں گے) پھر ہم (ان مشرکین سے) کہیں گے کہ (اب) اپنی کوئی دلیل (شرک کے دعوے کی صحت پر) پیش کرو سو (اُس وقت) اُن کو (بعین الیقین) معلوم ہو جائے گا کہ سچی بات خدا کی تھی (جو انبیاء کے ذریعہ بتلائی گئی تھی اور شرک کا دعویٰ جھوٹا تھا) اور (دُنیا میں) جو کچھ باتیں گھڑا کرتے تھے (آج) کسی کا پتہ نہ رہے گا (کیونکہ انکشافِ حق کے لئے باطل کا غائب ہو جانا لازم ہے)۔

فائدہ

اس سے پہلی آیت میں جو سوال مَاذَآ اَجَبْتُمُ میں کیا گیا اس میں کفار سے انبیاء کو جواب دینے کے متعلق باز پرس تھی اور یہاں خود انبیاء علیہم السلام سے شہادت دلوانا مقصود ہے اس لئے سوال میں کوئی تکرار نہیں۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ

قارون جو تھا سو موسیٰ کی قوم سے پھر شرارت کرنے لگا ان پر اور ہم نے دیئے تھے اس کو خزانے

مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ

اتنے کہ اس کی کنجیاں اُٹھانے سے تھک جاتے کئی مرد زور آور جب کہا اس کو اس کی قوم نے اِترا مت

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ

اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے اور جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اُس سے کمالے پچھلا گھر

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ

اور نہ بھول اپنا حصہ دُنیا سے اور بھلائی کر جیسے اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور مت چاہ

الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٧٧﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ

خرابی ڈالنی ملک میں اللہ کو بھاتے نہیں خرابی ڈالنے والے بولا یہ مال تو مجھ کو ملا ہے

عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ

ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے کیا اُس نے یہ نہ جانا کہ اللہ غارت کر چکا ہے اس سے پہلے کتنی جماعتیں

مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٧٨﴾

جو اس سے زیادہ رکھتی تھیں زور اور زیادہ رکھتی تھیں مال کی جمع، اور پوچھے نہ جائیں گنہگاروں سے اُن کے گناہ

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

پھر نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنے ٹھاٹھ سے، کہنے لگے جو لوگ طالب تھے دُنیا کی زندگی کے

يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿٧٩﴾ وَقَالَ

اے کاش ہم کو ملے جیسا کچھ ملا ہے قارون کو بیشک اس کی بڑی قسمت ہے اور بولے

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ج

جن کو ملی تھی سمجھ اے خرابی تمہاری اللہ کا دیا ثواب بہتر ہے اُن کے واسطے جو یقین لائے اور کام کیا بھلا

وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ قف فَمَا كَانَ

اور یہ بات انہی کے دل میں پڑتی ہے جو سہنے والے ہیں، پھر دھنسا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں پھر نہ ہوئی

لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ق وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾

اس کی کوئی جماعت جو مدد کرتی اس کی اللہ کے سوائے اور نہ وہ خود مدد لا سکا

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ

اور فجر کو لگے کہنے جو کل شام آرزو کرتے تھے اُس کا سا درجہ ارے خرابی یہ تو اللہ کھول دیتا ہے

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ج لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا

روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے اگر نہ احسان کرتا ہم پر اللہ

ع ۸ / ۱۱ لَخَسَفَ بِنَا ط وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

تو ہم کو بھی دھنسا دیتا، اے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر

آسان ترجمۂ قرآن

قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر اُس نے اُنہی پر زیادتی کی۔ اور ہم نے اُسے اتنے خزانے دیئے تھے کہ اُس کی چابیاں طاقت ور لوگوں کی ایک جماعت سے بھی مشکل سے اُٹھتی تھیں۔ ایک وقت تھا جب اُس کی قوم نے اُس سے کہا کہ: ''اِتراؤ نہیں، اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا، ﴿۷۶﴾ اور اللہ نے تمہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اُس کے ذریعے آخرت والا گھر بنانے کی کوشش کرو، اور دُنیا میں سے بھی اپنے حصے کو نظر انداز نہ کرو، اور جس طرح اللہ نے تم پر اِحسان کیا ہے، تم بھی (دوسروں پر) احسان کرو، اور زمین میں فساد مچانے کی کوشش نہ کرو۔ یقین جانو اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' ﴿۷۷﴾ کہنے لگا: ''یہ سب کچھ تو مجھے خود اپنے علم کی وجہ سے ملا ہے۔'' بھلا کیا اُسے اتنا بھی علم نہیں تھا کہ اللہ نے اُس سے پہلی نسلوں کے ایسے ایسے لوگوں کو ہلاک کر ڈالا تھا جو طاقت میں بھی اُس سے زیادہ مضبوط تھے، اور جن کی جمعیت بھی

زیادہ تھی۔اور مجرموں سے اُن کے گناہوں کے بارے میں پوچھا بھی نہیں جاتا۔ (۷۸) پھر (ایک دن) وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی آن بان کے ساتھ نکلا۔ جو لوگ دُنیوی زندگی کے طلب گار تھے، وہ کہنے لگے: ''اے کاش! ہمارے پاس بھی وہ چیزیں ہوتیں جو قارون کو عطا کی گئی ہیں۔ یقیناً وہ بڑے نصیبوں والا ہے۔'' (۷۹) اور جن لوگوں کو (اللہ کی طرف سے) علم عطا ہوا تھا، اُنہوں نے کہا: ''تم پر افسوس ہے (کہ تم ایسا کہہ رہے ہو)۔ اللہ کا دیا ہوا ثواب اُس شخص کے لئے کہیں زیادہ بہتر ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اور وہ اُنہی کو ملتا ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں۔'' (۸۰) پھر ہوا یہ کہ ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر اُسے کوئی ایسا گروہ میسر نہ آیا جو اللہ کے مقابلے میں اُس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود اپنا بچاؤ کر سکا۔ (۸۱) اور کل جو لوگ اُس جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے: ''اوہو! پتہ چل گیا کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں وسعت کر دیتا ہے، اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی کر دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ اوہو! پتہ چل گیا کہ کافر لوگ فلاح نہیں پاتے۔'' (۸۲)

خلاصۂ تفسیر

قارون (کا حال دیکھ لو کہ کفر و خلاف کرنے سے اس کو کیا ضرر پہنچا اور اس کا مال و متاع کچھ کام نہ آیا بلکہ اس کے ساتھ اس کا مال و متاع بھی برباد ہو گیا، مختصر اس کا قصّہ یہ ہے کہ وہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی برادری میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے، بلکہ ان کا چچازاد بھائی) تھا (کذا فی الدر)[1] سو وہ کثرتِ مال کی وجہ سے) ان لوگوں کے مقابلہ میں تکبر کرنے لگا اور (مال کی اس کے پاس یہ کثرت تھی کہ) ہم نے اس کو اس قدر خزانے دیئے تھے کہ اُن کی کنجیاں کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتی تھیں (یعنی اُن سے بہ تکلف اُٹھتی تھیں تو جب کنجیاں اس کثرت سے تھیں تو ظاہر ہے کہ خزانے بہت ہی ہوں گے اور یہ تکبر اس وقت کیا تھا) جبکہ اس کو اس کی برادری نے (سمجھانے کے طور پر) کہا کہ تو (اس مال و حشمت پر) اترا مت واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور (یہ بھی کہا کہ) تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دُنیا سے اپنا حصہ (آخرت میں لے جانا) فراموش مت کر اور (مطلب اِبْتَغِ، وَلَا تَنْسَ کا یہ ہے کہ) جس طرح خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر اور (خدا کی نافرمانی اور حقوق واجبہ ضائع کر کے) دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو (یعنی گناہ کرنے سے دُنیا میں فساد ہوتا ہے کقولہ تعالیٰ[2] ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم: ۴۱) بالخصوص متعدی گناہ) بیشک اللہ تعالیٰ اہلِ فساد کو پسند نہیں کرتا (یہ

---

[1] الدر المنثور ج:۸ ص:۱۳

[2] ترجمہ: خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں۔

سب نصیحت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی۔ غالباً یہ مضامین موسیٰ علیہ السلام نے اوّل فرمائے ہوں گے پھر مکرر دوسرے مسلمانوں نے ان کا اعادہ کیا ہوگا) قارون (یہ سُن کر) کہنے لگا کہ مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے (یعنی میں وجوہ وتدابیر معاش کی خوب جانتا ہوں اس سے میں نے یہ سب جمع کیا ہے پھر میرا تفاخر بیجا نہیں اور نہ اس کو غیبی احسان کہا جاسکتا ہے اور نہ کسی کا اس میں کچھ استحقاق ہوسکتا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ اس کے اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ) کیا اُس (قارون) نے (اخبار متواترہ سے) یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اُمتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کرچکا ہے جو قوت (مالی) میں (بھی) اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے اور مجمع (بھی اس سے) اُن کا زیادہ تھا اور (صرف یہی نہیں کہ بس ہلاک ہوکر چھوٹ گئے ہوں بلکہ بوجہ اُن کے ارتکابِ جرمِ کفر اور اللہ تعالیٰ کو یہ جرم معلوم ہونے کے قیامت میں بھی معذب ہوں گے جیسا وہاں کا قاعدہ ہے کہ) اہلِ جُرم سے اُن کے گناہوں کا (تحقیق کرنے کی غرض سے) سوال نہ کرنا پڑے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ سب معلوم ہے گو زجر وتنبیہ کے لئے سوال ہو لقوله تعالیٰ [1] لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ (الحجر)، مطلب یہ کہ اگر قارون اس مضمون پر نظر کرتا تو ایسی جہالت کی بات نہ کہتا کیونکہ پچھلی قوموں کے حالاتِ عذاب سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور مؤاخذۂ اخرویہ سے اُسی کا احکم الحاکمین ہونا ظاہر ہے، پھر کسی کو کیا حق ہے کہ اللہ کی نعمت کو اپنی ہنرمندی کا نتیجہ بتلائے اور حقوق واجبہ سے انکار کرے) پھر (ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ) وہ اپنی آرائش (اور شان) سے اپنی برادری کے سامنے نکلا جو لوگ (اُس کی برادری میں) دُنیا کے طالب تھے (گو مؤمن ہوں جیسا اُن کے اگلے قول وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الخ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے وہ لوگ) کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز وسامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحبِ نصیب ہے (یہ تمنا حرص کی تھی، اس سے کافر ہونا لازم نہیں آتا، جیسا اب بھی بعضے آدمی باوجود مسلمان ہونے کے شب وروز دوسری قوموں کی ترقیاں دیکھ کر للچاتے ہیں اور اس کی فکر میں لگے رہتے ہیں) اور جن لوگوں کو (دین کی) فہم عطا ہوئی تھی وہ (ان حریصوں سے) کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو (تم اس دُنیا پر کیا جاتے ہو) اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب (اس دُنیوی کرّوفر سے) ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور (پھر ایمان وعمل صالح والوں میں سے بھی) وہ (ثواب کامل طور پر) ان ہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیا کی حرص وطمع سے) صبر کرنے والے ہیں (پس تم لوگ ایمان کی تکمیل اور عمل صالح کی تحصیل میں لگو اور حد شرعی کے اندر دنیا حاصل کرکے زائد کی حرص وطمع سے صبر کرو) پھر ہم نے اس قارون کو اور اس کے محل سرائے کو (اس کی شرارت بڑھ جانے سے) زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ (کے عذاب) سے بچالیتی (گو وہ بڑی جماعت والا تھا) اور نہ وہ خود ہی اپنے کو بچا سکا اور کل (یعنی پچھلے قریب زمانہ میں) جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کررہے تھے وہ (آج اس کے خسف کو دیکھ کر) کہنے لگے بس جی

[1] ترجمہ: ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور باز پرس کریں گے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ (رزق کی فراخی اور تنگی کا مدار خوش نصیبی یا بد نصیبی پر نہیں ہے بلکہ یہ تو محض حکمت تکوینیہ سے اللہ ہی کے قبضہ میں ہے بس) اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہے اور (جس کو چاہے) تنگی سے دینے لگتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ اس کو خوش نصیب سمجھتے تھے ہماری توبہ ہے اور واقعی) اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا (کیونکہ حرص اور حبِّ دُنیا کی معصیت کے ہم بھی مرتکب ہوئے تھے) بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (گو چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر خسران ہے، بس فلاح معتد بہ اہلِ ایمان ہی کے ساتھ مخصوص ہے)۔

معارف ومسائل

سورۂ قصص کے شروع سے یہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ قصہ مذکور تھا جو اُن کو فرعون اور آلِ فرعون کے ساتھ پیش آیا، یہاں ان کا دوسرا قصّہ بیان ہوتا ہے جو اپنی برادری کے آدمی قارون کے ساتھ پیش آیا اور مناسبت اس کی سابقہ آیتوں سے یہ ہے کہ پچھلی آیتوں میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ دُنیا کی دولت و مال جو تمہیں دیا جاتا ہے وہ چند روزہ متاع ہے اس کی محبت میں لگ جانا دانشمندی نہیں۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، [1] الآیۃ (القصص:۶۰)، قارون کے قصّہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اُس نے مال و دولت حاصل ہونے کے بعد اس نصیحت کو بھلا دیا اس کے نشہ میں مست ہو کر اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی کی اور مال پر جو حقوق واجبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہیں ان کی ادائیگی سے منکر بھی ہوگیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ اپنے خزانوں سمیت زمین کے اندر دھنسا دیا گیا۔

قارون ایک عجمی لفظ غالباً عبرانی زبان کا ہے اس کے متعلق اتنی بات تو خود الفاظِ قرآن سے ثابت ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برادری بنی اسرائیل ہی میں سے تھا۔ باقی یہ کہ اس کا رشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا اس میں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی قرار دیا ہے اور بھی کچھ اقوال ہیں۔ (قرطبی و روح) [2]

رُوح المعانی میں محمد بن اسحاق کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قارون تورات کا حافظ تھا اور دوسرے بنی اسرائیل سے زیادہ اس کو تورات یاد تھی مگر سامری کی طرح منافق ثابت ہوا اور اس کی منافقت کا سبب دُنیا کے جاہ و عزّت کی بیجا حرص تھی۔ پورے بنی اسرائیل کی سیادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی اور اُن کے بھائی ہارون اُن کے وزیر اور شریکِ نبوّت تھے اس کو یہ حسد ہوا کہ میں بھی تو ان کی برادری کا بھائی اور قریبی رشتہ دار ہوں میرا اس سیادت و قیادت میں کوئی حصّہ

[1] ترجمہ: اور جو کچھ تم دیا دلایا گیا ہے وہ محض دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے۔

[2] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۳۱، روح المعانی ج:۱۵ ص:۱۸۶

کیوں نہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے اس کی شکایت کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے مجھے اس میں کچھ دخل نہیں مگر وہ اس پر مطمئن نہ ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حسد رکھنے لگا۔ [۱]

فَبَغٰى عَلَيْهِمْ لفظ بَغی چند معانی کے لئے آتا ہے۔ مشہور معنے ظلم کے ہیں، یہاں یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ اس نے اپنے مال و دولت کے نشہ میں دوسروں پر ظلم کرنا شروع کیا، یحییٰ بن سلام اور سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ قارون سرمایہ دار آدمی تھا، فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کی نگرانی پر مامور تھا، اس امارت کے عہدے میں اُس نے بنی اسرائیل کو ستایا۔ (قرطبی) [۲]

اور دوسرے معنے تکبر کے بھی آتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اس جگہ یہی معنی قرار دیئے ہیں کہ اس نے مال و دولت کے نشہ میں بنی اسرائیل پر تکبّر شروع کیا اور اُن کو حقیر و ذلیل قرار دیا۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ، کنوز، کنز کی جمع ہے، مدفون خزانہ کو کہا جاتا ہے اور اصطلاحِ شرع میں کنز وہ خزانہ ہے جس کی زکوٰۃ نہ دی گئی ہو۔ حضرت عطاء سے روایت ہے کہ اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک عظیم الشان مدفون خزانہ مل گیا تھا۔ (روح) [۳]

لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ، نَآءَ کا لفظ بوجھ سے جھکا دینے کے معنی میں آتا ہے اور عصبہ کے معنی جماعت کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اس کے خزانے اتنے زیادہ تھے کہ اُن کی کنجیاں اتنی تعداد میں تھیں کہ ایک قوی جماعت بھی ان کو اُٹھائے تو بوجھ سے جُھک جائے۔ اور ظاہر ہے کہ قفل کی کنجی بہت ہلکے وزن کی رکھی جاتی ہے جس کا اُٹھانا اور پاس رکھنا مشکل نہ ہو مگر کثرتِ عدد کے سبب یہ اتنی ہوگئی تھیں کہ ان کا وزن ایک قوی جماعت بھی آسانی سے نہ اُٹھا سکے۔ (روح) [۴]

لَا تَفْرَحْ، فرح کے لفظی معنے اُس خوشی کے ہیں جو انسان کو کسی لذتِ عاجلہ کے سبب حاصل ہو۔ قرآنِ کریم نے بہت سی آیات میں فَرَح کو مذموم قرار دیا جیسا کہ ایک اسی آیت میں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ اور ایک آیت میں وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ [۵] (الحدید:۲۳) اور ایک آیت میں ہے وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا [۶] (الرعد:۲۶) اور بعض آیات میں فرح کی اجازت بلکہ ایک طرح کا امر بھی وارد ہوا ہے جیسے وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ [۷] (الروم) میں اور آیت فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا [۸] (یونس:۵۸) میں ارشاد ہوا ہے۔ ان سب آیات کے مجموعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذموم اور ممنوع وہ فَرَح ہے جو اترانے اور تکبّر کرنے کی حد تک پہنچ جائے اور وہ جبھی ہو سکتا ہے کہ اس لذت و خوشی کو وہ اپنا ذاتی کمال اور ذاتی

---

[۱] روح المعانی ج:۱۵ ص:۱۸۶
[۲] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۳۱۰
[۳] روح المعانی ج:۱۵ ص:۱۸۶
[۴] روح المعانی ج:۱۵ ص:۱۸۷
[۵] ترجمہ: اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔
[۶] ترجمہ: اور یہ لوگ دنیوی زندگانی پر اتراتے ہیں۔
[۷] ترجمہ: اور اس روز مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے۔
[۸] ترجمہ: لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے۔

حق سمجھے اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان نہ سمجھے۔ اور جو خوشی اس حد تک نہ پہنچے وہ ممنوع نہیں بلکہ ایک حیثیت سے مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی شکر گزاری ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا، یعنی مسلمانوں نے قارون کو یہ نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے جو مال ودولت تجھے عطا فرمایا ہے اس کے ذریعہ آخرت کا سامان فراہم کر، اور دُنیا میں جو تیرا حصّہ ہے اُس کو نہ بھول۔

دُنیا کا حصہ کیا ہے اس کی تفسیر اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد دُنیا کی عمر اور اُس میں کئے ہوئے وہ اعمال ہیں جو اُس کو آخرت میں کام آئیں جس میں صدقہ خیرات بھی داخل ہے اور دوسرے اعمالِ صالحہ بھی۔ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور مفسّرین سے یہی معنے منقول ہیں (کما فی القرطبی)[1] اس صورت میں دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید وتائید ہوگی۔ پہلے جملے میں جو کہا گیا کہ جو کچھ تجھے اللہ نے دیا ہے یعنی مال ودولت اور عمر وقوت وصحت وغیرہ اُن سب سے وہ کام لے جو دارآخرت میں تیرے کام آئے اور درحقیقت دُنیا کا یہی حصہ تیرا ہے جو آخرت کا سامان بن جائے باقی دُنیا تو دوسرے وارثوں کا حصہ ہے۔ اور بعض مفسّرین نے فرمایا کہ دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اُس سے اپنی آخرت کا سامان بھی کرو مگر اپنی ضروریاتِ دُنیا کو بھی نہ بھلاؤ کہ سب صدقہ خیرات کرکے کنگال بن جاؤ بلکہ بقدر ضرورت اپنے لئے بھی رکھو۔ اس تفسیر پر نصیبِ دُنیا سے مراد اُس کی معاشی ضروریات ہوں گی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي، بعض مفسّرین نے فرمایا کہ یہاں علم سے مراد علم تورات ہے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ قارون تورات کا حافظ اور عالم تھا اور اُن ستّر اصحاب میں سے تھا جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میقات کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ مگر اس کو اپنے اس علم پر ناز وغرور پیدا ہوگیا اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھ بیٹھا اور اس کے اس کلام کا مطلب یہی تھا کہ مجھے جو کچھ مال ودولت ملا ہے میرے اپنے ذاتی کمالِ علمی کے سبب ملا ہے اس لئے میں اس کا خود حق دار ہوں اس میں مجھ پر کسی کا احسان نہیں۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد معاشی تدبیروں کا علم ہے مثلاً تجارت صنعت وغیرہ کا جن سے مال حاصل ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو مال مجھے حاصل ہوا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے احسان کا کیا دخل ہے یہ تو میں نے اپنی ہوشیاری اور کارگزاری کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور جاہل نے یہ نہ سمجھا کہ یہ ہوشیاری اور کارگزاری اور صنعت یا تجارت کا تجربہ اور علم بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا تھا اس کا کوئی ذاتی کمال نہ تھا۔

أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ، قارون کے اس قول کا کہ میرا مال ودولت میرے ذاتی علم وہنر سے حاصل

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۳۱۴

کردہ ہے اصل جواب تو وہ تھا جو اُوپر لکھا گیا ہے کہ اگر یہی تسلیم کرلیا جائے کہ اس کا سبب کوئی خاص علم و ہنر تھا تو بھی اللہ تعالیٰ کے احسان سے کیسے بَری ہوا کیونکہ یہ علم و ہنر اور قوتِ کسب بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے مگر اس کا جواب بوجہ غایت ظہور کے نظر انداز فرما کر قرآن نے یہ بتلایا کہ یہ مال و دولت فرض کرو کہ اس کو اپنے ہی ذاتی کمال سے حاصل ہوا ہو مگر خود اس مال و دولت کی کوئی حقیقت نہیں، مال کی فراوانی کسی انسان کے لئے نہ کوئی کمال اور فضیلت ہے اور نہ وہ ہر حال میں اس کے کام آتا ہے۔ اس کے ثبوت میں پچھلی اُمتوں کے بڑے سرمایہ داروں کی مثال پیش فرمائی کہ جب اُنہوں نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو اچانک پکڑ لیا مال و دولت اُن کے کچھ بھی کام نہ آیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ الآیۃ، اس آیت میں، اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ، یعنی علماء کا مقابلہ اَلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا سے کیا گیا ہے جس میں واضح اشارہ اس طرف ہے کہ متاعِ دُنیا کا ارادہ اور اس کو مقصود بنانا اہلِ علم کا کام نہیں اہلِ علم کی نظر ہمیشہ آخرت کے دائمی فائدہ پر رہتی ہے، متاعِ دُنیا کو بقدرِ ضرورت حاصل کرتے ہیں اور اُسی پر قناعت کرتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ

وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ ان لوگوں کو جو نہیں چاہتے اپنی بڑائی ملک میں

وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ

اور نہ بگاڑ ڈالنا اور عاقبت بھلی ہے ڈرنے والوں کی جو لے کر آیا بھلائی اس کو ملنا ہے اس سے بہتر

وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا

اور جو کوئی لے کر آیا بُرائی سو بُرائیاں کرنے والے اُن کو وہی سزا ملے گی

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

جو کچھ وہ کرتے تھے

آسان ترجمۂ قرآن

وہ آخرت والا گھر تو ہم اُن لوگوں کے لئے مخصوص کردیں گے جو زمین میں نہ تو بڑائی چاہتے ہیں، اور نہ فساد، اور آخری انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہوگا۔ (۸۳) جو شخص کوئی نیکی لے کر آئے گا تو اُس کو اُس سے بہتر چیز ملے گی، اور جو کوئی بدی لے کر آئے گا تو جنہوں نے برے کام کئے ہیں، اُن کو کسی اور چیز کی نہیں، اُن کے کئے ہوئے کاموں ہی کی سزا دی جائے گی۔ (۸۴)

خلاصۂ تفسیر

یہ عالَمِ آخرت (جس کے ثواب کا مقصود ہونا اُوپر (ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ الخ)[1] میں بیان ہوا ہے) ہم اُنہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دُنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا (یعنی نہ تکبّر کرتے ہیں جو باطنی گناہ ہے اور نہ کوئی ظاہری گناہ ایسا کرتے ہیں جس سے زمین میں فساد برپا ہو) اور صرف ان باطنی اور ظاہری بُرائیوں سے بچنا کافی نہیں بلکہ) نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے، (جو بُرائیوں سے اجتناب کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے بھی پابند ہوں اور کیفیت اعمال پر جزا و سزا کی یہ ہوگی کہ) جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا اُس (کے مقتضا) سے بہتر (بدلہ) ملے گا (کیونکہ نیک عمل کا اصل مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اُس کی حیثیت کے موافق عوض ملے مگر وہاں اُس سے زیادہ دیا جائے گا جس کا کم سے کم درجہ اس کی حیثیت سے دس گنا ہے) اور جو شخص بدی لے کر آئے گا سو ایسے لوگوں کو جو بدی کا کام کرتے ہیں اُتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے (یعنی اس کے مقتضیٰ سے زیادہ بدلہ سزا کا نہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا اس آیت میں دارِ آخرت کی نجات و فلاح کو صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے جو زمین میں علُو اور فساد کا ارادہ نہ کریں۔ علُو سے مراد تکبّر ہے یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا بنانے اور دوسروں کو حقیر کرنے کی فکر۔ اور فساد سے مراد لوگوں پر ظلم کرنا ہے (سفیان ثوری) اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر معصیت فساد فی الارض ہے کیونکہ گناہ کے وبال سے دُنیا کی برکت میں کمی آتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ تکبّر اور ظلم کا یا مطلق معصیت کا ارادہ کریں اُن کا آخرت میں حصہ نہیں۔

---

1 ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے۔

فائدہ

تکبّر جس کی حُرمت اور وبال اس آیت میں ذکر کیا گیا وہ وہی ہے کہ لوگوں پر تفاخر اور ان کی تحقیر مقصود ہو، ورنہ اپنے لئے اچھے لباس اچھی غذا اچھے مکان کا انتظام جب وہ دوسروں کے تفاخر کے لئے نہ ہو مذموم نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے۔[1]

معصیت کا پختہ عزم بھی معصیت ہے

اس آیت میں علو اور فساد کے ارادہ پر دار آخرت سے محروم ہونے کی وعید ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت کا پختہ ارادہ جو عزم مصمّم کے درجہ میں آجائے وہ بھی معصیت ہی ہے (کمافی الروح)[2] البتہ اگر پھر وہ خدا کے خوف سے اس ارادہ کو ترک کردے تو گناہ کی جگہ ثواب اُس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا ہے اور اگر کسی غیر اختیاری سبب سے اُس گناہ پر قدرت نہ ہوئی اور عمل نہ کیا مگر اپنی کوشش گناہ کے لئے پوری کی تو وہ بھی معصیت اور گناہ لکھا جائے گا (کما ذکرہ الغزالیؒ) آخر آیت میں فرمایا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ اس کا حاصل یہ ہے کہ آخرت کی نجات اور فلاح کے لئے دو چیزوں عُلو اور فساد سے اجتناب بھی لازم ہے اور تقویٰ یعنی اعمالِ صالحہ کی پابندی بھی، صرف ان دو چیزوں سے پرہیز کرلینا کافی نہیں بلکہ جو اعمال ازروئے شرع فرض و واجب ہیں اُن پر عمل کرنا بھی نجاتِ آخرت کی شرط ہے۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ

جس نے حکم بھیجا تجھ پر قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ، تو کہہ میرا رَبّ خوب جانتا ہے

مَنْ جَاۗءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا

کون لایا ہے راہ کی سُوجھ اور کون پڑا ہے صریح گمراہی میں اور تو تو توقع نہ رکھتا تھا

اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا

کہ اُتاری جائے تجھ پر کتاب مگر مہربانی سے تیرے رَبّ کی سو تو مت ہو مددگار

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب تحریم الکبر وبیانہ ج:۱ ص:۶۵

[2] روح المعانی (بالاختصار) ج:۱۵ ص:۲۱۶

لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ

کافروں کا اور نہ ہو کہ وہ تجھ کو روک دیں اللہ کے حکموں سے بعد اس کے کہ اُتر چکے تیری طرف اور بُلا

اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ

اپنے رب کی طرف اور مت ہو شریک والوں میں اور مت پکار اللہ کے سوائے دوسرا حاکم،

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

کسی کی بندگی نہیں اس کے سوائے ہر چیز فنا ہے مگر اس کا منہ اُسی کا حکم ہے اور اُسی کی طرف پھر جاؤ گے

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) جس ذات نے تم پر اس قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے، وہ تمہیں دوبارہ اُس جگہ پر لا کر رہے گا جو (تمہارے لئے) اُنسیت کی جگہ ہے۔ کہہ دو: ''میرا ربّ اُس سے بھی خوب واقف ہے جو ہدایت لے کر آیا ہے، اور اُس سے بھی جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔'' ﴿۸۵﴾ اور (اے پیغمبر!) تمہیں پہلے سے یہ اُمید نہیں تھی کہ تم پر یہ کتاب نازل کی جائے گی، لیکن یہ تمہارے ربّ کی طرف سے رحمت ہے، لہٰذا کافروں کے ہرگز مددگار نہ بننا۔ ﴿۸۶﴾ اور جب اللہ کی آیتیں تم پر نازل کر دی گئی ہیں، تو اس کے بعد یہ لوگ تمہیں ہرگز اُن (پر عمل کرنے) سے روکنے نہ پائیں۔ اور تم اپنے ربّ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہو، اور ہرگز ان مشرکین میں شامل نہ ہونا۔ ﴿۸۷﴾ اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز فنا ہونے والی ہے، سوائے اُس کی ذات کے۔ حکومت اُسی کی ہے، اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔ ﴿۸۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور آپ کے ان مخالفین نے جو آپ کو پریشان کر کے ترکِ وطن پر مجبور کیا ہے جس کی اضطراری مفارقت کا آپ کو صدمہ ہے تو آپ تسلّی رکھیں) جس خدا نے آپ پر قرآن (کے احکام پر عمل اور اس کی تبلیغ) کو فرض کیا ہے (جو مجموعاً

دلیل ہے آپ کی نبوّت کی) وہ آپ کو (آپ کے) اصلی وطن (یعنی مکہ) میں پھر پہنچادے گا (اور اُس وقت آپ آزاد اور غالب اور صاحبِ سلطنت ہوں گے، اور ایسی حالت میں اگر دوسری جگہ قیام کے لئے تجویز کی جاتی ہے بمصلحت و باختیار ہوتی ہے جس سے رنج نہیں ہوتا، اور باوجود آپ کے تحقق نبوّت کے جو یہ لوگ آپ کو غلطی پر اور اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں تو) آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ میرا رَبّ خوب جانتا ہے کہ کہ کون سچّا دین لے کر (منجانب اللہ) آیا ہے اور کون صریح گمراہی میں (مبتلا) ہے (یعنی میرے حق پر ہونے اور تمہارے باطل پر ہونے کے دلائل قطعیہ موجود ہیں مگر جب ان سے کام نہیں لیتے تو اخیر جواب یہی ہے کہ خیر، خدا کو معلوم ہے وہ بتلادے گا) اور (آپ کی یہ دولت نبوّت محض خداداد ہے حتّی کہ خود) آپ کو (نبی ہونے کے قبل) یہ توقع نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جائے گی مگر محض آپ کے رَبّ کی مہربانی سے اس کا نزول ہوا، سو آپ (ان لوگوں کی خرافات کی طرف توجہ نہ کیجئے اور جس طرح اب تک ان سے الگ تھلگ رہے آئندہ بھی اسی طرح) ان کافروں کی ذرا تائید نہ کیجئے، اور جب اللہ کے احکام آپ پر نازل ہو چکے تو ایسا نہ ہونے پائے (جیسا اب تک بھی نہیں ہونے پایا) کہ یہ لوگ آپ کو اُن احکام سے روک دیں اور آپ (بدستور) اپنے رَبّ (کے دین) کی طرف (لوگوں کو) بُلاتے رہیئے اور (جس طرح اب تک مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، اسی طرح آئندہ ہمیشہ) ان مشرکوں میں شامل نہ ہوجئے اور (جس طرح اب تک شرک سے معصوم ہیں اسی طرح آئندہ بھی) اللہ کے ساتھ کسی معبود کو نہ پکارنا (ان آیتوں میں کفار و مشرکین کو ان کی درخواستوں سے نا اُمید کرنا ہے اور رُوئے سخن اُن ہی کی طرف ہے کہ تم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین میں موافق ہونے کی درخواست کرتے ہو اس میں کامیابی کا کبھی احتمال نہیں، مگر عادت ہے کہ جس شخص پر زیادہ غصہ ہوتا ہے اُس سے بات نہیں کیا کرتے اپنے محبوب سے باتیں کر کے اُس شخص کو سُنایا کرتے ہیں۔ معالم میں حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ خطاب صرف ظاہر میں آپ کو ہے اور مقصود آپ نہیں۔ یہاں تک رسالت کے متعلق مضمون قصداً تھا، گو توحید کا بھی ضمناً آ گیا، آگے توحید کا مضمون قصداً ہے کہ) اُس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اس لئے کہ) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، بجز اس کی ذات کے پس اُس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہ ٹھہرا، یہ مضمون توحید کا ہوگیا، آگے معاد کا مضمون ہے کہ) اُسی کی حکومت ہے (جس کا ظہور کامل قیامت میں ہے) اور اُسی کے پاس تم سب کو جانا ہے (پس سب کو اُن کے کئے کی جزا دے گا۔ یہ معاد کا مضمون بھی ختم ہوگیا)۔

معارف و مسائل

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ آخر سورت میں یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلّی اور

اپنے فریضۂ رسالت و نبوّت پر پوری طرح قائم رہنے کی تاکید کے لئے ہیں، اور مناسبت اس کی سابقہ آیات سورت سے یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی قصّہ فرعون اور اس کی قوم کی دشمنی اور اُس سے خوف کا، پھر اپنے فضل سے ان کو قوم فرعون پر غالب کرنے کا ذکر فرمایا تو آخر سورت میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی حالات کا خلاصہ بیان فرمادیا کہ کفار مکہ نے آپ کو پریشان کیا، قتل کے منصوبے بنائے، مسلمانوں کی زندگی مکّہ میں اجیرن کردی مگر حق تعالیٰ نے اپنی عادتِ قدیمہ کے مطابق آپ کو سب پر فتح اور غلبہ نصیب فرمایا اور مکہ مکرمہ جہاں سے کفار نے آپ کو نکالا تھا وہ پھر مکمل طور پر آپ کے قبضہ میں آیا۔ اَلَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ، جس ذات پاک نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے یعنی اُس کی تلاوت اور تبلیغ اور اس پر عمل آپ پر فرض فرمایا ہے وہی ذات آپ کو پھر معاد پر لوٹائے گی۔ معاد سے مراد مکہ مکرمہ ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے معاد کی یہ تفسیر منقول ہے۔ [۱] مطلب یہ ہے کہ اگرچہ چند روز کے لئے آپ کو اپنا وطنِ عزیز خصوصاً حرم اور بیت اللہ چھوڑنا پڑا مگر قرآن کا نازل کرنے والا اور اُس پر عمل کو فرض کرنے والا خدا تعالیٰ آخر کار آپ کو پھر مکہ میں لَوٹا کر لائے گا۔ ائمۂ تفسیر میں سے مقاتل کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور سے رات کے وقت نکلے اور مکہ سے مدینہ جانے والے معروف راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں سے سفر کیا کیونکہ دشمن تعاقب میں تھے۔ جب مقام جحفہ پر پہنچے جو مدینہ طیبہ کے راستہ کی مشہور منزل رابغ کے قریب ہے اور وہاں سے وہ مکہ سے مدینہ کا معروف راستہ مل جاتا ہے اس وقت مکّہ مکرمہ کے راستہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ اور وطن یاد آیا، اُسی وقت جبرئیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے جس میں آپ کو بشارت دی گئی ہے کہ مکہ مکرمہ سے یہ جُدائی چند روزہ ہے اور بالآخر آپ کو پھر مکہ مکرمہ پہنچادیا جائے گا جو فتح مکہ کی بشارت تھی۔ اسی لئے حضرت ابنِ عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت جحفہ میں نازل ہوئی ہے نہ مکی ہے نہ مدنی۔ (قرطبی) [۲]

قرآن دشمنوں پر فتح اور مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ ہے

اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ واپسی کی بشارت اس عنوان سے دی گئی ہے کہ جس ذاتِ حق نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے آپ کو دشمنوں پر غالب کرکے دوبارہ مکہ مکرمہ لَوٹائے گا، اس میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ قرآن کی تلاوت اور اُس پر عمل ہی اس نصرتِ خداوندی اور فتح مبین کا سبب ہوگی۔

[۱] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ القصص، باب (ان الذی فرض الآیۃ) ج:۲ ص:۷۰۳

[۲] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱۳ ص:۳۲۱

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ اس آیت میں وجہہ سے مراد ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور معنے یہ ہیں ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا ہر چیز ہلاک وفنا ہونے والی ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ وجہہ سے مراد وہ عمل ہے جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ جو عمل اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص کے ساتھ کیا جائے وہی باقی رہنے والا ہے باقی سب فانی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الحمدُ لِلّٰہ سورۂ قصص آج ۹ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ کو ایسے حالات میں تمام ہوئی کہ پاکستان پر ہندوستان اور دوسری بڑی طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے شدید حملہ ہوا اور چودہ روز کراچی پر روزانہ بمباری ہوتی رہی، شہری آبادی کو جابجا سخت نقصان پہنچا، سیکڑوں مسلمان شہید اور مکانات منہدم ہوئے، اور چودہ دن کی جنگ اس حادثۂ جانکاہ پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان پاکستان سے کٹ گیا اور تقریباً نوے ہزار پاکستانی فوج نے وہاں محصور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور اس وقت تک وہاں مسلمانوں کا قتلِ عام جاری ہے، ہر مسلمان کا دل اس صدمہ سے پاش پاش اور دماغ ماؤف ہے، فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ وَاِلَیْہِ الْمُشْتَکٰی وَلَا مَلْجَا وَلَا مَنْجَا مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ۔

سُوۡرَةُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ

اٰیاتھا ۶۹ — ۲۹ سُوۡرَةُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ مَکِّیَّةٌ ۸۵ — رکوعاتھا ۷

سورۂ عنکبوت مکہ میں نازل ہوئی اس کی انہتر آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ۝۲

الٓمّٓ کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر ہم یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے،

وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا

اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے سو البتہ معلوم کرے گا اللہ جو لوگ سچے ہیں

وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ۝۳ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اَنۡ

اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹوں کو، کیا یہ سمجھتے ہیں جو لوگ کہ کرتے ہیں برائیاں کہ

يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ

ہم سے بچ جائیں، بُری بات طے کرتے ہیں، جو کوئی توقع رکھتا ہے اللہ کی ملاقات کی سو اللہ کا وعدہ

لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ

آرہا ہے، اور وہ ہے سننے والا جاننے والا، اور جو کوئی محنت اٹھائے سو اُٹھاتا ہے اپنے ہی واسطے

اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اللہ کو پروا نہیں جہان والوں کی، اور جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام

لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷

ہم اُتار دیں گے اُن پر سے بُرائیاں ان کی اور بدلہ دیں گے ان کو بہتر سے بہتر کاموں کا

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

الۗمّۗ ۔ ① کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُنہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا کہ بس وہ یہ کہہ دیں کہ: ''ہم ایمان لے آئے'' اور اُن کو آزمایا نہ جائے؟ ② حالانکہ ہم نے اُن سب کی آزمائش کی ہے جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ لہٰذا اللہ ضرور معلوم کر کے رہے گا کہ کون لوگ ہیں جنہوں نے سچائی سے کام لیا ہے، اور وہ یہ بھی معلوم کر کے رہے گا کہ کون لوگ جھوٹے ہیں۔ ③ جن لوگوں نے بُرے بُرے کام کئے ہیں، کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے؟ بہت بُرا اندازہ ہے جو وہ لگا رہے ہیں۔ ④ جو شخص اللہ سے جا ملنے کی اُمید رکھتا ہو، اُسے یقین رکھنا چاہئے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی میعاد ضرور آ کر رہے گی، اور وہی ہے جو ہر بات سنتا، ہر چیز جانتا ہے۔ ⑤ اور جو شخص بھی ہمارے راستے میں محنت اُٹھاتا ہے، وہ اپنے ہی فائدے کے لئے محنت اُٹھاتا ہے۔ یقیناً اللہ تمام دُنیا جہان کے لوگوں سے بے نیاز ہے۔ ⑥ اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ہم اُن کی خطاؤں کو ضرور اُن سے جھاڑ دیں گے، اور جو عمل وہ کرتے رہے ہیں، اُن کا بہترین بدلہ اُنہیں ضرور دیں گے۔ ⑦

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ، اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے میں چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو (انواعِ مصائب سے) آزمایا نہ جائے گا، (یعنی ایسا نہ ہوگا بلکہ قسم قسم کے امتحانات بھی پیش آئیں گے) اور ہم تو (ایسے ہی واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہو گزرے ہیں (یعنی اور امتوں کے مسلمانوں پر بھی یہ معاملے گزرے ہیں) سو (اسی طرح ان کی آزمائش بھی کی جائے گی اور اس آزمائش میں) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعویٰ میں) سچے تھے، اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا (چنانچہ جو صدق و اعتقاد سے مسلمان ہوتے ہیں وہ ان امتحانات میں ثابت رہتے ہیں بلکہ اور زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں اور جو دفع الوقتی کے لئے مسلمان ہو جاتے ہیں وہ ایسے وقت میں اسلام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یعنی یہ ایک حکمت ہے امتحان کی کیونکہ مخلص اور غیر مخلص کے خلط ملط میں بہت سی مضرتیں ہوتی ہیں، خصوص ابتدائی حالات میں۔ یہ مضمون تو مسلمانوں کے متعلق ہوا آگے ان ایذا دینے والے کفار کی نسبت فرماتے ہیں کہ) ہاں کیا جو لوگ بُرے بُرے کام کر رہے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم سے کہیں نکل بھاگیں گے، ان کی یہ تجویز نہایت ہی بیہودہ ہے (یہ جملہ معترضہ کے طور پر تھا جس میں کفار کی بدانجامی سنا کر مسلمانوں کی ایک گونہ تسلّی کر دی کہ ان ایذاؤں کا ان سے بدلہ لیا جائے گا، آگے پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ) جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو (اس کو تو ایسے ایسے حوادث سے پریشان ہونا ہی نہ چاہئے کیونکہ) اللہ (کے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور ہی آنے والا ہے (جس سے سارے غم غلط ہو جائیں گے، کقولہ تعالیٰ [1] وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر: ۳۴)) اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (نہ کوئی قول اس سے مخفی نہ کوئی فعل پس لقاء کے وقت تمہاری سب طاعات قولیہ وفعلیہ کا صلہ دے کر سب غم دُور کر دے گا) اور (یاد رکھو کہ ہم جو تم کو ترغیب دے رہے ہیں مشقتوں کے برداشت کرنے کی، سو اس میں ظاہر اور مسلّم ہے کہ ہماری کوئی منفعت نہیں بلکہ) جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی (نفع کے) لئے محنت کرتا ہے (ورنہ) خدا تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں (اس میں بھی ترغیب ہے تحمّل مشاق کی کیونکہ اپنے نفع پر متنبہ ہونے سے وہ فعل زیادہ آسان ہو جاتا ہے) اور (وہ نفع جو طاعت سے پہنچتا ہے اس کا بیان یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ہم ان کے گناہ ان سے دُور کر دیں گے (جس میں بعض گناہ جیسے کفر و شرک تو ایمان سے زائل ہو جاتے ہیں، اور بعض گناہ توبہ سے کہ اعمالِ صالحہ میں داخل ہے اور بعضے گناہ صرف حسنات سے اور بعضے گناہ محض فضل سے

[1] ترجمہ: اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔

معاف ہو جائیں گے اور کوئی گناہ بعد قدرے سزا کے، یہاں تکفیر سب کو عام ہے) اور ان کو ان کے (ان) اعمال (ایمان واعمالِ صالحہ) کا (استحقاق سے) زیادہ اچھا بدلہ دیں گے، (پس اتنی ترغیبات پر طاعت اور مجاہدہ پر استقامت کا اہتمام ضروری ہے)۔

معارف ومسائل

وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۞ فتنہ سے مشتق ہے جس کے معنی آزمائش کے ہیں، اہلِ ایمان خصوصاً انبیاء وصلحاء کو دنیا میں مختلف قسم کی آزمایشوں سے گزرنا ہوتا ہے پھر انجام کار فتح اور کامیابی ان کی ہوتی ہے، یہ آزمائشیں مخالفین کبھی کفار وفجار کی دشمنی اور ان کی طرف سے ایذاؤں کے ذریعہ ہوتی ہیں، جیسا کہ اکثر انبیاء اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو اکثر پیش آیا ہے، جس کے بے شمار واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، اور کبھی یہ آزمائش امراض اور دوسری قسم کی تکلیفوں کے ذریعہ ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو پیش آیا، اور بعض کے لئے یہ سب قسمیں جمع بھی کر دی جاتی ہیں۔

شانِ نزول اس آیت کا اگرچہ از روئے روایات وہ صحابہ ہیں جو ہجرتِ مدینہ کے وقت کفار کے ہاتھوں ستائے گئے، مگر مراد عام ہے ہر زمانے کے علماء وصلحاء اور اولیاء امت کو مختلف قسم کی آزمائشیں پیش آتی ہیں، اور آتی رہیں گی۔ (قرطبی) [1]

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا، یعنی ان امتحانات اور شدائد کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص اور نیک وبد میں ضرور امتیاز کریں گے۔ کیونکہ مخلصین کے ساتھ منافقین کا خلط ملط بعض اوقات بڑے نقصانات پہنچا دیتا ہے، مقصد اس آیت کا نیک وبد اور مخلص وغیر مخلص کا امتیاز واضح کر دینا ہے، جس کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے گا صادقین کو اور کاذبین کو، اللہ تعالیٰ کو تو ہر انسان کا صادق یا کاذب ہونا اس کے پیدا ہونے سے پہلے بھی معلوم ہے، امتحانات اور آزمائشوں کے جان لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس امتیاز کو دوسروں پر بھی ظاہر فرما دیں گے۔

اور حضرت سیّدی حکیم الامت تھانویؒ نے اپنے شیخ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اس کی توجیہ یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ بعض اوقات عوام کے درجۂ علم پر تنزّل کر کے بھی کلام کیا جاتا ہے، عام انسان مخلص اور منافق میں فرق آزمایش ہی کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں، ان کے مذاق کے مطابق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مختلف قسم کے امتحانات کے ذریعہ ہم یہ جان کر رہیں گے کہ کون مخلص ہے کون نہیں، حالانکہ اس کے علم میں یہ سب کچھ ازل سے ہے۔ واللہ اعلم

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۳۲۴

وَ وَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حُسۡنًا ؕ وَ اِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِیۡ

اور ہم نے تاکید کردی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی، اور اگر وہ تجھ سے زور کریں کہ تو شرک کرے میرا

مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا ؕ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ

جس کی تجھ کو خبر نہیں تو ان کا کہنا مت مان، مجھی تک پھر آنا ہے تم کو سو میں بتلادوں گا تم کو جو کچھ تم

تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸﴾ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ

کرتے تھے، اور جو لوگ یقین لائے اور بھلے کام کئے ہم ان کو داخل کریں گے

فِی الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۹﴾

نیک لوگوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ اور اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہراؤ جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اُن کا کہنا مت مانو۔ میری ہی طرف تم سب کو لوٹ کر آنا ہے، اُس وقت میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ ﴿۸﴾ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ہم اُنہیں ضرور نیک لوگوں میں شامل کریں گے۔ ﴿۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اور (اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس (کے معبود ہونے) کی کوئی (صحیح)

دلیل تیرے پاس نہیں ہے، (اور ہر چیز ایسی ہی ہے کہ کُل اشیاء کے ناقابلِ عبادت ہونے پر دلائل قائم ہیں) تو (اس باب میں) ان کا کہنا نہ ماننا، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے سو میں تم کو تمہارے سب کام (نیک ہوں یا بد) جتلا دوں گا اور (تم میں) جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور نیک عمل کئے ہوں گے ہم ان کو نیک بندوں (کے درجہ) میں (جو کہ بہشت ہے) داخل کر دیں گے (اور اسی طرح اعمالِ بد پر ان کے مناسب سزا دیں گے، پس اسی بناء پر جس نے والدین کی اطاعت کو ہماری اطاعت پر مقدم رکھا ہوگا وہ سزا پائے گا، اور جس نے اس کا عکس کیا ہوگا نیک جزا پائے گا، حاصل یہ ہوا کہ واقعۂ بالا میں ماں باپ کی نافرمانی سے وسوسہ گناہ کا نہ کیا جائے)۔

معارف و مسائل

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ، وصیت کہتے ہیں کسی شخص کو کسی عمل کی طرف بلانے کو جبکہ وہ بلانا نصیحت و خیر خواہی پر مبنی ہو۔ (مظہری) [1]

بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا لفظ حُسن مصدر ہے بمعنی خوبی، اس جگہ خوبی والے طرزِ عمل کو مبالغہ کے لئے حُسن سے تعبیر کیا ہے۔ مراد واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ وصیت فرمائی کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ، یعنی والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے حکم کی اطاعت اسی حد تک کی جائے کہ وہ حکم اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہ ہو، وہ اگر اولاد کو کفر و شرک پر مجبور کریں تو اس میں ان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ، (رواہ احمد والحاکم وصححہ) [2] یعنی خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صحابۂ کرام میں سے اُن دس حضرات میں شامل ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت جنتی ہونے کی بشارت دی ہے، جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی والدہ کے بہت فرمانبردار اور ان کی راحت رسانی میں بڑے مستعد تھے۔ ان کی والدہ حمنہ بنت ابی سفیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے سعدؓ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے بیٹے کو تنبیہ کی اور قسم کھالی کہ میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں

---

[1] تفسیر المظهری ج:۷ ص:۱۹۲

[2] مسند احمد، مسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رقم الحدیث:۳۹۶۶، والمستدرک للحاکمؒ (بألفاظ مختلفة) رقم الحدیث:۵۸۷۰، والمشکوٰة، کتاب الإمارة والقضاء ص:۳۲۱

گی جب تک کہ تم پھر اپنے آبائی دین پر واپس آجاؤ یا بس میں اسی طرح بھوک پیاس سے مرجاؤں، اور ساری دنیا میں ہمیشہ کے لئے یہ رسوائی تمہارے سر رہے کہ تم اپنی ماں کے قاتل ہو۔ (مسلم، ترمذی) [1] اس آیتِ قرآن نے حضرت سعدؓ کو ان کی بات ماننے سے روک دیا۔

بغوی کی روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ کی والدہ ایک دن رات اور بعض اقوال کے مطابق تین دن تین رات اپنی قسم کے مطابق بھوکی پیاسی رہی۔ حضرت سعدؓ حاضر ہوئے، ماں کی محبت و اطاعت اپنی جگہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان کے سامنے کچھ نہ تھی، اس لئے والدہ کو خطاب کر کے کہا کہ امّاں جان اگر تمہارے بدن میں سو روحیں ہوتیں اور ایک ایک کر کے نکلتی رہتی میں اس کو دیکھ کر بھی کبھی اپنا دین نہ چھوڑتا، اب تم چاہو کھاؤ پیو یا مرجاؤ، بہرحال اپنے دین سے نہیں ہٹ سکتا، ماں نے ان کی اس گفتگو سے مایوس ہو کر کھانا کھالیا۔ [2]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ

اور ایک وہ لوگ ہیں کہ کہتے ہیں یقین لائے ہم اللہ پر پھر جب اس کو ایذا پہنچے اللہ کی راہ میں کرنے لگے لوگوں کے ستانے کو

كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ

برابر اللہ کے عذاب کی اور اگر آپہنچے مدد تیرے ربّ کی طرف سے تو کہنے لگیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں،

اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ⑩ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ

کیا یہ نہیں کہ اللہ خوب خبردار ہے جو کچھ سینوں میں ہے جہان والوں کے۔ اور البتہ معلوم کرے گا اللہ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ⑪ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جو لوگ دغاباز ہیں، اور کہنے لگے منکر

---

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضل سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ تعالیٰ عنه) ج:۲ ص:۲۸۰، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة العنکبوت ج:۲ ص:۱۵۴

[2] تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۶ ص:۲۳۴

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ

ایمان والوں کو تم چلو ہماری راہ اور ہم اٹھالیں گے تمہارے گناہ، اور وہ

بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ⑫ وَلَيَحْمِلُنَّ

کچھ نہ اٹھائیں گے اُن کے گناہ بے شک وہ جھوٹے ہیں، اور البتہ اٹھائیں گے

اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ز وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اپنے بوجھ اور کتنے بوجھ ساتھ اپنے بوجھ کے، اور البتہ ان سے پوچھ ہوگی قیامت کے دن

عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ⑬ ع

جو باتیں کہ جھوٹ بناتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ: ''ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں'' پھر جب اُن کو اللہ کے راستے میں کوئی تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی پہنچائی ہوئی تکلیف کو ایسا سمجھتے ہیں جیسا اللہ کا عذاب۔ اور اگر کبھی تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی مدد ان (مسلمانوں) کے پاس آگئی ہے تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ: ''ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔'' بھلا کیا اللہ کو وہ باتیں اچھی طرح معلوم نہیں ہیں جو سارے دُنیا جہان کے لوگوں کے سینوں میں چھپی ہیں؟ ⑩ اور اللہ تعالیٰ ضرور معلوم کر کے رہے گا کہ کون لوگ ایمان لائے ہیں، اور وہ ضرور معلوم کر کے رہے گا کہ کون لوگ منافق ہیں۔ ⑪ اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، اُنہوں نے ایمان والوں سے کہا کہ: ''ہمارے راستے کے پیچھے چلو تو ہم تمہاری خطاؤں کا بوجھ اُٹھالیں گے''، حالانکہ وہ اُن کی خطاؤں کا ذرا بھی بوجھ نہیں اُٹھا سکتے، اور یہ لوگ یقیناً بالکل جھوٹے ہیں۔ ⑫ اور وہ اپنے گناہوں کے بوجھ بھی ضرور اُٹھائیں گے، اور اپنے بوجھ کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور یہ لوگ جتنے جھوٹ گھڑا کرتے تھے، قیامت کے دن اِن سے اُن سب کی باز پرس ضرور کی جائے گی۔ ⑬

خلاصۂ تفسیر

اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب ان کو راہِ خدا میں کچھ تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو لوگوں کی ایذا رسانی کو ایسا (عظیم) سمجھ بیٹھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب (جس سے آدمی بالکل ہی مجبور ہو جائے، حالانکہ کسی مخلوق کو ایسے عذاب پر قدرت ہی نہیں اب تو ان کا یہ حال ہے) اور اگر (کبھی) کوئی مدد (مسلمانوں کی) آپ کے رَبّ کی طرف سے آ پہنچتی ہے (مثلاً جہاد ہو اور اس میں ایسے لوگ ہاتھ آ جائیں) تو (اس وقت) کہتے ہیں کہ ہم تو (دین اور عقیدہ میں) تمہارے ساتھ تھے (یعنی مسلمان ہی تھے، گو کفار کے اکراہ اور زبردستی کی وجہ سے کفار کے ساتھ ہو گئے تھے، اس پر حق تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ) کیا اللہ تعالیٰ کو دنیا جہان والوں کے دلوں کی باتیں معلوم نہیں ہیں (یعنی ان کے دل ہی میں ایمان نہ تھا) اور (یہ واقعات اس لئے ہوتے رہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو معلوم کر کے رہے گا، اور منافقوں کو بھی معلوم کر کے رہے گا اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم (دین میں) ہماری راہ چلو اور (قیامت میں) تمہارے گناہ (جو کفر و معاصی سے ہوں گے) ہمارے ذمہ (اور تم سبکدوش) حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی (اس طور پر کہ وہ سبکدوش ہو جائیں) نہیں لے سکتے یہ بالکل جھوٹ بک رہے ہیں اور (البتہ یہ تو ہوگا کہ) یہ لوگ اپنے گناہ (پورے پورے) اپنے اوپر لادے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور بھی (لادے ہوں گے اور یہ گناہ وہ ہیں جن کے لئے یہ سبب بنتے تھے، اور یہ گناہ ان پر لادنے سے اصل گناہگار سبکدوش نہیں ہوں گے، غرض دوسرے تو ہلکے نہ ہوئے مگر یہ لوگ ان کو گمراہ کرنے کے سبب اور زیادہ بھاری ہو گئے) اور یہ لوگ جیسی جیسی جھوٹی باتیں بناتے تھے قیامت میں ان سے باز پُرس (اور پھر اس پر سزا) ضرور ہوگی۔

معارف و مسائل

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا، کفار کی طرف سے اسلام کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو بہکانے کی تدبیریں مختلف طریقوں سے ہوتی رہی ہیں، کبھی زور و زر کی نمائش سے کبھی شکوک وشبہات پیدا کرنے سے۔ اس آیت میں بھی ان کی ایک ایسی ہی تدبیر مذکور ہے، کہ کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم لوگ بلاوجہ عذابِ آخرت کے خوف سے ہمارے طریقہ پر نہیں چلتے، لو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر تمہاری ہی بات سچی ہوئی کہ اس طریقہ پر چلنے کی وجہ سے آخرت میں عذاب ہوگا تو تمہارے گناہوں کا بوجھ ہم اٹھا لیں گے جو کچھ عذاب، تکلیف پہنچے گی ہمیں پہنچے گی تم پر آنچ نہ آئے گی۔

اسی طرح کا ایک شخص کا واقعہ سورۂ نجم کے آخری رکوع میں ذکر کیا گیا ہے [1] اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ۝٣٣ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝٣٤ (النجم)، جس میں مذکور ہے کہ ایک شخص کو اس کے کافر ساتھیوں نے یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ تم ہمیں کچھ مال یہاں دیدو تو ہم قیامت اور آخرت کے دن تمہارے عذاب کو اپنے ذمہ لے کر تمہیں بچادیں گے، اس نے کچھ دینا بھی شروع کر دیا پھر بند کر دیا۔ اس کی بے وقوفی اور اس کے عمل کے لغو ہونے کا بیان سورۂ نجم میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اسی طرح کا ایک قول کفار کا عام مسلمانوں سے یہاں مذکور ہے، یہاں حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں ایک تو یہ فرمایا کہ ایسا کہنے والے بالکل جھوٹے ہیں، یہ قیامت میں ان لوگوں کے گناہوں کا کوئی بوجھ نہ اُٹھائیں گے، وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَىْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝١٢ یعنی وہاں کے ہولناک عذاب کو دیکھ کر ان کو ہمت نہ ہوگی کہ اس کے اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں، اس لئے یہ وعدہ ان کا جھوٹا ہے۔ اور سورۂ نجم میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ کچھ بوجھ اٹھانے کو تیار بھی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اس کا اختیار نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ قانونِ عدل کے خلاف ہے ایک کے گناہ میں دوسرے کو پکڑ لیا جائے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ ان لوگوں کا یہ کہنا تو غلط اور جھوٹ ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر تمہیں سبکدوش کر دیں گے، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ تمہارا بہکانا اور تمہیں راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرنا خود ایک بڑا گناہ ہے جو ان کے اپنے اعمال کے عذاب کے علاوہ اُن پر لاد دیا جائے گا۔ اس طرح اُن پر اپنے اعمال کا بھی وبال ہوگا اور جن کو بہکایا تھا اُن کا بھی۔

گناہ کی دعوت دینے والا بھی گناہگار ہے، گناہ کرنے والے کو جو عذاب ہوگا وہی اس کو بھی ہوگا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی دوسرے کو گناہ میں مبتلا کرنے کی تحریک کرے یا گناہ میں اس کی مدد کرے وہ بھی ایسا ہی مجرم ہے جیسا یہ گناہ کرنے والا۔ ایک حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ سے روایت کی گئی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہدایت کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو جتنے لوگ اس کی دعوت کی وجہ سے ہدایت پر عمل کریں گے ان سب کے عمل کا ثواب اس داعی کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، بغیر اس کے کہ عمل

[1] ترجمہ: تو بھلا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے روگردانی کی اور تھوڑا مال دیا اور بند کر دیا۔

کرنے والوں کے اجر وثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ اور جو شخص کسی گمراہی اور گناہ کی طرف دعوت دے تو جتنے لوگ اس کے کہنے سے اس گمراہی میں مبتلا ہوں گے ان سب کا گناہ اور وبال اس شخص پر بھی پڑے گا بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے وبال وعذاب میں کوئی کمی ہو۔ (مسلم عن ابی ہریرۃ وابن ماجۃ عن انس، قرطبی) [۱]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کے پاس پھر رہا ان میں ہزار برس

اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ

پچاس برس کم پھر پکڑا ان کو طوفان نے اور وہ گنہگار تھے، پھر بچادیا ہم نے اس کو

وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ

اور جہاز والوں کو اور رکھا ہم نے جہاز کو نشانی جہان والوں کے واسطے، اور ابراہیم کو جب کہا اس نے

لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

اپنی قوم کو بندگی کرو اللہ کی اور ڈرتے رہو اس سے یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ

تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوائے یہی بتوں کے تھان اور بناتے ہو جھوٹی باتیں، بے شک جن کو

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ

تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے وہ مالک نہیں تمہاری روزی کے سو تم ڈھونڈو اللہ کے یہاں روزی

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۳۳۱، وسنن ابن ماجة، المقدمة، باب من سن سنة حسنة او سيئة ص:۱۸، وصحيح مسلم، كتاب العلم، باب من سن سنة إلخ ج:۲ ص:۳۴۱

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ

اور اس کی بندگی کرو اور اس کا حق مانو اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔ اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو جھٹلا چکے ہیں

اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

بہت فرقے تم سے پہلے، اور رسول کا ذمہ تو بس یہی ہے پیغام پہنچا دینا کھول کر۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے نوح کو اُن کی قوم کے پاس بھیجا تھا، چنانچہ پچاس کم ایک ہزار سال تک وہ اُن کے درمیان رہے، پھر اُن کو طوفان نے آ پکڑا، اور وہ ظالم لوگ تھے۔ ﴿۱۴﴾ پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو بچالیا، اور ہم نے اُس کو دُنیا جہان والوں کے لئے ایک عبرت بنا دیا۔ ﴿۱۵﴾ اور ہم نے ابراہیم کو بھیجا جبکہ اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ''اللہ کی عبادت کرو، اور اُس سے ڈرو، یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھ سے کام لو۔ ﴿۱۶﴾ جو کچھ تم کرتے ہو وہ یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تم بتوں کو پوجتے ہو، اور جھوٹی باتیں گھڑتے ہو۔ یقین جانو کہ اللہ کو چھوڑ کر جن جن کی تم عبادت کرتے ہو، وہ تمہیں رزق دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، اس لئے رزق اللہ کے پاس تلاش کرو، اور اُس کی عبادت کرو، اور اُس کا شکر ادا کرو۔ اُسی کے پاس تمہیں واپس لوٹایا جائے گا۔ ﴿۱۷﴾ اور اگر تم مجھے جھٹلا رہے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلانے کی رَوِش اختیار کر چکی ہیں، اور رسول پر اس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی کہ وہ صاف صاف بات پہنچا دے۔'' ﴿۱۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا سو وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار برس رہے (اور قوم کو سمجھاتے رہے) پھر (جب اس پر بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے تو) ان کو طوفان نے آدبایا اور وہ بڑے ظالم لوگ تھے (کہ اتنی مدت دراز کی فہمائش سے بھی متاثر نہ ہوئے) پھر (اس طوفان آنے کے بعد) ہم نے ان کو اور کشتی والوں کو (جو ان کے ساتھ سوار تھے، اس طوفان سے) بچالیا اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان والوں کے لئے (جن کو تواتر کے ساتھ خبر پہنچی) موجبِ عبرت بنایا (کہ غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ مخالفتِ حق کا کیا انجام ہے) اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے (جو کہ بُت پرست تھے) فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس

سے ڈرو (اور ڈر کر شرک چھوڑ دو) یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (بخلاف طریقۂ شرک کے کہ محض بے وقوفی ہے کیونکہ) تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو (جو بالکل عاجز اور ناکارہ ہیں) پوج رہے ہو اور (اس کے متعلق) جھوٹی باتیں تراشتے ہو، (کہ ان سے ہماری روزی روزگار کی کاربرآری ہوتی ہے، اور یہ محض جھوٹ ہے، کیونکہ) تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو، (یعنی اس سے مانگو، مالک رزق وہی ہے) اور (جب مالکِ رزق وہی ہے تو) اسی کی عبادت کرو اور (چونکہ پچھلا رزق بھی اسی کا دیا ہوا ہے تو) اسی کا شکر کرو (ایک تو سبب وجوبِ عبادت کا یہ ہے کہ وہ مالک نفع کا ہے) اور (دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ مالک ضرر کا بھی ہے چنانچہ) تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس وقت کفر پر تم کو سزا دے گا) اور اگر تم (ان باتوں میں) مجھ کو جھوٹا سمجھو تو (یاد رکھو کہ میرا کوئی ضرر نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سی اُمّتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھوٹا سمجھ چکی ہیں (مگر ان پیغمبروں کا کوئی ضرر نہیں ہوا) اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) پیغمبر کے ذمّہ تو صرف (بات کا) صاف طور پر پہنچا دینا ہے (منوانا اس کا کام نہیں پس سب انبیاء تبلیغ کے بعد سبکدوش ہو گئے، اسی طرح میں بھی، پس ہم کو کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ البتہ ماننا تمہارے ذمہ واجب تھا اس کے ترک سے تمہارا ضرر ضرور ہوا)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں کفار کی مخالفت اور ان کی ایذاؤں کا بیان تھا جو مسلمانوں کو پہنچتی رہتی ہیں۔ آیاتِ صدر میں اس طرح کے واقعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینے کے لئے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے کچھ حالات کا بیان ہے، کہ قدیم سے یہ سلسلہ اہلِ ہدایت کو کفار کی طرف سے ایذاؤں کا جاری ہے۔ مگر ان تکلیفوں کی وجہ سے انہوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری، اس لئے آپ بھی ایذاء کفار کی پرواہ نہ کریں، اپنے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں مضبوطی سے کام کرتے رہیں۔

انبیائے سابقین میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا، اوّل تو اس وجہ سے کہ وہ ہی سب سے پہلے پیغمبر ہیں جن کو کفر و شرک کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ جتنی ایذائیں اپنی قوم سے ان کو پہنچیں وہ کسی دوسرے پیغمبر کو نہیں پہنچیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر طویل دینے کا خصوصی امتیاز عطا فرمایا، اور ساری عمر کفار کی ایذاؤں میں بسر ہوئی۔ ان کی عمر قرآن کریم میں جو نو سو پچاس سال مذکور ہے، وہ تو قطعی اور یقینی ہے ہی، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ عمر زمانۂ تبلیغ و دعوت کی ہے اور اس سے پہلے اور طوفان کے بعد مزید عمر کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم

بہر حال اتنی غیر معمولی طویل عمر مسلسل دعوت و تبلیغ میں صرف کرنا اور ہر تبلیغ و دعوت کے وقت کفار کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں مار پیٹ اور گلا گھوٹنے کی سہتے رہنا اور ان سب کے باوجود کسی وقت ہمت نہ ہارنا یہ سب خصوصیات حضرت نوح علیہ السلام کی ہیں۔

دوسرا قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو بڑے سے بڑے سخت امتحانات سے گزرے ہیں۔ آتشِ نمرود، پھر ملکِ شام سے ہجرت کر کے ایک لق ودق جنگل بے آب و گیاہ کا قیام، پھر صاحبزادے کے ذبح کرنے کا واقعہ وغیرہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے قصہ کے ضمن میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی امت کے واقعات اور آخر سورۃ تک دوسرے بعض انبیاء اور ان کی سرکش امتوں کے حالات کا سلسلہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمتِ محمدیہ کی تسلّی کے لئے اور ان کو دین کے کام پر ثابت قدم رکھنے کے لئے بیان ہوا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ

کیا دیکھتے نہیں کیوں کر شروع کرتا ہے اللہ پیدائش کو پھر اس کو دُہرائے گا، یہ اللہ پر

يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ

آسان ہے، تو کہہ ملک میں پھرو پھر دیکھو کیوں کر شروع کیا ہے پیدائش کو پھر اللہ

يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ج

اٹھائے گا پچھلا اٹھان، بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے،

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾

دُکھ دے گا جس کو چاہے اور رحم کرے گا جس پر چاہے، اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے،

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور تم عاجز کرنے والے نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں، اور کوئی نہیں تمہارا اللہ سے ورے

ع ۲ ۱۴ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ ع وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَاۗىِٕهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ

حمایتی اور نہ مددگار، اور جو لوگ منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے اور اس کے ملنے سے وہ

يَىِٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

ناامید ہوئے میری رحمت سے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح مخلوق کو شروع میں پیدا کرتا ہے؟ پھر وہی اُسے دوبارہ پیدا کرے گا، یہ کام تو اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔ ﴿۱۹﴾ کہو کہ: ''ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اللہ نے کس طرح مخلوق کو شروع میں پیدا کیا، پھر اللہ ہی آخرت والی مخلوق کو بھی اُٹھا کھڑا کرے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ﴿۲۰﴾ وہ جس کو چاہے گا، سزا دے گا، اور جس پر چاہے گا رحم کرے گا، اور اُسی کی طرف تم سب کو پلٹا کر لے جایا جائے گا۔ ﴿۲۱﴾ اور تم نہ زمین میں (اللہ کو) عاجز کر سکتے ہو، اور نہ آسمان میں، اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی رکھوالا ہے، اور نہ کوئی مددگار۔'' ﴿۲۲﴾ اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا اور اُس سے جا ملنے کا انکار کیا ہے، وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں، اور اُن کے لئے دُکھ دینے والا عذاب ہے۔ ﴿۲۳﴾

خلاصۂ تفسیر

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو اوّل بار پیدا کرتا ہے، (عدم محض سے وجود میں لاتا ہے) پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان بات ہے (بلکہ ابتدائی نظر میں دوبارہ پیدا کرنا اوّل آفرینش سے زیادہ سہل ہے، گو قدرتِ ذاتیہ کے اعتبار سے دونوں مساوی ہیں، اور یہ لوگ امر اول یعنی اللہ تعالیٰ کے خالق کائنات ہونے کا تو اعتراف کرتے تھے، لقولہ تعالیٰ [1] وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ (لقمان:۲۵) اور امر ثانی یعنی دوبارہ پیدا کرنا اسی کے مماثل ہے، اس کا داخل قدرت ہونا اور زیادہ واضح ہے، اس لئے اَوَلَمْ يَرَوْا اس سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور زیادہ اہتمام کے لئے آگے پھر یہی مضمون قدرے تفاوتِ عنوان سے سُنانے کے لئے حضور صلی اللہ

[1] ترجمہ: اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے۔

علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اوّل بار پیدا کیا ہے، پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (پہلے عنوان میں ایک عقلی استدلال ہے اور دوسرے عنوان میں حسّی، جس کا تعلق احوالِ کائنات کے مشاہدہ سے ہے، یہ تو قیامت کا اثبات تھا آگے جزاء کا بیان ہے کہ بعد بعث کے) جس کو چاہے گا عذاب دے گا (یعنی جو اس کا مستحق ہوگا) اور جس پر چاہے رحمت فرمادے گا، یعنی جو اس کا اہل ہوگا) اور (اس تعذیب و رحمت میں اور کسی کا دخل نہ ہوگا، کیونکہ) تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، (نہ کہ اور کسی کے پاس) اور (اس کی تعذیب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے) تم نہ زمین میں (چھپ کر خدا کو) ہرا سکتے ہو (کہ اس کے ہاتھ نہ آؤ) اور نہ آسمان میں (اڑ کر) اور نہ خدا کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار، (پس نہ اپنی تدبیر سے بچ سکے نہ دوسرے کی حمایت سے) اور (اوپر جو ہم نے کہا تھا يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، اب قاعدۂ کلیہ سے اس کا مصداق بتلاتے ہیں کہ) جو لوگ خدا تعالیٰ کی آیتوں کے اور (بالخصوص) اس کے سامنے جانے کے منکر ہیں وہ لوگ (قیامت میں) میری رحمت سے ناامید ہوں گے (یعنی اس وقت مشاہدہ ہو جائے گا کہ ہم محلِ رحمت نہیں ہیں) اور یہی ہیں جن کو عذاب دردناک ہوگا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ

پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ بولے اس کو مار ڈالو یا جلادو پھر اس کو بچادیا اللہ نے

مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ

آگ سے اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین لاتے ہیں، اور ابراہیم بولا جو ٹھہرائے تم نے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اللہ کے سوائے بتوں کے تھان سو دوستی کرکر آپس میں دنیا کی زندگانی میں، پھر دن قیامت کے

يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ

منکر ہو جاؤ گے ایک سے ایک اور لعنت کرو گے ایک کو ایک، اور ٹھکانا تمہارا آگ ہے اور کوئی نہیں تمہارا

مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ قلا فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ م وَ قَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ط

مددگار پھر مان لیا اس کو لوط نے اور وہ بولا میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے ربّ کی طرف

اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا

بیشک وہی ہے زبردست حکمت والا، اور دیا ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب اور رکھ دی

فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ج وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

اس کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب اور دیا ہم نے اس کو اس کا ثواب دنیا میں، اور وہ آخرت میں

لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾

البتہ نیکوں سے ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

غرض ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ اُنہوں نے کہا: ''قتل کر ڈالو اس کو یا جلا ڈالو اسے!'' پھر اللہ نے ابراہیم کو آگ سے بچایا۔ یقیناً اس واقعے میں اُن لوگوں کے لئے بڑی عبرتیں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ ﴿۲۴﴾ اور اِبراہیم نے یہ بھی کہا کہ: ''تم نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو (خدا) مانا ہوا ہے جس کے ذریعے دُنیوی زندگی میں تمہاری آپس کی دوستی قائم ہے۔ پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے، اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے، اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا، اور تمہیں کسی بھی طرح کے مددگار میسر نہیں ہوں گے۔'' ﴿۲۵﴾ پھر لوط اُن پر ایمان لائے، اور اِبراہیم نے کہا کہ: ''میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہوں، وہی ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔'' ﴿۲۶﴾ اور ہم نے اُنہیں اسحاق اور یعقوب (جیسے بیٹے) عطا فرمائے، اور اُن کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری رکھا، اور اُن کا اجر ہم نے انہیں دُنیا میں (بھی) دیا اور یقیناً آخرت میں اُن کا شمار صالحین میں ہوگا۔ ﴿۲۷﴾

خلاصۂ تفسیر

سو (ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر دلپذیر کے بعد) ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ (آپس میں) کہنے لگے کہ ان کو یا توقتل کر ڈالو یا ان کو جلادو (چنانچہ جلانے کا سامان کیا) سو اللہ نے ان کو اس آگ سے بچالیا (جس کا قصہ سورۂ انبیاء میں گزر چکا ہے) بیشک اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں کئی نشانیاں ہیں (یعنی یہ واقعہ کئی چیزوں کی دلیل ہے، اللہ کا قادر ہونا، ابراہیم علیہ السلام کا نبی ہونا، کفر وشرک کا باطل ہونا اس لئے یہ ایک ہی دلیل متعدد دلائل کے قائم مقام ہوگئی) اور ابراہیم (علیہ السلام) نے (وعظ میں یہ بھی) فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو (معبود) تجویز کر رکھا ہے، بس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے (چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اکثر آدمی اپنے تعلقات اور دوستی اور رشتہ داروں کے طریق پر رہتا ہے اور اس وجہ سے حق بات میں غور نہیں کرتا، اور حق کو سمجھ کر بھی ڈرتا ہے کہ سب دوست اور رشتہ دار چھوٹ جائیں گے) پھر قیامت میں (تمہارا یہ حال ہوگا کہ) تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا، (جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے [1] لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (الاعراف: ۳۸) اور سورۂ سباء میں ہے [2] يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ (سبا: ۳۱) اور سورۂ بقرہ میں ہے [3] اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا الخ (البقرة: ۱۶۶) خلاصہ یہ ہے کہ آج جن احباب واقارب کی وجہ سے تم گمراہی کو اختیار کئے ہوئے ہو قیامت کے روز یہی احباب تمہارے دشمن بن جائیں گے) اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہوگا سو (اتنے وعظ وپند پر بھی ان کی قوم نے نہ مانا) صرف لوط (علیہ السلام) نے ان کی تصدیق فرمائی اور ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں (تم لوگوں میں نہیں رہتا، بلکہ) اپنے پروردگار کی (بتلائی ہوئی جگہ کی) طرف ترکِ وطن کر کے چلا جاؤں گا بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے (وہ میری حفاظت کرے گا اور مجھ کو اس کا ثمرہ دے گا) اور ہم نے (ہجرت کے بعد) ان کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے ان کی نسل میں نبوّت اور کتاب (کے سلسلہ) کو قائم رکھا اور ہم نے ان کا صلہ ان کو دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی (بڑے درجہ کے) نیک بندوں میں ہوں گے (اس صلہ میں مراد قرب وقبول ہے، كقوله تعالى فى البقرة [4] وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا الخ، البقرة: ۱۳۰)۔

---

[1] ترجمہ: اپنی جیسی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی۔
[2] ترجمہ: ایک دوسرے پر بات ڈالتا ہوگا۔
[3] ترجمہ: جب کہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے لوگ چلتے تھے۔
[4] ترجمہ: اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا۔

معارف ومسائل

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ حضرت لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھانجے تھے، آتش نمرود میں ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر سب سے پہلے انہوں نے تصدیق کی۔ یہ اور آپ کی اہلیہ حضرت سارہ جو آپ کی چچازاد بہن بھی تھیں اور مسلمان ہوچکی تھیں ان دونوں کو ساتھ لے کر ابراہیم علیہ السلام نے وطن سے ہجرت کا ارادہ کیا، ان کا وطن مقام کوثا تھا، جو کوفہ کی ایک بستی ہے، اور فرمایا اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ یعنی میں وطن کو چھوڑ کر اپنے ربّ کی طرف جاتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ کسی ایسے مقام کی طرف جاؤں گا جہاں ربّ کی عبادت میں رکاوٹ نہ ہو۔

حضرت نخعیؒ اور قتادہؒ نے اِنِّیْ مُهَاجِرٌ کا قائل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ تو یقیناً انہی کا حال ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے اِنِّیْ مُهَاجِرٌ کو حضرت لوط علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے، مگر سیاقِ کلام سے پہلی تفسیر راجح معلوم ہوتی ہے، اور حضرت لوط علیہ السلام بھی اگرچہ اس ہجرت میں شریک ضرور تھے مگر جیسا حضرت سارہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع تھیں اسی طرح لوط علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر مستقلاً نہ ہونا کچھ بعید نہیں۔

دُنیا میں سب سے پہلی ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جن کو دین کے لئے ترکِ وطن اور ہجرت اختیار کرنا پڑی، ان کی یہ ہجرت پچھتّر سال کی عمر میں ہوئی۔ (یہ سب بیان قرطبی سے لیا گیا ہے) [1]

بعض اعمال کی جزاء دُنیا میں بھی مل جاتی ہے

وَاٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا ۚ یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اللہ کی راہ میں قربانیوں اور دوسرے اعمالِ صالحہ کی جزاء دنیا میں بھی دیدی کہ ان کو تمام مخلوق میں مقبول وامام بنادیا، یہودی، نصرانی، بت پرست سبھی ان کی عزت کرتے ہیں، اور اپنا مقتداء مانتے ہیں، اور آخرت میں وہ صالحین اہلِ جنت میں سے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کی اصل جزاء تو آخرت میں ملے گی مگر اس کا کچھ حصہ دنیا میں بھی نقد دیا جاتا ہے، جیسا کہ احادیث معتبرہ میں بہت سے اچھے اعمال کے دنیوی فوائد اور بُرے اعمال کے دنیوی مفاسد کا بیان آیا ہے، ایسے اعمال کو سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے ایک مستقل رسالہ ''جزاء الاعمال'' میں جمع فرمادیا ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۳۳۹

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِۦٓ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ ٱلْفَٰحِشَةَ ز مَا سَبَقَكُم بِهَا

اور بھیجا لوط کو جب کہا اپنی قوم کو تم آتے ہو بے حیائی کے کام پر تم سے پہلے نہیں کیا وہ

مِنْ أَحَدٍ مِّنَ ٱلْعَٰلَمِينَ ۲۸ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ ٱلرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ ٱلسَّبِيلَ لا

کسی نے جہان میں، کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر اور تم راہ مارتے ہو

وَتَأْتُونَ فِى نَادِيكُمُ ٱلْمُنكَرَ ط فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوا

اور کرتے ہو اپنی مجلس میں بُرا کام، پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ بولے

ٱئْتِنَا بِعَذَابِ ٱللَّهِ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ۲۹ قَالَ رَبِّ ٱنصُرْنِى

لے آ ہم پر عذاب اللہ کا اگر تو ہے سچا، بولا اے ربّ میری مدد کر

عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْمُفْسِدِينَ ۳۰ ع وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرَٰهِيمَ بِٱلْبُشْرَىٰ لا ۳ ع ۸ ۱۵

ان شریر لوگوں پر، اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر،

قَالُوٓا إِنَّا مُهْلِكُوٓا أَهْلِ هَٰذِهِ ٱلْقَرْيَةِ ج إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَٰلِمِينَ ۳۱ صلے ج

بولے ہم کو غارت کرنا ہے اس بستی والوں کو بیشک اس بستی کے لوگ ہو رہے ہیں گنہگار،

قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا ط قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَن فِيهَا وقفة لَنُنَجِّيَنَّهُۥ وَأَهْلَهُۥٓ

بولا اس میں تو لوط بھی ہے وہ بولے ہم کو خوب معلوم ہے جو کوئی اس میں ہے ہم بچالیں گے اس کو اور اس کے گھر والوں کو

إِلَّا ٱمْرَأَتَهُۥ ق كَانَتْ مِنَ ٱلْغَٰبِرِينَ ۳۲ وَلَمَّآ أَن جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا

مگر اس کی عورت کہ رہے گی رہ جانے والوں میں اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس

سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ قف اِنَّا مُنَجُّوْكَ

ناخوش ہوا ان کو دیکھ کر اور تنگ ہوا دل میں اور وہ بولے مت ڈر اور غم نہ کھا، ہم بچا دیں گے تجھ کو

وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ

اور تیرے گھر کو مگر عورت تیری رہ گئی رہ جانے والوں میں، ہم کو اتارنی ہے

عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾

اس بستی والوں پر ایک آفت آسمان سے اس بات پر کہ وہ نافرمان ہو رہے تھے،

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور چھوڑ رکھا ہم نے اس کا نشان نظر آتا ہوا سمجھ دار لوگوں کے واسطے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے لوط کو بھیجا جبکہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: ''حقیقت یہ ہے کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دُنیا جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔ ﴿۲۸﴾ کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو، اور راستوں میں ڈاکے ڈالتے ہو، اور اپنی بھری مجلس میں بدی کا ارتکاب کرتے ہو؟'' پھر اُن کی قوم کے لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ اُنہوں نے کہا: ''لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو!'' ﴿۲۹﴾ لوط نے کہا: ''میرے پروردگار! ان مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرمایئے۔'' ﴿۳۰﴾ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ابراہیم کے پاس (اُن کے بیٹا ہونے کی) خوشخبری لے کر پہنچے، تو اُنہوں نے کہا کہ: ''ہم اس بستی والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے باشندے بڑے ظالم بنے ہوئے ہیں۔'' ﴿۳۱﴾ ابراہیم نے کہا: ''اس بستی میں تو لوط موجود ہیں۔'' فرشتوں نے کہا: ''ہمیں خوب معلوم ہے کہ اُس میں کون ہے۔ ہم اُنہیں اور اُن کے متعلقین کو ضرور بچالیں گے، سوائے اُن کی بیوی کے کہ وہ اُن لوگوں میں شامل رہے گی جو پیچھے رہ جائیں گے۔'' ﴿۳۲﴾ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو لوط اُن کی وجہ سے سخت پریشان ہوئے، اور ان کی وجہ سے اُن کا دِل تنگ ہونے لگا۔ اُن فرشتوں نے کہا: ''آپ نہ ڈریے، اور نہ غم کیجئے۔ ہم آپ کو اور آپ کے

متعلقین کو بچالیں گے، سوائے آپ کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی۔ (۳۳) اس بستی کے باشندے جو بدکاریاں کرتے رہے ہیں، اُن کی وجہ سے ہم ان پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔'' (۳۴) اور ہم نے اس بستی کی کچھ کھلی نشانی اُن لوگوں کے لئے چھوڑ دی ہے جو سمجھ سے کام لیں۔ (۳۵)

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں نہیں کیا کیا تم مردوں سے بُرا فعل کرتے ہو، (وہ بے حیائی کا کام یہی ہے) اور (اس کے علاوہ دوسری نامعقول حرکتیں بھی کرتے رہو، مثلاً یہ کہ) تم ڈاکہ ڈالتے ہو (کذا فی الدر عن ابن زید)[1] اور (غضب یہ ہے کہ) اپنی بھری مجلس میں نامعقول حرکت کرتے ہو (اور معصیت کا اعلان یہ خود ایک معصیت و قبح عقلی ہے) سو ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو (کہ یہ افعال موجب عذاب ہیں) لوط (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے رَبّ مجھ کو ان مفسد لوگوں پر غالب (اور ان کو عذاب سے ہلاک) کردے اور (ان کی دعاء قبول ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے عذاب کی خبر دینے کے لئے فرشتے معیّن فرمائے۔ اور دوسرا کام ان فرشتوں کو یہ بتلایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کے تولّد کی بشارت دیں چنانچہ) ہمارے (وہ) بھیجے ہوئے فرشتے جب ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (ان کے فرزند اسحاق کے تولد کی) بشارت لے کر آئے تو (اثنائے گفتگو میں جس کا مفصل بیان دوسرے موقع پر ہے[2] قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۳۱) الخ (الذاریات)) ان فرشتوں نے (ابراہیم علیہ السلام سے) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو (جس میں قومِ لوط آباد ہے) ہلاک کرنے والے ہیں (کیونکہ وہاں کے باشندے بڑے شریر ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہاں تو لوط (علیہ السلام بھی موجود) ہیں (وہاں عذاب نہ بھیجا جائے کہ ان کو گزند پہنچے گا) فرشتوں نے کہا کہ جو جو وہاں (رہتے) ہیں ہم کو سب معلوم ہیں ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین کو (یعنی ان کے خاندان والوں کو اور جو مؤمن ہوں اس عذاب سے) بچالیں گے (اس طرح سے کہ نزولِ عذاب کے قبل ان کو بستی سے باہر نکال لے جائیں گے) بجز اُن کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں سے ہوگی (جس کا ذکر سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں گزر چکا ہے، یہ گفتگو تو ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی) اور (پھر وہاں سے فارغ ہو کر) جب ہمارے وہ فرستادے لوط (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو لوط (علیہ السلام) ان (کے آنے) کی وجہ سے (اس لئے)

[1] الدر المنثور ج:۸ ص:۳۴

[2] ترجمہ: ابراہیم کہنے لگے اچھا تو تم کو بڑی مہم کیا درپیش ہے اے فرشتو!

مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین جوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا) اور (اس وجہ سے) ان (کے آنے) کے سبب تنگ دل ہوئے اور (فرشتوں نے جو یہ حال دیکھا تو) وہ فرشتے کہنے لگے (آپ کسی بات کا) اندیشہ نہ کریں اور نہ مغموم ہوں (ہم آدمی نہیں ہیں بلکہ عذاب کے فرشتے ہیں، کقولہ تعالیٰ [1] اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (ہود:۸۱) اور اس عذاب سے) ہم آپ کو اور آپ کے خاص متعلقین کو بچالیں گے بجز آپ کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں ہوگی (اور آپ کو مع متعلقین کے اس سے بچا کر) ہم اس بستی کے (بقیہ) باشندوں پر ایک آسمانی عذاب (یعنی اسباب طبعیہ غیر ارضیہ سے) ان کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں (چنانچہ وہ بستی اُلٹ دی گئی، اور غیبی پتھروں سے سنگباری کی گئی) اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان (اب تک) رہنے دیئے ہیں ان لوگوں (کی عبرت) کے لئے جو عقل رکھتے ہیں (چنانچہ اہلِ مکہ سفر شام میں ان ویران مقامات کو دیکھتے تھے اور جو اہلِ عقل تھے وہ منتفع بھی ہوتے تھے کہ ڈر کر ایمان لے آتے تھے)۔

معارف و مسائل

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ اس جگہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کے تین سخت گناہوں کا ذکر کیا ہے، اوّل مرد کی مرد کے ساتھ بدفعلی، دوسرے قطع طریق یعنی مسافروں پر ڈاکہ زنی، تیسرے اپنی مجلسوں میں اعلاناً سب کے سامنے گناہ کرنا۔ قرآن کریم نے اس تیسرے گناہ کی تعیین نہیں فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ جو اپنی ذات میں گناہ ہے اگر اس کو علانیہ بے پروائی سے کیا جائے تو یہ دوسرا مستقل گناہ ہو جاتا ہے وہ کوئی بھی گناہ ہو۔ بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ ان گناہوں کو شمار کیا ہے جو یہ بے حیا اپنی مجلسوں میں سب کے سامنے کیا کرتے تھے، مثلاً راستہ چلتے لوگوں کو پتھر مارنا اور ان کا استہزاء کرنا جیسا کہ اُمّ ہانیؓ کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے، [2] اور بعض حضرات نے فرمایا کہ جو بے حیائی ان کی مشہور تھی اس کو وہ کہیں چھپ کر نہیں کھلی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے کرتے تھے۔ العیاذ باللہ۔

جن تین گناہوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان سب میں اشد پہلا گناہ ہے، جو ان سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا، اور جنگل کے جانور بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ باتفاقِ امت یہ گناہ زنا سے زیادہ شدید ہے۔ (کذا فی الروح) [3]

[1] ترجمہ: ہم تو آپ کے رَبّ کے بھیجے ہوئے ہیں۔

[2] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة العنكبوت ج:۲ ص:۱۵۴

[3] روح المعانی ج:۱۵ ص:۲۷۴

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا

اور بھیجا مدین کے پاس اس کے بھائی شعیب کو پھر بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی اور توقع رکھو

الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ

پچھلے دن کی اور مت پھرو زمین میں خرابی مچاتے، پھر اس کو جھٹلایا تو پکڑلیا ان کو

الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ ز وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ

زلزلہ نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے، اور ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو اور تم پر حال کھل چکا ہے

مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۟ قف وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ

ان کے گھروں سے اور فریفتہ کیا ان کو شیطان نے ان کے کاموں پر پھر روک دیا ان کو راہ سے

وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ ۙ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۟ قف وَلَقَدْ جَآءَهُمْ

اور وہ تھے ہوشیار، اور ہلاک کیا قارون اور فرعون اور ہامان کو اور ان کے پاس پہنچا

مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ صلے

موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر، پھر بڑائی کرنے لگے ملک میں اور نہیں تھے ہم سے جیت جانے والے،

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ

پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر، پھر کوئی تھا کہ اس پر ہم نے بھیجا پتھراؤ ہوا سے

وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ

اور کوئی تھا کہ اس کو پکڑا چنگھاڑنے، اور کوئی تھا کہ اس کو دھنسادیا ہم نے زمین میں،

وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا

اور کوئی تھا کہ اس کو ڈبادیا ہم نے، اور اللہ ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے پر تھے وہ

أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٠﴾ مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ

اپنا آپ ہی بُرا کرتے، مثال ان لوگوں کی جنھوں نے پکڑے اللہ کو چھوڑ کر اور حمایتی

كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ

جیسے مکڑی کی مثال بنالیا اس نے ایک گھر اور سب گھروں میں بودا

لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ

سو مکڑی کا گھر اگر ان کو سمجھ ہوتی، اللہ جانتا ہے جس جس کو وہ پکارتے ہیں

مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٤٢﴾ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا

اس کے سوائے کوئی چیز ہو، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا، اور یہ مثالیں بٹھلاتے ہیں ہم

لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ

لوگوں کے واسطے اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے، اللہ نے بنائے آسمان اور زمین

بِالْحَقِّ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٤﴾

جیسے چاہئیں، اس میں نشانی ہے یقین لانے والوں کے لئے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ چنانچہ اُنہوں نے کہا: "میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت

کرو، اور آخرت والے دن کی اُمید رکھو، اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔'' (۳۶) پھر ہوا یہ کہ ان لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا، چنانچہ زلزلے نے اُن کو آ پکڑا، اور وہ اپنے گھر میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ (۳۷) اور ہم نے عاد اور ثمود کو بھی ہلاک کیا، اور اُن کی تباہی تم پر اُن کے گھروں سے واضح ہوچکی ہے۔ اور شیطان نے اُن کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر اُنہیں راہِ راست سے روک دیا تھا، حالانکہ وہ سوجھ بوجھ کے لوگ تھے۔ (۳۸) اور قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کیا۔ موسیٰ اُن کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے تھے، مگر اُنہوں نے زمین میں تکبر سے کام لیا، اور وہ (ہم سے) جیت نہ سکے۔ (۳۹) ہم نے ان سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ میں لیا، چنانچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کچھ وہ تھے جن کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا، اور کچھ وہ تھے جن کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کچھ وہ جنہیں ہم نے پانی میں غرق کردیا۔ اور اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن یہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔ (۴۰) جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے رکھوالے بنا رکھے ہیں، ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے کوئی گھر بنالیا ہو۔ اور کھلی بات ہے کہ تمام گھروں میں سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ کاش کہ یہ لوگ جانتے! (۴۱) یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس جس چیز کو پکارتے ہیں اللہ اُسے خوب جانتا ہے، اور وہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ (۴۲) ہم یہ مثالیں لوگوں کے فائدے کے لئے دیتے ہیں، اور اُنہیں سمجھتے وہی ہیں جو علم والے ہیں۔ (۴۳) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق (مقصد کے لئے) پیدا کیا ہے۔ درحقیقت اس میں ایمان والوں کے لئے بڑی نشانی ہے۔ (۴۴)

خلاصۂ تفسیر

اور مدین والوں کے پاس ہم نے ان (کی برادری) کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا سو انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو (اور شرک چھوڑ دو) اور روزِ قیامت سے ڈرو (اور اس کے انکار سے باز آؤ) اور سرزمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی حقوق اللہ وحقوق العباد کو ضائع مت کرو، کیونکہ یہ لوگ کفر وشرک کے ساتھ کم ناپنے کم تولنے کے بھی خوگر تھے، جس سے فساد پھیلنا ظاہر ہے) سو ان لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا پس زلزلہ نے ان کو آ پکڑا، پھر وہ اپنے گھروں میں گِھر کر رہ گئے۔ اور ہم نے عاد وثمود کو بھی (ان کے عناد وخلاف کی وجہ سے) ہلاک کیا، اور یہ ہلاک ہونا تم کو ان کے رہنے کے مقامات سے نظر آرہا ہے (کہ ان کی ویران بستیوں کے کھنڈرات ملکِ شام کو جاتے ہوئے تمہارے راستہ پر ملتے ہیں) اور (حالت ان کی یہ تھی کہ) شیطان نے ان کے اعمالِ (بد) کو ان کی نظر میں مستحسن کر رکھا تھا اور (اس ذریعہ سے) ان کو راہِ (حق) سے روک رکھا تھا اور وہ لوگ (ویسے) ہوشیار تھے (مجنون و بیوقوف نہ تھے، مگر اس

جگہ انہوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا) اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ان کے کفر کے سبب) ہلاک کیا اور ان (تینوں) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں (حق کی) لے کر آئے تھے، پھر ان لوگوں نے زمین میں سرکشی کی اور ہمارے (عذاب سے) بھاگ نہ سکے تو ہم نے (ان پانچوں میں سے) ہر ایک کو اس کے گناہ کی سزا میں پکڑ لیا، سو ان میں بعضوں پر تو ہم نے سخت ہوا بھیجی (مراد اس سے قوم عاد ہے) اور ان میں بعضوں کو ہولناک آواز نے آدبایا (مراد اس سے قوم ثمود ہے، لقوله تعالیٰ فی سورة هود: [1] وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ (ہود: ۶۷)) اور ان میں بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا (مراد اس سے قارون ہے) اور ان میں بعض کو ہم نے (پانی میں) ڈبو دیا (مراد اس سے فرعون و ہامان ہے) اور (ان لوگوں پر جو عذاب نازل ہوئے تو) اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا (یعنی بلا وجہ سزا دیتا جو ظاہراً مشابہ ظلم کے ہے گو واقع میں بوجہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کے یہ بھی ظلم نہ تھا) لیکن یہی لوگ (شرارتیں کر کے) اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے (کہ اپنے کو مستحق عذاب بنایا، اور غارت ہوئے تو اپنا ضرر خود کیا) جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں ان لوگوں کی مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے، (پس جیسا اس مکڑی نے اپنے زعم میں ایک اپنی جائے پناہ بنائی ہے، مگر واقع میں وہ پناہ انتہائی کمزور ہونے کے سبب کالعدم ہے، اسی طرح یہ مشرک لوگ معبودات باطلہ کو اپنے زعم میں اپنی پناہ سمجھتے ہیں، مگر واقع میں وہ پناہ کچھ نہیں ہے) اگر وہ (حقیقت حال کو) جانتے تو ایسا نہ کرتے (یعنی شرک نہ کرتے، لیکن وہ نہ جانیں تو کیا ہوا) اللہ تعالیٰ (تو) ان سب چیزوں (کی حقیقت اور ضعف) کو جانتا ہے جس جس کو وہ لوگ خدا کے سوا پوج رہے ہیں (پس وہ چیزیں تو نہایت ضعیف ہیں) اور وہ (خود یعنی اللہ تعالیٰ) زبردست حکمت والا ہے (جس کا حاصل قوت علمیہ و عملیہ میں کامل ہونا ہے) اور (چونکہ ہم ان چیزوں کی حقیقت کو جانتے ہیں اسی لئے) ہم ان (قرآنی) مثالوں کو (جس میں سے ایک مثال اس مقام پر مذکور ہے) لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان کرتے ہیں، اور (ان مثالوں سے چاہئے تھا کہ ان لوگوں کا جہل علم سے بدل جاتا مگر) ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں (خواہ بالفعل عالم ہوں یا انجام کے اعتبار سے، یعنی علم اور حق کے طالب ہوں اور یہ لوگ عالم بھی نہیں طالب بھی نہیں، اس لئے جہل میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن ان کے جہل سے حق حق ہی رہے گا جس کو خدا جانتا ہے، اور اپنے بیان سے ظاہر فرماتا ہے، پس غیر اللہ کا مستحق عبادت نہ ہونا تو ثابت ہوا۔ آگے اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مناسب طور پر بنایا ہے، (چنانچہ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں) ایمان والوں کے لئے اس میں (اس کے استحقاق عبادت کی) بڑی دلیل ہے۔

---

[1] ترجمہ: اور ان ظالموں کو ایک نعرہ نے آدبایا۔

معارف ومسائل

ان آیات میں جن انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے واقعات اجمالاً بیان کئے گئے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں مفصّل آ چکے ہیں، مثلاً شعیب علیہ السلام کا قصہ سورۂ اعراف اور ہود میں، اسی طرح عاد وثمود کا قصہ بھی اعراف اور ہود میں گزر چکا ہے، اور قارون، فرعون، ہامان کا قصہ سورہ قصص میں ابھی گزرا ہے۔

وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝۳۸ استبصار سے مشتق ہے، جو بصیرت کے معنی میں ہے، اور مُسْتَبْصِرْ بمعنی مُبْصِرْ۔ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو کفر وشرک پر اصرار کر کے عذاب میں اور ہلاکت میں مبتلا ہوئے کچھ بیوقوف یا دیوانے نہ تھے، دنیا کے کاموں میں بڑے مبصّر اور ہوشیار تھے، مگر اُن کی عقل اور ہوشیاری اسی مادّی دنیا میں مقید ہو کر رہ گئی۔ یہ نہ پہچانا کہ نیک وبد کی جزاء وسزا کا کوئی دن آنا چاہئے، جس میں مکمل انصاف ہو۔ کیونکہ دنیا میں تو اکثر مجرم ظالم دندناتے پھرتے ہیں اور مظلوم ومصیبت زدہ مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی انصاف کے دن کا نام قیامت اور آخرت ہے، اس کے معاملہ میں ان کی عقل ماری گئی۔

یہی مضمون سورۂ روم میں بھی آگے آنے والا ہے، [۱] يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷ (الروم)، یعنی یہ لوگ دنیاوی زندگی کے کاموں کو تو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل ہیں۔

اور بعض ائمۂ تفسیر نے وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝۳۸ کے معنی یہ بتلائے کہ یہ لوگ ایمان اور آخرت پر بھی دل میں تو یقین رکھتے تھے اور اس کا حق ہونا خوب سمجھتے تھے، مگر دنیوی اغراض نے ان کو انکار پر مجبور کر رکھا تھا۔

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ عنکبوت مکڑی کو کہا جاتا ہے، اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض ان میں سے زمین میں گھر بناتی ہیں، بظاہر وہ یہاں مراد نہیں، بلکہ مراد وہ مکڑی ہے جو جالا تانتی ہے، اور اس میں معلّق رہتی ہے۔ اس جالے کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی جتنی قسم کے گھونسلے اور گھر معروف ہیں، یہ جالے کے تار ان سب سے زیادہ کمزور ہیں کہ معمولی ہوا سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ اس آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں اور ان پر اعتماد کرنے والوں کی مثال مکڑی کے اس جالے سے دی ہے جو کہ نہایت کمزور ہے۔ اسی طرح جو لوگ اللہ کے سوا بتوں پر یا کسی انسان وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ ایسا ہی ہے جیسا یہ مکڑی اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے۔

مسئلہ:- مکڑی کو مارنے اور اس کے جالے کو صاف کر دینے کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض حضرات اس کو پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ جانور بوقت ہجرت غار ثور کے دہانے پر جالا تان دینے کی وجہ سے قابلِ احترام ہو گیا، جیسا کہ خطیب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے اس کے قتل کی ممانعت نقل کی ہے۔ [۲] مگر ثعلبی نے اور ابن عطیہ نے حضرت علی

---

[۱] ترجمہ: یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔ [۲] بحوالہ الدر المنثور ج:۸ ص:۳۷

کرم اللہ وجہہٗ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے طَهِّرُوْا بُيُوْتَكُمْ مِنْ نَسْجِ الْعَنْكَبُوْتِ فَإِنَّ تَرْكَهٗ يُوْرِثُ الْفَقْرَ ''یعنی مکڑی کے جالوں سے اپنے مکانات کو صاف رکھا کرو، کیونکہ اس کے چھوڑ دینے سے فقر و فاقہ پیدا ہوتا ہے'' سنداً ان دونوں روایتوں کی قابلِ اعتماد نہیں، اور دوسری روایت کی دوسری احادیث [1] سے تائید ہوتی ہے جن میں مکانات اور فناءِ دار کو صاف رکھنے کا حکم ہے۔ (روح المعانی) [2]

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ مشرکین کے خداؤں کی کمزوری کی مثال مکڑی کے جالے سے دینے کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ہم ایسی ایسی واضح مثالوں سے توحید کی حقیت کا بیان کرتے ہیں، مگر ان مثالوں سے بھی سمجھ بوجھ صرف علمائے دین ہی حاصل کرتے ہیں، دوسرے لوگ تدبّر اور غور و فکر ہی نہیں کرتے، کہ حق ان پر واضح ہو جائے۔

اللہ کے نزدیک عالم کون ہے؟

امام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر فرمایا کہ عالم وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں غور و فکر کرے، اور اس کی اطاعت پر عمل کرے، اور اس کو ناراض کرنے والے کاموں سے بچے۔ [3]

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے محض الفاظ سمجھ لینے سے اللہ کے نزدیک کوئی شخص عالم نہیں ہوتا، جب تک قرآن میں تدبّر اور غور و فکر کی عادت نہ ڈالے، اور جب تک کہ اپنے عمل کو قرآن کے مطابق نہ بنائے۔

مسند احمد میں حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار مثال سیکھی ہیں، ابن کثیرؒ اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت عمرو بن عاصؓ کی بہت بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مذکورہ میں عالم انہی کو فرمایا ہے جو اللہ و رسول کی بیان کردہ امثال کو سمجھیں۔ [4]

اور حضرت عمرو بن مرہؒ نے فرمایا کہ جب میں قرآن کی کسی آیت پر پہنچتا ہوں جو میری سمجھ میں نہ آئے تو مجھے بڑا غم ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ (ابن کثیر) [5]

---

[1] جامع الترمذی، ابواب الإستئذان والأدب، باب ما جاء في النظافة ج:۲ ص:۱۰۷

[2] روح المعانی ج:۱۵ ص:۲۸۲

[3] تفسير البغوی تحت هٰذه الآية ج:۶ ص:۲۴۳، واتحاف الخيرة المهرة للبوصيريؒ، رقم الحديث:۵۷۷۹

[4] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۶ ص:۲۷۹، ومسند احمد، حديث عمرو بن العاص رضى الله تعالى عنه، رقم الحديث:۱۸۲۸۱

[5] تفسير ابن كثير ج:۶ ص:۲۸۰

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی

تو پڑھ جو اُتری تری طرف کتاب اور قائم رکھ نماز بے شک نماز روکتی ہے

عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ

بے حیائی اور بُری بات سے اور اللہ کی یاد ہے سب سے بڑی اور اللہ کو خبر ہے

مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

جو تم کرتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی گئی ہے، اُس کی تلاوت کرو، اور نماز قائم کرو۔ بیشک نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سب کو جانتا ہے۔ ﴿۴۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آپ رسول ہیں، اس لئے) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے آپ (تبلیغ کے واسطے) اس کو (لوگوں کے سامنے) پڑھا کیجئے (اور تبلیغ قولی کے ساتھ تبلیغ عملی بھی کیجئے کہ دین کے کام ان کو عمل کر کے بھی بتلایئے، خصوصاً) نماز کی پابندی رکھئے (کیونکہ تمام اعمال میں نماز اعظم عبادت بھی ہے اور اس کے اثرات بھی دور رس ہیں کہ) بیشک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے (یعنی بزبانِ حال کہتی ہے کہ تو جس معبود کی انتہائی تعظیم کر رہا ہے اور اس کی اطاعت کا اقرار کر رہا ہے، فحشاء اور منکر میں مبتلا ہونا اس کی شان میں بے ادبی ہے) اور (اسی طرح نماز کے سوا جتنے نیک کام ہیں سب پابندی کے لائق ہیں، کیونکہ وہ سب قولاً یا فعلاً اللہ کی یاد ہی ہیں) اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور (اگر تم اللہ کی یاد میں غفلت کرو تو یہ بھی سُن لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے (جیسا کرو گے ویسا بدلہ ملے گا)۔

معارف ومسائل

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ، سابقہ آیات میں چند انبیاء علیہم السلام اوران کی امتوں کا ذکر تھا، جن میں چند بڑے بڑے سرکش کفار اوران پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین امّت کے لئے تسلّی بھی ہے کہ انبیاء سابقین نے مخالفین کی کیسی کیسی ایذاؤں پر صبر کیا، اوراس کی تلقین بھی کہ تبلیغ ودعوت کے کام میں کسی حال میں ہمّت نہیں ہارنا چاہئے۔

اصلاحِ خلق کا مختصر جامع نسخہ

مذکورالصدر آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ کا ایک مختصر جامع نسخہ بتلایا گیا ہے، جس پر عمل کرنے سے پورے دین پر عمل کرنے کے راستے کھل جاتے ہیں، اوراس کی راہ میں جورکاوٹیں عادۃً پیش آتی ہیں وہ دور ہوجاتی ہیں، اس نسخۂ اکسیر کے دوجُزو ہیں، ایک تلاوتِ قرآن، دوسرے نماز کی اقامت۔ اوراس جگہ اصل مقصود تو یہی ہے کہ لوگوں کوان دونوں چیزوں کا پابند کیا جائے، لیکن ترغیب وتاکید کے لئے ان دونوں چیزوں کا حکم اوّلاً خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، تاکہ امت کواس پر عمل کرنے کی زیادہ رغبت ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تعلیم سے ان کوخود عمل کرنا بھی آسان ہوجائے۔

ان میں تلاوتِ قرآن توسب کاموں کی روح اوراصل بنیاد ہے، اس کے بعد دوسری چیز اقامتِ صلوٰۃ ہے، جس کوتمام دوسرے فرائض اوراعمال سے ممتاز کرکے بیان کرنے کی یہ حکمت بھی بیان فرمادی کہ نماز خوداپنی ذات میں بھی بہت بڑا اہم عبادت اوردین کا عمود ہے، اس کے ساتھ اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ جوشخص نماز کی اقامت کرلے تو نماز اس کو فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ فحشاء ہرایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اورایسی واضح ہو کہ ہرعقل والا مؤمن ہو یا کافر اس کو بُرا سمجھے، جیسے زنا، قتلِ ناحق، چوری، ڈاکہ وغیرہ، اور منکر وہ قول وفعل ہے جس کے حرام وناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو۔ اس لئے ائمہ فقہاء کے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جاسکتا۔

فحشاء اور منکر کے دولفظوں میں تمام جرائم اورظاہر وباطنی گناہ آگئے، جوخود بھی فساد ہی فساد ہیں اوراعمال صالحہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔

نماز کا تمام گناہوں سے روکنے کا مطلب

متعدد مستند احادیث کی رُو سے یہ مطلب ہے، کہ اقامتِ صلوٰۃ میں بالخاصہ تاثیر ہے کہ جواس کو ادا کرتا ہے اس

سے گناہ چھوٹ جاتے ہیں بشرطیکہ صرف نماز پڑھنا نہ ہو، بلکہ الفاظِ قرآن کے مطابق اقامت صلوٰۃ ہو۔ اقامت کے لفظی معنی سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں، جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ اس لئے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہوا کہ نماز کے تمام ظاہری اور باطنی آداب اُس طرح ادا کرے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر ادا کر کے بتلایا، اور عمر بھر ان کی زبانی تلقین بھی فرماتے رہے کہ بدن اور کپڑے اور جائے نماز کی مکمل طہارت بھی ہو، پھر نمازِ جماعت کا پورا اہتمام بھی اور نماز کے تمام اعمال کو سنت کے مطابق بنانا بھی، یہ تو ظاہری آداب ہوئے۔ باطنی یہ کہ مکمل خشوع خضوع سے اس طرح اللہ کے سامنے کھڑا ہو کہ گویا وہ حق تعالیٰ سے عرض و معروض کر رہا ہے۔ اس طرح اقامت صلوٰۃ کرنے والے کو منجانب اللہ خود بخود توفیق اعمالِ صالحہ کی بھی ہوتی ہے، اور ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کی بھی، اور جو شخص نماز پڑھنے کے باوجود گناہوں سے نہ بچا تو سمجھ لے کہ اس کی نماز ہی میں قصور ہے۔ جیسا کہ حضرت عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ کا کیا مطلب ہے، آپ نے فرمایا مَنْ لَّمْ تَنْهَهُ صَلٰوتُهٗ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلٰوةَ لَهٗ (رواہ ابن ابی حاتم بسندہ عن عمران بن حُصَین والطبرانی من حدیث ابی معاویۃ) [۱] یعنی جس شخص کو اس کی نماز نے فحشاء اور منکر سے نہ روکا اس کی نماز کچھ نہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ یُطِعِ الصَّلٰوةَ (رواہ ابن جریر بسندہ) [۲] یعنی اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے اپنی نماز کی اطاعت نہ کی اور نماز کی اطاعت یہی ہے کہ فحشاء اور منکر سے باز آجائے۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ جس شخص کی نماز نے اس کو اعمالِ صالحہ پر عمل اور منکرات سے پرہیز آمادہ نہیں کیا تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ان تینوں روایتوں کو نقل کر کے ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ احادیث مرفوعہ نہیں، بلکہ عمران بن حُصَین اور عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں جو ان حضرات نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمائے ہیں۔ [۳]

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ فلاں آدمی رات کو تہجد پڑھتا ہے اور جب صبح ہو جاتی ہے تو چوری کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ عنقریب نماز اس کو چوری سے روک دے گی۔ (ابن کثیر) [۴]

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم، رقم الحدیث: ۱۸۱۸۶، والمعجم الکبیر للطبرانیؒ (بألفاظ مختلفة) رقم الحدیث: ۱۱۰۲۵

[۲] تفسیر الطبری لابن جریر ج: ۲۰ ص: ۴۱

[۳] تفسیر ابن کثیر ج: ۶ ص: ۲۸۱

[۴] مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رقم الحدیث: ۹۷۷۷، وابن کثیر ج: ۶ ص: ۲۸۱، ۲۸۲

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد وہ اپنے گناہ سے تائب ہو گیا۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں بعض لوگ یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ نماز کے پابند ہونے کے باوجود بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں جو بظاہر اس آیت کے ارشاد کے خلاف ہے۔

اس کے جواب میں بعض حضرات نے تو یہ فرمایا کہ آیت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نماز نمازی کو گناہوں سے منع کرتی ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جس کو کسی کام سے منع کیا جائے وہ اس سے باز بھی آجائے۔ آخر قرآن و حدیث سب لوگوں کو گناہ سے منع کرتے ہیں، مگر بہت سے لوگ اس منع کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے، اور گناہ سے باز نہیں آتے۔ خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہی توجیہ لی گئی ہے۔

مگر اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ نماز کے منع کرنے کا مفہوم صرف حکم دینا نہیں بلکہ نماز میں بالخاصّہ یہ اثر بھی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہو جاتی ہے، اور جس کو توفیق نہ ہو تو غور کرنے سے ثابت ہو جائے گا کہ اس کی نماز میں کوئی خلل تھا، اور اقامتِ صلوٰۃ کا حق اس نے ادا نہیں کیا، احادیث مذکورہ سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝۴۵ ''یعنی اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے، اور وہ تمہارے سب اعمال کو خوب جانتا ہے۔'' یہاں ذکر اللہ کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ بندے جو اللہ کا ذکر نماز یا خارج نماز میں کرتے ہیں وہ بڑی چیز ہے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بندے جب اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے ذاکر بندوں کا ذکر فرشتوں کے مجمع میں کرتے ہیں (فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ [1] (البقرۃ: ۱۵۲)) اور یہ عبادت گزار بندوں کو اللہ کا یاد کرنا سب سے بڑی نعمت ہے۔ بہت سے صحابہ و تابعین سے اس جگہ ذکر اللہ کا یہی دوسرا مفہوم منقول ہے، ابن جریر اور ابن کثیر نے اسی کو ترجیح دی ہے، [2] اور اس مفہوم کے لحاظ سے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ نماز پڑھنے میں گناہوں سے نجات کا اصل سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس کا ذکر فرشتوں میں کرتے ہیں اور اس کی برکت سے اس کو گناہوں سے نجات مل جاتی ہے۔

[1] ترجمہ: ان نعمتوں پر مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا۔

[2] تفسیر ابن جریر الطبریؒ ج:۲۰ ص:۴۴ تا ۴۶، وتفسیر ابن کثیر ج:۶ ص:۲۸۲

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور جھگڑا نہ کرو اہلِ کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو، مگر جو

ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا

اُن میں بے انصاف ہیں اور یوں کہو کہ ہم مانتے ہیں جو اترا ہم کو اور اترا تم کو اور بندگی ہماری

وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ

اور تمہاری ایک ہی کو ہے اور ہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں، اور ویسی ہی ہم نے اتاری تجھ پر کتاب،

فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ

سو جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو مانتے ہیں اور ان (مکہ والوں) میں بھی بعضے ہیں کہ اس کو مانتے ہیں

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ

اور منکر وہی ہیں ہماری باتوں سے جو نافرمان ہیں اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب

وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ

اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے تب تو البتہ شبہ میں پڑتے یہ جھوٹے، بلکہ یہ (قرآن) تو آیتیں ہیں صاف

فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ، اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں،

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ

اور کہتے ہیں کیوں نہ اُتریں اس پر کچھ نشانیاں اس کے رَبّ سے تو کہہ نشانیاں تو ہیں اختیار میں اللہ کے

وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْکِتٰبَ

اور میں تو بس سُنا دینے والا ہوں کھول کر، کیا اُن کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر اُتاری کتاب

یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ع ٥ ع ٧ ١

کہ اُن پر پڑھی جاتی ہے، بیشک اس میں رحمت ہے اور سمجھانا اُن لوگوں کو جو مانتے ہیں،

قُلْ کَفٰی بِاللّٰهِ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ شَهِیْدًا ۚ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

تو کہہ کافی ہے اللہ میرے اور تمہارے بیچ گواہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَکَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور جو لوگ یقین لاتے ہیں جھوٹ پر اور منکر ہوئے اللہ سے، وہی ہیں نقصان پانے والے،

وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ

اور جلدی مانگتے ہیں تجھ سے آفت، اور اگر نہ ہوتا ایک وعدہ مقررہ تو آپہنچتی اُن پر آفت،

وَلَیَاْتِیَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ

اور البتہ آئے گی اُن پر اچانک اور ان کو خبر نہ ہوگی، جلدی مانگتے ہیں تجھ سے عذاب

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌۢ بِالْکٰفِرِیْنَ ﴿۵۴﴾ ۙ یَوْمَ یَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ

اور دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو، جس دن گھیرلے گا ان کو عذاب ان کے اوپر سے

وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَیَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور پاؤں کے نیچے سے اور کہے گا چکھو جیسا کچھ تم کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (مسلمانو!) اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو، مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، ـــــ البتہ اُن میں سے جو زیادتی کریں، اُن کی بات اور ہے ـــــ اور (ان سے) یہ کہو کہ: ''ہم اُس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، اور اُس پر بھی جو تم پر نازل کی گئی تھی، اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہے، اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔'' ۴۶ اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے، اس لئے جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور ان (بت پرستوں) میں سے بھی کچھ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لارہے ہیں، اور ہماری آیتوں کا انکار صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو کافر ہیں۔ ۴۷ اور تم اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے، اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل والے مین میخ نکال سکتے تھے۔ ۴۸ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ قرآن ایسی نشانیوں کا مجموعہ ہے جو اُن لوگوں کے سینوں میں بالکل واضح ہیں جنہیں علم عطا کیا گیا ہے، اور ہماری آیتوں کا انکار صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو ظالم ہیں۔ ۴۹ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ''ان (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) پر ان کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اُتاری گئیں؟'' (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ: ''نشانیاں صرف اللہ کے پاس ہیں، اور میں تو ایک واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔'' ۵۰ بھلا کیا ان کے لئے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اُتاری ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جارہی ہے؟ یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے جو ماننے والے ہوں۔ ۵۱ کہہ دو کہ: ''میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کے لئے اللہ کافی ہے، اُسے اُن تمام چیزوں کا علم ہے جو آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں۔ اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے ہیں، اور اللہ کا انکار کیا ہے، وہی ہیں جو سخت نقصان اُٹھانے والے ہیں۔'' ۵۲ اور یہ لوگ تم سے عذاب کی جلدی مچارہے ہیں۔ اگر (عذاب کا) ایک معین وقت نہ ہوتا تو ان پر ضرور عذاب آجاتا، اور وہ ان پر آئے گا ضرور (مگر) اتنا اچانک کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ۵۳ یہ تم سے عذاب کی جلدی مچارہے ہیں، اور یقیناً جہنم ان کو گھیرے میں لے لے گی، ۵۴ اُس دن جب عذاب اُن پر اُوپر سے بھی چھا جائے گا، اور ان کے پاؤں کے نیچے سے بھی، اور کہے گا کہ: ''چکھو اُن کاموں کا مزہ جو تم کیا کرتے تھے۔'' ۵۵

خلاصۂ تفسیر

اور (جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہے تو اے مسلمانو منکرینِ رسالت میں سے جو اہلِ کتاب ہیں ہم ان سے طریقۂ گفتگو بتلاتے ہیں، اور یہ تخصیص اس لئے کہ اوّل تو وہ بوجہ اہلِ علم ہونے کے بات کو سنتے ہیں اور مشرکین تو

بات سننے سے پہلے ہی ایذاء کے درپے ہوجاتے ہیں، دوسرے اہلِ علم کے ایمان لے آنے سے عوام کا ایمان زیادہ متوقع ہوجاتا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ) تم اہلِ کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقے کے مباحثہ مت کرو ہاں جو ان میں زیادتی کریں (تو اُن کو جواب ترکی بہ ترکی دینے کا مضائقہ نہیں، گو افضل جب بھی طریقۂ احسن ہے) اور (وہ مہذب طریقہ یہ ہے کہ مثلاً ان سے) یوں کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو تم پر نازل ہوئیں، (کیونکہ مدار ایمان کا منزّل من اللہ ہونا ہے، پس جب ہماری کتاب کا منزّل من اللہ ہونا تمہاری کتب سے بھی ثابت ہے، پھر تم کو قرآن پر بھی ایمان لانا چاہئے) اور (یہ تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ) ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے کقولہ تعالیٰ [۱] اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا الخ (آل عمران: ۶۴) جب توحید متفق علیہ ہے اور اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کی وجہ سے نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لانا خلاف توحید ہے، تو تم کو ہمارے نبی پر ایمان لانا چاہئے، کقولہ تعالیٰ [۲] وَ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا الخ، آل عمران: ۶۴) اور (اس گفتگو کے ساتھ اپنا مسلمان ہونا تنبیہ کے لئے سُنا دو کہ) ہم تو اس کی اطاعت کرتے ہیں (اس میں عقائد و اعمال سب آ گئے یعنی اسی طرح تم کو بھی چاہئے جبکہ مقتضی موجود ہے کقولہ تعالیٰ [۳] فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (آل عمران) اور (جس طرح ہم نے پہلے انبیاء پر کتابیں نازل کیں) اسی طرح ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی (جس کی بناء پر مجادلہ بالاحسن کی تعلیم کی گئی) سو جن لوگوں کو ہم نے کتاب (کی نافع سمجھ) دی ہے وہ اس (آپ والی) کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (اور ان سے مجادلہ کی بھی نوبت شاذ و نادر آتی ہے) اور ان (اہلِ عرب مشرک) لوگوں میں بھی بعض ایسے (منصف) ہیں کہ اس کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (خواہ خود سمجھ کر یا اہلِ علم کے ایمان سے استدلال کرکے) اور (وضوح دلائل کے بعد) ہماری (اس کتاب کی) آیتوں سے بجز (ضدی) کافروں کے اور کوئی منکر نہیں ہوتا (اوپر مجادلہ کی تقریر دلیلِ نقلی تھی جس سے خاص اہلِ نقل کو تخاطب تھا آگے دلیل عقلی ہے جس میں عام تخاطب ہے یعنی) اور (جو لوگ آپ کی نبوّت کے منکر ہیں، ان کے پاس کوئی منشاء اشتباہ بھی تو نہیں، کیونکہ) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ ناحق شناس لوگ کچھ شبہ نکالتے (کہ یہ لکھے پڑھے آدمی ہیں آسمانی کتابیں دیکھ بھال کر ان کی مدد سے مضامین سوچ کر فرصت میں بیٹھ کر لکھ لئے اور یاد کرکے ہم لوگوں کو سنا دیئے، یعنی اگر ایسا ہوتا تو کچھ تو منشاء اشتباہ کا ہوتا، گو جب بھی یہ شبہ کرنے والے مبطل ہوتے، کیونکہ اعجازِ قرآنی پھر بھی دلالت علی النبوّۃ کے لئے کافی تھا، لیکن اب تو اتنا منشاء اشتباہ بھی نہیں۔ اس لئے یہ کتاب محلِ ارتیاب نہیں) بلکہ یہ کتاب (باوجود واحد ہونے کے چونکہ ہر حصہ اس کا معجزہ ہے، اور حصص کثیر

---

[۱] [۲] [۳] اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رَب نہ قرار دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم اس کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

ہیں، اس لئے وہ تنہا گویا) خود بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور (باوجود ظہور اعجاز کے) ہماری آیتوں سے بس ضدی لوگ انکار کئے جاتے ہیں (ورنہ منصف کو تو ذرا شبہ نہیں رہنا چاہئے) اور یہ لوگ (باوجود عطاء معجزہ قرآن کے محض براہ تعنت وعناد) یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر ان کے رَبّ کے پاس سے (ہماری فرمائشی) نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوئیں، آپ یوں کہہ دیجئے کہ وہ نشانیاں تو خدا کے قبضۂ (قدرت) میں ہیں اور (میرے اختیار کی چیزیں نہیں) میں تو صرف ایک صاف صاف (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) ہوں (اور رسول ہونے پر صحیح دلیلیں رکھتا ہوں جن میں سب سے بڑی دلیل قرآن ہے۔ پھر خاص دلیل کی کیا ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ اس کے واقع نہ ہونے میں حکمت بھی ہو۔ آگے قرآن کا اعظم فی الدلالۃ ہونا فرماتے ہیں) کیا (دلالت علی النبوۃ میں) ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہوئی کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب (معجز) نازل فرمائی ہے جو ان کو (ہمیشہ) سنائی جاتی رہتی ہے (کہ اگر ایک بار سننے سے اعجاز ظاہر نہ ہو تو دوسری بار میں ہو جائے یا اس کے بعد ہو جائے، اور دوسرے معجزات میں تو یہ بات بھی نہ ہوتی، کیونکہ اس کا خارق ہونا دائمی نہ ہوتا جیسا ظاہر ہے اور ایک ترجیح اس معجزہ میں یہ ہے کہ) بلاشبہ اس کتاب میں (معجزہ ہونے کے ساتھ) ایمان لانے والے لوگوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے (رحمت یہ کہ تعلیم احکام کی ہے جو نفع محض ہے اور نصیحت ترغیب وترہیب سے ہے، اور یہ بات دوسرے معجزات میں کب ہوتی، پس ان ترجیحات سے تو اس کو غنیمت سمجھتے، اور ایمان لے آتے، اور اگر اس وضوح دلائل کے بعد بھی ایمان نہ لائیں تو آخری جواب کے طور پر) آپ کہہ دیجئے کہ (خیر بھائی مت مانو) اللہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت کا) گواہ بس ہے اس کو سب چیز کی خبر ہے جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے اور (جب میری رسالت اور اللہ کا علم محیط ثابت ہوا تو) جو لوگ جھوٹی باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ (کی باتوں) کے منکر ہیں (جن میں رسالت بھی داخل ہے) تو وہ لوگ بڑے زیاں کار ہیں (یعنی جب اللہ کے ارشاد سے میری رسالت ثابت ہے تو اس کا انکار کفر باللہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے تو اس کو اس انکار وکفر کی بھی خبر ہے، اور اللہ تعالیٰ کفر پر سزائے خسارہ دیتے ہیں، پس لامحالہ ایسے لوگ خاسر ہوں گے) اور یہ لوگ آپ سے عذاب (واقع ہونے کا) تقاضا کرتے ہیں (اور فوراً عذاب نہ آنے سے آپ کی نبوّت ورسالت میں شبہ وانکار کرتے ہیں)، اور اگر (علم الٰہی میں عذاب آنے کے لئے) میعاد معین نہ ہوتی تو (ان کے تقاضہ کے ساتھ ہی) ان پر عذاب آچکا ہوتا اور (جب وہ میعاد آجائے گی تو) وہ عذاب اُن پر دفعۃً آپہنچے گا، اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی (آگے ان لوگوں کی جہالت کے اظہار کے لئے ان کی جلد بازی کو مکرر ذکر کر کے عذاب کی میعاد معیّن اور اس میں پیش آنے والے عذاب کا ذکر کرتے ہیں کہ) یہ لوگ آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں اور (عذاب کی صورت یہ ہے کہ) اس میں کچھ شک نہیں کہ جہنم ان کافروں کو (چاروں طرف سے) گھیر لے گا جس دن اُن پر عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے نیچے سے گھیر لے گا اور (اس وقت ان سے) حق تعالیٰ فرمائے گا کہ جو کچھ (دنیا میں) کرتے رہے ہو (اب اس کا مزہ) چکھو۔

معارف و مسائل

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ڰ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، یعنی اہل کتاب سے بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو مجادلہ بھی ایسے طریقہ سے کرو جو بہتر ہو مثلاً سخت بات کا جواب نرم الفاظ سے، غصّہ کا جواب بردباری سے، جاہلانہ شور و شغب کا جواب باوقار گفتگو سے، اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، مگر وہ لوگ جنہوں نے تم پر ظلم کیا کہ تمہاری باوقار نرم گفتگو اور دلائلِ واضحہ کے مقابلہ میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا تو وہ اس احسان کے مستحق نہیں رہے، بلکہ ایسے لوگوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جائے تو جائز ہے، اگرچہ اولیٰ اور بہتر اس وقت بھی یہی ہے کہ ان کی بدخوئی کا جواب بدخوئی سے اور ظلم کا جواب ظلم سے نہ دیں۔ بلکہ کج خلقی کے جواب میں خوش خلقی کا اور ظلم کے جواب میں انصاف کا مظاہرہ کریں۔ جیسا کہ دوسری آیاتِ قرآن میں اس کی تصریح ہے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ (النحل) ”یعنی اگر ظلم و جور کا بدلہ تم ان سے برابر سرابر لے لو تو تمہیں اس کا حق ہے، لیکن صبر کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔“

اس آیت میں اہل کتاب سے مجادلہ میں جو ہدایت طریقۂ حسنہ کے ساتھ کرنے کی دی گئی ہے یہی سورۂ نحل میں مشرکین کے متعلق بھی ہے۔ اس جگہ اہل کتاب کی تخصیص اُس کلام کی وجہ سے ہے جو بعد میں آرہا ہے، کہ ہمارے اور تمہارے دین میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں تم غور کرو تو ایمان اور اسلام کے قبول کرنے میں تمہیں کوئی مانع نہ ہونا چاہئے، جیسا کہ ارشاد فرمایا وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ، یعنی تم اہلِ کتاب سے مجادلہ کے وقت ان کو اپنے قریب کرنے کے لئے یہ کہو کہ ہم مسلمان تو اس وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف بواسطہ ہمارے رسول کے بھیجی گئی ہے، اور اس وحی پر بھی جو تمہاری طرف تمہارے پیغمبر کے ذریعہ بھیجی گئی ہے، اس لئے ہم سے مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔

کیا اس آیت میں موجودہ تورات وانجیل کے مضامین کی تصدیق کا حکم ہے

اس آیت میں اہلِ کتاب کی طرف آنے والی کتابوں تورات وانجیل پر مسلمانوں کے ایمان کا تذکرہ جن عنوان سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کتابوں پر اجمالی ایمان رکھتے ہیں بایں معنی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں نازل فرمایا تھا اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ موجودہ تورات وانجیل کے سب مضامین پر ہمارا ایمان ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی بہت تحریفات ہو چکی تھیں اور اس وقت سے اب تک ان میں تحریف کا سلسلہ چل ہی رہا ہے۔ ایمان صرف ان مضامینِ تورات وانجیل پر ہے جو اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئے تھے، تحریف شدہ مضامین اس سے خارج ہیں۔

موجودہ تورات وانجیل کی نہ مطلقاً تصدیق کی جائے نہ مطلقاً تکذیب

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اہلِ کتاب تورات وانجیل کو ان کی اصل زبان عبرانی میں پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کو ان کا ترجمہ عربی زبان میں سناتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ تم اہلِ کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو، بلکہ یوں کہو اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْکُمْ [1] یعنی ہم اجمالاً اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تمہارے انبیاء پر نازل ہوئی ہے، اور جو تفصیلات تم بتلاتے ہو وہ ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد نہیں۔ اس لئے ہم اس کی تصدیق وتکذیب سے اجتناب کرتے ہیں۔

تفسیروں میں جو عام مفسرین نے اہلِ کتاب کی روایات نقل کی ہیں ان کا بھی یہی درجہ ہے۔ اور نقل کرنے کا منشاء بھی صرف اس کی تاریخی حیثیت کو واضح کرنا ہے، احکام حلال وحرام کا ان سے استنباط نہیں کیا جاسکتا، وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ یعنی نزولِ قرآن سے پہلے نہ آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے، نہ کچھ لکھ سکتے تھے بلکہ آپ اُمّی تھے، اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ لکھے پڑھے ہوتے تو اہلِ باطل کے لئے شک وشبہ کی گنجائش نکل آتی کہ یہ الزام لگاتے کہ آپ نے پچھلی کتابیں تورات وانجیل پڑھی ہیں یا نقل کی ہیں۔ آپ جو کچھ قرآن میں فرماتے ہیں وہ انہی پچھلی کتابوں کا اقتباس ہے، کوئی وحی اور نبوّت ورسالت نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا آپ کی بڑی فضیلت اور بڑا معجزہ ہے

حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورسالت پر جس طرح بہت سے واضح اور کھلے ہوئے معجزات ظاہر فرمائے انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو پہلے سے اُمّی رکھا، نہ کچھ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ خود کچھ لکھ سکتے تھے، اور عمر کے چالیس سال اسی حال میں تمام اہلِ مکہ کے سامنے گزرے۔ آپ کا اختلاط اہلِ کتاب سے بھی کبھی نہیں ہوا، کہ ان سے کچھ سُن لیتے۔ کیونکہ مکہ میں اہلِ کتاب تھے ہی نہیں، چالیسؔ سال ہونے پر یکایک آپ کی زبانِ مبارک سے ایسا کلام جاری ہونے لگا جو اپنے مضامین اور معانی کے اعتبار سے بھی معجزہ تھا، اور لفظی فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بھی۔

بعض علماء نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا ابتداء میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا اور اس کی دلیل میں واقعۂ حدیبیہ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ جب معاہدۂ صلح لکھا گیا تو اس میں [2] مِنْ مُّحَمَّدٍ عَبْدِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ اوّل لکھا تھا، اس پر مشرکینِ مکہ نے اعتراض کیا کہ ہم آپ کو رسول مانتے تو یہ

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الإعتصام بالکتاب، باب قول النبی صلی الله علیه وسلم لا تسألوا اهل الکتاب عن شیء ج:۲ ص:۱۰۹۴

[2] ترجمہ: اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے۔

جھگڑا ہی کیوں ہوتا، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' کا لفظ ہم قبول نہیں کریں گے۔ لکھنے والے حضرت علی مرتضیٰؓ تھے، آپ نے ان کو فرمایا کہ یہ لفظ مٹا دو، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ادب سے مجبور ہو کر ایسا کرنے سے انکار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ خود اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ لفظ مٹا کر یہ لکھ دیا، [1] مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ۔

اس روایت میں لکھنے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے، جس سے کچھ حضرات نے استدلال کیا ہے کہ آپ لکھنا جانتے تھے، مگر صحیح بات یہی ہے کہ کسی دوسرے سے لکھوانے کو بھی عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ ''اس نے لکھا''، جیسا کہ محاورات میں عام ہے، اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ اس واقعہ میں بطور معجزہ آپ سے نام مبارک بھی اللہ تعالیٰ نے لکھوا دیا، اس کے علاوہ صرف اپنے نام کے چند حروف لکھ دینے سے کوئی آدمی لکھا پڑھا نہیں کہلا سکتا، اس کو ان پڑھ اور اُمّی ہی کہا جائے گا، جب لکھنے کی عادت نہ ہو، اور بلا دلیل کتابت آپ کی طرف منسوب کرنا آپ کی فضیلت کا اثبات نہیں، غور کریں تو بڑی فضیلت اُمّی ہونے میں ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اے بندو میرے جو یقین لائے ہو میری زمین کشادہ ہے سو مجھ ہی کی بندگی کرو

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

جو جی ہے سو چکھے گا موت پھر ہماری طرف پھر آؤ گے، اور جو لوگ یقین لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور کئے بھلے کام ان کو ہم جگہ دیں گے بہشت میں جھروکے نیچے بہتی ہیں ان کے نہریں

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ط نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۵۸﴾ صلے الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ

سدا رہیں ان میں، خوب ثواب ملا کام والوں کو جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر

[1] ترجمہ: عبداللہ کے بیٹے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے۔

يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا

بھروسہ رکھا، اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں رکھتے اپنی روزی، اللہ روزی دیتا ہے ان کو

وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

اور تم کو بھی، اور وہی ہے سننے والا جاننے والا، اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمان

وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور زمین کو اور کام میں لگایا سورج اور چاند کو تو کہیں اللہ نے، پھر کہاں سے اُلٹ جاتے ہیں،

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اللہ پھیلاتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اپنے بندوں میں اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے بیشک اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ

ہر چیز سے خبردار ہے اور جو تو پوچھے اُن سے کس نے اُتارا آسمان سے پانی پھر زندہ کر دیا اس سے

الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

زمین کو اس کے مرجانے کے بعد تو کہیں اللہ نے تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہے پر بہت لوگ

لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع

نہیں سمجھتے

آسان ترجمۂ قرآن

اے میرے بندو جو ایمان لا چکے ہو! یقین جانو میری زمین بہت وسیع ہے، لہٰذا خالص میری عبادت کرو۔ ﴿۵۶﴾ ہر

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، پھر ہماری ہی طرف تم سب کو واپس لایا جائے گا۔ (۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن کو ہم ضرور جنت کے ایسے بالاخانوں میں آباد کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بہترین اجر ہے ان عمل کرنے والوں کا، (۵۸) جنہوں نے صبر سے کام لیا، اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (۵۹) اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے! اللہ اُنہیں بھی رزق دیتا ہے، اور تمہیں بھی، اور وہی ہے جو ہر بات سنتا، ہر چیز جانتا ہے۔ (۶۰) اور اگر تم اُن سے پوچھو کہ: ''کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور سورج اور چاند کو کام پر لگایا؟'' تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ: ''اللہ!'' پھر آخر یہ لوگ کہاں سے اوندھے چل پڑتے ہیں؟ (۶۱) اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے، رزق میں کشادگی کر دیتا ہے، اور جس کے لئے چاہتا ہے، تنگی کر دیتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا مکمل علم رکھتا ہے۔ (۶۲) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ: ''کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اُس کے ذریعے زمین کے مردہ ہونے کے بعد اُسے زندگی بخشی؟'' تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ: ''اللہ!'' کہو: ''الحمد للہ!'' لیکن ان میں سے اکثر لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ (۶۳)

خلاصۂ تفسیر

اے میرے ایمان دار بندو! (جب یہ لوگ غایتِ عداوت وعناد سے تم کو اقامتِ شرائع واختیارِ دین پر ایذاء پہنچاتے ہیں تو یہاں رہنا کیا ضرور) میری زمین فراخ ہے، سو (اگر یہاں رہ کر عبادت نہیں کر سکتے تو اور کہیں چلے جاؤ اور وہاں جا کر) خالص میری ہی عبادت کرو (کیونکہ یہاں اہلِ شرک کا زور ہے، تو ایسی عبادت جو توحید محض پر مبنی ہو اور شرک سے خالی ہو، یہاں مشکل ہے، البتہ خدا کے ساتھ غیر خدا کی بھی عبادت ہو یہ ممکن ہے مگر وہ عبادت ہی نہیں اور اگر تم کو ہجرت میں احباب واوطان کی مفارقت شاق معلوم ہو تو یہ سمجھ لو کہ ایک نہ ایک روز یہ تو ہونا ہی ہے، کیونکہ) ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا (ضرور) ہے (آخر اس وقت سب چھوٹیں گے اور) پھر تم سب کو ہمارے پاس آنا ہے (اور نافرمان ہو کر آنے میں خوف سزا کا ہے) اور (یہ مفارقت اگر ہماری رضا کے واسطے ہو تو ہمارے پاس پہنچنے کے بعد اس وعدہ کے مستحق ہو جاؤ اور وہ وعدہ یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے (جن پر عمل کرنا بعض اوقات ہجرت پر موقوف ہوتا ہے تو ایسے وقت میں ہجرت بھی کی) ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے، جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور ان نیک) کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے، جنہوں نے (واقع شدہ سختیوں پر جن میں ہجرت کی سختی بھی داخل ہوگئی) صبر کیا، اور (دوسرے ملک یا شہر میں جا کر جو تکلیف کا اور گزارے کی مشکلات کا اندیشہ تھا اس میں) وہ اپنے رَبّ پر توکل کیا کرتے تھے اور (اگر ہجرت میں تم کو یہ وسوسہ ہو کہ پردیس میں کھانے کو کہاں سے ملے گا تو یہ سمجھ لو کہ)

بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے (یعنی جمع نہیں کرتے گو بعضے جمع بھی کرتے ہیں، مگر بہت سے نہیں بھی کرتے) اللہ ہی ان کو (مقدر) روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی (مقدور روزی پہنچاتا ہے خواہ تم کہیں ہو، پھر ایسا وسوسہ مت لاؤ، بلکہ دل قوی کر کے اللہ پر بھروسہ رکھو) اور (وہ بھروسہ کے لائق ہے کیونکہ) وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (اسی طرح دوسری صفات میں کامل ہے اور جو ایسا کامل الصفات ہو وہ ضرور بھروسہ کے قابل ہے) اور (توحید فی الالوہیت کا جو مبنی ہے یعنی توحید فی التخلیق وہ تو ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہے چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ (بھلا) وہ کون ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے، تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے پھر (جب توحید فی التخلیق کو مانتے ہیں تو توحید فی الالوہیت کے بارے میں) کدھر الٹے چلے جارہے ہیں (اور جیسا خالق اللہ ہی ہے اسی طرح) اللہ ہی (رازق بھی ہے چنانچہ) وہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے، بیشک اللہ ہی سب چیز کے حال سے واقف ہے، (جیسی مصلحت دیکھتا ہے ویسی ہی روزی دیتا ہے غرض رازق وہی ٹھہرا، اس لئے رزق کا اندیشہ ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے) اور (جیسا کہ تخلیقِ کائنات میں اللہ کی توحید ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے، اسی طرح کائنات کے باقی رکھنے اور ان کا نظام چلانے میں بھی توحید کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو بعد اس کے کہ خشک (ناقابل نبات) پڑی تھی تروتازہ (قابل نبات) کر دیا تو (جواب میں) وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہی ہے آپ کہئے کہ الحمدللہ (اتنا تو اقرار کیا جس سے توحید فی الالوہیت پر استدلال بھی بدیہی ہے، مگر یہ لوگ مانتے نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں (نہ اس وجہ سے کہ عقل نہیں، بلکہ عقل سے کام نہیں لیتے اور غور نہیں کرتے، اس لئے بدیہی بھی خفی رہتا ہے)۔

معارف ومسائل

شروع سورت سے یہاں تک مسلمانوں کے ساتھ کفار کی عداوت اور توحید و رسالت سے مسلسل انکار اور حق اور اہلِ حق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹوں کا بیان تھا، مذکور الصدر آیات میں مسلمانوں کے لئے ان کے شر سے بچنے اور حق کو شائع کرنے اور حق وانصاف کو دنیا میں قائم کرنے کی ایک تدبیر کا بیان ہے جس کا اصطلاحی نام ہجرت ہے، یعنی وہ وطن اور ملک چھوڑ دینا، جس میں انسان خلافِ حق بولنے اور کرنے پر مجبور کیا جائے۔

ہجرت کے احکام اور اس کی راہ میں پیش آنے والے شکوک وشبہات کا ازالہ

اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے، اس لئے کسی کا یہ عذر

قابلِ سماعت نہیں کہ فلاں شہر یا فلاں ملک میں کفار غالب تھے، اس لئے ہم اللہ کی توحید اور اس کی عبادت سے مجبور رہے۔ ان کو چاہئے کہ اس سرزمین کو جہاں وہ کفر و معصیت پر مجبور کئے جائیں اللہ کے لئے چھوڑ دیں، اور کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں آزادی سے اللہ تعالیٰ کے احکام پر خود بھی عمل کر سکیں، اور دوسروں کو بھی تلقین کر سکیں، اسی کا نام ہجرت ہے۔

وطن سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ جانے میں دو قسم کے خطرات انسان کو عادۃً پیش آیا کرتے ہیں، جو اس کو ہجرت سے روکتے ہیں۔ پہلا خطرہ اپنی جان کا ہے کہ جب اس وطن کو چھوڑ کر کہیں جائیں گے تو یہاں کے کفار اور ظالم لوگ راہ میں حائل ہوں گے، اور مقابلہ و مقاتلہ کے لئے آمادہ ہوں گے۔ نیز راستہ میں ممکن ہے کہ دوسرے کفار سے بھی مقابلہ کرنا پڑے جس میں جان کا خطرہ ہے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں یہ دیا گیا کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر ایک جان چکھنے والی ہے مزہ موت کا، جس سے کسی کو کسی جگہ کسی حال مفر نہیں۔ اس لئے موت سے خوف اور گھبراہٹ مؤمن کا کام نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تو ہر شخص کو ہر حال میں پیش آئے گی۔ اپنی جگہ میں کیسے ہی حفاظت کے سامان کر کے رہے، پھر بھی آئے گی۔ اور مؤمن کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے موت نہیں آسکتی۔ اس لئے اپنی جگہ رہنے یا ہجرت کر کے دوسری جگہ جانے میں موت کا خوف حائل نہ ہونا چاہئے، خصوصاً جبکہ احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کرتے ہوئے موت آجانا دائمی راحتوں اور نعمتوں کا ذریعہ ہے جو ان کو آخرت میں ملیں گی جس کا ذکر بعد کی دو آیتوں میں فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا الآیۃ۔

دوسرا خطرہ ہجرت کی راہ میں یہ پیش آتا ہے کہ دوسرے وطن دوسرے ملک میں جا کر رزق کا کیا سامان ہوگا؟ اپنی جگہ تو کچھ آبائی میراث سے کچھ اپنی کمائی سے آدمی کوئی زمین جائداد یا صنعت و حرفت و تجارت وغیرہ کے سامان کئے رہتا ہے، ہجرت کے وقت یہ سب تو یہیں چھوٹ جائیں گے، آگے گزارہ کس طرح ہوگا؟ اس کا جواب بعد کی تین آیتوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ تم ان حاصل کردہ سامانوں کو رزق کی علت اور کافی سبب قرار دیتے ہو یہ تمہاری بھول ہے، رزق دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے وہ جب چاہتا ہے تو بغیر کسی ظاہری سامان کے بھی رزق پہنچا دیتا ہے، اور وہ نہ چاہے تو سب سامان و اسباب کے ہوتے ہوئے بھی انسان رزق سے محروم ہو سکتا ہے۔ اس کے بیان کے لئے پہلے تو یہ فرمایا: وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ یعنی اس پر غور کرو کہ زمین پر چلنے والے کتنے ہزاروں قسم کے جانور ہیں جو اپنے رزق جمع کرنے اور رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے نہ تحصیل رزق کے اسباب جمع کرنے کی کوئی فکر کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو روزانہ اپنے فضل سے رزق مہیا کرتے ہیں۔ علماء نے فرمایا ہے کہ عام جانور ایسے ہی ہیں۔ ان میں صرف چیونٹی اور چوہا تو ایسے جانور ہیں جو اپنی غذاء کے لئے اپنے بلوں میں جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ چیونٹی سردی کے موسم میں باہر نہیں آتی، اس لئے گرمی کے ایام میں کھانے کا سامان اپنے بل میں جمع کرتی ہے۔ اور مشہور ہے کہ پرندہ جانوروں میں

سے عقعق (کوّا) بھی اپنی غذا اپنے گھونسلہ میں جمع کرتا ہے مگر وہ رکھ کر بھول جاتا ہے۔ بہرحال دنیا کے تمام جانور جن کی انواع واصناف کا شمار بھی انسان سے مشکل ہے، وہ بیشتر وہی ہیں جو آج اپنی غذاء حاصل کرنے کے بعد کل کے لئے نہ غذاء مہیا کرتے ہیں نہ اس کے اسباب ان کے پاس ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ یہ پرندے جانور صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں، اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔ نہ اُن کی کوئی کھیتی باڑی ہے نہ کوئی جائداد وزمین، نہ یہ کسی کارخانے یا دفتر کے ملازم ہیں جہاں سے اپنا رزق حاصل کریں۔ خدا تعالیٰ کی کھلی زمین میں نکلتے ہیں اور سب کو پیٹ بھرائی رزق ملتا ہے۔ اور یہ ایک دن کا معاملہ نہیں، جب تک وہ زندہ ہیں یہی سلسلہ جاری ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں رزق کا اصلی ذریعہ بتلایا ہے جو حق تعالیٰ کی عطا ہے، اور فرمایا ہے کہ خود ان منکروں کافروں سے سوال کرو کہ آسمان زمین کس نے پیدا کئے؟ اور شمس وقمر کس کے تابعِ فرمان چل رہے ہیں؟ بارش کون برساتا ہے؟ پھر اس بارش کے ذریعہ زمین سے نباتات کون اُگاتا ہے؟ تو مشرکین بھی اس کا اقرار کریں گے کہ یہ سب کام ایک ذات حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ تو ان سے کہئے کہ پھر تم اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا پاٹ اور ان کو اپنا کارساز کیسے سمجھتے ہو۔ اگلی آیات وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ سے آخر رکوع تک اسی کا بیان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت سے روکنے والی دوسری فکر معاش کی ہے، وہ بھی انسان کی بھول ہے۔ معاش کا مہیا کرنا اس کے یا اس کے جمع کردہ اسباب وسامان کے قبضہ میں نہیں، وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کی عطا ہے۔ اسی نے اس وطن میں یہ سامان جمع فرمادیئے تھے وہ دوسری جگہ بھی سامانِ معاش دے سکتا ہے۔ اور بغیر کسی سامان کے بھی ضروریات معاش فراہم کرسکتا ہے۔ اس لئے یہ دوسرا خطرہ بھی ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے۔

ہجرت کب فرض یا واجب ہوتی ہے؟

ہجرت کے معنی اور تعریف اور اس کے فضائل وبرکات سورۂ نساء کی آیات نمبر ۹۷ تا ۱۰۰ میں اور شرعی احکام میں تبدیلی اسی سورت کی آیت نمبر ۸۹ کے تحت میں معارف القرآن کی جلد دوم صفحہ: ۵۹۱ تا ۵۹۶ اور کچھ صفحہ: ۵۷۶ میں بیان ہوچکے ہیں، ایک مضمون وہاں بیان کرنے سے رہ گیا تھا وہ یہاں لکھا جاتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے بامرِ الٰہی مکہ معظّمہ سے ہجرت فرمائی، اور سب مسلمانوں کو بشرطِ قدرت ہجرت کا حکم فرمایا اس وقت مکہ معظّمہ سے ہجرت کرنا فرضِ عین تھا۔ جس سے کوئی مرد وعورت مستثنیٰ نہیں تھا، بجز ان لوگوں کے جو ہجرت پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔

اور اس زمانے میں ہجرت صرف فرض ہی نہیں، بلکہ مسلمان ہونے کی علامت اور شرط بھی سمجھی جاتی تھی، جو باوجود

قدرت کے ہجرت نہ کرے، اس کو مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا تھا جو کفار کے ساتھ ہوتا ہے، جس کا بیان سورۂ نساء کی آیت نمبر ۸۹ میں ہے، [۱] حَتّٰی یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ - اس وقت ہجرت کا مقام اسلام میں وہ تھا جو کلمۂ شہادت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ہے، کہ یہ شہادت خود بھی فرض ہے اور مسلمان ہونے کی شرط اور علامت بھی کہ جو شخص باوجود قدرت کے زبان سے ایمان کا اقرار اور کلمۂ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت نہ دے اگر چہ دل میں یقین اور تصدیق رکھتا ہو وہ مسلمان نہیں سمجھا جاتا۔ عاجز جس کو اس کلمہ کے بولنے پر قدرت نہ ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کو ہجرت پر قدرت نہ تھی وہ مستثنیٰ سمجھے گئے جس کا ذکر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۸ [۲] اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ میں آیا ہے، اور جو لوگ باوجود ہجرت پر قادر ہونے کے مکہ میں مقیم رہے، ان کے لئے جہنم کی سخت وعید آیت نمبر ۹۷ [۳] اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ (اِلٰی) فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ میں مذکور ہے۔

جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو ہجرت کا یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا۔ کیونکہ اس وقت مکہ خود دار الاسلام بن گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حکم جاری فرمادیا: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، [۴] یعنی فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں، مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فرض ہونا پھر منسوخ ہونا قرآن وسنت کی نصوص سے ثابت ہوگیا، جو ایک واقعہ جزئیہ تھا۔ فقہاء امّت نے اس واقعہ سے یہ مسائل مستنبط کئے:-

مسئلہ:- جس شہر یا ملک میں انسان کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو، وہ کفر وشرک یا احکامِ شرعیہ کی خلاف ورزی پر مجبور ہو وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسرے شہر یا ملک میں جہاں دین پر عمل کی آزادی ہو چلا جانا بشرطیکہ قدرت ہو واجب ہے، البتہ جس کو سفر پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہو جہاں آزادی سے دین پر عمل کر سکے وہ شرعاً معذور ہے۔

مسئلہ:- جس دار الکفر میں عام احکامِ دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض وواجب تو نہیں، مگر مستحب بہرحال ہے اور اس میں دار الکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی اعلاناً ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر چہ وہاں کے حکمران کے مسلمان ہونے کی بناء پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو۔

یہ تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں تحریر فرمائی ہے [۵] اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں۔ اور مسند احمد کی ایک روایت جو حضرت ابو یحیٰی مولیٰ زبیر ابن عوامؓ سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ

---

[۱] ترجمہ: جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ [۲] ترجمہ: لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر نہ ہوں۔

[۳] ترجمہ: بے شک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے اپنے کو گنہگار کر رکھا تھا تو وہ اُن سے کہتے ہیں کہ تم کس کام میں تھے وہ کہتے ہیں ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے وہ کہتے ہیں کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترکِ وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہئے تھا سو ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور جانے کی وہ بُری جگہ ہے۔

[۴] صحیح البخاری، کتاب الجهاد باب لا هجرة بعد الفتح، ج:۱ ص:۴۳۳ [۵] فتح الباری، کتاب الجهاد، باب لا هجرة بعد الفتح۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْبِلَادُ بِلَادُ اللّٰہِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللّٰہِ حَیْثُمَا اَصَبْتَ خَیْرًا فَاَقِمْ۔ [1] (ابن کثیر)

”یعنی سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہوں وہاں اقامت کرو۔“

اور ابن جریرؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیرؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس شہر میں معاصی اور فواحش عام ہوں اس کو چھوڑ دو۔ اور امام تفسیر حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ جب تمہیں کسی شہر میں معاصی کے لئے مجبور کیا جائے تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہو۔ (ابن جریر طبری فی التفسیر) [2]

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ

اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے اور پچھلا گھر جو ہے

لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ

وقف لازم

سو وہی ہے زندہ رہنا اگر ان کو سمجھ ہوتی، پھر جب سوار ہوئے کشتی میں پکارنے لگے اللہ کو

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۶۵ لا

خالص اسی پر رکھ کر اعتقاد پھر جب بچالایا ان کو زمین کی طرف اسی وقت لگے شریک بنانے،

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ڔ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ وقفة فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۶۶ اَوَلَمْ يَرَوْا

تاکہ مکرتے رہیں ہمارے دیئے ہوئے سے اور مزے اڑاتے رہیں، سو عنقریب جان لیں گے، کیا نہیں دیکھتے

اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ

کہ ہم نے رکھ دی ہے پناہ کی جگہ امن کی، اور لوگ اُچکے جاتے ہیں ان کے آس پاس سے کیا جھوٹ پر

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۲ ص:۲۹۰، ومسند احمد، مسند الزبیر بن عویمر (رضی اللہ عنہ) رقم الحدیث:۱۴۳۶

[2] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآیة ج:۲۰ ص:۵۶

يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

یقین رکھتے ہیں اور اللہ کا احسان نہیں مانتے، اور اس سے زیادہ بے انصاف کون جو باندھے اللہ پر

كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى

جھوٹ یا جھٹلائے سچی بات کو جب اس تک پہنچے، کیا دوزخ میں بسنے کی جگہ نہیں

لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ

منکروں کے لئے، اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سجھادیں گے ان کو اپنی راہیں، اور بیشک اللہ

لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٦٩﴾ ع

ساتھ ہے نیکی والوں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ دُنیوی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ بھی نہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ دارِ آخرت ہی اصل زندگی ہے، اگر یہ لوگ جانتے ہوتے! ﴿۶۴﴾ چنانچہ جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو اس طرح پکارتے ہیں کہ ان کا اعتقاد خالص اُسی پر ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اُنہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔ ﴿۶۵﴾ کرلیں یہ لوگ ناشکری اُس نعمت کی جو ہم نے اُن کو دی ہے، اور اُڑا لیں کچھ مزے! پھر وہ وقت دُور نہیں جب اِنہیں سب پتہ چل جائے گا۔ ﴿۶۶﴾ بھلا کیا اِنہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے (ان کے شہر کو) ایک پُرامن حرم بنا دیا ہے، جبکہ ان کے اِردگرد لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُنہیں اُچک لیا جاتا ہے۔ کیا پھر بھی یہ باطل پر اِیمان لاتے ہیں، اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟ ﴿۶۷﴾ اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے، یا جب اُس کے پاس حق کی بات پہنچے تو وہ اُسے جھٹلائے؟ کیا جہنم میں (ایسے) کافروں کا ٹھکانا نہیں ہوگا؟ ﴿۶۸﴾ اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم اُنہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے، اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ﴿۶۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وجہ ان کے غور نہ کرنے کی انہماک ہے مشاغلِ دنیا میں حالانکہ) یہ دنیوی زندگی (جس کے یہ تمام تر اشغال ہیں فی نفسہٖ) بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالمِ آخرت (کی) ہے (چنانچہ دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی ہونے سے یہ دونوں مضمون ظاہر ہیں پس فانی میں اس قدر انہماک کہ باقی کو بھول میں ڈال کر اس سے محروم ہوجائے خود یہ بے عقلی کی بات ہے) اگر ان کو اس کا (کافی) علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے (کہ فانی میں منہمک ہوکر باقی کو بھلا دیتے اور اس کے لئے سامان نہ کرتے بلکہ یہ لوگ دلائل میں غور کرتے اور ایمان لے آتے جیسا کہ خود ان کو یہ تسلیم ہے کہ تخلیقِ کائنات اور اس کے باقی رکھنے میں خدا کا کوئی شریک نہیں) پھر (جیسا کہ ان کے اس اقرار وتسلیم کا مقتضی ہے کہ خدائی اور عبادت میں اسی کو منفرد مانتے اور اس کا بھی کبھی اظہار واقرار کرتے چنانچہ) جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور وہ کشتی زیر وزبر ہونے لگتی ہے) تو (اس وقت) خالص اعتقاد کرکے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ [1] لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ (یونس) اَیِ الْمُوَحِّدِیْنَ جس میں خدائی اختیارات اور معبودیت میں بھی توحید کا اقرار ہے، مگر یہ حالت بوجہ انہماک فی الدنیا کے دیرپا نہیں ہوتی، چنانچہ اس وقت تو سب قول واقرار توحید کے ہوچکتے ہیں مگر) پھر جب ان کو (اس آفت سے) نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو نعمت (نجات وغیرہ) ان کو دی ہے۔ اس کی ناقدری کرتے ہیں اور یہ لوگ (عقائد شرکیہ واعمالِ فسقیہ میں ہوائے نفسانی کا اتباع کرکے) چندے اور حظ حاصل کرلیں پھر قریب ہی ان کو سب خبر ہوئی جاتی ہے، (اور اب اس انہماک فی الدنیا کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا، سوایک مانع تو ان کو توحید سے یہ انہماک ہے۔ اور دوسرا ایک اور نامعقول حیلۂ مانعہ نکالا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ [2] اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ (القصص: ۵۷) یعنی اگر ہم مسلمان ہوجائیں تو ہمیں عرب کے لوگ ماردیں گے۔ حالانکہ مشاہدہ سے ان کو خود لغویت اس کی معلوم ہوسکتی ہے) کیا ان لوگوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم نے (ان کے شہر مکہ کو) امن والا حرم بنایا ہے اور ان کے گردوپیش (کے مقامات) میں (جو خارج حرم ہیں) لوگوں کو (مار دھاڑ کر ان کے گھروں سے) نکالا جارہا ہے (بخلاف ان کے کہ امن سے بیٹھے ہیں اور یہ بات خود محسوسات میں ہے تو بدیہیات سے گزر کر محسوسات میں بھی خلاف کرتے اور خوفِ ہلاکت کو ایمان لانے میں عذر مانع بتاتے ہیں اور) پھر (وضوحِ حق کے بعد اس حماقت اور ضد کا) کیا (ٹھکانا ہے کہ) یہ لوگ جھوٹے معبود (وں) پر تو

---

[1] ترجمہ: اگر آپ ہم کو اس سے بچا لیں تو ہم ضرور حق شناس بن جائیں۔

[2] ترجمہ: اگر ہم آپ کے ساتھ ہوکر ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے نکال دیئے جائیں۔

ایمان لاتے ہیں (جس پر ایمان لانے کا کوئی مقتضی نہیں اور موانع بہت سے ہیں) اور اللہ (جس پر ایمان لانے کے بہت سے مقتضی اور دلائل صحیحہ ہیں اس کی) نعمتوں کی ناشکری (یعنی اللہ کے ساتھ شرک) کرتے ہیں (کیونکہ شرک سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں کہ نعمتِ تخلیق وترزیق وابقاء وتدبیر وغیرہ تو وہ عطا فرمائے اور عبادت جو کہ ان نعمتوں کا شکر ہے دوسرے کے لئے تجویز کی جائے) اور (واقعی بات یہ ہے کہ) اس شخص سے زیادہ کون ناانصاف ہوگا جو (بلادلیل) اللہ پر جھوٹ افتراء کرے (کہ وہ شریک رکھتا ہے) اور جب سچی بات اس کے پاس (دلیل کے ساتھ) پہنچے وہ اس کو جھٹلا دے (بے انصافی ظاہر ہے کہ بلادلیل بات کی تو تصدیق کرے اور دلیل والی بات کی تکذیب) کیا ایسے کافروں کا (جو اس قدر ناانصافی کریں) جہنم میں ٹھکانا نہ ہوگا (یعنی ضرور ہے۔ کیونکہ سزا مناسب جرم کے ہوتی ہے۔ پس جیسا جرم عظیم ہے ایسی ہی سزا بھی عظیم ہے۔ اوپر اُن کا حال تھا جو اہل کفر اور نفس پرست ہوں) اور (اب ان کے اضداد کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب وثواب یعنی جنت) کے راستے ضرور دکھادیں گے (جس سے وہ جنت میں جا پہنچیں گے کقوله تعالىٰ [۱] وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا الآية (الاعراف: ۴۳)) اور بیشک اللہ تعالیٰ (کی رضا ورحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں کفار ومشرکین کا یہ حال مذکور ہوا ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش، شمس وقمر کا نظام، بارش نازل کرنے اور اس سے نباتات اُگانے کا سارا نظام یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہونے پر یقین رکھتے ہیں، اس میں کسی بُت وغیرہ کی شرکت نہیں مانتے، مگر پھر بھی وہ خدائی میں بتوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ (یعنی ان میں بکثرت لوگ وہ ہیں جو سمجھتے نہیں)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ مجنون دیوانے تو نہیں ہوشیار سمجھ دار ہیں، دنیا کے بڑے بڑے کام خوب کرتے ہیں پھر ان کے بے سمجھ ہوجانے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں یہ دیا گیا کہ ان کو دنیا اور اس کی مادّی اور فانی لذات وخواہشات کی محبت نے آخرت اور انجام میں غور وفکر کرنے سے اندھا اور بے سمجھ بنادیا ہے، حالانکہ یہ دنیا کی زندگی لہو ولعب یعنی وقت گزاری کا مشغلہ اور کھیل کے سوا کچھ نہیں، اور اصلی زندگی جو جاودانی ہے وہ آخرت کی زندگی ہے۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ اس جگہ حَيَوَانُ کا لفظ بمعنی حیات مصدری معنی میں ہے۔ (قرطبی) [۲]

---

[۱] ترجمہ: اور وہ لوگ کہیں گے اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا۔ [۲] تفسیر القرطبی ج: ۱۳ ص: ۳۶۲ تحت هذه الآية۔

اس میں حیاتِ دنیا کولہو ولعب فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے کھیلوں کا کوئی ثبات وقرار نہیں اور کوئی بڑا مقصد ان سے حل نہیں ہوتا، تھوڑی دیر کے بعد سب تماشہ ختم ہو جاتا ہے یہی حال اس دنیا کا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان مشرکین کا ایک اور بُرا حال یہ بتلایا گیا کہ جیسے یہ لوگ تخلیقِ کائنات میں اللہ تعالیٰ کو منفرد ماننے کے باوجود اس جہالت کے شکار ہیں کہ بتوں کو خدائی کا ساجھی بتاتے ہیں۔ اس سے زیادہ عجب یہ ہے کہ جب ان پر کوئی بڑی مصیبت آ پڑتی ہے تو اس مصیبت کے وقت بھی ان کو یہ یقین اور اقرار ہوتا ہے کہ اس میں کوئی بت ہمارا امدادگار نہیں بن سکتا۔ مصیبت سے رہائی صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ اس کے لئے بطور مثال کے فرمایا کہ یہ لوگ جب دریا کے سفر میں ہوتے ہیں اور ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے، تو اس خطرہ کو ٹالنے کے لئے کسی بت کو پکارنے کے لئے بجائے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کے مضطر اور بیقرار ہونے اور وقتی طور پر دنیا کے سارے سہاروں سے منقطع ہونے کی بناء پر ان کی دُعا قبول کر کے ان کو دُنیا کے مہلکہ سے نجات دے دیتا ہے۔ مگر یہ ظالم جب خشکی پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں تو پھر بتوں کو خدا کا شریک کہنے لگتے ہیں۔ آیت فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ کا یہی مطلب ہے۔

فائدہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر بھی جس وقت اپنے آپ کو بے سہارا جان کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے اور اس وقت یہ یقین کرتا ہے کہ خدا کے سوا مجھے اس مصیبت سے کوئی نہیں چھڑا سکتا، تو اللہ تعالیٰ کافر کی بھی دعاء قبول فرما لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ مضطر ہے اور اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دعاء قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ (قرطبی وغیرہ) [1]

اور ایک آیت میں جو یہ ارشاد آیا ہے وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ (المؤمن) یعنی ''کافروں کی دُعاء نا قابلِ قبول ہے''، یہ حال آخرت کا ہے، کہ وہاں کافر عذاب سے رہائی کی دعاء کریں گے تو قبول نہ ہوگی۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا الآیۃ اوپر کی آیات میں مشرکینِ مکہ کی جاہلانہ حرکتوں کا ذکر تھا کہ سب چیزوں کا خالق ومالک خدا تعالیٰ کو یقین کرنے کے باوجود پتھر کے خود تراشیدہ بتوں کو اس کی خدائی کا شریک بتاتے ہیں، اور صرف تخلیقِ کائنات ہی کا خدا تعالیٰ کو مالک نہیں سمجھتے بلکہ آڑے وقت میں مصیبت سے نجات دینا بھی اسی کے اختیار میں جانتے ہیں مگر نجات کے بعد پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے کفر وشرک کا ایک عذر بعض مشرکینِ مکہ کی طرف سے یہ بھی پیش کیا جاتا تھا کہ ہم آپ کے دین کو تو حق ودرست مانتے ہیں لیکن اس کی پیروی کرنے اور مسلمان ہو جانے میں ہم اپنی جانوں کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ سارا عرب اسلام کے خلاف ہے، ہم اگر مسلمان ہو گئے تو باقی عرب ہمیں اُچک لے جائیں گے اور مار ڈالیں گے۔ (کما روی عن ابن عباسؓ، روح) [2]

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۲۲۳

[2] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۱۵ ص:۳۱۶

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا یہ عذر بھی لغو ہے۔ کیونکہ اہلِ مکہ کو تو حق تعالیٰ نے بیت اللہ کی وجہ سے وہ شرف اور بزرگی دی ہے جو دنیا میں کسی مقام کے لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔ ہم نے مکہ کی پوری زمین کو حرم بنا دیا ہے۔ عرب کے باشندے مؤمن ہوں یا کافر سب کے سب حرم کا احترام کرتے ہیں، اس میں قتل وقتال کو حرام سمجھتے ہیں۔ حرم میں انسان تو انسان وہاں کے شکار کو قتل کرنا اور وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی کوئی جائز نہیں سمجھتا، باہر کا کوئی آدمی حرم میں داخل ہو جائے تو وہ بھی قتل سے مامون ہو جاتا ہے۔ تو مکہ مکرمہ کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے سے اپنی جانوں کا خطرہ بتلانا بھی ایک عذر لنگ ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا　جہاد کے اصلی معنی دین میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے ہیں، اس میں وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو کفار و فجار کی طرف سے پیش آتی ہیں، کفار سے جنگ ومقاتلہ اس کی اعلیٰ فرد ہے، اور وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو اپنے نفس اور شیطان کی طرف سے پیش آتی ہیں۔

جہاد کی ان دونوں قسموں پر اس آیت میں یہ وعدہ ہے کہ ہم جہاد کرنے والوں کو اپنے راستوں کو ہدایت کر دیتے ہیں۔ یعنی جن مواقع میں خیر وشر یا حق وباطل یا نفع وضرر میں التباس ہوتا ہے عقلمند انسان سوچتا ہے کہ کس راہ کو اختیار کروں، ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو صحیح، سیدھی، بے خطر راہ بتا دیتے ہیں۔ یعنی ان کے قلوب کو اُسی طرف پھیر دیتے ہیں جس میں ان کے لئے خیر وبرکت ہو۔

علم پر عمل کرنے سے علم میں زیادتی

اور حضرت ابوالدرداءؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جو علم لوگوں کو دیا گیا ہے جو لوگ اپنے علم پر عمل کرنے میں جہاد کرتے ہیں ہم ان پر دوسرے علوم بھی منکشف کر دیتے ہیں جو اب تک حاصل نہیں۔ اور فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ جو لوگ طلبِ علم میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لئے عمل بھی آسان کر دیتے ہیں۔ (مظہری) [1] واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

تمّت سُورة العنکبُوت

[1] تفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۲۱۶

سُوْرَةُ الرُّوْمِ

أياتها ٦٠ ۳۰ سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ ۸۴ رکوعاتها ٦

سورۂ روم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ

مغلوب ہوگئے ہیں رومی، ملتے ہوئے ملک میں اور وہ اس مغلوب ہونے کے بعد

سَيَغْلِبُوْنَ ﴿٣﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ

عنقریب غالب ہوں گے چند برسوں میں، اللہ کے ہاتھ ہیں سب کام پہلے اور پچھلے

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٤﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اور اس دن خوش ہوں گے مسلمان، اللہ کی مدد سے مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

اور وہی زبردست رحم والا، اللہ کا وعدہ ہوچکا، خلاف نہ کرے گا اللہ اپنا وعدہ لیکن بہت

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ

لوگ نہیں جانتے، جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو اور وہ لوگ

عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٧﴾

آخرت کی خبر نہیں رکھتے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

الٓمّٓ ① رُومی لوگ قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے ② و ③ چند ہی سالوں میں! سارا اختیار اللہ ہی کا ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اُس دن ایمان والے اللہ کی دی ہوئی فتح سے خوش ہوں گے۔ وہ جس کو چاہتا ہے، فتح دیتا ہے، اور وہی صاحبِ اقتدار بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔ ④ و ⑤ یہ اللہ کا کیا ہوا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ⑥ وہ دُنیوی زندگی کے صرف ظاہری رُخ کو جانتے ہیں، اور آخرت کے بارے میں اُن کا حال یہ ہے کہ وہ اُس سے بالکل غافل ہیں۔ ⑦

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ، (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) اہلِ رُوم ایک قریب کے موقع میں (یعنی ارضِ رُوم کے ایسے مقام میں جو بہ نسبت فارس کے عرب سے قریب تر ہے، مراد اس سے اذرعات و بصریٰ ہے، جو ملکِ شام میں دو شہر ہیں۔ کذا فی القاموس، اور حکومتِ روم کے تحت میں ہونے سے ارضِ رُوم میں داخل ہیں۔ اس موقع پر اہلِ روم اہلِ فارس کے مقابلہ میں) مغلوب ہوگئے (جس سے مشرکین خوش ہوئے) اور وہ (رومی) اپنے (اس) مغلوب ہونے کے بعد عنقریب

(اہل فارس پر دوسرے مقابلہ میں) تین سال سے لے کر نو سال کے اندر اندر غالب آجائیں گے (اور یہ مغلوب اور غالب ہونا سب خدا کی طرف سے ہے، کیونکہ مغلوب ہونے سے) پہلے بھی اختیار اللہ ہی کو تھا (جس سے مغلوب کر دیا تھا) اور (مغلوب ہونے سے) پیچھے بھی (اللہ ہی کو اختیار ہے جس سے غالب کر دے گا) اور اس روز (یعنی جب اہلِ روم غالب آئیں گے) مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے (اس امداد سے یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے قول میں سچا اور غالب فرما دے گا۔ کیونکہ اس پیشین گوئی کو مسلمانوں نے کفار پر ظاہر کیا اور انہوں نے تکذیب کی تو اس کے وقوع سے مسلمانوں کی جیت ہو جائے گی۔ اور یا یہ مراد ہے کہ مسلمانوں کو مقاتلہ میں بھی غالب کر دے گا۔ چنانچہ وہ وقت جنگِ بدر میں منصور ہونے کا تھا، اور ہر حال میں نصرت کا محل اہلِ اسلام ہی ہیں، اور مسلمانوں کی حالت ظاہری مغلوبیت کی دیکھ کر یہ بات مستبعد نہ سمجھی جائے کہ یہ مغلوب مسلمان مقابلہ کے وقت کفار پر غالب آجائیں گے، کیونکہ نصرت اللہ کے قبضے میں ہے) وہ جس کو چاہے غالب کر دیتا ہے اور وہ زبردست ہے (کفار کو جب چاہے قولاً یا فعلاً مغلوب کرا دے اور) رحیم (بھی) ہے (مسلمانوں کو جب چاہے غالب کر دے) اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے (اور) اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں فرماتا (اس واسطے یہ پیشین گوئی ضرور واقع ہوگی) ولیکن اکثر لوگ (اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو) نہیں جانتے (بلکہ صرف ظاہری اسباب کو دیکھ کر ان اسباب پر حکم لگا دیتے ہیں، اس لئے اس پیشین گوئی میں استبعاد کرتے ہیں، حالانکہ مسبّب الاسباب اور مالکِ اسباب حق تعالیٰ ہے، اس کو اسباب بدلنا بھی آسان ہے اور اسباب کے خلاف مسبّب کا واقع کرنا بھی آسان۔

اور جس طرح پیشین گوئی کے واقع ہونے سے پہلے اسباب ظاہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اسی طرح پیشین گوئی کو پورا ہوتا ہوا دیکھ کر بھی اس کو ایک اتفاقی امر قرار دیتے ہیں، وعدۂ الٰہیہ کا ظہور نہیں سمجھتے اس لئے لفظ لَا یَعْلَمُوْنَ میں یہ دونوں چیزیں آگئیں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ اور نبوّت سے غافل و جاہل رہنا اس سبب سے ہے کہ) یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کی ظاہر (حالت) کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے (بالکل ہی) بے خبر ہیں (کہ وہاں کیا ہوگا، اس لئے ان کو دنیا میں نہ اسباب عذاب سے بچنے کی فکر ہے نہ اسباب نجات ایمان اور عمل صالح کی تلاش ہے)۔

معارف ومسائل

قصہ نزولِ سورت، رُوم اور فارس کی جنگ

سورۂ عنکبوت اس آیت پر ختم ہوئی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے راستہ میں جہاد و مجاہدہ کرنے والوں کے لئے

اپنے راستے کھول دینے اور ان کے لئے مقاصد میں کامیابی کی بشارت دی تھی۔ سورۂ رُوم کی ابتداء جس قصہ سے ہوئی ہے وہ اسی نصرتِ الٰہیہ کا ایک مظہر ہے، اس سورت میں جو واقعہ روم اور فارس کی جنگ کا مذکور ہے یہ دونوں کفار ہی تھے، ان میں سے کسی کی فتح کسی کی شکست بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں، مگر ان دونوں کفار میں اہلِ فارس مشرکین آتش پرست تھے اور روم ونصاریٰ اہلِ کتاب۔ اور ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے کفار میں اہلِ کتاب مسلمانوں سے نسبۃً قریب ہیں۔ کیونکہ بہت سے اصولِ دین آخرت پر ایمان، رسالت اور وحی پر ایمان، ان کے ساتھ قدرِ مشترک ہے۔ اسی قدرِ مشترک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مکتوب میں کام لیا جو روم کے بادشاہ کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بھیجا تھا کہ [1] تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الآیۃ (آل عمران: ۶۴)، اہلِ کتاب کے ساتھ مسلمانوں کا ایک گونہ قرب ہی اس کا سبب بنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مکہ مکرمہ کے زمانہ میں فارس نے روم پر حملہ کیا۔ حافظ ابن حجر وغیرہ کے قول کے مطابق ان کی یہ جنگ ملکِ شام کے مقام اذرعات اور بصریٰ کے درمیان واقع ہوئی۔ اس جنگ کے دَوران میں مشرکینِ مکّہ یہ چاہتے تھے کہ فارس غالب آجائے، کیونکہ وہ بھی شرک وبت پرستی میں ان کے شریک تھے۔ اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ روم غالب آئیں، کیونکہ وہ دین ومذہب کے اعتبار سے اسلام کے قریب تھے۔ مگر ہوا یہ کہ اس وقت فارس روم پر غالب آگئے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ بھی فتح کرلیا، اور وہاں اپنی عبادت کے لئے ایک آتش کدہ تعمیر کیا۔ اور یہ فتح کسریٰ پرویز کی آخری فتح تھی، اس کے بعد اس کا زوال شروع ہوا، اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ (از قرطبی) [2]

اس واقعہ پر مشرکینِ مکہ نے خوشیاں منائیں اور مسلمانوں کو عار دلائی کہ تم جس کو چاہتے تھے وہ ہار گیا، اور جیسا کہ روم اہلِ کتاب کو بمقابلۂ فارس شکست ہوئی ہمارے مقابلہ میں تم کو شکست ہوگی۔ اس سے مسلمانوں کو رنج ہوا۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم) [3]

قرآن میں سورۂ روم کی ابتدائی آیتیں اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جن میں یہ پیشین گوئی اور بشارت دی گئی ہے کہ چند سال بعد پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یہ آیات سُنیں تو مکہ کے اطراف اور مشرکین کے مجامع اور بازار میں جاکر اس کا اعلان کیا کہ تمہارے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ چند سال میں پھر رُوم فارس پر غالب آجائیں گے۔ مشرکینِ مکہ میں

---

[1] ترجمہ: آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔

[2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱۴ ص:۵،۴

[3] تفسیر الطبری لابن جریر ج:۲۰ ص:۶۸

سے اُبیّ بن خلف نے مقابلہ کیا، اور کہنے لگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، ایسا نہیں ہوسکتا۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ خدا کے دشمن تو ہی جھوٹا ہے، اور میں تو اس واقعہ پر شرط کرنے کو تیار ہوں کہ اگر تین سال کے اندر روم غالب نہ آگئے تو دس اونٹنیاں میں تمہیں دوں گا اور وہ غالب آگئے تو دس اونٹنیاں تمہیں دینا پڑیں گی (یہ معاملہ قمار کا تھا مگر اس وقت قمار حرام نہیں تھا) یہ کہہ کر صدیق اکبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تو تین سال کی مدت متعین نہیں کی تھی۔ کیونکہ قرآن میں اس کے لئے لفظ بِضْعِ سِنِيْنَ مذکور ہے، جس کا اطلاق تین سے نو سال تک ہوسکتا ہے، تم جاؤ اور جس سے یہ معاہدہ ہوا ہے اس سے کہدو کہ میں دس اونٹنیوں کے بجائے سو کی شرط کرتا ہوں، مگر مدّت تین سال کے بجائے نو سال اور بعض روایات کی رُو سے سات سال) مقرر کرتا ہوں۔ صدیق اکبرؓ نے حکم کی تعمیل کی، اور اُبیّ بن خلف اس نئے معاہدہ پر راضی ہوگیا۔ (ابن جریر بسندہ عن مجاھد وروی القصّة الترمذی عن ابی سعید الخدری ودینار بن مکرم الاسلمی بتغیرِ یسیر)[۱]

روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے پانچ سال پہلے پیش آیا ہے اور پورے سات سال ہونے پر غزوۂ بدر کے وقت روم دوبارہ فارس پر غالب آگئے اس وقت اُبیّ بن خلف مر چکا تھا۔ صدیق اکبرؓ نے اس کے وارثوں سے اپنی شرط کے مطابق سو اونٹنیوں کا مطالبہ کیا، انہوں نے اونٹنیاں دے دیں۔

بعض روایات میں ہے کہ ہجرت سے پہلے اُبیّ بن خلف کو جب اندیشہ ہوا کہ ابوبکرؓ بھی شاید ہجرت کر کے چلے جائیں تو اس نے کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک آپ کوئی کفیل پیش نہ کریں، کہ میعاد معیّن تک روم غالب نہ آئے تو سو اونٹنیاں وہ مجھے دیدے گا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے صاحبزادے عبدالرحمٰن کو اس کا کفیل بنادیا تھا۔

جب شرط کے مطابق صدیق اکبرؓ جیت گئے اور سو اونٹنیاں اُن کو ہاتھ آئیں تو وہ سب لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ ان اونٹنیوں کو صدقہ کردو۔ اور ابویعلی، ابن عساکر میں حضرت براء بن عازب کی روایت سے اس میں یہ الفاظ منقول ہیں ھٰذَا السُّحْتُ تَصَدَّقْ بِہٖ، یہ تو حرام ہے اس کو صدقہ کردو۔ (روح المعانی)[۲]

مسئلہ قمار

قمار یعنی جُوا از روئے نصوص قرآن حرام قطعی ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد جس وقت شراب حرام کی گئی اسی کے

---

[۱] تفسیر الطبری تحت ھذہ الآیة ج:۲۰ ص:۷۰، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الروم ج:۲ ص:۱۵۴

[۲] تفسیر روح المعانی تحت ھذہ الآیة ج:۱۵ ص:۳۲۴

ساتھ قمار بھی حرام کر دیا گیا، اور اس کو شیطانی عمل قرار دیا۔ آیت [1] اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (المائدۃ:۹۰) میں میسر اور ازلام جُوے (قمار) ہی کی صورتیں ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور یہ دو طرفہ لین دین اور ہار جیت کی شرط جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اُبیّ بن خلف کے ساتھ ٹھہرائی یہ بھی ایک قسم کا جُوا اور قمار ہی تھا، مگر یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے جب قمار حرام نہیں تھا۔ اس لئے اس واقعہ میں جب یہ قمار کا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو کوئی مال حرام نہیں تھا۔

اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے صدقہ کر دینے کا حکم کیوں فرمایا، خصوصاً دوسری روایت میں جو اس کے متعلق لفظ سُحت آیا ہے جس کے مشہور معنی حرام کے ہیں یہ کیسے درست ہوگا؟ اس کا جواب حضرات فقہاء نے یہ دیا ہے کہ یہ مال اگرچہ اس وقت حلال تھا مگر قمار کے ذریعہ اکتسابِ مال اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ تھا، اس لئے صدیقِ اکبرؓ کی شان کے مناسب نہ سمجھ کر ان کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے شراب حلال ہونے کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی۔

اور لفظ سُحت جو بعض روایات میں آیا ہے اوّل تو اس روایت کو محدثین نے صحیح تسلیم نہیں کیا، اور اگر صحیح بھی مانا جائے تو یہ لفظ بھی کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے بمعنے حرام مشہور ہے، دوسرے معنی اس کے مکروہ و ناپسندیدہ کے بھی آتے ہیں۔ جیسا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَسْبُ الْحَجَّامِ سُحْتٌ، [2] یعنی پچھنے لگانے والے کی کمائی سُحت ہے۔ یہاں جمہور فقہاء نے اس کے معنی ناپسندیدہ اور مکروہ کے لئے ہیں۔ اور امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں لفظ سُحت کے یہ مختلف معانی محاورات عرب اور احادیث نبویہ سے ثابت کئے ہیں۔ [3]

حضرات فقہاء کا یہ کلام اس لئے بھی واجب القبول ہے کہ اگر واقع میں یہ مال حرام تھا تو شرعی اصول کے مطابق یہ مال اسی شخص کو واپس کرنا لازم تھا جس سے لیا گیا ہے، مالِ حرام کو صدقہ کرنے کا حکم صرف اُن صورتوں میں ہوتا ہے جبکہ اس کا مالک معلوم نہ ہو یا اس کو پہنچانا مشکل ہو، یا اس کو واپس کرنے میں کوئی اور شرعی قباحت ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ یعنی اس روز (جبکہ رُوم فارس پر غالب آئیں گے) مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے۔ نظمِ عبارت کے اعتبار سے ظاہر یہ ہے کہ یہاں نصر اور مدد سے رومیوں کی نصرت و امداد ہے،

[1] ترجمہ: بات یہی ہے کہ شراب اور جُوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں۔

[2] السنن الکبریٰ للبیهقیؒ ج:۱۹ ص:۲۳۸

[3] مفردات القرآن للأصفهانیؒ ج:۱ ص:۲۲۵، والنهاية لابن الأثيرؒ ج:۲ ص:۸۷۳

وہ اگرچہ کافر تھے مگر دوسرے کے مقابل کافروں کے اعتبار سے کفر میں ہلکے تھے، اس لئے ان کی نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا کوئی امر مستبعد نہیں، خصوصاً جبکہ ان کی نصرت سے مسلمانوں کو بھی خوشی حاصل ہو اور کفار کے مقابلہ میں ان کی جیت بھی ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ نصرت سے مراد یہاں مسلمانوں کی نصرت ہو جو دو وجہ سے ہوسکتی ہے۔ اوّل تو یہی کہ مسلمانوں نے رُومیوں کے غلبہ کو قرآن کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کیا تھا، اس لئے رُومیوں کا غلبہ درحقیقت مسلمانوں کی نصرت تھی، دوسری وجہ نصرت مسلمین کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس زمانے میں کفار کی بڑی طاقتیں بھی دو فارس اور رُوم تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو باہم بھڑا کر دونوں کو کمزور کردیا، جو آئندہ مسلمانوں کی فتوحات کا پیش خیمہ بنی۔ (کذا فی الروح) [1]

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ یعنی یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ایک پہلو کو تو خوب جانتے ہیں، کہ تجارت کس طرح کریں، کس مال کی کریں، کہاں سے خریدیں، کہاں بیچیں، اور کھیتی کس طرح کریں، کب بیج ڈالیں کب کاٹیں، تعمیرات کیسی کیسی بنائیں، سامانِ عیش و عشرت کیا کیا مہیا کریں۔ لیکن اسی حیاتِ دنیا کا دوسرا پہلو جو اس کی حقیقت اور اس کے اصلی مقصد کو واضح کرتا ہے کہ دنیا کا چندروزہ قیام درحقیقت ایک مسافرانہ قیام ہے، انسان یہاں کا مقامی آدمی (نیشنل) نہیں، بلکہ دوسرے ملک آخرت کا باشندہ ہے، یہاں کچھ مدت کے لئے ویزا پر آیا ہوا ہے، اس کا اصلی کام یہ ہے کہ اپنے اصلی وطن کے لئے یہاں سے سامانِ راحت فراہم کر کے وہاں بھیجے، اور وہ سامانِ راحت ایمان اور عمل صالح ہے، اس دوسرے رُخ سے بڑے بڑے عاقل کہلانے والے بالکل غافل اور جاہل ہیں۔

قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیجئے کہ يَعْلَمُوْنَ کے ساتھ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ فرمایا ہے، جس میں لفظ ظَاهِرًا کو تنوین کے ساتھ نکرہ لا کر قواعد عربیت کی رُو سے اس طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت یہ لوگ حیاتِ ظاہر کو بھی پورا نہیں جانتے، اس کے صرف ایک رُخ کو جانتے ہیں دوسرے رُخ سے غافل ہیں اور آخرت سے بالکل ہی غافل و جاہل ہیں۔

دنیا کے فنونِ معاش اگر آخرت سے غفلت کے ساتھ حاصل ہوں تو وہ کوئی دانشمندی نہیں

قرآنِ کریم اقوامِ دنیا کے عبرتناک قصّوں سے بھرا ہوا ہے، جو مکاسبِ دنیا اور عیش و عشرت کے سامان جمع کرنے میں بڑے نام آور تھے، پھر ان کا انجامِ بد بھی دنیا ہی میں لوگوں کے سامنے آیا، اور آخرت کا دائمی عذاب ان کا حصّہ بنا، اس

[1] روح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۵ ص:۳۲۹

لئے ان کو کوئی سمجھ دار آدمی عقلاء یا حکماء نہیں کہہ سکتا۔ افسوس ہے کہ آج کل عقل وحکمت کا سارا انحصار اسی میں سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ مال جمع کرے اور اپنی عیش وعشرت کا سامان سب سے بہتر بنا لے وہ سب سے بڑا عقلمند کہلاتا ہے، اگرچہ اخلاقِ انسانیت سے بھی کورا ہو۔ عقل وشرع کی رُو سے اس کو عقلمند کہنا عقل کی توہین ہے۔ قرآن کریم کی زبان میں عقل والے صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کو اور آخرت کو پہچانیں، اس کے لئے عمل کریں۔ دنیا کی ضروریات کو بقدر ضرورت رکھیں، اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائیں۔ آیت قرآن [1] اِنَّ فِیْ .... لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا الآیۃ (آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱) کا یہی مفہوم ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۫ قف مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ

کیا دھیان نہیں کرتے اپنے جی میں کہ اللہ نے جو بنائے آسمان اور زمین

وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی ط وَ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ

اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے سو ٹھیک سادھ کر اور وعدہ مقرر پر اور بہت لوگ

بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَکٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا

اپنے رَبّ کا ملنا نہیں مانتے، کیا انہوں نے سیر نہیں کی ملک کی جو دیکھیں

کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط کَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا

انجام کیسا ہوا ان سے پہلوں کا، ان سے زیادہ تھے زور میں اور جوتا انہوں نے

الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَکْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ط

زمین کو اور بسایا اس کو ان کے بسانے سے زیادہ اور پہنچے ان کے پاس رسول ان کے کھلے حکم لے کر

[1] ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۹ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ

سو اللہ نہ تھا ان پر ظلم کرنے والا لیکن وہ اپنا آپ بُرا کرتے تھے، پھر ہوا انجام

الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ ع

بُرا کرنے والوں کا بُرا اس واسطے کہ جھٹلاتے تھے اللہ کی باتیں اور اُن پر ٹھٹھے کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا کیا انہوں نے اپنے دِلوں میں غور نہیں کیا؟ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان پائی جانے والی چیزوں کو بغیر کسی برحق مقصد کے اور کوئی میعاد مقرّر کئے بغیر پیدا نہیں کر دیا' اور بہت سے لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار سے جا ملنے کے منکر ہیں۔ ۝۸ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں، تا کہ وہ یہ دیکھتے کہ اُن سے پہلے جو لوگ تھے، اُن کا انجام کیسا ہوا؟ وہ طاقت میں ان سے زیادہ مضبوط تھے، اور اُنہوں نے زمین کو بھی جوتا تھا، اور جتنا اِن لوگوں نے اُسے آباد کیا ہے، اُس سے زیادہ اُنہوں نے اُس کو آباد کیا تھا، اور اُن کے پاس اُن کے پیغمبر کھلے کھلے دلائل لے کر آئے تھے! چنانچہ اللہ تو ایسا نہیں تھا کہ اُن پر ظلم کرے، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۝۹ پھر جن لوگوں نے برائی کی تھی، اُن کا انجام بھی برا ہی ہوا، کیونکہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا تھا، اور وہ اُن کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ۝۱۰

خلاصۂ تفسیر

کیا (دلائل وقوعِ آخرت کے سُن کر بھی ان کی نظر دنیا ہی پر مقصور رہی اور) انہوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعاد معیّن (تک) کے لئے پیدا کیا ہے (جیسا اس نے آیات میں خبر دی ہے کہ ان حکمتوں میں سے ایک حکمت جزاء وسزا کی ہے۔ اور میعاد معیّن قیامت ہے۔ اگر اپنے دلوں میں غور کرتے تو ان واقعات کا امکان عقل سے اور ان کا وقوع نقل یعنی قرآن سے اور اس نقل کا صدق صفتِ اعجاز سے منکشف ہو جاتا، اور آخرت کے منکر نہ ہوتے، مگر غور نہ کرنے سے منکر ہو رہے ہیں)۔ اور (یہی کیا اور) بہت سے آدمی اپنے رَبّ کے ملنے کے منکر ہیں کیا یہ لوگ (کبھی گھر سے نہیں نکلے اور) زمین میں چلے پھرے نہیں، جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا (آخری) انجام کیا ہوا (کیفیت

ان کی یہ تھی کہ) وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے زمین کو بھی (ان سے زیادہ) بویا تھا اور جتنا انہوں نے (سامان اور مکان سے) اس کو آباد کر رکھا ہے اس سے زیادہ انہوں نے اس کو آباد کیا تھا اور ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے (جن کو انہوں نے نہیں مانا اور عذاب سے ہلاک ہوئے جن کی ہلاکت کے آثار ان کے ویران مکانات سے جو طریقِ شام میں ملتے ہیں نمودار ہیں) سو (اس ہلاکت میں) خدا تعالیٰ ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا وہ تو خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے (کہ انکار پیغمبروں کا کر کے مستحق ہلاکت ہوئے یہ تو ان کی حالت دنیا میں ہوئی اور) پھر (آخرت میں) ایسے لوگوں کا انجام جنہوں نے (ایسا) بُرا کام (یعنی رسل کا انکار) کیا تھا بُرا ہی ہوا (محض) اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو (یعنی احکام و اخبار کو) جھٹلایا تھا اور (تکذیب سے بڑھ کر یہ کہ) ان کی ہنسی اڑاتے تھے (وہ انجام سزائے دوزخ ہے)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر دونوں آیتیں مضمون سابق کا تکملہ اور اس پر بطور شہادت کے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی چند روزہ چمک دمک اور فانی لذتوں میں ایسے مست ہو گئے کہ اس کارخانہ کی حقیقت اور انجام سے بالکل غافل ہو گئے، اگر یہ خود بھی ذرا اپنے دل میں سوچتے اور غور کرتے تو ان پر یہ راز کائنات منکشف ہو جاتا کہ خالقِ کائنات نے یہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان کی مخلوقات کو فضول اور بیکار پیدا نہیں کیا۔ ان کی تخلیق کا کوئی بڑا مقصد اور بڑی حکمت ہے، اور وہ یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں کے ذریعہ ان کے پیدا کرنے والے کو بھی پہچانیں، اور اس کی تلاش میں لگ جائیں کہ وہ کن کاموں سے راضی ہوتا ہے کن سے ناراض، تاکہ اس کی رضا جوئی کا سامان کریں، اور ناراضی کے کاموں سے بچیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان دونوں قسموں کے کاموں کی کچھ جزاء و سزاء بھی ہونا ضروری ہے، ورنہ نیک و بد کو ایک ہی پلّے میں رکھنا عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے جس میں انسان کو اس کے اچھے یا بُرے عمل کی پوری جزاء ضرور مل ہی جائے، بلکہ یہاں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ آدمی خوش خرّم اور بامراد نظر آتا ہے، اور بُرے کاموں سے پرہیز کرنے والا مصائب اور تنگی کا شکار دیکھا جاتا ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جب یہ سب کارخانہ ختم ہو اور اچھے بُرے اعمال کا حساب ہو، اور ان پر جزاء و سزا مرتب ہو، جس کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ اگر غور و فکر کرتے تو یہی آسمان و زمین اور ان کی مخلوقات اس کی شہادت دے دیتیں کہ یہ چیزیں دائمی نہیں، کچھ مدّت کے لئے ہیں، اور ان کے بعد دوسرا عالم آنے والا ہے جو دائمی ہوگا۔ مذکورہ دو آیتوں میں سے

پہلی آیت کا یہی حاصل ہے اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ الآیۃ، یہ مضمون تو ایک عقلی استدلال کا ہے۔ اگلی آیت میں دنیا کی محسوسات ومشاہدات اور تجربات کو اس کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے، اور اہل مکہ کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ اہل مکہ تو ایک ایسی زمین کے باشندے ہیں جہاں نہ زراعت ہے نہ صنعت نہ تجارت کے مواقع اور نہ بلند و بالا حسین تعمیرات، مگر ملکِ شام اور یمن کے سفر ان لوگوں کو اپنے تجارتی مقاصد کے لئے پیش آتے ہیں۔ کیا ان سفروں میں ان لوگوں نے اپنے سے پہلی اقوام دنیا کے انجام کا مشاہدہ نہیں کیا جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں بڑے بڑے تصرفات کرنے کا سلیقہ دیا تھا کہ زمین کو کھود کر اس سے پانی نکالنا اور اس سے باغات اور کھیتوں کو سیراب کرنا اور چھپے ہوئے معادن سے سونا چاندی اور دوسری قسم کی معدنی دھاتیں نکالنا اور ان سے انسانی فوائد کے لئے مختلف قسم کی مصنوعات تیار کرنا ان کا وظیفۂ زندگی تھا اور یہ اپنے زمانے کی متمدن قومیں سمجھی جاتی تھیں۔ مگر انہوں نے اسی مادی اور فانی عیش وعشرت میں مست ہو کر اللہ کو اور آخرت کو بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلانے کے لئے اپنے پیغمبر اور کتابیں بھیجیں، مگر انہوں نے کسی کی طرف التفات نہیں کیا، اور بالآخر دنیا میں بھی مبتلائے عذاب ہوئے۔ جس پر ان کی بستیوں کے ویران کھنڈرات اس وقت تک شہادت دے رہے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ غور کرو کہ کیا اس عذاب میں ان پر اللہ کی طرف سے کوئی ظلم ہوا ہے یا انہوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ اسبابِ عذاب جمع کر لئے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ

اللہ بناتا ہے پہلی بار پھر اس کو دہرائے گا پھر اسی کی طرف پھر جاؤ گے، اور جس دن برپا ہوگی

السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا

قیامت آس توڑ کر رہ جائیں گے گنہگار، اور نہ ہوں گے ان کے شریکوں میں کوئی ان کے سفارش کرنے والے

وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ

اور وہ ہو جائیں گے اپنے شریکوں سے منکر اور جس دن قائم ہوگی قیامت اس دن لوگ ہوں گے

يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ

قسم قسم، سو جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام سو باغ میں ہوں گے

يُّحْبَرُوْنَ ﴿١٥﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ

ان کی آؤ بھگت ہوگی، اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتیں اور ملنا پچھلے گھر کا

فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿١٦﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ

سو وہ عذاب میں پکڑے آئیں گے، سو پاک اللہ کی یاد کرو جب شام کرو اور جب

تُصْبِحُوْنَ ﴿١٧﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ

صبح کرو، اور اسی کی خوبی ہے آسمان میں اور زمین میں اور پچھلے وقت اور جب

تُظْهِرُوْنَ ﴿١٨﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ

دوپہر ہو، نکالتا ہے زندہ کو مُردے سے اور نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿١٩﴾ ع ۲ ع ۹ ۵

زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے، اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ ہی مخلوق کی ابتدا کرتا ہے، اور وہی اُس کو دوبارہ پیدا کرے گا، پھر تم سب اُس کے پاس واپس بلا لئے جاؤ گے۔ ⑪ اور جس دن قیامت برپا ہوگی، اُس روز مجرم لوگ نا اُمید ہو جائیں گے۔ ⑫ اور انہوں نے جن کو اللہ کا شریک مان رکھا تھا، اُن میں سے کوئی اُن کا سفارشی نہیں ہوگا، اور خود یہ لوگ اپنے مانے ہوئے شریکوں سے منکر ہو جائیں گے۔ ⑬ اور جس دن قیامت برپا ہوگی، اُس روز لوگ مختلف قسموں میں بٹ جائیں گے۔ ⑭ چنانچہ جو لوگ ایمان لائے تھے، اور انہوں نے نیک عمل کئے تھے، اُن کو تو جنت میں ایسی خوشیاں دی جائیں گی جو اُن کے چہروں سے پھوٹی پڑ رہی ہوں گی۔ ⑮ اور جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کا سامنا کرنے کو جھٹلایا تھا، تو ایسے لوگوں کو عذاب میں دھر لیا جائے گا۔ ⑯ لہٰذا اللہ کی تسبیح کرو اُس وقت بھی جب تمہارے پاس شام آتی ہے، اور اُس وقت بھی جب تم پر صبح

طلوع ہوتی ہے، ⑰ ــــــ اور اُسی کی حمد ہوتی ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی ــــــ اور سورج ڈھلنے کے وقت بھی (اُس کی تسبیح کرو) اور اُس وقت بھی جب تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔ ⑱ وہ جاندار کو بے جان سے نکال لاتا ہے، اور بے جان کو جاندار سے نکال لیتا ہے، اور وہ زمین کو اُس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ اور اسی طرح تم کو (قبروں سے) نکال لیا جائے گا۔ ⑲

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ خلق کو اوّل بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی اس کو پیدا کرے گا پھر (پیدا ہونے کے بعد) اس کے پاس (حساب کتاب کے لئے) لائے جاؤ گے اور جس روز قیامت قائم ہوگی (جس میں اعادہ مذکور ہونے والا ہے) اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگ (باز پرس کے وقت) حیرت زدہ رہ جائیں گے (یعنی کوئی معقول بات ان سے نہ بن پڑے گی) اور ان کے (تراشے ہوئے) شریکوں میں سے (جن کو شریکِ عبادت بناتے تھے) ان کا کوئی سفارشی نہ ہوگا اور (اس وقت خود) یہ لوگ (بھی) اپنے شریکوں سے منکر ہوجائیں گے (کہ [1] وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ (الانعام) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز (علاوہ واقعۂ مذکورہ کے ایک واقعہ یہ بھی ہوگا کہ مختلف طریقوں کے) سب آدمی جدا جدا ہوجائیں گے یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کئے تھے وہ تو (بہشت کے) باغ میں مسرور ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا، اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے (یہ معنی ہیں جدا جدا ہونے کے، جب ایمان و عمل صالح کی فضیلت تم کو معلوم ہوگئی) سو تم اللہ کی تسبیح (اعتقاداً و قلباً بھی جس میں ایمان آگیا اور قولاً و لساناً بھی جس میں اقرار و دیگر اذکار آگئے اور عملاً و ارکاناً بھی جس میں تمام عبادتیں عموماً اور نماز خصوصاً آگئیں، غرض تم اللہ کی تسبیح ہر وقت) کیا کرو (اور خصوصاً) شام کے وقت اور صبح کے وقت اور (اللہ کی تسبیح کرنے کا جو حکم ہوا ہے تو وہ تو واقع میں اس کا مستحق بھی ہے، کیونکہ) تمام آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے (یعنی آسمان میں فرشتے اور زمین میں بعض اختیاراً اور بعض اضطراراً اس کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔ کقولہ تعالیٰ [2] وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل: ۴۴) پس جب وہ ایسا محمود الصفات کامل الذات ہے تو تم کو بھی ضرور اس کی تسبیح کرنی چاہئے) اور بعد زوال (بھی تسبیح کیا کرو) اور ظہر کے وقت (بھی تسبیح کیا کرو کہ یہ اوقات تجدّدِ نعمت و زیادت ظہور آثار قدرت کے ہیں ان میں تجدید تسبیح

[1] ترجمہ: کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے۔
[2] ترجمہ: اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو۔

کی مناسب ہے بالخصوص نماز کے لئے یہی اوقات مقرر ہیں، چنانچہ مَسَا میں مغرب وعشاء آ گئی اور عَشِیّ میں ظہر اور عصر دونوں داخل تھے، مگر ظہر صراحۃً مذکور ہے، اس لئے صرف عصر مراد رہ گئی، اور صبح بھی تصریحاً مذکور ہے، اور اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، کیونکہ اس کی ایسی قدرت ہے کہ) وہ جاندار کو بے جان سے باہر لاتا ہے اور بے جان کو جان دار سے باہر لاتا ہے (مثلاً نطفہ اور بیضہ سے انسان اور بچہ اور انسان اور پرندہ سے نطفہ اور بیضہ) اور زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد زندہ (یعنی تازہ وشاداب) کرتا ہے اور اسی طرح تم لوگ (قیامت کے روز) قبروں سے نکالے جاؤ گے۔

معارف ومسائل

فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ يُحْبَرُوْنَ، حبور سے مشتق ہے، جس کے معنی سرور اور خوشی کے ہیں۔ اور اس لفظ کے عموم میں ہر طرح کا سرور داخل ہے جو نعمائے جنت سے اہلِ جنت کو حاصل ہوگا۔ قرآنِ کریم میں اس کو یہاں بھی عام رکھا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ یہ ارشاد ہے [1] فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدۃ: ۱۷)، یعنی کسی شخص کو دنیا میں معلوم نہیں کہ اس کے لئے جنت میں آنکھوں کی ٹھنڈک (اور راحت وسرور) کے کیا کیا سامان جمع ہیں۔ بعض مفسرین نے جو خاص خاص سرور کی چیزوں کو اس آیت کے تحت میں ذکر کیا ہے وہ سب اسی اجمال میں داخل ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ مصدر ہے، اس کا فعل محذوف ہے یعنی سَبِّحُوا اللّٰهَ سُبْحَانًا، حِيْنَ تُمْسُوْنَ، یعنی جب تم شام کے وقت میں داخل ہو، اور وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ یعنی جب تم پر صبح کا وقت آئے، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ جملہ درمیان میں بطور دلیل کے لایا گیا ہے کہ صبح شام اللہ کی تسبیح اس لئے ضروری ہے کہ آسمان وزمین میں صرف وہی مستحقِ حمد ہے اور تمام آسمان وزمین والے اس کی حمد کرنے میں مشغول ہیں۔ اور جس طرح شروع آیت میں صبح شام کی تسبیح کا حکم ہے، آخر آیت میں عَشِيًّا اور حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ سے اور دو وقتوں میں تسبیح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک وقت عَشِیّ جو دن کے آخری حصہ کو کہا جاتا ہے، جو عصر کا وقت ہے۔ دوسرا وقت ظہر یعنی بعد زوالِ آفتاب کے۔

اور ترتیب بیان میں جس طرح شام کو صبح سے مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، اسی طرح دن کے آخری حصہ کو ظہر پر مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، شام یعنی رات کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی تاریخ میں رات مقدم ہوتی ہے، اور تاریخ غروبِ آفتاب سے بدلتی ہے۔ اور عشی یعنی وقتِ عصر کو ظہر سے مقدم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عصر

[1] ترجمہ: سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانۂ غیب میں موجود ہے۔

کا وقت عموماً کاروبار کی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے، اس میں کوئی دعاء تسبیح یا نماز عادۃً مشکل ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں صَلٰوۃ وُسْطٰی جس کی تفسیر جمہور کے نزدیک نماز عصر ہے، اس کی خصوصی تاکید آئی ہے: [۱] حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی (البقرۃ:۲۳۸)

آیت مذکورہ کے الفاظ میں نماز یا صلوٰۃ کی تصریح نہیں۔ اس لئے ہر قسم کے ذکر اللہ قولی اور عملی کو شامل ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ذکر اللہ کی تمام اقسام میں چونکہ نماز سب سے اعلیٰ اور افضل ہے، اس لئے وہ اس میں بدرجۂ اَولیٰ داخل ہے۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں پانچوں نمازوں کا مع ان کے اوقات کے ذکر آ گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا قرآن میں پانچ نمازوں کا ذکر صریح ہے؟ تو فرمایا ہاں! اور استدلال میں یہی آیت پیش کر کے فرمایا کہ حِيْنَ تُمْسُوْنَ میں نماز مغرب اور حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ میں نماز فجر اور عَشِيًّا میں نماز عصر اور حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ میں نماز ظہر کا ذکر صریح موجود ہے۔ اب صرف ایک نمازِ عشاء رہی، اس کے ثبوت میں دوسری آیت کا جملہ ارشاد فرمایا: [۲] مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ [۳] (النور:۵۸)

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حِيْنَ تُمْسُوْنَ میں نماز مغرب و عشاء دونوں داخل ہیں۔

فائدۂ عظیمہ

یہ آیت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دُعا ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم نے ان کو وفاءِ عہد کا خطاب دیا ہے، ارشاد فرمایا [۴] وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ (النجم)، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کلمات صبح شام پڑھا کرتے تھے۔

جیسا کہ اسانید صحیحہ کے ساتھ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف وفاءِ عہد سے کرنے کا سبب اُن کی یہ دُعا تھی۔ [۵]

اور ابوداؤد، طبرانی، ابن سنی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ ان دو آیتوں کے متعلق فرمایا کہ

---

[۱] ترجمہ: محافظت کرو سب نمازوں کی اور درمیان والی نماز کی۔ [۲] نماز عشاء کے بعد۔

[۳] المستدرك للحاكمؒ، رقم الحديث: ۳۵۴۱، وسنن الكبرىٰ للبيهقيؒ، رقم الحديث: ۱۷۵۲

[۴] ترجمہ: اور نیز ابراہیم کے جنہوں نے اَحکام کی پوری بجا آوری کی۔

[۵] مسند احمد، حديث معاذ بن انس رضي الله عنه، رقم الحديث: ۱۶۰۲۹، والمعجم الكبير، رقم الحديث: ۴۲۷

جس شخص نے صبح کو یہ کلمات پڑھ لئے تو دن بھر میں اس کے عمل میں جو کوتاہی ہوگی وہ ان کلمات کی برکت سے پوری کردی جائے گی، اور جس نے شام کے وقت یہ کلمات پڑھ لئے تو اس کے رات کے اعمال کی کوتاہی اس کے ذریعے پوری کردی جائے گی۔ (روح) [1]

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے پھر اب تم انسان ہو زمین میں پھیلے پڑے،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنادیئے تھے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس

وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ؕ

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان اور زمین کا بنانا اور طرح طرح کی بولیاں تمہاری اور رنگ،

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ

اس میں بہت نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کو، اور اس کی نشانیوں میں ہے تمہارا سونا رات اور دن میں

وَابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور تلاش کرنا اس کے فضل سے اس میں بہت پتے ہیں ان کو جو سنتے ہیں،

---

[1] روح المعانی ج:۱۳ ص:۳۴۵، وسنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب ما یقول إذا اصبح، ج:۲ ص:۳۴۴، ۳۴۵، والمعجم الکبیر، رقم الحدیث: ۱۲۹۹۱

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ

اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ دکھلاتا ہے تم کو بجلی ڈر اور امید کے لئے اور اُتارتا ہے آسمان سے پانی پھر زندہ کرتا ہے

بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

اس سے زمین کو مر گئے پیچھے اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو سوچتے ہیں،

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ

اور اس کی نشانیوں سے یہ ہے کہ کھڑا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے پھر جب پکارے گا تم کو

دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ

ایک بار زمین میں سے اسی وقت تم نکل پڑو گے، اور اسی کا ہے جو کوئی ہے آسمان

وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ

اور زمین میں سب اس کے حکم کے تابع ہیں، اور وہی ہے جو پہلی بار بناتا ہے پھر اس کو دُہرائے گا

وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ

اور وہ آسان ہے اس پر اور اس کی شان سب سے اوپر ہے آسمان اور زمین میں

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ ع

اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر تم دیکھتے ہی دیکھتے انسان بن کر

(زمین میں) پھیلے پڑے ہو۔ ⑳ اور اُس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم اُن کے پاس جا کر سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت کے جذبات رکھ دیئے۔ یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ ㉑ اور اُس کی نشانیوں کا ایک حصہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں دانش مندوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ ㉒ اور اُس کی نشانیوں کا ایک حصہ تمہارا رات اور دن کے وقت سونا اور اللہ کا فضل تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو بات سنتے ہوں۔ ㉓ اور اُس کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دِکھاتا ہے جس سے ڈر بھی لگتا ہے، اور اُمید بھی ہوتی ہے، اور آسمان سے پانی برساتا ہے، جس کے ذریعے وہ زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ㉔ اور اُس کی ایک نشانی یہ ہے کہ آسمان اور زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جب وہ ایک پکار دے کر تمہیں زمین سے بلائے گا تو تم فوراً نکل پڑو گے۔ ㉕ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اُسی کی ملکیت ہیں۔ سب اُسی کے حکم کے تابع ہیں۔ ㉖ اور وہی ہے جو مخلوق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اُسے دوبارہ پیدا کرے گا، اور یہ کام اُس کے لئے بہت آسان ہے۔ اور اُسی کی سب سے اُونچی شان ہے، آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، اور وہی ہے جو اقتدار والا بھی ہے، حکمت والا بھی۔ ㉗

خلاصۂ تفسیر

اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (امر) ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے جو مشتمل تھے تمام ذرّیت پر اور یا اس طرح کہ نطفہ کی اصل غذا ہے اور اس کی اصل عناصر ہیں جس میں جزو غالب مٹی ہے) پھر تھوڑے ہی روز بعد (کیا ہوا کہ) تم آدمی بن کر (زمین پر) پھیلے ہوئے پھرتے (نظر آتے) ہو اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ اس نے تمہارے (فائدے کے) واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں (اور وہ فائدہ یہ ہے کہ) تاکہ تم کو اُن کے پاس آرام ملے اور تم میں بی بی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں (کیونکہ استدلال کے لئے فکر کی ضرورت ہے اور نشانیاں جمع اس لئے فرمایا کہ امر مذکور کئی امر پر مشتمل ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمہارے لب ولہجہ اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا ہے، (لب ولہجہ سے مراد یا لغات ہوں یا آواز وطرز گفتگو) اس (امر مذکور) میں (بھی) دانشمندوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں (یہاں بھی صیغۂ جمع لانے کی وہی توجیہ مذکور ہو سکتی ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں (گو رات کو زیادہ

اور دن کو کم ہو) اور اس کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے (دن کو زیادہ اور رات کو کم، اسی لئے دوسری آیات میں نیند کو رات کے ساتھ اور تلاشِ معاش کو دن کے ساتھ خاص کر کے بیان کیا گیا ہے) اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو (دلیل کو توجہ سے) سنتے ہیں اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ وہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہوجانے کے بعد زندہ (یعنی تروتازہ) کردیتا ہے اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو عقل (نافع رکھتے ہیں) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم (یعنی ارادہ) سے قائم ہیں (اس میں بیان ہے ان کے ابقاء کا، اور اوپر خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ذکر تھا ان کی ابتداءِ آفرینش کا اور یہ تمام نظامِ عالم جو مذکور ہوا، یعنی تمہارا سلسلہ توالد و تناسل کا جاری ہونا اور باہم ازدواج ہونا اور آسمان و زمین کا بہیئت کذائیہ موجود و قائم ہونا اور زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف اور لیل و نہار کے انقلاب میں خاص مصلحتوں کا ہونا اور بارش کا نزول اور اس کے مبادی و آثار کا ظہور وہ سب اسی وقت تک باقی ہیں جب تک دنیا کو باقی رکھنا مقصود ہے اور ایک روز یہ سب ختم ہوجائے گا) پھر (اس وقت یہ ہوگا کہ) جب تم کو پکار کر زمین میں سے بلائے گا تو تم یکبارگی نکل پڑوگے (اور دوسرا نظام شروع ہوجائے گا جو مقصود مقام ہے) اور (اوپر دلائلِ قدرت سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ) جتنے (فرشتے اور انسان وغیرہ) آسمان اور زمین میں موجود ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں (اور) سب اسی کے تابع (یعنی مسخر قدرت) ہیں اور (اس ثبوت و اختصاص قدرت کاملہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ) وہی ہے جو اوّل بار پیدا کرتا ہے (چنانچہ یہ مخاطبین کے نزدیک بھی مسلّم تھا) پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا (جیسا کہ دلائل مذکورہ کے ساتھ خبر صادق کے مل جانے سے معلوم ہوا) اور یہ (دوبارہ پیدا کرنا) اس کے نزدیک (باعتبار مخاطبین کے بادی النظر کے بہ نسبت اوّل بار پیدا کرنے کے) زیادہ آسان ہے (جیسا قدرت بشریہ کے اعتبار سے عادت غالبہ یہی ہے کہ کسی چیز کو پہلی بار کے بنانے سے دوسری بار بنانا سہل تر ہوتا ہے) اور آسمان اور زمین میں اسی کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے (یعنی نہ آسمانوں میں کوئی ایسا بڑا ہے اور نہ زمین میں کقولہ تعالیٰ [1] وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الجاثیۃ: ۳۷)) اور وہ (بڑا) زبردست (یعنی قادر مطلق اور) حکمت والا ہے (چنانچہ اوپر کے تصرفات سے قدرت اور حکمت دونوں ظاہر ہیں، پس وہ اپنی قدرت سے اعادہ کرے گا، اور اس اعادۂ تخلیق میں جتنا توقف ہو رہا ہے اس میں حکمت و مصلحت ہے، پس قدرت و حکمت کے ثبوت کے بعد فی الحال واقع نہ ہونے سے انکار کرنا جہل ہے)۔

[1] ترجمہ: اور اسی کو بڑائی ہے آسمان و زمین میں۔

معارف و مسائل

سورۂ رُوم کے شروع میں رُوم و فارس کی جنگ کا ایک واقعہ سُنانے کے بعد منکرین اور کفار کی گمراہی اور حق بات کے سننے سمجھنے سے بے پروائی کا سبب ان کا صرف دنیا کی فانی زندگی کو اپنا مقصدِ حیات بنالینا اور آخرت کی طرف کوئی توجہ نہ دینا قرار دیا گیا تھا، اس کے بعد قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حساب کتاب اور جزاء وسزا کے واقع ہونے پر جو سطحی نظر والوں کو استبعاد ہوسکتا ہے، اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا گیا ہے، پہلے خود اپنے نفس میں غور وفکر کی پھر گرد وپیش میں گزرنے والی اقوام کے حالات اور ان کے انجام میں نظر کرنے کی دعوت دی گئی۔ پھر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ مطلقہ کا ذکر فرمایا جس میں اس کا کوئی سہیم وشریک نہیں، ان سب شواہد ودلائل کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستحقِ عبادت صرف اس کی یکتا ذات کو قرار دیا جائے۔ اور اس نے جو اپنے انبیاء کے ذریعہ قیامت قائم ہونے اور تمام اوّلین وآخرین کے دوبارہ زندہ ہوکر حساب کتاب کے بعد جنت یا دوزخ میں جانے کی خبر دی ہے اس پر ایمان لایا جائے۔ مذکور الصدر آیات میں اسی قدرت کاملہ اور اس کے ساتھ حکمت بالغہ کے چھ۶ مظاہر آیاتِ قدرت کے عنوان سے بیان فرمائے گئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت وحکمت کی نشانیاں ہیں:

پہلی آیتِ قدرت:- انسان جیسے اشرف المخلوقات اور حاکم کائنات کو مٹی سے پیدا کرنا ہے جو اس دنیا کے عناصرِ ترکیبیہ میں سب سے زیادہ ادنیٰ درجہ کا عنصر ہے جس میں حس وحرکت اور شعور وادراک کا کوئی شمّہ نظر نہیں آتا، کیونکہ مشہور چار عناصر آگ، پانی، ہوا، اور مٹی، میں سے مٹی کے سوا اور سب عناصر میں کچھ نہ کچھ حرکت تو ہے، مٹی اس سے بھی محروم ہے، قدرت نے تخلیقِ انسانی کے لئے اس کو منتخب فرمایا۔ ابلیس کی گمراہی کا سبب یہی بنا کہ اس نے آگ کے عنصر کو مٹی سے اشرف واعلیٰ سمجھ کر تکبّر اختیار کیا، اور یہ نہ سمجھا کہ شرافت اور بزرگی خالق ومالک کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے بڑا بنا سکتا ہے۔

اور انسان کی تخلیق کا مادّہ مٹی ہونا حضرت آدم علیہ السلام کے اعتبار سے ظاہر ہی ہے۔ اور وہ چونکہ تمام بنی آدم کے وجود کی اصل بنیاد ہیں اس لئے دوسرے انسانوں کی تخلیق بالواسطہ اُن ہی کی طرف منسوب کرنا کچھ بعید نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ عام انسان جو توالد وتناسل کے سلسلہ سے نطفہ کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی نطفہ جن اجزاء سے مرکب ہوتا ہے ان میں مٹی کا جزو غالب ہے۔

دوسری آیتِ قدرت:- یہ ہے کہ انسان ہی کی جنس میں اللہ تعالیٰ نے عورتیں پیدا کردیں جو مردوں کی بیبیاں

بنیں، ایک ہی مادّہ سے ایک ہی جگہ میں ایک ہی غذا سے پیدا ہونے والے بچّوں میں یہ دو مختلف قسمیں پیدا فرما دیں۔ جن کے اعضاء و جوارح، صورت و سیرت، عادات و اخلاق میں نمایاں تفاوت و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت وحکمت کے لئے یہ تخلیق ہی کافی نشانی ہے۔ اس کے بعد عورتوں کی اس خاص نوع کی تخلیق کی حکمت و مصلحت یہ بیان فرمائی لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا، یعنی ان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تمہیں ان کے پاس پہنچ کر سکون ملے۔ مرد کی جتنی ضروریات عورت سے متعلق ہیں ان سب میں غور کیجئے تو سب کا حاصل سکونِ قلب اور راحت و اطمینان نکلے گا، قرآن کریم نے ایک لفظ میں ان سب کو جمع فرما دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ازدواجی زندگی کے تمام کاروبار کا خلاصہ سکون و راحتِ قلب ہے، جس گھر میں یہ موجود ہے وہ اپنی تخلیق کے مقصد میں کامیاب ہے، جہاں قلبی سکون نہ ہو اور چاہے سب کچھ ہو وہ ازدواجی زندگی کے لحاظ سے ناکام و نامراد ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ باہمی سکونِ قلب صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد شرعی نکاح اور ازدواج پر ہو، جن ممالک اور جن لوگوں نے اس کے خلاف کی حرام صورتوں کو رواج دیا اگر تفتیش کی جائے تو ان کی زندگی کو کہیں پر سکون نہ پائیں گے، جانوروں کی طرح وقتی خواہش پوری کر لینے کا نام سکون نہیں ہوسکتا۔

ازدواجی زندگی کا مقصد سکون ہے جس کے لئے باہمی اُلفت ومحبت اور رحمت ضروری ہے

اس آیت نے مرد و عورت کی ازدواجی زندگی کا مقصد سکونِ قلب قرار دیا ہے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ طرفین ایک دوسرے کا حق پہچانیں اور ادا کریں، ورنہ حق طلبی کے جھگڑے خانگی سکون کو برباد کر دیں گے۔ اس ادائے حقوق کے لئے ایک صورت تو یہ تھی کہ اس کے قوانین بنا دینے اور احکام نافذ کر دینے پر اکتفاء کیا جاتا، جیسے دوسرے لوگوں کے حقوق کے معاملہ میں ایسا ہی کیا گیا ہے، کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کو حرام کر کے اس پر سخت وعیدیں سنائی گئیں سزائیں مقرر کی گئیں، ایثار و ہمدردی کی نصیحت کی گئی۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ صرف قانون کے ذریعہ کوئی قوم اعتدال پر نہیں لائی جاسکتی جب تک اس کے ساتھ خدا کا خوف نہ ہو، اسی لئے معاشرتی معاملات میں احکامِ شرعیہ کے ساتھ ساتھ پورے قرآن میں ہر جگہ [1] اِتَّقُوا اللّٰهَ (البقرۃ:۱۹۶)، [2] وَاخْشَوْا (لقمان:۳۳) وغیرہ کے کلمات بطور تکملہ کے لائے گئے ہیں۔

مرد و عورت کے باہمی معاملات کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ ان کے حقوق باہمی پورے ادا کرانے پر نہ کوئی قانون حاوی ہوسکتا ہے نہ کوئی عدالت ان کا پورا انصاف کر سکتی ہے۔ اسی لئے خطبۂ نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ [2] ترجمہ: اور ڈرو۔

نے قرآن کریم کی وہ آیات انتخاب فرمائی ہیں جن میں تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت کی تلقین ہے کہ وہی درحقیقت زوجین کے باہمی حقوق کا ضامن ہوسکتا ہے۔

اس پر ایک مزید انعام حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ازدواجی حقوق کو صرف شرعی اور قانونی نہیں رکھا بلکہ طبعی اور نفسانی بنا دیا۔ جس طرح ماں باپ اور اولاد کے باہمی حقوق کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا، کہ ان کے قلوب میں فطرۃً ایک ایسی محبت پیدا فرمادی کہ ماں باپ اپنی جان سے زیادہ اولاد کی حفاظت کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی طرح اولاد کے قلوب میں بھی ایک فطری محبت ماں باپ کی رکھ دی گئی ہے۔ یہی معاملہ زوجین کے متعلق بھی فرمایا گیا۔ اس کے لئے ارشاد فرمایا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً یعنی اللہ تعالیٰ نے زوجین کے درمیان صرف شرعی اور قانونی تعلق نہیں رکھا بلکہ ان کے دلوں میں مودّت اور رحمت پیوست کردی۔ وُدّ اور مَوَدَّتْ کے لفظی معنی چاہنے کے ہیں، جس کا ثمرہ محبت و الفت ہے۔ یہاں حق تعالیٰ نے دو لفظ اختیار فرمائے، ایک مودّت، دوسرے رحمت۔ ممکن ہے اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ مودّت کا تعلق جوانی کے اس زمانے سے ہو جس میں طرفین کی خواہشات ایک دوسرے سے محبت و الفت پر مجبور کرتی ہیں۔ اور بڑھاپے میں جب یہ جذبات ختم ہوجاتے ہیں تو باہمی رحمت و ترحم طبعی ہوجاتا ہے۔ (کما ذکرہ القرطبی عن البعض)[1]

اس کے بعد فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں، یہاں ذکر تو ایک نشانی کا کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں اس کو آیات اور نشانیاں فرمایا، وجہ یہ ہے کہ ازدواجی تعلق جس کا ذکر اس میں کیا گیا اس کے مختلف پہلوؤں پر اور ان سے حاصل ہونے والے دینی اور دنیوی فوائد پر نظر کی جائے تو یہ ایک نہیں بہت سی نشانیاں ہیں۔

تیسری آیت قدرت: - آسمان و زمین کی تخلیق اور انسانوں کے مختلف طبقات کی زبانیں اور لب و لہجہ کا مختلف ہونا اور مختلف طبقات کے رنگوں میں امتیاز ہونا ہے، کہ بعض سفید ہیں بعض سیاہ بعض سُرخ بعض زرد۔ اس میں آسمان و زمین کی تخلیق تو قدرت کا عظیم شاہکار ہے ہی، انسانوں کی زبانیں مختلف ہونا بھی ایک عجیب کرشمۂ قدرت ہے۔ زبانوں کے اختلاف میں لغات کا اختلاف بھی داخل ہے، عربی، فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی وغیرہ کتنی مختلف زبانیں ہیں، جو مختلف خطوں میں رائج ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بعض تو ایسی مختلف ہیں کہ کوئی باہمی ربط و مناسبت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اور اس اختلافِ السنہ میں لب و لہجہ کا اختلاف بھی شامل ہے کہ قدرتِ حق نے ہر فرد انسان مرد، عورت، بچّے، بوڑھے کی آواز میں ایسا امتیاز پیدا فرمایا ہے کہ ایک فرد کی آواز کسی دوسرے فرد سے، ایک صنف کی آواز دوسری صنف سے پوری طرح نہیں ملتی،

---

[1] روح المعاني تحت هذه الآية ج: ۲۱ ص: ۳۱ وما وجدت في القرطبي۔

کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رہتا ہے۔ حالانکہ اس آواز کے آلات زبان، ہونٹ، تالو، حلق، سب میں مشترک اور یکساں ہیں، تَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔[1]

اسی طرح الوان کا اختلاف ہے۔ کہ ایک ہی ماں باپ سے ایک ہی قسم کے حالات میں دو بچے مختلف رنگ کے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو تخلیق وصنعت گری کا کمال تھا، آگے زبانیں اور لہجے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے رنگ مختلف ہونے میں کیا کیا حکمتیں مستور ہیں، ان کا بیان طویل ہے۔ اور بہت سی حکمتوں کا معمولی غور وفکر سے سمجھ لینا مشکل بھی نہیں۔

اس آیت قدرت میں متعدد چیزیں آسمان، زمین، اختلافِ السنہ، اختلافِ الوان، اوران کے ضمن میں اور بہت سی قدرت وحکمت کی نشانیاں ہیں، اور وہ ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ کسی مزید غور وفکر کی بھی ضرورت نہیں، ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا ہے، اس لئے اس کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾ یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے۔

چوتھی آیت قدرت: - انسانوں کا سونا رات میں اور دن میں، اسی طرح ان کی تلاش معاش ہے رات میں اور دن میں۔ اس آیت میں تو نیند کو بھی دن ورات دونوں میں بیان فرمایا ہے اور تلاشِ معاش کو بھی، اور بعض دوسری آیات میں نیند کو صرف رات میں اور تلاش معاش کو دن میں بتلایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رات میں اصل کام نیند کا ہے، اور کچھ تلاش معاش کا بھی چلتا ہے، اور دن میں اس کے برعکس اصل کام تلاش معاش کا ہے، اور کچھ سونے آرام کرنے کا بھی وقت ملتا ہے۔ اس لئے دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ بعض مفسرین نے تاویل کر کے اس آیت میں بھی نیند کو رات کے ساتھ اور تلاش معاش کو دن کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر اس کی ضرورت نہیں۔

سونا اور تلاش معاش زہد وتوکل کے منافی نہیں

اس آیت سے ثابت ہوا کہ سونے کے وقت سونا اور جاگنے کے وقت تلاش معاش انسان کی فطرت بنائی گئی ہے، اور ان دونوں چیزوں کا حاصل کرنا انسانی اسباب وکمالات کے تابع نہیں، بلکہ درحقیقت یہ دونوں چیزیں خالص عطاء حق ہیں۔ جیسا کہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات نیند اور آرام کے سارے بہتر سے بہتر سامان جمع ہونے کے باوجود نیند نہیں آتی، بعض اوقات ڈاکٹری گولیاں بھی نیند لانے میں فیل ہو جاتی ہیں، اور جس کو مالک چاہتا ہے کھلی زمین پر دھوپ اور گرمی میں نیند عطا فرما دیتا ہے۔

یہی حال تحصیل معاش کا رات دن مشاہدہ میں آتا ہے کہ دو شخص یکساں علم وعقل والے برابر کے مال والے، برابر کی محنت والے تحصیلِ معاش کا یکساں ہی کام لے کر بیٹھتے ہیں ایک ترقی کر جاتا ہے دوسرا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو

---

[1] ترجمہ: کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

عالمِ اسباب بڑی حکمت و مصلحت سے بنایا ہے۔ اس لئے تلاشِ معاش اسباب ہی کے ذریعہ کرنا لازم ہے مگر عقل کا کام یہ ہے کہ حقیقت شناسی سے دور نہ ہو ان اسباب کو اسباب ہی سمجھے اور اصل رازق اسباب کے بنانے والے کو سمجھے۔

اس آیتِ قدرت کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ ''یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو بات کو دھیان دے کر سنتے ہیں'' اس میں سننے پر مدار رکھنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ دیکھنے میں تو نیند خود بخود آجاتی ہے جب آدمی ذرا آرام کی جگہ کر کے لیٹ جائے۔ اسی طرح معاش کا حصول محنت مزدوری تجارت وغیرہ سے ہو جاتا ہے۔ اس لئے دستِ قدرت کی کارسازی ظاہری نظروں سے مخفی رہتی ہے، وہ اللہ کا پیام لانے والے انبیاء بتلاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ نشانیاں انہی کو کارآمد ہوتی ہیں جو بات کو دھیان دے کر سنیں، اور جب سمجھ میں آجائے تو تسلیم کر لیں، ہٹ دھرمی اور ضد نہ کریں۔

پانچویں آیت قدرت:- یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو بجلی کا کوندنا دکھاتے ہیں جس میں اس کے گرنے اور نقصان پہنچانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے، اور اس کے پیچھے بارش کی امید بھی اور پھر بارش نازل فرماتے ہیں۔ اور اس خشک بے جان زمین کو زندہ تر و تازہ کر کے اس میں طرح طرح کے درخت اور پھل پھول اگاتے ہیں۔ اس کے آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، کیونکہ برق و باراں اور ان کے ذریعہ حاصل ہونے والی نباتات اور ان کے پھل پھول کی تخلیق منجانب اللہ ہونا یہ عقل و حکمت ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

چھٹی آیت قدرت:- یہ ہے کہ آسمان و زمین کا قیام اللہ ہی کے امر سے ہے، اور جب اس کا امر یہ ہوگا کہ یہ نظام توڑ پھوڑ دیا جائے تو یہ سب مضبوط مستحکم چیزیں جن میں ہزاروں سال چل کر بھی کہیں کوئی نقصان یا خلل نہیں آتا، دم کے دم میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائیں گی، اور پھر اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے دوبارہ سب مُردے زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

یہ چھٹی آیتِ قدرت درحقیقت پہلی سب آیات کا ماحصل اور مقصد ہے، اسی کے سمجھانے کے لئے اس سے پہلی پانچ آیتیں بیان فرمائی ہیں، اور اس کے بعد کئی آیات تک اسی مضمون کا ذکر فرمایا ہے۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى، لفظ مَثَل بفتح میم و ثاء ہر ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دوسرے سے کچھ مماثلت اور مناسبت رکھتی ہو بالکل اس جیسی ہونا اس کے مفہوم میں داخل نہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ کے لئے مَثَل ہونا تو قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، ایک یہیں، دوسرے فرمایا[1] مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ (النور: ۳۵) لیکن مِثل اور مثال سے حق تعالیٰ کی ذات پاک اور وراء الوراء ہے۔ واللہ اعلم

[1] ترجمہ: اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

بتلائی تم کو ایک مثل تمہارے اندر سے دیکھو جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں ان میں ہیں

مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ

کوئی ساجھی تمہارے ہماری دی ہوئی روزی میں کہ تم سب اس میں برابر رہو خطرہ رکھو ان کا جیسے خطرہ رکھو

اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ

اپنوں کا، یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں، بلکہ چلتے ہیں

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ

یہ بے انصاف اپنی خواہشوں پر بن سمجھے، سو کون سمجھائے جس کو اللہ نے بھٹکایا،

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ

اور کوئی نہیں اُن کا مددگار، سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہوکر وہی تراش اللہ کی

فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ

جس پر تراشا لوگوں کو بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو یہی ہے دین سیدھا،

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا

ولیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے، سب رجوع ہوکر اس کی طرف اور اس سے ڈرتے رہو اور قائم رکھو

الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ

نماز اور مت ہو شرک کرنے والوں میں، جنہوں نے کہ پھوٹ ڈالی اپنے دین میں

وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ

اور ہو گئے ان میں بہت فرقے ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر غش ہے، اور جب پہنچے لوگوں کو

ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ

کچھ سختی تو پکاریں اپنے ربّ کو اس کی طرف رجوع ہو کر پھر جہاں چکھائی ان کو اپنی طرف سے کچھ مہربانی اسی وقت ایک جماعت

مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۳۳ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ

ان میں اپنے ربّ کا شریک لگی بتانے، کہ منکر ہو جائیں ہمارے دیئے ہوئے سے سو مزے اڑا لو اب آگے

تَعْلَمُوْنَ ۝۳۴ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ

جان لوگے، کیا ہم نے ان پر اُتاری ہے کوئی سند سو وہ بول رہی ہے جو یہ

يُشْرِكُوْنَ ۝۳۵ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ

شریک بتاتے ہیں، اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو کچھ مہربانی اس پر پھولے نہیں سماتے، اور اگر آپڑے اُن پر

سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝۳۶ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ

کچھ بُرائی اپنے ہاتھوں کے بھیجے ہوئے پر تو آس توڑ بیٹھیں، کیا نہیں دیکھ چکے کہ اللہ

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

پھیلا دیتا ہے روزی جس پر چاہے اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کو

يُّؤْمِنُوْنَ ۝۳۷ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ

جو یقین رکھتے ہیں، سو تو دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو، یہ بہتر ہے

لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ مَآ اٰتَیْتُمْ

اُن کے لئے جو چاہتے ہیں اللہ کا منہ اور وہی ہیں جن کا بھلا ہے، اور جو دیتے ہو

مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَآ اٰتَیْتُمْ

بیاج پر کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں اور جو دیتے ہو

مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ

پاک دل سے چاہ کر رضامندی اللہ کی سو یہ وہی ہیں جن کے دُونے ہوئے، اللہ وہی ہے

خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ

جس نے تم کو بنایا پھر تم کو روزی دی پھر تم کو مارتا ہے پھر تم کو جلائے گا، کوئی ہے تمہارے شریکوں میں

مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ع

جو کر سکے ان کاموں میں سے ایک کام وہ نرالا ہے اور بہت اوپر ہے اس سے کہ شریک بتلاتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

وہ تمہیں خود تمہارے اندر سے ایک مثال دیتا ہے۔ ہم نے جو رزق تمہیں دیا ہے، کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی اُس میں تمہارا شریک ہے کہ اُس رزق میں تمہارا درجہ اُن کے برابر ہو (اور) تم اُن غلاموں سے ویسے ہی ڈرتے ہو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے ڈرتے ہو؟ ہم اسی طرح دلائل اُن لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو عقل سے کام لیں۔ ﴿۲۸﴾ لیکن ظالم لوگ کسی علم کے بغیر اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب اُس شخص کو کون ہدایت دے سکتا ہے جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو، اور ایسے لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ﴿۲۹﴾ لہٰذا تم یکسو ہو کر اپنا رُخ اِس دِین کی طرف قائم رکھو۔ اللہ کی بنائی ہوئی اُس فطرت پر چلو جس پر اُس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے ــــ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی، یہی بالکل سیدھا راستہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ــــ ﴿۳۰﴾ (فطرت کی پیروی) اس طرح (کرو) کہ تم

نے اُسی (اللہ) سے لو لگا رکھی ہو، اور اُس سے ڈرتے رہو، اور نماز قائم کرو، اور اُن لوگوں کے ساتھ شامل نہ ہو جو شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، ۳۱ وہ جنہوں نے اپنے دِین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا، اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ اپنے اپنے طریقے پر مگن ہے۔ ۳۲ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف چھوجاتی ہے تو وہ اپنے پروردگار سے لو لگا کر اُسی کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ اپنی طرف سے اُنہیں کسی رحمت کا ذائقہ چکھا دیتا ہے، تو اُن میں سے کچھ لوگ یکا یک اپنے پروردگار کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں، ۳۳ تاکہ ہم نے اُنہیں جو کچھ دیا تھا، اُس کی ناشکری کریں۔ اچھا! کچھ مزے اُڑا لو، پھر وہ وقت دُور نہیں جب تمہیں سب پتہ چل جائے گا۔ ۳۴ بھلا کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل نازل کی ہے جو اُس شرک کا ارتکاب کرنے کو کہتی ہو جو یہ اللہ کے ساتھ کرتے رہے ہیں؟ ۳۵ اور جب ہم لوگوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر اِترا جاتے ہیں، اور اگر انہیں خود اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے کوئی برائی پہنچ جائے تو ذرا سی دیر میں وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ ۳۶ کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، اور (جس کے لئے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔ اس میں یقیناً اُن لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو اِیمان لائیں۔ ۳۷ لہٰذا تم رشتہ دار کو اُس کا حق دو، اور مسکین اور مسافر کو بھی۔ جو لوگ اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں، اُن کے لئے یہ بہتر ہے، اور وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ ۳۸ اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھ جائے تو وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں ہے، اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، تو جو لوگ بھی ایسا کرتے ہیں وہ ہیں جو (اپنے مال کو) کئی گنا بڑھا لیتے ہیں۔ ۳۹ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر اُس نے تمہیں رزق دیا، پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ جن کو تم نے اللہ کا شریک مانا ہوا ہے، کیا اُن میں سے کوئی ہے جو ان میں سے کوئی کام کرتا ہو؟ پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر اُس شرک سے جس کا ارتکاب یہ لوگ کرتے ہیں۔ ۴۰

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ (شرک کو مذموم و باطل ثابت کرنے کے لئے) تم سے ایک مضمون عجیب تمہارے ہی حالات میں سے بیان فرماتے ہیں (وہ یہ کہ غور کرو) کیا تمہارے غلاموں میں کوئی شخص تمہارا اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا ہے شریک ہے کہ تم اور وہ (باعتبار اختیارات کے) اس میں برابر ہوں جن کا تم (تصرفات کے وقت) ایسا خیال کرتے ہو جیسا اپنے آپس (کے شریک و سہیم آزاد خود مختار کا) خیال کیا کرتے ہو (اور ان سے اجازت لے کر تصرفات کیا کرتے ہو یا کم از کم اندیشۂ مخالفت ہی ان سے رہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ غلام اس طرح شریک نہیں ہوتا۔ پس جب تمہارا غلام جو نوع بشر اور بہت سی چیزوں میں تمہارا شریک ہے اور تمہیں جیسا ہے، فرق صرف ایک چیز میں ہے کہ تم مال و دولت کے مالک ہو وہ نہیں، اس کے باوجود

جب وہ تمہارے خاص حقِ تصرف میں تمہارا شریک نہیں ہوسکتا تو تمہارے قرار دیئے ہوئے معبودات باطلہ جو کہ حق تعالیٰ کے غلام ہیں اور کسی کمال ذاتی یا وصفی میں خدا تعالیٰ کے مماثل نہیں، بلکہ بعض تو ان میں سے مخلوقاتِ الٰہیہ کے مصنوع ہیں۔ یہ معبودین حق تعالیٰ کے خاص حق معبودیت میں کس طرح اس کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہم نے جس طرح یہ دلیل شافی کافی بطلانِ شرک کی بیان فرمائی) ہم اسی طرح سمجھ داروں کے لئے دلائل صاف صاف بیان کرتے رہتے ہیں (اور مقتضا یہ تھا کہ وہ لوگ حق کا اتباع اختیار کر لیتے اور شرک چھوڑ دیتے مگر وہ حق کا اتباع نہیں کرتے) بلکہ ان ظالموں نے بلا (کسی صحیح) دلیل (کے محض) اپنے خیالات (فاسدہ) کا اتباع کر رکھا ہے سو جس کو (اس کی ہٹ دھرمی اور عناد و اصرار علی الباطل کی وجہ سے) خدا (ہی) گمراہ کرے اس کو کون راہ پر لائے (اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ معذور ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینا ہے کہ آپ غم نہ کریں آپ کا جو کام تھا وہ آپ کر چکے، اور جب ان گمراہوں کو عذاب ہونے لگے گا تو) ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا (اور جب اوپر کے مضمون سے توحید کی حقیقت واضح ہوگئی) تو (مخاطبین میں سے ہر ہر شخص سے کہا جاتا ہے کہ) تم (ادیانِ باطلہ سے) یک سو ہو کر اپنا رُخ اس دین (حق) کی طرف رکھو (اور سب) اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس (قابلیت) پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (مطلب فطرۃ اللہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں خلقۃً یہ استعداد رکھی ہے کہ اگر حق کو سننا اور سمجھنا چاہے تو وہ سمجھ میں آجاتا ہے، اور اس کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اس استعداد اور قابلیت سے کام لے، اور اس کے مقتضا پر عمل کرے غرض اس فطرت کا اتباع چاہئے اور) اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے پس سیدھا (رستہ) دین (کا) یہی ہے لیکن اکثر لوگ (اس کو بوجہ عدمِ تدبّر کے) نہیں جانتے (اس لئے اس کا اتباع نہیں کرتے غرض) تم خدا کی طرف رجوع ہو کر فطرتِ الٰہیہ کا اتباع کرو اور اس (کی مخالفت اور اس مخالفت کے عذاب) سے ڈرو اور (اسلام قبول کرکے) نماز کی پابندی کرو (جو توحید کا عملی اظہار ہے) اور شرک کرنے والوں میں سے مت رہو، جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا (یعنی حق تو یہ ایک تھا اور باطل بہت ہیں انہوں نے حق کو چھوڑ دیا اور باطل کی مختلف راہیں اختیار کرلیں، یہ ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے کہ ایک نے ایک راہ لے لی دوسرے نے دوسری) اور بہت سے (مختلف) گروہ ہوگئے (اور اگر حق پر رہتے تو ایک گروہ ہوتے اور باوجود اس کے کہ اِن حق کے چھوڑنے والوں میں سب کے طریقے باطل ہیں، مگر پھر بھی غایت جہل سے ان میں) ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہے جو اُن کے پاس ہے اور (جس توحید کی طرف ہم بلاتے ہیں باوجود اس کے انکار اور خلاف کرنے کے اضطرار کے وقت عام طور پر لوگوں کے حال وقال سے اس کا اظہار و اقرار بھی ہونے لگتا ہے جس سے مضمونِ توحید کے فطری ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، چنانچہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ) جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے (اس وقت بے قرار ہو کر) اپنے رَبّ (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتے ہیں (اور سب معبودین کو چھوڑ دیتے ہیں مگر) پھر (قریب ہی

یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) جب اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو بس ان میں سے بعض لوگ (پھر) اپنے رَبّ کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو (آرام وعیش) ان کو دیا ہے اس کی ناشکری کرتے ہیں (جو عقلاً بھی قبیح ہے) سو (خیر) چندروز اور حظ حاصل کرلو پھر جلدی تم (حقیقت) معلوم کرلو گے (اور یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خصوصاً اقرار توحید کے بعد تو ان سے کوئی پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے) کیا ہم نے ان پر کوئی سند (یعنی کوئی کتاب) نازل کی ہے کہ وہ ان کو خدا کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہے (یعنی ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نقلی بھی نہیں، اور مقتضائے بداہت عقل کے خلاف ہونا خود ان کی تسلیم سے حالتِ اضطرار میں ظاہر ہو جاتا ہے، پس سرتاسر باطل ٹھہرا) اور (آگے مضمون بالا کا تتمہ ہے اور وہ یہ ہے کہ) ہم جب (ان) لوگوں کو کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس سے (اس طرح) خوش ہوتے ہیں (کہ خوشی میں مست ہو کر شرک کرنے لگتے ہیں جیسا اوپر ذکر آیا) اور اگر ان کے اعمالِ (بد) کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو بس وہ لوگ ناامید ہو جاتے ہیں (اس مقام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تتمہ میں اصل مقصود پہلا جملہ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ ہے کہ اس میں ان کے مبتلائے شرک ہونے کا سبب بدمست اور غافل ہونا مذکور ہے، دوسرا جملہ محض تقابل کی مناسبت سے ذکر کر دیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں حالتوں میں اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بہت کم اور ضعیف ہے، ذرا ذرا سی چیز اس تعلق کو فراموش کر دیتی ہے۔ آگے اسی کی دوسری دلیل ہے کہ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں تو) کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے کم دیتا ہے (اور مشرکین کے نزدیک یہ مسلّم بھی تھا کہ روزی کا گھٹانا بڑھانا اصل میں خدا ہی کا کام ہے، لقولہٖ تعالیٰ [1] وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶۳)) اس (امر) میں (بھی توحید کی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (یعنی وہ سمجھتے ہیں اور دوسرے بھی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ جو شخص ایسا قادر ہوگا مستحق عبادت کا وہی ہوگا) پھر (جب دلائل توحید میں معلوم ہوا کہ رزق میں بسط وقبض اللہ ہی کی طرف سے ہے تو اس سے ایک بات اور بھی ثابت ہوئی کہ بخل کرنا مذموم ہے، کیونکہ بخل کرنے سے جتنا رزق مقدّر ہے اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، اس لئے نیک کاموں میں خرچ کرنے سے بخل نہ کیا کر بلکہ) قرابت دار کو اس کا حق دیا کر اور (اسی طرح) مسکین اور مسافر کو بھی (ان کے حقوق دیا کر جن کی تفصیل دلائلِ شرعیہ سے معلوم ہے) یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (ہم نے جو یہ قید لگائی کہ یہ مضمون بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا کے طلب گار ہوں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مطلق مال خرچ

[1] ترجمہ: اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو بعد اس کے کہ خشک پڑی تھی تر وتازہ کر دیا تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہی ہے۔

کر دینا موجبِ فلاح نہیں ہے بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو چیز تم (دنیا کی غرض سے خرچ کرو گے مثلاً کوئی چیز) اس غرض سے کسی کو) دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں (شامل ہو کر یعنی ان کے مِلک وقبضہ میں) پہنچ کر (تمہارے لئے) زیادہ ہو (کر آ) جائے جیسا نوتہ وغیرہ رسومِ دنیویہ میں اکثر اسی غرض سے دیا جاتا ہے کہ یہ شخص ہمارے موقع پر کچھ اور زائد شامل کر کے دے گا) تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا (کیونکہ خدا کے نزدیک پہنچنا اور بڑھنا اس مال کے ساتھ خاص ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جائے جیسا آگے آتا ہے، اور حدیث میں بھی ہے کہ ایک تمرہ مقبولہ اُحُد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے، اور اُس میں یہ نیت تھی نہیں، لہٰذا نہ مقبول ہوا نہ زائد ہوا) اور جو زکوٰۃ (وغیرہ) دو گے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے لوگ (اپنے دیئے ہوئے کو) خداتعالیٰ کے پاس بڑھاتے رہیں گے (جیسا ابھی حدیث کا مضمون گزرا اور یہ مضمون اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزّاق پر دلالت کرنے کی وجہ سے توحید کی تاکید کا ذریعہ ہے اس لئے یہ تبعاً آ گیا، اصل مقصود توحید کا بیان ہے، اسی لئے آگے پھر اسی توحید کا ذکر ہے)۔

اللہ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو مَوت دیتا ہے پھر (قیامت میں) تم کو جلائے گا (ان میں بعض امور تو مخاطبین کے اقرار سے ثابت ہیں، اور بعض دلائل سے، غرض کہ وہ ایسا قادر ہے، اب یہ بتلاؤ کہ) کہ تمہارے شرکاء میں بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے (اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ) وہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (یعنی اس کا کوئی شریک نہیں)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں مضمون توحید کو مختلف شواہد اور دلائل اور مختلف عنوانات میں بتلایا گیا ہے جو ہر انسان کے دل میں اُتر جائے۔ پہلے ایک مثال سے سمجھایا کہ تمہارے غلام نوکر جو تمہارے ہی جیسے انسان ہیں شکل وصورت، ہاتھ پاؤں مقتضیاتِ طبعیہ سب چیزوں میں تمہارے شریک ہیں، مگر تم ان کو اپنے اقتدار و اختیار میں اپنے برابر نہیں بناتے کہ وہ بھی تمہاری طرح جو چاہیں کیا کریں جو چاہیں خرچ کریں، بالکل اپنے برابر تو کیا بناتے ان کو اپنے مال و اختیار میں ادنیٰ سی شرکت کا بھی حق نہیں دیتے، جیسے کسی جزوی اور معمولی شریک سے آپ ڈرتے ہیں کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی تصرف کر لیا تو وہ اعتراض کرے گا۔ غلاموں نوکروں کو یہ درجہ بھی نہیں دیتے، تو غور کرو کہ تمام مخلوقات جن میں فرشتے، انسان اور دوسری کائنات سبھی داخل ہیں، یہ سب کے سب اللہ کی مخلوق اور اسی کی بندے اور غلام ہیں ان کو تم اللہ کے برابر یا اس کا شریک کیسے یقین کرتے ہو۔

دوسری آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ بات سیدھی اور صاف ہے مگر مخالف لوگ اپنی اہواءِ نفسانی کے تابع ہو کر کوئی علم وحکمت کی بات نہیں مانتے۔

تیسری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا عام مخاطب کو حکم دیا ہے کہ جب شرک کا نامعقول اور ظلمِ عظیم ہونا ثابت ہو گیا تو آپ سب خیالاتِ مشرکانہ کو چھوڑ کر اپنا رُخ صرف دین اسلام کی طرف پھیر لیجئے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا -

اس کے بعد اس دینِ اسلام کا مطابق اور مقتضائے فطرت ہونا اس طرح بیان فرمایا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یہ جملہ پہلے جملے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا کی توضیح اور دین حنیف جس کے اتباع کا حکم پہلے جملے میں دیا گیا ہے اس کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے کہ وہ دین فطرت ہے۔ اور فِطْرَتَ اللّٰهِ کی ترکیب نحوی میں منصوب ہونے کی وجہ مفسرین نے مختلف لکھی ہیں کہ لفظ اِتَّبِعْ یہاں سے محذوف ہے، یا لفظ اَعْنِیْ، بہرحال یہ متعین ہے کہ دین حنیف جس کا اتباع کا پہلے جملے میں حکم دیا گیا ہے اس کو اس جملے میں فِطْرَتَ اللّٰهِ قرار دیا ہے اور معنی اس کے خود اگلے جملے میں یہ بتلائے کہ اللہ کی فطرت سے مراد یہ ہے کہ جس فطرت پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

فطرت سے کیا مراد ہے؟

اس معاملہ میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں ان میں دو زیادہ مشہور ہیں:

اوّل یہ کہ فطرت سے مراد اسلام ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اپنی فطرت اور جبلّت کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے۔ اگر اس کو گرد و پیش اور ماحول میں کوئی خراب کرنے والا خراب نہ کر دے تو ہر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہی ہوگا۔ مگر عادۃً ہوتا یہ ہے کہ ماں باپ اس کو بعض اوقات اسلام کے خلاف چیزیں سکھا دیتے ہیں، جس کے سبب وہ اسلام پر قائم نہیں رہتا۔ جیسا کہ صحیحین کی ایک حدیث میں مذکور ہے۔[1] قرطبی نے اسی قول کو جمہورِ سلف کا قول قرار دیا ہے۔[2]

دوسرا قول یہ ہے کہ فطرت سے مراد استعداد ہے۔ یعنی تخلیقِ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ ہر انسان میں اپنے خالق کو پہچاننے اور اس کو ماننے کی صلاحیت و استعداد موجود ہے جس کا اثر اسلام کا قبول کرنا ہوتا ہے، بشرطیکہ اس استعداد سے کام لے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب إذا اسلم الصبي إلخ ج:١ ص:١٨٠، وصحيح مسلم، كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة إلخ ج:٢ ص:٣٣٦

[2] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:١٤ ص:٢٥

مگر پہلے قول پر متعدّد اشکالات ہیں، اوّل یہ کہ خود اسی آیت میں یہ بھی آگے مذکور ہے لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ اور یہاں خلق اللہ سے مراد وہی فطرۃ اللہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہیں کہ اللہ کی اس فطرت کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا، حالانکہ حدیث صحیحین میں خود یہ آیا ہے کہ پھر ماں باپ بعض اوقات بچے کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اگر فطرت کے معنی خود اسلام کے لئے جائیں جس میں تبدیلی نہ ہونا خود اسی آیت میں مذکور ہے تو حدیث مذکور میں یہودی، نصرانی بنانے کی تبدیلی کیسے صحیح ہوگی، اور یہ تبدیلی تو عام مشاہدہ ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں سے زیادہ کافر ملتے ہیں، اگر اسلام ایسی فطرت ہے جس میں تبدیلی نہ ہوسکے تو پھر یہ تبدیلی کیسے اور کیوں؟

دوسرے حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق صحیح حدیث میں ہے کہ اس لڑکے کی فطرت میں کفر تھا،[1] اس لئے خضر علیہ السلام نے اس کو قتل کیا، یہ حدیث بھی اس کے منافی ہے کہ ہر انسان اسلام پر پیدا ہوتا ہو۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی فطرت میں اس طرح رکھ دیا گیا ہے جس کی تبدیلی پر بھی اس کو قدرت نہیں تو وہ کوئی اختیاری فعل نہ ہوا پھر اس پر آخرت کا ثواب کیسا؟ کیونکہ ثواب تو اختیاری عمل پر ملتا ہے۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کے مطابق فقہاء امت کے نزدیک بچہ بالغ ہونے سے پہلے ماں باپ کے تابع سمجھا جاتا ہے، اگر ماں باپ کافر ہوں تو بچے کو بھی کافر قرار دیا جائے گا۔ اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طرز پر نہیں کی جائے گی۔

یہ سب شبہات امام تورپشتی نے شرح مصابیح میں بیان کئے ہیں۔ اور اسی بناء پر انہوں نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس خلقی استعداد کے متعلق یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، جو شخص ماں باپ یا کسی دوسرے کے گمراہ کرنے سے کافر ہوگیا اس میں استعداد اور قابلیتِ حق یعنی اسلام کی حقانیت کے پہچاننے کی ختم نہیں ہوتی۔ غلامِ خضر کے واقعہ میں اس کے کفر پر پیدا ہونے سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں حق کو سمجھنے کی استعداد ہی نہ رہی تھی، اور چونکہ اس خداداد استعداد و قابلیت کا صحیح استعمال انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے، اس لئے اس پر ثواب عظیم کا مرتب ہونا بھی واضح ہوگیا، اور حدیث صحیحین میں جو یہ مذکور ہے کہ بچے کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، اس کا مفہوم بھی اس دوسرے معنی کے اعتبار سے واضح اور صاف ہوگیا، کہ اگرچہ اس میں استعداد اور قابلیت فطری ہے جو اللہ نے اس کی تخلیق میں رکھی تھی وہ اسلام ہی کی طرف لے جانے والی تھی، مگر عوارض اور موانع حائل ہوگئے اور اس طرف نہ جانے دیا۔ اور حضرات سلف سے جو پہلا قول منقول ہے بظاہر اس کی مراد بھی اصل اسلام نہیں، بلکہ یہی استعدادِ اسلام اور اس کی قابلیت

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل خضر علیه السلام ج:۲ ص:۲۶۹

وصلاحیت ہے۔[1] محدّث دہلویؒ نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں جمہور کے قول کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔[2]

اور اس کی تائید اس مضمون سے ہوتی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بے شمار قسم کی مخلوقات مختلف طبائع اور مزاج کی بنائی ہیں، ہر مخلوق کی فطرت اور جبلّت میں ایک خاص مادّہ رکھ دیا ہے، جس سے وہ مخلوق اپنی تخلیق کے منشاء کو پورا کر سکے قرآن کریم میں[3] اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۞ (طٰہٰ) سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس مخلوق کو خالقِ کائنات نے کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس کو اس مقصد کے لئے ہدایت بھی دے دی ہے، وہ ہدایت یہی مادّہ اور استعداد ہے، شہد کی مکھی میں یہ مادّہ رکھ دیا کہ وہ درختوں اور پھولوں کو پہچانے اور انتخاب کرے پھر اس کے رَس کو اپنے پیٹ میں محفوظ کر کے اپنے چھتے میں لا کر جمع کرے، اسی طرح انسان کی فطرت وجبلّت میں ایسا مادّہ اور استعداد رکھ دی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانے، اس کی شکرگزاری اور اطاعت شعاری کرے، اسی کا نام اسلام ہے۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ مذکورالصدر تقریر سے اس جملے کا مطلب بھی واضح ہو گیا کہ اللہ کی دی ہوئی فطرت یعنی حق کو پہچاننے کی صلاحیت واستعداد میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کو غلط ماحول کافر تو بنا سکتا ہے مگر اس کی استعدادِ قبولِ حق کو بالکل فنا نہیں کر سکتا۔

اور اسی سے اُس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۞ (الذاریات) یعنی ہم نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا، بجز اس کے کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرت میں ہم نے عبادت کی رغبت اور استعداد رکھ دی ہے، اگر وہ اس استعداد سے کام لیں تو بجز عبادت کے کوئی دوسرا کام اس کے خلاف ہرگز سرزد نہ ہو۔

اہلِ باطل کی صحبت اور غلط ماحول سے الگ رہنا فرض ہے

آیت مذکورہ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا جملہ اگرچہ بصورت خبر ہے یعنی اللہ کی اس فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا، لیکن اس میں ایک معنی اَمر کے بھی ہیں، کہ بدلنا نہیں چاہئے۔ اس لئے اس جملے سے یہ حکم بھی مستفاد ہوا کہ انسان کو ایسے اسباب سے بہت پرہیز کرنا چاہئے جو اس قبولِ حق کی استعداد کو معطل یا کمزور کر دیں۔ اور وہ اسباب بیشتر غلط ماحول اور بُری صحبت ہے، یا اہلِ باطل کی کتابیں دیکھنا جب کہ خود اپنے مذہبِ اسلام کا پورا عالم اور مُبصّر نہ ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

---

۱ كتاب المُيَسَّر في شرح مصابيح السنة للتوربشتيؒ كتاب الإيمان باب الإيمان بالقدر ج: ۱ ص: ۵۴، ۵۵

۲ لمعات التنقيح، كتاب الإيمان، باب الإيمان بالقدر ج: ۱ ص: ۱۵۸

۳ ترجمہ: ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر رہنمائی فرمائی۔

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۳۱﴾ پچھلی آیت میں انسان کی فطرت کو قبولِ حق کے قابل اور مستعد بنانے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اوّل قبولِ حق کی صورت یہ بتلائی گئی کہ نماز قائم کریں کہ وہ عملی طور پر ایمان واسلام اور طاعتِ حق کا اظہار ہے اس کے بعد فرمایا وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۳۱﴾ یعنی شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہوجاؤ جنہوں نے اپنی فطرت اور قبولِ حق کی استعداد سے کام نہ لیا، آگے ان کی گمراہی کا ذکر ہے:- مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَکَانُوۡا شِیَعًا یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنہوں نے دینِ فطرت اور دینِ حق میں تفریق پیدا کردی، یا یہ کہ دینِ فطرت سے مفارق اور الگ ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے۔ شِیَعًا، شیعہ کی جمع ہے، ایسی جماعت جو کسی مقتداء کی پیرو ہو، اس کو شیعہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینِ فطرت تو توحید تھا جس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ سب انسان اس کو اختیار کرکے ایک ہی قوم ایک ہی جماعت بنتے مگر انہوں نے اس توحید کو چھوڑا، اور مختلف لوگوں کے خیالات کے تابع ہوگئے اور انسانی خیالات اور رایوں میں اختلاف ایک طبعی امر ہے، اس لئے ہر ایک نے اپنا اپنا ایک مذہب بنالیا، عوام ان کے سبب مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے، اور شیطان نے ان کو اپنے اپنے خیالات ومعتقدات کو حق قرار دینے میں ایسا لگادیا کہ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۳۲﴾ یعنی ان کی ہر پارٹی اپنے اپنے اعتقادات وخیالات پر مگن اور خوش ہے، اور دوسروں کو غلطی پر بتاتی ہے، حالانکہ یہ سب کے سب گمراہی کے غلط راستوں پر پڑے ہوئے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ وَالۡمِسۡکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ اس سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ رزق کا معاملہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو پھیلا دیتا ہے اور زیادہ کردیتا ہے، اور جس کا چاہتا ہے رزق سمیٹ کر تنگ کردیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اس کے مصارف میں خرچ کرتا رہے تو اس سے اس میں کمی نہیں آتی، اور اگر کوئی خرچ کرنے میں بخل کرے اور جو کچھ اپنے پاس ہے اس کو جمع کرکے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے اس سے مال میں وسعت نہیں ہوتی۔

اس مضمون کی مناسبت سے آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بقول حسن بصری ہر مخاطب انسان کو جس کو اللہ نے مال میں وسعت دی ہو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جو مال اللہ نے آپ کو دیا ہے اس میں بخل نہ کرو بلکہ اس کو ان کے مصارف میں خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اس سے تمہارے مال اور رزق میں کمی نہیں آئے گی۔ اور اس حکم کے ساتھ اس آیت میں مال کے چند مصارف بھی بیان کردیئے، اوّل:- ذوی القربٰی، دوسرے:- مساکین، تیسرے:- مسافر، کہ خدا تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے مال میں سے ان لوگوں کو دو اور ان پر خرچ کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ نے تمہارے مال میں شامل کردیا ہے اس لئے ان کو دینے کے وقت ان پر کوئی احسان نہ جتلاؤ، کیونکہ حق والے کا حق ادا کرنا مقتضائے عدل وانصاف ہے کوئی احسان وانعام نہیں ہے۔

اور ذوی القربیٰ سے مراد ظاہر یہ ہے کہ عام رشتہ دار ہیں، خواہ ذورحم محرم ہوں یا دوسرے (کما هو قول الجمهور من المفسرین)۔ اور حق سے مراد بھی عام ہے خواہ حقوقِ واجبہ ہوں جیسے ماں باپ، اولاد اور دوسرے ذوی الارحام کے حقوق یا محض تبرّع واحسان ہو جو رشتہ داروں کے ساتھ بہ نسبت دوسروں کے بہت زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے ذوی الارحام رشتہ دار محتاج ہوں وہ ان کو چھوڑ کر دوسروں پر صدقہ کرے تو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔ اور ذوی القربیٰ کا حق صرف مالی امداد ہی نہیں ان کی خبر گیری، جسمانی خدمت اور کچھ نہ کر سکے تو کم ازکم زبانی ہمدردی اور تسلّی وغیرہ جیسا کہ حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ ذوی القربیٰ کا حق اس شخص کے لئے جس کو مالی وسعت حاصل ہو یہ ہے کہ مال سے ان کی امداد کرے اور جس کو یہ وسعت حاصل نہ ہو اس کے لئے جسمانی خدمت اور زبانی ہمدردی ہے۔ (قرطبی)[1]

ذوی القربیٰ کے بعد مسکین اور مسافر کا حق بتلایا گیا ہے یہ بھی اسی طرح عام ہے، وسعت ہو تو مالی امداد، نہ ہو تو اچھا سلوک۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ، اس آیت میں ایک بُری رسم کی اصلاح کی گئی ہے، جو عام خاندانوں اور اہلِ قرابت میں چلتی ہے۔ وہ یہ کہ عام طور پر کنبہ رشتہ کے لوگ جو کچھ دوسرے کو دیتے ہیں اس پر نظر رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے وقت میں کچھ دے گا بلکہ رسمی طور پر کچھ زیادہ دے گا، خصوصاً نکاح، شادی وغیرہ کی تقریبات میں جو کچھ دیا لیا جاتا ہے اس کی یہی حیثیت ہوتی ہے جس کو عرف میں نوتہ کہتے ہیں۔ اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ اہلِ قرابت کا جو حق ادا کرنے کا حکم پہلی آیت میں دیا گیا ہے ان کو یہ حق اس طرح دیا جائے کہ نہ اُن پر احسان جتائے اور نہ کسی بدلے پر نظر رکھے۔ اور جس نے بدلے کی نیت سے دیا کہ ان کا مال دوسرے عزیز رشتہ دار کے مال میں شامل ہونے کے بعد کچھ زیادتی لے کر واپس آئے گا تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی درجہ اور ثواب نہیں اور قرآنِ کریم نے اس زیادتی کو لفظ ربٰو سے تعبیر کر کے اس کی قباحت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ایک صورت سود کی سی ہوگئی۔

مسئلہ:- ہدیہ اور ہبہ دینے والے کو اس پر نظر رکھنا کہ اس کا بدلہ ملے گا یہ تو ایک بہت مذموم حرکت ہے، جس کو اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے۔ لیکن بطور خود جس شخص کو کوئی ہبہ عطیہ کسی دوست عزیز کی طرف سے ملے اس کے لئے اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ وہ بھی جب اس کو موقع ملے اس کی مکافات کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جو شخص آپ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا تو اپنے موقع پر آپ بھی اس کو ہدیہ دیتے تھے۔ (کذا روی عن[2] عائشةؓ، قرطبی) ہاں اس مکافات کی صورت ایسی نہ بنائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ میرے ہدیہ کا بدلہ دے رہا ہے۔

[1] تفسیر القرطبی ج:۱۴ ص:۳۵　[2] صحیح البخاری، کتاب الهبة، باب المکافأة فی الهبة، ج:۱ ص:۳۵۲

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِی النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ

پھیل پڑی ہے خرابی جنگل میں اور دریا میں لوگوں کے ہاتھ کی کمائی سے چکھانا چاہئے

بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ

ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا تاکہ وہ پھر آئیں، تو کہہ پھرو ملک میں

فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ

تو دیکھو کیسا ہوا انجام پہلوں کا بہت ان میں تھے

مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِیَ يَوْمٌ

شرک کرنے والے، سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ سیدھی راہ پر اس سے پہلے کہ آپہنچے وہ دن

لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ

جس کو پھرنا نہیں اللہ کی طرف سے اس دن لوگ جدا جدا ہوں گے، جو منکر ہوا سو اس پر پڑے اس کا منکر ہونا

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ لَا لِيَجْزِیَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور جو کوئی کرے بھلے کام سو وہ اپنی راہ سنوارتے ہیں، تاکہ وہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور کام کئے بھلے اپنے فضل سے بے شک اس کو نہیں بھاتے انکار والے

آسان ترجمۂ قرآن

لوگوں نے اپنے ہاتھوں جو کمائی کی، اُس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیلا، تاکہ انہوں نے جو کام کئے ہیں

اللہ اُن میں سے کچھ کا مزہ اُنہیں چکھائے، شاید وہ باز آجائیں۔ ﴿۴۱﴾ (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ: "زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جو لوگ پہلے گذرے ہیں، اُن کا کیسا انجام ہوا۔ اُن میں سے اکثر مشرک تھے۔" ﴿۴۲﴾ لہٰذا تم اپنا رُخ صحیح دِین کی طرف قائم رکھو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کا اللہ کی طرف سے کوئی اِمکان نہیں ہے۔ اُس دن لوگ الگ الگ ہوجائیں گے۔ ﴿۴۳﴾ جس نے کفر کیا ہے، اُس کا کفر اُسی پر پڑے گا، اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے، وہ اپنے لئے ہی راستہ بنا رہے ہیں، ﴿۴۴﴾ نتیجہ یہ کہ اللہ اُن لوگوں کو اپنے فضل سے جزا دے گا جو اِیمان لائے ہیں، اور اُنہوں نے نیک عمل کئے ہیں۔ یقیناً اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿۴۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(شرک و معصیت ایسی بُری چیز ہے کہ) خشکی اور تری (یعنی تمام دنیا) میں لوگوں کے (بُرے) اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں (مثلاً قحط و وباء و طوفان) تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعضے اعمال (کی سزا) کا مزہ ان کو چکھادے تا کہ وہ (اپنے ان اعمال سے) باز آجائیں (جیسا دوسری آیت میں ہے [1] وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (الشوریٰ: ۳۰) اور بعض اعمال کا مطلب یہ ہے کہ اگر سب اعمال پر یہ عقوبتیں مرتب ہوں تو ایک دم زندہ نہ رہیں، کقولہٖ تعالیٰ [2] وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰی ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (فاطر: ۴۵) اسی معنی سے آیتِ بالا میں وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ﴿۳۰﴾ (الشوریٰ) فرمایا ہے، یعنی بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کر دیتے ہیں، بعض ہی اعمال کی سزا دیتے ہیں۔ غرض جب اعمالِ بد مطلقاً سبب وبال ہیں تو شرک و کفر سب سے بڑھ کر موجب عذاب ہوگا اور اگر مشرکین کو اس کے ماننے میں تردّد ہو تو) آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ ملک میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ جو (کافر و مشرک) لوگ پہلے ہوگزرے ہیں ان کا اخیر کیسا ہوا ان میں اکثر مشرک ہی تھے (سو دیکھ لو وہ عذاب آسمانی سے کس طرح ہلاک ہوئے جس سے صاف واضح ہوا کہ شرک کا بڑا وبال ہے اور بعضے کفر کی دوسری انواع میں مبتلا تھے، جیسے قومِ لوط اور قارون اور جو لوگ مسخ ہو کر بندر اور خنازیر ہوگئے تھے، کیونکہ آیات کی تکذیب اور نبی کی مخالفت کر کے مبتلائے کفر ولعن ہوئے۔ اور شاید شرک کا بالتخصیص ذکر اس لئے ہو کہ کفار مکہ کی خاص اور مشہور حالت یہی تھی اور جب شرک کا موجبِ وبال ہونا محقق ہوگیا) سو (اے مخاطب) تم اپنا رُخ اس دین راست (یعنی توحید اسلامی) کی طرف رکھو قبل اس کے کہ ایسا دن آئے جس کے واسطے پھر خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا (یعنی جیسے دنیا میں خاص عذاب کے وقت کو اللہ تعالیٰ قیامت کے وعدہ پر ہٹاتا جاتا ہے، جب وہ موعود دن

[1] ترجمہ: اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے۔

[2] ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب داروگیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑتا۔

آ جائے گا پھر اس کو نہ ہٹائے گا اور توقف وامہال نہ ہوگا۔ اس جملہ میں شرک کے وبالِ اخروی کا ذکر ہو گیا جیسا اوپر ظَهَرَ الْفَسَادُ الخ اور كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الخ میں وبالِ دنیوی مذکور تھا اور) اس دن (یہ ہوگا کہ) سب (عمل کرنے والے) لوگ (باعتبار جزاء کے) جدا جدا ہو جائیں گے (اس طور پر کہ) جو شخص کفر کر رہا ہے اس پر تو اس کا (وبال) کفر پڑے گا اور جو نیک عمل کر رہا ہے سو یہ لوگ اپنے (نفع کے) لئے سامان کر رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے فضل سے (نیک) جزا دے گا جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے (اور اس سے کفار محروم رہیں گے جیسا اوپر فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ سے معلوم ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا (بلکہ ان کے کفر پر ان سے ناخوش ہے)۔

معارف و مسائل

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ، "یعنی خشکی اور دریا میں سارے جہان میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اعمالِ بد کی وجہ سے" تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فساد سے مراد قحط اور وبائی امراض اور آگ لگنے اور پانی میں ڈوبنے کے واقعات کی کثرت اور ہر چیز کی برکت کا مٹ جانا، نفع بخش چیزوں کا نفع کم نقصان زیادہ ہو جانا وغیرہ آفات ہیں۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان دنیوی آفات کا سبب انسانوں کے گناہ اور اعمالِ بد ہوتے ہیں جن میں شرک و کفر سب سے زیادہ اشد ہیں، اس کے بعد دوسرے گناہ ہیں۔

اور یہی مضمون دوسری ایک آیت میں اس طرح آیا ہے وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ﴿۳۰﴾ (الشوریٰ) یعنی تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے ہے۔ یعنی ان معاصی کے سبب جو تم کرتے رہتے ہو اور بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو مصائب اور آفات تم پر آتی ہیں ان کا حقیقی سبب تمہارے گناہ ہوتے ہیں، اگرچہ دنیا میں نہ ان گناہوں کا پورا بدلہ دیا جاتا ہے اور نہ ہر گناہ پر مصیبت و آفت آتی ہے، بلکہ بہت سے گناہوں کو تو معاف کر دیا جاتا ہے، بعض بعض گناہوں پر ہی گرفت ہوتی اور آفت و مصیبت بھیج دی جاتی ہے۔ اگر ہر گناہ پر دنیا میں مصیبت آیا کرتی، تو ایک انسان بھی زمین پر زندہ نہ رہتا۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کو تو حق تعالیٰ معاف ہی فرما دیتے ہیں اور جو معاف نہیں ہوتے ان کا بھی پورا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا، بلکہ تھوڑا سا مزہ چکھایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت کے آخر میں فرمایا لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا، یعنی تاکہ چکھا دے اللہ تعالیٰ کچھ حصہ ان کے بُرے اعمال کا۔ اور اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اعمالِ بد اور گناہوں کی وجہ سے جو مصیبت و آفت دنیا میں بھیج دی جاتی ہے وہ بھی غور کرو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہی ہے۔ کیونکہ مقصود اس دنیا کی مصیبت

سے یہ ہوتا ہے کہ غافل انسان کو تنبیہ ہو جائے اور وہ اپنے گناہوں اور نافرمانیوں سے باز آ جائے جو انجام کار اس کے لئے مفید اور بڑی نعمت ہے، جیسا کہ آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۴۱

دنیا کی بڑی بڑی آفتیں اور مصائب انسانوں کے گناہوں کے سبب سے آتے ہیں

اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ جو انسان کوئی گناہ کرتا ہے وہ ساری دنیا کے انسانوں چوپایوں اور چرندے وپرندے جانوروں پر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے گناہوں کے وبال سے جو بارش کا قحط اور دوسرے مصائب دنیا میں آتے ہیں اس سے سب ہی جان دار متأثر ہوتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے روز یہ سب بھی گناہگار انسان کے خلاف دعویٰ کریں گے۔

اور شقیق زاہد نے فرمایا کہ جو شخص حرام مال کھاتا ہے وہ صرف اس پر ظلم نہیں کرتا جس سے یہ مال ناجائز طور پر حاصل کیا ہے، بلکہ پورے انسانوں پر ظلم کرتا ہے (روح)[1] کیونکہ اول تو ایک کے ظلم سے دوسرے لوگوں میں ظلم کرنے کی رسم پڑتی ہے، اور یہ سلسلہ ساری انسانیت کو محیط ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس کے ظلم کی وجہ سے دنیا میں آفتیں اور مصائب آتے ہیں جس سے سب ہی انسان متأثر ہوتے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

احادیث صحیحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بھی موجود ہیں کہ دنیا مؤمن کے لئے جیل خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے،[2] اور یہ کہ کافر کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں بصورتِ مال و دولت وصحت دے دیا جاتا ہے، اور مؤمن کے اعمال کا بدلہ آخرت کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے، اور یہ کہ مؤمن کی مثال دنیا میں ایک نازک شاخ کی سی ہے، کہ ہوائیں اس کو کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف جھکا دیتی ہیں، کبھی سیدھا کر دیتی ہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، اور یہ کہ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَآءً الْاَنْبِيَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ،[3] ''یعنی دنیا میں بلائیں سب سے زیادہ انبیاء پر آتی ہیں پھر جو اُن کے قریب ہو پھر جو اُن کے قریب ہو۔''

یہ تمام احادیث صحیحہ بظاہر اس آیت کے مضمون سے مختلف ہیں۔ اور عام دنیا کے مشاہدات بھی یہی بتلاتے ہیں کہ دنیا میں عام طور پر مؤمن مسلمان تنگی اور تکلیف میں اور کفار فجار عیش وعشرت میں رہتے ہیں۔ اگر آیت مذکورہ کے مطابق دنیا کے مصائب اور تکلیفیں گناہوں کے سبب سے ہوتیں تو معاملہ برعکس ہوتا۔

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۱۵ ص:۳۷۸

[2] صحیح مسلم، کتاب الزهد، فصل الدنیا سجن المؤمن إلخ ج:۲ ص:۴۰۷

[3] مسند البزار، مسند سعد بن ابی وقاص رضی الله عنه، رقم الحدیث:۱۱۵۹

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں گناہوں کو مصائب کا سبب ضرور بتلایا ہے مگر علّتِ تامّہ نہیں فرمایا کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آئے تو گناہ ہی کے سبب سے ہوگی۔ جس پر کوئی مصیبت آئے اس کا گناہگار ہونا ضروری ہو بلکہ عام اسباب کا جو دنیا میں دستور ہے کہ سبب واقع ہونے کے بعد اس کا مسبّب واقع ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی دوسرا سبب اس کے اثر کے ظاہر ہونے سے مانع ہو جاتا ہے تو اس سبب کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، جیسے کوئی مسہل یا مُلیّن دواء کے متعلق یہ کہے کہ اس سے اسہال ہوں گے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر بعض اوقات کسی دوسری دواء، غذا یا ہوا وغیرہ کے اثر سے اسہال نہیں ہوتے، جو دوائیں بخار اُتارنے کی ہیں بعض اوقات ایسے عوارض پیش آجاتے ہیں کہ اُن دواؤں کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، خواب آور گولیاں کھا کر بھی نیند نہیں آتی۔ جس کی ہزاروں مثالیں دنیا میں ہر وقت مشاہدہ کی جاتی ہیں۔

اس لئے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اصل خاصہ گناہوں کا یہ ہے کہ ان سے مصائب و آفات آئیں، لیکن بعض اوقات دوسرے کچھ اسباب اس کے منافی جمع ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے مصائب کا ظہور نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں بغیر کسی گناہ کے کوئی آفت و مصیبت آجانا بھی اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ بغیر گناہ کے کوئی تکلیف و مصیبت کسی کو پیش نہیں آتی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ کسی کو کوئی مصیبت و آفت کسی دوسرے سبب سے پیش آجائے جیسے انبیاء واولیاء کو جو مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کا سبب کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی آزمائش اور آزمائش کے ذریعہ ان کے درجات کی ترقی اس کا سبب ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے جن آفات و مصائب کو گناہوں کے سبب سے قرار دیا ہے اس سے مراد وہ آفات و مصائب ہیں جو پوری دنیا پر یا پورے شہر یا بستی پر عام ہو جائیں، عام انسان اور جانور اُن کے اثر سے نہ بچ سکیں۔ ایسی مصائب و آفات کا سبب عموماً لوگوں میں گناہوں کی کثرت خصوصاً علانیہ گناہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ شخصی اور انفرادی تکلیف و مصیبت میں یہ ضابطہ نہیں بلکہ وہ کبھی کسی انسان کی آزمائش کرنے کے لئے بھی بھیجی جاتی ہے، اور جب وہ اس آزمائش میں پورا اترتا ہے تو اس کے درجاتِ آخرت بڑھ جاتے ہیں۔ یہ مصیبت درحقیقت اس کے لئے رحمت و نعمت ہوتی ہے۔ اس لئے انفرادی طور پر کسی شخص کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بہت گناہگار ہے۔ اسی طرح کسی کو خوش عیش بعافیت دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ بڑا نیک صالح بزرگ ہے۔ البتہ عام مصائب و آفات جیسے قحط، طوفان، وبائی امراض، گرانی اشیاءِ ضرورت، چیزوں کی برکت مٹ جانا وغیرہ اس کا اکثر اور بڑا سبب لوگوں کے علانیہ گناہ اور سرکشی ہوتی ہے۔

فائدہ:- حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا کہ اس دنیا میں خیر و شر یا مصیبت و راحت، مشقت و سہولت کے اسباب دو طرح کے ہیں۔ ایک ظاہری، دوسرے باطنی، ظاہری اسباب تو وہی مادی اسباب ہیں جو عام دنیا کی نظر میں اسباب سمجھے جاتے ہیں۔ اور باطنی اسباب انسانی اعمال اور ان کی بناء پر فرشتوں کی امداد و نصرت یا اُن کی لعنت

ونفرت ہیں۔ جیسے دنیا میں بارش کے اسباب اہلِ فلسفہ واہلِ تجربہ کی نظر میں سمندر سے اُٹھنے والے بخارات (مان سون) اور پھر اوپر کی ہوا میں پہنچ کر ان کا منجمد ہونا، پھر آفتاب کی شعاعوں سے پگھل کر برس جانا ہیں، مگر روایاتِ حدیث میں ان چیزوں کو فرشتوں کا عمل بتلایا گیا ہے۔ درحقیقت ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ایک چیز کے اسباب متعدد ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ظاہری اسباب یہی ہوں، اور باطنی اسباب فرشتوں کا تصرف ہو۔ یہ دونوں طرح کے اسباب جمع ہوجائیں تو بارش امید اور ضرورت کے مطابق ہوا اور جہاں یہ دونوں اسباب جمع نہ ہوں وہاں بارش کے وقوع میں اختلال رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اسی طرح دنیا کے مصائب وآفات کے کچھ اسباب طبعیہ مادّیہ ہیں جو نیک وبد کو نہیں پہچانتے۔ آگ جلانے کے لئے ہے وہ بلا امتیاز متقی اور فاجر کے سب کو جلائے ہی گی بجز اس کے کسی خاص فرمان کے ذریعہ اس کو اس عمل سے روک دیا جائے، جیسے نارِ نمرود ابراہیم علیہ السلام کے لئے بَرد وسلام بنادی گئی، پانی وزنی چیزوں کو غرق کرنے کے لئے ہے وہ یہی کام کرے گا، اسی طرح دوسرے عناصر جو خاص خاص کاموں کے لئے ہیں وہ اپنی مفوضہ خدمت میں لگے ہوئے ہیں، یہ اسباب طبعیہ کسی انسان کے لئے راحت وسہولت کے سامان بھی فراہم کرتے ہیں، اور کسی کے لئے مصیبت وآفت بھی بن جاتے ہیں۔

انہی اسباب ظاہرہ کی طرح مصائب وآفات اور راحت وسہولت میں مؤثر انسان کے اپنے اعمالِ خیر وشر بھی ہیں۔ جب دونوں ظاہری اور باطنی اسباب کسی فرد یا جماعت کی راحت وآرام اور سہولت وخوش عیشی پر جمع ہوجاتے ہیں تو اس فرد یا جماعت کو دنیا میں عیش وراحت مکمل طور پر حاصل ہوتی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس فرد یا جماعت کے لئے اسباب طبعیہ مادّیہ بھی مصیبت وآفت لارہے ہوں اور اس کے اعمال بھی مصیبت وآفت کے مقتضی ہوں تو اس کی مصیبت وآفت بھی مکمل ہوتی ہے جس کا عام مشاہدہ ہوتا ہے۔

اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسباب طبعیہ مادّیہ تو مصیبت وآفت پر مجتمع ہیں، مگر اس کے اعمالِ حسنہ باطنی طور پر راحت وسکون کے مقتضی ہیں ایسی صورت میں یہ اسباب باطنہ اس کی ظاہری آفتوں کو دور کرنے یا کم کرنے میں صرف ہوجاتے ہیں اس کی عیش وراحت مکمل طور پر سامنے نہیں آتی۔ اسی طرح اس کے برعکس بعض اوقات اسباب مادیہ عیش وآرام کے مقتضی ہوتے ہیں مگر اسباب باطنیہ یعنی اس کے اعمال بُرے ہونے کی وجہ سے ان کا تقاضا مصیبت وآفت لانے کا ہوتا ہے، تو ان متضاد تقاضوں کی وجہ سے نہ عیش وراحت مکمل ہوتی ہے اور نہ بہت زیادہ مصیبت وآفت ان کو گھیرتی ہے۔

اسی طرح بعض اوقات مادی اسباب طبعیہ کو کسی بڑے درجہ کے نبی ورسول اور ولی ومقبول کے لئے ناسازگار بنا کر اس کی آزمائش وامتحان کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس تفصیل کو سمجھ لیا جائے تو آیات قرآن اور مذکورہ احادیث کا باہم ارتباط اور اتفاق واضح ہوجاتا ہے، تعارض وتضاد کے شبہات رفع ہوجاتے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

مصائب کے وقت ابتلا وامتحان یا سزا وعذاب میں فرق

مصائب وآفات کے ذریعہ جن لوگوں کو ان کے گناہوں کی کچھ سزا دی جاتی ہے، اور جن نیک لوگوں کو رفع درجات یا کفارۂ سیئات کے لئے بطور امتحان مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے، ظاہری صورت ابتلاء کی ایک ہی سی ہوتی ہے، ان دونوں میں فرق کیسے پہچانا جائے؟ اس کی پہچان حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ لکھی ہے کہ جو نیک لوگ بطور ابتلاء وامتحان کے گرفتار مصائب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو مطمئن کر دیتے ہیں، اور وہ ان مصائب وآفات پر ایسے ہی راضی ہوتے ہیں جیسے بیمار کڑوی دواء یا آپریشن پر باوجود تکلیف محسوس کرنے کے راضی ہوتا ہے، بلکہ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتا ہے، سفارشیں مہیا کرتا ہے۔ بخلاف اُن گنہگاروں کے جو بطور سزاء مبتلاء کئے جاتے ہیں ان کی پریشانی اور جزع وفزع کی حد نہیں رہتی، بعض اوقات ناشکری بلکہ کلماتِ کفر تک پہنچ جاتے ہیں۔

سیّدی حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے ایک پہچان یہ بتلائی کہ جس مصیبت کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اپنے گناہوں پر تنبہ اور توبہ واستغفار کی رغبت زیادہ ہو جائے وہ علامت اس کی ہے کہ یہ قہر نہیں بلکہ مہر اور عنایت ہے، اور جس کو یہ صورت نہ بنے بلکہ جزع وفزع اور معاصی میں اور زیادہ انہماک بڑھ جائے وہ علامت قہرِ الٰہی اور عذاب کی ہے۔ واللہ اعلم

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی اور تا کہ چکھائے تم کو کچھ مزہ اپنی مہربانی کا

وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۴۶

اور تا کہ چلیں جہاز اس کے حکم سے اور تا کہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تا کہ تم حق مانو،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

اور ہم بھیج چکے ہیں تجھ سے پہلے کتنے رسول اپنی اپنی قوم کے پاس سو پہنچے ان کے پاس نشانیاں لے کر

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

پھر بدلہ لیا ہم نے ان سے جو گنہگار تھے اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی،

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ

اللہ ہے جو چلاتا ہے ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر پھیلا دیتا ہے اس کو آسمان میں جس طرح چاہے

وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ

اور رکھتا ہے اس کو تہ بہ تہ پھر تو دیکھے مینہ کو نکلتا ہے اس کے بیچ میں سے پھر جب اس کو پہنچاتا ہے

مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ

جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے تب ہی وہ لگتے ہیں خوشیاں کرنے، اور پہلے سے ہو رہے تھے

اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ

اس کے اُترنے سے پہلے ہی ناامید سو دیکھ لے اللہ کی مہربانی کی نشانیاں

كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ

کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے، بیشک وہی ہے مُردوں کو زندہ کرنے والا اور وہ ہر

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ

چیز کرسکتا ہے، اور اگر ہم بھیجیں ایک ہوا پھر دیکھیں وہ کھیتی کو کہ زرد پڑگئی تو لگیں اس کے پیچھے

يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ

ناشکری کرنے سو تو سنا نہیں سکتا مُردوں کو اور نہیں سُنا سکتا بہروں کو پکارنا

اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ

جبکہ پھیریں پیٹھ دے کر، اور نہ تو راہ سجھائے اندھوں کو ان کے بھٹکنے سے،

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع

تُو تو سُنائے اسی کو جو یقین لائے ہماری باتوں پر سو وہ مسلمان ہوتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُس (اللہ کی قدرت) کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے جو (بارش کی) خوشخبری لے کر آتی ہیں، اور اس لئے بھیجتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت کا کچھ مزہ چکھائے، اور تاکہ کشتیاں اُس کے حکم سے پانی میں چلیں، اور تم اُس کا فضل تلاش کرو، اور شکر اَدا کرو۔ ﴿۴۶﴾ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر اُن کی قوموں کے پاس بھیجے، چنانچہ وہ اُن کے پاس کھلے کھلے دلائل لے کر آئے۔ پھر جنہوں نے جرائم کا ارتکاب کیا تھا، ہم نے اُن سے انتقام لیا، اور ہم نے یہ ذمہ داری لی تھی کہ ایمان والوں کی مدد کریں۔ ﴿۴۷﴾ اللہ ہی وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے، چنانچہ وہ بادل کو اُٹھاتی ہیں، پھر وہ اُس (بادل) کو جس طرح چاہتا ہے، آسمان میں پھیلا دیتا ہے، اور اُسے کئی تہوں (والی گھٹا) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تب تم دیکھتے ہو کہ اُس کے درمیان سے بارش برس رہی ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنے بندوں میں سے جن کو چاہتا ہے، وہ بارش پہنچاتا ہے تو وہ اچانک خوشی منانے لگتے ہیں، ﴿۴۸﴾ حالانکہ اس سے پہلے جب تک اُن پر بارش نہیں برسائی گئی تھی، وہ نا اُمید ہو رہے تھے۔ ﴿۴۹﴾ اب ذرا اللہ کی رحمت کے اثرات دیکھو کہ وہ زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندگی بخشتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ ﴿۵۰﴾ اور اگر ہم (نقصان دہ) ہوا چلا دیں جس کے نتیجے میں وہ اپنے کھیت کو پیلا پڑا ہوا دیکھیں تو اس کے بعد یہ ناشکری کرنے لگیں۔ ﴿۵۱﴾ غرض (اے پیغمبر!) تم مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے، اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں، ﴿۵۲﴾ اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گمراہی سے نکال کر راستے پر ڈال سکتے ہو۔ تم تو اُنہی لوگوں کو اپنی بات سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں، پھر فرماں بردار بن جائیں۔ ﴿۵۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی (قدرت ووحدت ونعمت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ وہ (بارش سے پہلے)

ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی) خوش خبری دیتی ہیں (پس ان کا بھیجنا ایک تو جی خوش کرنے کے لئے ہوتا ہے) اور (نیز اس واسطے) تا کہ (اس کے بعد بارش ہو اور) تم کو اپنی (اس) رحمت (بارش) کا مزہ چکھائے (یعنی بارش کے فوائد عنایت فرمائے) اور (نیز اس واسطے ہوا بھیجتا ہے) تا کہ (اس کے ذریعے سے بادبانی) کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تا کہ (اس ہوا کے ذریعہ سے بواسطۂ کشتی دریا کے سفر سے) تم اس کی روزی تلاش کرو (یعنی کشتیوں کا چلنا اور روزی تلاش کرنا دونوں ارسالِ ریاح سے حاصل ہوتے ہیں اول بلاواسطہ اور ثانی بواسطۂ کشتی کے) اور تا کہ تم شکر کرو اور (ان دلائلِ بالغہ اور نعمِ سابغہ پر بھی یہ مشرکین حق تعالیٰ کی جو ناشکریاں کرتے ہیں، یعنی شرک اور مخالفتِ رسول، اور ایذاءِ مؤمنین وغیرہ، تو آپ اس پر غمگین نہ ہوں، کیونکہ ہم عنقریب ان سے انتقام لینے والے اور اس میں ان کو مغلوب اور اہلِ حق کو غالب کرنے والے ہیں جیسا کہ پہلے بھی ہوا ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبران کی قوموں کے پاس بھیجے اور وہ ان کے پاس دلائلِ (ثبوتِ حق کے) لے کر آئے (جس پر بعضے ایمان لائے اور بعضے نہ لائے) سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم کے ہوئے تھے (اور وہ جرائم تکذیبِ حق و مخالفتِ اہلِ حق ہیں اور اس انتقام میں ہم نے ان کو مغلوب اور اہلِ ایمان کو غالب کیا) اور اہلِ ایمان کو غالب کرنا (حسبِ وعدہ و عادت) ہمارے ذمہ تھا (وہ انتقام عذاب الٰہی تھا اور اس میں کفار کا ہلاک ہونا یا ان کا مغلوب ہونا ہے اور مسلمانوں کا بچ جانا (ان کا غالب آنا ہے، غرض اسی طرح ان کفار سے انتقام لیا جائے گا، خواہ دنیا میں خواہ بعد موت اور یہ مضمون تسلّی کا بطور جملہ معترضہ کے تھا آگے ارسال ریاح کے بعضے آثار مذکورہ بالا جمال کی تفصیل ہے کہ) اللہ ایسا (قادر و حکیم و منعم) ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو (جو کہ کبھی ان ہواؤں سے پہلے بخارات اٹھ کر بادل بن چکتے ہیں اور کبھی وہ بخارات انہی ہواؤں سے بلند ہو کر بادل بن جاتے ہیں پھر وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے یعنی فضائے آسمانی سے یا زمین سے) اٹھاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس (بادل) کو (کبھی تو) جس طرح چاہتا ہے آسمان (یعنی فضائے آسمانی) میں پھیلا دیتا ہے، اور (کبھی) اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے (بسط کا مطلب یہ ہے کہ مجتمع کر کے دور تک پھیلا دیتا ہے اور كَيْفَ يَشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ کبھی تھوڑی دور تک کبھی بہت دُور تک اور كِسَفًا کا مطلب یہ کہ مجتمع نہیں ہوتا متفرق رہتا ہے) پھر (دونوں حالت میں) تم مینہ کو دیکھتے ہو کہ اس (بادل) کے اندر سے نکلتا ہے (مجتمع بادل سے برسنا تو بکثرت ہے اور بعض موسموں میں اکثر بارش متفرق بدلیوں سے بھی ہوتی ہے) پھر (بادل سے نکلنے کے بعد) جب وہ (مینہ) اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے تو بس وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ قبل اس کے کہ ان کے خوش ہونے سے پہلے اُن پر برسے (بالکل ہی) ناامید (ہو رہے) تھے (یعنی ابھی ابھی ناامید تھے اور ابھی خوش ہو گئے۔ اور ایسا ہی مشاہدہ بھی ہے کہ انسان کی کیفیت ایسی حالت میں بہت جلدی جلدی بدل جاتی ہے) سو (ذرا) رحمت الٰہی (یعنی بارش) کے آثار (تو) دیکھو کہ اللہ تعالیٰ (اس کے ذریعہ سے) زمین کو اس کے مُردہ (یعنی خشک)

ہونے کے بعد کس طرح زندہ (یعنی تروتازہ) کرتا ہے (اور یہ بات نعمت اور دلیل وحدت ہونے کے علاوہ اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر پوری قدرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا نے مردہ زمین کو زندہ کردیا) کچھ شک نہیں کہ وہی (خدا) مردوں کو زندہ کرنے والا ہے (پس عقلاً ممکن ہونے میں دونوں برابر اور قدرت ذاتی دونوں کے ساتھ برابر اور مشاہدہ میں دونوں کاموں کا یکساں ہونا یہ سب چیزیں اس استبعاد کو رفع کرنے والی ہیں کہ مرنے کے بعد پھر کیسے زندہ ہوں گے) اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (یہ مضمون احیاء موتی کا بمناسب حیاتِ ارض کے جملۂ معترضہ تھا) اور (آگے پھر بارش و ریاح کے متعلق مضمون ہے، جس میں اہلِ غفلت کی ناشکری کا بیان ہے۔ یعنی اہلِ غفلت ایسے حق ناشناس و ناسپاس ہیں کہ اتنی بڑی بڑی نعمتوں کے بعد) اگر ہم ان پر اور (قسم کی) ہوا چلادیں پھر (اس ہوا سے) یہ لوگ کھیتی کو (خشک اور) زرد دیکھیں (کہ اس کی سبزی اور شادابی جاتی رہی) تو یہ اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں (اور پچھلی نعمتیں سب طاقِ نسیاں میں رکھ دیں) سو (جب ان کی غفلت اور ناشکری پر اقدام اس درجہ میں ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ بالکل ہی بے حس ہیں تو ان کے عدمِ ایمان و عدمِ تدبّر پر غم بھی بے کار ہے، کیونکہ) آپ مُردوں کو (تو) نہیں سُنا سکتے اور بہروں کو (بھی) آواز نہیں سُنا سکتے (خصوصاً) جبکہ پیٹھ پھیر کر چل دیں (کہ اشارہ کو بھی نہ دیکھیں) اور (اسی طرح) آپ (ایسے) اندھوں کو (جو کہ بصیر کا اتباع نہ کریں) اُن کی بے راہی سے راہ پر نہیں لاسکتے (یعنی یہ تو ماؤف الحواس والحیٰوۃ کے مشابہ ہیں) آپ تو بس ان کو سنا سکتے ہیں، جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں (اور جب یہ لوگ مُردوں، بہروں، اندھوں کے مشابہ ہیں پھر ان سے توقع ایمان کی نہ رکھئے اور غم نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۭ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ؀ ''ہم نے مجرموں کافروں سے انتقام لے لیا، اور ہمارے ذمہ تھا کہ ہم مؤمنین کی مدد کرتے۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ مؤمنین کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا تقاضا بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں کبھی شکست نہ ہو، حالانکہ بہت سے واقعات اس کے خلاف بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے کہ مؤمنین سے مراد وہ مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں جو خالص اللہ کے لئے کفار سے جنگ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ہی انتقام اللہ تعالیٰ مجرمین سے لیتے ہیں اور ان کو غالب کرتے ہیں، جہاں کہیں اس کے خلاف کوئی صورت پیش آتی ہے وہاں عموماً مجاہدین کی کوئی لغزش ان کی شکست کا سبب بنتی ہے، جیسے غزوۂ اُحد کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران:۱۵۵) ''یعنی شیطان نے ان لوگوں کو لغزش دے دی، ان کے بعض اعمال کی غلطی کے سبب'' اور ایسے حالات

میں بھی انجام کار اللہ تعالیٰ پھر انہی کو غلبہ اور فتح عطا فرما دیتے ہیں، جبکہ ان کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو جائے جیسا غزوۂ اُحد میں ہوا۔ اور جو لوگ محض اپنا نام مؤمن مسلمان رکھ لیں، احکامِ خداوندی سے غفلت و سرکشی کے عادی ہوں، اور غلبۂ کفار کے وقت بھی اپنے گناہوں سے تائب نہ ہوں وہ اس وعدہ میں شامل نہیں، وہ نصرت الٰہیہ کے مستحق نہیں ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بغیر کسی استحقاق کے بھی نصرت و غلبہ عطا فرما دیتے ہیں، اس کی امید رکھنا اور اس سے دعاء مانگنا ہر حال میں مفید ہی مفید ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى، اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے رہا یہ معاملہ کہ مُردوں میں سننے کی صلاحیت ہے یا نہیں اور عام مُردے زندوں کا کلام سنتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ کی مختصر تحقیق معارف القرآن سورۂ نمل کی تفسیر میں گزر چکی ہے، اور مکمل تحقیق احقر کے مستقل رسالہ بزبانِ عربی میں ہے جس کا نام "تکمیل الحبور بسماع اھل القبور" ہے، اور جو احکام القرآن بزبان عربی کے حزب خامس کا جز ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً

اللہ ہے جس نے بنایا تم کو کمزوری سے پھر دیا کمزوری کے پیچھے زور

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ

پھر دے گا زور کے پیچھے کمزوری اور سفید بال، بناتا ہے جو کچھ چاہے اور وہ ہے سب کچھ جانتا

الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا

کرسکتا اور جس دن قائم ہوگی قیامت قسمیں کھائیں گنہگار، کہ ہم نہیں رہے تھے

غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

ایک گھڑی سے زیادہ اسی طرح تھے اُلٹے جاتے، اور کہیں گے جن کو ملی ہے سمجھ

وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا

اور یقین تمہارا ٹھہرنا تھا اللہ کی کتاب میں جی اُٹھنے کے دن تک سو یہ ہے

قرء حفص بضم الضاد وفتحها فی الثلاثة والضم مختار ۱۲

يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ

اُٹھنے کا دن پر تم نہیں تھے جانتے، اس دن کام نہ آئے گا

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ

اُن گنہگاروں کو قصور بخشوانا اور نہ اُن سے کوئی منانا چاہے، اور ہم نے بٹھلائی ہے آدمیوں کے واسطے

فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ

اس قرآن میں ہر ایک طرح کی مثل، اور جو تو لائے ان کے پاس کوئی آیت تو ضرور کہیں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ

وہ منکر تم سب جھوٹ بناتے ہو، یوں مُہر لگادیتا ہے اللہ ان کے دلوں پر

الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ

جو سمجھ نہیں رکھتے، سو تو قائم رہ بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور اکھاڑ نہ دیں تجھ کو

الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کمزوری سے کی، پھر کمزوری کے بعد طاقت عطا فرمائی، پھر طاقت کے بعد (دوبارہ) کمزوری اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے، اور وہی ہے جس کا علم بھی کامل ہے، قدرت بھی کامل۔ ﴿۵۴﴾ اور جس دن قیامت برپا ہوگی، اُس دن مجرم لوگ قسم کھالیں گے کہ وہ (برزخ میں) ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ اسی طرح (دُنیا میں بھی) وہ اوندھے چلا کرتے تھے۔ ﴿۵۵﴾ جن لوگوں کو علم اور ایمان عطا کیا گیا ہے، وہ کہیں گے کہ:

"تم اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق حشر کے دن تک (برزخ میں) پڑے رہے ہو۔ اب یہ وہی حشر کا دن ہے، لیکن تم لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔" (۵۶) چنانچہ جن لوگوں نے ظلم کی راہ اپنائی تھی، اُس دن اُن کی معذرت اُنہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی، اور نہ اُن سے یہ کہا جائے گا کہ اللہ کی ناراضی دُور کرو۔ (۵۷) اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں (کو سمجھانے) کی خاطر ہر قسم کی باتیں بیان کی ہیں۔ اور (اے پیغمبر!) اِن کا حال یہ ہے کہ تم ان کے پاس کوئی بھی نشانی لے آؤ، یہ کافر لوگ پھر بھی یہی کہیں گے کہ تم کچھ بھی نہیں، بالکل غلط کار ہو۔ (۵۸) اللہ اسی طرح اُن لوگوں کے دِلوں پر ٹھپہ لگا دیتا ہے جو سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ (۵۹) لہٰذا (اے پیغمبر!) تم صبر سے کام لو، یقین جانو اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ جو لوگ یقین نہیں کرتے، اُن کی وجہ سے تم ڈھیلے پڑ جاؤ۔ (۶۰)

خلاصۂ تفسیر

اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا (مراد اس سے ابتدائی حالت بچپن کی ہے) پھر (اس) ناتوانی کے بعد توانائی (یعنی جوانی) عطا کی پھر (اس) توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کیا (اور) وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ (ہر تصرف کو) جاننے والا (اور اس تصرف کے نافذ کرنے پر) قدرت رکھنے والا ہے (پس جو ایسا قادر ہو اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ یہ تو بیان تھا بَعْث کے امکان کا) اور (آگے اس کے وقوع کا بیان ہے یعنی) جس روز قیامت ہوگی مجرم (یعنی کافر) لوگ (وہاں کی ہول وہیبت و پریشانی کو دیکھ کر قیامت کی آمد کو غایت درجہ ناگوار سمجھ کر) قسم کھا بیٹھیں گے کہ (قیامت بہت جلدی آگئی اور) وہ لوگ (یعنی ہم لوگ عالمِ برزخ میں) ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے (یعنی جو میعاد قیامت کے آنے کی مقرر تھی وہ بھی پوری نہ ہونے پائی کہ قیامت آپہنچی جیسا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اگر پھانسی والے کی میعاد ایک ماہ مقرر کی جائے تو جب مہینہ گزر چکے گا تو اس کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا مہینہ نہیں گزرا اور مصیبت جلدی آگئی، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) اسی طرح یہ لوگ (دنیا میں) اُلٹے چلا کرتے تھے (یعنی جس طرح یہاں آخرت میں قیامت کے قبل از وقت آجانے پر قسمیں کھانے لگے، اسی طرح دنیا میں قیامت کے وجود ہی کے منکر تھے اور نہ آنے پر قسمیں کھایا کرتے تھے)۔

اور جن لوگوں کو ایمان اور علم عطا ہوا ہے (مراد اہلِ ایمان ہیں کہ اخبارِ شرعیہ کا علم ان کو حاصل ہے) وہ (ان مجرمین کے جواب میں) کہیں گے کہ (تم برزخ میں میعاد سے کم تو نہیں رہے، تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ) تم تو (میعاد) نوشتۂ خداوندی کے موافق قیامت کے دن تک رہے، سو قیامت کا دن یہی ہے، (جو میعاد مقرر تھی برزخ میں رہنے کی) ولیکن (وجہ اس بات کی کہ قیامت کو میعاد سے پہلے آیا ہوا سمجھتے ہو یہ ہے کہ) تم (دنیا میں قیامت کے وقوع کا) یقین (اور

اعتقاد) نہ کرتے تھے (بلکہ تکذیب وانکار کیا کرتے تھے اس انکار کے وبال میں آج پریشانی کا سامنا ہوا اس وجہ سے گھبرا کر یہ خیال ہوا کہ ابھی تو میعاد پوری بھی نہیں ہوئی اور اگر تصدیق کرتے اور ایمان لے آتے تو اس کے وقوع کو جلد نہ سمجھتے بلکہ یوں چاہتے کہ اس سے بھی جلدی آجائے، کیونکہ انسان جب اس سے کسی راحت وآرام کا وعدہ ہو تو طبعی طور پر اس کا جلدی آنا چاہتا ہے اور انتظار شاق اور اس کی مدت طویل معلوم ہوا کرتی ہے۔ جیسا حدیث میں بھی ہے کہ کافر قبر میں کہتا ہے [۱] رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ اور مؤمن کہتا ہے [۲] رَبِّ اَقِمِ السَّاعَةَ، [۳] اور مؤمنین کے اس جواب سے بھی جو یہاں مذکور ہے کہ مقامِ برزخ کو انہوں نے بہت سمجھا ہے، یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ مشتاق تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ جلد آجائے) غرض اس روز ظالموں (یعنی کافروں کی پریشانی اور مصیبت کی یہ کیفیت ہوگی کہ ان) کو ان کا (کسی قسم کا جھوٹا سچا) عذر کرنا نفع نہ دے گا اور نہ اُن سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جائے گا (یعنی اس کا موقع نہ دیا جائے گا کہ توبہ کر کے خدا کو راضی کر لیں) اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے اس قرآن (کے مجموعہ یا اس کے اس خاص جز و یعنی اس سورۃ) میں ہر طرح کے عمدہ (اور عجیب) مضامین (ضروریہ) بیان کئے ہیں (جو اپنی بلاغت اور کمال کی وجہ سے مقتضی اس کو ہیں کہ ان کافروں کو ہدایت ہو جاتی، مگر ان لوگوں نے غایتِ عناد سے اس کو قبول نہ کیا اور اس سے منتفع نہ ہوئے) اور (قرآن کی کیا تخصیص ہے ان لوگوں کا عناد اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ) اگر (قرآن کے علاوہ ان معجزات سے جن کی یہ خود فرمائش کیا کرتے ہیں) آپ اُن کے پاس کوئی نشان لے آئیں تب بھی یہ لوگ جو کہ کافر ہیں یہی کہیں گے کہ تم سب (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین جو آیات تشریعیہ وتکوینیہ کی تصدیق کرتے ہیں) نرے اہلِ باطل ہو (پیغمبر کو سحر کی تہمت لگا کر صاحبِ باطل کہیں اور مسلمانوں کو سحر کی تصدیق کرنے سے اہلِ باطل کہیں اور ان لوگوں کے اس عناد کے بارے میں اصل بات یہ ہے کہ) جو لوگ (باوجود مکرر نشانیاں اور دلائلِ حق ظاہر ہونے کے) یقین نہیں کرتے (اور نہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر یوں ہی مُہر کر دیتا ہے (جیسا کہ ان کے دلوں پر ہو رہی ہے، یعنی روزانہ استعداد قبولِ حق کی مضمحل وضعیف ہوتی جاتی ہے، اس لئے انقیاد میں ضعف اور عناد میں قوت بڑھتی جاتی ہے) سو (جب یہ ایسے معاندین ہیں تو ان کی مخالفت اور ایذاء رسانی اور بدکلامی وغیرہ پر) آپ صبر کیجئے بیشک اللہ تعالیٰ کا وعدہ (کہ آخر میں یہ ناکام اور اہلِ حق کامیاب ہوں گے) سچا ہے (وہ وعدہ ضرور واقع ہوگا پس صبر وتحمل تھوڑے ہی دن کرنا پڑتا ہے) اور یہ بدیقین لوگ آپ کو بے برداشت نہ کرنے پائیں (یعنی ان کی طرف سے خواہ کیسی ہی بات پیش آئے مگر ایسا نہ ہو کہ آپ برداشت نہ کریں)۔

---

[۱] ترجمہ: اے میرے پروردگار قیامت قائم نہ کر۔ [۲] ترجمہ: اے میرے پروردگار قیامت قائم کر دیجئے۔

[۳] مسند احمد، حدیث البراء بن عازب رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث: ۱۹۰۳۸

معارف و مسائل

اس سورت کا بڑا حصہ منکرین قیامت کے شبہات کے ازالہ سے متعلق ہے جس کے لئے حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کاملہ اور حکمت بالغہ کی بہت سی آیات اور نشانیاں دکھلا کر غافل انسان کو غفلت سے بیدار کرنے کا سامان کیا گیا ہے۔ مذکور الصدر پہلی آیت میں ایک نئے انداز سے اسی مضمون کا اثبات ہے وہ یہ کہ انسان اپنی طبیعت سے جلد باز واقع ہوا ہے اور سامنے کی چیزوں میں لگ کر ماضی و مستقبل کو بھلا دینے کا عادی ہے، اور اس کی یہی عادت اس کو بہت سی مہلک غلطیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ جس وقت انسان جوان ہوتا ہے اس کی قوت اپنے شباب پر ہوتی ہے، یہ اپنی قوت کے نشہ میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا، حدود پر قائم رہنا اس کو دُوبھر معلوم ہوتا ہے۔ اس کو متنبہ کرنے کے لئے اس آیت میں قوت وضعف کے اعتبار سے انسانی وجود کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں دکھلایا ہے کہ انسان کی ابتداء بھی کمزور ہے، اور انتہاء بھی، درمیان میں بہت تھوڑے دنوں کے لئے اس کو ایک قوت ملتی ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس چندروزہ قوت کے زمانہ میں اپنی پہلی کمزوری اور آنے والی کمزوری سے کبھی غافل نہ ہو، بلکہ اپنی اس کمزوری کے مختلف درجات کو ہمیشہ سامنے رکھے۔ جن سے گزر کر یہ قوت وشباب تک پہنچا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ میں انسان کو یہی سبق دیا گیا کہ اپنی اصل بنیاد کو دیکھ، کس قدر ضعیف بلکہ عین ضعف ہے کہ ایک قطرۂ بے جان، بے شعور، ناپاک، گھناؤنی چیز ہے۔ اس میں غور کر کہ کس کی قدرت وحکمت نے اس گھناؤنے قطرہ کو ایک خون منجمد کی صورت میں پھر خون کو گوشت کی صورت میں پھر اس گوشت کے اندر ہڈیاں پیوست کرنے میں تبدیلیاں کیں۔ پھر اس کے اعضاء وجوارح کی نازک نازک مشینیں بنائیں کہ یہ ایک چھوٹا سا وجود ایک چلتی پھرتی فیکٹری بن گیا، جس میں سیکڑوں عجیب وغریب خودکار مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ اور زیادہ غور سے کام لو تو ایک فیکٹری نہیں بلکہ ایک عالم اصغر ہے کہ پورے جہان کے نمونے اس کے وجود میں شامل ہیں۔ اس کی تخلیق وتکوین بھی کسی بڑے ورکشاپ میں نہیں، بلکہ بطن مادر کی تین اندھیریوں میں ہوئی۔ اور نو مہینے اسی تنگ وتاریک جگہ میں بطن مادر کے خون اور آلائشوں سے غذا پاتے ہوئے حضرت انسان کا وجود تیار ہوا۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ (عبس) پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ظہور کے لئے راستہ آسان فرما دیا اس عالم میں آئے تو ان کی شان یہ تھی کہ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا (النحل: ۷۸) یعنی تمہیں شکم مادر سے اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، اب قدرت نے تعلیم وتلقین کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلا ہنر رونے کا سکھلایا جس

سے ماں باپ متوجہ ہوکر اس کی بھوک پیاس اور ہر تکلیف کو دور کرنے پر لگ جائیں۔ پھر ہونٹوں، مسوڑوں کو دبا کر ماں کی چھاتیوں سے دودھ نکالنے کا ہنر سکھلایا، جس سے وہ اپنی غذاء حاصل کرے۔ کس کی مجال تھی جو اس لایعقل بچے کو یہ دونوں ہنر سکھادے جو اس کی موجودہ ساری ضرورتوں کی کفالت کرتے ہیں، بجز اس قدرت کے جو اس کی تخلیق کی مالک ہے۔ اب ضعیف بچہ ہے ذرا ہوا لگ جائے تو پژمردہ ہوجائے، ذرا سردی یا گرمی لگ جائے تو بیمار ہوجائے نہ اپنی کسی ضرورت کو مانگ سکتا ہے، نہ کسی تکلیف کو دور کرسکتا ہے۔ یہاں سے چلئے اور جوانی کے عالم تک اس کی تدریجی منازل تک غور کرتے جایئے تو قدرتِ حق جل شانہٗ کا ایسا عظیم شاہکار سامنے آئے گا کہ عقل حیران رہ جائے گی۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً، اب یہ قوت کی منزل میں پہنچے تو زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے، چاند اور مریخ پر کمند پھینکنے لگے، بحر و بر پر اپنے قبضے جمانے لگے، اپنے ماضی و مستقبل سے غافل ہوکر مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حٰمٓ السجدۃ:۱۵) (ہم سے زیادہ کون قوی ہوسکتا ہے) کے نعرے لگانے لگے۔ یہاں تک کہ اسی قوت کے نشہ میں اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے اور اس کے احکام کی پیروی کو بھی۔ مگر قدرت نے اس کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا:- ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً کہ غافل! خوب سمجھ لے کہ یہ قوت تیری چند روزہ ہے۔ پھر اسی ضعف کے عالم کی طرف لوٹنا ہے، اور اسی تدریج سے ضعف بڑھنا شروع ہوگا جس کا اثر ایک وقت کے بعد شَيْبَة بالوں کی سفیدی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور پھر سب ہی اعضاء و جوارح کی شکل وصورت میں تبدیلیاں لائے گا۔ دنیا کی تاریخ اور دوسری کتابیں نہیں خود اپنے وجود میں لکھی ہوئی اس مخفی تحریر کو پڑھ لو تو اس یقین کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا کہ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾ کہ یہ سب کارسازی اس رَبّ العزّت کی ہے جو پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور علم میں سب سے بڑا ہے اور قدرت میں بھی۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کچھ شبہ کی گنجائش رہ گئی، کہ وہ جب چاہے مُردوں کو دوبارہ بھی زندہ کرسکتا ہے۔

آگے پھر منکرینِ قیامت کی لغوگوئی اور ان کی جہالت کا بیان ہے، وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ "یعنی جس روز قیامت قائم ہوگی تو یہ منکرینِ قیامت اس وقت کے ہولناک مناظر سے مدہوش ہوکر یہ قسمیں کھانے لگیں گے، کہ ہمارا قیام تو ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہا۔ مراد اس قیام سے ہوسکتا ہے کہ دنیا کا قیام ہو کیونکہ ان کی دنیا آرام وعیش سے گزری تھی اور اب مصائبِ شدیدہ سامنے آئے تو جیسے انسان کی طبعی عادت ہے کہ راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھا کرتا ہے اس لئے قسمیں کھائیں گے کہ دنیا میں تو ہمارا قیام بہت ہی مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس قیام سے مراد قبر اور برزخ کا قیام ہو، اور مطلب یہ ہو کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ قبر یعنی عالمِ برزخ میں قیام بہت طویل ہوگا اور قیامت بہت زمانہ کے بعد آئے گی، مگر معاملہ برعکس ہوگیا، کہ ہم برزخ میں تھوڑے ہی دیر ٹھہرنے پائے تھے کہ قیامت آگئی۔ اور یہ جلدی آنا ان کو اس بناء پر محسوس ہوگا کہ قیامت میں ان کے لئے کوئی خوشی وراحت کی چیز تو تھی نہیں، مصیبت ہی مصیبت تھی۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ مصیبت آنے کے وقت پچھلی راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھنے لگتا ہے، اور کافروں کو اگرچہ قبر و برزخ میں بھی عذاب ہوگا مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ بھی راحت محسوس ہونے لگے گا، اور اس زمانے کو مختصر سمجھ کر قسم کھائیں گے کہ قبر میں ہمارا قیام بہت مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

کیا محشر میں اللہ کے سامنے کوئی جھوٹ بول سکے گا؟

اس آیت سے معلوم ہوا کہ محشر میں کفار قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ ہم تو دنیا میں یا قبر میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، اسی طرح ایک دوسری آیت میں مشرکین کا یہ قول مذکور ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے [1] وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ (الانعام)۔ وجہ یہ ہے کہ محشر میں ربّ العالمین کی عدالت قائم ہوگی وہ سب کو آزادی دیں گے کہ جو چاہے بیان دے، جھوٹ بولے یا سچ بولے۔ کیونکہ ربّ العزّت کو ذاتی علم بھی پورا پورا ہے، اور عدالتی تحقیقات کے لئے وہ ان کے اقرار کرنے نہ کرنے کا محتاج نہیں، جب انسان جھوٹ بولے گا تو اُس کے منہ پر مہر لگادی جائے گی، اور اس کے ہاتھ پاؤں اور کھال وبال سے شہادت لی جائے گی وہ سچ سچ سارا واقعہ بیان کردیں گے، جس کے بعد اس کو کوئی حجت باقی نہ رہے گی، [2] اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ الآية (یٰسٓ: ۶۵) کا یہی مطلب ہے۔ اور قرآن کریم کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں مختلف مواقف ہوں گے، ہر موقف کے حالات الگ ہیں۔ ایک موقف وہ بھی ہوگا جس میں بغیر اذنِ الٰہی کے کسی کو بولنے کا اختیار نہ ہوگا اور وہ صرف سچ اور صحیح بات ہی بول سکے گا، جھوٹ پر قدرت نہ ہوگی، جیسا ارشاد ہے [3] لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ (النبا)

قبر میں کوئی جھوٹ نہ بول سکے گا

اس کے برخلاف قبر کے سوال وجواب میں احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ جب کافر سے پوچھا جائے گا کہ تیرا

---

[1] ترجمہ: کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے۔

[2] ترجمہ: آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے۔

[3] ترجمہ: کوئی بول نہ سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اجازت دیدے اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے۔

رَبّ کون ہے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ تو وہ کہے گا: ھَاہُ ھَاہُ لَا اَدْرِیْ،[1] "یعنی ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا" اگر وہاں جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو کیا مشکل تھا، کہہ دیتا کہ میرا رَبّ اللہ ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ تو یہ ایک عجیب بات ہے کہ کافر لوگ اللہ کے سامنے تو جھوٹ بولنے پر قادر ہوں اور فرشتوں کے سامنے جھوٹ نہ بول سکیں۔ مگر غور کیا جائے تو کچھ تعجب کی بات نہیں، وجہ یہ ہے کہ فرشتے نہ تو عالم الغیب ہیں، نہ ان کو یہ اختیار ہے کہ ہاتھ پاؤں کی گواہی لے کر اس پر حجت تمام کر دیں، اگر ان کے سامنے جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو سب کافر فاجر عذابِ قبر سے بے فکر ہو جاتے، بخلاف اللہ جل شانہ کے کہ وہ دلوں کے حال سے بھی واقف ہیں۔ اور اعضاء و جوارح کی شہادت سے اس کا جھوٹ کھول دینے پر قادر بھی ہیں۔ اس لئے محشر میں یہ آزادی دے دینا عدالتی انصاف میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا۔ واللہ اعلم

تَمَّتْ

سُورۃ الرُّوم بحمد اللہ فی یوم السّبت ٢٨/ذیقعدہ ١٣٩١ھ

[1] سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب المسألة فی القبر وعذاب القبر ج:٢ ص:٣٠٥

تفسیر معارف القرآن میں قرآنِ کریم کی سورتوں کی فہرست

جامعہ دار العلوم کراچی

Jamia Darululoom Karachi